قال تعالیٰ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (الآیۃ)

فکیف ودّی ماحییت ونصرتی لآل رسول اللہ زین المحافل

(حسان ابن ثابتؓ فی مدح ام المؤمنین عائشۃ صدیقۃؓ)

زین المحافل

شرح الشمائل للترمذی

افادات

شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ

استاذ الحدیث ومہتمم جامعہ دار العلوم حقانیہ

جلد اول

ضبط وترتیب

مولانا اصلاح الدین حقانی

نظر ثانی وحاشیہ

مولانا مفتی مختار اللہ حقانی

ناشر: مؤتمر المصنفین جامعہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

نام کتاب : زين المحافل شرح الشمائل للامام الترمذی

افادات : شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ
استاد الحدیث و مہتمم جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

ضبط وترتیب : مولانا اصلاح الدین حقانی
استاد الحدیث جامعہ اسلامیہ لکی مروت

نظر ثانی وحاشیہ : مولانا مفتی مختار اللہ حقانی
مفتی واستاد شعبہ تخصص فی الفقہ والافتاء جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

کمپوزنگ : محمد اکمل، بابر حنیف جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

صفحات : جلد اول:532 جلد دوم:526

طبع اول : اپریل ۲۰۰۷ء

ناشر : مؤتمر المصنفین جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

طابع : المطبعۃ العربیہ، لیک روڈ پرانی انارکلی لاہور

مطبوعات مؤتمرالمصنفین جامعہ حقانیہ

نمبر شمار	نام کتاب	تصنیف	افادات	صفحات
۱	حقائق السنن شرح جامع السنن	حضرت مولانا سمیع الحق	شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحقؒ	۵۳۶
۲	دعواتِ حق (مکمل دو جلد)	" " "	" " " "	۱۱۹۲
۳	قومی اسمبلی میں اسلام کا معرکہ	" " "	" " " "	۴۰۰
۴	عبادات وعبدیت	" " "	" " " "	۸۸
۵	مسئلہ خلافت وشہادت	" " "	" " " "	۱۰۴
۶	صحبتے با اہل حق (مجلد)	مولانا عبدالقیوم حقانی	" " " "	۴۰۸
۷	اسلام اور عصر حاضر (مجلد)	حضرت مولانا سمیع الحق	حضرت مولانا سمیع الحق	۴۶۰
۸	قرآن حکیم اور تعمیر اخلاق	" " "	" " " "	۹۶
۹	کاروان آخرت (مجلد)	" " "	" " " "	۴۴۶
۱۰	شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ خصوصی نمبر	مولانا عبدالقیوم حقانی	" " " "	۱۲۰۰
۱۱	قادیانیت اور ملت اسلامیہ کا موقف	حضرت مولانا سمیع الحق	" " " "	۲۰۸
۱۲	قادیان سے اسرائیل تک	" " "	" " " "	۲۲۴
۱۳	قومی اور ملی مسائل پر جمعیت کا مؤقف	" " "	" " " "	
۱۴	میری علمی اور مطالعاتی زندگی (مجلد)	" " "	" " " "	۵۶۰
۱۵	روسی الحاد	" " "	" " " "	۲۲۰
۱۶	فتاوی حقانیہ (چھ جلد)	مولانا مفتی مختار اللہ	حضرات شیخ الحدیث ومفتیان حقانیہ	۳۶۰۰
۱۷	خطبات حق	" " "	حضرت مولانا سمیع الحق	۴۵۰
۱۸	اسلام کا نظام اکل وشرب وفلسفہ حلال وحرام	" " "	" " " "	۴۵۰
۱۹	صلیبی دہشت گردی اور عالم اسلام	مولانا عبدالقیوم حقانی	" " " "	۵۰۰
۲۰	زین المحافل (شرح شمائل ترمذی) (۲ جلد)	مولانا اصلاح الدین حقانی	" " " "	زیر طبع
۲۱	مروجہ کرنسی کیلئے معیار نصاب سونا یا چاندی	مولانا مفتی مختار اللہ	مولانا مفتی مختار اللہ	۱۰۰

نمبر شمار	نام کتاب	تصنیف	افادات	صفحات
	انوارِ حق (جلد اول)	حافظ سلمان الحق حقانی	حضرت مولانا انوار الحق حقانی	۲۶۰
	شریعت بل کا معرکہ	حضرت مولانا سمیع الحق		
	مکتوبات مشاہیر بنام شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ	" " "		زیر طبع
	مکتوبات مشاہیر بنام مولانا سمیع الحق مدظلہ	" " "		زیر طبع
	اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ باتیں	حضرت مولانا سمیع الحق		
	ماہنامہ الحق کا مولانا عبدالحقؒ نمبر	مولانا عبدالقیوم حقانی		
	حیات صدر المدرسین	مولانا محمد ابراہیم فانی		
	افادات حلیم	" " "	شیخ الحدیث مولانا عبدالحلیمؒ زروبوی	
	حیات شیخ القرآن	" " "		
	دروس الکافیہ	مولوی محمد سلیم سواتی حقانی	مولانا محمد ابراہیم فانی	
	العیون الصافیہ	مولوی مولاداد ہمدرد حقانی	" " "	
	داغہائے فراق	مولانا محمد ابراہیم فانی	" " "	
	جماعۃ النساء کی شرعی حیثیت	مولانا مفتی مختار اللہ حقانی	مولانا مفتی مختار اللہ حقانی	
	سادات اور بنو ہاشم کیلئے زکوۃ دینے کی شرعی حیثیت	" " "	" " "	
	صفۃ الاقوال فی استحباب صوم ستۃ من شوال	" " "	" " "	زیر طبع
	دار العلوم سے جامعہ ازہر تک	مولانا مفتی غلام الرحمٰن		
	تبلیغ مستورات سے ازالہ شبہات	مولانا حافظ شوکت علی		
	اعمالِ روحانی	" " "	شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ	
	تنویر الجامع شرح ملا جامی (پشتو)	" " "	مولانا حافظ شوکت علی	
	مسئلہ رویت ہلال اور اختلاف مطالع	مولانا مفتی مختار اللہ حقانی	مولانا مفتی مختار اللہ حقانی	زیر طبع
	سفر کے مسائل	مولانا مفتی غلام قادر نعمانی		

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

قال تعالیٰ لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ (الآیۃ)

فکیف ووِدّی ماحییت ونصرتی لآل رسول اللّٰہ زین المحافل

(حسان ابن ثابتؓ فی مدح ام المؤمنین عائشۃ صدیقہؓ)

زین المحافل شرح الشمائل للترمذی

جلد دوم

افادات

شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ

استاذ الحدیث و مہتمم جامعہ دار العلوم حقانیہ

ضبط و ترتیب

مولانا اصلاح الدین حقانی

نظر ثانی و حاشیہ

مولانا مفتی مختار اللہ حقانی

ناشر: مؤتمر المصنفین جامعہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

مقدمہ

(از مولانا اصلاح الدین حقانی مرتب کتاب)

کسی بھی علم میں ابتداء علی وجہ البصیرت کرنے کیلئے کچھ امور کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔ ان امور کے مجموعے کو مقدمۃ العلم کہتے ہیں۔ کتاب کی شرح شروع کرنے سے پہلے ہم علم حدیث کے متعلق ایسے چند امور کا بیان کریں گے۔

امر اول: علم حدیث کیا ہے؟ ''علم الحدیث'' ایک مرکب لفظ ہے جس کے دو جزو ہیں۔ مضاف یعنی علم اور مضاف الیہ یعنی ''الحدیث'' علم چار معانی میں مستعمل ہے۔

(۱) علم کا لغوی معنی دانستن یعنی جاننا ہے۔ یہ ایک مصدری مفہوم ہے جو اختیاری اور کبھی غیر اختیاری ہوتا ہے۔

(۲) علم کا عرفی معنی ہے مابہ الانکشاف یعنی وہ چیز جس کے ذریعے کسی مفہوم کا ادراک اور انکشاف ہوتا ہے۔ اس معنی میں علم کا مصداق عقلاء کے نزدیک ہر زمانہ میں متنازع فیہ رہا ہے۔ چنانچہ بعض لوگ اسے کیفیت قلبی بتاتے ہیں۔ بعض حصول الصورۃ کے بعد حال سے تعبیر کرتے ہیں کچھ لوگ اسے صورۃ حاصلہ اور بعض دیگر افراد حصول الصورۃ کو اس کا مصداق گردانتے ہیں۔ اور کچھ لوگ اس کو عین عالم بھی سمجھتے ہیں۔ بہر حال اس کے مصداق میں قول فیصل ناپید ہے۔

(۳) علم کا تیسرا معنی شرعی ہے۔ وہ ہے ''نور فی المؤمن مقتبس من مشکوٰۃ مصابیح النبوۃ'' یعنی وحی اور نبوۃ کی وہ روشنی جو کسی مومن کے قلب کو منور کرے۔ شرعی معنی میں علم کہلاتا ہے۔

(۴) علم کا چوتھا استعمال ''علم مدوّن'' کے معنی میں ہے یعنی واضعین و مدوّنین کا ترتیب دیا ہوا فن۔ جیسے ''علم فقہ''، ''علم بلاغت'' وغیرہ۔

اجمالی طور پر اس کے بھی تین مصداق علماء کے نزدیک مذکور ہیں۔

(۱) نفس مسائل (۲) تصدیقات بالمسائل (۳) تصدیقات سے حاصل شدہ ملکہ

دوسرا جزء "الحدیث" ہے یہ تین معانی میں مستعمل ہے

(۱) لغوی لحاظ سے یہ فعیل کا وزن ہے جو فاعل کے معنی میں ہے۔یعنی حدیث حادث (نو پیدا) کے معنی میں ہے۔جو قدیم کا متضاد ہے۔

(۲) عرفاً حدیث خبر (جو انشاء کی ضد ہے) کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔اردو میں اس کا معنی "نئی بات" سے کرنا مناسب ہے۔لغوی معنی اور عرفی معنیٰ میں مناسبت واضح ہے۔حضرت علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں "**وامّا الحدیث فاصله ضدالقدیم وقداستعمل فی قلیل الخبر وکثیرہٖ" لأنّه یحدث شیئاً فشیئاً**(۱)۔

(۳) حدیث کا شرعی معنی ہے "**مایضاف إلیٰ النبیّ ﷺ فی قولٍ اوفعلٍ او تقریرٍ**(۲)" چونکہ آئندہ اسی معنیٰ میں حدیث زیر بحث رہے گا۔اس لئے اس تعریف کی کچھ تشریح کرنا مناسب ہے۔یہاں تین چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔قول نبی ﷺ، فعل نبی ﷺ اور تقریر نبی ﷺ۔

قول نبی ﷺ: وہ الفاظ اور ارشادات لسانیہ ہیں جو وقتاً فوقتاً نبی کریم ﷺ سے صادر ہو چکے ہیں۔مثلاً نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے **انما الاعمال بالنّیات**۔

فعل نبی ﷺ: اس سے مراد وہ کام اور اعمال ہیں جو نبی کریم ﷺ سے صادر ہو چکے ہیں۔مثلاً **مسح النبیّ ﷺ علی الخفّین** یعنی نبی کریم ﷺ نے موزوں پر مسح کیا۔

تقریر نبی ﷺ: تقریر یہاں تثبیت کے معنی میں ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کسی صحابی کو کوئی قول یا فعل کرتا ہوا دیکھیں اور آپ ﷺ اس پر سکوت فرمائیں اور انکار نہ فرمائیں۔یہ کم از کم اس فعل کے جائز ہونے کی دلیل بن جاتی ہے۔مثلاً صحابہ کرامؓ صرف اِزار (لنگی) باندھ کر نماز پڑھا کرتے تھے۔اور نبی کریم ﷺ خاموشی سے ان کو دیکھتے تھے۔یہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے صحابہ کرامؓ کے اس فعل کی تقریر ہے۔

---

(۱) تدریب الراوی جلد نمبر ۱ ص ۴۲

امر دوم: حدیث کی وجہ تسمیہ: حدیث کی وجہ تسمیہ کے بارے میں علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی رائے پہلے ذکر ہو چکی ہے۔وہ فرماتے ہیں ''لأنّــه یـحـدث شیئـاًفشیئا ''یعنی چونکہ نبی اکرم ﷺ کے اقوال وافعال اور تقریرات حادث ہیں۔اس لئے اسے حدیث کہتے ہیں۔

علامہ ابن حجرؒ نے اس کی کچھ مزید وضاحت کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ شریعت کے دو مدار ہیں۔کتاب اللہ اور رسول اللہ۔حدیث مؤخرالذکر کے ساتھ مختص ہوتا ہے اور چونکہ کتاب اللہ قدیم ہے اور مؤخرالذکر حادث ہے لہٰذا کتاب اللہ کے تقابل کی وجہ سے اسے حدیث کہا گیا ہے''وکـانّـه أریدبہ مقابلة القرآن لأنّه قدیم"(۱)۔

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے مقدمہ فتح الملہم میں ایک اور وجہ تسمیہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہ کہتے ہیں کہ حدیث کا لفظ''قرآنی آیت''''واّمـا بـنـعـمـة ربّـک فحدّث" (۲) سے مقتبس یعنی ماخوذ ہے۔اس کی تفصیل یہ ہے کہ سورۃ الضحیٰ میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر تین انعامات کا ذکر کیا ہے۔ (۱)ایواء(ٹھکانہ دینا)(۲)ہدایت(۳)اغناء۔پھر ہر نعمت کے مقابلہ میں ایک مطالبہ کیا گیا ہے۔دوسری نعمت یعنی ہدایت دینے کے مقابلہ میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس نعمت کا اظہار و بیان کر دو۔اس حکم کو آیت مذکورہ میں''فـحـدّث''سے بیان کیا گیا ہے۔چنانچہ آپ کے بیان کو تـحـدیـث اور بیان شدہ امور کو ''حدیث''کہا گیا۔

امر سوم: علم الحدیث کی تعریف: مضاف اور مضاف الیہ کی تشریح کے بعد مرکب لفظ''علم الحدیث'' کی تشریح کا مرتبہ آتا ہے۔واضح رہے کہ علم کے معنی میں سب سے آخری معنیٰ اور حدیث کے معانی میں بھی سب سے آخری معنیٰ لے کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ''علم الحدیث''وہ علم مدوّن ہے جس میں نبی کریم ﷺ کے اقوال،افعال اور تقریرات سے بحث کی جاتی ہے۔واضح رہے کہ علم الحدیث کی تعریف میں متقدمین اور متاخرین کا اختلاف نقل کیا جاتا ہے۔

---

(۱)تدریب الراوی جلد۱ص۴۲

(۲)سورۃ والضحیٰ

متقدمین کہتے ہیں"هو علم يعرف به أقوال النبيّ ﷺ وأفعاله وأحواله" (۱) اس تعریف کی رو سے علم الحدیث روایۃ الحدیث کے ساتھ مختص ہوگا۔یعنی سند حدیث سے صرف نظر کر کے متن الحدیث میں جو کچھ مقصود بالروایۃ ہوتا ہے اسی کی معرفت علم الحدیث کہلائے گا۔

انکے نزدیک علم الحدیث کا موضوع ذات النبیّ ﷺ من حيث أنّه نبيّ ومبلّغ ہے۔اور اس کا غایہ قریبہ معرفة متون الاحاديث ہے۔یعنی راویوں نے جو مضامین روایت کی ہیں ان کو جاننا مقصود ہوتا ہے۔

متاخرین نے علم الحدیث کی تعریف یوں کی ہے"هو علم يعرف بها احوال السند والمتن"یعنی علم حدیث وہ علم ہے جس میں روایۃ الحدیث کی حقیقت،شروط،انواع واحکام کے ساتھ ساتھ احوال رواۃ،اصناف مرویات اور دیگر متعلقات روایت بیک وقت زیر بحث ہوتے ہیں۔اس کو درایۃ الحدیث بھی کہتے ہیں۔اس فن کا موضوع متن وسند دونوں اور غایہ مقبول ومردود احادیث میں تمیز کرنا ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں ؎

علم الحديث ذو قوانين تحدّ یدریٰ بها احوال متن وسند

فذالک الموضوع والمقصود ان يعرف المقبول والمردود (۲)

متاخرین میں سے بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اول الذکر مطلق علم الحدیث کی تعریف ہے اور مؤخر الذکر علم اصول حدیث کی تعریف ہے لیکن سلف میں سے بعض نے مؤخر الذکر کو بھی مطلق علم الحدیث کی تعریف قرار دیا ہے۔

<u>امر چہارم:حدیث،اثر،خبر اور سنت:</u> بعض حضرات کے نزدیک یہ چاروں الفاظ مترادف ہیں۔جب کہ بعض لوگوں نے ان میں فرق کیا ہے۔چنانچہ حدیث"ما نسب إلى النبيّ ﷺ من قولٍ او فعلٍ او تقريرٍ"کو کہا جاتا ہے۔اور اثر"ما نسب إلى الصحابيّ"کو کہا جاتا ہے۔یعنی وہ قول وفعل جو کسی صحابی

(۱)الکرمانی ج۱ص۱۲،عینی جلد نمبر۱۰ص۱۱

(۲)اوجز المسالک جلد۱ص۵

کی طرف منسوب ہو۔جبکہ خبر کا لفظ عام ہے۔اَحوال نبیﷺ اوراَحوال سلاطین ماضیہ دونوں کو کہا جاتا ہے۔

البتہ سنت کا لفظ اصطلاحاً عام ہے۔ نبی کریمﷺ،صحابہؓ اور تابعین کے ہاں پسندیدہ طور طریقوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

تنبیہ: واضح رہے کہ سند طریق حدیث یعنی رجال کے اس مجموعہ کا نام ہے جنہوں نے حدیث کی روایت کی ہے اور کبھی اسناد بھی اسی معنیٰ میں مستعمل ہوتا ہے۔جبکہ متن ان کلمات اور احکام کا نام ہے جو مقصود بالبیان ہو یا بالفاظ دیگر "مایساق له السند" یعنی وہ حکم جس کیلئے سند بیان کی گئی ہو۔

امر پنجم: موضوع علم حدیث اور غرض وغایہ: ان دونوں امور کا ذکر علم الحدیث کی تعریف کے ضمن میں ہو گیا ہے۔

امر ششم: مرتبۂ علم حدیث: فضیلت کے اعتبار سے تفسیر کے بعد دوسرا مرتبہ علم حدیث کا ہے۔کیونکہ قرآن مجید اور اس کی تفسیر کو مطلقاً شرف حاصل ہے۔جبکہ تعلّم کے اعتبار سے علم حدیث کا مرتبہ سب سے آخر میں ہوتا ہے کیونکہ تمام علوم آلیہ تو حدیث کے فہم میں معاون بلکہ اس کیلئے موقوف علیہ کے درجہ میں ہیں۔کیونکہ بغیر دیگر علوم کے غلطی اور حدیث بیان کرتے ہوئے کذب علی النبیﷺ کا خوف ہوتا ہے جو بہت خطرناک بات ہے۔اس لئے تعلّم کے وقت دیگر فنون کو اس پر مقدم کرنا ضروری ہے۔تاکہ روایت میں خطا سے بچا جاسکے۔

امر ہفتم: تدوین حدیث: احادیث کی نسبت تو آنحضرتﷺ کی طرف ہوتی ہے۔اور اس کی کتابت کا سلسلہ بھی نبی کریمﷺ اور صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں ثابت ہے۔چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ زمانہ نبوت میں احادیث کی کتابت کرتے تھے۔اس طرح حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد اُن سے سنی ہوئی احادیث کی کتابت کیا کرتے تھے۔جن میں حسن بن عمروؒ، بشر بن نھیکؒ،ھمام بن منبہؒ اور وھب بن منبہؒ کے امالی اور صحیفے قابل ذکر ہیں(۱)۔لیکن اس کو فن کا درجہ اور مستقل علم کی حیثیت کس نے دی ہے۔اس سلسلے میں دو نام قابل ذکر ہیں۔

(۱) سنن دارمی جلد نمبر ا ص ۱۳۸ اور مسند احمد جلد ۲ ص ۳۱۲ تا ۳۱۸

اول: امام محمد بن مسلم بن عبیداللہ بن عبداللہ بن شہاب الزہریؒ (م ۱۲۵ھ) ہیں۔ جد امجد شہاب کی طرف ان کی نسبت ہوتی ہے۔ علامہ ابن حجرؒ نے ان کو "اول من دون الحدیث" کا مصداق ٹھہرایا ہے(۱)۔

اسی طرح امام مالکؒ نے بھی انہی کو مدوّن اوّل قرار(۲) دیا ہے۔

دوم: ابوبکر بن حزمؒ (م ۱۲۰ھ) ہیں جو عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں مدینہ کے گورنر تھے۔ انہوں نے بھی اپنے زمانہ میں احادیث کو جمع کیا تھا۔

دراصل حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے خلافت کے زمانہ میں علماء اور امراءِ جنود (جرنیلوں) کو حکم دیا تھا کہ وہ احادیث کو جمع کر کے محفوظ کرلیں کیونکہ ان کے ضائع ہونے کا خدشہ تھا۔ اس سلسلے میں امام زہریؒ، ابوبکر بن حزمؒ اور سعد بن ابراہیمؒ کو خصوصی طور پر جمع حدیث کا حکم ملا تھا۔ چنانچہ امام زہریؒ نے تعمیل حکم میں احادیث کا مجموعہ تیار کر کے عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس بھیجا تھا۔ انہوں نے اس کی نقلیں کروا کر اطراف مملکت میں بھیج دیں۔ جب کہ ابن حزمؒ کا مجموعہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس نہیں پہنچ سکا۔ اسی وجہ سے امام مالکؒ وغیرہ نے امام زہریؒ کو مدوّن اوّل کا درجہ دیا۔ اور یہی راجح معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ امام زہریؒ تدوین حدیث کے طبقہ اولیٰ کے سرخیل ہیں۔ اس کے بعد دوسرے طبقہ میں ربیع ابن صبیحؒ (م ۱۶۰ھ) اور سعید بن ابی عروبہؒ (م ۱۵۶ھ) وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ جنہوں نے تصنیف کے ساتھ تبویب اور ترتیب کا لحاظ بھی رکھا۔

تیسرا دور ۱۵۰ھ سے ۲۲۰ھ تک کا ہے جس میں ابن جریجؒ (م ۱۵۰ھ)، معمر بن راشدؒ (م ۱۵۴ھ) امام اوزاعیؒ (م ۱۵۷ھ) امام ثوریؒ (م ۱۶۱ھ) امام مالکؒ اور عبداللہ ابن المبارکؒ کے نام قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے بھی احادیث اور آثار صحابہ کو جمع کر کے متعدد ابواب کے مجموعے تیار کئے اور مستقل کتب تالیف کیں۔

---

(۱) فتح الباری ج ۱ ص ۲۰۸

(۲) حلیۃ الاولیاء ج ۳ ص ۳۶۳

چوتھا دور ۲۰۰ھ سے ۲۲۵ھ تک کا ہے جس میں عبیداللہ بن موسیٰؒ (م۲۱۳ھ) نعیم ابن حمادؒ (م۲۲۸)، عثمان بن ابی شیبہؒ (م۲۳۹) اورامام احمد بن حنبلؒ (م۲۴۱) وغیرہ شامل ہیں ان حضرات نے مرفوع احادیث کے مجموعے لکھے۔ جن میں آثار صحابہ کوکم ذکر کیا گیا لیکن ان مجموعوں میں حسن اور ضعیف احادیث بھی موجود تھیں۔

پانچواں طبقہ کتب صحاح وحسان کے مصنفین کا ہے۔ جن کا دور ۲۲۵ھ سے شروع ہوتا ہے۔ ان کے سرخیل امام بخاریؒ اورامام مسلمؒ ہیں۔ جن کی تقلید میں امام نسائیؒ، امام ابوداؤدؒ، امام ترمذیؒ، امام ابن ماجہؒ نے بھی تالیفات کیں۔ انہوں نے صحاح کی تجرید کی یعنی غیرصحیح احادیث سے ان کو الگ کر دیا۔

<u>امر ہشتم: کتب حدیث:</u> کتب حدیث کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن ان میں سات بڑی قسموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

<u>(۱) جوامع:</u> جامع کی جمع ہے۔ جامع اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں ان آٹھ فنون کی احادیث کو جمع کیا گیا ہو جن کو اس شعر میں ذکر کیا گیا ہے۔

سیر وآداب وتفسیر وعقائد　　　　فتن، احکام واشراط ومناقب

صحیح بخاری اور سنن ترمذی بالاتفاق جوامع میں سے ہیں۔ جبکہ صحیح مسلم شریف میں تفسیر کی قلت کی وجہ سے اختلاف ہے کہ جامع ہے یا نہیں۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ مسلم میں بھی تفسیر کے بارے میں اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ اگرچہ وہ متفرق ہے اس لئے صاحب کشف الظنون اور صاحب قاموس نے اسے بھی جوامع میں سے شمار کیا ہے۔

<u>(۲) سنن:</u> فقہی ترتیب کے موافق ترتیب دی ہوئی حدیث کی کتاب کو سنن کہا جاتا ہے جیسے سنن ترمذی اور سنن ابی داؤد وغیرہ۔

<u>(۳) مسانید:</u> مسند حدیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں صحابہ کرامؓ کی مروی احادیث کو صحابہ کرام کی ترتیب کے مطابق لایا جائے۔ یہ ترتیب یا تو اسماء صحابہ کے حروف تہجی کو ملحوظ رکھتے ہوئے دی جاتی ہے یا پھر ان کے مراتب کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ جیسے مسند امام احمدؒ

<u>(۴) معاجم:</u> معجم اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں مصنفؒ نے اپنے مشائخ کی ترتیب کا لحاظ

کیاہو۔ پھر مشائخ کی ترتیب میں کبھی ان کی وفیات کواور کبھی ان کے علم وفضل کوملحوظ رکھاجاتا ہے۔لیکن اکثروبیشتر یہاں بھی ان کے اسماء کے حروف تہجی کا اعتبار کیا جاتا ہے۔جیسے امام طبرانیؒ کی معجم کبیر،معجم اوسط اورمعجم صغیر وغیرہ۔

(۵)مستدرکات: مستدرک احادیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں کسی مؤلف کتاب کے شروط کے مطابق اس سے متروک احادیث کوجمع کیاجائے جیسے "مستدرک حاکم" یہ کتاب ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الحاکم(م۴۰۵ھ) نے لکھی ہے۔اور بخاری ومسلم کے شروط کے مطابق ان سے چھوٹی ہوئی احادیث کوجمع کیا۔

(۶)مستخرجات: مستخرجات مستخرج کی جمع ہے۔مستخرج اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں مصنف کسی دوسرے مصنف کی روایات کواپنی سند کے ساتھ روایت کرے۔یوں کہ مصنف سابق کاواسطہ درمیان میں نہ آئے۔جیسے محمد بن عبدالمالک کی "مستخرج علی سنن ابی داؤد" وغیرہ۔

(۷)اجزاءورسائل: جزء احادیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں کسی ایک مسئلہ کے متعلق احادیث کوجمع کیاجاتا ہے۔مثلاً جزء القراءۃ خلف الامام للبخاریؒ۔اسے متاخرین کی اصطلاح میں رسالہ بھی کہاجاتا ہے۔امام ترمذیؒ کی کتاب شمائل ترمذی کوبھی اسی صنف کے تحت شمار کیاجانا چاہیے۔

مذکورہ مشہوراقسام کے علاوہ کچھ دیگراصناف بھی ہیں۔مثلاً کتاب الافراد والغرائب، کتاب العلل،اطراف،مسلسلات اوراربعینات وغیرہ

امرنہم:حکم شرعی: علم حدیث کاحصول فرض کفایہ ہے حتیٰ کہ جہاں پر مسلمان موجود ہوں اورکوئی بھی اس علم کاعالم نہ ہوتو تمام مسلمان ترک فریضہ کے گنہگار ہونگے۔

امر دہم:تقسیمات حدیث: حدیث میں مختلف جہات سے متعدد تقسیمات ہیں۔

تقسیم اول باعتبارانتہائے حدیث: اس اعتبار سے حدیث تین قسم پر ہے۔

(۱)مرفوع (۲)موقوف (۳)مقطوع

مرفوع: مرفوع وہ حدیث ہے جس میں کسی قول،فعل یاتقریر کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف کی گئی ہو۔

موقوف: وہ حدیث ہے جس میں نسبت صحابی کی طرف کی گئی ہو۔

مقطوع: مقطوع وہ حدیث ہے جس میں نسبت کسی تابعی کی طرف ہو۔

تقسیم دوم باعتبار تعداد رواۃ: اس لحاظ سے حدیث کی چار بڑی قسمیں ہیں۔

(۱) متواتر: اگر کسی روایت کو ہر زمانے میں راویوں کی اتنی تعداد روایت کرے کہ کثرت کی بناء پر ان کے جھوٹ پر اتفاق کو عقل سلیم عادتاً محال سمجھے تو حدیث متواتر کہلاتی ہے۔ بعض لوگوں نے یہاں مخصوص عدد کا اعتبار کیا ہے لیکن حق یہ ہے کہ تواتر میں راویوں کی کسی خاص عدد کا اعتبار نہیں ہوتا۔ بلکہ جب بھی کوئی تعداد یقین اور جزم کا مفید ہو تو وہ تواتر کا فائدہ دے گا۔

(۲) غریب: اگر کسی زمانہ میں کسی روایت کو روایت کرنے والا ایک ہو تو اسے غریب کہتے ہیں۔

(۳) عزیز: اگر سند کے کسی طبقہ میں رواۃ کی تعداد دو سے کم نہ ہو مگر تمام طبقات میں تین تک نہ پہنچتی ہو تو اسے عزیز کہتے ہیں۔

(۴) مشہور (۱): جب تمام مراتب سند میں رواۃ کی تعداد دو سے زیادہ ہو اور حدیث متواتر کے درجہ کو بھی نہ پہنچی ہو تو وہ حدیث مشہور یا مستفیض کہلاتی ہے۔

تنبیہ: علامہ عثمانیؒ فتح الملہم کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ مشہور یہ ہے کہ حدیث مشہور اور حدیث عزیز میں طبقہ اولیٰ یعنی صحابہ کے زمانے میں تعداد شرط نہیں ہے گویا ایک صحابی کی روایت بھی عزیز یا مشہور ہو سکتی ہے۔

تقسیم سوم باعتبار سقوط رواۃ اور عدم سقوط: اس اعتبار سے حدیث کی دو بڑی قسمیں ہیں۔

(۱) متصل: اگر حدیث کی سند میں کہیں بھی کوئی راوی گرا ہوا نہ ہو تو اس کو حدیث متصل کہتے ہیں۔ متصل مرفوع بھی ہو سکتا ہے اور موقوف یا مقطوع بھی۔ البتہ مسند کا اطلاق کبھی تو صرف مرفوع متصل روایت پر ہوتا ہے اور کبھی یہ صرف متصل کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔

(۲) منقطع: اگر رواۃ میں کسی جگہ کوئی ایک یا زیادہ راوی ساقط ہو چکے ہوں تو اس کو حدیث منقطع (بالمعنی الاعم) کہتے ہیں۔ پھر منقطع بالمعنی الاعم کی کئی قسمیں ہیں۔

---

(۱) فقہاء احناف کے ہاں حدیث کی بنیادی تین قسمیں ہیں (۱) متواتر (۲) مشہور (۳) آحاد جبکہ جمہور کے ہاں حدیث کی بنیادی دو قسمیں (۱) متواتر (۲) احاد۔ فقہاء احناف میں بھی بعض فقہاء جیسے امام جصاص وہ اس تقسیم میں جمہور کا ساتھ دیتے ہیں۔ مگر فرق اتنا ہے کہ بعض فقہاء احناف مشہور کو متواتر کا قسم اور جمہور مشہور کو خبر واحد میں داخل کرتے ہیں۔

(۱)مرسل: وہ حدیث جس کی سند کے آخر میں صحابی ساقط ہو چکا ہو۔

(۲)معلق: وہ حدیث جس کی سند کی ابتداء میں ایک یا متعدد راوی ساقط ہوں۔

(۳)منقطع بالمعنی الاخص: وہ حدیث جس کی سند کے وسط میں ایک یا متعدد لیکن غیر متتالی (یعنی بغیر لگاتار کے) راوی ساقط ہوں۔

(۴)معضل: وہ حدیث جس کی سند کے درمیان میں متعدد راوی متتالی یعنی لگاتار ساقط ہو۔

(۵)مدلّس: وہ حدیث ہے جس میں راوی اپنا شیخ ترک کر کے شیخ الشیخ سے اس طرح روایت کرے کہ وہ شیخ الشیخ سے موہم سماع ہو۔ یعنی مخاطب یہ سمجھے کہ جس شیخ الشیخ کا وہ نام لے رہا ہے۔ اس سے وہ بلاواسطہ روایت سن چکا ہے۔

تقسیم رابع: باعتبار احوال رواۃ: راویوں کی صفات اور احوال کے لحاظ سے حدیث کی ابتدائی پانچ قسمیں ہیں۔ جن کی تفصیل سے قبل راویوں میں طعون اور عیوب کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ راویوں میں دو قسم کے عیوب کا احتمال ہے۔ ایک وہ جو راوی کی عدالت کو مجروح کرتے ہیں۔ اور وہ پانچ ہیں۔ کذب، تہمت کذب، فسق، بدعت اور جہالت یعنی مجہول ہونا۔ دوم وہ جو راوی کے ضبط کو مجروح کرتے ہیں۔ وہ بھی پانچ ہیں۔ کثرت غفلت، کثرت غلط، کثرت وہم، سوء حفظ، اور دوسرے ثقہ راویوں کی مخالفت۔

اس تفصیل کے بعد راویوں کی صفات کے اعتبار سے پانچ قسموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اول: صحیح لذاتہ: وہ متصل حدیث جس کو کامل العدل اور کامل الضبط راوی روایت کریں۔ اور وہ علت وشذوذ وغیرہ صفات سے محفوظ ہو۔ صحیح لذاتہ کہلاتا ہے۔ گویا صحیح لذاتہ میں تین وجودی صفات (کمال عدالت، کمال ضبط اور اتصال) نیز وہ سلبی صفات یعنی علت سے خالی ہونا۔ اور شذوذ سے خالی ہونا معتبر ہے(۱)۔

---

(۱)محدثین نے صحیح کی ایک اور تعریف بھی کی ہے اذا تلقاہ الناس بالقبول وإن لم یکن له إسناد صحیح قال ابن عبدالبر فی الاذکار لمّا حکی عن الترمذیّ أنّ البخاریّ صحّح حدیث البحر ھوالطھور ماء ہ واھل الحدیث لا یصحّحون مثل اسنادہ لکنّ الحدیث عندی صحیح لأنّ العلماء تلقوہ بالقبول (مقدمة اعلاء السنن قواعدالحدیث ۱۹ / ۶۰)(مختار)

دوم: صحیح لغیرہ: وہ متصل حدیث جس کی راویوں میں کمال عدل یا کمال ضبط نہ ہو لیکن یہ روایت متعدد طرق (طریقہ کی جمع) سے مروی ہو اور علت وشذوذ سے سالم ہو صحیح لغیرہ کہلاتا ہے۔ گویا اس کی سند میں نقصان کا جبیرہ تعدد اسانید کی وجہ سے ہوتا ہے۔

سوم: حسن لذاتہ: وہ متصل حدیث جس کو کامل العدل لیکن غیر کامل الضبط راوی روایت کرے اور طرق متعدد نہ ہوں لیکن علت وشذوذ سے سالم ہو۔

چہارم: حسن لغیرہ: وہ متصل حدیث جس کے راویوں میں کمال عدل نہ ہو یا کمال عدل اور کمال ضبط دونوں مفقود ہوں۔ لیکن وہ طرق متعددہ سے مروی ہو۔ اور علت وشذوذ سے بھی خالی ہو۔ حسن لغیرہ کہلاتا ہے۔

پنجم: ضعیف: وہ حدیث جسے ناقص العدل اور ناقص الضبط راوی روایت کریں۔ اور اس کے طرق بھی متعدد نہ ہوں یا اس میں علت شذوذ وغیرہ میں عیوب پائے جائیں ضعیف کہلاتا ہے۔

حدیث ضعیف کی اقسام: حدیث ضعیف کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جن میں مشہور اقسام کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) موضوع: وہ حدیث جس کا راوی روایت حدیث میں کذب سے متہم ہو۔ یہ کذب خود اس کے اقرار یا دیگر قرائن سے ثابت ہو چکا ہو۔ موضوع کہلاتا ہے۔ ایسی حدیث قطعی طور پر غیر مقبول ہوتی ہے۔

(۲) متروک: وہ حدیث جس کا راوی غیر باب الروایۃ میں جھوٹ سے مطعون ہو یا یہ روایت دین کے معلوم ومعروف قواعد کے خلاف مروی ہو۔

(۳) شاذ: وہ روایت جس کو ثقہ راوی روایت کرے لیکن وہ اپنے سے اوثق راوی یا ثقہ راویوں کی جماعت سے مخالف ہو شاذ کی مخالف روایت محفوظ کہلاتی ہے۔

(۴) منکر: وہ روایت جس کا راوی ضعیف ہونے کے باوجود ثقہ راویوں کی مخالفت کرے اس کی مخالف روایت معروف کہلاتی ہے۔

(۵) معلل: وہ حدیث جس میں کوئی علۃ خفیہ موجود ہو، جس کی وجہ سے حدیث میں ضعف ہو۔ اس

علۃ خفیہ کوصرف ماہرین فن معلوم کر سکتے ہیں۔

(۶)مضطرب: وہ حدیث جس کی سند یا متن میں کمی بیشی یا تقدیم وتاخیر وغیرہ کے لحاظ سے اختلاف ہو۔اوراس اختلاف کورفع کرنے کیلئے تطبیق یا ترجیح بھی ممکن نہ ہومضطرب کہلاتی ہے۔

(۷)مصحف: وہ حدیث ہے جس میں نقطوں یا حرکت وسکون کے تغیر کی وجہ سے غلطی واقع ہوئی جب کہ عبارت کی صورت خطی باقی رہے۔مثلاً اُبی کی جگہ ابی پڑھا جائے۔جیسے کہ عوام ابن المراجم کی جگہ عوام بن المزاحم پڑھا گیا ہے۔اس طرح ''من صام رمضان واتبع ستاً من شوال فکانّما صام الدھر کله'' کی جگہ ''واتبع شیئاً من شوال'' پڑھا گیا ہے۔کبھی کبھی اس کومحرّف بھی کہتے ہیں۔

(۸)مقلوب: وہ حدیث جس کی سند یا متن میں تقدیم وتاخیر کی گئی ہومقدم کی جگہ مؤخراور مؤخر کی جگہ مقدم ذکرکیا گیا ہو۔یا کسی راوی کی جگہ دوسراراوی ذکر کیا جائے۔یا کسی متن کی سند کودوسرے متن کی سند سے بدل دیا جائے۔

(۹)مدرج: وہ حدیث جس میں راوی اپنا کلام حدیث میں بغرض تفسیر داخل کردے لیکن ادوات تفسیر ذکر نہ کرے۔

(۱۰)منقلب: وہ حدیث جس میں راوی تفسیر کی غرض سے نہیں بلکہ صرف مناسبت کی وجہ سے اپنا کلام داخل کردے جیسے''لاتحاسدوا ولاتباغضواولاتدابروا..''کے ساتھ''ولاتنافسوا'' کااضافہ بھی روایت کیا جائے۔

(۱۱)مدلّس: وہ روایت جس میں راوی شیخ کوترک کرکے شیخ الشیخ سے روایت کرے یوں کہ شیخ الشیخ سے حدیث سننے کاایہام بھی ہو۔یہ بھی ضعیف کی ایک قسم ہے۔

(۱۲)غریب: غریب اورفرد حدیث بھی کبھی غرابت کی وجہ سے ضعیف ٹھہرائی جاتی ہے۔ضعیف کی دیگر قسموں میں وہ روایات ہیں جس کاراوی مجہول،مبتدع اورسیئ الحفظ ہو۔

تقسیم خامس باعتبار صیغ ادا: ادائے حدیث کے صیغوں کے اعتبار سے حدیث کی دوقسمیں ہیں۔

(۱)حدیث مسلسل: وہ حدیث جس میں روایت مقبول صیغوں سے ادا کی جائے۔جیسے حدثنا فلان،

أخبرنافلان، انبأنافلان، قال لنا، رویٰ لنا، سمعته یقول، ذکرنی فلان وغیرہ

(۲)حدیث معنعن: وہ حدیث ہے جسے عــن انَّ یاأن صیغوں سے روایت کیا جائے جوراوی کے سماع پر دلالت نہ کریں۔جیسے عن فلان، انّ فلاناً قال، رویٰ فلاناً، قال فلان، ذکرفلان، کتب فلان وغیرہ۔اس کوحدیث مؤنّن بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ اَنّ اورانّ سے بھی روایت ہوتا ہے۔

تنبیہ: حدیث معنعن کی قبولیت اورقبولیت کی شرائط میں وسیع اختلاف ہے۔ جسے اختصاراً ترک کیاجاتا ہے۔

تقسیم سادس حدیث مقبول میں: عمل کے اعتبار سے حدیث مقبول دوقسم پر ہے۔

(۱)محکم سالم عن المعارضة (۲)مختلف الحدیث

محکم حدیث جس کا کوئی معارض موجود نہ ہو۔مطلقاً معمول بہ ہوتا ہے۔جبکہ مختلف الحدیث یعنی وہ حدیث جس کا دوسرے حدیث سے تعارض ہو تفصیل طلب ہے۔چنانچہ اگر دو حدیث متعارض ملیں تو سب سے پہلے ان میں تطبیق تلاش کی جائے گی۔اگر دونوں کے الگ الگ محمل مل جائیں تو دونوں حدیثوں پرعمل کیاجائے گا۔تطبیق ممکن نہ ہوتو دونوں حدیثوں کی تاریخ کو دیکھا جائے گا۔اگران میں سے کوئی حدیث مؤخر ہوتو وہ معمول بہ ہوگا اورمقدم منسوخ ہوگا۔اگرتاریخ معلوم نہ ہوسکے تو پھراسباب الترجیح کی طرف رجوع کیاجائے گا۔اگرایک کوراجح ثابت کرلیا گیا تو وہی معمول بہ اوردوسرامتروک ہوگا۔اوراگر یہ بھی ممکن نہ ہوسکا تو پھر دونوں پرعمل نہیں ہوگا اورتوقف اختیارکیاجائے گا۔

امر یازدہم:مراتب رواۃ اورصحاح کی درجہ بندی: قوت وضعف کے لحاظ سے راویوں کے پانچ مرتبے ہیں۔

(۱)قوی الضبط کثیر الملازمه: یہ وہ راوی ہے جوحدیث کے اخذ کے وقت غفلت اوراداکے وقت کثرت خطا سے محفوظ ہونیزاپنے استاد سے استفادہ کا التزام رکھے۔

(۲)قوی الضبط قلیل الملازمه: وہ راوی جوغفلت اورخطا کی کثرت سے تو محفوظ ہولیکن شیخ سے اس کااستفادہ قلیل ہو۔

(۳)**قلیل الضبط کثیر الملازمہ:** وہ راوی جو دوسری قسم کا عکس ہو۔

(۴)**قلیل الضبط قلیل الملازمہ سالم من العیوب:** وہ راوی جس کا ضبط اور شیخ کے ساتھ ملازمہ تو ناقص ہو لیکن اس کی عدالت میں نقص نہ ہو اور کذب فسق اور بدعت یا جہالت سے متصف نہ ہو۔

(۵)**قلیل الضبط قلیل الملازمہ مطعون:** جو راوی ضبط وملازمہ میں ناقص ہونے کے ساتھ ساتھ مذکورہ عیوب میں سے کچھ عیوب سے مطعون بھی ہو۔ان کو ضعفاء اور مجہولین بھی کہا جاتا ہے۔

ان مراتب کو ملحوظ رکھ کر صحاح ستہ کی درجہ بندی یوں کی جاتی ہے کہ امام بخاریؒ طبقہ اولیٰ سے بالاستیعاب روایت کرتے ہیں۔اور دوسرے طبقہ کے راویوں سے انتخاب فرماتے ہیں۔اس لئے ان کی کتاب صحت کے اعلیٰ مقام پر ہے۔

امام مسلمؒ کی کتاب دوسرے نمبر پر ہے۔اس لئے کہ وہ اول دو طبقوں سے بالاستیعاب روایت کرتے ہیں۔جب کہ تیسرے طبقہ کے مشاہیر سے روایت کرتے ہیں۔

امام ابوداؤد اور امام نسائی اول الذکر تین طبقوں سے بالاستیعاب روایت کرتے ہیں۔جب کہ چوتھے طبقہ کے راویوں سے انتخاب فرماتے ہیں۔لیکن امام نسائی کی کتاب کو امام ابوداؤد کی سنن پر سبقت درجہ ذیل وجوہ سے حاصل ہے۔

(۱) امام نسائی کمزور احادیث کی کمزوری بیان کر لیتے ہیں۔جبکہ امام ابوداؤد ایسا کم کرتے ہیں۔

(۲) طبقہ رابعہ سے امام نسائی کی روایت کم ہوتی ہے۔جب کہ امام ابوداؤد نسبتاً زیادہ روایت کرتے ہیں

(۳) امام نسائی شخصی لحاظ سے امام ابوداؤد کی نسبت احفظ ہیں۔بلکہ علامہ سبکیؒ اور علامہ ذہبیؒ نے تو ان کو مسلمؒ سے بھی زیادہ احفظ کہا ہے۔

امام ترمذیؒ پہلے چار طبقوں سے روایت کرتے ہیں اور پانچویں طبقہ کے مشاہیر سے بھی۔لیکن انہوں نے بھی اکثر مقامات پر تنقید کا اہتمام کیا ہے۔لہٰذا وہ پانچویں نمبر پر ہے۔

اور آخر میں ابن ماجہؒ کی سنن کا درجہ آتا ہے۔جو مذکورہ تمام طبقات سے روایت کرتے ہیں۔

امر دوازدہم: مشتغلین فی الحدیث کی اقسام:

(۱)طالب: وہ شخص جو طلب حدیث اور اخذ روایت کی ابتداء کرتا ہے۔

(۲)محدّث یا شیخ الحدیث: وہ شخص جو روایات کے حصول کے بعد اس کو نقل کرتا ہو علم حدیث کے ساتھ ایسا تعلق ہو کہ ناسخ ومنسوخ، احوال رواۃ، علل احادیث کے اصول سے واقف ہو۔ اور علم حدیث میں مشغول رہے۔ بعض لوگوں نے ایک ہزار روایات یاد ہونے کی بھی شرط لگائی ہے۔ لیکن مولانا اعزاز علیؒ نے یہ تعریف لکھی ہے کہ "من یُعتنیٰ بروایته ویکتفیٰ بدرایته" یعنی اس کی روایت معتبر اور شرح احادیث قابل اعتماد ہو۔

(۳)حافظ : وہ محدّث جسے ایک لاکھ احادیث اسماء الرجال اور ناسخ ومنسوخ کی معرفت کے ساتھ یاد ہوں۔

(۴)حجۃ: وہ شخص جس کو تین لاکھ احادیث مذکورہ حیثیت کے ساتھ یاد ہوں۔

(۵)حاکم: وہ شخص جس کو تمام روایات اور بعض حضرات کے بقول دس لاکھ احادیث متناً وسنداً جرحاً وتعدیلاً یاد ہوں۔

حافظ، حجۃ اور حاکم کی مذکورہ تعریفیں ملا علی قاریؒ نے فرمائی ہیں۔ لیکن بعض حضرات کا خیال ہے کہ متقدمین کی کتابوں میں مذکورہ القاب کی معیّنہ تعریفات نہیں ملتیں۔

امر سیزدہم: حجیت حدیث: دیگر فتنوں کی طرح دور حاضر میں انکار حدیث کا فتنہ بھی زوروں پر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس دور کے علماء کو جزائے خیر عطا فرمائے جنہوں نے مستقل کتابیں لکھ کر اس فتنے کا سد باب کیا۔ اس لئے ہم اس بحث کو زیادہ تو نہیں چھیڑنا چاہتے۔ بطور خلاصہ صرف اتنا کہیں گے کہ قرآن مجید خود حدیث کی حجیت پر ناطق ہے۔ اور احادیث سے انکار قرآن سے انکار کے مترادف ہے۔

قرآن خود کہتا ہے۔

(۱) اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول(الآیة)

اگر صرف قرآن ہی دلیل وحجت ہے تو اطیعوا الرسول کیلئے کیا رہ جاتا ہے۔

(۲) قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ.(الآیۃ)

اتباع رسول کا امر حدیث پرعمل کی صورت ہی میں ممکن ہے۔

(۳) من یطع الرسول فقداطاع اللّٰہ(الآیۃ)

شرط اور جواب شرط میں مغائرت کے اصول کے مطابق اطاعت رسول،قرآن پرعمل کرنے کے بعدایک اور مامور بہ ہے۔

(۴) ولکم فی رسول اللّٰہ أسوۃ حسنۃ.(الآیۃ)

اس اسوہ حسنہ کواحادیث کے سواہم کہاں ڈھونڈ کے لائیں۔

(۵) وماآتاکم الرسول فخذوہ ومانھٰکم عنہ فانتھوہ.(الآیۃ)

کلمہ مـا کاعموم اس کا متقاضی ہے کہ قرآن کی طرح حدیث بھی واجب العمل ہے۔کیونکہ وہ بھی "ماآتاکم اورمانھٰکم"کا مصداق ہے۔

<u>امر چہاردہم:شرف علم حدیث:</u> قرآن مجید کے علم کے بعد بالاجماع علم حدیث کا مقام آتا ہے۔ بلکہ امام ابوحنیفہؒ سے مروی ہے۔لولا السنۃ لمافھم القرآن۔ظاہر ہے کہ قرآن فہمی کے لئے احادیث کا علم ضروری اور موقوف علیہ ہے۔کیونکہ قرآنی احکام کے اجمال کی تفصیل نبی اکرمﷺ کے قول وفعل ہی میں موجود ہے۔

علاوہ ازیں علم حدیث کا موضوع ذات النبی من حیث ھو نبی ہے۔اور ذات النبی تمام مخلوقات سے افضل ہے۔اس لئے اس سے بحث کرنے والا علم بھی افضل العلوم ہوگا۔

دوسری طرف علم حدیث کی اشاعت کرنے والوں کے لئے نبی اکرمﷺ کی خصوصی دعائیں، اس علم کی افضلیت کی کافی دلیل ہیں۔بہرحال علم حدیث کا علوم میں ایک بڑا عظیم مرتبہ ہے۔اس وجہ سے علماء کافیصلہ ہے کہ"علم حدیث کاحصول فرض کفایہ ہے"

شمائل ترمذی

علم حدیث سے متعلق ضروری مباحث ذکر کرنے کے بعد کتاب کے بارے میں چند ضروری مباحث کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

امر اول: مؤلف کتاب: امام ترمذی رحمہ اللہ

امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن الضحاک السلمی الضریر البوغی الترمذیؒ کا شمار چوٹی کے ان محدثین میں ہوتا ہے جن کی خدمت حدیث کا اعتراف پورے عالم میں اور ہر زمانہ میں یکساں کیا جاتا ہے۔

آپؒ کی کنیت ابوعیسیٰ تھی۔ مصنف ابن ابی شیبہؒ کی ایک حدیث میں ابوعیسیٰ کنیت رکھنے سے منع بھی مروی ہے۔ اس کے باوجود آپ کی کنیت ابوعیسیٰ مشہور ہے۔ اور خود کتاب میں اپنے آپ کیلئے یہی کنیت استعمال کرتے ہیں۔

آپؒ کی اس روش کے لئے شرّاح حدیث متعدد توجیہات کرتے ہیں مثلاً

(۱) مصنف بن ابی شیبہ کی حدیث منسوخ ہے۔

(۲) اس حدیث میں نہی تنزیہی ہے کیونکہ حضرت مغیرہ ابن شعبہؓ نے جب نبی کریم ﷺ سے ابوعیسیٰ کنیت رکھنے کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے اجازت دے دی۔ یعنی یہ دلیل ہے کہ یہ نہی تحریمی نہیں تھی۔

(۳) مصنف ابن ابی شیبہؒ کی حدیث امام ترمذیؒ تک نہیں پہنچی۔

(۴) مصنف ابن ابی شیبہؒ کی حدیث میں نہی صرف اس صورۃ پر محمول ہے۔ جس میں حضرت عیسیٰؑ کے لئے والد ثابت ہونے کا ابہام ہو۔ مطلقاً یہ کنیت استعمال کرنا ممنوع نہیں ہے۔ اس پر قرینہ یہ ہے کہ خود مصنفؒ کی روایت میں نہی مرفوع نہیں ہے۔ بلکہ واقعہ یوں ہے کہ ایک صحابی نے کنیت ابوعیسیٰ رکھ لی تھی۔ جب نبی کریم ﷺ کے علم میں یہ بات آئی تو فرمایا انّ عیسیٰ لااب لہ۔

(۵) بعض حضرات نے نبی کریم ﷺ کے کلام کو ملاطفت اور مزاح پر بھی محمول کیا ہے۔ کہ مقصود نہی نہیں بلکہ توہم فاسدہ کی طرف صرف اشارہ ہے۔ البتہ حضرت عمرؓ سے اس پر واضح نکیر مروی ہے۔ کہ انہوں

نے اپنے ایک بیٹے کو اس پر سزا بھی دی تھی جس کی کنیت ابو عیسیٰ تھی۔ اور مغیرۃ بن شعبہؓ کی کنیت تبدیل کر کے ابو عبداللہ رکھ دی تھی۔

بہر حال روایات پر نظر غائر کرنے کے بعد اس کنیت کے استعمال کی ممانعت کی دلیل غیر مضبوط نظر آتی ہے۔ اور شاید اسی وجہ سے امام ترمذیؒ نے اس کنیت کو استعمال فرمایا ہے۔

آپؒ کی نسبتیں: بنی سلم قبیلہ کی طرف نسبت کی وجہ سے آپ کو سُلمی کہا جاتا ہے۔ ضریر آپ کو اس لئے کہتے ہیں کہ بعض مؤرخین کے نزدیک آپ مادرزاد اندھے تھے۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔

صحیح یہ ہے کہ غلبۂ خوف الٰہی کی وجہ سے آپ اکثر رویا کرتے تھے جس کی وجہ سے آپؒ کی بینائی جاتی رہی۔ جیسا کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ بستان المحدثین میں لکھتے ہیں کہ ''بخوف الٰہی بسیار گریہ وزاری کرد و نابینا شد'' یہی بات علامہ ابن کثیرؒ نے البدایہ والنہایہ میں بھی لکھی ہے اور امام حاکمؒ سے بھی ایسا ہی مروی ہے۔

بوغی: بوغ کی طرف نسبت ہے۔ جو ترمذ سے ۱۸ میل کے فاصلے پر ایک قصبہ ہے۔ جب کہ ترمذ دریائے آمو کے کنارے ایک شہر اور بوغ کیلئے مرکز ہے۔ اس لئے ترمذ کی طرف بھی آپؒ کی نسبت کی جاتی ہے۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ ترمذی کے حوالے سے تین محدثین مشہور ہیں۔

(۱) ابوالحسن احمد بن الحسن الترمذیؒ جو ترمذی کبیر کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ابو عیسیٰ ترمذی اور امام بخاری کے شیوخ میں سے ہیں اور امام محمدؒ اور امام احمدؒ کے شاگرد ہیں۔ فقہ علل اور رجال کے بہت ماہر ہیں۔ ۲۴۰ھ کے بعد وفات پائی ہے۔

(۲) ابو عبداللہ محمد بن علی بن الحسین الترمذیؒ الزاہد یہ حکیم الترمذی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ اپنی کتاب نوادر الاصول سے مشہور ہوئے ہیں۔ یہ سلوک اور طریقت میں زیادہ محو تھے۔ حتی کہ بعض تفردات کی وجہ سے ترمذ سے جلاوطن کئے گئے تھے۔ ۲۸۵ھ تک زندہ تھے۔

(۳) محمد بن عیسیٰ ابو عیسیٰ الترمذیؒ یعنی ہمارے امام ترمذی یہ عمر میں سب سے چھوٹے ہیں۔ ۲۰۹ھ

میں بوغ میں ان کی ولادت ہوئی۔اور سوموار ۱۳ رجب ۹ ۲۷ ھ میں وفات پائی۔

علامہ کاشمیریؒ فرماتے ہیں ؎

الترمذی محمدذوزین عطروفات عمرہ فی عین

تحصیل علم: آپؒ نے تحصیل علم میں بہت سے علاقوں کے سفر کئے۔خراساں،عراق اور حجاز کے متعدد شہروں میں سینکڑوں شیوخ سے استفادہ کیا۔ بخاری کے شاگرد ہیں۔ جامع ترمذی میں اسماء رجال اور نقد حدیث میں ان سے اپنے استفادے کو بار بار بیان کرنے کے علاوہ ان سے دو روایتیں بھی نقل کی ہیں۔امام مسلمؒ سے بھی ایک روایت جامع ترمذی میں روایت کی ہے۔ نیز بہت سے اساتذہ میں وہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے شریک بھی ہیں۔

مسلک: علامہ شاہ انور شاہ کاشمیریؒ نے فیض الباری ج ا ص ۵۸ میں امام ترمذی کو شافعی المسلک قرار دیا ہے۔اسی طرح عرف شذی میں بھی آپ کا یہ قول منقول ہے۔حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ان کو مجتہد منتسب الیٰ احمد و اسحٰق بتایا ہے۔لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ امام ترمذی کسی بھی امام کے مقلد محض نہیں ہیں۔اگر چہ اکثر و بیشتر وہ امام شافعی کے مسلک کے موافق ہوئے ہیں۔

علامہ ابن تیمیہؒ نے ان کو اہل حدیث میں سے شمار کیا ہے۔یعنی نہ تو وہ مجتہد مطلق ہیں نہ مقلد محض (۱)۔

مناقب: امام ترمذیؒ حدیث کے بڑے امام ہیں۔لیکن ابن حزم اندلسیؒ نے ایک عجیب بات لکھی ہے۔ وہ یہ کہ ''محمد بن عیسیٰ ترمذی مجہول ہیں'' ابن حزمؒ کے اس قول کے بارے میں بعض لوگوں نے توجیہات کی ہیں۔ چنانچہ علامہ ذہبیؒ میزان الاعتدال میں فرماتے ہیں۔ کہ ابن حزمؒ نے اپنی کتاب میں ترمذی کو اس لئے مجہول کہا ہے کہ ان کو ترمذی کی جامع اور کتاب العلل نہیں پہنچی (۲)۔

اسی طرح سیر النبلاء میں ابن حزم کچھ مناقب اور کچھ عیوب بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

(۱) راجع توجیہ النظر الی اصول الاثر ص ۱۸۵

(۲) میزان ج ۳ ص ۲۸۹

(۳) سیر النبلآء جلد ۱۸ ص ۲۰۱

''ماذکر سنن ابن ماجة ولاجامع ابی عیسیٰ الترمذی فانّہ مارء اھما ولادخلاالی الاندلس الابعدموته(۳)''

لیکن ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ یہ بات کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ ابن حزمؒ نے شاید امام ترمذی کو نہیں پہچانا تھا۔اوران کے حافظ اور تصانیف کا ان کو علم نہیں تھا۔یہ اس لئے کہ ابن حزم نے یہ عبارۃ دوسرے مشہور ثقہ حفاظ کے بارے میں بھی لکھی ہے۔مثلاً ابی القاسم بغویؒ،اسماعیل ابن محمد صفارؒ اور ابوالعباس الاصمؒ وغیرہ کو بھی مجہول کہا ہے۔خصوصاً جب حافظ فرضی نے ترمذیؒ کا ذکر اپنی کتاب المؤتلف والمختلف میں قدر ومنزلت کے ساتھ کیا ہے تو کیسے ابن حزمؒ امام ترمذیؒ کو نہ پہچان سکا(۱)۔

حق یہ ہے کہ ابن حزمؒ رجال کے سلسلے میں انتہائی متشدد ہیں۔مشہور ہے کہ **قلم ابن حزم کسیف حجاج** یعنی حجاج کی تلوار کی طرح ان کے قلم سے بھی کوئی نہ بچ سکا۔

بہرحال امام ترمذیؒ جلیل القدر امام ہیں۔عمر بن علک کا بیان ہے کہ بخاری نے مرتے مرتے سارے خراسان میں ترمذی جیسا شخص علم وورع اور زہد میں نہیں چھوڑا۔

حافظہ: ان کا حافظہ ضرب المثل تھا۔احمد بن عبداللہ بن داؤدؒ خود امام ترمذیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے ایک شیخ کی حدیثوں کے دو جزء (رسالے) لکھے تھے۔ایک دفعہ مکہ جاتے ہوئے اس شیخ سے ملاقات کا موقع ملا۔میں نے ان کے بارے میں لوگوں سے پوچھا۔بتایا گیا کہ وہی شیخ ہیں۔ میں وہی دو جزء سننے کے لئے ان کے پاس حاضر ہوا۔میرا خیال تھا کہ لکھے ہوئے جزء میں اپنے ساتھ اٹھالایا ہوں۔لیکن غلطی سے میں ان جزوؤں کے مشابہ دوسرے سفید جزء کو ساتھ لایا تھا۔ملنے کے بعد میں نے وہ دو جزء سنانے کی درخواست کی۔تو وہ اپنے حافظہ سے وہی احادیث سنانے لگے۔اور میں خالی صفحے سامنے رکھ کر سنتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا تو سفید کاغذ پر نظر پڑتے ہی غصہ ہو کر بولا کہ تمہیں مجھ سے شرم نہیں آتی؟۔۔۔ میں نے سارا واقعہ سنادیا۔اور کہا کہ آپ کی ساری احادیث میں یاد کر چکا ہوں۔وہ بولے کہ پڑھو اور میں نے احادیث سنا دیں۔اس نے کہا کہ میرے پاس آنے سے پہلے تو یہ احادیث تجھ کو یاد نہ تھیں۔میں نے کہا

---

(۱) تہذیب التہذیب ج۹ص ۳۸۸

نہیں۔ پھر اس نے کہا کہ چلو تم کو اور احادیث سنادوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے نادر و غریب احادیث میں سے چالیس احادیث سنادیں۔ جب بعد میں میں نے اسی طرح دھرادیں۔ تو وہ بولے ما رأیت مثلک (۱).

امام ترمذیؒ خود نقل کرتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے مجھ سے کہا "میں نے تجھ سے جتنا نفع حاصل کیا اتنا تم نے مجھ سے حاصل نہیں کیا"

علامہ کاشمیریؒ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ایک کامل استاذ کو ایک کامل شاگرد کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ وہ اس کے علوم وفیوض کی اشاعت کرے۔ یہی امام بخاریؒ کا اس مقام پر مقصد تھا۔

کتب: آپؒ کی عظمت کا اندازہ آپؒ کی تصنیفات سے بخوبی ہوتا ہے۔ جو آپؒ کے کثرت علم، تاریخ دانی، اسماء رجال اور علل الاحادیث کی معرفت، فقہی مہارت اور طلب حدیث میں جہاں نوردی کی واضح دلیل ہیں۔ سب سے زیادہ جامع اور مفید ترین کتاب "جامع ترمذی" ہے۔ اس طرح کتاب "العلل الکبیر" اور "کتاب العلل الصغیر" کی افادیت بیان سے مستغنی ہے۔ شمائل ترمذی میں آپ نے جس نہج سے سیرت وصورت نبوی ﷺ کا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اصحاب صحاح ستہ میں علو سند کے لحاظ سے امام ترمذیؒ کا بڑا مقام ہے۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے کل بائیس ثلاثی احادیث ذکر کی ہیں۔ جبکہ امام ترمذیؒ نے جامع کی کتاب الفتن میں ایک ثلاثی حدیث روایت کی ہے۔ البتہ ابن ماجہؒ کی کتاب میں صحیح بخاری سے بھی زیادہ ثلاثی احادیث موجود ہیں۔

لیکن صحت کے لحاظ سے امام ابن ماجہؒ کی کتاب آخری مرتبہ میں ہے۔ جبکہ صحیح مسلم، سنن ابی داؤد اور سنن نسائی ثلاثیات سے خالی ہیں۔

امر دوم: کتاب شمائل ترمذیؒ: امام ترمذیؒ نے کتاب شمائل ترمذی لکھی ہے۔ جو اپنے طرز پر مضمون کے لحاظ سے بے مثال کتاب ہے۔ اگرچہ آپ کی تقلید میں دیگر محدثین نے بھی اس موضوع کو ایک مستقل موضوع کی حیثیت دیکر تالیفات کیں۔ لیکن "الفضل للمتقدم" کے تحت اس موضوع پر پہلی تالیف آپ کی ہے یہ ایک واضح اور مسلمہ حقیقت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ سراپا نور وہدایت ہے۔

(۱) تهذيب التهذيب ج ۹ ص ۳۸۸

دوست، دشمن، مؤمن، کافر آپ کے کردار کی عظمت اور لاثانی دیانت وامانت کے قائل رہے۔ نبوت سے پہلے کی زندگی اتنی بے داغ رہی کہ رب ذوالجلال نے اسے نبوت کی دلیل کے طور پر پیش کیا۔ فرمایا

لقدلبثت فیکم عمراً من قبله أفلاتعقلون(سورۃ یونس)

یعنی دعویٰ نبوت سے پہلے تمہارے درمیان میں نے چالیس برس گزارے۔ تم ہی لوگوں نے مجھے صادق وامین مانا۔ تم ہی نے مجھے دیانت، عبادت، اخلاق عالیہ، عصمت کاملہ کا مرقع گردانا۔ انسانیت کے سب سے بلند مقام پر ہوتے ہوئے کیا یہ ممکن ہے کہ اچانک چالیس سال بعد خداوند کریم پر جھوٹ بولنے کا عظیم ترین جرم سرزد ہو جائے۔ کردار کی یہ بلندی آج بھی اطاعت کی متقاضی ہے۔

ایک غیر مسلم بادشاہ ہرقل نے بھی ابوسفیانؓ سے انٹرویو کے دوران یہی سوال کیا تھا کہ **فھل کنتم تتھمونه بالکذب قبل ان یقول ماقال**، نبوت کے دعویٰ سے قبل کیا تم لوگ اس نبی پر کبھی جھوٹ بولنے کی تہمت لگانے کے روادار ہوئے؟

ابوسفیان نے جواب دیا نہیں۔ ہرقل رومی نے بالآخر فیصلہ سناتے ہوئے یہی کہا۔ کہ **فقداعرف انه لم یکن لیذر الکذب علی الناس ویکذب علی اللہ** ۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ یہ شخص لوگوں میں تو جھوٹ بولنے سے بچتا رہے اور جا کر خدا پر جھوٹ باندھنے لگے(۱)۔

اخلاق ودیانت کی عظمت کے ساتھ ساتھ نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس حسن وجمال اور مادی وصوری کمالات کا بھی مرقع تھی۔ جس کا مکمل تذکرہ کتاب میں آئیگا۔

حسن صورت بھی مقبولیت اور تقلید واطاعت کا فطری سبب ہے۔ اسی وجہ سے عقل وخرد اور علم ودانش کے ساتھ ساتھ سفارت کیلئے ایسے لوگوں کا عادتاً انتخاب کیا جاتا ہے جو ظاہری تقدس، وقار اور محاسن کا حامل ہو۔ جس کا مشاہدہ روزمرہ کی زندگی میں کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ نبی اکرم ﷺ کے ظاہری وباطنی محاسن کو اجاگر کرنا اشاعت دین اور ہدایت عالم کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اور گویا امام ترمذیؒ نے اس موضوع پر مستقل کتاب لکھنے میں سبقت حاصل

(۱) بخاری ج ۱ ص ۴ کتاب الایمان

کرتے ہوئے مضمون اور طرز کے لحاظ سے بے نظیر کتاب شمائل ترمذی تالیف فرمائی ہے۔ پھر اگر امام ترمذیؒ نے اپنی جامع ترمذی کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا تھا کہ من کان فی بیتہٖ ھذا الکتاب فکانّما فی بیتہٖ نبی یتکلم

جس کے گھر میں جامع ترمذی ہوتو گویا اس کے گھر میں بولتا ہوا نبی موجود ہے۔ تو یہ کہنا بھی بالکل بے جا نہ ہوگا۔ کہ جس کے پاس شمائل ترمذی موجود ہوتو گویا اس کے سامنے نور افشاں پیغمبر موجود ہے۔

ے اھل الحدیث ھم اھل النبی وان لم یصحبو انفسہ انفاسہ صحبوا

ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں:

ومن احسن ماصنّف فی شمائلہٖ واخلاقہٖ ﷺ کتاب الترمذی المختصر الجامع فی سیرہ علی الوجہ الاتم بحیث انّ مطالعۃ ھذاالکتاب کأنّہ یطالع طلعۃ ذالک الجناب ویری محاسنہ الشریفۃ فی کل باب(۱)۔

نبی کریم ﷺ کے اخلاق وشمائل میں امام ترمذیؒ کی مختصر مگر سیرت طیبہ میں جامع وکامل کتاب سب سے اچھی کتاب ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنے والا گویا جناب عالی کا خود مطالعہ کرتا ہے اور ہر باب میں محاسن شریفہ خود دیکھ رہا ہے۔

صاحب تحفۃ الاحوذی لکھتے ہیں:

ومنھاشمائل النبیّ ﷺ وھوأحسن الکتب المؤلفۃ فی ھذاالباب کثیر الیمن والبرکات وقال الشیخ عبدالحقؒ فی اشعّۃ اللمعات ''خواندن آں برائے مہمات مجرب اکابر است(۲)۔

امام ترمذیؒ کی تصانیف میں سے شمائل النبی ﷺ ہے۔ جو اس باب میں سب سے اچھی کتاب ہے۔ اور بہت سے برکات کا حامل ہے۔ شیخ عبدالحقؒ اشعۃ اللمعات میں لکھتے ہیں کہ اس کتاب کا پڑھنا اکابر کے ہاں اہم حوائج میں مجرب ہے۔

(۱) جمع الوسائل (۲) مقدمہ تحفۃ الاحوذی

عشاق ایسی کتاب پا کر بقول کسے یہ کہہ کر بھی تسکین خاطر کر لیتے ہیں ؎

یاعین ان بُعد الحبیب و دار ہ　　ونأت مرابعه وشط مزاره

فلقدظفرت من الحبیب بطائل　　ان لم تریه فهذہ آثارہ

یعنی اے میری آنکھ! اگر محبوب دور ہے، اس کا گھر دور ہے، مسکن دور ہے، ملاقات متعذر ہے۔ پھر بھی محبوب سے استفادے تک تجھے رسائی حاصل ہے۔ اگر تو اس کو نہیں دیکھ سکتا تو یہ اس کے نشانات ہیں (اس سے تسکین حاصل کر لے)

انہی جذبات کے تحت بندہ کو بھی یہ خیال آیا کہ حسن دوعالم کا ذکر بھی تو ایک لذت ہے۔ کم از کم میرے ان نقوش کو بھی اس حسن کی وجہ سے استحسان کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ ؎

ماان مدحت محمداً بمقالتی　　ولکن مدحتُ مقالتی بمحمدٍ

اس مقصد کیلئے شیخنا حضرت مولانا سمیع الحق صاحب دامت برکاتہم کے درس کا انتخاب کیا۔ اور اس کو حتی الوسع اپنی تعبیر کا رنگ دے کر قارئین کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ میں اس خدمت میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں یہ فیصلہ قارئین پر چھوڑ رہا ہوں۔ میں اپنی جہالت اور وفور معاصی پر نظر کر کے کبھی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے علاوہ کوئی بھی اس کام کو مجھ سے بہتر نہیں کر سکتا۔ بلکہ یہ ضرور کہتا ہوں کہ اگر میرے احباب میری کوتاہیوں کی نشاندہی کر کے مجھے تنبیہ کر لیں۔ تو منت شناسی اور امتنان وتشکر میں بندہ کو کسی سے کم نہیں پائیں گے۔

<u>امر سوم: شرح کیلئے نام کا انتخاب:</u> صحیح بخاری کے درس کے لئے فتح الباری کا مطالعہ کر رہا تھا کہ حبیبۃ حبیب اللہ سیدۃ عائشہؓ کے بارے میں حضرت حسان بن ثابتؓ کی زبان سے نکلا ہوا الہامی قصیدہ سامنے آیا۔ جس میں انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے۔

عقیلۃُ حیٍّ من لؤیّ بن غالب　　کرام المساعی مجدهم غیرزائل

مهذبة قدطیب اللّٰه خیمها　　وطهّرهامن کل سوء وباطل

فان کنت قدقلت الذی زعموالکم　　فلارفعت سوطی الیّ انامل

فکیف وودی ماحییت ونصرتی　　　لآل رسول اللہ زین المحافل(۱)

اچانک اس وقت یہ سوچ آئی کہ اصل "**زین المحافل**" تو نبی کریم ﷺ ہیں۔انہی کی وجہ سے آل رسول ﷺ کی مجلسیں حسین ہونے لگی تھیں۔اور ساتھ ہی زیر ترتیب شرح کا بھی دھیان آیا۔نام پسند آ گیا۔بعد میں حضرت الشیخ مدظلہم نے فون پر نام کے بارے میں دریافت فرمایا تو بندہ نے تجویز سامنے رکھ دی۔اور ان کو بھی پسند آ گئی۔

امر چہارم:التزامات: اس شرح کی تکمیل میں بندہ نے جن امور کو بالخصوص مدنظر رکھا وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) اس شرح کی اساس چونکہ حضرت شیخ مدظلہ کی درس تھی۔لہٰذا اصل مضمون میں تغیر بہت ہی کم کرنا پڑا۔

(۲) شرح کی زبان کو عامیانہ رکھنے کی بجائے تعلیمی زبان اور تدریسی اصطلاحات کو ترجیح دی گئی ہے۔اس لئے کہ یہ صورۃ علماء اور طلباء کے لئے خصوصی افادیت کی حامل ہے۔پھر بھی اہم مقامات پر مناسب تفصیل کے ذریعے عوامی استفادے کو ممکن بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۳) لغوی اور فنی تشریحات میں مبتدئین کی بجائے منتہی طلبہ کی رعایت کی گئی ہے۔اس لئے طول سے بچنے کی خاطر عام،صرفی،نحوی اور لغوی تحقیقات کو محدود کر دیا گیا ہے۔

(۴) شرح میں بیان کی گئی بعض احادیث اور آیات کی حتی الوسع تخریج کر دی گئی ہے۔

(۵) متداول شروح اور اکابر کی تحقیقات سے مراجعت کے بعد بعض مقامات میں مفید اضافے کرنے پڑے جو اگرچہ کم ہیں لیکن انتہائی ضروری تھے۔اہل علم کو پتہ ہے کہ کوئی بھی شرح اس عمل سے مستغنی نہیں ہے۔

(۶) تقریباً ہر باب کے خاتمے پر خلاصۂ باب کے عنوان سے ایک خلاصہ تحریر کیا گیا ہے۔تا کہ باب کا اندازہ لگ سکے۔میرا خیال ہے کہ کسی باب کو پڑھنے سے پہلے خلاصۂ باب کو پڑھا جائے تو سارے باب کے سمجھنے میں بہت معاون ہوگا۔

---

(۱) فتح الباری ج۸ ص ۶۲۳

(۷) ہر حدیث کے راوی کے حالات کو بقدر ضرورت تحریر کیا گیا ہے۔ لیکن تکرار سے بچنے کی خاطر صرف اس حدیث کے ضمن یہ حالات تحریر کئے گئے ہیں جو شمائل ترمذی میں اس کی پہلی حدیث ہو۔ سہولت کے لئے مذکورہ راویوں کے ناموں کی فہرست حروف تہجی کے لحاظ سے آخر میں شامل کی گئی ہے تاکہ جس راوی کے حالات معلوم کرنے ہوں ان سے مروی پہلی حدیث کی نشاندہی ہو جائے۔

(۸) ابتداء میں علم حدیث اور کتاب کے تعارف کے طور پر ایک مفید مقدمہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔

(۹) کسی حدیث میں اشکال کی توجیہ میں مختلف آراء کو بسط کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ توجیہات میں ترجیح بھی بعض مقامات پر ظاہر کی گئی ہے۔

(۱۰) نسخوں میں اختلاف کے وقت جامع ترمذی شریف کے ساتھ مطبوعہ نسخے کا خیال رکھا گیا ہے۔ کیونکہ طلبہ کو عموماً یہی نسخہ میسر ہوتا ہے۔ البتہ بعض مقامات پر دوسرے نسخوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

<u>وجہ ضبط و ترتیب:</u> یہ شوال ۱۴۰۰ھ مطابق اگست 1980ء کی بات ہے۔ جب راقم الحروف پہلے پہلے دارالعلوم حقانیہ میں ایک متعلم کی حیثیت سے داخل ہوا۔ تمام اساتذہ محاسن و کمالات کے خزانے تھے۔ بندہ حسب عادت اساتذہ کے قرب کو درس پر بھی مقدم سمجھتا تھا۔ البتہ حضرت الشیخ مولانا سمیع الحق صاحب سے ذرا بعد تھا۔ خیال تھا کہ عام صاحبزادوں کی طرح ان میں بھی نزاکت یا تعلّی قسم کی کوئی خوبی ہوگی اور ایسے شخص کے ساتھ تادیر نبھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر ان کے ساتھ پہلے سال تعلّم کا رشتہ بھی نہیں تھا۔

جلد ہی مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب کے ساتھ تعلقات استوار ہو گئے۔ جو خود مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک تھے۔ ان دنوں موصوف حضرت مولانا سمیع الحق کے قائم کردہ ادارہ مؤتمر المصنفین میں ان کے زیر نگرانی مراحل تحریر و تصنیف طے کرنے میں منہمک تھے۔ ان کی شہہ پر راقم الحروف نے بھی کچھ مضامین لکھے۔ جن میں سے ایک کو "الحق" میں بھی جگہ دی گئی۔ اور وہیں سے حضرت الاستاذ کی نظر التفات کو راہ ملی۔ چنانچہ ان کے حکم کے مطابق ان کے دفتر میں گاہے گاہے حاضری ہوتی تھی۔ دل موہ لینے والی شفقت و محبت ملتی۔ اور جلد ہی حضرت کے بارے میں سوء الظن کافور ہو گیا۔ بلکہ اپنی طرف سے خود ساختہ تکلف کو بے تکلفی میں بدلنا پڑا۔ اور پھر ان کے تلمذ کا انتظار کرتا گیا۔ یہاں تک کہ دورۂ حدیث کے سال یہ

تمنا پوری ہوگئی۔حضرت کے پاس شمائل ترمذی کے علاوہ بخاری ج ۲ اور ترمذی ج ۲ کے بعض اجزاء تھے۔

راقم الحروف کی ایک عادت تھی کہ مشکل کتابوں میں ہر استاد کے درس کے دوران ان کے فرمودات تحریری طور پر ضبط کرتا تھا۔اس عمل سے اساتذہ کے ارشادات کی حفاظت کے علاوہ میں نے ایک بڑا فائدہ یہ بھی پایا تھا۔کہ دھیان درس پر مرکوز رہتا تھا۔اور دوران درس ادھر ادھر التفات سے محفوظ رہتا تھا۔ نیز بعد میں دوران تکرار طلبہ کے استفسارات کے لئے بھی راقم الحروف کے پاس مرجع موجود ہوتا تھا۔ چنانچہ تعلم کے آخری چھ سالوں میں بندہ نے اس کا التزام کیا۔دورۂ حدیث میں بھی بندہ اساتذہ کے افادات تحریر کرتا رہا۔

مولانا نے جب میرے شغف کو دیکھا تو حکم دیا کہ لکھنے کی بجائے میرے درس کو ٹیپ کے ذریعے محفوظ کرنا اور پھر کمرے میں جا کر آرام سے لکھنا چونکہ پہلے سے حضرت اقدس شیخ الحدیثؒ کے درس کو ریکارڈ کرنے کی ذمہ داری بھی مولانا نے بندہ پر ڈال دی تھی۔اس لئے مولانا نے حکم دیا کہ درس میں لکھنے کے بجائے ریکارڈنگ کرتے رہنا۔مجھے فکر ہوئی کہ اتنے کیسٹ کہاں سے لاؤں۔لیکن دوسرے روز حضرت نے نئے کیسٹوں کا پورا پیکٹ بھجوا دیا۔درس کی ریکارڈنگ تو ہوگئی مگر اسے کاغذ پر منتقل کرنے کی فرصت نہ مل سکی۔

فراغت کے بعد تدریسی مشاغل کی وجہ سے اس کام پر توجہ نہ دے سکا۔تا آنکہ فراغت کے پانچ سال بعد احباب نے فرمائش کی کہ شمائل ترمذی کو نقل کر دوں۔چنانچہ عاریتاً ٹیپ ریکارڈر حاصل کر کے اسے کاغذ پر منتقل کر دیا۔اور جب مولانا کی خدمت میں پیش کیا۔تو انہوں نے مولانا عبدالقیوم حقانی کو تبییض کی ذمہ داری سپرد کی۔مگر ان کے دیگر مصروفیات کی وجہ سے کام میں تاخیر ہوئی۔اور حضرت نے کچھ عرصہ بعد مسودہ بھیج کر بندہ کو ہی تبییض کا حکم دیا۔

راقم میں ان دنوں اتنی خود اعتمادی نہ تھی۔لہٰذا دو ڈھائی باب کرنے کے بعد ہمت جواب دے گئی۔اور آٹھ سال تک یہ سلسلہ ٹھپ ہو کر رہا گیا۔غالباً ۱۴۱۸ھ یعنی 1998ء کی بات ہے۔ایک ملاقات میں مولانا نے اس کام کے بارہ میں دریافت کیا۔چونکہ ان دنوں خود بندہ پر شمائل ترمذی، مسلم شریف اور ترمذی ج ۲ پڑھانے کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی۔لہٰذا پھر ایک داعیہ پیدا ہو گیا۔اور تقریباً تین چوتھائی مسودہ

صاف کردیا۔ دیگر شروح سے تطبیق، اجمال کی ضروری تفصیل اور غیر ضروری تفصیل کی قدرے اجمال کے بعد حضرت کی خدمت میں پیش کردیا۔ تاکہ وہ نظر ثانی فرمائیں۔ تب تک میں باقی حصہ کی تبییض کرلوں۔

شومئ قسمت سے ملکی اور جماعتی، سیاست اور سینٹ میں ان کے پیش کردہ شریعت بل کا معرکہ اتنا گرم ہوا کہ مولانا کی مصروفیات ان دنوں اتنی بڑھیں کہ مسودہ ویسے کا ویسے پڑا رہا۔ ادھر مجھے خیال آیا کہ حضرت کو میرا کیا ہوا کام پسند نہیں آیا۔ اس لئے مزید کا تقاضا نہیں کررہے۔ چنانچہ جذبہ ماند پڑ گیا۔ مگر ۱۴۲۵ھ کے اوائل میں حضرت نے حکم دیا کہ بقیہ حصہ بھی مکمل کرلوں۔ اور معاون خاص جناب مولانا مفتی مختار اللہ حقانی کو حکم دیا کہ اصلاح الدین سے یہ کام مکمل کروانا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ انہوں نے بار بار یاددہانی کروائی اور اس ہیچمدان نے اپنے شکستہ الفاظ میں حضرت کی خواہش کی تکمیل کی۔

اہل فن جانتے ہیں کہ کسی دوسرے شخص کی ترجمانی کا حق ادا کرنا مشکل کام ہے۔ اور پھر ایسے شخص کی ترجمانی جو خود جوامع الکلم کی ترجمانی کررہا ہو، مشکل تر ہوجاتا ہے۔ اور اگرچہ ایک استاد اور شاگرد کے درمیان جو نسبت ہوتی ہے وہ شاگرد کیلئے کافی حد تک استاد کے مافی الضمیر تک رسائی میں معاون ہوتی ہے۔ اور مطالب کے ادراک کو آسان بنادیتی ہے۔ مگر اس میں شاگرد کے استعداد کو کلیدی مقام حاصل ہے۔ اور راقم الحروف کو اعتراف ہے کہ اساتذہ کے حسن ظن اور ان کی بے انتہاء شفقت کے باوصف ان سے علمی اکتساب کے بجائے ان کے ساتھ عقیدت ومحبت کے تعلق کیلئے زیادہ کوشاں رہتا تھا۔ اس لئے کام کی عظمت اور اپنی بے مائیگی کو دیکھ کر یہ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ حضرت الشیخ کے مطالب کی ترجمانی میں قصور ضرور ہوگا۔ بلکہ بندہ کی تحریر شمائل ترمذی اور پھر حضرت الشیخ کی تشریحات کی اشاعت کے عظیم کام کو داغدار بنانے کے مترادف ہے۔ لیکن حضرت کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانا بھی قرین قیاس نہیں تھا۔

لہٰذا ان کے حکم کے بعد یہ جرأت کرنی پڑی۔ اگر میری اس کوشش کو اللہ رب العزت، حضرت الاستاد مدظلہم اور دیگر علماء وطلباء کے ہاں قبولیت ملی۔ تو یہ میرے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ اور اللہ تعالیٰ کا خصوصی احسان ہوگا۔ اور اگر اسے قابل التفات نہ سمجھا گیا تو اس کی ساری ذمہ داری بندہ پر ہوگی۔ اور اس عظیم کام کو ضائع کرنے پر اللہ تعالیٰ سے، حضرت الشیخ سے اور پھر علماء وطلباء سے معافی کا خواستگار ہوں۔

اگر حضرت شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحقؒ کی خصوصی دعاؤں اور حضرت الاستاذ مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہم کی بھرپور توجہات کے طفیل اللہ تعالیٰ نے اس کاوش کو قبولیت عطا فرمائی۔تب بھی اہل قلم کے تجربات کے مطابق اس کام میں کوتاہیاں اور غلطیاں دیکھنے کو ملیں گی۔ایسے میں اہل علم سے التماس ہے کہ دوران مطالعہ میری جس بھول چوک پر مطلع ہوں تو حتی الوسع بندہ کو اطلاع دینے کی سعی فرمائیں تاکہ آئندہ اس کی اصلاح کی جاسکے۔شاید آپ کی ادنیٰ توجہ ایک تباہ حال عاصی کو تباہی سے بچاسکے۔

خادم الطلباء والعلماء

اصلاح الدین حقانی

۱۲ رشوال المکرم ۱۴۲۷ھ　　　　خادم الحدیث دارالعلوم اسلامیہ لکی مروت

از مولانا مفتی مختار اللہ حقانی
مفتی واستاذ شعبہ تخصص فی الفقہ والافتاء

پیش لفظ

الحمدللّٰہ و کفیٰ والصلوٰۃ والسلام علی خیر الخلائق و الانبیاء، أمّابعد

جب سے بنی نوع انسان کا سلسلہ شروع ہوا ہے اسی روز سے اللہ تعالیٰ نے بے راہ انسانوں کی ہدایت اوران کوراہ راست پرلانے کیلئے انبیاء کرام کی بعثت کا سلسلہ شروع کیا۔اوراس کی آخری کڑی نبی آخرالزمان سرداردوعالم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔

<u>رسول اللہ ﷺ کی امتیازی شان:</u> اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کوایک امتیازی شان کیساتھ مبعوث فرمایا اورآپ ﷺ کی ذات اقدس میں تمام انبیاء کرام کے مکارم اخلاق ودیعت رکھا گیا۔اورعملی نمونہ آنحضرت ﷺ نے امت کے سامنے پیش کیا۔

کسی نے حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا کہ آپ ﷺ کے اخلاق کیا تھےتو آپؓ نے فرمایا کہ کیا آپ نے قرآن نہیں پڑھا؟ توسائل نے عرض کیاہاں پڑھاہے۔تو آپؓ نے فرمایا **کان خلقہ القرآن** یعنی آپ ﷺ کے اخلاق قرآن پاک کی عملی تصویر تھے۔اس لئے قرآن کریم نے آپ ﷺ کے اس عملی نمونہ اورحسن کرداراورعمدہ اخلاق کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے **وانّک لعلیٰ خلق عظیم** (القلم) بیشک آپ عظیم اخلاق کے حامل ہیں۔اوراسی کوتمام انسانیت کے لئے بلاامتیاز رنگ ونسل اسوۂ حسنہ قراردیا۔ **لقدکان لکم فی رسول اللّٰہ ﷺ اسوۃ حسنۃ** (الاحزاب) یقیناً تمہارے لئے آپ ﷺ کی ذات اقدس میں عمدہ نمونہ موجود ہے۔اوریہی رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد ہے **اِنّما بعثت لاتمّم مکارم الاخلاق** (مشکوٰۃ) کہ بیشک میں اسلئے بھیجا گیاہوں تاکہ دنیامیں عمدہ اخلاق کی تکمیل کروں۔پھرساری عمراسی صفت کے ساتھ دنیامیں رہےاوراسی سیرت طیبہ کیساتھ اپنی ذمہ داری پوری فرماتے رہے۔آنحضرت ﷺ کے اس حسن کرداراوراعلیٰ اخلاق وعادات کی تعریف نہ صرف قرآن کریم اوراپنوں نے کی بلکہ غیروں کی زبانی بھی ستائش وتحسین کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری رہاہے۔

آنحضرت ﷺ غیر مسلموں کی نظر میں: چنانچہ جنیوا یونیورسٹی کے پروفیسر مسٹر ایڈورڈ مونٹ لکھتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ کو اصلاح اخلاق اور سوسائٹی کے متعلق جو کامیابی ہوئی اس کے اعتبار سے آپ ﷺ کو انسانیت کا محسن اعظم یقین کرنا پڑتا ہے۔ (مقدمات تاریخ ہند ۲/۳۴۰)

پیشوائے اعظم بدھ مذہب: مانگ نونگ نے کہا ہے کہ: حضرت محمد ﷺ کا ظہور بنی نوع انسان پر خدا کی ایک رحمت تھی لوگ کتنا ہی انکار کریں مگر آپ ﷺ کی اصلاحات عظیمہ سے چشم پوشی ممکن نہیں۔ ہم بدھی لوگ حضرت محمد ﷺ سے محبت کرتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں۔

(معجزات اسلام ۶۶ بحوالہ نقوش نمبر ۴/۴۶۲)

ماسٹر تارا سنگھ پریذیڈنٹ سکھ لیگ: جب کوئی مجھ سے یہ کہتا ہے کہ محمد ﷺ نے تلوار کے زور سے اپنا مذہب پھیلایا تھا تو مجھے اس شخص کی کم فہمی پر ہنسی آتی ہے۔

(اخبار، الامان، دھلی ۱۷/جولائی ۱۹۳۲ء بحوالہ نقوش نمبر ۴/۴۶۲)

لالہ رام لال ورما ایڈیٹر اخبار تیج: جمہوریت، اخوت، مساوات یہ عطیات ہیں جو حضرت محمد ﷺ نے بنی نوع انسان کو عطاء کئے۔ (نقوش نمبر ۴/۴۶۱)

ڈاکٹر جے کارام برھما: حضرت محمد ﷺ نے اخلاق عالیہ کی تلقین ہی نہیں کی بلکہ ان اصولوں پر عمل بھی فرمایا ان کی زندگی ایثار و قربانی کی زندگی تھی۔ (نقوش نمبر ۴/۴۵۹)

گاندھی جی: وہ (رسول اللہ ﷺ) روحانی پیشوا تھے بلکہ ان کی تعلیمات کو سب سے بہترین سمجھتا ہوں کسی روحانی پیشوا نے خدا کی بادشاہت کا پیغام ایسا جامع اور مانع نہیں سنایا جیسا کہ پیغمبر اسلام نے۔

(رسالہ ایمان پٹی ضلع لاہور اگست ۱۹۳۶ء بحوالہ نقوش نمبر ۴/۴۵۷)

ڈاکٹر لین پول: اگر محمد ﷺ نبی نہ تھے تو کوئی نبی دنیا میں برحق آیا ہی نہیں۔ (بحوالہ نقوش نمبر ۴/۴۴۹)

ڈاکٹر اینڈر برنگھم: مجھ کو کسی وقت یہ خیال بھی نہ ہوا کہ اسلام کی ترقی تلوار کی مرہون منت ہے بلکہ اسلام کی کامیابی رسول اللہ ﷺ کی سادہ، بے لوث، ایفائے وعدہ، اصحاب و پیروں کی غیر معمولی حمایت، توکل بخدا اور ذاتی جرأت و استقلال سے وابستہ ہے الخ۔ (بحوالہ نقوش نمبر ۴/۴۴۹)

ڈاکٹر ڈی رائٹ: محمد ﷺ اپنی ذات اور قوم کیلئے نہیں بلکہ دنیائے ارضی کیلئے ابر رحمت تھے۔ تاریخ میں کسی ایسے شخص کی مثال موجود نہیں جس نے احکام خداوندی کو اس مستحسن طریقہ سے انجام دیا ہو۔

(اسلامک رویو اینڈ مسلم انڈیا فروری ۱۹۲۰ء بحوالہ نقوش نمبر ۴/۷۴۴)

مسٹر ایڈورڈ موسئے: آپ ﷺ نے سوسائٹی کے تزکیہ اور اعمال کی تطہیر کیلئے جو اسوۂ حسنہ پیش کیا ہے وہ آپ ﷺ کو محسن انسانیت کا محسن اول قرار دیتا ہے۔ (نقوش نمبر ۴/۷۴۴) اور اسی طرح بے شمار غیر مسلموں نے آنحضرت ﷺ کی حسن سیرت کا اعتراف کیا ہے۔ ادارۂ فروغ اردو لاہور نے نقوش رسول نمبر میں کئی غیر مسلم اہل علم اور سکالروں، سیاسی وغیر سیاسی شخصیات کے تعریفی اقوال کا ذکر کیا ہے یہ کتاب کئی ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ کئی غیر مسلموں نے رسول اللہ ﷺ کے حسن کردار پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اس اسوۂ حسنہ کو اصطلاح میں سنت کہا جاتا ہے۔

سنت کی تعریف: اس لئے کہ علماء امت نے سنت کی جو تعریف کی ہے وہ اس پر صادق ہے۔ علامہ عبدالحی فرنگی محلیؒ سنت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں إنّ السنة تطلق على قول الرسول وفعله وسكوته وطريقة الصحابة(ظفر الامانی فی مختصر الجرجانی) بیشک سنت کا اطلاق آنحضرت ﷺ کے اقوال، افعال اور تقریرات پر ہوتا ہے حتی کہ صحابہ کرام کے طریقے کو بھی سنت کہا جاتا ہے۔

سنت کی اقسام: البتہ سنت کی دو قسمیں ہیں (۱) سنت مؤکدہ جسے سنت ھدیٰ بھی کہا جاتا ہے۔ (۲) سنت زوائد جسے سنت غیر مؤکدہ بھی کہا جاتا ہے۔

صاحب شرح الوقایہ علامہ صدر الشریعہ عبیداللہ بن مسعودؒ ان دونوں اقسام سنت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں قلتُ السنة ماواظب النبی ﷺ علیه مع الترک احیاناً فان کانت المواظبة المذکورة علی سبیل العبادة فسنن الهدیٰ وان کانت علی سبیل العادة فسنن الزوائد. کلبس الثیاب والاکل بالیمین وتقدیم الرجل الیمنیٰ فی الدخول ونحو ذلک(شرح الوقایة علی صدر السعایة ۱/ ۱۷۱تا۱۷۵) میں کہتا ہوں سنت وہ ہے جس

پر آنحضرت ﷺ نے مواظبت فرمائی ہو لیکن کبھی ترک بھی کیا ہو۔اب اگر یہ مواظبت عبادت کے طریق پر ہو تو سنن الھدیٰ (سنت مؤکدہ) اور اگر مواظبت علیٰ سبیل العادۃ ہو تو سنت زوائد جیسے کپڑے پہننا، دائیں ہاتھ سے کھانا،دایاں پاؤں جوتے میں داخل کرنا وغیرہ۔

<u>ایک غلط فہمی کا ازالہ:</u> مگر سنت زوائد ہونے کی وجہ سے یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہئے کہ سنت کے مطابق کھانے، پینے ،اٹھنے، بیٹھنے، گفتگو کرنے وغیرہ کو اگر چہ فی ذات عبادت نہیں کہا جائے گا لیکن ان امور پر عمل کرنا عبادت ضرور ہے۔قاضی عیاض مالکیؒ نے شفاء میں لکھا ہے **اصول مذھبنا ثلاثة الاقتداء بالنبی ﷺ فی الاخلاق والافعال والاکل من الحلال واخلاص النیة فی جمیع الاعمال** ہمارے مذہب کی تین بنیادیں ہیں (۱) اخلاق واعمال میں نبی پاک ﷺ کی اقتداء کرنا (۲) حلال کھانا (۳) اورتمام اعمال میں اخلاص نیت۔اس عبارت کی شرح میں لکھتے ہیں ہیں **ای فی جمیع اقواله وافعاله واحواله** (بحواله شمائل کبریٰ ۱/۷۳) یعنی آنحضرت ﷺ کے جمیع اقوال،افعال اوراحوال میں اقتداء کرنا۔

اورعلامہ بدر عالم میرٹھیؒ لکھتے ہیں حالانکہ آپ ﷺ کا ہر قول اور آپ ﷺ کا ہر عمل سب حدیث کا جزو ہے اسی طرح اسوۂ حسنہ صرف عمل کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ آپ ﷺ کا قول وفعل جو کچھ بھی ہے وہ سب امت کیلئے نمونہ ہے۔نماز، روزہ، حج اور زکوۃ ہی پر موقوف نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کی ذات جس طرح اس بارے میں اسوۂ ہے اسی طرح فصل خصومات، امت کے نظم ونسق اور دیگر ضروریات میں بھی اسوۂ ہے حتی کہ خوش طبعی، ہنسی اور مسکراہٹ کے طور وانداز میں بھی، قرآن کریم نے کسی ادنیٰ تفصیل کے بغیر تمام امور میں آپ ﷺ کی ذات کو اسوۂ کہا ہے اور کوئی معمولی سا معمولی اشارہ بھی اس طرح نہیں کیا کہ نماز وروزہ یا عبادات کی تشریح کے سواء بقیہ امور میں آپ کی ذات اسوۂ نہیں ہے (ترجمان السنۃ ۱/۱۶۴)

<u>آپ ﷺ کی اتباع مطلوب ہے:</u> یہی وجہ ہے کہ سنت کی یہ دونوں قسمیں شرعاً مطلوب ہیں۔اور سنت پر عمل ہی اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔**من یطع الرسول فقد اطاع اللّٰه**(النساء) جو شخص آپ ﷺ کی فرمانبرداری کرے گا تو بے شک اس نے اللہ کی فرمانبرداری کی ۔اور دوسرے مقام پر

آپ ﷺ کی پیروی کو اللہ کی طرف سے محبت اور بخشش کی نوید قرار دیا گیا۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفر لکم ذنوبکم(آل عمران) اے پیغمبر ﷺ آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا بھی تم سے محبت رکھے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔ حدیث پاک میں سنت سے محبت کو جنت میں رسول اللہ ﷺ کی معیت کا سبب کہا گیا ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا من احبّ بسنتی فقد أحبّنی ومن احبنی کان معی فی الجنة(مشکوٰۃ المصابیح ۳۰) جس نے میری سنت سے محبت کی (اس پر عمل کیا) تو اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ رہے گا۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا من تمسک بسنتی عند فساد اُمّتی فله اجر مائة شهید(مشکوٰۃ ۳۰) جس نے میری سنت کو فساد امت کے وقت زندہ کیا تو اسے ۱۰۰ شہیدوں کا ثواب ملے گا۔

گویا دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی و کامرانی کا راز رسول اللہ ﷺ کی سنتوں کی اتباع میں مضمر ہے۔ اسلئے امام مالکؒ نے فرمایا ہے إنّ السنة مثل سفينة نوح من رکبهانجیٰ ومن تخلف عنها غرق الخ سنت کی مثال حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کی ہے جو اس میں سوار ہوا تو کامیاب ہوا اور جو اس سے پیچھے رہا وہ غرق ہوا۔

اور ولی کامل عارف باللہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا ہے اساس الخیر متابعة النبی ﷺ فی قوله وفعله کہ تمام خیر اور خوبیوں کی جڑ رسول اللہ ﷺ کے قول و عمل کی اتباع میں ہے۔

اور امام غزالیؒ نے فرمایا ہے اعلم ان مفتاح السعادة اتباع السنة والاقتداء برسول الله ﷺ فی جميع مصادره وموارده وحركاته وسكناته حتی فی هيئة اكله وقيامه ونومه وكلامه لست اقول ذلک فی آدابه فی العبادات فقط لاوجه لاهماله السنن الواردة فيها بل ذلک فی جميع امور العادات فبذلک يحصل الاتباع المطلق (اربعین ۵۸) جان لو کہ تمام امور میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع سعادت ہے۔ آنحضرت ﷺ سے صادر

ہونے والے تمام حرکات، سکنات یہاں تک کہ کھانے، پینے، اٹھنے، سونے، باتیں کرنے میں بھی آنحضرت ﷺ کے عادات طیبہ کے چھوڑنے کی کوئی وجہ نہیں اسی لئے میں اسوۂ حسنہ کو صرف عبادت میں منحصر نہیں کرتا بلکہ تمام عادات، احوال میں بھی کمال اتباع اسی سے حاصل ہوگی۔ اور مزید لکھتے ہیں **فعلیک ان تلبس السراویل قاعداً وتتعمّم قائماً وتبدأ بالیمین فی تنعلک وتاکل بیمینک (اربعین ۵۸)** پس تم پر لازم ہے کہ شلوار بیٹھ کر پہنے، عمامہ کھڑے ہوکر باندھے، جوتا اولاً دائیں پاؤں میں پہنیں اور دائیں ہاتھ سے کھائیں۔

<u>رسول اللہ ﷺ نعمت عظمٰی:</u> اس لئے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت اس امت مرحومہ بلکہ تمام عالم پر اللہ تعالٰی کا ایک بہت ہی بڑا احسان ہے۔ اس لئے اللہ تعالٰی نے آنحضرت ﷺ کی بعثت کو ایک نعمت عظمٰی کے طور پر ذکر فرمایا ہے **لقد منّ اللّٰہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکّیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلٰلٍ مبین(الآیۃ)** ۔ یقیناً اللہ تعالٰی نے مؤمنین پر احسان عظیم فرمایا ہے کہ اس نے انہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان پر اللہ تعالٰی کی آیات تلاوت کرتا ہے ان کے نفس کی اصلاح کرتا ہے اور انہیں قرآن کریم اور حکمت ودانائی کی تعلیم دیتا ہے جبکہ وہ اس سے پہلے صریح گمراہی میں تھے۔

اسلئے رسول اللہ ﷺ کی سنتوں، عادات واطوار اور بودوباش کے طریقوں کو ہلکا نہ سمجھا جائے کیونکہ آپ ﷺ کی سنتوں کو ہلکا سمجھنا فرائض سے محرومی کا ذریعہ ہے۔

علامہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے تفسیر فتح العزیز میں لکھا ہے **من تھاون بالسنۃ عوقب بحرمان الفرائض** جسنے سنت کے ادا کرنے میں سستی کی تو اس کو فرائض سے محرومی کی سزا ملے گی۔

اس لئے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ دونوں قسم کی سنتوں کی اتباع کرنی چاہئے سنت مؤکدہ کا ترک کرنا گمراہی اور ضلالت کا سبب ہے اور سنت زوائد کے ترک کرنے سے کمال ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔

علامہ عبدالحیٔ لکھنویؒ نے لکھا ہے **والآیات فی ھذا الباب کثیرۃ والاخبار النبویۃ شھیرۃ کلّھا تدل صراحۃً او اشارۃ علی انّ الأخذ بما التزمہ رسول اللّٰہ ﷺ موجب للھدایۃ**

وخلافه موجب للضلالة واماسنن الزوائدفلمالم یکن ترکھا موجباً للضلالة ولامخلافی اصل الهداية وان لم يحصل كمال الهداية سميت بذلک(السعاية ۱ ر۱۷۳)

اس بابت آیات قرآنی بہت ساری ہیں اوراحادیث نبویہ صلوات اللہ علیہ وسلامہ مشہور ہیں جو تمام کی تمام صراحۃً یا اشارۃً اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جن امور پر رسول اللہ ﷺ نے مواظبہ فرمائی ہو وہ موجب ہدایت ہیں اوراس کی مخالفت موجب ضلالت ہےاور سنن زوائد اگر چہ ان کا ترک کرنا موجب ضلالت نہیں اور نہ اصل ہدایت میں مخل ہے لیکن اس کے باوجود (ان کے ترک کرنے سے) کمال ہدایت حاصل نہیں ہوگی اسی وجہ سے ان کوسنن زوائد نام رکھا گیا ہے۔اور مزید لکھتے ہیں

والتحقيق انّ الترک ليس بمعتبر لافى السنن الهدىٰ ولافى السنن الزوائد انّما الفرق بينهما بالعبادة والعادة (السعاية ۱ ر۱۷۳) اور تحقیق یہ ہے کہ بیشک سنتیں چاہئے سنن ھدیٰ ہوں یا سنن زوائدان کا ترک کرنا معتبر نہیں ان میں فرق صرف عادت اور عبادت کی وجہ سے ہے۔

<u>بعض سنتیں ترک کرنا موجب ملامت نہیں:</u> مگر یہ بات ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ جو سنتیں عادیہ ہوں اوران پرآنحضرت ﷺ سے دوام بھی منقول نہ ہوں مثلاً ثرید کھانا، عجوہ کھجور کھانا، جبہ پہننا وغیرہ ان امور میں اتباع موجب اجروثواب ضرور ہےاوران پرعمل کرنے والا عامل بالسنۃ ہوگا لیکن اگرکوئی ان کو بجانہ لائے تو ترک کرنے والے کوتارک السنۃ نہیں کہاجائے گا اور نہ اس پراس ترک کی کوئی ملامت ہوگی۔اسی طرح جن سنتوں پرآنحضرت ﷺ سے دوام مروی ہومگران میں دوام مطلوب اورمراد نہ ہو بلکہ ماحول ومعاشرہ کے اعتبار سے آنحضرت ﷺ نے دوام فرمایا ہو جیسے جو کی روٹی کھانا، کھجور کھانا، تہبند باندھنا،خفین استعمال کرنا وغیرہ تو ان سنتوں کے ترک کرنے والوں پر ملامتی یاارتکاب ترک سنت کاالزام نہ ہوگا۔اگرچہ عمل کرنے میں کمال اتباع اورمحبت رسول اللہ ﷺ کی علامت ہے اورآخرت میں رسول خدا ﷺ کی رفاقت،معیت اورشفاعت کاذریعہ ہے۔

<u>ضعیف حدیث اوررسول اللہ ﷺ:</u> آج کل بعض لوگوں کے دل ودماغ میں یہ بات ہےاوروہ سنت کوسلسلہ رجال کے کسوٹی پر پرکھتے ہیں اگر سلسلہ رجال درست اور محدثین کے پیمانے پرصحیح اترتا ہوتو ٹھیک

ورنہ اس حدیث کو ضعیف کہتے ہوئے ترک کرتے ہیں۔اھ

مگر یہ وہم اتباع سنت کے موافق نہیں اس لئے کہ سنت پر عمل کرنے کیلئے یہ ہرگز نہ سوچا جائے کہ یہ روایت ضعیف ہے اور یہ صحیح اس لئے کہ اس ضعف کا تعلق سلسلہ رجال کے ساتھ ہے متن حدیث کے ساتھ نہیں۔اور سلسلہ رجال کا ضعف متن پر مؤثر نہیں ہوتا۔

علامہ سیوطیؒ نے لکھا ہے **اذا رأیت حدیثاً باسنادٍ ضعیف فلک ان تقول هو ضعیف بهذا الاسناد و لاتقل ضعیف المتن**(قواعدعلوم الحدیث ۵۸، تدریب الراوی) کہ جب تم کسی حدیث کو سند کے اعتبار سے ضعیف دیکھ لو تو تم یہ کہہ سکتے ہو کہ یہ حدیث اس سند کے ساتھ ضعیف ہے لیکن اس کو ضعیف المتن نہیں کہہ سکتے۔

یہی وجہ ہے کہ فضائل اور مندوبات میں فقہاء کرام اور محدثین نے ضعیف احادیث پر عمل کرنے اور اس کو قابل قبول ماننے کی اجازت دی ہے۔

علامہ نوویؒ نے لکھا ہے **قال العلماء من المحدثین والفقهاء وغیرهم یجوز و یستحب العمل فی الفضائل و الترغیب و الترهیب بالحدیث الضعیف مالم یکن موضوعاً**(الاذکار ص۵) محدثین اور فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ حدیث ضعیف پر عمل کرنا فضائل وترغیب وترھیب میں جائز اور مستحب ہے تاوقتیکہ موضوع نہ ہو اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے مقدمہ فتح الملہم میں لکھا ہے کہ ارباب حدیث اس امر پر متفق ہیں کہ فضائل وغیرہ میں حدیث ضعیف پر عمل کرنا درست ہے(فتح الملہم ۱/۵۸)

اور علامہ جلال سیوطیؒ کے ہاں تو ضعیف حدیث بھی احکام میں معمول بہ ہے۔فرماتے ہیں کہ **ویعمل بالضعیف ایضا فی الاحکام اذا کان فیه احتیاط** (تدریب الراوی ۱۰۸) اور ضعیف حدیث پر احکام میں بھی عمل کیا جائے گا جب اس روایت پر عمل کرنے میں احتیاط ہو۔

<u>حدیث ضعیف سے استدلال:</u> علماء احناف کے ہاں تو ضعیف روایت کسی امر کے استحباب کے لئے مفید ہے۔ علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں **الا ستحباب یثبت بالضعیف غیر الموضوع**(اعلاء السنن ۱۹/ ۱۱۰) کہ ضعیف حدیث سے استحباب کا ثبوت ہوسکتا ہے جب وہ روایت موضوع نہ ہو اور

یہی بات علامہ عبدالحیؒ نے تفصیل کے ساتھ لکھی ہے۔فالحق فی هذا المقام:أنّه اذا لم یثبت ندب شئی او جوازه بخصوصه بحدیث صحیح وورد بذلک حدیث ضعیف لیس شدید الضعف یثبت استحبابه وجوازه به بشرط ان یکون مندرجاًتحت اصل شرعی ولا یکون منا قضا للاصول الشرعیة والا دلّة الصحیحة(الاجوبة الفاضلة ص ۵۵) کہ جب کسی امر کا استحباب یا جواز کسی صحیح حدیث سے ثابت نہ ہواور اس بارے میں ضعیف روایت وارد ہوتو اگر اسکی ضعف شدید نہ ہوتو اس روایت سے اس امر کا استحباب اور جواز ثابت ہوگا بشرطیکہ وہ کسی اصل شرعی کے تحت واقع ہواور اصول شرعیہ اور ادلۂ صحیحہ سے متصادم نہ ہو۔

ضعیف حدیث سے استحباب کی مثالیں: اسلئے حنفیہ کثر اللہ سوادھم نے بہت سارے مسائل کے استحباب کے لئے ضعیف حدیث کو مستدل بنایا ہے وضاحت کے لئے چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

۱) احناف کے ہاں اذان میں ارسال اور اقامۃ میں حدر مستحب ہے اور اس کے لئے احناف ترمذی کی روایت پیش کرتے ہیں عن عبدالمنعم بن نعیم عن یحیی بن مسلم عن الحسن وعطاء عن جابر أنّ رسول الله ﷺ قال لبلال یا بلال اذا اذنت فترسل فی اذانک واذا اقمت فاحدر واجعل بین اذانک واقامتک قدر ما یتفرغ الأ کل من اکله والشارب من شربه الخ(جامع ترمذی ۱/۱۱۳) حضرت جابرؓ سے روایت ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلالؓ سے فرمایا اے بلال جب تو اذان دے تو اپنے اذان میں ارسال کر اور جب تو اقامۃ کرے تو اس میں حدر کر اور اذان اور اقامۃ میں اتنا فاصلہ رکھ کہ کھانے والا کھانے سے اور پینے والا پینے سے فارغ ہوجائے۔حالانکہ اس روایت کے بارے میں امام ترمذیؒ خود فرماتے ہیں هذا الحدیث لانعرفه إلاّمن هذا الوجه من حدیث عبدالمنعم وهو اسناد مجهول ،اس روایت کو ہم نہیں جانتے مگر عبدالمنعم کے طریق سے اور یہ اسناد مجہول ہے۔امام دارقطنیؒ اور دوسرے علماء جرح وتعدیل نے عبدالمنعم کی تضعیف کی ہے اسکے علاوہ اگرچہ روایت امام حاکمؒ نے بھی روایت کی ہے مگر اس میں عمرو بن فائد الاسواری عن یحیی بن مسلم الخ ہے اور عمرو بن فائد مطعون ہے۔

۲) احناف کثر اللہ سوادہم کے ہاں گردن کی مسح مستحب ہے اور اس کے لئے وہ ابوداؤد اور

مسند احمد کی روایت سے استدلال کرتے ہیں۔ طلحہ بن مصرف عن أبيه عن جده قال رأيت رسول الله يمسح راسه مرة واحدة حتىٰ بلغ القذال طلحہ بن مصرف کے دادا فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ اپنے سر مبارک پر ایک بار مسح فرماتے، یہاں تک کہ آپ ﷺ گردن تک پہنچاتے۔ حالانکہ یہ روایت ضعیف ہے شیخ عبد الفتاح ابوغدہؒ لکھتے ہیں وهذه الاحاديث ضعفه لاجل طلحة بن مصرف فقال ابن القطان طلحة و ابوه وجده لا يعرفان وقال النووى طلحة بن مصرف احد الائمة الاعلام من التابعين احتج به الائمة الستة وابوه وجده لا يعرفان (حاشيه الاجوبة الفاضلة ۴۵۰) گردن کے مسح کے متعلق تمام تر احادیث طلحہ بن مصرف کی وجہ سے ضعیف ہیں۔ امام ابن قطان فرماتے ہیں کہ طلحہ کے باپ اور دادا کا پتہ نہیں کہ وہ کون ہیں امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ طلحہ بن مصرف تابعین کے بلند پایہ ائمہ میں سے ہیں ائمہ ستہ نے ان سے حجت پکڑی ہے۔ لیکن اس کے باپ اور دادا غیر معروف ہیں۔ لیکن اس کے باوجود علماء احناف کے ہاں گردن کا مسح کرنا مستحب ہے۔

(۳) ائمہ مجتہدین نے بسا اوقات احتیاط کی بناء پر ضعیف حدیث کی وجہ سے کسی امر کی کراہت کا فتوی بھی دیا ہے (ا) جیسے ماء مشمس کے استعمال کی کراہت کا فتوی کتب فقہ میں وضاحت کے ساتھ مذکور ہے کہ ماء مُشَمَّس سے وضو کرنا مکروہ ہے اور اس کراہت کے لئے بطور استدلال حضرت عائشہ کی روایت پیش کی جاتی ہے قالت اسخنت ماء لرسول الله ﷺ في الشمس ليغتسل به فقال لي يا حميراء لا تفعلي فإنّه يورث البرص (نصب الراية ۱/۱۰۲) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے لئے سورج کی تپش پر پانی کو گرم کیا تاکہ آپ ﷺ اس سے غسل کرلیں تو آپ ﷺ نے فرمایا اے حمیرا ایسا نہ کرو کیونکہ اس سے برص کا مرض پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ روایت ضعیف ہے مگر چونکہ اسی میں احتیاط ہے اس لئے فقہائے کرام نے ماء مشمس کے استعمال سے منع فرمایا ہے۔ لہٰذا حدیث مبارک اگر ضعیف بھی ہو لیکن اس کا تعلق آنحضرت ﷺ کی زندگی، اخلاق، اعمال اور اسوۂ حسنہ سے ہو تو اس کو معمول بہ مانا جائے گا۔ اور اس پر عمل باعث اجر وثواب اور دنیا وآخرت کی کامیابی کا ذریعہ ہے۔

شمائل ترمذی: چونکہ آنحضرت ﷺ کی زندگی مختلف پہلوؤں پر محیط تھی۔ اس لئے اصحاب علم وکمال

نے ہر پہلو کو مستقل موضوع بنا کر اس پر تصانیف لکھی ہیں مگر ان پہلوؤں میں ایک اہم پہلو رسول اللہ ﷺ کے شمائل اور خصائل ہیں۔ اس پہلو کو بھی ایک مستقل حیثیت حاصل ہے۔ جس میں رسول اللہ ﷺ کی ظاہری، باطنی سیرت وصورت کے متعلق بحث ہوتی ہے اور اس میں آنحضرت ﷺ کے چال ڈھال، آپ ؐ کی نشست وبرخاست، کھانے پینے کے طریقوں کو بیان کیا جاتا ہے اور آپ ﷺ کے لباس، آپ ﷺ کا مزاج ومذاق، حسن معاشرت، عسر وتنگدستی، عمر مبارک میں پیش آمدہ واقعات وغیرہ پر اس موضوع میں سیر حاصل بحث کی جاتی ہے۔ علماء امت نے اس موضوع پر تقریباً ہر زبان میں متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ مگر امام ترمذیؒ کی تصنیف شمائل ترمذی کو خدا تعالیٰ نے ایک فائق اور بلند مقام عطاء فرمایا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جس طرح امام ترمذیؒ کی جامع ترمذی درس نظامی میں شامل نصاب ہے تو اسی طرح شمائل ترمذی بھی درس نظامی کے نصاب میں شامل ہے۔ اور دورۂ حدیث کے طلباء کو سبقاً سبقاً پڑھایا جاتا ہے۔

<u>شمائل ترمذی اکابرین امت کی نظر میں:</u> ملا علی قاریؒ نے امام ترمذیؒ کی اس تصنیف کے بارے میں فرمایا ہے کہ ومن احسن ما صنّف فی شمائله واخلاقه علیہ السلام کتاب الترمذی المختصر الجامع فی سیره علی الوجه الاتم بحیث إنّ مطالع هذاالکتاب کانّه یطالع طلعة ذلک الجناب ویریٰ محاسنه الشریفة فی کل باب ولذاقیل والاذن تعشق قبل العین احیاناً(جمع الوسائل ۱ / ۲) رسول اللہ ﷺ کے اخلاق، عادات پر امام ترمذیؒ نے ایک اچھی اور عمدہ مختصر، جامع اور مکمل کتاب لکھی ہے۔ اس کے مطالعہ سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے آنحضرت ﷺ کی سیرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ آپ ﷺ کی سیرت مبارکہ کا ہر گوشہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے حالانکہ وہ آنکھوں سے پوشیدہ ہیں اس لئے کہا گیا ہے کہ کان کبھی کبھی آنکھوں سے پہلے عاشق ہوجاتا ہے۔

اور علامہ بیجوریؒ نے اس کتاب کے بارے میں فرمایا ہے کہ إنّ کتاب الشمائل للامام الترمذی کتاب وحید فی بابه فرید فی ترتیبه واستیعابه حتّیٰ علاذلک الکتاب من المواهب وطارفی المشارق والمغارب (المواهب اللدنية ص ۲) کہ امام ترمذیؒ کی کتاب شمائل ترمذی آنحضرت ﷺ کے شمائل وخصائل کے باب میں ایک منفرد کتاب ہے۔ ترتیب واستیعاب میں ایک یکتا کتاب ہے یہاں تک اس کتاب کو مواہب میں سے شمار کیا گیا ہے اور مشارق ومغارب پر چھا چکی ہے۔

شمائل ترمذی کے شروح: امام ترمذیؒ کی اس تصنیف کی اس اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ ارباب علم نے ہر دور میں اس کی مختلف زبانوں میں شروحات اور تراجم لکھی ہیں۔ جن میں سے بعض کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) جمع الوسائل (عربی): یہ کتاب مشہور و معروف محدث وفقیہ علامہ علی بن سلطان محمد القاری الشہیر بالملاعلی قاریؒ المتوفی ۱۰۱۴ھ کی تصنیف ہے اور ایک جامع شرح ہے۔

(۲) المناوی شرح الشمائل: یہ حضرت الامام المحدث الشیخ عبدالرؤف المناوی المصریؒ المتوفی ۱۰۰۳ھ کی تصنیف ہے۔ اور اس وقت جمع الوسائل کے حاشیہ پر شائع ہو چکی ہے۔

(۳) المواہب اللدنیۃ علی الشمائل المحمدیۃ: یہ علامہ الامام الشیخ ابراہیم البیجوریؒ کی تصنیف ہے۔

(۴) زہر الخمائل علی الشمائل: یہ علامہ جلال الدین السیوطیؒ کی عمدہ کتاب ہے۔

(۵) الاتحافات الربانیۃ بشرح الشمائل المحمدیۃ: یہ علامہ احمد عبدالجواد احمد الرومیؒ کی تصنیف ہے۔

(۶) اشرف الوسائل شرح علی الشمائل: یہ علامہ ابن حجر المکی الھیثمیؒ کی کتاب ہے۔

(۷) الفوائد الجلیلۃ البھیۃ علی الشمائل المحمدیۃ: یہ علامہ محمد بن قاسم بن اسد المغربیؒ کی تصنیف ہے۔

(۸) اسنیٰ الوسائل بشرح الشمائل: یہ علامہ اسماعیل بن محمد العجلونیؒ المتوفی ۱۱۶۲ھ کی تصنیف ہے۔

(۹) المواہب المحمدیۃ بشرح الشمائل الترمذیۃ: یہ علامہ سلیمان بن عمر المعروف بالجمل المتوفی ۱۲۰۴ھ کی عمدہ تصنیف ہے۔

(۱۰) شرح شمائل للترمذی: للعلامہ ابراہیم بن محمد بن عرب شاہؒ المتوفی ۹۴۳ھ

(۱۱) شرح الشمائل للترمذیؒ: للعلامہ سلطان بن احمد المصری المزاحیؒ المتوفی ۱۰۷۵ھ

(۱۲) شرح الشمائل: للشیخ عبداللہ نجیب العینتابی شارح الشفاء المتوفی ۱۲۱۹ھ

(۱۳) شمائل النبی ﷺ: للعلامہ مصلح الدین اللاری محمد بن صلاح الدین جلال المتوفی ۹۷۹ھ

(۱۴) خصائل النبوی شرح شمائل ترمذی: یہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوریؒ کی اردو زبان میں عمدہ شرح ہے۔ جو اختصار کے ساتھ جامع بھی ہے۔

(۱۵) ترجمہ شمائل ترمذی: حضرت مولانا عبدالشکور لکھنویؒ کا اردو زبان میں ترجمہ ہے۔

(۱۶)شمائل ترمذی مع اردو ترجمہ وتشریح: مفسر قرآن علامہ مولانا صوفی عبدالحمید سواتیؒ کے درسی افادات کا مجموعہ ہے۔

(۱۷) آفتاب نبوت کی کرنیں شمائل اور خصائل کی روشنی میں: یہ مولانا محمد حسین صدیقی مدظلہ کی شمائل ترمذی کی اردو زبان میں شرح ہے۔

(۱۸)شرح شمائل ترمذی: یہ مولانا عبدالقیوم حقانی مدظلہ بانی ومہتمم جامعہ ابو ہریرۃ خالق آباد نوشہرہ کی شمائل ترمذی کا عمدہ شرح ہے۔

ان کے علاوہ بھی بہت سارے شروح ہیں۔

کچھ شرح ھذا کے بارے میں: قائد جمیعت حضرت مولانا سمیع الحق صاحب زید مجدہم سیاسی میدان میں شہرت رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک کہنہ مشق اور ماہر ترین مدرس بھی ہیں۔آپ مدظلہ نے ایام تدریس میں جو بھی کتاب پڑھائی،اس کتاب کی لفظی اور عبارتی تشریح کا نہ صرف حق ادا کیا بلکہ حالات حاضرہ اوران سے پیدا ہونے والے مسائل کا حل اوراس موضوع کے مالھاو ماعلیھا سے طلباء علوم دینیۃ کے اذہان کومنور اور معطر فرمایا۔اور خصوصاً احادیث کی کتابوں کو پڑھاتے وقت جس جامعیت اور سہل انداز سے طلباء کو درس حدیث دیتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔یہی وجہ ہے کہ قارئین ماہنامہ الحق کی اصرار پر آپکے جامع ترمذی کے درسی افادات کو الحق میں بالاقساط شائع کیا جاتا ہے۔جامع ترمذی کے درسی افادات کو مزید افادہ واستفادہ کے لئے بندہ ناچیز (مختاراللہ حقانی) نے جامع ترمذی کے کتاب الاطعمۃ والاشربۃ کو یکجا کر کے''اسلام کا نظام اکل وشرب'' کے نام سے ایک ضخیم جلد میں مرتب کر کے شائع کیا۔جس کو مجالس علم میں کافی پزیرائی حاصل ہوئی۔اور یہ مقبولیت اس لئے ہے کہ مولانا سمیع الحق صاحب کے جامع ترمذی کے درسی افادات ہر خاص وعام کیلئے مفید ہیں۔اسی طرح زیر نظر کتاب زین المحافل شرح الشمائل بھی مذکورہ صفات کی حامل کتاب ہے۔مولانا اصلاح الدین حقانی مدظلہ استاذ الحدیث جامعہ اسلامیہ کلی مروت چونکہ خود شمائل ترمذی حضرت اقدس مدظلہ سے پڑھ چکے ہیں اور ساتھ ساتھ آپ مدظلہ کا درس آڈیو کیسٹ میں بھی محفوظ ہے اسلئے انہوں نے انتہائی عرق ریزی سے آپ کے انداز بیان اور طرز افہام وتفہیم کو مدنظر رکھتے

ہوئے زینت قرطاس کیا۔جواب آپ حضرات کے ہاتھوں میں ہے۔

بندہ اپنے لئے سعادت سمجھتا ہے کہ مجھ ناچیز کو حضرت اقدس مدظلہ کے ان جواہر پاروں کی نظر ثانی، کمپوز کروانے اور ان کو کتابی شکل میں ترتیب دینے کی خدمت کا موقع ملا۔بندہ ناچیز نے مناسب مقام پر کچھ حواشی بھی لکھے اور ساتھ شمائل ترمذی میں جو روایات امام ترمذیؒ نے نقل کی ہیں ان کی تخریج بھی دیگر کتب حدیث سے کی۔تاکہ کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہوجائے۔اس کے علاوہ بعض معرکۃ الآراء فقہی مسائل کی قدرے وضاحت کی کوشش کی ہے۔تخریج احادیث میں متعلقہ کتاب کا جلد اور صفحہ نمبر کتاب اور باب کو ذکر کیا ہے تاکہ اصل مراجع تک رسائی آسان ہو۔اس کے علاوہ ترتیب، پروف ریڈنگ اور تصحیح اغلاط کی کافی حد تک اپنی بساط کے مطابق کوشش کی ہے مگر ابی اللّٰہ عصمۃ کتاب غیر کتابہ کی وجہ سے کتاب میں لفظی، معنوی اور ترتیبی غلطیوں کا امکان کوئی ناگزیر نہیں۔اس لئے اہل علم اور قارئین حضرات سے التجاء ہے کہ دوران مطالعہ اگر کوئی لفظی، معنوی یا کتابتی غلطی نظر آئے تو ازراہ کرام ان اغلاط پر مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں ان کا ازالہ ہو سکے۔آخر میں ان سب حضرات کا مشکور ہوں خصوصاً برادر مکرم مولانا عرفان الحق اظہار حقانی مدرس دارالعلوم حقانیہ کا جنہوں نے اس کتاب کی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ وغیرہ میں تعاون کیا اور اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس مجموعہ کو حضرت اقدس مدظلہ، مولانا اصلاح الدین حقانی اور مجھ ناچیز کے لئے دنیا و آخرت میں ذخیرۂ خیر بنائے۔آمین

احقر العباد مختار اللہ حقانی

خادم دارالافتاء، شعبہ تخصص فی الفقہ والافتاء

جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

۱۱ر مئی ۲۰۰۷ء بروز جمعہ المبارک

مختصر سوانحی خاکہ شیخ الحدیث

حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ

نام ونسب: حضرت مولانا سمیع الحق دامت برکاتہم العالیہ ۱۸ ستمبر ۱۹۳۷ء کو حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحبؒ کے گھر اکوڑہ خٹک میں پیدا ہوئے۔ آپکے آباؤاجداد سلطان محمود غزنویؒ کے ہمرا جہاد کیلئے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ اور پھر اکوڑہ خٹک میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آپ کا تعلق ایک علمی گھرانے سے ہے۔ کئی پشتوں سے یہ خاندان دینی اور مذہبی خدمات انجام دیتا چلا آرہا ہے۔

ابتدائی تعلیم: آپ نے پرائمری تک عصری تعلیم گاؤں ہی میں اپنے والد محترم حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ کے قائم کردہ انجمن تعلیم القرآن اسلامیہ پرائمری سکول میں حاصل کی۔ دینی تعلیم ابتدائی درجات سے لے کر درجات عالیہ تک جامعہ دارالعلوم حقانیہ میں حاصل کی۔ اور ۱۹۵۷ء کو دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد الامام الکبیر شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ سے ۱۳۷۸ھ کو دورۂ تفسیر کیا۔

اعزازی اسناد: جامعہ دارالعلوم حقانیہ سے سندِ فراغت کے علاوہ بعض دوسرے اکابرین علماء کرام مثلاً قطب العالم شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر الدین غورغشتویؒ، حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنیؒ، حضرت مولانا فخر الدین صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیو بند، اور مکہ مکرمہ کے مسند وقت شیخ علوی مالکیؒ نے آپ کو اعزازی اسناد اور اجازاتِ حدیث سے نوازا۔

اساتذہ: ولی کامل حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالغفور سواتی، مولانا عبدالحلیم زروبویؒ، قطب العالم شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ وغیرہ اکابرین سے شرف تلمذ آپ کو حاصل ہے۔

تدریس: تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۵۸ء کو جامعہ دارالعلوم حقانیہ ہی میں درس وتدریس کا آغاز کیا۔ اور جلد ہی خداداد صلاحیتوں کی بدولت ابتدائی کتب سے کتب حدیث کی تدریس تک پہنچ گئے جو

کہ آج تک جاری وساری ہے۔

اندازِ تدریس: آپ کا انداز ایسا عام فہم اور سلیس ہے کہ ادنیٰ سمجھ رکھنے والا طالبعلم بھی کتاب کے مطلب کو تقریباً کما حقہ سمجھ جاتا ہے۔ عموماً مدرسین حضرات کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ وہ سال کے آغاز میں خوب تحقیق وتدقیق سے اسباق پڑھاتے ہیں۔ لمبی چوڑی تقاریر کرتے ہیں۔ بسا اوقات وہ محققانہ باتیں طلباء کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں۔ لیکن چند مہینے بعد اور خصوصاً سال کے آخر میں کتاب کو ختم کرنے کی غرض سے عبارت کا ترجمہ تک نہیں کرتے۔ ہاں کہیں ضروری بات ہو تو وہ کرجاتے ہیں۔ مگر مولانا صاحب کا اندازِ درس سال کے آغاز سے لیکر اختتام تک یکساں ہوتا ہے۔ آپ کی تقریر میں تکرار نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک بہتے دریا کی طرح رواں دواں ہوتی ہے۔ آپ درس میں محققانہ روایتی ابحاث کے ساتھ ساتھ جدید دور کے جدید تقاضوں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ بین الاقوامی سیاست، یہود وہنود اور اسلام دشمن عناصر کے عزائم سے بھی طلباء کو آگاہ کرتے ہیں۔ اگر چہ مولانا صاحب نے تقریباً ہر فن میں کوئی نہ کوئی کتاب پڑھائی ہے اور ہر ایک کتاب کی تدریس کا ایک الگ انداز ہے۔ مگر علم حدیث کی کتابوں کی تدریس اور پڑھانے میں آپ کا دیگر محدثین حضرات سے الگ تھلگ اپنا ایک منفرد اور انوکھا انداز ہے۔ حدیث کی لفظی تشریح کے ساتھ اس حدیث کے اسرار ولطائف بھی بیان کرتے ہیں، فقہی مسائل، مذاہب وجوہ اختلاف دلائل اور پھر ترجیح الراجح بیان کرتے ہیں۔ ترقی سائنس سے پیدا شدہ مسائل، جدید سیاسی صورت حال کا جائزہ، جدید معاشی نظام کا نشیب وفراز، نئے فتنوں کے عزائم، یہود وہنود کے منصوبے، عالم اسلام کو درپیش مسائل اور پھر قرآن وسنت کی روشنی میں ان کا حل خصوصیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ جس کا اندازہ زیرِ نظر درسی افادات سے لگایا جاسکتا ہے۔

صحافت: درس وتدریس کے ساتھ ساتھ ۱۹۶۵ء میں آپ نے ماہنامہ الحق کے نام سے ایک دینی وعلمی جریدے کا آغاز کیا۔ جسے بہت جلد ملک اور بیرون ملک مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہوئی۔ اور تادمِ تحریر نہایت آب وتاب سے جاری ہے۔

مشہور تلامذہ: ویسے تو اس طویل دورِ تدریس میں آپ کے تلامذہ کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے جو

ملک و بیرون ملک مختلف خدمات دینیہ میں مشغول ہیں۔ نگران میں چند مندرجہ ذیل ہیں:

حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن (مہتمم جامعہ عثمانیہ پشاور)، حضرت مولانا اصلاح الدین (مرتب تقریر شمائل ترمذی کتاب ھذا وانا)، حضرت مولانا محمد محسن شاہ (مہتمم جامعہ حلیمیہ درہ پیزو)، حضرت مولانا نصیب علی شاہؒ (سابق ایم این اے، مہتمم المرکز الاسلامی بنوں)، مولانا حبیب اللہ حقانی (ناظم دارالعلوم اسلامیہ لکی مروت)، حضرت مولانا حافظ ابن امین (مہتمم دارالعلوم تخت نصرتی)، استاد المعقول والمنقول حضرت مولانا تاج محمد حقانی (مدرس دارالعلوم کاہی)، حضرت مولانا عبیداللہ چترالیؒ (سابق مہتمم دارالعلوم تعلیم الاسلام باڑہ گیٹ پشاور)، حضرت مولانا گوہر شاہ (ایم این اے، مہتمم جامعہ اسلامیہ چارسدہ)، حضرت مولانا غلام محمد صادق (ایم این اے، ناظم جامعہ اسلامیہ)، شیخ الحدیث حضرت مولانا ادریس حقانی (ایم پی اے، اتمان زئی)، حضرت مولانا بدر منیر صاحب (مہتمم دارالعلوم تعلیم القرآن بٹ خیلہ) حضرت مولانا صبغۃ اللہ حقانی (مہتمم مدرسہ ہاشمیہ کوئٹہ)، حضرت مولانا خیر محمد (جامعہ خیر المدارس کوئٹہ)، حضرت مولانا سید عبدالباری آغا (سابق صوبائی وزیر مذہبی امور بلوچستان)، حضرت مولانا عصمت اللہ (سابق وزیر خزانہ بلوچستان)، حضرت مولانا نصیب خان صاحب استاد حدیث دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک)، حضرت مولانا سیف اللہ حقانی (رئیس دارالافتاء دارالعلوم حقانیہ)، حضرت مولانا الطاف الرحمٰن بنوی (استاد حدیث جامعہ امدادالعلوم پشاور)، حضرت مولانا نثار اللہ حقانی (مہتمم دارالعلوم اضاخیل)، حضرت مولانا قاضی فضل اللہ صاحب (سابق ایم این اے چھوٹا لاہور حال مقیم امریکہ)، حضرت مولانا محمد ابراہیم فانی (مدرس دارالعلوم حقانیہ)، حضرت مولانا حافظ شوکت علی حقانی (مدرس دارالعلوم حقانیہ)، حضرت مولانا مفتی غلام قادر حقانی (مدرس دارالعلوم حقانیہ) مولانا عبدالکبیر حقانی (سابق گورنر جلال آباد و معاون سرپرست شوریٰ عالی افغانستان)، حضرت مولانا سعید الرحمٰن حقانی (پاکستان میں افغانستان کے سابق سفیر، معاون وزیر فوائد عامہ "مواصلات و تعمیرات")، مولانا احمد اللہ حقانی (سابق وفاقی وزیر فوائد عامہ "مواصلات و تعمیرات")، مولانا سید غیاث الدین حقانی (سابق وفاقی وزیر اوقاف)، مولانا مسلم حقانی (سابق معاون وزیر حج)، مولانا عبداللطیف

حقانی (سابق وفاقی وزیر زراعت)، مولانا عبدالرقیب حقانی (سابق وفاقی وزیر شہداء صالحین)، مولانا حفیظ اللہ حقانی (سابق سیکرٹری خارجہ وسابق وزیر منصوبہ بندی)، مولانا حاجی احمد جان حقانی (سابق وفاقی وزیر پانی وبجلی)، مولانا صدر اعظم حقانی (نائب گورنر جلال آباد)، مولانا نور محمد ثاقب حقانی (سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ آف افغانستان)، اور دیگر بے شمار تحریک طالبان اور جہاد افغانستان کے قائدین بھی آپ کے تلامذہ کی فہرست میں شامل ہیں۔

<u>اولاد واحفاد:</u> اللہ تعالیٰ نے اولاد واحفاد کی نعمت سے بھی نوازا ہے۔ جن میں مولانا حامد الحق فاضل مدرس حقانیہ ممبر قومی اسمبلی، مولانا راشد الحق فاضل مدرس حقانیہ ایڈیٹر "الحق"، اسامہ سمیع، خزیمہ سمیع، عبدالحق ثانی ابن مولانا حامد الحق، محمد احمد بن مولانا راشد الحق سمیع وغیرہ شامل ہیں۔

<u>تصنیف وتالیف:</u> تدریسی، سیاسی اور دارالعلوم کی انتظامی ذمہ داریوں کے باوجود آپ نے تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ آپ کے تصانیف اور درسی افادات میں بعض اہم کتابیں درج ذیل ہیں:

(۱) ملت اسلامیہ کا مؤقف (قومی اسمبلی میں مرزائیوں کو متفقہ طور پر غیر مسلم اقلیت اس کتاب کو پیش کرنے کے بعد قرار دیا گیا)

(۲) حقائق السنن شرح جامع الترمذی (افادات حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ)

(۳) اسلام کا نظام اکل وشرب وفلسفہ حلال وحرام (شرح جامع ترمذی کتاب الاطعمۃ والاشربہ)

(۴) میری علمی اور مطالعاتی زندگی (۵) اسلام اور عصر حاضر

(۶) قومی اسمبلی میں اسلام کا معرکہ (۷) زین المحافل شرح شمائل ترمذی ۲ جلدوں میں

(۸) دعوات حق (خطبات شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحقؒ) دو جلدوں میں

(۹) خطبات حق (خطبات مولانا سمیع الحق)

(۱۰) مکتوبات مشاہیر اکابر امت بنام مولانا عبدالحقؒ

(۱۱) مکتوبات مشاہیر بنام مولانا سمیع الحق، کئی جلدوں میں

(۱۲) صلیبی دہشت گردی اور اسلام کا معرکہ(عالمی میڈیا سے بے لاگ مکالمہ اور انٹرویوز)

(۱۳) سینٹ میں شریعت بل کا معرکہ (۱۴)وفاقی مجلس شوریٰ(فوجی پارلیمنٹ میں اسلام کی جنگ)

(۱۵) روسی الحاد (۱۶) عبادات وعبدیت

(۱۷) مسئلہ خلافت وشہادت (۱۸) صحبتے با اہل حق

(۱۹) قرآن حکیم اور تعمیر اخلاق (۲۰) کاروان آخرت

(۲۱) قادیان سے اسرائیل تک (۲۲) قومی اور ملی مسائل پر جمعیت کا موقف

اوراسی تصنیف وتالیف اور ریسرچ کیلئے آپ مدظلہ نے جامعہ دارالعلوم حقانیہ میں شعبۂ مؤتمر المصنفین کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔جو ان کی نگرانی میں شب وروز مصروف عمل ہے۔

تحریکات اور ملی خدمات: درس وتدریس کے ساتھ آپ نے مختلف تحریکات میں بھی بھر پور حصہ لیا۔ صدر ایوب خان کے دورِ حکومت میں جب ماڈرن ازم کے داعی ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے فتنہ نے سر اٹھایا تو آپ نے اس کا بھر پور تعاقب کیا۔جس پر ماہنامہ الحق میں شائع شدہ آپ کے اداریئے دال ہیں۔

۱۹۷۴ء میں جب تحریک ختم نبوت شروع ہوئی،تو آپ نے اس تحریک میں بھی اپنے والدمحترم اور قائد جمعیت علماء اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور دوسرے اکابر علماء کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے قومی اسمبلی میں امت مسلمہ کی ترجمانی کرتے ہوئے قادیانیت کے بارے میں ''ملت اسلامیہ کا موقف'' جو سنایا تھا۔اس کا کافی حصہ آپ نے لکھا تھا۔

۱۹۷۷ء میں جب تحریک نظام مصطفیٰ شروع ہوئی۔تو اس میں بھی آپ نے قائدانہ کردار ادا کیا۔ جس کی پاداش میں آپ نے ہری پور جیل میں قید وبند کی صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔

سیاسی خدمات: درس وتدریس،تصنیف وتالیف،ماہنامہ الحق کی ادارت اور دارالعلوم کے انتظامی امور کے ساتھ ساتھ ملکی سیاست میں بھی آپ نے اہم خدمات سرانجام دی ہیں۔۱۹۷۰ء میں جب اکابرین جمعیت علماء اسلام حضرت مولانا عبداللہ درخواستیؒ،حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور مجاہد ملت حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ کو عام انتخابات میں حصہ لینے پر مجبور کیا۔ تو

آپ (مولانا سمیع الحق) کو مجبوراً حصہ لیناپڑا۔اور حضرت شیخ الحدیثؒ کی کامیابی کے بعد قومی اسمبلی میں ساری کارروائی پس پردہ آپ ہی چلاتے رہے۔تحاریک التواء کی قراردادیں، اور ۱۹۷۳ء کے آئین میں ترامیم پیش کرنے میں بھی آپ پیش پیش رہے۔

جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دورِ مارشل لاء میں آپ کو وفاقی مجلس شوریٰ کا ممبر نامزد کیا گیا۔تو زکوٰۃ وعشر، حدود، قصاص ودیت اور امتناع قادیانیت آرڈیننس کا نفاذ اور آئین میں بے شمار اسلامی شقوں اور دفعات کا شمول آپ ہی کی شبانہ روز جدوجہد کی بدولت ممکن ہوسکا۔اور جب (۱۹۸۵ء میں) سینٹ آف پاکستان کے آپ ممبر بنے۔تو آٹھ سال کی طویل تاریخی جدوجہد کے بعد سینٹ سے شریعت بل منظور کروایا۔

اسلامی جمہوری اتحاد کا قیام: مملکت خداداد پاکستان پر جب سیکولرزم کے منحوس سائے دوبارہ پھیلنے لگے تو اس کے تدارک کیلئے آپ نے اس وقت اسلامی جمہوری اتحاد کی بنیاد رکھی۔جس میں نوسیاسی ومذہبی جماعتیں شامل ہوئیں۔اور متفقہ طور پر آپ کو اس اتحاد کا سنئیر نائب صدر منتخب کیا گیا۔

متحدہ علماء کونسل کا قیام: ۱۹۸۸ء میں جب بے نظیر کی حکومت قائم ہوئی۔تو آپ نے اس کے خاتمہ کے لئے متحدہ علماء کونسل کے پلیٹ فارم پر تمام مکاتب فکر کے علماء اور اکابرین کو جمع کیا۔جس کی بدولت نسوانی حکومت کا خاتمہ ممکن ہوسکا۔

متحدہ دینی محاذ کی تشکیل: بھارت میں جب بابری مسجد کے انہدام کا دلخراش حادثہ پیش آیا۔تو ملک میں دینی اقدار وآثار کو تباہی سے بچانے کیلئے ۱۵دسمبر ۱۹۹۲ء کو ایک بار پھر تمام دینی جماعتوں کے قائدین کو جمع کرکے ''متحدہ دینی محاذ'' کی تشکیل کی۔

تحریک تحفظ مدارس دینیہ: ۱۹۹۴ء میں جب بے نظیر حکومت نے مدارس دینیہ کے خلاف بے بنیاد الزامات لگانے، مدارس کی انکوائریاں اور تحقیقات کرانے کا سلسلہ شروع کیا، تو مولانا صاحب نے یکم جنوری ۱۹۹۵ء کو لاہور میں تمام مکاتب فکر کے علماء اور ارباب مدارس کو جمع کرکے ''تحریک تحفظ مدارسِ دینیہ'' قائم کی اور حکومت کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملادیا۔

اب جبکہ جنرل پرویز مشرف کی فوجی حکومت اور اس کے ناعاقبت اندیش وزراء نے امریکہ کی

خوشنودی حاصل کرنے کیلئے مدارس دینیہ کے خلاف مہم شروع کی۔تو اسی مرد مجاہد نے ۳۰ اپریل ۲۰۰۰ء کو دارالعلوم حقانیہ میں تمام مدارس کے مہتممین کو جمع کرکے مذکورہ منصوبہ کے سامنے بند باندھا۔

ملی یکجہتی کونسل کا قیام: ۱۹۹۶ء میں ملک عزیز میں فرقہ واریت کی آگ بھڑک اٹھی۔اور حکومتی سطح پر امریکہ کے نیو ورلڈ آرڈر کی تکمیل کی سازشیں شروع ہوئیں۔تو اس نازک وقت میں آپ ہی نے تمام سیاسی اور مذہبی جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرکے "ملی یکجہتی کونسل" قائم کی۔

سی ٹی بی ٹی: ۱۹۹۸ء میں جب نواز حکومت سی ٹی بی ٹی پر دستخط کیلئے آمادہ ہوئی تو مولانا صاحب نے نہ صرف اپنے ادارہ جامعہ دارالعلوم حقانیہ سے اس کی مخالفت میں مدلل شرعی فتویٰ شائع کرکے راتوں رات سینٹ اور قومی وصوبائی اسمبلیوں کے ممبران میں تقسیم کروایا، بلکہ ۵ مئی ۱۹۹۸ء کو تمام دینی جماعتوں کی آل پارٹیز کانفرنس طلب کرکے اس ناپاک سازش کو ناکام بنایا۔

دفاع افغانستان وپاکستان کونسل کا قیام: جہادِ افغانستان اور تحریک طالبان میں حضرت مولانا سمیع الحق صاحب کا کلیدی کردار کسی پر مخفی نہیں کہ انہوں نے اس جہاد میں قائدانہ کردار ادا کیا۔اور کر رہے ہیں۔اس لئے کہ تحریک طالبان میں شامل طلباء اور ان کے قائدین کے آپ نہ صرف مربی ہیں۔بلکہ دارالعلوم حقانیہ کے مہتمم کی حیثیت سے ہزاروں کی تعداد میں علماء اور طالبان لیڈر آپ کے براہ راست شاگرد ہیں۔جنوری ۲۰۰۱ء میں جب امریکہ نے افغانستان پر پابندیاں لگانے کا فیصلہ کیا تو مولانا صاحب نے ملک کی تمام دینی اور سیاسی جماعتوں کے مرکزی قائدین کو دارالعلوم حقانیہ میں جمع کیا۔اس کانفرنس میں امریکی استعمار اور سامراج کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہوئے "دفاع افغانستان وپاکستان کونسل" کے قیام کا باضابطہ اعلان کیا گیا۔اور اتفاق رائے سے مولانا صاحب کو اس کونسل کا چیئرمین نامزد کیا گیا۔

سود کے خلاف آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد: پاکستان کے اعلیٰ عدالتی ادارے سپریم کورٹ نے حکومت کو ۳۰ جون ۲۰۰۱ء تک سودی نظام ختم کرنے کا حکم دیا۔اور حکومت نے حسب سابق اس سلسلہ میں لیت ولعل کی پالیسی اختیار کرنی شروع کی۔تو مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ نے ۱۹ مئی ۲۰۰۱ء کو کراچی میں تمام دینی اور سیاسی جماعتوں کا مشترکہ سربراہی اجلاس طلب کیا۔اور حکومت کو سپریم کورٹ کے فیصلہ پر عمل کرنے کا نوٹس دیا۔اور بصورت دیگر حکومت کے خلاف تحریک چلانے کا اعلان کیا۔

مختصر تذکرہ مرتبِ کتاب

مولانا اصلاح الدین حقانی بن مولانا سراج الدینؒ

ولادت: ۱۸ ستمبر ۱۹۵۸ء مطابق ۴ ربیع الاول ۱۳۷۸ھ بروز جمعرات بمقام ملازئی ضلع ٹانک

گھرانہ: آپ کے دادا اپنے علاقہ کے مشہور عالم تھے۔ والد صاحب مولانا سراج الدین مرحوم تقسیم سے قبل سہارنپور میں پڑھتے تھے۔ تقسیم ہند کی وجہ سے ۱۹۴۷ء میں جامعہ خیر المدارس ملتان آگئے اور وہیں سے فراغت حاصل کی۔ جید عالم دین اور اپنے علاقہ میں افتاء کے مرجع تھے۔

تعلیم: ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں ملازئی میں حاصل کی۔ دینی کتب دادا مولانا شیخ امیر صاحب، والد صاحب مولانا سراج الدین صاحب اور مولانا عبدالحق صاحب رحمہم اللہ سے پڑھیں۔ یہیں سے ۱۹۷۵ء میں سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ سکول کے اساتذہ اور دیگر احباب کی رائے تھی کہ کالج میں داخلہ لیں۔ مگر اپنے شوق اور والدین جبکہ بالخصوص دادا جان کی خواہش نے دینی علوم کی طرف کھینچا۔ میٹرک کے نتیجہ کے بعد چونکہ مدارس کے تعلیمی سال کا کچھ حصہ گزر چکا تھا۔ اس لئے بڑے مدارس میں داخلہ کی توقع نہیں تھی۔ تو والد صاحب نے اپنے تعارف پر بنوں کے دارالعلوم الاسلامیہ میں ۲۶ جنوری ۱۹۷۶ء مطابق ۱۳۹۶ھ کو داخلہ دلوایا۔ جون ۱۹۸۰ء تک یہیں پڑھتے رہے۔ اور ابتدائی فنون یہیں پڑھے۔

۲۴ اگست ۱۹۸۰ء مطابق ۱۲ شوال ۱۴۰۰ھ کو مشہور عالم درسگاہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں داخلہ لیا۔ پانچ سال تک یہی پڑھتے رہے۔ شعبان ۱۴۰۵ھ میں وفاق المدارس کے عالمیہ کے امتحان سے فارغ ہو کر ۳ مئی ۱۹۸۵ء دارالعلوم حقانیہ سے سند الفراغت حاصل کی اور وفاق المدارس کے امتحان میں پاکستان بھر میں اول آنے کا اعزاز ملا۔

فراغت کے بعد دارالعلوم الاسلامیہ لکی مروت دارالعلوم وزیرستان وانا (جنوبی وزیرستان ایجنسی) اور جامعہ اسلامیہ زرگری ضلع ہنگو میں مختلف فنون اور حدیث پاک کی کتابوں کی تدریس کا موقع ملا جو الحمدللہ تاحال جاری ہے۔

عصری علوم: جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ میٹرک کا امتحان ریگولر طالب علم کی حیثیت سے اپنے گاؤں سے پاس کیا۔ پھر دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری علوم کا پرائیویٹ مطالعہ جاری رہا۔ ۱۹۸۰ء میں ایف اے کا امتحان پشاور بورڈ سے پاس کیا۔ ۱۹۸۳ء میں گومل یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان دیا تو یونیورسٹی میں اول آئے۔ اور گولڈ میڈل کا مستحق قرار دیئے گئے۔ اور ۱۹۸۶ء میں ایم اے عربی کے امتحان میں یونیورسٹی بھر میں اول آئے۔ اور دوبارہ گولڈ میڈل کا مستحق قرار دیئے گئے۔

اور ۱۹۸۹ء میں ایم اے اسلامیات کے امتحان میں یونیورسٹی میں تیسری پوزیشن لی۔

تحریر و تحقیق: ابتداء ہی سے ادبی ذوق ملا تھا۔ سکول کے زمانہ میں بھی اساتذہ کے حکم سے مضامین لکھتے رہے۔ اشعار کا ملکہ بھی ملا تھا۔ طالبعلمی کے زمانے کے بہت سے اشعار تو ضائع ہو چکے ہیں۔ اور فراغت کے بعد شعر گوئی کی طرف توجہ کم کرنی پڑی۔ البتہ اساتذہ کے دروس کے امالی محفوظ ہیں۔ بلکہ مطول اور مسلم شریف کے دروس کے امالی ایک افغانی شخص اپنے نام سے چھپوا چکا ہے۔ الحمد للہ اس کو کوئی کوفت نہیں ہوئی۔ ان امالی میں مشکوٰۃ شریف کی تقریر سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ جس سے ہزاروں فوٹوسٹیٹ کا پیاں نکل چکی ہیں۔

حضرت مولانا شیخ الحدیث مغفور اللہ صاحب مدظلہم کے درس کی اس تقریر سے ایک عالم استفادہ کر رہا ہے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب رحمہ اللہ کی حقائق السنن کے احادیث کی تخریج بھی کرتے رہے۔ اسی زمانہ میں دیگر مضامین لکھنے کا شغف بھی تھا۔ جن میں الحق اکوڑہ خٹک، اقرأ کراچی اور النصیحۃ چارسدہ وغیرہ جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ایک مکمل شرح کی حیثیت سے زیر نظر کتاب نقش اول ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور سعادت دارین کا وسیلہ بنائے۔ آمین

بسم اللّٰہ الرحمان الرحیم

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے

الحمد للّٰہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ قال الشیخ الحافظ ابوعیسیٰ محمد بن عیسی بن سورۃ الترمذی.

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں اور سلامتی ہو اس کے ان بندوں پر جن کو انہوں نے منتخب کیا۔ شیخ حافظ ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ الترمذیؒ فرماتے ہیں

کتاب کی ابتداء میں بسم اللّٰہ اور حمد لانے کی متعدد وجوہ بیان کی گئی ہیں جن میں اہم وجوہ درج ذیل ہیں۔

۱) قرآن مجید کی اقتداء

۲) تیمّن یعنی برکت کا حصول

۳) ان احادیث کا اتباع جن میں بسم اللہ اور حمد کے بغیر کسی کام کے شروع کو ابتر اور اجذم یعنی ناقص اور بے برکت کہا گیا ہے۔

۴) سلف صالحین کی دیگر کتابوں کی تقلید

<u>اجزاء کی تشریح اور ظرف کا متعلق:</u> باء کو استعانت کے لیے لایا گیا ہے جو تیمّن اور تبرک کو متضمن ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے اسم مبارک کی اعانت سے برکت حاصل کر رہا ہوں، بعض حضرات نے باء کو تعدیۃ کے لیے قرار دیا ہے جیسا کہ علامہ بیجوریؒ نے صفویؒ اور جوینیؒ کی طرف منسوب کیا ہے۔

لفظ اللہ اس ذات حق کے لیے علم کے مرتبہ میں ہے جو تمام صفات کمال سے متصف اور صفات نقصان سے پاک ہے جبکہ رحمٰن اور رحیم دونوں رحمت سے مبالغہ کے صیغے ہیں جو کہ دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر دال ہیں اور (دنیا و آخرت) کے لیے تسکین و تسلی کا سامان ہیں۔

بسم اللّٰہ کی باء جارہ بظاہر فعل مقدر کے ساتھ متعلق ہے جو کہ ابتدأیاً و لفٌ ہے یا پھر ابتدائی یا

تالیفی جیسے مصادر کے ساتھ اس کا تعلق ہے یہ مقدم بھی مقدر کہا جاتا ہے اور مؤخر بھی لیکن محققین شرّاح ومفسرین نے مؤخر مقدر کرنے کو ترجیح دی ہے۔ کیونکہ اس طرح قصر حصر کے علاوہ تقدیم اسم الٰہی کی وجہ سے تعظیم بھی مستفاد ہوتا ہے نیز اسم الٰہی کو مقدم ماننے سے تبرک کا حصول بھی زیادہ قریب تر ہے اور یہی اصل مقصود بھی ہے۔

حمد کا مطلب: اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے تمام محامد کا مستحق ہے اور اختیاری محاسن کے مقابلے میں واقع تمام تعریفیں صرف اسی کے لائق ومناسب ہیں کیونکہ وہی ذات تمام محاسن کے لیے مبدأ ہے جبکہ مخلوق اسی ذات کی جمالی اور جلالی صفات کے مظاہر ہیں۔

لفظ سلام کی تشریح: سلام سے یا تو تسلیم مراد ہے یعنی سلام بھیجنا یا یہ سلامتی کے معنی میں ہے اور اس کی تنکیر میں بھی دو احتمال ہیں یا تو تعظیم کیلئے ہے یعنی ہماری طرف سے عظیم سلام ہو۔ یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے لامحدود سلامتی ہو منتخب بندوں پر یا پھر تکثیر وتعمیم کیلئے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر قسم کی سلامتی ہو ان لوگوں پر جو عبدیت کا اعلیٰ ترین مقام پانے کیساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے منتخب شدہ بھی ہیں یہ دونوں وصف انبیاء کرام، علماء واولیاء، فرشتوں اور جنات صالحین میں پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا نبی کریم ﷺ اہل بیت اور حضرات صحابہ سب کا حق ادا ہو گیا۔ اس مقام پر بعض شرّاح نے کہا ہے کہ الحمد کے مقابلے میں سلام کے لفظ کو نکرہ لانے میں نکتہ یہ ہے کہ حمد میں تعظیم اور سلام میں (تحقیر یعنی حمد سے کم درجہ گویا تقلیل وتصغیر مقصود ہے) اگرچہ اس قول کی ایک تاویل بھی علامہ بیجوریؒ وغیرہ نے کی ہے۔ لیکن ملا علی قاریؒ اور قسطلانیؒ نے اس کو مردود قرار دیا ہے۔ اگر یہ تحقیر کے لیے نہیں تو پھر اس میں کیا نکتہ ہے۔ تو بعض شراح نے یہ کہا ہے کہ اس میں تنکیر تعظیم کے لیے ہے یا تکثیر وتعمیم کے لیے۔ جیسے پہلے بیان ہو چکا ہے۔

کیا صلوٰۃ وسلام بیک وقت لازمی ہیں: یہاں پر یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ امام نوویؒ نے صلوٰۃ وسلام کو ایک دوسرے کے بغیر لانے کو مکروہ قرار دیا ہے بلکہ خود جب امام مسلمؒ نے صرف صلوٰۃ کا ذکر کیا ہے تو اس کے اس فعل کو منکر کہہ دیا ہے اس کا استدلال ہے کہ یایھا الذین آمنو صلّوا علیه وسلموا تسلیما (الآیة) میں صلوٰۃ و سلام کا یکجا امر ہوا ہے۔ لہٰذا صلوٰۃ کا افراد ناجائز ہے اسی طرح سلام کا

افراد بھی ناجائز ہوگا۔

اس سوال کے جواب میں بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ صلوٰۃ کا افراداوراسی طرح سلام کا افرادابتدائے اسلام میں مکروہ تھا مگر یہ کراہت بعد میں منسوخ ہوگئی لیکن ملاعلی قاریؒ نے تاریخی ثبوت نہ ہونے کی بناء پراس قول کومردود کہا ہے۔بعض حضرات نے جواب دیا ہے کہ مصنفؒ اوراسی طرح امام مسلمؒ پر افراد کا اعتراض اس وقت صحیح ہوتا جبکہ اسی مجلس میں اوراس پوری کتاب میں وہ ایسا کرنے کے مرتکب ہوتے یعنی اس مجلس میں سلام کے ساتھ صلوٰۃ ذکر نہ کرتے یا کتاب میں صلوٰۃ نہ لاتے۔تو ان کوتارک صلوٰۃ کہا جاسکتا تھا جبکہ یہاں پر سلام صلوٰۃ کو متضمن ہے۔نیز مصنف کی کتاب تو صلوٰۃ و سلام سے بھری پڑی ہے لیکن اصل اور صحیح جواب یہ ہے کہ امام نوویؒ نے کراہت کا جودعویٰ کیا ہے وہ درست نہیں بلکہ خود شوافع میں ان کے سوا کوئی اس کا قائل نظر نہیں آتا۔علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں لم اقف علٰی دلیل یقتضی الکراھۃ۔ علامہ جزریؒ نے امام نوویؒ پر رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر چہ صلوٰۃ وسلام میں جمع اولیٰ ہے لیکن لا اعلم احداً نصّ علی ذالک (قول الکراھۃ)من علماء نا و لا غیرھم.

بایں ہمہ امام ترمذیؒ تو ویسے بھی اس الزام سے بری نظر آتے ہیں کیونکہ انہوں نے سلام کا یہ انداز سورۃ النمل کی آیت ۵۹ سے بطور اقتباس اختیار کیا ہے لہٰذا اس کی ذمہ داری ان پر نہیں ڈالی جائیگی۔ بلکہ خود رب ذوالجلال کی طرف سے یہ انوکھا اور بہترین اندازِ تسلیم ہے۔اب یہاں یہ استفسار ہوسکتا ہے کہ مصنف خود اپنے الفاظ میں حمد کیوں نہیں لائے اور اقتباس کا انداز اختیار کرنے کا کیا سبب ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس انداز میں ایک طرف تو اس امر کا امتثال ملحوظ نظر ہے جو رب تبارک وتعالیٰ کی طرف سے صادر ہوا ہے کہ وقل الحمدللّٰہ و سلام علٰی عبادہ الذین اصطفیٰ.(سورۃ النمل ۵۹)

دوسری طرف ادائے حمد کے عمل عظیم میں اپنی عجز کو بھی اشارہ ہے اور یہ وضاحت کرنا مطلوب ہے کہ میں خود اپنی طرف سے حمد وصلوٰۃ کا حق ادا نہیں کرسکتا جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔

خدا در انتظارِ حمدِ ما نسیت — محمد چشم بر راہ ثنا نیست

محمد حامد حمدِ خدا بس — خدا خود مدح آفرین مصطفیٰ بس

بلکہ حق یہ ہے کہ دنیا میں حضور اقدس ﷺ خود بھی حمد کا حق ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شفاعت کبریٰ کے موقع پر حالت سجدہ میں مجھ پر کچھ ایسے انداز سے حمد کا القاء فرمائے گا جو اس وقت سے پہلے میرے علم میں نہیں ہوگا۔ نیز ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں کہ **سبحانک لا نحصی ثناءً علیک أنت کما أثنیت علی نفسک**.

اے اللہ تو پاک ہے ہم تیری تعریف کا حق ادا کرنے سے قاصر ہیں تو ویسا ہے جیسا کہ تو نے اپنے آپ کی تعریف کی ہے۔

رہی یہ بات کہ **وعلٰی عباده الذین اصطفیٰ**۔ میں سلامتی اللہ کے منتخب بندوں پر بتائی گئی ہے اور اللہ کے منتخب بندے انبیاء کرام ہیں۔ مگر سوال اٹھتا ہے کہ کفار کی جانب سے انبیاء اور ان کے صحابہ پر تو بہت زیادہ مظالم ہوئے ان کو زیادہ تکالیف پہنچائی گئیں۔ قتل کیے گئے، مارے گئے، گالیاں دی گئیں۔ **اوذیت فی اللہ مالم یؤذ احداً** ارشاد نبوی ﷺ ہے تو سلامتی کا کیا مطلب؟ جواب یہ ہے کہ دراصل یہ انشاء ہے اور سلامتی کی دعا ہے اخبار نہیں ہے۔ لہٰذا اشکال نہیں رہا۔ اور اگر اخبار کے معنی میں لے لیں تو توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ انبیاء کرام تمام تکالیف کے باوجود منصب نبوت کی ادائیگی کو ملحوظ رکھنے میں سلامت رہے اور تھوڑی سی لغزش اور کوتاہی بھی ان سے اپنے منصب میں صادر نہیں ہوئی۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ عباد سے مراد یہاں انبیاء کرام ہیں جن کو خداوند کریم نے نبوت کے لیے منتخب فرمایا۔ لیکن عبدیت کے لقب سے ذکر کیا اور بندگی ہی کسی بندہ کے لیے عظیم ترین صفت ہے۔ حتیٰ کہ نبی کی عبدیت کو نبوت اور رسالت سے افضل سمجھا جاتا ہے کیونکہ عبدیت کا تعلق اللہ کی نسبت ہے اور رسالت دوسرے لوگوں کی نسبت سے ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کے لیے قرآن مجید میں "**عبـــده**" کا لفظ لایا گیا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ اضافت خود اپنی طرف کروا کر بندہ کی تشریف و تعظیم کرتے ہیں تو یہاں بھی اضافت تشریفی اور تعظیم کے لیے ہے۔ واضح رہے کہ ہر جگہ اضافت تعظیم کے لیے نہیں ہوتی۔ یہاں قرائن خارجہ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ تشریفی ہے ورنہ **ثم بعثنا علیهم عبادا لنا اولی بأس شدید** (الایۃ) میں عباد سے مراد بخت نصر اور اس کے ساتھی ہیں جنہوں نے بیت المقدس کو ڈھایا تھا تو وہاں پر اضافت تعظیم کے لیے نہیں ہے۔

خطبہ میں تشہد: بعض حضرات نے امام ترمذیؒ کے اس خطبہ پر یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ اس میں تشہد موجود نہیں ہے۔اور خود نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ کل خطبة ليست فيها تشهد فهي كاليد الجذمیٰ۔لہٰذا یہ خطبہ ناقص ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں خطبہ سے مراد ہر خطبہ نہیں بلکہ خطبہ نکاح مراد ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ امام ابوداؤدؒ نے یہ حدیث کتاب النکاح میں ذکر کیا ہے۔تو گویا ان کے نزدیک بھی یہاں خطبہ نکاح مراد ہے۔علاوہ ازیں ممکن ہے مصنفؒ نے زبانی طور پر تشہد ادا کیا ہو یا دل میں پڑھا ہو لہٰذا اشکال باقی نہیں رہے گا۔

شیخ و حافظ کی اصطلاحات: قال الشيخ الحافظ(۱): شیخ لغت میں عمر رسیدہ شخص کو کہتے ہیں لیکن علماء کی اصطلاح میں اس شخص پر بھی بولا جاتا ہے جو کسی فن میں ماہر، کامل اور قابل تقلید ہو۔ اگر چہ عمر کے لحاظ سے نوجوان ہو۔بعض لوگوں نے حدیث کی تدریس کے لیے معمر ہونے کو ترجیح دی ہے۔ لیکن خود محدثین عظام کے عمل سے اس کی تردید ہوتی ہے،اور حافظ سے بھی ہمارے ہاں کی مروجہ اصطلاح کے مطابق حافظ قرآن مراد نہیں بلکہ حافظ الحدیث مراد ہے جو کہ علم اصولِ حدیث کی اصطلاح میں علم حدیث اور روایت حدیث سے شغف رکھنے والے حضرات کے ایک خاص مرتبہ پر بولا جاتا ہے۔چنانچہ محدثین کے ہاں حافظ الحدیث وہ شخص ہے جسے ایک لاکھ احادیث کی متون اور اسانید و علل از بر ہوں اسے امام بھی کہا جاتا ہے اور یہاں یہ مراد ہے(۲)۔

ابوعیسیٰ محمد بن سورة الترمذیؒ: اس مقام پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ امام ترمذیؒ نے خود شیخ اور حافظ کہہ کر خودستائی اور فخر و تکبر کا ارتکاب نہیں کیا ہے۔ بلکہ درحقیقت تلامذہ کے اعتماد کو حاصل کرنے کے لیے اور تحدیث بالنعمة کے طور پر حقیقتِ حال کا اظہار فرمایا ہے جو کہ بوقتِ ضرورت واجب بھی ہوتا ہے۔

---

(۱) قال کے فاعل کے بارے میں بعض اہل علم کی رائے یہ ہے کہ مصنفؒ خود اس کا فاعل ہے۔اور بعض کا کہنا ہے کہ اس کا فاعل آپؒ کا ایک شاگرد ابوالعباس محمد بن محبوب المروزی المتوفی ۳۴۶ھ ہیں۔(مختار)

(۲) حضرت تھانویؒ نے فرمایا ہے کہ آج کل حافظ وہ شخص ہے جس کا احادیث کے ساتھ اتنا لگاؤ اور شغف ہو کہ جب بھی وہ کسی حدیث کو سنے تو اس حدیث کے بارے میں اسے صحیح اور ضعیف ہونے کا پہچان ہو سکے اور اس کو ایک ہزار سے زائد احادیث یاد ہوں۔(مختار)

جس طرح کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر بننے سے قبل مصر کے بادشاہ ریان کے سامنے اپنی صلاحیتیں اور کمالات گن گن کر پیش کی تھیں۔یا پھر امام ترمذیؒ نے تفاؤلاً یہ لقب اختیار کئے۔ تا کہ یہ کمالات حاصل ہو جائیں۔آج کل بھی اپنے ساتھ ڈاکٹر، پروفیسر، انجینیر، پی ایچ ڈی یا فاضل تعارف کے لئے لکھا جاتا ہے نہ کہ تعریف اور خودستائی کیلئے۔

جبکہ بعض شراح(۱) کے خیال میں اس بات کا احتمال ہے کہ امام ترمذیؒ کے بعض شاگردوں نے جوان کی کتابوں کے راوی اور ناقل ہیں ان القاب کا اضافہ کر دیا ہے اور خود امام ترمذیؒ نے کوئی خودستائی نہیں کی۔واللہ اعلم۔

ابوعیسیٰ کنیت کا حکم: ابوعیسیٰ اس کنیت کو اختیار کرنے سے حدیث میں بھی ممانعت آئی ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کی طرف باپ کے منسوب ہونے کی وجہ سے یہ کنیت رکھنا مکروہ بتایا گیا ہے۔رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنے فرمان میں اس علت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا انّ عیسیٰ علیہ السلام لا اب لہ (۲). لیکن ملا علی قاریؒ نے کہا ہے کہ ابتداءً ابوعیسیٰ کنیت رکھنا اگرچہ مکروہ ہے لیکن کسی شخص کو اگر اس کنیت سے شہرت حاصل ہو جائے تو جائز ہوگی۔اس پر علماء کا اجماع ہے بلکہ خود نبی کریم ﷺ نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو اس کنیت سے پکارا ہے۔ لہٰذا کراہت کا قول درست نہیں البتہ ابتداءً کنیت رکھنے میں چونکہ اس لفظ سے ایک فاسد معنیٰ کا توہم ہوتا ہے لہٰذا خلاف اولیٰ ہوگا۔

---

(۱) جمع الوسائل ج ۱ ص ۸

(۲) المواہب الدنیہ ص ۵

۱۔ باب ماجاء فی خلق رسول اللہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے حلیہ مبارک کے بارے میں

<u>لفظ باب کا اعراب:</u> لفظ باب مشہور ترکیب کے مطابق مرفوع ہے اور عموماً اسے ماجاء الخ کی طرف مضاف کر کے پڑھا جاتا ہے۔اس طرح یہ خبر ہو کر اس کی مبتداء محذوف ہوگی یعنی "ھذا باب ماجاء الخ" یا پھر مبتدا بن کر اس کیلئے خبر مقدر ماننا جائیگا اور تقدیر عبارت یوں ہوگی "باب ما جاء الخ ھذا الکلام الآتی"

دوسرا احتمال یہ ہے کہ باب یعنی تنوین کے ساتھ مرفوع پڑھا جائے اس طرح یہ لفظ مبتداء محذوف کی خبر ہوگی۔یعنی "ھذا باب" اور مابعد کا کلام یعنی ماجاء مستأنف کلام ہوگا۔

تیسرا احتمال وقف کا ہے یعنی باب موقوف پڑھا جائے اس تقدیر پر محل من الاعراب میں واقع نہیں ہوگا۔علامہ کرمانیؒ نے اس احتمال کو بھی جائز کہا ہے۔

<u>خَلق اور خُلُق کا فرق:</u> خَلق بفتح الخاء اور خُلُق بضم الخاء و اللام میں معنی کے لحاظ سے فرق ہے۔اوّل الذکر دراصل ایجاد، ابداع اور پیدا کرنے کے معنی میں مستعمل ہے نیز ظاہری صورت وضع قطع اور طبعی ھیئت پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔جن کا ادراک بصارت کے ذریعے ہوتا ہے۔

جبکہ مؤخر الذکر کا اطلاق عموماً باطنی سیرت یعنی عادات و اخلاق اور ان صفات و معانی پر ہوتا ہے جو آنکھوں اور بصارت کے ذریعے معلوم نہ ہوں بلکہ بصیرت سے معلوم ہو رہی ہوں۔یہاں پر لفظ خَلق خاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔کیونکہ اس باب میں جو چودہ احادیث مذکور ہیں وہ اصالۃً آپ ﷺ کی ظاہری صورت اور شکل وہیئت سے متعلق ہیں۔

<u>آپ ﷺ کے کمالات باطنی اور محاسن ظاہری:</u> نبی کریم ﷺ باطنی کمالات کے ساتھ ساتھ ظاہری محاسن کے بھی جامع تھے۔اگرچہ ان محاسن کا کما حقہ ادراک عام لوگوں کو نہیں ہوتا تھا۔لیکن کائنات میں آپ ﷺ سے زیادہ حسن کا مالک کوئی بھی نہیں تھا۔امام قرطبیؒ کا قول ہے کہ اگر آپ ﷺ کے تمام محاسن ظاہر ہو جاتے تو صحابہؓ آپ ﷺ کو دیکھنے کی تاب نہ لا سکتے۔لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان احادیث میں جو کچھ بیان ہے یہ صرف وہ ہیں جو صحابہ کو نظر آیا۔جبکہ آپ ﷺ کا حقیقی حسن اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔حتیٰ

کہ یہاں پر ہر مبالغہ حقیقت سے کم تر ہے۔ کیونکہ ان کے اوصاف جمیلہ سے الفاظ عاجز ہیں خود صحابہؓ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں جیسا کہ شمائل ترمذی میں آگے آرہے ہیں۔

یہی وہ بات ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔

لواحی زلیخا لورأین جبینہ　　　لاثرن بالقطع القلوب علی الید

ترجمہ: اگر حضرت یوسفؑ کی محبت کی وجہ سے زلیخا کو ملامت کرنے والی عورتیں میرے محبوب کی جبین حسین کو دیکھ لیتیں تو ہاتھوں کی بجائے دل کو کاٹ دینے کو ترجیح دیتیں۔

اور کیوں نہ ہو جب حضرت عائشہؓ سے سوئی گم ہو جاتی ہے تو رخ انور کی روشنی میں وہ مل جاتی ہے۔

مصنف شمائل ترمذی میں نبی کریم ﷺ کے اخلاق، سیرت اور صفات کے مختلف پہلوؤں کو روایات کی روشنی میں اجاگر کرتے ہیں۔ لیکن ظاہری اور صوری محاسن کو باطنی محاسن پر اس لیے مقدم کیا کہ ایک تو ادنیٰ سے اعلیٰ کو ترقی ہو، دوسری بات یہ کہ اس میں ترتیب وجود کے طرف بھی اشارہ ہے۔ چنانچہ جسمانی وجود صورت وہیئت کے بعد ہی اخلاق اور سیرت کا نمبر آتا ہے۔ علاوہ ازیں ظاہری صورت باطن کی ترجمان ہوتی ہے، اسلئے کہتے ہیں کہ **الظاھر عنوان الباطن**. چنانچہ آپ نے خَلق کو مقدم ذکر کیا۔

(۱) أخبرنا ابو رجاء قتیبة بن سعید عن مالک بن أنسؓ عن ربیعة بن أبی عبدالرحمٰن عن أنس بن مالک أنّه سمعه یقول کان رسول اللّٰہ ﷺ لیس بالطویل البائن ولا بالقصیر ولا بالابیض الامھق ولا بالآدم ولا بالجعد القطط ولا بالسبط بعثه اللّٰہ تعالیٰ علی رأس اربعین سنة فاقام بمکّة عشر سنین وبالمدینة عشر سنین فتوفاہ اللّٰہ تعالیٰ علی رأس ستین سنة و لیس فی رأسه ولحیته عشرون شعرة بیضاء(۱)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نہ بہت لمبے قد کے تھے نہ

---

(۱) صحیح البخاری ۱/۵۰۲ کتاب المناقب باب صفة النبی ﷺ، صحیح مسلم ۲/۵۸ کتاب الفضائل باب فی صفة شعر النبی ﷺ وصفاته الخ (مختار)

پستہ قد کے نہ خالص (چونہ کی طرح) سفید تھے اور نہ بالکل گندم گوں (سانولے)
تھے۔ آپ ﷺ کے بال مبارک نہ زیادہ گھنگریالے تھے نہ بالکل سیدھے تھے۔
چالیس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو نبوت بخشی۔
پھر دس برس مکہ میں رہے اور مدینہ میں بھی دس برس قیام فرمایا۔ پھر ساٹھ سال کی عمر
میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو وفات دی۔ اس وقت آپ ﷺ کے سر مبارک اور
داڑھی مبارک میں بیس بال بھی سفید نہ تھے۔

<u>حدّثنا اور اُخبرنا میں فرق:</u> ادائے حدیث کے متعدد صیغے مثلاً حدثنا، أخبرنا، اور أنبانا وغیرہ ہیں۔ یہاں پر أخبرنا ذکر ہے جبکہ بعض نسخوں میں حدثنا کا لفظ آتا ہے۔ یہ دونوں لفظ لغت میں ہم معنی ہیں اور اصطلاح میں بھی متقدمین محدثین مثلاً امام مالکؒ اور امام بخاریؒ کے نزدیک ایک ہیں۔ جبکہ امام ابن جریجؒ، امام شافعیؒ اور بعض دیگر حضرات نے ان دونوں لفظوں میں فرق بتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ استاد حدیث کی قراءت کرے اور شاگرد سنے تو حدثنا کا لفظ مستعمل ہوتا ہے اور اگر شاگرد استاد کے سامنے حدیث پڑھ کر سنائے تو أخبرنا کے لفظ سے روایت کی جاتی ہے۔ تیسرا لفظ أنبانا کا ہے جو عموماً اس موقع پر بولا جاتا ہے جہاں قرأت نہ ہو بلکہ شیخ نے صرف اجازت دی ہو۔

پھر فرق کی صورت میں تحدیث یعنی شیخ کی قرأت بہتر ہے یا اخبار یعنی شاگرد کی قرأت۔ اس میں اختلاف ہے امام ابوحنیفہؒ اور بعض آئمہ نے مؤخر الذکر کو ترجیح دی ہے۔ جبکہ دیگر اہل عراق سماع من الشیخ یعنی تحدیث کو اولیٰ کہتے ہیں۔ امام بخاریؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک دونوں برابر ہیں۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ اس اختلاف کو اختلاف زمانہ وحالات پر محمول کیا جائے۔ متقدمین کے زمانہ میں طلبہ کے حضور اور کمال توجہ کی وجہ سے شیخ کی قرأت کو ترجیح دی جاتی تھی کیونکہ نبی کریم ﷺ اور صحابہؓ کا بھی ادائے حدیث کا طریقہ یہی تھا جبکہ بعد میں طلبہ میں کمال توجہ کے فقدان کے سبب ان سے حدیث پڑھوا کر شیخ تصحیح کیا کرتا تھا۔ حضور ﷺ کی مجلس میں تو طلبہ کے حضور کی حالت اور تھی۔ حضرت عروہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جب آپ ﷺ بات کرتے تو صحابہ ایسے ساکن اور متوجہ ہوتے تھے کأنّ علی رؤوسھم الطیر گویا سر پر پرندے بیٹھے ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ: اس حدیث کے راوی ابوحمزہ انس بن مالک بن نضر انصاری خزرجیؓ ہیں۔آپ ہجرت سے دس سال قبل مدینہ میں پیدا ہوئے۔والدہ ام سلیمؓ عطر بیچا کرتی تھیں۔جب اس میں نبی کریم ﷺ کا پسینہ ملایا تو اس کی خوشبو میں ایک خوشگوار اضافہ ہوا۔ہجرت کے بعد حضرت انسؓ کی والدہ ان کو لے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ یہ تیرا خادم ہے۔ اس کیلئے دعا فرمائیں۔آپ ﷺ نے دعا فرمائی **اللھم بارک لہ فی مالہ وولدہ واطل عمرہ واغفرلہ.**

اے اللہ اس کے مال واولاد میں برکت دے۔اس کی عمر دراز فرما اور اس کی بخشش فرما۔

حضرت انسؓ اخیر عمر میں فرمایا کرتے تھے کہ تین دعائیں تو میری زندگی ہی میں قبول ہو چکی ہیں۔ چنانچہ اپنے صلبی اولاد میں سے اٹھانوے کو تو دفن کر چکا ہوں۔

اور مال ایسا ملا کہ میرے باغ میں پھل سال میں دو مرتبہ لگتے ہیں۔اور زندگی ایسی ملی کہ اس سے تنگ آچکا ہوں، جبکہ چوتھی دعا یعنی مغفرت کی قبولیت کی توقع ہے۔آپؓ کی اولاد کی تعداد سو سے متجاوز تھی۔ صرف طاعون جارف میں آپ کی اولاد میں اسی ۸۰ افراد کا انتقال ہوا تھا۔ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ سو بچے پیدا ہوئے جن میں نرینہ اولاد کی تعداد اٹھتر ۷۸ تھی عمر بھی سو سال سے متجاوز تھی۔حضرت عمرؓ کے زمانہ میں فقہ کی تعلیم دینے کیلئے بصرہ تشریف لے گئے۔چنانچہ بہت سے ائمہ نے آپؓ سے استفادہ کیا۔اور وہیں ۹۳ھ میں وفات پائی (۱)۔بصرہ میں وفات ہونے والے صحابہ میں آپ آخری صحابی تھے۔

نبی کریم ﷺ کی قد و قامت: حلیہ کی تفصیل میں سب سے پہلے حضور اقدس ﷺ کے قد مبارک کا بیان ہے۔راوی فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ زیادہ لمبے قد والے نہیں تھے۔بائن کے معنی الگ اور ممتاز کے بھی ہوتے ہیں۔اور بعید کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔لہٰذا طویل بائن کے معنی ہیں۔اتنا لمبا جو دوسروں سے الگ اور ممتاز نظر آئے۔یا وہ جس کے اعضاء ایک دوسرے سے دور دور ہوں۔

---

(۱) جمع الوسائل میں تاریخ وفات ۷۱ھ لکھی ہے جو درست معلوم نہیں ہوتی۔شاید ناسخ نے احدیٰ و تسعین کی جگہ غلطی سے احدیٰ و سبعین لکھدیا ہو۔ورنہ آپ کی تاریخ وفات میں ۹۰ھ، ۹۱، ۹۲، ۹۳ اور ۹۵ ہجری کے مختلف اقوال تو پائے گئے ہیں ۷۱ھ کا قول جمع الوسائل کے سوا کہیں بھی نہیں ملتا۔بلکہ خود ملا علی قاریؒ نے مرقات میں آپ کی تاریخ وفات ۹۳ھ لکھی ہے اور یہی قول راجح بھی ہے۔دیکھیں مرقات شرح مشکوٰۃ ج۱،ص ۱۴۴ (اصلاح الدین)

ولا بالقصیر "لا" سابقہ نفی کی تاکید کے لیے ہے۔اور قصیر پستہ قد کو کہتے ہیں۔گویا آپ ﷺ پستہ قد بھی نہیں تھے۔لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ آپ میانہ قد شخص تھے۔جس طرح کہ آگے دوسری احادیث میں اس کی تصریح موجود ہے۔لیکن بعض دیگر احادیث میں یہ بھی مروی ہے۔آپ ﷺ طول کی طرف مائل اور قریب تھے یعنی میانہ قد سے قدرے اونچے تھے۔اسلئے جہاں روایات میں مربوع (میانہ قد) کا لفظ آتا ہے اس سے مراد میانہ قد کے قریب ہے بالکل میانہ قد مراد نہیں۔حضرت براء بن عازبؓ کی حدیث میں اس کی تصریح ہے۔اور حضرت انسؓ کی اس حدیث میں بھی اس بات کی طرف اشارہ موجود ہے کیونکہ اس میں قصیر کی تو مطلقاً نفی کی گئی ہے۔لیکن طویل کی نفی مطلقاً نہیں بلکہ طویل بائن کی نفی کی گئی ہے(۱)۔

<u>چہرہ مبارک کا رنگ:</u> **ولا بالابیض الا مہق ولا بالآدم:** **امہق مہق** سے صفت مشبہ ہے۔جو خالص سفیدی کو کہتے ہیں جسمیں نورانیت اور ملاحت نہ ہو جیسا کہ بعض گوروں یا برص کے مریضوں کا مکروہ رنگ ہوتا ہے۔اور اُدمۃ سخت گندمی رنگ کو کہتے ہیں۔جو سیاہی کی طرف مائل ہو۔خلاصہ یہ ہوا کہ آپ ﷺ کا رنگ بالکل سفید اور تیز گندمی نہیں تھا۔بلکہ ہلکا گندمی سفید رنگ تھا۔بیہقی کی روایت میں "کان ابیض بیاضہ الی السمرۃ" کے الفاظ آئے ہیں۔ اس حدیث سے اگلی حدیث میں آپ کو اسمر اللون کہا گیا ہے۔وہاں بھی دراصل سخت سفید کی نفی مقصود ہے ورنہ آپ گندمی رنگ کے نہیں تھے بلکہ پندرہ صحابہؓ نے آپ ﷺ کے رنگ کو سفید بتایا ہے(۲)۔لیکن وہ سفید مراد ہے جس میں سرخی کے خلط کیوجہ سے ملاحت ہو۔بعض روایات میں "ازھر اللّون" کے الفاظ آئے ہیں یعنی رُخ انور میں تجلی اور نورانیت ہوا کرتی تھی۔اور جس روایت میں "کان أبیض کانّما صیغ من فضّۃ" کے الفاظ آئے

---

(۱) مگر اس کے باوجود آپ ﷺ کا معجزہ تھا کہ مجمع میں کوئی بھی جتنا لمبا آدمی ہوتا تھا آنحضرت ﷺ اس سے کچھ لمبے معلوم ہوتے تھے۔کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ

پستہ قد نہ لامبے کوئی مفہوم ہوتے ہیں   میانہ قد سے کچھ نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں
مگر مجمع میں ہوتے تھے جب بھی حضرت والا   نمایاں اور اونچا ہوتا تھا سر و قد بالا (مختار)

(۲) جمع الوسائل ص ۱۷،اور اسی کثرۃ روایت کی وجہ سے علامہ مناویؒ وغیرہ نے تطبیق کی بجائے سفید رنگ بیان کرنے والی احادیث کو راجح اور گندمی رنگ بیان کرنے والی احادیث کو مرجوح قرار دیا ہے۔(مختار)

ہیں اس سے بھی یہی مباحث مراد ہونی چاہیے۔

بال کھلے مگر قدرے گھنگریالے تھے: ولا بالجعد القطط ولا بالسبط. جعودۃ گھنگریالے پن کو کہتے ہیں اور قطط جعد کی صفت ہے۔اس سے مراد سخت گھنگریالے ہونا ہے۔جیسے افریقہ کے حبشی لوگوں کے بال ہوتے ہیں۔جبکہ سبط سین مفتوحہ اور باء ساکن یا مفتوح یا مکسور کے ساتھ کھلے ہموار بالوں کو کہتے ہیں۔جن میں سرے سے شکستگی اور موڑ نہ ہو۔لہٰذا آپ ﷺ کے بالوں کی کیفیت یہ ہوئی کہ کھلے ہونے کے ساتھ ساتھ قدرے گھنگریالے بھی تھے نہ بالکل ہموار اور نہ زیادہ گھنگریالے۔حضرت انسؓ کی ایک اور روایت میں آیا ہے کہ کان شعرہ بین شعرین لارجل سبط ولا جعد (بیجوری)

علامہ زمخشریؒ کہتے ہیں کہ وفی العرب جعودۃ وفی العجم سبوطۃ۔تو گویا اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عرب وعجم میں محبوب بنانے کیلئے دونوں خوبیوں سے نوازا۔

بعثت کے وقت عمر: بعثہ اللّٰہ علی راس اربعین سنۃ: چالیس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو رسالت عطا فرمائی۔محدثین کے نزدیک چالیس سال مکمل ہونے کے بعد آپ ﷺ کو نبوت عطا کی گئی۔اس لیے رأس اربعین سے مراد چالیسویں سال کا آخری سرا ہے۔نہ کہ ابتدائی سرا۔لیکن اس میں یہ اشکال ہے کہ ابتدائی وحی رمضان میں نازل ہوئی جبکہ آپ ﷺ کی ولادت ربیع الاول میں ہوئی تھی۔اسلئے بعثت کے وقت یقیناً آپ ﷺ کی عمر چالیس سال نہ تھی۔اس اشکال کی مختلف توجیہات ہیں بہترین توجیہہ یہ ہے کہ راوی نے کسر کا اعتبار نہیں کیا ہے ورنہ درحقیقت آپ ﷺ کی عمر ساڑھے چالیس یا ساڑھے انتالیس برس تھی۔علامہ قرطبیؒ نے اسے راجح کہا ہے۔لیکن علامہ ابن حجرؒ نے مسعودیؒ اور علامہ ابن عبدالبرؒ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت بھی ولادت کی طرح ربیع الاول ہی میں ہوئی تھی اور اس قول کو اصح الاقوال بھی کہا ہے۔اس تقدیر پر چالیس سال کی عمر میں بعثت کا قول حقیقت پر محمول ہوگا۔(۱)

---

(۱) احقر کے خیال میں یہ توجیہ بھی ممکن ہے کہ ٹھیک چالیس کی عمر میں یعنی ربیع الاول کے مہینے میں آپ ﷺ پر رؤیائے صادقہ کے نزول کا دور شروع ہوا ہو۔اور پھر چھ ماہ بعد رمضان المبارک میں پہلی وحی اقرأ باسم ربک (الآیۃ) نازل ہوئی ہو اور رؤیائے صادقہ کو بھی بعثت کا زمانہ شمار کرلیا گیا ہو واللہ اعلم بالصواب (اصلاح الدین)

بعض روایات میں تریالیس (۴۳) سال کا بھی ذکر ہے۔ علامہ ملاعلی قاریؒ نے اس کی توجیہہ یہ کی ہے کہ نبوت چالیس سال بعد اور رسالت تریالیس سال بعد عطا کی گئی۔ اسی طرح رسالت نبوت کے تین سال بعد ملی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلی وحی چالیس سال کی عمر میں آئی ہو اور پھر تقریباً تین سال فترۃ الوحی کے بعد تریالیس سال کی عمر میں تتابع سے وحی آئی ہو۔اور فترۃ وحی کے زمانہ کو بعثت میں شمار نہ کیا گیا ہو۔

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا قیام: فاقام بمکۃ عشر سنین: جناب نبی کریم ﷺ نبوت کے بعد مکہ مکرمہ (زادھا اللہ شرفاً) میں دس برس ٹھہرے مگر صحیح روایات کے مطابق آپ ﷺ نبوت کے بعد تیرہ برس تک مکہ میں رہے۔اس تعارض کو دفع کرنے کیلئے بعض شرّاح نے زیرِ نظر حدیث کو مرجوح قرار دیکر تیرہ سال والی روایات کو متعدد وجوہ کی بناء پر راجح کہہ دیا ہے۔لیکن بعض حضرات نے تاویل کا سہارا لیکر دونوں رواتیوں میں تطبیق کرتے ہوئے کہا ہے کہ چالیس سال کی عمر میں آپ ﷺ کو نبوت اور تین سال بعد رسالت ملی۔یوں رسول ہونے کی حیثیت سے آپ ﷺ مکہ میں دس سال رہے۔لیکن اس تاویل کو مدنظر رکھ کر بھی بعد کی عبارت یعنی ساٹھ سال کی عمر میں وفات کی بات پر اشکال باقی رہتا ہے۔اسلئے یہاں بھی کہنا بہتر ہوگا کہ راوی نے کسر کا اعتبار نہ کر کے دس سال کا ذکر کیا ہے۔اور ایک توجیہہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ نبوت کے بعد قیام مکہ کے ابتدائی تین سال مخالفت اور تکالیف سے خالی ہونے کیوجہ سے باقی مکی زندگی کی طرح نہیں تھے لہٰذا انہیں عہد نبوت میں شمار نہیں کیا گیا۔

وبالمدینۃ عشر سنین: نبی کریم ﷺ بارہ ربیع الاول کو سوموار کے دن مدینہ منورہ پہنچے اسی سال آپ ﷺ نے ہجری سنِ تاریخ کے اجراء کا حکم دیا اور حضرت عمرؓ نے محرم کے مہینے کو پہلا مہینہ قرار دیکر تاریخ کا اجراء کیا۔اور مدینہ منورہ میں تشریف آوری کے ٹھیک دس سال بعد ۱۲ ربیع الاول کو آپ ﷺ وفات پائے۔جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

حضور ﷺ کی عمر مبارک: علی رأس ستین سنۃ جناب نبی کریم ﷺ کی عمر میں روایات مختلف ہیں۔اس مقام پر ساٹھ سال کا ذکر ہے۔بعض صحابہ نے پینسٹھ سال اور کچھ نے تریسٹھ سال عمر بتائی ہے۔

مؤخر الذکر قول کو صحیح ترین قول قرار دیا گیا ہے(۱)۔ جبکہ اس حدیث میں یہ تاویل کی جاتی ہے کہ یہاں راوی نے کسر کا الغاء کر کے اس کا اعتبار نہیں کیا ہے جبکہ پینسٹھ سال والے قول کے بارے میں شراح حدیث کہتے ہیں کہ راوی نے ولادت اور وفات کے دو سال مستقل گن کر اصل عمر میں دو سال کا اضافہ کر دیا ہے۔ جبکہ یہ دونوں سال پورے سال نہیں تھے۔

تا حیات حسنِ زلف کی بقاء: **ولیس فی راسه ولحیته عشرون شعرة بیضاء** وفات کے وقت حضور اکرم ﷺ کے سر اور داڑھی میں بیس بال سفید نہیں تھے۔ حضرت انسؓ کی دیگر روایات میں ان سفید بالوں کی تعداد گیارہ، چودہ، سترہ یا اٹھارہ مذکور ہے۔ ابن عمرؓ کی حدیث میں بیس کے قریب بتائے گئے ہیں۔

اس کی تحقیق اور مزید تفصیل تو ریش مبارک کے باب میں آجائے گی۔ لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ سفید بال نور اور وقار ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے احادیث میں ان کی مدح فرمائی ہے پھر نبی کریم ﷺ اس منقبت سے محروم کیوں رہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ سفید بال واقعۃً وقار اور قابل لحاظ حیثیت پر دلالت کرتے ہیں لیکن جوان جذبات کے حامل افراد اور بالخصوص عورتوں کی نظر میں بالکل سفید بال ناپسندیدہ ہوتے ہیں۔ اور شاید اسی حکمت کو مد نظر رکھ کر نبی کریم ﷺ نے تغییر شیب یعنی سفید بالوں کو رنگنے کا حکم دیا ہے تاکہ حسن اور نفاست برقرار رہے۔ **ولم یشنهُ اللّٰه بالشیب** (۲)۔ اور چونکہ نبی کریم ﷺ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر قسم کے قابل نفرت احوال و کیفیات سے برأت اور ہر قسم کی محبوبیت عطا فرمائی تھی اس لیے آپ ﷺ کو بالوں میں سفیدی بھی محض علامتی طور پر ظاہر کر دی تاکہ ہدایت میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے اور کوئی شخص بھی طبعی نفرت کا بہانہ نہ کر سکے۔ نہ ازواج مطہرات کی طبیعت میں ناپسندیدگی آسکے۔

---

(۱) امام بخاریؒ نے حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے أنّ النبیّ ﷺ توفی وهو ابن ثلاث ستین (صحیح بخاری ۱/۱۵۰۱) اور اسی پر علماء کا اتفاق ہے (مختار)

(۲) مگر بالوں یا داڑھی کا سفید ہونا کوئی عیب نہیں بلکہ وقار کی علامت ہے ایک روایت میں آتا ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کے بال سفید ہوئے تھے آپؑ نے جب دیکھا تو حیران ہو کر اللہ تعالیٰ سے استفسار کیا تو اللہ جل شانہ نے فرمایا یہ تو مؤمن کی وقار ہے تو اس پر آپؑ نے یہ دعا کی اللّٰھمّ زدنی وقارا کہ اے اللہ میرے اس وقار میں اضافہ فرما۔ (مختار)

پھر نبی کریم ﷺ سے نفرت یا ناپسندیدگی میں کفر کا خطرہ بھی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو سفید بالوں کی طرح دیگر عیوب سے بھی محفوظ رکھا۔ حتیٰ کہ علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص کہے کہ نبی کریم ﷺ کالے تھے تو کافر ہو جائے گا۔

(۲) حدثنا حمید بن مسعدة البصریّ ثنا عبدالوهاب الثقفیّ عن حمید عن أنس بن مالک قال کان رسول الله ﷺ ربعة و لیس بالطویل و لا بالقصیر حسن الجسم و کان شعره لیس بجعد و لا سبط اسمر اللون اذا مشیٰ یتکفأ (۱)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ میانہ قد تھے نہ زیادہ لمبے اور نہ پستہ قد۔ خوبصورت معتدل بدن والے تھے آپ ﷺ کے بال نہ بالکل گھنگریالے تھے نہ بالکل سیدھے۔ نیز آپ ﷺ گندمی رنگ کے تھے جب راستہ پر چلتے تو آگے کی طرف جھکے ہوئے چلتے تھے۔

حمید الطویل کون تھے؟ عن حمید عن انسؓ حضرت انسؓ سے روایت کرنے والے تابعی کا نام حمید ہے۔ لیکن حمید الطویل کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ علامہ مناویؒ نے اس کے نام کے بارے میں آٹھ دیگر اقوال بھی ذکر کئے ہیں (۲)۔ الطویل کے نام سے شہرت کی وجہ بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اگر چہ یہ شخص خود لمبے نہیں تھے لیکن اس کے ہاتھ اتنے لمبے تھے کہ کسی مردے کے ساتھ کھڑے ہو کر ہاتھ پھیلاتے تو ایک ہاتھ میت کے سر اور دوسرا اس کے پاؤں سے جا لگتا تھا۔ اور بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ چونکہ اس کا ایک دوسرا پڑوسی بھی اس کا ہم نام تھا اور وہ اس کی نسبت زیادہ پستہ قد تھا لہٰذا حضرت انسؓ کے اس شاگرد کو حمید الطویل اور اس دوسرے شخص کو حمید القصیر کہا جانے لگا۔ حمیدؒ کی وفات بھی نماز میں کھڑے کھڑے ہوئی تھی۔ ۱۴۲ھ یا ۱۴۳ھ میں وفات پائی۔

---

(۱) جامع ترمذی ۱/۳۰۳ کتاب اللباس باب ماجاء فی الجمة واتخاذ الشعر، شرح السنة للبغوی ۱۳/۲۲۰ باب صفة النبی ﷺ رقم حدیث ۳۶۴۰ (مختار)

(۲) تیرویہ، دارویہ، طرحان، مہران، عبداللہ، عبدالرحمٰن، مخلد وغیرہ (مختار)

قد کا بیان: کان رسول اللہ ﷺ ربعۃً(۱)،ربعۃ راءمفتوحہ کے ساتھ مربوع کے معنی میں ہے۔جس کا معنی میانہ قد کے ہوتے ہیں راوی خود اس لفظ کی تشریح لیس بالطویل و لا بالقصیر سے کر رہے ہیں۔لیکن یہ بات،ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ آپ ﷺ میانہ قدی سے قدرے طول کی طرف مائل تھے۔

حسن الجسم قد کا حسن بیان کرنے کے بعد تعمیم کرتے ہیں کہ ہر لحاظ سے آپ حسین تھے۔حسی اور عقلی اعتبار سے آپ ﷺ کا جسم حسین اور جاذب نظر تھا۔اور رنگ،بدن کی نرمی اور ساخت کے لحاظ سے تمام بدن میں حسن واعتدال تھا۔گویا نہ زیادہ موٹے تھے نہ بالکل کمزور بلکہ سڈول جسم،متوازن اور متناسب اعضاء کے مالک تھے۔اور اگر چہ حسن میں ہر علاقہ کے لوگوں کا معیار مختلف ہوتا ہے لیکن تناسب اعضاء سب کے ہاں قدر مشترک ہے۔جبکہ حسن صورت تناسب اعضاء کا نام ہے۔

لون أسمر کی توجیہ: أسمر اللون آپ ﷺ کے رنگ کے بارے میں پچھلی حدیث میں تفصیل گذر چکی ہے یہاں اسمر کہا گیا ہے جسکے معنی ہیں سانولا یعنی سیاہی مائل سرخ۔اب صحیح روایات کے مطابق یہ روایت حقیقت سے بعید لگتی ہے اس لئے بعض لوگوں نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ یہاں بدن کے ان حصوں کے رنگ کا بیان ہے جو دھوپ میں کھلے رہنے کی وجہ سے سیاہی مائل ہو چکے تھے جبکہ آپ ﷺ کے بدن کا اصل رنگ سفید تھا اور بعض لوگوں کے خیال میں یہاں لفظ میں تصحیف ہوگئی ہے اصل میں أزھر اللون یعنی پھول جیسا چمکدار رنگ والے تھے جبکہ علامہ ابن جوزیؒ نے اس روایت ہی کو غیر صحیح قرار دیا ہے۔

باوقار چال کی کیفیت: اذا مشیٰ یتکفّا یعنی چلتے ہوئے آگے کی طرف جھکے ہوئے ہوتے تھے(۲)۔ جیسا کہ دوسری روایات میں آتا ہے کانّما ینحطّ من صبب یعنی گویا آپ اترائی میں اتر رہے ہوں۔ یہ شجاعت،ہیبت اور وقار کی رفتار ہوتی ہے۔بعض لوگوں نے اس جملہ کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ آپ ﷺ جب

---

(۱)ربعۃ کی جمع رَبَعَات،رَبْعَات اور مربوعات آتی ہے،جس کا معنی ہے المتوسط بین الطویل و القصیر (مناوی ص۱۶) یہاں آنحضرت ﷺ کیلئے مؤنث کا صیغہ باعتبار نفس استعمال کیا گیا ہے کہا جاتا ہے رجل ربعۃ و امراۃ ربعۃ (مختار)

(۲)جدید حکماء اطباء نے اس کے کئی فوائد بھی بیان کئے ہیں (۱) جوڑوں میں درد نہیں ہوگا (۲) سفر میں تھکاوٹ محسوس نہیں ہوگی (۳) نگاہ تیز ہوگی (۴) یہ بات یورپین سیاحوں کی کتابوں میں ملتی ہے کہ لمبے سفر میں پاؤں کے پنجوں پر وزن ڈالو اور قدرے جھک کر چلو اس طرح سفر جلدی طے ہو جائے گا (مختار)

چلتے تو سرعت کیساتھ چلتے تھے۔اور بعض شرّاح کے نزدیک معنی یہ ہے کہ چلتے ہوئے قوت کیساتھ قدم اُٹھاتے تھے تینوں تشریحات اپنی جگہ صحیح ہیں آپ کی رفتار کے بارے میں مستقل باب میں تفصیل آجائے گی

(۳) حدّثنا محمّد بن بشّار یعنی العبدیّ ثنا محمّد بن جعفر ثنا شعبة عن أبی اسحٰق قال سمعت البراء بن عازب یقول کان رسول اللّٰہ ﷺ رجلاً مربوعاً بعید ما بین المنکبین عظیم الجمّة إلی شحمة اذنیه علیه حلّة حمراء مارأیت شیئاً قط أحسن منه(۱).

ترجمہ: حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک میانہ قد آدمی تھے آپ ﷺ کے دونوں مونڈھوں کے درمیان قدرے زیادہ فاصلہ تھا۔ لمبے بالوں والے تھے جو کان کی لوتک آئے تھے آپ ﷺ پرایک سرخ (دھاری دار) جوڑا تھا۔ میں نے آپ ﷺ سے زیادہ حسین کبھی کوئی چیز نہیں دیکھی۔

راوی حضرت براء بن عازبؓ: **عن براء بن عازبؓ** ابوعمارہ براء بن عازبؓ انصاری حارثی اوسی صحابی ہیں ان کے والد بھی صحابی ہیں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ہم عمر ہیں۔کوفہ میں رہا کرتے تھے۔نبی کریم ﷺ کے ہمراہ سب سے پہلے غزوہ خندق میں شرکت کی۔نیز حضرت علیؓ کے ہمراہ جنگ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہروان میں شریک رہے ۷۲ھ میں کوفہ میں وفات پائی۔

کان رسول اللّٰہ ﷺ رجلاً مربوعاً: یعنی نبی کریم ﷺ میانہ قد آدمی تھے اس جگہ اگرچہ کان کا خبر بظاہر رجلاً ہے لیکن مقصود مربوعیۃ کا اثبات ہے نہ کہ رجلیۃ کا۔اور مربوعیۃ کی بات بھی تقریبی ہے کیونکہ پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ آپ میانہ قد سے اونچے تھے بعض شرّاح کہتے ہیں کہ یہ لفظ رجلاً بکسر الجیم ہے۔جس میں بالوں کی صفت بیان کرنا مقصود ہے یعنی آپ ﷺ کے بال کھلے ہوئے تھے زیادہ

(۱) صحیح بخاری ۱/۵۰۲ کتاب المناقب باب صفة النبی ﷺ، صحیح مسلم ۲/۲۵۸ کتاب الفضائل باب فی صفة شعر النبی ﷺ وصفاته، الخ، ابو داؤد ۲/۲۰۷ کتاب اللباس باب فی الرخصة فی ذلک.(مختار)

گھنگریالے نہ تھے۔ان کی دلیل یہ ہے کہ مردانگی بیان کرنا بے معنی ہے اور کسی بھی صحابی سے مروی نہیں ہے۔لیکن پہلی تاویل بھی صحیح ہے۔کیونکہ رجلاً دراصل توطئہ ہے مربوعاً کیلئے جو بالذات مقصود ہے۔اب بھی کہتے ہیں فلاں ایسے آدمی تھے۔

<u>سینہ اور کولھوں کی چوڑائی:</u> بعید ما بین المنکبین، بعید باء کے فتح کے ساتھ فعیل کے وزن پر ہے جبکہ بعض روایات میں باء کے ضمہ کے ساتھ تصغیر کے صیغہ پر آیا ہے۔ منکب کندھے کو کہتے ہیں اس طرح اس حدیث میں اس بات کا بیان ہے کہ آپ ﷺ کے کولہوں کے درمیان فاصلہ تھا جو پیٹھ کے بالائی حصہ کی چوڑائی پر دلالت کرتا ہے نیز اس کے ساتھ سینہ کی چوڑائی بھی لازم ہے۔اور یہی درحقیقت مقصود بھی ہے کیونکہ سینہ کی فراخی سخاوت، وقار اور نجابت کی علامت ہے۔

<u>زلف مبارک:</u> عظیم الجمّۃ جمّۃ جیم کے ضمہ کیساتھ جموم سے ہے جس کے معنی اجتماع کے ہوتے ہیں۔وتحبون المال حباًجمّا اس لفظ کے مفہوم کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے بعض کے ہاں یہ وفرہ سے بڑھے ہوئے بالوں کو کہتے ہیں۔بعض کے ہاں پیشانی کے بالوں کے مجموعہ کو کہا جاتا ہے لیکن علامہ ابن اثیرؒ نے لکھا ہے کہ سر کے وہ بال جو کانوں کے لوتک پہنچے وفرہ کہلاتے ہیں۔اور اگر اس سے قدرے لمبے ہوں تو لمہ کہلاتے ہیں۔اور اس سے بڑھ جائیں اور کندھوں پر پڑھے رہیں تو جُمہ کہا جائیگا۔ ترتیب کو لفظ و لج میں اشارہ ہے یعنی واو وفرہ لام لمّہ اور جیم جُمّۃ۔اور اسی تحقیق کو علامہ بیجوریؒ اور بعض دیگر شرّاح نے ترجیح دی ہے۔لہٰذا اس تحقیق کے مطابق اس مقام پر جمہ سے مراد وفرہ ہوگا کیونکہ یہاں ''إلــی شحمۃ الاذن'' کی قید لگادی گئی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ شحمۃ الخ کا قید عظیم کے لفظ کیلئے ہے نہ کہ جمہ کیلئے۔تو مطلب یہ ہوا کہ جمہ کا بڑا حصہ کانوں کی لووں تک تھا لیکن کچھ بال بڑھ کر کندھے پر بھی پڑھے رہتے تھے۔نبی کریم ﷺ کے بالوں کی لمبائی کے بارے میں روایات مختلف ہیں جو کہ مختلف اوقات اور ازمنہ پر محمول ہیں۔ان کی تفصیل اپنے باب میں آجائے گی۔

<u>سرخ جوڑے کا استعمال:</u> علیہ حلّۃ حمراء ایک جیسے دو کپڑوں کو جو ایک ساتھ مستعمل ہوں حلّۃ ہے۔اردو میں جوڑا کہتے ہیں۔یہ عموماً ازار یعنی لنگوٹی اور رداء یعنی اوڑھنے کے چادر پر مشتمل ہوتا تھا جو دو یمنی

لکیردار چادروں کا مجموعہ تھااوراسی وحدت کی بناء پراس کی صفت مفرد دلائی گئی ہے۔مگر یہاں سرخ رنگ کے جوڑے کا ذکر ہے جس سے امام شافعیؒ اس بات پر استدلال کرتے ہیں کہ سرخ لباس کا پہننا جائز ہے۔جبکہ احناف کے نزدیک خالص سرخ لباس مردوں کیلئے جائز نہیں (۱)۔تو حدیث مذکور سے جواب یوں دیا جاتا ہے کہ یہ جوڑا یا تو ان دو چادروں سے مرکب تھا جن میں سرخ لکیریں تھیں۔خالص سرخ جوڑا نہیں تھا(۲)۔

جسطرح کہ یمنی چادروں کے بارے میں معروف بات ہے کہ خالص سرخ نہیں ہوتے تھے۔اوراگر یہ مان لیا جائے کہ یہ جوڑا جو آپ ﷺ زیب تن کئے ہوئے تھے خالص سرخ تھا تو ہم کہتے ہیں کہ یہ نبی کریم ﷺ کی خصوصیات میں سے تھا۔دوسرے لوگوں کیلئے جائز نہیں اور یا یہ کہ آپ ﷺ نے یہ جوڑا منع کئے جانے سے قبل پہنا ہوگا۔اورسرخ لباس سے نہی بعد میں وارد ہوئی۔جس طرح کہ احادیثِ نہی اس پر ناطق ہیں۔

<u>حسن بے مثال:</u> مارأیت شیئاً أحسن منه ۔میں نے ان سے زیادہ حسین کوئی چیز نہیں دیکھی۔یعنی نہ کوئی انسان نہ سورج نہ چاند۔نہ اور کوئی چیز ان سے زیادہ حسین نظر آئی۔اس تعمیم سے صحابی کی محبت ظاہر ہوتی ہے۔نیز حقیقت میں اہل علم کا اس پر اتفاق بھی ہے کہ آپ ﷺ کو جس قدر ظاہری محاسن سے نوازا گیا تھا۔کائنات کی کوئی چیز بھی ان محاسن تک نہیں پہنچ سکتی۔اس لیے یہ حقیقت ہے کہ آپ ﷺ سے زیادہ حسین

---

(۱)علماء احناف میں علامہ سرخسیؒ امام شافعیؒ کی طرح سرخ لباس کو جائز سمجھتے ہیں۔لکھتے ہیں وفیہ دلیل أنّه لابأس بلبس الثوب الأحمر(شرح السیر الکبیر ۱/۱۱۵) مگر ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے والحاصل أنّ عندنا یؤوّل الحمراء بالتی لها خطوط حمراء ویعدّ من خصائصه ﷺ بعد تسلیم صحة الحدیث اویحمل لبسه علی ماقبل نهیه(جمع الوسائل ۱/۲۱) گویا علماء احناف کے ہاں بھی یہ مسئلہ مختلف فیہا ہے بقول علامہ شامیؒ کے کہ علامہ شرنبلالیؒ نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا ہے جس میں انہوں نے سرخ لباس پہننے کے بارے میں آٹھ اقوال ذکر کیے ہیں اور ترجیح کراہت کو دی ہے۔أقول ولکنّ جل الکتب علی الکراهة کالسراج والمحیط والاختیار والمنتقیٰ والذخیرة وغیرها وبه افتی العلامة قاسم اھ(ردالمحتار ۳۵۸/۶ کتاب الکراهیة فصل فی لبس(مختار)

(۲)اوراس کی تائید حضرت قدامہ کلابیؓ کی روایت سے بھی ہوتی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو عرفہ کی رات دیکھا کہ آپ ﷺ کے جسم مبارک پر سرخ دھاری دار منقش حلّہ تھا(مختار)

کوئی بھی نہیں۔ غالباً حضرت حسان بن ثابتؓ نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

واحسن منک لم ترقط عینی　　واجمل منک لم تلدالنساء

خلقت مبرأً من کل عیبٍ　　کانّک قدخلقت کماتشاء

اورام المؤمنین سیدنا عائشہؓ نے آپ ﷺ کے حسن کے بارے میں فرمایا ہے

لواحی زلیخالورأین جبینه　　لاثرنّ بالقطع القلوب علی الید

اسی طرح شاعر نے کہا　　حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضاء داری　　آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

(۴)　حدثنا محمود بن غیلان ثنا وکیع ثنا سفیان عن أبی اسحاق عن البراء بن عازب قال ما رأیت من ذی لمّة فی حلّة حمراء أحسن من رسول اللّٰه ﷺ له شعر یضرب منکبیه بعید مابین المنکبین لم یکن بالقصیر ولا بالطویل(۱)۔

ترجمہ: حضرت براءؓ سے روایت ہے کہ میں نے کانوں سے لمبے بال رکھنے والے کسی شخص کو سرخ جوڑا پہنے ہوئے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ حسین نہیں دیکھا۔ نبی کریم ﷺ کے بال مونڈھوں تک آرہے تھے۔ آپ ﷺ کے دونوں مونڈھوں کے درمیان کا حصہ ذرا زیادہ چوڑا تھا۔ آپ ﷺ نہ پستہ قد تھے نہ زیادہ لمبے تھے۔

سفیان ثوری یا ابن عیینہ: حدثنا سفیان، اس میں اختلاف ہے کہ یہ کونسے سفیان ہیں۔ بعض شراح کہتے ہیں کہ ابواسحٰق ہمدانیؒ کے مشہور تلامذہ میں سفیان بن عیینہؒ ہی ہے۔ اس لئے وہی مراد ہیں۔ لیکن علامہ قسطلانیؒ کا خیال ہے کہ یہ سفیان ثوریؒ ہیں کیونکہ امام ترمذیؒ نے جامع ترمذی میں بھی حدیث اسی سند کے ساتھ ذکر کی ہے۔ جس میں انہوں نے ثوری کی تعیین کی ہے۔ ملا علی قاریؒ نے بھی اسی کو صحیح قرار دیا ہے اور یہی راجح معلوم ہوتا ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری ۱/۵۰۲ کتاب المناقب باب فی صفة النبی ﷺ، شرح السنة للبغوی ۱۳/۲۲۴ باب صفة النبی ﷺ (مختار)

کیفیات لمّہ، جمّہ، وفرۃ میں تطبیق: ما رأیت من ذی لمّةٍ فی حلّة حمراء الخ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کی جسم مبارک کی کچھ تفصیل کے ساتھ ساتھ بالوں کا بھی ذکر ہے یہاں لمّہ کا ذکر ہے جبکہ جمّہ کا ذکر پچھلی حدیث میں کیا گیا ہے آپ ﷺ کی بالوں کی کیفیت بدلتی رہتی تھی۔ کبھی وفرہ کبھی اس سے بڑھ کر لمّہ اور کبھی اس سے بھی بڑھ کر جمّہ تک پہنچ جاتے تھے۔ اس لئے صحابہ میں سے جس نے جس حالت میں آپ ﷺ کو دیکھا بیان فرمایا۔ چنانچہ بالوں کے بارے میں روایات میں تعارض نہیں ہے۔ ''من ذی لمّة'' میں من تاکید عموم کی غرض سے زائد لایا گیا ہے۔ ذی کبھی اشارہ کیلئے آتا ہے اور کبھی صاحب کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ یہاں مؤخر الذکر معنی مراد ہے۔ لمّہ وہ بال ہیں جو کان کے لو سے نیچے بڑھ جائیں۔ المام کا معنی نزول ہے اسی سے لمّہ مستعمل ہے۔ اور لمّ یلمّ کا ایک معنی جمع کرنا بھی ہے۔ کہا جاتا ہے۔ لمّ اللّٰہ شعث فلانٍ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کے پراگندہ امور کو مجتمع کردے۔ گویا کانوں کے نیچے بالوں کو جمع کردیا جاتا ہے۔ فی حلّة حمراء یہ حال ہے ترکیب میں۔ یعنی اس حال میں کہ وہ صاحب لمّہ سرخ جوڑا پہنے ہوئے ہو۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حمراء سے مراد خالص سرخ رنگ کا جوڑا نہیں۔ بلکہ یہ دراصل سرخ مخطط کپڑا ہوتا تھا جس میں دوسرے رنگ کی دھاریں ہوتی تھیں۔ ہاں بظاہر سرخ اس لیے نظر آتا تھا کہ دوسرا رنگ مغلوب ہو جاتا تھا۔ اس سلسلے میں تفصیل باب لباس رسول اللہ ﷺ میں آرہی ہے۔ مارأیت یہاں رؤیۃ سے رویۃ بصری مراد ہے اس لئے یہ فعل ایک مفعول چاہتا ہے۔ اس صورت میں "احسن" ذی لمّہ سے حال ہوگا۔ اور اگر رویۃ قلبی مراد ہو تو فعل دو مفعولوں کا مقتضی ہوگا۔

لهُ شَعَرٌ شعر بالوں کو کہتے ہیں۔ اور اس میں چار لغات ہیں شَعْرٌ سکون عین کے ساتھ۔ شَعَرٌ عین کے فتحہ کے ساتھ۔ شَعْرۃٌ عین کے سکون اور تاء کے ساتھ۔ اور شَعَرَۃٌ عین کے فتح اور تاء کے ساتھ۔ یہاں پہلے دونوں لغتوں کے مطابق مروی اور مستعمل ہے۔

یضرب منکبیه، یضرب یصل کے معنی میں ہے۔ اور لمّہ کی صفت ہے۔ پہلے بھی گزر چکا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بال مونڈھوں کو چھوتے تھے لیکن یہاں یہ اشکال ہے کہ مونڈھوں کو جو بال چھوتے ہیں۔ ان کو جمّہ کہتے ہیں جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے اور یہاں تو لمّہ کا ذکر ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان

الفاظ کا ایک دوسرے کی جگہ استعمال شائع ہے۔اس لیے یہاں لمّہ کا ذکر ہے۔لیکن مراد جمّہ ہے۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ لمّہ ہی مراد ہوا گرچہ براہ راست مونڈھوں تک نہیں پہنچتا۔لیکن اگر بال کان کی لو سے بڑے ہوئے اور گھنے ہوں۔تو سر کو حرکت دینے سے بال کندھوں تک آجاتے ہیں بہر حال اس صورت میں بال ہر وقت مونڈھوں سے لگے ہوئے نہ تھے بلکہ حرکت کے وقت مونڈھوں کو چھوتے تھے۔

مونڈھوں کے درمیان وسعت: بعید مابین المنکبین، منکب نکب سے ماخوذ ہے۔ پھیرنے کے معنی میں مستعمل ہے۔کہا جاتا ہے نکبت و جھہ میں نے اس کا منہ پھیرا۔چونکہ کسی طرف مڑنے اور پھرنے میں مونڈھوں کو پھیرنا پڑتا ہے۔اس لیے مونڈھے کو منکب کہا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ کے مونڈھے کے درمیان وسعت تھی لیکن تھوڑی۔بعید کو تصغیر کے صیغہ سے اس لیے لایا کہ زیادہ چوڑائی بھی جسمانی طور پر بدصورتی کا باعث بنتی ہے۔جبکہ کچھ نہ کچھ فاصلہ ضروری بھی ہے اور مونڈھوں کے درمیان فاصلے کی وجہ سے سینہ بھی چوڑا پڑتا ہے۔جو کہ مردانہ حسن کا حصہ ہے اور نہایت درجہ کی بردباری اور تحمل پر بھی دلالت کرتا ہے۔

(۵) عن محمّد بن إسماعيل ثنا أبو نعيم ثنا المسعوديّ عن عثمان بن مسلم بن هرمز عن نافع بن جبير بن مطعم عن عليّ بن أبي طالبؓ قال لم يكن النبيّ ﷺ بالطويل و لا بالقصير شثن الكفين والقدمين ضخم الرأس ضخم الكراديس طويل المسربة اذا مشٰى تكفأً كانّما ينحط من صبب لم ارقبله و لا بعده مثله ﷺ.

حدّثنا سفيان بن وكيع ثنا أبي عن المسعوديّ بهذا الاسناد نحوه بمعناه(۱).

ترجمہ: حضرت علی بن ابی طالب سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نہ زیادہ لمبے تھے نہ پستہ قد، ہتھیلیاں اور دونوں پاؤں پُرگوشت تھے (یا سخت تھے) بڑے سر

(۱) المستدرک للحاکم ۲/۶۰۶، جامع ترمذی ۲/۱۸۳ کتاب المناقب باب ماجاء فی صفة النبی ﷺ (مختار)

والے تھے اور ہڈیوں کے جوڑ بھی بڑے بڑے تھے۔سینہ سے ناف تک بالوں کی ایک باریک دھاری تھی۔جب چلتے تھے تو قوت سے چلتے تھے جیسے کسی اونچی جگہ سے نیچے کو اتر رہے ہوں۔میں نے نبی کریم ﷺ جیسا نہ آپ سے پہلا دیکھا اور نہ بعد میں دیکھا۔

سند کو خلاف عادت عن سے شروع کرنے کی وجہ: عن محمد بن إسمٰعیل. امام ترمذی کا طریقہ یہ ہے کہ وہ سند کو حدثنا سے شروع کرتے ہیں لیکن یہاں پر انہوں نے سند کو حدثنا سے شروع کرنے کی بجائے عن سے شروع کیا ہے۔شراح کہتے ہیں کہ یہ یا تو شاگردوں کی ترمیم ہے یا پھر یہ جدّت امام ترمذی نے قصداً کی ہے۔اور حدثنا سے ذکر کرنے کا التزام انہوں نے جامع ترمذی میں کیا ہے جبکہ شمائل ترمذی مستقل کتاب ہے لیکن بعض نسخوں میں حدثنا محمّد بن اسماعیل کے الفاظ بھی ہیں۔

یہ حدیث امام ترمذی نے امام بخاریؒ سے روایت کی ہے۔جو ترمذی کے شیوخ میں سے ہیں۔ امام ترمذی کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ خود امام بخاریؒ نے بھی ان سے روایت کی ہے جس کو روایة الأکابر عن الأصاغر کہا جاتا ہے۔

ھرمز: یہ نام بعض کے نزدیک منصرف اور بعض کے نزدیک عجمہ اور علمیت کی وجہ سے غیر منصرف ہے لیکن دوسرا قول راجح ہے۔

علی بن ابی طالبؓ: حضرت علی کرم اللہ وجہہ خلفائے راشدین میں سے چوتھے خلیفہ ہیں۔باپ کا نام عبد مناف اور کنیت ابوطالب تھی۔ماں کا نام فاطمہ بنت اسدؓ تھا جو ایمان اور ہجرت دونوں سے مشرف ہو چکی تھیں۔خود آپ کی کنیت ابوتراب اور ابوالحسن ہے۔بچوں میں آپ بالاتفاق سب سے پہلے ایمان لائے اور بعض اقوال کے مطابق آپ مردوں میں بھی سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔اس وقت آپ کی عمر مختلف اقوال کے مطابق پندرہ،چودہ،تیرہ،آٹھ یا دس سال تھی۔

حضرت علیؓ کا اعزاز: جنگ تبوک کے علاوہ تمام غزوات میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ شریک رہے اس جنگ میں بھی خود نبی کریم ﷺ نے آپ کو مدینہ طیبہ میں یہ کہہ کر ٹھہرایا کہ ”أما ترضٰی ان تکون منّی بمنزلة هارون من موسٰی الّا أنّه لا نبّی بعدی“ کیا تجھے یہ پسند نہیں کہ تیری نسبت مجھ سے ایسی ہو

جیسے ہارونؑ کو موسیٰ سے تھی۔ہاں مگر میرے بعد کوئی نبی آنیوالا نہیں۔

آپؓ کا رنگ گہرا سانولا تھا، بڑی بڑی آنکھیں تھیں، قد سے پستہ قد تھے، بڑی داڑھی اور سر مبارک میں گنجاپن تھا۔حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد اٹھارہ ذی الحجہ ۳۵ھ کو مسند خلافت پر بٹھا دیئے گئے۔ چار سال نو ماہ اور چند دن خلافت کا فریضہ انجام دیا۔ستر ہ رمضان ۴۰ھ کو بروز جمعہ صبح کی نماز کے وقت عبدالرحمن بن ملجم مرادی نے کوفہ میں خنجر مارا اور تین دن بعد وفات پائے۔آپ کے دونوں بیٹوں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ اور بھتیجے حضرت عبداللہ بن جعفرؓ نے آپ کو غسل دیا۔حضرت حسنؓ نے نماز جنازہ پڑھائی، اور وہیں دفن ہوئے آپ کی عمر تریسٹھ برس تھی۔اہلسنت کا اس پر اجماع ہے کہ مرتے وقت روئے زمین پر آپ سے افضل شخص نہ تھا۔

تشریح حدیث: لم یکن النبی ﷺ بالطویل نبی کریم ﷺ کے قد وقامت کا بیان ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نہ زیادہ لمبے تھے نہ زیادہ کوتاہ قد، بلکہ میانہ قد والے تھے۔لیکن یہاں مراد أقرب إلیٰ الطول ہے۔یعنی میانہ قد سے کچھ اونچے تھے۔جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔

ہتھیلیوں کی سختی اور نرمی: شثن الکفین، شثن سمِعَ اور کَرم دونوں بابوں سے آتا ہے جس کے معنی ہیں غَلُظَ و خَشُن یعنی سخت اور کھر درا ہونا۔یہ نعومت اور لین کے مقابل ہے کام اور محنت کی وجہ سے ہاتھ کی سختی کو شثن کہتے ہیں۔امام اصمعی لغت کے امام ہیں انہوں نے شثن کی تشریح میں کہا ہے کہ الغلیظ الاصابع من الکفین والقدمین (۱)۔یعنی شثن اس آدمی کو کہا جاتا ہے جس کے ہاتھ پاؤں کی انگلیاں سخت اور کھردری ہوں۔لیکن علامہ ابن حجرؒ نے شثن الکفین والقدمین کی تفسیر غَلیظُ الاصابع والراحة سے کی ہے۔یعنی صرف انگلیوں کی خشونت نہیں بلکہ ساتھ ساتھ ہتھیلیوں کی سختی

---

(۱) شثن الکفین الخ مرفوع بھی پڑھا گیا ہے اور منصوب بھی، مرفوع کی صورت میں یہ خبر ہے اور مبتداء محذوف ہوگئی اور منصوب کی صورت میں کان مقدر کے لئے خبر ہے۔ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے قال میرک الروایة فیه بالرفع فیکون خبراً هو المحذوف قیل ویجوز النصب لیکون خبراً لکان المقدر (جمع الوسائل ۱/۲۵) اور نصب کی صورت اس میں حال ہونے کا بھی احتمال ہے (مناوی) (مختار)

بھی مراد ہےاوراس کی تائید ضخم الکفین و القدمین سے بھی ہوتی ہے(۱)۔

اشکال وازالہ: لیکن یہاں ایک اشکال ہے وہ یہ کہ دوسرے مقام پر حضرت انسؓ کی روایت ہے فرماتے ہیں کہ "ما مسستُ خزّاً ولا حریرا الین من کف رسول اللہ ﷺ "یعنی میں نے ریشمی کپڑے کو بھی نبی کریم ﷺ کے ہاتھ سے نرم نہیں پایا۔

اس حدیث کا بظاہر حضرت علیؓ کی حدیث سے تعارض معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں سختی کا ذکر ہے۔ بعض حضرات نے دونوں حدیثوں میں تطبیق کرتے ہوئے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کام کاج اور محنت و مشقت کیا کرتے تھےاور صحابہؓ کے ساتھ خدمت میں شرکت فرماتے جیسا کہ غزوہ خندق کے موقع پر خندق کی کھدائی اور دوسرے مواقع پر لکڑیاں کاٹنے اور جمع کرنے کے کام میں آپ ﷺ صحابہ کرامؓ کے ساتھ برابر کے شریک رہے۔تو ایسی حالت میں آپ ﷺ کے ہاتھ سخت ہوجاتے جبکہ عام حالات میں آپ ﷺ کے ہاتھ نرم ہوتے تھے۔ابن بطالؒ نے شثن الکفین و القدمین (۲) کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ مملوءۃ لحماً۔

---

(۱) بخاریؒ۔کہاجاتا ہے کہ امام اصمعیؒ نے شثن کا ترجمہ غلیط الاصابع و القدمین سے کیا۔تو کسی نے ان پر یہ اعتراض کیا۔کہ یہ لفظ تو نبی کریم ﷺ کے ہاتھوں کے بارے میں آیا ہے۔اس پر انہوں نے قسم کھائی کہ آئندہ کے لیے وہ کبھی بھی حدیث میں وارد الفاظ کی تشریح نہیں کریگا۔(مناوی۔۔جمع الوسائل ص۲۵)(اصلاح الدین)

شثن کی لغت میں دو معانی ہیں (۱) کھردرا ہونا (۲) پرگوشت ہونا، یہاں دوسرا معنی مراد ہے اسلئے کہ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ مبارک ریشم سے زیادہ نرم تھے۔اوراس کی تائید حضرت ابو ہریرہؓ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کی ہتھیلی گوشت سے پُر تھی۔اور حضرت ھند بن ابی ہالہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ہتھیلی ذرا پھیلی ہوئی تھی۔ملا علی قاریؒ نے جمع الوسائل میں لکھا ہے کہ بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ہتھیلی مبارک کا کشادہ ہونا سخاوت سے کنایہ ہے۔اور علامہ مناویؒ نے فرمایا ہے کہ یہ وسعت قوت کی طرف اشارہ ہے(جمع الوسائل ۱/۲۵) یادرہے کہ ہتھیلی کا کشادہ اور پُر گوشت ہونا مردوں میں ممدوح اور خواتین میں مذموم ہے(مختار)

(۲) حضرت ہند بن ابی ہالہؓ کی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کے قدم مبارک پُر گوشت تھے۔ملا علی قاریؒ نے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ آپ ﷺ کے پاؤں کی انگلیاں موٹی تھیں۔

(جمع الوسائل ۱/۲۰)(مختار)

یعنی آپ ﷺ کے ہاتھ اور پاؤں گوشت سے بھرے ہوئے تھے گویا شثن سے سختی مراد نہیں۔اس صورت میں دونوں حدیثوں میں تعارض ہی نہیں۔

سر مبارک: ضخم الرّاس، ضخم اور ضخامت دونوں مصدر آتے ہیں حجم میں بڑے ہونے کو کہتے ہیں جیسے بڑی کتاب ''کتاب ضخیم'' کہتے ہیں۔یعنی آپ ﷺ کا سر بڑا تھا۔حکماء،اطباء اور علم الابدان کے ماہرین کہتے ہیں کہ سر کا بڑا ہونا، دماغی قوتوں کے کمال پر دلالت کرتا ہے۔ یہ وصف موجود ہو، تو فکری،نظری اور دماغی قوتیں صحیح اور درست ہونگی۔لہٰذا سر کا بڑا ہونا خوبی ہے۔

ضخم الکرادیس۔کرادیس کردوس کی جمع ہے بعض شرّاح کا خیال ہے کہ کردوس عظم الـــرأس یعنی ہڈی کے سرے کو کہتے ہیں۔جو دوسری ہڈی سے ملکر جوڑ بنتا ہے اور بعض کے خیال میں کردوس ''مجتمع العظمین النقیا'' یعنی دو ہڈیوں کے آپس میں ملنے کی جگہ اور جوڑ کو کہتے ہے۔احادیث میں ایک اور لفظ ''جلیل المشاش'' آتا ہے وہ بھی ضخم الکرادیس کا ہم معنی ہے۔بہر حال معنی یہ ہوئے کہ نبی کریم ﷺ کی ہڈیاں اور جوڑ مضبوط تھے جو کہ جسمانی قوت، صحتمندی، شجاعت، اور نجابت کی علامت ہے۔

سینہ کے بال: طویل المسرّبة، مســرّبة میں راء کا ضم اور فتح دونوں منقول ہیں۔ ســرَبَ یسـرُب سے ہے۔جس کے معنی ہیں پانی کا برتن یا مشک سے نیچے کی طرف جاری ہونا۔آنسو اور پانی کے بہنے کے راستے کو نیز مرعی یعنی چراگاہ کو بھی مسرّب کہتے ہیں۔کیونکہ لوگ چراہ گاہ میں اپنے حیوانات کھلے چھوڑ دیتے ہیں۔بہر حال اونچائی سے اترائی کی طرف بہکر اور دھار کی طرح چلے جانے کو مسروب کہتے ہیں۔یہاں مقصود یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے سینہ پر زیادہ بال نہ تھے صرف اوپر کے ابھرے ہوئے حصہ پر تھوڑے بال تھے لیکن سینہ مبارک سے ناف تک بالوں کی ایک باریک لمبی دھاری سی تھی جس طرح کہ آگے امام اصمعیؒ کی تشریح سے واضح ہوتا ہے نیز بیہقی وغیرہ میں تصریح ہے کہ ''لہ شعرات فی سرّتہ کالقصیب'' یعنی حلق سے لے کر ناف تک ایک باریک دھاری تھی جیسے ٹہنی ہو۔

انداز رفتار: اذا مشیٰ تکفّاً تکفواً، کفئت الاناء کے معنی برتن کے الٹ جانے کے ہیں۔ یعنی آپ ﷺ کی چال ایسی تھی جس میں آگے کی طرف میلان اور جھکاؤ ہوتا تھا۔اور رفتار کی یہ ہیئت عاجزی اور فروتنی کی علامت ہے۔تو معنیٰ یہ ہوا کہ نبی کریم ﷺ جاتے ہوئے تواضع سے آگے کی طرف جھک کر

جاتے تھے۔دوسرا معنیٰ یہ کیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ جاتے ہوئے سرعت سے جاتے تھے قدم چھوٹے نہیں ہوتے تھے۔تیسرا معنیٰ جو کہ آگے ایک اور حدیث کے لفظ اذا مشیٰ تقلع سے معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ آپ ﷺ قوت اور طاقت سے جاتے تھے۔ کانما ینحط من صبب گویا آپ بلندی سے پستی کی جانب اُتر رہے ہیں۔یہاں مِن فِی کے معنیٰ میں ہے عموماً اترائی کی طرف جاتے ہوئے انسان تیزی اور احتیاط کے ساتھ قدم جما جما کر رکھتا ہے اور کچھ کچھ آگے کی طرف جھکا بھی ہوتا ہے۔نیز ایسی حالت میں چلنا تکبر اور نخوت سے بھی خالی ہوتی ہے۔لہٰذا اس تشبیہ سے تمام مقاصد حاصل ہوتے ہیں۔صبب حدور اور المنحدر من الارض یعنی زمین کی گہرائی اور پستی کے حصے کو کہتے ہیں۔صبّ ادغام کے ساتھ بھی اسی معنیٰ میں مستعمل ہے۔لیکن اس کے ایک اور معنیٰ عشقِ شدید کے بھی آتے ہیں اس لیے رفع التباس کے لیے ادغام کو چھوڑ دیا۔لم أر قبله و لا بعده مثله : حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ جیسا نہ ان سے پہلے دیکھا نہ ان کے بعد دیکھا ہے۔

اشکال وازالہ: یہاں یہ اشکال ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت علیؓ سے عمر میں بڑے تھے اور ایک ہی گھر کے آدمی تھے۔تو نبی کریم ﷺ سے پہلے کا ذکر عبث ہے کیونکہ آپ سے پہلے کسی غیر کا دیکھنا ممکن نہ تھا۔بلکہ بدو شعور سے آپ ﷺ کو دیکھ لیا تھا اس کا جواب یہ ہے کہ لم أر قبله کا معنیٰ "لم أسمع قبله" یا "لم أفهم قبله" ہے یعنی میں نے نبی کریم ﷺ سے پہلے گزرنے والوں کے بارے میں نہ یہ سنا نہ جانا کہ آپ ﷺ سے پہلے بھی کوئی آپ جیسا حسین گزرا ہے۔لہٰذا رؤیت سے صرف بصری رؤیت مراد نہیں ہے۔اس طرح نبی کریم ﷺ کی تمام لوگوں پر فضیلت ظاہر ہوگئی۔نیز یہاں پر اگرچہ نبی کریم ﷺ سے حسین تر کی نفی ہے لیکن نبی کریم ﷺ کے مثل کی نفی بھی مقصود ہے گویا آپ جیسا حسین کوئی نہیں تھا حدثنا امام ترمذیؒ سابقہ حدیث کی تائید کے لیے دوسری سند لا رہے ہیں۔

مثلہ اور نحوہٗ: پہلی سند میں امام بخاریؒ ابونعیم کے واسطے سے عبدالرحمن مسعودیؒ سے روایت کرتے تھے اس سند میں سفیان بن وکیعؒ اپنے والد وکیعؒ کے واسطے سے مسعودی سے روایت کرتے ہیں۔لہٰذا مصنف مسعودیؒ سے دو واسطوں کے ذریعے روایت کرتے ہیں۔ نحو بمعناه ضابطہ یہ ہے کہ اگر کوئی حدیث دو

سندوں کے ساتھ مروی ہو تو اگر دونوں لفظاً اور معناً موافق ہوں تو ایسی صورت میں مثلہ کے الفاظ لائے جاتے ہیں۔لیکن اگر روایتیں لفظاً مغائر اور معناً متحد ہوں تو دوسری سند کے ساتھ نحوہ لاتے ہیں۔اور کبھی دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ مجازاً استعمال ہوتے ہیں۔اب یہاں یہ شبہ ہوتا تھا کہ شاید نحوہ سے مثلہ مراد ہو یعنی روایتوں میں لفظی اور معنوی اتحاد ہوگا۔تو اس وہم کو دفع کرنے کے لیے مصنف نے بمعناہ کا لفظ تاکیداً بڑھا دیا۔تاکہ صرف معنوی اتحاد پر تنبیہ ہو اور یہ وہم دفع ہو کہ نحوہ مثلہ کی جگہ مستعمل ہے۔

(٦) حدّثنا احمد بن عبدة الضبّی البصری وعلّی بن حجر وابو جعفر محمّد بن الحسین وھو ابن ابی حلیمة والمعنی واحد قالوا ثنا عیسیٰ بن یونس عن عمر بن عبداللّٰہ مولیٰ غفرة قال حدّثنی إبراھیم بن محمّد من ولد علیّ بن أبی طالب قال کان علیؓ اذا وصف رسول اللّٰہ ﷺ قال لم یکن رسول اللّٰہ ﷺ بالطویل المُمَغّط و بالقصیر المتردد و کان ربعة من القوم لم یکن بالجعد القَطِطُ و لا بالسبط کان جعداً رجلا و لم یکن بالمطهّم و لا بالمُکلثم و کان فی وجهه تدویر ابیض مشرب أدعج العینین أهدب الأشفار جلیل المشاش و الکتد اجرد ذو مسربة شثن الکفین و القدمین اذا مشیٰ تقلّع کا نّما ینحّط فی صبب واذا التفت التفت معاً بین کتفیه خاتم النبوّة وهو خاتم النبیّن أجود الناس صدراً و أصدق الناس لهجة و ألینهم عریکة وأکرمهم عشیرة من راه بداهة هابه و من خالطه معرفة أحبّه یقول ناعته لم ارقبله ولا بعده مثله ﷺ(١)۔

ترجمہ: ابراہیم بن محمدؒ جو حضرت علیؓ کی اولاد میں سے ہیں فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ نبی کریم ﷺ کا حلیہ بیان کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ حضور اقدس ﷺ نہ زیادہ لمبے

(١) جامع ترمذی ٢/٢٠٥ کتاب المناقب باب ماجاء فی صفة النبیّ ﷺ، المستدرک للحاکم ٢/٦٠٦،مسنداحمد ١/١٢٧ ا شرح السنة للبغوی ١٣/٢٨٢ باب صفة النبی ﷺ(مختار)

تھے نہ زیادہ پستہ قد بلکہ میانہ قد لوگوں میں سے تھے۔حضور ﷺ کے بال نہ زیادہ گھنگریالے نہ بالکل سیدھے تھے بلکہ قدرے خم دار بالوں والے تھے۔نہ آپ ﷺ موٹے بدن کے تھے نہ گول چہرے والے تھے البتہ تھوڑی سی گولائی آپ ﷺ کے چہرہ انور میں تھی۔سفید سرخی مائل رنگ کے حامل تھے آپ ﷺ کی آنکھیں نہایت سیاہ اور پلکیں دراز تھیں۔ہڈیوں کے سرے(جوڑوں پر)موٹے تھے،نیز دونوں مونڈھوں کے درمیان کا حصہ بھی موٹا تھا(سوائے بعض حصوں کے)بدن کا اکثر حصہ بالوں سے خالی تھا۔سینہ مبارک سے لیکر ناف تک بالوں کی ایک لکیر سی تھی۔ہاتھ اور قدم مبارک پُرگوشت تھے۔جب چلتے تو قدموں کو قوت سے اٹھاتے گویا پستی کی طرف اتر رہے ہیں اور جب کسی کی طرف توجہ فرماتے تو پورے بدن مبارک کے ساتھ توجہ فرماتے۔دونوں کندھوں کے درمیاں مہر نبوت تھی اور آپ نبیوں کو ختم کرنے والے تھے۔سب سے زیادہ سخی دل کے مالک تھے اور سب سے زیادہ سچی زبان نرم طبیعت والے تھے نیز سب سے زیادہ شریف خاندان والے تھے جو شخص آپ ﷺ کو اچانک دیکھتا وہ آپ ﷺ سے مرعوب ہو جاتا تھا۔البتہ جو شخص آپ ﷺ کو پہچان کر آپ سے گھل مل جاتا وہ آپ ﷺ کی محبت میں گرفتار ہو جاتا تھا۔آپ ﷺ کا حلیہ بیان کرنے والا(خواہ وہ کوئی بھی ہو)صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ جیسا(جمال وکمال کا حامل)شخص نہ آپ ﷺ سے پہلے دیکھا نہ آپ ﷺ کے بعد دیکھا۔

<u>حضرت علیؓ کی روایت اور امام اصمعی کی لغوی تشریحات:</u>

قال ابوعیسیٰؒ سمعت أبا جعفر محمّد بن الحسین یقول سمعت الاصمعیّ یقول فی تفسیر صفة النبی ﷺ الممغّط الذاهب طولا قال وسمعت أعرابیاً یقول فی کلامه تمغّط فی نشّابته ای مدّها مدّا شدیداً والمتردّد الداخل بعضه فی بعض قصرا واما القطط فالشدید الجعودة

والرجل الذی فی شعره حجونة ای تثنٍّ قلیلا و اما المطهّم فالبادن الکثیر اللحم والمکلثم المدور الوجه والمشرّب الذی فی بیاضه حمرةٌ والادعج الشدید سواد العین والأ هدب الطویل الأشفار والکتد مجتمعة الکتفین وهو الکاهل والمسرّبة هو الشعر الدقیق الذی کانّه قضیب من الصدر إلیٰ السرة والشثن الغلیظ الأصابع من الکفین والقدمین والتقلّع ان یمشی بقوّة والصبب الحدور تقول انحدرنا فی صبوب و صبب و قوله جلیل المشاش یرید رؤس المناکب و العشرة الصحبة والعشیر الصحاب و البداهة المفأجة یقال بدهته بامر ای فجئته.

ترجمہ: امام ابوعیسٰی الترمذیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابوجعفر محمد بن حسینؒ سے سنا ہے انہوں نے فرمایا کہ میں نے امام اصمعیؒ سے سنا جو رسول اللہ ﷺ کے حلیہ مبارک کی تشریح فرماتے تھے کہ الممغط اس شخص کو کہا جاتا ہے جو درازی کی طرف جارہا ہو، وہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک دیہاتی کو یہ کہتے سنا کہ اس نے اپنے تیر کو چلے پر چڑھا کر خوب کھینچا۔ اور المتردد کا مطلب یہ ہے جو انسانی اعضاء جو پستی کی وجہ سے بعض بعض کے ساتھ ملے ہوئے ہوں۔ اور قطط سے بالوں کا شدت کے ساتھ گھنگھریالے ہونا مراد ہے۔ اور رجل کا معنی معمولی گھنگھریالے ہونا ہے۔ مطھم بھاری جسم والے شخص کو کہا جاتا ہے اور مکلثم گول چہرے والے آدمی کو کہا جاتا ہے۔ مشرب اس رنگ کو کہا جاتا ہے کہ سفیدی میں سرخی کی ملاوٹ ہو اور ادعج بالکل سیاہ آنکھوں والے شخص کو کہا جاتا ہے اور اھدب لمبی پلکوں والے شخص کو کہتے ہیں اور کَتَدُ دونوں کندھوں کے اکٹھے ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ گویا ایک باریک لکیر جو سینے سے ناف تک چلی گئی ہو اور شثن سے مراد ہاتھوں اور پاؤں کا پُر گوشت ہونا ہے اور تقلع

کا مطلب ہے کہ آدمی قوت کے ساتھ چلے اور صبب سے مراد پستی یا ڈھلوان ہے جیسا کہ تو کہتا ہے کہ ہم نچلی جگہ میں اتر گئے اور راوی نے جو کہا ہے کہ آپ ﷺ جلیل المشاش تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کندھوں کے کنارے بڑے تھے اور عشرۃ کا معنی رفاقت اور عشیر سے مراد ساتھی ہے اور بداھۃ سے مراد اچانک ملاقات ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ میں اس کے پاس کوئی معاملہ لے کر اچانک آیا۔

<u>حدیث کی سندی بحث:</u> والمعنیٰ واحد یعنی احمد بن عبدہ علی بن حجر اور محمد بن الحسین تینوں کی روایات میں معنوی موافقت ہے اگر چہ لفظاً ان میں مغائرت ہے۔ قالوا حدثنا عیسیٰ الخ یعنی تینوں حضرات میں سے ہر ایک نے فرمایا کہ "حدثنا عیسیٰ" لہذا یہ حدثنا پہلے حدثنا کا بیان اور اس کی تفصیل ہو جائے گی۔ ابراھیم بن محمد، ابراہیم کے والد محمد سے ابوالقاسم محمد بن الحنفیہؒ مراد ہیں۔ جو علم و شجاعت میں بہت مشہور تھے۔ ان کی والدہ خولہ بنت جعفر بنو حنفیہ کی قیدیوں میں سے تھیں اور حضرت علیؓ کے حصے میں آئیں۔ بعض غالی شیعہ محمد بن الحنفیہ کے بارے میں الوھیت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ فلعنھم اللہ

<u>وُلد کی بحث:</u> شراح کہتے ہیں کہ ابراہیم کی ملاقات حضرت علی سے ثابت نہیں خود امام ترمذی بھی ایک جگہ اس کی تصریح کر چکے ہیں اس لیے یہ حدیث منقطع ہوگی۔ من ولد علی ولد، واو، اور لام دونوں کے فتح کے ساتھ مروی ہیں اور واو کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ بھی درست ہے۔ امام قسطلانیؒ فرماتے ہیں کہ اول صورت میں یہ اسم جنس اور دوسری صورت میں اسمِ جمع ہے بہر حال حضرت ابراہیمؒ، حضرت علیؓ کے پوتے ہیں۔

<u>تناسب قد و قامت:</u> الممغط یہ باب انفعال یعنی انمغاط سے اسم فاعل کا صیغہ ہے جسکے معنی ہوتے ہیں زیادہ لمبا ہونا۔ تمغط البعیر کا معنی ہوتا ہے " مدّبدنہ فی السیر شدیداً " یعنی اونٹ نے سفر میں لمبے لمبے قدم لئے۔ یہاں مراد حد سے زیادہ اور نمایاں طول ہے۔ ولا بالقصیر المتردّد، متردد کا معنی بعد میں خود نقل کرتا ہے۔ یہاں تناہی فی القصر کے معنی میں مستعمل ہے۔ مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کے اعضاء ایک دوسرے میں مضموم یعنی گھسے ہوئے نہ تھے۔ آپ پستہ قد نہ تھے بہر حال نبی کریم ﷺ کی میانہ قدی اس

حدیث میں اوراس قسم کی دوسری احادیث میں مذکور ہے لیکن صحیح احادیث کے مطابق آپ میانہ قدی سے کچھ بڑھ کرطول کی طرف مائل تھے۔چنانچہ ھند بن ابی ہالہؓ کی روایت میں اس کی تصریح فرماتے ہیں کان اطول من المربوع ۔یعنی میانہ قدی سے قدرے اونچے تھے۔ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کسی جماعت اور مجمع میں کھڑے ہوتے تو سب سے اونچے نظر آتے تھے۔لیکن اس کا حدیثِ باب سے کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ آپ ﷺ کا سب سے بلند نظر آنا درازی قد کی وجہ سے نہ تھا بلکہ یہ آپ ﷺ کا معجزہ تھا کہ ہر مجلس میں آپ ﷺ نمایاں نظر آتے تھے۔ و کان ربعة من القوم مردوں میں میانہ قد تھے۔قوم اس جماعت کو کہتے ہیں جس میں عورت نہ ہو کیونکہ قوامیت کی خصوصیت مردوں میں ہے۔ولم یکن بالجعد القطط یہاں آپ ﷺ کے بال مبارک جو جسم کا حصہ ہیں کا بیان ہے جعد کے معنی انطویٰ و انقبض ۔یعنی مڑنے اور گھنگریالے ہونے کے ہیں۔جبکہ قطط سے مراد شدة جعودة ہے۔یعنی سخت گھنگریالا پن۔ولا بالسبط سبط عدم تکسُّر شَعر یعنی بالوں کے بالکل ہموار اور غیر پیچیدہ ہونے کو کہتے ہیں۔بلکہ کان جعداً رجلاً یعنی سیدھے اور قدرے گھنگریالے بال تھے۔

<u>چہرے کی ساخت:</u> ولم یکن بالمطهَّم چہرے کا بیان ہے۔مطهّم کے متعدد معانی ہیں یہ لفظ اضداد میں سے ہے۔ سمین البدن یعنی فربہ اور نحیف البدن یعنی کمزور دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔امام اصمعیؒ تو بادن کثیر اللحم کا ترجمہ کرتے ہیں یعنی موٹا پُر گوشت۔جبکہ بعض لوگوں نے منتفخ الوجه سے تفسیر کی ہے جس کا معنی گوشت سے بھرے چہرے والا ہوتا ہے۔اور چہرے میں حد سے زیادہ گوشت کا ہونا بھی حسن کو ختم کردیتا ہے کیونکہ اس طرح چہرہ گویا سوجا ہوا اور متورم نظر آتا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ مطهم یہاں رنگ کی صفت ہے سرخ مائل بسیاہ کو اسمر کہا جاتا ہے لیکن سفیدی اور سرخی کے مقابلے میں زیادہ سیاہی آجائے تو طهمه کہتے ہیں۔مقصد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ سیاہی مائل نہ تھے لیکن یہ معنی کچھ بعید معلوم ہوتا ہے۔

ولا بالمکلثم مکلثم مدوّر الوجه اور خالص گول چہرے والے کو کہتے ہیں اس سے چہرے کا حسن ختم ہو جاتا ہے اسی طرح چہرے میں زیادہ لمبائی بھی بدصورتی پیدا کرتی ہے۔اور اگر کچھ

تدویراور کچھ طول ہوتو اسے کتابی چہرہ کہتے ہیں۔اوراس سے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ایسے چہرے والے کو عربی میں اسیل الوجہ کہتے ہیں۔تو نبی کریم ﷺ کے چہرہ انور میں اگر چہ تدویر تھی اور کامل استطالۃ نہ تھی۔جیسے کہ خود راوی کہتے" وکان فی وجھہ تدویر "لیکن بالکل گول چہرہ بھی نہ تھا جس طرح کہ روسیوں اور چینیوں کا ہوتا ہے۔

رنگ کا بیان: أبیض مشرب: ابیض، کان کا خبر ہوتو منصوب ہوگا۔لیکن راجح یہ ہے کہ یہ مرفوع ہواور مبتداء محذوف کی خبر ہو یعنی ھوا بیض کیونکہ مشرّب بھی مرفوع ہے۔اورمشرب راء کی تخفیف کے ساتھ اشراب کا اوراس کی تشدید کے ساتھ باب تفصیل کا اسم مفعول ہے دونوں صحیح ہیں۔ اشراب اصل میں خلط لونٍ بلون یعنی ایک رنگ کا دوسرے میں مخلوط ہونے کو کہتے ہیں۔تو یہاں مقصود یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا رنگ سفید تھا لیکن اس میں سرخی تھی۔سفیدی میں سرخی آمیزش ہوتو یہ حسن میں اضافہ کا سبب بنتی ہے۔نبی کریم ﷺ کے رنگ کے بارے میں صرف ایک حدیث میں اسمر یعنی گندم گون کا لفظ مستعمل ہے۔اس کے علاوہ جہاں بھی آپ ﷺ کے رنگ ذکر کیا گیا ہے وہ أبیض یا أبیض مشرب بالحمرۃ ہے یعنی سرخی مائل سفید رنگ تھا۔

چشم مبارک کی ساخت: أدعج العینین دَعج یدعج کے معنی ہیں سیاہی کا سخت سیاہ ہونا۔ چونکہ رنگوں میں افعل کا صیغہ تفصیلی معنی سے خالی ہوتا ہے اس لیے مراد یہاں یہ ہے کہ آپ ﷺ کی آنکھوں کی سیاہی زیادہ سیاہ تھی۔آنکھیں نیلی یا بھورے رنگ کی نہ تھیں۔شراح نے تصریح کی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے آنکھوں کی سفیدی زیادہ سفید تھی اور بعض روایات کے مطابق اس میں سُرخ ڈورے بھی تھے یہ دونوں چیزیں آنکھوں کے لیے انتہائی درجہ کا حسن ہیں۔کیونکہ آنکھوں کی سفیدی میں زردی آجائے یا میلی نظر آئیں تو اس سے آنکھوں کا حسن ختم ہوجاتا ہے۔أھدب الأشفار أھدب ھدبٌ سے ہے لٹکنے کے معنی میں مستعمل ہے۔ھدبہ جھالر اور پھندنے کو کہتے ہیں ایک حدیث میں آتا ہے"کھدبۃ ثوبی ھذا "میرے اس کپڑے کے پھندنے کی طرح۔کپڑے کا وہ حصہ جو لٹک رہا ہو کپڑے کی لمبائی اور طول کی علامت ہے۔ چنانچہ اھدب سے بھی مراد اس مقام پر یہی ہے کہ پلکیں لمبی اور لٹکی ہوتی تھیں۔اور اشفار شفرہ کی جمع ہے

جس کے معنی ہیں پلکوں کا منبت یعنی آنکھ کا وہ حصہ جس پر پلکیں ہوتی ہیں لیکن یہاں منبت ذکر ہے اور نابت یعنی بال مراد ہیں۔ کیونکہ خمیدگی پلکوں میں ہوتی ہے ان کے منبت میں نہیں ہوتی اور منبت اور نابت میں ملابست کے سبب یہ مجاز صحیح ہے۔ یا پھر یہاں مضاف محذوف ہے۔ اور أهدب الأشفار سے مراد أهدب شعر الأشفار ہے۔ یعنی پلکیں لمبی اور دراز تھیں۔

جلیل المشاش: مُشاشة کی جمع مُشاش آتی ہے یہاں اس سے مراد ہڈیوں کے سرے ہیں جو بڑے بڑے اور مضبوط تھے۔ ضخم الكراديس اور جليل المشاش کا ایک ہی معنی بنتا ہے والكتد، کتد سے مراد مونڈھوں کے درمیان کی جگہ ہے جہاں مونڈھوں کی ہڈیاں ملتی ہیں۔ اور اس کا بڑا اور مضبوط ہونا جسمانی قوت کی علامت ہے۔ اجرد، اجرد کے معنی ہیں بالوں سے خالی۔ نبی کریم ﷺ کے عام بدن پر بال نہ تھے۔ پاؤں، ہاتھ، پیٹھ وغیرہ بدن کے اکثر حصے بالوں سے خالی تھے۔ بعض لوگ اجرد کے معنی میں یہ کہتے ہیں کہ بدن پر چھوٹے چھوٹے بال تھے کیونکہ اجرد دراصل اس گھوڑے کو کہتے ہیں جس کے بدن پر بال چھوٹے چھوٹے ہوں لیکن یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ اجرد کا یہ معنی حیوانات کی نسبت سے ہے جس طرح کہ قاموس میں اس کی تصریح ہے۔ اور انسان کے اوصاف محمودہ میں سے یہ ہے۔ کہ چند مخصوص اعضاء کے سوا جسم کے دوسرے حصے بالوں سے بالکل خالی ہوں جس طرح کہ بعض حصوں پر بالوں کا زیادہ ہونا پسندیدہ وصف ہے۔ ذو مسربة عربة یعنی سینہ کے وسط میں ناف تک بالوں کی پتلی لکیر تھی۔ عربة کی تفصیل پچھلی حدیث میں گزر چکی ہے۔ اسی طرح شثن الكفين و القدمين کا ترجمہ گزر چکا ہے ۔ اذا مشیٰ تقلّع چلنے کی کیفیت کا بیان ہے۔ قلع کے معنی گڑی ہوئی چیز کو بیخ سے نکالنے کے ہیں۔ نبی کریم ﷺ جب چلتے تو گویا پاؤں زمین میں دھنسے ہوئے ہیں۔ اور آپ ﷺ انہیں نکال نکال کر جا رہے ہیں۔ یعنی پوری قوت سے زمین سے اٹھاتے ہیں۔ اس میں اس قوت اور مضبوطی کی طرف اشارہ ہے جو نبی کریم ﷺ کی رفتار سے معلوم ہوتی تھی۔ کانّما ینحط من صبب الخ گویا آپ ﷺ اونچائی سے اترائی کی طرف جا رہے ہیں۔ اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

التفات تام: واذا التفت التفت معاً۔ نبی کریم ﷺ کے اخلاق عالیہ کا ایک عظیم پہلو ذکر کر رہے

ہیں۔کہ جب آپ ﷺ کسی کی طرف توجہ فرماتے تو پوری ہمہ تنی سے توجہ فرماتے۔شراح کہتے ہیں کہ ''لایسارق النظر کما ھو عادۃ المتکبّرین ''یعنی متکبرین کی طرح آپ ﷺ کن انکھیوں سے نہیں دیکھتے تھے۔بلکہ آپ ﷺ تو خلقِ عظیم کی دولت سے مالا مال تھے۔اگر معمولی درجہ کا کوئی آدمی بھی آپ ﷺ سے بات کرتا تو سینہ مبارک اس کی طرف پھیر کر خوب توجہ سے بات سنتے اور پیٹھ پھیر کر کسی سے بات کرنے سے احتراز کرتے۔

ایک تشریح یہ بھی کی جاتی ہے کہ آپ ﷺ ہر کام کو ہمہ تن اور توجہ سے کرتے تھے۔خواہ وہ کوئی دنیوی کام ہو یا اخروی کام،التفاتِ تام کے بغیر نہیں کرتے۔بنی نوع انسان کی اصلاح نبوت کے مشن اور جہاد و دعوت میں آپ ﷺ تمام وسائل اور صلاحیتوں کو مستعمل فرماتے۔لیکن دوسری جانب ازواج مطہرات،اقارب اور دوستوں کے حقوق کا بھی پورا پورا خیال فرماتے۔اور ضابطہ بھی ہے کہ مکمل التفات اور کامل توجہ کے بغیر کوئی کام بھی درست نہیں ہوتا۔ بین کتفیه خاتم النبوۃ۔ ایک بڑی جسمانی علامت اور آپ ﷺ کی صداقت کی نشانی کا ذکر ہے وہ یہ کہ آپ ﷺ کے دونوں کندھوں کے درمیان بدن پر نبوت کی مہر تھی جو کہ آپ ﷺ کی صداقت اور نبوت کی بڑی علامت تھی۔مہر نبوت کے بارے میں مستقل اور مفصل بحث اپنے باب میں آئے گی اور اس کی کیفیت،کمیت اور رنگ وغیرہ حالات کا ذکر ہوگا۔

وھو خاتم النبییّن یہ جملہ معترضہ ہے۔گویا راوی کے خیال میں یہ مہر ختم نبوت کی دلیل تھی۔

<u>فراخ دلی:</u> أجود الناس صدراً آپ تمام مخلوق سے سینہ کے اعتبار سے زیادہ سخی تھے۔یہاں صدر سے مراد قلب ہے کیونکہ صدر محل اور قلب حال ہے۔محل کو ذکر کر کے مجازاً حال مراد ہے۔مطلب یہ کہ آپ دریا دل اور سخی تھے۔نیز کشادہ دل اور تحمل کی یہ حالت تھی کہ مخالفین کا ہر ستم ہر مخالفت برداشت کرتے رہے مظالم سہتے رہے لیکن اپنے مشن سے دستبردار نہ ہوئے۔بلکہ تمام تر عداوتوں کے باوجود دشمن سے ملاقات کے وقت پیشانی مبارک پر بل نہ آنے دیا۔رہی مال کے سلسلے میں سخاوت تو وہ تو کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ہاں اس میں اس پر بھی تنبیہ ہے کہ آپ ﷺ کی سخاوت دل سے تھی۔تکلف،ریاکاری اور تصنع سے سخاوت نہیں کرتے تھے۔

آپ ﷺ کی صدق گفتاری اور نرم مزاجی: وأصدق الناس لهجةً، زبان اور کلام کے لحاظ سے سارے عالم میں سچے تھے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اللہ تعالیٰ خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں ومن أصدق من اللّٰه حديثاً ۔ پھر دوسرے نمبر پر نبی کریم ﷺ کے بارے میں ارشاد ہے۔ والذی جاء بالصدق ۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ما ينطق عن الهوى ان هو إلاّ وحي يوحىٰ۔ وہ اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کرتے اس کی بات تو صرف وحی ہے جو اس پر اتاری گئی ہے۔ یہاں لهجة سے مراد زبان اور کلام ہے۔ یعنی آپ ﷺ ہمیشہ سچ بولا کرتے تھے۔

وألينهم عريكة: عريكة فطرت اور طبیعت کو کہتے ہیں اور الين لان يلين سے اسم تفضیل ہے۔ یعنی آپ ﷺ تمام عالم میں نرم طبیعت کے مالک تھے۔ مزاج میں فطری نرمی تھی اور نرم خوئی میں ہزارہا حکمتیں ہوتی تھیں۔ خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فبما رحمةٍ من اللّٰهِ لنت لهم و لو كنت فظّا غليظ القلبِ لا نفضّوا من حولك (الآية) اللہ تعالیٰ کی رحمت کاملہ سے تم ان کے لیے نرم ہو گئے ہو اور اگر تم بے رحم اور سنگ دل ہوتے تو لوگ تم سے بکھر جاتے۔

سخت گیر، سنگ دل اور تیز زبان شخص کے قریب لوگ نہیں جاتے۔ اور جس شخص میں محبت، الفت اور عفو و درگزر کی خوبیاں ہوں تو لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ جس سے آپ ﷺ کے لیے منصب نبوت کے فرائض ادا کرنے میں سہولت ہوتی تھی۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ألين کے معنی منقاد کے ہیں۔ اور آپ ﷺ کی طبیعت حق کے لیے مسخر اور منقاد تھی۔

خاندانی شرافت اور معاشرتی کرامت: وأكرمهم عشيرة . عشیرۃ صحبت کو بھی کہتے ہیں۔ اور چونکہ ابتدائی صحبت اور مجالست اپنے ہم قوم افراد اور قبیلہ کے لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے اس لیے عشیرۃ قبیلہ کو بھی کہتے ہیں۔ بہر حال ایک معنی یہ ہوا کہ قبیلہ کے لحاظ سے آپ ﷺ تمام لوگوں میں معزز اور اشرف ترین ہیں۔ کیونکہ قریش کا خاندان سارے عالم میں شریف ترین خاندان ہے ایک حدیث میں ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام فرماتے ہیں کہ مجھے بنو ہاشم سے زیادہ اشرف خاندان نظر نہیں آیا۔ تو آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے خاندانی نجابت و شرافت سے نوازا تھا۔ لیکن ایک دوسرے نسخہ کے مطابق یہ لفظ

عشرۃ ہے جس سے مراد مصاحبت ومعاشرت ہی ہے پھر مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ بودو باش اور رفاقت میں تمام لوگوں سے اکرم تھے۔ حقوق دینے اور دلوانے میں، نیز دوسروں کے آرام وراحت کا خیال رکھنے میں آپ ﷺ اپنی نظیر آپ تھے۔ معاملات میں نرمی برتتے، لیکن اس نرمی اور معاملات کی بھی ایک خاص حد تھی وہ یہ کہ حدود شریعت کے اندر رہ کر آپ ﷺ سب کچھ برداشت کرتے تھے لیکن اگر حدود شریعت کو پامال کیا جاتا اللہ تعالیٰ کے حقوق پر دست اندازی ہوتی تو آپ ﷺ کے غصہ کی انتہا نہیں ہوتی تھی۔ ایسی ہی حالت کے بارے میں حدیث میں آتا ہے کہ لم یقم لغضبہٖ شئی(۱)۔ تو پھر آپ ﷺ کے غصہ کے سامنے کوئی چیز ٹھہر نہیں سکتی تھی۔

(۷) حدّثنا سفیان بن وکیع قال ثنا جمیع بن عمیر بن عبدالرحمٰن العجلیّ أملاء علینا من کتابه قال أخبرنی رجل من بنی تمیم من ولد أبی هالة زوج خدیجة یکنیّ أبا عبدالله عن إبن لأبی هالة. عن الحسن بن علیّ قال سألت خالی هندابن أبی هالة و کان وصّافًا عن حلیة رسول اللّٰه ﷺ وأنا اشتهی ان یصف إلیّ شیئاً اتعلّق به فقال کان رسول اللّٰه ﷺ فخمًا مفخّماً یتلا لؤوجهه تلالؤ القمر لیلة البدر أطول من المربوع وأقصر من المشذّب عظیم الهامة رجل الشعران انفرقت عقیقتهُ فرّق والا فلا یجاوز شعره شحمة اذنیه إذا هووفرة أزهرا للون واسع الجبین أزجّ الحواجب سوابغ من غیر قرن بینهما عرق یدرّه الغضب أقنیٰ العرنین له نور یعلوه یحسبه من لم یتامّله اشمّ کثّ اللحیة سهل الخدّین ضلیع الفم مفلّج الاسنان دقیق المسربة کانّ عنقه جید دمیة فی صفآء الفضّة معتدل الخلق بادن متماسک سواء البطن والصدرعریض الصدر بعید مابین المنکبین ضخم

(۱) شمائل ترمذی

الکرادیس أنور المتجرد موصول ما بین اللبّة والسرّة بشعر یجری کالخط عاری الثدیین والبطن مماسویٰ ذلک أشعر الذراعین والمنکبین و اعالی الصدر طویل الذندین رحب الراحة شثن الکفین والقدمین سائل الأطراف أوقال شائل الأطراف خمصان الاخمصین مسیح القدمین ینبو عنهما الماء اذازال زال قلعاً یخطوتکفّیا و یمشی هوناًذریع المشیة إذا مشیٰ کا نّما ینحط من صبب وإذا التفت التفت جمیعًاخافض الطرف نظره الی الارض اکثرمن نظره إلی السماء جلّ نظره الملاحظة یسوق أصحابه یبدء من لقی بالسلام(۱).

ترجمہ: ہمیں سفیان بن وکیع نے بیان کیا کہ ہمیں جمیع بن عمیر بن عبدالرحمٰن العجلی نے اپنی کتاب سے سنایا کہ ہمیں بنوتمیم کے ایک آدمی نے جو أبی هاله کی اولاد سے تھااور وہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ کا پہلا خاوند تھا اس کی کنیت ابوعبداللہ تھی وہ ابوھالہ کے ایک فرزند سے روایت کرتا ہےاورانہوں نے حضرت حسن بن علیؓ سے یہ روایت سنی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے ماموں ھند بن ابی ھالہ سے حضوراقدس ﷺ کے حلیہ مبارک کے بارے میں دریافت کیا جبکہ وہ آنحضرت ﷺ کے حلیہ مبارک کو بہت ہی وضاحت سے بیان فرماتے تھے۔ مجھے یہ خواہش ہوئی کہ وہ ان اوصاف جمیلہ میں سے کچھ میرے سامنے بھی ذکرکریں تاکہ میں ان کے بیان کواپنے لئے حجت اورسند بناؤں یعنی میں اس کے ساتھ تعلق قائم کرلوں۔تو انہوں نے فرمایا کہ آپ ﷺ اپنی ذات میں عظیم تھے اوردوسروں کے نزدیک بھی عظیم تھے۔آپ ﷺ کا چہرہ مبارک چودھویں رات کے چاند کیطرح چمکتا تھا۔آپ ﷺ درمیانہ قد سے قدرے لمبے تھے اور دراز قد سے قدرے پست تھے۔آپ ﷺ کا سرمبارک معتدل بڑا تھا۔آپ ﷺ کے بال مبارک کسی قدربل کھائے ہوئے تھے۔اکثرسر کے بالوں میں خودمانگ نکل

(۱)جامع ترمذی ۲/۸۳ا باب ماجاء فی صفة النبی ﷺ شرح السنة للبغوی ۱۳/۲۷۰ (مختار)

آتی تھی تو آپ ﷺ مانگ رہنے دیتے ورنہ آپ ﷺ خود مانگ نکالنے کا اہتمام نہ فرماتے تھے۔آپ ﷺ کے بال مبارک کانوں کی لو سے تجاوز کر جاتے تھے جب کہ آپ ﷺ بڑھالیتے ۔آپ ﷺ کا رنگ مبارک سرخ وسفید تھا اور پیشانی مبارک کشادہ تھی۔ آپ ﷺ کے آبرو مبارک باریک اور خم دار اور گنجان تھے اور دونوں آبرو جدا جدا تھے۔ایک دوسرے سے ملے ہوئے نہیں تھے دونوں آبروں کے درمیان ایک باریک رگ تھی جو غصہ کے وقت ابھر آتی تھی آپ ﷺ کی ناک مبارک اونچی بلندی مائل تھی اور اس پر ایک چمک اور نور تھا ابتداءً (بغور کے) دیکھنے والا گمان کرتا کہ آپ ﷺ کی ناک اونچی ہے آپ ﷺ کی داڑھی مبارک گھنی تھی۔آپ ﷺ کے رخسار مبارک ہموار تھے۔آپ ﷺ کا دہن مبارک کشادہ تھا،سامنے کے دانتوں میں قدرے کشادگی تھی سینے سے ناف تک باریک بالوں کی لکیر تھی آپ ﷺ کی گردن مبارک مورتی کی گردن جیسی تھی جو صفائی میں چاندی جیسی تھی۔آپ ﷺ کے تمام اعضاء معتدل اور پُر گوشت تھے اور بدن مبارک گٹھا ہوا تھا، پیٹ اور سینہ مبارک برابر تھے۔سینہ مبارک کشادہ تھا۔آپ ﷺ کے دونوں کندھوں کے درمیان قدرے فاصلہ تھا۔آپ ﷺ کے اعضاء کی جوڑوں کی ہڈیاں بھی بڑی اور مضبوط تھیں۔جسم مبارک کا لباس سے خالی حصہ بڑا روشن اور چمکدار تھا۔سینہ اور ناف کو بالوں کی ایک باریک لکیر ملاتی تھی اور سینہ کے اوپر حصہ میں بال تھے۔آپ ﷺ کی دونوں کلائیاں دراز تھیں، دونوں پاؤں کے تلوے گہرے تھے، دونوں قدم مبارک ہموار تھے، پانی ان کی وجہ سے بہہ جاتا تھا۔جب آپ ﷺ چلتے تو قوت سے قدم اٹھاتے اور جب قدم رکھتے تو جھک کر چلتے۔قدم زمین پر آہستہ سے رکھتے۔آپ ﷺ کی چال مبارک تیز تھی۔آپ ﷺ چلتے تو کشادہ قدم رکھتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ ﷺ ڈھلان سے اتر رہے ہیں۔جب آپ ﷺ کسی کی طرف متوجہ ہوتے تو پورے بدن کے ساتھ توجہ فرماتے۔آپ ﷺ کی نگاہ مبارک نیچے رہتی تھی اور بنسبت آسمان کے زمین کی

طرف زیادہ رہتی تھی۔آپ ﷺ عموماً گوشہ چشم سے دیکھتے تھے اور چلنے میں صحابہ کرامؓ
کوآگے رکھتے تھے جس سے ملتے تھے تو سلام کرنے میں خود ہی پہل فرماتے تھے۔

حدیث کے بعض راویان کا تذکرہ: باب کی اس حدیث میں جمع بن عمیر العجلی کا ذکر ہے۔بعض نسخوں میں جمیع بن عمر کا ذکر ہے۔اس راوی کے بارے میں اہل علم نے لکھا ہے کہ یہ ایک غالی رافضی ہے اسلئے اس نے اپنے باپ کا نام عمر کی جگہ عمیر رکھا اس لئے کہ رافضیوں کا حضرت عمرؓ سے تعصب ہے تو اس تعصب کی وجہ سے جمیع نے بھی اپنے باپ کا نام عمیر بتایا ہے۔

املاء علینا من کتابہ، کہ اس نے ہمیں اپنی کتاب سے املاء کروائی،محدثین کرام کا ایک تو روایت حدیث یہ تھا کہ صرف نفس روایت کو بیان فرماتے تھے۔اس کے الفاظ کی تشریح،معانی اور مطالب نہیں ہوتے تھے۔اور دوسرا طریقہ یہ تھا کہ الفاظ حدیث کے ساتھ ساتھ ان الفاظ کے معانی مطالب اور تشریح بھی بیان کرتے تھے۔اور اسی کو املاء کہا جاتا تھا۔مگر یہاں املاء سے یہ اصطلاحی معنی مراد نہیں بلکہ یہاں لغوی معنی یعنی لکھوانا مراد ہے۔مطلب یہ ہے کہ جمیع نے یہ روایت اپنی کتاب (۱) سے لکھوادی۔

صاحب مواہب نے لکھا ہے کہ ھو الالیق ھناکہ یہی معنی مناسب ہے۔

رجل من بنی تمیم من ولدابی ھالۃزوج خدیجۃ یکنٰی أباعبداللّٰہ ،اس آدمی کے نام میں اختلاف ہے بعض نے یزید بن عمرو بتایا ہے جبکہ بعض نے عمرو اور بعض نے عمیر (۲)۔اس لئے یہ آدمی مجہول ہے اور اس کی اس جہالت کی وجہ سے روایت بھی معلول ہے۔

اُبو ہالہ کون تھے: یہ ام المؤمنین خدیجۃ الکبریٰؓ کے شوہر اول تھے اس کا نام مالک،ہند،نباش بن زرارہ یا زرارہ بن نباش بتایا جاتا ہے۔

---

(۱) حفاظت حدیث کے تین طریقے ہیں (۱) حفظ (یاداشت) اس طریقے کا سارا مدار حافظہ پر ہوتا ہے (۲) تعامل یعنی سنی گئی روایات پر عمل کرنا اس کا مدار عمل پر ہوتا ہے (۳) کتابت (لکھائی) اس طریقے کا مدار کاتب پر ہوتا ہے کہ سنی گئی روایات کو کاغذ وغیرہ پر لکھوا کر محفوظ کردیا جائے۔یہ تین طریقے روز اول سے رائج تھے۔(مختار)

(۲) اور علامہ نورالدین علی بن ابی بکر الہیثمیؒ نے لکھا ہے قال ابوعبیدابوھالۃ کان زوج خدیجۃ قبل رسول اللّٰہ ﷺ واسمہ النباش وابنہ ھندبن النباش من بنی اُسیدبن عمرو بن تمیم(مجمع الزوائد۸/۱۹۴ کتاب علامات النبوۃ(مختار)

یکنٰی أباعبداللہ، یعنی ابوہالہ کا تعارف زوج خدیجہ سے جس شخص نے کیا ہے اس کی کنیت ابوعبداللہ ہے اور ترتیب کے لحاظ سے یہ جملہ رجل موصوف کے لئے صفت ثالثہ ہے۔ اس لئے کہ نحوی ترتیب کے لحاظ سے رجل موصوف من بنی تمیم صفت اول من ولد أبی ھالہ زوج خدیجۃ پورا جملہ صفت ثانیہ اور یکنٰی الخ صفت ثالثہ۔

ایک اشکال کا جواب: البتہ یہاں ایک اشکال وارد ہوتا ہے کہ یکنّی تو فعل مجہول کا صیغہ ہے۔ اباعبداللہ اس کا نائب فاعل ہوا جبکہ قانون یہ ہے کہ جس طرح فاعل مرفوع ہوتا ہے۔ نائب فاعل بھی مرفوع ہوتا ہے تو یہاں ابوعبداللہ ہونا چاہئے تھا جبکہ یہاں أباعبداللہ ہے تو یہ منصوب کیوں؟

الجواب: تو اس اعتراض کے اہل علم حضرات نے مختلف جوابات دیئے ہیں۔

(۱) بعض کا تو کہنا ہے کہ یہاں اباعبداللہ نائب فاعل نہیں بلکہ مفعول ثانی ہے اور نائب فاعل ھو ضمیر مضمر ہے اور مفعول کا اعراب نصب ہے۔

(۲) بعض نے لکھا ہے کہ یہاں یہ بھی احتمال ہے کہ یہاں أباعبداللہ منصوب بالمدح ہو اور اعنی فعل مقدر ہو یعنی یکنی اعنی أباعبداللہ ہوگا۔

(۳) اور یہ جواب بھی دیا گیا ہے کہ نصب نزع حافض ہے اصل عبارت یہ تھی یکنیٰ بأبی عبداللہ یکنّیٰ أباعبداللہ ہوا۔

عن إبن أبی ھالۃ، ابوہالہ کے بیٹے کا نام ہند ہے اور سند میں ابوعبداللہ کے نام سے ذکر ہوا۔ اس کا نام بھی ہند ہے مگر اس کو ابوعبداللہ کے نام سے ذکر کیا تاکہ تمیز آجائے۔

سالتُ خالی ھند بن ابی ھالۃ، یہ حضرت حسنؓ کے ماموں تھے اس لئے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے ساتھ نکاح کیا تو اس کے ساتھ پہلے شوہر ابوھالۃ کا ایک بیٹا تھا جس کا نام ہند تھا۔ اور حضرت فاطمہؓ حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ کی بیٹی تھی۔ اس لئے ہند بن ابی ہالہ(۱) حضرت

---

(۱) ھند بن ابی ہالہ حضور اقدس ﷺ کے ربیب تھے کیونکہ جب آپ ﷺ نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ کے ساتھ شادی کرلی تو آپ ؓ بچپن میں آپ ﷺ کی پرورش میں آئے۔ چنانچہ وہ آپ ﷺ کے ربیب بنے۔ اس لئے وہ آپ ﷺ کے ساتھ بے تکلف تھے۔ اسلئے آپ ﷺ کے عادات، خصائل اور حلیہ مبارک کا آپ کو خوب علم تھا (مختار)

فاطمہؓ کا اخیافی بھائی بنا۔ اور اسی طرح وہ حضرت حسنؓ کا ماموں بھی ہوا۔ اس لئے آپؓ نے فرمایا کہ میں نے اپنے ماموں ہند بن ابی ہالۃ سے پوچھا چونکہ وہ آپ ﷺ کے ربیب تھے اور بچپن آپ ﷺ کی پرورش میں گزرا تھا۔ اور آپ ﷺ سے بے پناہ محبت تھی اس عشق و محبت کی وجہ سے وہ آپ ﷺ کی بہت زیادہ تعریف کیا کرتا تھا۔

سوال: یہاں پر ایک سوال اٹھتا ہے حضرت حسنؓ گھر کا فرد تھا تو اس کو خود آنحضرت ﷺ کے بارے میں خود علم ہونا چاہئے تھا۔ اس نے اپنے ماموں سے کیوں پوچھا؟

الجواب: تو حضرات محدثین نے اس اشکال کا جواب یہ دیا ہے کہ جس وقت آنحضرت ﷺ کا وصال ہوا تو حضرت حسنؓ کی عمر سات سال (۱) تھی۔ اور ظاہر بات ہے کہ اس کا بچپنا تھا ابھی پختگی نہیں آئی تھی اور نہ اتنی عمر میں علم و فہم کا ذوق ہوتا ہے لیکن جب پختگی آئی اور علم و آنحضرت ﷺ کے سیرت و کردار، عادات و اخلاق کے جاننے کا جذبہ پیدا ہوا تو آپؓ نے اپنے ماموں سے پوچھا جو آپ ﷺ کیساتھ زیادہ رہ چکے تھے اور اس کو رسول اللہ ﷺ کے عادات و اخلاق کا بہت زیادہ علم تھا اور خود نہ جاننے اور اپنے نانا محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں جاننے کے ذوق و خواہش پر آپؓ کا یہ جملہ کہ **وانا اشتهی ان یصف لی منها شیئاً أتعلق به،** کہ میری خواہش ہے کہ وہ مجھے آنحضرت ﷺ کے کچھ اوصاف بیان کریں اور میں اس کے ساتھ اپنا تعلق قائم کروں (۲)۔

اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ میں اس کی اقتداء کروں **لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ أسوۃ حسنۃ (الآیۃ)** اے ایمان والوں تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ میں بہترین نمونہ ہے۔

---

(۱) حضرت حسنؓ رسول خدا ﷺ کے نواسے ہیں اور شیر خدا حضرت علیؓ اور خاتون جنت حضرت فاطمۃ الزہرائؓ کے فرزند ہیں آپ ﷺ ۳ھ میں پیدا ہوئے، ۲۲ روایات خود آنحضرت ﷺ سے سنی تھیں۔ آپؓ بڑے حسین و جمیل اور انتہائی بہادر تھے۔ کئی جہادوں میں شریک رہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا **الحسن و الحسین سیّدا شباب اهل الجنة**، بعض لوگوں کی آپؓ سے دشمنی تھی جس کی وجہ سے آپؓ کو زہر دیا گیا۔ چنانچہ ۴۹ھ یا ۵۰ھ کو انتقال کر گئے۔ آپؓ سگے تین بھائی تھے۔ خود آپ، حسین، محسن اور ایک بہن ام کلثوم تھی۔ (مختار)

(۲) تمام صحابہ کرامؓ کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ ہر قول و فعل پر عمل کریں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ آپؓ اپنے قدم بھی وہاں رکھتے تھے جہاں رسول اللہ ﷺ قدم رکھ چکے تھے اور اس جگہ وضو فرماتے تھے جہاں آپ ﷺ وضو کر چکے تھے۔ (مختار)

کان وصّافاً، وصّافا فعّالٌ کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے اور اس کے کئی معانی ہیں کثرت سے بیان کرنا، بار بار بیان کرنا، مزے لے لے کر بیان کرنا، اور یہاں سب معانی لئے جاسکتے ہیں۔

فقال کان رسول اللہ ﷺ فخماً مفخّماً، فخمّاً خاء کے کسرے کے ساتھ باب نصر اور کرم سے وہ شخص مراد ہوتا ہے جو عظمت والا ہو اور جسامت کے اعتبار سے موزون ہو اور **مفخّماً** سے مراد جو لوگوں میں عظمت والا ہو تو مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ خود اپنی ذات میں بھی عظیم تھے اور دوسروں کی نظروں میں بھی عظیم تھے۔ بعض لوگوں میں عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنی ذات میں کمتر ہوتے ہیں مگر دوسروں کے سامنے بڑا بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اصولاً ایسا کرنا بڑا سمجھا جاتا ہے۔ مگر رسول اللہ ﷺ کی بات الگ ہے آپ ﷺ حقیقت میں ایسے ہی تھے کہ **کان عظیماً فیاتی ومعظّماً عندالنّاس** کہ آپ ﷺ اپنی ذات میں بھی عظیم تھے اور لوگوں کی نظروں میں بھی عظیم تھے۔ آپ ﷺ اپنے لئے یہ دعا بھی فرمایا کرتے تھے **اللھمّ اجعلنی فی عینی صغیراً وفی أعین النّاس کبیراً** کہ اے اللہ مجھے اپنی نگاہ میں چھوٹا اور لوگوں کی نگاہوں میں بڑا بنادے۔ اور شیخ عبدالرؤف مناویؒ دوسرا معنی فرماتے ہیں **فخم عظیم عنداللہ معظّم عندالنّاس (مناوی)**

یتلألأ وجھہ تلألؤ القمر لیلۃ البدر رسول اللہ ﷺ کا چہرہ انور چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتا تھا اور یہ کوئی تخیلاتی بات نہیں تھی بلکہ حقیقت میں ایسا ہی تھا۔ لؤلؤ (۱) موتی کو کہا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت چمکتا ہے اس لئے علامہ مناویؒ نے لکھا ہے **لؤلؤ ھو الاضاءۃ والاشراق یتلألؤ وجھہ ای یستنیر ویشرق ویضیءُ.**

أطول من المربوع واقصر من المشذّب، کہ آپ ﷺ کا قد مبارک عام درمیانے قد سے ذرا لمبا تھا اور زیادہ لمبے قد سے قدرے آپ ﷺ کا قد کچھ کم تھا۔

---

(۱) موتی کی حقیقت یہ ہے کہ جب بارش ہوتی ہے تو سمندر میں موجود سیپی کا منہ قدرتی طور پر کھلا رہتا ہے۔ اور جب بارش ہوتی ہے اور بارش کا قطرہ اس سیپی میں داخل ہوجاتا ہے تو سیپی کا منہ قدرتی طور پر بند ہو کر سیپی سمندر کی تہہ میں چلی جاتی ہے اور پھر ایک خاص مدت کے اندر اس بارش کے قطرے سے موتی بن جاتا ہے مردوں کیلئے اس دنیا میں بھی موتیوں کا استعمال روا ہے اور جنت میں تو ایک خاص قسم کا لباس ہے۔ **یحلّون فیھا من اساور من ذھب ولؤلؤ (الآیۃ)** کہ مؤمنوں کو وہاں سونے اور موتیوں کے ہار پہنائے جائینگے جبکہ دنیا میں مردوں کیلئے سونا چاندی کا استعمال حرام اور خواتین کیلئے جائز ہے (مختار)

المربوع درمیانی قد کو کہا جاتا ہے۔امام ذہلیؒ نے لکھا ہے کہ **المربوع ھوإلی الطول اقرب** تو مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا قد مبارک زیادہ دراز نہیں تھا بلکہ طول کی طرف قدرے مائل تھا۔

أقصر من المشذّب (۱)، **مشذّب** باب تفعیل سے جس درخت کی شاخیں کاٹ دی گئی ہوں اس لئے شذب کانٹ چھانٹ کو کہا جاتا ہے۔ درخت کی جب شاخیں کاٹ دی جائیں تو وہ درخت لمبا نظر آتا ہے تو مشذب کا معنی طویل بائن ہے۔اسی سے تشذیب ہے یعنی کھجور یا کسی درخت کی زائد اور خشک شاخوں کو کاٹنا۔اہل علم نے تہذیب اخلاق کو بھی تشذیب کہا ہے۔مطلب یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا قد مبارک اس درخت کے مانند لمبا نہیں تھا جس کی شاخیں کاٹ دی گئی ہوں بلکہ اس سے کم تھا۔مگر اس کے باوجود اگر کوئی طویل سے طویل تر آدمی آپ ﷺ کے ساتھ چلتا تو آپ ﷺ بلند معلوم ہوتے تھے اور یہ آپ ﷺ کا معجزہ تھا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ہر حیثیت سے رفعت عطا فرمائی تھی۔ **ورفعنالک ذکرک(الآیة)**

عظیم الهامة، هامة کھوپڑی کو کہا جاتا ہے۔اس کی جمع **هامات** آتی ہے۔ اصولی طور پر عرف عام میں بڑا سر محمود اور چھوٹا سر معیوب سمجھا جاتا ہے۔اور سر کا بڑا ہونا عقل مندی کی علامت ہے۔اس لئے جسکا سر بڑا ہو تو اس میں دماغ بھی زیادہ ہوگا اور اس شخص میں سوچنے سمجھنے اور غور کرنے کی استعداد بھی زیادہ ہوگی۔اور جس کا سر چھوٹا ہو تو اس میں دماغ بھی کم ہوتا ہے اور دماغ کم ہونے کی وجہ سے اس میں سوچنے، سمجھنے اور غور کرنے کی صلاحیت بھی کم ہوگی۔تو رسول اللہ ﷺ کا سر مبارک قدرتی طور پر بغیر عارضہ کے اعتدال کے ساتھ بڑا تھا اور ایسا بڑا ہونا کمال کی علامت ہے۔

رجل الشعر، آپ ﷺ کے بال قدرے گھنگریالے تھے **ان انفرقت عقیقته فرق والافلا** اگر آپ ﷺ کے سرمبارک پر مانگ نکل آتی تو نکال لیتے ورنہ چھوڑ دیتے یعنی مانگ نکالنے میں تکلف نہیں فرماتے تھے۔

عقیقته، کا لفظ بال اتارنے اور نافرمانی کرنے میں استعمال ہوتا ہے۔عقیقۃ کو عقیقۃ اس لئے

---

(۱)قال الهیثمی المشذب،المفرط فی الطول وکذلک هو فی کل شئ قال جریر ألوی بهاشذب العروق مشذّب..فکانّماوکیب علی طربال(مجمع الزوائد۸/۲۹۱)کتاب علامات النبوة(مختار)

کہاجاتا ہے کہ اس میں بچے کے بال کاٹے جاتے ہیں(۱)۔مگراس روایت میں مطلق بال مراد ہیں اوراس لفظ کے استعمال کی وجہ شاید یہی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں پیدا ہونے کے بعد اس کے بال اتارے جاتے تھے اور کچھ اور رسومات ادا کی جاتی تھیں اور وہ تمام رسومات آنحضرت ﷺ کی نہیں کی گئیں تو یہ بال آنحضرت ﷺ کے عقیقہ والے بال تھے۔

مگر بعض اہل علم نے اس کو رد کیا ہے۔اس لئے کہ آپ ﷺ کا تعلق بنوہاشم سے تھا اور بنوہاشم عرب کا شریف خاندان اور ایک شریف خاندان سے کیسے ممکن ہے کہ ایسے کام میں غفلت کرے۔اس لئے ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے **فأنّہ مستبعد جداً فی العادة فأنّ عادتھم حلق الشعر المولود فی السابع و کذا ذبح الغنم و اطعام الفقراء(جمع ۱/۴۲)**(۲)

آنحضرت ﷺ کا قدرتی مانگ: **فلایجاوز شعرہ شحمة اذنیہ اذاھو وفرة**،رسول اللّٰہ ﷺ نے تین طرح کے بال رکھے تھے۔

(۱) وفرة،جب بال کانوں کے لوتک پہنچ جائے تواسے وفرہ کہاجاتا ہے۔

(۲) لمّۃاور جب بال کانوں کے لو سے تجاوز کر جائے اور منکبین تک نہ پہنچے ہوں تو اسے جمہ کہاجاتا ہے

(۳) جمّة، جوکانوں کی لو سے تجاوز کر کے منکبین تک پہنچ جائیں تو اسے جمہ کہاجاتا ہے گویارسول اللّٰہ ﷺ کے بالوں کا حد اول وفرہ تھا درمیانی حد لمّۃ تھا اور آخری حد جمّۃ تھا۔مگر عموماً آپ ﷺ کے بال وفرہ ہوا کرتے تھے(۳)۔

---

(۱)علامہ مناویؒ نے لکھا ہے **والعقیقة کالحقیقة و اصل العق القطع و الشق و من ثم قیل للذبیحة التی تذبح عن المولود یوم سابعہ عقیقة لانّھا یشقّ حلقھا وقیل للشعر الخارج علی رأس المولود من بطن أمہ عقیقة لأنّہ یحلق ثم قیل للشعر النابت بعدذلک عقیقة مجازاً لأنّہ منھا و نباتہ من اصول(مناوی علی ھامش جمع الوسائل ۱/۴۲)(مختار)**

(۲)بعض شارحین نے لکھا ہے کہ ممکن ہے رسول اللّٰہ ﷺ کے بال معجزانہ طور پر رہ چکے ہوں اس لئے کہ رسول اللّٰہ ﷺ کا والد محترم ان کی پیدائش سے تقریباً چھ ماہ قبل وفات پا چکے تھے اور آپ ﷺ کے بال باقی رکھے گئے تا کہ ان پر مشرکانہ رسوم ادا نہ کی جائیں۔(مختار)

(۳)مردوں کے لئے اس طرح کے بال رکھنا جائز بلکہ موافق السنۃ ہیں اور اس سے زیادہ لمبے کرنا جیسے کہ آج کل کے فیشن ایبل حضرات،خواتین کی طرح بال رکھتے ہیں خلاف سنت اور گناہ ہے(مختار)

ازھر اللون، رسول اللہ ﷺ کا رنگ مبارک سرخ وسفید تھا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے رنگ مبارک میں ایک خاص چمک تھی(۱)۔اور ویسے سے بھی عموماً سرخ وسفید رنگ زیادہ خوبصورت لگتا ہے۔

واسع الجبین، رسول اللہ ﷺ کشادہ جبین والے تھے یعنی آپ ﷺ کی پیشانی طولاً وعرضاً کشادہ تھی۔انسان میں ایسی پیشانی حسن کی علامت ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پیشانی مبارک ایسی چمکدار تھی کہ گویا سورج دوڑ رہا ہے۔علماء کرام فرماتے ہیں کہ جبین کا وسیع اور کشادہ ہونا خوش قسمتی کی علامت ہے۔ایسا آدمی عموماً سخی اور خوش اخلاق ہوتا ہے۔پیشانی اگر وسیع اور کشادہ ہو تو آدمی باوقار اور وجیہہ معلوم ہوتا ہے۔

ازجّ الحواجب الخ ،رسول اللہ ﷺ کے آبرو باریک اور خمدار ہونے کے ساتھ ساتھ کامل تھے مگر ملے ہوئے نہ تھے اور ان دونوں ابروؤں کے درمیان ایک باریک رگ تھی جو غصہ کے وقت ابھرتی تھی۔ ازج زجّ سے مشتق ہے۔جس کا معنیٰ ہے دوڑنا، نیزہ مارنا زجاج شیشہ کو کہا جاتا ہے اور نیزے کے پھل کو بھی زج کہا جاتا ہے۔

حواجب ،حاجب کی جمع ہے اور حاجب دربان اور چوکیدار کو کہا جاتا ہے چونکہ یہ بھویں بھی آنکھوں کی حفاظت کرتی ہیں اور جب کوئی شے آنکھوں کی طرف آتی ہے تو یہ بھویں خود بخود بند ہو جاتی ہیں اور آنکھوں کو اس چیز کے نقصان سے بچاتی ہیں۔

<u>حواجب کے تین صفات:</u> بھوؤں اور آبروؤں میں تین صفات کا ہونا حسن وجمال کا باعث ہوتا ہے۔ (۱)طویل ہونا (۲)باریک ہونا (۳)دونوں ماجبین کے درمیان قدرے فاصلہ ہونا تو ازج میں اول دو صفات کا ذکر ہے اور سوابغ من غیر قرن میں تیسری صفت کا ذکر ہے۔

<u>حواجب جمع ذکر کرنے کی وجہ:</u> یہاں ایک اشکال ہوتا ہے کہ حواجب جمع کا صیغہ ہے جب کہ ہر انسان کے دو حاجبین ہوتی ہیں تو حدیث پاک میں حاجبین کیوں مذکور نہیں حواجب کا ذکر کیوں ہے؟

<u>الجواب:</u> مگر اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ عربی لغت میں کبھی کبھی تثنیہ پر بھی جمع کا اطلاق ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حمل مبالغۃً ہو اور یہ مبالغہ ان دونوں کے امتداد کی وجہ سے ہو۔

---

(۱)قال أبو حنيفةؒ الزهرة اشراق فی الألوان (مناوی ص۴۳)(مختار)

عرق واعصاب میں فرق: یہاں یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ عرق جس کی جمع عروق ہے ان رگوں کو کہا جاتا ہے جو مجوف ہوں اور عصب جمع اعصاب ان رگوں کو کہا جاتا ہے جو مجوف نہ ہو۔ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے العرق بکسر العین هو أجوف يكون فيه الدم والعصب غير أجوف (جمع ۴۴)

تو رسول اللہ ﷺ کا بین الحاجبین والی رگ غصہ کے وقت ابھرتی تھی جو رسول اللہ ﷺ کے انتہائی قوت غضب پر دلالت کرتی ہے۔

اقنى العرنين الخ، رسول اللہ ﷺ کی ناک باریک، بلند اور قدرے لمبی تھی۔ چہرے کے حسن میں ناک کے باریک اور بلند ہونے میں بڑا دخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل ذوق ناک میں تین صفات کا موجود ہونا حسن و جمال تصور کرتے ہیں (۱) قدرے لمبائی (۲) باریک ہونا (۳) قدرے بلند ہونا۔ اور ناک مبارک پر ایک نور اور چمک ہوتا تھا۔

كث اللحية (۱)، اور آپ ﷺ کی داڑھی مبارک گھنی تھی۔ کث گنجان کو کہا جاتا ہے۔ باب نصر سے گھنا ہونا اور گنجان ہونا آتا ہے۔ اہل علم کا کہنا ہے کہ داڑھی کا گھنا اور وسیع ہونا خوشنمائی کی علامت ہے اور چوڑی و لمبی داڑھی سے چہرہ حسین وجمیل لگتا ہے۔

داڑھی کی مقدار: ائمہ اربعہ کے ہاں ایک مشت کے برابر داڑھی رکھنا لازمی ہے۔ اور ایک مشت سے زیادہ ہو تو اس کا کٹوانا جائز ہے۔ بعض مصری علماء کرام داڑھی کو سنت عادیہ سمجھتے ہیں اور سنت عادیہ کی مخالفت موجب گناہ یا ملامت نہیں۔ البتہ جمہور اہل علم داڑھی کو سنت مؤکدہ سمجھتے ہیں۔

سهل الخدين: اور آپ ﷺ کے رخسار ہموار تھے رخساروں کا نرم اور ہموار ہونا اور کیل چھائیوں، داغ دھبوں سے محفوظ ہونا حسن سمجھا جاتا ہے۔

سهل اس زمین کے مقابلے میں استعمال کیا جاتا ہے جو بلند و بالا ہو۔ تو سہل کا معنیٰ ہے غیر مرتفع۔ مطلب حدیث کا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے رخسار مبارک بالکل صاف، نرم، ہموار اور پُر گوشت تھے۔

کشادہ دہن: ضليع الفم ضلع دراصل پسلیوں کی صفت ہے۔ چوڑی اور لمبی پسلیوں والے کو

---

(۱) علامہ ہیثمیؒ نے لکھا ہے الكثونة ان تكون اللحية غير رقيقة ولا طويلة ولكن فيها كثانة من غير عظم ولا طول (مجمع الزوائد ۳/ ۲۹۲ کتاب علامات النبوة) (مختار)

ضلیع کہتے ہیں یہاں مطلق کشادگی کے معنی پر ہے بعض اقوام کے ہاں بہت چھوٹا منہ حسن سمجھا جاتا ہے اور بعض کشادہ دہنی کو حسن سمجھتے ہیں نبی کریم ﷺ کا منہ مبارک زیادہ چھوٹا نہ تھا بلکہ اپنے جسم کے دیگر اعضاء کے بالکل موافق ذرا کھلا ہوا اور کشادہ تھا۔ یہ صفت دراصل **ما فی الضمیر** کے بہتر اظہار کرنے میں مد ہوتی ہے فصاحت کی علامت ہے اور خطابت اور دعوت کے کام میں معاون ہے۔

<u>گردن اور دانتوں کی خوبصورتی:</u> **مفلّج الأسنان فلج** دانتوں کی کشادگی کو کہتے ہیں اور دانتوں کے درمیان تھوڑی کشادگی فطری حسن کو جلا بخشتی ہے بالکل بند اور ملے ہوئے دانت خوبصورت بھی دکھائی نہیں دیتے اس کے مقابلے میں جو صفت آتی ہے وہ **الصّ** ہے جو کہ ملے ہوئے دانتوں والے شخص کو کہتے ہیں لیکن شرّاح کہتے ہیں کہ **فلج** آپ ﷺ کے ثنایا یعنی آگے کے دانتوں میں تھا جو کہ ممدوح صفت ہے بخلاف پچھلے دانتوں کے ان میں فلج نہیں تھا۔

کان عنقه جید دمیّة آپ ﷺ کی گردن گڑیا کی گردن کی طرح ہموار تھی گویا کسی ماہر مصور نے انگلیوں سے بنائی ہو۔ **الدمیّة المنحوت من العاج او الرخام** یعنی ہاتھی دانت یا سنگ مرمر کو تراش کر بنائی ہو۔ گڑیا کو دمیّة کہتے ہیں۔ دمیٰ اس کی جمع ہے۔ متنبّی کا شعر ہے کہ

خرجت غداة النفر اعترض الدمیٰ　　　فلم ارأحلیٰ منک فی العین و القلب

الغرض آپ ﷺ کی گردن مبارک بھی اعتدال واستواء اور حسنِ ساخت میں ایسی تھی جیسے کسی ماہر بت تراش نے ہاتھی دانت سے تراش کر بنائی ہو۔

معتدل الخلق یہ گزری ہوئی تفصیل کے لئے اجمال ہے یا پھر بعد کے لئے اجمال ہے یعنی خلاصہ کلام یہ ہے کہ ساری جسمانی ساخت میں بہت زیادہ اعتدال تھا گویا آپ ﷺ سڈول جسم کے مالک تھے۔ ہر ہر چیز میں توازن اور اعتدال وتناسب تھا۔

<u>جسم نہایت معتدل تھا:</u> **بادن متماسک** ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ اس سے قبل کے الفاظ کان کی خبریت کی بناء پر منصوب تھے لیکن آگے کے الفاظ مرفوع مروی ہیں۔ آپ ﷺ فربہ تھے لیکن اعضاء میں تماسک تھا یعنی اعتدال کے ساتھ اعضاء پر گوشت تھے۔ لیکن ان کا گوشت لٹکا ہوا نہیں تھا جس طرح کے

پہلے بھی مطھم ہونے کی نفی کی گئی ہے۔عموماً ورزش اور جفاکشی کی کمی اور تنعم و بسیارخوری کے باعث جسم کا گوشت جوانی ہی میں لٹکنے لگتا ہے لیکن نبی کریم ﷺ کی زندگی تو فوجی زندگی تھی جفاکشی کے کاموں اور سخت سے سخت تر مشقت کے کاموں میں آپ ﷺ پیش پیش رہتے تھے۔عبادات میں بھی ایسا انہاک تھا کہ پاؤں میں ورم آجاتا تھا اس وجہ سے بدن میں پکڑ پیدا ہوا تھا یعنی گوشت ہڈیوں کے ساتھ اور اعضاء ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے چمٹے ہوئے تھے۔یہ صفت صحت وتندرستی کی علامت بھی ہے۔اور بظاہر یہی لگتا ہے کہ آپ ﷺ کی یہ صفت بڑھاپے تک برقرار تھی۔

سواء البطن والصدر زیادہ خوراک اور کم ورزش کے باعث عموماً پیٹ بڑھ جاتا ہے وزن بڑھ جاتا ہے جو ایک طرح بدصورتی کے ساتھ ساتھ سستی اور کاہلی کا سبب بنتا ہے۔دوسری طرف کئی بیماریوں کا خطرہ پیدا ہوتا ہے۔اطباء کا اس پر اتفاق ہے کہ پیٹ بڑھنا ایک مستقل بیماری ہے لیکن آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ کو تو **قوت لا یموت** ملتی تھی پھر مشقتیں اور جفاکشی اس پر مستزاد ہوتی تھی۔نیز دین کا غم اور امت کی فکر الگ کھائے جارہی تھی اس لئے پیٹ بڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔جس کی وجہ سے جسم بہت معتدل تھا۔**عریض الصدر** بعض روایات میں **رحب الصدر** آیا ہے سینہ کا چوڑا ہونا مردانہ حسن کے علاوہ تحمل اور بردباری کی علامت بھی ہے۔

__جسم مبارک کی رنگت:__ **انور المتجرّد** ،متجرد بدن کے اس حصے کو کہتے ہیں جس پر بال نہ ہوں یا اس حصے کو جس سے کپڑا ہٹایا جائے یعنی برہنہ حصے کو کہتے ہیں۔اس لفظ کی تفسیر میں دو احتمال ہیں یہ بھی صحیح ہے کہ جب آپ ﷺ کپڑا بدن سے ہٹادیتے تو چھپے ہوئے اعضاء ظاہر ہوکر دوسرے اعضاء کی نسبت زیادہ روشن دکھائی دیتے تھے کیونکہ کھلے ہوئے اعضاء کا رنگ گندم گون ہوتا ہے لیکن اس سے بہتر تفسیر یہ ہے کہ عام حالت میں جو اعضاء کپڑے سے خالی اور ظاہر ہوتے ہیں وہ منور اور روشن ہوتے تھے جبکہ کپڑے کے اندر چھپے ہوئے اعضاء تو اور بھی زیادہ منور ہوتے تھے۔اس توجیہ میں اس قول پر رد بھی ہوجاتا ہے کہ آپ ﷺ کا رنگ گندم گون تھا۔

__سینہ کے بال:__ **موصول مابین اللبة والسرة بشعر** سینے کے اوپر گڑھا سا دکھائی دیتا ہے لبہ

کہلاتا ہے اور سرۃ ناف کو کہتے ہیں۔ان دونوں کے درمیان بالوں کی ایک لکیر تھی جو باریکی میں خط جیسے تھی۔اسی مفہوم کو پہلے دقیق المسربۃ سے بیان کیا گیا ہے۔

عاری الثديين و البطن مما سوىٰ ذالک اس خط اور بالوں کی لکیر کے علاوہ سینہ اور پیٹ پر بال نہیں تھے۔بعض لوگوں نے اس روایت سے اور حضرت انسؓ کی روایت سے جس میں **بیاض الإبط** کا ذکر ہے۔بغلوں کے نیچے کے بالوں کی بھی نفی کی ہے مگر یہ درست نہیں کیونکہ روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ بغلوں کے بالوں کو نکالا کرتے تھے۔

أشعر الذراعين و المنكبين و اعالي الصدر، اشعر اجرد کی ضد ہے یعنی مذکورہ حصوں پر بال زیادہ اور طویل تھے۔**طويل الزندين**، زند کلائی کو کہتے ہیں آپ ﷺ کی کلائیاں طویل اور لمبی تھیں۔

رحب الراحة آپ ﷺ کی ہتھیلیاں چوڑی اور کشادہ تھیں اس لحاظ سے بھی ان میں فراخی پائی جاتی تھی اور یہی حسن فراخی اس معنوی فراخی پر بھی دلالت کرتی ہے جو کہ نبی کریم ﷺ میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔چنانچہ آپ ﷺ کی سخاوت بے مثل تھی بعض لوگوں نے اس جملہ کا معنیٰ ''**واسع القوة**'' سے بھی کیا ہے یعنی شدائد کے وقت آپ ﷺ بہت مضبوط اور جمے ہوئے رہتے تھے۔لیکن پہلا معنیٰ راجح ہے کیونکہ یہاں بدن کی ظاہری ساخت کا بیان مقصود ہے۔

<u>ہاتھ پاؤں اور اطراف کا ذکر:</u> **سائل الأطراف او قال شائل الأطراف** راوی کو شک ہے کہ اس کے استاد نے سائل کا لفظ بولا تھا یا شائل کہا تھا بلکہ بعض روایات میں **سائن الأطراف** اور بعض روایات میں **سائر الاطرف** بھی آیا ہے جو سائل کے قریب المعنیٰ ہیں سائل **سال يسيل** کا اسم فاعل ہے جس کے حقیقی معنیٰ ''بہا ہوا'' ہوتے ہیں لیکن یہاں پر لمبا ہونے کے معنیٰ میں مستعمل ہے کہا جاتا ہے ''**سالت غرة الفرس**'' بمعنیٰ **استطالت و عرصت** اور شائل **شال يشول** کا اسم فاعل ہے جو رفع اور ارتفاع یعنی متعدی اور لازم دونوں معنوں میں مستعمل ہے کہتے ہیں **شال الميزان** ترازو کا ایک پلڑا دوسرے سے اونچا ہوگیا اور ''**شال الفرس ذنبه**'' کا معنیٰ ہے گھوڑا دم اٹھا کر بھاگا۔اطراف ہاتھ پاؤں اور سر یعنی دھڑ سے جدا ہونے والے اعضاء نیز انگلیوں پر بھی بولا جاتا ہے بہر حال یہاں پر نبی کریم ﷺ کے ہاتھ

پاؤں کا ذکر ہے کہ وہ لمبے اور سیدھے تھے۔ٹیڑھے اور چھوٹے نہ تھے۔

قدم مبارک کی ساخت: خمصان الأخمصین ،خمصان فتح خاء کے ساتھ بھی درست ہے لیکن روایت ضم خاء کے ساتھ ہے یہ مبالغہ کا صیغہ ہے اور أخمص بھی خمص خموصا ومخمصة سے ہے جس کے اصل معنی خالی ہونے کے ہیں أخمص اس آدمی کو کہتے ہیں جس کے پاؤں کا درمیانی حصہ گوشت سے خالی ہو اور چلتے وقت سارا پاؤں زمین پر نہ لگے اور اس کا دوسرا معنی ہے"ما یتجا فیٰ عن الأرض عند وضع القدم"یعنی پاؤں کا وہ حصہ جو چلتے وقت زمین پر نہ لگے یہاں پر بھی اس دوسرے معنی میں مستعمل ہے یہ وصف پاؤں کے حسن میں اضافہ کرتا ہے اس کے برعکس پاؤں پر گوشت زیادہ ہو اور سارے کا سارا زمین پر پڑے تو یہ متورم اور بدصورت دکھائی دیتا ہے۔أخمص قدمین کو کہا جاتا ہے۔متنبی کا شعر ہے کہ فبایّماقدم سعیت إلیٰ العُلیٰ ادم الھلال لاخمصیک خذاء

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کے پاؤں میں یہ صفت ثابت کی گئی ہے لیکن حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث میں آتا ہے کہ"اذا وطئی بقدمه وطئی بکلّها لیس له أخمص"جس میں اس صفت کی بصراحت نفی کی ہے سند کے لحاظ سے بھی محدثین کے ہاں بہ نسبت اس حدیث کے ابو ہریرہؓ کی حدیث قوی ہے کیونکہ ہند کی اس حدیث میں جمیع کے علاوہ مجہول راوی بھی ہیں۔لہٰذا اس حدیث کی توجیہ میں یہی کہا جائے گا کہ چونکہ نبی کریم ﷺ کے قدم مبارک کا خمص نہایت اعتدال پر تھا نہ معدوم تھا۔اور نہ اتنا زیادہ تھا کہ پاؤں ٹیڑھا نظر آئے۔اس لئے ہند کی اس حدیث میں جس خمص کا اثبات ہے وہ معتدل خمص ہے اور ابوھریرہؓ کی حدیث میں جس خمص کی نفی ہے وہ اعتدال سے باہر کا خمص ہے اور اسی وجہ سے خمصان کا معنی بھی زیادہ أخمص نہیں کیا جائے گا بلکہ یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کا خمص نہایت معتدل تھا۔اس طرح دونوں حدیثوں کا تعارض ختم ہو جاتا ہے ۔ مسیح القدمین مسیح چکنے اور ہموار کو کہتے ہیں اور یہ اس لئے کہ مسح اور مسلسل ملنا ہموار اور چکنے ہونے کا سبب بنتا ہے آپ ﷺ کے پاؤں مبارک نشیب وفراز سے خالی تھے ہڈیاں اِدھر اُدھر کو نکلی ہوئی نہ تھیں۔

ینبو عنھما الماء چونکہ پاؤں میں دراڑیں وغیرہ نہ تھیں اس لئے پانی پڑتے ہی ان سے جدا ہو

جاتا تھانبا ینبو ،نبوۃ کے معنی اچٹنا کے ہیں کہتے ہیں ''لکل سیف نبوۃ ولکل جواد کبوۃ'' یعنی تلوار جو بھی ہو کبھی کبھی اچٹ جاتی ہے اور گھوڑا بہترین ہو تو بھی کبھی کبھی ٹھوکر کھا جاتا ہے۔

سبک رفتاری: ویمشی ھوناً آرام سے جانے کا مقصد وقار و سکون کی رفتار ہے جس میں جلدی نہ ہو اگرچہ تیز ہو اور دراصل اس میں عجلت کی نفی مقصود ہے جس کا تو ہم زال قلعا سے ہوسکتا ہے۔عباد الرحمٰن کی صفت میں ہے الذین یمشون علی الأرض ھونا جس میں تکبر اور تبجر کا شائبہ نہ ہو۔

ذریع المشیۃ ،مشیۃ ایک قدم اور دوسرے قدم کے درمیانی مساحۃ کو کہتے ہیں کچھ لوگ چلتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہیں یہ تکاہل و سستی یا تکبر کی علامت ہوتی ہے۔اس کے برعکس نبی کریم ﷺ بے تکلفی کے ساتھ لمبے ڈگ بھرتے تھے۔چستی کے ساتھ جمے ہوئے قدم اٹھاتے تھے نیز تکبر سے محفوظ تھے۔ چنانچہ فطری طور پر آپ ﷺ کی رفتار بھی تیز ہوتی تھی۔ایک صحابی فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ جاتے تو گویا زمین آپ ﷺ کے لئے سمٹی جاتی تھی بعض لوگ طـــــیّ الأرض کو آپ ﷺ کا معجزہ قرار دیتے ہیں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔لیکن ہر جگہ اسے معجزہ پر بھی حمل نہیں کیا جائیگا۔مثلاً اسراء اور معراج میں تو اس معجزہ کا ظہور رہوا۔لیکن عمومی طور پر ویسے ہی آپ ﷺ کے قدم بھی لمبے تھے۔جس کی وجہ سے رفتار بھی تیز تھی۔واذا التفت التفت جمیعاً اس کی تشریح پہلے گزر چکی ہے۔

دنیا سے صرفِ نظر: خافض الطرف آپ ﷺ میں یہ کمال درجہ کی حیا موجود تھی کسی سے بات کرتے تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ کرتے نظر اکثر نیچی ہوتی تھی دنیا اور جہانداری کی چیزوں کو کبھی نظر بھر کر نہیں دیکھا۔دنیا سے آپ ﷺ کا تعلق ہی نہ تھا اللہ تعالیٰ ہی سے تعلق تھا۔نبوت کی ذمہ داریوں اور فرائض کے بوجھ نے آپ ﷺ کو اجازت ہی نہ دی کہ دنیا کی طرف میلان بھی پیدا ہو۔خود فرماتے ہیں کہ مالی وللدنیا ما أنا إلاکراکب استظلّ تحت الشجرۃ دنیا سے مجھے کیا کام میں تو ایک مسافر کی طرح ہوں جو تھوڑی دیر ستانے کے لئے درخت کے نیچے بیٹھ جائے۔

یعنی اصل منزل ہماری آخرت ہے دنیا اور اس کے کاموں میں دل لگانا اولیاء اور انبیاء کا کام نہیں غالباً المدخل میں نظر سے گزرا۔ایک بزرگ جن کا نام غالباً محمد بن اسلم تھا یا کوئی اور راستے میں جارہے

تھے ایک کوٹھی پر نظر پڑی تو کھڑے ہو کر پوچھا من ھذہ الدار یہ گھر کس کا ہے پھر خیال آیا کہ یہ کیا کیا۔ آخر تیرا اس سے کیا مطلب۔ اس پر نہ تیری دنیا موقوف ہے نہ آخرت، مجھے اس سوال سے کیا تعلق؟ چنانچہ ایک سال تک اس ایک نگاہ غلط انداز اور لایعنی سوال کا کفارہ ادا کرنے کے لئے روزے رکھے۔

بہر حال نبی کریم ﷺ نے بھی ہمیشہ دنیا سے صرف نظر کر کے آخرت اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ دی فکر آخرت اور مشاہدہ عالم الغیب میں مشغول رہے جس کی وجہ سے نظر عموماً نیچی رہتی تھی نیز اس عمل میں ایک گونہ تواضع اور انکسار بھی تھا جو کہ آپ ﷺ کی فطری خوبی تھی۔ **نظرہ إلی الأرض أطول من نظرہ إلیٰ السماء** یہ ماقبل کے لئے تاکید ہے۔ لیکن ابوداؤدؒ نے حضرت عبداللہ بن سلامؓ کی حدیث نقل فرمائی ہے وہ کہتے ہیں کہ **کان ﷺ إذا جلس یتحدّث یکثر ان یرفع طرفة إلی السماء.** نبی کریم ﷺ جب بیٹھے ہوئے باتیں کیا کرتے تھے تو اکثر آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے تھے۔

تطبیق بین الاحادیث: ان دونوں حدیثوں میں تطبیق یوں کی گئی ہے جب آپ ﷺ خاموش بیٹھے ہوتے تھے تو نظر زمین پر ہوتی تھی اور باتیں کرتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا کرتے تھے۔ یا یوں کہ آپ ﷺ عام حالت میں نظر نیچی رکھتے تھے کیونکہ دنیا اور اس کے لوازم سے کوئی غرض نہ تھی لیکن وحی کا انتظار ہوتا تھا تو نظر آسمان کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ **جلّ نظرہ الملاحظة، ملاحظة** "نظر بالالحاظ" یعنی کن انکھیوں سے دیکھنے کو کہتے ہیں **لحاظ** آنکھ کے اس گوشہ کو کہتے ہیں جو کان کی طرف ہوتا ہے بعض متصوفین دنیا کی ہر چیز کو یک قلم رد کر دیتے ہیں اور عیسائی راہبوں کے طریقہ پر چلتے ہوئے کبھی کبھار غلط نگاہ بھی دنیا پر ڈالنا گوارا نہیں کرتے جس کی وجہ سے اکثر ان کے متعلقین کے دل ٹوٹ جاتے ہیں۔ لیکن نبی کریم ﷺ کا عمل اس کے برعکس تھا آپ ﷺ کسی شخص کو کسی چیز میں دلچسپی لیتے ہوئے دیکھتے تو اس کی دلجوئی اور خاطرداری کے لئے آپ ﷺ بھی اس کی دلچسپی میں تھوڑی سی شرکت فرماتے لیکن حریص اور لالچی لوگوں کی طرح انہماک سے احتراز ضرور کرتے بس ایک اوپری سی نظر سے دیکھتے۔ کیونکہ آپ ﷺ کو طمع و حرص کی نظر سے منع کیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ **ولا تمدنّ عینیک إلیٰ ما متّعنا به (آلایة)**

یسوق أصحابه آپ ﷺ صحابہ کی جماعت کے ساتھ چلتے تو ان کے پیچھے پیچھے چلتے آگے نہ

جاتے لوگوں کے آگے جانے والے کو قائد اور پیچھے جانے والے کو سائق کہتے ہیں اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سفر میں پیشوا اور لیڈر کو قوم کے پیچھے چلنا چاہیے تا کہ آگے جانے والوں کی حالت معلوم ہو سکے۔ ویسے بھی نبی کریم ﷺ صحابہؓ کی انتہائی نگہداشت فرماتے تھے ہر وقت ان کی کامیابی و سرفروشی کے لئے فکر منداور ان کے تزکیہ کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ اسی لئے آپ ﷺ صحابہ کے پیچھے چلتے جیسے چرواہے مویشی کو ہانک کر لے جارہے ہوں نیز اس میں تواضع بھی ہے علاوہ ازیں چونکہ آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے فرشتے بھی چلتے تھے۔ لہذا ان کے لئے جگہ خالی کروانے کے لئے بھی آپ ﷺ صحابہ کو آگے کر لیتے تھے۔

یبدأ من لقی بالسلام آپ ﷺ تکبر اور خود پسندی سے نہایت دور رہتے تھے کبھی یہ خیال تک نہیں گزرا کہ لوگ سلوٹ، سلام، استقبال اور خوش آمدید کریں۔ انسانیت کے سب سے عظیم ترین مرتبہ پر فائز ہونے کے باوصف ہر چھوٹے بڑے پر سلام میں سبقت آپ ﷺ کا شیوہ تھا۔ اور یہی انسانیت کی معراج بھی اور گارڈ آف آنر ہے۔ آج کل تو بعض طالبعلم بھی ایسے ہیں کہ راستہ جاتے ہوئے اساتذہ سے ملتے ہیں تو اساتذہ کے سلام کا انتظار کرتے ہیں اور پھر اساتذہ کے سلام کا جواب بھی ٹھیک طرح سے نہیں دیتے۔ بہر حال سلام میں نبی کریم ﷺ کے اتباع کی کوشش کرنی چاہیے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ دو ملنے والوں میں جو شخص سلام میں ابتداء کرے وہی اللہ تعالیٰ سے زیادہ قریب تر ہے(۱)۔

فقہائے کرام کا فیصلہ ہے کہ اگر چہ ابتداء بالسلام سنت ہے اور اس کا جواب واجب ہے مگر اس باب میں واجب کی نسبت سنت کو فضیلت حاصل ہے اور ابتداء بالسلام کا ثواب زیادہ ہے اس لئے یہاں یہ توجیہ درست نہیں ہوگی کہ آپ ﷺ امت کو جوابِ سلام کا موقع دے کر ان سے واجب عمل کروانا چاہتے تھے تا کہ ان کو ثواب زیادہ حاصل ہو۔

(۸) حدثنا أبو موسىٰ محمّد بن المثنیٰ ثنا محمّد بن جعفر ثنا شعبة عن سماک بن حرب قال سمعت جابر بن سمرة يقول كان رسول الله ﷺ ضليع الفم أشكل العين منهوس العقب قال شعبة قلت لسماک ما ضليع الفم قال عظيم الفم قلت ما أشكل العين قال

---

(۱) ترمذی، ابوداؤد، شمائل

طویل شق العین قلت ما منهوس العقب قال قلیل لحم العقب (۱).

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرۃؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ فراخ دہن تھے آپ ﷺ کی آنکھوں کی سفیدی میں سرخ ڈورے پڑے ہوئے تھے ایڑی مبارک پر بہت کم گوشت تھا۔شعبہؒ نے کہا کہ میں نے حضرت سماکؒ سے پوچھا کہ ضلیع الفم کا کیا معنی ہے۔تو آپؒ نے فرمایا عظیم الفم۔ (فراخ دہن) یعنی فصاحت۔ پھر میں نے پوچھا کہ اشکل العین کا کیا معنی ہے۔تو آپؒ نے فرمایا کہ اس سے مراد فراخ چشم ہے۔میں نے پھر کہا کہ منهوس العقب کا کیا معنی ہے۔آپؒ نے کہا کہ کہا گیا ہے لحم العقب۔

عن جابر بن سمرۃؓ، ابوعبداللہ جابر عامریؓ حضرت سعد بن ابی وقاص کے بھانجے ہیں کوفہ میں رہا کرتے تھے اور ۷۴ھ میں وفات پائی ان کے والد حضرت سمرۃ بن جندبؓ بھی صحابی ہیں۔اصل میں فرازی ہیں انصار کے حلیف رہے انہوں نے ۵۹ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔

أشكل العين اس کا ایک معنی یعنی **طویل شق العین** تو سماک سے روایت کر کے مصنف خود کرتا ہے لیکن اکثر علماء کے نزدیک اشکل کے معنی اور ہیں وہ کہتے ہیں کہ آنکھیں دوصفت رکھتی ہیں ایک **شکلة** جو کہ ممدوح ہے دوسری **شهلة** جو کہ مذموم ہے **شکلة** کے معنی یہ ہیں کہ آنکھوں کی سفیدی میں سرخ ڈورے ہوں اور آنکھوں میں خمار سا آجاتا ہے۔اور نشیلی آنکھیں خوبصورت دکھائی دیتی ہیں اور **شهلة** کا مطلب یہ ہے کہ آنکھوں کی سیاہی میں سرخ ڈورے یا نیلا پن ہو یہ صفت آنکھوں کے لئے حسن نہیں بلکہ عیب ہے۔

خلاصہ یہ کہ راجح قول کے مطابق **أشكل العينين** اس شخص کو کہتے ہیں جس کی آنکھوں کی سفیدی میں سرخ ڈورے ہوں۔حافظ عراقیؒ نے کہا ہے کہ آپ ﷺ کی آنکھوں میں **شکلة** آپ ﷺ کی نبوت کی علامات میں سے ایک علامت تھی۔

منهوس العقب اور ایک اور روایت میں **منهوش العقب** بھی آیا ہے نهس اور نهش

(۱) المستدرک للحاکم ۶۴۰/۲

دونوں گوشت کو ہڈی سے الگ کرنے کیلئے نوچنے کو کہتے ہیں۔ یہاں قلیل اللحم کے معنی میں آیا ہے گویا کہ آپ ﷺ کے ایڑیوں کے گوشت کو نوچا گیا ہو۔ یعنی ایڑیاں گوشت سے خالی تھیں۔ قال شعبة شعبہؒ اپنے شیخ سے بعض مشکل الفاظ کے معانی پوچھتے ہیں طویل شق العین شراح کے قول کے مطابق یہ معنی سماکؒ کے وہم کا نتیجہ ہے اس سے قبل اس کے راجح معنی ہم بیان کر چکے ہیں۔

(۹) حدثنا هنادبن السريّ ثناعثربن القاسم عن اشعث يعني ابن سوارعن أبي إسحاق عن جابربن سمرة قال رأيت رسول اللهﷺ في ليلة اضحيان وعليه حلّةٌ حمراء فجعلت انظراليه وإلىٰ القمر فهوعندي أحسن من القمر(۱)

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرۃؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ چاند کی چودھویں رات کو نبی کریم ﷺ کو دیکھا آپ ﷺ اس وقت سرخ جوڑا زیب تن کئے ہوئے تھے میں کبھی چاند کو دیکھتا اور کبھی آپ ﷺ کو پس خدا کی قسم نبی کریم ﷺ میری نظر میں چاند سے زیادہ حسین دکھائی دے رہے تھے۔

ليلة اضحيان علامہ زمخشری کہتے ہیں کہ اس وزن پر اوصاف بہت کم آتے ہیں یہ لفظ ضحو سے ہے جس کے معنی ہیں روشن ہونا۔ ضحی چاشت کے وقت کو بھی کہتے ہیں جب دن چڑھنے کی وجہ سے ہر چیز روشن ہو جائے قربانی کو بھی اضحیہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ باطن کو منور کرتا ہے۔ ليلة اضحيان اس رات کو کہتے ہیں جو ابتداء سے آخر تک روشن ہو سر شام چاند نکل آئے اور صبح تک روشنی پھیلاتا رہے۔ یہ دراصل قمری مہینہ کی تیرھویں اور چودھویں رات ہوتی ہے۔ أحسن من القمر چاند کی روشنی بہت خوبصورت ہوتی ہے اس میں حرارت نہیں ہوتی بلکہ برودت اور سکون وراحت ہوتی ہے۔ دیکھنے سے انسان کو تسکین ملتی ہے سرور حاصل ہوتا ہے وہ تمام صفات نبی کریم ﷺ کے چہرہ انور میں بھی تھیں آپ ﷺ کے چہرے کی نورانیت چاند سے بھی زیادہ تھی اور یہ محض عقیدت کی بناء پر نہیں کہتا بلکہ نفس الامر ہی ایسا تھا اور یہ

---

(۱)صحيح مسلم ۲/۲۵۷ كتاب الفضائل باب ماجاء في صفة شعرالنبيﷺصفاته الخ، جامع ترمذی ۲/۱۸۳ كتاب المناقب باب ماجاء في صفة النبيّﷺ ،مسنداحمد ۶/۸۸(مختار)

عقیدہ رکھنا آج بھی جزوایمان ہے۔حضور نبی کریم ﷺ کے چہرے کا نور بہت زیادتھا۔ابن مبارکؒ اور ابن جوزیؒ کی ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے۔ عن ابن عباسؓ انہ ﷺ لم یکن له ظلّ ولم یقم مع شمس قط الأغلب ضوء ه علی ضوء الشمس لم یقم مع سراج الأغلب ضوء ه علی ضوء السراج.

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا سایہ نہیں ہوتا تھا اور وہ جب بھی سورج کے ساتھ کھڑے ہوتے تو سورج کی روشنی پر آپ ﷺ کی روشنی غالب آجاتی تھی اور جب بھی کسی چراغ کے ساتھ کھڑے ہوتے تھے تو چراغ کی روشنی پر آپ ﷺ کی روشنی غالب آجاتی تھی۔

(۱۰) حدثنا سفیان بن وکیع ثنا حمید بن عبدالرحمٰن الرواسی عن زهیر عن أبی إسحاق قال سأل رجل البراء بن عازب أكان وجه رسول اللّٰه ﷺ مثل السیف قال لابل مثل القمر(۱).

ترجمہ: ابواسحٰقؒ فرماتے ہیں کہ کسی شخص نے حضرت براءؓ سے پوچھا کہ کیا نبی کریم ﷺ کا چہرہ مبارک تلوار کی طرح تھا تو انہوں نے کہا کہ نہیں بلکہ بدر (چاند) کی طرح تھا۔

<u>تشبیہ میں بھی انتہائے ادب تھا:</u> لابل مثل القمر تلوار اس زمانے میں بیش قیمت ہتھیار تھا اور جب یہ نئی اور صیقل شدہ ہوتی تو اس کی چمک قابل دید ہوتی تھی چونکہ تلوار اس وقت عام حالات میں بھی لوگوں کے پاس ہوتی تھی اس لئے لوگوں کے درمیان چمک دمک میں تشبیہ دینے کے لئے تلوار متعارف تھی لہٰذا سائل کا مقصد یہ تھا کہ کیا آپ ﷺ کا چہرہ انور چمک میں تلوار کی طرح تھا اور ممکن ہے کہ استطالۃ کا مفہوم بھی ملحوظ ہو اور یہ مقصد ہو کہ کیا نبی کریم ﷺ کا چہرہ تلوار کی طرح لمبا اور منور تھا۔حضرات صحابہ کرامؓ کے نزدیک چونکہ ادب کا زیادہ پاس ہوتا تھا نبی کریم ﷺ کا مرتبہ اور شان کو وہ مشابہۃ اور تشبیہ میں بھی ملحوظ رکھتے اس لئے حضرت براءؓ نے کہہ دیا کہ تلوار کی طرح نہیں بلکہ چاند کی طرح تھا۔

---

(۱) سنن دارمی ۱/۳۰، المستدرک للحاکم ۴/۱۸۶

<u>سیف نہیں چاند سے تشبیہ کے وجوہات:</u> اس تشبیہ کو بدلنے میں متعدد وجوہ ہیں ایک وجہ تو یہ ہے کہ مشبہ بہ یعنی تلوار میں تدویر نہیں جو کہ نبی کریم ﷺ کے چہرہ میں تھی بلکہ تلوار لمبی ہوتی ہے لہذا انہوں نے اس تشبیہ کی نفی کی۔

اور دوسری تشبیہ ذکر کی تا کہ مشبہ اور مشبہ به میں حتی الامکان من کل الوجوہ قرب ہو تو بہتر ہے۔

دوسری وجہ یہ کہ تلوار مصنوعی چیز ہے اس کا تنور بھی مصنوعی اور وقتی ہوتا ہے یہ ٹوٹتی ہے، استعمال سے کند ہو جاتی ہے اور اسے زنگ بھی لگتا ہے جس سے چمک ختم ہو جاتی ہے جبکہ چاند میں اس قسم کا کوئی عیب نہیں وہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا دائمی منور جرم ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نور بخشا ہے۔ انسان کے عمل کا اس میں کوئی دخل نہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے بھی نبی کریم ﷺ کو چراغ سے تشبیہ دی ہے۔ جو کم از کم تلوار سے زیادہ روشن اور چاند کے قریب ہے فرماتے ہیں کہ یاایّها النّبیّ إنّا أرسلنک شاهداً و مبشراً و نذیراًo و داعیاً إلیٰ اللّٰه باذنه و سراجاًمنیراo (الاحزاب ۴۵۔۴۶)

اے پیغمبر ﷺ ہم نے تجھ کو گواہ اور خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔ نیز اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی طرح دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر۔ اور چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ آپ کے مشکوٰۃ نبوت سے صحابہ کرام رشد و ہدایت اور روشنی کے چراغ اور ماہ و انجم بن کر نکلے اصحابی کاالنجوم (الحدیث) پھر چراغ اور شمع اندھیروں اور تاریکیوں سے لڑ لڑ کر سپیدۂ سحر تک جلتی رہتی ہے۔

ع   شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

تو سراجاً منیراً میں علوم و نکات کا ایک مسند پنہاں ہے۔ نیز دوسرے صحابہ بھی قمر ہی کے ساتھ آپ ﷺ کے چہرے کو تشبیہ دیا کرتے تھے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ تلوار کا محل استعمال جنگ، بدامنی، ہلاکت اور قتل و غارت ہے اگرچہ بعض اوقات تلوار کا استعمال جائز بلکہ موجب ثواب بھی ہوتا ہے لیکن فی نفسہ یہ ایک قبیح امر ہے۔ جبکہ نبی کریم ﷺ بنیادی طور پر رحمۃ للعالمین ہیں امن کا پروانہ لے کر دنیا میں تشریف لائے آپ ﷺ کا مقصد

بعثت اہلاک نہیں احیاء ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے کہ یا ایھا الذین آمنوا استجیبو للّٰہ والرسول إذا دعاکم لما یحییکم (الآیۃ انفال ۲۴) اے ایمان والو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے کہنے کو بجالایا کرو جبکہ رسول تم کو تمہاری زندگی بخش چیز کی طرف بلاتے ہوں۔

وہ زندگی کے ہر میدان میں امت کے لئے پیغام حیات ہیں یوں مشبہ اور مشبہ بہ میں کوئی جوڑ نہیں رہتا جبکہ چاند خالص ایک نعمت ہے خیر ہی خیر ہے شر کا کوئی شائبہ نہیں۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ قمر کے لغوی مفہوم میں غلبہ کا معنی پایا جاتا ہے۔مقامرۃ قمار ایک دوسرے پر غلبہ کیلئے ہوتا ہے۔اور نبی کریم کو بھی غلبہ دلانے کیلئے اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا۔فرماتے ہیں ھوالذی أرسل رسوله بالهدیٰ و دین الحق لیظهره علی الدین کله ولو کره المشرکون(توبۃ ۳۳)

وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تا کہ اس کو تمام دینوں پر غالب کردے گو مشرکین اس سے ناخوش ہوں۔

اور سیف کے مفہوم میں اہلاک اور فنا کے گھاٹ اتارنا ہے۔جبکہ اس قسم کی مناسبت تلوار اور نبی کریم ﷺ کی ذات مبارک میں نہیں ہے۔اس حدیث میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ کلام میں آداب ہر صورت میں ملحوظ رکھنے چاہیں۔

<u>ہارون الرشید کے بیٹوں کا واقعہ:</u> ہارون الرشید کے دو بیٹے امین الرشید اور مامون الرشید تھے۔ دونوں کا تاریخ میں بڑا نام ہے۔اول الذکر ہارون الرشید کی چہیتی بیوی زبیدہ خاتون کے بیٹے تھے۔جبکہ دوسرے ایک کنیز کے بیٹے تھے۔مامون الرشید کو اللہ تعالیٰ نے ذہانت وفطانت سے نوازا تھا اور بچپن ہی سے اساتذہ اور بڑوں کے آداب کا لحاظ رکھا کرتے تھے۔اسی لئے وہ ہارون الرشید کو زیادہ پیارے تھے۔ایک دن زبیدہ خاتون نے شکایت کی کہ ہارون میرے بیٹے پر ایک کنیز کے بیٹے کو ترجیح دیتا ہے جس کی وجہ سے ہارون نے دونوں کا امتحان لے کر زبیدہ پر ظاہر کردیا کہ مامون الرشید واقعی زیادہ پیار کے مستحق ہیں۔وہ اس طرح کہ اس نے چند مسواک ہاتھ میں لے کر پہلے امین الرشید کو بلایا اور پوچھا کہ میرے ہاتھ میں کیا ہے اس نے جواب دیا کہ ''مساویک'' جس کے دو معنی ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ یہ لفظ مسواک کی جمع ہے۔ اس لحاظ سے جواب درست تھا لیکن اس کا دوسرا معنی ''تیرے گناہ'' یا ''تیرے عیوب'' بھی بنتا ہے۔اس لحاظ سے

باپ کو یہ جواب دینا مناسب نہ تھا۔اس کے بعد ہارون الرشید نے مامون کو بلا کر پوچھا کہ بیٹے میرے ہاتھ میں کیا ہے اس نے قدرے سوچ کر جواب دیا کہ ''ضد محاسنک'' اورسوء ادب کے محض احتمال کی وجہ سے براہ راست مساویک نہ کہا اگر چہ ضد محاسنک بھی مآلاً مساویک بنتا ہے کیونکہ مساوی محاسن کی ضد ہے۔

(۱۱) حدثنا أبو داؤد المصاحفیّ سلیمان بن سلم ثنا النظر بن شمیل عن صالح بن أبی الأخضر عن ابن شهاب عن أبی سلمة عن أبی هریرة قال کان رسول الله ﷺ أبیض کا نّما صیغ من فضة رجل الشعر(۱).

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ اس قدر سفید اور خوبصورت تھے گویا کہ چاندی سے آپ ﷺ کا بدن مبارک ڈھالا گیا ہو۔آپ ﷺ کے بال مبارک ہموار مگر قدرے خمدار تھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ: ابو هريرةؓ، تمام صحابہؓ میں سے زیادہ احادیث روایت کرنے والے ہیں۔آپؓ کے نام ونسب میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔جاہلیت کے زمانہ میں آپ کا نام عبدشمس یا عبد عمرو تھا۔ اسلام لانے کے بعد نبی کریم ﷺ نے آپ کا نام تبدیل کردیا۔جس کے بارے میں بھی اختلاف ہے لیکن سب سے مشہور دو نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن بن صخر الدوسی۔اس کے علاوہ آپؓ کے نام میں چالیس تک کے اقوال پائے جاتے ہیں پھر آپ اپنی کنیت کی وجہ سے اتنے مشہور ہوئے کہ گویا آپؓ کا کوئی نام ہی نہ تھا(۲)۔ غزوہ خیبر سے کچھ قبل اسلام لائے اور غزوہ خیبر میں شریک ہوئے۔پھر نبی کریم ﷺ کی ایسی مصاحبت اختیار کی۔جہاں نبی کریم ﷺ جاتے آپؓ بھی ساتھ ہوتے اور ایک ایک لفظ اور ادا کو یاد رکھا کرتے تھے۔حصول علم کے شوق میں فاقے برداشت کئے۔آپ خود فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے شکایت کی کہ یارسول اللہ ﷺ آپ سے سنی ہوئی باتیں یاد نہیں رہتیں۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ چادر

---

(۱)جامع ترمذی ۱۸۳/۲ کتاب المناقب باب ماجاء فی صفة النبی ﷺ

(۲) آپؓ کے کنیت کی وجہ تسمیہ کے بارے میں الاکمالات میں ہے وسبب التکنیة ان رسول اللہ ﷺ رأی هرة فی قمه فناداه بها(ص ۴۵)(مختار)

پھیلاؤ۔ میں نے پھیلائی تو آپ ﷺ نے تھوڑی دیر کے بعد فرمایا کہ اس چادر کو ابھی لپیٹ کر سینے سے لگاؤ تو میں نے چادر کو اپنے سینے سے لگایا تو اس کے بعد میں کوئی بھی روایت نہ بھولا۔

(البدایۃ والنھایۃ ۱۰۵/۸، بخاری ۲۲/۱)

صحابہ اور تابعین میں سے آٹھ سو سے زائد لوگ آپؓ سے روایت کرتے ہیں(۱)۔امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ آپؓ کے زمانہ میں رواۃ حدیث میں آپؓ سے زیادہ حافظہ والا کوئی نہیں تھا(۲)۔بارہ ہزار تسبیحات روزانہ کا معمول تھا۔ مدینہ کے گورنر بھی رہے ۵۷ھ، ۵۸ھ، ۵۹ھ کو اٹھتر سال کی عمر میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

كان رسول الله ﷺ ابيض كانّما صيغ من فضة

ایسے سفید اور صاف رنگ کے مالک تھے گویا چاندی کو قالب میں ڈھال کر بنایا گیا ہو۔

صیغ صاغ یصوغ سے ماضی مجہول کا صیغہ ہے بنانے اور سانچہ میں ڈھال کر بنانے کو کہتے ہیں۔اس حدیث میں آپ ﷺ کے رنگ کی سفیدی اور نورانیت کا ذکر ہے۔

(۱۲) حدّثنا قتيبة بن سعيد انا الليث بن سعد عن أبى الزبير عن جابر بن عبدالله أنّ رسول الله ﷺ قال عرض علىّ الأنبياء فإذا موسىٰ عليه السلام ضرب من الرجال كانّه من رجال شنوءة ورأيت عيسىٰ بن مريم عليه السلام فاذا أقرب من رأيت به شبها عروة بن مسعود ورأيت إبراهيم عليه السلام فاذا أقرب من رأيت به شبها صاحبكم يعنى نفسه الكريمة ورأيت جبرئيل عليه السلام فاذاأقرب من رأيت به شبها دحية(۳).

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مجھ پر

---

(۱) حاکم نیشاپوریؒ نے ۲۸ صحابہ کے اسماء لکھے ہیں جنہوں نے آپؓ سے روایت کی ہے۔(مختار)

(۲) بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ کان ذکیا فقیہا صاحب لیل وصوم(مناوی ص ۵۸)وھکذا فی اعلام الموقعین۔ اور صحابہ کرام میں سے سب سے زیادہ روایت کرنے والے ہیں وھو اکثر الصحابة رواية باجماع۔ (مختار)

(۳) مسند احمد ۴۲۶/۳

تمام انبیاءؑ پیش کئے گئے پس میں نے موسیٰؑ کو دیکھا تو وہ ذرا دبلے پتلے بدن کے آدمی تھے۔ گویا کہ قبیلہ شنوءۃ کے لوگوں میں سے ہیں۔ اور حضرت عیسیٰؑ کو دیکھا تو ان سب لوگوں میں جو میری نظر میں ہیں عروۃ بن مسعودؓ ان سے زیادہ ملتے جلتے معلوم ہوئے۔ اور حضرت ابراہیمؑ کو دیکھا تو میرے دیکھے ہوئے لوگوں میں سے تمہارا ساتھی یعنی خود میں ان سے زیادہ مشابہ ہوں۔ اور جبرئیلؑ کو دیکھا تو ان کے ساتھ مشابہ ان لوگوں میں سے جو میری نظر میں ہیں دِحیہ کلبی ہیں۔

جابر بن عبداللہ: عن جابر بن عبداللّٰہ، ابوعبداللہ جابر بن عبداللہ انصاری سلمیؓ صحابی ہیں ان کے والد حضرت عبداللہؓ غزوہ احد میں شہید ہوئے جبکہ حضرت جابرؓ نبی کریم ﷺ کے ساتھ مختلف اقوال کے مطابق سترہ، اٹھارہ، یا اُنیس غزوات میں شریک ہوئے۔ آخری عمر میں بینائی جاتی رہی مدینہ میں ۷۴ھ کو ۹۴ سال کی عمر میں وفات پائی۔

عرض انبیاء: عرض علی الأنبیاء نبی کریم ﷺ پر انبیاء کا پیش ہونا یا تو لیلۃ الاسراء کے موقع پر بیت المقدس میں ہوا تھا یا معراج کی رات آسمانوں میں جو عرض ہوا تھا وہ مراد ہے۔ اور بعض روایات کے قرینہ سے یہ عرض منامی تھا یعنی خواب میں رسول پاک ﷺ سے ان کی ملاقات کرائی گئی تھی۔ بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ أرانی اللیلۃ عند الکعبۃ فی المنام فاذا رجل آدم کأحسن مایریٰ من الرجال تضرب لمتہ بین منکبیہ (الحدیث) اور بخاری ہی کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں۔ لیلۃ أسریٰ بی رأیت موسیٰ(الحدیث) اس مقام پر تین انبیاء کا ذکر ہے جن میں سے دو تو بنی اسرائیل کے نبی تھے جن کو اہل کتاب خوب جانتے تھے۔ تیسرے حضرت ابراہیمؑ نبی کریم ﷺ کے آباء میں سے ہیں اور تمام مشرکین اور اہل کتاب کے ہاں مشہور ومعروف تھے۔

موسیٰ علیہ السلام کا حلیہ: ضرب من الرجال الخ بعض علماء کہتے ہیں کہ ضرب کے معنی ہیں معتدل خفیف اللحم لیس بناحل ولا مطھّم یعنی وہ شخص جو نہ تو زیادہ کمزور ہو نہ زیادہ فربہ۔ اور بعض شراح کا خیال ہے کہ ضرب نوع اور قسم کے معنی میں مستعمل ہے۔ گویا کہ موسیٰ خاص قسم کے لوگوں میں

سے تھے۔بعض اقوام امتیازی شکل وشباہت اور خاص جسمانی ہیئت کے مالک ہوتے ہیں کچھ ہٹے کٹے اور مضبوط قسم کے ہوتے ہیں بعض کمزور اور نحیف ہوتے ہیں تو ضرب من الرجال کا معنی یہ ہوگا کہ آپ اس طرح کی ایک خاص قوم کے فرد معلوم ہو رہے تھے۔اور جب نبی کریم کو صحابہ کرامؓ میں کوئی خاص تشبیہ دینے کیلئے دکھائی نہ دیا تو آپ نے پہلے ایک غیر معین قبیلہ سے اس کی تشبیہ دی پھر اس قبیلہ کا تعین ''کأنہ من رجال شنوءہ'' سے کیا۔شنوءہ یمن کا ایک قبیلہ ہے جس کو عرب جانتے تھے یا یہ قحطانیوں کی ایک شاخ ہے۔یہ لوگ بھی جسمانی لحاظ سے متوسط اور معتدل تھے۔نہ زیادہ فربہ اور نہ کمزور۔چونکہ یہ لوگ ذاتی تعلّی کی بناء پر دوسرے لوگوں کو اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتے تھے۔غیر قوم میں رشتوں سے پرہیز کرتے تھے چنانچہ ان کے انساب بالکل خالص اور رنگ دلکش تھے اور اسی وجہ سے ان کو شنوءۃ کہا گیا کیونکہ شناءۃ کا اصل معنی بُعد اور دوری ہے(۱)۔

فاذا اقرب من رأیت بہ شبھاً عروۃ، اقرب مبتدا ہے اور عروۃ بن مسعود خبر ہے۔

<u>**عروۃ بن مسعودؓ:**</u> حضرت عروۃ بن مسعود الثقفیؓ صحابی ہیں۔آپ کے عجیب حالات کتب سوانح میں لکھے ہیں۔صلح حدیبیہ میں کفار کی طرف سے شریک ہوئے بلکہ ان کی طرف سے سفارت کی۔<u>۹ھ</u> کو اسلام لائے اور اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے حضورﷺ سے اجازت طلب کی۔اجازت ملنے پر آپ نے جا کر قوم کو توحید کی دعوت دی تو کسی نے تیر مار کر شہید کر دیا۔اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیوی اور اخروی وجاہت سے نوازا تھا۔لیکن حضرت عروہؓ کا حلیہ بہر حال ہمارے لئے ایک نامعلوم بات ہے۔ہاں عیسائیوں نے اندازوں اور تخمینوں سے عیسیٰؑ کی جو تصاویر بنائی تھیں ان کے مطابق آپ بہت حسین تھے۔اور ممکن ہے کہ واقعۃ ان تصاویر سے کوئی تصویر آپؑ سے ملتی ہو۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو ''وجیھ'' کہا ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ جو صاحب وجاہت اور پروقار شخصیت کے مالک تھے انگریز لوگ کہتے

---

(۱) ملا علی قاریؒ اور علامہ عبدالرؤف مناویؒ نے اس احتمال کو ذکر کیا ہے اس صورت میں ''کأنہ من رجال شنوءۃ'' ماقبل کا بیان ہوگا۔کیونکہ پہلے بھی حضرت موسیٰؑ کے بدن کا چھریرا ہونا مذکور ہے۔اور اس قبیلہ کے ساتھ تشبیہ میں بھی مقصود یہی ہے۔لیکن پھر دونوں نے نیز دیگر شراح نے یہ کہا ہے کہ راجح یہ ہے کہ یہ کلام تاکید نہ ہو بلکہ مستقل تشبیہ ہو اور حضرت موسیٰؑ کی شکل وصورت کی تشبیہ اس قوم سے دینا مقصود ہو جبکہ پہلے موسیٰؑ کے جسمانی اعتدال کا بیان تھا۔(اصلاح الدین)

ہیں کہ ان کا حلیہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ملتا جلتا تھا ایک دفعہ آپ راولپنڈی جیل میں تھے جیل کا عیسائی داروغہ ہروقت آپ کو کن انکھیوں سے دیکھا کرتا تھا۔ کسی نے پوچھا کہ تم ہروقت بخاری کو اس طرح کیوں دیکھتے ہو اس نے کہا کہ حضرت عیسیٰؑ کے خدوخال، رعب ووقار کی جتنی تفصیلات ہم تک پہنچی ہیں وہ سب شاہ جی صاحب میں دیکھ رہا ہوں۔

حضرت ابراہیمؑ سے مشابہت: صاحبکم یعنی نفسه الكريمة: یہ راوی نے اپنی طرف سے تفسیر کردی۔ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ملت ابراہیمی کا مجدد بنایا تھا۔ اور حضرت ابراہیمؑ کی بہت سی ظاہری اور معنوی صفات آپ ﷺ کو عطا کی گئی تھیں۔ جسمانی صورت اور حلیہ میں بھی آپ ﷺ حضرت ابراہیمؑ سے زیادہ مشابہ تھے۔ ایک جگہ آپ فرماتے ہیں کہ أنا أشبه ولد إبراهيم. میں ابراہیمؑ کی اولاد میں ان کے ساتھ سب زیادہ مشابہت رکھتا ہوں۔

ابراہیم کا لفظ یا تو ابؑ رحیم یعنی شفیق باپ سے نکلا ہے اور آپ تمام لوگوں کے لئے شفیق باپ ہی تھے۔ تمام ادیان وملل کو آپ ﷺ سے بے انتہا محبت ہے۔ آپؑ کو حقیقت میں ایک شفیق باپ کا درجہ دیتے ہیں۔ تمام لوگ آپؑ کے اتباع کے مدعی ہیں۔ حتیٰ کہ ہندو جیسی مشرک قوم بھی ابراہیمؑ کے اتباع کے مدعی ہیں۔ ان کے بعض الفاظ مثلاً برھمن اور براھمہ کا رشتہ لفظ ابراہیم سے معلوم ہوتا ہے۔ یہودی اور عیسائی بھی سب آپ کو پیشوا تسلیم کرتے ہیں۔ اس لئے آپ کو اب رحیم کہا گیا ہے۔ قرآن میں ہے وتركنا عليه في الآخرين سلامٌ على إبراهيم. (الاية)

بعض شراح کے خیال میں ابراہیم ابراھام اور براہم سب عبرانی الفاظ ہیں۔ ورأيت جبرئيل یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے عرض کی بات ہورہی تھی اور جبرئیل تو نبی نہیں۔ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہ قول قصہ کی ابتداء یعنی ''عرض عليّ '' پر عطف ہے۔ یا جواب یہ ہے کہ حضرت جبرئیلؑ کا انبیاء کرام کے ساتھ زیادہ تعلق اور بہت اختلاط تھا جس کی وجہ سے ان کا ذکر بھی انبیاء کے ضمن میں کیا گیا جو غیر مناسب نہیں۔ گویا آپؑ بھی انبیاء کے ایک فرد ہیں جس طرح ابلیس کو جن ہونے کے باوجود کثرت اختلاط کی وجہ سے فرشتوں میں شمار کیا گیا تھا۔ اور اسی وجہ سے فرشتوں کو سجدہ کا حکم اسے بھی شامل تھا۔ لہٰذا نبی

کریم ﷺ نے حضرت جبرئیلؑ کا ذکر بھی انبیاء کے ساتھ فرمایا۔ ویسے بھی پروٹوکول اور تشریفات کیلئے مستقل شعبے ہوتے ہیں تو عرض انبیاء میں حضرت جبرئیلؑ کی موجودگی مناسب معلوم ہوتی ہے۔

دحیہ کلبی: دحیۃ، حضرت دحیۃ بن خلیفہؓ دال کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ مشہور کلبی صحابی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حسن وجمال اور وجاہت سے نوازا تھا۔ رسول پاک ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں شرکت کی۔ مثالی حسن کے مالک تھے۔ شہر میں داخل ہوتے تو عورتیں پردوں سے باہر نکل آتیں۔ نبی کریم ﷺ کی طرف سے سفارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ان کو قیصرِ روم کے پاس بھی بھیجا تھا۔ شام میں سکونت اختیار کی اور حضرت معاویہؓ کے زمانہ تک زندہ رہے۔

فرشتہ ہونے کی وجہ سے اگرچہ جبرئیل شخصی ومعین انسانی شکل نہیں رکھتے تھے لیکن وحی لاتے ہوئے کبھی کبھار انسانی شکل میں آتے تو دحیہ کلبی کی شکل میں آتے تھے۔ دنیا کے سفارتی ضوابط میں سے ایک ضابطہ یہ بھی ہے کہ سفارتی تعلقات کیلئے وجیہ، حسین وجمیل، اور باوقار شخص کو منتخب کیا جاتا ہے۔ تاکہ وہاں لوگ اس سے مرعوب اور متاثر ہوں۔ اسی طرح بھیجنے والے وفود میں ارکان کے علم اور عقل وکمال کے ساتھ ساتھ قوت وشجاعت اور جسمانی کیفیات سب کا لحاظ ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ باہر کے سفارتی پیغامات کیلئے حضرت دحیہ کو بھیجتے۔ کیونکہ آپ میں مذکورہ خوبیاں اور صلاحیتیں موجود تھیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کا سفیر بھی دحیہ کی شکل میں آتا تھا۔ اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں رسول اللہ ﷺ کا عظیم مقام ہے اسی وجہ سے وجیہہ اور مقبول شخصیت کے حامل انسان کی شکل میں اپنا قاصد آپ ﷺ کے پاس بھیجتے تھے۔

(۱۳) حدثنا محمّد بن بشار سفیان بن وکیع المعنی واحد قال انا یزید بن ھارون عن سعید الجریریّ قال سمعت أبا الطفیل یقول رأیت رسول اللّٰہ ﷺ و ما بقی علی وجه الأرض احدراہ غیری قلت صفه لی قال کان ابیض ملیحا مقصّدا(۱)۔

---

(۱)صحیح مسلم ۲/۲۶۶ کتاب الفضائل باب صفة شعرہ ﷺ وصفاته وحلیة ابوداؤد ۲/۳۲۰ کتاب الادب باب فی ھدی الرجل

ترجمہ: ابوطفیلؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا اور آپ ﷺ کو دیکھنے والوں میں اب روئے زمین پر میرے سوا کوئی نہیں رہا۔(سعید جریری کہتے ہیں) میں نے ان سے کہا کہ نبی کریم ﷺ کا کچھ حلیہ میرے لئے بیان فرمائیں۔تو انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ سفید رنگت والے حسین اور معتدل جسم والے تھے۔

ابوالطفیل: ابوالطفیل عامر بن واثلہ لیثی کنانیؓ(۱) ہجرت کے سال یا غزوہ احد کے سال پیدا ہوئے۔ اور ۱۰۰ھ یا ۱۰۲ھ اور صحیح قول کے مطابق ۱۱۰ھ کو وفات پائی۔ وما بقی علی وجه الارض احدا راہ غیری۔ اس جملہ میں ایک طرف تو صحابیت پر تنبیہ ہے نیز اس بات کی ترغیب بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے متعلق جو کچھ سننا ہو مجھ سے سیکھو۔ کیونکہ صحابہ کی جماعت سے صرف میں باقی ہوں۔ میرے بعد اور کوئی نہیں ملے گا۔ گویا موقع اور اپنی موجودگی کی اہمیت بیان کرنے کے لئے آپؓ نے یہ بات کہہ دی۔ یہ وہ وقت تھا جب تمام صحابہ وفات پا چکے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپؓ کے بعد صحابہ میں سے کچھ لوگ مثلاً عمران بن حصین وغیرہ باقی تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوالطفیلؓ کو اپنے سوا کسی دوسرے صحابی کے حیات کا علم نہ تھا۔ بعد کے مؤرخین ومحققین کو معلوم ہوا ہوگا۔ لیکن چونکہ اس زمانہ میں اطلاعات کا موجودہ نظام نہ تھا۔ اسلئے یا تو آپؓ دوسرے زندہ صحابی کو جانتے نہ تھے یا انکی زندگی سے لاعلم تھے۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ جب تک جوانی کا اثر باقی ہو خود کو بوڑھا ظاہر کرنے سے ہر کوئی کتراتا ہے۔ بلکہ عموماً اپنی عمر کم بتا کر جوان دکھائی دینا پسند کرتا ہے۔ لیکن جب بڑھاپا طاری ہو جاتا ہے تو اپنی عمر آٹھ دس سال زیادہ بتاتا ہے۔ اس سے دراصل دوسروں پر برتری اور اپنی تجربہ کاری کا احساس دلانا مقصود ہوتا ہے۔ حضرت ابوالطفیلؓ صحابی ہونے کے ناطے سے جھوٹ تو نہیں بول سکتے لیکن آپؓ کا یہ بیان حقیقت ہونے کیوجہ سے دوسرے لوگوں پر حقیقۃً آپکی برتری اور لوگوں کے درمیان ممتاز مقام پر دلالت کرتا ہے۔

یہاں پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوالطفیلؓ کی بات صحیح نہیں اسلئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اس وقت زندہ تھے جنہوں نے نبی کریم ﷺ کو بھی دیکھا تھا اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابوالطفیلؓ نے تصریح کی ہے کہ سطح زمین پر میرے سوا کوئی دوسرا دیکھنے والا موجود نہیں وہ آسمانوں کی بات نہیں کر رہا۔

---

(۱) امام ابوحنیفہؒ کو حضرت ابوطفیل عامر بن واثلہؓ سے ملاقات کا شرف حاصل ہے۔(مختار)

<u>حضرت خضرؑ کی حیات وموت:</u> باقی رہے حضرت خضرؑ جن کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ وہ بھی زندہ ہیں اور بعض تکوینی امور کو سرانجام دینے کیلئے دنیا ہی میں رہتے ہیں۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بعض صوفیوں کا مسلک ہے جبکہ اکثر محققین مثلاً علامہ ابن قیمؒ، علامہ ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن حجرؒ وغیرہ جیسے محققین محدثین حیاتِ خضر علیہ السلام سے منکر ہیں۔ علامہ ابو حیانؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ **والجمهور علی أنه مات** یعنی جمہور علماء کے خیال میں وہ زندہ نہیں ہیں۔اگرچہ صوفیہ کا ایک معتدبہ گروہ کہتا ہے کہ وہ زندہ ہیں اور تکوینی امور میں ان کو بڑا عمل دخل ہے۔حتیٰ کہ بعض جاہل اور خودغرض پیروں نے تو حد کردی وہ سڑک پر کھڑے ہوکر ہوائی معانقہ کرتے ہیں اور پوچھنے پر فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے ملاقات ہوگئی۔خضر علیہ السلام تو ان کے جیب ہی میں رہتے ہیں۔ جہاں بھی ضرورت پڑی تو جھٹ سے کہہ دیا کہ خضرؑ نے اس کام کے بارے میں مجھے یہ ہدایت دے دی۔بہرحال اگرچہ صوفیائے کرام میں چند قابل اعتماد لوگ بھی حضرت خضرؑ کے حیات کے قائل ہیں۔لیکن اس مسئلہ میں ان کا قول معتمد نہیں ہے۔ حضرت خضرؑ کی وفات کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر وہ زندہ ہی ہیں تو کبھی تو نبی کریم ﷺ کے ساتھ مل چکے ہوتے۔حالانکہ ذخیرہ احادیث میں اور صحابہ کے سوانح میں کبھی بھی آپ ﷺ اور ان کی ملاقات کا ذکر نہیں ملتا۔احد اور بدر کے سخت معرکے ہوئے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے تمام سابقہ انبیاء کرام علیہ السلام سے نبی آخرالزمان ﷺ کی نصرت کا عہد بھی لیا تھا۔فرماتے ہیں کہ **واذا اخذ اللّٰه ميثاق النبيّن لما آتيتكم من كتاب وحكمة ثم جاء كم رسول مصدق لما معكم لتؤمنن به و لتنصرنّه** (الآیۃ آل عمران آیت ۸۱) اور جبکہ اللہ تعالیٰ نے عہد لیا انبیاء سے کہ جو کچھ میں تم کو کتاب اور علم دوں، پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے جو مصدق ہو، اس کا جو تمہارے پاس ہے۔تو تم ضرور اس رسول پر اعتقاد بھی لانا اور اس کی مدد بھی کروگے۔

تو کیا حضرت خضرؑ نے جو برسوں سے پیر صاحب کی خدمت میں مصروف ہیں، مگر اس عہد کے باوجود نبی کریم ﷺ سے ملاقات بھی گوارا نہیں کی۔لہٰذا معلوم ہوا کہ حضرت خضرؑ ابوالطفیلؓ کے اس قول کے وقت موجود نہیں تھے۔اور اگر بالفرض وہ زندہ بھی ہیں لیکن نبی کریم ﷺ سے نہیں ملے تو بھی حضرت ابوالطفیلؓ کی بات صحیح ہے کیونکہ انہوں نے "**مابقی احدارأہ غیری**" کہہ دیا ہے۔اور حضرت خضرؑ تو

نبی کریم ﷺ سے نہیں ملے نہ انہیں دیکھا ہے۔باقی اسماء الرجال اور جرح وتعدیل کی کتب میں درج ہے کہ ہندوستان میں ایک شخص ۶۰۰ھ تک موجود تھا جو کہ بابا رتن کے نام سے مشہور تھا اور صحابہ کرام میں سے تھا۔ اسی طرح بعض لوگ معمر مغربی کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ طویل زمانے تک زندہ رہے۔تو اول تو یہ خرافات ہیں علامہ ابن حجر عسقلانی نے ان باتوں کو افسانہ قرار دیا ہے۔اور اگر بالخصوص کوئی نبی کریم ﷺ کو دیکھنے والا حضرت ابوالطفیلؓ کے بعد تک موجود رہا ہو تو بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا وجود حضرت ابوالطفیلؓ کو معلوم نہ تھا حتیٰ کہ انکو جھوٹا کہا جائے۔

كان أبيض مليحاً ملیح کا ایک معنی حسین کے ہوتے ہیں ملح سے ہے جو حسن کے معنی میں ہے اور دوسرا معنی ملح کا بیاض مشرب بالحمرة بھی ہے تو گویا آپ کا رنگ سرخ وسفید تھا۔

مقصداً قصد سے ہے(۱) جس کے معنی میانہ روی کے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے کہ وعلى الله قصد السبيل لوگوں پر اللہ کیلئے وسط سبیل کا اتباع واجب ہے۔(نحل ۹)

یعنی وہ راستہ جو افراط وتفریط سے خالی ہے۔علم معاشیات کو اقتصادیات اسی لئے کہتے ہیں کہ اچھے اور حقیقی معاشی نظام میں افراط وتفریط نہیں ہوتا۔الغرض نبی کریم ﷺ اپنی خلقت اور اخلاق دونوں لحاظ سے بالکل اعتدال پر تھے۔افراط وتفریط سے مبرّا تھے۔

(۱۴) حدثنا عبدالله بن عبد الرحمان أخبرنا إبراهيم بن المنذر الحزاميّ أنا عبدالعزيز بن ثابت الزهريّ حدّثني إسماعيل بن إبراهيم ابن اخي موسىٰ بن عقبة عن كريب عن ابن عباسؓ قال كان رسول الله ﷺ أفلج الثنيّتين إذا تكلّم رأى كالنّور يخرج من بين ثناياه(۲).

---

(۱) باب تفعیل سے اسم مفعول ہے بمعنی متوسط کے ہے اس لئے کہا جاتا ہے رجل مقصّدٌ اى متوسط. علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے والمراد انّه ﷺ متوسط بين الطول والقصروبين الجسامة والنحافة بل جميع صفاته على غاية من الأمر الوسط فكان لونه وهيكله وشعره وشرعه مائلاً عن طرفى الافراط والتفريط (المواهب اللدينية ص ۲۹) (مختار)

(۲) مجمع الزوائد۸/۲۹۸ كتاب علامات النبوة باب فى صفته ﷺ معجم الاوسط الطبرانى رقم الحديث ۷۷۱،معجم الكبير للطبرانى رقم الحديث ۱۲۱۸۱

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے اگلے دانت مبارک کچھ کشادہ تھے جب باتیں کرتے تو ایک نور سا ظاہر ہوتا جو دانتوں کے درمیان سے نکلتا تھا۔

حضرت ابن عباسؓ: نبی کریم ﷺ کے چچازاد بھائی اور ام المؤمنین حضرت میمونہؓ کے بھانجے حبر الامۃ، ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ فضل وکرم سخاوت اور علم کی وجہ سے تمام صحابہ میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے آپ کے حق میں علم وحکمۃ اور فقہ وتاویل کی دعا فرمائی تھی۔ حضرت مسروقؒ فرماتے ہیں کہ جب ابن عباسؓ پر میری نظر پڑتی تو وہ لوگوں میں حسین ترین شخصیت دکھائی دیتے تھے۔ اور جب وہ کوئی بات کرتے تو میں کہتا کہ وہ فصیح ترین شخص ہیں۔ اور جب حدیث بیان کرتے تو میرے خیال میں وہ سب سے زیادہ علم والے دکھائی دیتے۔

ذہانت اور وسیع علم کی وجہ سے حضرت عمرؓ آپ کو اکابر صحابہ کے ساتھ بٹھاتے تھے اور مشوروں میں آپؓ کے مشورہ کو وقعت دیتے تھے۔ حالانکہ آپ کی عمر نبی کریم ﷺ کی وفات کے وقت صرف تیرہ سال تھی آخر میں نابینا ہو گئے اور طائف میں ۶۸ھ یا ۸۷ھ کو وفات پائی۔

أفلج الثنیتین(۱)، ثنیتین ،ثنیۃ کا تثنیہ ہے سامنے کے دو دانتوں کو کہا جاتا ہے اور افلج اس شخص کو کہتے ہیں جس کے سامنے کے دانتوں میں تھوڑی کشادگی ہو۔ اس کی ضد الص ہے جو کہ ملے ہوئے دانتوں والے کو کہتے ہیں جبکہ فرق سامنے کے صرف دو دانتوں کی کشادگی کے ساتھ مختص ہے۔ رأی کالنور آپ ﷺ کے دانت مبارک ایسے چمکیلے اور سفید تھے کہ بات کرتے ہوئے جب کبھی دانت دکھائی دیتے تھے تو ایسا نور نکلتا ہوا دکھائی دیتا تھا گویا بادلوں کے درمیان بجلی چمک رہی ہے۔

---

(۱) علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے تثنیۃ ثنیۃ بتشدید الیاء وفی نسخ الثنایا بصیغۃ الجمع قال الطیبی الفلج ھنا الفرق بقرینۃ اضافتہ إلی الثنایا إذ الفلج فرجۃ بین الثنایا والرباعیات والفرق فرجۃ بین الثنایا اھ (المواھب اللدنیۃ ص ۲۹)(مختار)

۲۔ باب ما جاء فی خاتم النبوۃ(۱)

آنحضرتﷺ کی مہر نبوت کا بیان

یہاں ایک بڑے جسمانی نشانی کا بیان ہے جو کہ نبی کریمﷺ کی نبوت اور ختم نبوت کی دلیل ہے۔

لفظ خاتم اور اس کا معنی: خاتم بفتح التاء اور خاتم بکسر التاء دونوں طرح مستعمل ہے لیکن بالکسر راجح ہے اور دونوں بمعنی ما یختم بہ یعنی آلہ ختم مہر لگانے کا آلہ جسے طابع بھی کہتے ہیں۔ اور یہ دونوں عاقبة کل شئی یعنی ہر چیز کے آخر کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ مہر بھی عموماً خط یا دستاویز کے آخر میں لگتا ہے۔ اس غرض سے کہ اب اس میں کمی بیشی نہ ہو سکے۔ نبی کریمﷺ کا مہر انگوٹھی کی شکل میں تھا۔ جس کی تفصیل کے لیے الگ باب آرہا ہے۔ یہاں اول الذکر معنی لیا جائے گا لیکن یہاں کوئی طابع مراد نہیں بلکہ اس کا اثر مراد ہے۔ یعنی وہ نشانی جو مہر لگانے کے بعد باقی رہ جاتی ہے کیونکہ اس مقام پر مقصود وہ ابھرا ہوا گوشت ہے۔ جو مہر لگانے سے پیدا ہوا تھا۔ چونکہ یہ مہر تمام کتب سماویہ میں نبی کریمﷺ کی نبوت اور ختم نبوت کی تصدیق کی علامت کے طور پر مذکور ہے۔ اس لیے یہاں اس کی اضافت نبوت کی طرف کی گئی ہے(۲) اور قرآن کریم میں خاتم کی اضافت انبیاء کی طرف کی گئی ہے(۳)۔ جو عاقبت اور آخر کے معنی میں مستعمل ہے یعنی وہ نبی جو سب سے آخر میں آئے۔ وہاں جھوٹے نبیوں نے دجل و تلبیس کی متعدد تاویلات بھی کی ہیں۔ مثلاً مرزا غلام احمد قادیانی نے اس کے معنی میں تحریف کر کے کہا ہے کہ یہاں خاتم سے مہر مراد ہے اور نبی کریمﷺ آنے والے انبیاء کے لیے مہر یعنی مصدق ہیں۔ تو آپﷺ کے بعد جو نبی آئے گا اس کی نبوت کی تصدیق کے لیے آپﷺ مہر کا کام دیتے ہیں اور میری نبوت کی تصدیق نبی کریمﷺ کر چکے ہیں۔ لیکن یہ سراسر افتراء اور تلبیس ہے کیونکہ خود نبی کریمﷺ سے اس جملے کی توضیح

---

(۱) بفتح التاآلة کالقالب و الطابع و بالکسر لغة(مختار)

(۲) مہر نبوت آنحضرتﷺ کے خصائص میں سے ہے۔ آپﷺ کے علاوہ کسی دوسرے نبی کو یہ خصوصیت نہیں دی گئی تھی (شرح الشمائل للمناوی علی حامش جمع الوسائل) (مختار)

(۳) ما کان محمدابااحدمن رجالکم ولکن رسول اللّٰہ و خاتم النبیین (الاحزاب ۴۰)(اصلاح الدین)

مختلف طریقوں سے منقول ہے۔آپ ﷺ نے لانبی بعدی دوٹوک الفاظ فرمائے ہیں۔لہٰذا خاتم کے معنی مہر نہیں عاقبۃ اور آخر ہوگا اور اگر مہر کا معنی بھی لیں تو بھی اس کا مقصود حاصل نہیں ہوتا۔کیونکہ مہر آخر میں اس لئے لگتی ہے کہ اس میں کمی وبیشی نہ ہو سکے۔اور نبی کریم ﷺ اس لحاظ سے سلسلہ انبیاء کے لیے مہر ہیں یعنی آپ ﷺ پر یہ سلسلہ ایسے منقطع ہو گیا کہ اب اس میں کمی وبیشی کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔مجموعی لحاظ سے اس باب میں جو احادیث مذکور ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہر نبوت کندھوں کے درمیان میں نمایاں قسم کی چیز تھی۔

(۱) حدثنا قتیبة بن سعید انا حاتم بن اسمٰعیل عن الجعد ابن عبدالرحمان قال سمعت السائب بن یزید یقول ذهبت بی خالتی فقالت یا رسول اللّٰه ان ابن اختی و جع فمسح رسول اللّٰه ﷺ راسی و دعالی بالبرکة و توضا فشربت من وضوئه و قمت خلف ظهره فنظرت الی الخاتم الذی بین کتفیه فاذا هو مثل زر الحجلة(۱).

ترجمہ: حضرت سائب بن یزیدؓ فرماتے ہیں کہ میری خالہ مجھ کو نبی کریم ﷺ کے پاس لے گئیں اور عرض کیا کہ میرا بھانجا بیمار ہے نبی کریم ﷺ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میرے لیے برکت کی دعا فرمائی اور نبی کریم ﷺ نے وضو فرمایا تو میں نے آپ ﷺ کے وضو کا پانی پیا۔ میں نبی کریم ﷺ کے پس پشت کھڑا ہوا تو میں نے مہر نبوت دیکھی جو مسہری کی گھنڈیوں جیسی تھی۔

سائب بن یزیدؓ: یہ مشہور صحابی ہیں ابو یزید کندی کنیت تھی۔۲ھ میں پیدا ہوئے۔حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے والد کے ہمراہ حج کو بھی آئے تھے۔۸۰ھ یا ۸۶ھ اور بعض روایات کے مطابق ۹۱ھ میں وفات پائی۔ علامہ بیجوریؒ نے ۹۴ سال عمر لکھی ہے۔لیکن یہ محل نظر ہے کیونکہ خود انہوں نے تاریخ وفات ۸۰ھ بتائی ہے۔

ذهبت بی خالتی الخ بیماری کی وجہ سے میری خالہ مجھے نبی کریم ﷺ کے پاس لے گئیں اس

---

(۱)صحیح بخاری ۱/۵۰۱ کتاب المناقب باب خاتم النبوۃ، صحیح مسلم ۲/۲۵۹ کتاب الفضائل باب اثبات خاتم النبوۃ(مختار)

عمل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بزرگوں اور نیک بندوں کے پاس تبرک کے لیے جانے میں کوئی حرج نہیں۔ اس عورت کا نام تو معلوم نہیں البتہ علامہ جزریؒ نے اس کی دوسری بہن کا نام نمر بنت قاسط اور ملا علی قاریؒ نے حضرت سائبؓ کی والدہ کا نام علبہ بنت شریح لکھا ہے۔

وَجع(۱): یہ لفظ فتح واؤ اور کسرۂ جیم کے ساتھ وجع سے صفت ہے اس کے معنی ہیں دردمند ہونا۔ یعنی ذو وجع درد والا ہے۔ مذکورہ صحابیؓ کا یہ درد پاؤں میں ہو رہا تھا۔

بعض روایات میں وقع بھی آیا ہے یعنی إنّ ابن اختی وقع (۲) کے الفاظ آئے ہیں۔ لغۃً یہ سخت اور پتھریلی زمین پر چلنے کی وجہ سے پاؤں کے درد کو بھی کہتے ہیں اور اصل میں یہ پولیو کی طرح ایک خاص بیماری ہے۔ جو پاؤں میں درد اور لنگڑے پن کا سبب بنتی ہے۔

نبی کریمﷺ کی مسیحائی شان: فمسح راسی (۳) یہاں یہ اشکال ہے کہ درد پاؤں میں ہوتا تھا اور نبی کریمﷺ نے سر پر ہاتھ پھیرا؟ لیکن اس کا جواب آسان ہے۔ وہ یوں کہ نبی کریمﷺ نے شفاء ہاتھ نہیں پھیرا تھا بلکہ محض شفقت کی بناء پر ہاتھ پھیرا تھا۔ ہاں ساتھ ساتھ کچھ دم وغیرہ بھی کیا ہوگا۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ پاؤں کے ساتھ ساتھ سر میں بھی شکایت ہو۔ اور نبی کریمﷺ نے پاؤں کی نسبت سر کے علاج کو اہمیت دے کر ہاتھ پھیرا۔ اور بعض شراح کہتے ہیں کہ نبی کریمﷺ نے پاؤں کے علاج کے طور پر ہی سر پر ہاتھ پھیرا تھا اور نبی کریمﷺ کا عظیم مسیحائی مقام ہے۔ کہ درد پاؤں میں ہے اور سر پر ہاتھ پھیرنے سے وہ درد جاتا رہا۔ آپ کو یہ اعجازی تاثیر بہت وافر مقدار میں ملی تھی۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام برص کے مریضوں اور اندھوں کا علاج کر سکتے تھے تو نبی کریمﷺ تمام امراض کا علاج ایک توجہ سے کر سکتے تھے جس کے متعدد واقعات کتب احادیث میں منقول ہیں۔ مثلاً غزوہ خیبر کے موقع پر حضرت علیؓ کی دکھتی آنکھ

---

(۱) ای ذو وجع و هو یقع علی کل مرض (مواهب اللدنیة ص ۳۵)(مختار)

(۲) وقع گر جانے کو کہا جاتا ہے الاتحافات میں ہے الوقع وجع القدمین، مطلب یہ ہے میرا بھانجہ گر گیا ہے جس کی وجہ سے اس کے پاؤں میں تکلیف ہے۔ مگر زیادہ مشہور وجع ہے۔ (مختار)

(۳) دم کرنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ جس جگہ تکلیف ہو اسی جگہ ہاتھ پھیرے کما فی المواهب یوخذ منه ان یسنّ للراقی ان یمسح محل الوجع من المریض (مختار)

آپ ﷺ کی اعجازی تاثیر سے فوراً ٹھیک ہوگئی۔غار ثور میں ہجرت کے موقعہ پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کو سانپ نے ڈس لیا۔آپ ﷺ نے اس پر لعاب لگایا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ ٹھیک ہوگئے۔یہودی سردار ابورافع عبداللہ بن ابی الحقیق کے قتل کے بعد حضرت عبداللہ بن عتیک واپسی پر سیڑھی سے اترتے گر پڑے اور پنڈلی ٹوٹ گئی حضوراقدس ﷺ کے پاس پہنچ کر تفصیل بتلادی آپ ﷺ نے فرمایا پاؤں پھیلاؤ۔ حضوراقدس ﷺ نے اس پر ہاتھ پھیرا تکلیف ایسی زائل ہوگئی کہ کبھی تھی ہی نہیں۔بہرحال آپ ﷺ کے صرف ہاتھ لگانے سے بہت سی مہلک بیماریاں فوراً ختم ہوچکی ہیں۔حضرت سائبؓ کے سر پر جہاں ہاتھ لگا تھا روایت میں ہے کہ وہاں کے بال موت کے وقت تک سیاہ رہے۔

<u>برکت:</u> **ودعالی بالبرکة الخ** امام راغبؒ کے ہاں برکت کے معنی ہیں **وقوع الخیر الالٰھی فی الشیٔ الخ** یعنی کسی چیز میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر کا وقوع۔یہ عمر،صحت،علم،مال،رزق وغیرہ میں واقع ہوتی ہے۔اوقات میں بھی برکت ہوتی ہے جس کا معنیٰ یہ ہے کہ تھوڑے سے وقت میں اللہ تعالیٰ بہت بڑا کام انسان سے کرائے۔ہمارے بزرگوں نے بہت تھوڑے عرصہ میں علوم وفنون کے ذخائر چھوڑے ہیں۔حضرت تھانویؒ کی ہزار کے لگ بھگ تصانیف ہیں۔علامہ ابن تیمیہؒ کی تصانیف اتنی ہیں کہ روزانہ سینکڑوں صفحات اوسط نکلتے ہیں۔امام سیوطیؒ کی تصانیف ہزار سے اوپر ہیں۔مولانا عبدالحیٔ لکھنویؒ سے تھوڑی عمر میں اللہ تعالیٰ نے تصنیف وتالیف کا عظیم کام لیا۔حجۃ الاسلام مولانا قاسم نانوتویؒ سے مختصر زندگی میں کتنے بڑے کام لئے۔یہ بھی برکت۔حضرت سائبؓ کو بھی اللہ تعالی نے طویل عمر کے ساتھ صحت وعافیت بھی بخشی تھی۔اخیر عمر میں فرمایا کرتے تھے **"إِنِّی مَا متعت بسمعی و بصری إلاببرکة دعاء النبی ﷺ"**

فتوضأ(۱): یہ وضوء یا تو نماز کے لیے فرمایا یا قصداً حضرت سائبؓ کو وضوء کا پانی پلانے کیلئے آپ نے وضو کیا۔**شربت من وضوئه** واؤ کے فتحہ کے ساتھ ہے جو اس پانی کو کہتے ہیں جو وضو کرنے کیلئے رکھا گیا ہو۔اور بعض کہتے ہیں کہ وضو کرنے کے بعد جو فاضل پانی بچ جاتا ہے اور بعض کے خیال میں

---

(۱) **وضؤ بضم الواو غسل الاعضاء** کو کہا جاتا ہے جو شرعی طریقہ سے ہو، **وضؤ بفتح الواو** اس پانی کو کہا جاتا ہے جس کے ساتھ وضوء کیا جاتا ہے۔(مختار)

وہ مستعمل پانی جس سے وضو کیا جائے وضو کہلاتا ہے۔ یہاں پر اول معنی درست دکھائی نہیں دیتا کیونکہ نبی کریم ﷺ کے وضو کیلئے رکھے ہوئے پانی سے پینا سوء ادب ہے۔ دوسرا معنی محتمل ہے لیکن تیسرا معنی راجح ہے کہ نبی کریم ﷺ نے وضو کیا اور اعضاء مبارکہ سے جو پانی لگا تو اس کو پیا جس میں یقیناً شفاء کا اثر ہوگا۔

ماء مستعمل کا حکم: رہا یہ مسئلہ کہ مستعمل پانی پاک ہے یا نجس تو یہ فقہ کا مسئلہ ہے اور فقہ کی کتابوں میں اس کی تفصیل موجود ہے یا ترمذی کے ابواب الطہارات اس کے بیان کیلئے مناسب جگہ ہے۔ یہاں صرف اتنا معلوم ہونا چاہیے کہ امام ابوحنیفہؒ سے معروف قول کے مطابق یہ نجاست غلیظہ کے ضمن میں آتا ہے اور اس کا منشاء یہ بتایا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کو اللہ تعالیٰ نے وافر مقدار میں فراست ایمانی سے نوازا تھا۔ آپ کسی کے وضو کا پانی دیکھ کر بتا دیتے کہ اس شخص نے فلاں گناہ کیا ہے جو کہ وضو کی وجہ سے دھل کر پانی میں شامل ہو گیا۔ اگر وضو کے مستعمل پانی میں کبیرہ گناہوں کی نجاست شامل ہوتی تو آپ نے حکم دیا کہ یہ نجس ہے اور اگر گناہ صغیرہ کا احساس ہو جاتا تو نجاستِ خفیفہ کہہ دیتے۔ یہ تو مزاج کی لطافت کی بات ہے۔ بعض لوگوں کو بول و براز سے بھی بدبو کا احساس نہیں ہوتا اور بعض لوگ بہت دور سے اس کا احساس کر لیتے ہیں۔ اسی طرح بعض اکابر محض سونگھ کر بتا دیتے تھے کہ یہ کھانا حلال ہے اور یہ حرام کمائی سے خریدا ہوا ہے۔ بہر حال حضرت امام ابوحنیفہؒ کے ہاں ایک قول میں وضو کا مستعمل پانی نجس ہے۔ روایت ہے کہ آپ نے اپنے اس فتوے سے بعد میں رجوع بھی کیا ہے۔ اس لئے احناف کا مسلک یہ ہے کہ یہ پانی طاہر ہے مطہر نہیں (۱)۔

---

(۱) شرح وقایہ میں ہے والاختلاف الثالث فی حکمه فعندابی حنیفةؒ هونجس نجاسة غلیظة وعندابی یوسف هو نجس نجاسة خفیفة وعندمحمدهوطاهرغیرطهور (۱/۸۹) وهوروایة عن ابی حنیفة (الهدایة ۱/۱۶۴) وعلیه الفتویٰ کما فی البنایة وهوالاقویٰ من حیث الدلیل کما بسطناه فی السعایة (عمدة الرعایة ۱/۸۹) اور اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے علامہ عبدالحی لکھنویؒ لکھتے ہیں و من لطائف الاقوال ما فی المیزان لعبدالوهاب الشعرانیؒ قال سمعتُ سیدی علیاً الخوّاص قال مدارک الامام ابی حنیفة دقیقة یطلع علیها الاهل الکشف من اکابرالاولیاء و کان ابوحنیفة اذارأی ماء المیضاة یعرف سائر الذنوب التی فیه فلذاجعل ماء الطهارة اذاتطهربه المکلف له ثلاثة احوال احدها انه کالنجاسة الغلیظة لاحتمال ان یکون المکلف ارتکب کبیرة والثانی إنّه کالنجاسة المتوسطة لاحتمال ان یکون ارتکب صغیرة والثالث طاهرفی نفسه غیرمطهّر لغیره لاحتمال ان یکون ارتکب مکروهاً اوخلاف الأولیٰ (عمدة الرعایة ۱/۸۹) (مختار)

امام شافعیؒ اگراس حدیث سے مستعمل پانی کی طہارت پر استدلال کریں تو یہ درست نہیں ہوگا۔اس لئے کہ اگر یہاں مستعمل پانی مراد بھی ہو پھر بھی یہ تو نبی کریم ﷺ کے وضو کا پانی تھا اور آپ گناہوں سے پاک تھے تو وضو کی وجہ سے نجاست کا خلط پانی میں متصور نہیں ہے جبکہ دوسرے لوگوں کے وضو کا مستعمل پانی اس پانی پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا۔دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت سائبؓ نے استشفاء کی نیت سے وہ پانی پی لیا تھا جو نبی کریم ﷺ نے وضو میں مستعمل کیا تھا اور تداوی کیلئے استعمال عذر بھی ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ پہلے سے باوضو ہوں اور اس موقع پر محض وضو کی تجدید کی ہو ایسے وضو میں مستعمل پانی امام ابوحنیفہؒ کے ہاں بھی نجس نہیں ہے۔بعض حضرات نے نسخ کا احتمال بھی لیا ہے مگر درحقیقت تاریخ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے یہ احتمال راجح نہیں ہے۔

<u>حضرت سائبؓ کا طفلانہ تجسس:</u> فقمت خلف ظهره میں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے کھڑا ہوگیا اس وقت نبی کریم ﷺ وضو فرمارہے تھے۔ممکن ہے کہ یہ صحابی محض اتفاقاً آپ کے پیچھے آئے ہوں اور ہوسکتا ہے کہ چونکہ اس وقت حضرت سائب بن یزیدؓ چھوٹے تھے اور بچوں میں کرید اور تجسس کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔لہٰذا ممکن ہے کہ ختم نبوت کے بارے میں سننے کے بعد خود مشاہدہ کرنے کی تمنا ہو۔اور قصداً آپ ﷺ کے پیچھے آ کھڑے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ مہر نبوت دیکھنے کی نیت سے نہیں بلکہ ادباً پشت کی جانب کھڑے ہونے کو ترجیح دی ہو۔نبی کریم ﷺ گاہے گاہے قمیص استعمال کرتے تھے مگر عموماً رداء یعنی چادر استعمال فرماتے تھے اور چادر کبھی کبھی بدن سے سرک کر ہٹ جاتی ہے۔خصوصاً وضو اور دوسرے کام کرتے ہوئے چادر کے سرکنے کا احتمال زیادہ ہوتا ہے تو شاید یہ صحابی بھی اس انتظار میں کھڑے ہوں کہ مہر نبوت نظر آنے کا موقع ملے گا۔

<u>مہر نبوت کا محل:</u> فنظرت إلىٰ الخاتم الذى بين كتفيه ۔مہر نبوت آپ ﷺ کی پیٹھ پر کس جگہ واقع تھی راوی کے قول الذى بين كتفيه سے معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) کاندھوں کے درمیان میں واقع تھی۔

(۲) دوسرا قول اس بارے میں یہ ہے کہ عند كتفه الايمن یعنی داہنے کندھے کے قریب تھی۔

(۳) جبکہ ایک قول یہ ہے کہ بائیں کندھے کے قریب محاذاتِ قلب میں تھی۔

جیسا کہ علامہ قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ اخبار اس پر متفق ہیں کہ یہ بائیں کندھے کے نزدیک تھی اور چونکہ نبوت کی صداقت وحقانیت کیلئے مہر بڑی علامت تھی اسلئے قلب سے اسکا قریبی تعلق بھی تھا۔ مستدرک حاکم نے ایک روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام کو نبوت کی ایک علامت بخشی تھی لیکن وہ انکے دائیں ہاتھ میں ہوتی تھی جبکہ نبی کریمﷺ کو خصوصی طور پر یہ علامت پیٹھ پر کندھوں کے درمیان میں عطا کی گئی تھی۔

<u>ظہور مہر نبوت کا زمانہ:</u> یہ مہر کب سے لگی تھی اس کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔

(۱) ایک قول یہ ہے کہ نبی کریمﷺ کی ولادت کے ساتھ ساتھ مہر نبوت کا ظہور بھی ہوا تھا۔

(۲) دوسرا قول یہ کہ ولادت کے بعد یہ علامت ظاہر ہوئی۔

(۳) ایک روایت کے مطابق شق صدر کا معجزہ ہوا تو یہ مہر بھی ظاہر ہوئی۔

علامہ ابن حجرؒ اور قاضی عیاضؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے لیکن امام نوویؒ وغیرہ نے اس کو غلط قرار دیا ہے(۱)۔

(۴) جبکہ بعض کے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ عمر کے چالیسویں سال جب آپ کی بعثت ہو گئی تب یہ علامت ظاہر ہو گئی کیونکہ یہ نبوت کی علامت ہے اور اس سے پہلے نبوت کا اعلان نہیں ہوا تھا۔ تو ظہور علامت کی ضرورت نہ تھی اس کی تائید میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بعض روایات کے مطابق نبی کریمﷺ کی وفات کے بعد یہ علامت غائب ہو گئی(۲) لیکن محققین کے قول کے مطابق غائب ہونے کی بات درست نہیں جیسے کہ علامہ مناویؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔

---

(۱) ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے واختلفوا ھل ولد بہ اووضع بعد ولادتہ فعند ابی نعیم أنّہ لما ولد اخرج الملک صرۃ من حریر ابیض فیھا خاتم فضرب علی کتفہ کالبیضۃ وفی حدیث البزار وغیرہ انّہ قیل یا رسول اللّٰہﷺ کیف علمت انّک نبی وبم علمت حتی استیقنت قال اتانی اثنان وفی روایۃ ملکان وانا ببطحاء مکۃ فقال احدھما لصاحبہ اغسل بطنہ غسل الاناء واغسل قلبہ غسل الملاء ثم قال احدھما لصاحبہ خط بطنہ فخاط بطنی وجعل الخاتم بین کتفی کما ھو الآن وولیاعنی وکأنّی اری الأمر معاینۃ(جمع الوسائل ۱/۱۷) اور بعض کی رائے یہ ہے کہ یہ پیدائشی تھی۔(مختار)

(۲) <u>وفات کے بعد مہر ختم ہوا:</u> اور جب آنحضرتﷺ کا انتقال ہوا تو وہ مہر ختم ہو گئی۔ ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے روی البیھقی فی الدلائل عن شیوخہ انّھم قالوا لماشک الناس فی موت رسول اللّٰہﷺ وضعت اسماء بنت عمیس یدھا بین کتفیہ فقالت توفی رسول اللّٰہﷺ قد رفع الخاتم من بین کتفیہ(جمع الوسائل ۱/۷۰)(مختار)

زر الحجلة: فاذا هو مثل زر الحجلة حجلہ سے حجلۂ عروسی مراد ہے عموماً خاص مہمان یا اہم شخصیت کیلئے مجلس میں ممتاز اور الگ جگہ بنائی جاتی ہے جسے منصہ بھی کہتے ہیں۔ جیسا کہ دار الحدیث میں شیخ الحدیث کیلئے بنا ہوا ہمار چھوٹا سا تخت ہے جسے ہم مسند کہتے ہیں اسی طرح دلہا یا دلہن کو بھی نمایاں جگہ پر بٹھایا جاتا ہے جہاں چھوٹی سی چھت لگی ہوتی ہے چادروں اور پھولوں سے اس جگہ کی تزئین ہوتی ہے یہ ایک بیش قیمت تخت ہوتا ہے جسے چھپر کھٹ اور مسہری بھی کہتے ہیں۔ عربی میں اسے حجلۃ العروس کہا جاتا ہے۔

حجلہ یا چھپر کھٹ پر بیش قیمت پردے اور منقش چادریں ہوتی ہیں ان پر کپڑے وغیرہ سے بنے ہوئے گول گول بٹن ہوتے ہیں انہی کو "زر" کہتے ہیں اردو میں اسے گھنڈی کہتے ہیں جس کی جمع ازرار ہے۔ مختصر المعانی میں آپ نے یہ شعر پڑھا ہوگا لا تعجبوا من بلی غلالته قدزر ازاره علی القمر

ترجمہ: اس محبوب کے بدن سے لگے ہوئے کپڑے کی بوسیدگی سے تعجب نہ کرو کیونکہ اس کی گھنڈیاں تو چاند کے اوپر باندھی گئی ہیں (اور چاند ریشمی کپڑے کو جلدی بوسیدہ کر دیتا ہے)

ایک اور روایت میں مثل رز الحجلة کے الفاظ منقول ہیں (۱) یعنی راء مقدم ہے۔

اس صورت میں حجلة سے مراد کبوتر کی جسامت کا ایک خاص قسم کا پرندہ ہے اس کی چونچ سرخ ہوتی ہے جسے چکور اور کبک کہتے ہیں۔ عربی میں دجاج البر کے نام سے مشہور ہے۔ رز اس کے انڈے کو کہتے ہیں اصل میں یہ لفظ رزتِ الجرادة سے ہے ٹڈی جب انڈے دیتی ہے تو وہ اپنی دم زمین میں دھنسا دیتی ہے اور انجکشن کی طرح ایک بار میں بہت زیادہ انڈے دے دیتی ہے۔ ٹڈی کے اس عمل کیلئے رزت الجرادة بولا جاتا ہے۔ بہر حال یہاں تشبیہ سے مراد یہ ہے کہ جسم میں مہر نبوت رز الحجلة یعنی چکور کے

---

(۱) عن سائب بن يزيد قال ذهبت بي خالتي إلیٰ رسول الله ﷺ فقالت يا رسول الله إنّ ابن اختي وقع فمسح رأسي ودعالي بالبركة و توضأ فشربت من وضوئه ثم قمت خلف ظهره فنظرت إلیٰ خاتم بين كتفيه مثل زر الحجلة قال ابن عبدالله الحجلة من حجل الفرس الذى بين عينيه. وقال ابراهيم بن حمزة مثل رز الحجلة قال ابوعبدالله الصحيح الراء قبل الزاء (بخاری ج ۲ ص ۵۰۱). (اصلاح الدين)

انڈے جتنا تھا(۱)۔ مہر کی سمت اور مقدار کی تعبیر کسی نے کم اور کسی نے زیادہ کردی کہ ہر ایک کا ایک اندازہ اور تخمینہ ہوتا ہے اس لئے روایات متعارض نہیں۔ تفصیل آرہی ہے۔

(۲) حدثنا سعید بن یعقوب الطالقانی أخبرنا أیوب بن جابر عن سماک بن حرب عن جابر بن سمرۃ قال رأیت الخاتم بین کتفی رسول اللّٰہ غدۃ حمراء مثل بیضۃ الحمامۃ(۲).

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرۃؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی مہر نبوت کو آپ ﷺ کے دونوں کندھوں کے درمیان دیکھا جو سرخ رسولی جیسے تھی اور مقدار میں کبوتر کے انڈے جتنی تھی۔

مہر نبوت کا رنگ: **غدۃ حمرأ، الغدۃ القطعۃ المرتفعۃ من اللحم فی الجسم** یعنی بدن میں گوشت کے ابھرے ہوئے ٹکڑے کو غدہ کہتے ہیں اردو میں اسے غدود کہا جاتا ہے اس کی جمع غدود آتی ہے۔ یہاں پر مہر نبوت کا رنگ سرخ بتایا گیا ہے اس کے رنگ میں روایات مختلف ہیں کہیں زرد اور کہیں سبز بھی مروی ہے۔

مسلم کی ایک روایت میں سیاہ اور ایک دوسری روایت میں جلد کی رنگت کا ذکر آیا ہے۔ لیکن روایات میں تطبیق آسان ہے کیونکہ یہ رنگ یا تو مختلف اوقات میں تبدیل ہوتا رہا اور موسم کی تبدیلیوں سے اس میں فرق آتا رہا(۳) اور یا یہ ہے کہ دیکھنے والے کو جس طرح محسوس ہوا اسی طرح روایت کردی۔

ایک روایت کے مطابق اس مہر پر باطن میں **وحدہ لا شریک لہ** اور ظاہر میں توجہ

---

(۱) چکور کا انڈا مرغی کے انڈے سے قدرے چھوٹا ہوتا ہے اور کبوتری کے انڈے سے ذرا بڑا ہوتا ہے۔ اور مولانا شیخ زکریاؒ نے فرمایا ہے کہ حقیقت میں یہ سب تشبیہات ہیں اور ہر شخص کی تشبیہ اس کے ذہن کے مطابق ہوتی ہے جو تقریبی حالت ہوتی ہے اور تقریب کے اختلاف میں اشکال نہیں ہوتا بندہ کے نزدیک یہ توجیہ زیادہ مناسب ہے(خصائل)(مختار)

(۲) **مسلم ۲/۲۵۹ کتاب الفضائل باب اثبات خاتم النبوۃ، جامع ترمذی ۲/۱۸۴ کتاب المناقب باب فی خاتم النبوۃ(مختار)**

(۳) **قال شیخ إبراھیم البیجوریؒ ولا تدافع بین ھذہ الروایات لأنّہ کان یتفاوت باختلاف الاوقات فکانت کلون جسدہ تارۃ وکانت حمراء تارۃ وھکذا بحسب الاوقات (المواھب اللدنیۃ ص ۳۱)(مختار)**

حیث کنت فانت منصور کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ مگر یہ مرجوح ہے کیونکہ بعثت انبیاء بھی ایک آزمائش ہے ایمان لانا اور نہ لانا بندوں کے اختیار میں ہے۔ اور بات ایسی ہوتی تو انکار کی گنجائش باقی نہ رہتی اور یہ اضطرار کے مترادف ہوتا دراصل اس وہم کا منشا یہ بنا کہ انگوٹھی کو بھی خاتم کہا جاتا ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کی انگوٹھی پر کچھ الفاظ کندہ تھے۔ اس سے بعض حضرات کو یہ وہم ہوا کہ یہ الفاظ خاتم نبوت پر لکھے ہوئے تھے۔

مہر نبوت کا حجم: مہر نبوت کے حجم یعنی کمیت اور مقدار میں بھی روایات مختلف ہیں ایک روایت میں مثل زر الحجلة آیا ہے یعنی چھپر کھٹ کے پردے کے گھنڈی جتنا تھا۔ بعض نے ان کے معنی انڈے اور حجلہ کے معنی چکور کیلئے ہیں یعنی چکور کے انڈے جتنا تھا۔ ایک اور روایت میں صرف شعرات مجتمعات مروی ہے۔ مصنفؒ کی روایت میں بضعة ناشزة یعنی گوشت کا ابھرا ہوا ٹکڑا ذکر ہے۔ ابن حبان کی ایک روایت میں بیضة نعامة آیا ہے۔ مسلم کی روایت میں کبیضة الحمام مذکور ہے۔ بیہقی کی روایت میں سیب اور ابن عساکر کی روایت میں بندقہ یعنی غلیل کی گولی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بعض روایات میں کأثر المحجم ذکر ہے۔ بعض نے صرف چمکتی روشنی بتایا ہے۔ ابوسعید خدریؓ کی روایت میں مثل الجمع یعنی مٹھی جتنا کہا گیا ہے۔ نیز یہ بھی ہے کہ اس کے اردگرد مسوں کی طرح سیاہ تل تھے۔ بہر حال ان تمام روایات میں تطبیق آسان ہے اور وہ اس طرح کہ اس کے حجم اور کیفیت میں اختلاف زمانے پر مبنی ہے یعنی مختلف اوقات میں اس کا حجم بھی مختلف ہوتا رہا۔ کبھی چھوٹا ہوتا تو کبھی بڑا ہو جاتا تھا۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ درحقیقت یہ تمام اقوال تشبیہات اور اندازے ہیں۔ تحدیدی بات نہیں۔ جس صحابی نے مہر نبوت کو دیکھا اس نے اپنی تقریبی تخمینے سے اس کی کمیت و کیفیت کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہے اس وجہ سے رواۃ کے بیانات میں اختلاف واقع ہوا ہے(۱)۔

خلاصہ تمام روایات کا یہ ہے کہ مہر نبوت جلد پر ایک ابھری ہوئی چیز تھی جو کہ آپ ﷺ کی پیٹھ پر صاف اور واضح دکھائی دیتی تھی۔ اس کے اردگرد بال بھی تھے اور رنگ میں تبدیلی بھی واقع ہوتی تھی۔ غلیل کی

---

(۱) اور ایک جواب یہ بھی ہے کہ گزشتہ حدیث پاک میں گھنڈیوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے وہ اس کی خوبصورتی کے لحاظ سے ہے اور اب بناوٹ کے لحاظ سے بیان ہے کہ مہر نبوت اپنے بناوٹ میں کبوتری کے انڈے کے مشابہ تھی (فیض الباری)، (مختار)

گولی جتنا چھوٹا ہو جاتا تھا اور کبھی بڑھ کر مٹھی جتنا ہو جاتا تھا(۱)۔

(۳) حدّثنا أبو مصعب المدنیّ أخبرنا یوسف ابن الماجشون عن أبیہ عن عاصم بن عمر بن قتادۃ عن جدتہ رمیثۃ قالت سمعت رسول اللّٰہ ﷺ ولو اشاء ان اقبل الخاتم الذی بین کتفیہ من قربہ لفعلت یقول لسعد بن معاذ یوم مات اهتزلہ عرش الرحمان .

ترجمہ: حضرت رمیثہؓ کہتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے (اتنے قریب سے) سنا کہ اگر میں چاہتی کہ قرب کی وجہ سے آپ ﷺ کے کندھوں کے درمیان کے مہر نبوت کو چوم لوں تو ایسا کر سکتی۔ آپ ﷺ حضرت سعدؓ کی وفات کے روز ان کے بارے میں فرما رہے تھے کہ ان کی موت کی وجہ سے حق تعالیٰ شانہ کا عرش بھی جھوم اٹھا۔

الماجشون اور رمیثہؓ: عن یوسف بن الماجشون: یوسفؒ کے باپ یعقوبؒ اور ان کے دیگر آباء کو ماجشون کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دراصل یہ یعقوب کے دادا ابو سلمہ تیمی کا لقب تھا۔ کہتے ہیں کہ چہرے کی سرخی کے سبب اسے ماجشون کہا جاتا تھا۔ یہ لفظ جیم کے کسرہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ منقول ہے۔ بعض نے فتحہ کو بھی درست قرار دیا ہے۔ اصل میں یہ فارسی لفظ ماہ گون یعنی چاند نما یا مے گون سے معرب ہے میگون کے معنی شراب جیسی رنگت والا ہوتے ہیں۔

عن جدتہ رمیثۃ بنت عمر و بن ھشام عمرو بن ہشام کی بیٹی کم عمر صحابیہ ہیں ان سے دو حدیثیں مروی ہیں اس حدیث میں غزوہ خندق کے موقع کی روایت کرتی ہیں۔

لقربہ: یعنی بسبب قربہ اور قرب کا مصدر اپنے مفعول کو مضاف ہے یعنی لقربی ایاہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ قرب کے بیان میں دراصل صحابیہ کا مقصد یقینی روایت اور کمال معرفت پر تنبیہ کرنا ہے یعنی اتنے

---

(۱) کتب سابقہ میں بھی آنحضرت ﷺ کے مہر نبوت کا ذکر موجود تھا۔ شاہ مقوقس کے پاس جب رسول اللہ ﷺ کا خط مبارک پہنچا تو اس نے کہا کہ کتب سابقہ میں نبی آخر الزمان کی تین علامات میں نے پڑھی ہیں (۱) اس کے دونوں کندھوں کے درمیان مہر نبوت ہوگی (۲) دراز گوش پر سوار ہوں گے (۳) معمولی چادر اوڑھنے میں بھی تکلف نہیں کریں گے۔ (مختار)

قریب سے مہر دیکھ لی کہ چاہتی تو چھوم بھی سکتی تھیں(۱)۔

سعد بن معاذ اور اهتزاز عرش الرحمن: **یقول لسعد بن معاذؓ یعنی یقول فی شانه اوفی حقه** ،یعنی حضرت سعد بن معاذؓ کے حق میں یا اس کے بارے میں فرمایا تو لام اس جگہ فی کے معنی پر مستعمل ہے۔قرآن مجید میں لام فی کی جگہ استعمال ہوا ہے۔جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ **وقال الذین کفرو اللذین آمنوا لو کان خیراً ما سبقونا الیه.** (الایۃ)

بہر حال اس جگہ بھی نبی کریم ﷺ حضرت سعدؓ کی مدح کرتے ہوئے ان کے بارے میں کچھ فرماتے ہیں۔حضرت سعد بن معاذؓ قبیلہ اوس کے سردار تھے۔۳۷ سال کی بھرپور جوانی میں جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے۔یہ ۵ھ کا واقعہ ہے جب جنگ خندق میں تیر لگنے کی وجہ سے خون زیادہ بہہ گیا اور شہادت پائی۔ستر ہزار فرشتے بھی نماز جنازہ میں شریک ہوئے۔نبی کریم ﷺ نے آپؓ کی موت کے بارے میں فرمایا کہ **اهتزّله عرش الرحمان** یعنی آپؓ کی وفات سے اللہ تعالیٰ کا عرش ہل گیا۔

اس کی کئی توجہات ہیں۔

(۱) اهتزّ،هزّ سے باب افتعال کا ماضی ہے کہتے ہیں **هززته فاهتزّ** میں نے اسے ہلایا تو وہ ہل گیا۔ **هزّ اور اهتزّ** دونوں کے معنی حرکت کرنا اور جھومنا ہے۔لیکن اهتزاز کا لفظ خوشی میں بھی مستعمل ہے کیونکہ خوشی کے موقع پر بھی انسان جھومنے لگتا ہے دل کی دھڑکن بھی خوشی کی وجہ سے تیز ہو جاتی ہے۔اس لحاظ سے **اهتزاز** خوشی میں جھومنے کو بھی کہتے ہیں۔اگر چہ یہ نفسِ حرکت اضطراب، ہلنے اور جھومنے کا نام ہے۔اللہ

---

(۱) **ولو اشاء ان اقبّل الخاتم الذی بین کتفیه من قربه**، مہر نبوت کی جگہ کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ مہر نبوت دونوں مونڈھوں کے درمیان بائیں بازو کے مساوی بائیں کندھے کے نیچے قلب کے مقابل میں تھی اس کی علت یہ بیان کرتے ہیں کہ اسی جگہ سے شیطان وسوسہ ڈالتا ہے۔اس مہر نبوت کی وجہ سے آپ ﷺ شیطانی وسوسہ سے محفوظ ہو گئے تھے۔ملا علی قاریؒ اور حافظ ابن حجرؒ نے اس بات کو نقل کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ شق صدر کے موقع پر جب دل کو زمزم سے دھویا گیا اس کے بعد میری پیٹھ پر مہر نبوت لگادی گئی جس کی ٹھنڈک کو میں نے اپنے دل میں محسوس کیا۔(مختار)

مہر نبوت کی خوشبو: اور اس مہر نبوت سے خوشبو آتی تھی۔ملا علی قاریؒ نے اس پر حضرت جابرؓ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اپنے پیچھے بٹھایا تو میں نے آپ ﷺ کی مہر نبوت کو بوسہ دیا تو اس سے مشک کی خوشبو آرہی تھی۔(مختار)

تعالیٰ کا عرش اس خوشی میں جھومنے لگا کہ حضرت سعد بن معاذؓ کی عظیم قربانی اور للّٰھیت اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہوگئی۔

(۲) دوسری توجیہ یہ ہے کہ عرش سے مراد یہاں اہل العرش اور حملۃ العرش یعنی عرش کو اٹھانے والے فرشتے مراد ہیں جن کو ملائکہ کروبیین کہتے ہیں (۱)۔ شاعر کہتا ہے۔

دردِدل کے واسطے پیدا کیا انسان کو   ورنہ طاعت کیلئے کچھ کم نہ تھیں کروبیاں

قرآن کریم بتلاتا ہے کہ ان فرشتوں کو مومنین کے ساتھ بے انتہا محبت ہے حتیٰ کہ ان کے بال بچوں تک کیلئے دعا کرتے رہتے ہیں۔

الـذیـن یـحـملون العرش و من حوله یسّبحون بحمد ربهم و یـومـنـون بـه و یستغفرون للذین آمنوا ربّنا وسعت کل شئی رحمةً و عـلـماً فاغفر للذین تابوا واتبعوا سبیلک و قهم عذاب الجحیم. ربّنا وادخـلهـم جنّٰت عدن التی وعدتهم ومن صلح من آباء هم وأزواجهم وذریّاتهم انّک انت العزیز الحکیم(۱).

ترجمہ: وہ فرشتے جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ جو اس کے اردگرد ہیں۔ وہ اپنے رب کی تسبیح وتحمید کرتے رہتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور ایمان والوں کیلئے استغفار کیا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تیری رحمت اور علم ہر چیز کو شامل ہے۔ سو ان لوگوں کو بخش دیجئے جنہوں نے توبہ کرلی ہے اور آپ کے راستے پر چلتے ہیں اور ان کو عذاب جہنم سے بچالیجئے۔ اے ہمارے رب! اور ان کو ہمیشہ رہنے کی بہشتوں میں جن کا تم نے ان سے وعدہ کیا ہے داخل کردیجئے، اوران کے ماں باپ اور

---

(۱) اور ایک توجیہ یہ بھی ہے کہ اللہ کے عرش میں جنبش پیدا ہوئی ان کافروں پر غصہ کی وجہ سے کہ انہوں نے اسلام کے سچے جاں نثار کو زخمی کیا جس سے ان کی شہادت ہوگئی۔ بقول ایک انصاری شاعر کے

وما اهتزّ عرش الله من موت هالک   سمعنا به إلاّ لسعد ابی عمرو (کسی مرنے والے کی موت پر اللہ کا عرش نہیں ہلا مگر سعد ابی عمرو کی موت پر (ابوعمرو آپؓ کی کنیت ہے) (مختار)

(۲) سورۃ المؤمن ۷، ۸

بیویوں اور اولاد میں سے جو لائق ہوں ان کو بھی داخل کردیجئے بلاشک تو زبردست حکمت والا ہے۔

تو ان فرشتوں نے جب حضرت سعدؓ کی عجیب وغریب قربانی دیکھ لی تو بہت خوش ہو گئے اور کیف و وجد میں آئے اور جب حملۃ العرش حرکت کریں گے تو عرش میں بھی حرکت آئے گی۔

(۳) تیسری توجیہ یہ ہے کہ عرش ، کرسی، آسمان، اور زمین تمام کے تمام مومن کے اعمال صالحہ کی وجہ سے خوش ہوتے ہیں۔ اعمال سیئہ کی وجہ سے انہیں دکھ ہوتا ہے جب تک اعمال صالحہ جاری ہوں گے وہ انبساط ومسرت میں ہونگے وہ جگہ جہاں مومن سجدے کیا کرتا تھا سجدوں کے انقطاع سے روتا ہے۔ وہ راستہ جن سے اس کے اعمال حسنہ گزرتے تھے اعمال کے سبب خوش ہوتا تھا۔ اعمال کے انقطاع سے اسے دکھ ہوتا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ آسمان وزمین مومنین کی موت پر روتے ہیں کفار کے لئے وہ نہیں روتے۔ اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ

فما بكت عليهم السماء والارض و ما كانوا منظرين(دخان ۲۹)

پس نہ تو ان (فرعونیوں پر) آسمان وزمین کو رونا آیا اور نہ ان کو مہلت دی گئی۔

بہر حال یہ غم واضطراب کا رعشہ تھا جو عرش کی حرکت کا سبب بنا۔

(۴) چوتھی توجیہ یہ ہے کہ عرش سے مراد عرش الرحمان نہیں بلکہ مراد وہ چارپائی ہے جس پر لاش پڑی تھی جیسا کہ براء بن عازبؓ کی روایت میں ہے **اهتزّ السرير** (۱) چارپائی حرکت میں آئی۔ یعنی جس چارپائی پر لاش پڑی تھی فرشتوں کے ہجوم کی وجہ سے وہ ہچکولے کھا گئی لیکن اس صورت میں پھر عرش الرحمان کا لفظ اچھی طرح منطبق نہیں ہوتا۔

<u>حضرت براءؓ کے بارے میں غلط فہمی اور اس کا ازالہ:</u> حضرت جابرؓ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت براء بن عازبؓ نے حدیث کی یہ تشریح اس لئے کی ہے کہ حضرت سعدؓ اوسی اور حضرت براءؓ خزرجی ہیں۔ اور معاصرت کی وجہ سے دونوں قبیلوں میں بدگمانیاں تھیں۔ اور چونکہ حضرت سعدؓ کے بارے

(۱)عن جابرؓ سمعت النبیﷺ يقول اهتزّ العرش لموت سعد بن معاذؓ. فقال رجل لجابر فان البراءؓ يقول اهتزّ السرير فقال كان بين هذين الحيين ضغائن سمعت النبیﷺ يقول اهتزّ عرش الرحمان لموت سعد بن معاذؓ. (صحیح بخاری ج ۲ ص ۵۳۶)(اصلاح الدین)

میں رسول اللہ ﷺ کا یہ قول اوس کیلئے بھی بڑا اعزاز تھا اس لئے اس نے پرانی چشمک کی بنا پر عرش الرحمٰن کا مفہوم السریر سے بدل دیا۔

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو کسی جلیل القدر صحابی سے اس قسم کی عصبیت کا صدور بعید از قیاس ہے کہ وہ محض حسد کی بناء پر نبی کریم ﷺ کے قول میں بھی تحریف کرلے بلکہ اس قسم کی تبدیلی کرنے والا عادل ہی نہیں رہتا اس کی روایت قبول نہیں۔ لہٰذا اصل بات یہ ہے کہ حضرت براءؓ کو اگرچہ غلط فہمی ہوئی ہے لیکن وہ اس پر مبنی نہیں کہ حضرات براءؓ خزرجی ہیں اور حضرت سعد اوسی بلکہ یہ الزام ہی بے بنیاد اور سراسر غلط ہے وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں صحابی اوسی (۱) ہیں لہٰذا مذکورہ وجہ تبدیلی کیلئے نہیں بن سکتی۔

رہا حضرت جابرؓ کی حدیث تو وہ درحقیقت حضرت براءؓ کی طرف سے اس کی توجیہ کیلئے اعتذار کر رہے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ انہوں نے یہ تبدیلی یا توجیہہ اس لئے نہ کی کہ اوسی ہونے کی وجہ سے حضرت سعدؓ کی فضیلت پر پردہ ڈال دے۔ اس لئے کہ یہ کام تو حضرت جابرؓ کے قبیلہ کے کسی شخص کو کرنا تھا کیونکہ خزرج کو حضرت سعدؓ کے قبیلہ اوس سے پرانی چشمک تھی۔ چنانچہ حضرات براء بن عازبؓ کی بات عجیب لگتی ہے کہ اوسی ہونے کے باوجود اپنے سردار کی فضیلت کا انکار کررہے ہیں اسلئے ظاہر ہے وہ کسی غلط فہمی کی بناء پر ایسا کررہے ہیں نہ کہ حسد کی بناء پر۔ بہرحال ان کے خیال میں بھی عرش الرحمان ہی درست ہے اور یہ راجح بھی ہے (۲)۔

---

(۱) علامہ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں حضرت براءؓ کا شجرہ یوں لکھا ہے۔ براء بن عازب بن الحارث بن عدی بن مجدعة بن حارثة بن الحارث بن الخرج بن عمرو بن مالک بن الاوس ۱۲ (اصلاح الدین)

(۲) وانّما قال جابر ذالک اظهاراً للحق واعترافاً بالفعل لاهله فکانّه تعجب من البراء کیف قال ذالک مع انّه اوسيّ ثم قال امّا انا وان کنت حزرجیاً وکان بین الاوس والخزرج ضغائن لا یمنعنی ذالک ان اقول الحق نذکر الحدیث والعذر للبراء انّه لم یقصد تغطیة فضل سعد وإنّما فهم ذالک فجزم به(فتح الباری) شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے یہی فرمایا ہے کہ جس کو حضرت جابرؓ بیان فرمارہے ہیں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ محقق ہے اس میں کسی قسم کی زیادتی و تحریف نہیں ہے حضرت براءؓ کو پورے الفاظ یاد نہیں کیونکہ میں خزرجی ہوں اور حضرت سعدؓ اوسی ہیں اوس اور خزرج میں مدتوں کینہ رہا ہے تو ایک قبیلہ والا دوسرے مقابل کے قبیلہ کے فضائل میں زیادتی نہیں کرسکتا بلکہ پورا بیان کیا ہے کہ عرش الرحمٰن کے الفاظ تھے (تقریر ترمذی) (مختار)

<u>غیر ذوی العقول کا ادراک:</u> یہاں ایک اشکال سامنے آتا ہے کہ عرش تو غیر ذی عقل ہے اور غیر ذی عقل سے کسی کی

(باقی اگلے صفحہ پر)

(۴) حدّثنا أحمد بن عبدة الضبیّ وعلی بن حجر وغیر واحد قالوا نبانا عیسیٰ بن یونس عن عمر بن عبداللّٰہ مولی غفرۃ قال حدّثنی إبراھیم بن محمّد من ولد علی بن ابی طالبؓ قال کان علیؓ اذا وصف رسول اللّٰہ ﷺ فذکر الحدیث بطولہ وقال بین کتفیہ خاتم النبوۃ وھو خاتم النبیین(۱)۔

ترجمہ: ابراہیم بن محمد جو حضرت علیؓ کے پوتے ہیں کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ جب نبی کریم ﷺ کی صفت بیان کیا کرتے تو فرماتے ۔۔اور مذکورہ حدیث کو بیان کیا اس میں یہ بھی فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے دونوں مونڈھوں کے درمیان مہر نبوت تھی اور آپ خاتم النبین تھے۔

(بقیہ پچھلے صفحہ کا)۔۔۔۔۔۔۔۔موت پر حرکت کرنا کیسے ممکن ہے؟ تو اہل علم نے لکھا ہے کہ دنیا میں کوئی چیز عقل وشعور سے خالی نہیں حتیٰ کہ جمادات اور شجر وحجر بھی اپنی اپنی عقل کے مطابق اپنے رب کا ذکر اور تسبیح پڑھتے ہیں۔قرآن پاک میں ارشاد خداوندی ہے تسبّح لہ السموات السبع والارض ومن فیھنّ وان من شیٔ إلاّ یسبح بحمدہ(الایۃ) قرآن پاک میں خشیۃ الٰہی کی وجہ سے پہاڑ کی سے گرنا،اس میں شگاف پیدا ہوکر اس پتھر سے نہر کا جاری ہونا وغیرہ ثابت ہے۔وإنّ من الحجارۃ لمایتفجر منہ الانھٰر وانّ منھالمایشقق فیخرج منہ الماء وإنّ منھالمایھبط من خشیۃ اللّٰہ(الایۃ سورۃ البقرۃ ایت ۷۴) اور رسول اللہ ﷺ سے ہاتھ مبارک میں کنکریوں کا ذکر وتسبیح ثابت ہے۔ اسی طرح صحیح مسلم میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں اب بھی اس پتھر کو پہچانتا ہوں کہ جو نبوت سے پیشتر مجھ کو سلام کیا کرتا تھا۔اسی طرح صحیحین میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ،ابوبکرؓ،عمرؓ اور عثمانؓ جبل اُحد یا حراء پر چڑھے تو پہاڑ کو جنبش ہوئی تو آپ ﷺ نے اپنا قدم مبارک پہاڑ پر مارا اور فرمایا کہ اے پہاڑ ٹھہر إنّ علیک نبی وصدیق وشھیدان ،اور حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ ہم جب کبھی نبی کریم ﷺ کے ساتھ مکہ سے باہر جاتے تو جس درخت یا پہاڑ پر گزر ہوتا تو یہ آواز آتی السلام علیک یارسول اللّٰہ ﷺ ،اور اسی طرح ستون حنانہ کا واقعہ صحیح بخاری شریف میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔اس لئے علامہ کاندھلویؒ نے لکھا ہے اہلسنت والجماعت کے نزدیک حیوانات اور جمادات میں بھی روح اور حیات ہے اور ان میں ایک خاص قسم کا شعور اور ادراک ہے جس کی حقیقت اللہ ہی کو معلوم ہے(معارف القرآن ۲۱۰،۲۱۲)

تو اسی وجہ سے عرش الرحمٰن کا حضرت سعدؓ کی موت کا ادراک کرکے حرکت کرنا ناممکن نہیں(مختار)

(۱)مشکوٰۃ المصابیح ۵۱۷/۲ باب اسماء النبی ﷺ، جامع ترمذی ۲۰۵/۲ ابواب المناقب باب صفۃ النبی ﷺ(مختار)

نے ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو میری انگلیاں مہر نبوت پر پڑیں۔ میں نے پوچھا کہ مہر نبوت کیا چیز تھی انہوں نے کہا کہ کچھ بالوں کا مجموعہ تھا۔

أبو زید عمر بن أخطب الأنصاریؓ مشہور بدری صحابی ہیں نبی کریم ﷺ کے زمانے میں جن چار صحابہ نے قرآن جمع فرمایا تھا ان میں آپ کا نام گرامی بھی ہے۔ایک روایت میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے آپ کے بارے میں دعا کی تھی انکے پوتے کہتے ہیں کہ ایک سو بیس سال تک زندہ رہے اور آپ کی داڑھی اور سر میں صرف چند بال سفید تھے۔

یاأبا زید بعض نسخوں میں ''یاابازید'' بغیر الف کے لکھا گیا ہے۔لیکن ہمزہ کا سقوط صرف کتابت میں جائز ہے قرأت میں یا ابازید ہی پڑھا جاتا ہے۔

صحابی کو مسح ظہر کا حکم: فامسح ظهری الخ کبھی کبھی کپڑوں میں حشرات میں سے کوئی چیز مثلا چیونٹی ، بچھو یا بھڑ وغیرہ گھس جائے تو اپنے ساتھیوں سے کہا جاتا ہے کہ ذرا اس کی تلاش کرنے میں مدد دے۔تو شاید آپ ﷺ کو بھی کسی موذی چیز کا احساس ہو چکا ہو لہذا صحابی سے کہا کہ وہ دیکھ لے کہ کہیں بچھو وغیرہ نہ ہو اور ممکن ہے کہ آپ ﷺ کی پیٹھ میں کھجلی اٹھی ہو اور صحابی کو کھجلانے کا حکم دیا ہو۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ نبی کریم ﷺ نے نور نبوت سے یہ محسوس کرلیا ہو کہ اس صحابی کو مہر نبوت دیکھنے کی خواہش اور تمنا ہے جیسا کہ بعض صحابہ کو تجسس ہوتا تھا اور اس علامت کو دیکھنے کے متمنی ہوتے تھے۔تو نبی کریم ﷺ نے یہ خواہش اپنی فراست سے محسوس کی اور صحابی کے اطمینان کے لیے مہر نبوت دیکھنے کی دعوت دی لیکن اس صحابی نے کپڑے کے اندر سے ہاتھ ڈال کر دیکھا ہے آنکھوں سے نہیں دیکھا نبی کریم ﷺ کے پاس عموماً قمیص نہیں ہوتی تھی اور ہوسکتا ہے کہ قمیص پہنے ہوئے ہوں تو شاید گریباں پیٹھ کی جانب بنا ہوا ہو۔جس طرح کہ آج کل بھی بعض علاقوں کا دستور ہے۔کہ گریباں سینہ کی بجائے پیٹھ پر بنایا جاتا ہے۔

قلت ما الخاتم شاگرد کا مقصد ماہیت سے سوال نہیں بلکہ وہ کیفیت کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہے۔شعرات مجتمعات بالوں کا گچھا سا تھا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس حدیث کا دیگران احادیث سے بظاہر تعارض ہے جن میں مہر نبوت کو لحم نابت (ابھرے ہوئے گوشت) یا غدہ اور بضعہ ناشزۃ وغیرہ سے

تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ اگر ایک طرف مہر نبوت ابھرا ہوا گوشت تھا تو دوسری طرف اس کے اردگرد بال بھی تھے اب یا تو اس راوی کی انگلیاں صرف بالوں پر پڑی ہیں لہٰذا وہ ابھرے ہوئے گوشت کا ذکر نہیں کرتا یا پھر یہاں عبارت حذف مضاف سے ہے تقدیر یوں ہوگی کہ لحم نات ذو شعرات یعنی ابھرا ہوا گوشت تھا جس کے اردگرد بال تھے۔

علامہ بیجوریؒ نے علم قیافہ والوں کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ جس شخص کی پیٹھ پر سیاہ دھبہ ہو جس پر بال ہوں اس کی اپنی زندگی بھی تھکا دینے والی ہوگی۔ نیز اس کے اقارب اس کی وجہ سے دنیا میں شدائد جھیلیں گے۔ نیز اس کی موت بھی زہر سے ہوگی اور تینوں باتیں نبی کریمﷺ کے حق میں ظاہر ہو چکی ہیں(۱)۔

(۶) حدثنا أبو عمّار الحسين بن حديث الخزاعی ثناعلی بن حسين بن واقد ثنی ابی عبدالله بن بريدة قال سمعت أبی بريدة يقول جاء سلمان الفارسی إلی رسول اللهﷺ حين قدم المدينة بمائدة عليها رطب فوضعها بين يدی رسول اللهﷺ فقال يا سلمان ما هذا فقال صدقة عليک وعلی اصحابک فقال ادفعها فانا لاناکل الصدقة قال فرفعها فجاء الغدبمثله فوضعه بين يدی رسول اللهﷺ فقال ما هذا يا سلمان فقال هدية لک فقال رسول اللهﷺ لاصحابه ابسطوا ثم نظر الی الخاتم علی ظهر رسول اللهﷺ فآمن به و كان لليهود فاشتراه رسول اللهﷺ بكذا و كذا درهماً علی ان يغرس لهم نخيلا فيعمل سلمان فيه حتی تطعم فغرس رسول اللهﷺ

(۱)واعلم أنّهم قالوا من كان علی ظهره شامة عليهاشعرنابت كان كثير العناء وأصاب أهل بيته لأجله مكروه ويكون موته من قبل السم وقدكان كذلک فكانﷺ كثير العناء لمّالاقی من الشدائدوأصاب بنی هاشم لأجله مالايخفی وأماالموت بالسم فقدقال مازالت أكلة خيبرتعاودنی فهذاأوان انقطاع أبهری(المواهب اللدنية ص ۳۴)(مختار)

النخل إلا نخلة واحدة غرسها عمر فحملت النخل من عامها ولم تحمل النخلة فقال رسول الله ﷺ ما شان هذه النخلة فقال عمر يا رسول الله ﷺ انا غرستها فنزعها رسول الله ﷺ فغرسها فحملت من عامه(۱).

ترجمہ: حضرت بریدۃ بن الحصیبؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریمﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو حضرت سلمانؓ ایک خوان لے کر آئے جس میں تازہ کھجوریں تھیں اور نبی کریمﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا آپﷺ نے فرمایا کہ اے سلمان یہ کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ یہ آپﷺ پر اور آپﷺ کے ساتھیوں پر صدقہ ہے۔ نبی کریمﷺ نے فرمایا کہ ہم لوگ صدقہ نہیں کھاتے اس لئے اسے میرے پاس سے اٹھا لو۔ دوسرے دن پھر حضرت سلمانؓ اسی طرح کھجوریں لائے اور نبی کریمﷺ کے سامنے رکھ دیں۔ نبی کریمﷺ نے پھر پوچھا کہ اے سلمان یہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ آپﷺ کیلئے ہدیہ ہے۔ نبی کریمﷺ نے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا کہ ہاتھ بڑھاؤ پھر حضرت سلمانؓ نے نبی کریمﷺ کی پشت مبارک پر مہر نبوت دیکھی تو مسلمان ہو گئے۔ حضرت سلمانؓ اس وقت یہود کے غلام تھے پس نبی کریمﷺ نے ان کو اتنے دراھم دے کر خریدا (یعنی بدل کتابت ادا کرنے میں مدد دی نیز یہود نے یہ شرط لگائی) کہ سلمانؓ ان کے لیے (تین سو) کھجور کے درخت لگائیں اور پھل لانے تک ان کی خبر گیری بھی کریں۔ پس نبی کریمﷺ نے اپنے دست مبارک سے وہ درخت لگائے سوائے ایک درخت کے جسے حضرت عمرؓ نے لگایا۔ چنانچہ وہ تمام درخت اسی سال پھل لائے سوائے اس درخت کے کہ وہ پھل نہ لایا۔

نبی کریمﷺ نے اس درخت کے بارے میں دریافت کیا کہ اسے کیا ہو گیا ہے تو

(۱) المستدرک ۵۵۹/۳، مسند احمد ۳۵۴

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یارسول اللہﷺ اسے میں نے لگایا تھا نبی کریمﷺ نے اس کو اکھاڑا پھر خود اپنے ہاتھ سے لگایا۔ چنانچہ وہ درخت بھی اسی سال پھل لایا۔

سمعت أبي بريدة۔ بریدہ لفظ ''أبی'' سے بدل یا عطف بیان ہے۔اس کے والد کا نام حصیب بضم حاء ہے بریدہؓ صحابی ہیں۔غزوہ بدر سے پہلے اسلام لائے تھے مگر کسی وجہ سے اس میں شرکت نہ کرسکے۔بصرہ میں ۶۲ھ یا ۶۳ھ میں وفات پائی۔

سلمان فارسیؓ کی فضیلت اور قبول اسلام: حضرت سلمان فارسیؓ کی زندگی کے واقعات بڑے عجیب وعبرت ناک ہیں۔آپ کو اللہ تعالیٰ نے بہت طویل عمر بخشی تھی۔دوسو، ڈھائی سو، تین سو، ساڑھے تین سو، اور چار سو سال تک کی روایات موجود ہیں۔آپ کا تعلق اصفہان کے ایک شہر سے تھا۔چونکہ ایران کے لوگ گھڑ سواری میں بہت ماہر تھے اسلئے عرب لوگ ایران اور اس سے ملحقہ علاقوں کو فارس کہتے تھے اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ نام ان کے دادا فارس بن کیومرث کی وجہ سے پڑا۔بہر حال علاقے کی وجہ سے آپؓ کو بھی فارسی کہا جاتا تھا۔آپؓ اصفہان کے ایک دولتمند آدمی کے بیٹے تھے باپ خود مجوسی تھا اور بیٹے سے بہت محبت تھی اس نے بیٹے کو مجوسیت کیلئے وقف کردیا۔یہاں تک کہ سلمان آتش کدہ کا محافظ بن گیا۔خوش قسمتی سے ایک دن آپ کا گزر ایک عیسائی گرجے پر ہوا اور محض سیر کی خاطر آپؓ اس میں داخل ہوگئے اندر جا کر ان کی عبادت اور دین حق کا نور دیکھا تو بہت متاثر ہوئے اور شام تک وہیں رہے پھر تو آپؓ کو عیسائیت پسند آگئی اور جب بھی موقع ملتا عیسائی پادریوں کی خدمت میں حاضر ہوجاتے۔باپ نے پہلے تو سختی سے منع کیا مگر بے سود بالآخر آپ کو بیڑیاں پہنا کر گھر میں قید کردیا مگر پادریوں سے آپ کا رابطہ بدستور رہا۔اور ان سے مذہب کے مرکز کے بارے میں دریافت کیا۔انہوں نے بتادیا کہ اس کا مرکز شام میں ہے۔چنانچہ آپؓ نے پادریوں کو کہلا بھیجا کہ جب شام سے سوداگر لوگ آئیں تو مجھے اطلاع دے دیں۔کچھ مدت بعد سوداگر آئے اور آپؓ کو اطلاع ملی۔جب وہ واپس شام جانے لگے تو آپ نے بیڑیاں کاٹ دیں اور بھاگ کر ان کے ساتھ شام چلے گئے وہاں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس مذہب کا سب سے زیادہ علم فلاں پادری کے پاس ہے۔چنانچہ آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عیسائیت میں اپنی رغبت اور

خواہش ظاہر فرمائی۔اس نے آپؓ کو اپنے ہاں رکھ لیا اور عیسائیت کی تعلیم دی۔جب وہ مر گیا تو اس کی جگہ ایک اور پادری کو قائم مقام بنا دیا گیا۔جو بقول سلمان فارسیؓ پہلے سے بہتر تھا۔دنیا سے بے رغبت اور مخلص تھا۔آپؓ اس کی خدمت میں رہنے لگے کچھ عرصہ بعد یہ شخص وفات ہونے لگا تو حضرت سلمان فارسیؓ نے پوچھا کہ آپ کے بعد میں کس کے پاس جاؤں اس نے بتایا کہ نصیبین میں فلاں شخص کے پاس چلے جاؤ۔ چنانچہ آپ وہاں گئے اور مذکورہ شخص کی تلاش کر کے تلمذ اختیار کی۔وہ بھی وفات ہونے لگے۔تو اس کی ہدایت کے مطابق آپ عموریا کے ایک پادری کی خدمت میں گئے۔اس مقام پر آپؓ نے کچھ مال بھی کمایا اور کچھ گائیں اور بکریاں آپ کے پاس جمع ہو گئیں۔یہ آدمی وفات ہونے کے قریب ہوا تو حضرت سلمانؓ نے اس سے پوچھا کہ اب کہاں جاؤں گا۔اس نے بتایا کہ خدا کی قسم جس طریقہ پر ہم لوگ ہیں اس صحیح اور سچے طریقہ پر اب کوئی باقی نہیں رہا البتہ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی کا زمانہ قریب آ گیا ہے جو ملت ابراہیمی کے علمبردار ہونگے اور عرب میں پیدا ہونگے۔ان کی ہجرت کرنے کی جگہ میں کھجوریں زیادہ ہونگی۔وہ ہدیہ تو قبول کریں گے لیکن صدقہ نہیں کھائیں گے۔ان کے دونوں کندھوں کے درمیان مہر نبوت ہوگی۔پس اگر ہو سکے تو تم اس جگہ پہنچ جانا۔

حضرت سلمان فارسیؓ یہ سن کر تلاش حق میں نئی منزل کی طرف نکل پڑے۔آخر کار بنو کلب کے کچھ تاجروں سے ملاقات ہو گئی۔آپ نے ان کو اپنے ساتھ عرب لے جانے کی درخواست کی اور اس کے عوض بکریاں اور گائیں ان کی نذر کر دیں۔وہ آپ کو مکہ لائے لیکن یہاں پر ان کو اپنا غلام ظاہر کر کے بیچ ڈالا۔پھر بنو قریظہ کے کسی یہودی نے انہیں اہل مکہ سے خریدا اور مدینہ لے آیا۔جسے دیکھ کر آپ کو یقین ہو گیا کہ یہی نبی آخر الزمان کی ہجرت گاہ ہوگی۔اگرچہ وہ آزاد تھے لیکن انہیں غلام کی طرح بیچا گیا۔چنانچہ مدینہ میں آپ کے مختلف مالکوں کا ذکر ملتا ہے۔کبھی کسی کے ہاں اور کبھی کسی کے ہاں۔پے در پے آپ کے دس مالک تبدیل ہوتے رہے،بکتے رہے اور مدینہ میں رہتے رہے۔ہجرت نبوی ﷺ کے وقت بھی آپ بنو قریظہ کے کسی یہودی شخص کی ملکیت میں تھے۔

الغرض دو ڈھائی سو سال تک یہ تکالیف اور مصائب جھیلتے ہوئے حق کی تلاش میں آپ سرگرداں

رہے۔طویل سفر، قید و بند اور صعوبتوں کے مراحل سے گزرے لیکن وہ مایوس نہ ہوئے نہ مطمئن ہوئے کہ بس حق مل گیا۔کہ اتنے میں اچانک اطلاع ملی کہ نبی آخرالزماں جس کی تلاش میں اس نے اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا اس کے شہر مدینہ تشریف لا چکے ہیں۔ بنو قریظہ کے لوگوں میں نبی کریمﷺ کی آمد ان کے استقبال اور علامات کے بارے میں جو کھسر پھسر ہوتی تھی آپ کے کانوں میں بھی اس کی بھنک پڑ گئی تھی لہٰذا آپ بھی دوڑے آئے لیکن اس بار وہ بند آنکھوں سے تقلید کرنے والے نہ تھے۔مشقتیں اور تکالیف برداشت کر کر کے محتاط ہو گئے تھے۔دودھ کا جلا پانی کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے وہ تو ساری زندگی ٹھوکریں کھاتے رہے، دھوکے کھاتے رہے خصوصاً سفر اور غربت کے زمانہ میں غلط اور گمراہ لوگوں سے بھی واسطہ پڑتا رہا۔ اب وہ صحیح تحقیق کرنا چاہتے تھے کہ کہیں کسی متنبی کذاب کے پنجے میں نہ آجائیں۔ کیونکہ کچھ راہب اور پادری لوگ جن سے ان کا واسطہ پڑا تھا بدعمل اور بدکردار بھی تھے۔آپ صرف ظاہری شکل وشباہت پر دھوکہ کھا جاتے اور بعد میں پچھتاتے۔اس لئے آج تحقیق کے لئے علامات سے امتحان لینا چاہا۔

سب سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ نبی کریمﷺ خیرات اور صدقہ قبول کرتے ہیں یا نہیں۔پھر ہدیہ پیش کرتے ہیں بعد میں مہر نبوت کی بھی تحقیق کرتے ہیں اور جب نبی کریمﷺ آپؓ کے علم کے مطابق معیار نبوت پر پورا اترتے ہیں تو ایمان لے آتے ہیں۔ بلکہ اغلب یہ ہے کہ آپؓ اپنے تجربہ اور فراست کی بنا پر دیکھتے ہی ان کو پہچان چکے ہونگے۔اور اب مزید اطمینان کے لیے یہ تحقیق کرنا چاہا پھر جب ایمان لے آئے تو اللہ تعالیٰ نے مزید قرب کی توفیق دے دی۔ نبی کریمﷺ کے ساتھ محبت اور خصوصی تعلق تھا۔آپﷺ ہی نے یہودیوں سے انہیں آزاد کرایا جس کا اجمالی تذکرہ حدیث میں موجود ہے۔حضرت علیؓ فرماتے تھے کہ **سلمان منا اهل البیت** کہ سلمان ہمارے گھر کا فرد ہے اور سلمان نے بھی دنیا کو یہ سبق دیا کہ قوم و وطن، جغرافیہ اور علاقائی ولسانی عصبیتیں کچھ بھی اسلام میں نہیں۔کوئی پوچھتا کون ہے؟ فرماتے سلمان۔پوچھا جاتا کہ کہاں کے ہو، کس قبیلہ کے ہو؟ تو فرماتے سلمان بن الاسلام بن الاسلام بن الاسلام فارس واصفہان کو بھلا دیا۔حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ **علمه علم الاول والاخر وهو بحر لا ینزف**۔آپ کو اولین کا علم حاصل تھا یعنی یہودیت وعیسائیت وغیرہ پر تو عبور تھا تمام علوم منحصر تھے آخر میں

نبی کریم ﷺ کا علم بھی حاصل ہوا۔طویل عمر کے باوجود آپ نے ہمیشہ زہدوقناعت کا دامن تھامے رکھا۔

مائدۃ اور چنے گئے اشیاء: مائدۃ مادیمید حرکت کے معنی میں ہیں اللہ تعالیٰ زمین کے بارے میں فرماتے ہیں ان تمید بکم. ای لئلا تمیدبکم ۔یعنی زمین میں ہم نے بڑے بڑے پہاڑ اس لیے پیدا کئے کہ یہ ہلنے سے محفوظ رہے۔اور چونکہ دسترخوان پر بھی سارے لوگ حرکت کرتے ہیں۔ہاتھ چلتے رہتے ہیں، برتن بھی حرکت میں ہوتے ہیں۔یہ لووہ لوکا شور ہوتا ہے۔خود دسترخوان اور جو کچھ اس پر ہوتا ہے سب متحرک ہوتے ہیں اس لئے دسترخوان کو بھی مائدہ کہاجاتا ہے(۱)۔

اس طرح مادکا ایک اور معنی میں بھی مستعمل ہے کہتے ہیں مادہ ای اعطاہ اور چونکہ دسترخوان بھی اپنی ساری چیزیں لوگوں کو پیش کرکے دیتا ہے اسلئے اسے مائدہ کہا گیا ہے۔

علیھا رطب : پکے ہوئے تازہ کھجور کو رطب کہتے ہیں۔خشک کھجور کو تمر کہتے ہیں کچا جو پکنے کے قریب ہوا سے بُسر کہتے ہیں اگر پختگی سر کی طرف سے ظاہر ہو چکی ہو اور دم کی طرف تھوڑا سا کچاپن باقی ہو تو اسے رطب مذنب کہتے ہیں اور اگر پختگی دم کی جانب سے ظاہر ہو اور کھجور کے سر کی جانب تھوڑا سا کچاپن باقی ہو تو اسے بسر مذنب کہتے ہیں۔طبرانی کی ایک اور روایت میں تمر کا لفظ بھی آیا ہے۔اب اشکال یہ ہے کہ ان روایات میں بظاہر تعارض ہے جس کی توجیہہ ضروری ہے تو اس کے دو جواب ہیں کہ یا تو یہ مختلف مواقع کے لحاظ سے ہے۔صحابی نے کبھی رطب، کبھی تمر اور کبھی ثرید پیش کیا ہوگا اور طعام سب کو کہاجاتا ہے لیکن اس سے زیادہ واضح جواب یہ ہے کہ خوانچہ تو بڑی چیز ہے دسترخوان پر تو روٹی، سالن، چٹنی، پیاز اور پلاؤ پھل وغیرہ سب چیزیں ہوسکتی ہیں تو ہوسکتا ہے کہ دسترخوان مذکورہ تمام انواع پر مشتمل ہو لیکن صحابہ میں سے کسی نے تمر کا

(۱) مگر ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے والمشہور عندارباب اللغۃ أنّ المائدۃ خوان علیه عام فاذالم یکن علیه طعام فلایسمٰی مائدۃ فعلی ھذاقوله علیھا رطب لتعیین ماعلیھامن الطعام(جمع الوسائل ۱ / ۷۹)

اسی لئے علامہ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں لکھا ہے وقدتطلق المائدۃ ویرادبھاماعلیه من الطعام وان لم یکن خواناًاہ. لیکن وقدیطلق علی الطعام نفسه اوانائه اہ(شرح الشمائل لشیخ مناوی علی ھامش جمع ج ۱ ص ۷۹) کمافی القران الکریم وانزل علینا مائدۃ من السماء(الایة) اسلئے مائدۃ کا اطلاق ان سب پر ممکن ہے(مختار)

ذکر کیا ہو کسی نے رطب کا کسی نے ثرید کا کسی نے طعام کا۔ جبکہ حقیقت میں تمام چیزیں دستر خوان پر موجود تھیں۔

علم الغیب اور نبی کریمﷺ: یاسلمان ماھذا خطاب کا صیغہ مستعمل ہے، بریلوی حضرات اس سے علم غیب کے ثبوت پر استدلال کرتے ہیں یوں کہ دیکھو اگر نبی کریمﷺ کو علم غیب نہ تھا تو سلمانؓ کا نام آپ کو کیسے معلوم ہو گیا لیکن اس جہالت کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ یہاں علم غیب کا اثبات تو درکنار اس کی نفی ہوتی ہے اور وہ یوں کہ خود نبی کریمﷺ پوچھتے ہیں کہ ماھذا؟ یہ کیا ہے؟ استفسار تو اس چیز کے بارے میں ہوتا ہے جو معلوم نہ ہو۔ اگر معلوم ہوتا تو وہ کیوں پوچھتے؟ اور اگر وہ کہتے ہیں کہ پھر نبی کریمﷺ کو نام کیسے معلوم ہوا؟ تو اس کا واضح جواب یہ ہے کہ پہلی ملاقات کے وقت ضروری تو نہیں کہ نام بھی نہ سنا ہو اس وقت مجلس ہی میں صحابہ نے بتادیا ہوگا کہ یہ نووارد سلمان ہیں یا مجلس سے قبل غائبانہ تعارف ہو چکا ہوگا کہ اتنی لمبی عمر اور ایسی رنگت کا سلمان نامی ایک فارسی شخص بھی مدینہ میں رہتا ہے اسکے علاوہ اور بھی کئی طریقے ہو سکتے ہیں۔ رسول اللہﷺ کے علم کے مثلاً حضرت جبرئیلؑ نے بتایا ہوگا کہ یہ آنے والا سلمان ہے وہ باتیں تو راوی نہیں کرتا، راوی تو صرف واقعہ بیان کرتا ہے تو اس سے علم غیب کیونکر ثابت ہوگا۔ جبکہ ماھذا اس وقت کہا جاتا ہے جب کسی چیز کی ماہیت یا کیفیت کے بارہ میں پوچھا جائے۔ لہٰذا یہ صراحت عدم علم پر دلالت کرتا ہے۔ بہر حال یہ عجیب علم غیب ہے کہ ساتھ جو چیز رکھی ہے وہ تو معلوم نہیں اور جب حضرت سلمانؓ کی دلجوئی، خاطر داری اور تالیف قلب کیلئے نبی کریمﷺ نے نام لیکر پکارا۔ کیونکہ نام سے پکارنا بے تکلفی اور محبت پر دلالت کرتا ہے اور محبوب کے اس شفقت بھرے خطاب سے ان کی تکالیف اور طویل اسفار کی ساری تھکاوٹ کافور ہو گئی۔

صدقہ اور ہدیہ میں فرق: صدقة عليك: صدقة اور هدية میں تین وجوہ سے فرق ہے۔ ایک یہ کہ صدقہ جس کو دیا جائے وہ اس مال کا مالک ہو جاتا ہے۔ رجوع کر کے مال کو واپس نہیں کیا جاسکتا جبکہ ہدیہ میں امام ابوحنیفہؒ کے ایک قول کے مطابق رجوع جائز ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ صدقہ میں ترحم اور شفقت باعث بنتا ہے جس کو دیا جائے اس کے عجز و مسکنت کا اعتبار اور اس پر ترس ہوتا ہے جبکہ ہدیہ

میں ترحم وغیرہ نہیں ہوتا ہدیہ تو بادشاہوں، نوابوں، امیروں، غریبوں اور مسکینوں سب کو پیش کیا جاتا ہے۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ صدقہ میں مصدق علیہ کی ایک گونہ تحقیر اور اہانت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل علم طبقہ اگر چہ اللہ تعالیٰ اور لوگوں کے ہاں معزز اور مشرف ہوتا ہے لیکن محض خیرات خوری کی نظر سے لوگ انہیں دیکھتے ہیں تو ان کے رویئے سے حقارت ٹپکتی نظر آتی ہے جو چیز خراب اور باسی ہو جاتی ہے کہہ دیتے ہیں کہ طالب علموں کو دیدو۔ جبکہ ہدیہ کا مقصد ہی مھدیٰ لہ کی تعظیم ہوتا ہے۔ ہدیہ دینے والا عزت و اکرام اور عظمت کی نظر سے دیکھ کر ہی ہدیہ دیتا ہے۔

حضرت سلمان فارسیؓ صدقہ پیش کر کے آزمائش کرتے ہیں کہ صدقہ نہ لیا پھر تو پیغمبر برحق ہیں ورنہ نہیں۔

یہاں پر یہ اشکال پیش آتا ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ تو اس وقت غلام تھے جو کسی چیز کے مالک نہیں بن سکتے تو اس کا صدقہ صدقہ کیسے بنے گا۔ لیکن اس کا جواب آسان ہے وہ یہ کہ اس وقت غلاموں کے احکام میں یہ حکم موجود نہ تھا بلکہ یہ حکم اسلام میں نازل ہوا کہ غلام کا سب کچھ آقا کا ہوتا ہے لیکن یہ شبہ پھر بھی ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کا ہدیہ کیوں قبول کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت سلمانؓ کی غلامی دراصل شرعی غلامی نہ تھی بلکہ غیر شرعی طور پر اسے بیگار میں پکڑا گیا تھا۔ جنگ میں کہیں ان کو نہیں پکڑا تھا بلکہ محض ظالمانہ تسلط و تغلب کے ذریعے یہود کے قبضہ میں تھے اسلئے وہ اپنی کمائی کے خود مالک تھے۔ اس کا صدقہ اور ہدیہ دونوں درست تھے۔

فقال ارفعھا یعنی اٹھالو یہ ہمارے کام کا نہیں اور ایک روایت میں ادفعھا بھی آیا ہے پھر مطلب یہ ہے کہ مجھ سے اٹھا کر میرے ساتھیوں کو دے دو جو صدقہ کے مستحق ہیں۔ مثلاً اصحاب صفہ غربت کے سبب اکثر فاقہ کشی کیا کرتے تھے۔ ان تکالیف اور مشقتوں کی برکت ہی تھی کہ ان کو علم کی بے پناہ دولت ملی۔ ان کو بھی طالب علموں کی طرح صدقات ملتے تھے لیکن ان صدقات کے ساتھ مشقت نہایت ضروری ہے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ اور صدقات سے معاملہ: والد ماجد حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ قدس سرہ اپنی صحت کے زمانہ میں ابتدائے سال اور انتہائے سال میں تقریر و ہدایات کے علاوہ عصر کی نماز پڑھانے کے بعد دس پندرہ منٹ تقریر فرماتے۔ جس میں بہت بڑا سبق اور کام کی باتیں

ہوتی تھیں آج ان ارشادات سے ہم محروم ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ طلبہ میں اخلاقی پستی سرایت کر رہی ہے۔ اخلاقی تربیت، خلوص وللّٰہیت اور علم میں فنائیت کی باتیں سننے کی بناء پر پرانے فضلاء بڑے خوبیوں کے حامل ہوتے تھے۔

بہر حال مولاناؒ بعض اوقات یہ بتاتے کہ جو ہم کھاتے ہیں اوساخ الناس ہیں۔ زکوٰۃ اور خیرات گندہ میل کچیل ہے بلکہ سود، حرام، سمگلنگ، ملاوٹیں ہر گندی کمائی خیرات کی شکل میں بھی ہمارے ہاں آتی ہے۔ لیکن ان کو ہضم کرنا پھر بھی کارے دارد۔ اسلئے جس طرح سخت غذا کو ہضم کرنے کیلئے کھیل، دوڑ، مشقت ومحنت کرنی پڑتی ہے۔ سخت چیزیں کھائے اور محنت نہ کرے تو آدمی بیمار ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔ آپ فرماتے کہ ان اموال میں باطنی سختی ہوتی ہے ان کو ہضم کرنے کا واحد راستہ طالب علم کیلئے سخت محنت ہے۔ تعلیم وتعلم درس وتدریس مطالعہ اور عمل کر کے محنت کی جائے تو یہ اوساخ الناس آدمی کو راست آئیں گے۔ ورنہ آدمی کو بیمار کر کے قریب الموت کر دیتے ہیں۔ بہر حال نبی کریمﷺ نے فرمایا کہ جو لوگ صدقہ کے مستحق ہیں ان کو دے دو۔ علامہ حافظ عراقیؒ فرماتے ہیں کہ ادفعها کے نسخے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ نبی کریمﷺ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کلوا وامسک یعنی تم کھاؤ خود نہیں کھایا۔

حضورﷺ کا صدقات سے احتراز: أنا لا ناکل الخ جمع کا صیغہ لانے کیلئے تین توجیہات کی جاتی ہیں کہ یا تو تعظیماً اپنے آپ کیلئے جمع کا صیغہ استعمال کیا۔ یا پھر دوسرے انبیاء کو بھی اپنے ساتھ شامل کیا۔ یعنی نحن معاشر الأنبياء لاناکل الصدقة یعنی ہم انبیاء کا طبقہ صدقہ نہیں کھاتے کیونکہ یہ تو أوساخ الناس ہیں اور ہم أوساخ الناس سے محفوظ ہیں یا پھر أنا سے مراد أنا وأهل بيتي یعنی میں اور میرا خاندان لینگے کیونکہ جو حکم اس سلسلے میں نبی کریمﷺ کا تھا وہی بنو ہاشم کا بھی تھا۔ لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ میں اور میرا خاندان صدقہ کا مال نہیں کھاتے (۱)۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلمانؓ کا یہ صدقہ نفلی صدقہ تھا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ نبی کریمﷺ نے

(۱) بنو ہاشم اور صدقات: یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ سادات اور بنو ہاشم کیلئے زکوٰۃ یا صدقات واجبہ کھانا جائز ہے یا نہیں۔ تو اکثریت کی رائے یہ ہے کہ سادات اور بنو ہاشم کیلئے کسی بھی صورت میں زکوٰۃ یا دیگر صدقات واجبہ جائز نہیں علامہ ابن قدامہؒ نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے فرماتے ہیں لانعلم خلافاً في أنّ بني هاشم (بقیہ اگلے صفحہ پر)

نفلی صدقہ کھاتے تھے نہ واجبی۔ اوراس کا سبب یہی ہے کہ صدقہ میں مصدق علیہ کے فقرو عجز اور مصدق کی نسبت حقارت کا پہلو ہوتا ہے۔ نیز اس طرح کسی تہمت سے بھی آپ بچ جاتے ہیں۔ کیونکہ اکثر و بیشتر یوں ہوتا ہے کہ مکار اور جعلی پیر اور دھوکہ باز رہنما قسم کے لوگ کچھ مدت فاقہ مستیاں کرتے ہیں۔ پھر خود اسے اور اس کی اولاد کو سونے چاندی میں کھیلنے کا موقع ملتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کا سد باب کیا تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ اولاد کیلئے شکرانوں اور نذرانوں کا راستہ کھول دیا ہے بلکہ نبی کریم ﷺ نے بتادیا کہ میرا ہر کام خالصتاً اللہ ہی کیلئے ہے۔ اعلان فرمایا کہ ان اجری الا علی اللّٰہ میرا اجر اللہ تعالیٰ ہی دے گا۔

قال فرفعها اور دوسری روایات کے مطابق فدفعها ہوگا یہ بریدہ بن حصیب کا قول ہے۔ فجاء الغد بمثله، موقع شناسی اور استاد و شیوخ کی مزاج شناسی بہت بڑی خوبی ہے۔ حضرت سلمانؓ دوسرا تجربہ کرکے اپنے یقین کی تکمیل کرتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) لاتحلّ لهم الصدقة المفروضة(المغنی ۵۱۹/۲) اور علامہ عینیؒ نے لکھا ہے وفی الایضاح الصدقات الواجبات کلّها علیهم لاتجوز باجماع الائمة الأربعة(البنایة شرح الهدایة ۲۰۳/۴) مگر جب رسول اللہ ﷺ اس دار فانی سے رحلت فرما گئے اور اس کے بعد بنو ہاشم کا مال غنیمت میں حصہ خمس ختم ہوا تو بعض فقہاء کرام نے اس صورت میں جواز کا فتویٰ دے دیا۔ جس میں مذاہب اربعہ کے جلیل القدر فقہاء و محدثین شامل ہیں خود امام ابوحنیفہؒ سے بھی جواز کا قول مروی ہے وعن الامام انه یجوز لبنی هاشم فی زمانه لأنّ لهم فی عوضها خمس الخمس ولم یصل الیهم (مجمع الانهر ۲۲۳/۱) اور اسی کو امام محمدؒ نے ترجیح دی ہے فی الاثار للمحمّد عن الامام روایتان قال محمّد وبالجواز ناخذ لأنّ الحرمة مخصوصة بزمانه علیه الصلوة والسلام(فقه الزکوة ۷۴۳/۲) اور امام طحاویؒ نے بھی اس کو راجح کہا ہے وفی شرح الاثار عن ابی حنیفةؒ لابأس بالصدقات کلّها علی بنی هاشم والحرمة للعوض وهو خمس الخمس فلمّا سقط ذلک بموته ﷺ حلّت لهم الصدقة قال الطحاوی وبه نأخذ(البنایة شرح الهدایة ۲۰۳/۴) اور اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے متاخرین اہل علم میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مولانا عبدالغفور مدنیؒ، مولانا محمد معصومؒ، مولانا عبدالقدیرؒ، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ، مولانا قاضی عبدالکریم مدظلہ، محدث کبیر مولانا مفتی محمد فرید مدظلہ، مولانا سیف اللہ رحمانی، علامہ وہبہ زحیلی مدظلہ، ڈاکٹر یوسف قرضاوی مدظلہ وغیرہ اکابر علماء امت نے فی زماننا خمس الخمس نہ ہونے اور بعض دوسرے حالات کی وجہ سے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ تفصیل کیلئے احقر کا رسالہ "سادات اور بنو ہاشم کو زکوٰۃ کی شرعی حیثیت" مطالعہ کیا جائے (مختار)

اشراف نفس اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا استغناء: سید الطائفہ حکیم الامت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا واقعہ ہے کہ اپنے طالب علموں اور مریدوں کے ساتھ بیٹھے تھے، خوب بھوکے تھے، اتنے میں ایک شخص اٹھ کر چلا گیا اور کھانے سے بھرا خوانچہ لایا۔ ساتھی بہت خوش ہوئے کہ کچھ کھانے کو مل گیا لیکن حاجی صاحب نے کہہ دیا کہ اٹھاؤ لیجاؤ ہم یہ نہیں کھائیں گے۔ اسلئے کہ ہم بھوکے تھے۔ تم نے محسوس کیا، تمہارے جانے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ تم کچھ لاؤ گے۔ چنانچہ ہمیں انتظار اور اشرافِ نفس پیدا ہو گیا۔ لہٰذا یہ ہمارے لئے جائز نہیں اسے لیجاؤ۔ وہ مرید خوانچہ لے کر نکلے اور غائب ہو گئے۔ پھر دوسرے دروازہ سے اچانک داخل ہو گئے اور خوانچہ رکھ کر کہا کہ لیجئے کھائیں۔ جب میں واپس گیا تو آپ کا طمع منقطع ہو گیا تھا۔ اب آپ کا تمہیں یقین تھا کہ میں کچھ نہیں لاؤں گا۔ لہٰذا اشراف نفس بھی ختم ہو گیا حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ واقعی اس شخص نے ہمیں شکست دی۔

فقال ما هذا ماہیت سے نہیں بلکہ کیفیت سے استفسار ہے کہ یہ طعام کس حیثیت سے لائے ہو۔ صدقہ ہے کہ تحفہ یا ہدیہ ہے۔ سلمانؓ نے فرمایا کہ **هدية لك** یہ تیرے لئے تحفہ اور ہدیہ ہے۔ صدقہ میں ترحم اور ہدیہ میں اکرام کا فرق **لام** اور **علی** سے بھی ظاہر ہوتا ہے کیونکہ **علی** ترحم کیلئے ہوتا ہے اور **لام** میں اکرام ہوتا ہے تو معنی یہ ہوا کہ **اكراما لك** یعنی آپ کی تعظیم کیلئے یہ ہدیہ پیش کیا ہے(۱) اس سے قبل حضرت سلمانؓ نے **صدقة عليك وعلى اصحابك** کہا تھا لیکن چونکہ ہدیہ صرف **مهدى له** کا اکرام مقصود ہوتا ہے۔ اس لئے اس مقام پر **هدية لك** و **لأصحابك** کی بجائے **لك** پر اکتفاء کیا۔

بسط اور نشاط: **فقال لا صحابه ابسطو** یہ صیغہ **بسط يبسط** سے ہے جس کے متعدد معانی ہیں **بسط** کے معنی ہاتھ بڑھانے کے ہیں تو معنی یہ ہوگا کہ ہاتھ بڑھاؤ اور کھاؤ۔ نیز بسط کا معنی پھیلانے کے بھی آتے ہیں تو معنی یہ ہوگا کہ مجلس میں کھانا پھیلاؤ تاکہ سارے حاضرین کھا سکیں۔ علاوہ ازیں بسط پھیل

---

(۱) صدقہ اور ہدیۃ میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ صدقۃ اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف آتا ہے۔ اس لئے کہ مالدار اور صاحب ثروت لوگ فقراء و مساکین کو کچھ مال دیتے ہیں اور اس سے اللہ کی رضا اور اس کا تقرب مقصود ہوتا ہے جبکہ ہدیۃ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف جاتا ہے۔ اس میں بزرگوں کی خوشحالی اور خوشنودی کی غرض پائی جاتی ہے اور تقرب الی اللہ بھی ہوتا ہے مگر اس سے اصل دوسرے کا اعزاز مقصود ہوتا ہے (مختار)

جانے کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔تو مطلب یہ ہوگا کہ پھیل جاؤ تا کہ کھانا درمیان میں رکھا جاسکے۔یا تا کہ سلمانؓ کے بیٹھنے کے لیے جگہ بن سکے۔بعض لوگوں نے بسط کو انبساط کے معنی میں لیا ہے جس کے معنی کشادہ روئی ہیں۔پھر ترجمہ یہ ہوگا کہ کشادہ رو ہو جاؤ۔اور سلمانؓ سے دل لگی کی باتیں کرو۔کیونکہ وہ بھی تمہاری جماعت کا بننے والا ہے۔اور ایک روایت میں انشطوا آیا ہے جو نشاط سے ہے سرور کا معنی ہیں۔ صحابہؓ اکثر اوقات میں بھوکے رہتے تھے۔پیٹ پر پتھر باندھے ہوتے تھے۔خصوصاً نبی کریم ﷺ کے اہل مجلس اصحاب صفہ جن کا ذریعہ معاش کچھ نہ تھا۔نبی کریم ﷺ نے اسی وجہ سے فرمایا کہ کھانے کی چیز ملی ہے خوش ہو جاؤ۔

<u>ہدیہ میں دوسروں کو شریک کرنا:</u> تمام صحابہ کرامؓ کو شریک فرما کر نبی کریم ﷺ نے اس بات کی تعلیم بھی دی ہے کہ اگر کسی کے پاس کوئی ہدیہ یا تحفہ وغیرہ آئے تو سارے کا سارا گھر نہ لے جائے بلکہ شاگردوں، دوستوں، اور ہم نشینوں کو بھی اس میں شریک کرلے۔رسول اللہ ﷺ کے مکارم اخلاق یہی ہیں۔اگر چہ فقہی اعتبار سے ہم مجلس لوگوں اور دوستوں کا حق تو نہیں ہے لیکن اخلاقی اقدار کی بات اور ہے۔ صوفی اور فقیہ کے مسلک الگ الگ ہیں۔ایک بزرگ کے ساتھ مرید بیٹھے ہوئے تھے کسی نے ہدیہ پیش کیا۔ مریدوں میں سے کسی نے کہا کہ الھدایا مشترکۃ تو انہوں نے سارا ہدیہ مریدوں کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا أنا لا نحبّ الشرک کہ ہم موحد ہیں۔شرک پسند نہیں کرتے۔دوسری طرف امام ابو یوسفؒ فقیہ ہیں۔ایک دفعہ شاگردوں کے ساتھ بیٹھے تھے کسی نے ہدیہ پیش کیا۔حاضرین میں سے کسی نے کہا الھدایا مشترکۃ آپ نے سختی سے منع کیا تا کہ یہ کہیں فقہی قانون نہ بن جائے(۱)۔بہر حال یہ فقہی مسئلہ

---

(۱) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے ومن اللطائف ان الامام ابا یوسف اتی بھدیۃ من النقود فقیل لہ الھدایا مشترکۃ فقال اللام للعھدای الھدایا من الرطب و الزبیب و امثالھما(جمع الوسائل ۱/۸۳) اور علامہ بدرالدین العینیؒ نے لکھا ہے أنّ الرشید أھدیٰ إلیہ مالاً کثیراً وھو جالس مع أصحابہ فقیل لہ قال رسول اللّٰہ ﷺ جلساؤکم شرکاؤکم فقال أبویوسف أنّہ لم یرد فی مثلہ و انّما ورد فیما خفّ من الھدایا من المأکل والمشرب ویروی من غیر ھذا الوجہ أنّہ کان جالساً وعندہ أحمد بن حنبل ویحییٰ بن معین فحضر من عند الرّشید طبق وعلیہ أنواع من التحف المثمنۃ(عمدۃ القاری ۱۳/۲۳۳)(مختار)

نہیں بلکہ اخلاق حسنہ کی بات ہے۔عرب کا مقولہ ہے حدیث بھی نہیں ہے(۱)۔

سلمانؓ کا خاتم کا مشاہدہ: ثم نظر الی الخاتم علی ظهر رسول اللهﷺ شروح حدیث میں ہے کہ ثم کے کلمہ سے تراخی کا فائدہ مقصود ہے۔اور مطلب یہ ہے کہ تیسری علامت نبوت کا ظہور اسی موقع پر نہیں ہوا۔ بلکہ اسے دیکھنے کیلئے آپ نے انتظار کیا۔ کچھ عرصہ بعد نبی کریمﷺ ایک انصاری کے جنازے میں شرکت کیلئے بقیع غرقد گئے۔ حضرت سلمانؓ بھی حاضر ہو گئے اور نبی کریمﷺ کی پیٹھ کی جانب بیٹھ گئے۔ نبی کریمﷺ کو آپؓ کے ارادہ کا احساس ہو گیا۔ چنانچہ پیٹھ سے چادر ہٹا دی۔ آپؓ نے تیسری علامت کا مشاہدہ کیا اور اسی موقع پر ایمان لئے آئے۔

اس جملہ سے حدیث کی ترجمۃ الباب سے مطابقت بھی واضح ہوگئی۔وکان للیهود یعنی ایمان لاتے وقت آپ بعض یہودیوں کی ملکیت میں تھے جنہوں نے بنی کلب سے آپ کو خرید لیا تھا۔

حضرت سلمانؓ کی آزادی کیلئے شرائط: فاشتراه اشتراء سے حقیقی خریدنا مقصود نہیں کیونکہ حضرت سلمانؓ غلام ہی نہ تھے بلکہ کتابت مراد ہے یا یہ کہ فدیہ دے کر آزاد کرانا مراد ہے۔

بکذا و کذا درهما دراہم کی مقدار دوسرے مقامات میں مفصل مذکور ہے۔بعض روایات میں چالیس اوقیہ سونا ذکر ہے۔ایک اوقیہ ساڑھے دس تولہ ہوتا ہے۔اس حساب سے چالیس اوقیہ چار سو بیس تولے سونے کے برابر بنتا ہے۔

---

(۱) حدیث پاک میں اس قسم کے الفاظ تو نہیں البتہ ایسے الفاظ کتب احادیث میں مرفوعاً و موقوفاً دونوں طرح مروی ہیں جن سے یہی معنی مفہوم ہوتا ہے چنانچہ علامہ بدرالدین عینیؒ نے لکھا ہے أن جلساء ه شركاء ه روی هذا عن ابن عباس مرفوعاً و موقوفاً والموقوف أصح اسناداً من المرفوع أما المرفوع فرواه البيهقي من حديث محمد بن الصلت حدثنا مندل بن علي عن ابن جريج عن عمرو بن دينار عن ابن عباس قال رسول اللهﷺ من أهديت له هدية وعنده ناس فهم شركاؤه فيها ومندل بن علي ضعيف ورواه عبدالرزاق أيضا عن محمد ابن مسلم عن عمرو عن ابن عباس مرفوعاً نحوه وعنده قوم واختلف على عبدالرزاق عنه في وقفه ورفعه والمشهور عنه الوقف وهو أصح الروايتين عنه وله شاهد مرفوع من حديث الحسن بن علي في مسند إسحاق بن راهوية وآخر عن عائشة عند العقيلي واسنادهما ضعيف أيضاً (عمدة القاری ۱۳/ ۲۳۳)(مختار)

<u>سلمانؓ کی آزادی یہود کی ساہوکاری:</u> یہود نے بہت اونچے دام بتائے کیونکہ ان کی خواہش یہی تھی کہ سلمان ہماری خدمت کرتا رہے۔اس میں زیادہ نفع ہے یہود بھی آخر بنیا قوم ہے کسی کو یک روپیہ دیتے ہیں تو دس نچوڑ لیتے ہیں۔اس وقت بھی یہود کے ساہوکاری نظام نے سارے عالم کو شکنجہ میں کس دیا ہے۔امریکہ میں یہ ظالم قوم بہت تھوڑی ہے لیکن ان کی معاشی گرفت کی وجہ سے امریکہ بے بس اور مجبور ہے تمام اقتصادیات،معاشیات اور بنکوں پر یہود کا قبضہ ہے۔یہاں بھی وہ اپنے بنیا پن کا پورا مظاہرہ کرر ہے ہیں۔ قیمت کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی لگاتے ہیں کہ سلمان یہود کیلئے تین سو کھجور کا درخت لگائے گا اور تب تک وہ آزاد نہیں ہوسکتا جب تک ان درختوں میں پھل نہ آئے، کھجور کا درخت بویا جاتا ہے تو بونے والے کے پوتوں کو کہیں اس کا پھل کھانے کو ملتا ہے۔تیسری نسل میں جا کر یہ ثمر آور ہوتا ہے۔یہود کب سلمانؓ کی طرح دیانتداری، متقی اور مخلص غلام سے دستبردار ہونے پر راضی تھے۔وہ تو ہمیشہ کیلئے اسے شکنجہ میں رکھ کر اس کا خون چوسنا چاہتے تھے۔اسلئے قیمت کے ساتھ یہ غیر معقول شرط بھی لگائی کہ وہ مذکورہ تعداد میں کھجور بوئے گا۔اور تب تک ان کی آبیاری، گوڈی وغیرہ اس کے ذمے ہوگی جب تک یہ بارآور نہ ہوں اور سلمانؓ کب اس پر قادر تھے۔یہ تو نبی کریم ﷺ کا معجزہ تھا جو ظاہر ہونے والا تھا چنانچہ نبی کریم ﷺ نے سودا قبول کرلیا۔

یغرس: غرس نرسری کو کہتے ہیں یعنی پودے لگانا،حدیث مبارک میں ہے کہ **لایزال اللہ یغرس لھذا الدین غرساً یستعملھم فی طاعته**(۱)

ترجمہ:اللہ تعالیٰ ہر زمانہ میں اس دین کیلئے نئے نئے لوگ تیار کرائے گا جنہیں وہ اپنی اطاعت میں مصروف رکھے گا۔

اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے صحابہؓ کو سلمانؓ سے تعاون کا حکم دیا۔چنانچہ انہوں نے تین سو پودے جمع کئے اور نبی کریم ﷺ نے خود جا کر پودے لگائے۔آپ ﷺ کا لگایا ہوا باغ،آپ ﷺ کی نسبت کی وجہ سے آج تک مدینہ میں مشہور ہے۔حجاج کرام وہاں زیارت کے لیے جاتے ہیں۔مسجد نبوی ﷺ سے سات اٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔کچھ عرصہ پہلے ہم بھی گئے تھے اس وقت بھی بعض کھجوریں اس میں باقی تھیں۔

(۱)ابن ماجہ ص ۲

لوگ اس کا پھل محبت سے خریدتے تھے آج کل وہ باغات وغیرہ آبادیوں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔شہر وسیع ہو رہا ہے حتیٰ کہ جبل احد بھی اس میں آ رہا ہے۔شاید کچھ مدت بعد جبل احد کا صرف نام ہی رہ جائے۔

إلا نخلة واحدة ہوسکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عمرؓ کو کہہ دیا ہو کہ کھجور میں خود لگاؤں گا لیکن شاید انہوں نے یہ سوچا ہو کہ نبی کریم ﷺ کو تکلیف ہوگی۔ان کا کچھ تو ہاتھ بٹانا چاہیے۔بہر حال ایک پودا ان میں حضرت عمرؓ نے اپنے ہاتھ سے بویا۔

من عامها یہ نبی کریم ﷺ کا معجزہ تھا کہ کھجور کے درخت صرف ایک سال میں پھل لے آئے لیکن جب ایک درخت پھل نہ لایا تو نبی کریم ﷺ نے پوچھا **ما شان هذا النخلة** اس کھجور کو کیا ہو گیا ہے۔حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ تو میں نے بویا تھا۔نبی کریم ﷺ نے اسی وقت یا کسی دوسرے وقت اسے نکال کر دوبارہ بو دیا اور وہ بھی پھل لے آیا۔یہ شرط تو پوری ہوگئی۔اور مقررہ قیمت اس طرح ادا ہوئی۔کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس کچھ سونا لے آیا جو مطلوبہ مقدار سے کم تھا۔نبی کریم ﷺ نے حضرت سلمانؓ سے کہہ دیا جاؤ۔اس مالک کے پاس لیجاؤ اس نے کہا یہ تو کم ہے آپ ﷺ نے پھر فرمایا کہ تم لے جاؤ وہ لے گیا اور تول کر دیکھا تو پورا چالیس اوقیہ نکلا۔اور حضرت سلمانؓ سونا دے کر آزاد ہو گئے۔

(۷) حدثنا محمّد بن بشّار أنا بشر بن الوضّاح أنا أبو عقيل الدروقيّ عن أبي نضرة العوفيّ قال سألت أبا سعيد الخدريّ عن خاتم رسول الله ﷺ يعني خاتم النبوة فقال كان في ظهره بضعة ناشزة(۱).

ترجمہ: ابونضرۃ عوفی کہتے ہیں کہ میں نے ابوسعید خدریؓ سے نبی کریم ﷺ کی مہر نبوت کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ آپ ﷺ کی پشت مبارک پر گوشت کا ابھرا ہوا ٹکڑا تھا۔

ابوسعید خدریؓ کا مقام اور فضیلت: **ابا سعید خدری الخ** آپ کا نام سعد بن مالک بن سنانؓ ہے۔خدرہ بنو خزرج کی ایک شاخ ہے جس کی طرف آپؓ منسوب ہیں۔آپؓ کے والد حضرت مالکؓ بھی

(۱) مسند احمد ۶۹/۳ من طریق غیاث الکبریٰ عن ابی سعید (مختار)

انصاری صحابی ہیں۔احد کے بعد کے غزوات میں شریک رہے ۶۴ھ کو چوراسی سال کی عمر میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

بضعۃ ناشزۃ یہ کان کا خبر ہے جس کا اسم ضمیر خاتم نبوۃ کی طرف راجع ہے۔جبکہ فی ظهرہ پہلی خبر ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ فی ظهرہ خبر ہو اور بضعۃ ناشزۃ حال ہو۔بعض روایات میں بضعۃ ناشزۃ مرفوع بھی مروی ہے۔اس طرح یہ کان کا اسم اور فی ظهرہ خبر ہوگا اور یہ احتمال بھی ہے کہ کان تامہ ہونے کی وجہ سے مرفوع ہو۔بہر حال اس حدیث میں خاتم نبوت کی کیفیت اور مقام کا ذکر ہے(۱)۔

(۸) حدثنا أبو الأشعث أحمد بن المقدام العجليّ البصريّ أنا حمّاد بن زيد عن عاصم الأحول عن عبدالله بن سرجس قال أتيت رسول اللّه ﷺ و هو في ناس من أصحابه فدرت هكذا من خلفه فعرف الذي أريد فالقى الرداء عن ظهره فرأيت موضع الخاتم على كتفيه مثل الجمع حولها خيلان كانّها ثآليل فرجعت حتى استقبلته، فقلت غفرالله لك يا رسول الله فقال ولك فقال القوم استغفرلك رسول اللهﷺ فقال نعم ولكم ثمّ تلاهذا الاية واستغفر لذنبك وللمؤمنين والمؤمنات (الاية)(۲)

(۱) یہ بات تو مسلم ہے کہ مہر نبوت آنحضرتﷺ کے دونوں شانوں کے مابین تھی مگر یہ بات اختلافی ہے کہ اس پر کچھ لکھا ہوا تھا یا نہیں؟ تو مستندروایات میں اس کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں ملتی۔البتہ بعض روایات میں کچھ لکھا ہونے کا ذکر ملتا ہے اس لئے ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ اس مہر نبوت پر محمد،رسول،اللہ لکھا ہوا تھا اور بعض کا کہنا ہے کہ اس پر یاسربانک المنصور لکھا ہوا تھا۔دلائل النبوۃ میں ہے کہ حاکم نے تاریخ نیشاپوری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ اس پر گوشت سے محمد،رسول،اللہ لکھا ہوا تھا۔اور محدث ابونعیم نے حضرت سلمانؓ سے نقل کیا ہے اس کے اندرونی حصے پر الله وحده لاشريك له محمّدرسول الله اوراوپر کے حصہ پر توجه حيث شئت فانّك المنصور لکھا ہوا تھا۔(آفتاب نبوت کی کرنیں ص۱۳۹)(مختار)

(۲)صحيح مسلم ۲/۲۵۹ كتاب الفضائل باب في اثبات خاتم النبوة الخ ،مسنداحمد ۵/۸۲(مختار)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن سرجس کہتے ہیں کہ میں نبی کریمﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ نبی کریمﷺ اس وقت صحابہؓ کی ایک جماعت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اس طرح آپ کی پشت کی جانب چکر لگایا۔ نبی کریمﷺ میرا منشاء سمجھ گئے اور پشت مبارک سے چادر اتاردی۔ میں نے آپﷺ کے کندھوں کے درمیان مہر نبوت کی جگہ کو مٹھی کے ہم شکل دیکھا۔ جس کے اردگرد تل تھے جو مسوں کے برابر دکھائی دیتے تھے۔ پھر میں واپس ہو کر نبی کریمﷺ کے سامنے آیا اور کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے۔ تو آپﷺ نے فرمایا، اور اللہ تیری مغفرت بھی فرمائے۔ لوگوں نے کہا کہ نبی کریمﷺ نے تیرے لیے دعا مغفرت فرمائی۔ میں نے کہا۔ ہاں اور تم سب کے لیے بھی دعا کی۔ پھر حضرت عبداللہ نے یا نبی کریمﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ''اے رسول تم مغفرت کی دعا کرو۔ اپنے لئے بھی اور مؤمن مردوں اور عورتوں کے لیے بھی''۔

<u>عبداللہ بن سرجسؓ:</u> سرجس نرگس کی طرح جیم کے کسرہ کے ساتھ ہے یہ مزنی (بنومزن) صحابی ہیں۔ بنومخزوم کی طرف بھی آپ کی نسبت ہوتی ہے۔ جو غالباً ان کا حلیف ہونے کی وجہ سے ہے۔ بصرہ میں رہا کرتے تھے۔ اس لئے بصری صحابہؓ میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔

فدرت ھکذا من خلفه داریه وردوران سے ہے اور **ھکذا** میں اس کیفیت کو بیان کرتے ہیں جس کیفیت سے راوی چکر لگا کر آئے تھے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ راوی حضرت عبداللہ ابن سرجس یہ حدیث مسجد نبویﷺ میں بیان کرتے ہوئے اس مکان کو اشارہ کر چکے ہوں۔ جہاں پر چکر کاٹ کروہ نبی کریمﷺ کی پشت مبارک تک پہنچے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ میں پیچھے سے آیا۔ رسول اللہﷺ نے میرے تجسس کو محسوس کیا کہ میں خاتم نبوت دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ سامنے جگہ ہو اور پھر بھی کوئی قصداً پیچھے بیٹھے تو یہ تو یا ادباً ہوتا ہے یا پھر کوئی خاص مقصد ہوتا ہے۔ **علی کتفیه** یعنی مہر کندھوں پر نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔ **مثل الجمع** اس روایت میں مہر کی مقدار اور کمیت بہت زیادہ بتائی گئی ہے۔ کیونکہ مکا بڑا ہوتا

ہے لیکن درحقیقت یہ تحدید نہیں بلکہ تخمینی اور تقریبی اندازے ہیں۔ یا پھر مقصد یہ ہے کہ اس مہر کی بناوٹ اور کیفیت مکّے کی طرح تھی(۱)۔ **حولها خيلان** یعنی اس کے اردگرد تل بھی تھے۔ **خيلان** خال کی جمع ہے۔ پچھلے زمانہ میں ان کا رواج تھا سوئی چبھو چبھو کر جلد کے کسی حصہ کو زخمی کیا جاتا ہے پھر اس میں رنگ بھر دیا جاتا ہے۔ زخم ٹھیک ہو جانے پر نیلے اور سیاہ نشان بن جاتے ہیں ان نشانات کو خیلان کہا جاتا ہے۔ لیکن مہر نبوت کے اردگرد جو خال نما نشانات تھے وہ مصنوعی نہ تھے بلکہ قدرتی تھے۔ ثالیل یہ ثؤلول کی جمع ہے کبھی کبھی بدن کے بعض حصوں پر چھوٹے چھوٹے دانوں کی طرح چیزیں نکل آتی ہیں جو دائمی ہوتی ہیں، اسے ثؤلول کہتے ہیں۔ اردو میں اسے مسا یا بھٹنی کہا جاتا ہے۔ اس حدیث میں جو کیفیت مہر نبوت کی بیان ہوئی ہے وہ بھی دوسری روایتوں سے قدرے مختلف ہے جو کہ یا تو زمانہ کی تبدیلیوں کا اثر ہے۔ اور بعض کا خیال ہے کہ **كل شبه بما سنح له فى رايه تخمينا لا تحديداً** یعنی جس کسی نے مہر نبوت دیکھی تو اسے جیسے نظر آیا بیان کر دیا۔ ان کا یہ قول تحدید نہ تھا بلکہ تخمین اور اندازے سے جو رائے قائم کی تھی وہی بیان کر دی ہے۔

<u>نبی کریم ﷺ کے لیے دعائے مغفرت کیوں:</u> **فقلت غفر الله لک:** خوشی، جذبات اور اظہار محبت میں دعا کی کہ اللہ تعالیٰ تیری مغفرت فرمائے۔ اپنے شیخ اور استاذ وغیرہ کو عموماً ایسے مواقع پر اس قسم کے الفاظ کہے جاتے ہیں۔ اور نبی کریم ﷺ کا یہ محض احسان تھا کہ جو مہر نبوت بڑی بڑی کتابوں میں مذکور تھی آپ ﷺ نے علامت کی زیارت کا موقع دیا تو اس احسان کا شکریہ ادا کرنے کیلئے صحابی دعا کرتے ہیں۔ ورنہ نبی کریم ﷺ تو بخشے بخشائے ہیں۔ **ليغفر لک الله ما تقدم من ذنبک وما تاخر ويتمّ نعمته عليک**(فتح۔ ۲)

''تاکہ اللہ تعالیٰ تیرے اگلے اور پچھلے سب گناہ معاف کر دے اور تم پر اپنی نعمت پوری فرمائے''

آیات اور نصوص اس پر ناطق ہیں کہ نبی کریم ﷺ معصوم اور مغفور ہیں۔ تو یہ دعا نبی کریم ﷺ کو بخشوانے

---

(۱) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے **قال حماد جمع الكف وجمع حماد كفه وضم اصابعه**(جمع الوسائل ۱/۸۸) اب سوال یہ ہے کہ یہ تشبیہ کس لئے ہے۔ تو بعض کا کہنا ہے کہ یہ تشبیہ بیان ہیئت کیلئے ہے اور بعض نے فرمایا ہے کہ یہ تشبیہ بیان مقدار کیلئے ہے۔ ملا علی قاریؒ نے زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔ **ويحتمل ان يكون تشبيهاً به فى المقدار وان يكون تشبيهاً فى الهيئة المجموعة وهو أنسب**(جمع الوسائل ۱/۸۸)(مختار)

کے لئے نہیں بلکہ تشکر و امتنان کا اظہار ہے(۱)۔ اور جس طرح کہ ہم درود و سلام بھیجتے ہیں تو نبی کریم ﷺ کے درجات بلند ہوتے جاتے ہیں۔ اسی طرح ان دعاؤں سے آپ ﷺ کے درجات بلند ہوتے جاتے ہیں۔ نیز دعا کرنے والے کو اس کا اجر ملتا ہے جس طرح کہ صلوٰۃ و سلام کے اثرات واپس درود بھیجنے والے کو آتے ہیں۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک شخص لاکھوں ووٹ لے کر بظاہر منتخب ہو چکا ہے اس کے بعد کوئی اسے ووٹ دے یا نہ دے اس کی کامیابی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن بایں ہمہ ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ میرا ووٹ بھی اس کے ووٹوں میں شامل ہو اور اس کی حمایت کی سعادت مجھے بھی حاصل ہو جائے۔ اسی طرح اگر اس شخص کے ووٹ دس لاکھ کی بجائے گیارہ لاکھ ہو جائیں تو اس کی وقعت و مقبولیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ تو نبی کریم ﷺ پر روزانہ کروڑوں لوگ جو درود بھیجتے رہتے ہیں اس سے آپ ﷺ کے درجات بلند ہوتے ہیں اور آپ ﷺ کو جو دعائیں دی جاتی ہیں وہ بھی رفع درجات کا سبب بنتی ہیں۔

<u>عصمتِ انبیاء:</u> انبیاء تو معصوم ہیں اور اگر چہ ان کے بعض اعمال کو ذنوب کا نام دیا جاتا ہے لیکن وہ بھی حقیقتاً گناہ نہیں بلکہ محض مجازی طور پر ترک اولیٰ کو ذنب کہا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نہایت قرب کی وجہ سے انبیاء کے لئے ترک اولیٰ بھی عیب سمجھا جاتا ہے۔ **حسنات الابرار سیئات المقربین**

مقرب جتنا قریب ہوتا ہے اتنی ہی اس کی ذمہ داری بھی بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔

نزدیک کے لوگوں کی معمولی نافرمانی شاق گزرتی ہے اور اگر کوئی سرکش و نافرمان ہے تو اس کی نافرمانی پر اتنا دکھ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کے مقرب ترین بندے چونکہ انبیاء ہیں۔ لہٰذا ان سے خلاف اولیٰ کام

---

(۱) بعض نے یہ کہا ہے کہ نبی سے کبھی کبھار خلاف اولیٰ کام اور اجتہادی خطاء ہو جاتی ہے تو اس پر استغفار کرنے کو کہا گیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ نبی کا استغفار کرنا امت کی تعلیم کیلئے ہوتا ہے کہ جب نبی معصوم ہے تو وہ استغفار کرتے ہیں تو امت تو خطاؤں کا پتلا ہے تو اس کا زیادہ حق ہے کہ وہ اللہ کے دربار میں اپنے گناہوں کی معافی مانگے۔ اور بعضوں کا کہنا ہے کہ نبی طاعت اور نیکیوں پر استغفار کرتے تھے کہ جو اللہ تعالیٰ کا حق اطاعت ہے اور نیکی کا وہ اللہ تعالیٰ کے شایان شان ادا نہ ہو سکا۔ (مختار)

یا زلہ ولغزش سرزد ہوتو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس پر ذنب کا اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن اس ذلت میں دوام نہیں ہوتا، لغزش کا معنی یہی ہے کہ آدمی جب گرنے لگتا ہے تو فوراً اپنے نفس کی جانب سے اس کی تنبیہ ہوتی ہے اور اس حالت پر استقرار نہیں رہتا۔ جسم کا اعصابی نظام نہایت تیز ہے معمولی بے قاعدگی پر ہزاروں اعصاب بیدار ہو جاتے ہیں اور بجلی کی کرنٹ کی طرح جسم کا ہر حصہ چوکنا ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر کہیں جلد کے کسی حصے میں سوئی چبھ جائے تو دماغ فوراً دفاعی اقدام کا بندوبست کرتا ہے۔ ٹھوکر کھاتے ہی آدمی فوراً سنبھلنے کا بندوبست کرتا ہے۔ اسی طرح نبی کا خلاف اولیٰ کام بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ ہوتی ہے تو توبہ کا حکم اور فوراً ہی بخشش کا اعلان بھی ہوتا ہے۔

یہ تشریح اس احتمال پر ہے کہ جملہ دعائیہ ہو۔ اور یہ بھی محتمل ہے کہ یہ جملہ خبریہ ہو۔ اور معنی یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی بخشش فرما چکے ہیں۔ جس طرح نصوص اس پر شاہد ہیں۔ لیکن پہلا احتمال راجح معلوم ہوتا ہے کیونکہ بعد کا کلام ''ولک'' یقیناً دعائیہ کلمہ ہے جو کہ راوی کے لیے نبی کریم ﷺ نے ادا فرمایا ہے۔

<u>نبی کریم ﷺ کی دعائے استغفار کرنے پر صحابہ کو رشک:</u> **فقال ولک** یہ خوش قسمت صحابی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے جن کے لئے مغفرت کی دعا نکلتی ہے۔ اس نے بھی نبی کریم ﷺ کو دعا دی تھی۔ اور نبی کریم ﷺ نے احسان کا بدلہ احسان سے دیا۔ **هل جزاء الاحسان الا الاحسان** بلکہ نبی کریم ﷺ نے بہتر بدلہ دیا۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کی دعا سے بڑی نعمت کوئی نہیں۔

گویا نبی کریم ﷺ نے دعا کا جواب دے کر اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو بھی ملحوظ رکھا۔

واذا حییتم بتحیّة فحیّوا بأحسن منها اوردّوها (نساء ۵۷)

فقال القوم : نبی کریم ﷺ کی معمولی توجہ اور عنایت بڑی سعادت ہے اس لئے سب لوگوں نے حضرت عبداللہ بن سرجس رضی اللہ عنہ کو مبارکباد دیں۔ کہ تم خوش قسمت ہو کہ پیغمبر ﷺ نے آپ کے حق میں استغفار کیا۔ یا معنی یہ ہے کہ بعد میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ جن لوگوں کو یہ واقعہ بیان کر رہے تھے انہوں نے یہ سوال کیا تو آپ نے فرمایا **نعم ولکم** صحابی نے جواب میں کہا کہ ہاں میرے لئے تو دعا ہوئی لیکن مایوس نہ ہونا تمہارے لیے مغفرت کی دعا کی ہے۔ بلکہ ہر وقت کرتے رہتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

فاعلم انه لاالٰه الاالله واستغفر لذنبک وللمؤمنین والمومنات(محمد ۱۹)

ترجمہ: پس جان لو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اپنے گناہوں کی بخشش طلب کر اور مومن مردوں اور عورتوں کے لئے بخشش طلب کر۔

ایک اور مقام پر فرمایا کہ **فاعف عنهم واستغفر لهم و شاورهم فی الامر(آل عمران ۵۹)**

دوسری جگہ ارشاد ہے کہ **واستغفر لهم الله انّ الله غفور رحیم(نور ۶۲)**

ترجمہ: اوران کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ بہت مغفرت اوررحم کرنے والا ہے۔

نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ وہ اپنے ساتھ مومنین اور مومنات کے لئے بھی دعا مانگیں اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے امر ہے تو آپ ﷺ ضرور اس پر عمل بھی کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ **شانه ان یستغفر لی ولکم** نبی کریم ﷺ کا مقام یہی ہے کہ وہ میرے لئے اور تمہارے لئے دعا کریں گے۔ وہ اس سعادت سے کسی کو محروم نہیں کرتے۔

<u>معراج میں مکالمہ کا کلمات تشہد میں اعادۃ:</u> تمام امت کے لئے آپ ﷺ کی غم خواری کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ معراج کے موقع پر جب دربار رب العزت میں پیش ہوئے نہایت جامع انداز میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی فرمایا: **التحیات لله والصلوات والطیبات**

تمام لسانی بدنی اور مالی عبادتیں اللہ ہی کے لئے ہیں۔

اللہ نے جواب دیا **السلام علیک و رحمة الله و برکاته**

یعنی اے پیغمبر اللہ تعالیٰ کی سلامتی رحمت اور برکتیں تجھ پر ہوں۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے خطاب خاص یعنی **علیک** کا صیغہ لایا لیکن آپ کی شان کریم نے یہ برداشت نہ کیا کہ اس سعادت سے دوسرے بندے محروم رہیں۔ لہٰذا فرمایا کہ

السلام علینا وعلی عباداللہ الصالحین

مجھ پر اور اللہ تعالیٰ کے تمام نیک بندوں پر سلامتی ہو۔

عباداللّٰہ الصالحین میں دوسرے انبیاء کرام اور فرشتے بھی داخل ہو جاتے ہیں چنانچہ جب انہوں نے آپ ﷺ کی یہ رحمت وشفقت دیکھی تو وہ سب یک زبان ہو کر بولے،

اشھد أنّ لا الہ الاّاللّٰہ و اشھد أنّ محمّداً عبدہ و رسولہ

سب نے اعتراف کیا کہ عبدیت ورسالت کے اہل اور اس منصب جلیلہ اور فضیلت کے لائق شخصیت نبی کریم ﷺ کی ہے۔ یہ یادگار مکالمہ تشہد کے طور پر محفوظ ہو کر جزو نماز بن گیا اور قیامت تک دھرایا جائے گا۔

بہر حال صحابی کا مقصد یہاں بھی یہی ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی امت کو دعائے مغفرت سے محروم نہیں کرتے۔

ثمّ تلا ھذہ الایۃ یعنی جب صحابی نے **نعم ولکم** کہہ کر حاضرین کے لئے نبی کریم ﷺ کے استغفار کا دعویٰ کیا تو استشہاد کے لئے یہ آیت پیش کردی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خود اس آیت کو پیش کر کے صحابی کے اس دعوے کی تصدیق کردی ہو۔ واللہ اعلم

۳: باب ماجآء فی شعر رسول اللّٰہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے بالوں کا بیان

شَعَر اور شَعْرٌ (۱) یعنی سکون عین فتح عین دونوں درست ہیں اس کا واحد شعرۃٌ آتا ہے۔ گزشتہ ابواب میں نبی کریم ﷺ کے بالوں کے بارے میں ضمناً کافی بحث ہو چکی ہے اب اس سلسلے میں امام ترمذیؒ مستقل باب لا رہے ہیں۔ اس باب میں دراصل بالوں کی مقدار، کثرت وطول کا بیان مقصود ہے ۔علامہ ابن عربیؒ نے بال بڑھانے کو سنت اور منڈھانے کو بدعت کہا ہے(۲) لیکن جمہور کے نزدیک سر کے بال منڈھوانا بھی جائز ہے۔ جس طرح کہ صحابہ سے منقول ہے۔ اس باب میں آٹھ احادیث کا ذکر ہے۔

(۱) حدثنا علیّ بن حجر انا إسماعیل بن إبراهیم عن حمید عن أنس بن مالک قال کان شعر رسول اللّٰہ ﷺ إلیٰ نصف اذنیه(۳)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے بال مبارک کانوں کے نصف تک تھے۔

<u>بالوں کی مقدار میں اختلاف:</u> الی نصف اذنیه اس حدیث میں کانوں کی نصف تک کا ذکر ہے۔ بعض دوسری روایات میں "شحمة اذنیه" یعنی کانوں کی لو تک، بعض میں وفرہ اور جمہ کے درمیان اور بعض میں جمہ کی تصریح ہے۔ پہلے مرحلہ پر وفرۃ دوسرے میں لمۃ اور تیسرے میں جمہ کہلاتے ہیں اور اس کی ترتیب لفظ ولج کے مطابق ہے۔ بظاہر ان احادیث میں تعارض معلوم ہو رہا ہے لیکن ان میں تطبیق ممکن

---

(۱) شعر بفتح الشین جس کی جمع شعرات آتی ہے جس کا معنی ہے بال اور بکسر الشین سمجھ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی سے شاعر ہے اسلئے کہ شاعر میں عام لوگوں کے مقابل احساس زیادہ ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے وما یشعرون کہ ان میں شعور نہیں (مختار)

(۲) قال ابن العربی والشعر فی الرأس زینة وترکه سنة وحلقه بدعة وحالة مذمومة جعلها المصطفیٰ شعار الخوارج ففی الصحیح عن أبی سعید أنّ النبیّ ﷺ ذکر قوماً یکونون فی امته یخرجون فی فرقة سیماها التحقیق (شرح الشمائل للمناوی علی هامش جمع الوسائل ج ۱ ص ۹۰) (مختار)

(۳) صحیح مسلم ۲/۲۵۸ باب صفة شعر النبی ﷺ کتاب الفضائل وسنن ابی داؤد ۲/۲۲۰ کتاب الترجل باب ماجاء فی الشعر (مختار)

ہے۔ اس طرح کہ نبی کریم ﷺ نے زندگی میں کئی بار سر منڈھوایا ہے۔ مثلاً صلح حدیبیہ، عمرۃ القضاء، اور حجۃ الوداع میں تو آپ ﷺ سے حلق ثابت ہے۔ بخاریؒ اور مسلمؒ کی روایات کے مطابق صرف ایک دفعہ آپ ﷺ سے قصر بھی ثابت ہے۔ پھر آپ ﷺ احرام سے نکلتے وقت حلق کو پسند بھی فرماتے تھے۔ اسی لئے سر منڈھانے والوں کو آپ ﷺ نے دعا فرمائی۔

رحم اللہ المحلقین (۱) اللہ تعالیٰ بال مونڈھنے والوں پر رحم فرمائے۔

لہٰذا قاضی عیاضؒ اور امام نوویؒ وغیرہ محققین کی رائے کے مطابق یہ اختلاف دراصل اختلاف زمانہ پر مبنی ہے۔ اور ''کلٌ روی حسب رؤیتہ'' یعنی ہر راوی نے روایت اپنے مشاہدہ کے مطابق کی ہے۔ جس نے جس حالت میں نبی کریم ﷺ کی بالوں کو دیکھا اسی مقدار میں بیان کیا۔ مثلاً حلق الراس کے کچھ مدت کے بعد بال کانوں تک بڑھے۔ کسی نے دیکھ کر اس حالت کی روایت کی۔ پھر کچھ مدت بعد کانوں کے درمیان تک بڑھے۔ تو بعض صحابہ نے اس کو دیکھا اور اس کو روایت کیا۔ اسی طرح بعد میں بال بڑھتے رہے۔ تو کسی نے بالوں کو کانوں کی لوؤں تک بڑھنے کا مشاہدہ کیا۔ کسی نے لمہ کو دیکھا اور کسی کو جمہ نظر آیا (۲)۔ اور جو دیکھا وہی بیان کیا۔ لہٰذا در حقیقت یہاں کوئی تعارض نہیں۔ بلکہ آپ ﷺ کے بال ان تمام کیفیات سے گزر چکے ہیں (۳)۔

---

(۱) جامع ترمذی ۱/ ابواب الحج. باب ماجاء فی الحلق والتقصیر ۱۱۱۔

(۲) اور ملا علی قاریؒ نے قاضی عیاض کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ کے سر کے اگلے حصے کے بال نصف کان تک پہنچتے تھے اور وسط سر کے بال اس سے نیچے اور آخر حصے کے بال اس کے نیچے پہنچ جاتے تھے (آفتاب نبوت کی کرنیں ص ۱۴۴) (مختار)

(۳) مگر کندھوں سے بال بڑھانا منع ہے اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خریمؓ کے بارے میں فرمایا کہ خریم کیا ہی اچھا آدمی ہے کاش اس کے بال لمبے اور ازار نہ لٹکتے جب حضرت خریمؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے بالوں کو کاٹ کر کان کی لو تک کر لیا اور ازار کو نصف پنڈلیوں تک کر لیا (ابن سعد بحوالہ آفتاب نبوت کی کرنیں ص ۱۵۲) اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا معمول تھا کہ وہ جمعہ کے دن محافظین کو مساجد کے دروازوں پر متعین کیا کرتے تھے کہ وہ لوگوں کے لمبے لمبے بال کاٹ دیں عن اسامۃ قال کان عمر بن عبدالعزیز اذا کان یوم الجمعۃ بعث الأحراس فیاخذون بابواب المسجد ولا یجدون رجلاً موفر الشعر یعنی مبذر الشعر إلا اجزوہ (مصنف ابن ابی شیبۃ ۶/ ۶۰) (مختار)

(۲) حدثنا هنّاد بن السریّ انا عبدالرحمٰن بن أبی الزنا دعن هشام بن عروة عن ابيه عن عائشة رضی الله عنها قالت كنت اغتسل انا ورسول اللّٰه ﷺ من انآءٍ واحدٍ و كان له شعر فوق الجمة و دون الوفرة(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ میں اور نبی کریم ﷺ ایک ہی برتن میں سے غسل کیا کرتے تھے اور نبی کریم ﷺ کے بال جمہ سے اوپر اور وفرہ سے کم تھے۔

حضرت عائشہؓ: أمّ المومنين حضرت عائشة صديقة بنت ابی بكرؓ الصديق کی والدہ کا نام ام رومان تھا۔ ۴؁ نبوی کو مکہ میں ولادت ہوئی۔ اور ہجرت سے تین سال قبل شوال ۱۰ نبوی کو نبی کریم ﷺ کے نکاح میں آئیں۔ اور نو سال کی عمر میں شوال ۲؁ھ کو نبی کریم ﷺ کے گھر منتقل ہو گئیں۔ نبی کریم ﷺ کے پاس نو سال تک رہیں۔ آپؓ کے سوا کوئی کنواری عورت نبی کریم ﷺ کے نکاح میں نہیں آئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم و فضل، تفقہ اور فراست سے نوازا تھا۔ عرب کے بہت سے واقعات اور اشعار بھی یاد تھے۔ مغلق مسائل میں فقہاء صحابہ کرام عموماً آپؓ سے رجوع فرماتے تھے(۲)۔ نبی کریم ﷺ کو آپ سے بہت محبت تھی۔ اور آپ ﷺ پیار سے حمیرا کے نام سے آپ کو یاد فرماتے۔ اور دوسری بیویوں پر آپؓ کی فضیلت کا کئی بار ذکر کیا تھا۔ واقعہ افک میں اللہ تعالیٰ نے خود آپؓ کی برآءت کا اعلان فرمایا۔ اور اسطرح آپ کی پاکدامنی کا تذکرہ قیامت تک جاری رہے گا۔ آپؓ کے مناقب کا سلسلہ بہت طویل ہے۔ صحابہؓ اور تابعینؒ نے آپ سے ۲۲۱۰ احادیث روایت کی ہیں(۳)۔ مدینہ طیبہ میں سترہ رمضان المبارک ۵۷؁ھ کو وفات پائی بعض روایات میں ۵۶؁ھ اور بعض میں ۵۸؁ھ کا ذکر ہے۔ حضرت ابوھریرہؓ نے نماز جناہ پڑھائی اور آپ کی وصیت کے مطابق رات کے وقت جنت البقیع میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

---

(۱) جامع ترمذی ۱/۳۰۳ كتاب اللباس باب ماجاء فی الجمة واتخاذالشعر وابوداود ۲/۲۲۰ كتاب الترجل باب ماجاء فی الشعر(مختار)

(۲) كان فقهاء اصحاب رسول اللّٰه ﷺ يرجعون إليها(تذكرة الحفاظ ۱/۲۷)(مختار)

(۳) اور صرف بخاری شریف میں آپؓ سے ۲۴۲ احادیث مروی ہیں۔ (مختار)

ان کی سوانح کے لئے مؤرخ اسلام علامہ سید سلیمان ندوی کی تصنیف سیرۃ عائشہ کا مطالعہ بہت مفید رہے گا(۱)۔

ایک برتن سے غسل: قالت کنت اغتسل أنا و رسول اللہ ﷺ من اناء واحد ام المومنین حضرت عائشہؓ کا مقصد اس جملہ سے دراصل قرب کا اظہار ہے(۲) اور اس بات پر تنبیہ ہے کہ میں قریب سے مشاہدہ کرنے کے بعد نبی کریم ﷺ کے بالوں کی کیفیت بیان کرنے والی ہوں۔

اس زمانہ میں یہ غسل خانہ، ٹب، سبیل اور نلکے وغیرہ نہیں تھے بلکہ آج کل بھی بعض پسماندہ علاقوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہی حالت ہے۔ایک بڑا برتن پانی سے بھر دیا جاتا ہے۔اسی سے وضو، غسل اور دھونے دھلانے کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔چنانچہ نبی کریم ﷺ نے بھی ایک برتن سے حضرت عائشہؓ کے ساتھ غسل کیا۔

ضرورت اور حیا کی پاسداری: منکرین حدیث اگرچہ خود تو بے حیائی کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ہیں لیکن حدیث میں جب کوئی معمولی سی بے تکلفی کی بات دیکھتے ہیں۔زبانیں کھول دیتے ہیں کہتے ہیں کہ اس قسم کی بے حیائی نبی کریم ﷺ کی شان کے منافی ہے۔لہٰذا ایسی احادیث قابل قبول نہیں۔حالانکہ مذکورہ اور اس قسم کی احادیث میں عیب کی کوئی بات نہیں۔خاوند اور بیوی میں کیا پردہ ہوتا ہے؟ ان کے لیے ایک جگہ کھانا، پینا، سونا، نہانا کوئی عیب نہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ھن لباس لکم و انتم لباس لھن(بیویاں تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کیلئے لباس ہو)ایک ہی برتن سے دونوں کا نہانا اجماعاً جائز ہے۔اگر ایک ہی کپڑے میں برہنہ ہو کر سونا جائز ہے تو ایک جگہ نہانے کی اجازت کیوں نہیں۔مزید یہ کہ نبی کریم ﷺ نے کمال حیا کی جو مثالیں قائم کی ہیں اس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔حتیٰ کہ خود حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ما رأیت من رسول اللہ ولا رایٰ منی. یعنی کمال اختلاط کے باوجود کبھی بھی ہم میں

(۱)حضرت عروہ بن زبیرؓ نے کہا ہے ما رأیت احداً من النّاس أعلم بالقرآن ولا بفرضیة ولا بحلال وحرام ولا بشعر ولا بحدیث العرب ولا انسب من عائشۃؓ(تذکرۃ الحفاظ ۲۸/۱)(مختار)

(۲)اسلئے ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے افادت الحکایة الماضیة بصیغة المضارع استحضاراً للصورة المتقدمة واشارة الی تکراره واستمراره ای اغتسلتُ مکرراً(جمع الوسائل ۹۱/۱)(مختار)

سے کسی نے دوسرے کی شرمگاہ نہیں دیکھی۔حالانکہ میاں بیوی کیلئے ان امور سے بچنا مشکل ہوتا ہے۔لہٰذا آپکی عادت شریفہ کوملحوظ رکھ کر یہ کہنا قرین قیاس ہے کہ یہاں بھی دونوں کوئی کپڑا باندھ کرنہار ہے ہونگے یا پھر دونوں کے درمیان پردہ حائل ہوگا۔آجکل بھی یہ رواج ہے کہ جہاں غسل خانہ میسر نہیں تو غسل کی فوری ضرورت پورا کرنے کیلئے کوئی کپڑا وغیرہ لگا کر پردہ بنایا جاتا ہے۔اوراگرچہ برہنہ حالت میں بھی میاں بیوی کیلئے اکٹھے نہانا کوئی شرعی عیب نہیں۔لیکن مجسمہ حیاء نبی کریم ﷺ کی ذات ہے جوکہ عزیمت اوراستحباب کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔یہ بعید ہے،بہرحال اکٹھا نہانے کے باوجود بے پردگی کا احتمال نہیں ہے۔

<u>اکٹھے اور یکے بعد دیگرے نہانے کا حکم:</u> فقہی لحاظ سے بھی دونوں میاں بیوی کا اکٹھے نہانا بالاجماع جائز ہے۔ہاں تقدیم وتاخیر کی صورت فقہاء کے نزدیک محل بحث ہے۔امام ابوحنیفہؒ کے ہاں بیوی پہلے نہائے اور خاوند بعد میں یہ بھی جائز ہے(۱)۔اور بیوی بعد میں نہائے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ ہاں کسی غیرمحرم عورت کے تنہا نہانے کے بعد اس کے باقی ماندہ پانی سے احتیاطاً احتراز کرے۔جبکہ امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک یہ صورت جائز نہیں۔کیونکہ اس طرح غلط خیالات کا احتمال پیدا ہوتا ہے اورعورت سے بچے ہوئے پانی سے نہانے کی صورت میں خیالات وتصورات میں ہیجان پیدا ہوتا ہے جوکہ خطرناک ہے یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایسی عورت پر جوخوشبو لگا کر گھر سے نکلی ہو زانیہ کا حکم لگایا ہے(۲)۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ اس عورت کے پیچھے شیطان لگا ہوا ہوتا ہے۔استشر فھا الشیطان (الحدیث) بہرحال سد ذرائع معصیت کیلئے اس قسم کا احتیاط فقہاء سے منقول ہے کہ مرد کسی غیرعورت کے باقی ماندہ پانی سے غسل نہ کرے۔

<u>جمہ اور وفرہ کا معنیٰ:</u> فوق الجمة و دون الوفرة نبی کریم ﷺ کے بالوں میں تین قسم کی روایات منقول ہیں۔بعض میں وفرہ بعض میں لمہ اور بعض میں جمہ کا ذکر ہے۔مذکورہ الفاظ کے بارے میں

(۱) امام مالک اور امام شافعیؒ بھی امام صاحب کے ساتھ ہیں اوراس صورت کو جائز سمجھتے ہیں(حقائق السنن ۱/۲۷/۱) مختار

(۲) عن أبیٰ موسیٰ الأشعری ایّما إمرأة استعطرت فمرت علی قوم لیجد وا من ریحها فهی زانیة.

(سنن نسانی ۲/۲۸۶ کتاب الزینة باب ما یکره للنساء من الطیب)(مختار)

جمہور اہل لغت کا قول یہ ہے کہ وفرہ وہ بال ہیں جو کانوں کی لوؤں تک پہونچیں۔اس سے کچھ نیچے ہوں تو اسے لمہ کہتے ہیں اور کندھوں تک بڑھ کر پہنچ جائیں تو جمۃ کہا جاتا ہے۔بعض نے کانوں سے بڑھے ہوئے بالوں کو جمہ اور کندھوں کو چھونے والے بالوں کو لمہ کہا ہے مگر صحیح قول جمہور اہل لغت کا ہے۔

اس حدیث میں "فوق الجمّة و دون الوفرة " کا ذکر ہے(۱) اس جملے کا ایک معنی تو یہ ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ کے بال جمہ سے اوپر یعنی اس سے لمبے اور وفرۃ سے کم یعنی چھوٹے تھے۔مگر جمہ اور وفرہ کے مذکورہ معانی کو مدنظر رکھا جائے تو یہ تشریح درست معلوم نہیں ہوتی۔لہٰذا اس مقام پر مقدار میں فوقیت یعنی لمبا ہونا مراد نہیں۔بلکہ "فوق الجمّة " سے مراد محل کے اعتبار سے فوقیت یعنی اونچا ہونا مراد ہے۔جبکہ "دون الوفره" کا معنی انزل من الوفرة یعنی وفرہ سے لمبا ہونا مراد ہے اس طرح حضرت عائشہؓ کے اس جملے کا مطلب یہ ہوگا۔کہ آپ ﷺ کے بال جمہ سے اونچے یعنی چھوٹے تھے۔اور وفرہ سے نیچے یعنی لمبے تھے۔گویا اس وقت آپ ﷺ کے بال لمہ کی حالت میں تھے۔

ابوداؤد اور ابن ماجہ کی ایک روایت میں اس کی تصریح موجود ہے۔چنانچہ وہاں الفاظ اس طرح

---

(۱) جبکہ ابوداؤد شریف میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کان شعر رسول اللہ ﷺ فوق الوفرة دون الجمّة(سنن ابی داؤد ۲/ ۲۲۰ کتاب الترجل باب ماجاء فی الشعر) تو ان دونوں روایات میں بظاہر تعارض ہے اس تعارض کو حل کرنے کیلئے علامہ احمد عبدالجواد الدومیؒ لکھتے ہیں وھذہ الروایة تخالف روایة ابی داؤد (فوق الوفرة دون الجمة) لعل الجمع بینهما ان تقول إنّ روایة ابی داؤدبالنسبة لکثرة الشعرو روایة الترمذی بالنسبة لوصول الشعر قال ابن حجرؒ وھو جمع جید (الاتحافات ص ۶۵)

اور ایک توجیہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ فوق اور دون دونوں کے معنی دونوں میں الگ الگ لے جائیں ابوداؤد کی روایت میں فوق کے معنی زائد اور دون کے معنی کم یعنی ناقص لئے جائیں۔اور مطلب یہ ہوگا کہ وفرہ سے زائد اور جمہ سے کم ان دونوں کے درمیانی درجہ تھا۔یعنی لمہ اور ترمذی کی روایت میں فوق کے معنی اوپر لئے جائیں اور دون کے معنی اسفل لئے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کے بال جمہ سے ذرا اونچے اور وفرہ سے ذرا نیچے تھے۔تو اس کا مصداق بھی لمہ ہے(الدرالمنضود شرح ابی داؤد ۲۱۲/۶) اس لئے کہ فوق اور دون اضداد میں سے ہیں تو گویا دونوں روایات کا معنی ہے کان شعره متوسطاً بین الجمّة و الوفرة (المواھب اللدنیة ۴۶)(مختار)

ہیں"فوق الوفرة دون الجمّة" جن کا معنی یہ ہے کہ وفرہ سے بڑھے ہوئے اور جمہ سے چھوٹے تھے۔

چنانچہ وہاں پر فوق الوفرة کا معنی اکبر من الوفرة اور دون الجمّة کا معنی اقل من الجمة ہوگا۔ پھر یہ مقدار بھی بعض احوال پر محمول ہوگی کیونکہ روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ آپ کے بال کندھوں تک پہنچ جاتے تھے۔ یعنی بعض حالات میں بال کنگھی کرنے کی وجہ سے یا ویسے وقت گزر جانے کے سبب لمبے ہوکر کندھوں کو چھونے لگتے تھے۔

(۳) حدّثنا احمد بن منیع انا ابو قطن أناشعبة عن أبیٰ إسحاق عن البراء بن عازب قال کان رسول اللّٰہ ﷺ مربوعاً بعید ما بین المنکبین و کانت جمّته تضرب شحمة اذنیه (۱)

ترجمہ: حضرت براءؓ بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ میانہ قد آدمی تھے۔ آپ ﷺ کے دونوں کندھوں کے درمیان وسعت تھی۔ آپ ﷺ کے بال کانوں تک ہوتے تھے۔

کانت جمّته تضرب شحمة اذنیه: جمّہ سے اگر وہ عرفی معنی مراد ہو جو پہلے گزر چکا ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کے جمہ کا بڑا حصہ کانوں تک پہنچتا تھا۔ اور کچھ بال کندھوں تک بڑھے ہوئے ہوتے تھے۔ اور اگر صرف کانوں تک پہنچنا مراد ہو تو پھر جمہ اس مقام پر وفرہ کے معنی میں مستعمل ہے۔ لہٰذا کوئی اشکال نہیں ہوگا جبکہ بعض لوگوں نے جمہ کو مطلق بالوں کے معنی میں بھی لیا ہے۔ پھر معنی یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کے بال کانوں کی لو تک پہنچتے تھے۔ پہلے باب میں اس کے بارے میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ حدیث کے بقیہ حصوں کی تشریح بھی پہلے باب میں گزر چکی ہے۔

(۴) حدّثنا محمّد بن بشّار أنا وهب بن جریر بن حازم ثنی أبی عن قتادة قال قلت لأنس کیف کان شعر رسول اللّٰہ ﷺ قال لم یکن

(۱) سنن ابی داؤد ۲/ ۲۲۰ باب ماجاء فی الشعر کتاب الترجل، صحیح ابن حبان ۸/ ۶۸ باب صفته ﷺ و أخبان شرح السنة للبغوی ۱۳/ ۲۲۴ باب صفة النبی ﷺ (مختار)

بالجعد و لا بالسبط كان يبلغ شعره شحمة اذنيه (۱)

ترجمہ: حضرت قتادہؒ کہتے ہیں میں نے حضرت انسؓ سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کے بال کیسے تھے۔ انہوں نے فرمایا نہ بالکل گھنگریالے تھے اور نہ بالکل ہموار۔ آپ ﷺ کے بال کانوں کی لوتک پہنچے تھے۔

اس حدیث کی تشریح بھی باب اول میں گزر چکی ہے۔

(۵) حدثنا محمّد بن يحيىٰ بن أبي عمر المكي أنا سفيان ابن عيينة عن ابن أبي نجيح عن مجاهد (۲) **عن ام هانی بنت أبي طالب قالت قدم رسول الله ﷺ علينا بمكة قدمة وله اربع غدائر**(۳)

ترجمہ: حضرت ام ہانیؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ مکہ مکرمہ تشریف لائے تو آپ ﷺ کے بال مبارک چار حصوں میں گندھے ہوئے تھے۔

امّ ھانیؓ: آپؓ کا نام فاختہ، عاتکہ یا ہند تھا۔ ابوطالب کی بیٹی اور نبی کریم ﷺ کی چچازاد بہن تھیں فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئیں۔ مسجد حرام کے قریب ہی گھر تھا۔ نبی کریم ﷺ ان کا بڑا احترام کیا

---

(۱)ابوداؤد۲/ ۲۲۰باب فی الرجل یعقص شعره كتاب الترجل، سنن ابن ماجة ص۲۵۸ كتاب اللباس باب اتخاذ الجمّة و الذوائب، مصنف ابن ابی شیبة ۵۸/٦ باب فی اتخاذالجمّة والشعر كتاب اللباس والزينة(مختار)

(۲)اس روایت کو حضرت مجاہدؒ بن جبر نے ام ہانیؓ سے روایت کیا ہے جب کہ امام بخاریؒ فرماتے ہیں لانعرف لمجاهد سماعاً من أمّ هانی البتہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فتح الباری باب الجعد میں فرماتے ہیں رجال هذاالحديث ثقات واخرجه ابو داؤدايضاًوقال فی موضع اخرجه ابو داؤد والترمذی بسندحسن۔ تو ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں اقول ولامنافاة اذاالعلة التی ذكرهاالبخاری انّماتمنع الصحة عنده(جمع الوسائل ۱/ ۹۵)(مختار)

(۳)ابوداؤد کے كتاب الترجل باب فی الرجل یضفرشعره رقم حديث۴۱۸۵ میں بھی روایت کچھ اضافی کلمات کے ساتھ مروی ہے عن مجاهد قال قالت أمّ هانیؓ قدم النبیّ ﷺ إلىٰ مكة وله اربع غدائرتعنی عقائص اھ. مگر علامہ ابی طیب محمد شمس الحق عظیم آبادیؒ نے تعنی عقائص کے اضافہ کے بارے میں لکھا ہے وهوتفسير من بعض الرواة یہ حدیث مصنف ابن ابی شیبه۵۷/٦ كتاب اللباس والزينة باب فی اتخاذالجمه والشعر میں بھی موجود ہے(مختار)

کرتے تھے۔فتح مکہ کے دن نبی کریم ﷺ نے اعلان کیا تھا کہ ام ہانیؓ کے گھر میں پناہ لینے والوں کیلئے بھی امن ہے نبی کریم ﷺ نے انہیں نکاح کا پیغام بھی دیا تھا مگر انہوں نے معذرت ظاہر کردی(۱) کل چونسٹھ احادیث آپؓ سے روایت کی گئی ہیں۔حضرت معاویہؓ کی خلافت کے زمانہ میں وفات پائیں۔

قدم رسول اللہ ﷺ الخ نبی کریم ﷺ ہجرت کے بعد چار بار مکہ آئے۔اول عمرۃ القضاء کے موقع پر۔دوم فتح مکہ کے موقع پر۔سوم عمرۃ الجعرانہ کیلئے۔اور آخری بار حجۃ الوداع کے موقع پر۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نبی کریم ﷺ کی یہ آمد عمرہ کی غرض سے تھی لیکن راجح خیال یہ ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر جب نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو مسجد حرام آکر خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کیا۔اور جب حالات معمول پر آئے تو تھوڑی دیر ستانے کی نیت سے حرم کے قریب ام ہانیؓ کے گھر تشریف لے گئے۔وضو کر کے نماز پڑھی اور جو کچھ تیار تھا امّ ہانیؓ نے کھانے کو پیش کیا۔علامہ بیجوریؒ نے بھی اسی قول کو ترجیح دی ہے کہ آپ ﷺ کی یہ آمد فتح مکہ کے موقع پر تھی۔

<u>غدائر اور اس کا حکم:</u> **لہ اربع غدائر** غدائر غدیرۃ کی جمع ہے۔اصل میں غدر ترک کو کہتے ہیں۔تالاب کو غدیر اس لئے کہتے ہیں کہ پانی اس میں چھوڑ کر جمع کیا جاتا ہے۔اس طرح اگر بال چھوڑ کر بڑھا دیئے جائیں اور پھر اس سے منڈھیاں بنادی جائیں تو انہیں غدیرہ کہا جاتا ہے۔اسی طرح اسے ذولبۃ اور ضفیرۃ بھی کہتے ہیں۔

امرؤالقیس کا یہ شعر تم نے پڑھا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

غدائرھا مستشزرات الی العلیٰ تضل العقاص فی مثنیٰ و مرسل.

(۱)رسول اللہ ﷺ آپؓ ہی کے گھر سے معراج تشریف لے گئے تھے۔آپ ﷺ نے ان سے نکاح کرنے کا ارادہ بھی فرمایا تھا۔مگر قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ان خواتین سے نکاح کریں جو آپ کے ساتھ ہجرت کریں۔اور یہ آیت نازل ہوئی (ھاجرن معک)یعنی آپ ﷺ ان خواتین سے نکاح کریں جو آپ ﷺ کے ساتھ ہجرت کی ہو۔چونکہ حضرت ام ہانیؓ نے مکہ سے ہجرت نہیں کی تھی بلکہ مکہ معظمہ ہی میں رہی۔اس لئے آپ ﷺ سے نکاح نہیں فرمایا۔اور ہجرت کی نوبت حضرت ام ہانیؓ کو اس لئے نہیں آئی کیونکہ آپؓ نے اسلام ہی فتح مکہ کے بعد قبول کیا تھا(مختار)

عام حالات میں بالوں کا عورتوں کی طرح مینڈھیاں بنانا ناجائز ہے۔ کیونکہ اس میں تشبہ بالنساء آتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ سفر اور جہاد کی حالت ہے۔ اور سفر بھی مہینوں کا تھا۔ صفائی اور کنگھی کرنے کو فرصت نہیں ملتی تھی۔

لہٰذا گرد وغبار سے بچانے کے لیے بالوں سے مینڈھیاں بنانا ہوتی تھی۔ خصوصاً جہاد کے لئے تو بالوں کو سنبھالنا پڑتا ہے۔ اور انتشار اور پریشانی سے بچانے کے لئے اضطراراً ان سے مینڈھیاں بنانی پڑتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ نبی کریم ﷺ نے بالوں کو تقسیم کرکے چار مینڈھیاں بنائی تھیں (۱)۔ مگر یہ آنحضرت ﷺ کا معمول نہ تھا ایسا کرنا ضرورۃً تھا تاکہ سفر کی وجہ سے بال گرد وغبار سے بچ جائیں۔

(٦) حدثنا سوید بن نصر ثنا عبداللّٰه بن المبارک عن معمر عن ثابت عن أنس أنّ شعر رسول اللّٰه ﷺ کان الی انصاف اذنیه (۲)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بال مبارک نصف کانوں تک ہوتے تھے۔

انصاف أذنیه انصاف نصف کی جمع ہے اور اس سے **مافوق الواحد** مراد ہے یا عین نصف کے قریب قریب دیگر مقدار میں بھی ساتھ مراد ہیں۔ لہٰذا انصاف متحقق ہو جاتی ہیں۔

(٧) حدثنا سوید بن نصر انا عبداللّٰه بن المبارک عن یونس بن یزید عن الزهری أنا عبید اللّٰه بن عبداللّٰه بن عتبة بن عبداللّٰه عن ابن عباسؓ أنّ رسول اللّٰه ﷺ کان یسدل شعره و کان المشرکون تفرقون رؤوسهم و کان اهل الکتاب یسدلون رؤوسهم و کان یحبّ موافقة

(۱) مگر شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ نے فرمایا ہے کہ یہ لٹیں اس طرح نہیں تھیں جیسے عورتوں کی ہوتی ہیں۔ (خصائل نبوی ۳۴) کیونکہ خواتین کی طرح چوٹیاں بنانا مردوں کیلئے منع ہے۔ (مختار)

(۲) سنن ابی داؤد ۲/۲۲۰ باب ماجاء فی الشعر کتاب الترجل، سنن النسائی ۲/۲۷۵ کتاب الزینة باب اتخاذ الشعر۔ (مختار)

اھل الکتاب فیما لم یؤ مر فیہ بشئی ثم فرّق رسول اللّٰہ ﷺ راسہ(۱)۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ اولاً بالوں کو مانگ نکالے بغیر چھوڑ دیتے تھے۔ جبکہ مشرکین مانگ نکالا کرتے تھے۔ اور اہل کتاب نہیں نکالتے تھے۔ اور نبی کریم ﷺ ان امور میں اہل کتاب کی موافقت پسند کیا کرتے تھے جن کے بارے میں آپ ﷺ پر کوئی حکم نازل نہیں ہوتا تھا۔ پھر بعد میں نبی کریم ﷺ نے مانگ نکالنا شروع فرمایا۔

بالوں کے سدل اور فرق میں نبی کریم ﷺ کا رجحان: **کان یسدل شعرہ،** سدل کے معنی ہیں بالوں میں مانگ بنائے بغیر ان کو کھلا چھوڑ دینا۔ ارسال کا بھی یہی مفہوم ہے۔ اس کے برعکس کنگھی کر کے مانگ نکالنے کو فرق کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کو طبعی لحاظ سے فرق پسند تھا۔ لیکن چونکہ یہ عرب مشرکین کی تہذیب تھی۔ اور آپ ﷺ کو ان کی اقتدا قطعاً پسند نہ تھی۔ لہٰذا آپ ﷺ اس سے کتراتے تھے تو فرق کو چھوڑ کر ارسال اختیار کیا۔ کیونکہ اہل کتاب ایک دین سماوی، کتاب اور پیغمبر کا اقرار کرتے تھے۔ چنانچہ مشرکین کی نسبت ان کی حالت مذہبی لحاظ سے بہتر تھی۔ علاوہ ازیں فرق کی بجائے ارسال کو اختیار کرنے میں نبی کریم ﷺ کا مقصد یہود و نصاریٰ کی تالیف قلبی تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی تالیف قلب کیلئے آپ ﷺ کو نماز میں بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا تھا۔ بعد میں جب اسلام کو قوت و غلبہ حاصل ہوا اور اہل کتاب کی طرف سے بھی نہ تعاون کی توقع رہی نہ مقابلے کا خطرہ، تو تالیف قلب کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اور آپ ﷺ پھر سے فرق کرنے لگے جس طرح آپ ﷺ کو بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا۔

تشبّہ بالغیر کا حکم: جو کام کفار کے شعائر یعنی امتیازی نشانیوں میں سے تھے اس میں تشبہ جائز نہیں۔ اسی طرح بعض امور ایسے بھی ہیں جن میں تشبہ بالنساء بھی آتا ہے۔ اصولی طور پر رسول اللہ ﷺ نے

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبۃ ۶/۵۸ کتاب اللباس والزینۃ باب فی اتخاذ الجمہ والشعر، صحیح بخاری ۲/۷۷ باب الفرق کتاب اللباس، صحیح مسلم ۲/۲۵۷ کتاب الفضائل باب فی سدل النبی ﷺ، ابو داؤد ۲/۲۲۰ باب ماجاء فی الفرق کتاب الترجل۔(مختار)

ہمیشہ تشبہ بالکفار اور تشبہ بالنساء سے منع فرمایا ہے۔فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان مردوں پر لعنت فرمائے جو عورتیں بننے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان عورتوں پر لعنت فرمائے جو مرد بننے کی کوشش کرتی ہیں (۱)۔

آج کل تو تہذیب اتنی گندی ہو رہی ہے کہ مرد اور عورت میں تمیز مشکل ہوگئی ہے۔سامنے سے آنے والے مرد عورتوں کی طرح اور عورتیں مردوں کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔ایک ہی طرح کا لباس ایک ہی طرح کا وضع قطع ہے۔مرد مخنث بنتے جا رہے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت شدہ مردانگی کی تمام علامات مردوں نے ہٹا دی ہیں۔

ثمّ فرّق رسول اللّٰه الخ ۔اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے فرق یعنی مانگ بنانا شروع کیا کیونکہ مشرکین کے غلبہ کا خوف اور ان کی تہذیب وتمدن سے خطرہ نہ رہا۔اس کے بعد اہل کتاب کی تہذیب سے ٹکر لینی تھی۔جو مانگ نکالنے کی صورت میں آپ ﷺ نے پورا کیا۔رہی یہ بات کہ فرق اور سدل دونوں میں سے کونسا راجح ہے؟ تو علماء نے اس کی تصریح کی ہے کہ دونوں جائز ہیں۔لیکن فرق مستحب ہے (۲)۔کیونکہ بعض روایات میں "ثم امر بالفرق و کان الفرق آخر الامرین" (۳) کے الفاظ مروی ہیں۔جس سے کم از کم فرق کی ترجیح معلوم ہوتی ہے۔اگرچہ بعض صحابہ آپ ﷺ کے زمانے کے بعد تک سدل بھی کیا کرتے تھے۔

---

(۱)جامع ترمذی ج۲ ابواب الادب باب ما جاء فی المشبهات بالرجال من النساء ۱۰۲ (اصلاح الدین)

(۲)اور ملا علی قاریؒ نے مانگ کو سنت کہا ہے اور قاضی عیاضؒ اسے ضروری سمجھتے ہیں۔حضرات صحابہ کرامؓ کا دونوں پر عمل تھا۔ تاہم بالوں میں مانگ نکالنا سنت اور ویسے بال چھوڑنا جائز ہے۔علامہ نوویؒ کے ہاں دونوں برابر ہیں۔ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے والفرق سنة لأنّه رجع إليه رسول اللّٰه ﷺ والظاهر إنّه انّما رجع اليه بوحي لقوله مالم يؤمر فيه بشئ وقال القاضي عياض نسخ السدل فلايجوز فعله اه، (جمع الوسائل ۹۷/۱) وفي المطالع الحديث يدلّ على جواز الأمرين والأمر فيه واسع لكن الفرق افضل لكون النبيّ رجع اليه آخراً وليس بواجب فقد نقل أنّ من الصحابة من سدل بعدولو كان الفرق واجباً لماسدلوا (المواهب اللدنية ص ۴۲) اور علامہ عینیؒ نے لکھا ہے والصحيح أنّ الفرق مستحب لا واجب وهو قول الجمهور وبه قال مالك وقال النوويّ الصحيح جواز السدل والفرق (عمدة القارى ۸۷/۲۲)(مختار)

(۳) مصنف عبدالرزاق۔جمع الوسائل ج۱ ص ۹۸

٨. حدّثنا محمّد بن بشّار انا عبدالرحمٰن بن مهدی عن إبراهيم بن نافع المكيّ عن ابن أبی نجيح عن مجاهد عن امّ هانی قالت رأيت رسول الله ﷺ ذا ضفائر اربع.

ترجمہ: حضرت ام ہانیؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو چار گیسوؤں والا دیکھا۔

اس حدیث کی تشریح پہلے گزر چکی ہے۔

۴۔ باب ما جاء فی ترجّل رسول اللہ ﷺ

بالوں کی دیکھ بھال کا بیان

گزشتہ باب میں بالوں کا بیان ہے۔ بال رکھنے کے بعد ان کی صفائی اور حفاظت کرنا بھی لازمی امر ہے۔ بال گندے ہوں، میل، گرد وغبار اور جوؤں سے بھرے ہوں، کنگھی اور صفائی کا بندوبست نہ ہو تو انسان جانوروں کی طرح لگتا ہے۔

ترجّل اور **ترجیل** بالوں کو صاف رکھنے اور ان میں تیل اور کنگھی کے اہتمام کو کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ انتہائی درجہ کے نظافت پسند اور نفیس طبیعت کے مالک تھے۔ نظافت کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ "**النظافة من الایمان**" نیز فرمایا کہ "**من کان له شعر فلیکرمه**" (۱) آپ ﷺ نے بال رکھے تھے تو ان کی خوب حفاظت اور صفائی بھی کیا کرتے تھے۔

<u>بالوں کی حفاظت سنت ہے:</u> آج کل تو بالوں کو بنانے اور سنوارنے کے بڑے بڑے سسٹم بنائے جاتے ہیں۔ ان کو ترتیب وتزیین کے لئے مشینوں سے کام لیا جاتا ہے۔ ان کو گھنگریلا بنانے اور ان کے رنگ بدلنے کے لیے بھی آلات واوزار کا استعمال ہوتا ہے۔ شہر شہر گلی گلی میں بیوٹی پارلر ہیں۔ لیکن یہ بھی محض تکلف اور تصنع ہے کیونکہ بالوں کو ستھرا رکھنا اور ان میں تیل اور کنگھی کا اہتمام کرنا کسی حد تک مسنون امر ہے۔ جس طرح کہ اس باب میں احادیث سے ظاہر ہوتا ہے۔ مگر اس میں مبالغہ کرنے سے احتراز کرنا بھی ضروری ہے۔ بعض دوسری احادیث میں اس کی تصریح ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ ارفاہ سے منع کیا کرتے تھے (۲)۔ جس سے مراد یہ ہے کہ کنگھی وغیرہ میں اس قسم کے تکلفات سے احتراز کیا جائے جس قسم کی تکلفات عورتیں اپنے بالوں میں کرتی ہیں۔ تو اعتدال کے ساتھ بالوں کی خدمت کرنے سے متعلق اس باب میں احادیث لائی گئی ہیں۔

---

(۱) سنن ابی داؤد ۲/ کتاب الترجل باب ماجاء فی اصلاح الشعر

(۲) سنن ابی داؤد ۲/ کتاب الترجل باب اصلاح الشعر

(۱) حدثنا اسحاق بن موسیٰ الأنصاری ثنا معن بن عیسیٰ ثنا مالک بن أنس عن هشام بن عروة عن أبیه عن عائشةؓ قالت کنت أرجّل رأس رسول الله ﷺ وأنا حائض(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ میں حیض کی حالت میں نبی کریم ﷺ کے سر مبارک پر کنگھی کرتی تھی۔

<u>حالت حیض میں بیوی سے تعلق:</u> کنت أرجّل رأس رسول الله ﷺ وأنا حائض. حضرت عائشہؓ کی اس حدیث میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ حالتِ حیض میں زوجین کے درمیان جماع کے سوا باقی کاموں میں اختلاط ناجائز نہیں ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

فاعتزلو ا النساء فی المحیض عورتوں سے حیض کی حالت میں کنارہ کش رہو۔

نیز فرمایا کہ و لا تقربو هنّ حتیٰ یطهرن جب تک وہ پاک نہ ہوں ان کے قریب نہ جانا۔

ان آیتوں سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حیض کے وقت بیوی سے مکمل قطع تعلق ہو۔ یہی جاہلیت کے زمانے کا رواج بھی تھا۔ حائضہ کو کتیا کا درجہ حاصل تھا۔ اسے گھر کے ایک کونے میں علیحدہ بٹھادیا جاتا تھا۔ اور دور سے اسے کھانا دلایا جاتا تھا۔ یہی حالت نفاس اور عدتِ وفات میں بھی تھی۔

لیکن درحقیقت اعتزال اور منع قرب سے مراد جماع سے احتراز ہے۔ جماع کے بغیر حیض ونفاس کی حالت میں میاں بیوی کا ایک جگہ رہنا، کھانا، سونا اور مکمل مخالطت جائز ہے۔ اس حدیث میں بھی اس کے جواز کی تصریح ہے۔ اس لئے یہ حدیث ان قرآنی آیتوں کی تفسیر کررہی ہے کہ وہاں ہر قسم کے اختلاط کی ممانعت مقصود نہیں ہے۔

<u>میاں بیوی کے باہمی حقوق:</u> نیز حدیث مذکور میں اس بات پر بھی تنبیہ ہے کہ بیوی کو شوہر کی خدمت کرنی چاہیے اگرچہ اس میں لزوم نہیں بلکہ یہ استحباب کے درجہ میں ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے ہاں

(۱) صحیح بخاری ۱/۴۳ کتاب الحیض باب غسل الحائض رأس زوجها، سنن نسائی ۱/۶۸ کتاب الحیض والاستحاضة باب غسل الحائض رأس زوجها(مختار)

بہت زیادہ بے اعتدالیاں پائی جاتی ہیں۔ پٹھان اور بعض دوسرے قبائل بیوی کو بالکل کنیز کا مرتبہ دیتے ہیں۔ بیوی کا کام ہی گویا کھانا پکانا، دھونا اور پاؤں دبانا وغیرہ امور ہیں۔ اور آئے دن کی مار پیٹ اس پر مستزاد ہوتی ہے۔ حالانکہ شرعی لحاظ سے بیوی پر کسی قسم کی خدمت واجب نہیں۔ بلکہ فقہاء میں امام ابو یوسفؒ تو اس کے لئے دو خادم رکھنے کا حکم دیتے ہیں۔ ایک گھر کے کام کاج کیلئے اور دوسرا باہر کے کاموں کے لئے۔ البتہ امام محمدؒ ایک خادم پر اکتفاء فرماتے ہیں۔ لہٰذا حق تو یہ ہے کہ بیوی کو کپڑے، اور نان ونفقہ پکی پکائی گھر کے اندر ملنی چاہیے۔ ہاں جماع کا جو حق شوہر کا بیوی پر ہے وہاں مرد کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو بیوی کو نفل روزہ رکھنے سے بھی منع کر سکتا ہے۔ لیکن استخدام کا حق مرد کے لیے نہیں ہے۔

<u>حقوق نسواں کے نام پر توہین نسواں:</u> دوسری طرف عورت کو اسلام نے یہ اخلاقی تعلیم دی ہے کہ وہ گھر کی حفاظت اور اس کے اندر کے کام کاج خود کرے۔ نیز حتی الوسع شوہر کی خدمت میں کوتاہی نہ کرے۔ آج کل حقوق نسواں کے نام پر ساری دنیا میں بڑا فتنہ برپا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ عورت بھی آخر انسان ہے۔ اسے انسانوں جتنے حقوق تو ملنے چاہئیں۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ ہم نے کب کہا ہے کہ وہ انسان نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کے جو مقاصد، مراتب اور فرائض مقرر کئے ہیں اور جو کہ عین فطرت سے موافق بھی ہیں۔ ان کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ آج جو شخص حقوق نسواں کا نعرہ لگاتا ہے وہ فرائض نسواں سے چشم پوشی کر جاتا ہے۔ بچے کی حفاظت، تربیت، آرام وراحت اور رضاعت کا خیال رکھنا، شوہر کے گھر کی دیکھ بھال کرنا، اور اپنی عصمت کا خیال رکھنا وغیرہ جو فرائض عورت کے ذمے لگائے گئے ہیں۔ نئی روشنی کے دعویدار حضرات وہ پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ بلکہ ان کے بارے میں اسلامی احکام اور قرآن وحدیث کے ساتھ استہزاء کا معاملہ برتا جاتا ہے۔ اور آزادئ نسواں کے نام پر گمراہی کی ترغیب وتعلیم بھی دی جاتی ہے۔

مغربی تہذیب میں تو باقاعدہ بیوی اور شوہر کے درمیان اجنبیوں کی طرح کمائی، خرچ اور رہائش تک کے امور میں علیحدگی رائج ہے۔ مرد عورت کی نجی زندگی سے بے خبر ہے اور عورت کو مرد کی نجی زندگی کا کوئی پتہ نہیں۔ خاوند ایک دفتر میں تو بیوی دوسرے دفتر میں کام کرتی ہے۔

درحقیقت مرد کا عورت پر ایک ظلم یہ بھی ہے کہ اسے مرد کے ساتھ مساوی ہونے کا احساس دلا کر

اسے باہر نکالنے کی شہہ دیتا ہے۔مغرب کا بوالھوس مرد اپنی عیش وعشرت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے عورت کو چاردیواری سے باہر نکال رہا ہے۔حقیر سے حقیر چیز کا اشتہار کیوں نہ ہو،عورت کی تصویر سے خالی نہیں۔عورت ان کے ہاں جنسی تسکین کے لئے محض ایک آلہ کی حیثیت رکھتی ہے۔وہاں کے مرد نے عورت سے بڑی زیادتی کی ہے۔عورت پریشان ہے کہ وہ بچوں کی حفاظت کرے،کارخانہ اور دفتر جائے،یا پھر اپنی حفاظت کرے۔اس صریح ظلم کی آگ میں مغربی عورت ہروقت جلتی رہتی ہے۔

<u>دیت کس کی آدھی؟</u> اسلام نے عورت کو بڑی عزت،احترام اور تقدس سے نوازا۔اسے گھر بٹھا کر مرد کو حکم دیا کہ جہاں سے بھی ہو،کماؤ اور بیوی کو کھلاؤ۔خوردونوش،رہائش اور لباس کا بندوبست کرو،اسلام نے ہر جگہ عورت کی رعایت کی ہے۔لیکن آج کی عورت سمجھائے نہیں سمجھتی۔دیت کے مسئلہ میں آجکل دنیا میں ایک ہنگامہ برپا ہے۔وہ اعتراض کرتے ہیں کہ عورت کی دیت آدھی کیوں ہے۔کیا وہ نصف انسان ہے۔ لیکن دراصل اس میں بھی عورت ہی کی رعایت کی گئی ہے۔شریعت بل کے ہنگامہ میں عورتیں میرے پیچھے بھی پڑی تھیں۔کہ تم کیوں عورت کے نصف دیت پر مصر ہو۔میں نے ان سے کہا کہ دیکھیں اگر میاں بیوی میں کسی ایک کو قتل کردیا جائے تو دیت تو مرنے والے کو نہیں،بلکہ دوسرے کو ملے گی۔اب اگر مرد مر گیا،تو بیوی کو مثلاً اپنا حصہ ایک لاکھ روپے ملیں گے اور عورت مرگئی تو مرد کو ملنے والی دیت پچاس ہزار روپے ہوگی۔ لہٰذا اگر نعوذ باللہ شریعت نے ظلم کیا ہے تو مرد پر کیا ہے عورت پر نہیں کیونکہ مرد نے اپنی شادی وغیرہ پر لاکھوں روپے بھی خرچ کیئے،اور دیت آدھی ملی۔جبکہ عورت نے شادی کے موقع پر بھی بڑی مقدار میں رقم لے لی اور دیت بھی دگنی ملی۔بہر حال دراصل دیت مرد کی آدھی ہے عورت کی پوری ہے۔

<u>نصف دیت کی حکمت:</u> درحقیقت اس میں بھی بڑی حکمت پوشیدہ ہے وہ یہ کہ دیت کا فائدہ چونکہ وارث کو ملتا ہے اور بیوی کے اخراجات خاوند کی زندگی میں اس کے ذمے تھے۔خاوند کے مرنے کے بعد اسے بچوں کی پرورش اور خود اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے مال کی زیادہ ضرورت ہے۔اس کے برعکس بیوی کی موت پر سارا گھر نہیں اجڑتا۔کیونکہ اخراجات اور نفقہ پہلے سے مرد کے ذمے ہیں۔اب مرنے کے بعد بھی اس کی ذمہ داریوں میں کچھ زیادہ اضافہ نہیں ہوا۔لہٰذا از روئے عقل اسے بیوی کی نسبت کم رقم ملنی

چاہیے۔بہر حال مرد کا بیوی پر استخدام کا حق تو نہیں۔لیکن مکارم اخلاق کا تقاضا ہے کہ بیوی محبت و شرافت سے خاوند کی خدمت کرتی رہے۔جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے عملاً ہمیں بتلایا کہ عورت کو مرد کی خدمت کرنی چاہیے۔

(۲) حدثنا یوسف بن عیسیٰ أنا و کیع أنا الربیع بن صبیح عن یزید بن أبان هو الرقاشیّ عن أنس بن مالک قال کان رسول اللّٰہ ﷺ یکثر دهن رأسه و تسریح لحیته و یکثر القناع حتی کان ثوبه ثوب زیّات(۱).

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کثرت سے سر میں تیل لگایا کرتے تھے اور بکثرت داڑھی میں کنگھی کیا کرتے تھے،حتیٰ کہ آپ ﷺ کا کپڑا کسی تیلی کا کپڑا معلوم ہوتا تھا۔

بالوں میں تیل اور کنگھی کا استعمال:دهن رأسه:دَهن کا دال مفتوح اور ہاء ساکن ہے۔یہ مصدر ہے اور معنی یہ کہ آپ ﷺ تیل کا استعمال بہت زیادہ کرتے تھے(۲)۔و تسریح لحیة دہن راسہ پر عطف ہے،یعنی آپ ﷺ داڑھی میں کنگھی بھی زیادہ کرتے تھے۔احادیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ سفر و حضر میں اپنے ساتھ مسواک،کنگھی،آئینہ،سرمہ دانی،تیل کی شیشی اور قینچی وغیرہ رکھا کرتے تھے(۳)۔و یکثر القناع قناع قاف مکسورہ کے ساتھ ما یتقنّع به کو کہتے ہیں۔یعنی وہ چھوٹا سا کپڑا جو ٹوپی یا پگڑی کے نیچے سر پر باندھتے ہیں۔تاکہ تیل کے اثر سے ٹوپی یا عمامہ محفوظ رہے۔نبی کریم ﷺ کی طبیعت میں بہت نفاست تھی۔آپ ﷺ کے کپڑے تیل وغیرہ کے داغوں سے محفوظ ہوتے تھے۔اس لئے سر پر تیل لگانے

---

(۱)الشرح السنة ۲ ا /۸۲ باب ترجیل العر و تدهیه ،مشکوٰة المصابیح ۲/ ۳۸۱ باب الترجل(مختار)

(۲)موجودہ زمانے کے سائنس دان بھی کہتے ہیں کہ سر پر تیل لگانا یہ ذہنی دباؤ اعصابی کھچاؤ،سر درد کے پرانے مریض،گرد پھٹوں کے درد،شانوں کے درد،کھچاؤ نگاہ کی کمزوری اور چہرے کی سرجری کیلئے بہت مفید ہے(آفتاب نبوت کی کرنیں ص۱۵۶)(مختار)

(۳)ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کبھی کبھار دن میں دو مرتبہ بھی تیل استعمال فرما لیتے تھے(مختار)

کے بعدٹوپی یا پگڑی پہننے سے قبل سر پر کپڑا ڈال دیتے تھے۔ کان ثوبه ثوب زيات ثوبه سے آپ ﷺ کے بدن کا کپڑا مراد نہیں کیونکہ اس کا میلا اور تیل سے آلودہ ہونا نظافت کے خلاف ہے۔ بلکہ ثوبہ سے مراد یہی قناع ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے اور قناع کا تیل سے آلودہ ہونا قبیح بات بھی نہیں ہے بعض روایات کے مطابق ''حتى كان ملحفته ملحفة زيات'' کے الفاظ مروی ہیں۔

(۳) حدثنا هنادبن السرىّ أنا أبو الأحوص عن أشعث بن أبى الشعثاء عن أبيه عن مسروق عن عائشةؓ قالت كان رسول اللهﷺ ليحبّ التيمن فى طهوره اذا تطهّر و فى ترجّله اذا ترجّل و فى انتعاله اذا انتعل(۱)۔

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ طہارت کے وقت پانی کے استعمال میں کنگھی کرتے وقت کنگھی کرنے میں اور جوتے پہنتے وقت جوتیاں پہننے میں دائیں طرف سے شروع کرنا پسند فرماتے تھے۔

كان رسول اللهﷺ الخ اِن مخفف من المثقل ہے۔اسم محذوف ہے اور تقدیر انه كان الخ ہے۔اور ليحب کا لازم اس کا قرینہ ہے۔ کیونکہ ان قافیہ ہونے کی صورت میں خبر پر لام داخل نہیں ہوتا۔

ليحبّ التيمن فى طهوره الخ طہور کی طاء مفتوح ہو تو اس پانی کو کہتے ہیں جس سے طہارت حاصل کی جائے اس صورت میں مضاف مقدر ہوگا یعنی ''فى استعمال طهوره'' اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں پر مصدری معنی مراد ہو۔ اور طاء مضموم ہو گویا وضوء کرنے میں پہلے دائیں اعضاء سے ابتداء کرتے۔ اس صورت میں تقدیر کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

اسی طرح کنگھی کرنے اور جوتا پہننے میں بھی تیامن کی عادت تھی۔

تیامن اور تیاسر کے اصول: بلکہ ہر اچھے کام میں تیامن ملحوظ رکھتے تھے۔ ضابطہ یہ ہے کہ جو کام مکرم، مشرف اور تزئین کا ہو تو وہاں تیامن مسنون ہے اور جس کام میں شرف و کرامت اور تزئین نہ ہو تو اس

(۱) صحيح بخارى ۱/۲۸ كتاب الوضوء باب التيمن فى الوضوء، سنن نسائى ۲/۲۹۲ كتاب الزينة باب التيامن فى الترجل(مختار)

میں تیاسر چاہئے۔ مثلاً مسجد میں داخل ہوتے وقت دایاں پاؤں اور نکلتے وقت بایاں پاؤں آگے کرنا چاہیے۔ جبکہ بیت الخلاء میں اس کے برعکس ہونا چاہیے۔اسی طرح کپڑا پہننے میں دائیں جانب سے اور اتارنے میں بائیں جانب سے نکالنا بہتر ہے۔ کیونکہ ستر زینت اور کرامت ہے اور عریانی اس کے برعکس ہے۔

بخاری اور مسلم کی حدیث میں اس روایت کے آخر میں "وفی شانہ کلہ" کے الفاظ کا اضافہ ہے۔ یہاں شاید راوی کو یہ عبارت مستحضر نہیں تھی۔اس لئے اسے نہیں لایا۔ درحقیقت تمام افعالِ خیر میں آپ ﷺ تیامن پسند فرماتے تھے۔

اتباع سنت کے اہتمام کی عجیب مثالیں: بزرگوں کے ہاں سنت کا بہت زیادہ پاس ہوتا تھا۔ المدخل میں ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ اس نے بے دھیانی سے پہلے اپنا بایاں جراب پہنایا، بائیں پاؤں کی جوتی پہنی۔ بعد میں خیال آیا تو کفارہ کے طور پر 36 من کا غلہ صدقہ دیا۔ نبی کریم ﷺ سے محبت کرنے والوں کو معلوم ہوتا ہے کہ اتباع سنت کے کتنے دینی اور دنیوی برکات ہیں۔ زندگی کے تمام معمولات اور عادات میں بھی اتباع سنت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔

ایک بزرگ جس کا نام غالباً محمد بن اسلم ہے نے ساری عمر تربوز نہیں کھائی اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ مجھے یہ معلوم نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے تربوز کیسے کھایا ہے۔ چھلکے اتار کر یا قاشیں بنا کر یا گودا نکال کر۔ اس لئے میں سنت کے خلاف نہ کر بیٹھوں۔ بہر حال وہ لوگ لاعلمی میں بھی خلاف سنت کا ارتکاب برداشت نہیں کرتے تھے۔

حضرت حسن بصریؒ نے جب پہلی مرتبہ ایک شخص کو بدعت میں مبتلا دیکھا۔ تو آپ کو اتنا دکھ ہوا کہ جب پیشاب کرنے بیٹھے تو پیشاب کی جگہ خون نکل آیا۔ اتباع سنت سے لاپرواہی کے سبب آج ہم سے فرائض بھی چھوٹ گئے ہیں۔ کیونکہ جو شخص مستحبات میں تکاہل برتتا ہے وہ سنن سے محروم ہو جاتا ہے۔ جو شخص سنن سے بے پرواہ ہوتا ہے۔ اسے واجبات کی توفیق نہیں ہوتی۔ اور واجبات سے جو شخص لاپرواہی برتتا ہے اسے فرائض سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ مشہور بزرگ حضرت شبلیؒ نے اپنی موت کے وقت شاگردوں سے فرمایا کہ مجھے وضو کراؤ۔ نزع کی حالت تھی سکرات موت میں مبتلا تھے۔ شاگردوں نے بڑی تکلیف سے وضوء

کروایا۔لیکن وضوء کے بعد آپ نے شاگردوں سے کہا۔کہ تم نے تو مجھے خلال نہیں کروایا۔اس لئے دوبارہ وضوء کراؤ۔انہوں نے کہا کہ خلال سنت یا مستحب چیز ہے۔ادھر تمہیں شدید تکلیف ہے۔اس لئے رہنے دیں اس نے کہا کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایسی حالت میں ملاقات نہیں کرنا چاہتا کہ میں نے ان کی ایک سنت کو ترک کردیا ہو۔لہٰذا آپ نے دوبارہ وضوء کروایا تا کہ خلال بھی ہوجائے وضوء کے ختم ہوتے ہوتے آپ کی روح بھی پرواز کرگئی۔

(۴) حدّثنا محمّد بن بشّار أنا یحییٰ بن سعید عن ھشام بن حسان عن الحسن البصریّ عن عبداللّٰہ بن مغفّل قال نھیٰ رسول اللّٰہ ﷺ عن الترجّل الاغبّاً(۱)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مغفل ؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کنگھی کو منع فرماتے مگر گاہے گاہے۔

عن عبداللّٰہ بن مغفل: عبداللہ بن مغفل مزنی صحابی ہیں۔بیعت رضوان سے مشرف ہوئے تھے اور فتح مکہ کے دن سب سے پہلے مکہ میں داخل ہونے والے شخص تھے۔بصرہ میں ۵۷ھ یا ۶۰ھ کو وفات پائی۔

بالوں کے بناؤ سنگھار میں اعتدال: اِلاّغبّاً الخ اسلام اعتدال کا درس دیتا ہے۔وہ ہر وقت تعیش، تزیین اور بناؤ سنگھار میں لگے رہنے سے منع کرتا ہے۔جس طرح کے بعض طلبہ درس میں بھی کنگھی آئینہ کا اہتمام کرتے ہیں۔تو اگرچہ اسلام ایک طرف صفائی اور نظافت کا حکم دیتا ہے۔اور میلے رہنے کو ناپسند کرتا ہے لیکن عورتوں اور مترفین کی طرح ہر وقت بناؤ سنگھار کے اہتمام کو بھی پسند نہیں کرتا۔

لفظ غب: غب کا اصلی معنی ہے ورود الابل الماء یوماً و ترکہ اخریٰ یعنی اونٹ کا ایک دن پانی پینے کے لئے آنا اور دوسرے دن چھوڑنا۔پرانے زمانے میں صحرائی علاقوں میں پانی کی دوری اور قلت کے سبب روزانہ اونٹوں کو پانی پلانا مشکل تھا۔اس لئے ایک دن انہیں پانی پلاتے تھے اور دوسرے دن ناغہ ہوتا تھا۔

---

(۱)سنن ابی داؤد ۲/۲۱۷ کتاب الترجل، سنن نسائی ۲/۲۷۵، کتاب الزینۃ باب الترجل غباً،جامع ترمذی ۱/۳۰۵ کتاب اللباس باب ماجاء فی النھی عن الترجل الاغباً(مختار)

اونٹ کواللہ تعالیٰ نے یہ طاقت دی ہے کہ وہ کئی کئی دن تک بغیر پانی پیئے گزارہ کرسکتا ہے۔بعض لوگوں کے خیال میں اونٹ کے پیٹ میں پانی کوذخیرہ کرنے کیلئے الگ جگہ ہوتی ہے۔لیکن یہ غلط ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اونٹ کوصحرائی علاقوں سے بہت مناسب فطرت دی ہے۔اونٹ کے کوہان میں چربی ہوتی ہے، جو پیاس کی صورت میں پگھل پگھل کر پیاس بجھاتی رہتی ہے۔لہٰذاوہ کئی کئی دن تک بغیر پانی کے گزارہ کرسکتا ہے۔اوراسی وجہ سے جس شخص کا پیٹ بڑھ جائے اسے ڈاکٹر پانی نہ پینے یا کم پینے کا مشورہ دیتے ہیں۔بہرحال پیاس کی کمی کے باعث اونٹ کوہمیشہ پلانے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ کبھی کبھی پلاتے ہیں۔ اسی کوغب کہتے ہیں عرب کامشہور مقولہ ہے زرغباً تزددحباً۔کبھی کبھی ملاقات کرنے جاؤ محبت بڑھتی جائے گی۔یہاں بھی غب ناغہ کے معنی پرمستعمل ہے۔ہروقت کسی دوست کے پیچھے پڑے رہو گے تو بیزاری آئے گی۔

اور چونکہ ہروقت کنگھی کرنا عیش پرستوں اورعورتوں کا کام ہے اس لئے کنگھی بھی کبھی کبھار ہونی چاہیے۔علامہ ابن عربیؒ نے کنگھی کے بارے میں کیاخوب فرمایاہے کہ موالاتہ تصنع و ترکہ تدنس واغبابہ تسنن. اس میں ہروقت لگے رہنا،تصنع اورتکلف ہے۔اس کابالکل چھوڑ دینا میلاپن ہے۔اور اسے کبھی کبھی کرنا سنت ہے(۱)۔

(۵) حدّثنا الحسن بن عرفة قال ثنا عبدالسلام بن حرب عن یزید بن أبی خالد عن أبی العلاء الأودیّ عن حمید بن عبدالرحمٰن عن رجل من أصحاب النبیّ ﷺ أنّ النبیّ ﷺ کان یترجل غباً(۲).

ترجمہ: ایک صحابیؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی عادت مبارک کبھی کبھی کنگھی کرنے کی تھی۔

---

(۱)قال ملاعلی قاریؒ وقیل ھوان یفعل یوماًویترک یوماًونقل عن الحسن فی کل السبوع قال القاضی والمرادالنھی عن المواظبة علیه والاھتمام به لانّه مبالغة فی التزین تھالک به

(جمع الوسائل ۱/۱۰۷)(مختار)

(۲)تفرد به الترمذی:

عن یزید بن ابی خالد اس راوی کے بارے میں تحقیق یہ ہے کہ یہ یزید بن ابی خالد نہیں بلکہ یزید بن خالد ہیں۔ بہت متقی اور پرہیزگار تھے۔ **عن رجل الخ** صحابی مجہول ہے لیکن چونکہ تمام صحابہ عدول ہیں۔اس لئے یہ جہالت مضر نہیں ہے۔بعض لوگوں نے اس صحابی کی تعین کی ہے۔کسی نے حکم بن عمروؓ کا نام لیا ہے۔کسی نے عبداللہ بن سرجسؓ کا نام لیا ہے اور بعض لوگوں کے خیال میں یہ صحابی عبداللہ بن مغفلؓ ہیں۔ جو سابقہ حدیث کے راوی ہیں البتہ یہ حدیث فعلی ہے اور گزشتہ حدیث میں نبی کریم ﷺ کا قولی حکم بیان کیا گیا تھا(۱)۔

---

(۱) علامہ ابن عربیؒ نے فرمایا ہے کہ بار بار کنگھی کرنا یہ تصنع اور بناوٹ میں داخل ہے اور کنگھی بالکلیہ ترک کرنا بالوں میں میل وکچیل جمع ہونے کا باعث بنتا ہے جو باعث ضرر ونقصان ہے اس لئے اعتدال سے کام لینا چاہئے۔

<u>کنگھی اور جدید سائنس:</u> آج کل سائنس کی تحقیق یہ ہے کہ کنگھی سے ایک حرارت اور انرجی بدن میں پیدا ہوتی ہے جو بالوں کے ذریعے جسم انسانی کی طرف منتقل ہوتی ہے اور اعصابی نظام میں قوت پیدا کرتی ہے اور اگر کنگھی نہ کی جائے تو پھر بالوں میں جراثیم اٹک جاتے ہیں۔اور بدن انسانی میں منتقل ہوجاتے ہیں اور بسا اوقات خطرناک بھی ثابت ہوسکتے ہیں۔(مختار)

۵. باب ماجاء فی شیب رسول اللہ ﷺ
حضور اقدس ﷺ کے بالوں کی سفیدی کا بیان

اس سے قبل بالوں کا تذکرہ ہو چکا ہے۔اور چونکہ عمر کے آخر میں بالوں کو سفیدی عارض ہو جاتی ہے۔اس لئے اب اس باب میں نبی کریم ﷺ کے بالوں کی سفیدی کا بیان ہے. شیب شاب یشیب کا مصدر ہے جس کے معنی سیاہ بالوں کا سفید ہونا ہے۔اسی طرح اس کا اطلاق اس حالت پر بھی ہوتا ہے جس میں بال سفید ہو جاتے ہیں۔عمر کی زیادتی کی وجہ سے قُویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں، طاقت چلی جاتی ہے بڑھاپا آجاتا ہے۔تو اسے بھی شیبۃ اور شیب کہتے ہیں۔

(۱) حدّثنا محمّد بن بشّار أنا ابو داؤد أنا همّام عن قتادة قال قلت لأنس بن مالک هل خضب رسول الله ﷺ قال لم یبلغ ذلک إنّما کان شیبا فی صدغیه و لکن ابو بکر خضب بالحناء و الکتم(۱).

ترجمہ: حضرت قتادۃؒ کہتے ہیں میں نے حضرت انسؓ سے پوچھا کہ حضور اقدس ﷺ خضاب لگایا کرتے تھے۔انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے بالوں کی سفیدی خضاب کی حد کو نہیں پہنچی تھی۔سفیدی نبی کریم ﷺ کی دو کنپٹیوں میں تھوڑی سی تھی۔ البتہ ابو بکرؓ مہندی اور کتم کا خضاب لگایا کرتے تھے۔

ابو داؤد: ائمہ حدیث میں سے یہ کنیت دو افراد کے لئے بولی جاتی ہے ایک ابوداؤد سلیمان بن داؤد طیالسیؒ ہیں دوسرے ابوداؤد مصاحفیؒ اور چونکہ ابوداؤد مصاحفیؒ کا ہمامؒ سے سماع ثابت نہیں اس لئے یہاں پر اول الذکر ہی مراد ہونگے۔

لم یبلغ ذالک : لم یبلغ کی ضمیر مستتر میں تین احتمال ہیں۔اول یہ کہ ضمیر نبی کریم ﷺ کو راجع ہو اور ذالک سے حد الخضاب کو اشارہ ہو۔جس پر قرینہ حضرت قتادہؒ کا سوال "ھل خضب " ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری ۱/۵۰۱ باب صفة النبی ﷺ کتاب المناقب، سنن نسائی ۲/۲۷۸ کتاب الزینة باب الخضاب بالعضرة(مختار)

(۱) تقدیر یوں ہوگی کہ "لم یبلغ رسول اللہ ﷺ حدالخضاب" یعنی بالوں کو خضاب لگانے کی نوبت نہیں آئی۔(۲) دوم یہ کہ ضمیر شیب کو راجع ہو تو عبارت کی تقدیر یوں ہوگی کہ "لم یبلغ الشیب حدالخضاب" یعنی آپ کے بال اتنے سفید ہی نہیں تھے کہ خضاب کی ضرورت پڑے۔(۳) سوم یہ کہ ضمیر شعرالنبی ﷺ کو راجع ہو تو تقدیر یوں ہو کہ "لم یبلغ شعرہ ﷺ حدالخضاب" یعنی آپ ﷺ کے بال مبارک خضاب کی حد تک سفید نہیں ہوئے تھے۔

بہر حال اس جملے کا مقصد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بالوں میں معدودے چند بال سفید تھے۔ اس لئے آپ ﷺ کو خضاب لگانے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ اگلے باب میں یہ بات تفصیل سے آجائے گی کہ نبی کریم ﷺ نے خضاب کا استعمال کیا ہے یا نہیں۔

انما کان شیبا فی صدغیه الخ: صدغ آنکھ کے گوشے اور کان کے درمیان کے حصے کو کہتے ہیں لیکن اس حصے پر موجود بالوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں پر اس کی مراد میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ھو الشعر المتدلی بین الاذن و العین یعنی آنکھ اور کان کے درمیان بالوں کی پٹی۔ جسے اردو میں کنپٹی کہتے ہیں۔ بالوں میں سفیدی کی ابتداء کن پٹی سے ہوتی ہے نبی کریم ﷺ کی کن پٹیوں میں چند سفید بال ظاہر ہوگئے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا خضاب(۱): ولکنّ ابا بکر الخ حضرت انسؓ کے بیان کے مطابق نبی کریم ﷺ نے خضاب کا استعمال نہیں کیا تھا۔ جس سے معلوم ہوا کہ خضاب لگانا ناجائز نہ تھا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے خضاب نہیں لگایا تو آپ ﷺ کے قریب ترین دوست سب سے بڑے اور بزرگ صحابی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کیوں لگایا تھا؟ اس وہم کے دفعیہ کے لئے حضرت انسؓ نے اس جملہ کا اضافہ کردیا کہ اگرچہ ابوبکر صدیقؓ نے خضاب لگایا تھا لیکن وہ بھی خالص خضاب نہ تھا بلکہ درحقیقت وہ سیاہی مائل مہندی استعمال کرتے تھے۔ اور کتم کی سیاہی کو ختم کرنے کے لئے اس میں مہندی

---

(۱) خضاب یعنی بالوں کو رنگنے کا رواج پرانے زمانے سے ہے۔ پہلے ادوار میں عام طور پر مہندی یا وسمہ یا کتم (ایک قسم کا بوٹا ہے) استعمال کیا جاتا تھا، البتہ اس وقت بہت سارے ہیئر کلرز بازاروں میں ملتے ہیں اس میں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔(مختار)

ڈالتے تھے۔اسی لئے تو ابوبکر صدیقؓ نے اسے استعمال کیا تھا اور نہ ابوبکر صدیقؓ خلاف سنت کام کبھی بھی نہیں کرتے تھے۔اس تشریح کے مطابق حضرت انسؓ کی اس حدیث سے خضاب کے جواز کی نفی ہوتی ہے۔

ایک دوسری تشریح کے مطابق اس حدیث میں دراصل خضاب لگانے کو جائز کہا گیا ہے اور خضاب کے عدم جواز کیلئے حدیث بیان نہیں ہوئی بلکہ دراصل یہ بات اس لئے کی گئی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خضاب لگا کر کوئی جرم نہیں کیا۔رہی یہ بات کہ ان کا عمل نبی کریم ﷺ کے عمل کے خلاف تھا تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ آپ ﷺ کے نزدیک خضاب ناجائز تھا بلکہ دراصل نبی کریم ﷺ حد خضاب کو نہیں پہنچے تھے۔اگر ابو بکر صدیقؓ کی طرح آپ ﷺ کے بال بھی سفید ہوجاتے تو آپ ﷺ بھی استعمال کرتے۔

تیسری توجیہ یہ ہے کہ یہاں پر سائل نے نبی کریم ﷺ کے عمل کے بارے میں استفسار کیا ہے۔ لیکن حضرت انسؓ نے جواب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا عمل ذکر کیا۔کیونکہ نبی کریم ﷺ کے بعد امت میں آپؓ ہی کا نمبر آتا ہے۔تو گویا حضرت انسؓ کا مقصد یہ ہے کہ اگرچہ نبی کریم ﷺ نے خضاب نہیں لگایا۔ لیکن امت کی تاسی اور اقتداء کے لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا عمل موجود ہے جنہوں نے خضاب لگایا تھا۔ اس سے صحابہؓ کے نزدیک صدیق اکبرؓ کا مرتبہ اور مقام بھی بخوبی معلوم ہوتا ہے۔

<u>کتم:</u> اس حدیث میں کتم(۱) کا ذکر ہے جس کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں۔صحیح قول کے مطابق ایک پودا ہے جو میدانی علاقوں میں ہوتا ہے۔اس کا قد انسان جتنا ہوتا ہے زیتون کی طرح پتلے پتلے پتے ہوتے ہیں مرچ کے دانوں کی طرح دانے اس میں آتے ہیں۔جس کو کوٹ کر ابالا جاتا ہے۔اور سیاہ رنگ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔لکھنے کی سیاہی بنانے کے کام بھی آتا ہے۔مہندی سے مل کر اس کا رنگ سرخی مائل سیاہ ہوجاتا ہے۔اس حدیث میں درحقیقت خضاب کا بیان ہے۔اس لئے شراح نے لکھا ہے کہ یہ حدیث اس باب کی نسبت اگلے باب سے زیادہ مناسب ہے۔

---

(۱) بعض اہل علم فرماتے ہیں کتم رنگ کے اعتبار سے کالا ہوتا ہے جب اس کو مہندی کے ساتھ ملایا جائے تو سرخ بن جاتا ہے۔اور بعض کا کہنا ہے کہ کتم کا رنگ سبز ہوتا ہے لیکن جب مہندی سے ملایا جائے تو سیاہ بن جاتا ہے مگر غلبہ کے اعتبار سے ہو یعنی اگر مہندی غالب ہو تو سرخ بن جاتا ہے اور اگر کتم غالب ہو تو سیاہ بن جاتا ہے۔علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے فرمایا ہے **الکتم الصرف یوجب سواداً مائلاإلی الحمرة والحناء توجب الحمرة فاستعمالهمایوجب مابین السوادوالحمرة اه(جمع الوسائل ۱/۱۰۱)(مختار)**

خضاب کا حکم: بعض لوگوں کے خیال میں نبی کریم ﷺ نے خضاب کبھی نہیں لگایا۔اوران کا اعتماد ان روایات پر ہے جن میں نبی کریم ﷺ سے خضاب کی نفی ثابت ہے۔لیکن صحیح روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خضاب استعمال کیا ہے۔اور چونکہ مثبت روایت نافی روایت سے فی ذاتہ راجح ہوتی ہے کیونکہ ایک علم اور دوسری عدم علم پر مبنی ہوتی ہے۔اس لئے بہت سے لوگوں نے جن میں امام احمد بن حنبلؒ بھی شامل ہیں خضاب کو جائز کہا ہے۔جبکہ بعض روایات میں نبی کریم ﷺ نے مشروط اجازت دی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے والد ابی قحافہؓ جن کا سر اور داڑھی بالکل سفید ہو چکے تھے۔نبی کریم ﷺ کے پاس فتح مکہ کے روز آئے۔رسول اللہ ﷺ آپ کا سر دیکھ کر فرمایا۔غیّر واھذا بشئی واجتنبو ا السواد (۱) یعنی اس کے بالوں کا رنگ بدل دو لیکن سیاہ رنگ سے اجتناب کرو۔

اس طرح دیگر احادیث میں بھی خضاب کے جواز کی تصریح موجود ہے۔البتہ سیاہ خضاب کے بارے میں نہی بھی وارد ہے۔احادیث کے درمیان تطبیق کیلئے علماء کے دو طبقے ہیں۔بعض علماء سیاہ خضاب کے جواز کے بھی قائل ہیں۔ہاں ممانعت صرف اس صورت پر حمل کرتے ہیں۔جس میں تدلیس کا شبہ ہو۔ اسلام تزیین وتحسین کے خلاف نہیں۔لیکن بعض اوقات دھوکہ اور فریب کیلئے بالوں کو سیاہ کیا جاتا ہے۔ایسی حالت میں اسلام خضاب کو ممنوع قرار دیتا ہے تاکہ دھوکہ کا انسداد ہو سکے۔کیونکہ تدلیس اور فریب میں دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر ایک شخص کے بال سفید ہو چکے ہیں۔کوئی رشتہ نہیں ملتا جس سے رشتہ طلب کرتا ہے، وہ سفید بال دیکھ کر بوڑھا سمجھ لیتا ہے۔اور رشتہ سے انکار کر دیتا ہے۔چنانچہ وہ خضاب کا سہارا لیتا ہے اور لوگ اسے جوان سمجھ کر رشتہ دے دیتے ہیں۔بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہ تو بوڑھا ہے۔اسی طرح وہ عورت بھی کبھی کبھی دھوکہ دے سکتی ہے جس کی عمر زیادہ ہے بال سفید ہیں۔لیکن وہ بیوٹی کلینک سے بن سنور کر نکلی کسی کی نظر پڑی۔اور اسے جوان سمجھ کر شادی رچائی۔بعد میں معلوم ہوا تو پچھتا تا رہا۔اسی طرح پرانے زمانے میں عموماً غلاموں اور کنیزوں کی فروخت کے وقت بھی تدلیس سے کام لیا جاتا تھا۔مالک اپنے غلام یا کنیز کی

(۱) مسلم ج۲ ص۱۹۹

قیمت بڑھانے کے لئے ان کو خضاب لگا کر اور میک اپ کروا کر نوجوان ظاہر کرتے۔ تاکہ خریدار لوگ دھوکہ کھا کر خرید لیں۔ ان صورتوں میں چونکہ دھوکہ فریب اور دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ اس لئے خضاب لگانا ممنوع ہے۔ لیکن اگر دھوکہ فریب نہ ہو۔ مثال کے طور پر میاں بیوی میں سے کسی کے بال سفید ہیں اور دوسرے کو اس کے بڑھاپے کا خوب پتہ ہے۔ بلکہ خود کہہ دیتا ہے کہ سفید بالوں کو خضاب لگا دیا جائے تو ایسے موقع پر خضاب خواہ وہ خالص سیاہ کیوں نہ ہو۔ لگانے میں کوئی حرج نہیں۔ علامہ ابن قیمؒ نے بھی اس کی تصریح کردی ہے۔

بعض دوسرے علماء کا خیال ہے کہ اگر خضاب خالص سیاہ نہ ہو۔ بلکہ کوئی دوسرا رنگ مثلاً سرخ مہندی وغیرہ اس میں ملا دیا جائے تو سرخی مائل خضاب کے لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور نبی کریم ﷺ نے بھی اگر خضاب استعمال کیا ہے تو وہ بھی خالص سیاہ نہ تھا۔ بلکہ یہی مخلوط خضاب تھا۔ بلکہ بعض علماء نے خضاب لگانے کو مستحب قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس میں اہل کتاب کی مخالفت ہے۔ اور جہاں ممانعت کا ذکر ہے تو سواد بحت یعنی خالص سیاہ خضاب مراد ہے۔ علامہ ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں بڑے اکابر صحابہ کے نام بھی لکھے ہیں جنہوں نے خضاب کا استعمال کیا تھا۔ ان میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت حسنؓ اور حسینؓ کے نام بھی شامل ہیں۔ اور ایک بڑی تعداد کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ سیاہ خضاب استعمال کیا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں بھی یہی توجیہ کی جائے گی کہ انہوں نے تدلیس کے لئے نہیں کیا تھا۔ نیز جو خضاب لگایا تھا وہ بھی خالص سیاہ نہیں تھا۔ بلکہ مہندی سے مخلوط تھا۔

(۲) حدثنا إسحاق بن منصور و يحيىٰ بن موسىٰ قالا ثنا عبدالرزاق عن معمر عن ثابت عن أنس قال ما عددت فى راس رسول الله ﷺ ولحيته إلاّ أربع عشرة شعرة بيضاء(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے سر مبارک اور داڑھی مبارک میں چودہ سے زائد بال نہیں گنے۔

---

(۱) صحيح ابن حبان ۸/۰۷ باب من صفته ﷺ وأخباره شرح السنة ۱۳/ ۲۸ ۲ باب شيبة وخضابه ﷺ (مختار)

بالوں میں موجود سفید بالوں کا تخمینہ: إلا أربع عشرة شعرة اس حدیث میں چودہ بال مذکور ہیں۔ آگے ایک اور حدیث میں تقریباً بیس اور حضرت انسؓ ہی کی ایک حدیث میں سترہ اور اٹھارہ بالوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اور اگرچہ مذکورہ روایات میں اعداد مختلف ہیں۔ لیکن ان احادیث میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ کیونکہ اختلاف زمانہ کی وجہ سے سفید بالوں کے عدد میں کمی بیشی آتی رہتی ہے علاوہ ازیں ایک شخص کا گننا دوسرے شخص کے گننے سے مختلف ہوتا ہے۔ ہر کوئی تو جوؤں کی طرح تلاش کر کے ایک ایک بال نہیں گنتا۔ پھر نبی کریم ﷺ کی عظمت و ہیبت کی وجہ سے ہر شخص اتنی گہرائی سے آپ ﷺ کے چہرہ انور کو کب دیکھ سکتا تھا۔ بس دور سے تخمینہ لگا کر صحابہ نے اعداد بتائے ہیں۔ چنانچہ کسی نے چودہ تک گن لئے۔ کسی نے سترہ کسی نے اٹھارہ اور کسی نے بیس تک گنے ہیں۔ ممکن ہے کہ بال اور بھی ہوں لیکن شمار میں نہ آئے ہوں۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب سفید بالوں کا عدد چودہ ہو کر دوسرے عشرہ میں داخل ہوا تو بیس کا نصف سے بڑھ کر بیس سے قریب ہو گیا۔ اس لئے اگلی روایت میں نحواً من عشرين کا قول تقریبی ہے۔ لیکن بہتر توجیہ یہی ہے کہ یہ سب اقوال تخمین پر مبنی ہیں۔ یا پھر اختلاف زمانہ کی وجہ سے عدد میں اختلاف آیا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت انسؓ کی دونوں حدیثوں میں تطابق کی ایک توجیہ یہ بھی ہے کہ یہاں پر انہوں نے "ما عددت في رأس الخ" کا لفظ کہا ہے۔ جس کا معنی ہے کہ میں نے چودہ گنے تھے۔ اب درحقیقت بال چودہ سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں تو دوسری روایات میں سترہ اٹھارہ کا جو ذکر ہے وہ دوسرے موقع پر گننے کے مطابق ہوگا۔

(۳) حدثنا محمد بن المثنىٰ أنا أبو داؤد أنا شعبة عن سماك ابن حرب قال سمعت جابر بن سمرة يسئل عن شيب رسول الله ﷺ فقال كان اذا ادّهن راسه لم ير منه شيب فاذا لم يدّهن روى منه (۱)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے نبی کریم ﷺ کے سفید بالوں کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ جب نبی کریم ﷺ تیل کا استعمال فرماتے تھے تو بالوں کی سفیدی دکھائی نہیں دیتی تھی اور جب تیل استعمال نہیں فرماتے تھے تو کچھ سفیدی دکھائی دیتی تھی۔

---

(۱) صحیح مسلم ۲/۲۰۸ کتاب الفضائل باب شیبة، سنن نسائی ۲/۲۸۱ کتاب الزینة باب الدهن (مختار)

اذا دّھن راسه: دھن ثلاثی مجرد کے صیغے سے بھی مروی ہے۔اور ادھن افتعال کے صیغے کے ساتھ بھی مروی ہے۔جو کہ اصل میں ادتھن تھا۔تاء کو دال سے بدل کر دال کو دال میں مدغم کیا گیا۔دونوں کا معنی ایک ہے۔ لم یر منه شئی اس کی وجہ یہ تھی کہ بالوں میں تیل لگانے سے چمک آجاتی ہے جس کی وجہ سے سفیدی مغلوب ہو جاتی ہے اور دکھائی نہیں دیتی۔فاذالم یدھّن یہاں پر بھی باب افتعال اور ثلاثی مجرد دونوں طرح مروی ہے۔پہلی صورت میں دال مشدد اور دوسری صورت میں غیر مشدد ہوگا۔ رُوی منه جب بال خشک اور پریشان ہوں تو سفید بال نمایاں نظر آتے ہیں بہر حال اس حدیث سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے بالوں میں سفید بال بہت کم تعداد میں تھے۔

(۴) حدّثنا محمّد بن عمر بن الولید الکندیّ الکوفّی أنا یحیی بن ادم عن شریک عن عبداللّٰه بن عمر عن نافع عن ابن عمر قال إنّما کان شیب رسول اللّٰه ﷺ نحوا من عشرین شعرة بیضاء(۱)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے سفید بال تقریباً بیس تھے۔

عن عبداللّٰه بن عمرؒ یہ تبع تابعی ہیں اور مشہور صحابی حضرت ابن عمرؓ کے بھتیجے حفص بن عاصمؒ کے پوتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ: عن ابن عمر بن الخطابؓ یہ مشہور صحابی ہیں۔۔ نبی کریم ﷺ کی بعثت کے کچھ عرصہ بعد پیدا ہوئے نام عبداللہ تھا۔والد کے ساتھ ہجرت کی۔بعض علماء کے خیال میں جنگ احد میں شریک ہوئے جبکہ بعض کے خیال میں جنگ احد میں صغر سنی کی وجہ سے آپ کو شرکت کی اجازت نہیں ملی۔البتہ بعد کے تمام غزوات نیز بیعتِ رضوان میں شریک رہے۔نبی کریم ﷺ سے ایک ہزار چھ سو تین احادیث روایت کی ہیں۔اتباع سنت اور کثرتِ صدقہ کی وجہ سے بہت مشہور تھے ۷۳ھ یا ۷۴ھ میں وفات پائی۔

---

(۱)سنن ابن ماجة ۲۵۸ کتاب اللباس من ترک الخضاب، صحیح ابن حبان۸/ ۷۰باب صفة النبی ﷺ واخباره(مختار)

نحواً من عشرین الخ اس حدیث میں بیس کے قریب بالوں کا ذکر ہے۔اور پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ حضرت انسؓ کی حدیث سے اس کا کوئی تعارض نہیں ہے۔

(۵) حدثنا ابو کریب محمّد بن العلاء أنا معاویة بن هشام عن شیبان عن أبی إسحاق عن عکرمة عن ابن عباس قال قال أبو بکر یا رسول اللّٰہ ﷺ قد شبت قال شیّبتنی هود والواقعة والمرسلات و عم یتساء لون واذا الشّمس کوّرت (۱).

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ تو بوڑھے ہوگئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے سورۃ هود، سورۃ واقعه، سورۃ مرسلات، عمّ یتساء لون اور سورۃ اذا الشّمس کوّرت نے بوڑھا کردیا۔

یا رسول اللّٰہ ﷺ قد شبت حضرت ابوبکر صدیقؓ کو نبی کریم ﷺ سے انتہائی درجہ کا عشق تھا۔ ہر وقت یہ غم ہوتا کہ کہیں جدائی نہ آجائے۔چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب نبی کریم ﷺ کے بالوں میں سفید بال دیکھے۔چہرۂ انور پر کمزوری اور جسمانی قوتوں میں اضمحلال محسوس ہوا تو کہا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ تو بوڑھے ہوگئے ہیں۔

<u>احساس ذمہ داری کی انتہا:</u> شیّبتنی هود نبی کریم ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ مجھے سورۂ هود نے بوڑھا کردیا۔مطلب یہ کہ وحی اور قرآن کے احکام، فریضۂ نبوت کی ذمہ داریوں اور اللہ تعالیٰ کے براہ راست خطاب کے بوجھ اور تقاضوں نے فکرمند کردیا ہے۔کہ یہ ذمہ داریاں پوری بھی ہونگیں یا نہیں اور یہ فرض ادا کرنے کی توفیق بھی ملے گی یا نہیں۔اور فکروں کی زیادتی اور احساس کی دامنگیری بڑھاپے کا سبب بنی۔کیونکہ افکار انسان کو کمزور ولاغر اور بوڑھا کردیتے ہیں۔متنبی کہتا ہے ۔

والهمّ یخترم الجسیم نحافة ولیشیب ناصیة الصبی و یخرم

(۱)مستدرک للحاکم ۳۴۳/۲ کتاب التفسیر تفسیر سورة هود، جامع الترمذی ۱۴۴/۲ کتاب التعبیر باب ومن سورة الواقعه(مختار)

اور قرآن مجید تو ہر قدم پر ذمہ داری کا احساس دلاتا ہے۔ پھر بعض سورتوں میں تو وعیدیں اور جہنم و آخرت کے احوال و شدائد بکثرت مذکور ہیں۔ دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کا یقین اور عالمِ آخرت پر پختہ ایمان سونے پر سہاگہ تھا۔

<u>سورۃ ھود میں استقامت کا حکم:</u> خصوصاً سورۃ ھود کا حکم کہ "فاستقم کما امرت" بہت بھاری حکم تھا کیونکہ اس میں ثابت قدمی اور قواعد و ضوابط کی پابندی کی تاکید ہے۔ ویسے بھی استقامت بڑا مشکل کام ہے۔ اسی لئے تو کہتے ہیں الاستقامة خیر من ألف کرامة استقامت ہزار کرامتوں سے افضل ہے۔ اور یہ اس لئے کہ اس میں تکلیف زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر کوئی شخص ایک دو روز عشاء کے بعد دس گھنٹے تک مطالعہ بھی آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں لیکن اگر وہ عزم کرے کہ وہ ہمیشہ کیلئے عشاء کے بعد صرف ایک گھنٹہ تسلسل اور پابندی سے مطالعہ کرے گا۔ چاہے اس وقت اس کا باپ یا عزیز دوست اس کا منتظر کیوں نہ ہو۔ جلسہ، جلوس یا کوئی دوسرا پروگرام کیوں نہ ہو۔ وہ ایک گھنٹہ ضرور مطالعہ میں صرف کرے گا۔ تو یہ استقامت مشکل کام ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ اس انضباط اوقات اور پابندی میں بڑی کامیابی بھی مضمر ہیں۔

شرح السنة میں لکھا ہے کہ کسی نے نبی کریم ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ اس نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے کہ سورۂ ھود نے مجھے بوڑھا کر دیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس میں ایک آیت ہے۔ کہ واستقم کما امرت کہ استقامت خود بھی مشکل کام ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ امر کے موافق ہونا بھی شرط ہے۔ انسان ہزار بار کوشش کرے۔ لیکن بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کما حقہ نہ ہو سکے۔ خود نبی کریم ﷺ کو بھی اس بات کا اعتراف و احساس تھا۔ چنانچہ فرمایا کرتے تھے کہ ما عبدناک حق عبادتک یعنی اے اللہ ہم نے تیری عبادت کا حق ادا نہیں کیا۔

نبی کریم ﷺ نے اس مقام پر سورۂ ھود کی آیت کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ سورۂ شوریٰ میں بھی بالکل اسی قسم کی آیت موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ فَلِذٰلِکَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ کَمَا اُمِرْتَ ۔ اسی دین کی طرف بلاؤ اور جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ ویسے ثابت قدم رہو۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سورۂ ھود میں

''فاستقم کما امرت'' کے ساتھ ''ومن تاب معک'' کا اضافہ بھی آیا ہے۔یعنی نبی کریم ﷺ کو حکم ہے کہ وہ خود بھی ضوابط کے مطابق رہیں۔اور مومنین کو بھی استقامت پر رکھنا تھا۔نبی کریم ﷺ کو یہ فکر زیادہ دامن گیر تھا کہ میں تو توفیق الٰہی سے استقامت پر رہ سکوں گا۔لیکن امت سے اس میں کوتاہی ہوئی تو اس کا جواب کون دے گا۔اگر اس کا محاسبہ بھی مجھ ہی سے ہوا تو یہ مشکل ہے۔علاوہ ازیں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سب سے پہلے یہ امر سورۃ ہود میں نازل ہوا ہو لہٰذا شوریٰ کے امر کا اعتبار نہیں کیا گیا۔

والواقعة والمرسلٰت:ان تمام سورتوں میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی اصطلاح کے مطابق **تذکیر بآلاء اللّٰہ**، **تذکیر بما بعد الموت** اور **تذکیر بایام اللّٰہ** تینوں مضامین بکثرت آئے ہیں۔

اور بعض روایات میں **سورة الحاقة**، **سورة القارعة** اور **سورة الغاشية** کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ان تمام سورتوں میں قیامت،جہنم اور آخرت کی دہشت اور ھول کا بیان ہے۔

(۲) حدثنا سفیان بن وکیع أنا محمّد بن بشر عن علیّ بن صالح عن أبی إسحاق عن أبی جحیفة قال قالو یا رسول اللّٰہ نراک قد شبت قال شیّبتنی ھو دوا خواتھا (۱).

ترجمہ: حضرت ابو جحیفہؓ کہتے ہیں کہ صحابہؓ نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ بوڑھے ہو چکے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے سورۂ ھود اور اس کے مثل سورتوں نے بوڑھا کر دیا۔

عن أبی حجیفة الخ جحیفہ تصغیر کے وزن پر ہے ان کا نام وھب بن عامر بن صعصعہ سوائی کوفی تھا۔حضرت علیؓ آپؓ سے محبت کرتے تھے اور آپؓ کو وھب الخیر کہا کرتے تھے۔نبی کریم ﷺ کی وفات کے وقت آپؓ نابالغ تھے۔آپؓ سے کل پچاس حدیثیں مروی ہیں ۷۴ھ کو وفات پائی۔

قد شبت الخ. صرف بالوں کی سفیدی مراد نہیں کیونکہ روایات کے مطابق وہ تو برائے نام تھی بلکہ مراد یہ ہے کہ بدن بھاری اور مضمحل ہوگیا ہے اور اُٹھنے کے لئے بھی سہارے کی ضرورت ہوتی تھی۔

---

(۱) الحلیة الاولیاء لابی نعیم ۳۵۰/۴ بطریق آخر (مختار)

شیبتنی ھود الخ. جس میں قیامت وجہنم کے مصائب کا ذکر اور استقامت کا حکم ہے علامہ زمخشری کا بیان ہے کہ ایک شخص نے خواب میں جہنم اور قیامت کا منظر دیکھا۔صبح ہوئی تو راتوں رات سیاہ داڑھی بالکل سفید ہوچکی تھی۔تو نبی کریم ﷺ کو بھی جہنم اور اس کے عذاب پر یقین بلکہ مشاہدہ تھا لہٰذا آپ ﷺ کے بڑھاپے کا سبب بھی عذابوں کا ذکر بن سکتا ہے۔

بعض دیگر روایات میں سورۃواقعۃ، سورۃالحاقۃ، سورۃسائل، سورۃاقتربت الساعۃ کا ذکر بھی آیا ہے جن میں قیامت اور اس کے عذابوں کا امتیازی ذکر ہے(۱)۔

(۷) حدثنا علیّ بن حجر قال أنبانا شعیب بن صفوان عن عبدالملک بن عمیر عن أیاد بن لقیط العجلیّ عن أبی رمثۃ التیمیّ تیم الرّباب قال أتیت النبی ﷺ و معی ابن لی قال فَأُرِیتُہ فقلت لمّا رأیتہ ھذا نبی اللّٰہ وعلیہ ثوبان أخضران ولہ شعر قد علاہ الشیب و شیبہ احمر(۲).

ترجمہ: حضرت ابو رمثہ التیمیؓ فرماتے ہیں کہ میں اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔مجھے نبی کریم ﷺ دکھائے گئے۔میں نے دیکھا تو مجھے بے اختیار فوراً یہ کہنا پڑا کہ واقعی یہ اللہ کے سچے نبی ہیں۔اس وقت نبی کریم ﷺ سبز کپڑوں میں ملبوس تھے۔اور آپ ﷺ کے چند بالوں پر بڑھاپے کے آثار نمایاں ہوگئے تھے۔لیکن وہ سرخ تھے۔

<u>تیم الرِباب:</u> عن أبی رمثۃ التیمیّ تیم الرِباب ۔رمثہ کا راء مکسور ہے۔مشہور صحابی ہیں آپؓ کے نام میں اختلاف ہے۔اس سلسلے میں چار نام خباب(۳)، رفاعہ، جندب، اور خشخاش مروی ہیں۔

---

(۱)اس لئے مفسرین حضرات نے لکھا ہے کہ اخوات سے مراد وہ سورتیں جس میں آخرت کی عذاب، قیامت اور جہنم کے عذاب کا ذکر ہو ماقبل حدیث میں ذکر شدہ سورتوں میں انحصار نہیں۔(مختار)

(۲)ابو داؤد ۲/۲۲۲ کتاب الترجل باب فی الخضاب (مختار)

(۳)علامہ بیجوریؒ نے خباب کی جگہ حیان لکھا ہے(اصلاح الدین)

تیم عرب کا ایک بڑا قبیلہ ہے اس میں پانچ شاخیں ہیں۔ ضبہ، ثور، عکل، تیم اور عدی ان لوگوں نے کسی موقع پر تیل کی تلچھٹ میں ہاتھ ڈبو ڈبو کر آپس میں مدد کی قسمیں کھائیں۔ چونکہ تلچھٹ کو رباب کہتے ہیں اسلئے ان کو تیم الرباب کہا جانے لگا۔ بنو بکر کا بھی ایک قبیلہ تیم ہے جس کو تیم قریش کہتے ہیں اور چونکہ مراد اول الذکر قبیلہ تھا اس لئے التیمی کے بعد تیم الرباب کا لفظ بڑھا دیا۔

فاریته مجہول کا صیغہ ہے غالباً صحابی نے اہل مجلس میں سے کسی سے پوچھا ہو جس کے بعد کسی نے اشارہ کر دیا ہو کہ نبی کریم ﷺ وہ ہیں۔

هذا نبی الله مطلب یہ ہے کہ میں نے جان لیا کہ واقعی یہ شخص اللہ کے نبی ہیں۔ گویا نور نبوت اس قدر واضح تھا کہ دیکھتے ہی یقین ہو گیا۔

وعلیه ثوبان أخضران. یعنی آپ سبز چادروں کا جوڑا زیب تن کئے ہوئے تھے۔

<u>بالوں میں سرخی کیوں تھی:</u> **وله شعر قد علاه الشیب۔ شعرٌ** میں تنوین تقلیل کیلئے ہے یعنی معدودے چند بالوں پر سفیدی چھائی ہوئی تھی۔ **وشیبه احمر** یعنی جن بالوں کا رنگ متغیر ہو چکا تھا۔ وہ سرخ تھے۔ شراح میں سے بعض کا خیال ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خضاب لگایا تھا۔ لیکن یہ مہندی کا سرخی مائل خضاب تھا جبکہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ سرخی خضاب یا مہندی کی سبب نہ تھی بلکہ ذاتی سرخی تھی۔ کیونکہ بال مکمل سفید ہونے سے پہلے سرخ ہو جاتے ہیں۔ تو یہ نبی کریم ﷺ کے بالوں میں سفیدی آنے کی ابتدائی حالت تھی۔

(۸) حدّثنا أحمد بن منیع أنا سریح بن النعمان أنا حمّاد بن سلمة عن سماک بن حرب قال قیل لجابر بن سمرة أمّا کان فی راس رسول الله ﷺ شیب قال لم یکن فی راس رسول الله ﷺ شیب إلاّ شعرات فی مفرق راسه اذا دّهن واَرَاهنّ الدّهن(۱) .

ترجمہ: سماک بن حربؓ کہتے ہیں کہ حضرت جابر بن سمرہؓ سے کسی نے پوچھا کہ کیا نبی کریم ﷺ کے سر کے بالوں میں سفیدی نہیں تھی تو انہوں نے کہا کہ آپ ﷺ کے

---

(۱)المستدرک للحاکم ۲/۶۰۷ باب ذکر خضاب رسول الله ﷺ(مختار)

سر مبارک میں صرف چند بال مانگ پر سفید تھے۔ جب آپ ﷺ تیل لگا لیتے تھے تو تیل ان کو چھپا دیتا تھا۔

إلاشعرات فی مفرق رأسه الخ مانگ پر جہاں بال جدا ہوں کچھ سفید بال تھے مگر یہ بال تھوڑے تھے کیونکہ شعرات کی تنوین تقلیل کے لئے ہیں۔

واراهن الدهن مواراة سے ماضی کا صیغہ ہے۔ چھپانے میں مبالغہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ **فاواری سوۃ اخی** (تا کہ میں اپنے بھائی کی لاش چھپالوں) مطلب یہ کہ بالوں میں تیل لگنے کی وجہ سے چمک آجاتی ہے۔ اور وہ جم جاتے ہیں۔ تو سفید بال بھی غائب ہو جاتے تھے۔

۶۔ باب ما جاء فی خضاب رسول اللّٰہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے خضاب لگانے کے بیان میں

خضاب کا معنی: خضاب لغت میں مایخضب بہ کو کہتے ہیں یعنی وہ چیز جس سے بالوں کو رنگا جاتا ہے اور عموماً وہ مہندی اور کتم ہوا کرتا ہے۔ جس طرح کہ حضرت ابوذرؓ کی ایک حدیث میں اس کی طرف اشارہ ہے فرماتے ہیں۔ أحسن ما غیّر به هذا الشیب الحناء و الکتم(۱)۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خضاب خضب یخضبُ سے مصدر ہے۔ بالوں کو رنگ دینے کے معنی میں مستعمل ہے اور چونکہ دیگر ابواب میں بھی الفاظ مصدری معانی پر محمول ہیں اس لیے اس مقام پر مؤخر الذکر معنی راجح بھی ہے۔ اس باب میں امام ترمذیؒ نے چار احادیث لائے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے خضاب لگایا یا نہیں؟ روایات اس سلسلے میں مختلف ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے خضاب کا استعمال کیا ہے یا نہیں۔ بعض روایات سے اثبات معلوم ہوتا ہے اور بعض روایات سے خضاب لگانے کی نفی ہوتی ہے۔ مسلمؒ اور بخاریؒ کی ایک حدیث میں خضاب کا حکم بھی آتا ہے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ أنّ الیهود و النصاریٰ لا یصبغون فخالفوا هم (۲)۔ کہ بیشک یہود اور نصاریٰ بالوں کو نہیں رنگتے۔ لہٰذا تم ان کی مخالفت کرو۔

ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ أنّ رسول اللّٰہ ﷺ کان یصبغ بالصفرة(۳)۔ اسی طرح اس باب کی دوسری حدیث سے بھی رسول اللہ ﷺ کے عمل کی تصریح موجود ہے۔

جبکہ جامع ترمذیؒ میں امام ترمذیؒ نے کعب بن مرہؓ کی حدیث ذکر کی ہے جس سے خضاب کی مخالفت معلوم ہوتی ہے۔

---

(۱) ابو داؤد جلد ۲ ص ۲۲۲، کتاب الترجل باب فی الخضاب، ترمذی جلد ۱ ص ۲۰۸۔ ابواب اللباس باب ماجاء فی الخضاب ص ۳۰۵ (مختار)

(۲) بخاری جلد ۲ ص ۸۷۵ کتاب اللباس باب الخضاب، ابو داؤد جلد ۲ ص ۲۲۲ کتاب الترجل باب فی الخضاب (مختار)

(۳) بخاری جلد ۲ ص ۸۷۰ باب النعال السبتیّة وغیرها کتاب اللباس (مختار)

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ من شاب شیبة فی الاسلام کانت له نوراً یوم القیامة (۱) جس شخص کے بال اسلام کی حالت میں سفید ہو گئے۔تو یہ سفیدی قیامت کے روز اس کیلئے نور ہو گی۔

اسی طرح حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ أنّ النبیّ ﷺ کان یکره تغییره الشیب (۲)۔ نبی کریم ﷺ سفید بالوں کا رنگ بدلنے کو بُرا مانتے تھے۔

شراح کہتے ہیں کہ امام ترمذیؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خضاب کا استعمال نہیں کیا۔جیسا کہ پہلی حدیث میں امام ترمذیؒ نے اپنی رائے خوب واضح طور پر دیدی ہے۔اور پچھلے باب کی تقریباً تمام احادیث بھی اس کی دلیل ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے خضاب نہیں لگایا۔صحابہ میں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کا خضاب لگانا ثابت ہے۔جبکہ حضرت علیؓ، حضرت سلمة بن الاکوعؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ سے خضاب نہ لگانا ثابت ہے۔

علماء احناف کا بھی اسی طرف میلان ہے۔درمختار میں اس بات کی تصریح ہے کہ وہ روایات زیادہ صحیح ہیں جو نبی کریم ﷺ کے خضاب نہ لگانے پر دلالت کرتی ہیں۔اس کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں مفصل بحث ہم پچھلے باب میں کر چکے ہیں۔اور جن روایات میں خضاب لگانے کا بیان ہے تو ان کا مختلف طریقوں سے جواب دیا جاتا ہے۔

(۱) یہ کہ نبی کریم ﷺ کے بالوں میں سیاہی کے بعد سرخی نمودار ہو چکی تھی۔جس طرح کہ عموماً بالوں میں سفیدی آنے سے قبل سرخی آتی ہے۔اس فطری سرخی کو مجازاً خضاب سے تعبیر کیا گیا تھا۔دراصل یہ خضاب نہ تھا بلکہ وہ ذاتی سرخی تھی جو سفیدی آنے سے قبل بالوں کو لگتی ہے۔اور رأیت شعر رسول الله مخضوباً کا یہی معنی ہے کہ وہ رنگ شدہ دکھائی دے رہے تھے دراصل اس کو خضاب لگا نہ تھا۔

(۲) بعض لوگوں نے اختلاف روایات کو اختلاف اوقات پر حمل کیا ہے۔گویا نبی کریم ﷺ کبھی کبھی خضاب لگاتے تھے لیکن اکثر خضاب نہیں لگاتے تھے۔چنانچہ بعض صحابہ نے خضاب کی حالت میں

---

(۱)جامع ترمذی جلد ۱ ص ۱۹۷ و مثله السنن النسائی ۲/۲۲۵ کتاب اللباس باب فی نتف الشیب، کنز العمال ۱۵/۶۶۶ رقم الحدیث ۴۲۶۴ (مختار)

(۲)و مثله فی السنن النسائی ۲/۲۲۶ کتاب اللباس باب ماجاء فی خضاب السواد (مختار)

آپ ﷺ کو دیکھا اور بعض دوسرے صحابہ نے آپ ﷺ کے خضاب کو نہیں دیکھا تھا۔لہٰذا اس کی خبر دی۔ علامہ ابن حجرؒ نے بھی اس اختلاف کو اختلافِ زمانہ پر حمل کیا ہے۔

(۳) بعض لوگوں نے خضاب نہ لگانے کی تاویل کی ہے وہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اگرچہ بعض اوقات کتم یا مہندی سے خضاب لگایا ہے لیکن وہ دراصل بالوں کو رنگنے کی نیت سے نہ تھی۔ بلکہ بالوں کے آخر عمر تک سیاہ ہونے کے سبب آپ کو تلوین الشعر کی ضرورت ہی پیش نہ آئی اور اگر کبھی نبی کریم ﷺ سے خضاب لگانا ثابت بھی ہے تو وہ گرمی کی شدت کو کم کرنے یا کسی دوسری تکلیف کی وجہ سے بطور دواء آپ ﷺ نے کیا ہے۔جیسا کہ عام طور پر تبرید کے لئے ہاتھ پاؤں پر بھی مہندی لگاتے ہیں۔تو نبی کریم ﷺ نے سردی یا مرض کے علاج اور تداوی کیلئے مہندی لگائی ہوگی۔ بالوں کو رنگنے کی غرض سے نہیں گویا آپ ﷺ نے خضاب کے اصل مقصد سے خضاب نہیں لگایا۔لہٰذا دونوں قسم کی روایات میں کوئی تعارض نہیں۔

بہرحال امام ترمذیؒ کے نزدیک زیادہ راجح یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خضاب استعمال نہیں کیا۔ اور آگے اس کی وجہ کی طرف بھی "لم یبلغ الشیب" میں اشارہ کر دیا کہ آپ ﷺ کے بال سیاہ ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کو خضاب کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی۔

(۱) حدثنا أحمد بن منیع أنا هشيم أنا عبدالملک بن عمير عن أياد بن لقيط قال أخبرني أبو رمثة قال أتيت رسول الله ﷺ مع ابن لي فقال ابنک هذا فقلت نعم اشهدبه قال لايجني عليک و لا تجني عليه قال ورأيت الشيب أحمر قال أبو عيسىٰ هذا أحسن شئ روى في هذا الباب و افسّره لان الروايات الصحيحة اَنّ النبيّ ﷺ لم يبلغ الشيب و أبورمثة إسمه رفاعة بن يثربي التيميّ(۱)۔

ترجمہ: حضرت ابورمثہؓ کہتے ہیں کہ میں اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کیا تیرا بیٹا یہ ہے میں نے کہا۔ہاں

---

(۱)سنن ابی داؤد ۲/۲۲۶ باب الخضاب کتاب الترجل ،سنن نسائی باب الخضاب بالحناء و الکتم کتاب الزینۃ ج۲ ص۲۷۷ (مختار)

یہ میرا بیٹا ہے۔آپ اس کے گواہ رہئے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس کی جنایت کا بدلہ تجھ پر نہیں اور تیری جنایت کا بدلہ اس پر نہیں۔ابو رمثہؓ کہتے ہیں کہ اس وقت میں نے آپ ﷺ کے بعض بالوں کو سرخ دیکھا۔

ابنک هذا الخ یہاں پر ہمزہ استفہام محذوف ہے ابنک مبتدا اور هذا اس کی خبر ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو پہلے سے حضرت ابو رمثہؓ کے بیٹے کے بارے میں اجمالی پتہ چلا ہو۔اب دیکھا تو پوچھا کہ کیا تیرا بیٹا یہی ہے۔اور یہ بھی احتمال ہے کہ ہذا مبتداء مؤخر ہو اور ابنک خبر ہو۔پھر سوال یوں ہوگا کہ کیا یہ تیرا بیٹا ہے۔فقلت نعم اشهد عام شراح کے نزدیک یہ امر کے صیغے سے مروی ہے۔گویا حضرت ابو رمثہؓ نبی کریم ﷺ کو اس بات پر گواہ بنانا چاہتے ہیں کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ تاکہ اگر کبھی کسی ایک کا دوسرے کی جگہ مواخذے کی ضرورت پڑی تو میرا یہ اقرار بالنسب معلوم ہو۔ نبی کریم ﷺ کا جواب بھی اس تشریح سے مناسبت رکھتا ہے۔اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ مضارع سے متکلم کا صیغہ ہو۔اور اخبار ہو۔اس صورت میں یہ نعم کی تاکید ہوگی۔اور مقصود وہی ہوگا کہ جاہلیت کے رسم کے مطابق ہم ایک دوسرے کی جگہ مواخذے کے لئے تیار ہیں۔اور اخبار ہو یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ میرا بیٹا ہے۔

<u>ایک کے بدلے دوسرے کا مؤاخذہ رسم جاہلیت:</u> قال لا یجنی علیک الخ اس جملہ کے تین مطلب بیان کئے جاتے ہیں۔

(۱) اول یہ کہ یہ قول نبی کریم ﷺ کی طرف سے حضرت ابو رمثہؓ کو دعا ہو۔مطلب یہ ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے لئے عافیت و سلامتی کا باعث بنو۔باپ پر بیٹے کی وجہ سے اور بیٹے پر باپ کی وجہ سے جرمانہ نہ آئے۔اللہ تعالیٰ تم میں سے ہر ایک کو جرائم و جنایات سے محفوظ رکھے۔تاکہ وہ دوسرے کے لئے تکلیف اور پریشانی کا سبب نہ بنے۔

(۲) دوم یہ کہ یہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے پیشن گوئی ہے کہ مستقبل میں نہ تم جرم کرو گے۔جس کی سزا تیرا بیٹا بھگتے اور نہ تیرا بیٹا ارتکاب جرم کرے گا کہ جس کی سزا تم کو بھگتنا پڑے۔

(۳) تیسری اور سب سے واضح تشریح یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اس صحابی کے قول سے جاہلیت کے

فرسودہ رسم کی بو آئی۔ وہ یہ کہ دراصل یہ صحابی اپنے نسب پر نبی کریم ﷺ کو اس لئے گواہ بنانا چاہتے تھے کہ اس کا بیٹا آئندہ کیلئے اس سے سرزد جرائم میں اس کی جگہ ماخوذ ہو سکے۔ کیونکہ اس وقت کے رواج کے مطابق باپ جرم کرتا تو بیٹا پکڑا جاتا تھا۔ اور اگر بیٹا جرم کرتا تو باپ پکڑا جاتا۔ باپ کے جرم میں بیٹے کو قتل بھی کیا جاسکتا تھا۔ جیسا کہ بیٹے کے جرم میں باپ کو قتل کیا جاسکتا تھا۔ مالی جرمانوں کی حالت بھی یہی تھی کہ ایک کی جگہ دوسرے سے وصول کئے جاسکتے تھے۔ اسلام نے آکر جاہلیت کی یہ رسم مٹادی۔ دنیا کے معاملات میں بھی یہی حکم ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کیلئے جوابدہ ہے۔ دنیا کا معاملہ ہو یا آخرت کا معاملہ۔ بہر صورت ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہوگا۔ ایک شخص دوسرے کی جگہ ماخوذ نہیں ہوگا۔ اس توجیہ کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے۔ کہ ابو داؤدؒ کی ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابو رمثہؓ کو یہ بھی فرمایا کہ لَاتَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی(۱) کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اور یہی فطری ضابطہ اسلام کا مستقل قانون بن گیا۔ بہر حال نبی کریم ﷺ نے اس صحابی کے اس خیال کی تردید کے لئے یہ جملہ کہا کہ قال ورأیت الشیب أحمر ابو رمثہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے وہ بال جن کا رنگ بدل چکا تھا سرخ دیکھے۔ اس میں دو احتمال ہیں۔ یہ احتمال بھی ہے کہ آپ ﷺ کے بال خلقۃً سرخ تھے۔ اور یہ مصنوعی رنگ نہ تھا۔ بلکہ قدرتی طور پر آپ ﷺ کے بالوں میں سُرخی آگئی تھی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ راوی کا مقصد یہ ہو کہ آپ ﷺ نے خضاب لگا کر بالوں کو سرخ کر دیا تھا۔ مؤخر الذکر احتمال کی تائید حضرت ابو رمثہؓ ہی کی ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں آپ نے تصریح فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حنا اور کتم سے خضاب لگایا کرتے تھے (۲)۔ دونوں صورتوں میں تطبیق کی تفصیل ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔

امام ترمذیؒ نے یہی حدیث پچھلے باب میں بھی ذکر کی ہے۔ اور اس باب میں بھی لے آئے۔ اس کی توجیہ بعض لوگوں نے یہ کی ہے کہ پچھلے باب میں اس حدیث کا مطلب یہ تھا کہ حضرت ابو رمثہؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے بالوں کو متغیر دیکھا تھا۔ جو کہ سیاہی سے سرخ رنگ کیطرف مائل ہو چکے تھے۔ وہاں خضاب لگانے یا نہ لگانے کی بات مقصود نہیں جبکہ یہاں حضرت ابو رمثہؓ کے قول کا مطلب یہ ہوگا کہ

---

(۱) جمع الوسائل جلد ۱ ص ۱۱۶ اور ص ۱۱۹

(۲) عن ابی رمثۃ قال کان رسول اللہ ﷺ یخضب بالحناء والکتم (کتاب الوفاء لابن الجوزی)(مختار)

آپ ﷺ کے بالوں کے رنگ کا سرخ ہونا خضاب کی وجہ سے تھا۔ جس طرح کہ ہم پہلے اس کیلئے مؤید بھی لا چکے ہیں اور امام ترمذیؒ کا حدیث کو اس باب میں ذکر کرنا بھی اس کی دلیل ہے۔

قال ابو عیسیٰ هذا احسن شئی الخ. امام ترمذی کہتے ہیں کہ خضاب کے اثبات کے باب میں جو احادیث مروی ہیں ان سب میں راجح اور واضح ترین حدیث یہی ہے کیونکہ دوسری صحیح روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے خضاب نہیں لگایا۔ کیونکہ آپ ﷺ کو اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اس کا یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ امام ترمذیؒ کے ہاں دوسری احادیث صحیحہ کو ملحوظ رکھ کر اس حدیث میں تاویل کی جائے گی۔ کہ خلقی سرخی کو دیکھ کر حضرت ابو رمثہؓ کو خضاب کا شبہ ہوا۔ گویا راجح یہ ہے کہ آپ ﷺ نے خضاب کبھی نہیں لگایا(۱)۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دوسری صحیح احادیث کے اس جملے کا مقصد کہ ''ان النبی ﷺ لم یبلغ الشیب '' کا معنی یہ لیا جائے کہ آپ ﷺ کے سفید بال بہت کم تعداد میں تھے اور یہ بات خضاب لگانے کے منافی نہیں ہے۔

اور اگر یہ مان لیا جائے تو پھر امام ترمذیؒ کا مقصد یہ ہوگا کہ نبی کریم ﷺ نے خضاب استعمال فرمایا تھا۔ البتہ بالوں کو رنگنے کی ضرورت پیش نظر نہیں بلکہ کسی اور مقصد کے لئے ہوگا۔ جیسے کہ پہلے گزر چکا ہے۔

---

(۱) اور یہی رائے علماء احناف کی ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی خضاب نہیں لگایا تھا وہ قدرتی سرخ تھے۔ **والأصحّ أنّه عليه السلام لم يفعله قال ابن عابدين فانّه لم يحتج إليه لأنّه توفي ولم يبلغ شيبه عشرين شعرة في رأسه ولحيته بل كان سبع عشرة كما في البخاري وغيره** (ردالمحتار ۶/۴۲۲) اگرچہ علامہ زبیدی حنفیؒ نے شرح احیاء میں لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بعض مواقع پر خضاب کا استعمال فرمایا ہے اور یہی مختار ہے (اتحاف السادۃ المتقین) اور یہی بات علامہ بیجوریؒ نے بھی لکھی ہے۔ البتہ حضرات صحابہ کرام سے مثلاً ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ وغیرہ نے سفید بالوں پر خضاب لگائے ہیں۔ اس لئے علماء احناف کے ہاں بغیر لڑائی کے بھی خضاب لگانا نہ صرف جائز ہے بلکہ مستحب ہے۔ **ويستحب للرجل خضاب شعره ولحيته ولو في غير حرب في الاصح وقال ابن عابدين أن ابابكرؓ خضب بالحناء والكتم** (ردالمحتار و درمختار ۶/۴۲۲)(مختار)

اور شوافع کے ہاں سیاہ خضاب کے علاوہ دوسرے خضاب لگانا سنت ہے اور سیاہ خضاب حرام ہے۔ علامہ بیجوریؒ فرماتے ہیں **وهو عندنا معاشر الشافعية بغير السواد سنة وبالسواد حرام يدل لنا ما في الصحيحين لما جئ بأبي قحافة يوم الفتح للنبيّ ﷺ ولحيته ورأسه كالثغامة بياضاً فقال غيّروا هذا الشيب واجتبوا السواد** (المواهب اللدنية ص ۵۰)(مختار)

لان الروایات الخ یہ دراصل ماسبق کی علت نہیں بن سکتا بلکہ یہاں معلول محذوف ہوگا۔ خلاصۂ عبارت یہ ہوگا کہ یہ حدیث احسن اور زیادہ واضح تو ہے لیکن اس کے مقابلے میں زیادہ صحیح روایات خضاب کی عدم ضرورت پر دلالت کرتی ہیں۔ لہٰذا مقصد کے لحاظ سے یہ اصح نہیں ہے۔ علامہ بیجوریؒ نے تقدیر عبارت یہ نکالی ہے کہ "ھذا أحسن شئی روی فی ھذا الباب و افسر وانّما لم یکن صحیحا لانّ الرویات الخ"(۱)

وأبو رمثة إسمه الخ امام ترمذیؒ صحابی کا تعارف کراتے ہیں لیکن ان کے نام میں اختلاف منقول ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے تفصیل سے عرض کر چکے ہیں۔

(۲) حدّثناسفیٰن بن وکیع قال أنا أبی عن شریک عن عثمان ابن موھب قال سئل أبو ھریرة ھل خضب رسول اللہ ﷺ قال نعم قال أبو عیسیٰ وروی أبو عوانة ھذا الحدیث عن عثمان بن عبداللہ ابن موھب فقال عن أمّ سلمة(۲).

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے پوچھا گیا کہ کیا نبی کریم ﷺ خضاب لگایا کرتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ ہاں۔ ھل خضب رسول اللہ کا سائل غیر معلوم ہے لیکن عثمان بن عبداللہ بن موہب تیمی کی ملاقات حضرت ابو ہریرہؓ سے ثابت ہے۔ قال نعم اس میں نبی کریم ﷺ کے خضاب لگانے کی تصریح ہے۔ گویا کبھی کبھی آپ ﷺ نے خضاب لگایا تھا۔ لیکن یہ بال رنگنے کے لئے نہ تھا کیونکہ آپ ﷺ کے بالوں میں معدودے چند بال سفید تھے۔ بلکہ شاید دوسرے اغراض سے آپ ﷺ نے خضاب استعمال فرمایا تھا۔

---

(۱)المواھب اللدنیة ص ۵۹

(۲)صحیح البخاری جلدثانی کتاب اللباس باب الخضاب ص۸۷۵،وابن ماجه کتاب اللباس باب الخضاب ص۲۵۸ (مختار)

قال ابو عیسیٰ (۱) **وروی أبو عوانة الخ** اس سند کے لحاظ سے یہ حدیث حضرت ابو ہریرہؓ کی جگہ حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے۔ امام ترمذیؒ کی غرض یا تو پہلے سند کی تقویت اور اثبات ہے۔ اور یا اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مذکورہ سند میں شریک کو وہم ہوا ہے۔ جبکہ حقیقت میں یہ حدیث ابو ہریرہؓ کی بجائے حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے۔ ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ "**بل لم یر دعن ابی هريرة فی هذا الباب شئی فدلّ علی أنّ مراد المصنف با یراد طریق ابی عوانة الاشارة إلیٰ أنّ روایة شریک شاذة بل منکرة**"۔ نیز اس طریق کے بیان میں یہ فائدہ بھی حاصل ہوا کہ موہب عثمان کے دادا کا نام ہے والد کا نہیں۔

(۳) حدثنا إبراهيم بن هارون قال أنبانا النضربن زرارة عن أبی جناب عن أياد بن لقيط عن الجهذمة امراة بشير بن الخصاصية قالت أنا رأيت رسول اللّه ﷺ يخرج من بيته ينفض راسه وقد اغتسل وبراسه ردع او قال ردغ من حناء شک فی هذا الشيخ(۲).

ترجمہ: بشیر بن الخصاصیہ کی بیوی جہذمہؓ سے روایت ہے۔ فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو مکان سے باہر تشریف لاتے ہوئے دیکھا کہ آپ ﷺ نے غسل فرمایا تھا چنانچہ آپ ﷺ سر مبارک کے بال جھاڑ رہے تھے اور آپ ﷺ کے سر پر حنا کا اثر تھا۔

جهذمة رضی اللّه عنها: الجهذمة جلیل القدر صحابیہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کا نام تبدیل کر کے لیلیٰ رکھا تھا۔ جبکہ ان کے خاوند کا نام زحم تھا۔ اسے بھی رسول اللہ ﷺ نے بدل کر بشیر نام رکھ دیا تھا۔ ابن الخصاصیہ علانیہ کے وزن پر یہ کبشہ نامی عورت کا لقب ہے جو کہ بشیر کے جدات میں سے ہے اور خصاصۃ بن عمرو بن کعب کی طرف منسوب ہے۔

---

(۱) **قال ابو عیسیٰ** میں دو احتمال ہیں (۱) یہ تلامذہ کا اضافہ ہے (۲) مصنف کا اپنا کلام ہے۔ اس لئے کہ آپؒ کی کنیت آپ کے اسم (نام) پر غالب ہے۔ علامہ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے **بناء علی غلبة کنيته علی اسمه وهو فی ذلک تبع لشيخه ومقتداه وهو الإمام أبو عبدالله محمّد بن إسماعيل البخاریّ حيث عبّر فی صحيحه وسائر تصانيفه ايضاً عن نفسه بأبی عبدالله** (جمع الوسائل ۱۱۹/۱) (مختار)

(۲) **تفرد به الامام الترمذی بهذا الحديث**

برأسه ردع: علامہ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ ردع کے معنی رنگ کے ہوتے ہیں۔ جبکہ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ کے نزدیک ورس یا زعفران سے لتھیڑنے کو کہتے ہیں۔ یعنی زعفران کو پانی میں ملا کر گھاڑا کیا گیا تھا اور اسے سر مبارک پر مہندی کی طرح لگایا تھا۔

جبکہ دوسرے محققین کہتے ہیں کہ ردع خود زعفران کو کہتے ہیں۔ تو گویا نبی کریم ﷺ نے سر پر مہندی کی طرح لگایا تھا۔ او قال ردغ امام ترمذیؒ کے استاد ابراہیم بن ہارون کو شک ہوا ہے کہ نضرؒ نے ردع کہا تھا یا ردغ۔ ردغ اور ردغۃ کیچڑ کو کہتے ہیں لیکن مجازاً اس سے مراد زعفران ہی ہوگا جسے کیچڑ کی طرح گاڑھا بنا کر سر پر لگایا گیا تھا۔ بعض نسخوں میں او ردغ من حناءٍ مذکور ہے۔ بہر حال پہلی روایت راجح ہے۔

(۴) حدثنا عبداللّٰہ بن عبدالرحمٰن أنا عمرو بن عاصم أنا حمّاد بن سلمة أنا حميد عن أنس قال رأيت شعر رسول الله ﷺ مخضوباً قال حمّاد و أخبرنا عبداللّٰه بن محمّد بن عقيل قال رأيت شعر رسول الله ﷺ عندأنس بن مالک مخضوبا(۱)

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے بالوں کو خضاب لگا ہوا دیکھا۔

رأيت شعر الخ اس سے قبل خود انسؓ سے نبی کریم ﷺ سے خضاب کی نفی منقول تھی۔ لہٰذا اس حدیث کے بارے میں یہی کہا جائے گا کہ بعض احوال میں نبی کریم ﷺ نے خضاب لگایا بھی تھا۔ جبکہ اکثر نہیں لگاتے تھے۔ یا پھر خلقۃ سرخی کو خضاب کہا گیا ہے۔ گویا کہ کلام تشبیہ پر مبنی ہوگا۔ تقدیر یہ ہوگی کہ رأيت شعر رسول الله أحمر كالمخضوب.

قال حمّاد و أخبرنا عبدالله الخ پچھلی سند میں مذکور حماد بن سلمہ ہی مراد ہیں۔ وہ اپنے استاد عبداللہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت انسؓ کے ہاں نبی کریم ﷺ کے خضاب لگائے بال دیکھے۔

<u>تبرکات نبوی ﷺ سے عشق:</u> عند أنس مخضوباً حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے سر مبارک کے بال مونڈھ لئے تھے اور بال صحابہؓ میں تقسیم فرمائے تھے۔ اب بھی اگر کہیں وہ موجود

(۱) تفرد به الامام الترمذی بهذا الحدیث

ہوں تو اگر چہ ثبوت قطعی نہ بھی ہو۔لیکن محض نسبت کی وجہ سے بھی ہمارے لئے قابل احترام اور واجب التعظیم ہیں۔اور کچھ بعید بھی نہیں کہ یقیناً وہ موجود ہوں ۔ کیونکہ صحابہ آپ ﷺ کے تبرکات کی حفاظت کا اہتمام بھی فرماتے تھے۔حضرت امیر معاویہؓ نے آپ ﷺ کا ایک کٹورا کئی لاکھ درہم میں خرید ا تھا۔اسی طرح کئی لاکھ درہم دے کر آپ ﷺ کے ناخن مبارک خرید لئے تھے۔اور مرتے وقت وصیت فرمائی تھی کہ مجھے دفن کرتے وقت یہ ناخن میری آنکھوں میں ڈال دو۔صحابہؓ کے عشق کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے وضوء کا پانی بلکہ تھوک بھی زمین پر گرنے نہیں دیتے تھے۔حضرت انسؓ تو آپ ﷺ کے خاص خادم تھے۔ان کے پاس نبی کریم ﷺ کے بال موجود تھے اور تابعین گاہے گاہے ان کی زیارت سے مشرف ہوتے تھے۔

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کے خضاب لگانے کا ذکر نہیں۔ہاں بالوں کا ذکر ہے کہ وہ رنگے ہوئے معلوم ہورہے تھے۔شاید یہ وہی قدرتی سرخی ہو جو سفیدی آنے سے قبل بالوں میں لگتی ہے۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خضاب سے ان کا رنگ بدلا ہو۔بعض شراح نے یہ احتمال بھی لکھا ہے کہ حضرت انسؓ نے رسول اللہ ﷺ کی موت کے بعد از خود بالوں پر مہندی یا کتم لگائی ہو کہ یہ تادیر محفوظ رہیں۔ بہر حال اس روایت سے رسول اللہ ﷺ کا خضاب لگانا یقینی طور پر معلوم نہیں ہوتا۔

۷. باب ما جاء فی کحل رسول اللہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے سرمہ لگانے کے بیان میں

زینت، تطیب اور تطہر کے سلسلہ ابواب میں ترجل اور خضاب کے بعد سرمہ کے استعمال کا باب منعقد کر رہے ہیں۔ پچھلے باب سے مناسبت یوں ہے کہ پچھلے باب میں تلوین شعر سے بحث کی۔ اس باب میں تلوین العیون سے بحث ہو رہی ہے۔ سرمہ کا استعمال تزین کیلئے بھی ہوتا ہے اور دوا کے طور پر استشفاء کیلئے بھی سرمہ کا استعمال مروج ہے۔ اس باب میں مصنفؒ نبی کریم ﷺ کے زیر استعمال سرمہ کی ماہیت اور کیفیت استعمال کے بارے میں احادیث لاتے ہیں۔ کحل فتح کاف سے ہو تو مصدر ہے۔ آنکھوں میں سرمہ ڈالنے کو کہتے ہیں اور ضم کاف سے **کل ما یوضع فی العین** کو کہتے ہیں۔ یعنی ہر اس چیز کا نام ہے جو کہ آنکھوں میں ڈالی جاتی ہے۔

<u>سرمہ کا حکم اور فوائد:</u> سرمہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا قول و عمل اس بات پر دلیل ہے کہ یہ جائز ہے۔ لیکن چونکہ یہ تزئین اور دوا دونوں کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور دونوں منافع دنیوی سے ہیں۔ اس لئے علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ سرمہ کے استعمال کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا امر ندب اور ارشاد پر محمول ہوگا(۱)۔ جبکہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سرمہ اور خصوصاً اثمد لگانا سنت (۲) ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے اسکے بارے میں امر کے علاوہ آپ ﷺ کی مواظبت بھی مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس جو اسکندرانی ڈبہ

---

(۱) علامہ مرغینانی فرماتے ہیں ولا بأس بالاکتحال للرجال اذا قصد به التداوی دون الزینة (الهدایة ۱/۲۰۳ کتاب الصوم باب یوجب القضاء الخ) اور اسی کے تحت مولانا عبدالحی لکنویؒ نے لکھا ہے قوله بالاکتحال الخ قال الأترازیّ یعنی اکتحال الرجل بالکحل الأسود مباح إذا قصد به الدواء فأمّا الزینة فلا قال العینی معترضاً علیه لاأدری مافائدة تقیید الکحل الاسود (باب مایوجب القضاء الخ الهدایة ۱/۲۰۳) فإنّ الکحل لایکون إلاالأسود أقول لیس کذلک فإنّ الکحل یکون أسود وأبیض وأحمر وقد شاهدنا هذه الأقسام فأمّا الأحمر والأبیض فلیسا للزینة وإنّما هو الأسود فلذا قیّد الأترازی به یتعلق قوله اذا لم یکن من قصده الزینة لأنّ غیر الأسود ینفع العین وغیره فهو کان دواء الرمد وغیره ولیس للزینة اه

(حاشیة الهدایة ۱/۲۰۳ کتاب الصوم باب مایوجب القضاء والکفارہ(مختار)

(۲) والاکتحال عندنا معاشر الشافعیة سنةٌ للاحادیث الواردة فیه۱۲ المواهب اللدنیه ۱۲ مختار)

تھا اس میں شیشہ، ہاتھی دانت کی کنگھی، قینچی اور مسواک کے علاوہ سرمہ دانی بھی تھی۔امام مالکؒ اسے امراض میں دواء کے طور پر مردوں کیلئے جائز سمجھتے ہیں۔البتہ زینت کیلئے سرمہ کا استعمال ان کے ہاں مکروہ ہے۔ لیکن علامہ ابن عربیؒ کہتے ہیں کہ زینت کے لئے بھی ہو تب بھی یہ ممنوع تصنع کے زمرہ میں نہیں آتا۔بہر حال سنت کی نیت سے یا آنکھوں کی حفاظت کے لئے سرمہ کا استعمال بالاتفاق جائز بلکہ مندوب ہے۔

(۱) حدّثنا محمّد بن حمید الرازیّ أنبانا أبو داؤد الطیالسیّ عن عبّاد بن منصور عن عکرمة عن ابن عباسؓ أنّ النبیﷺ قال اکتحلوا بالاثمد فانّہ یجلو البصر وینبت الشعر وزعم أنّ النبیّﷺ کانت له مکحلة یکتحل منها کل لیلة ثلاثة فی ھذہ وثلاثة فی ھذہ(۱).

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے۔فرماتے ہیں کہ نبی کریمﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اثمد کا سرمہ آنکھوں میں ڈالا کرو۔اس لئے کہ وہ نظر کو تیز کرتا ہے۔ اور پلکیں بھی زیادہ اُگاتا ہے نیز ان کو یقین تھا کہ نبی کریمﷺ کے پاس ایک سرمہ دانی تھی جس سے دونوں آنکھوں میں ہر رات تین تین سلائی کا سرمہ لگایا کرتے تھے۔

اکتحلوا بالاثمد: یہاں امر ندب اور استحباب کے لئے ہے۔وجوب کے لئے نہیں ہے۔اثمد میں دو لغت ہیں اول ہمزہ اور میم دونوں کے کسرہ کے ساتھ دوسرا ہمزہ کے کسرہ اور میم کے ضمہ کے ساتھ۔

اثمد کیا ہے؟ اثمد شراح کے اقوال کے مطابق سرخی مائل سیاہ سرمہ ہوتا ہے بعض اسے اصفہانی سرمہ کہتے ہیں اور بعض توتیا(۲) بتاتے ہیں۔طبی لحاظ سے نبی کریمﷺ نے کئی باتوں کی نشاندہی کی ہے۔اس

---

(۱) جامع ترمذی جلد۷ ص ۳۰۵، کتاب اللباس باب ماجاء فی الاکتحال جلد ۱ ص ۳۰۵، سنن ابن ماجۃ ص ۲۵۰، کتاب الطب باب من الکتحل ص ۲۵۰، وتراً شرح السنة للبغوی کتاب اللباس باب الاکتحال ۱۲/ ۱۱۶ (مختار)

(۲) علامہ ذہبیؒ اثمد کے بارے میں فرماتے ہیں اثمد الکحل الأصبھانیّ بارد یا بس یقویّ عصب العین و یحفظ صحتھا وقولهٗ إنّ خیرا کحالکم الاثمدای فی حفظ صحتھا لا فی أمراضھا(الطب النبوی علی ھامش تسھیل المنافع ص ۴۰)(مختار) صاحب منجد نے انتیمو ان کو اثمد بتایا ہے جس کا کیمیکل کوڈ (SB) ہے۔(اصلاح الدین)

سلسلے میں امام ترمذیؒ مستقل ابواب بھی لائے ہیں۔آنکھوں کے بارے میں بھی نبی کریم ﷺ نے متعدد قسم کے علاج بتائے ہیں۔

آج تک حکماء اور ڈاکٹر بڑی تحقیق کے بعد نبی کریم ﷺ کے اقوال کی تائید کرتے ہیں۔اور قیامت تک کرتے رہیں گے۔اثمد بھی آنکھوں کی حفاظت اور تقویت کیلئے ایک مفید سرمہ ہے۔بالخصوص جب اس میں مشک کی تھوڑی مقدار ملا دی جائے۔آنکھوں کے امراض میں یہ مضر بھی ہوسکتا ہے۔اس لئے نبی کریم ﷺ نے اگرچہ آنکھوں کی بیماریوں کے دیگر متعدد علاج بتائے ہیں لیکن بیمار آنکھوں کو اثمد کا محل استعمال نہیں بتایا کیونکہ یہ تندرست آنکھوں کے لئے مفید ہے(۱)۔

فإنّه یجلّوا البصر یعنی آنکھوں کے نور کو بڑھاتا ہے۔ **ویُنبتُ الشعو** شعر سے پلکیں مراد ہیں جن کے بڑھانے کے لئے اثمد مفید ہے۔

زعَم کی حقیقت اور مراد: **زعَم** یعنی ابن عباسؓ کا زعم تھا۔زعم گمان کے معنی میں آتا ہے لیکن اس مقام پر قول محقق مراد ہے یعنی ابن عباسؓ یقین کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک سرمہ دانی رکھی تھی۔

آج کل تو گمان اور زعم جھوٹ تراشنے کا بہانہ ہے۔اخبار والے ہر قسم کا جھوٹ چھاپ کر قانون سے بچنے کیلئے، خیال کیا جاتا ہے اور گمان کیا جاتا ہے کے الفاظ لکھ دیتے ہیں۔لوگ بھی آپس میں باتیں کرتے ہوئے جھوٹ بولنے کے لئے ان جملوں سے مدد لیتے ہیں۔اسی لئے تو حدیث میں آیا ہے کہ **بئس مطیّة الرجال زعموا** یعنی **زعموا** کا کلمہ آدمی کیلئے بری سواری ہے۔

حدیث میں قول محقق مراد ہے۔محض احتیاط کیلئے جزمی بات کو زعم کہا ہے۔بعض شراح نے زعم کا فاعل ترمذی کا شیخ محمد بن حمیدؒ بتایا ہے۔علامہ مناویؒ نے اسے ترجیح دی ہے۔مگر علامہ بیجوریؒ اور دیگر شراح

(۱) اور خصوصاً بچوں اور عمر رسیدہ افراد کیلئے زیادہ مفید ہے۔رات کے وقت سرمہ لگانے سے یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ سرمہ اچھی طرح آنکھوں کے کونوں میں سرایت کر جاتا ہے اور دیر تک آنکھوں میں باقی رہتا ہے جو طبی لحاظ سے مفید ہے۔

(جمع الوسائل ۱/۷۲ اختیار)

زعم کوحضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب کرتے ہیں(۱)۔

مکحلة ضم میم کے ساتھ سرمہ دانی کو کہتے ہیں۔قیاساً میم کا کسرہ ہونا چاہیے تھا۔خلاف القیاس ضمہ آیا ہے۔

کل لیلة نبی کریم ﷺ رات کوسرمہ استعمال کرتے تھے۔جس میں حکمت یہ ہے کہ رات کوآدمی سوتا ہے تو سرمہ آنکھوں میں خوب نفوذ کرتا ہے۔اور گندہ مواد بھی باہرلا کرزیادہ فائدہ دیتا ہے۔جبکہ دن کو آنکھیں کھلے رہنے اور بار بار دھونے کی وجہ سے سرمہ آنکھوں میں سرائیت نہیں کرسکتا۔

<u>سرمہ کے استعمال کا طریقہ</u>: **ثلاثة فی هذه وثلاثة فی هذه** ہرایک آنکھ میں حسب روایت تین تین دفعہ سرمہ لگایا ہے۔اس طرح ہرآنکھ میں طاق دفعہ سرمہ ڈالا ہے۔جس کا حکم نبی کریم ﷺ نے ایک اور حدیث میں بھی دیا ہے فرماتے ہیں کہ **من اکتحل فلیوتر**(۲)۔جوشخص سرمہ لگائے تو طاق مرتبہ لگائے۔

بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ دائیں آنکھ میں تین دفعہ اور بائیں میں دودفعہ سرمہ لگانا چاہیے۔

طبرانیؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے نبی کریم ﷺ کے سرمہ لگانے کا یہی طریقہ نقل کیا ہے تاکہ دائیں آنکھ سے یہ عمل شروع ہواوراسی پرختم بھی ہو۔اسی صورت میں **ایتار من حیث المجموع** آیا ہے۔بہرحال سرمہ لگانے میں ایتار مستحب ہے۔فرداًفرداًہویا **من حیث المجموع** لیکن علامہ ابن حجرؒ نے قولِ اوّل کوترجیح دی ہے۔یعنی پہلے دائیں آنکھ میں تین بارسرمہ ڈالے اور پھر بائیں آنکھ میں تین بار

(۱)اب سوال یہ ہے کہ جب **قال** کا فاعل بھی عبداللہ بن عباسؓ ہیں اور **زعم** کا فاعل بھی آپؓ ہی ہیں تو پھر وہاں **قال** اور یہاں **زعم** کوکیوں استعمال کیا گیا ہے؟<u>ازالہ</u> اس اشکال اور شبہ کا جواب بعض حضرات نے یہ دیا ہے کہ **قال** اور **زعم** کا فاعل اگرچہ عبداللہ بن عباسؓ ہی ہے مگر دونوں کا معنی الگ الگ ہے۔یعنی یہاں عبداللہ بن عباسؓ کوکچھ معمولی ساشک وشبہ ہواہوگا۔اس لئے آپؓ نے یہاں **زعم** کالفظ استعمال کیا۔جبکہ بعض اہل علم نے یہ جواب دیا ہے کہ یہاں عبداللہ بن عباسؓ کی قولی حدیث وفعلی حدیث دونوں ذکر ہیں اسلئے دونوں میں امتیاز پیدا کرنے کیلئے قال اورزعم کے الفاظ استعمال کئے گئے۔**ایماء الی أنّ الاوّل حدیث مرفوع والثانی موقوف اوالاوّل قولی والثانی فعلی**(جمع الوسائل ۱/۱۲۶)(مختار)

(۲)ابن ماجة ۲۵۰ ابواب الطب باب من اکتحل وتراً (مختار)

ڈالے۔مذکورہ حدیث میں بھی اسی طرف اشارہ ملتا ہے(۱)۔

(۲) حدّثنا عبداللّٰہ بن الصبّاح الهاشمی البصریّ انا عبیداللّٰہ ابن موسیٰ أنا إسرائیل عن عبّاد بن منصور ح و حدّثنا علیّ بن حجر ثنا یزید بن هارون أنبانا عبّاد بن منصور عن عکرمة عن ابن عباسؓ قال کان النّبیّ ﷺ یکتحل قبل ان ینام بالاثمد ثلاثا فی کل عین وقال یزید بن هارون فی حدیثه أنّ النّبیّ ﷺ کانت له مکحلة یکتحل منها عند النوم ثلاثا فی کل عین(۲)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سونے سے قبل ہر آنکھ میں اثمد کے سرمہ سے تین سلائی سرمہ ڈالا کرتے تھے۔ اور یزید بن ہارونؒ اسی حدیث میں (حضرت عبداللہ بن عباسؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک سرمہ دانی تھی جس سے سونے کے وقت تین تین سلائی آنکھ میں ڈالا کرتے تھے۔

<u>تحویل کی حقیقت اوراس مقام پراس کی ضرورت:</u> **ح و حدّثنا تحویل من اسناد الی آخر** کامخفف ہے مصنفؒ جب دوسری سند بیان کرتا ہے اور متن ایک ہو تو صرف سند لاتا ہے اور ''ح'' کے حرف سے تحویل سند پر تنبیہ کرتا ہے۔

اس باب کی پہلی حدیث میں حضرت ابن عباسؓ کی حدیث دو واسطوں سے امام ترمذیؒ عباد بن منصورؒ سے روایت کرتے ہیں۔اس لحاظ سے پہلی سند عالی اور دوسری سند سافل معلوم ہوتی ہیں لیکن ملا علی

---

(۱)اور ایک صورت یہ بھی ہے کہ ہر آنکھ میں دو دو سلائی ڈالیں اور پھر ایک سلائی دونوں آنکھوں میں ڈالیں۔ملا علی قاریؒ نے فرمایا ہے کہ پہلا طریقہ راجح ہے **وأرجحها الاوّل لحصول الوتر شفعاًمع انّه یتوصّل ان یکتحل فی کل عین واحدة ثم وثم ویؤل امره الی الوترین بالنسبة إلی العضوین.(جمع الوسائل ۱/۱۲۷)(مختار)**

(۲)شرح السنة ۱۲/۱۱۷ باب الاکتحال کتاب اللباس المعجم الکبیر للطبرانی ۱۱۹/۳(مختار)

قاریؒ کہتے ہیں کہ معنوی اعتبار سے پہلی سند کی نسبت دوسری سند قوی ہے۔کیونکہ محمد بن حمید الرازی کو بعض محدثین ضعیف کہتے ہیں جبکہ عبداللہ بن الصباح قوی رواي ہے۔اسی لئے اول الذکر سے شیخین روایت نہیں کرتے جبکہ مؤخر الذکر شیخین کے راوی ہیں۔اور شاید تقویت کے حصول کیلئے مصنفؒ نے تحویل کے ذریعے اس سند کو عالی کردیا ہے۔سند کے علاوہ متن کے الفاظ میں جو اختلاف ہے وہ خود امام ترمذی بیان کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک وہ صحت اسناد کی علامت ہے۔اور''صح هذا الاسناد' 'یا''هذا الاسناد صحيح '' سے کنایہ ہےاور تیسرا قول اس میں اہل مغرب کا ہےوہ کہتے ہیں کہ یہ''الحدیث'' سے مخفف ہے۔جبکہ بعض لوگ اسے حیلولۃ یا حائل سے عبارت سمجھتے ہیں۔لیکن سب سے پہلا قول سب سے راجح ہے۔اس کلمہ پر تلفظ میں بھی اختلاف ہے۔بعض کے خیال میں اس پر تلفظ نہیں ہوتا بعض لوگ اس کی جگہ''الحدیث'' کا لفظ بولتے ہیں۔لیکن جمہور کے نزدیک راجح یہ ہے کہ اس کلمہ کو اسی طرح ادا کیا جائے گا جس طرح یہ لکھا جاتا ہے یعنی''حاء'' بولا جائے گا۔

وقال يزيد بن هارون: پہلی سند کی خصوصیت کا بیان ہے۔اس میں سابق حدیث کی تائید بھی ہوتی ہیں اور اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ وہاں زعم سے گمان نہیں بلکہ قول محقق مراد ہے۔کیونکہ یہاں مقصود یہ ہے کہ یزید بن ہارونؒ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے جو روایت کرتے ہیں اس میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک سرمہ دانی تھی جس سے سوتے وقت تین تین سلائی ہر آنکھ میں ڈالا کرتے تھے۔نیز اس میں اس بات پر بھی تنبیہ ہے کہ اسرائیل اور یزید کی روایتوں میں معنوی اتحاد ہے لیکن لفظی مغائرت ہے۔

(۳) حدّثنا أحمد بن منيع أنبانا محمّد بن يزيد عن محمّد ابن إسحاق عن محمّدابن المنكدر عن جابر قال قال رسول الله ﷺ عليكم بالإثمد عندالنوم فانّه يجلو البصر و ينبت الشعر(١).

ترجمہ: حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اثمد کا سرمہ نیند سے

---

(١)شرح السنة للبغوى ١٢/١١٧ كتاب اللباس باب الاكتحال (مختار)

پہلے آنکھوں میں ضرور ڈالا کرو۔ کیونکہ یہ نظر کو بھی روشن کرتا ہے اور پلکیں بھی خوب اُگاتا ہے۔

بشر بن الفضل: یہ مشہور زاہد و عابد ولی تھے۔ چار سو رکعات نفل ہر رات پڑھتے تھے اور صوم داؤدی علیہ السلام بھی معمول تھا۔

تصحیح نیت: **عند النوم** یعنی نیند سے قبل اثمد کا سرمہ لگایا کرو۔ یہ حکم تندرست آنکھوں کے لئے ہے۔ بیمار آنکھوں کے لئے اثمد مضر بھی ہوسکتا ہے۔ اور اس حدیث میں اس پر تنبیہ ہے کہ سرمہ کا اصل مذکورہ دو امور ہیں اور اسی نیت سے استعمال ہونا چاہیے۔ اگر چہ زینت بھی ضمناً حاصل ہوگی بلکہ رات کے وقت استعمال میں شاید تزئین سے اجتناب کی جہت بھی ملحوظ ہے۔

(۴) حدثنا قتيبة بن سعيد قال أنا بشر بن المفضّل عن عبدالله ابن عثمان بن خثيم عن سعيد بن جبير عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ إنّ خير اكحالكم الاثمد يجلو البصر و ينبت الشعر(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے سرموں میں سے اثمد بہترین سرمہ ہے۔ یہ نظر کو تیز کرتا ہے اور پلکیں خوب اُگاتا ہے۔

إنّ خير اكحالكم الخ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی پہلی روایت اور اس روایت میں معنوی لحاظ سے مناسبت خوب واضح ہے۔

(۵) حدثنا إبراهيم بن المستمر البصريّ ثنا أبو عاصم عن عثمان ابن عبدالملك عن سالم عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ عليكم بالاثمد فإنّه يجلو البصر و ينبت الشعر(۲).

---

(۱) سنن نسائی ص ۲۸۱/۲، كتاب الزينة باب الكحل، سنن ابن ماجة ۲۵۰، كتاب اللب باب الكحل بالاثمد المستدرک للحاكم ۴۰۸/۴ (مختار)

(۲) ابن ماجة ص ۲۵۰ كتاب الطب باب الكحل بالاثمد (مختار)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم اثمد کا سرمہ ضرور استعمال کیا کرو۔ کیونکہ یہ آنکھوں کے نور کو تیز کرتا ہے(۱) اور پلکیں خوب اُگاتا ہے۔

مصنفؒ نے اس حدیث کو متعدد اسانید کے ساتھ مکرر اس لئے ذکر کیا کہ اس طرح مذکورہ حدیث کو تقویت ملتی ہے۔

سُرمہ اور جدید سائنس:

(۱) جدید سائنس نے بھی سرمہ لگانے کے بہت سارے فوائد بیان کئے ہیں مثلاً

(۱) سرمہ میں اعلیٰ درجہ کا دافع تعفن یعنی انٹی سیپٹک (Anti Septic) ہوتا ہے۔

(۲) سرمہ سے آنکھوں کے اوپر پھنسی انفکشن (Lead Infection) اور ککرے بالکل نہیں ہوتے۔

(۳) سورج کی تیز شعاعیں آنکھوں کی پتلی (Reting) کو نقصان نہیں پہونچا سکتیں۔

(۴) آشوب چشم کیلئے سرمہ لگانا بہت ہی زیادہ مفید ہے۔

(۵) ان امراض سے اللہ تعالیٰ حفاظت رکھتے ہیں جو لاعلاج سمجھے جاتے ہیں۔

(۶) آنکھوں کے زخم پر خراش اور سوزش کیلئے سرمہ بہت مفید ہے نیز یہ کہ ہر قسم کے چھوٹے جراثیم Contafious germs کو ختم کر دیتا ہے۔ (آفتاب نبوت کی کرنیں ص ۱۸۴)(مختار)

۸. باب ماجاء فی لباس رسول اللہ ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے لباس کا بیان

لباس "مـا یـلبسه الانسان" کو کہتے ہیں۔پردہ، تن بدن اور سر یا پاؤں کو چھپانے کیلئے جو قمیض، شلوار، چادر، جبہ اور واسکٹ وغیرہ پہنے جاتے ہیں سب لباس ہیں۔اسے ملبس اور لبوس بھی کہتے ہیں۔

ایک چیز کو دوسری چیز میں لپیٹنے کو لبـس کہا جاتا ہے جس سے تلبیس بنا ہے۔لباس سے بھی انسان کے ظاہری اعضاء چھپ جاتے ہیں۔جسمانی عیوب بھی مثلاً داغ، دھبے، سفیدی اور سیاہی وغیرہ مستور ہو جاتے ہیں۔ماقبل ابواب سے مناسبت یہ ہے کہ اس سے قبل مختلف قسم کی زینتوں کا بیان تھا اور لباس بھی بدن کیلئے زینت ہے۔خود اللہ تعالیٰ نے اس کی تعبیر زینت کے لفظ سے کی ہے۔اس سے پردہ پوشی ہوتی ہے اور اس کے بغیر انسان حیوانات سے بھی زیادہ قبیح المنظر دکھائی دیتا ہے۔اسلئے زینت کے ابواب کے سیاق میں لباس کے باب کا بیان زیادہ مناسب ہے۔

نبی کریم ﷺ نے جو کچھ بھی پہنا تھا امام ترمذیؒ اس باب میں بیان فرمائیں گے اگر چہ وہ محض اتفاقاً اور صرف ایک بار کیوں نہ ہو۔اس سلسلے میں امام ترمذیؒ سولہ احادیث لائے ہیں۔

<u>لباس کا حکم:</u> لباس کے پہننے کے مختلف احکام ہیں(۱) کبھی کبھی یہ واجب ہوتا ہے۔مثلاً مرد کیلئے ناف سے گھٹنوں تک اور عورت کا سوائے بعض اعضاء کے تمام بدن کو ڈھانپنے کے لئے کپڑا پہننا واجب ہے۔(۲) کبھی کبھی یہ مندوب ہوتا ہے۔مثلاً سفید کپڑے، عید و جمعہ کیلئے بہترین کپڑے اور عمامہ پہننا مستحب ہے(۳) بعض صورتوں میں لباس حرام بھی ہوتا ہے مثلاً مردوں کیلئے ریشمی لباس پہننا(۴) کبھی کبھی یہ مکروہ بھی ہوتا ہے۔مثلاً مرد کے لئے ایسا لباس جو ٹخنوں سے نیچے ہو، پہننا۔اور غنی کے لئے دائماً بوسیدہ لباس پہننا جس میں وہ محتاج نظر آئے(۵) ان کے علاوہ عام طور پر جو لباس پہنے جاتے ہیں وہ مباح ہیں(۱)۔

---

(۱) حضرت عمرؓ کا فرمان ہے کہ دو قسم کی لباس سے پرہیز کرو(۱) شہرت کے لباس سے(۲) حقارت کے لباس سے(مختار)

لباس میں نبی کریم ﷺ کا معمول: نبی کریم ﷺ نے دیگر امور کی طرح لباس میں بھی اعتدال کو معمول بنایا تھا۔ نہ زیادہ مشہور اور بیش قیمت لباس کے استعمال کی عادت تھی۔ نہ نہایت گرا ہوا اور حقیر کپڑا پہنتے تھے۔ عموماً قیمتی کپڑا ہاتھ لگتا تو ایثار کر کے احباب کو دے دیتے تھے۔ ایک عظیم سلطنت کے امیر ہونے کے باوجود بھی آپ ﷺ کی زندگی فقر سے زیادہ قریب تھی۔ لباس فاخرہ سے احتراز کرتے تھے۔ اور یہی رنگ آپ ﷺ کے صحابہؓ میں بھی پایا جاتا ہے۔

(۱) حدثنا محمّد بن حميد الرازیّ أنبانا الفضل بن موسیٰ وأبو تميلة وزيد بن حباب عن عبدالمؤمن بن خالد عن عبداللّٰه بن بريدة عن أمّ سلمة قالت كان احبّ الثياب إلیٰ رسول اللّٰه ﷺ القميص(۱)

ترجمہ: حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کو قمیص سب کپڑوں سے زیادہ پسندیدہ لباس تھا۔

أمّ سلمةؓ: عن أمّ سلمة ام المؤمنین ام سلمہؓ کا نام ھند بنت حذیفۃ تھا۔ ان کا بنو مخزوم سے تعلق تھا۔ حضرت ابو سلمہؓ کی وفات کے بعد نبی کریم ﷺ کے نکاح میں آئیں۔ حضرت ابو سلمہؓ کی معیت میں حبشہ کی طرف سب سے پہلے ہجرت آپؓ نے کی۔ رسول اللہ ﷺ کی ۳۷۸ احادیث آپؓ کے واسطہ سے مروی ہیں۔ ۶۲ھ میں وفات پائیں اور امہات المؤمنین میں سب سے آخری موت آپ کی واقع ہوئی۔ آپؓ سے پے در پے تین احادیث مروی ہیں۔

احبّ الثياب ... القميص: قمیص کی تعریف کرتے ہوئے شراح کہتے ہیں کہ ھو اسم لما يلبس من المخيط له كمّان وجيب ولا يكون من صوف. یعنی قمیص پہننے کے لئے سلا ہوا کپڑا ہوتا ہے جس کے دو آستین ہوں اور ایک گریبان لیکن وہ اون کا نہ ہو۔ بلکہ روئی کا کتان کا ہو۔ یہ نام یا تو تقمص سے ماخوذ ہے جس کے معنی تقلب یعنی بدلنا ہے۔ کیونکہ انسان اس میں ایک جگہ سے دوسری جگہ

(۱) سنن ابی داؤد ج۲ ص ۲۰۲، کتاب اللباس باب ماجاء فی القمیص ج۲ ص ۲۰۲، سنن نسائی ج۲ ص ۲۰۲، کتاب الزينة، ابن ماجة ص ۲۵۵ کتاب اللباس باب لبس المقيص (مختار)

کو منتقل ہوتا رہتا ہے۔ نیز قمیص اچھلنے کودنے کو بھی کہتے ہیں اور قمیص بھی جسم کی حرکت کے ساتھ حرکت کرتی ہے۔ یا پھر یہ لفظ **قمیص الجنین** اور **قمیص القلب** سے ماخوذ ہے جن کے معنی بچے کے اوپر کی جھلی اور دل کے غلاف کے ہوتے ہیں۔ قمیص بھی بدن پر جھلی کی طرح محیط ہوتی ہے۔ آپ ﷺ کی قمیص کی ساخت کے بارے میں کچھ باتیں اگلی حدیثوں میں آئیں گی۔ لیکن مذکورۃ الصدر تینوں حدیثوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قمیص آپ ﷺ کا محبوب ترین لباس تھا۔

__قمیص کی پسندیدگی کی وجہ:__ اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں ستر بدن اچھی طرح اور آسانی سے ہوسکتا ہے۔ اسے پہن کر آدمی بے فکر ہو جاتا ہے جبکہ رداء وغیرہ کو باندھنا پڑتا ہے۔ نیز ہوا، بارش اور چلنے پھرنے سے اس کے کھلنے اور گرنے کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔ اور اگرچہ بالائی بدن کی ستر ضروری نہیں پھر بھی گرمی اور سردی کی تکلیف تو ہوتی ہے۔ اس کے برعکس قمیص میں انسان گرمی اور سردی سے محفوظ رہتا ہے۔ نیز اگر ازار کھل جائے تو بھی قمیص ستر عورت کیلئے کافی ہوتی ہے۔ اس کا استعمال بھی دوسرے لباسوں کی نسبت آسان ہے اور بعض لوگوں کے ہاں اس میں تکبر سے بھی آدمی محفوظ ہوتا ہے۔ ان امور کے ساتھ ساتھ عرب کی قدیم تاریخ بھی قمیص سے مربوط ہے قرآن نے حضرت یوسفؑ کی زبان سے یہ بھی کہا ہے کہ **اذهبوا بقميصي هذا فالقوه علی وجه ابي** میری قمیص لے کر میرے باپ کے چہرے پر ڈالنا

مفسرین کے ہاں یہ قمیص حضرت یوسفؑ کے اجداد کی قمیص تھی۔ جو ان کو والد کی طرف سے ملی تھی آج کل بھی عرب کے قومی لباس میں ایک لمبے قمیص کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ آپ ﷺ کی قمیص کی تفصیل دوسری کتابوں میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ کا ایک کرتا تھا، یا متعدد۔ حضرت عائشہؓ آپ ﷺ کی وفات کے بعد ایک ایک کر کے قمیص نکالتی تھی اور صحابہؓ کو بتاتی تھیں کہ یہ نبی کریم ﷺ کی قمیص تھی۔

(۲) حدثنا عليّ بن حجر ثنا الفضل بن موسیٰ عن عبدالمؤمن ابن خالد عن عبدالله ابن بريدة عن أمّ سلمة قالت كان أحبّ الثياب إلیٰ رسول الله ﷺ القميص (۱)

---

(۱) جامع ترمذی ج ۲ ص ۲۲۵ کتاب اللباس (مختار)

ترجمہ: حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سب کپڑوں میں قمیص کو زیادہ پسند کرتے تھے۔

حدّثنا عليّ الخ: یہ حدیث پہلے حدیث سے متن میں مختلف نہیں ہے البتہ سند دوسری ہے لیکن اس سند میں بھی عبداللہ بن بریدہ کی ماں کا ذکر نہیں جس کا ذکر اگلی سند میں ہے۔ نبی کریم ﷺ کی قمیص کے بارے میں جو روایات مذکور ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوتی کپڑے سے بنا ہوتا تھا۔ زیادہ لمبا نہیں تھا آستینیں بھی لمبی نہیں تھیں کشادہ بھی تھا(۱)۔

(۳) حدّثنا زياد بن أيوب البغداديّ ثنا أبو تميلة عن عبدالمؤمن ابن خالد عن عبدالله بن بريدة عن أمّه عن أمّ سلمة قالت كان أحبّ الثياب إلىٰ رسول الله ﷺ يلبسه القميص قال أبو عيسىٰ هكذا قال زياد بن ايوب في حديثه عن عبدالله بن بريدة عن امّه عن امّ سلمة وهكذا روى غير واحد عن أبي تميلة مثل رواية زياد بن ايوب وابو تميلة يزيد في هذا الحديث عن امه وهو أصحّ (۲).

ترجمہ: حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو پہننے کے لئے سب کپڑوں میں کرتہ زیادہ پسند تھا۔

قال أبو عيسىٰ الخ: مصنف کی غرض اس عبارت سے آخری سند کی ترجیح ہے۔ گویا یہ روایت پہلی دوروایتوں کی نسبت اصح ہے۔ کیونکہ سابقہ دوروایتوں کی سندوں میں عبداللہ بن بریدہ کی ماں کا ذکر نہیں ہے جبکہ زیاد بن ایوب کے واسطے سے ابوتمیلہ کی سند میں یہ کمی پوری کی گئی ہے۔ اور زیاد بن ایوب اس زیادۃ میں منفرد بھی نہیں بلکہ امام ترمذیؒ کے بقول یہ زیادۃ اس کے کئی دیگر شیوخ سے بھی ثابت ہے۔

---

(۱) علامہ عراقیؒ نے فرمایا ہے کہ کُرتا پہننا مندوب ومستحب ہے اس لئے کہ آنحضرت ﷺ کو پسندیدہ تھا اور یہ اس لئے کہ اس میں ستر پوشی زیادہ ہے۔ ملاعلی قاریؒ نے فرمایا ہے کہ کُرتا بدن پر ہلکا ہوتا ہے اور اس میں تواضع بھی ہوتی ہے۔ (جمع الوسائل ار۱۰۷)(مختار)

(۲) جامع ترمذی ج ۲ ص ۲۵ ۷ کتاب اللباس (مختار)

وھو اصح: اس میں دواحتمال ہیں۔ایک یہ کہ یہ ابوتمیلہ کا قول ہواوراس کی زیادۃ کا حصہ ہو یعنی ابوتمیلہ نے "عن امہ وھواصح" کی زیادت کی ہواور دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ امام ترمذیؒ کا قول ہو پھر معنیٰ یہ ہوتا کہ ابوتمیلہ نے عن امہ کا اضافہ سند میں ذکر کیا ہے اورامام ترمذیؒ نے اسی وجہ سے ابوتمیلہ کی اس روایت کو اصح کہا ہے علاوہ ازیں اس روایت کے متن میں "یلبسہ" کا لفظ بھی زائد مذکور ہے جو کہ دوسری رواتیوں میں نہیں ہے۔

(۴) **حدثنا عبداللّٰہ بن محمّد بن الحجاج ثنا معاذ بن هشام حدثني أبي عن بديل العقيلي عن شهر بن حوشب عن أسماء بنت يزيد قالت كان كم قميص رسول الله ﷺ إلىٰ الرسغ**(۱)۔

ترجمہ:اسماء بنت یزیدؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی قمیص کی آستین پہونچے تک ہوتی تھی۔

أسماء بنت يزيدؓ: عن أسماء بنت يزيدؓ، علامہ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ یہ یزید بن سکن انصاریؒ کی بیٹی اور حضرت معاذ جبلؓ کی پھوپھی زاد بہن ہیں۔ بہت دلیر صحابیہ تھی۔ یرموک کی لڑائی میں خیمہ کا بانس لے کر نو رومی فوجیوں کو ہلاک کر ڈالا۔علامہ بیجوریؒ کہتے ہیں کہ کچھ اورلوگوں کو بھی نقصان پہنچایا۔ نبی کریم ﷺ سے اکیاسی احادیث روایت کرچکی ہیں۔

آستینوں کی لمبائی اوراختلاف کی توجیہات: الی الرسغ کلائی کے جوڑ کو کہتے ہیں۔اورایک روایت میں کلائی تک قمیص کی آستینوں کا بیان ہے جبکہ بعض روایات میں اسفل من الرسغ کا لفظ آتا ہے۔ بلکہ بعض میں یہ بھی آیا ہے کہ ان الكُمّ كان يصل إلىٰ الأصابع یعنی آستین انگلیوں تک پہنچتی تھی۔ بظاہر یہ تعارض معلوم ہوتا ہے۔

(۱) لیکن اس کا جواب ممکن ہے کیونکہ یہ تعدّد اقمصہ پر حمل ہے،یعنی آپ ﷺ کی متعدد قمیصیں تھیں جن میں سے اکثر قمیصوں کی آستینیں کلائی تک ہوتی تھیں جبکہ بعض کی اس سے لمبی بھی ہوا کرتی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس بادشاہوں اور امراء کی طرف سے بطور ہدیہ لباس بھی آیا کرتے تھے۔اس لئے

---

(۱)سنن ابی داؤد ج۲ص۲۰۳،کتاب اللباس ماجاء فی القمیص، جامع ترمذی کتاب اللباس ج۲ص۲۵۷باب ماجاء فی القمیص(مختار)

قیصوں کا تعدد محتمل ہے۔اوران کی آستینوں میں بھی اختلاف ہوسکتا ہے۔

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ کلائی تک کا قول تخمین واندزاہ پر مبنی ہے۔آستینیں اس سے لمبی یا چھوٹی بھی ہوسکتی ہیں۔جیسا بعض جبوں کی آستینیں بہت لمبی ہوا کرتی ہیں۔

(۳) تیسرا جواب یہ ہے کہ آستینیں کلائی تک ہوتی تھیں اور سفر کی حالت میں ایسی قمیص ہوتی تھی کہ آستینوں سے ہاتھ چھپ جاتے تھے تاکہ گرمی اور سردی سے حفاظت ہوسکے۔

(۴) چوتھا جواب یہ ہے کہ شاید جب پہلی دفعہ قمیص نئی نئی پہنی ہوتو آستینیں لمبی ہوں بعد میں دھونے کی وجہ سے یہ چھوٹی ہوچکی ہوں جس طرح کہ سوتی کپڑے میں ہوتا رہتا ہے۔

(۵) پانچواں جواب یہ ہے کہ یہ اختلاف ہاتھ کی وضع پر مبنی ہے۔کبھی ہاتھ لمبا ہوتا تھا تو آستین کلائی تک پہنچتی تھی اوراگر ہاتھوں کو کھینچ لیتے تھے تو آستین لمبی ہوکر سارا ہاتھ ڈھانپ لیتی تھی۔

(۶) چھٹا جواب یہ کہ وضوء وغیرہ سے جب آستین کا کپڑا گیلا ہوجاتا تھا تو سکڑ جاتا تھا اور کلائی تک پہنچ جاتا تھا۔ورنہ عام حالت میں یہ قدرے لمبا ہوتا تھا۔بہرحال یہ اختلاف زیادہ اہم اختلاف نہیں۔

(۵) حدثنا ابو عمّار الحسین بن حریث انا أبو نعیم انا زهیر عن عروة بن عبدالله بن قشیر عن معاویة بن قرّة عن أبیه قال أتیت رسول الله ﷺ فی رهط من مزینة لنبایعه وإنّ قمیصه لمطلق اوقال زر قمیصه مطلق قال فادخلت یدی فی جیب قمیصه فمسست الخاتم(۱)

ترجمہ: قرۃ بن ایاسؓ سے روایت ہےانہوں نے فرمایا کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں قبیلہ مزینہ کی ایک جماعت کے ساتھ حاضر ہوا تاکہ ہم آپ ﷺ سے بیعت کریں۔آپ ﷺ کی قمیص کھلی ہوئی تھی (یایوں کہا کہ) آپ ﷺ کی قمیص کی گھنڈی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے آپ ﷺ کے گریبان کے اندر ہاتھ ڈالا اور(تبرکاً)مہر نبوت کو چھوا۔

(۱)سنن ابی داؤد ج۲ص ۲۰۹باب ماجاء فی حل الازار، ابن ماجه ص ۲۵۶ کتاب اللباس باب حل الازار(مختار)

عن ابیه حضرت معاویہؓ کے والد کا نام قرۃ بن ایاس بن ہلال مزنی ہے۔مشہور صحابی ہیں ۶۴ھ کو بصرہ میں وفات پائی۔

رھط: **فی رھط الخ** رھط میں ہاء کا سکون اور فتحہ دونوں صحیح ہیں۔تین سے دس تک آدمیوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔بشرطیہ کہ ان میں عورت نہ ہو۔بعض کے مطابق چالیس تک کے مردوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔اسلام لانے کی غرض سے مزینہ قبیلہ کے چارسوافراد وفد کی صورت میں نبی کریم ﷺ کے پاس آئے تھے۔لہٰذا ان پر رھط کا اطلاق یا تو مجازاً ہے یا پھر سارے کے سارے نبی کریم ﷺ کے پاس یکجا نہیں آئے تھے بلکہ مجلس میں حاضر ہوتے وقت چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ گئے تھے۔

وإنّ قمیصه لمطلق او قال زر قمیصه لمطلق: امام ترمذیؒ کے استاد کو شک ہے کہ راوی نے زر یعنی گھنڈی کا لفظ ذکر کیا تھا یا نہیں۔یہاں مطلب یہ ہے کہ بٹن بند نہ تھے۔گریبان کھلا ہوا تھا(۱)۔عظیم ذمہ داریوں کے فکر کے سبب اتنا خیال نہ رہا کہ بٹن بند کئے جائیں۔گویا مقصد سے عشق اور لگاؤ یا کیفیت جذب ومحبت نے گریبان بند کرنے کا موقع نہ دیا۔ویسے بھی نبی کریم ﷺ کو تکلف کے ساتھ بیٹھنے کی عادت نہ تھی(۲)۔

---

(۱) یہ آنحضرت ﷺ کی سنت مستمرہ نہ تھی بلکہ کبھی آپ ﷺ کے قمیص کے بٹن کبھی بند رہتے تھے تو کبھی کھلے رہتے تھے چونکہ آپ ﷺ سادہ اور بے تکلف زندگی بسر کرتے تھے۔اس لئے کبھی کھلے گریبان بھی اپنے ساتھیوں میں بیٹھتے تھے۔مگر اس وقت گریبان کھلا رکھنا بدمعاش، اور آوارہ لوگوں کا شعار بن چکا ہے۔اور ہمارے معاشرے میں کھلے گریبان کو خلاف مروت سمجھا جاتا ہے۔اس لئے اس زمانہ میں کھلے گریبان سے پرہیز کرنا ہی مناسب ہے اور ویسے بھی بند گریبان سنت ہے۔(مختار)

مرد اور عورت کے گریبان میں فرق: علامہ ابن نجیمؒ نے لکھا ہے مرد کے کرتے کو قمیص اور عورت کے کرتے کو درع کہا جاتا ہے کیونکہ مرد کے قمیص کا گریبان سینے پر ہوتا ہے اور عورتوں کے کرتے کا گریبان ستر کی وجہ سے جنگی زرہ کی طرح مونڈھے پر ہوتا ہے۔(البحر الرائق ۲/۱۷۶)(مختار)

(۲) حضرت عروہؒ جو اس حدیث کو معاویہ بن قرہؓ سے روایت کرتے ہیں۔فرماتے ہیں کہ میں نے معاویہؓ اور اس کے باپ قرہؓ کو جس موسم میں بھی دیکھا۔ان کے گریبان کھلے رہتے تھے یہ عشق ومحبت کی انتہاء ہے کیونکہ محبوب کی ہر ادا محبوب ہوتی ہے ایک عربی شاعر کہتا ہے کہ **وکل ما یفعل الحبیب حبیب** (اصلاح الدین)

ہمارے شیخ الشیوخ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ اکثر یہ شعر گنگناتے تھے جس میں اس صورتحال کی طرف اشارہ ہے ؎

ہم نے تو اپنے آپ گریبان کیا ہے چاک اس کو سیا، سیا، نہ سیا پھر کسی کو کیا؟

ادخلت یدی فی جیبہ الخ مہر نبوت کی شہرت اور کچھ اپنی تجسس کی وجہ سے گریبان سے ہاتھ اندر داخل کیا یا پھر تبرک یا مزید طمانیت اور علامت حقانیت کے مشاہدے کے لئے ہاتھ ڈالا(۱)۔ یہاں جیب سے گریبان مراد ہے اور آج کل کا مروج گریبان سامنے یا اس کے ایک طرف یا پھر پیچھے کی طرف ہوتا ہے لیکن اس جگہ شراح کے نزدیک وہی گریبان مراد ہے جو سینے پر ہوتا ہے۔

(۲) حدّثنا عبد بن حمید ثنا محمّد بن الفضل أنا حمّاد بن سلمة عن حبیب بن الشهید عن الحسن عن أنس بن مالک أنّ النبی ﷺ خرج و هو متّکی علی أسامة بن زید علیه ثوب قطری قد توشّح به فصلّی بهم و قال عبد بن حمید قال محمّد بن الفضل سألنی یحیٰ ابن معین عن هذا الحدیث اوّل ماجلس إلیّ فقلت ثنا حمّاد بن سلمة فقال لو کان من کتابک فقمت لاخرج کتابی فقبض علی ثوبی ثمّ قال امله علیّ فانّی أخاف ان لاّ ألقاک قال فاملیته علیه ثمّ اخرجت کتابی فقرأت علیه(۲) .

خرج و هویتکئی علی اسامةؓ یعنی بوجہ ضعف آپ ﷺ نے گھر سے نکلتے ہوئے حضرت اسامہؓ پر ہاتھ رکھ کر ان کا سہارا لیا تھا یہ مرض الوفات کا واقعہ ہے کیونکہ دوسری روایات میں تصریح

(۱) شرعی مسئلہ یہ ہے کہ کسی کے گریبان میں ہاتھ ڈالنا بغیر اجازت کے جائز نہیں۔ اور یہاں حدیث پاک میں آنحضرت ﷺ کے گریبان میں ہاتھ ڈالنے کی اجازت کا ذکر بھی نہیں۔ تو ایک صحابیؓ رسول ﷺ نے کیسے اس بے ادبی کا ارتکاب کیا تو اس شبہ کا ازالہ یہ ہے کہ کسی صحابیؓ سے بے ادبی کی توقع بھی ممکن نہیں۔ لازماً انہوں نے آپ ﷺ سے اجازت طلب کی ہوگی۔ اور آپ ﷺ نے اجازت دی ہوگی۔ یا آنحضرت ﷺ اس کے انداز سے سمجھ چکے ہوں گے۔ تو آپ ﷺ نے خود بخود اجازت مرحمت فرمائی ہوگی۔ (مختار)

(۲) جامع الترمذی ج ۲ ص ۲۵۷ کتاب اللباس باب ماجاء فی القمیص (مختار)

ہے کہ مرض وفات میں آپ ﷺ فضل بن عباسؓ اور اسامہ بن زیدؓ پر تکیہ کر کے گھر سے نکلتے تھے۔

اور ممکن ہے کہ کوئی دوسرا مرض ہو۔ قطریؒ قاف کی مکسور اور طاء کو ساکن پڑھا جاتا ہے۔ یہ بیش قیمت چادریں ہوتی تھیں جن کی نسبت علاقہ کی طرح کی جاتی تھی۔ یعنی قطر اور اس کے قرب و جوار میں یہ کپڑا اپنایا جاتا تھا۔ اور ان میں سرخ لکیریں ہوتی تھیں۔ **قدتو شّح بہ:** آپ ﷺ نے چادریں کندھوں کے اوپر ڈال کر دونوں طرف لٹکائی تھی جیسے ہار گلے میں ڈالا جاتا ہے۔ یا پھر توشح اضطباع مراد ہے یعنی جس طرح محرم دائیں بغل کے نیچے سے چادر کا ایک طرف نکال کر بائیں کندھے پر ڈالتا ہے۔ لیکن عام طور پر شراح پہلا معنیٰ لیتے ہیں۔ اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قمیص کے علاوہ دوسرے کپڑے بھی بطور تزین یا گرمی سردی سے بچنے کے لئے کبھی کبھی استعمال فرمائے ہیں۔ **فصلّی بھم** اگر یہ مرض الموت کا واقعہ ہو تو پھر معنیٰ یہ ہوگا کہ **فصلّی معھم** یعنی نبی کریم ﷺ نے صحابہؓ کے ساتھ نماز پڑھی۔ کیونکہ روایات کے مطابق آپ ﷺ نے مرض الوفات میں صحابہؓ کے ساتھ جو نماز پڑھی تھی اس میں آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو پیچھے آنے سے منع فرمایا تھا اور امامت ان ہی سے کروائی تھی۔

<u>یحییٰ بن معینؒ اور حرص طلب علم</u>: **قال محمد بن فضل سالنی یحیٰ بن معینؒ۔** یحییٰ عظیم محدث، اور جرح و تعدیل کے امام ہیں۔ حفاظ حدیث میں بڑا درجہ رکھتے تھے۔ لاکھوں احادیث یاد تھیں دس لاکھ تو اپنے ہاتھ سے لکھی تھی امام احمدؒ فرماتے ہیں **کل حدیث لا یعرفہ یحیٰ فلیس بحدیث** یحییٰ کو جو حدیث معلوم نہ ہو وہ حدیث ہی نہیں۔ نیز فرمایا کہ **السماع من یحیٰ شفاء لما فی الصدور** یحییٰ سے حدیث سننا دل کا علاج ہے۔

<u>۲۳۸ھ</u> کو مدینہ میں وفات پائی۔ اور نبی کریم ﷺ کو جس تختہ پر غسل دیا گیا تھا اسی پر آپ کو بھی غسل دیا گیا۔ ان کے استاد محمد بن فضل فرماتے ہیں کہ یحییٰ پہلی دفعہ آ کر میری مجلس میں بیٹھے۔ تو اس حدیث کے بارے میں پوچھا۔ دراصل یہ لوگ مسند کو متصل کرنے کے لیے مشقتیں برداشت کرتے۔ اور بڑے بڑے سفر کیا کرتے تھے۔ کبھی تو متعدد طرق سے حدیث معلوم بھی ہوتی۔ لیکن کسی اچھے شیخ سے سماع مقصود ہوتا یا پھر سند کے اختصار کی غرض سے اتنے لمبے سفروں کا اہتمام کیا جاتا۔ آج کل کی طرح احادیث کا تیار

مجموعہ ملنے کا رواج نہ تھا بلکہ بعض اوقات تو محض ایک حدیث کے لئے ہزاروں میل کا فاصلہ طے کیا جاتا تھا۔ایک شخص مدینہ سے شام تک کا سفر کرتا ہے میزبان اس کی آمد سے خوش ہوتا ہے لیکن مہمان بیٹھتا بھی نہیں۔حدیث کھڑے کھڑے بیان کرنے کا مطالبہ کرتا ہے اور حدیث سننے کے بعد واپس ہوجاتا ہے۔یحیٰ بن معینؒ کو بھی حدیث معلوم تھی لیکن صرف سند کے اتصال کی خاطر محمد بن فضلؒ کے پاس آئے تھے۔

لو کان من کتابک: یحیٰ بن معینؒ کو استاد کے حافظہ پر اعتماد ہے اور حافظہ سے حدیث سنانا جائز ہے۔لیکن احتیاط اس میں تھی کہ کتاب سے پڑھے تاکہ خطا کا احتمال ہی نہ ہو۔اس لئے انہوں نے استاد کو کتاب سے حدیث بیان کرنے کا التماس کیا۔

فقبض علی ثوبی. محمد بن فضلؒ کہتے ہیں کہ جب میں اٹھنے لگا کہ کتاب لاؤں تو یحیٰؒ نے مجھے پکڑا کہ حدیث کا معاملہ ہے اور غم عشق است وہزار بدگمانی۔

اس لئے درخواست کی کہ کتاب لانے سے پہلے حدیث بیان کرہی دیں۔کیونکہ ممکن ہے کہ یہاں سے نکلتے ہی ہم دونوں میں کسی کی موت آئے اور حدیث سننے سنانے کا موقع نہ ملے۔اس لئے علم کی عظیم نعمت سے محرومی سے بچنے کی خاطر پہلے زبانی حدیث بیان کردیں۔چنانچہ انہوں نے پہلے زبانی بیان کرنے کے بعد کتاب لاکر دوبارہ کتاب سے بھی بیان کی۔

<u>اسلاف اور وقت کی قدر و قیمت کی چند مثالیں:</u> شمائل ترمذی میں تحصیل علم کے سلسلے میں کوشش، تڑپ اور جذبہ عشق سے بھرپور اس مقام پر جب بھی میں نے غور کیا۔تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ موت کے ڈر سے بھی حدیث کا درس ضائع نہیں ہونے دیتے۔کتنی نزاکت سے اہتمام ہے تحصیل علم کا۔اس کے برعکس ہمارے اوقات کس طرح ضائع ہوتے ہیں اور ہمیں احساس تک نہیں ہوتا۔طلبہ فضول مشاغل کے لئے درس حدیث کو قربان کرتے ہیں۔ہمارے اسلاف کو وقت کے لحاظ کا شدت سے احساس تھا۔

غالباً حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ میری زندگی میں روٹی کھانے اور قضائے حاجت کے اوقات میرے ہاتھ سے فضول نکل گئے ہیں۔جن میں علم کے مشغلہ سے کٹ جاتا ہوں۔وہ طبعی ضروریات پر بھی وقت لگانے کے لئے کف افسوس ملتے ہیں۔

امام ابو یوسفؒ کا مشہور واقعہ ہے۔ حضرت ابراہیم بن الجراحؒ کی روایت ہے کہ امام یوسفؒ بیمار ہوئے تو میں ان کی عیادت کیلئے حاضر ہوا۔ تو سکرات الموت کی حالت تھی آپ بیہوش تھے۔ کچھ افاقہ ہوا تو نزع کی حالت ہی میں مجھ سے دریافت فرمایا کہ ابراہیم بتاؤ رمی جمار پیدل کرنا افضل ہے یا سوار ہو کر۔ ہمیں سخت تعجب ہوا کہ حالت نزع میں بھی علم سے یہ شغف ہے۔ میں نے منع کیا تو انہوں نے فرمایا کہ بتاؤ کہ میں اس مسئلہ میں عالم مروں یہ بہتر ہے یا جاہل؟ چنانچہ مسئلہ کے بارے میں ابھی بحث و تنقیح ہو رہی تھی کہ میں اُٹھ کر جانے لگا اور ابھی مشکل سے دروازے تک پہنچا تھا کہ گھر سے عورتوں کے رونے کی آواز آئی۔ میں پلٹا تو معلوم ہوا کہ امام صاحبؒ انتقال فرما چکے ہیں۔

ان لوگوں کے دلوں میں کبھی خیال بھی نہ گزرا کہ بس کافی ہے۔ ہم علامہ بن گئے بلکہ حصول علم کا جذبہ ہوتا تھا اور ہر وقت اس کی تڑپ اور پیاس لگی رہتی۔ حدیث میں آیا ہے کہ **منهو مان لا يشبعان منهوم في العلم لا يشبع منه و منهوم في الدنيا لا يشبع منها** (۱)۔ کہ دو حریص کبھی بھی سیر نہیں ہوتے۔ ایک علم کا حریص جو اس سے سیر نہیں ہوتا۔ دوسرا دنیا کا حریص جو اس سے سیر نہیں ہوتا۔

ایک مستشرق پروفیسر کا جذبۂ حصول علم: مولانا سید سلیمان ندویؒ نے حیات شبلی میں ایک عجیب واقعہ لکھا ہے۔ وہ حضرت شبلی سے روایت کرتے ہوئے ان کے ایک سفر نامے کے بارے میں لکھتے ہیں یا علامہ شبلیؒ نے خود اپنے سفر نامے ''سفر نامۂ مصر و شام'' میں لکھا ہے کہ جس بحری جہاز میں ہم سوار تھے۔ اس میں ہمارا استاد پروفیسر آرنلڈ بھی سوار تھا۔ یہ علی گڑھ یونیورسٹی کا مشہور مستشرق پروفیسر تھا۔ جس نے مشہور کتاب دعوتِ اسلام (Preaching of Islam) لکھی۔

علامہ لکھتے ہیں کہ دوران سفر اچانک جہاز کو طوفان نے آگھیرا۔ شور اٹھا کہ جہاز ڈوب رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت انسان سب کچھ بھول جاتا ہے۔ سمندری جہاز ڈوبنے کا منظر بڑا ہولناک ہوتا ہے۔ ہر کوئی اپنے لئے حفاظتی کشتی کی تلاش میں ہے۔ خطرے کا سائرن بجا۔ اس حالت میں مجھے یاد آیا کہ پروفیسر آرنلڈ ہر وقت کتاب مطالعہ میں ڈوبا رہتا ہے۔ دیکھوں تو اسکی کیا حالت ہے۔ میں دوڑ کر گیا اور کیبن کا دروازہ کھولا دیکھا کہ وہ کتاب پڑھ رہا ہے۔ میں چیخا کہ سر! جہاز ڈوب رہا ہے۔ اس نے اچھا کہہ کر مجھے ٹال دیا۔ اور مزید استغراق سے

---

(۱) مشکوٰۃ کتاب العلم فصل ثالث ص ۳۷

کتاب پڑھنے لگا۔ میں نے پھر کہا تو اس نے کہا کہ اگر جہاز ڈوب رہا ہے اور موت آنے والی ہے تو مجھے چھوڑ دو کہ یہ صفحہ ختم کر دوں۔ صفحہ چھوڑ کر مروں تو کیا فائدہ۔ کافروں میں بھی ایسے لوگ ہیں جنہیں تحصیل علم میں اتنا انہماک ہوتا ہے۔

امام مالک اور یحیٰ مصمودیؒ: امام مالکؒ کے ساتھ طلبہ بیٹھے تھے۔ درسِ حدیث شروع تھا۔ مؤطا امام مالکؒ کے راوی حضرت یحیٰ بن یحیٰ مصمودیؒ بھی بیٹھے تھے۔ کسی نے کہا کہ مدینہ میں ہاتھی لایا گیا ہے۔ ہاتھی کو دیکھنے کے لئے سارے طلبہ امام مالکؒ کو چھوڑ کر دوڑے۔ کیونکہ ہاتھی عجیب جانور ہے اور اہل مدینہ نے اسے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ صرف یحیٰ بن یحیٰ مصمودیؒ تھے جو نہ اٹھے۔ امام مالکؒ نے اس کے بارے میں فرمایا کہ ''ھذا عاقل '' یہی عقلمند ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت یحیٰ بن یحیٰ مصمودیؒ کی روایت کردہ مؤطا کو شہرت حاصل ہوئی۔ سترہ یا اٹھارہ نسخے مؤطا کے دنیا میں بیان کئے گئے ہیں (۱)۔ لیکن سوائے آپ کے نسخے کے دوسرے نسخے متداول نہیں ہو سکے۔

حقوق الاوقات کی تلافی ممکن نہیں: ہمارے شیخ حضرت مولانا عبدالغفور مدنیؒ نے ایک بار یہاں دارالعلوم میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک حقوق اللہ فی الاوقات ہیں اور ایک حقوق الاوقات ہیں۔ مثلاً نماز کسی سے قضاء ہوئی یا روزہ توڑ دیا تو قضاء یا کفارہ سے اس کی تلافی ممکن ہے لیکن حق الوقت یہ ہے کہ وقت بے مقصد خرچ نہ ہو، صحیح طریقہ پر صرف ہو۔ اگر یہ وقت ضائع ہوا تو قیامت تک اس کی تلافی ممکن نہیں کیونکہ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔ قیامت کے روز وقت کے ضیاع پر پچھتانا پڑے گا۔ اسی لئے تو قیامت کے دن کو یوم الحسرۃ بھی کہا جاتا ہے۔ مشہور مقولہ ہے کہ **الوقت سیف قاطع إمّا تقطعه وإمّا يقطعك** وقت تیز تلوار ہے یا تو اسے استعمال کر کے صرف کر دے گا۔ یا وہ تجھے کاٹ کر رکھ دے گا۔

بہر حال یہاں بھی حضرت محمد بن فضلؒ نے پہلے زبانی اور بعد میں کتاب سے حدیث بیان کر کے حضرت یحیٰ بن معینؒ کی تشنگی کا مداوا کیا۔ اور امام ترمذیؒ نے یہ حکایت صرف اس لئے بیان کی کہ اس میں مذکورہ سند کی مزید تقویت ہے۔

---

(۱) بلکہ مؤطا کے رواۃ کی تعداد پچاس سے بھی زائد بیان کی جاتی ہے۔ (اصلاح الدین)

(۷) حدّثنا سوید بن نصر أنا عبداللّٰہ بن المبارک عن سعید ابن أیاس الجریریّ عن أبی نضرة عن أبی سعید الخدریّ قال کان رسول اللّٰہ ﷺ اذا استجد ثوباسمّاہ باسمه عمامة او قمیصا اورداء ثمّ یقول اللّٰھمّ لک الحمد کما کسوتنیه أسالک خیرہ و خیر ما صنع له وأعوذبک من شرّہ و شرّ ما صنع له.

حدّثنا هشام بن یونس الکوفیّ أنبانا القاسم بن مالک المزنیّ عن الجریری عن أبی نضرة عن أبی سعید الخدریّ عن النبیّ ﷺ نحو(۱).

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب کوئی نیا کپڑا پہنتے تو (اظہار مسرت کے طور پر) اس کا نام لیتے۔ مثلاً فرماتے کہ یہ پگڑی ہے یا قمیص ہے یا چادر پھر دعا فرماتے کہ اے اللہ تیرے ہی لئے تمام تعریفیں ہیں۔ جیسے کہ تو ہی نے مجھے یہ کپڑا پہنایا۔ اے اللہ میں تجھ سے اس کپڑے کی بھلائی چاہتا ہوں۔ اور جن مقاصد کے لئے یہ بنا ہے ان کی بھلائی چاہتا ہوں۔ اور تجھ سے اس کپڑے کی شر سے پناہ مانگتا ہوں اور جن مقاصد کے لئے یہ بنا ہے اس کی شر سے پناہ مانگتا ہوں۔

اذا استجد ثوباًالخ یعنی جب آپ ﷺ کو کہیں سے نیا کپڑا ملتا مثلاًبازار سے لاتے یا کہیں بطور ہدیہ پیش کیا جاتا۔ یا معنی یہ ہے کہ جب کبھی آپ ﷺ کوئی نیا کپڑا پہنتے۔

تسمیۂ لباس کے مختلف احتمالات: سمّاہ باسمه، اس جملے کے مقصد میں مختلف احتمالات ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ کپڑا ملتا تو جو چیز اس سے بنانی مطلوب ہوتی تھی وہ نامزد کردیتے تھے۔ مثلاً یہ فرماتے کہ اس سے قمیص بناؤں گا، یا اس سے عمامہ بناؤں گا۔ اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اگر قمیص، عمامہ یا

(۱)سنن ابی داؤد ج۲ص ۲۰۲، کتاب اللباس مصنف ابن ابی شیبة ۲۰۳/۱۰ عمل الیوم واللیلة لابن السنی ص (مختار)

کوئی دوسرا کپڑا کوئی پیش کرتا تو شکر یہ ادا کرتے اور فرماتے کہ اچھی قمیص ہے یا اچھا عمامہ ہے۔ بعض مقامات میں یہ بھی آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بعض لباسوں کے مستقل نام بھی تھے۔ مثلاً آپ ﷺ کی ایک پگڑی کا نام سحاب (بادل) تھا، پھر یہ معنی بھی ممکن ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی طرف سے کپڑے پر مناسب نام رکھ دیتے تھے۔ علامہ بیجوریؒ لکھتے ہیں کہ یہ احتمال بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ اس کپڑے کے مادے کی حیثیت سے اس کی جنس کا نام لیتے تھے۔ مثلاً یہ سوتی کپڑا ہے اونی ہے یا کتان کا ہے۔

الحمد للّٰہ کما کسوتنیہ الخ(۱): کما تشبیہ کے لئے ہے۔ حمد اور تشکر کو اللہ تعالیٰ کی خلعت نوازی سے تشبیہ دی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کسوۃ یعنی کپڑا پہنانا تیرے ساتھ مختص ہے دنیا کی کوئی قوت مجھے کپڑا نہیں دے سکتی تھی۔ اسی طرح حمد بھی تیرے ساتھ خاص ہے۔ یا پھر یہاں تشبیہ سے مقصود یہ ہے کہ جس طرح کپڑا اللہ تعالیٰ دیتے ہیں اور ہم فقر و احتیاج کی بناء پر اس کے مستحق بن جاتے ہیں۔ اس طرح ہماری حمد کا مستحق فقط اللہ تعالیٰ ہے۔ اس لحاظ سے تشبیہ محض استحقاق میں ہے(۲)۔

خیرہ' کپڑے کے خیر ہونے کی متعدد صورتیں ہیں مثلاً یہ کہ دیرپا ثابت ہو۔ صاف رہے۔ جس مقصد کیلئے اسے حاصل کیا گیا ہو۔ اسی میں استعمال ہو۔ ثواب کے کاموں میں صرف ہو اور گناہوں میں استعمال نہ ہو۔ اسی طرح شر کی صورت یہ ہوگی۔ کہ جلد بوسیدہ ہو جائے، جل جائے، پھٹ کر بیکار ہو جائے اور سب سے بدترین شر یہ ہے کہ انسان میں عجب تکبر اور خود پسندی پیدا ہونے کا سبب بنے۔

حدّثنا هشام بن یونس الخ سابقہ متن کو دوسری سند سے ذکر کر رہے ہیں جس سے پہلی سند کی تائید ہوتی ہے۔

---

(۱) جب کوئی نیا کپڑا پہنے تو یہ دعا پڑھے وحدیث معاذ بن أنس مرفوعاً من لبس ثوباً جدیداً فقال الحمدللّٰه الذی کسانی هذا ورزقنیه من غیر حول ولاقوة غفر اللّٰه له ماتقدم من ذنبه زادابوداؤد ج۲ص۲۰۲ فی روایته وماتأخر (المواهب اللدنیة ص ۶۱)(مختار)

(۲) یہ احتمال بھی ہے کہ یہاں کاف لام تعلیل یا علی کے معنی میں ہو دونوں صورتوں میں یہ تعلیل کے معنی میں ہوگا یعنی اے اللہ اس کپڑے کے بخشنے پر ہم تیرا شکر ادا کرتے ہیں۔ (اصلاح الدین)

(۸) حدّثنا محمّد بن بشار أنبانا معاذ بن هشام ثنی أبی عن قتادہ عن أنس بن مالک قال کان أحبّ الثیاب إلیٰ رسول اللہﷺ یلبسہ الحبرۃ (۱)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریمﷺ کو یمنی منقش چادر کپڑوں میں زیادہ پسند تھی۔

الحِبرۃ حاء کے کسرہ اور باء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ نبی کریمﷺ کے پسندیدہ لباس میں سے ایک حبرہ بھی تھا۔ یہ تحبیر سے ماخوذ ہے جو تحسین وتزئین اور منقش بنانے کے معنی میں ہے۔ یہاں مراد وہ یمنی چادر ہے جس میں لکیریں ہوتی تھیں۔ دراصل یہ ملائم سوتی چادر ہوتی تھی۔ نبی کریمﷺ اس لئے بھی اس کو پسند فرماتے تھے کہ اس کی لکیریں عموماً سبز (۲) ہوتی تھیں۔ اور اہل جنت کے کپڑوں کا رنگ بھی سبز ہوگا۔ نیز ملائمت، ساخت کے لحاظ سے نفاست اور میل خوری کی وجہ سے بھی آپﷺ کو یہ چادر پسند تھی۔

<u>زیادہ محبوب قمیص یا حبرہ</u>: واضح رہے کہ جن روایات میں قمیص کو زیادہ محبوب کپڑا کہا گیا ہے ان کا حضرت انسؓ کی اس حدیث سے بظاہر تعارض معلوم ہو رہا ہے۔ لیکن اس کی توجیہ یہ ہے کہ دراصل دونوں لباسوں کی حیثیتوں میں فرق ہے۔ چنانچہ چادروں اور ان سلے رومالوں میں آپﷺ کو حبرہ زیادہ پسند ہوگا، سلے ہوئے پہننے کے کپڑوں میں قمیص، اور کوٹ کے قسموں میں چغہ زیادہ پسند ہوگا۔ یا یہ کہ گھر میں قمیص اور باہر حبرہ پسند تھا۔

(۹) حدّثنا محمود بن غیلان أنبانا عبدالرزاق أنبانا سفیان عن عون بن أبی جحیفۃ عن أبیہ قال رأیت النّبیّ ﷺ وعلیہ حلّۃ حمراء

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب اللباس ص ۸۶۵، باب البرود والحبر والشملۃ، صحیح مسلم ج۲ ص ۲۰۱ کتاب اللباس والزینۃ باب فضل لباس، سنن نسائی ج۲ ص ۲۰۳ کتاب الزینۃ باب الحبرۃ (مختار)

(۲) بعض روایات کے مطابق اس میں سرخ یا نیلی لکیریں ہوتی تھیں جس طرح اگلی حدیث سے سرخ رنگ میں ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ (مختار)

کانیّ انظر الی بریق ساقیه قال سفیان أراها حبرة (۱).

ترجمہ: حضرت ابوجحیفہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو سرخ جوڑا پہنے ہوئے دیکھا۔حضور ﷺ کی پنڈلیوں کی چمک گویا اب بھی میرے سامنے ہے۔راوی حدیث سفیان کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ یہ حبرہ تھا۔

سرخ لباس استعمال کرنے کی توجیہات: **وعلیه حلّة حمراء** حضرت ابوجحیفہؓ کی یہ ملاقات نبی کریم ﷺ کے ساتھ حجۃ الوداع کے موقع پر بطحاء مکہ میں ہوئی تھی۔جس کی تائید بخاری شریف کی روایت سے ہوتی ہے۔اس روز آپ ﷺ سرخ چادر اور ازار پر مشتمل جوڑا پہنے ہوئے تھے(۲)۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ احادیث میں سرخ رنگ کے کپڑے کے استعمال کی ممانعت آئی ہے تو نبی کریم ﷺ نے خود کیسے استعمال فرمایا۔اس کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں۔

(۱) اول یہ کہ ممکن ہے آپ ﷺ کا یہ عمل تحریم سے پہلے کا ہو۔یعنی ابھی تک سرخ کپڑے کے استعمال کی ممانعت نہ ہوئی ہو۔

(۲) دوم یہ کہ یہ نبی کریم ﷺ کی خصوصیت ہو کہ ان کے لئے مباح ہو۔دوسرے لوگوں کے لئے نہ ہو۔ اور اس سے تکبر اور خود پسندی کی بیماری پیدا ہونے کا اندیشہ نہ تھا۔جبکہ دوسرے لوگ شاذ و نادر ہی اس مرض سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

---

(۱)صحیح مسلم ص۱۹۵ کتاب الصلوٰۃ باب سترالمصلی، ابوداؤد ج۱ ص۸۴ کتاب الصلوٰۃ باب فی المؤذن یستدیر فی آذانه، سنن نسائی ج۲ ص۲۵۸ کتاب الزینة باب اتخاذ القاب الحمر(مختار)

(۲)ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے والمراد بالحلة الحمراء بردان یمانیان منسوجان بخطوط حمر مع سود کسائر البرود الیمنیة وهی معروف بهذاالاسم باعتبار مافیها من الخطوط الحمر والّافالأحمر البحث منهیّ عنه ومکروه لبسه لحدیث أخرجه أبوداؤد من حدیث عبداللّٰه بن عمرو قال مرّ بالنّبیّ ﷺ رجلٌ وعلیه حلّتان حمراوان فسلّم علیه فلم یرد علیه وحمله البیهقی علی ماصبغ بعد النسج وإمّاصبغ غزله ثمّ نسج فلاکراهة فیه والظاهر أنّه لافرق بینهمالأنّه زینة الشیطان وموجب للخیلاء والطغیان وقدرویٰ الحسن عن النبی ﷺ أنّ الحمرة من زینة الشیطان.(جمع الوسائل ۱/۱۴۱،۱۴۲)(مختار)

(۳) سوم یہ کہ یہ کپڑا خالص سرخ نہ تھا بلکہ سرخ لکیروں پر مشتمل تھا۔ جس کی طرف امام ترمذیؒ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ سفیانؒ کے خیال میں یہ حبرہ تھا۔ اور تحریم و کراہت خالص سرخ کپڑے میں ہوگی لکیردار ہو تو مضائقہ نہیں۔

(۴) چہارم یہ کہ ممکن ہے کہ سرخی سیاہی مائل ہو۔ جس کی وجہ سے اس میں اباحت کی جہت پیدا ہو چکی ہو۔

(۵) پنجم یہ کہ ممکن ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ بیان جواز کے لئے کیا ہو۔ جیسا کہ بعض فقہاء کی رائے ہے۔ بلکہ بعض نے تو سرخ لباس کو مستحب قرار دیا ہے۔

<u>فقہاء کی آراء:</u> بہر حال اس سلسلے میں فقہاء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض تو تحریم کے قائل ہیں۔ بعض کراہت تحریمی اور کچھ تنزیہی کے قائل ہیں۔ اور کچھ لوگ اباحت کا قول بھی کرتے ہیں۔ ملا علی قاریؒ نے شمائل شرح جمع الوسائل میں تمام اقوال نقل کئے ہیں۔ علامہ گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ ایک تقویٰ ہے اور ایک فتویٰ ہے۔ تقویٰ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کی اجازت نہیں دی تو اس کے استعمال سے رک جانا چاہیے۔ اور اگر فتوے کی بات ہو تو اس میں جواز کا ثبوت بھی موجود ہے۔

کانّی أنظر إلیٰ بریق ساقیه صحابی فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی پنڈلیاں اس وقت جس خوبصورتی کے ساتھ چمک رہی تھیں گویا اب بھی وہ چمک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

نبی کریم ﷺ اس روز اونٹنی پر سوار تھے۔ پاؤں مبارک ازار سے کھلے ہوئے تھے۔ بریق کا لفظ برق سے ہے جو اگر نصر ینصر سے آئے تو لمعان اور چمکنے کے معنی میں مستعمل ہے اور سمع سے ہو تو پھر چمک کی وجہ سے آنکھیں چندھیانے کو کہتے ہیں جس طرح عموماً سورج کی طرف دیکھنے سے ہوتا ہے۔

---

(۱) اس لئے مردوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنا ازار ٹخنوں سے اونچا رکھیں اور نصف ساق تک رکھنا مستحب ہے۔ علامہ مناویؒ نے لکھا ہے **فیسنّ للرّجل إلیٰ نصف ساقیه ویجوز إلیٰ کعبیه وما زاد حرام ان قصد الخیلاو إلاّ کره** (مناوی شرح شمائل علی هامش جمع الوسائل ۱/۱۴۲) **وفی الفتاویٰ الهندیة ینبغی ان یکون الازار فوق الکعبین الیٰ نصف الساق وهذا فی حق الرجال واما النساء فیرخین ازارهنّ أسفل من کعب یستر ظهر قدمهنّ**.(مختار)

أراھا حبرۃ ھمزہ کا ضمہ اور فتحہ دونوں منقول ہیں لیکن ضمہ راجح ہے۔ یعنی میرا خیال ہے کہ یہ سرخ کپڑا جس کا ذکر ہو رہا ہے حبرہ تھا۔

(۱۰) حدّثنا علّی بن خشرم أنا عیسیٰ بن یونس عن اسرائیل عن أبی إسحاق عن البراء بن عازب قال ما رأیت احداً من الناس أحسن فی حلة حمراء من رسول اللہ ﷺ ان کانت جمّته لتضرب قریباً من منکبیه(۱).

ترجمہ: حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کبھی کسی سرخ جوڑے والے کو نبی کریم ﷺ سے زیادہ حسین نہیں دیکھا آپ ﷺ کے بال آپ ﷺ کے مونڈھوں کے قریب پہنچ رہے تھے۔

فی حلّة حمراء سرخ جوڑے کے ذکر کی وجہ سے یہ حدیث یہاں دوبارہ لائے۔ ورنہ یہ حدیث پہلے باب میں گزر چکی ہے۔

(۱۱) حدّثنا محمّد بن بشّار ثنا عبدالرحمان بن مھدی أنبانا عبیداللّٰه بن ایاد عن أبیه عن أبی رمثة قال رأیت النبیّ ﷺ وعلیه بردان أخضران(۲).

ترجمہ: حضرت ابو رمثہؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دو سبز چادریں اوڑھے ہوئے دیکھا۔

رأیت النبیّ ﷺ الخ یہ حدیث اس سے قبل **باب ماجاء فی خلق الرسول اللہ ﷺ** میں بالتفصیل گزر چکی ہے۔

وعلیه بردان أخضران بردان بُرد کا تثنیہ ہے جس کی جمع برود آتی ہے۔ یہ لکیر دار کپڑا ہوتا

---

(۱) صحیح بخاری ۸۷۹/۲ کتاب اللباس باب الثوب الإحمر، سنن نسائی ج۲ ص۲۴۸ کتاب الزینة باب إتخاذالشعر. (مختار)

(۲) ابوداؤد ج۲ ص۲۰۷، کتاب اللباس باب فی الخضرة، سنن نسائی ۲۳۳/۱ کتاب الصلوٰة والعیدین باب الزینة للخطبة العیدین. (مختار)

ہے۔کبھی اس پر نقوش بھی ہوتے ہیں جبکہ بعض لوگوں کے خیال میں بردسیاہ چارخانہ دار کپڑا ہوتا ہے۔لیکن یہاں پر اس کا رنگ سبز بتایا گیا ہے(۱)۔آپ ﷺ کو سبز لباس بھی سفید لباس کی طرح پسند تھا کیونکہ اہل جنت کے کپڑوں کا رنگ ہے۔اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ حبرہ ہو کیونکہ حبرہ بیش قیمت منقش لکیردار چادر کا نام ہے۔رنگ کوئی بھی ہو۔

نبی کریم ﷺ کی چادریں: حضرت عروہ بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی وہ چادر جس میں آپ ﷺ وفود سے ملتے تھے چار ذراع لمبی اور دو ذراع اور ایک بالشت چوڑی تھی۔آپ ﷺ وفات کے بعد دو چادریں چھوڑ گئے تھے۔

چونکہ نبی کریم ﷺ کو چادر پسند تھی اس لئے اموی اور عباسی خلفاء جمعوں اور عیدوں میں چادر کو بطور شعار استعمال کرتے تھے۔بعض روایات کے مطابق یہ وہی چادریں تھیں جو نبی کریم ﷺ چھوڑ گئے تھے۔

چنانچہ علامہ ماوردیؒ کے مطابق حضرت ابان بن ثعلبؓ سے روایت ہے کہ حضرت کعب بن زبیرؓ نے اپنا مشہور قصیدہ ''بانت سعاد الخ'' نبی کریم ﷺ کو سنایا۔تو جب اس شعر پر پہنچے

ان الرسول لسیف یستضاء به مهنّد من سیوف اللّٰه مسلول

تو نبی کریم ﷺ نے ان کو ایک چادر مرحمت فرمائی۔

امراء بنی عباس و بنوامیہ کے پاس حضور اقدس ﷺ کی چادریں: حضرت معاویہؓ نے اپنی امارت کے زمانہ میں حضرت کعبؓ کو اس چادر کے لئے دس ہزار درہم کی پیش کش کی۔تو حضرت کعبؓ نے جواب دیا کہ نبی کریم ﷺ کے کپڑے کے بارے میں میں اپنے سوا کسی دوسرے شخص کو ترجیح نہیں دے سکتا۔لیکن حضرت کعبؓ کی وفات کے بعد حضرت معاویہؓ نے وہ چادر بیس ہزار درہم دے کر خرید لی۔یہ چادر بعض اقوال کے مطابق حضرت معاویہؓ کے کفن میں شامل کی گئی اور بعض اقوال کے مطابق بعد میں بنی امیہ کے زوال کے بعد لاپتہ ہوگئی۔

عباسی خلفاء کے پاس بھی نبی کریم ﷺ کی ایک چادر کا ذکر ملتا ہے۔کہتے ہیں کہ وہ چادر دراصل

(۲) ملا علی قاریؒ نے فرمایا ہے سبز سے مراد مکمل سبز نہیں بلکہ اس میں سبز رنگ کی دھاریاں تھیں(جمع الوسائل ۱/۱۴۴)(مختار)

نبی کریم ﷺ نے اہل ایلہ کو امان دیتے ہوئے بطور نشانی دی تھی۔ بعد میں والی ایلہ سعید بن خالد نے یہ چادر حاصل کر کے خلیفہ کے پاس بھیج دی۔

بہر حال عباسی خلفاء بھی امویوں کی طرح بڑے اہتمام سے نبی کریم ﷺ کی چادر کو اہم مواقع میں استعمال کرتے رہے۔ علامہ کرمانیؒ لکھتے ہیں کہ یہ چادر سقوط بغداد کے بعد ہلاکو کے ہاتھ لگی۔ اس نے اسے جلا کر اس کی راکھ دریائے دجلہ میں بہادی۔

(۱۲) حدثنا عبد بن حمید أنا عفّان بن مسلم قال أنبانا عبداللّٰہ ابن حسان العنبریّ عن جدّتیه دُحیبة و علیبة عن قیلة بنت مخرمة قالت رأیت النّبیّ ﷺ و علیه اسمال ملیّتین کانتا بز عفران وقد نفضته و فی الحدیث قصّة طویلة(۱)۔

ترجمہ: حضرت قیلہ بنت مخرمہؓ کہتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو اس حال میں دیکھا کہ آپ ﷺ پر دو پھٹی پرانی چادریں تھیں۔ جو زعفران میں رنگی ہوئی تھیں لیکن ان سے زعفران کا اثر جا چکا تھا۔ اور اس حدیث میں ایک طویل قصہ بھی ہے۔

قیلة اور دحیبة و علیبة کا تعارف: عن جلتیه دحیبة و علیبة. دحیبہ اور علیبہ دونوں تصغیر کے صیغہ سے مروی ہیں۔ اس حدیث کی سند کے بیان میں مؤلف سے غلطی سرزد ہوگئی ہے۔ کیونکہ دراصل علیبہ دحیبہ کا باپ ہے(۲)۔ جس کی دوسری بیٹی کا نام صفیہ ہے۔ دحیبہ اور صفیہ کے والد علیبہ بن حرملہ کی نانی کا نام قیلہ بنت مخرمہؓ ہے۔ علامہ بیجوریؒ کہتے ہیں وھی جدة ابیھما لانّھاامّ امّه الخ جو صحابیہ ہیں۔ حضرت قیلہؓ نے اپنے نواسے علیبہ کی ان دونوں بیٹیوں کی پرورش کی تھی۔ اور ان دونوں سے عبداللہ بن حسان روایت کرتے ہیں۔ ملا علی قاریؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ صفیہ اور دحیبہ میں سے ایک عبداللہ کی دادی اور دوسری نانی ہے۔ امام ترمذیؒ نے جامع ترمذی میں اور امام ابوداؤدؒ نے مندرجہ بالا صحیح طریق سے

---

(۱) ابو داؤد کتاب الخراج والامارة باب فی اقطاع الارضین، الادب المفرد للامام البخاری رقم حدیث ۱۱۷۸، (مختار)

(۲) علامہ مناویؒ نے علامہ سیوطی سے نقل کرتے ہوئے علیبہ کو دحیبہ اور صفیہ کی ماں بتایا ہے۔ مگر ملا علی قاریؒ نے مضبوط شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ یہ ان کے والد کا نام ہے۔ نیز علامہ بیجوریؒ نے بھی یہی تحریر کیا ہے۔ (اصلاح الدین)

اسی سند کو ذکر بھی کیا ہے۔لہٰذا صحیح عبارت یوں ہونی چاہیے کہ" عبداللّٰہ بن حسان العنبری عن جدتیه دحیته و صفیة بنتا علیبة عن قیلة بنت مخرمة الخ"

قیلة بنت مخرمة الخ یہ صحابیہ ہیں بعض نے عنزیہ، بعض نے عنبریہ اور بعض لوگوں نے تمیمیہ کہا ہے امام بخاریؒ اور امام ابوداؤدؒ نے بھی امام ترمذیؒ کی طرح ان کی روایت کو نقل کیا ہے۔

وعلیه إسمال ملیّتین اسمال سمل(۱) کی جمع ہے پرانے کپڑے یعنی چھیتڑے کو کہتے ہیں۔ یہ صفت ہے اس کے جمع سے مفرد بھی موصوف ہوسکتا ہے اور جمع بھی۔ثوب اسمال بھی کہتے ہیں۔ ملاعلی قاریؒ کہتے ہیں کہ اس وقت یہ جمع کے وزن پر مفرد کا صیغہ ہوتا ہے اور اثواب اسمال بھی کہا جاتا ہے۔

ملاءۃ کا مطلب: ملیتین ملاءۃ کی تصغیر ملیۃ کا تثنیہ ہے۔ملائہ وہ کپڑا ہے جس کے حصوں کو دھاگے کے ذریعے سیانہ گیا ہو۔ بلکہ ایک ہی تانے کا بنا ہوتا ہے۔ جو چادر درمیان میں سلی ہوتی ہے وہ ملائہ کی تعریف میں داخل نہیں ہوگی۔تو ملائہ کھدر قسم کی موٹی اور بڑی چادر کو کہتے ہیں۔بعض لوگوں کے خیال میں یہ ملاء سے ہے جو بھرنے کے معنی میں ہے۔یہ فراخ چادر سر سے پاؤں تک بدن کو ڈھانپ لیتی ہے اس لئے اسے ملاءۃ کہتے ہیں۔یہاں پر اسمال کی اضافت تثنیہ کی طرف ہوئی ہے جو اضافۃ الصفۃ الی الموصوف کے قبیل سے ہے۔یعنی یہ ملیتین تھے جو کہ اسمال یعنی پھٹے پرانے چھیتڑے تھے۔اور چونکہ جمع سے مافوق الواحد بھی مراد ہوسکتا ہے۔لہٰذا تثنیہ کی صفت اسمال سے صحیح ہوگی۔یا پھر تثنیہ کو اس لئے جمع سے موصوف کیا گیا ہے کہ دونوں کپڑوں میں سے ہر ایک مختلف اجزاء پر مشتمل تھا۔اس اعتبار سے ان میں تکثر آیا ہے۔نیز یہ احتمال بھی ہے کہ یہ اضافت بیانی ہو یعنی وہ اسمال ملیتین تھے۔بہرحال حدیث کا حاصل یہ ہوا کہ آپ ﷺ دو لمبی چوڑی پرانی چادریں اوڑھے ہوئے تھے جو بوسیدہ اور پھٹے پرانی تھیں۔

زعفرانی لباس: بزعفران عبارت میں تقدیر ہے یعنی کانتا مصبوغتین بزعفران۔مطلب یہ

---

(۱) سمل کا لفظ صاحب منجد نے صرف میم کے کسرہ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔جبکہ اس کا ایک ہم معنی لفظ سملۃ بھی منجد میں ذکر ہے جو میم مفتوحہ اور آخر میں تاء کے ساتھ ہے۔لیکن سمل کا فتحہ بھی منقول ہے۔شمائل ترمذی کے شراح نے تصریح کی ہے کہ الاسمال جمع سمل ہے۔صاحب مقامات حریری تیرویں مقامہ میں لکھتے ہیں اذوقف بنا شخص علیه سمل و فی مشیته قزل (اصلاح الدین)

ہے کہ دونوں کپڑے زعفران سے رنگے ہوئے تھے(۱)۔ قد نفضتہ الخ ۔فاعل کا ضمیر اسمال کو راجع ہے۔اور بعض روایات میں نفضتا تثنیہ کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ پھر فاعل کا ضمیر ملیتین کو راجع ہوگا۔جس کپڑے پر زعفران لگا ہوا ہو۔ایسے مزعفر کپڑے سے چونکہ نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔اس لئے اس توہم کو دفع کرنے کے لئے کہ نبی کریم ﷺ نے مزعفر کپڑا کیسے استعمال فرمایا؟ قیلہؓ نے یہ کہا کہ زعفران کا بہت تھوڑا اثر باقی تھا۔دھونے سے اس کا غالب اثر چلا گیا ہے اور رنگ پھیکا پڑ چکا تھا(۲)۔

<u>لباس فاخرہ کا استعمال:</u> لباس فاخرہ کے استعمال میں ضابطہ یہ ہے کہ اگر تکبر اور غرور کا اندیشہ ہو تو استعمال ناجائز ہے ورنہ جائز ہے۔ بلکہ تحدیث نعمت کے طور پر لباس فاخرہ کا استعمال مستحب ہوگا۔ خود نبی ﷺ کو ایک بار ایک جوڑا ہدیہ کیا گیا جو کہ تینتیس اونٹوں یا اونٹنیوں کے عوض خریدا گیا تھا۔آپ ﷺ نے پہن کر اسے زینت بخشی۔

نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جو پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔آپ ﷺ نے اس سے دریافت فرمایا کہ کیا اس کے پاس کوئی مال ہے؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ کس قسم کا مال ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی دولت میں اونٹ اور بھیڑ بکریاں ہیں۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ فلیر اثر نعمة الله علیک و کرامته(۳)۔یعنی پس اللہ تعالیٰ کے انعام واکرام کا اثر تم پر نظر آنا چاہیے۔

لیکن یہ تب جائز ہوگا کہ ترفہ اور خود پسندی سے خالی ہو۔خود آپ ﷺ نے بالخصوص کسی خاص نوعیت کے کپڑوں کے استعمال پر اصرار نہیں کیا۔نہ استعمال میں تکلفات سے کام لیا۔ بلکہ حسب ضرورت آپ ﷺ نے مختلف قسم کا لباس استعمال و پسند فرمایا۔ ازار و رداء عمومی لباس تھا۔لیکن قمیص کا استعمال بھی

---

(۱) ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے کانتابزعفران ای مصبوغتین به او اماقول الحنفی ای مخلوطتین ففیه تسامح لایخفی(جمع الوسائل ۱/۱۴۵)(مختار)

(۲) اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ﷺ نے یہ زعفرانی رنگ کا کپڑا انھی سے قبل استعمال کیا ہو ویدل علیہ مافی القصة الطویلة انها کانت فی اول الاسلام(جمع الوسائل ۱/۵۶)(مختار)

(۳) المواهب اللدنية ص ۷۵

مذکور ہے۔ پاجامہ کا اگرچہ آپ ﷺ سے استعمال تو ثابت نہیں لیکن آپ ﷺ کے ترکہ میں پایا گیا تھا۔(۱)

پھر قیمت کے لحاظ سے خوش پوشی کوئی عیب نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ آپ ﷺ نے اغنیاء کو اس کی ترغیب دی ہے۔ اور اسی وجہ سے بعض ائمہ کرام اور بزرگوں نے اسی جہت کو اختیار کر کے نبی کریم ﷺ کے مرغوب لباس کا استعمال کیا ہے اور بلا ضرورت رہبانیت اور تصنع کو ناپسند فرمایا ہے۔

<u>لباس اور اکابر کا طرز عمل:</u> حضرت شاذیؒ بھی انہی بزرگوں میں سے ہیں ایک دفعہ ایک شخص نے آپؒ کی خوش پوشی کو ناپسندیدہ کہا۔ تو آپؒ نے فرمایا کہ **یا ھذا ھیئتی ھذہ تقول الحمدللّٰہ ھیئتک ھذہ تقول اعطونی.** ارے بھائی! میرا لباس زبان حال سے خدا کا شکر ادا کر رہا ہے اور تیرا لباس زبان حال سے تیری گداگری کی ترجمانی کر رہا ہے۔

بہر حال لباس اپنی حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے۔ لیکن صوفیاء کرام اور اہل اللہ کا عمومی شیوہ یہی ہے کہ وہ اس سلسلے میں ترفہ اور عیاشی سے دور رہتے تھے۔ طلبہ کو بھی زیادہ تکلفات سے دور رہنا چاہیے۔

حضرت علامہ گنگوہیؒ ایک بار بیت اللہ کے طواف میں مصروف تھے۔ دیکھا کہ ایک اندھا شخص مطاف میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اندھا ہونے کے باوجود جب علامہ گنگوہیؒ پاس سے گزرتے تو وہ سمجھ لیتے کہ حضرت گزر رہے ہیں۔ شاید کوئی اللہ تعالیٰ کے ولی تھے۔ فرماتے ہیں کہ ایک بار جب علامہ گنگوہیؒ پاس سے گزرے، تو انہوں نے کہا کہ **البس لباس الصالحین** نیک لوگوں کا لباس پہنا کرو۔ دوسری بار جب آپ ان کے پاس گزرے، تو اس شخص نے پھر یہی کہا۔ تیسری بار بھی یہی کہا۔ تو حضرت گنگوہیؒ نے پوچھا کہ صالحین کا لباس کیسے ہوتا ہے؟ اس نے کہا خشن خشن یعنی کھردرا کھردرا۔ بہر حال طلبہ کو بھی اپنے آپ کو بدعتیوں کی طرح قبر نہیں بنانی چاہیے۔ جو کہ ریشمی رومالوں اور منقش چادروں سے ڈھکی ہوئی ہوتی ہے۔ ابھی سے محنت اور جفاکشی کی عادت ڈالنی چاہیے۔ بعد میں یہ کام آئے گی۔

<u>نبی کریم ﷺ کی ہیئت:</u> **وفی الحدیث قصة** چونکہ اس قصہ کا تعلق لباس سے نہ تھا۔ اس لئے اسے یہاں ذکر نہیں کیا۔

---

(۱)مشکوۃ کتاب اللباس ص ۳۷۵(مختار)

طبرانی میں تفصیلاً وہ قصہ مذکور ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک آدمی نبی کریم ﷺ کے پاس آیا سلام عرض کیا۔ آپ ﷺ نے جواب دیا۔ قصہ کی روایت کرنے والی حضرت قیلہ بنت مخرمہؓ فرماتی ہیں کہ اس وقت آپ ﷺ دو پھٹی پرانی چادروں میں ملبوس تھے۔ ہاتھ میں کھجور کی چھڑی تھی جو پتوں سے خالی تھی۔ نبی کریم ﷺ اکڑوں بیٹھے تھے۔ فرماتی ہیں کہ میں نے جب نبی کریم ﷺ کو اس حالت میں دیکھا (اور سوچا کہ اللہ تعالیٰ کے عظیم پیغمبر اور اتنی تواضع کہ فنائیت طاری ہے۔ مسکنت کا لباس، مسکینوں جیسی نشست، غریبوں جیسی ہیئت جبکہ اللہ تعالیٰ کے بعد کوئی عظمت میں آپ ﷺ کے ہمسر نہیں) تو رعب اور خوف کی وجہ سے مجھ پر رعشہ چھا گیا۔ نبی کریم ﷺ کے ایک ہمنشین نے آپ ﷺ سے کہا۔ کہ اس بیچاری کو تو آپ ﷺ نے خوفزدہ کر دیا۔ آپ ﷺ نے میری طرف دیکھا اور فرمایا **علیک السکینۃ** یعنی اطمینان اور قرار پاؤ۔ اس کے بعد جو ھیبت اور رعب مجھ پر چھائی ہوئی تھی ختم ہوگئی۔

(۱۳) حدثنا قتیبة بن سعید ثنا بشر بن المفضل عن عبد اللّٰه ابن عثمان بن خثیم عن سعید بن جبیر عن ابن عباسؓ قال قال رسول اللّٰه ﷺ علیکم بالبیاض من الثیاب لیلبسها احیاء کم و کفّنوا فیها موتا کم فانّھا من خیار ثیابکم(۱)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ سفید کپڑوں کو اختیار کرو۔ تمہارے زندوں کو سفید کپڑے پہننا چاہیے اور سفید کپڑوں ہی میں مردوں کو دفن کرنا چاہیے۔ کیونکہ سفید کپڑے تمہارے بہتر لباسوں میں سے ہیں۔

علیکم بالبیاض من الثیاب الخ اس حدیث میں سفید کپڑے پہننے کا حکم دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ خود نبی کریم ﷺ نے اگلی حدیث میں بیان فرمائی ہے۔ دوسرے مقامات میں نبی کریم ﷺ سے زرد، سیاہ، سرخ اور سبز رنگ کے کپڑوں کا استعمال بھی منقول ہے۔ لیکن وہ نبی کریم ﷺ کا عمل ہے جبکہ سفید لباس کے بارے میں آپ ﷺ کی طرف سے حکم ہے۔ اور ضابطہ یہ ہے کہ قولی حدیث فعلی حدیث نبی ﷺ پر راجح

(۱) سنن ابن ماجة ص ۱۰۶ کتاب الجنائز باب ماجاء فیما یستحب من الکفن، جامع ترمذی ۱/۱۹۳ کتاب الجنائز باب مایستحب من الاکفان، ابوداؤد کتاب اللباس باب فی البیاض (مختار)

ہوتی ہے کیونکہ عمل کی اطلاع صحابہؓ کا بیان ہوتا ہے جس میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ خصوصیت یا بعض حالات اور اوقات کے ساتھ خصوصیت کا احتمال ہوتا ہے۔ جبکہ قول امت کے لئے ہدایت ہوتی ہے۔ پھر بخاری شریف میں یہ تصریح (۱) بھی آتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سفید بالوں کو بھی زینت بخشی ہے۔ لہٰذا عمل کے مقابلے میں عمل بھی مروی ہے۔ بہر حال سفید لباس کی ترجیح میں شک نہیں (۲) اور یہاں اسی ترجیح کو مدنظر رکھ کر اس حدیث کو باب میں جگہ دی گئی ہے۔ ورنہ اس میں نبی کریم ﷺ کے پہننے کا ذکر نہیں۔

(۱۴) حدّثنا محمّد بن بشّار أنبانا عبدالرحمان بن مهدی أنا سفیان عن حبیب بن أبی ثابت عن میمون بن أبی شبیب عن سمرة بن جندب قال قال رسول اللّٰہ ﷺ البسوا البیاض فانّھا أطھر و أطیب و کفّنوا فیھا موتاکم (۳)

ترجمہ: حضرت سمرہ بن جندبؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ سفید کپڑے پہنا کرو۔ اس لئے کہ وہ زیادہ پاک صاف رہتے ہیں اور اسی میں اپنے مردوں کو کفن دیا کرو۔

سفید لباس کی افضلیت کی وجہ: **فانّھا أطھر و أطیب الخ** یہ دراصل سفید کپڑوں کی ترجیح کی علت ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ انسان پاک اور صاف کپڑے پہنے۔ اس لحاظ سے سفید رنگ بہت زیادہ مفید ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ سفید کپڑے پر دوسرے کپڑوں کی نسبت نجاست جلد ظاہر ہوتی ہے۔ رنگدار کپڑے پر نجاست کا پتہ نہیں چلتا۔ اس لئے سفید کپڑا زیادہ صاف رکھا جائے گا۔ دوسری بات یہ کہ دھوتے وقت سفید کپڑے کو خوب محنت کے ساتھ دھویا جاتا ہے تاکہ اچھی طرح صاف ہو۔ جبکہ رنگدار کپڑے کو جلد صاف

---

(۱) عن ابی ذرؓ قال اتیت النبی ﷺ وعلیہ ثوب ابیض و هونائم الحدیث (بخاری ج ۲ ص ۸۶۶ کتاب اللباس باب الثیاب البیض) (مختار)

(۲) اسلئے علامہ عبدالجواد الرومیؒ فرماتے ہیں فی ھذا الحدیث یرغب نبینا محمد ﷺ فی البیاض ویحببه لنا فی الحیاة و بعد الممات والتعلیل کما جاء فی الحدیث الآتی (الاتحافات ص ۱۱۱) (مختار)

(۳) ابن ماجة ص ۲۵۵ کتاب اللباس باب البیاض من الثیاب، جامع ترمذی ج ۲ ص ۵۱۹ کتاب الادب باب ماجاء فی لبس البیاض، (مختار)

ہونے کی وجہ سے یا رنگ کے جانے کی خوف سے کم دھویا جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ زیادہ دھونے سے نجاست کا ازالہ بھی خوب ہوگا۔ اس لئے سفید کپڑے کو اطہر کہا۔ اور اطیب اس لئے فرمایا کہ یہ اچھا رنگ ہے اور اطمینان قلب میں بہت مدد ہے۔

سیاہ لباس:

(۱۵) حدثنا احمد بن منیع أنبانا یحییٰ بن زکریا بن أبی زائدة أنا أبی عن مصعب بن شیبة عن صفیة بنت شیبة عن عائشة قالت خرج رسول اللہ ﷺ ذات غداة و علیه مرط من شعر أسود(۱)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ صبح کو مکان سے باہر تشریف لائے تو آپ ﷺ کے بدن پر سیاہ بالوں کی چادر تھی۔

حضرت صفیّة بنت شیبة یہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتی ہیں۔ بعض لوگ انکی صحابیت کے منکر ہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ صحابیہ ہیں۔ امام بخاریؒ نے تصریح کی ہے کہ نبی کریم ﷺ سے ان کا سماع بھی ثابت ہے۔ وعلیه مرط من شعر اسود الخ مرط اون، ریشم یا بکری کے بالوں سے بُنے ہوئے کمبل کو کہا جاتا ہے۔ سردی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ عموماً ازار کے طور پر مستعمل ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی کبھی کبھی اس سے لنگی باندھی تھی۔ اس میں تکلف و ترفہ نہیں ہوتا بلکہ درحقیقت جفاکشوں کا کپڑا ہے۔ اسود مرط کی صفت ہے اور شعر کی صفت بھی ہو سکتی ہے لیکن پھر دال مفتوح پڑھا جائے گا۔ اس حدیث میں ایک اور رنگ یعنی سیاہ کپڑے کے استعمال کی خبر دی گئی ہے۔ مسلم اور ابوداؤد(۲) کی روایات کے مطابق اس چادر میں کچھ دوسرے رنگ بھی تھے لیکن چونکہ سیاہ رنگ غالب تھا۔ اسلئے یہاں صرف سیاہ رنگ کا ذکر ہے۔

(۱) صحیح مسلم ج۲ ص۲۰۲ کتاب اللباس والزینة باب التواضع فی اللباس الخ، ابوداؤد ج۲ ص۲۰۳ کتاب اللباس باب فی لبس الصوف والشعر، ج۲ ص۵۷۰ جامع ترمذی کتاب الادب باب ماجاء فی الثوب الأسود (مختار)

(۲) عن عائشةؓ قالت خرج النبی ذات غداة وعلیه مرط مرحل من شعر اسود(ابوداؤد ص۲۰۳ کتاب اللباس باب فی لبس الصوف والشعر مسلم ج ۲ کتاب اللباس باب التواضع فی اللباس) (مختار)

(۱۶) حدثنا یوسف بن عیسیٰ أنا وکیع أنا یونس بن أبی إسحاق عن أبیه عن الشعبیّ عن عروۃ بن المغیرۃ بن شعبة عن أبیه أنّ النبیّ ﷺ لبس جُبّة رومیة ضیّقة الکمّین(۱).

ترجمہ: حضرت مغیرۃ بن شعبہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک رومی جبہ زیب تن فرمایا تھا جس کی آستینیں تنگ تھیں۔

حضرت مغیرۃ بن شعبةؓ: عن ابیه عروہ کے باپ مغیرہ بن شعبہؓ مشہور ثقفی صحابی ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے خدام میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ جنگ خندق کے سال اسلام لائے اور ہجرت کر کے مدینہ آئے۔ بعد میں کوفہ میں رہائش اختیار کی۔ اور امیر معاویہؓ کی طرف سے کوفہ کے امیر بھی ہوئے۔ تہذیب میں لکھا ہے کہ ''قیل انه احصن ثلث مأۃ امرأۃ فی الاسلام'' ۵۰ھ کو ستر سال کی عمر میں کوفہ ہی میں وفات پائی۔

جبہ، رومی، یا شامی: جبۃ رومیۃ بعض روایات میں شامی جبہ کا ذکر آیا ہے۔ اب ہوسکتا ہے کہ یہ دو مواقع ہوں۔ ایک موقع پر رومی اور دوسرے موقع پر شامی جبہ پہنے ہوئے ہوں۔

لیکن غالب خیال یہ ہے کہ یہ ایک ہی واقعہ کی حکایت ہے۔ اور ایک ہی جبہ کو شامی اور رومی کہا گیا ہے۔ اس کی توجیہ یہ ہے کہ یہ شامی جبہ تھا لیکن اس پر رومی کا اطلاق بھی جائز ہے۔ کیونکہ شام روم کا حصہ تھا۔ اس وقت کے نوآبادیاتی نظام میں شام پر رومۃ الکبریٰ کا تسلط تھا جس کی حکومت بہت وسیع تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عراق کی جنگ میں شکست کو بھی رومیوں کی شکست تعبیر کیا گیا اور ''الم غلبت الروم'' نازل ہوئی۔ یہ بالکل اس طرح جیسے ہندوستان کو کبھی برطانوی علاقہ یا روسی تسلط کے بعد افغانستان کو روسی علاقہ کہا جاتا تھا۔

کفار کی مصنوعات کا استعمال: اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کفار کی مصنوعات استعمال کی ہیں۔ لہٰذا کفار کی مصنوعات کا استعمال جائز ہوگا(۲)۔ ان کے توپ، مشین اور دیگر

---

(۱) صحیح مسلم ج۲ ص ۲۰۲، جامع ترمذی ص ۲۳۹ کتاب اللباس باب ماجاء فی لبس الجبة والخفین، ابوداؤد ج۲ ص ۲۰۳ (مختار)

(۲) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے ومن فوائد الحدیث الانتفاع بثیاب الکفر حتّی یتحقق نجاستها لأنّه ﷺ لبس الجبة الرومیة ولم یتفصل(جمع الوسائل ۱/ ۱۵۱)(مختار)

اسلحہ کا استعمال بھی جائز ہیں۔ان کے بنائے ہوئے کپڑے طہارت کی تحقیق کے بغیر بھی پہننا جائز ہیں۔ جبکہ ان کی نجاست کی یقینی دلیل یا غالب امکان نہ ہو۔کئی بار نبی کریم ﷺ نے کفار کا بنایا ہوا کپڑا بطور تحفہ قبول کیا ہے اور اسی موقع پر پہنا بھی ہے۔

ہاں وہ ملبوسات جو کفار استعمال کر کے پھینک دیں۔اور ہمارے ہاں لنڈا بازاروں میں فروخت ہوتے ہیں۔انہیں استعمال سے قبل دھونا ضروری ہے۔کیونکہ غالب خیال یہ ہے کہ ان پر نجاست مثلاً شراب وغیرہ گری ہوگی۔اوران کی تطہیر کا خاطر خواہ انتظام بھی نہیں ہوتا۔ضیقة الکمین نبی کریم ﷺ عموماً کھلے آستینوں والا کپڑا پہنتے۔تاکہ وضوء اور دوسرے کاموں کیلئے آستین آسانی کے ساتھ چڑھائے جاسکیں۔اور اسباغ الوضوء میں فرق نہ آئے۔اب بھی اگر تنگ آستینوں کا کپڑا وضوء کے لئے رکاوٹ ہو۔ تو نہیں پہننا چاہیے۔اور اگر وضوء کی تکمیل میں رکاوٹ نہیں تو حرج نہیں۔بعض ائمہ حدیث (۱) کا خیال ہے کہ یہ غزوہ تبوک کا موقع ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے شامی جبہ پہنا تھا۔اور ظاہر ہے کہ سفر کے دوران تنگ آستینوں والے کپڑے پہننے میں سہولت ہوتی ہے۔مجاہد لوگ ویسے بھی ہلکے پھلکے اور تنگ لباس استعمال کرتے ہیں جس میں تگ و دو آسان ہو۔فوجیوں کیلئے مخصوص وردی بھی اسی لئے بناتے ہیں۔لہٰذا آپ ﷺ نے یہ جبہ جنگی مصالح کے تحت پہنا تھا۔جبکہ اقامت کے دوران کھلے آستینوں کا کپڑا آپ ﷺ کو پسند تھا۔اور صحابہ کرامؓ کی آستینیں بھی کھلی ہوتی تھیں۔

---

(۱)ابوداؤد اور امام احمد نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔جمع الوسائل (اصلاح الدین)

۹۔ باب ماجاء فی عیش النبی ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے گزر اوقات کا بیان

عربی میں عیش زندگی گزارنے کو کہتے ہیں۔ یہ عاش یعیش معیشۃ کا مصدر بھی ہے۔ اور عیش سے "مایعاش بہ الرجل" کا معنی بھی لیا جاتا ہے۔ یعنی زندگی کے وہ لوازم جو زندگی کی بقا کیلئے ضروری ہیں۔ اور روٹی، کپڑا، مکان جیسی بنیادی ضروریات جن پر انسان کی زندگی کا دارومدار ہے۔ ہم جسے گزارہ اور گزر اوقات کہتے ہیں عیش کہلاتا ہے۔ تو اس باب میں نبی کریم ﷺ کے گزارے کا بیان ہے۔ یعنی کہ آپ ﷺ کو وقت گزارنے کی چیزیں میسر تھیں یا نہ تھیں۔ پھر عیش کیلئے بالکل بنیادی چیز کھانا ہے کیونکہ اسی پر بدن کا قوام اور دارومدار ہے۔ تو اب اس بات کا بیان ہوگا کہ آپ ﷺ کی روٹی سالن وغیرہ کی کیفیت کیا تھی۔ عیش اڑاتے تھے، یا محض قوت لایموت پر گزارا تھا؟ بہرحال یہاں عیش کو کھانے سے خاص کیا گیا ہے۔ آج کل عرب ملکوں میں روٹی طلب کی جاتی ہے تو کہتے ہیں اعطنی عیش کذا۔ (اتنی روٹی دے دو)

<u>تکرار باب عیش کی وجہ:</u> یہاں ایک سوال اٹھتا ہے کہ یہ باب امام ترمذیؒ بعد میں تفصیل سے لا رہے ہیں۔ تو اس تکرار کی کیا ضرورت تھی۔ وہاں بھی اسی فقر و فاقہ اور جفاکشی کا بیان مقصود ہے۔ اس کے جواب میں بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ گزشتہ زمانہ تصنیف میں ترتیب ابواب کا اتنا اہتمام نہ تھا۔ تکرار سے احتراز کوئی اہم بات نہ تھی لیکن یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ اسلاف نے اتنی نظم و ضبط، دقیقہ سنجی اور جامعیت کے ساتھ کتابیں لکھی ہیں۔ کہ وہ آج کل کے مصنفین کے لئے چیلنج ہیں۔ لہٰذا اس مقام پر زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام ترمذیؒ نے یہ باب دو جگہ سہواً درج کیا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ بہتر جواب یہ ہے کہ امام ترمذیؒ نے قصداً ایسا کیا ہے جس میں دراصل اس بات کو اشارہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا اس قسم کا گزارہ اور تنگ و ترش زندگی اختیاری اور دائمی تھی۔ اضطراری نہ تھی تاکہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ نبی کریم ﷺ کو دولت ملتی نہ تھی، اور غربت و تنگدستی کی وجہ سے قوت لایموت پر اضطراراً گزارہ کرتے تھے۔ پھر جب مدینہ میں خوشحالی

آئی تو پُر تکلف زندگی اپنائی ہوگی۔تو امام ترمذیؒ اس وہم کا دفعیہ کرتے ہوئے اس بات پر تنبیہ کرنے کیلئے دو باب لائے ہیں۔کہ آپ ﷺ کی زندگی کی ابتداء اور انتہاء ایک جیسی ہے۔مکہ میں ہو یا مدینہ میں یہ فاقہ کشی اور زہد وقناعت زندگی کے تمام ادوار پر محیط ہے۔

ملا علی قاریؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اس باب میں نبی کریم ﷺ کی اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کی زندگی کے حالات بیان کرنا مقصود ہوں۔اور آگے جو طویل باب آرہا ہے اس میں نبی کریم ﷺ اور اس کے اہل خانہ کا خصوصی ذکر کرنا مقصود ہو۔گویا پہلے اس دور کی عمومی غربت بیان ہوئی اور آخر میں خود نبی کریم ﷺ کے زہد وقناعت سے اجتناب کا ذکر ہے۔

جبکہ علامہ بیجوریؒ نے دونوں بابوں میں فرق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دراصل یہاں پر نبی کریم ﷺ کی زندگی کی کیفیت تنگی اور کفاف پر اکتفاء کا بیان مدنظر ہے۔جبکہ آگے جو باب آرہا ہے اس میں بنیادی طور پر ماکولات ومشروبات کا ذکر ہے جو کہ ناکافی اور غیر معیاری ہونے کے باعث آپ ﷺ کے زہد وفقر اور ترفہ اور تعیش سے اجتناب کو اجاگر کرتی ہیں۔مگر اس اعتزار کے باوجود ایک ہی عنوان اور تقریباً ایک ہی مقصد کے حامل ہونے کی وجہ سے دونوں بابوں کو الگ الگ لانے کو انہوں نے نامناسب خیال کیا ہے۔

(۱) حدّثنا قتيبة بن سعيد ثنا حمّاد بن زيد عن أيوب عن محمّد ابن سيرين قال كنّا عندأبی هريرة و عليه ثوبان ممشّقان من كتّان فيتمخّط فی احدهما فقال بخ بخ يتمخّط أبو هريرة فی الكتان لقد رأيتنی و أنّی لاخرّ فيما بين منبر رسول الله ﷺ و حجرة عائشة مغشيًّا علّی فيجئی الجائی فيضع رجله علی عنقیُ يُریٰ انّ بی جنوناً و ما بی جنون و ما هو الّا الجوع (۱)۔

ترجمہ: ابن سیرینؒ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس تھے وہ کتان کی دو چادروں میں ملبوس تھے جو مشق سے رنگی ہوئی تھیں۔حضرت ابو ہریرہؓ نے

---

(۱)صحيح بخاری ۱۰۸۹/۲ كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة باب ماذكر النبی ﷺ وحضّ علی اتفاق اهل العلم، جامع ترمذی ۶۱/۲ كتاب الزهد باب ماجاء فی معيشة اصحاب النبی ﷺ (مختار)

ان میں سے ایک سے ناک صاف کیا۔ پھر تعجب کے ساتھ فرمایا کہ واہ واہ۔ ابوہریرہ کتان کے کپڑے سے ناک صاف کرتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں منبر نبوی ﷺ اور حضرت عائشہؓ کے حجرے کے درمیان بے ہوش ہوکر گر پڑتا۔ پھر کوئی آتا اور مجھے مجنون سمجھ کر میری گردن پر علاج کی نیت سے اپنا پاؤں رکھ دیتا تھا۔ حالانکہ مجھے جنون وغیرہ کچھ نہیں ہوتا تھا۔ یہ حالت تو صرف بھوک کی شدت کے سبب ہو جاتی تھی۔

وعلیه ثوبان ممشقان من كتّان. یعنی مشق سے رنگی ہوئی دو چادریں آپ پہنے ہوئے تھے۔

مشق: مشق ایک خاص قسم کی سرخ خوشبودار مٹی ہے۔ جسے طین احمر بھی کہتے ہیں۔ کپڑے کو اس سے رنگ دیا جاتا ہے تو وہ خوشبودار ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے سرخ کپڑے کو مُمَشّق کپڑا کہتے ہیں۔ آج کل بھی بعض خوشبودار صابنوں میں اس مٹی کی اقسام کو شامل کیا جاتا ہے۔ صاحب صحاح کی تحقیق کے مطابق پٹ سن کی قسم کا ایک پودا ہے جسے اردو میں السی کہتے ہیں۔ اس کی چھال کی تاروں سے بُنا ہوا پردہ بہت باریک اور ملائم ہوتا ہے۔ اور اس سے جو کپڑے بُنتے ہیں اسے کتان کہتے ہیں۔ یہ اس عہد کا بیش قیمت کپڑا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ ممشق بھی تھا۔ ابوہریرہؓ ایسے کپڑے سے ناک صاف کرتے ہیں۔ اور تعجب وحیرت کے انداز سے اظہار تشکر کرتے۔ تنگی کا زمانہ یاد کرتے ہیں۔

ابوہریرہؓ اور سرخ کپڑے کا استعمال: اب یہ بات کہ یہ تو سُرخ کپڑا ہے جس کا استعمال ممنوع ہے اور یہ کہنا بھی درست نہ ہوگا کہ یہ تحریم سے پہلے کی بات ہے۔ کیونکہ یہ وفات النبی ﷺ کے بعد کی بات ہے۔ اس کا جواب یا تو یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے محض بیان جواز کے لئے یہ کپڑا پہنا ہوگا۔ تاکہ اس بات پر تنبیہ ہو کہ اس کا استعمال ناجائز نہیں۔ ملا علی قاریؒ نے بھی اس سلسلے میں جتنے اقوال لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک قول اباحت کا بھی ہے۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ رنگدار اور معطر و منقش کپڑا اس وقت استعمال کرنا ناجائز ہے جب انسان میں غرور اور تبختر پیدا کرنے کا سبب بنے۔ اور اگر یہ خطرہ نہ ہو تو تحریم بھی نہیں ہوگی۔ اور ابوہریرہؓ کے ہاں تکبر کہاں۔ جبکہ بعض حضرات نے اس اعتراض کا ایک اور دقیق جواب دیا ہے۔ وہ یہ کہ یہ چادر مشق کے ساتھ رنگی گئی تھی۔ جو سرخ مٹی ہے اور شیطان لعین کو مٹی سے سخت نفرت ہے۔ انسان کو سجدہ نہ

کرنے کے لئے تو یہی عذر اس نے بیان کیا تھا کہ خلقتنی من نار و خلقته من طین. بہر حال شیطان کو مٹی سے فطری دشمنی ہے۔اس لئے اس کے ساتھ رنگے ہوئے کپڑے کے استعمال سے خوش ہونا تو کجا وہ دور بھاگتا ہے جبکہ سرخ رنگ سے ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اس سے شیطان خوش ہوتا ہے۔اور پھر مٹی سے رنگدار ہونے کے سبب تکبر سے بھی بعید ہے۔

بخ بخ: باء مفتوحہ اور خاء ساکنہ کے ساتھ عموماً استعمال ہوتا ہے۔دوسری لغتیں بھی اس میں ہیں۔کسی بات پر راضی اور خوش ہو کر کسی امر کی تعظیم کے موقعہ پر یہ کلمہ بولا جاتا ہے۔

ابو ہریرہؓ پرانے وقتوں کو بھلاتا نہیں۔اور بھلانا مناسب بھی نہیں۔ ہمارے بزرگوں نے طالب علمی میں کتنی تکلیفوں میں وقت گزارا ہے۔نہ چھت نہ پنکھا، درختوں کے نیچے وقت گزارتے۔طلبہ گھر گھر روٹی مانگنے جاتے۔اگر آج ہم اپنی حالت کا ان حالات سے موازنہ کریں تو ہم کتنی عیش وعشرت کی زندگی گزارتے ہیں۔برکتیں دراصل ان کی زندگی میں تھیں۔جنہون نے ان تکالیف وشدائد میں علم حاصل کیا ہے وہی حقیقی علماء تھے۔ہمیں تو آج اپنی حالت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

ابو ہریرہؓ بھی شکر اور تحدیث بالنعمة کے طور پر خود سے کہتے ہیں۔کہ واہ واہ اب تو مزے ہیں۔پہلے کھانے کو کچھ نہ ملتا تھا اور آج بیش قیمت کپڑے سے ناک صاف کرتے ہیں۔یہ وہ زمانہ تھا جب آپ ایک علاقے کے گورنر تھے۔

إنّي لأخِرُّ الخ خرّ یخرّ باب ضرب سے گرنے کے معنی میں آتا ہے یعنی میں حضرت عائشہؓ کے حجرے اور منبر رسول ﷺ کے درمیان بے ہوش ہو کر گر جاتا۔اسی جگہ کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا" مابین قبری و منبری روضة من ریاض الجنّة "(۱) بعض روایات میں منبر کی بجائے حضرت ام سلمہؓ کا حجرہ مذکور ہے۔یعنی حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کے حجروں کے درمیان میں گر جاتا تھا۔

لیکن یہ کوئی تعارض نہیں کیونکہ مذکورہ دونوں چھوٹے چھوٹے حجرے قریب قریب تھے۔اور دونوں کے دروازے مسجد کی جانب کھلتے تھے۔تو یہ تقریباً ایک ہی جگہ کا نام ہے۔یا پھر جواب یہ ہے کہ یہ دو

(۱) بخاری جلد ۱ ص ۱۵۹ باب فضل مابین القبر والمنبر، ۲۵۳ باب بلا ترجمة (مختار)

الگ الگ واقعوں کا بیان ہے۔ اور اگر واقعہ ایک ہو تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بیہوشی کی حالت میں انسان ایک جگہ بیہوش ہو کر گر جاتا ہے۔ لیکن پھر قلابازیاں کھاتے ہوئے دوسری جگہ تک پہنچ جاتا ہے۔ شاید آپؓ کو بھی کچھ اس قسم کا واقعہ پیش آیا ہے۔ رجلہ علی عنقی الخ مرگی اور جنات کی وجہ سے جب آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے۔ تو لوگوں کے ہاں اس کے علاج کے لئے مختلف ٹونے ٹوٹکے کئے جاتے ہیں۔ شاید اس زمانے میں مرگی کے علاج کا یہی طریقہ رائج ہو کہ مریض کی گردن پر پاؤں رکھ دیا جائے۔ جیسا کہ اب بھی بعض لوگ جوتا سونگھاتے ہیں۔ اس لئے شاید ابو ہریرہؓ کے ساتھ یہ برتاؤ کیا گیا۔ حالانکہ آپؓ کے قول کے مطابق آپ کو مرگی وغیرہ کا عارضہ نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ بھوک کی شدت ہی اس بیہوشی کا سبب ہوا کرتی تھی۔

صحابہ اور حضور اقدس ﷺ کی فاقہ کشی: اب سوال یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی عیش کا بیان کرنا مقصود ہے۔ لیکن یہاں تو صحابیؓ کے عیش کا بیان ہو چکا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو بہت قریب کے صحابی ہیں نبی کریم ﷺ تو بہت دور کے صحابی کی بھی یہ حالت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کچھ گھر میں موجود ہوتا تو ضرور حضرت ابو ہریرہؓ کو دے دیتے۔ اور ان کی یہ حالت نہ ہوتی۔ لیکن آپ ﷺ کے پاس یقیناً کچھ نہیں تھا ورنہ آپ ﷺ کے مقرب خاص اور محبوب طلبہ کی یہ حالت کیوں ہوتی۔ اس طرح اس روایت سے نبی کریم ﷺ کی فقر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

(۲) حدثنا قتیبة ثنا جعفر بن سلیمان الضبعیّ عن مالک بن دینار قال ما شبع رسول الله ﷺ من خبز قطّ ولا لحم الاّعلیٰ ضفف قال مالک سالت رجلاً من أهل البادیة ما الضفف فقال ان یتنا ول مع النّاس(۱).

ترجمہ: مالک بن دینار فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے روٹی یا گوشت سے کبھی بھی سیر ہو کر نہیں کھایا مگر ضفف پر۔ مالکؒ کہتے ہیں میں نے ایک بدوی سے ضفف کے معنی پوچھے تو اس نے کہا کہ ضفف کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کے ساتھ کھانا کھایا جائے۔

(۱) تفرد بهذا الحدیث الامام الترمذی

مالک بن دینار: مشہور زاہد تابعی ہیں۔ بصرہ کے رہنے والے تھے ۱۳۰ھ میں یا اس کے قریب وفات پائی(۱)۔لہٰذا یہ حدیث مرسل ہوگی۔ بلکہ بعض اقوال کے مطابق یہ روایت حضرت حسن بصریؒ کے واسطہ سے روایت کی گئی ہے جو یہاں سند میں مذکور نہیں۔

ما شبع رسول اللہ ﷺ من خبز الخ(۲) یعنی فاقہ کشی کی یہ حالت تھی کہ نہ کبھی روٹی پیٹ بھر کر کھائی نہ گوشت کبھی پیٹ بھر کر کھانے کو ملا۔

الاعلی ضفف ضفف کا ترجمہ بعد میں خود امام ترمذیؒ ذکر کر رہے ہیں۔یعنی''**ان یتناول مع الناس** ''بعض شراح نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جب آپ کسی کے ہاں مہمان بنتے تھے یا دعوت پر جاتے۔تب کہیں پیٹ بھرنے کے لئے کافی کھانا آپ ﷺ کو ملتا۔لیکن علامہ بیجوریؒ اور علامہ عبدالرؤف مناویؒ شارح شمائل نے اس کو ہفوۃ کہہ کر اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ بات جناب رسول اللہ ﷺ کی شان کے مناسب نہیں بلکہ یہ تو ہم اپنے حق میں برداشت نہیں کرتے کہ کوئی ہمارے بارے میں یہ کہے کہ گھر میں تو پیٹ بھر کر نہ کھائیں اور دوسروں کے ہاں پیٹ بھر کر کھائیں۔کیونکہ یہ تو بخل کی صورت ہے۔لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آپ ﷺ کے لئے عیب نہیں کیونکہ صحابہؓ آپ ﷺ کو بہت زیادہ محبت اور اصرار کے ساتھ لے جاتے۔ان کا مقصد یہی ہوتا تھا کہ آپ ﷺ پیٹ بھر کر کھائیں۔اس سلسلے میں عموماً میزبان تکلفات سے بھی کام لیتے ہیں۔اور ضابطہ یہ ہے کہ اگر میزبان مرغ، پلاؤ اور گوشت وغیرہ تکلفات کا انتظام کر کے کھلانے کی خواہش کرے اور مہمان پھر بھی نہ کھائے تو میزبان کو ضرور تکلیف پہنچے گی۔اس صورت میں مہمان کے زیادہ کھانے سے میزبان کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔چنانچہ نبی کریم ﷺ بھی ان حضرات کی دلجوئی اور خاطر داری کے لئے ایسا کرتے۔باقی گھر میں کچھ ہوتا نہ تھا کہ پیٹ بھر کر کھالیں۔

---

(۱)روی عن أنس مات سنة ثلاثين ومائة(مناوی علی هامش جمع الوسائل ۱/۱۰۰) كان ابوه من سبی سجستان وقيل من كابل روی عن أنس بن مالک وابن سيرين وعطاء بن ابی رباح وعنه أبان بن يزيد وصدقة بن موسیٰ ذكره ابن حبان فی الثقات وقال كان يكتب المصاحف بالاجرة ويتقوت باجرته(تهذيب التهذيب ۱۰/۱۳)(مختار)

(۲)بعض نسخوں میں ولالحم کے ساتھ لا ذکر نہیں اس لئے جہاں لا مذکور ہے تو نفی کی تاکید مقصود ہے اور جہاں لا نہیں تو وہ ماقبل پر عطف کی وجہ سے نفی کا معنی پایا گیا(مختار)

لیکن اس کلام کا ایک اور معنیٰ بھی ہے جس پر مذکورہ اعتراض وارد نہیں ہوتا۔جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ ساتھیوں کے ساتھ ہی کھانا کھاتے جو کچھ گھر میں ہوتا مہمانوں یا ساتھیوں کے لئے حاضر کردیتے تھے۔ایسے موقع پر جب تک مہمان پیٹ بھر کر نہ کھاتے۔آپ ﷺ بھی ان کے ساتھ تناول فرمایا کرتے تھے۔جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ آپ ﷺ بھی دوتہائی پیٹ بھر کر کھالیا کرتے تھے(۱)۔

---

(۱) راقم الحروف کو بقیۃ السلف حضرت الاستاد سیدی واستاذی حضرت مولانا عبدالحنان جہانگیروی (جو صاحب کتاب زین المحافل کے ماموں ہیں) تلمیذ رشید حضرت مدنیؒ نے فرمایا تھا کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی عادت مبارک تھی کہ آخر تک مہمانوں کے ساتھ کھانے میں شریک رہتے تھے۔اور مہمانوں کے لئے عموماً ایک ہی برتن میں ایک سالن لایا جاتا تھا اور سارے مہمان اسی برتن کے گرد جمع ہوکر اسی برتن میں کھاتے تھے۔اور اگر کبھی مہمان زیادہ ہوتے تو دو برتنوں میں سالن رکھ کر دیا جاتا تھا۔اور اپنے ہاتھوں سے مہمانوں میں روٹی تقسیم کرتے تھے اور ساتھ ساتھ تھوڑا تھوڑا خود بھی مہمانوں کے ساتھ کھاتے تھے(مختار)

۱۰۔ باب ماجاء فی خف رسول اللّٰہ ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے موزوں کے بیان میں

اس سے قبل لباسوں میں سے بعض کا بیان ہو چکا ہے۔ درمیان میں نبی کریم ﷺ کی عیش کا ذکر آچکا ہے۔ اور اس کی توجیہ بھی ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اب پھر بعض ان اشیاء کا ذکر ہے جو لباس کے قبیلے سے ہیں۔ موزے بھی چونکہ پہنے جاتے ہیں۔ اس لئے اس باب میں اس بات کا بیان ہوگا کہ نبی کریم ﷺ نے موزے استعمال کئے ہیں۔ اور یہ کہ آپ ﷺ کے متعدد موزے تھے۔ چار جوڑے موزے تو آپ ﷺ کو خیبر کی غنیمت سے ملے تھے۔

موزے پہننے کے آداب: موزے پہننے کے کچھ آداب ہیں۔ مثلاً یہ کہ دوسرے لباس کی طرح ان میں بھی پہلے دایاں موزہ پہننا چاہیے۔ نیز پہننے سے قبل ان کو جھاڑ دینا چاہیے تاکہ اگر حشرات الارض میں سے کوئی چیز ان میں داخل ہوا ہو وہ نکل جائے۔ بلکہ نبی کریم ﷺ نے اس بات کا حکم دیا ہے۔ طبرانی کی ایک روایت میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ انسانی تقاضے کیلئے ایک موقع پر باہر گئے ہوئے تھے۔ وہاں وضوء کی ضرورت ہوئی آپ ﷺ نے وضوء فرمایا اور جب موزے پہننے لگے۔ تو ابھی ایک موزہ ہی پہنا تھا کہ ایک سبز پرندہ آیا اور دوسرا موزہ اچک کر لے اُڑا۔ اور اوپر جا کر وہاں سے موزہ پھینک دیا۔ موزہ زمین پر آیا تو اس سے ایک سیاہ سانپ نکل آیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ تو ایک معجزہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے مضر مخلوقات سے پناہ کی دعا مانگی۔

واقعی یہ ایک بڑا معجزہ تھا کہ ہوا کے پرندے بھی آپ ﷺ کو تکلیف سے بچانے کی فکر میں تھے۔ ایک اور روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ اس وقت تک موزہ نہ پہنے جب تک اسے جھاڑ نہ لے۔ یہی کام جوتے اور بوٹ وغیرہ پہننے کے وقت کرنا چاہئے۔

(۱) حدثنا هناد بن السريّ ثنا وكيع عن دلهم بن صالح عن حجير بن عبدالله عن ابن بريدة عن أبيه أنّ النجاشيّ أهدىٰ للنبي ﷺ

خفین أسود ین ساذ جین فلبسهما ثمّ توضأ و مسح علیهما(۱).

ترجمہ: حضرت بریدہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نجاشی نے نبی کریم ﷺ کے پاس سیاہ رنگ کے دو سادہ موزے بطور ہدیہ بھیجے۔ نبی کریم ﷺ نے ان کو پہنا۔ پھر وضوء کیا اور دونوں پر مسح فرمایا۔

شاہ حبشہ نجاشی اور اس کی حکومت: ان النجاشی اهدیٰ نجاشی نون مفتوحہ یا مکسورہ اور تخفیف جیم کے ساتھ حبشہ کے امراء اور بادشاہوں کا لقب تھا۔ جیسے مصر کے قبطی بادشاہوں کا لقب فرعون تھا، روم کے بادشاہ کو قیصر اور فارس کے حکمران کو کسریٰ کہا جاتا تھا۔ یمن والے اپنے بادشاہ کو تبع اور شام والے ہرقل کہتے تھے اور ابھی قریب ہی مکہ کے گورنر کو شریفِ مکہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ نجاشی کا اصل معنی حکم نافذ کرنے والا ہوتا ہے۔ مؤرخین کے مطابق نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں حبشہ پر دو نجاشی گزرے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ان کو اسلام کی دعوت دی تھی۔ ان میں پہلے نجاشی نے بھی نبی کریم ﷺ کے پیغام کا بہت قدر و احترام کیا تھا۔ اگرچہ اس نے بظاہر اسلام قبول نہیں کیا البتہ ابتداء میں مسلمانوں کو پناہ کی ضرورت ہوئی تو حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ اس زمانہ میں یہی اول نجاشی ہی تھے جنہوں نے مسلمانوں کو پناہ دی تھی۔

لیکن یہ تحفے دوسرے نجاشی نے بھیجے تھے۔ ان کا نام اصحمہ بن بحر تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ ۶ھ میں اسلام لایا تھا جب حضرت عمرو بن امیہ ضمریؓ نبی کریم ﷺ کا خط آپ کے پاس لائے۔ اور ۹ھ کو نبی کریم ﷺ سے ملاقات کرنے کی غرض سے وہ مدینہ آرہے تھے کہ راستے میں وفات پائی۔ اور رسول اللہ ﷺ نے ان پر غائبانہ نماز جنازہ ادا کی تھی۔ ائمہ کا خیال ہے کہ ان کی لاش نبی کریم ﷺ کو پیش کر کے دکھا دی گئی تھی(۲)۔

---

(۱) سنن ابی داؤد ۱/۲۳ کتاب الطهارة باب المسح علی الخفین ۱/۴۲، سنن ابن ماجة کتاب الطهارة باب ما جاء فی المسح علی الخفین، جامع ترمذی کتاب الادب باب ماجاء فی الخف الاسود (مختار)

(۲) غائبانہ نماز جنازہ ائمہ مجتہدین کے ہاں اختلافی چلا آرہا ہے۔ علماء احناف اس کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ اور یہی راجح ہے۔ ذیل میں ایک استفتاء کا جواب جو احقر نے دارالعلوم حقانیہ کے دارالافتاء سے شائع کیا ہے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ)۔۔۔افادۂ عام کے لئے نظر قارئین ہے۔تا کہ مسئلے کی تفصیلی نوعیت سامنے آسکے۔

غائبانہ جنازہ پڑھانے کی شرعی حیثیت

اسلامی تعلیمات کی رو سے ایک مسلمان کے دوسرے مسلمانوں پر چند ایسے حقوق ہیں جن کی ادائیگی دوسرے مسلمانوں پر لازم ہے۔ان حقوق میں سے ایک حق کسی مسلمان کے مرجانے کے بعد اس پر نماز جنازہ پڑھنا بھی ہے۔

۔۔۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔کہ مسلمان کے مسلمان پر پانچ حق ہیں۔اس کی عیادت کرنا۔اس کی نماز جنازہ میں شریک ہونا۔اس کی دعوت کو قبول کرنا۔گویا کسی مسلمان پر نماز جنازہ پڑھنا اس کے حقوق ہی میں داخل ہے۔علماء احناف کثر اللہ سوادھم اور علماء مالکیہ کے ہاں نماز جنازہ میں میت کا امام کے سامنے حاضر اور موجود ہونا ضروری ہے۔علامہ حصکفیؒ نے لکھا ہے وشرطها ایضاً حضوره (ووضعه) وكونه هووا كثره (امام المصلی) وكونه للقبلة فلا تصح علی غائب ومحمول علی نحو دابة وموضوع خلفه الخ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ۲/۲۰۸)

اور علامہ حسن الشرنبلالی لکھتے ہیں والرابع (حضوره أو حضور اكثر بدنه أونصفه مع رأسه (مراقی الفلاح علی صدر طحطاوی ۲/۲۲۳) عمدۃ الفقہ میں لکھا ہے کہ میت کا وہاں موجود ہونا' پس غائبانہ نماز جنازہ درست نہیں ہے (بحوالہ فتاوی رحیمیہ ۷/۴۷) معلوم ہوا کہ نماز جنازہ کی صحت کیلئے میت کا امام کے سامنے ہونا ضروری ہے۔اس لئے ان حضرات کے ہاں غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا ناجائز ہے۔دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بیسوں صحابہ کرام اور خود آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی سیدہ رقیہؓ کا جب انتقال ہوا تو رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ میں موجود نہ تھے۔مگر اس کے باوجود آپ ﷺ نے ان کا غائبانہ نماز جنازہ نہیں پڑھایا۔حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے سیدہ رقیہؓ کی بیماری کی وجہ سے حضرت عثمانؓ کو غزوہ بدر میں جانے سے روکا تھا۔اور پھر مال غنیمت میں اس کیلئے حصہ بھی مقرر فرمایا تھا۔لیکن جب سیدہ رقیہؓ انتقال کر گئیں تو رسول اللہ ﷺ نے اُن کا غائبانہ نماز جنازہ نہیں پڑھا۔حالانکہ ان صحابہ کرامؓ اور سیدہ رقیہؓ کے ساتھ تو آنحضرت ﷺ کی کوئی کدورت نہ تھی جس کی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے ان پر نماز جنازہ غائبانہ نہ پڑھی اور ان کو اپنی رحمت سے محروم کر دیا۔یقیناً یہ اس بات کی دلیل ہے کہ غائبانہ نماز جنازہ مشروع و جائز نہیں ہے ورنہ اس وقت ایسا کوئی خاص عذر مانع بھی نہ تھا جو رسول اللہ ﷺ کو ان پر غائبانہ نماز پڑھنے سے روکے۔رسول اللہ ﷺ کی اپنی امت کیلئے شان یہ ہے کہ حريص عليكم بالمومنين رؤوف رحيم (الایۃ) اور یہ ممکن نہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی شان رحمت کے منافی اور خلاف کوئی کام کریں' مگر رسول اللہ ﷺ کا قصداً ارادۃً بلا کسی عذر کے ان سب کی غائبانہ جنازہ نہ پڑھنا اور نماز جنازہ سے احتراز فرمانا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ یہ امر مشروع نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔(بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ)۔۔۔۔۔مولانا مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ نے لکھا ہے کہ جب بیر معونہ کا مشہور حادثہ پیش آیا تو ستر (۷۰) قراء صحابہؓ کو دشمنان اسلام نے دھوکہ سے اپنے ساتھ لے جا کر بڑی بیدردی سے سب کو شہید کر دیا۔حضور ﷺ کو اس سے بہت ہی صدمہ ہوا۔ایک مہینہ تک فجر کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھی مگر ان کی غائبانہ نماز جنازہ نہیں پڑھی۔غزوہ موتہ میں خود حضور ﷺ نے حضرت زید بن حارثہؓ ، جعفر بن ابی طالبؓ ، عبداللہ بن رواحہؓ کی شہادت کی خبر دی۔ان کے لئے دعا مغفرت کی۔مگر غائبانہ نماز نہیں پڑھی۔اگر غائبانہ نماز جنازہ کا عام حکم ہوتا تو آپ ﷺ ہر ایک کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھتے۔اور آپ ﷺ کی اتباع کرتے ہوئے خلفائے راشدین اور دیگر صحابہؓ پڑھتے۔مگر اس کا صحیح طور پر ثبوت نہیں۔لہٰذا اب کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ غائبانہ نماز جنازہ پڑھے۔اگر پڑھے گا تو یہ خلاف سنت ہوگا۔

(فتاویٰ رحیمیہ ۷/۴۶)

اسی طرح عمدہ الفقہ میں ہے۔میت کا وہاں موجود ہونا...... پس غائبانہ نماز جنازہ درست نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ نے نجاشی اصحمہؒ شاہ حبشہ کی نماز جنازہ غائبانہ پڑھائی ہے۔یہ حضور ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے کہ آپ ﷺ کے سامنے سے جنازہ کے درمیان کے پردے اللہ تعالیٰ نے ہٹا دیئے۔اور اس کا جنازہ آپ ﷺ کے سامنے کر دیا۔دوسرے لوگ اس کو نہیں دیکھ رہے تھے۔تو آپ ﷺ کا امام ہو کر اس کی نماز جنازہ حاضر میت پر ہوا اور صحابہؓ کا آپ ﷺ کی اقتداء کرنا اگر چہ وہ میت کو نہ دیکھ رہے ہوں۔جائز ہوا۔اس میں کوئی مانع نہیں۔اگر غیر موجود میت پر نماز جنازہ جائز ہوتی،تو حضور ﷺ ان صحابہ کرامؓ کی نماز جنازہ غائبانہ ضرور پڑھتے۔جو کثیر تعداد میں آپ ﷺ سے دور فوت ہوئے اور دفن ہوئے۔حالانکہ باوجود آپ ﷺ کے نماز جنازہ پر بہت حرص فرمانے کے اور باوجود حکم الٰہی کے ان صلوتک سکن لهم اور آپ ﷺ نے فرمایا لايموتنّ أحدمنكم الااذ نتموني به فان صلٰوتي عليه رحمة لـه کسی کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا آپ ﷺ سے ثابت نہیں ہوا۔ پس کسی کی نماز جنازہ غائبانہ پڑھنا درست نہیں ہے۔ اور جن لوگوں نے حدیث نماز جنازہ بادشاہ حبشہ نجاشی سے سند پکڑ کر اس کا رواج ڈالا ہے یہ غلط اور غیر مشروع ہے۔(عمدۃ الفقہ بحوالہ فتاوی رحیمیہ ۷/۴۷) اور تقریباً یہی بات علامہ زیلعیؒ لکھتے ہیں: ويدلّ على ذلك أنّ النّبيّ ﷺ لم يصل على غائب غيره وقدمات من الصحابة خلق كثير وهم غائبون عنه وسمع بهم فلم يصل عليهم إلاّ غائبا واحداً (نصب الراية ۲/۲۹۱) اور اسی طرح علامہ عینیؒ نے بھی لکھا ہے ملاحظہ ہو (عمدة القاری ۸/۲۷۱) اور شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ نے لکھا ہے کہ ويدل على هذا أنه لم ۔۔۔۔۔۔(بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ)۔۔۔۔ینقل انه کان یصلّی علی کل الغائبین غیرہ (اوجز المسالک ۲/۴۴۵)

اور یہی رائے احناف کے علاوہ اکثر علماء کی ہے کہ غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں۔چنانچہ لامع الدراری میں ہے' وقالت الحنفیّة والمالکیّة لاتشرع ونسبه ابن عبدالبر إلی أکثر العلماء وقال ابن رشد أکثر العلماء علی أنّه لایصلّی إلاّعلی الحاضر...... وقال الشیخ ابن القیم لم یکن من هدیه ﷺ الصلوٰة علی کل میت غائب فقد مات خلق کثیر من المسلمین وهم غیب فلم یصل علیهم (لامع الدراری ۲/۱۲۱) امام بخاریؒ کا بھی یہی مذہب ہے اور اسی کو راجح سمجھتے ہیں اس لئے کہ انہوں نے تو حدیث نجاشی کو ذکر کیا ہے۔ مگر آپؒ نے باب اس حدیث کے مطابق صلوٰۃ علی الغائب نہیں باندھا۔اور امام بخاریؒ کا اصول یہ ہے کہ جب وہ حدیث شریف میں ذکر شدہ مسئلہ پر ترجمۃ الباب نہیں باندھے،تو وہ اس مسئلہ کے ہاں راجح نہیں ہوتا۔

چنانچہ شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ لکھتے ہیں فالأوجه عند هذا الضعیف أنّ الأمام البخاری مال فی هذه المسئلة إلیٰ قول الحنفیّة والمالکیّة وأشار بباب الصفوف علی الجنازة إلیٰ توجیهم المشهور إنّ الجنازة کانت مشاهدة ولذالم یبوب بباب الصلوٰة علی الغائب مع وجود الحدیث عنده وقد تقدم فی الاصل الخامس والستین من اصول التراجم أنّ الأمام البخاریّ قد لا یترجم علی مسئلة فی الحدیث لعدم روية بذلک (لا مع الدراری ۲/۱۲۲)

البتہ شوافع اور حنابلہ کے ہاں غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا جائز بلکہ مسنون ہے۔لیکن ان مذاہب کے بڑے بڑے اہل علم وفتویٰ اور درجہ اجتہاد پر فائز حضرات بھی یہ جواز اطلاقی نہیں بلکہ ضرورت اور مقید بالشروط ہیں۔مثلاً شیخ الاسلام ابن تیمیہ حنبلیؒ فرماتے ہیں کہ الصواب أنّ الغائب ان مات ببلد لم یصل علیه فیه صلّی علیه صلوٰة الغائب کما صلّی النّبیّ ﷺ علی النجاشی لأنّه مات بین الکفار ولم یصل علیه وان صلّی علیه حیث مات لم یصل علیه صلوٰة الغائب لأنّ الفرض قد سقط بصلوٰة المسلمین علیه (بحوالہ اوجز المسالک ۲/۴۴۵)

یعنی یہ غائبانہ نماز جنازہ اس وقت جائز ہے جب کوئی مسلمان دارالشرک میں فوت ہو چکا ہو۔اور وہاں اس پر نماز جنازہ پڑھانے والا کوئی نہ ہو۔ورنہ اگر اس پر نماز جنازہ پڑھا جا چکا ہو تو پھر اس پر غائبانہ نماز جنازہ جائز نہیں۔

شیخ الحدیثؒ نے لکھا ہے کہ اس مسئلہ کے بارے میں امام احمدؒ کے مذہبی اقوال میں مذکورہ بالا قول راجح اور صحیح ہے' والأقوال ثلاثة فی مذهب احمد واصحها هذا التفصیل والمشهور عند (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ) اصحابہ الصلوٰۃ علیہ مطلقا (اوجز المسالک ۲/۴۳۵) اسی طرح علامہ خطابیؒ غائبانہ نماز جنازہ کے جواز کی یہ شرط بیان کرتے ہیں کہ غائبانہ نماز جنازہ اس پر جائز ہے کہ جس جگہ میت کا انتقال ہوا ہو۔اور وہاں کوئی اس پر نماز جنازہ پڑھنے والا موجود نہ ہو۔شافعیہ میں سے علامہ رویانیؒ نے بھی اس قول کو پسند کیا ہے۔(درس ترمذی ۳/۲۹۹) اوراسی کوعلامہ ابن رشد قرطبیؒ اورامام ابوداوٗدؒ نے بھی اختیار کیا ہے۔لامع میں ہے کہ واما اختارہ شیخ الاسلام ابن تیمیۃ من التفصیل بہ جزم الخطابی والیہ مال ابن رشد فی مقدماتہ والیہ میل الامام ابی داؤد اذ ترجم علی حدیث الصلوٰۃ علی النجاشی بباب الصلوٰۃ علی المسلم یموت فی بلاد الشرک

(لامع الدراری ۲/۱۲۲)

علامہ خطابیؒ ابن تیمیہؒ وغیرہ حضرات کے مذکورہ قول کی تائید مسند ابی داوٗد طیالسی٬ سنن ابن ماجہ اور مسند احمد کی ذکرکردہ روایت سے ہوتی ہے کہ عن حذیفۃ بن اسیدؓ انّ النبیّ ﷺ قال انّ اخاکم مات بغیر ارضکم فقوموا فصلوا علیہ اورابن ماجہ کے الفاظ ہیں۔ عن حذیفۃ بن اسید انّ النبیّ ﷺ خرج لھم فقال صلّوا علی اخ لکم مات بغیر ارضکم قالوا من ھو؟ قال النجاشی (اعلاء السنن /۲۸۵) اور بعض حضرات کے ہاں جائز تو ہے مگراسی دن یااس کے قریب قریب وقت میں جس دن میت کاانتقال ہو چکا ہو۔ کما قال العینی واجازۃ بعضھم اذا کان فی یوم الموت اوقریب منہ (حاشیہ فیض الباری ۲/۴۷۰)

اورامام ابن حبانؒ فرماتے ہیں کہ غائبانہ نماز جنازہ کے جواز کی شرط یہ ہے کہ مصلی کی نسبت سے میت جانب قبلہ ہو لہٰذا اگرمیت کا علاقہ مصلی کی نسبت سے قبلہ کی جانب مخالف میں ہوتو غائبانہ نماز جائز نہ ہوگا۔(درس ترمذی ۳/۲۹۹) اورشوافع میں علامہ ابن قطانؒ فرماتے ہیں کہ غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا تو جائز ہے مگراس سے فرض کفایہ ساقط نہیں ہوتا چنانچہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں ماحکی عن ابن القطان احد اصحاب الوجوہ من الشافعیۃ انّہ قال یجوز ذلک ولا یسقط الفرض (فتح الباری ۲/۱۴۷) مذہب شافعیؒ واحمدؒ کے ارباب علم کے اقوال سے معلوم ہوا کہ یہ جواز مطلق نہیں بلکہ ضرورت کے تحت ہے۔اورضرورت کے تحت جوامر ثابت ہوجائے اس کومتعدی نہیں کیا جاسکتا۔

جہاں تک ان ایک دوواقعات کاتعلق ہے جن سے غائبانہ نماز جنازہ کا ثبوت بظاہر ملتا ہے۔وہ روایات درحقیقت معلول ہیں۔اس لئے کہ جب سنت مستمرۃ غائبانہ نماز جنازہ نہ پڑھنے کا ہے اوراصول یہ ہے کہ ایک دوجزئی واقعات کی وجہ سے سنت مستمرہ نہیں چھوڑی جاسکتی ہے اورخصوصاً جب ان واقعات کے وجوہ اوراسباب بھی معلوم نہ ہوں۔(بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ) کما قال العلامة انور شاہ الکشمیریؒ و بالجملة لاتترک سنة فاشیة مستمرة لاجل الوقائع الجزئیة التی لم تنکشف وجوهها ولم تدر أسبابها (فیض الباری ۲/۴۷۰) لہٰذا جہاں تک ان دلائل کا تعلق ہے جن کو غائبانہ نماز جنازہ کے جواز میں پیش کیا جاتا ہے' تو ان کے جوابات درجہ ذیل ہیں۔

<u>مجوزین حضرات کے دلائل:</u> جو حضرات غائبانہ نماز جائز سمجھتے ہیں ان کی بنیادی دلیل یہ حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حبشہ کے بادشاہ عبدالمسیح اصحمہ شاہ نجاشی پر غائبانہ نماز جنازہ پڑھایا تھا۔ عن أبی هریرة قال نعیٰ النبی ﷺ إلی أصحابه النجاشیّ ثم تقدم فصفوا خلفه فکبّر اربعاً (صحیح بخاری ۱/۱۷۶)

عن جابر بن عبداللّٰہ أنّ رسول اللّٰہ ﷺ صلی علی النجاشیّ فکنت فی الصف الثانی او الثالث (صحیح بخاری ۱/۱۷۶)

الجواب: لیکن اس روایت کے بہت سارے جوابات دیئے گئے ہیں۔ اولاً تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حضرت نجاشیؓ کی خصوصیت تھی کہ آنحضرت ﷺ نے ان پر غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی۔ اس لئے کہ رسول اللّٰہ ﷺ نے ان کے علاوہ کسی اور پر کبھی بھی غائبانہ نماز جنازہ نہیں پڑھائی۔ جیسا کہ علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے لکھا ہے۔

ومن الاعتذارات ایضاً أنّ ذلک خاص بالنجاشی لأنّه لم یثبت أنّه ﷺ صلّی علی غائب غیره. (اعلاء السنن ۸/۲۸۳) اور علامہ ابن عبدالبرؒ نے لکھا ہے کہ وقال الحنفیة والمالکیة لاتشرع وإنّهم قالوا ذلک خصوصیته ودلائل الخصوصیة واضحة (اوجز المسالک ۲/۴۴۵) اور علامہ خطابیؒ نے لکھا ہے کہ وقد ذهب بعض العلماء إلی کراهة الصلوٰة علی المیت الغائب زعموا أنّ النبیّ ﷺ کان مخصوصاً بهذا الفعل (عمدة القاری ۲/۱۷)

اور شیخ الحدیثؒ نے لکھا ہے واجیب ایضاً بأنّ ذلک خاص بالنجاشیّ لاشاعة أنّه مات مسلماً او ائتلاف قلوب الملوک الذی اسلموا فی حیاته (اوجز المسالک ۲/۴۴۵) اور علامہ بدرالدین العینیؒ لکھتے ہیں: وقع فی کلام ابن بطال تخصیص ذلک بالنجاشی فقال بدلیل إطباق الأمة علی ترک العمل بهذا الحدیث قال ولم اجد لأحد من العلماء اجازة الصلاة علی الغائب إلاّ ماذکره ابن زید عن عبدالعزیز بن أبی سلمة فانه قال اذا استوذن أنّه غرق اوقتل اوأکله السباع ولم یوجد منه شئی صلی علیه کما فعله بالنجاشی وبه قال ابن حبیب وقال ابن عبدالبر أکثر (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ)......... أهل العلم يقولون أنّ ذلک مخصوص به (حاشية فيض الباري ۴۷۰)

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ جنازہ غائبانہ نہ تھا بلکہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے سے تمام حجابات ہٹائے گئے تھے۔ اور پھر آنحضرت ﷺ نے نجاشی پر نماز پڑھائی۔ چنانچہ علامہ الواحدیؒ بلا اسناد حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں۔ قال كشف للنبيّ ﷺ سرير النجاشي حتىٰ راه وصلّى عليه اور علامہ ابن حبانؒ عمران بن حصینؓ سے روایت کرتے ہیں عن عمران بن حصين فقاموا وصفوا خلفه وهم لايظنون إلاّ أنّ جنازة بين يديه.

اور ابوعوانہ سے منقول ہے عن عمران بن حصينؓ فصلينا خلفه ونحن لانرى إلاّ أنّ الجنازة قدامنا اس معلوم ہوا کہ نجاشی پر جنازہ پڑھاتے وقت نجاشی کی نعش آنحضرت ﷺ کے سامنے تھی۔ اور جواز نماز کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

اعتراض: البتہ اس جواب پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ مجمع بن جاریہؓ فرماتے ہیں فصفنا خلفه صفين ومانرى شيئاً (فتح الباري ۱۸۹/۳) کہ ہم نے آپ ﷺ کی اقتداء میں دو صف بنائی اور ہم نے کچھ نہیں دیکھا۔ تو عمران بن حصینؓ کیسے کہتے ہیں کہ جنازہ آنحضرت ﷺ کے سامنے تھا۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے ممکن ہے کہ یہ نجاشیؓ کے جنازے سے یہ حجابات بعض حضرات کے حق میں تو اٹھائے گئے ہوں۔ تو ممکن ہے کہ حضرت مجمعؓ ان حضرات میں سے ہوں جن کے حق میں حجابات باقی ہوں۔ (کمافی عمدۃ القاری) اور علامہ عثمانیؒ نے بھی یہی لکھا ہے والتوفيق كما افاده الشيخ بأنّها كشفت لبعض دون بعض (اعلاء السنن ۲۸۳/)

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ مانری شیأ کا تعلق مقتدیوں سے ہے کہ ہم مقتدیوں کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس میں آنحضرت ﷺ کی نفی نہیں۔ اور جواز صلوٰۃ جنازہ کیلئے اتنا بھی کافی ہے کہ میت امام کو نظر آئے۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں لكنّ أجاب بعض الحنفية عن ذلک بماتقدم من أنّه يصير كالميت الذي يصلّي عليه الامام وهويراه ولايراه المأمون فانّه جائز اتفاقاً (فتح الباري ۱۴۷/۲)

(۳) تیسرا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے مجبوراً اور ضرورت کے تحت اس کا جنازہ پڑھایا تھا۔ اس لئے کہ آپؓ ایسی جگہ پر تھے کہ وہاں اس پر نماز جنازہ پڑھانے والا موجود نہیں تھا۔ دوم اس نے آخر تک اپنا ایمان بھی چھپائے رکھا تھا۔ تو اس مجبوری کی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے اس پر نماز پڑھی ہے تاکہ اس کے ایمان کی اشاعت ہوجائے۔

كما قال العينيؒ و جواب آخر أنّه من باب الضرورة لأنّه مات بأرض لم يقم (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ)فیھا علیہ فریضۃ الصلوۃ فتعین فرض الصلوۃ لعدم من یصلی علیہ ثم (شرح ابی داؤد ۱۵۲/۶) اورعمدۃ القاری میں مزید لکھتے ہیں وقال الخطابی النجاشی رجل مسلم قد امن برسول اللّٰہ ﷺ وصدقہ علی نبوتہ إلاّ أنّہ کان یکتم ایمانہ الخ (عمدۃ القاری ۱۷۲/۸)

(۴) چوتھا جواب: اورایک جواب یہ بھی ہے نجاشی پر جنازہ سے مرادصلوۃ حقیقی نہیں بلکہ دعاہے کما قال الحصکفی و صلاۃ النبی ﷺ علی النجاشی لغویۃ قال ابن عابدین قولہ لغویۃ ای الدعا (ردالمحتار ۲۱۹/۲) اورعلامہ عینیؒ نے مصنف کے حوالہ سے حضرت حسنؒ بصری کاقول نقل کیاہے۔ وفی المصنف عن الحسن إنّما دعالہ ولم یصل وعلی ھذہ فلا اشکال ولا جواب (اوجز المسالک ۴۴۶/۲)

دوسرااستدلال: مجوزین حضرات کادوسرا استدلال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاویہ بن معاویہ المزنیؓ پر غائبانہ نماز جنازہ پڑھایا ہے۔چنانچہ علامہ عینیؒ لکھتے ہیں۔ روی الطبرانی فی معجمۃ الاوسط و کتاب (مسند الشامیین) من حدیث أبی أمامۃ قال کنّا مع رسول اللّٰہ ﷺ بتبوک فنزل جبریلؑ فقال یارسول اللّٰہ إنّ معاویۃ بن معاویۃ المزنیّ بالمدینۃ أتحبّ ان تصلّی علیہ الخ (عمدۃ القاری)

الجواب(۱) مگراس روایت سے استدلال کرنا بھی صحیح نہیں۔اس لئے اس روایت کی سندمین علاء بن زیاد ہے۔اور اس کے بارے میں علی بن مدینیؒ فرماتے ہیں یہ راوی احادیث وضع کیا کرتا تھا۔شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ نے لکھا ہے ولکن لایصحّ فإنّ فی الاسناد العلاء بن زیاد ویقال یزید قال علیّ بن المدینی إنّہ یضع الحدیث ۔ قال النوویؒ فی الخلاصۃ والعلاء ھذا ابن زید ویقال ابن یزید اتفقوا علی ضعفہ قال البخاریّ وابن عدیّ وأبوحاتم ھو منکر الحدیث (شرح ابی داؤد للعینی ۵۳/۶) (اوجز المسالک ۴۴۵/۲)

دوسراجواب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اگرچہ معاویۃ بن معاویۃ المزنی کی نماز جنازہ پڑھائی ہے لیکن حضرت معاویہؓ کا جنازہ آپ ﷺ کے سامنے تھا۔اوروہ تمام حجابات ختم ہوچکے تھے جوآپ ﷺ اورحضرت معاویہؓ کے درمیان تھے۔چنانچہ علامہ عینیؒ نے لکھا روی حدیث الطبرانی فی معجمۃ الأوسط وکتاب الشامیین من حدیث أبی أمامۃ قال کنّا مع رسول اللّٰہ بتبوک فنزل جبریلؑ فقال یارسول اللّٰہ أنّ معاویۃ بن معاویۃ المزنیّ.

مات بالمدنیۃ أتحبّ ان تطوی لک الارض فتصلّی علیہ ؟ قال نعم (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ)۔۔۔فضرب بجناحه على الأرض ورفع له سريره فصلّى عليه وخلفه صفان من الملائكة في كل صف سبعون الف ملك ثمّ رجع (عمدة القاری ۱۷۳/۸) اورالاصابہ میں حافظ ابن حجرؒ نے طبرانیؒ ابن مندہ اور بیہقی وغیرہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

عن أنس بن مالك قال نزل جبرئيل على النّبيّ ﷺ فقال يا محمد مات معاوية ابن معاوية المزنّي أتحبّ أن تصلي عليه قال نعم فضرب بجناحيه فلم يبقى أكمة ولا شجرة الاتضعضعت فرفع سريره حتى نظر إليه فصلى عليه وخلفه صفان من الملائكة كل صف سبعون الف ملك (الاصابة)

اورایک اورروایت میں ہے فوضع جبرئيل جناحه الايمن على الجبال فتواضعت حتى نظرنا الى المدينة (اعلاء السنن ۲۸۴/۲) بلکہ ایک اورروایت میں ہے قال جبرئيل فهل لك ان تصلى عليه فاقبض لك الارض قال نعم فصلّى عليه (اعلاء السنن ۲۸۴/۲)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ حضرت معاویہؓ بن معاویہ المزنیؓ کا جنازہ آپ ﷺ کے سامنے تھا۔اور جنازہ کے جواز کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ جنازہ امام کے سامنے ہو۔مقتدی جنازہ دیکھے یا نہ دیکھے' مقتدیوں کا دیکھنا ضروری نہیں۔ کماقال ابن عابدینؒ حتىٰ صلّى عليه الصلوة والسلام بحضرته فتكون صلوٰة من خلفه على ميت يراه إلامامرو بحضرته دون الما مومنين وهذا غير مانع من الاقتداء (ردالمحتار ۲۰۹/۲) اور شیخ الحدیثؒ نے لکھا ہے فتكون صلوٰته كصلوٰة الامام على ميت رأه ولم يره المامون ولاخلاف في جوازها (اوجز المسالك ۴۴۵/۲)

تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ حضرت معاویہؓ المزنی کی خصوصیت ہے اور یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا يا جبرائيل بما نال معاوية هذه المنزلة ؟ قال يحب قل هو الله احد وقرأته ايا ها جائيا وذاهبا وقائماً وقاعداً وعلى كل حال (اعلاء السنن ۲۸۴/۲)

اور یہ روایت جو مجوزین حضرات پیش کرتے ہیں بذات خود حضرت معاویہؓ کی خصوصیت پر دال ہے۔اس لئے کہ اگر غائبانہ نماز جنازہ مشروع ہوتو پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام کے سوال اتحب أن تصلي عليه ؟ وضربه بجناحيه بعد قول نعم کا کیا مطلب۔اس کا ظاہر مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث حضرت معاویہؓ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ) کی خصوصیت ہے۔اس لئے یہ روایت ہمارے لئے حجت ہے۔ہمارے اوپر نہیں۔(اعلاء السنن ۲۸۲/۳)

اب اس پوری تفصیل سے وضاحت کے ساتھ معلوم ہوا ہوگا کہ غائبانہ نماز جنازہ جائز نہیں۔جو ایک دو واقعات دور نبوی ﷺ میں رونما ہو چکے ہیں۔آنحضرت ﷺ نے غائبانہ نماز جنازہ پڑھی ہے۔اولاً تو چونکہ وہ جزئی واقعات ہیں۔اس لئے وہ کلی حکم کے لئے مستدل نہیں بن سکتے۔اگر ایسا ہوسکتا تو پھر ایک آدمی کی گواہی بھی جائز ہونی چاہیے۔اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت حزیمہؓ کے اکیلے گواہی کو حل مقدمہ میں دلیل اور حجت سمجھ کر قبول فرمایا تھا۔

لیکن ان کے علاوہ مقدمہ میں صرف ایک آدمی کی گواہی مقبول نہیں ہوگی۔اور نہ ایک آدمی کی گواہی پر دعویٰ ثابت ہوسکتا ہے۔تو جس طرح حضرت حزیمہؓ کی ایک فرد کی گواہی دو کے قائم مقام ہے۔اور یہ اس کی خصوصیت ہے۔اور یہ حکم دوسروں کی طرف متعدی نہیں ہوسکتا۔تو اسی طرح غائبانہ جنازہ بھی ان دو حضرات کی خصوصیت ہے۔اس لئے ان واقعات سے کلی حکم کے لئے استدلال درست نہیں۔ثانیاً درحقیقت یہ دونوں نماز جنازہ غائبانہ نہ تھے۔اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ اور میت کے درمیان حائل تمام حجابات ہٹا دیئے تھے۔جیسا کہ آنحضرت ﷺ سے جب مکہ مکرمہ میں کفار مکہ نے بیت المقدس کے بارے میں دریافت کیا۔تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ اور بیت المقدس کے درمیان تمام حجابات ہٹا دیئے۔اور بیت المقدس کو آپ ﷺ کے سامنے کر دیا۔اور آپ اس کو دیکھ کر کفار کے تمام سوالات کے جوابات دیتے رہے۔تو اسی طرح یہاں بھی ہوا کہ میتوں کو آپ ﷺ کے سامنے کر دیا گیا۔اور آپ ﷺ نے ان پر نماز جنازہ ادا فرمائی۔جس پر ذکر شدہ روایات دال ہیں۔اور نماز جنازہ کی صحت کیلئے اتنا ہی کافی ہے۔مقتدیوں کو جنازہ نظر آنا ضروری نہیں۔اس لئے یہ حقیقتاً غائبانہ نماز جنازہ نہیں تھے۔

ثالثاً اگر غائبانہ نماز جنازہ ہو بھی تب بھی آنحضرت ﷺ نے عذر کی وجہ سے ایسا کیا۔اس لئے کہ حبشہ میں اس پر نماز جنازہ پڑھانے والا کوئی نہ تھا۔اس نے اپنا ایمان بھی ظاہر نہیں کیا۔رسول اللہ ﷺ نے اس کے ایمان کی اشاعت اور فرض کفایہ کی تکمیل کے لئے نماز جنازہ پڑھائی۔تو اس ضرورت کے تحت کیئے گئے عمل کو کلی حکم کے لئے مستدل نہیں بنایا جاسکتا۔اس لئے کہ الضرورة تتقدر بقدر الضرورة اور یہاں پر یہ ضرورت بھی نہیں۔اس لئے کہ شہید عامر عبدالرحمٰن چیمہ صاحبؒ کا جنازہ اس کے آبائی گاؤں میں پڑھایا جاچکا ہے۔اور وہ فریضہ ادا ہو چکا ہے اس لئے اب اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔بعض لوگ اس کو ایصال ثواب سمجھتے ہیں۔مگر یہ نظریہ بھی صحیح نہیں۔اس لئے کہ ایصال ثواب کیلئے اور بھی بہت سارے اعمال موجود ہیں۔لہذا جو ایصال ثواب (بقیہ اگلے صفحہ پر)

خدمت اسلام کاثمرہ: علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ مذکورہ ہدیہ بھیجتے وقت نجاشی مسلمان نہیں ہوا تھا۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ وہ نجاشی تھا جو اسلام لانے سے قبل مر گیا تھا۔ لیکن اسلام اور صحابہؓ کا انہوں نے بھی احترام کیا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے ان کیلئے بھی دعائیں فرمائی تھیں۔ اور اسی کی برکت تھی کہ ان کی حکومت کو سینکڑوں سال تک دوام حاصل ہوا۔ ہمارے والد ماجد حضرت شیخ الحدیثؒ کے بقول حبشہ کا شاہ ھیل سلامی بھی انہی کے قبیلہ سے تھا۔ جن کا اقتدار ابھی چند سال قبل ایک فوجی انقلاب کے ذریعے ختم ہو گیا تھا۔ یہ لوگ تقریباً تیرہ سو سال سے حضور اکرمؐ کی دعاؤں کی برکت سے حکومت کرتے رہے۔ لیکن جب انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی کو شیوہ بنایا۔ اور سرکشی کو شعار بنایا تو اللہ تعالیٰ نے انکی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اور آج حبشہ میں بہت زیادہ مظالم ہو رہے ہیں۔ کمیونسٹ ممالک کے زیر اثر ہیں۔ یہاں مسلمان اقلیتوں پر ظلم ہوتا ہے۔

غیر مسلموں کے ہدایا سے سلوک: بہر حال نبی کریم ﷺ نے یہ ہدیہ قبول کر کے اس بات کی تعلیم دی کہ اگر روابط اور تعلقات اچھے ہوں تو کفار کا ہدیہ قبول کرنا جائز ہے۔ یہاں صرف خفین اسودین ہے۔ دوسری روایات کے مطابق انہوں نے اور بھی ہدایا بھیجے تھے۔ جن میں قمیص اور شلوار اور کچھ دیگر چیزیں بھی تھیں۔ لیکن یہاں اس حدیث میں صرف موزوں کا ذکر ہے۔

ساذجین دونوں سادہ تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر کھال ایسی خشک اور صاف کی جائے کہ بال چمڑے پر رہیں اور صاف نہ ہو تو اس سے بناء ہوا موزہ سادہ کہلاتا ہے۔ اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ

(بقیہ حاشیہ)۔۔۔۔ کتاب وسنت سے ثابت ہے اس کو اختیار کیا جائے۔ غائبانہ نماز جنازہ کتاب وسنت سے ایصال ثواب کیلئے مشروع نہیں ہے۔ بلکہ جو حضرات اس کے جواز کے قائل ہیں ان کیلئے یہ ایک مسنون عمل ہے۔ صرف ایصال ثواب کے لئے نہیں جس کی وضاحت جواب میں مذکور ہوئی ہے۔ اور اگر اس سے سیاسی مقاصد کا حصول یا عوام الناس کی توجہ حاصل کرنا ہو تو اس کیلئے بھی دیگر ذرائع اور اسباب ہیں۔ جن کو اختیار کرتے ہوئے سیاسی مقاصد اور عوام کی توجہ حاصل کی جا سکتی ہے۔ کسی غیر ثابت شدہ اور غیر مشروع عمل کو لوگوں میں مشہور کر کے شہرت حاصل کرنا اور اختلاف اور بے جا گفتہ وشنید کا دروازہ کھولنا اہل علم کو زیب نہیں دیتا۔ اور یہ بات کسی بھی صاحب علم پر مخفی نہیں کہ بلاضرورت دوسرے مذہب کے قول پر عمل تو کجا اپنے مذہب کے اندر مرجوح قول پر عمل کرنا اس پر فتویٰ دینا ناجائز اور خرق للاجماع ہے۔ اس لئے اس طرح کے اعمال سے پرہیز کیا جائے۔ واللہ علم وعلمہ اتم. مختار اللہ حقانی (مختار)

سادہ سے مراد غیر منقش ہے یا یہ کہ ان میں دوسرا رنگ نہ تھا یعنی خالص سیاہ رنگ کے تھے۔

مسح علیھما: یعنی آپ ﷺ نے موزے ملتے ہی پہن کر اس پر مسح فرمائی (۱)۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر کفار کی مصنوعات پر کوئی ظاہری نجاست نہ ہو تو اس کے ساتھ طہارت کا معاملہ ہوگا۔ نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ جو شخص جس مقصد کیلئے ہدیہ دے تو اس ہدیہ کو اس مقصد میں جلدی صرف کر دینا چاہیے۔ اس بات سے ہدیہ دینے والا خوش ہوتا ہے۔

یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسح تو تب ہوتا ہے جب موزہ طہارت کاملہ پر پہنا جائے اور پھر وضو ٹوٹنے کے بعد وضو کیا جائے لہٰذا یہاں بھی ہم یہی کہیں گے کہ عین اسی وقت مسح نہیں کیا ہوگا۔ بلکہ پہننے کے بعد جو وضو ٹوٹا تو بعد میں وضو کرتے ہوئے مسح کیا ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس حدیث سے مسح علی الخفین کا جواز بھی معلوم ہوتا ہے جو کہ تقریباً متواترۃ المعنی احادیث سے ثابت ہے۔

(۲) حدّثنا قتیبة بن سعید انا یحییٰ بن زکریا بن أبی زائدة عن الحسن بن عیاش عن أبی إسحاق عن الشعبیّ قال قال المغیرة بن شعبة أهدی دحیة للنبی ﷺ خفین فلبسهما وقال اسرائیل عن جابر عن

---

(۱) احناف کے ہاں مسح الخفین مطلقاً جائز ہے۔ چاہے موزے پہننے والا سفر میں ہو یا حضر میں۔ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا ہے **ماقلت بالمسح علی الخفین حتی جاء نی مثل ضؤ النهار**، علامہ مناویؒ نے فرمایا ہے کہ وقدروی فی **المسح ثمانون صحابیاً واحادیثه متواترة ومن ثمّ قال بعض الحنفیّة أخشیٰ ان یکون انکاره ای من أصله کفراً (مناوی علی هامش جمع الوسائل ۱/ ۱۵۶)** شرح عقائد میں حضرت انس بن مالکؓ کا فرمان مذکور ہے کہ آپؐ اہل السنۃ والجماعۃ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا **ان تحبّ الشیخین ولاتطعن فی الختنین وتمسح علی الخفین (شرح العقائد ص ۱۱۸)** اس لئے حافظ ابن مندہ اصفہانیؒ نے فرمایا ہے کہ مسح علی الخفین افضل ہے اس لئے کہ اسمیں اہل بدعت کیساتھ اختلاف ہے اور اس کے علاوہ اس میں اتباع حق اور اظہار سنت بھی ہے۔ (احکام الاحکام ۱/۲۰) اگرچہ علامہ نوویؒ نے غسل کو ترجیح دی ہے شرح مسلم للنووی ۱/۱۳۲) مگر حافظ ابن قیمؒ کی رائے اعدل الاقوال ہے فرماتے ہیں کہ **ولم یکن علیه السلام یتکلف ضد حالة التی علیهاقدماه بل ان کانت فی الخف مسح علیهما ولم ینزعهماوان کانتا مکشوفتین غسل القدمین ولم یلبس الخف لیمسح علیه وهذااعدل الاقوال فی مسئلة الافضل من المسح والغسل قاله شیخنا (زادالمعاد ۱/ ۲۹)(مختار)**

عامر وجبة فلبسهما حتى تخرّقا لا يدرى النبيﷺ أذكيّ هما ام لا

قال أبو عيسىٰ هذا هوا بو اسحٰق الشيبا نى واسمه سليمان(۱) .

ترجمہ: مغیرہ بن شعبہؓ فرماتے ہیں کہ دحیہ کلبیؓ نے دوموزے نبی کریمﷺ کو بطور ہدیہ پیش کئے تو آپﷺ نے ان کو پہنا۔ایک دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے موزے اور ایک جبہ پیش کیا۔تو آپﷺ نے انہیں پہنا۔یہاں تک کہ وہ پھٹ گئے۔نبی کریمﷺ کو یہ علم بھی نہ تھا کہ یہ موزے مذبوح جانور کی کھال کے تھے یا غیر مذبوح کے۔

اهدیٰ دحیه الخ حضرت دحیہؓ وہ صحابی ہیں جن کی صورت میں متشکل ہو کر حضرت جبریلؑ نبی کریمﷺ کے پاس وحی لایا کرتے تھے۔باب اول کی بارہویں حدیث کے ضمن میں ان کا تذکرہ گزر چکا ہے۔**فلبسهما** یہیں سے ترجمۃ الباب کا اثبات ہوتا ہے۔**وجبة الخ** حضرت عامر شعبیؒ سے روایت کرتے ہوئے اسرائیل نے موزوں کے ساتھ جبہ کا ذکر بھی کیا ہے۔یہ شامی جبہ تھا۔جسے نبی کریمﷺ نے پہنا بھی تھا۔

---

(۱)جامع ترمذی ۱/۳۰۶ کتاب اللباس باب ماجاء فی لبس الجبة والخفين (مختار)

۱۱. باب ما جاء فی نعل(۱) رسول اللہ ﷺ

حضوراقدس ﷺ کی جوتی مبارک کے بیان میں

جوتی مبارک کاذکر: عام طور پر نبی کریم ﷺ کے نعل ایسے ہوتے تھے جیسے کہ پلاسٹک کے بعض چپل ہوتے ہیں۔اوپر سے دوشراک یعنی پٹیاں ہوتی تھی (۲)۔حضرت تھانویؒ وغیرہ علماء نے پاپوش مبارک پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔اوران میں وہ نقش بھی کھینچا ہے۔علامہ بیجوریؒ لکھتے ہیں کہ وقد کانت نعله ﷺ مخصرة معقبة ملسنة کما رواه ابن سعد فی الطبقات(المواھب الدنیة ص ۸۰) یعنی نبی کریم ﷺ کا جوتہ درمیان میں تنگ تھا۔پچھلی طرف بھی باندھنے کی پٹی تھی اور آگے کی طرف زبان جیسی نوکدارتھی۔اس کی بہت سی برکتیں ہیں۔بعض لوگ اسے بطورتعویذ استعمال کرتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے قدم کی خاک بھی مبارک ہے۔پاپوش کے متبرک ہونے میں تو بات ہی نہیں۔بلکہ اس کے نقش میں بھی بڑی برکتیں ہیں۔حضرت تھانویؒ نے زادالسعید کے نام سے ایک رسالہ تحریر کیا ہے۔اوراس میں وہ برکات وفیوضات لکھی ہیں جن کا تجربہ مشائخ کو ہوا ہے۔عموماً اہل اللہ حضرات اس نقش سے توسّل کرتے ہیں۔سر پر رکھ کردعا کرتے ہیں۔ایک شاعر شیخ محمد بن محمد الجزریؒ نے بہت خوبصورت انداز میں نعل مبارک کے نقش سے متعلق اشعار کہے ہیں۔فرماتے ہیں کہ

یا طالباً تمثال نعل نبیّہٖ	ھا قد وجدت الی اللقاء سبیلا
فاجعله فوق الراس واخضعن له	وفتغال فیه واولدالتقبیلا

---

(۱)نعل جوتے ،اور پاپوش کوکہاجاتا ہے۔مواہب الدنیۃ میں لکھا ہے کل ماوقیت به القدم عن الارض(ص ۶۹) یہ لفظ مصدر بھی استعمال ہوتا ہےاوراسم بھی اور یہاں دونوں کا احتمال ہےوھی ھنامحتملة الاثنین

(اتحافات ص ۱۲۱)(مختار)

(۲)رسول اللہ ﷺ کے پاپوش کے بارے میں مواہب ۸۰ میں وقد کانت نعله ﷺ مخضرة معقبه ملسنة کہ آپ ﷺ کی پاپوش کی کمر باریک پشت والے عقب والاتھا(جسکے تسمہ سےایڑی باندھی جاتی تھی)اوراس کا اگلا حصہ زبان کی طرح نکلا ہواتھا یہ تینوں آنحضرت ﷺ کے نعلین مبارک کے امتیازی صفات تھیں(مختار)

من یدعی الحب الصحیح فانّہ یثبت علی ما یدعیہ دلیلا(۱)

اس باب میں کل گیارہ احادیث ہیں۔نعل مبارک کا نقشہ اس باب کی تمام احادیث پڑھ کر ذہن میں نقش ہو جائے گا۔

(۱) حدّثنا محمّد بن بشّار ثنا أبو داؤد ثنا همّام عن قتادة قلت لأنس بن مالک کیف کان نعل رسول اللّٰہ ﷺ قال لهما قبالان(۲)۔

ترجمہ: حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انسؓ سے دریافت کیا۔کہ نبی کریم ﷺ کے نعل مبارک کیسے تھے؟انہوں نے فرمایا ہر ایک جوتی میں دو دو تسمے تھے۔

نعل مؤنث سماعی ہے۔اس لئے کیف کانت کہنا بھی درست تھا۔لیکن تانیث غیر حقیقی ہونے کی بناء پر کانَ بھی درست ہے۔جیسے طلع الشمس اور طلعت الشمس علاوہ ازیں تانیث حقیقی نہ ہونے کی بناء پراس کی تاویل ملبوس سے ہوسکتی ہے۔اوراس کے ساتھ مذکر کا معاملہ ہوسکتا ہے۔ لهما قبالان ہر نعل کے دو دو قِبال تھے(۳)۔ قِبال قاف کے کسرہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔اوراس کی تفسیر میں اختلاف ہے۔راجح بات یہ ہے کہ قبال وہ پٹی نما چمڑا ہوتا ہے جو انگلیوں کے درمیان سے گزر کر تلوے کے اگلے حصے کو اوپر کی پٹیوں یعنی شراک سے ملاتی ہے۔اسے شِسْع بھی کہا جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کے پاپوش مبارک میں دو قبال تھے۔جن میں سے ایک انگوٹھے اور ساتھ والی دوسری انگلی کے درمیان سے گزرتا تھا۔ دوسرا درمیانی انگلی اور اس کے ساتھ والی چھوٹی انگلی کے

---

(۱) اے طلب کرنیوالے!نقش نعل شریف اپنے نبی ﷺ کے آگاہ ہوجا۔تحقیق پالیا تو نے اس کے ملنے کا راستہ۔
پس رکھ اس کو سر پر اور خضوع کر اس کیلئے اور مبالغہ کر خضوع اور پے در پے اس کو بوسے دے۔
جو شخص دعوی کرے سچی محبت کا پس بے شک وہ قائم کرتا ہے اپنے دعوے پر دلیل کو(مختار)

(۲)صحیح بخاری ج۲ص ۸۷۱ کتاب اللباس باب قبالان فی نعل الخ ، سنن ابی داؤد ۲/ ۲۱۷ کتاب اللباس باب الانتعال، ابن ماجه ص۲٦٧ کتاب اللباس باب صفة النعال ، جامع ترمذی ۱/ ۳۰٦ کتاب اللباس بابماجاء فی نعل النبی ﷺ(مختار)

(۳)لهماقبالان کا یہ مطلب ہے کہ لکل واحدمنهما قبالان یاتقسیم الاحاد علی الاحاد ہے کہ ہر ایک نعل کیلئے ایک قبالہ تھا۔تو یہاں لغوی لحاظ سے دونوں مطلب مراد ہوسکتے ہیں۔مگر حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ہر نعل کے دو قبالے تھے(مختار)

درمیان سے گزرتا تھا(۱)۔

(۲) حدّثنا أبو کریب محمّد بن العلاء ثنا وکیع عن سفیان عن خالد الحذّاء عن عبداللّٰہ بن الحارث عن ابن عباس قال کان لنعل رسول اللّٰہ ﷺ قبالان مثنی شراکھما(۲)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے نعلین کے بالائی تسمے دہرے تھے۔

خالد الحذّاء یہ جلیل القدر تابعی تھا۔ حذاء موچی کو کہتے ہیں۔ راوی اور روایت میں اتفاقی موافقت ہے کیونکہ روایت جوتی کے بارے میں ہے اور راوی بھی موچی ہے(۳)۔

<u>پیشہ باعث عار نہیں</u>: گزشتہ زمانے میں یہ کوئی شرم کی بات نہیں تھی کہ کوئی شخص اپنے یا اپنے آبائی پیشے کی طرف نسبت کرے۔ خواہ وہ کچھ بھی ہو۔ بہت سے فقہاء، محدثین اور مفسرین کے ساتھ آپ کو حلوائی، دباغ، وراق، حدّاد، اور حذّاد وغیرہ کے الفاظ ملیں گے۔ جو مذکورہ پیشوں کی طرف ان کی نسبت کو ظاہر کرتے ہیں۔

قبالان مثنیٰ شراکھما پاؤں کے اوپر گزرنے والی پٹی کو شراک کہا جاتا ہے۔ پشت پا کا یہ تسمہ ثنی دہرا یعنی دو تہوں والا تھا۔

(۳) حدّثنا احمد بن منیع و یعقوب بن إبراھیم ثنا أبو احمد الزبیریّ ثنا عیسیٰ بن طھمان قال اخرج الینا أنس بن مالک نعلین جرداوین لھما قبالان قال فحدّثنی ثابت بعد عن أنس

---

(۱) شیخ بیجوریؒ نے لکھا ہے و کان ﷺ یضع احد القبالین بین الابھام والتی تلیھا والآخر بین الوسطیٰ والتی تلیھا (المواھب اللدنیة ص ۷۰) (مختار)

(۲) سنن ابن ماجة ص ۲۶۷ کتاب اللباس باب صفة النعال، مصنف ابن ابی شیبة ۸ / ۳۱۱ (مختار)

(۳) علامہ مناویؒ نے لکھا ہے کہ آپؒ نے موچیوں میں شادی کی تھی۔ شیخ عبدالرؤف نے آپؒ کے بارے میں لکھا ہے ثقة امام حافظ تابعی جلیل القدر کثیر الحدیث واسع العلم مات سنة احدیٰ و اربعین و مائة۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ چونکہ آپؒ اکثر و بیشتر موچیوں کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے اس لئے آپؒ کو الحذاء کہا جاتا ہے۔ (مختار)

أنّهما کانتا نعلی رسول اللہ ﷺ(۱).

ترجمہ: عیسیٰ بن طھمان کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ نے ہمیں دو جوتے جن پر بال نہیں تھے۔نکال کر دکھلائے۔ بعد میں مجھے ثابتؒ نے حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہوئے بتایا کہ یہ نبی کریم ﷺ کی جوتیاں تھیں۔

جرداوین یہ جرداء کا تثنیہ ہے اس نعل کا نام ہے جس پر بال نہ ہوں۔اور بعض کے خیال میں جرداء وہ جوتا ہے جس پر چھوٹے چھوٹے بال ہوں۔ نبی کریم ﷺ اس قسم کے نعل اس لئے پسند فرماتے کہ اس میں نفاست زیادہ ہوتی ہے۔گرد اور مٹی سے پاک ہوتے ہیں۔اس کے مقابل میں شعراوین ہوتے ہیں۔یعنی وہ جوتے جن پر ابھی بال باقی ہوں یا جس پر لمبے بال ہوں۔یعنی ان کی چمڑے کی دباغت بالوں کے ساتھ ہوئی ہو۔پرانے زمانے میں لوگ سادگی کے سبب شعراوین کا استعمال کرتے تھے لیکن تہذیب کی قہقری رجعت کی وجہ سے آج یہ فیشن کے طور پر پسند اور استعمال کئے جاتے ہیں(۲)۔

(۴) حدثنا اسحاق بن موسی الانصاری قال معن قال ثنا مالک ثنا سعید بن ابی سعید المقبت عن عبید بن جریح انه قال لا بن عمر رایتک تلبس النعال السبتیة قال انی رأیت رسول اللہ ﷺ یلبس النعال التی لیس فیها شعرو یتوضأ فیها فانی احب ان البسها(۳).

---

(۱) صحیح بخاری ۱/۴۳۸ کتاب الجهاد باب ماذکر من درع النبی ﷺ الخ(طبقات ابن سعد ۱، ۲/۱۶۷) (مختار)

(۲) تبرک باثار الصالحین کا مسئلہ: اس روایت سے تبرک باثار الصالحین بھی ثابت ہے۔الاتحافات میں ہے ویوخذ من الحدیث ندب حفظ آثار الصالحین ،حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ فرماتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس آنحضرت ﷺ کا ایک جبہ تھا جسے وہ بیمار لوگوں کو پہنایا کرتے تھے اور اس کو دھو کر اس کا پانی لوگوں کو بغرض شفاء پلایا کرتے تھے۔جس سے وہ ٹھیک ہو جاتا۔ہمارے اکابر علماء دیوبند بھی تبرک باثار الصالحین کے قائل تھے اور ہیں مگر یاد رہے کہ تبرک میں ایسا مبالغہ کرنا صحیح نہیں جو شرک کی حدود کو کراس کرے۔(مختار)

(۳) صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۲۸ کتاب الوضوء باب غسل الرجلین فی النعلین الخ و کتاب اللباس ج ۲ ص ۸۷۰ باب النعال السبتیة وغیرها، صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۸۶ باب بیان ان الافضل ان یحدم الخ ،کتاب الحج ، سنن ابی داؤد ج ۱ ص ۲۶۳ کتاب المناسک باب وقت الاحرام، سنن نسائی ۱/۳۱ کتاب الطهارة باب الوضوء فی النعل(مختار)

ترجمہ: عبید بن جریجؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت ابن عمرؓ سے پوچھا کہ آپ بغیر بالوں کے جوتے پہنتے تھے۔(اس کی کیا وجہ ہے)تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ایسے جوتے پہنتے ہوئے دیکھا تھا جن پر بال نہیں ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ ان میں وضوء بھی فرماتے تھے اس لئے میں ان کو پہننا پسند کرتا ہوں۔

النعال السبتیّۃ. سبتیّۃ سبت سے ہے جس کے معنی کاٹنے کے ہیں۔اور سبت سین کے کسرہ کے ساتھ گائے کی اس کھال کو کہتے ہیں جو خوب پکائی جا چکی ہو کیونکہ اس طرح اس کے بال گر جاتے ہیں۔ ہفتے کے دن کو بھی یوم السبت اس لئے کہتے ہیں کہ اس دن اللہ تعالیٰ تخلیق کائنات سے فارغ ہو چکے تھے۔ نیز یہ یہود کی تعطیل کا دن تھا۔وہ بھی اس دن ہر کام سے کٹ جاتے تھے۔ بہر حال سبتیّۃ وہ جوتیاں ہیں جن کے بال چمڑے کی دباغت کے وقت صاف کئے گئے ہوں۔ چونکہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں اس قسم کا چمڑا عام طور پر استعمال نہیں ہوتا تھا۔ نیز قیمتی ہونے کی وجہ سے ہر کسی کو میسر نہ تھا۔

چنانچہ صحابہ کرامؓ عموماً ایسے جوتے نہیں پہنتے تھے جیسا کہ بخاری شریف کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے۔اس لئے غالب خیال یہی تھا کہ نبی کریم ﷺ نے بھی یہ استعمال نہیں کئے ہونگے۔ یہ تو صرف مترفین اور دولتمند لوگوں کو میسر ہو سکتا تھا۔ادھر حضرت ابن عمرؓ ان کا استعمال کرتے تھے حالانکہ حضرت ابن عمرؓ تو اتباع سنت میں بہت مشہور تھے۔ بلکہ آپؓ تو اس قدر محو فی السنۃ تھے کہ اسی نسبت سے آپؓ کو تمام صحابہ میں شہرت حاصل تھی۔ نبی کریم ﷺ کے پیچھے جاتے تو جہاں نبی کریم ﷺ کا قدم مبارک پڑتا وہیں آپؓ بھی قدم رکھتے تھے۔حج کے سفر کے دوران راستے میں پوچھتے رہتے کہ نبی کریم ﷺ سفر حج میں کس راستے پر گئے ہیں۔ جہاں نبی کریم ﷺ اتفاقاً بھی بیٹھے تھے آپؓ بھی وہاں بیٹھتے۔ جہاں آپ ﷺ نے قیام کیا وہاں آپؓ نے بھی قیام کیا۔ جہاں آپ ﷺ نے پیشاب کیا وہاں آپؓ بھی پیشاب کرنے بیٹھے۔ ساری عمر ایسی اتباع اور پیروی کرتے رہے۔

<u>سوال کا منشا:</u> لہٰذا سائل کے سوال کیلئے منشا پیدا ہوا کہ تم نے تو بالوں سے صاف چمڑے کی جوتیاں پہنی ہیں۔اور رسول اللہ ﷺ کو یہ کب میسر تھے۔لہٰذا تمہارا یہ عمل خلاف سنت تو نہیں۔ نیز اعتراض کا منشا یہ

بھی ہوسکتا ہے کہ اس قسم کی جوتیاں پہننا عیش پرستوں کا شیوہ ہے۔ جواب میں حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے سنت کی مخالفت نہیں کی۔ نہ عیش پرستی میں مبتلا ہوں بلکہ میرا یہ عمل بھی اتباع سنت میں داخل ہے۔ کیونکہ میں نے خود نبی کریم ﷺ کو وہ جوتے پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ جس پر بال نہیں تھے۔ اور آپ ﷺ اس میں کبھی کبھی وضوء بھی فرماتے تھے۔ جس طرح کبھی چپل سمیت پاؤں دھوئے جاتے ہیں(۱)۔ اور تنجسّ اور تلویث کا اندیشہ نہ ہو تو ایسا جائز بھی ہے۔ جس طرح کہ حدیث مذکور سے اشارہ ملتا ہے۔

(۵) حدّثنا إسحٰق بن منصور ثنا عبدالرزاق عن معمر عن ابن أبی ذئب عن صالح مولیٰ التوأمة عن أبی هريرة قال كان لنعل رسول اللّٰه ﷺ قبالان(۲).

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے نعل مبارک کے دو تسمے تھے۔

توأمةؓ: مولی التوأمه توأمہ ربیعہ بن امیہ بن خلف کی بہن ہیں صحابیہ ہیں۔ چونکہ ولادت کے وقت دوسری بہن کے ساتھ جڑواں پیدا ہوئی تھی اس لئے ان کو توأمہ کہا جانے لگا۔

(٦) حدّثنا أحمد بن منيع ثناأبوأحمد أنا سفيٰن عن السّدّی حدّثنی من سمع عمرو ابن حريث يقول رأيت رسول اللّٰه ﷺ يصلّی فی نعلين مخصوفتين(۳).

---

(۱) علامہ نوویؒ نے لکھا ہے کہ اس روایت کا معنیٰ یہ بھی ہے کہ أنّه يتوضأ ويلبسها بعدو رجلان رطبان فاناأحبّ ان البسها اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جوتا پہننا چاہئے۔ البتہ مسجد کے احترام اور مقبرہ کے احترام کی وجہ سے احتراماً جوتے باہر اتارنا اصول ہے۔ (مختار)

(۲) جامع ترمذی ۱/۴۴۰ ابواب اللباس باب ماجاء فی نعل النبیّ ﷺ شرح السنة ۱۲/۴۷ باب النعل، كتاب اللباس (مختار)

(۳) مسنداحمد ۴/۳۰۷ وابوالشيخ ۱۳۵ (مختار)

ترجمہ: عمرو بن حریثؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ایسے جوتوں میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا جن میں دوسرا چمڑا سلا ہوا تھا۔

عن السدی: سدہ گھر کے دروازے کو کہتے ہیں۔ یہاں مسجد کوفہ کے بڑے دروازے کی طرف نسبت کر کے اسماعیل بن عبدالرحمٰن کو سدی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ مسجد کے مین گیٹ کے ساتھ بیٹھ کر چہرہ کے آنچل اور سر کے دوپٹے فروخت کیا کرتا تھا۔ یہ شیعہ راوی ہے لیکن محدثین اس کی توثیق کرتے ہیں۔

عمرو بن حریثؓ: **من سمع عمرو بن حریث،** عمرو بن حریثؓ قرشی مخزومی صحابی ہیں۔ نبی کریم ﷺ کو دیکھا سنا۔ اور نبی کریم ﷺ نے ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر ان کے لئے دعا بھی فرمائی۔ نبی کریم ﷺ کی وفات کے وقت ان کی عمر صرف بارہ سال تھی۔ بعد میں کوفہ میں رہائش اختیار کی اور ایک زمانہ میں کوفہ کے امیر بھی رہے۔ یہیں ۸۵ھ میں وفات پائی۔ ان سے ان کے بیٹے کے علاوہ کئی دوسرے تابعین نے بھی روایت کی ہے۔ یہاں پر سدی جس شخص سے روایت کرتے ہیں۔ وہ مجہول ہے شراح نے لکھا ہے کہ یہ راوی غالباً عطاء بن السائب ہونگے۔

مخصوفتین، یعنی ایسے جوتوں میں جس کے تلوے دو تہوں کے سلے ہوئے مضبوط تھے۔ خصف کے معنی "**خیاطة الجلد علی الجلد طیاً علی طیٍّ**" کہا جاتا ہے۔ یعنی خصف مضبوطی کے لئے ایک چمڑے کو دوسرے چمڑے پر لگانے اور چپکانے کو کہتے ہیں۔ گویا مراد یہ ہے کہ اس کا تلو ادھرا تھا۔ لیکن چونکہ بعض احادیث میں ایک تلوے کا ذکر ہے۔ اس لئے بعض شراح نے مخصوفتین کا معنی مرقعتین لیا ہے یعنی آپ ﷺ پیوند لگے جوتے پہنے ہوئے تھے۔ قرآن کریم میں آدمؑ وحواؑ کے بارہ میں ہے **فطفقا یخصفان علیھما من ورق الجنة.(الآیة)**

جوتوں میں نماز: یہاں سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ جوتوں کی یقینی طہارت کے صورت میں ان کے ساتھ نماز پڑھنا جائز ہے۔ جوتوں کی طہارت ان میں چلنے اور ان کے زمین کے ساتھ رگڑنے کی وجہ سے بھی حاصل ہو جاتی ہے لیکن جوتوں میں نماز ادا کرنا کوئی فرض اور لازم بات بھی نہیں۔ جس طرح کہ بعض

اہل نجد محض ظاہر حدیث کو دیکھ کر اس کا التزام کر لیتے ہیں(۱)۔

(۷) حدثنا إسحق بن موسى الأنصاری أنا معن أنا مالک عن أبی الزناد عن الأعرج عن أبی هريرة أنّ رسول الله ﷺ قال لا يمشينّ احدكم فی نعل واحد لينعلهما جميعا او ليحفهما جميعا(۲).

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی ایک جوتی پہن کر نہ چلے یا تو دونوں جوتیاں پہنے یا دونوں نکال دے۔

لینعلھما: یہ لفظ یا تو یائے مضمومہ کے ساتھ باب افعال کا امر غائب ہے۔اس صورت میں ہما کی

---

(۱) ۸۴،۸۳؁۱۳ھ میں مجھے پہلے حج اور زیارت حرمین کی سعادت حاصل ہوئی۔رمضان شوال ذی قعدہ مدینہ منورہ میں قیام کی سعادت نصیب ہوئی۔ان ایام میں ہمارے کئی اہم پاکستانی دوست جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں زیر تعلیم تھے۔ان کی رفاقت میں مجھے بھی رحلات علمیہ اور آثار مبارکہ دیکھنے کیلئے سفر کا اتفاق ہوا۔ایک بار خیبر کی طرف رحلۃ تھا۔راستہ میں ایک شب غالبًا وادی القریٰ میں پڑاؤ ہوا۔رحلۃ کے مشرف علامہ ناصر الدین البانیؒ (علم الجرح والتعدیل کے معروف عالم ومصنف) طلبہ سے اپنے مسلک پر سختی سے عمل کرانے پر سختی سے کاربند رہے۔ساری جماعت کو صف واحد میں کھڑے ہو کر جوتے پہنے ہوئے نماز کراتے رہے۔اور کسی کو اس کے خلاف کرنے کی اجازت نہ دی۔یہی حال درس کے دوران ان کے تفردات کا رہا۔میں باضابطہ طالب علم نہیں تھا پاکستانی احباب کے تعلق سے مجھے بھی بعض دروس میں اعزازی شرکت کی سعادت ملی۔میری شیخ البانیؒ سے نوک جھونک جاری رہتی۔محترم کا کاخیل منع کرتے رہے مگر میں باضابطہ طالب علم نہ ہونے کی وجہ سے جھجک محسوس نہ کرتا۔یہ پاکستانی طلبہ جو میرے نہایت مخلص دوست اور مہربان بنے رہے۔میرے صدیق صمیم مولانا عبداللہ کاکاخیلؒ مولانا محمد حسن جان شیخ الحدیث پشاور، مولانا عبدالرزاق سکندر مہتمم جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی ان کے علاوہ علامہ احسان الٰہی ظہیر مرحوم تھے۔سفر حج کے رفیق خاص محب مکرم حضرت مولانا قاری سعید الرحمٰن کاعلپوری راولپنڈی تھے۔(سمیع الحق)

(۲)صحیح بخاری ۸۷۰/۲ کتاب اللباس باب لایمشی فی نعل واحد، صحیح مسلم ۲۰۵/۲ کتاب اللباس والزينة باب استحباب لبس النعال الخ.فی اليمنیٰ الخ، سنن ابی داؤد ۲۱۷/۲ باب فی الانتعال كتاب اللباس باب فی الانتعال، مؤطا امام مالک ص ۵۱۰، كتاب الجامع باب ماجاء فی الانتعال (مختار)

ضمیر قدمین کو رجع ہوگی جن کا ذکر دلالۃً موجود ہے۔اور یا پھر یائے مفتوحہ کے ساتھ ثلاثی مجرد سے امر کا صیغہ ہے اس صورت میں ہما کی ضمیر نعلین کو راجع ہونی چاہیے۔اگرچہ قدمین کو راجع ہونے کا احتمال بھی ہے۔نعل اور انعال دونوں پاؤں میں جوتی پہننے کو کہتے ہیں اور احفاء اس کی ضد ہے۔بہرحال مطلب یہ ہے کہ یا تو دونوں پاؤں میں جوتیاں ہوں یا ایک بھی نہ ہو۔ایک پاؤں برہنہ ہونے سے آدمی مسخرہ سا بن جاتا ہے۔

<u>نہی کا راز:</u> نبی کریم ﷺ امت کو بہترین معاشرتی آداب کی تعلیم بھی دیتے تھے۔کہ اگر جوتیاں پہننے ہوں تو دونوں پاؤں میں ڈالو ورنہ برہنہ پا ہی بہتر ہے۔اور یہ تو جہالت اور سفاہت کی نشانی ہے کہ ایک پاؤں میں جوتا ہو اور دوسرا پاؤں برہنہ ہو۔دونوں پاؤں برہنہ ہوں تو بھی آدمی کم ازکم برا تو نہیں لگتا۔لیکن فقط ایک پاؤں برہنہ ہونے سے آدمی مسخرہ سا بن جاتا ہے۔جبکہ نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں **لیس لنا مثل السوء ان نجلس کالکلب**(۱)۔

علاوہ ازیں اس قسم کے عمل میں طبی لحاظ سے بھی بڑے نقصان ہیں۔ایک پاؤں اونچا اور دوسرا نیچے ہو تو اس سے جسم کو بہت زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔جسم تو زنجیر کی طرح کڑیوں کا ایک سلسلہ ہے بڑے باریک اور پیچیدہ پرزے ہیں۔جو اوپر سے گوشت سے ڈھکے ہوئے ہیں۔چلنے اور حرکت کے دوران اعضاء اور اس کے جوڑ توازن کے ساتھ حرکت کرتے ہیں۔اور اگر ایک پاؤں اونچا اور دوسرا نیچے ہو تو چلتے وقت یہ حرکت غیر متوازن ہو جاتی ہے جس سے اعضاء کی فطری وضع کو بہت نقصان پہنچتا ہے(۲)۔پھر اس صورت میں گرنے کا بھی زیادہ احتمال ہوتا ہے جو کبھی کبھی ہمیشہ کے لئے معذور کر دیتا ہے۔اطباء کی تحقیق کے مطابق اگر چلتے وقت توازن برقرار نہ ہو تو ریڑھ کی ہڈی اور جسم کے دیگر نظاموں کو نقصان پہنچتا ہے۔جو

---

(۱)ایک نسخہ میں لیحفهما کی بجائے لیخلعهما ہے پھر ضمیر صرف نعلین کو راجع ہو سکتی ہے۔(اصلاح الدین)

(۲) آج کل کے سائنس دان بھی یہی کہتے ہیں کہ ایک جوتا پہن کر چلنا انسانی صحت کیلئے صحیح نہیں۔ان کا کہنا ہے کہ انسانی جسم ایک اعصابی نظام کے تحت چل رہا ہے۔جس کا مرکز دماغ اور حرام مغز ہے۔جب آدمی کا ایک پاؤں ننگا اور دوسرا ڈھکا ہوا ہو تو اعصابی نظام کیلئے بہت نقصان دہ ہے۔اس سے کنگری کے درد میں(SHYAHTICA)مبتلا ہونے کا خطرہ ہے۔(مختار)

جسم میں مضر اثرات چھوڑتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اطباء کی اس رائے کو بہت پہلے اپنے مذکورہ ارشاد میں واضح فرمایا ہے۔فعلیه الف تحیة و سلام. لیکن یہ حکم بھی اس وقت کے لئے ہے جب کوئی عذر نہ ہو۔اور اگر کسی عذر کی وجہ سے چند قدم ایک ہی جوتے میں چلنا پڑے تو مضائقہ نہیں۔ مثلاً ایک جوتا ٹوٹ جائے اور کسی مناسب جگہ تک پہنچنے کے لئے یونہی جانا پڑا تو ناجائز بھی نہیں ہوگا۔ بلکہ خود نبی کریم ﷺ سے بھی اس قسم کا چلنا ایک جوتی میں ثابت ہے(۱)۔ جس کا محمل یہی ہوگا۔

بہر حال اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک جوتی میں نہیں چلتے تھے بلکہ وہ اس عمل سے دوسروں کو بھی منع کرتے تھے اور اس طرح ترجمۃ الباب سے مطابقت حاصل ہوگئی۔

(۸) حدّثنا قتيبة عن مالک عن ابی الزناد نحوه

(۹) حدّثنا إسحٰق ابن موسىٰ أنا معن أنا مالک عن أبی الزبير عن جابر أنّ النّبیّ ﷺ نهىٰ ان يا كل يعنی الرجل بشماله او يمشی فی نعل واحدة(۲).

ترجمہ: حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص بائیں ہاتھ سے کھائے یا ایک جوتہ پہن کر چلے۔

يعنی الرجل حضرت جابرؓ یا ابوالزبیر کی طرف سے یہ زیادۃ دراصل "یا کل" کی ضمیر کی تعیین ہے تا کہ یہ توہم نہ ہو کہ ضمیر جابرؓ کو راجح ہوگی۔اور "رجل" سے مراد اس جگہ شخص ہے کیونکہ عورت کے لئے

(۱)عن عائشةؓ قالت ربما مشی النبیﷺ فی نعل واحد(جامع ترمذی ۱/ ۳۰۷ باب ماجاء فی الرخصة فی النعل الواحدة) اور خود حضرت ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے ایک جوتے میں چلنا ثابت ہے۔عن عائشةؓ أنها مشت بنعل واحدة(جامع ترمذی ۱/ ۳۰۷) رسول اللہ ﷺ کا ایسا کرنا ضرورت کے وقت بیان جواز کیلئے تھا۔ ورنہ علماء نے لکھا ہے کہ بلا عذر ایک پاؤں میں جوتا پہن کر اور دوسرے کو خالی رکھ کر چلنا مکروہ تنزیہی ہے۔(مظاہر حق ۴/ ۲۰۸)(مختار)

(۲)صحيح مسلم ۲/ ۲۰۶ كتاب اللباس و الزينة باب النهی عن اشتعال الصماء الخ، سنن ابی داؤد باب فی الانتعال ۲/ ۲۱۷ مؤطا امام مالک ص ۲۱۷ كتاب اللباس باب النهی من الاكل بالشمال(مختار)

بھی یہی حکم ہے کہ نہ بائیں ہاتھ سے کھائے نہ ایک جوتا پہن کر چلے۔

یہ دونوں امور بلا عذر مکروہ ہیں جس کی وجہ پہلے گزر چکی ہے۔ ترجمۃ الباب سے مناسبت ''او یمشی فی نعل واحدۃ'' میں ہے کیونکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایسا کبھی نہیں کیا ہوگا۔

(۱۰) حدثنا قتیبة عن مالک ح و أنا إسحاق بن موسیٰ أنا معن أنا مالک عن أبی الزناد عن الأعرج عن أبی هریرة أنّ النبیّ ﷺ قال اذا انتعل احدکم فلیبدأ بالیمین واذا نزع فلیبدأ بالشمال فلتکن الیمنیٰ اوّ لهما تنعل وآخر هما تنزع(۱).

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے جب کوئی شخص جوتے پہنے تو پہلے دائیں جانب سے ابتداء کرے اور جب نکالے تو بائیں سے نکالے پس دایاں پاؤں جوتا پہننے میں مقدم اور نکالنے میں مؤخر ہونا چاہیے

دائیں سے ابتداء کیوں؟ فلیبدأ بالیمین الخ اس حدیث میں جوتے پہنتے وقت تیمن کا حکم دیا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا عمل اور سنت نبوی ﷺ کا ضابطہ یہ ہے کہ جو کام تشریف، کرامت اور تزئین کے باب سے ہے اس کو دائیں جانب سے شروع کرنا چاہیے(**کل ما کان من قبل التزین والتکرم والتشریف**) ورنہ بائیں جانب سے ابتداء کرنا مسنون ہوگا۔ کیونکہ دائیں جانب کو عنداللہ بھی شرافت اور محبوبیت ثابت ہے۔ چنانچہ اہل جنت عرش کے دائیں جانب ہونگے۔ انہیں اعمالنامے دائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے۔ کاتب حسنات دائیں طرف ہوتا ہے۔ پھر حسنات میزان کے دائیں پلڑے میں رکھ کر تولے جائیں گے(۲)۔

---

(۱) صحیح بخاری ۸۷۰/۲ کتاب اللباس باب ینزع فعل بالیسریٰ، سنن ابی داؤد ۲۱۷/۲ کتاب اللباس باب فی الانتعال، جامع ترمذی ۳۰۷/۱ کتاب اللباس باب ماجاء بأی رجل یبدأ اذاانتعل(مختار)

(۲) صاحب مظاہر حق علامہ قطب الدین محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ دایاں پاؤں بائیں پاؤں کے بنسبت زیادہ دیر تک رہے گا۔ گویا یہ دائیں پاؤں کے اعزاز واحترام کا ذریعہ ہے۔ اسی پر مسجد وغیرہ میں داخل ہونے اور نکلنے کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔ (مظاہر حق ۲۰۷/۴)(مختار)

(۱۱) حدّثنا أبو موسیٰ محمّد بن المثنّیٰ أنا محمّد بن جعفر أنا شعبة ثنا أشعث وهوا بن أبی الشعثاء عن أبیه عن مسروق عن عائشةؓ قالت کان رسول اللّٰه ﷺ یحبّ التیامن ما استطاع فی ترجله و تنعله و طهوره (۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنے بال کنگھی کرنے میں، جوتے پہننے میں اور وضوء میں حتی الوسع دائیں جانب سے ابتداء فرماتے تھے۔

فی ترجله و تنعله. اسی میں ترجمۃ الباب بھی ہے۔ کیونکہ اس میں پاپوشی سے متعلق نبی کریم ﷺ کی عادتِ مستمرہ کا بیان ہے کہ آپ ﷺ جوتے پہنتے وقت بھی دائیں جانب سے ابتداء فرماتے تھے۔ مذکورہ تین چیزوں میں تیمن منحصر نہیں۔ بلکہ لباس، تزیّن، اور دیگر عادات شریفہ میں آپ ﷺ دائیں جانب سے ابتداء فرماتے تھے۔ جس طرح کہ بعض احادیث میں ''وفی شأنه کله '' کا اضافہ بھی مروی ہے(۲)۔

(۱۲) حدّثنا محمّد بن مرزوق أبو عبیداللّٰه ثنا عبدالرحمٰن بن قیس أبو معاویة أنبانا هشام عن محمّدعن أبی هریرة قال کان لنعل رسول اللّٰه ﷺ قبالان و أبی بکر و عمرؓ و أوّل من عقد عقد او احداعثمانؓ(۳).

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے نعلین کے دو دو تسمے تھے۔ اسی طرح ابو بکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کے جوتوں میں بھی دو تسمے تھے اور سب سے پہلے حضرت عثمانؓ نے ایک قبال کے جوتے بنوائے۔

---

(۱) مسند احمد ۹۴/۶، ۳۰، طبقات ابن سعد ۱۶۸/۲ (مختار)

(۲) گویا اس حدیث مبارک میں یہ ضابطہ بیان ہوا کہ فضیلت والے کام کو دائیں طرف سے شروع کرنا مندوب ہے مثلاً جوتا پہننا، مسجد میں داخل ہونا، کنگھی کرنا، اور جو عمل ایسا نہ ہو اس کو بائیں طرف سے شروع کیا جائے مثلاً مسجد سے نکلنا، بیت الخلاء میں داخل ہونا، جوتا نکالنا۔ (مختار)

(۳) مجمع الزوائد ۲۴۳/۵ کتاب اللباس باب ماجاء فی الخفاف والنعال، طبرانی فی الصغیر ۹۲/۱ (مختار)

<u>اندازِ پاپوشی بدلنے کی وجہ:</u> أوّل من عقد عقدا و احدا عثمانؓ۔ چونکہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں فیشن تبدیل ہو چکا تھا۔ ایک قبال کی جوتیاں بننے اور استعمال ہونے لگی تھیں۔ اس لئے آپؓ نے بھی اسی طرز کی جوتیاں پہنیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپؓ نے یہ کام بطور بدعت کیا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس طرح لباس اور کپڑوں کی ہیئت اور ڈیزائن بدلتے رہتے ہیں جوتوں کے بھی زمانہ قدیم سے سینکڑوں ڈیزائن بدل چکے ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ سے قبل جوتیاں دو قبالوں کی بنتی تھیں۔ لیکن آپؓ کے زمانہ میں یہ ڈیزائن مقبول ہوا۔ اور ایک قبال کی ایسی جوتیاں استعمال میں آنے لگیں جن کا قبال انگوٹھے اور ساتھ کی دوسری انگلی کے درمیان ہوتا تھا۔ اور چونکہ لباس میں توسع ہے۔ اس لئے آپؓ نے بھی تمام لوگوں کی طرح ایک ہی قبال کے جوتے پہننا شروع کر دیئے۔

علاوہ ازیں آپؓ کے اس عمل سے بیان جواز بھی ہوتا ہے تاکہ یہ تو ہم لوگوں میں پیدا نہ ہو کہ ایک قبال کی جوتیاں پہننا جائز نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کے عمل کے خلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو آج مختلف قسم کے بوٹ اور چپل وغیرہ پہننا ناجائز ہوتے۔

۱۲۔ باب ما جاء فی ذکر خاتم رسول اللہ ﷺ

نبی کریم ﷺ کے انگوٹھی کے بیان میں

اس باب میں مصنف نے خلاف عادت ''ذکر'' کے لفظ کا اضافہ کردیا ہے۔اس کے لئے علماء یہ نکتہ بیان فرماتے ہیں کہ چونکہ اس سے قبل باب خاتم النبوۃ گزر چکا ہے جس میں مہر نبوت کا ذکر تھا۔اور اس باب سے تمیز کرنا مقصود تھا۔جس کے لئے یہاں یہ لفظ زیادہ کردیا گیا۔

مہر کیلئے انگوٹھی: خاتم کا لفظ تاء کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ مہر کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔اور ما یختم بہ یعنی آلہ مہر کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور چونکہ پرانے زمانے میں انگوٹھی کے ذریعے مہر لگایا جاتا تھا۔جس میں مہر کے الفاظ کندہ ہوتے تھے۔اس لئے مطلقاً اس انگوٹھی کو بھی خاتم کہا جانے لگا،جس میں نگینہ لگا ہوتا تھا۔البتہ صرف حلقہ یعنی چھلے کو عربی میں فتحۃ کہتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے مہر کے لئے انگوٹھی بنوا کر اس کا استعمال فرمایا ہے(۱) جس طرح کہ اس باب کی متعدد حدیثوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

---

(۱) مشاہیر امت کے انگوٹھیوں پر نقش کلمات: رسول اللہ ﷺ کی انگوٹھی پر محمد رسول اللہ نقش تھا۔حضرت ابوبکر صدیقؓ کی انگوٹھی پر نعم القادر ،حضرت عمر فاروقؓ کی انگوٹھی پر کفی بالموت واعظاً ،حضرت عثمانؓ کی انگوٹھی پر تبصرن اولتندمن ،حضرت علیؓ کی انگوٹھی پر للہ الملک ،حضرت خذیفہؓ کی انگوٹھی پر الحمدللہ،امام ابوحنیفہؒ کی انگوٹھی پر قل خیراً والاً فاسکت ،امام ابویوسفؒ کی انگوٹھی پر من عمل برائہ فقدندم ، امام محمدؒ کی انگوٹھی پر من صبر ظفر،قطب الاقطاب مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی انگوٹھی پر رشید احمد،حضرت شیخ الہندؒ مولانا محمود حسنؒ کی انگوٹھی پر الٰھی عاقبت عمدہ گرداں کے الفاظ نقش تھے۔اور شارحین نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت آدمؑ کی انگوٹھی پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ،حضرت موسیٰ علیہ السلام کی انگوٹھی پر انا اللہ لا الہ الا انا محمدٌ عبدی ورسولی کے الفاظ کندہ تھے۔(ماخوذ المواھب اللدنیۃ ص۷۶،۷۷شرح مسلم للنووی۲/۱۹۶،آفتاب نبوت کی کرنیں ص۲۳۶)علامہ بیجوریؒ مذکورہ تفصیل بیان کرتے ہوئے معجم طبرانی کے حوالہ سے لکھتے ہیں وفی معجم الطبرانی مرفوعاً کان فص خاتم سلیمان بن داؤد سماویاً ألقی الیہ من السماء فأخذہ فوضعہ فی خاتمہ فکان نقشہ انااللّٰہ لاالہ إلاّانامحمدعبدی ورسولی(المواھب اللدنیۃ ص۷۶،۷۷)(مختار)

(۱) حدثنا قتیبة بن سعید وغیر واحد عن عبداللّٰہ بن وھب عن یونس عن ابن شھاب عن أنس بن مالک قال کان خاتم النبی ﷺ من ورق و کان فصه حبشیًّا(۱) .

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی انگوٹھی چاندی کی تھی اور اس کا نگینہ حبشی تھا۔

من ورق ورق راء مکسورہ اور راء ساکنہ دونوں کے ساتھ چاندی کو کہتے ہیں۔اس حدیث سے یہ بات معلوم ہورہی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انگوٹھی کا استعمال فرمایا ہے۔بعض روایات میں یہ بات مذکور ہے کہ آپ ﷺ انگوٹھی مہر کیلئے استعمال کرتے تھے، پہنتے نہ تھے۔مگر صحیح احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ ﷺ انگوٹھی پہنتے بھی تھے مگر کبھی کبھی پہنتے تھے۔اسی طرح صحابہ کرامؓ نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں اسے پہنتے تھے۔اور آپ ﷺ انکار نہیں فرماتے تھے۔پھر بھی بعض علماء نے یہ تفصیل کی ہے کہ بادشاہ، قاضی اور مہر کا استعمال کرنے والے دیگر افراد کے لئے انگوٹھی کا استعمال مندوب ہے۔جبکہ دوسرے لوگوں کے لئے یہ ناجائز ہے۔لیکن اکثر ائمہ احناف کی رائے یہ ہے کہ یہ مطلقاً یعنی مہر کے لئے ہو، یا اس کے بغیر ہو جائز ہے۔ بلکہ بعض کے ہاں مسنون ہے۔البتہ تکبّر کے طور پر یا مردوں کے لئے تزیّن کی نیت سے مکروہ ہے۔ملاعلی قاریؒ لکھتے ہیں کہ اگرچہ ضرورت کے وقت یہ مباح ہے مگر اس کا ترک کرنا افضل ہے۔کیونکہ نبی کریم ﷺ نے بوقت ضرورت بنوائی تھی۔جس طرح کہ آگے احادیث میں آتا ہے۔

و کان فصه حبشیًّا اس جملے کی تفسیر میں شراح حدیث سے متعدد اقوال منقول ہیں جو درج ذیل ہیں۔

اول: یہ کہ اس کا نگینہ جزع یعنی گونگے سیپیوں سے یا عقیق سے بنا ہوا تھا۔جس کی کانیں یمن کی طرح حبشہ میں بھی ہوتی ہیں اس وجہ سے اسے حبشی کہا گیا۔

---

(۱) صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۰۵ کتاب اللباس و الزینة باب تحریم خاتم الذھب علی الرجل ونسخ ما کان من اباحته فی اول الاسلام، مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۷۹ باب الخاتم شرح السنة ۱۲/ ۲۵ باب فص الخاتم، کتاب اللباس (مختار)

وغیر واحدِ یہ گزشتہ باب کی کہ چھٹی حدیث کا اعادہ ہے وہاں مصنفؒ نے اپنے شیوخ میں تین روایوں کے نام لئے ہیں۔(۱) احمد بن عبدۃ ضبیؒ (۲) علی بن حجرؒ (۳) ابوجعفر محمد بن الحسینؒ
اس باب میں اول الذکر دو شیوخ ذکر کرنے کے بعد "وغیر واحد" کہا۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مذکورہ دو راویوں کے علاوہ متعدد راوی ہیں ایک نہیں۔ جبکہ گزشتہ باب میں صرف ایک کا ذکر ہے۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے۔ اس حدیث میں مصنف کے شیوخ تین سے زیادہ ہوں اور یہاں پر مذکورہ رواۃ کے علاوہ متعدد رواۃ اور بھی ہوں اس باب میں ان کی طرف اشارہ ہے جبکہ گزشتہ باب میں صرف ذکر کرنے سے زیادہ ہونے کی نفی نہیں ہوتی، لہٰذا غیر واحد درست ہے، مولی غفرۃ، غفرۃ حضرت بلالؓ کی بہن ہیں۔ راوی ان کا آزاد کردہ غلام ہے۔ اس کی مزید تشریح گزشتہ باب میں گزر چکی ہے(۱)۔

(۵) حدثنا محمّد بن بشّار أنا أبو عاصم أناعذرة بن ثابت حدثنی علباء ابن أحمر الیشکری قال أبو زید عمر بن أخطب الأنصاری قال قال لی رسول اللهﷺ یا أبا زید ادن مِنّی فامسح ظهری فمسحت ظهره فوقعت أصابعی علی الخاتم قلت و ما الخاتم قال شعرات مجتمعات(۲).

ترجمہ: علباء بن احمر کہتے ہیں کہ ابوزید عمرو بن اخطب انصاریؓ نے مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا کہ نبی کریمﷺ نے مجھے حکم دیا کہ قریب ہو جاؤ اور میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرو میں

---

(۱) یہ روایت گزشتہ باب میں چھٹے نمبر طویل حدیث ذکر ہے یہاں اس روایت کو دوبارہ لانے کی وجہ باب کو ثابت کرنا ہے۔ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے وقد تقدم الحدیث فی اول الکتاب فی الباب الاول والمقصود من ایراده فی هذاالباب قوله بین کتفیه خاتم النبوة فانّه یدل علی وجودالخاتم وتعیین محله من جسدهﷺ(جمع الوسائل ۱/۶۷)اور علامہ بیجوریؒ نے بھی یہی لکھا ہے قوله فذکر الحدیث بطوله أی المقدم فی أول الکتاب وإنّماأورده هنااجمالالأجل قوله بین کتفیه خاتم النبوة ولذلک صرح به بقوله وقال بین کتفیه الخ(المواهب اللدنیة ص ۳۳)(مختار)

(۲) المستدرک للحاکم ۲/۶۰۶، مسند احمد ۵/۷۷(مختار)

دوم: یہ کہ حبشی سبزی مائل زبرجد کی ایک قسم ہے۔ جو بلاد حبش میں پایا جاتا ہے۔ حکیم بن بیطار نے اس کو اپنے مفردات میں ذکر کیا ہے۔ اور اس کے طبی خواص بھی لکھے ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے بھی اسے نقل کیا ہے۔

سوم: یہ کہ اس کے نگینے کا رنگ حبشی یعنی سیاہی مائل سرخ تھا۔

چہارم: یہ کہ اس کے تراشنے والا اور کندہ کرنے والا شخص حبشی تھا۔

پنجم: یہ کہ یہ حبشی طرز پر تراشا گیا تھا۔ جس طرح آپ ﷺ کی تلوار کے بارے میں آتا ہے کہ "و کان حنفیاً" یعنی آپ ﷺ کی تلوار بنو حنفیہ کی تلواروں کی طرح تھی۔

ششم: یہ کہ یہ حبشہ سے لایا گیا تھا۔ لہٰذا حبشہ کی طرف منسوب تھا۔

تنبیہ:

چاندی کی انگوٹھی: آگے حضرت انسؓ کی ایک اور روایت میں آتا ہے کہ "کان خاتم رسول اللّٰہ ﷺ من فضة فصه منه" جس سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ آپ ﷺ کی انگوٹھی کا نگینہ بھی انگوٹھی کی طرح چاندی سے تھا۔ ہماری پہلی اور دوسری توجیہ پر یہ کہنا پڑے گا کہ نبی کریم ﷺ کی دو انگوٹھیاں تھیں۔ جبکہ مؤخر الذکر چاروں توجیہات پر سرے سے تعارض ہی نہیں۔

لیکن امام بیہقیؒ کی رائے ہے کہ جس انگوٹھی کا نگینہ حبشی تھا۔ وہ سونے کی بنی ہوئی تھی۔ اور دوسری انگوٹھی چاندی کی بنی ہوئی تھی۔ جس کا نگینہ بھی اسی چاندی سے تھا۔ واللّٰہ اعلم.

(۲) حدّثنا قتیبة أنا أبو عوانة عن أبی بشر عن نافع عن ابن عمر أنّ النّبیّ ﷺ اتخذ خاتما من فضة فکان یختم به و لا یلبسه قال أبو عیسیٰ أبو بشر اسمه جعفر بن أبی وحشیّة (۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی۔ جس سے آپ ﷺ مہر لگوایا کرتے تھے اور پہنتے نہ تھے۔

---

(۱) سنن نسائی ۲/۲۴۷ کتاب الزینة باب نزع الخاتم عند دخول الخلاء مسند احمد ۲/۶۸، ۹۶ (مختار)

پہننے یا نہ پہننے کی تفصیل: فكان يختم به ولا يلبسه یعنی اپنی طرف سے بادشاہوں کے پاس آپ ﷺ جو خطوط بھیجتے تھے۔ان پر اس انگوٹھی سے مہر لگاتے تھے لیکن اسے پہنتے نہ تھے۔ بظاہر اس حدیث کا بعد کی آنے والی حدیث اور ان روایات سے تعارض معلوم ہوتا ہے جن میں نبی کریم ﷺ کے انگوٹھی پہننے کا ذکر ہے۔چنانچہ دونوں روایتوں میں تطبیق کے لئے مختلف اقوال منقول ہے۔

اول: یہ کہ لایلبسه کا مطلب یہ ہے کہ دائماً نہیں پہنتے تھے۔کبھی کبھار پہنتے تھے۔

دوم: یہ کہ آپ ﷺ کی دو انگوٹھیاں تھیں ایک کو صرف مہر کی غرض سے رکھتے تھے۔ پہنتے نہ تھے۔اور دوسری انگوٹھی پہنتے تھے۔تاکہ دوسرے لوگ دیکھ کر آپ ﷺ کی اقتداء کریں۔

سوم: یہ کہ ابتداء صرف مہر کی نیت سے بنوائی تھی۔ پہنتے نہ تھے۔لیکن بعد میں پہننا بھی شروع کیا۔تو اس حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ نبی کریم ﷺ نے پہننے کی نیت سے انگوٹھی نہیں بنوائی تھی۔ بلکہ مہر کی غرض سے بنوائی۔اس کی تائید اگلی احادیث سے بھی ہوتی ہے۔

بہر حال روایات اس بات پر ناطق ہیں کہ نبی کریم ﷺ انگوٹھی پہنتے تھے۔اسی طرح صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کی زندگی میں۔اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد انگوٹھیاں پہنتے تھے۔البتہ یہ بات ملحوظ رہے کہ انگوٹھی چاندی کی پہننا چاہیے۔سونے کا استعمال مردوں کے لئے ناجائز ہے۔اس طرح لوہے اور تانبے وغیرہ کی انگوٹھیوں سے بھی ممانعت مروی ہے۔اس لئے علامہ مناویؒ اور ملا علی قاریؒ کے کلام میں اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ ایک روایت میں اگر چہ یہ بات مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ایک انگوٹھی لوہے کی تھی مگر نہیں میں وارد ہونے والی احادیث سے کم از کم کراہت تنزیہی معلوم ہوتی ہے۔

(۳) حدثنا محمود بن غيلان نا حفص بن عمر بن عبيد هو الطنافسي أنا زهير عن حميد عن انس قال كان خاتم رسول الله ﷺ من فضة وفصه منه(۱).

---

(۱)سنن ابی داؤد ۲/۲۲۸ كتاب الخاتم باب ماجاء في اتخاذ الخاتم، سنن نسائی ۲/۲۵۱ كتاب الزينة باب صفة خاتم النبي ﷺ،جامع ترمذی ۱/۳۰۴ كتاب اللباس باب ماجاء مايستحب في فص الخاتم، (مختار)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی انگوٹھی چاندی کی تھی۔
جس کا نگینہ بھی چاندی ہی کا تھا۔

فصّه منه بعض شراح نے لکھا ہے کہ منه کی ضمیر فضه کو راجع ہے۔لیکن پھر تو منه نہیں بلکہ منها ہونا چاہیے تھا۔الا یہ کہ فضۃ کی تاویل ورق سے کر کے مذکر کی ضمیر راجع کی جائے۔اس لئے اکثر شراح نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ منہ کی ضمیر خاتم کو راجح ہو اور اور من تبعیضیہ ہو۔

<u>اہل عجم کے نام مکاتیب کیلئے مہر:</u>

(۴) حدّثنا إسحاق بن منصور أنا معاذ بن هشام ثني أبي عن قتادة عن أنس بن مالك قال لمّا اراد النّبيّ ﷺ ان يكتب إلىٰ العجم قيل له أنّ العجم لا يقبلون إلاّ كتاباً عليه خاتم فاصطنع خاتماً فكأنيّ أُنظر إلىٰ بياضه في كفه(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب اہل عجم کو خطوط لکھنے کا ارادہ فرمایا۔تو ان سے کہا گیا کہ عجم کے لوگ بغیر مہر کے خط قبول نہیں کرتے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے انگوٹھی بنوائی۔جس کی سفیدی گویا اب بھی میری نظروں کے سامنے ہے۔

ان يكتب إلىٰ العجم الخ ۶ھ کے اواخر میں صلح حدیبیہ کے بعد جب قریش کی جانب سے آپ ﷺ کو اطمینان ہوا۔تو آپ ﷺ نے اشاعت دین کے فریضے کی طرف خوب توجہ دی۔اس سلسلے میں نبی کریم ﷺ نے زبانی دعوت کے ساتھ ساتھ اسلام کی طرف تحریری دعوت بھی دی تھی۔ مختلف بادشاہوں کے نام آپ ﷺ نے خطوط لکھ کر محرم ۷ھ میں بھیجے۔جن میں دین حق کی طرف آنے

---

(۱)صحيح مسلم ۲/۲۰۳ كتاب اللباس والزينةباب تحريم خاتم الذهب على الرجال ونسخ ما كان من اباحته في اول الاسلام، جامع ترمذی ۲/۱۰۱ كتاب الاستيذان باب ماجاء في ختم الكتاب(مختار)

کی دعوت دی گئی تھی۔الا کتابا علیه خاتم مہر کے بغیر خط قبول نہ کرنے کا سبب یا تو یہ تھا کہ اس طرح ان کی تعظیم میں کمی ہو جاتی تھی۔ جو ان کے لئے قابل قبول نہ تھا۔علاوہ ازیں خط پر اعتماد بھی باقی نہیں رہتا۔ کہ شاید کوئی اپنی طرف سے اس میں کمی یا اضافہ کر دے۔اس کے ساتھ ساتھ ان بادشاہوں کی یہ بھی خواہش ہوتی تھی کہ کسی پر ان کے راز ظاہر نہ ہوں اور مہر زدہ خط میں راز کا انکشاف نہیں ہوا کرتا۔

فاصطنع خاتماً یعنی آپ ﷺ نے اپنے لئے ایک انگوٹھی بنانے کا حکم دیا۔علامہ بیجوریؒ اور مناویؒ نے لکھا ہے کہ یہ ذی القعدۃ ۶ھ کا واقعہ ہے۔نیز یہ بھی لکھا ہے کہ اس میں دشمنوں کی تالیف قلب اور لوگوں کے ساتھ ان کی پسند کے مطابق طرز معاشرت اختیار کرنے کا استحباب معلوم ہو رہا ہے۔واضح رہے کہ آپ ﷺ کی انگوٹھی حضرت یعلی بن امیہؓ نے آپ ﷺ کے لئے بنائی تھی۔

کأنی انظر إلیٰ بیاضه الخ راوی کا اس جملہ سے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ یہ انگوٹھی چاندی کی تھی کیونکہ سفیدی چاندی میں ہوتی ہے۔نیز ممکن ہے راوی کی غرض اپنے اتقان اور کمالِ استحضار کی طرف اشارہ ہو کہ گویا ابھی اس کی آنکھوں میں وہ منظر نمایاں ہے۔

کلمات نقش کی ترتیب:

(۵) حدثنا محمّد بن یحییٰ أنا محمّد بن عبداللّٰه الأنصاری ثنی أبی عن ثمامة عن أنس بن مالک قال کان نقش خاتم النّبیّ ﷺ محمّد سطر و رسول سطر واللّٰه سطر(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی انگوٹھی کا نقش یوں تھا کہ محمد ایک سطر، رسول دوسری سطر اور لفظ اللہ تیسری سطر میں تھا۔

محمّد سطر الخ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اوپر سے پہلی سطر پر لفظ محمد، دوسری پر لفظ رسول اور

(۱)صحیح بخاری ۱/۴۳۸ کتاب الجهاد باب ماذکر من درع النبی ﷺ وعصاہ وسیفه وخاتمه، جامع ترمذی ۱/۳۰۵ کتاب اللباس باب ماجاء فی نقش الخاتم، صحیح ابن حبان ۸/۱۰۳ باب من صفته ﷺ واخبارہ (مختار)

تیسری سطر پر لفظ اللہ کندہ تھا۔بعض محدثین نے لکھا ہے کہ پہلی سطر لفظ اللہ، دوسری سطر لفظ رسول اور تیسری سطر لفظ محمد پر مشتمل تھا۔اور یہ کلمہ نیچے سے پڑھا جاتا تھا۔اس لئے کہ پہلی صورت میں اللہ تعالیٰ کے نام کی تعظیم میں فرق پڑتا ہے۔لیکن علامہ ابن حجرؒ نے اس پر اعتراض کیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ احادیث میں لفظ اللہ کے اوپر لکھنے کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس معمول کے مطابق نقش کا تذکرہ موجود ہے۔علاوہ ازیں قرآن مجید میں لفظ اللہ کی زبانی تاخیر منقوش مقروء ہے۔اور مضر نہیں ہے تو یہاں پر کیوں مضر ہے۔

اس حدیث میں صرف انہی تین لفظوں کی کتابت کا تذکرہ موجود ہے بعض دوسری روایات میں یہی کلمات بسم اللہ اور بعض میں لا الہ الا اللّٰہ کے اضافے کے ساتھ مروی ہیں مگر ان روایات کی تضعیف کی گئی ہے۔

بہر حال اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کی انگوٹھی کی ساخت اور نقش کی قدرے تفصیل ہے۔رہی یہ بات کہ یہ خاتم مربع،تکون، یا گول تھا۔اس بارے میں احادیث میں کوئی تصریح نہیں ہے۔علامہ بیجوریؒ نے زین الدین عراقیؒ سے بھی یہی نقل کیا ہے کہ یہ تفصیل منقول ومروی نہیں ہے۔

<u>انگوٹھی پر لفظ اللہ کا حکم:</u> علامہ نوویؒ نے ابن سیرینؒ اور بعض دوسرے علماء سے یہ بات نقل کی ہے کہ انگوٹھی پر اللہ تعالیٰ کا نام کندہ کرنا مکروہ ہے۔لیکن ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ ابن سیرینؒ سے اس کی اباحت بھی مروی ہے۔البتہ جہاں پر اللہ تعالیٰ کے مبارک اسم کی بے حرمتی کا خطرہ ہو مثلاً جب آدمی کو یہ انگوٹھی پہننا پڑے یا اسی ہاتھ سے استنجا کرے جس میں انگوٹھی پہنی ہو۔اس صورت میں یہ مکروہ ہے۔ورنہ انگوٹھی پر لفظ اللہ کندہ کرنا یا اپنا نام لکھنا جائز ہوگا۔

<u>کسریٰ قیصر اور نجاشی:</u>

(۶) حدثنا نصر بن علی الجھضمی أبو عمر و أنبانا نوح بن قیس عن خالد بن قیس عن قتادة عن أنس أنّ النبیّ ﷺ کتب إلیٰ کسریٰ و قیصر و النجاشی فقیل لہ إنّھم لا یقبلون کتابا إلاّ بخاتم فصاغ رسول اللّٰہ ﷺ خاتما حلقتہ فضّة و نقش فیہ

محمّد رسول اللّٰہ ﷺ(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کسریٰ اور قیصر اور نجاشی کے پاس تبلیغی خطوط لکھنے کا ارادہ فرمایا۔ کسی نے کہا کہ یہ لوگ بغیر مہر کے خط قبول نہیں کرتے۔ تو نبی کریم ﷺ نے ایک مہر بنوائی۔ جس کا حلقہ چاندی کا تھا اور اس میں محمد رسول اللہ منقوش تھا۔

إلیٰ کسریٰ و قیصر و النجاشیّ. کسریٰ فارسی شہنشاہوں کا لقب تھا۔ جو اصل میں خسرو کا معرب ہے۔ اس وقت کے کسریٰ کا نام پرویز تھا۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن حذافہؓ کے ذریعے اس کے پاس یہ خط بھیجا۔ اور جب حضرت عبداللہؓ نے خط اس کے حوالے کیا تو اس نے غصہ میں اسے پھاڑ کر اس کی اہانت کی۔ نبی کریم ﷺ کو پتہ چلا تو آپ ﷺ نے اس کے حق میں بددعا فرمائی۔ اور اس کی سلطنت بھی اسی طرح پاش پاش ہو کر رہ گئی۔

قیصر رومی بادشاہوں کا لقب تھا۔ اس وقت کے بادشاہ کا نام ہرقل تھا۔ اس کے پاس حضرت دحیہ کلبیؓ نبی کریم ﷺ کا خط لائے تو اس نے خط کی تکریم کی۔ اور اسے اپنے ہاں محفوظ کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی سلطنت بھی محفوظ کر لی۔

نجاشی حبشہ کے بادشاہوں کا لقب تھا۔ ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی زندگی میں دو نجاشی گزرے ہیں۔ ایک کا نام اصحمہ بن بحر تھا۔ جو ۶ھ میں مسلمان ہوئے۔ اور ۹ھ کو وفات پائی۔ یہ ایمان لا چکے تھے۔ اور اس وجہ سے نبی کریم ﷺ نے ان کی نماز جنازہ بھی غائبانہ طور پر پڑھی تھی۔ اسکے بعد جو نجاشی حبشہ کا بادشاہ بنا۔ اسکے نام مذکورہ خط لکھا گیا تھا۔ جو عمرو بن امیہ ضمریؓ لے کر اس کے پاس لے گئے

---

(۱) صحیح مسلم ۲/۲۰۴ کتاب اللباس و الزینۃ باب تحریم خاتم الذھب علی الرجال ونسخ ما کان من اباحتہ فی اول الاسلام، مشکوٰۃ ۳۷۸ باب الخاتم شرح السنۃ ۱۲/۶۱ باب اباحۃ خاتم الفضۃ، کتاب اللباس (مختار)

تھے۔لیکن اس بادشاہ کا نام اور اسلام دونوں پردۂ خفاء میں ہیں۔

مختلف علاقوں میں بادشاہوں کے مختلف مگر مخصوص القاب ہوتے ہیں۔جس طرح کہ مصر کے بادشاہوں کو فرعون، حمیر کے بادشاہوں کو تبّع اور ترکوں کے بادشاہوں کو خاقان کہا جاتا تھا۔یہاں پر تین بادشاہوں کے القاب کا تذکرہ ہے(۱)۔

<u>بے ادبی سے احتراز:</u>

(۷) حدّثنا إسحاق بن منصور أنبانا سعید بن عامر و الحجاج ابن منهال عن همّام عن ابن حریج عن الزهری عن انس بن مالک أنّ النبیّ ﷺ کان اذا دخل الخلاء نزع خاتمه(۲).

---

(۱)رسول اللہ ﷺ نے جن بادشاہوں کے نام خطوط بھیجے تھے وہ درج ذیل ہیں:

بادشاہ کا نام اور ملک	بادشاہ کا اصلی نام	بھیجے گئے صحابی کا نام
نجاشی شاہ حبشہ	اصحمہ	عمرو بن امیہ ضمریؓ
مقوقس شاہ مصر	جریج بن فتی	حاطب بن ابی بلتعہؓ
کسریٰ شاہ فارس	خسرو پرویز	عبداللہ بن خرافہ سہمیؓ
قیصر شاہ روم	ہرقل	حضرت دحیہ کلبیؓ
حاکم بحرین	منذر بن ساویٰ	حضرت علاء بن الحضرمیؓ
حاکم یمامہ	میوزہ بن علی	حضرت سلیط بن عمرو عامریؓ
حاکم دمشق	حارث بن ابی شمر غسانی	حضرت شجاع بن وھبؓ
حاکم یمامہ	حیفر اور اسکے بھائی	حضرت عمرو بن العاصؓ

رسول اللہ ﷺ کے ان خطوط کے بارے میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحبؒ آف فرانس نے بہت ہی بہترین تحقیق کی ہے تفصیل کے لئے رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی ۱۲۳ تا ۱۸۷ مطالعہ کریں۔(مختار)

(۲)سنن ابی داؤد ۱/۴ کتاب الطهارة باب الخاتم یکون فیه ذکر اللّٰه تعالیٰ یدخل به الخلاء، سنن نسائی ۲/۲۴۶ کتاب الزینة باب نزع الخاتم عندخول الخلاء، سنن ابن ماجة ص ۲۶ کتاب الطهارة باب ذکر اللّٰه عزوجل علی الخلاء والخاتم فی الخلاء (مختار)

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب بیت الخلاء میں داخل ہوتے تو انگوٹھی نکال لیتے تھے۔

نزع خاتمہ اس جملہ سے ایک تو اس بات کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ نبی کریم ﷺ انگوٹھی پہنتے تھے اور بیت الخلاء میں جانے سے پہلے نکال لیتے تھے۔ کیونکہ اس میں محمد اور اللہ کے دو مبارک نام منقوش تھے۔ اوران ناموں کا بیت الخلاء جیسی گندگی کے مقامات پر لے جانا بعض کے نزدیک مکروہ تنزیہی اور بعض کے ہاں مکروہ تحریمی ہے۔

بیراریس کا واقعہ:

(۸) حدثنا إسحاق بن منصور أنا عبداللّٰہ بن نمیر أنا عبیداللّٰہ ابن عمر عن نافع عن ابن عمر قال اتخذ رسول اللّٰہ ﷺ خاتماً من ورق فکان فی یدہ ثم کان فی یدأبی بکر ثمّ کان فی ید عمر ثمّ کان فی ید عثمانؓ حتّیٰ وقع فی بئراریس نقشہ محمد رسول اللّٰہ(۱) .

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی جو آپ ﷺ کے ہاتھ میں رہی۔ پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ اور پھر حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں اور پھر حضرت عثمانؓ کے ہاتھ میں رہی۔ یہاں تک کہ (ان کے زمانے میں) بیراریس میں گر گئی۔ اس انگوٹھی کا نقش محمد رسول اللہ تھا۔

فکان فی یدہ اس جملے سے بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ انگوٹھی پہنتے تھے۔ فی یدابی بکرؓ و عمرؓ الخ شیخین اور حضرت عثمانؓ تینوں اس انگوٹھی کو کبھی کبھی پہنتے تھے۔ لیکن عام طور پر یہ انگوٹھی حضرت معیقیب کے پاس بطور امانت پڑی رہتی تھی۔ بعض شراح نے "فی یدابی بکرؓ" کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ انگوٹھی حضرت ابوبکرؓ کے قبضہ اور تصرف میں ہوتی تھی۔ نہ یہ کہ وہ اسے پہنتے تھے۔ لیکن سیاق حدیث

(۱)صحیح بخاری ۸۷۳/۲ کتاب اللباس باب نقش الخاتم، صحیح مسلم ۲۰۳/۲ کتاب اللباس والزینۃ باب تحریم خاتم الذھبہ علی الرجال ونسخ ما کان من اباحتہ فی اول الاسلام،شرح السنۃ ۶۲/۱۲ باب اباحۃ خاتم الفضۃ، کتاب اللباس (مختار)

سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات اسے یا تو محض تبرک کے لئے یا اپنے خطوط و دستاویزات پر مہر لگانے کے لئے احیاناً پہنتے تھے۔

اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ آپ ﷺ کی میراث آپ ﷺ کے بعد وارثوں کو نہیں ملی۔ کیونکہ یہ انگوٹھی ورثاء کی بجائے ان خلفاء کے ہاں رہی۔

آثار سلف صالحین کے برکات: فوقع فی بیر أریس بیر أریس مسجد قبا کے قریب ہی ایک کنواں تھا۔ بعض شرّاح نے لکھا ہے کہ اریس اس باغ کا نام تھا جس میں کنواں تھا۔ اور علامہ سمہودیؒ نے تاریخ مدینہ میں لکھا ہے کہ أریس ایک یہودی تھا جس کے نام سے یہ کنواں مشہور تھا۔ حضرت عثمانؓ نے بعد میں اس کنویں میں انگوٹھی کو خوب تلاش کیا۔ تین دن تک اس کا پانی نکالتے رہے مگر انگوٹھی کا پتہ نہ چلا۔ علماء نے لکھا کہ اس انگوٹھی میں یہ برکت تھی کہ اس کے وجود سے فتنے دبے ہوئے تھے۔ اس کے غائب ہوتے ہی فتنوں نے سر ابھارا۔ حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا۔ اور پھر صحابہؓ کی ایک کثیر تعداد فتنوں میں ضائع ہوگئی۔

جس طرح کہ سلیمانؑ کی انگوٹھی میں یہ حکمت تھی کہ جب تک آپؑ کے پاس رہی۔ آپؑ کی حکومت برقرار رہی۔ اور انگوٹھی کے غائب ہونے کے بعد آپؑ کی حکومت ختم ہوگئی۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس جراب تھا۔ (کھجوروں کا توشہ دان) کبھی ختم نہ ہوا۔ گم گیا تو حضرت ابو ہریرہؓ کو شدید صدمہ ہوا۔ اسی سال حضرت عثمانؓ بھی شہید ہو گئے تھے۔ دونوں حادثوں کا ایک شعر میں اس طرح ذکر کرتے ہے

للناس هم ولی همان بینهم هم الجراب وهم الشیخ عثماناً

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ انگوٹھی کس کے ہاتھ سے کنویں میں گر گئی تھی۔ تو امام مسلمؒ کی ایک روایت کے مطابق حضرت معیقیبؓ سے گری تھی۔ یہی بات اگلی باب کی ایک حدیث سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جس طرح کی اس حدیث میں ہے اسی طرح بخاری اور مسلمؒ کی دوسری روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ انگوٹھی حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے کنویں میں گری تھی۔ ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ دونوں روایتوں کو اس طرح جمع کیا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ حضرت عثمانؓ حضرت معیقیبؓ کے ہاتھ سے انگوٹھی لے رہے ہوں یا

ان کو واپس دے رہے ہوں۔ اور درمیان میں یہ انگوٹھی گر گئی ہو۔ اب راوی کو یہ شک ہو کہ انگوٹھی کس کے ہاتھ سے گر گئی ہے چنانچہ کبھی حضرت عثمانؓ کو اور کبھی حضرت معیقیبؓ کو اس بات کی نسبت کی جاتی ہے۔ نیز یہ بھی لکھا ہے کہ ترجیح کی بات ہو تو اصول حدیث کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات راجح نظر آتی ہے کہ انگوٹھی حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے گری تھی (۱)۔ واللہ اعلم۔

(۱) علماء کرام فرماتے ہیں کہ یہ کنواں مسجد قباء کے پاس تھا۔ جب یہ انگوٹھی گم ہوگئی تو تین دن تک مسلسل اسے تلاش کیا گیا۔ اور کنویں کا سارا پانی نکالا گیا۔ مگر انگوٹھی نہ مل سکی۔ علامہ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ انگوٹھی کے برکات تھے کہ جب تک وہ انگوٹھی موجود تھی، تو کوئی فتنہ کھڑا نہ ہوا تھا۔ مگر جب انگوٹھی گم ہوگئی، تو اس کے بعد خوارج کا ایسا فتنہ پیدا ہوا، جنہوں نے حضرت عثمان غنیؓ کو شہید کیا۔ (جمع الوسائل ۱/۱۴۶، ۱۴۶) (مختار)

۱۴۳۔ باب ماجاء فی أنّ النّبیّ ﷺ کان یتختم فی یمینه

حضور اقدس ﷺ کی انگوٹھی دائیں ہاتھ میں پہننے کے بیان میں

اس سے قبل انگوٹھی کی بناوٹ اور کیفیت کا تذکرہ تھا۔اب اس باب میں مصنفؒ انگوٹھی پہننے کے بارے میں نبی کریم ﷺ کے قول وعمل کو بیان کرر ہے ہیں۔لیکن اس جگہ ترجمۃ الباب ہی میں ''فی یمینه'' کہہ کر مصنفؒ نے اس بات پر تنبیہ کردی کہ اس کے نزدیک دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننا راجح ہے۔اسی وجہ سے انہوں نے اس باب میں بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننے سے متعلق ایک بھی مرفوع حدیث ذکر نہیں کی۔ بلکہ اس بارے میں جامع ترمذی میں حضرت انسؓ کی ایک مرفوع حدیث ذکر کی ہے۔اوراس کی بھی تضعیف کی ہے۔اس باب میں مصنفؒ نواحادیث لارہے ہیں۔

(۱) حدّثنا محمّد بن سهل بن عسکر البغدادیّ و عبدالله ابن عبدالرحمٰن قالا أخبرنا یحییٰ بن حسان أنا سلیمان بن بلال عن شریک بن عبدالله بن ابی نمر عن أبراهیم بن عبدالله بن حنین عن أبیه عن علیّ بن ابی طالب ؓ أنّ النّبیّ ﷺ کان یلبس خاتمه فی یمینه(۱).

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ انگوٹھی دائیں ہاتھ میں پہنتے تھے۔

<u>انگوٹھی کس ہاتھ میں:</u> **یلبس فی یمینه** اس باب کی احادیث میں اس بات کی تصریح ہے کہ نبی کریم ﷺ دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔اس طرح کی دیگر متعدد روایات میں بھی دائیں ہاتھ کا ذکر موجود ہے۔لیکن بعض روایات میں بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننے کا ذکر بھی موجود ہے۔صحابہ کرامؓ میں سے بھی

---

(۱)سنن ابی داؤد ۲/ ۲۲۹ کتاب الخاتم باب ماجاء فی التختم فی الیمین، سنن نسائی ۲/ ۲۴۵،۲۴۶ کتاب الزینة باب موضع الخاتم من الید(مختار)

کچھ لوگ دائیں ہاتھ میں اور کچھ بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے۔محدثین حضرات اس بارہ میں دونوں قسم کی روایات کو جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔جمع کی متعدد وجوہ میں سے کچھ یہ ہیں۔

اول: یہ کہ نبی کریم ﷺ پہلے تزین کی نیت سے دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔پھر اس نیت سے انگوٹھی پہننے سے منع فرمایا۔لیکن ضرورت کی وجہ سے جب دوبارہ پہننا پڑا،تو بائیں ہاتھ میں پہننا پسند کیا۔جس طرح اس باب کے آخر میں مذکورہ حضرت ابن عمرؓ کی ایک روایت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

دوم: یہ کہ دائیں ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی پہنتے تھے۔پھر اسے اتار پھینکا۔اور چاندی کی انگوٹھی بائیں ہاتھ میں پہنتے تھے۔جو کہ آخر الامرین بھی ہے۔

سوم: یہ کہ اکثر دائیں ہاتھ میں اور کبھی کبھی بائیں ہاتھ میں پہنتے تھے۔مگر بعض حضرات نے دونوں قسم کی روایتوں میں ترجیح کی کوشش کی ہے۔

چنانچہ امام بخاریؒ،امام ترمذیؒ اور اکثر شوافع حضرات نے دائیں ہاتھ کی روایات کو ترجیح دی ہے۔اور اس کی عقلی وجہ یہ بیان کی ہے۔کہ چونکہ انگوٹھی پہننا تزین کے باب سے ہے۔اس لئے دائیں کو ترجیح ملے گی۔نیز یہ کہ بائیں ہاتھ سے استنجا کیا جاتا ہے۔جس سے انگوٹھی کو نجاست پہنچنے کا احتمال ہے۔رہی یہ بات کہ دائیں ہاتھ میں پہننا روافض یا دیگر باغیوں کا شعار تھا۔تو وہ ایک زمانے میں ہوتا تھا اب نہیں ہے۔لہٰذا اب جائز بلکہ راجح ہوگا۔علاوہ ازیں علامہ بیجوریؒ لکھتے ہیں کہ وکونہ صار شعار الروافض لا اصل له(۱)۔یعنی یہ کہ دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننا شیعوں کا شعار تھا۔بے اصل بات ہے(۲)۔

فقہاء کرام میں سے بعض حضرات نے جمع روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے دونوں قسم کی روایات کو برابر اور دونوں ہاتھوں میں پہننے کو یکساں قرار دیا ہے۔البتہ زینت کیلئے دائیں ہاتھ اور مہر کے لئے بائیں ہاتھ میں

---

(۱) مگر علامہ حصکفیؒ نے لکھا ہے کہ وقیل الیمنیٰ إلاّ أنّه من شعار الروافض فیجب التحرز عنه قهستانی وغیره وقال ابن عابدین (قوله فیجب التحرز عنه) عبارة القهستانی عن المحیط جاز أن یجعله فی الیمنیٰ إلاّ إنّه شعار الروافض(ردالمحتار ودرمختار ۶ / ۳۶۱)(مختار)

(۲) المواهب اللدنیة ص ۹۱

انگوٹھی پہننا زیادہ موزوں ہے(۱)۔لیکن امام مالکؒ سے بائیں ہاتھ میں پہننے کی کراہت بھی مروی ہے۔

احناف کا مسلک: ہمارے احناف میں سے ملاعلی قاریؒ نے دائیں ہاتھ کو ترجیح دی ہے۔لیکن علامہ شامیؒ کی تحقیق کے مطابق علماء احناف کے ہاں راجح مذہب مساوات یا بائیں ہاتھ کی ترجیح ہے۔بائیں ہاتھ میں پہننے کو ترجیح دینے والے اس کی عقلی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس طرح ایک تو بائیں ہاتھ کی محرومیت اور ضعف کا قدرے مداوا ہو جائے گا۔اوراسی وجہ سے شاید اس کے لئے سب سے چھوٹی انگلی کا انتخاب کیا گیا ہے۔دوسری یہ کہ مہر لگانے کے لئے بائیں ہاتھ سے انگوٹھی اتاری جائے گی۔تو سیدھی دائیں ہاتھ میں

(۱)اس لئے ملاعلی قاریؒ نے شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے ولاتعارض بينهما لجوازانه فعل الأمرين فكان يتختم في اليمين مرة وفي اليسرىٰ اخرى حسبما اتفق وليس في شئ منها مايدل صريحاً على المداومة والإصرار على واحد منهما قلت قد صرح البيهقيؒ بأن الاول منسوخ وأخرج ابن عدى وغيره أنه ﷺ تختم في يمينه ثم حوّله في يساره فكان من فعل خلافه لم يصل إليه النسخ وأقله أن يقال التختم في اليسرىٰ أفضل كما هوالصحيح من مذهبنا لأنّه أبعد من الإعجاب والزهو كجعل فصه مما يلى كفه قال النووى وقدأجمعوا على جوازالتختم في اليمنىٰ وعلى جوازه في اليسرىٰ واختلفوا في أيهما أفضل والصحيح في مذهبنا أن اليمين افضل لأنّه زينة واليمين أشرف وأحق بالزينة والاكرام اه(مرقات شرح مشكوة ۱۸۶/۸)

اب مسئلہ یہ ہے کہ انگوٹھی کونسی انگلی میں پہنی جائے۔تو ملاعلی قاریؒ نے شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے وعن عليؓ قال نهاني رسول الله ﷺ أن أتختم اى ألبس الخاتم في أصبعي هذه أوهذه أولتنويع قال الطيبى أوهذه ليست لترديد الراوى بل للتقسيم ...فأوما بهمزة في آخره وفي نسخة فأوى أى فأشارإلى الوسطىٰ والتي تليها أى المسبحة ولم يثبت في الابهام والبنصر رواية عن النبيّ ﷺ عن الصحابة والتابعين فيثبت ندبه في الخنصر وإليه جنح الشافعية والحنفية ذكره ميرك وظاهرالقياس أن لبسه في الابهام والبنصر منهي بالنسبة إلى الرجال دون النساء وقال النووى يكره للرجل جعل الخاتم في الوسطىٰ والتي تليها كراهة تنزيهة وأما المرأة فلها التختم في الأصابع كلها(مرقات شرح مشكوٰة ۱۸۶/۸) گویا مرد حضرات ہاتھ کے دو چھوٹی انگلیوں میں انگوٹھی استعمال کریں اور خواتین ہاتھوں کے پانچوں انگلیوں میں استعمال کرسکتی ہیں۔(مختار)

پڑے گی۔جس کے ذریعے مہر لگائی جاتی ہے۔ بصورت دیگر بائیں ہاتھ میں پڑے گی اور پھر دائیں ہاتھ سے مہر لگانے کے لئے اس کو منتقل کرنا پڑے گا۔نیز چونکہ روافض اور اہل بغی کا شعار دائیں ہاتھ میں پہننا ہے۔اس لئے ان سے ممانعت بھی بائیں ہاتھ میں پہننے کے لئے وجہ ترجیح ہے۔واللہ اعلم بالصواب۔

(۲) حدّثنا محمّد بن یحییٰ أنا أحمد بن صالح ثنا عبداللّٰہ ابن وھب عن سلیمان بن بلال عن شریک بن عبداللّٰہ بن أبی نمر نحوه حدّثنا أحمد بن منیع أنا یزید بن ھرون عن حمّاد بن سلمة قال رأیت ابن أبی رافع یتختّم فی یمینه فسالته عن ذلک فقال رأیت عبداللّٰہ ابن جعفر یتختّم فی یمینه و قال عبداللّٰہ بن جعفر کان النّبیّ ﷺ یتختّم فی یمینه(۱).

ترجمہ: حماد بن سلمہؒ کہتے ہیں کہ میں نے ابن ابی رافع کو داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے ہوئے دیکھا۔میں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی؟ تو انہوں نے کہا کہ میں نے عبداللہ بن جعفرؓ کو دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنے ہوئے دیکھا۔اور عبداللہ بن جعفرؓ نے یہ فرمایا کہ نبی کریم ﷺ دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔

عبداللہ بن جعفرؓ: رأیت عبداللّٰہ بن جعفرؓ الخ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کم عمر صحابہ میں سے ہیں۔ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کے بیٹے ہیں۔ہجرت کے پہلے سال حبشہ میں ان کی ولادت ہوئی۔جہاں حضرت جعفرؓ ہجرت کی زندگی گزار رہے تھے۔۸۰ھ میں اسی سال کی عمر میں وفات پائی۔

(۳) حدّثنا یحییٰ بن موسیٰ أنبانا عبداللّٰہ بن نمیر أنبانا إبراھیم ابن الفضل عن عبداللّٰہ بن محمّد بن عقیل عن عبداللّٰہ بن جعفر أنّ النبی ﷺ کان یتختم فی یمینه (۲).

---

(۱) سنن نسائی ۲/۲۸۹ کتاب الزینة باب موضع الخاتم من الید، جامع ترمذی ۱/۳۰۴،۳۰۵ کتاب اللباس باب ما جاء فی لبس الخاتم فی الیمین ، شرح السنة للبغوی ۱۲/۶۶،۶۷باب موضع الخاتم، کتاب اللباس (مختار) (۲)تفرد بھذا الحدیث الامام الترمذی بھذا الاسناد شرح السنة ۱۲/۶۷ باب موضع الخاتم، کتاب اللباس (مختار)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن جعفرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔

یحییٰ بن موسیٰ بعض نسخوں میں موسیٰ بن یحییٰ لکھا ہے جو غلط ہے۔

کان یتختم فی یمینه بعض روایات میں یہ اضافہ بھی ہے کہ وقبض ﷺ والخاتم فی یمینه یعنی وفات کے وقت بھی انگوٹھی آپ ﷺ نے داہنے ہاتھ میں پہنی ہوئی تھی۔اور بعض روایات میں یہ اضافہ بھی ہے کہ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ الیمین أحق بالزینة من الشمال۔دایاں ہاتھ زینت کا بائیں سے زیادہ حقدار ہے۔

مصنفؒ نے عبداللہ بن جعفرؓ کی حدیث جامع ترمذی میں بھی ذکر کی ہے۔اور اس کے بارے میں امام بخاریؒ کی یہ رائے بھی لکھ دی ہے کہ اصح شئی ورد فی هذا الباب یعنی دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننے کے سلسلے میں یہ حدیث صحیح ترین حدیث ہے۔

(۴) حدثنا أبو الخطاب زیاد بن یحییٰ أنا عبداللّٰه بن میمون عن جعفر بن محمّد عن ابیه عن جابر بن عبداللّٰه أنّ النّبیّ ﷺ کان یتختم فی یمینه(۱).

ترجمہ: حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے۔

أخبرنا عبداللّٰه بن میمون الخ. اس روای کے بارے میں ائمہ حدیث نے ذاهب الحدیث، واهی الحدیث اور منکر الحدیث وغیرہ تضعیف کے القاب استعمال کئے ہیں۔لیکن چونکہ اس روایت کے لئے دوسرے شواہد موجود ہیں۔لہٰذا اسے منکر نہیں کہا جا سکتا۔

(۵) حدثنا محمّد بن حمید الرازیّ ثنا جریر عن محمّد ابن إسحاق عن الصلت بن عبداللّٰه قال کان ابن عباس یتختم فی یمینه

(۱) سنن ابی داؤد ۲/۲۲۹ کتاب الخاتم باب ماجاء فی التختم فی الیمین والیسار، جامع ترمذی ۱/۳۰۴ کتاب اللباس باب ماجاء فی لبس الخاتم فی الیمین، شرح السنة ۱۲/۶۷ باب موضع الخاتم، کتاب اللباس (مختار)

ولا اخاله إلاّ قال كان رسول الله ﷺ يتختم فى يمينه(۱).

ترجمہ: صلت بن عبداللہؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے۔اور جہاں تک میرا خیال ہے یہ کہا کرتے تھے کہ نبی کریم ﷺ بھی داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔

لااخاله ،اخاله ہمزہ کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ درست ہے۔لیکن کسرہ سے پڑھنا افصح ہے۔اس کا معنی ہے "**لا اظنه الا قال**"یعنی میرا خیال صرف یہ ہے کہ انہوں نے فرمایا۔

امام ترمذیؒ نے یہ حدیث اس مقام پر ذرا مختصر ذکر کی۔امام ابوداؤد نے اس کو تھوڑا مفصل کر کے ذکر کیا ہے۔جس میں اس بات کا اضافہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اس انگوٹھی کا نگینہ ظاہر الکف یعنی اوپر کی جانب کر رکھا تھا۔

(٦) حدّثنا ابن عمر أنا سفيان عن ايوب بن موسى عن نافع عن ابن عمر أنّ رسول الله ﷺ اتخذ خاتماً من فضة و جعل فصه مما يلى كفّه و نقش فيه محمد رسول الله ونهى ان ينقّش احد عليه و هوالذى سقط من معيقيب فى بيرأريس(۲).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی۔اور اس کا نگینہ ہتھیلی کی جانب میں رہتا تھا۔اس میں محمد رسول اللہ کندہ کروایا تھا۔اور لوگوں کو اس سے منع فرمایا تھا کہ کوئی اس جیسا نقش کندہ کروائے۔یہ وہی انگوٹھی تھی جو حضرت معیقیبؓ سے (حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں) بیر اریس میں گرگئی تھی۔

---

(۱)ابوداؤد ج۲ص ۲۲۹ کتاب الخاتم باب ماجاء فى التختم فى اليمين واليسار شرح السنة۱۲/ ۶۷ باب موضع الخاتم ، كتاب اللباس (مختار)

(۲) سنن ابى داؤد ۲/ ۲۲۷ . ۲۲۸ كتاب الخاتم باب ماجاء فى اتخاذ الخاتم، سنن نسائى ۲/ ۲۴۷ كتاب الزينة باب نزع الخاتم عنددخول الخلاء، ابن ماجة ص۲۶۷ كتاب اللباس باب نقش الخاتم، (مختار)

نگینہ اوپر ہو یا نیچے: و جعل فصّه الخ کف سے باطن الکف مراد ہے۔یعنی نگینہ ہتھیلی کی جانب رکھا تھا۔اس سے قبل جو حدیث گزری ہے۔اس کی تفصیل میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا عمل بلکہ خود نبی کریم ﷺ کا عمل یہ مروی ہے کہ نگینہ اوپر کی جانب کر رکھا تھا۔جبکہ یہاں بـاطن الکف کا ذکر ہے۔اس کی تطبیق میں ائمہ کرام نے یہی کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا عمل اس سلسلے میں مختلف تھا۔کبھی نگینہ ہتھیلی کی جانب اور کبھی اوپر کی جانب ہوتا تھا۔جبکہ نبی کریم ﷺ سے قولاً اس سلسلے میں کچھ بھی مروی نہیں ہے۔اس لئے دونوں روایات اپنی جگہ درست ہیں۔البتہ امام نوویؒ وغیرہ نے لکھا ہے کہ مردوں کے لئے راجح بات یہ ہے کہ نگینہ ہتھیلی کی جانب رہے۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ عجب وخود پسندی اور غرور وتکبر سے دور رہے گا۔ دوسری یہ کہ اس طرح نگینہ ٹوٹنے یا رگڑنے سے محفوظ رہتا ہے۔اور نگینہ کا نقش خراب نہیں ہوتا۔علاوہ ازیں یہ نقش چھپا رہتا ہے۔لہٰذا اس کی نقل بھی آسانی سے نہیں بنائی جاسکتی۔علماء احنافؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ جائز دونوں صورتیں ہیں۔البتہ علامہ شامیؒ کی تحقیق کے مطابق مردوں کیلئے بہتر یہ ہے کہ نگینہ ہتھیلی کی جانب رہے۔لیکن چونکہ عورتیں محض تزین کیلئے انگوٹھی پہنتی ہیں۔اس لئے ان کو اوپر کی جانب نگینہ رکھنا چاہیے۔

نقش کی نقل کی ممنوعیت: ونهیٰ ان ینقّش علیه أحد نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو اس طرح کے نقش کی انگوٹھی سے اس لئے منع فرمایا تھا کہ اس طرح آپ ﷺ کی مہر دوسرے صحابہؓ کی مہر سے خلط ہو کر رہ جاتی۔اور خطوط میں التباس کا خطرہ پیدا ہو جاتا۔خلفاء راشدینؓ نے بھی ظاہری نہی کا اتباع کرتے ہوئے اس جیسی مہر بنوانے سے مکمل اجتناب کیا۔اور نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد بھی صرف یہی مہر استعمال کرتے رہے۔لیکن ایک روایت میں یہ تصریح بھی ہے کہ حضرت معاذؓ نے اس نقش کی انگوٹھی بنوائی تھی۔اور نبی کریم ﷺ نے اس پر انکار نہیں فرمایا تھا اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو وہ روایت ثابت نہیں ہے۔جس طرح کہ علامہ بیجوریؒ نے اور علامہ مناویؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔اور اگر ثابت ہو تو بھی یہ احتمال ہے کہ حضرت معاذؓ نے یہ کام نہی کے ورود سے قبل ہی اتباع النبی ﷺ کی نیت سے کیا ہو۔یا پھر نہی آپؓ تک نہیں پہنچی ہو۔یا یہ کہ حضرت معاذؓ کی خصوصیت ہو۔مگر بعض علماء نے اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا

ہے کہ یہ نہی نبی کریم ﷺ کی زندگی تک محدود ہوگی۔ کیونکہ التباس کا خطرہ اس وقت تھا۔لہٰذا اب اگر کوئی اس نقش کی انگوٹھی بنوائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔

معیقیبؓ: وھو الذی سقط من معیقیب الخ معیقیب بن ابی فاطمۃ الدوسیؓ حضرت سعید بن العاصؓ کے آزاد کردہ غلام تھے۔اور بعض کے ہاں ان کے حلیف تھے۔اسلام کے ابتدائی زمانہ میں مسلمان ہوئے حبشہ کی طرف ہجرت بھی فرمائی۔غزوۂ بدر میں بھی شریک رہے۔نبی کریم ﷺ کے انگوٹھی کے امین تھے۔جب نبی کریم ﷺ انگوٹھی اتار لیتے تھے۔تو آپؓ کو دے دیتے تھے۔حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بیت المال کے متولی تھے۔حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جذام کے مرض میں مبتلا ہوئے۔مگر حضرت عمرؓ نے علاج کروایا جس کے بعد صحتیاب ہوگئے۔

سنہ ۴۰ھ میں اور بعض روایات کے مطابق حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری ایام میں وفات پائی۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ انگوٹھی حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے کنویں میں گرگئی تھی۔اس تعارض کا جواب گزشتہ باب میں گزر چکا ہے۔

(۷) حدثنا قتیبة بن سعید قال أنا حاتم بن اسمٰعیل عن جعفر ابن محمّد عن أبیه قال کان الحسن و الحسینؓ یتختمان فی یسارهما(۱).

ترجمہ: امام محمد باقرؒ کہتے ہیں کہ حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ اپنے بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے۔

سند حدیث اور ترجمۃ الباب سے مطابقت: عن أبیه امام جعفر صادقؒ کے والد محمد باقرؒ کی ملاقات حضرات حسنینؓ سے نہیں ہوئی۔اس لئے یہ حدیث منقطع ہے۔امام بیہقیؒ نے ان دونوں کے علاوہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے بارے میں بھی یہ روایت بیان کی ہے کہ وہ بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔لیکن یہاں یہ اشکال ہے کہ یہ اثر ترجمة الباب یعنی تختم بالیمین سے مطابقت نہیں رکھتا۔اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ تختم بالیسار کے سلسلے میں یہ اثر مروی ہے۔لیکن امام ترمذیؒ اس پر تنبیہ کرنا چاہتے ہیں کہ یہ قابل استدلال نہیں۔کیونکہ دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننے کے سلسلے میں بہت سی مرفوع روایات مروی ہیں۔اور اکثر

---

(۱) جامع ترمذی ۱/۳۰۴ کتاب اللباس باب ماجاء فی لبس الخاتم فی الیمین (مختار)

مواقع میں آپ ﷺ کا عمل بھی وہی تھا۔ اگر چہ مذکورہ حضرات کا عمل اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ کبھی کبھی آپ ﷺ اسے بائیں ہاتھ میں بھی پہنے ہوئے ہونگے۔ ورنہ پھر یہ حضرات بھی ایسا نہ کرتے۔ بعض شراح نے ترجمۃ الباب سے مطابقت کیلئے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ تختم بالیسار کا یہ اثر مرفوع اور موقوف دونوں طرح سے مروی تھا۔ چنانچہ امام بیہقیؒ نے کتاب الادب میں ان الفاظ سے اسے روایت کیا ہے "کان رسول اللّٰہ ﷺ وأبوبکر و عمر و علی والحسن والحسین یتختّمون فی الیسار"

لیکن چونکہ مرفوع سند میں امام ترمذیؒ کے نزدیک کلام تھا۔ اس لئے اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے یہ اثر ذکر کیا کہ مرفوع کی نسبت موقوف سند راجح ہے۔ جبکہ تختم بالیمین مرفوعا ثابت ہے۔ اور بعض شراح نے اشکال کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ ترجمۃ الباب میں "فی یمینه" کا قید صرف اس بات پر تنبیہ کرنے کی غرض سے لایا گیا ہے کہ دائیں ہاتھ میں پہننا افضل ہے۔ جبکہ اس اثر کو بیان جواز کے لئے لایا ہے۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ ترجمۃ الباب کے آخر میں "فی یمینه" کا کلمہ نہیں یا "ام فی یساره" کا کلمہ محذوف ہے۔ چنانچہ سرے سے اعتراض ہی نہیں ہوتا۔

مصنفؒ نے اس اثر کے بعد دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننے کے سلسلے میں دو مرفوع حدیث ذکر کی ہیں۔ اس لئے اکثر شرّاح نے مصنفؒ کے اس اثر کے بارے میں لکھا ہے کہ اس اثر کو درمیان میں لانے کی کوئی معقول توجیہ نہیں ہوسکتی۔ اگر اسے سب سے آخر میں لاتے تو اچھا ہوتا۔

(۸) حدّثنا عبداللّٰہ بن عبدالرحمٰن أنا محمد بن عیسیٰ و هوابن الطباع ثنا عبد بن العوام عن سعید بن أبی عروبة عن قتادة عن أنس بن مالک أنّ النّبیّ ﷺ تختّم فی یمینه قال أبو عیسیٰ هذاحدیث غریب لانعرفه من حدیث سعید بن أبی عروبة عن قتادة عن أنسؓ عن النّبیّ ﷺ نحو هذا إلاّمن هذا الوجه وروىٰ بعض أصحاب قتادة عن قتادة عن أنس أنّ النبی ﷺ تختّم فی یساره وهوحدیث لایصحّ ایضاً(۱).

---

(۱) سنن نسائی ۲/ ۲۸۹ کتاب الزینة باب موضع الخاتم شرح السنة ۱۲/ ۶۸ باب موضع الخاتم کتاب اللباس (مختار)

ترجمہ: حضرت قتادہؒ حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہنی تھی۔ اور حضرت قتادہؒ کے بعض شاگرد اسی سند کے ذریعے حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔

امام ترمذیؒ کی کمال دیانت: قال ابو عیسی الخ یہ عبارت شمائل کے صحیح نسخوں میں موجود نہیں ہے۔ بلکہ دراصل مصنفؒ جامع ترمذی میں اس حدیث کو روایت کر کے اس کے بعد یہ عبارت لائے ہیں۔ جمع الوسائل میں ہے کہ علامہ ابن حجرؒ نے جامع ترمذی کی اس عبارت کو شمائل کی عبارت سمجھ لی ہے۔ بہر حال عبارت شمائل کی ہو یا جامع کی۔ اس عبارت سے بظاہر مصنفؒ کی غرض اس بات پر تنبیہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت قتادہؒ کے واسطے سے حضرت انسؓ کی اس حدیث میں یمین یا یسار کی تعیین درست نہیں ہے۔ اگر چہ انگوٹھی بنوانے یا چاندی کی انگوٹھی بنوانے کی حد تک اس کی روایت صحیح ہے۔ البتہ قتادہؒ کے بغیر دوسرے طرق صحیحہ سے حضرت انسؓ کی روایت مروی ہے۔ جہاں بعض طرق میں یمین اور بعض میں یسار کا ذکر ہے۔

امام نوویؒ کہتے ہیں کہ انگوٹھی کے سلسلے میں یمین و یسار دونوں سے متعلق صحیح احادیث موجود ہیں۔ بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننے سے متعلق احادیث مسلم اور ابوداؤد میں موجود ہیں۔ اور دائیں ہاتھ سے متعلق احادیث تو یہاں گزر گئیں۔ لیکن چونکہ روایت حدیث کے قواعد کی رو سے اس خاص (یعنی قتادہؒ) کے واسطے سے یہ روایت درست نہیں تھی۔ لہٰذا مصنفؒ نے کمال دیانت کا ثبوت دیتے ہوئے ایک کو غیر معروف اور دوسرے کو غیر صحیح کہہ دیا۔ فجزاہ اللہ

(۹) حدّثنا محمّد بن عبید المحاربی ثنا عبدالعزیز بن أبی حازم عن موسیٰ بن عقبة عن نافع عن ابن عمر قال اتخذ رسول اللہ ﷺ خاتماً من ذهب فکان یلبسه فی یمینه فاتخذ الناس خواتیم من ذهب فطرحه رسول اللہ ﷺ وقال لا ألبسه ابداً فطرح النّاس خواتیمهم(۱)۔

(۱) صحیح مسلم ۲/ ۲۰۳، ۲۰۲ کتاب اللباس و الزینة باب تحریم الخاتم الذهب علی الرجال الخ، جامع ترمذی ۱/ ۳۰۴ کتاب اللباس باب ماجاء فی لبس خاتم فی الیمین، سنن ابی داؤد ۲/ ۲۲۹ کتاب اللباس(مختار)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سونے کی انگوٹھی بنوائی۔جس کو آپ ﷺ اپنے داہنے ہاتھ میں پہنتے تھے۔پس لوگوں نے بھی سونے کی انگوٹھیاں بنوائیں۔تو نبی کریم ﷺ نے وہ انگوٹھی پھینک دی۔اور یہ فرمایا کہ میں اسے کبھی بھی نہیں پہنوں گا۔اس کے بعد لوگوں نے بھی اپنی انگوٹھیاں پھینک دیں۔

سونے کی انگوٹھی ترک کرنے کی وجہ: فطرح الناس خواتیمھم۔ خواتم اورخواتیم دونوں خاتم کی جمع ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے سونے کی انگوٹھی اس لئے اتاری اوراتروائی کہ ایک تو صحابہؓ کی انگوٹھیوں کی وجہ سے التباس کا خطرہ پیدا ہوا۔اور خصوصا سونے کی انگوٹھی میں عجب وتکبر کا خدشہ بھی دیکھا۔یا اس لئے کہ عین اس وقت سونے کے استعمال سے ممانعت نازل ہوئی۔جبکہ اس سے قبل سونے کا استعمال مردوں کے لئے جائز تھا۔اسی وجہ سے آپ ﷺ نے خوداور دوسرے صحابہؓ نے انگوٹھیاں اتروائیں۔

جہاں تک سونے کی انگوٹھی کی بات ہے تو اس پر فقہائے امت کا تقریباً اجماع ہے کہ مردوں کے لئے اس کا پہننا حرام ہے۔بعض صحابہؓ سے اس کا استعمال بھی مروی ہے مگر وہ یا تو نہی کے ورود سے قبل یا نہی سے عدم علم پر محمول ہوگا۔اور یہ بھی احتمال ہے کہ انہوں نے نہی کو تنزیہی سمجھ کر یہ عمل کیا ہو۔مگر تمام ائمہ فقہ نے اس کی تحریم میں شک تک بھی نہیں کیا۔البتہ عورتوں کے لئے دوسرے زیورات کی طرح سونے کی انگوٹھی کا استعمال بھی جائز ہے۔

اس باب میں اس بات کا بیان نہیں ہے کہ آپ ﷺ کونسی انگلی میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے۔لیکن صحیحین کی ایک روایت میں سب سے چھوٹی انگلی کی تعیین کی روایت موجود ہے۔جیسے کہ علامہ بیجوریؒ نے اس کا ذکر کیا ہے۔اس لئے انگلیوں میں چھوٹی انگلی اس کے لئے بہتر ہوگی۔

۱۴۔ باب ما جاء فی ذکر سیف رسول اللہ ﷺ

حضوراقدس ﷺ کے تلوار کے بیان میں

اس سے قبل دو بابوں میں خطوط کا ذکر آیا ہے۔اسلامی نظام کے نفاذ واشاعت کا دستور العمل یہ ہے کہ سب سے پہلے دعوت دی جائے،تقریر وتحریر کے ذریعے تبلیغ کی جائے،اگر کفار مان لیں تو بہتر،ورنہ تلوار سے کام لینا پڑتا ہے۔نبی کریم ﷺ نے بھی زبانی تبلیغ کے ساتھ کافروں کے پاس وفود بھیجے،خطوط لکھے،جب کام نہ بنا تو آپ ﷺ کو تلوار اٹھانا پڑی،بہرحال خطوط کے ضمناً تذکرہ کے بعد تبلیغ اسلام کے دوسرے قدم یعنی جہاد سے متعلق امور کا ذکر ہے۔اور چونکہ تلوار اس زمانے کا اہم ترین اسلحہ تھا اس لئے اسے مقدم ذکر کیا۔

<u>نبی کریم ﷺ کی تلوار:</u> نبی کریم ﷺ کی متعدد تلواریں تھیں۔ان کے الگ الگ نام بھی تھے۔مثلاً اپنے والد سے میراث میں ملنے والی تلوار کا نام مـاثور تھا۔اس طرح آپ ﷺ کی دوسری تلواروں کے نام قـضَیـب، بتّـار، الحتف، ذوالفقار، قلعی، مخذم، رسوب، صـمـصـامه اور اللّحیف منقول ہیں(۱)۔اس باب میں چار احادیث مذکور ہیں۔

(۱) حدّثنا محمّد بن بشّار أنا وهب بن جریر أنا أبی عن قتادة عن أنس قال کان قبیعة سیف رسول اللہ ﷺ من فضّة(۲).

---

(۱)ان تلواروں کے علاوہ آنحضرت ﷺ کے مزید دو تلواریں اور تھی (۱)ان میں سے ایک کا نام الـعـون تھا۔اس تلوار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ غزوہ بدر کے موقع پر حضرت عکاشہؓ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میری تلوار ٹوٹ گئی ہے۔تو آپ ﷺ نے اس کو ایک خشک ٹہنی عطاء فرمائی۔اور فرمایا کہ اضرب به جب آپؓ نے لیا فعادفی یـده سیـفـاً صـارمـاً طـویلاً أبیـض شـدیـدالـمتـن فقاتل به ثمّ لم یزل عنده یشهد به المشاهدإلی ان استشهد(المواهب اللدنیة ص ۸۳) (۲)اور دوسری کا نام العرجون تھا۔جنگ احد کے موقع پر حضرت عبداللہ بن جحشؓ کی تلوار ٹوٹ گئی تو آپ ﷺ نے اس کو کھجور کی ایک ٹہنی عطاء فرمائی اور وہ بھی آپؓ کے ہاتھ میں تلوار بن گئی۔(المواہب الدنیہ ص۸۳)(مختار)

(۲)سـنن ابی داؤد ۱/ ۳۵۵ کتاب الجهادباب فی السیف یحلّی، سنن نسائی ۲/ ۳۰۱ کتاب الزینة بـاب حـلیّة السیف، سنن الکبریٰ لبهیقی ۴/ ۱۴۳، سنن دارمی ۲/ ۱۶۶ .شرح السنة ۱۰/ ۳۹۷، کتاب السیروالجهاد باب السیف وحلیته(مختار)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی تلوار کے قبضہ کی ٹوپی چاندی کی تھی۔

کان قبیعة الخ تلوار کے دستے کی آخری سرے پر جو دھات تلوار کو آگے کی طرف پھسلنے سے بچانے کے لئے لگی ہوئی ہوتی ہے۔ اسے قبیعة کہتے ہیں جبکہ دستہ کے اگلے حصہ کو شارب کہتے ہیں۔ یہاں آپ ﷺ کی مشہور تلوار ذو الفقار کا ذکر ہے(۱)۔ جو فتح مکہ کے روز بھی آپ ﷺ کے ہاتھ میں تھی۔

(۲) حدّثنا محمّد بن بشّار أنا معاذ بن هشام ثنی أبی عن قتادة عن سعید بن أبی الحسن قال كانت قبیعة سیف رسول اللّٰہ ﷺ من فضّة(۲).

ترجمہ: سعید بن ابی الحسنؒ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی تلوار کے قبضہ کی ٹوپی چاندی کی تھی۔

سعید بن ابی الحسنؒ: سعید بن ابی الحسنؒ یہ حضرت حسن بصریؒ کے بھائی ہیں تابعی ہے۔ ان کا نام یسار ہے ۱۰۰ھ اور ایک روایت کے مطابق ۹۹ھ میں وفات پائی۔ لہٰذا یہ حدیث مرسل ہے لیکن چونکہ اس حدیث کے لئے دوسرے شواہد موجود ہیں جس طرح کے حدیث سابق ہے۔ اس لئے یہ مقبول ہے۔ اس میں بھی تلوار کی قبیعہ کا ذکر ہے۔

(۳) حدّثنا أبو جعفر محمّد بن صدر أنّ البصریّ انا طالب ابن حجیر عن هود و هوا بن عبداللّٰه بن سعید عن جده قال دخل

---

(۱) اس تلوار کے بارے میں ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں واخرج ابن سعد عن ابن عباس أنّ النّبیّ ﷺ تنفل سیفاً لنفسه یوم بدر یقال له ذوالفقار وهو الذی رای فیه الرؤیا بواحد(جمع الوسائل ۱/۱۹۳) آپ ﷺ نے یہ تلوار حضرت علیؓ کو مرحمت فرمائی تھی۔ اس تلوار کے بارے میں الاتحافات میں ہے ذو الفقار بفتح الفاء و کسرها لان فی ظهره فقرات ای حضر صغار کفقرات الظهر(۱۴۴) (مختار)

(۲) سنن ابی داؤد ۱/۳۵۵ کتاب الجهاد باب فی السیف یحلّی، شرح السنة ۱۰/۳۹۷ کتاب السیر والجهاد باب السیف وحلیته، سنن نسائی ۲/۳۰۱ کتاب الزینة باب حلیة السیف(مختار)

رسول اللّٰہ ﷺ مکة یوم الفتح و علی سیفه ذهب و فضة قال طالب فسألت عن الفضّة فقال کانت قبیعة السیف فضّة(۱)۔

ترجمہ: ہود کے نانا کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ فتح مکہ کے دن جب شہر میں داخل ہوئے تو نبی کریم ﷺ کی تلوار پر سونا چاندی تھا۔ طالبؒ کہتے ہیں میں نے ہود سے پوچھا کہ چاندی کس جگہ تھی۔ تو انہوں نے فرمایا کہ قبضہ کی ٹوپی چاندی کی تھی۔

وهو ابن عبدالله بن سعید الخ ہود کے نانا کا نام اکثر نسخوں میں سعید لکھا ہے۔ لیکن علامہ قسطلانیؒ کے بقول سعد درست ہے۔

مزیدة بن جابرؓ: عن جده ہود کے نانا کا نام مزیدة بن جابر ہے۔ بنو عبدالقیس قبیلہ کے صحابی ہیں۔ فتح مکہ کے موقع پر عبدالقیس کے وفد میں تشریف لائے تھے۔ یہ علامہ ابن حجرؒ کا قول ہے جبکہ علامہ جزریؒ نے ان کا نام مزیدہ (بوزن مکرمہ) ذکر کیا ہے۔

کیا تلوار پر سونا لگانا جائز ہے؟ وعلی سیفه ذهب وفضة یہ بات قابل ذکر ہے کہ مردوں کیلئے سونے کا استعمال ناجائز ہے۔ اور اس حدیث سے پہلے ہی اس کے استعمال کی حرمت کا حکم آیا ہے۔ جمہور کے نزدیک تلوار، بندوق اور دوسرے آلات حرب میں بھی سونا لگانا جائز نہیں۔ اسلام اس قسم کے تکلفات کو ناپسند کرتا ہے۔ اس وجہ سے سونے کے برتن، اوزار اور اسلحہ کا استعمال ناجائز ہے۔ اور تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ مسلمان جب بھی عیش پرستی میں مبتلا ہوئے ان پر زوال وتباہی آئی۔ جبکہ اس حدیث میں سونے کا استعمال اور تلوار میں اس کی موجودگی مذکور ہے۔ چنانچہ اس حدیث سے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں۔

مثلاً یہ کہ مذکورہ حدیث سند کے لحاظ سے ضعیف بلکہ منکر ہے۔ خود امام ترمذیؒ نے یہ سند جامع ترمذی میں ذکر کر کے فرمایا ہے کہ هذا حدیث غریب حسن بلکہ ائمہ حدیث میں سے اکثر نے بڑے شد و مد سے اس کی تضعیف کی ہے(۲)۔

---

(۱) جامع ترمذی ۱/۲۹۸ کتاب الجهاد باب ماجاء فی السیوف وحلیتها(مختار)

(۲) ملا علی قاریؒ نے علامہ تورپشتیؒ کے حوالہ سے لکھا ہے وقال التوربشتی هذاالحدیث لایقوم به حجّة اذلیس له سند یعتمد به(جمع الوسائل ۱/۱۹۴) اور علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے هذاالحدیث ضعیف کماقاله القطان بل منکر فلاتقوم به الحجة علی حل التحلیة بالذهب(المواهب اللدنیة ص ۸۴)(مختار)

اور اگر حدیث کو صحیح تسلیم کیا جائے تو پھر اسے مبالغہ پر محمول کیا جائے گا۔اور مطلب یہ ہوگا کہ ایسی نفیس تلوار تھی گویا اس پر سونا چاندی لگا ہوا ہو۔اور یہ بھی احتمال ہے کہ راوی نے چاندی دیکھی ہو۔جس کا استعمال جائز ہے۔پھر اس نے سونے کا ذکر تبعاً کیا ہو۔اور اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ راوی سے چاندی کے متعلق پوچھا گیا ہے کہ یہ کہاں لگا تھا۔اب اگر واقعتاً سونا بھی ہوتا تو اس کے بارے میں بھی ضرور پوچھا جاتا کہ وہ کہاں لگا تھا کیونکہ چاندی کی نسبت سونا زیادہ اہم اور قیمتی ہے۔

بعض لوگوں نے یہ جواب بھی دیا ہے کہ سونے کا یہ استعمال تحریم سے پہلے تھا۔لیکن یہ قول ضعیف ہے کیونکہ اس حدیث میں تصریح ہے کہ فتح مکہ کا موقع تھا اور تحریم کا حکم فتح مکہ مکرمہ سے یقیناً پہلے تھا۔اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ راوی نے جس پر سونے کا گمان کیا ہے وہ دراصل تمویہ تھا سونا نہ تھا۔یعنی اس دستے پر سنہری رنگ چڑھایا گیا تھا۔اس حدیث سے چاندی کے استعمال کا جواز بھی معلوم ہوتا ہے۔

(۴) حدّثنا محمّد بن شجاع البغدادیّ أنا أبو عبیدة الحدّاد عن عثمان بن سعد عن ابن سیرین قال صنعت سیفی علی سیف سمرة بن جندب وزعم سمرة أنّه صنع سیفه علی سیف رسول اللّٰه ﷺ و کان حنفیاً(۱).

ترجمہ: محمد بن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی تلوار حضرت سمرة بن جندب کی تلوار کے موافق بنائی۔اور وہ کہتے ہیں کہ ان کی تلوار نبی کریم ﷺ کی تلوار کے موافق بنی ہوئی تھی اور وہ قبیلہ بنو حنفیہ کی تلواروں کی طرح تھی۔

ابن سیرین (۲) یہ مشہور تابعی اور حدیث کے امام ہیں۔حسن بصریؒ کے ہمعصر ہیں۔بصرہ میں رہتے تھے اور ۱۱۰ھ میں وفات پائی۔

---

(۱) جامع ترمذی ۱/۲۹۷ کتاب الجهاد باب ما جاء فی صفة سیف النبی ﷺ شرح السنة للبغوی ۱۰/۳۹۸ کتاب السیر والجهاد باب السیف وحلیته(مختار)

(۲) آپ کا نام محمد ہے۔آپ تعبیر الرویا کے بھی امام تھے۔(مختار)

صنعت سیفی اس سے پتہ چلتا ہے کہ بوقت ضرورت علماء کو بھی مسلح رہنا چاہئے تا کہ شر پسندوں اور فتنہ پردازوں سے نمٹا جاسکے۔

علی سیف سمرۃ یعنی میں نے اسی مقدار اور اسی ڈیزائن کی تلوار بنائی۔اور حضرت سمرۃؓ کا خیال تھا کہ اس کی تلوار نبی کریم ﷺ کی تلوار جیسی تھی۔تو گویا حضرت ابن سیرینؒ نے بھی نبی کریم ﷺ کی تقلید میں تلوار بنائی تھی۔

و کان حنفیا یعنی نبی کریم ﷺ کی تلوار بنو حنفیہ کی بنی ہوئی تھی یا تو صانع کی طرف نسبت ہے۔ اور یا محض ڈیزائن کا بیان ہے۔لیکن اس جملے کا مقصد بہر حال یہ نہیں کہ وہ امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے موافق تھی۔اگر چہ یہ لفظی اتفاق مستحسن ہے لیکن یہ ترجمہ کرنا غلط ہے۔

لطیفہ: لفظی اتفاق کے سلسلے میں ایک لطیفہ بیان کیا جاتا ہے۔کہتے ہیں کہ ایک شیعہ اور ایک سنی کے درمیان مذہب کی بات چل پڑی۔شیعہ نے کہا کہ قرآن کہتا ہے کہ ابراھیمؑ بھی شیعہ تھے۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے **وان من شیعتہ لإ براھیم.** تو سنی نے کہا کہ جھوٹ بولتے ہو۔شیعہ تو ایک زمانہ بعد فرعون کے بنائے ہوئے ہیں۔اس نے مصر والوں کو سب سے پہلے شیعہ بنایا۔قرآن کہتا ہے۔**وإنّ فرعون عَلا فی الأرض و جعل أهلها شیعا.**

(۵) حدّثنا عقبة بن مکرم البصریّ ثنا محمّد بن بکر عن عثمان بن سعد بهذا الاسناد نحوه.

یہ سند پہلی سند کی تائید کے لئے لائے ہیں۔

۱۵۔ باب ما جاء فی صفة درع النبی ﷺ

نبی کریم ﷺ کا جنگی لباس زرہ کے بیان میں

فولادی صنعت کی اہمیت: ایک اور جنگی لباس زرہ کا بیان ہے جو فولادی کڑیوں سے بنایا جاتا ہے۔ حضرت داؤدؑ نے فولادی صنعت اور سامان جنگ کی تیاری میں بہت ترقی کی تھی۔ وہ اقتدار و غلبہ اور جنگی مہارت میں بہت آگے تھے۔ آج تو جہاز، ٹینک، بندوق اور توپ وغیرہ جنگی آلات بنانے اور فولادی صنعت میں عالم اسلام بہت پیچھے ہے۔ تیس پینتیس سال کے عرصہ میں تقریباً چالیس مسلمان ملک آزاد ہو چکے ہیں لیکن ہم فولادی مصنوعات میں پھر بھی یورپ اور امریکہ کے محتاج ہیں۔ ہماری معدنیات اور خام مال سے فولاد بنا کر وہ لوگ جہاز، ٹینک وغیرہ بناتے ہیں اور پھر ہم درخواستیں دے دے کر مانگتے ہیں۔ حالانکہ فولادی صنعت دفاع، امن اور خوشحالی کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت داؤدؑ لوہے کو ہاتھ لگاتے تو معجزانہ طور پر وہ خود بخود نرم ہو جاتا۔ پھر وہ اس سے پتلی پتلی کڑیاں بنا کر اس سے زرے بناتے۔ صاحب جلالین نے لکھا ہے کہ **و کانت قبل ذالک صفائح** یعنی داؤدؑ کے زمانے سے پہلے لڑائی لڑنے والے لوگ اپنے جسموں کے ساتھ تختیاں باندھتے تھے لیکن ان کے ساتھ نقل و حرکت مشکل ہوتی تھی۔ پھر جب کڑیوں والی زرہیں آئیں تو جنگ کے دوران چلنا پھرنا آسان ہو گیا۔ اس باب میں نبی کریم ﷺ کے دروع یعنی زرہوں کا بیان ہے۔

درع کا لفظ جس طرح جنگ میں پہنی جانے والی فولادی قمیص پر بولا جاتا ہے۔ اس طرح عورتیں جو قمیص پہنتی ہیں اس کو بھی درع کہتے ہیں۔ لیکن اس لفظ کی ایک عجیب خوبی یہ ہے کہ جو زرہ جنگ کے دوران مرد پہنتے ہیں اس کیلئے دِرعٌ کا مستعمل لفظ عموماً مؤنث استعمال ہوتا ہے۔ اور عورت کی قمیص پر بولا جانے والا لفظ درع مذکر مستعمل ہوتا ہے۔

حضور اقدس ﷺ کے زرہیں: نبی کریم ﷺ کی متعدد زرہیں تھیں۔ آپ ﷺ کی سات زرہوں کے نام منقول ہیں جو یہ ہیں۔

ذات الفضول، ذات الحواشی، فضّة، سغدیة، بتراء، ذات الوشاح اور الخرنق.

(۱) حدثنا ابو سعید عبدالله بن سعید الاشجّ أنا یونس بن بکیر عن محمّد بن إسحاق عن یحییٰ بن عبّاد بن عبدالله بن الزبیر عن أبیه عن جده عبدالله بن الزبیر عن الزبیر بن العوام قال کان علی النّبیّ ﷺ یوم أحد درعان فنهض الی الصخرة فلم یستطع فاقعد طلحة تحته فصعد النّبیّ ﷺ حتی استوی علی الصخرة قال فسمعت النّبیّ ﷺ یقول اوجب طلحة(۱).

ترجمہ: حضرت زبیر بن العوامؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ پر احد کے روز دو زرہیں تھیں۔ آپ ﷺ نے ایک چٹان پر چڑھنے کا ارادہ فرمایا۔ مگر چڑھ نہ سکے۔ تو آپ ﷺ نے طلحہؓ کو نیچے بٹھایا اوران کی مدد سے چٹان پر چڑھے۔ حتیٰ کہ اس پر ٹھیک طرح سے قیام فرمایا۔ حضرت زبیرؓ کہتے ہیں کہ پھر میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ طلحہ نے (جنت یا میری شفاعت کو) واجب کر دیا۔

عن الزبیر بن العوام بعض نسخوں میں حضرت زبیرؓ کا ذکر نہیں ہے۔ اور روایت حضرت عبداللہؓ کی طرف منسوب ہے۔ مگر یہ غلط ہے کیونکہ جنگ احد کے موقع پر حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ کی عمر بمشکل ایک سال بنتی ہے۔ اس لئے پھر حدیث مرسل ہو جائیگی۔ بلکہ "سمعت النبی ﷺ" کی تصحیح مشکل ہوگی۔ علاوہ ازیں مصنفؒ نے جامع میں بھی یہ حدیث حضرت زبیرؓ سے روایت کی ہے۔

<u>زبیر بن العوامؓ</u>: حضرت زبیر بن العوامؓ مشہور صحابی ہیں۔ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ مکہ میں اسلام لائے اور حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ پھر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ آپؓ پہلے صحابی ہیں جنہوں نے اسلام اور اللہ کی راہ میں تلوار اٹھائی تھی۔ 16 سال کی عمر میں اسلام لائے اور چچا کی طرف سے اذیتیں بھی دی گئیں مگر آپؓ ثابت قدم رہے۔ نبی کریم ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں شریک رہے۔ ۳۶ھ کو سفوان

---

(۱) جامع ترمذی ۱/ ۲۹۸ کتاب الجهاد باب ما جاء فی الدرع، المستدرک للحاکم ۳/ ۲۵ (مختار)

کے مقام پر ۶۴ سال کی عمر میں شہید کئے گئے۔ پہلے وادی السباع میں دفن ہوئے۔ بعد میں بصرہ کو منتقل کر دیئے گئے۔

علیه درعان جنگ احد میں آپ ﷺ نے جو زر ہیں پہنی تھیں وہ ذات الفضول اور فضہ تھیں۔ اس جنگ میں مسلمانوں پر بڑا امتحان آیا تھا۔ اور انہیں بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ خود نبی کریم ﷺ اس جنگ میں زخمی ہوئے تھے۔ خود اپنی کڑیاں چہرہ انور میں گھس گئیں۔ دانت مبارک شہید ہوئے اور خون میں لت پت آپ ﷺ ایک گڑھے میں گر پڑے۔ اس وقت ابلیس لعین نے آواز لگائی کہ رسول اللہ ﷺ نعوذ باللہ قتل کر دیئے گئے۔ جس سے مسلمانوں کی رہی سہی قوت اور حوصلہ جواب دے گیا۔ اس حالت کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے اپنے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کیلئے ایک اونچی جگہ پر چڑھنا چاہا تا کہ صحابہ کرامؓ دیکھ لیں کہ رسول اللہ ﷺ زندہ ہیں۔ یہ جگہ جہاں آپ ﷺ چڑھنا چاہتے تھے سطح زمین سے بلند پہاڑی میں ایک غار نما جگہ ہے بلندی کے باعث ویسے بھی اس جگہ پر تنہا چڑھنا مشکل ہوتا ہے۔ پھر نبی کریم ﷺ اس حالت میں دو زر ہیں بھی پہنے ہوئے تھے۔ صحابہ کرامؓ کی حوصلہ افزائی کے علاوہ میدان جنگ کا نقشہ دیکھنے اور تھوڑی دیر ستانے کیلئے بھی اس جگہ پہنچنے کی کوشش کرتے رہے۔

<u>دفاعی صلاحیت کا حصول ضروری ہے:</u> نبی کریم ﷺ کے اس عمل میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ بے مثال قوت کے مالک تھے کیونکہ جہاں ایک زرہ کا سنبھالنا مشکل ہوتا ہے وہاں آپ ﷺ عمر کے آخری دور میں دو زر ہیں پہنے ہوئے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس میں اس بات کی تعلیم ہے کہ اسلحہ اور دفاعی سامان کا استعمال توکل کے منافی نہیں جب نبی کریم ﷺ تحفظ کے لئے ایک کے بجائے دو زر ہیں پہنتے ہیں۔ تو امت کے لئے بطریق اولیٰ یہ بات جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان **خذوا حذركم** اور **اعدو الهم ما استطعتم** میں انہی دفاعی اسباب کے استعمال کی طرف توجہ دلائی ہے۔

فلم یستطع ایک تو جگہ اونچی تھی۔ دوسری بات یہ کہ نبی کریم ﷺ کا خون بہہ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے ضعف پیدا ہو گیا تھا۔ پھر عمر کے آخری حصہ ہونے کی وجہ سے جسم ویسے بھی بوجھل تھا۔ ساتھ دو زر ہیں

اور دیگر اسلحہ بھی ہوگا۔ ان اسباب کی وجہ سے آپ ﷺ کے لئے اس جگہ پر چڑھنا مشکل ہوگیا۔

فاقعد طلحة تحته آپ ﷺ نے طلحہ کو بٹھایا اور اس کے سہارے چڑھ گئے۔

قربانی کا صلہ: **او جب طلحة** یعنی **اوجب طلحة الجنة لنفسه یا اوجب الشفاعة اوالمغفرة والرضوان لنفسه۔** مطلب یہ ہے کہ طلحہؓ نے اپنے لئے جنت، یا شفاعت، یا مغفرت، یا رضائے الٰہی واجب کردیا یہ بڑا مرتبہ ہے۔ جو آپؓ کو ملا۔ اس جنگ میں آپؓ کا صرف یہی کارنامہ نہیں بلکہ ساری جنگِ احد میں آپؓ نے عظیم کردار ادا کیا تھا۔ مغازی میں آپؓ کی قربانیوں کا تفصیل سے تذکرہ موجود ہے۔ حتی کہ ابوبکر صدیقؓ فرماتے تھے کہ احد طلحہؓ کا ہے۔ یعنی وہ اس جنگ کے ہیرو اور مین آف دی وار (Man of the War) ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنے جسم کو نبی کریم ﷺ کے لئے ڈھال بنایا تھا۔ تیر آتا تو خود آگے ہوجاتے۔ تلوار کا وار ہوتا تو ہاتھوں سے روکتے. چنانچہ اس طرح آپ کو اسی (۸۰) سے زیادہ زخم آئے تھے. بایاں ہاتھ بالکل شل ہوگیا لیکن اس حالت میں بھی نبی کریم ﷺ کو بچاتے رہے۔ اس لئے نبی کریم ﷺ آپؓ کو چلتا پھرتا شہید کہا کرتے تھے۔

حضرت طلحہؓ: ابومحمد طلحہ عبید اللہ قرشیؓ مشہور صحابی ہیں۔ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ ابتدائے اسلام میں ایمان لائے. غزوۂ بدر کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے ان کو اور حضرت سعد بن زیدؓ کو قریش کے قافلہ کی خبر گیری کے لئے بھیجا تھا۔ چنانچہ آپؓ جنگ کے بعد بدر کے مقام پر پہنچے۔ بدر کے علاوہ تمام غزوات میں شریک رہے اور جمادی الاخریٰ ۳۶ھ کو جنگ جمل میں چونسٹھ سال کی عمر میں شہید ہوئے. بصرہ میں دفن ہوئے۔

(۲) حدثنا ابن أبی عمر ثنا سفیان بن عیینة عن یزید بن خصیفة عن السائب بن یزید أنّ رسول اللّٰه ﷺ کان علیه یوم احد درعان قد ظاهر بینهما(۱).

ترجمہ: حضرت سائب بن یزید کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے بدن مبارک پر احد کے روز دو زرہیں تھیں۔ جن کو آپ ﷺ نے اوپر نیچے پہن رکھا تھا۔

---

(۱) سنن ابن ماجة ص۲۰۷ کتاب الجهاد باب السلاح، سنن الکبریٰ للبیهقی ۴۶/۹ کتاب السیر باب الاختیار فی التحرز (مختار)

سائب بن یزیدؓ چونکہ حضرت سائبؓ غزوہ احد کے سال ہی پیدا ہوئے تھے۔اس لیے ظاہر ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے۔اور صحابی کا مرسل بالاتفاق مقبول ہے۔

قدظاهر بينهما اوپر پہنے ہوئے کپڑے کو ظہارہ اور نیچے پہنے ہوئے کپڑے کو بطانہ کہتے ہیں۔اس لئے بعض شراح نے حدیث کا ترجمہ یوں کیا ہے۔کہ ایک زرہ پہن کر اس کے اوپر ظہارہ پہنا تھا اور پھر ظہارہ کے اوپر دوسری زرہ پہنی تھی۔لیکن اکثر شرّاح نے ترجمہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایک زرہ کو دوسری کے لئے ظہارہ بنا دیا تھا۔یعنی ایک پہن کر اس کے اوپر دوسری زرہ پہنی تھی۔

١٦۔ باب ما جاء فی صفة مغفر رسول اللہ ﷺ
نبی کریم ﷺ کے فولادی خود کے بیان میں

اس باب میں ایک اور دفاعی ہتھیار کا ذکر ہے جسے خود کہتے ہیں۔مغفر غفر سے ہے جس کے لغوی معنی ستر اور چھپانے کے ہیں۔مغفرة بھی اس سے ہے جس کے معنی گناہ چھپانا اور پردہ ڈالنے کے ہیں۔مغفر ایک فولادی ٹوپی سی ہوتی ہے جس کا استعمال آج بھی فوجیوں اور مسلح جماعتوں کے لئے معروف ہے۔اس کے ذریعے تلوار، نیزہ، پتھر وغیرہ سے سر کو بچایا جاتا ہے۔بعض اہل سیر نے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے دو مغفر یعنی خود تھے۔ایک کا نام موشح اور دوسرے کا نام ذو السبوع تھا۔اس باب میں مصنفؒ دو حدیثیں لاتے ہیں۔

(١) حدثنا قتيبة بن سعيد ثنا مالك بن أنس عن ابن شهاب عن أنس بن مالك أنّ النبيّ ﷺ دخل مكة و عليه مغفر فقيل له هذا ابن خطل متعلق بأستار الكعبة فقال اقتلوه(١).

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ مکہ میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ کے سر پر خود تھا۔کسی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ ابن خطل کعبہ کا پردہ پکڑے ہوئے ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسے قتل کردو۔

دخل مكة یہ فتح مکہ کا واقعہ ہے۔اس روز آپ ﷺ اونٹنی پر سوار ہو کر مکہ داخل ہوئے تھے۔دیگر اسلحہ سے مسلح ہونے کے علاوہ سر پر خود تھا۔جس کے اوپر سیاہ عمامہ باندھے ہوئے تھے۔اسی دن انجیل کی وہ پیشن گوئی ثابت ہوگئی جس میں بتایا گیا تھا کہ "خداوند فاران سے آیا۔سعیر سے طلوع ہوا اور دس ہزار قدوسیوں کے ہمراہ گھر میں داخل ہوا۔"

---

(١)صحیح بخاری ١/ ٢٤٩ کتاب جزاء الصید باب دخول الحرم ومکة بغیر احرام ٢/ ٨٦٤ و کتاب اللباس باب المغفر، صحیح مسلم ١/ ٤٣٩ کتاب الحج باب جواز دخول مکة بغیر احرام، سنن ابی داؤد ٢/ ٩ کتاب الجهاد باب قتل الاسیر الخ۔(مختار)

فاتحین کے لئے درس: یہی صحابہؓ وہ قدوسی تھے جو آپ ﷺ کے ساتھ تھے جن کی بشارت کتب سماویہ میں دی گئی تھی۔ فتح مکہ بجائے خود ایک مکمل درسِ حیات اور فاتحین کے لئے ہدایات کا ایک عظیم سرچشمہ ہے۔ ایک کمانڈر جب کسی ملک کو فتح کرتا ہے تو اس کے لئے مفتوحین کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کی عملی تعلیم دی۔ آپ ﷺ نے دشمن کے ساتھ بے مثال رحمت وشفقت کا معاملہ اور احسان اور حسن سلوک کا عظیم مظاہرہ کیا۔ جس میں غرور وتکبر اور تعلّی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ اسی تاریخی واقعے کو اللہ تعالیٰ نے فتح مبین کہا ہے۔

مکہ مکرمہ پر حملے کا حکم: یہاں پر یہ اشکال ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مکہ پر حملہ کرنے سے منع فرمایا چنانچہ فرماتے ہیں کہ **لایحلّ لاحدکم ان یحمل بمکة السلاح** (۱)

تم میں سے کسی مسلمان کے لئے مکہ میں مسلح ہو کر چلنا جائز نہیں۔

گویا خود اللہ تعالیٰ نے اس شہر میں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کیا ہے۔ شرعی طور پر یہ امن کی جگہ ہے پھر نبی کریم ﷺ یہاں مسلح ہو کر کیوں آئے؟ اس اشکال کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں۔

اول: یہ کہ یہ نبی کریم ﷺ کی خصوصیت ہے اور لوگوں کے لئے یہ پہلے بھی حرام تھا۔ اور اب بھی حرام ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کے لئے یہ حلت اس لئے تھی کہ خانہ کعبہ پر کافروں کا قبضہ تھا۔ اسے کافروں کے چنگل سے چھڑانا ضروری تھا۔ اور حرم شریف اس وقت دارالامن نہیں دارالحرب تھا۔ اسے دارالامن بنانے کے لئے ابتداء میں یہاں اسلحہ اٹھانا پڑا۔ جو جائز ہے۔ اور اب ان شاء اللہ قیامت تک مکہ کے دارالحرب بننے کی نوبت نہیں آئے گی۔ اسی لئے اب مکہ میں اسلحہ اٹھانا جائز نہیں رہا۔ نیز فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ نعوذ باللہ اگر کعبۃ اللہ اور حرم شریف کی حفاظت خطرے میں ہو تو اب بھی دفاعاً مکہ بلکہ کعبہ میں اسلحہ اٹھانا جائز ہے۔ اور نعوذ باللہ دشمن اس پر قبضہ کرے تو پھر تو یہ ضروری ہوگا۔

دوسرا جواب: یہ کہ دراصل اسلحہ اٹھانے سے ممانعت مطلقاً نہیں بلکہ **محاربة مع المسلمین** کے لئے اسلحہ اٹھانے پر محمول ہے۔ **محاربة مع الکفار** کے لئے جائز ہے۔

تیسرا جواب: یہ کہ یہ حلت نبی کریم ﷺ کے لئے بھی ایک مخصوص وقت کے لئے تھی۔ بعد

---

(۱) صحیح مسلم ۱/۴۳۹ کتاب الحج باب النهی عن حمل السلاح بمکة من غیر حاجة (مختار)

میں یہ منسوخ ہوگئی۔اور اس پر بخاری شریف کی وہ روایت بھی دلالت کرتی ہے جس میں نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ فانّھما لا تحلّ لاحد کان قبلی إنّھا احلّت لی ساعة من النّھا ر وإنھا لن تحلّ لاحد من بعد (الحدیث)(۱)

وعلیه مغفر ترجمۃ الباب سے مطابقت اسی جملہ میں ہے یعنی آپ ﷺ خود پہنے ہوئے تھے۔

<u>حضور ﷺ کی دریادلی:</u> فقیل له الخ حضرت سعید بن حریث ؓ نے آپ ﷺ کو نشاندہی کی کہ یہ ابن خطل ہے۔ھذا ابن خطل الخ نبی کریم ﷺ مکہ میں داخل ہوئے تو تمام کفار جمع تھے۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارا کیا خیال ہے؟ آج میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا۔انہوں نے کہا کہ جس طرح کہ ایک شریف بھائی اپنے بھائی سے معاملہ کرتا ہے۔ایسی ہی ہماری توقع ہے۔کونسا ظلم ہے جو ان کافروں نے نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں پر نہیں کیا تھا۔لیکن نبی کریم ﷺ نے اس موقع پر فرمایا کہ لا تثریب علیکم الیوم یعنی آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔

تم سب معاف ہو۔رحمتِ حق کو تو بہانہ چاہیے۔اس روز بڑے سرکش اور متمرد لوگ معاف ہوئے۔اگرچہ لوگوں کا خیال تھا کہ آج مکہ کی گلیوں میں خون کی ندیاں بہیں گی۔لیکن حضور ﷺ نے تو سب سے بڑے دشمن ابوسفیان کے گھر کو دار الامان بنادیا۔کعبہ میں داخل ہونے والے،اور گھر کا دروازہ بند کرنے والے تو دوران حملہ بھی مامون قرار دیئے گئے۔

لیکن بایں ہمہ بعض جرائم ناقابل معافی ہوتے ہیں۔اسی لئے نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے دن گیارہ آدمیوں اور چھ عورتوں کے بارے میں اعلان فرمایا کہ ان کے لئے معافی نہیں ہے۔

<u>اشاعت اسلام کا اصل سبب:</u> یہ ہے حقیقت اس جھوٹے پروپیگنڈے کی کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔حالانکہ یہ بات کہنے والے لوگ اگر اپنی تاریخ دیکھیں تو انہیں معلوم ہوجائے گا کہ ایک شہر فتح کرتے ہوئے انہوں نے اتنے قتل کئے کہ نبی کریم ﷺ کی ساری دس سالہ جنگوں میں اتنے قتل نہیں ہوئے۔یہ تو اسلام کی حقانیت اور نبی کریم ﷺ کی رحمت کاملہ ہونے کا کرشمہ تھا کہ اسلام کی طرف لوگ دوڑنے لگے اور تقریباً دس لاکھ مربع میل کا علاقہ فتح کرکے بھی مسلمانوں کی لڑی ہوئی جنگوں میں صرف چند آدمی قتل ہوئے۔

---

(۱) بخاری ۱/ ۳۲۸ کتاب اللقطه باب کیف تعرف اللقطة اهل مکة (مختار)

بہر حال عام معافی کا اعلان ہوا۔لیکن 17 افراد کے جرائم نا قابل معافی تھے۔اس لئے ان کو معافی سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ بعد میں سات مردوں اور دو عورتوں کو معافی ملی۔اور چار عورتوں سمیت آٹھ افراد کو قتل کیا۔جبکہ بعض روایات میں چار مرد اور دو عورتوں کو قتل کرنے کا ذکر ہے۔اور وہ بھی دراصل وہی لوگ تھے جن کے جرائم کے ساتھ حقوق العباد وابستہ تھے۔انہوں نے انسانوں پر ظلم کیا تھا۔اور ظالم کو معاف کرنا مظلوم کے ساتھ بے انصافی ہے۔

<u>ابن خطل اور اس کا جرم:</u> انہی لوگوں میں ایک ابن خطل بھی تھا۔یہ شخص اسلام لایا تھا۔جاہلیت میں اس کا نام عبدالعزیٰ بن ہلال بن خطل تھا۔اسلام لانے کے بعد اس کا نام عبداللہ یا غالب رکھا گیا۔خط و کتابت سے واقفیت کے سبب حضور ﷺ نے ان کو بڑا اعزاز دیا تھا۔حتیٰ کہ وحی کی کتابت کی اجازت بھی دے دی۔ بعد میں ایک غلام حوالہ کر کے نبی کریم ﷺ نے ایک قبیلہ کے پاس عامل بنا کر بھیجا۔راستے میں اس نے غلام سے کہا کہ میں سوتا ہوں تم جاگتے رہو اور کھانا وغیرہ تیار کرلو۔پھر مجھے جگا دو۔وہ جاگا تو دیکھا کہ غلام سویا پڑا ہے۔کھانا بھی تیار نہیں تھا۔سخت غصہ میں غلام پر تلوار چلائی اور اسے قتل کر دیا۔پھر سوچا کہ نبی کریم ﷺ اب مجھ سے ضرور قصاص لینگے۔اس خوف کی وجہ سے مرتد ہو کر وہ مکہ آیا۔چونکہ مکہ کے کافر مرتدوں کی بہت عزت افزائی کرتے تھے۔اس لئے اس نے ارتداد پر اکتفاء نہیں کیا۔ بلکہ دو لونڈیاں اس غرض سے خریدیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ہجویہ اشعار کہہ کر لوگوں کو سنائیں۔یہ گستاخانہ اور گندے اشعار ہوتے تھے۔جو جگہ جگہ مجلسوں میں گائے جاتے تھے۔اور چونکہ ادب اور شعر و شاعری کا چرچا تھا۔اس لئے یہ اشعار پھیل کر دوست دشمن سب کی زبانوں سے سنے جانے لگے۔ نبی کریم ﷺ کو اس سے بہت اذیت ہوتی تھی۔ بہر حال اس ظالم نے ایک تو قتل کیا تھا۔اور ہجویہ اشعار کا اہتمام جرم بالائے جرم تھا۔اس لئے آپ ﷺ نے اس کو واجب القتل قرار دیا تھا۔**متعلق باستار الکعبة** ۔یعنی کعبہ کے پردوں کو پکڑ کر ابن خطل معافی چاہتا تھا۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس زمانے میں بھی خانہ کعبہ کا غلاف ہوتا تھا۔ **اقتلوہ** رحم درخواست رد کر دی گئی تو لوگوں نے اسے قتل کر دیا۔

<u>قاتل کون تھا:</u> قاتلین میں چار آدمیوں کے نام ہیں۔سعید بن زیدؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، زبیر بن

العوامؓ اور ابو برزۃ اسلمیؓ۔ علامہ قسطلانیؒ نے مؤخر الذکر کو ترجیح دی۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ اس کو قتل کرنے کے لئے چاروں نے حملہ کیا ہو۔ اور مؤخر الذکر کے ہاتھوں وہ جہنم رسید ہو چکا ہو۔ واللہ اعلم

حرم میں حدود و قصاص کا حکم: علامہ ابن حجرؒ وغیرہ نے اس حدیث سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ مسجد حرام میں حدود و قصاص کا اجراء جائز ہے۔ کیونکہ ابن خطل کو بھی قصاصاً حرم ہی میں قتل کیا گیا تھا۔ احناف کے ہاں مسجد حرم کو نجاست سے بچانے کے لئے اس میں حدود و قصاص کا اجراء نہیں ہوگا۔ بلکہ قاتل یا صاحب حد کو بھوکا پیاسا رکھ کر حرم سے باہر نکلنے پر مجبور کیا جائے گا۔ اور باہر ہی حد یا قصاص کا نفاذ ہوگا۔

مذکورہ استدلال سے ملا علی قاریؒ نے یہ جواب دیا ہے کہ اس قتل کو حد یا قصاص کہنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ ابن خطل اس وقت حربی تھا۔ جس پر حدود و قصاص نافذ نہیں ہوتے۔ البتہ وہ معافی کے اعلان میں مستثنیٰ ہونے کی بناء پر قتل کیا گیا تھا۔

(۲) حدثنا عیسیٰ بن احمد ثنا عبداللہ بن وھب ثنی مالک ابن انس عن ابن شھاب عن أنس بن مالک أنّ رسول اللہ ﷺ دخل مکة عام الفتح وعلی راسه المغفر قال فلما نزعه جاءہ رجل فقال ابن خطل متعلق بأستار الکعبة فقال أقتلوہ قال ابن شھاب و بلغنی أنّ رسول اللہ ﷺ لم یکن یومئذ محرما(۲).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ فتح مکہ کے وقت جب مکہ میں داخل ہوئے تو نبی کریم ﷺ کے سر مبارک پر خود تھی۔ جب نبی کریم ﷺ نے

---

(۱) ملا علی قاریؒ نے اس سلسلہ میں بعض روایات کی مدد سے تین اور صحابہ یعنی سعید بن حریثؓ، عمار بن یاسرؓ اور شریک بن عبدہ عجلانیؓ کا ذکر بھی کیا ہے۔ لیکن اصل قاتل کے سلسلے میں ترجیح ابو برزہ اسلمیؓ کو دی ہے۔ علامہ بیجوریؒ کہتے ہیں کہ پہلے ابو برزۃ اسلمیؓ قتل کرنے آئے بعد میں سعید بن حریثؓ نے بھی اس میں مدد کی ابن ہشامؒ نے سیرت میں اسی کو ترجیح دی۔ (مختار)

(۲) صحیح بخاری ۱/ ۲۴۹ کتاب جزاء الصید باب دخول الحرم ومکة بغیر احرام ۲/ ۸۶۴ کتاب اللباس باب المغفر، صحیح مسلم ۱/ ۴۳۹ کتاب الحج باب جواز دخول مکة بغیر احرام، سنن ابی داؤد ۲/ ۹ کتاب الجهاد باب قتل الاسیر (مختار)

اسے اتارا۔تو ایک شخص نے آ کرعرض کیا کہ ابن خطل کعبہ کے پردوں سے لپٹا ہوا ہے۔تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس کو قتل کردو۔ابن شہاب زہریؒ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ نبی کریم ﷺ اس روز محرم نہیں تھے۔

حرم شریف میں داخلہ اور شرط: لم یکن یو مئذ محرما۔ایک فقہی مسئلہ کی طرف اشارہ ہے وہ یہ کہ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، اور امام احمدؒ کے ہاں بغیر احرام کے حرم میں داخل ہونا ناجائز ہے۔شوافع کہتے ہیں کہ بغیر احرام باندھے حرم میں داخل ہونا جائز ہے۔مذکورہ حدیث بظاہر شوافع کا مستدل ہے کہ نبی کریم ﷺ خود مکہ میں احرام باندھے بغیر داخل ہو چکے ہیں۔جس طرح امام زہریؒ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔جمہور اور امام ابوحنیفہؒ کی طرف سے اس کے کئی جوابات دیئے گئے ہیں۔

اول: یہ کہ یہ نبی کریم ﷺ اور اس دن کی خصوصیت تھی۔کہ اس روز مسلح ہو کر داخل ہونا بھی جائز تھا اور مذکورہ فقہی حکم سے بھی یہ دن مستثنیٰ تھا۔لہٰذا اس روز بغیر احرام کے مکہ میں داخل ہونا جائز تھا۔

دوم: یہ کہ نبی کریم ﷺ کو یہ علم نہ تھا کہ آئندہ کس طرح کے حالات پیش آنے والے ہیں۔مکہ فتح ہوگا یا نہیں۔مقابلہ ہوگا یا نہیں۔لہٰذا نبی کریم ﷺ نے اس عذر کی بناء پر احرام نہیں باندھا۔ورنہ بصورت جنگ احرام سے نکلنا پڑتا۔

سوم: یہ کہ ممکن ہے کہ حضور ﷺ نے پہلے مکہ کے مضافات کی نیت کی ہو۔اور جنگ کے خطرے کے پیش نظر مکہ کی نیت ہی نہ ہو۔اور اس صورت میں ہمارے ہاں بھی احرام کی ضرورت نہیں۔

چہارم: یہ کہ امام زہریؒ کا یہ قول کہ "بلغنی الخ" بلاسند ہے جو اُن مستند احادیث کا مقابلہ نہیں کرسکتا جن میں بغیر احرام کے حرم میں داخل ہونے کی ممانعت مروی ہے۔

۱۷۔ باب ما جاء فی عمامۃ النبی ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے عمامہ کا بیان

<u>عمامہ کی تعریف اور فضیلت</u>: سر پر بندھی ہوئی پگڑی کو عمامہ کہتے ہیں جو کہ نبی کریم ﷺ کا پسندیدہ لباس تھا۔ اور کثرت سے روایات اس بارے میں منقول ہیں۔ اسی وجہ سے پگڑی باندھنا فقہاء کے نزدیک سنت ہے۔ خواہ ٹوپی کے اوپر باندھی جائے یا اس کے بغیر ہو۔ البتہ صرف ٹوپی کے استعمال کو علامہ ابن جوزیؒ وغیرہ نے زی المشرکین یعنی مشرکوں کا فیشن قرار دیا ہے۔ بلکہ اس مفہوم میں صریح حدیث بھی موجود ہے۔

اس باب میں عمامہ کے ذکر کے ساتھ ساتھ سر پر بندھی ہوئی پٹی کا بھی ذکر ہے۔ تو گویا عنوان میں سر پر بندھے ہوئے ہر قسم کے کپڑے کو عمامہ کہا گیا ہے۔ احادیث میں نبی کریم ﷺ کی متعدد پگڑیوں کا ذکر موجود ہے۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ ان میں سے ایک پگڑی سات ذراع (ساڑھے دس فٹ) لمبی تھی۔ جیسا کہ طبرانیؒ کی ایک روایت میں مذکور ہے۔ جبکہ بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا طول سات ذراع اور عرض ایک ذراع تھا۔ علامہ بیجوریؒ شرح شمائل میں کہتے ہیں کہ "لا اصل لہٗ" یعنی یہ دونوں باتیں بے بنیاد ہیں۔

لیکن علامہ نوویؒ نے عمامہ رسول ﷺ کی مقدار کے بارے میں یہ بات لکھی ہے کہ آپ ﷺ کی دو پگڑیاں تھیں۔ ایک چھ اور دوسری بارہ ذراع لمبی تھی(۱)۔ بہر حال مقدار میں اختلاف متعدد پگڑیوں کی وجہ

---

(۱)لکن نقل عن النووی انہ کان لہ ﷺ عمامۃ قصیرۃ و کانت ستۃ ازرع و عمامۃ طویلۃ کانت اثنی عشر ذراعاً(المواھب اللدنیۃ ص ۹۹) اور شیخ عبدالحق المحدث الدھلویؒ نے اپنے رسالہ اداب اللباس میں لکھا ہے کانت عمامتہ ﷺ فی البیت سبعۃ او ثمانیۃ أذرع و فی وقت الصلوات الخمس اثنا عشر ذراعاً و فی الجمعۃ اربعۃ عشر ذراعاً و فی الحروب خمسۃ عشر ذراعا اھ. (آداب اللباس ص ۳ بحوالہ شابیب الغمامۃ ص ۴۳)اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے لکھا ہے کانت عمامتہ علیہ السلام فی اکثر الأحیان ثلاثۃ أذرع شرعیۃ و فی الصلوات الخمس سبعۃ اذرع و فی الجمع و الأعیاد اثناعشر ذراعاً ا۵.(العرف الشذی علی جامع الترمذی ۱/ ۳۰۴) گویا رسول اللہ ﷺ سے مختلف اوقات میں مختلف قسم کے عمائم پہننا ثابت ہے۔ اس لئے مختلف مقدار کے عمائم پہننا جائز ہے۔ (مختار)

سے ہوسکتا ہے۔لیکن یہ بات ثابت ہے کہ پگڑی باندھنا نبی کریم ﷺ کی سنت مستمرہ ہے۔آپ ﷺ خود بھی پگڑی باندھا کرتے تھے اور جگہ جگہ اس کا حکم بھی دیا کرتے تھے۔ چنانچہ فعلی احادیث کی طرح قولی احادیث بھی اس سلسلہ میں مروی ہے۔

(۱) حدّثنا محمّد بن بشّار ثنا عبدالرحمان بن مهدی عن حمّاد بن سلمة حدثنا محمود بن غيلان ثنا وكيع عن حمّاد بن سلمة عن أبی الزبير عن جابر قال دخل النبیّ ﷺ مكة يوم الفتح و عليه عمامة سوداء(۱)۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب فتح مکہ کے روز شہر میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ کے سر پر سیاہ پگڑی تھی۔

<u>ایک تعارض اوراس کا جواب:</u> **وعليه عمامة سوداء الخ** گزشتہ ابواب میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ "**دخل مكة وعليه مغفر**" یعنی آپ ﷺ خود پہنے ہوئے مکہ میں داخل ہوئے تھے جبکہ اس حدیث میں خود کی بجائے سیاہ پگڑی کا ذکر ہے۔ بظاہر دونوں حدیثوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تعارض نہیں بلکہ نفس الامر میں یہ دونوں جمع ہوسکتے ہیں۔اس طرح کہ آپ ﷺ نے خود سر پر رکھا ہوا اور اوپر سے پگڑی باندھی ہو کیونکہ خود لوہے کا ہوتا ہے جو ظاہری ہیئت کے لحاظ سے بدنما دکھائی دیتا ہے۔لہٰذا نبی کریم ﷺ نے اسے پگڑی سے چھپا دیا ہوگا۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ چونکہ خود بھاری ہوتا ہے۔برہنہ سر پر اسے رکھنے سے تکلیف ہوتی ہے۔لہٰذا ممکن ہے کہ آپ ﷺ نے نیچے پگڑی باندھی ہو اور اوپر سے خود رکھا ہو۔ بہرحال دونوں حدیثیں اپنی جگہ درست اور صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں ہوسکتا ہے کہ عین دخولِ مکہ کے وقت تو سر پر خود ہو۔ پھر کچھ دیر بعد خود رکھ دیا ہو اور سیاہ پگڑی باندھی ہو۔اور یہ دونوں واقعات تعدد اوقات پر مبنی ہوں۔

---

(۱)سنن ابی داؤد ۲/ ۲۰۹ كتاب اللباس باب فی الغنائم، سنن ابن ماجة ص ۲۰۸ كتاب الجهاد باب لبس العمائم فی العرب و كتاب اللباس باب العمامة السوداء ، سنن دارمی ۲/ ۸۴(مختار)

کیاذوالحال اور حال کاایک زمانہ ضروری ہے: اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ ذوالحال کے عامل اور حال کے زمانوں میں اتحاد شرط ہے۔اس لئے دخولِ مکہ کے موقع پر مغفر اور عمامہ دونوں کا ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے ۔لیکن اس اعتراض کا علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ مذکورہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے بلکہ کبھی کبھی خارجی تحقق کے اعتبار سے دونوں زمانے مختلف ہوسکتے ہیں۔علاوہ ازیں دخول شہر کے بعد بھی کچھ وقت مجاورت کے سبب دخول ہی کی حالت شمار کی جائے گی۔الغرض یہاں پر وحدت زمانی نہ ہو تو قرب زمانی موجود ہے۔جو صحت حالیت کے لئے کافی ہے۔جبکہ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ عمامہ سے خود مراد ہے جو صحتِ حالیت کے لئے کافی ہے۔لہٰذا تعارض سرے سے موجود نہیں ہے۔

سیاہ پگڑی کا ثبوت: اس حدیث میں سیاہ پگڑی کا ثبوت ہے۔بعض شرّاح کا خیال ہے کہ یہ پگڑی دراصل سیاہ نہیں تھی بلکہ زیادہ میلی ہونے کے سبب سیاہ دکھائی دے رہی تھی۔جس طرح کہ دوسری حدیث میں ''عمامة دسماء '' کے لفظ سے تعبیر کی گئی ہے یا پھر چونکہ اس کے نیچے سیاہ خود سر پر رکھا تھا اور پگڑی کے نیچے سے وہ نظر آرہا تھا۔اس لئے یہ عارضی طور پر سیاہ نظر آتی تھی کیونکہ نبی کریم ﷺ سفید لباس پسند فرمایا کرتے تھے۔لیکن علامہ بیجوریؒ وغیرہ شراح نے اس توجیہ کو خلاف ظاہر بتایا ہے۔

رہی یہ بات کہ آپ ﷺ سے روایت مروی ہے کہ سفید پوشاک بہترین لباس ہے(۱)۔ تو اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ سیاہ لباس یا پگڑی ناجائز ہے(۲) یا حضور ﷺ نے اسے استعمال نہیں کیا ہے خصوصاً جب خود نبی کریم ﷺ سے اس کا استعمال مروی ہے۔جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

---

(۱)شمائل ترمذی باب لباس رسول اللہ ﷺ ص ۵ قال رسول ﷺ علیکم بالبیاض من الثیاب الخ

(۲)اس لئے کہ لباس بذاتہ ممنوع نہیں ہوتے تاہم کسی دوسرے قوم یا فرقہ سے مشابہت کی بناء پر انہیں مکروہ کہا جاتا ہے۔ مثلاً کالی پگڑی یا لباس کا کوئی دوسرا سیاہ کپڑا ممنوع نہیں ہے مگر محرم کے دنوں میں چونکہ شیعہ حضرات خصوصیت کے ساتھ ماتم کے اظہار کے لئے سیاہ لباس پہنتے ہیں۔لہٰذا ان مخصوص ایام میں سیاہ لباس یا پگڑی پہننے سے گریز کرنا چاہئے۔(شمائل ترمذی ۱/۲۴۳ مولانا صوفی عبدالحمید)علامہ شیخ احمد عبدالجواد الرومیؒ نے لکھا ہے والعمائم البیض ھی التی تناسب زی العلماء فی ھذا الزمان (الاتحافات الربانیة ص ۱۵۷)اور ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے فی الحدیث جواز لبس الاسود فی الخطبة ولبس البیاض افضل (جمع الوسائل ۱/۲۰۵) (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ)رسول اللہ ﷺ کی مختلف الوان کی پگڑیاں: سیاہ پگڑی کے علاوہ دوسرے الوان کی پگڑیاں بھی آنحضرت ﷺ اور سلف صالحین سے استعمال کرنا ثابت ہے۔مثلاً (۱) سرخ رنگ کی پگڑی عن أنس بن مالکؓ قال رأیتُ رسول اللّٰہ ﷺ یتوضّأوعلیه عمامة قطریة فأدخل یده من تحت العمامة فمسح مقدم رأسه ولم ینقض العمامة سنن ابی داؤد کتاب الطهارة باب المسح علی العمامة صاحب عون المعبود نے اس حدیث کے ذیل میں لکھا ہے استدل به علی التعمیم بالحمرة وهواستدلال صحیح لو کان فی الحدیث ضعف(عون المعبود شرح ابی داؤد ۱/۲۵۱) (۲)زرد رنگ کی پگڑی عن زیدبن أسلم أنّ ابن عمرؓ کان یصبغ لحیته بالصفرة حتی تمتلی ثیابه من الصفرة فقیل له لم تصبغ بالصفرة فقال إنیّ رأیت رسول اللّٰہ ﷺ یصبغ بها ولم یکن شیٔ أحبّ إلیه منها وقدکان یصبغ بها ثیابه کلّها حتی عمامته، سنن ابی داؤد کتاب اللباس باب فی المصبوغ بالصفرة، وعن اسماعیل بن عبداللّٰہ بن جعفر عن أبیهؓ قال رأیت رسول اللّٰہ ﷺ وعلیه ثوبان مصبوغان بالزعفران رداءٌ عمامةٌ المستدرک للحاکم ۴/۱۸۹، وقال صحیح علی شرط الشیخین ولم یخرجاه. (۳)سفید رنگ کی پگڑی مصنف ابن ابی شیبۃ میں ہے عن ابی صالح قال رأیت علی الشعبی عمامة بیضاء قد أرخی طرفها ولم یرسله وعن إسماعیل بن عبدالمطلب قال رأیت علی سعید بن جبیرعمامة بیضاء وعن سلیمان بن أبی عبداللّٰہ قال ادرکت المهاجرین الأولین یعتمون بعمائم کرابیس سودٍوبیض لایخرجها من تحت ذقنه (مصنف ابن ابی شیبة ۵/۱۷۹ کتاب اللباس والزینة باب لبس العمائم البیض) (۴)سبز رنگ کی پگڑی جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہؒ کا حوالہ گزر گیا ہے۔اسی طرح سنن ابی داؤد میں حضرت ابورمثہؓ سے مروی ہے قال رأیت رسول اللّٰہ ﷺ وعلیه بردان أخضران (ابوداؤد کتاب اللباس باب فی الخضرة) اوراس روایت کوخود امام ترمذیؒ نے بھی نقل کیا ہے۔(جامع ترمذی کتاب الادب باب ماجاء فی الث ﷺ ب الاخضر) مگریاد رہے سبز رنگ کی دوسرے الوان پرکوئی فضیلت نہیں بلکہ اس رنگ کی پگڑی کا استعمال محض اباحت تک ہے۔اس لئے بہت سارے اہل علم نے اس رنگ کے استعمال سے انکار کیا ہے۔چنانچہ علامہ ابن حجرالہیتمیؒ فرماتے ہیں والعمامة الخضراء فلااصل لها وانّما حدث سنة ثلاث وسبعین وسبعمائة بأمرالملک شعبان بن حسین (الفتاوی الحدیثیة ۲۲۵)اورعلامہ سیوطیؒ نے لکھا ہے الجواب: أنّ هذه العلامة لیس لها أصل (بقیہ اگلے صفحہ پر)

سیاہ پگڑی کے فوائد: پھر سیاہ پگڑی کے استعمال میں کچھ ایسے فوائد بھی ہیں جو سفید میں نہیں۔ مثلاً میل خورا ہونے کی وجہ سے جلدی اس پر میل ظاہر نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں نبی کریم ﷺ سر مبارک پر تیل کا استعمال کثرت سے کیا کرتے تھے۔ اس لئے بھی سیاہ رنگ زیادہ مناسب تھا۔ جس پر تیل آسانی سے ظاہر نہیں ہوتا۔ خصوصاً سفر کی حالت میں جب دھونے دھلانے کے مواقع کم ہوتے ہیں، سفید کی نسبت سیاہ کپڑے کا استعمال زیادہ مناسب ہے۔ علاوہ ازیں فتح مکہ کے اس تاریخی موقع پر آپ ﷺ نے اس عمل سے دین محمدی ﷺ کے دوام اور عدم تغیر پذیری کی طرف اشارہ بھی فرمایا۔ کیونکہ سیاہ رنگ بھی متبدل اور دوسرے رنگ سے متاثر نہیں ہوتا(۱)۔

(۲) حدثنا ابن أبی عمر ثنا سفیان عن مساور الورّاق عن جعفر ابن عمرو بن حریث عن أبیه قال رأیت علی رسول اللہ ﷺ عمامة سوداء(۲).

(بقیہ حاشیہ) فی الشرع ولا فی السنة ولا کانت فی الزمن القدیم وإنّما حدثت فی سنة ثلاث وسبعین وسبعمائة بأمر الملک الأشراف یعنی شعبان بن حسین (الحاوی للفتاویٰ ۱/۳۳) اور علامہ محمد کامل نے لکھا ہے سئلت عمّن انتسب إلی آل بیت النبوة ولیس هو منهم ولبس عمامة الخضراء لیقال أنه سید وشریف ماذا یلزمه؟ فالجواب: أنه یمنع من لبس العمامة الخضراء ویعزر تعزیراً شدیداً یحبس حتی یظهر صلاحه أفتی بذلک فی البهجة (الفتاویٰ الکاملیة ۲۶۵) گویا سبز پگڑی کا ثبوت صراحتاً نہیں۔ اس لئے اس کو سنت نہ سمجھا جائے۔ البتہ اگر اہل جنت کے لباس سے مشابہت یا گنبد خضراء کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے بوجۂ عشق استعمال کیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ (مختار)

(۱) خلفائے عباسیہ کے ہاں ایک پگڑی کا ذکر ملتا ہے۔ جس کے ذریعے وہ ہر نئے خلیفہ کی دستار بندی کرتے تھے۔ اور ان کا خیال تھا کہ یہ وہی پگڑی ہے جو فتح مکہ کے دن نبی کریم ﷺ نے پہنی تھی۔ اور بعد میں اپنے چچا حضرت عباسؓ کو بخش دی تھی۔ اور اس طرح بنو عباس کو ملی (اصلاح الدین)

(۲) صحیح مسلم ۱/۴۳۹ کتاب الحج باب جواز دخول مکة بغیر احرام، ابوداؤد ۲/۲۰۹ کتاب اللباس باب فی العمائم سنن النسائی ۲/۲۵۵ کتاب الزینة باب لبس العمائم السود، ابن ماجة ص ۲۰۸ کتاب اقامة الصلوٰة والسنة باب ماجاء فی الخطبة یوم الجمعة وکتاب اللباس بالعمامة السوداء (مختار)

ترجمہ: عمرو بن حریثؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے سر مبارک پر سیاہ عمامہ دیکھا۔

(۳) حدّثنا محمود بن غیلان ویوسف بن عیسیٰ قالا ثنا وکیع عن مساور الورّاق عن جعفر بن عمرو بن حریث عن أبیه أنّ النبی ﷺ خطب النّاس و علیه عمامة سوداء.

ترجمہ: عمرو بن حریثؓ سے یہ روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ لوگوں کو اس حال میں خطبہ دیا کہ آپ ﷺ کے سر مبارک پر سیاہ عمامہ تھا۔

وعلیہ عمامة سوداء اوپر کی دونوں حدیثوں میں یہ تعین نہیں ہے کہ حضرت عمرو بن حریثؓ یہاں کس روز اور کس موقع کی بات کر رہے ہیں۔ لیکن مسلم اور نسائی کی حدیثوں میں انہوں نے کہا ہے کہ وہ منظر گویا میرے سامنے ہے جب نبی کریم ﷺ منبر پر خطبہ دے رہے تھے سیاہ عمامہ آپ ﷺ کے سر مبارک پر تھا اور اس کا شملہ دونوں شانوں کے درمیان تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جمعہ کا دن تھا نیز یہ خطبہ اس خطبہ کے علاوہ ہے جو آپ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر دیا تھا۔ کیونکہ وہ خطبہ منبر پر نہ تھا بلکہ کعبہ کے دروازے پر چڑھ کر آپ ﷺ نے دیا تھا۔ صاحب مصابیح نے بھی یہ حدیث باب خطبۃ الجمعہ کے تحت ذکر کی ہے(۱)۔ علامہ نوویؒ اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ سیاہ لباس پہننا جائز ہے اگرچہ سفید اس سے بہتر ہے۔

---

(۱) لیکن علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ عمرو بن حریثؓ کی حدیث میں جو خطبہ مذکور ہے یہ وہی خطبہ ہے جو کہ آپ ﷺ نے فتح مکہ کے دن باب کعبہ کے پاس دیا۔ تو گویا انہوں نے دروازے کی دہلیز کو مجازاً منبر کہا ہے۔ (عبدالرؤف مناوی) اور اسی رائے کی طرف میرک شاہؒ کے کلام میں بھی اشارہ ملتا ہے۔ (کما فی جمع الوسائل) نیز علامہ بیجوریؒ فرماتے ہیں کہ "والمراد بالمنبر فی بعض الروایات عتبة الباب لانّها منبر بالمعنی اللغوی و ھو کل مرتفع" (المواھب اللدنیہ) جبکہ ملا علی قاریؒ کی رائے یہ ہے کہ یہ خطبہ آپ ﷺ کا مرض وصال والا ہے۔ (اصلاح الدین)

(۴) حدّثنا هارون بن إسحاق الھمد انیّ ثنا یحییٰ بن محمّد المدینّی عن عبد العزیز بن محمّد عن عبداللّٰہ بن عمر عن نافع عن ابن عمر قال کان النّبیّ ﷺ اذا اعتمّ سدل عمامته بین کتفیه قال نافع وکان ابن عمر یفعل ذلک قال عبیداللّٰہ ورأیت القاسم ابن محمّد و سالما یفعلان ذلک(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب عمامہ باندھتے تھے تو اس کا شملہ اپنے دونوں مونڈھوں کے درمیان لٹکا ہوا چھوڑ دیتے تھے۔ نافعؒ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ ایسا کرتے تھے۔ نافعؒ کے شاگرد عبیداللہ بن عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے قاسم بن محمد بن ابی بکر اور سالم بن عبداللہ بن عمرؓ کو ایسا کرتے دیکھا تھا۔

سدل عمامة بین کتفیه الخ یعنی آپ ﷺ نے پگڑی کا شملہ جسے عربی زبان میں عذبة یا علاقة کہتے ہیں کندھوں کے درمیان پیچھے کی جانب چھوڑ دیا تھا(۲)۔ اس حدیث سے شملہ چھوڑنے کا ثبوت ملتا ہے۔ اور یہ سنت ہے۔ عموماً آپ ﷺ شملہ چھوڑ کر پگڑی باندھا کرتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی بغیر شملہ کے بھی پگڑی باندھی ہے۔ اکثر یہ ثابت ہے لیکن بائیں جانب کو چھوڑنے کا ذکر نہیں۔ امام مناویؒ کہتے ہیں کہ کندھوں کے درمیان چھوڑنا افضل ہے۔ یہ بھی آیا ہے کہ آپ ﷺ نے پگڑی کے دونوں سرے چھوڑ کر دو شملے لٹکائے ہوں لیکن عموماً آپ ﷺ ایک شملہ چھوڑ کر پگڑی باندھا کرتے تھے۔

اس کی مقدار میں بھی اقوال ہیں۔ کم از کم مقدار چار انگلیوں جتنی منقول ہے اور زیادہ سے زیادہ

---

(۱) جامع ترمذی ۱/۳۰۴ باب ماجاء فی العمامة السوداء کتاب اللباس باب سدل العمامة بین الکتفین، شرح السنة للبغوی ۱۲/۳۷، کتاب اللباس باب العمامة والتقنع، صحیح ابن حبان ۸/۱۰۴ باب وصف تعمیم المصطفیٰ (مختار)

(۲) آگے کی طرف شملہ چھوڑتے ہوئے دائیں جانب چھوڑنا لازمی نہیں ہے۔ علامہ مناویؒ حافظ زین الدین عراقیؒ سے نقل کرتے ہیں کہ ولم ارمادل علی تعیین الایمن إلاّفی حدیث أبی أمامةؓ عندالطبرانی لکنّه ضعیف بلکہ صوفیاء تو بائیں جانب چھوڑنے کو ترجیح دیتے ہیں تاکہ دل کا رابطہ دنیا اور غیر اللہ سے نہ ہو۔ (اصلاح الدین)

ایک ذراع کا ذکر ہے جوعموماً پیٹھ کی وسط تک پہنچ جاتا ہے۔اس لئے شملہ کو زیادہ لمبا نہیں کرنا چاہیے۔ذراع سے تجاوز کرنے کو بعض علماء نے بدعت میں شمار کیا ہے اور اسبال کے زمرہ میں ہونے کے سبب ناجائز قرار دیا ہے۔علامہ مناویؒ کہتے ہیں کہ تکبر کے طور پر زیادہ لمبا چھوڑنا حرام ہے۔واللہ اعلم

یفعل ذالک ابن عمرؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے شاگرد حضرت نافعؒ کے بقول حضرت ابن عمرؓ ایسا کرتے تھے۔یعنی شملہ چھوڑ کر پگڑی باندھا کرتے تھے۔حضرت عبداللہ ابن عمرؓ ویسے بھی اتباع سنت میں امتیازی مقام رکھتے تھے۔

قال عبیداللّٰہ یہ حضرت نافع کے شاگرد ہیں۔**ورأیت القاسم بن محمد و سالما یفعلان ذالک** یعنی حضرت قاسمؒ اور حضرت سالمؒ بھی شملہ پیٹھ کی جانب چھوڑا کرتے تھے۔یہ دونوں ممتاز تابعین میں سے ہیں۔اوّل الذکر حضرت ابوبکرؓ کے پوتے اور دوسرے حضرت عمرؓ کے پوتے ہیں۔ان آثار کے نقل سے امام ترمذیؒ کا مقصد یہ ہے کہ شملہ چھوڑنا سنت ماثورہ ہے۔اور سلف صالحین نے اس کا التزام فرمایا ہے۔

(۵) حدثنا یوسف بن عیسیٰ ثنا وکیع ثنا أبو سلیمان و ھو عبدالرحمٰن بن الغسیل عن عکرمة عن ابن عباسؓ أنّ النّبیّ ﷺ خطب النّاس و علیه عصابة دسماء(۱).

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ لوگوں کو خطبہ دیا اور آپ ﷺ کے سر مبارک پر تیل سے آلودہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔

عن عبدالرحمان بن غسیل الخ حضرت حنظلہؓ کو غسیل الملائکہ کہتے ہیں۔ان کے بیٹے کے پوتے حضرت عبدالرحمٰن بن سلیمان بن عبداللہ بن حنظلہ مراد ہیں۔

حضرت حنظلہ نے نئی نئی شادی کی تھی۔ادھر آپؓ نے بیوی سے ہمبستری کی۔ادھر جہاد کی منادی ہوئی۔جنابت کی حالت میں میدان جنگ کی طرف دوڑے۔دلہن کا خیال تو کجا، غسل کرنے کے لئے بھی نہیں ٹھہرے۔اس قسم کی قربانی کسی بھی امت میں کوئی پیش نہ کر سکا۔الغرض جہاد کرتے ہوئے جام شہادت

---

(۱)صحیح بخاری ۱/۱۲۵، ۱۲۶ کتاب الجمعة باب من قال فی الخطبة بعد الثناء امابعد،مسند احمد ۱/۲۳۳(مختار)

نوش فرمایا۔آپ کی لاش مبارک پر حضورﷺ کی نظر پڑی تو دیکھا کہ فرشتے غسل دینے میں مصروف ہیں۔ آپﷺ نے تعجب فرمایا۔بیوی سے پتہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ میرے ساتھ صحبت کی حالت میں منادی کی آواز سنی۔فوراً اٹھ کر میدان جنگ کو آئے۔غسل نہیں کیا۔اگر چہ شہید کو غسل نہیں دیا جاتا مگر جنابت کی وجہ سے فرشتوں نے ان کو غسل دیا۔چنانچہ اس وجہ سے آپ غسیل الملائکہ کہلانے لگے۔

خطب الناس وعلیه عصابة دسماء الخ دسماء دسومة سے ہے جو چکناہٹ کو کہتے ہیں اور عموماً تیل لگانے کے سبب ہوتا ہے۔یعنی نبی کریمﷺ کے سر پر تیل سے آلودہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ عصابہ دراصل اس پٹی کو کہتے ہیں جس پر عموماً سر درد کے وقت سر باندھا جاتا ہے۔یہ نبی کریمﷺ کی مرض الوفات کا واقعہ ہے۔آپﷺ نے باہر آ کر لوگوں کو خطبہ دیا۔اور امراء کو انصار کی رعایت کا حکم دیا۔یہ آپﷺ کا آخری خطبہ ہے۔اس کے بعد آپﷺ نے لوگوں کو کوئی خطبہ نہیں دیا۔اس دوران آپﷺ کو سر درد کی شکایت بہت ہوتی تھی بلکہ آپﷺ کا اصل مرض ہی یہی تھا۔اس موقع پر آپﷺ کا سر اس پٹی کے ذریعے بندھا ہوا تھا۔چنانچہ اس حدیث سے پٹی کے ذریعے سر کو باندھنے کا ثبوت ملتا ہے۔جبکہ بعض شراحِ حدیث کے نزدیک عصابہ اور عمامہ ہم معنی ہیں۔لہٰذا یہاں عمامہ اور پگڑی ہی مراد ہے۔بلکہ ایک اور روایت میں **عمامة دسماء** مروی ہے۔عمامہ کے باب میں لاتے ہوئے شاید امام ترمذیؒ کا بھی یہی مقصد ہے کہ یہاں عمامہ مراد ہے۔

۱۸. باب ما جاء فی صفة ازار النبی ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے تہہ بند کے بیان میں

<u>نبی کریم ﷺ کا تہہ بند اور اس کی مقدار:</u> شلوار کی جگہ لنگوٹی باندھی جاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ اسے استعمال کیا کرتے تھے۔ اس باب میں لنگوٹی کا بیان مقصود ہے۔ البتہ ضمنا رداء کا بھی ذکر ہوا۔ ازار کے معنی سختی، شدت اور مضبوطی کے ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ "فاشدد به ازری" یعنی میرے بھائی کے ذریعے مجھے تقویت دے۔

چونکہ ازار کو بھی نطاق یعنی کمر بند کے ذریعے مضبوطی سے باندھا جاتا ہے۔ اس لئے اسے ازار کہا جانے لگا۔ اس زمانے میں ازار اور لنگوٹی بطور تہہ بند استعمال کرنے کا عام رواج تھا۔ لہٰذا آپ ﷺ کی لباس میں ازار کے استعمال کا ذکر کثرت سے آیا ہے۔ آپ ﷺ جو ازار استعمال کرتے تھے روایات کے مطابق اس کا طول چار ہاتھ اور ایک بالشت تھا۔ جبکہ عرض دو ہاتھ تھا۔ جبکہ حضور ﷺ کے رداء کے بارے میں دو قسم کی روایات منقول ہیں۔ اول طول چار ذراع اور عرض ڈھائی ذراع دوم طول چھ ذراع اور عرض تین ذراع ایک بالشت۔

<u>شلوار کا حکم:</u> احادیث میں نبی کریم ﷺ کے بارے میں شلوار پہننے کا واضح ثبوت نہیں ہے۔ لیکن صاحب زاد المعاد کی تحقیق کے مطابق نبی کریم ﷺ نے شلوار پہنی بھی تھی اور محبت کی نظر سے دیکھ کر یہ بھی فرمایا تھا کہ یہ استر ہے۔ یعنی خوب پردہ پوشی کرنے والا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے شلوار کا خریدنا(۱) ثابت ہے اور یہ قرینہ ہے کہ آپ ﷺ نے اسے پہنا بھی ہوگا۔ بہر حال شلوار بہتر لباس ہے۔

(۱) حدثنا أحمد بن منيع ثنا اسماعيل بن إبراهيم ثنا أيوب عن حميد بن هلال عن أبي بردة قال أخرجت إلينا عائشة رضی اللہ عنہا كساً ملبّدً

---

(۱) قال ابن القيم والظاهر انهٗ اشتراه ليلبسه قال وروى انّه لبسه و كانوا يلبسونه فى زمانه و باذنه.

(جمع الوسائل ج ۱ ص ۲۱۶)(اصلاح الدين)

او إزار أ غليظاً فقالت قبض روح رسول اللهﷺ فی هذین(۱).

ترجمہ: حضرت ابو بردہؒ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے ہمیں ایک پیوند لگی ہوئی چادر اور ایک لنگوٹی دکھلائی۔اور یہ فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کا وصال ان دو کپڑوں میں ہوا تھا۔

ابو بردہؒ: عن ابی بردۃؒ الخ یہ مشہور تابعی اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے بیٹے ہیں۔ان کا نام عامر یا حارث تھا۔کوفہ کے قاضی بھی رہ چکے تھے۔اپنے والد کے علاوہ دیگر صحابہؓ اور حضرت عائشہؓ سے بھی روایت ثابت ہے۔بعض نسخوں میں یہاں "عن ابیه" کا اضافہ ہے۔لیکن حضرت عائشہؓ سے ملاقات اور روایت ثابت ہونے کی بناء پر موجودہ نسخہ کی حدیث بھی مرسل نہیں ہوتی۔

زہد نبویﷺ یاددہانی: أخرجت إلينا عائشةؓ الخ حضرت عائشہؓ کبھی کبھی نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد بھی صحابہؓ کو آپ ﷺ کے زہد اور فقر کی زندگی یاد دلانے کے لئے آپ ﷺ کے حالات کا ذکرہ کرتی تھیں۔اس سلسلے میں ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے صحابہؓ کو ایک چادر اور ایک لنگوٹی دکھلائی جو انہوں نے بقصد تبرک حفاظت سے رکھی تھیں(۲)۔چادر میں تہہ بتہہ ٹکڑے سیئے گئے تھے۔اور لنگوٹی بھی کھدر جیسے سخت اور موٹے کپڑے کی تھی دونوں دکھلاتے ہوئے فرمایا کہ ان دو کپڑوں میں شاہ کونین ﷺ کی روح مبارک پرواز کرگئی تھی۔کساءً ملبداً بدن کے اوپر کا حصہ چھپانے کیلئے جو موٹا کپڑا یا کمبل استعمال ہوتا ہے کساء کہلاتا ہے جبکہ ملبد سے مراد اکثر شراح کے نزدیک پیوند لگا کپڑا ہے(۳)۔جبکہ بعض شراح کہتے

(۱)صحیح بخاری کتاب اللباس باب الاکیة والخمائص ۸۶۵/۲،کتاب فرض الخمس باب ماذکر من درع النبیﷺ وعصاه وسیفه الخ، سنن ابی داؤد ۲۰۴/۲ باب لباس الصوب والشعر کتاب اللباس ، جامع ترمذی ۳۰۴/۱ کتاب اللباس باب ماجاء فی لبس الصرف، ابن ماجة کتاب الباس باب لباس رسول اللهﷺ(مختار)

(۲)اس روایت سے بزرگوں کے لباس، عمامہ، عصا وغیرہ اشیاء کو تبرک کے طور پر رکھنا ثابت ہوتا ہے اور ملا علی قاریؒ نے اس روایت سے اس مسئلہ کا اثبات کیا ہے۔شاکر غنی سے صابر فقیر بہتر ہے(جمع الوسائل ۲۱۱/۱)(مختار)

(۳)علماء نے لکھا ہے کہ پیوند لگائے ہوئے کپڑوں کا استعمال معیوب نہیں۔بلکہ مستحسن ہے۔حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں مشہور ہے کہ جب آپؓ بیت المقدس پہنچے تو آپؓ کی قمیص میں سترہ پیوند لگے ہوئے تھے۔تو مسلمان فوج کے جرنیل حضرت ابوعبیدہؓ نے عرض کیا کہ یہاں کے لوگ اس کو حقیر سمجھتے ہیں۔تو حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ ہم نادار اور غریب لوگ تھے۔اللہ نے ہمیں دین اسلام کی وجہ سے عزت بخشی۔اگر ہم دین اسلام کے علاوہ عزت تلاش کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہمیں رسوا کریگا۔(مختار)

ہیں کہ وہ کپڑا جو موٹائی کی وجہ سے سخت ہو چکا ہو ملبد کہلاتا ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ایک وسیع اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اور دور دور تک کے علاقے اس کے زیر نگیں تھے۔ لیکن اس کے سربراہ کے فقر کی یہ حالت تھی۔ بہر حال اس حدیث میں ازار پہننے کا ثبوت ملتا ہے۔

(۲) حدّثنا محمود بن غیلان أنا أبو داؤد عن شعبة عن الأشعث ابن سلم قال سمعت عمتی تحدّث عن عمّها قال بینهما أنا أمشی بالمدینة اذا انسان خلفی یقول ارفع إزارک فانه اتقیٰ و أبقیٰ فالتفّت فاذا هو رسول اللّٰه ﷺ فقلت یا رسول اللّٰه ﷺ إنّما هی بردة ملحاء قال أمالک فیَّ أسوةٌ فنظرت فاذا إزاره إلیٰ نصف ساقیه(۱).

ترجمہ: عبید بن خالد محاربیؓ کہتے ہیں کہ میں مدینہ منورہ میں ایک مرتبہ جا رہا تھا کہ اچانک ایک شخص میرے پیچھے سے بولا کہ لنگوٹی کو اوپر اٹھاؤ۔ کہ یہ تقویٰ سے زیادہ قریب اور زیادہ دیر تک رہنے کے لئے مفید ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ نبی کریم ﷺ تھے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! یہ ایک معمولی سی سیاہ (ناقابل فخر) چادر ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کیا تیرے لئے میرا اتباع کافی نہیں۔ میں نے اس ارشاد پر نبی کریم ﷺ کی لنگوٹی کو دیکھا تو وہ نصف پنڈلی تک تھی۔

سمعت عمّتی تحدّث عن عمّها الخ ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ اشعث کی پھوپھی کا نام رہم بنت الاسود بن خالد ہے۔ اور وہ اپنے چچا عبید بن خالدؓ سے روایت کرتی ہے لہٰذا "**تحدّث عن عمّها**" درست ہوگا۔ لیکن علامہ مناویؒ اور دیگر شراح نے لکھا ہے کہ اشعث کی پھوپھی کا نام رہم بنت الاسود بن حنظل بن خالد ہے۔ اور ان کے چچا سے مراد عبید بن خالدؓ ہونگے۔ لہٰذا اصح یہ ہے کہ "**تحدث عن عم ابیها**" کیونکہ عبید رہم بنت الاسود کے باپ اسود کے چچا لگتے ہیں۔

بینما أنا امشی الخ حضرت عبیدؓ کہتے ہیں کہ میں مدینہ میں جا رہا تھا کہ اچانک ایک انسان

---

(۱) سنن النسائی ۲/۲۹۷ کتاب الزینة باب العمائم السود، مسند احمد ۵/۳۶۵، المستدرک للحاکم ۲/۶۰۸ (مختار)

میرے پیچھے سے آواز لگا رہا تھا کہ تہہ بند کو اونچا کردو۔ فانّه اتقیٰ و ابقیٰ یعنی اونچا باندھنے سے ایک تو لنگوٹی زیادہ محفوظ ہو جائے گا، نجاست وغیرہ نہیں لگے گی۔ دوسرا یہ کہ یہ زیادہ دیر تک باقی رہے گا۔ جلد بوسیدہ بھی نہیں ہوگا۔ نیز ابقیٰ کے یہ معنی بھی ہو سکتی ہے کہ یہ تکبر اور غرور سے زیادہ حفاظت کرنے والا ہے۔ اور بعض روایات میں اتقیٰ کی جگہ انقی کا لفظ ذکر ہے۔ یعنی صفائی سے زیادہ اقرب ہے۔ بہرحال اس سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ انسان کو کپڑوں وغیرہ کی بھی رعایت کرنی چاہیے۔ عبیدؓ فرماتے ہیں کہ جب میں نے پیچھے لوٹ کر دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ نبی کریم ﷺ ہی ہیں جو مجھے پکار فرما رہے ہیں۔ إنّما هی بردة ملحاء ملحاء أملح کی تانیث ہے۔ اس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ یہ ایک حسین اور بیش قیمت چادر ہے۔ رنگدار اور خوبصورت کپڑا ہے اور کاٹنے سے تو یہ خراب ہوگا۔ چنانچہ یونہی میں نے پہن لیا۔ تکبر کی وجہ سے یہ لمبا کپڑا میں نے نہیں لیا۔ اور ملحاء اس بکری کو بھی کہتے ہیں جس کے سفید رنگ میں سیاہ دھبے ہوں (اور اس سے مراد وہ سیاہ وسفید ادنی درجے کا کپڑا ہوگا جو کہ اعراب اور مزدور پیشہ لوگ پہنتے ہیں) اس لحاظ سے یہ پرانے اور خراب رنگ سے کنایہ ہوگا۔ لہٰذا اس کا دوسرا معنی یہ ہوگا کہ یہ تو میلا اور مبتذل کپڑا ہے۔ جس طرح کہ عموماً مزدور پیشہ لوگوں کی محنت مزدوری کا لباس گندہ اور بوسیدہ ہوتا ہے۔

تو یہ اسی قسم کی ایک چادر ہوگی۔ اور صحابیؓ کا مقصد اس قول سے یہ ہوگا۔ کہ یہ اگر لمبا بھی ہے تو اس میں تکبر کا شائبہ نہیں کیونکہ پھٹا پرانا اور میلا کچیلا کپڑا ہے۔ شراح حدیث نے دوسرے معنی کو ترجیح دی ہے۔ اور پہلے معنی کو درست قرار نہیں دیا(۱)۔ دوسرا معنی سیاق وسباق سے بھی مطابق ہے۔ بہرحال اس صحابیؓ نے نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے مقابلے میں کوئی عذر پیش کیا جس کی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا اما لک فِیّ اسوة. یعنی یہ کیا منطق پڑھائی جاتی ہے۔ کیا میرا طریقہ تیرے لئے قابل اتباع نہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ لقد کان لکم فی رسول اللّٰه اسوة حسنة.(الایۃ)

تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہتر قابل تقلید نمونہ موجود ہے۔

لہٰذا تم میری پیروی کرو اور باتیں چھوڑ دو۔ گویا نبی کریم ﷺ کا مقصد یہ ہے کہ اگرچہ یہ قیمتی نہیں

---

(۱) ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں کہ وهو خطأ فاحش لفظا و معنی اور پھر تفصیل سے لفظی اور معنوی اعتبار سے اس رائے کو خطا ثابت کر دیا ہے۔ (جمع الوسائل ج ۱ ص ۲۱۳) (اصلاح الدین)

لیکن سدًا للذریعة اس میں بھی اسبال ناجائز ہے۔

إلی نصف ساقیه آپ ﷺ کا ازار آدھی پنڈلیوں تک لٹک رہا تھا۔ اس حدیث میں بھی ازار کا پہننا ثابت ہو رہا ہے۔

(۳) حدثنا سوید بن نصر ثنا عبدالله بن المبارک عن موسیٰ ابن عبیدة عن إیاس بن سلمة بن الأکوع عن أبیه قال کان عثمان یأتزر إلیٰ أنصاف ساقیه وقال هکذا کانت إزرة صاحبی یعنی النّبیّ ﷺ(۱).

ترجمہ: حضرت سلمۃ بن الاکوعؓ کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ تہہ بند آدھی پنڈلی تک باندھتے تھے اور فرماتے تھے کہ اسی طرح میرے آقا یعنی نبی کریم ﷺ کی لنگوٹی بھی تھی۔

سلمة بن الاکوعؓ: عن ابیه حضرت سلمۃ بن عمرو بن الاکوعؓ مشہور صحابی ہیں۔ بہادری کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ بہترین تیر انداز تھے، اور تیز اتنے تھے کہ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کو پکڑ لیتے تھے۔ نبی کریم ﷺ کے ساتھ سات غزوات میں شرکت کی۔ بیعت رضوان میں بھی موجود تھے۔

هکذا کانت ازرة صاحبی حضرت عثمانؓ کہتے ہیں کہ میرے آقا کا ازار بھی اسی طرح یعنی نصف ساق تک ہوتا تھا۔ گویا میں بھی اسی وجہ سے ایسا کرتا ہوں۔ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ ساتھ ان کے ایک خلیفہ حضرت عثمانؓ کی سنت بھی مذکور ہے۔

(۴) حدثنا قتیبة انا أبو الأحوص عن أبی إسحاق عن مسلم ابن نذیر عن حذیفة بن الیمان قال اخذ رسول الله ﷺ بعضلة ساقی اوساقه فقال هذا موضع الازار فان ابیت فاسفل فان ابیت فلا حق للازار فی الکعبین(۲).

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ ۲۰۶/۸، ۲۰۸ (مختار)

(۲) سنن النسائی ۲۹۸/۲ کتاب الزینة باب موضع الازار، ابن ماجة ۲۶۴/۱ کتاب اللباس باب موضع الازار این هو شرح السنة للبغوی ۱۰/۱۲ باب موضع الازار کتاب اللباس (مختار)

ترجمہ: حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے میری پنڈلی یا اپنی پنڈلی کے گوشت کو پکڑ کر یہ فرمایا کہ یہ حد ہے لنگوٹی باندھنے کی۔ اور اگر تم اس جگہ باندھنے پر قناعت نہ کرسکو۔ تو اس سے کچھ نیچے تک (باندھو) اور اگر اس پر بھی قناعت نہ ہو تو جان لو کہ لنگوٹی کا ٹخنوں پر کوئی حق نہیں۔

حذیفة بن الیمانؓ کا تذکرہ: **عن حذیفة بن الیمانؓ** ابوعبداللہ حذیفہ بن الیمان عبسی کے والد کا اصل نام حسل بن جابر یا حسیل بن جابر الیمانی تھا۔ حذیفہؓ اور ان کے والد دونوں غزوہ بدر سے کچھ قبل مسلمان ہو چکے تھے۔ ان کے والد غزوہ احد میں غلطی سے مسلمانوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ حضرت حذیفہؓ کو صاحب سرِ رسول اللہ ﷺ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ آپؓ منافقین اور فتنوں کے سلسلے میں نبی کریم ﷺ کے راز دان تھے۔ غزوہ خندق میں آپ ہی کو نبی کریم ﷺ نے معلومات کیلئے کفار کی فوج میں بھیج دیا تھا۔ آپ گئے اور آ کر خبر دی کہ مشرکین واپس ہونا چاہتے ہیں جس سے نبی کریم ﷺ بہت خوش ہو گئے۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے چالیس دن بعد ۳۵ھ میں مدائن میں وفات پائی اور وہیں دفن ہو گئے۔ بعض اہل سیر ۳۶ھ میں وفات کے قائل ہیں۔

عضلة ساقی او ساقه عضلة پنڈلی کے اس حصہ کو کہتے ہیں جہاں گوشت زیادہ ہوتا ہے۔ راوی مسلم کو شک ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے اپنی پنڈلی کا ذکر کیا تھا یا نبی کریم ﷺ کی پنڈلی کا ذکر کیا۔ **فقال هذا موضع الازار فان ابیت فاسفل الخ.** یعنی اگر طبیعت کو ناگوار ہو تو ذرا نیچے کرلو۔ لیکن اگر اس سے بھی دل کو اچھا نہ لگے اور نیچے باندھنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ کیونکہ کعبین میں ازار کا حق نہیں۔ اور اس سے نیچے کرنا اسبال ہوگا۔ جو ناجائز ہے۔

شلوار کا ٹخنوں سے نیچے ہونا: اس حدیث سے اسبال یعنی ازار کا ٹخنوں سے نیچے ہونا ناجائز معلوم ہوتا ہے۔ یہی حکم شلوار اور لمبی قمیص کا بھی ہے۔ اس سلسلے میں علماء کا تقریباً اس بات پر اتفاق ہے کہ مرد کے لئے لنگوٹی اور شلوار کا آدھی پنڈلی تک ہونا مستحب ہے۔ اور اس سے نیچے ٹخنوں تک ہونا بلا کراہت جائز ہے۔ بلکہ اگر کسی عذر کی وجہ سے ٹخنوں سے نیچے ہو جائے تب بھی جائز ہے لیکن بغیر عذر کے ٹخنوں سے نیچے ہونا

مکروہ ہے۔اور اگر تکبر کی وجہ سے ہوتو حرام ہے۔دوسری احادیث میں اس پر سخت وعید بھی آئی ہے۔نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ **ما اسفل من الکعبین من الإزار فی النار**(۱)۔

ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ اسبال اور جرِّ ثوب سے جو ممانعت آئی ہے اس میں آستینوں اور شملہ کا معتاد طریقے اور حد سے لمبا کرنا بھی آتا ہے۔لہٰذا اگر یہ تجاوز بھی تکبر کی نیت سے ہوتو حرام ورنہ مکروہ ہے۔

البتہ عورتوں کے لئے چونکہ ستر کی تاکید آئی ہے۔لہٰذا ان کے تمام کپڑوں میں مردوں کی نسبت لمبا چوڑا ہونا ہی بہتر ہے تاکہ جسم کے تمام حصوں کو خوب ڈھانپ سکے۔اور جب تک یہ اسراف کی حدود تک نہ پہنچے گا ممنوع نہیں ہوگا۔

یہاں پر یہ بات واضح رہے کہ قاضی عیاضؒ نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ اسبال یعنی کپڑے کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانا مردوں کے لئے ممنوع ہے عورتوں کے لئے نہیں۔ بلکہ ان کے لئے اتنا لمبا کپڑا پہننے کی گنجائش ہے کہ بالشت دو بالشت زمین پر گھسیٹتا رہے۔جیسا کہ ام سلمہؓ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے اور یہ اس لئے کہ ان کے قدم دکھائی نہ دیں۔البتہ اگر پاؤں کو جراب،موزوں وغیرہ سے ڈھانپ لیا جائے تو پھر زمین تک کپڑا لٹکانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

پھر بعض احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کے لئے بھی اسبال کی حرمت تکبر کی علت کی وجہ سے ہے نہ مطلقاً۔جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ **لا ینظر اللّٰہ الی من جرّ ثوبہ خیلاء(رواہ البخاری عن ابن عمرؓ)** اسی طرح ابن عمرؓ کی حدیث ہے کہ جب ابوبکرؓ نے اسبال سے نہی کی بات سنی تو نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ میری ازار کا ایک پہلو مجھ سے نہیں سنبھلتا بے اختیار لٹک جاتا ہے۔اس لئے بہت تکلف سے کام لیکر ہی اسے اونچا رکھ سکتا ہوں۔تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ "**لست ممن یصنعہ خیلاء**" تم تکبر کرنے کی غرض سے ایسا کرنے والوں میں سے نہیں ہو۔تو گویا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اسبال پر آپ ﷺ نے اسلئے انکار نہیں فرمایا کہ وہ تکبر کی نیت سے نہیں تھا۔اسلئے "**ما اسفل من الکعبین فی النار**" اور "**لاحق للازار فی الکعبین**" جیسی احادیث کو بھی تکبراً اسبال پر محمول کیا جائے گا۔

---

(۱)بخاری ۲/ ۸٦۱ کتاب اللباس باب ما اسفل من الکعبین ففی النار(مختار)

البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ سداً للذریعۃ مطلقاً اسبال مکروہ ہے اور احتیاط بھی اسی میں ہے نیز تکبر کے علاوہ اسبال کی کراہت کے دوسرے اسباب بھی تو ہیں۔ مثلاً اس میں اسراف اور کپڑے کا ضیاع بھی ہے۔ باب کی پہلی حدیث میں اس طرف بھی اشارہ ہے۔

البتہ فقہائے کرام نے عذر کے وقت اسبال کو بلا کراہت جائز قرار دیا ہے۔ مثلاً کسی شخص کے پاؤں زخمی ہیں۔ اور مکھیوں یا دیگر موذی حشرات سے بچنے کا کوئی دوسرا طریقہ اس کے پاس نہیں سوائے اس کے کہ قمیص یا ازار وغیرہ کو لٹکا کر زخم کو چھپادے۔ تو اس صورت میں اسبال جائز ہوگا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

١٩. باب ماجاء فی مشیة رسول اللہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کی رفتار کے بیان میں

مشیة "ھیئة المشی" یعنی چال اور چلنے کی عادی کیفیت کو کہا جاتا ہے(١)۔ امام ترمذیؒ اس باب میں نبی کریم ﷺ کی رفتار مبارک کی کیفیت بیان فرماتے ہیں۔ اگر چہ پہلے باب میں بھی رفتار کا ذکر ضمناً ہو چکا ہے لیکن یہاں اصالۃً بیان کرتے ہیں۔

(١) حدّثنا قتیبة بن سعید أنا ابن لھیعة عن أبی یونس عن أبی ھریرة قال ما رأیت شیئاً أحسن من رسول اللہ ﷺ کأنّ الشمس تجری فی وجھہ و ما رأیت احداً أسرع فی مشیتہ من رسول اللہ ﷺ کأنّما الأرض تطوی لہ انّالنجھد انفسنا وإنّہ لغیر مکترث(٢).

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے زیادہ حسین کوئی چیز نہیں دیکھی۔ (آپ ﷺ کا چہرہ ایسا چمکدار تھا) گویا کہ آفتاب آپ ﷺ کے چہرہ میں چمک رہا ہے۔ میں نے آپ ﷺ سے زیادہ تیز رفتار شخص کوئی نہیں دیکھا۔ (آپ ﷺ کے چلتے ہوئے) ہم اپنے آپ کو تھکا دیتے تھے اور آپ ﷺ کو (معمول سے زیاد چلنے سے) پرواہ بھی نہیں ہوتی تھی۔

ما رأیت الخ رویت علمی مراد ہے یعنی میرے علم میں آپ ﷺ سے زیادہ کوئی حسین نہیں ہے۔ اگر چہ رؤیت بصری کا بھی احتمال ہے۔

کانّ الشمس تجری فی وجھہ۔ نبی کریم ﷺ کے حسن اور چہرے کی چمک دمک کو سورج کی روشنی اور حسن سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی گویا کہ آفتاب کا نور آپ ﷺ کے چہرۂ انور میں چمکتا جا رہا ہے۔

---

(١) المشیة ما یعتادہ الشخص من المشی ذکرہ الجابردی ١٢ جمع الوسائل ج١ ص٢١٦ (اصلاح الدین)

(٢) جامع الترمذی ٢/٢٠٦ کتاب المناقب باب فی صفة النبی ﷺ، مسند احمد ٥/٣٥ (مختار)

أسرع من رسول اللّٰہ فی مشیته یہ لفظ مشیۃ ہے جس طرح کہ باب میں ذکر ہے۔ یعنی آپ ﷺ سے چال میں کوئی تیز تر نہیں تھا۔ یا پھر تاء کے بغیر مشی مصدر ہے۔ اور مضاف مقدر ہے یعنی فی کیفیة مشیه ﷺ. اس قطعہ میں ترجمۃ الباب کے ساتھ مناسبت موجود ہے کیونکہ اس میں تیز رفتاری کا ذکر ہے۔

معجزہ طی الارض: کانها الارض تطوی له طی الارض معجزہ اور کرامت کے طور پر بھی ہوتا ہے۔ اس طرح کہ بہت طویل سفر آسان اور مختصر بن جائے۔ پشتو کے شاعر صوفی عبدالرحمانؒ کہتے ہیں کہ ۔

چی پہ یو قدم تر عرشه پورے رسی ۔۔۔ مالیدلے دے رفتار د درویشانو

ترجمہ: میں نے ان درویشوں کی رفتار دیکھی ہے جو ایک قدم اٹھا کر عرش تک پہنچ جاتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ رات کے ایک مختصر حصہ میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک گئے اور وہاں سے آسمانوں اور جنت وجہنم کا مشاہدہ کر کے واپس آئے۔ دروازے کا کواڑ ابھی ویسے ہی ہل رہا تھا۔ یہ طی الارض کا معجزہ تھا۔ اسی طرح اولیائے کرام کے لئے کبھی لمبا سفر چھوٹا ہو جاتا ہے۔

حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی کی کرامت: کہتے ہیں کہ سید الطائفہ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ مکہ مکرمہ سے پیدل چلے اور عصر کی نماز کیلئے مدینہ پہنچ گئے۔ حالانکہ پیدل جاتے ہوئے یہ پندرہ، سولہ دن کا سفر ہے۔ بہرحال یہ ایک اکرام ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیک بندوں کا ہوتا ہے۔ ایک روایت میں نبی کریم ﷺ سے ایک دعا مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللّٰهم از ولنا الارض و هوّن علینا السفر(۱)

ترجمہ: اے ہمارے رب ہمارے لئے زمین کی دوری سمیٹ لے اور ہم پر سفر آسان فرما دے۔

اس حدیث میں بھی اس بات کے امکان کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ ویسے بھی خرق عادت امور کا بزرگوں سے صادر ہونا کوئی اچھنبے کی بات نہیں۔ میں جن دنوں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے ہاں رہتا تھا جن کو حضرت شیخ الحدیثؒ سے انتہائی محبت تھی۔ اور اسی وجہ سے انہوں نے اس کمرے میں میری رہائش رکھی۔ جو کہ آپ کے کمرے کے اندر کی طرف کھلتا تھا۔ رمضان شریف کا مہینہ تھا۔ وہاں ایک بزرگ حافظ

(۱) جامع ترمذی ۲/۱۵۶ کتاب الدعوات باب ما یقول اذا خرج مسافراً (مختار)

صاحب تشریف لائے انہوں نے کسی بزرگ کا قصہ سنایا اور کہا کہ ایک بار وہ وعظ فرما رہے تھے چھوٹی سی مسجد تھی۔ سامنے ہال اور اس کے بعد برآمدے کی دیوار تھی۔ انہوں نے معراج نبوی ﷺ کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے آسمانوں میں خرق والتیام کے امکان کا مسئلہ چھیڑا اور مناطقہ کے اس قول پر رد کیا کہ آسمانوں میں ٹوٹ پھوٹ ممنوع ہے۔ مسجد کے اندر کچھ فلسفی ذہن کے لوگ بھی بیٹھے تھے۔ جن کو شاید یہ بات مستبعد معلوم ہوئی۔ چنانچہ وہ دلوں میں آپ کی بات کو خلاف حقیقت سمجھنے لگے۔ ولی اللہ نے اپنی فراستِ ایمانی سے محسوس کیا کہ کچھ زائغین بیٹھے ہیں جو اس بات کو نہیں مانتے، چنانچہ وہ جلال میں آئے۔ منبر سے کودے اور کہا "یوں گئے" ساتھ ہی دیواروں کو چیرتے ہوئے باہر چلے گئے۔ پھر کہا کہ "یوں آئے" اور انہی دیواروں کو چیرتے ہوئے واپس اندر آئے اس طرح سات بار باہر جا کر واپس آئے۔ ہر بار دیوار پھٹ کر اس کو راستہ دیتی اور وہ گزر جاتے اس طرح طی الارض بھی معجزہ اور کرامت کے سامنے کوئی انہونی بات نہیں۔ لیکن یہاں پر طی الارض مراد نہیں۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ عام طور پر نبی کریم ﷺ کی فطری رفتار اور چال اتنی چست تھی کہ بڑا فاصلہ تھوڑے سے وقت میں طے کر لیتے تھے۔ اور یوں محسوس ہوتا تھا گویا زمین ان کیلئے سمٹتی جا رہی ہے۔

إنّــا لــنـجهد انفسنـا ۔ نجھد جھد سے ثلاثی مجرد کے مضارع کا صیغہ ہے۔ یا پھر مضموم النون یعنی افعال سے مضارع معلوم کا صیغہ ہے۔ اور معنی یہ ہوگا کہ ہم خود کو تھکا دیتے تھے اور بتکلف تیز چلتے ہوئے خود کو مشقت میں مبتلا کر دیتے تھے لیکن آپ ﷺ کو ایسا چلنے کی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ یعنی آپ ﷺ کو تھکاوٹ کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ نہ اس وجہ سے وقار میں فرق آتا تھا۔ بلکہ اطمینان کے ساتھ چلتے تھے۔ ایک اور حدیث میں آپ ﷺ کی صفات میں "ذریع المشیة" (۱) کا لفظ آیا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ جاتے ہوئے آپ ﷺ لمبے لمبے ڈگ بھرتے تھے۔ لیکن وہ بھی کمال قوت کی وجہ سے ہوتا تھا۔ نہ کہ عجلت اور مشقت کی صورت میں۔

(۲) حدّثنا علیّ بن حجر و غیر واحد قالو ا ثنا عیسیٰ بن یونس عن عـمـر بـن عبـداللّٰہ مولٰی غفرة حدّثنی إبراھیم بن محمّد من ولد علی

---

(۱) شمائل باب نمبر ۱ حدیث نمبر ۷

ابن أبی طالبؓ قال کان علیؓ اذا وصف النبیﷺ قال اذا مشیٰ تقلع کأنّما ینحط فی صبب.(۱)

ترجمہ: ابراہیم بن محمدؒ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ جب نبی کریم ﷺ کا ذکر کرتے، تو یوں کہتے کہ نبی کریم ﷺ جب چلتے تو پاؤں کو قوت کے ساتھ اٹھا کر چلتے تھے۔ گویا پستی کی طرف اتر رہے ہوں۔

اس حدیث کی تشریح اس سے پہلے باب خلق النبی ﷺ میں تفصیل سے گزر چکی ہے۔ اس کے مذکورہ حصے میں آپ ﷺ کی رفتار کا ذکر ہے۔ اور اسی مناسبت سے اس حصے کو اس مقام پر دوبارہ لے آئے۔

(۳) حدّثنا سفیان بن وکیع قال أنا أبی عن المسعودیّ عن عثمان بن مسلم بن ھرمز عن نافع بن جبیربن مطعم عن علیّ بن أبی طالبؓ قال کان رسول اللہ ﷺ اذا مشی تکفا تکفّوا کأنّما ینحطّ من صبب(۲).

ترجمہ: حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ چلتے تھے تو آگے کی طرف جھک کر قوت کے ساتھ چلتے تھے۔ جیسے کسی اونچی جگہ سے اترائی کی طرف جا رہے ہوں۔

اذامشیٰ تکفا الخ یہ حدیث بھی گزشتہ حدیث کی طرح ہے۔ یہاں حدیث کے مختصر حصے کا ذکر ہے جو کہ پہلے باب میں مکمل تشریح کے ساتھ گزر چکی ہے۔

---

(۱)جامع ترمذی ۲/۶۸۲ ابواب المناقب باب ماجاء فی صفة النبیّ ﷺ، مسنداحمد۵/۳۵، شرح السنة۱۳/۲۲۱ باب صفة النّبیّ ﷺ کتاب الفضائل . (مختار)

(۲)جامع ترمذی ۲/۶۸۲ ابواب المناقب باب ماجاء فی صفة النّبیّ ﷺ، شرح السنة۱۳/۲۲۱ باب صفة النّبیّ ﷺ کتاب الفضائل، مسنداحمد۵/۳۵ (مختار)

۲۰۔ باب ما جاء فی تقنع رسول اللہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے قناع کے بارے میں

<u>قناع کیا ہے؟</u> قناع کے استعمال کرنے کو تقنع کہتے ہیں۔اور قناع وہ کپڑا یا رومال ہوتا ہے جو سر یا چہرہ چھپانے کے لئے استعمال ہوتا ہے(۱)۔عورت کے اس کپڑے کو بھی قناع کہتے ہیں جو سر یا چہرہ ڈھانپنے کے لئے استعمال کرتی ہے۔لیکن یہاں وہ کپڑا مراد ہے جو کہ سر پر لگے ہوئے تیل سے کپڑوں کی حفاظت کرنے کے لئے نیز سر کو گرمی یا سردی سے بچانے کے لئے سر پر ڈالتے ہیں۔عرب ممالک میں آج کل بھی سر پر رومال قسم کا کپڑا اڈالنے کا رواج ہے۔اوران علاقوں میں اس کی ضرورت پڑتی ہے۔کیونکہ وہ ریگستانی علاقہ ہے۔گرم ہوا ریت اڑاتی رہتی ہے۔پھر دھوپ کی وجہ سے بدن پر پسینہ بھی ہوتا ہے۔اس لئے سر اور چہرے کی حفاظت کے لئے رومال سے ڈھانپا جاتا ہے۔اور آج کل تو یہ عربوں کا گویا قومی شعار بن گیا ہے۔وہ ایئر کنڈیشنڈ محلات میں رہتے ہوئے بھی یہ رومال استعمال کرتے ہیں۔اوران کو یہ بہت زیب بھی دیتا ہے۔لیکن اس کی تاریخ دراصل بہت قدیم ہے اس باب میں صرف ایک حدیث ہے(۲)۔

(۱) حدثنا یوسف بن عیسیٰ أنا و کیع أنا الربیع بن صبیح عن یزید بن أبان عن أنس بن مالک قال کان رسول اللہ ﷺ یکثر القناع کان ثوبہ ثوب زیّات.(۳)

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ اپنے سر مبارک پر کپڑا اکثر رکھا کرتے تھے۔گویا کہ ان کا یہ کپڑا چکناہٹ میں تیلی کا کپڑا معلوم ہوتا تھا۔

(۱) ملاعلی قاریؒ تقنع کا معنی لکھتے ہیں ھو تغطیۃ الرأس بطرف العمامۃ اوبرداء اعم من ان یکون فوق العمامۃ اوتحتھا (جمع الوسائل ۱/۲۱۸)(مختار)

---

(۲) یہ روایت باب الترجل میں بھی گزری ہے یہاں اس کو مستقل باب کے تحت ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا تقنع کا خاص اہتمام فرماتے ہیں۔(مختار)

(۳) شرح السنۃ ۱۲/۸۲ باب ترجیل الشعر ونرھیۃ کتاب اللباس(مختار)

کان ثوبه ثوب زیّات خود نبی کریم ﷺ کا نہیں بلکہ قناع کا کپڑا مراد ہے۔کیونکہ خود آپ ﷺ کہ آپ ﷺ تیل بکثرت استعمال کیا کرتے تھے۔اوراسی وجہ سے آپ ﷺ کوقناع کا استعمال کرنا پڑتا تھا۔یعنی عمامہ کے نیچے ایک فاضل کپڑا باندھا کرتے تھے۔اورآپ ﷺ کے قناع کے کپڑے پر تیل اتنا زیادہ لگا ہوتا تھا کہ وہ کسی تیلی کا کپڑا معلوم ہوتا تھا۔

خصوصی لباس کا فائدہ: یہ حدیث اس سے قبل باب الترجل میں گزر چکی ہے۔البتہ قناع پہننے کے فوائد کا کچھ تذکرہ یہاں مناسب ہوگا۔علامہ بیجوریؒ وغیرہ نے لکھا ہے کہ علماء وخواص کے لئے صالحین اور مخصوص طرز کا لباس پہننا چاہیے۔تاکہ وہ پہچانے جاسکیں۔اورلوگ ان سے ضرورت کے وقت مسائل پوچھیں۔ان کی بات مانیں اورعوام کی طرح انہیں نظر انداز نہ کریں۔قناع بھی چونکہ خواص اور صالحین کا لباس ہے۔اس وجہ سے اس کا پہننا بہتر ہوگا۔علاوہ ازیں سر چھپانا بے یارو مددگار ہونے کی علامت ہے۔نیز اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کا لباس ہے۔اس لئے یہ ترکِ معاصی اور خدا سے حیا کی یاددہانی کراتا ہے۔جس طرح کہ پرانے زمانے میں طیلسان کے بارے میں اہل تصوف کا قول تھا کہ **الطیلسان الخلوة الصغریٰ** یعنی طیلسان اہل اللہ کا لباس ہونے کی بنا پر خدا خوفی،یادالٰہی اورمناجات رب کا مورث ہے۔جس طرح کہ خلوت کا انتظام ان مقاصد کے لئے کیا جاتا ہے۔حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ

التقنع من اخلاق الانبیاء. قناع کا استعمال انبیاء کرام کے اخلاق کا جزو ہے۔

۲۱۔ باب ماجاء فی جلسة رسول اللّٰہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے نشست کے بارے میں

جلسہ جیم کے کسرہ کے ساتھ بیٹھنے کی ہیئت اورانداز کو کہتے ہیں۔قیام سے بیٹھنے کیلئے عموماً قعود کا لفظ مستعمل ہوتا ہےاور لیٹنے یا تکیہ کے بعداٹھ بیٹھنے کے لئے عموماً جلوس کالفظ بولا جاتا ہے۔لیکن یہاں اس فرق کے بغیر صرف اس ہیئت کاذکر مقصود ہے جس پر نبی کریم ﷺ بیٹھتے ہوئے متصف ہوتے تھے۔

(۱) حدثنا عبداللّٰہ بن حمیدأنبانا عفان بن مسلم أنا عبداللّٰہ ابن حسان عن جدتیه عن قیلة بن مخرمة أنّها رات رسول اللّٰہ ﷺ فی المسجد و هو قاعدالقرفصاء قالت فلمّا رأیت رسول اللّٰہ ﷺ المتخشع(۱) فی الجلسة ارعدت من الفرق(۲)۔

ترجمہ: قیلہ بنت مخرمہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ مسجد میں گوٹ مار کر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے جب ان کو اس عاجزانہ ہیئت میں بیٹھے ہوئے دیکھا تو میں وحشت کے مارے لرز اٹھی(۳)۔

---

(۱)علامہ مناویؒ نے لکھا ہے کہ المتخشع باب تفعل سے اور تفعل کا باب تکلف کیلئے نہیں بلکہ زیادہ مبالغہ کے لئے آتا ہے(المناوی علی جمع الوسائل ۱/۲۲۰) جیسا کہ توحد،تکبر تو گویا آنحضرت ﷺ عاجزانہ حالت میں تشریف فرماتے اور ایسا بیٹھنا آپ ﷺ کو پسند تھا۔اور آپ ﷺ متکبرین اور جبابرہ کی طرح بیٹھنے کو ناپسند فرمایا کرتے تھے اجلس کما یجلس العبدواکل کما یأکل العبد لاعلی هیئة جلوس الجبارین المتکبرین من التربع والتمدد والاتکاء ورفع الرأس وشماخة الانف وعدم الالتفات الی المساکین والاحتجاب عن المحتاجین(جمع الوسائل ۱/۲۲۰)(مختار)

(۲)الادب المفرد للامام البخاری ص رقم حدیث۱۱۷۸،شرح السنة للبغوی ۱۲/۳۲۳ (مختار)

(۳)ایک دوسری روایت میں ہے کہ میرے اس خوف کو دیکھ کر کسی نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا یہ مسکینہ تو خوفزدہ ہوچکی ہے آپؓ(قیلہؓ) فرماتی ہے کہ میں آنحضرت ﷺ کی پشت کی طرف تھی آپ ﷺ میری طرف متوجہ بھی نہ ہوئے اور صرف زبان مبارک سے ارشادفرمایایامسکینة علیک السکینة کہ اے مسکینہ سکون اختیار کر،چنانچہ آنحضرت ﷺ کا یہ فرمانا تھا کہ اذهب اللّٰہ ماکان دخل قلبی من الرعب مجھ سے وہ ڈر اور خوف ختم ہوا۔(جمع الوسائل ۱/۲۲۰)(مختار)

عن جلتیہ۔ کتاب اللباس میں حدیث نمبر۱۲ میں یہ حدیث کچھ تفصیل سے گزر گئی ہے۔اور وہاں عبداللہ بن حسانؓ کی دادی اور نانی کے بارے میں تفصیل بھی گزر گئی ہے۔ان میں سے ایک کا نام صفیہ اور دوسری کا نام دحیبة ہے جو علیبہ کی بیٹیاں ہیں۔

قرفصاء کی تفسیر: قرفصاء الف مقصورہ وممدودہ دونوں کے ساتھ ایک ہی معنی میں مستعمل ہے لیکن اس کے معنی میں دو قول ہیں۔(۱) آدمی اپنی سرین زمین سے لگا کر اس طرح بیٹھے کہ اس کے ران پیٹ سے لگے ہوں اور ہاتھ دونوں پاؤں کے گرد بندھے ہوئے ہوں اسے احتباء بھی کہتے ہیں۔اور اردو میں گوٹ مارنا(۱)۔(۲) دوزانوں ہوکر بغلوں میں ہاتھ ٹھونس لے اور پھر جھک کر پیٹ کو رانوں سے لگادے(۲)۔

(۲) حدّثنا سعید بن عبدالرحمان المخزومی وغیر واحد قالوا أنا سفیان عن الزهریّ عن عباد بن تمیم عن عمّه أنّه رای النّبیّ ﷺ مستلقیا فی المسجد واضعا احدی رجلیه علی الاخری(۳).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن زیدؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو مسجد میں چھت پر لیٹے ہوئے دیکھا اس حال میں کہ آپ ﷺ نے اپنا ایک پاؤں دوسرے پاؤں پر رکھا تھا۔

عبداللہ بن زیدؓ: حضرت ابو محمد عبداللہ بن زید بن عاصم المازنی حضرت تمیم داریؓ کا علاتی یا اخیافی بھائی ہے۔مشہور صحابی ہیں۔ کہتے ہیں کہ مسیلمہ کذاب کے اصل قاتل عبداللہ بن زیدؓ ہی تھے۔ جنہوں نے وحشیؓ کی مدد سے اسے جہنم رسید کیا۔۶۳ھ کو واقعہ حرہ میں شہید ہوئے۔

---

(۱) اس طرح بیٹھنا اس وقت ہوتا ہے جب انسان کسی گہری سوچ میں ہو اور آنحضرت ﷺ کا اس طرح بیٹھنا اور گہری سوچ امت کیلئے کی تھی (مختار)

(۲) تیسرا معنی یہ بھی لکھا گیا ہے کہ کسی چیز کا سہارا لیکر سرین پر بیٹھا جائے اور رانوں کو پیٹ سے لگا کر بغلوں میں ہاتھ ٹھونس لئے جائے۔(اتحافات۱۶۹)(مختار)

(۳) صحیح بخاری ۶۸/۱ کتاب الصلوٰة باب الاستلقاء فی المسجد ومدالرجل، صحیح مسلم ۲/۲۰۳ کتاب اللباس والزینة باب فی اباحة الاستلقاء الخ، سنن ابی داؤد ۲/۳۱۲ کتاب الادب باب فی الرجل یضع احدی رجلیه علی الاخریٰ (مختار)

دواشکال اوران کا جواب: رأیت رسول اللّٰہ مستلقیا. استلقاء پیٹھ لگا کر لیٹنے کو کہتے ہیں۔یہاں پر دواشکال ہیں۔ پہلا یہ کہ نبی کریم ﷺ نے اس طرح لیٹنے سے منع فرمایا ہے کہ ایک پاؤں اٹھا کر دوسرے پر رکھا جائے۔مسلم شریف کی حدیث ہیں۔لایستلقین احد کم ثم یضع احدیٰ رجلیه علی الاخریٰ. تو پھر نبی کریمؐ نے خود یہ عمل کیوں کیا۔اس اعتراض کے شراح نے متعدد جواب دیتے ہیں۔مثلاً

اول یہ کہ آپ ﷺ کا یہ عمل نہی سے قبل تھا نہی بعد میں وارد ہوئی۔لہٰذا یہ حدیث منسوخ ہے۔

دوم یہ کہ نبی کریم ﷺ کی خصوصیت تھی جبکہ دوسروں کیلئے ایسا کرنا منع ہے کیونکہ یہ عمل بے احتیاطی بے ادبی اور غفلت پر دلالت کرتا ہے جو کہ دراصل تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے اور نبی کریم ﷺ میں تکبر مفقود تھا۔

لیکن ان توجیہات کو جو کہ کسی نہ کسی طرح ترجیح پر مبنی ہیں۔دیگر شراح نے ناپسند فرمایا ہے اور اکثر شراح نے دونوں حدیثوں کو جمع کرنے کی مختلف توجیہات کی ہیں جو یہ ہیں۔

اول نبی کریم ﷺ نے جس استلقاء سے منع کیا ہے وہ ہے کہ جس میں کشف عورت کا خطرہ ہو۔ مثلاً ایک پاؤں کھڑا ہو اور دوسرا اس کے اوپر اٹھا کر رکھ دیا جائے۔

چونکہ عرب میں عام رواج لنگوٹی باندھنے کا تھا اور اس طرح کے عمل سے کشف عورت کا احتمال زیادہ تھا۔لہٰذا آپ ﷺ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا۔اب اگر کشف عورت کا احتمال نہ ہو مثلاً لنگوٹی کے جگہ شلوار پہنی ہوئی ہو یا پھر ایک پاؤں بھی پھیلا کر زمین پر پڑا ہو اور دوسرا اس کے اوپر لمبا پڑا ہو۔تو لنگوٹی ہوتے ہوئے بھی کشف عورت نہیں ہوگا۔اس سے نہی نہیں ہوگا اور نبی کریم ﷺ کا عمل بھی اس دوسرے قسم پر محمول ہوگا۔

دوم یہ کہ نہی اپنے ظاہر پر محمول ہے لیکن بلاضرورت لیٹے ہوئے ایک پاؤں کو دوسرے پاؤں پر رکھنا ممنوع ہے اور اگر ضرورت ہو تو ایسا کرنا منع نہیں ہوگا۔مثلاً اگر آدمی تھکا ہوا ہو اور تھکاوٹ دور کرنے کیلئے تھوڑی دیر کیلئے ایسا کرے تو یہ جائز ہوگا۔

سوم یہ کہ نہی اپنے ظاہر پر محمول ہو اور نبی کریم ﷺ کا عمل بیان جواز کیلئے ہو گویا آپ ﷺ نے تنزیھاً نہی کر کے اس بات پر تو تنبیہ کردی کہ یہ عمل اچھا نہیں۔اس میں سوءادب کا احتمال ہے۔نیز باوقار لوگوں کو

اس سے بچنا چاہیے۔لیکن چونکہ یہ عمل حرام تو تھا نہیں اسلئے بیان جواز کی بھی ضرورت تھی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے عملاً اس کی جواز کی طرف اشارہ کردیا۔لیکن علامہ بیجوریؒ کہتے ہیں کہ بایں ہمہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ آپ نے یہ عمل عمومی مجلس کے دوران نہیں کیا تھا بلکہ مسجد میں اس وقت ایسے لوگ نہیں ہونگے۔جس سے نبی کریمؐ تکلف کرتے ہوں کیونکہ عام لوگوں کے درمیان آپ ﷺ کی نشست و برخاست احتیاط سے ہوتی تھی۔

ملاعلی قاریؒ نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ شاید اعتکاف کے دوران مسجد میں اقامت کئے ہوئے آپ اس ہیئت سے لیٹے ہوں گے۔

(۲) دوسرا اشکال اس پر یہ ہے کہ یہ حدیث ترجمۃ الباب سے مطابقت نہیں رکھتی۔کیونکہ اس میں تو جلسہ کا ذکر نہیں بلکہ آپ ﷺ کے لیٹنے کا بیان ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں ترجمۃ الباب کے ساتھ مناسبت ہے۔

<u>مسجد میں سونے کا حکم</u>: کیوں کہ اس حدیث سے مسجد میں لیٹنے کا جواز معلوم ہورہا ہے(۱)۔جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ مسجد میں ہر طرح کے بیٹھنے کو بھی جائز سمجھتے ہیں اور خود مسجد میں بیٹھے بھی ہونگے۔

بعض شرّاح کہتے ہیں۔کہ یہاں پر ترجمۃ الباب میں تعمیم ہے اور صرف بیٹھنے کا بیان مقصود نہیں۔بلکہ قیام کے علاوہ ھیئت و کیفیت کا بیان مقصود ہے اس طرح ترجمۃ الباب لیٹ جانے کی کیفیت کو بھی شامل ہوگا۔لہذا اشکال باقی نہیں رہا۔

(۳) حدّثنا سلمة بن شبیب أنبانا عبداللّٰه بن إبراهيم المدنیّ أنا إسحاق بن محمّد الأنصار عن ربیع بن عبدالرحمان بن ابی سعید عن

(۱) یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ فقہاء اور محدثین نے تو مسجد میں سونے کو مکروہ کہا ہے کما فی ردالمحتار مگر یہاں تو جواز بلاکراہت معلوم ہوتا ہے۔الجواب: مگر اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے آنحضرت ﷺ نے ایسا اعتکاف کے دوران کیا ہو اور اعتکاف کی نیت سے مسجد میں لیٹنا وغیرہ جائز ہو(۲) یا یہ جواب دینا ممکن ہے کہ کراہت مسجد کو آرام گاہ بنانے میں ہے اگر کوئی عبادت کرتے کرتے تھک جائے تو کمر سیدھی کرنے اور کچھ ستانے کیلئے لیٹ جائے تو کوئی کراہت نہیں اور اسی کے جواز پر مؤطا امام مالک میں حضرت عثمانؓ کا اثر موجود ہے۔(مختار)

أبیـه عن جده أبی سعید الخدری قال کان رسول اللہ ﷺ اذا اجلس فی المسجداحتبی بیدیه (۱).

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ جب مسجد میں تشریف رکھتے تو گوٹ مارکرتشریف رکھتے تھے۔

احتباء کسے کہتے ہیں: احتبیٰ بیدیه: احتباء گوٹ مارنے کو کہتے ہیں جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ آدمی سرین پر بیٹھ جائے دونوں گھٹنے آگے کی طرف اٹھائے۔اور اپنے ہاتھ پنڈلیوں کے گرد حلقہ بناتے ہوئے پکڑے اس طرح آدمی کو بیٹھنے میں آرام ہوتا ہےاور یوں محسوس ہوتا ہے۔جیسے کسی چیز کوٹیک لگا کر بیٹھا ہولیکن ہاتھوں کی بجائے کبھی کبھی کپڑا کمر اور پنڈلیوں کے گرد باندھ کر مزید آرام حاصل کیا جاتا ہے۔عموماً عربوں اور خصوصاً دیہاتی خانہ بدوشوں کواس وضع میں بیٹھنے کی عادت ہوتی تھی(۲)۔کیونکہ ان کی زندگی میں دیواریں تکیے اور دیگر ایسی چیزوں کا وجود نہ تھا جس کووہ ٹیک لگا کرستائیں۔

لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ نہ تو ہمیشہ احتباء مستحسن ہے(۳) نہ آپ ﷺ ہمیشہ مسجد میں اس وضع سے بیٹھتے تھے بلکہ کبھی کبھی آپ ﷺ تشہد اور کبھی آلتی پالتی مار کر بھی بیٹھتے ہیں۔مثلاً ابوداوؐد نے حضرت جابر بن

---

(۱)سنن ابی داؤد کتاب الادب باب فی جلوس الرجل، السنن الکبری للبیهقی ۲۳۶/۳ شرح السنة للبغوی ۳۲۳/۱۲، ملاعلی قاریؒ نے اس روایت کوان الفاظ کے ساتھ ذکرکیا ہے **قال کان رسول اللہ ﷺ اذاجلس فی المسجد وفی بعض النسخ فی المجلس احتبی بیدیه زادالبزار ونصب رکبتیه واخرج البزار ایضاً من حدیث أبی هریرةؓ بلفظ جلس عندالکعبة فضمّ رجلیه واقامهاواحتبیٰ بیدیه وفی بعض النسخ صلوات اللّٰه علیه وفی بعضها صلوات اللّٰه وسلامه علیه(جمع الوسائل ۲۲۲/۱)(مختار)**

(۲) کہاجاتا ہے کہ **الاحتباء حیطان العرب** (یعنی گوٹ مارنا عربوں کے لئے دیواروں کے قائم مقام ہے) (مختار)

(۳) ایسے بیٹھنا اولیٰ ہے اس لئے کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ نے لکھا ہے کہ اس طرح بیٹھنا تواضع اور مسکنت کی نشست ہے اس لئے رسول اللہ ﷺ اس کی اتباع میں اس طرح بیٹھتے تھے اور حضرات صحابہ کرامؓ بھی آنحضرت ﷺ کی اتباع میں ایسا کرتے تھے مگر یہ عمل ہمیشہ نہیں کیا جاتا۔(مختار)

سمرہؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ **أنّ النّبيّ ﷺ کان إذا صلّی الفجر تربع فی مجلسه حتی تطلع الشمس حسناء**(۱).

اس طرح ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ **نهی النبی ﷺ عن الاحتباء یوم الجمعة والامام یخطب** یعنی امام کا خطبہ دیتے وقت سامعین کو نبی کریم ﷺ نے احتباء سے منع فرمایا ہے اور یہ اس لئے کہ اس طرح نیند جلدی آتی ہے اور خطبہ سننا فوت ہو جاتا ہے بلکہ وضوء ٹوٹنے کی وجہ سے نماز جمعہ فوت ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔

(۱) یہی وجہ ہے کہ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے **فقیل هذا الحدیث مخصص وقال میرک محمول علی اختلاف الاحوال فتارة تربع وتارة احتبیٰ وتارة استلقی وتارة ثنیٰ رجلیه توسعة للامة المرحومة** (جمع الوسائل ۱/۲۲۲) اسی طرح آنحضرت ﷺ نے بیٹھنے کیلئے کوئی خاص اور ممتاز جگہ کا انتخاب نہیں کیا۔ (مختار)

۲۲۔ باب ما جاء فی تکأة رسول اللہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے تکیہ کے بیان میں

تکأۃ کا معنی: تکأۃ اصل میں وکاۃ تھا تراث کی طرح اس کے واو کو تاء سے بدل کر تکاۃ بنایا گیا ہے اور یہ ما یتکأ بہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ یعنی وہ چیز جو ٹیک لگانے کے لئے تیار ہو چکی ہو۔ اس لئے اگر انسان پر ٹیک لگایا جائے تو اسے تکاۃ نہیں کہیں گے۔ اس باب میں صرف انہی اشیاء کا ذکر ہوگا جو کہ اسی مقصد کیلئے بنائی گئی تھیں۔ اور نبی کریم ﷺ نے ان پر ٹیک بھی لگایا تھا۔

البتہ اگلے باب میں صرف انسان پر ٹیک لگانے کا ذکر ہے۔ اور اس کو علیحدہ ذکر کرنے کی وجہ آگے آرہی ہے۔

(۱) حدّثنا عباس بن محمّد الدوریّ البغدادیّ أنا إسحاق ابن منصور عن إسرائیل عن سماک بن حرب عن جابر بن سمرة قال رأیت رسول اللّٰہ ﷺ متکئا علی وسادة علی یسارہ(۱)۔

ترجمہ: جابر بن سمرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ بائیں طرف کو رکھے ہوئے ایک وسادہ پر ٹیک لگا کر تشریف فرما ہیں۔

وسادة اسے **اِسادہ** بھی کہا جاتا ہے اس بڑے سے تکیہ کو کہتے ہیں جو ٹیک کے لئے بنایا جاتا ہے۔ کبھی کبھی سرہانے کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ **علی یسارہ الخ** دائیں جانب کو ٹیک لگانا بہتر ہے۔ اس حدیث میں بائیں جانب کا ذکر محض اتفاقی ہے۔ بلکہ آئندہ امام ترمذیؒ یہ بات لا رہے ہیں کہ

---

(۱) سنن ابی داؤد ۲/۲۱۸ کتاب اللباس باب الفرش، جامع ترمذی ۲/۱۰۵ کتاب الادب باب ماجاء فی الاتکاء سنن دارمی ۲/۱۷۶ (مختار)

(۲) اسلئے حافظ ابن قیمؒ نے لکھا ہے وکان ﷺ یتکئ علی الوسادة و ربّما اتکاء علی یسارہ وربّما اتکأ علی یمینہ وکان اذا احتاج فی خروجہ توکأ علی بعض أصحابہ من الضعف (زاد المعاد ۱/۶۰) (مختار)

علی یسارہ کا ذکر عمومی طور پر روایات میں نہیں ہے۔

(۲) حدّثنا حمید بن مسعدة أنا بشر بن المفضّل انا الجریریّ عن عبدالرحمان بن ابی بکرة عن أبیه قال قال رسول اللّٰه ﷺ ألا احدثکم بأکبر الکبائر قالوا بلیٰ یا رسول اللّٰه ﷺ قال الاشراک باللّٰه وعقوق الوالدین قال و جلس رسول اللّٰه ﷺ وکان متکئا قال و شهادة الزورا و قال الزور قال فما زال رسول اللّٰه ﷺ یقولها حتیٰ قلنا لیته سکت(۱)۔

ترجمہ: حضرت ابو بکرہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا تم لوگوں کو کبیرہ گناہوں میں بڑے بڑے گناہ نہ بتاؤں۔ صحابہؓ نے عرض کیا کیوں نہیں یا رسول اللہ ﷺ بتا دیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ (بڑے گناہ) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک بنانا اور والدین کی نافرمانی کرنا۔ اس وقت آپ ﷺ ٹیک لگائے ہوئے تشریف فرما تھے۔ اہتماماً بیٹھ کر فرمایا۔ اور جھوٹی گواہی دینا یا جھوٹی بات کرنا۔ بار بار اس کو اتنا دھرایا کہ ہم لوگوں نے (جذبۂ ترحم سے دلوں میں) یہ کہا کہ کاش اب حضور ﷺ خاموش ہو جائیں۔

ابوبکرہؓ: عن أبیه، عبدالرحمٰن کے والد کا نام حضرت ابوبکرہ نفیع بن الحارث مشہور صحابی ہیں۔ آپ کو ابوبکرہ کی کنیت جنگ طائف کے دوران نبی کریم ﷺ کی طرف سے ملی تھی۔ جب طائف کے لوگ محاصرہ میں تھے۔ تو اس وقت مسلمانوں نے قلعہ والوں کو آواز دی کہ من نزل من الحصار فهو حرٌ جو کوئی قلعہ سے نیچے آئے تو وہ آزاد ہے۔ اس وقت آپؓ سیڑھی لگا کر ایک بڑی بالٹی میں بیٹھ کر قلعہ کی دیوار سے نیچے آئے۔ چونکہ عربی میں بڑی بالٹی کو بکرۃ کہتے ہیں۔ ایک قول میں بکرۃ سیڑھی کو کہتے ہیں۔ ابوبکرۃ بھی اسے دیکھ کر

---

(۱) صحیح بخاری ۸۸۴/۲ کتاب الادب باب فی عقوق الوالدین، جامع ترمذی ۱۲/۲ کتاب البر والصلة باب ماجاء فی عقوق والدین۔(مختار)

تئیس (۲۳) ساتھیوں کے ساتھ طائف کے قلعہ سے سیڑھی چڑھ کر دیوار کو عبور کر کے اترے تھے۔ اس لئے ابوبکرۃ کہلائے وفات ۵۱ھ میں بصرہ میں ہوئی نام نفیع بن الحارث اور والدہ کا نام سمیہ تھا جس کا بیٹا زیاد ابن ابی سفیان تھا۔

اس لیے نبی کریم ﷺ نے آپ کو ابوبکرۃ کہا۔ پھر اس کنیت سے آپ مشہور ہوئے بلکہ اگر کوئی آپ سے نسب کے بارے میں پوچھتے تو فرماتے انا مولیٰ رسول اللہ ﷺ میں نبی کریم ﷺ کا آزاد شدہ غلام ہوں۔

کبیرہ کیا ہے؟ الا احدثکم باکبر الکبائر. کبائر کبیرہ کی جمع ہے جو صغیرہ کی ضد ہے۔ چھوٹے گناہ کو صغیرہ اور بڑے گناہ کو کبیرہ کہا جاتا ہے۔ لیکن کبیرہ کی تعریف میں اختلاف ہے کہ کونسا گناہ کبیرہ بنتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ہر وہ گناہ جس پر شریعت میں وعید غضب یا لعنت قسم کے الفاظ سے مواخذہ ہونے کا ذکر ہے۔ وہ کبیرہ ہے بعض نے کہا ہے کہ جس کے بارے میں دنیوی حد شرعی نازل ہو یا اخروی عذاب و دھمکی دی گئی ہو۔ کوئی کہتا ہے کہ ہر وہ جرم جو دین کے بارے میں لاپرواہی برتنے پر ہو کبیرہ ہے۔ کوئی کہتا ہے جس کو قرآن و حدیث نے گناہ کہا ہو۔ بعض نے گن گن کر لکھے ہیں کہ یہ یہ کبائر اور دیگر گناہ صغائر ہیں۔ پھر تعداد میں اور تعین میں بھی اختلاف واقع ہوا ہے۔ حتیٰ کہ علامہ ذھبیؒ نے ایک مستقل کتاب اس کے بارے میں لکھی ہے۔ جس میں چار سو کبائر کا ذکر ہے۔ بعض شراح نے ان میں سے بعض کا ذکر کیا ہے(۱)۔ بہر حال

(۱) ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے وقد عدّ الفقهاء منها جملاً مستكثرة كقتل نفس، وزنا ولواطة وشرب خمر وسرقة وقذف وشهادة زور وكتم شهادة ويمين غموس وغصب مايقطع بسرقته وفرار من الكفار بلا عذر وربا واخذ مال يتيم ورشوة وعقوق اصل وقطع رحم وكذب على النبي ﷺ عمداً وافطار رمضان عدواً وبخس كيل اووزن او ذرعٍ وتقديم مكتوبة على وقتها وتاخيرها عنه وترك الزكاة وضرب مسلم اوذمي عدواناً وسب صحابي وغيبة عالم اوحامل قرآن وسعاية عندالظالم (ظالم سے چغلی کھانا) وديانة (یعنی بیوی، بیٹی کا ناجائز تعلق گوارہ کرنا) وقيادة (اسی طرح کے دوسرے ناجائز تعلقات میں کوشش کرنا) وترك امربمعروف ونهي عن منكر من قادر وتعلم سحراوتعليمه اوعمله ونسيان حرف من القران بعدالبلوغ واحراق حيوان بغيرضرورة ويأس من رحمة الله تعالىٰ وامن من مكره (عذاب سے نہ ڈرنا) ونشوز زوجة (شوہر کی نافرمانی کرنا) اباء حليلة من خليلها عدواً ونميمة (جمع الوسائل ۱/۲۲۴) اس کے علاوہ بھی کبیرہ گناہ ہیں جو کتابوں میں مذکور ہیں (مختار)

ایسی کوئی جامع تعریف نہیں ہے جو کہ تمام کبائر کو شامل ہو اور جس میں صغائر داخل نہ ہوں (۱)۔

اسی وجہ سے علامہ واحدیؒ اور بعض دیگر ائمہ نے کہا ہے کہ کبیرہ کی تعریف بھی ہمارے لئے مبہم کردی گئی ہے تاکہ لوگ خوف کی وجہ سے ہر معصیت سے اجتناب کریں۔ جیسے لیلۃ القدر کے ابہام کی بڑی حکمت بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ شب قدر کی لالچ میں لوگ ہر رات کو عبادت کریں۔ کبیرہ کے بارے میں مزید تفصیلات آپ نے صحیحین کی کتاب الایمان میں پڑھی ہیں۔ اس استفسار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معلم اور مزکی کو چاہیے کہ شاگردوں کو جو اہم بات بتانی ہو تو پہلے ان کی توجہ حاصل کرے اس قسم کے سوال کا بڑا مقصد بھی یہی ہے کہ مخاطب ہمہ تن گوش ہو جاتا ہے۔ اور دوسرے خیالات و مشاغل چھوڑ کر کمال توجہ سے بات سننے لگتا ہے۔

الا شراک باللہ الخ شرک بدترین گناہ اور کفر ہے۔ لیکن یہاں پر صرف شرک نہیں بلکہ مطلقاً کفر مراد ہے خواہ شرک ہو یا دہریت ہو تعطیل ہو یا تجسیم وغیرہ۔

<u>والدین کی نافرمانی گناہ کبیرہ ہے:</u> **وعقوق الوالدین.** اللہ تعالیٰ کے بعد انسان کے سب سے بڑے محسن والدین ہیں۔ تو اگر ایک طرح محسن اعظم پر کفر کبیرہ ہے۔ تو دوسری طرف والدین جیسے محسن کا کفران اور ناشکری اور ان کی نافرمانی حرام اور کبیرہ ہے۔ خواہ والدین کافر کیوں نہ ہوں۔ جب تک وہ معصیت الٰہی کا حکم نہ دیں۔ ان کی اطاعت واجب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ **و لا تقل لھما اف و لا تنھرھما. وان جاھداک علی ان تشرک باللہ ما لیس لک بہ علم فلا تطعھما وصاحبھما فی الدنیا معروفا.** (الآیۃ) تو اگر چہ ان کی طرف سے معصیت اور شرک کا امر نا قابل اطاعت ہے لیکن ساتھ ساتھ دنیا میں ان سے احسان و نیکی سے پیش آنے کا واضح امر ہے۔ بہر حال والدین سے ایسا رویہ اور سلوک جس سے وہ ناراض اور غصہ ہوں۔ عقوق ہے اور تمام دنیوی امور میں ان کو ایسی اذیت دینا حرام ہے۔

---

(۱) یہی وجہ ہے کہ علامہ انور شاہؒ فرماتے ہیں کہ ان دونوں میں نسبت اضافی ہے۔ ہر ایک دوسرے کے مقابلہ میں چھوٹا اور دوسرا بڑا۔ (مختار)

شہادۃ زوراور جھوٹ پر تنبیہ میں زیادہ اہتمام کیوں: قال و شهادة الزور اوقال الزور الخ کبیرہ گناہوں کے ذکر میں جھوٹ کو خصوصی اہمیت آپ ﷺ نے دی۔ جس کے اظہار کے لئے آپ ﷺ اٹھ بیٹھے۔ نیز اس کا ذکر بھی بار بار کرنے لگے۔ اور اس اہتمام کا سبب یہ ہے کہ جھوٹ آسان ترین گناہ ہے اور کوئی بھی شخص اسے بول سکتا ہے۔ پھر لوگ اسے بے پرواہی سے بول لیتے ہیں۔ نیز اس کے لئے دشمنی، حسد، استہزاء، اور جرم سے گلوخلاصی بلکہ محض مشغلہ وغیرہ بہت سے دیگر اسباب ہیں۔

علاوہ ازیں شرک کو صحیح الفطرت انسان کا عقل بھی قبول نہیں کرتا۔ اور اسی طرح والدین کی نافرمانی بھی انسان کے طبعی تقاضوں کی ضد ہے۔ جبکہ جھوٹ سے نفرت طبعی نہیں ہوتی نہ ہمیشہ عقل اس سے منع کرتا ہے بلکہ اکثر تو عقل اور نفس کا تقاضا ہی ہوتا ہے جس کی وجہ سے انسان جھوٹ بولتا ہے۔

حضور ﷺ کا اصرار اور صحابہ ؓ کی شفقت: لیته سکت الخ یہ اس لئے نہیں تھا کہ آپ ﷺ کی بات صحابہ کو بری لگی۔ بلکہ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے نہایت اہتمام کے اظہار کے لئے جب بار بار جھوٹ کا ذکر کیا۔ تو اس سے ضرور آپ ﷺ کو تھکاوٹ بھی ہو رہی تھی۔ صحابہ ؓ کو آپ ﷺ پر رحم آیا کہ آپ ﷺ کو تکلیف ہو رہی تھی۔ رہا مقصد تو وہ تو ویسے بھی حاصل ہو چکا تھا۔ چنانچہ صحابہ ؓ کی یہ تمنا آپ ﷺ پر شفقت پر مبنی ہے۔

بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ امت کے جھوٹ کا ذکر کرتے ہوئے آپ ﷺ کو غصہ اور ناراضگی بھی ہو۔ اور صحابہ آپ ﷺ کی ناراضگی کے خوف سے مزید اس کا ذکر نہ کرنے کی تمنا کر رہے ہوں۔ بعض کے خیال میں ہو سکتا ہے کہ یہ خوف ہو کہ مبادا جھوٹوں کے بارے میں آپ ﷺ کوئی ایسے بددعائیہ الفاظ کہہ دیں جو ہمیشہ کے لئے جھوٹوں کے خسران اور بدانجامی کا باعث ہوں۔ بہر حال اس میں اس بات کی تعلیم ہے کہ اہم بات کہتے ہوئے واعظ، خطیب، استاد اور پیر کو تکرار اور اصرار اتنا کر دینا چاہیے کہ سامعین کو اس پر رحم آئے۔

ویسے بھی جھوٹ بہت برا عمل ہے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں جھوٹ بولنے والے شخص کے منہ سے جو بدبو نکلتی ہے اس کی وجہ سے رحمت کے فرشتے دروغ گو شخص سے ایک میل دور کھڑے ہو جاتے ہیں۔

جب حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا مومن جھوٹا ہو سکتا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ پھر خصوصاً جھوٹی گواہی میں تو کبھی معصوم جان کو خطرہ، کبھی دوسرے کے مال پر دست اندازی، کبھی افتراء و بہتان، کبھی حلال کی تحریم اور کبھی حرام کی تحلیل وغیرہ امور کا ارتکاب بھی شامل ہو جاتا ہے۔ بلکہ خود شرک بھی ایک بہت بڑا جھوٹ ہی تو ہے۔ بہر حال اس حدیث میں کبائر کا ذکر ہے۔ جن کا حکم یہ ہے کہ اگرچہ رحمت خداوندی کے سامنے کبائر کی کوئی حیثیت ہی نہیں وہ سب کو معاف کر سکتا ہے۔ لیکن قانونِ الٰہی یہ ہے کہ کبائر کو توبہ سے معاف کرتے ہیں۔

اشکال اور جواب: یہاں پر یہ ایک اشکال ہے کہ اس حدیث میں کسی بھی تکأۃ کا ذکر نہیں ہے۔ تو اسے یہاں پر کیوں لایا گیا ہے۔ بعض شراح نے تو اس اشکال کو ذکر کر کے اس کا جواب دینے کی تکلیف نہیں کی۔

لیکن بعض حضرات نے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً علامہ ابن حجرؒ نے یہ جواب دیا ہے کہ حدیث سے اتکاء ثابت ہوتا ہے۔ اور اتکاء کے لئے تکأۃ کا وجود لازم ہے اس لئے دلالت التزامی سے یہ حدیث تکأۃ پر بھی دلالت کرتی ہے۔

لیکن ملا علی قاریؒ وغیرہ شرّاح نے اس جواب کو ناپسند کیا ہے۔ کیونکہ اتکاء تکأۃ کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ بعض دوسرے شرّاح نے یہ جواب دیا ہے کہ ترجمۃ الباب اس مقام پر عام ہے۔ یعنی اس باب میں تکأۃ اور غیر تکأہ پر ٹیک لگانے کا بیان مقصود ہے۔

(۳) حدثنا قتیبة بن سعید ثنا شریک عن علیّ بن الأقمر عن أبی جحیفة قال قال رسول اللہ ﷺ أمّا أنا فلا آکل متکئاً(۱).

ترجمہ: ابوجحیفہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں تو ٹیک لگا کر نہیں کھاتا۔

اس روایت میں ٹیک لگا کر کھانے سے منع کرنا مقصود ہے۔ اس لئے کہ ایسا کرنا انسانی صحت کے

(۱) صحیح بخاری ۲/۸۱۲ کتاب الأطعمة باب الأکل متکئاً، سنن ابی داؤد ۲/۱۷۳ کتاب الأطعمة باب ماجاء فی الاکل متکئا، ابن ماجة ۲۴۲ کتاب الاطعمة باب الاکل متکأً. (مختار)

لئے بھی مضر ہے(۱)اور عبدیت کی طرح کھانے کے خلاف ہے۔

امّا انا فلا أکل متکئاً نبی کریم ﷺ خود اپنے آپ کا ذکر تو فرما رہے ہیں۔ اپنی امت کے لیے کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے اگر چہ عاقل کے لیے اشارہ کافی ہے۔ اور اس کا واضح معنی یہی ہے کہ ''مجھے دوسرے لوگوں کا بھی ٹیک لگا کر کھانا پسند نہیں ہے۔ اسی لیے تو خود اس ہیئت پر نہیں کھاتا'' کیونکہ متکبرین کی عادتوں میں سے ہے۔ نیز اس طرح ضرورت سے زیادہ کھانا کھایا جاتا ہے۔ جو کہ ایک ناپسندیدہ امر ہے۔ نیز کھانے سے استغناء اور اس کی بے قدری پر بھی دلالت کرتا ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ اس طرح طعام اپنے گلے میں مشقت سے گزرتا ہے اس لیے کبھی کبھی یہ مضر صحت بھی بن جاتا ہے۔ بلکہ امام ابراہیم نخعیؒ سے روایت ہے کہ اکابر پیٹ بڑھنے کے خوف سے ٹیک لگا کر نہیں کھاتے تھے۔ پھر اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ لیٹے لیٹے کھانا اور بھی زیادہ شنیع ہے۔

البتہ کھڑے ہو کر کھانے کو علامہ ابن حجرؒ نے مکروہ نہیں کہا ہے۔ یہاں پر ٹیک لگانا عام ہے۔ تکیہ کو پیٹھ لگا کر ہو یا کوئی پہلو لگا کر ہو یا دیوار یا ہاتھ وغیرہ سے کسی دوسری چیز کو ٹیک لگایا ہو۔ یہ سب ایک ہی حکم میں ہے بلکہ بعض لوگوں نے گدیلے وغیرہ پر التی پالتی مار کر کھانے کو بھی ٹیک لگانے میں داخل کر دیا ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ جبرئیلؑ نے نبی کریم ﷺ کو ٹیک لگا کر کھانا کھاتے ہوئے دیکھا تو آپ ﷺ کو اس سے منع کیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے کبھی بھی اس حالت میں کھانا نہیں کھایا۔ بہر حال ٹیک لگا کر کھانا کھانا

(۱) نئی سائنسی تحقیق نے ٹیک لگا کر کھانا کھانے میں تین قسم کے نقصان بتائے ہیں (الف) کھانا صحیح طور پر نہیں چبایا جائے گا اور اس میں لعاب جتنی ضرورت تھی نہیں ملے گا۔ اور پھر معدے میں جا کر نشاستہ دار غذ یہ(Cosbohydstes) کو ہضم کرنا ہو وہ نہیں مل سکے گا۔ جس سے نظام انہضام متاثر ہوگا۔ (ب) ٹیک لگا کر بیٹھنے سے معدہ پھیل جاتا ہے جس سے غیر ضروری خوارک معدے میں چلی جائے گی۔ اور نظام انہضام متاثر ہوگا۔ (ج) ٹیک لگا کر کھانے سے آنتوں اور جگر(Liver) کے نظام پر برا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے امام ابراہیم نخعیؒ ٹیک لگا کر کھانے کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ پیٹ بڑھ جاتا ہے اور ایسا کھانا متکبرین کی علامت ہے۔ شیخ احمد عبدالجواد الرومیؒ نے آنحضرت ﷺ کے کھانے کیلئے بیٹھنے کے بارے میں لکھا ہے **فکانت جلسة رسول اللّٰہ ﷺ وقت الاکل کلھا ادب واحترام فتارة یجلس علی صدور قدمیه وتارة یجلس ناصباً رجله الیمنیٰ وجالساً علی الیسریٰ (الاتحافات ۱۷۵)(مختار)**

مکروہ ہے یا کم از کم خلاف اولیٰ ضرور ہے۔البتہ اگر کوئی عذر ہو تو پھر ٹیک لگا کر کھانا جائز ہے۔اب یہ بات کہ اگر ٹیک لگا کر کھانا مکروہ ہے تو کس وضع سے کھایا جائے۔

ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ کھانے کے وقت مستحب یہ ہے کہ آدمی دوزانوں بیٹھے۔البتہ قدموں کے پشت زمین پر لگائے(۱)۔یا پھر دایاں پاؤں کھڑا ہو اور بائیں پاؤں پر بیٹھ جائے۔علامہ بیجوریؒ پہلی کیفیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ کیفیت کھانے کے سب سے بہتر کیفیات میں سے ہے۔کیونکہ اس طرح انسان اپنی اس طبعی حالت پر ہوتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ صحت کے اعتبار سے انفع کیفیت ہے۔

(۴) حدثنا محمّدبن بشّارثناعبدالرحمٰن بن مھدی أخبرناسفیان عن علی بن الأقمرقال سمعت أباجحیفة یقول قال رسول اللہ ﷺ لاأکل متکئاً(۲)۔

ترجمہ: ابو جحیفہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا۔

یہ حدیث دراصل سابقہ حدیث ہی ہے۔متن کے الفاظ میں معمولی مغائرت ہے لیکن سند میں فرق ہے۔اور شاید امام ترمذیؒ نے سند کی تبدیلی کی وجہ سے ہی یہ حدیث دہرائی ہے(۳)۔بعض شراح نے اس کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ دراصل شریک جو علی بن الأقمر کا شاگرد ہے۔سئی الحفظ ہے۔اس لئے سفیان ثوریؒ کے واسطے سے اس حدیث کو روایت کر کے امام ترمذیؒ گزشتہ حدیث کی تقویت فرما رہے ہیں۔ان دونوں حدیثوں پر بھی وہی اشکال ہوتا ہے کہ ان میں تکاۃ کا ذکر تو نہیں ہے اور اس کا جواب بھی وہی ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔

---

(۱) یہی کیفیت نبی کریم ﷺ سے بھی مروی ہے۔(اصلاح الدین)

(۲) صحیح بخاری ۲/۸۱۲ کتاب الاطعمة باب الأکل متکئاً،سنن ابی داؤد ۲/۱۷۳ کتاب الأطعمة باب ماجاء فی الأکل متکئاً سنن ابن ماجة ۱/۲۴۲ کتاب الأطعمة باب الأکل متکئاً.(مختار)

(۳) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے قال السیدامیرالدین یظھر الفرق بین الحدثین باختلاف بعض رجال السند وتغییر یسیر فی المتن والغرض تاکیدھذاالامر بالنسبة إلی النبی ﷺ (جمع الوسائل ۱/۲۲۹)(مختار)

(۵) حدّثنا یوسف بن عیسی ثنا وکیع ثنا اسرائیل عن سماک ابن حرب عن جابر بن سمرۃ قال رأیتُ النبیّ ﷺ متکئًا علی وسادۃ قال أبو عیسیٰ لم یذکر وکیع علی یسارہ هکذا رویٰ غیر واحدٍ عن إسرائیل نحو روایة وکیع ولا نعلم احداً روی فیه علی یسارہ إلّا ماروی إسحٰق بن منصور عن إسرائیل.

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ تکیہ پر ٹیک لگائے ہوئے تشریف فرما ہیں۔ امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ وکیعؒ اس حدیث میں ''علی یسارہ'' کا لفظ ذکر نہیں کرتے۔ اسی طرح اسرائیل کے متعدد دیگر شاگرد بھی یہ لفظ ذکر نہیں کرتے سوائے اسحٰق بن منصور کے کسی کے بارے میں ہمیں علم نہیں جو یہ لفظ ذکر کر رہا ہو۔

متکئا علی یسارہ الخ حضرت جابرؓ کی یہ حدیث باب کی ابتداء میں گزر چکی ہے جہاں پر اسحٰق کی روایت سے **علی یسارہ** کا اضافہ مذکور تھا۔ یہاں پر یہ اضافہ ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا اگر اس حدیث کو حضرت جابرؓ کی اس حدیث سے متصل لایا جاتا تو بہتر ہوتا۔

قال ابو عیسیؒ امام ترمذیؒ کا مقصد اس بیان سے یہی معلوم ہو رہا ہے کہ پہلی سند سے مروی حضرت جابرؓ کی اس حدیث کی غرابت پر تنبیہ ہو جائے کیونکہ ''**علی یسارہ**'' کا اضافہ جو کہ اسحاق بن منصورؒ کی روایت میں مذکور ہے اسرائیلؒ کے دیگر شاگردوں کے ہاں موجود نہیں۔ حتیٰ کہ وکیعؒ جیسے عظیم المرتبہ شاگرد نے بھی اسے ذکر نہیں کیا ہے جس کا مرتبہ اسحٰقؒ سے بڑا ہے۔ اور دیگر تمام شاگرد بھی اس روایت کو اس اضافہ کے بغیر روایت کرتے ہیں۔

لہٰذا یہ اضافہ غریب ہوگا۔ جامعہ ترمذی میں بھی اس اضافہ پر کلام کیا گیا ہے لیکن اسے یکسر غلط کہنا بھی بیجا ہوگا۔ جیسا کہ امام ترمذیؒ نے بھی یہ جرأت نہیں کی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ قوی احتمال موجود ہے کہ اس واقعہ میں آپ ﷺ بائیں طرف ٹیک لگا کر بیٹھے ہوں۔ یہ ناجائز تو نہیں ہے بلکہ اس طرح یہ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ دایاں ہاتھ فارغ ہو جاتا ہے۔ جسے مصافحہ وغیرہ کے کاموں میں لایا جا سکتا ہے۔

۲۳۔ باب ما جاء فی اتکاء رسول اللہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے تکیہ کے علاوہ کسی اور شئی پر ٹیک لگانے کے بیان میں

اتکاء ٹیک لگانے کو کہتے ہیں لیکن اس باب کی دونوں حدیثیں چلتے ہوئے کسی آدمی پر ٹیک لگانے سے متعلق ہیں۔اس طرح یہ باب سابقہ باب یعنی باب تکاۃ النبی ﷺ سے ممتاز ہو جاتا ہے۔جس میں مطلق ٹیک کا ذکر ہے۔اور یہ اعتراض دفع ہو جاتا ہے کہ مؤلف کو دونوں باب علیحدہ نہیں لانا چاہیے تھے۔ ایک دوسرا فرق بھی شراح نے دونوں بابوں میں بیان کیا ہے۔کہ تکاۃ اس چیز کو کہتے ہیں جو ٹیک لگانے کی غرض سے تیار کی گئی ہو۔جیسے تکیہ،عصا وغیرہ۔غرض وغایہ کی وجہ سے ٹیک لگانے کے سلسلے میں ان اشیاء کو ایک گونہ مقصودیت حاصل ہوتی ہے۔اور اسی مقصودیت اور اصالت کی وجہ سے ان کیلئے خصوصی باب منعقد کیا۔اس کے برعکس کسی انسان پر ٹیک لگانے میں انسان کے متوکا علیہ ہونے کی حیثیت حقیقی نہیں ہوتی بلکہ عارضی ہوتی ہے۔البتہ اتکاء مقصود ہوتا ہے۔اس لئے دوسرا باب اتکاء کے عنوان سے الگ لا رہے ہیں۔

علاوہ ازیں دوسرے باب کو الگ ذکر کرنا شاید اس لئے بھی مناسب ہے کہ انسان کے علاوہ دوسری اشیاء پر ٹیک لگانا جائز ہے لیکن کیا انسان پر بھی جائز ہوگا؟ اس سوال کا جواب اہم تھا اور وہ اس باب کی احادیث سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے۔لہٰذا اس باب کو علیحدہ ذکر کیا۔

(۱) حدثنا عبداللہ بن عبدالرحمان أنا عمر و بن عاصم أنا حمّاد ابن سلمة عن حمید عن أنسؓ أنّ النّبیّ ﷺ کان شاکیا فخرج یتو کأ علی أسامة و علیه ثوب قطریّ قد توشّح به فصلّی بهم(۱)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ بیمار تھے۔چنانچہ حضرت اسامہؓ پر ٹیک لگائے ہوئے حجرہ سے باہر تشریف لائے۔اس وقت آپ ﷺ ایک قطری چادر میں لپٹے ہوئے تھے۔باہر آ کر آپ ﷺ نے صحابہ کو نماز پڑھائی۔

کان شاکیا الخ یہ حدیث اس سے پہلے "باب لباس النبی ﷺ" میں کافی تشریح کے

(۱) تفرد بهذا الحدیث الامام الترمذی ص۹ (مختار)

ساتھ گزر چکی ہے وہیں حضرت اسامہؓ کے بارے میں تفصیل لکھی جا چکی ہے۔ ثوب قطری یہ ایک خاص قسم کا منقش کپڑا ہوتا تھا جو قطر میں بنایا جاتا تھا۔

توشح بہ توشّح کا معنی تزیّن بھی آتا ہے لیکن یہاں پر معنی یہ ہے کہ "جعلہ کالوشاح" یعنی آپ ﷺ وشاح کی طرح اسے پہنے ہوئے تھے۔ اوراس کی دوصورتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ محرم کی طرح چادر کا ایک طرف دائیں ہاتھ کے نیچے سے گزار کر بائیں کندھے پر ڈال دیا جائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ چادر اس طرح کندھوں پر ڈالی جائے کہ دونوں پہلو آگے کی طرف لٹک جائیں۔

فصلّی بھم یعنی آپ ﷺ نے امامت کر کے صحابہ کرامؓ کو نماز پڑھائی۔ اور ممکن ہے کہ بھم کا معنی "معھم" ہو۔ پھر مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ نے صدیق اکبرؓ کی امامت میں صحابہ کرامؓ کے ساتھ نماز پڑھی۔ خود امامت نہ کر سکے۔ جس کی تفصیل دوسرے مقام پر آرہی ہے۔

(۲) حدّثنا عبداللّٰہ بن عبدالرحمان أنا محمّد بن المبارک ثنا عطاء بن مسلم الخفاف الحلبّی أناجعفر بن برقان عن عطاء ابن أبی رباح عن الفضل بن عبّاس قال دخلت علی رسول اللّٰہ ﷺ فی مرضہ الذی توفی فیہ و علی راسہ عصابۃ صفراء فسلّمت فقال یا فضل قلت لبیک یا رسول اللّٰہ ﷺ قال اشدد بھذہ العصابۃ راسی قال ففعلت ثمّ قعد فوضع کفہ علی منکبی ثمّ قام و دخل فی المسجد و فی الحدیث قصّۃ(۱).

ترجمہ: فضل بن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی مرض وفات کے موقع پر میں نبی کریم ﷺ کے پاس آیا آپ ﷺ کے سر مبارک پر پیلی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے سلام کیا (جواب دینے کے بعد) آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے فضل! میں نے کہا لبیک یارسول اللہ، تو آپ ﷺ نے فرمایا ذرا اس پٹی کو میرے سر پر کس کر باندھ دو میں نے تعمیل کی۔ پھر آپ ﷺ اٹھ بیٹھے اور میرے کندھے پر ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے اور مسجد میں تشریف لے گئے۔ اس حدیث میں مفصل قصہ ہے۔

---

(۱) المعجم الکبیر للطبرانی ۱۸/۲۸۱، دلائل النبوۃ للامام البیھقی ۷/۱۷۹ (مختار)

عن عطاء بن مسلم الخفاف یہ حلب کے باشندے ہیں۔مشہور محدث ہیں۔موزے بنایا کرتے تھے۔۱۹۰ھ میں وفات پائی۔

فضل بن عباسؓ: فضل بن عباس نبی کریم ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے ساتھ غزوۂ حنین میں شریک ہوئے اور صحابہؓ میں انتشار کے وقت آپ ﷺ کے ساتھ ثابت قدم بھی رہے۔ حجۃ الوداع میں شریک ہوئے اور نبی کریم ﷺ کے ردیف رہے۔پھر جہاد کی غرض سے شام کو نکلے۔اسی سلسلے میں آپ اردن کے قریب ہی کہیں موجود تھے کہ طاعون عمواس آئی اور آپ اکیس(۲۱)سال کی عمر میں وفات پائے جبکہ بعض اقوال کے مطابق جنگ یرموک میں شہادت پائی۔

عصابة صفراء: عصابة کپڑے کی اس پٹی کو کہتے ہیں جو کہ ٹوٹنے یا درد کی وجہ سے کسی عضو پر باندھی جائے۔ نبی کریم ﷺ کو مرض وفات میں سر درد کی شکایت بہت زیادہ تھی۔اسی وجہ سے آپ نے سر کو باندھ رکھا تھا۔یا ویسے ہی سر پر کپڑا پڑا تھا۔ فقال یا فضل یعنی سلام کا جواب دینے کے بعد مجھ سے فرمایا کہ اے فضل اشدد بھٰذہ العصابة راسی ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ پٹی جو ویسے پڑی ہے۔ میرے سر پر باندھ لو۔ فوضع کفه علی منکبی یہی سے ترجمۃ الباب کے ساتھ تعلق ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فضل بن عباسؓ کا سہارا لیا تھا۔

فدخل فی المسجد یہاں حرف جر کا اظہار کیا گیا ہے جو کہ عموماً ذکر نہیں ہوتا۔لیکن دخل کے صلہ میں فی کا استعمال جائز ہے۔اگرچہ عام نہیں ہے۔

وفی الحدیث قصة اس واقعہ کو دوسرے محدثین نے کتابوں میں نقل کیا ہے۔جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ ﷺ مسجد آکر منبر پر تشریف فرما ہوئے اور لوگوں کو جمع ہونے کا حکم دیا۔صحابہ کرامؓ حاضر ہوئے۔ تو آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد مسلمانوں سے اس بات کا التماس کیا کہ وہ اپنے تمام حقوق جو نبی کریم ﷺ کے ذمے رہتے ہیں۔ابھی اس دنیا میں طلب کریں۔اور آخرت کے لئے نہ چھوڑیں۔اور جب آپ ﷺ نے مسلمانوں سے اس کا مطالبہ اصرار کے ساتھ کیا تو بعض صحابہ نے اپنے حقوق ظاہر کئے جن کو آپ ﷺ نے فضل بن عباسؓ سے کہہ کر ادا کروایا۔ جبکہ بعض صحابہ کرامؓ نے اپنے بعض عوارض کے لئے آپ ﷺ سے دعا بھی کروائی۔ کچھ تفصیل آگے باب الوفات میں آرہی ہے۔

۲۴. باب ماجاء فی صفة اکل رسول اللہ ﷺ
نبی کریم ﷺ کے کھانے کا بیان

اس باب میں امام ترمذیؒ نبی کریم ﷺ کے کھانے کے آداب، طرز اور طریقے بیان فرماتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ آپ ﷺ کیا کیا تناول فرماتے تھے۔ اس کا بیان آئندہ مختلف ابواب میں آئے گا۔ روٹی سالن اور پھل وغیرہ کے لیے الگ الگ ابواب آئیں گے۔ نیز جامع ترمذی کے ابواب الاطعمہ میں تفصیل سے وہ اشیاء ذکر کی گئی ہیں۔ اس باب میں اس بات کا بیان مقصود ہے۔ کہ کھانے کے مناسب انداز اور مسنون طریقے کیا ہیں۔

(۱) حدثنا محمّد بن بشّار ثنا عبدالرحمٰن بن مهدیّ عن سفیان عن سعد بن إبراهیم عن ابن لکعب بن مالک عن أبیه أنّ النبیّ ﷺ کان یلعق أصابعه ثلاثاً قال أبو عیسیٰ وروی غیر محمّد بن بشّار هذا الحدیث قال کان یلعق أصابعه الثلاث(۱).

ترجمہ: حضرت کعب بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی انگلیاں تین مرتبہ چاٹ لیا کرتے تھے۔

ابن کعبؓ الخ سند میں مذکور اس راوی کا نام عبداللہ یا عبدالرحمٰن ہے۔ بڑے تابعی ہیں۔ عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت کعب بن مالکؓ جیسے جلیل القدر صحابی کے فرزند اور ان سے فیض یافتہ ہیں۔ بلکہ عبداللہ بن کعبؓ کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا تھا۔

کعب بن مالکؓ کا ذکر: عن أبیه حضرت کعب کے بیٹے اپنے والد کعب بن مالک بن ابی مالک سلمی مدنیؓ سے روایت کرتے ہیں۔ حضرت کعبؓ مشہور صحابی ہیں۔ بیعت عقبہ اولیٰ اور ثانیہ میں شریک رہے۔ غزوۂ تبوک میں حاضر نہ ہو سکے۔ بلکہ ان تین معتوب صحابہؓ میں سے ایک آپؓ بھی ہیں جن کی توبہ کی قبولیت

---

(۱) صحیح مسلم ۲/۱۸۳، سنن ابی داؤد ۲/۱۸۱، شرح السنة ۱۱/۳۱۵ رقم الحدیث ۲۸۷۴، ابواب الاطعمة لعق الاصابع (مختار)

کو مؤخر کردیا گیا تھا۔ نبی کریم ﷺ کے شاعروں میں آپؓ کا شمار ہوتا ہے۔ ستتر (۷۷) سال کی عمر میں ۵۰ھ کو وفات پائی(۱)۔

تین انگلیاں یا تین بار: یلعق اصابعه ثلاثا. یعنی آپ ﷺ کھانا کھانے کے بعد تین بار انگلیاں چاٹتے تھے۔ محمد بن بشارؒ کی روایت میں یہی مذکور ہے۔ لیکن ان کے علاوہ دیگر رواۃ حضرت کعب بن مالکؓ کی یہ حدیث یوں بیان کرتے ہیں۔ کہ آپ ﷺ تین انگلیاں چاٹتے تھے۔ مذکورہ حدیث کے الفاظ میں دونوں صورتوں کا احتمال موجود ہے۔ لیکن مؤخر الذکر صورت کو بعض شراح نے اس لیے ترجیح دی ہے کہ آگے امام ترمذیؒ خود حضرت کعب بن مالکؓ کی وہ حدیث لاتے ہیں۔ جس میں تصریح ہے کہ "یاکل باصابعه الثلث" اور مؤخر الذکر تشریح پر دونوں روایتوں میں تطبیق ممکن ہے۔ لیکن علامہ ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ بظاہر یہاں تین بار چاٹنے کا ذکر ہے۔ اور دوسری روایات میں تین انگلیوں کا ذکر ہے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ تین انگلیوں کا تین بار چاٹنا مراد لیا جائے۔

انگلیوں سے کھانا انسان کا اعزاز: اس مقام پر انگلیوں سے کھانا ثابت ہو رہا ہے۔ اور یہ فعل قبیح نہیں بلکہ مستحسن ہے۔ اسی طرح انگلیوں کا چاٹنا بھی مستحسن امر ہے۔ نئی تہذیب کے نام نہاد روشن خیال حلال وحرام اور پلید وناپاک ہر قسم کی چیزیں کھا کر انگلیوں کے چاٹنے کو بدتہذیبی اور قبیح فعل سمجھتے ہیں۔ بلکہ انگلیوں کے ذریعے کھانا بھی پسند نہیں کرتے۔ حالانکہ غلاظتوں کا یہ حال ہے کہ نہ وضوء نہ غسل۔ لیکن انگلیوں پر ان کو جراثیم نظر آتے ہیں۔ چھری، کانٹے اور چمچوں کے ساتھ کھانا ان کے ہاں قابل فخر تہذیب خیال کیا جاتا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ ہمارے استعمال میں آنے والی چھری، کانٹے اور چمچے تو ہر آدمی کے منہ میں جاتے ہیں۔ خواہ وہ بیمار ہو یا تندرست۔ مغرب کی اندھی تقلید میں ان کو ان آلات میں بھی کوئی عیب دکھائی نہیں دیتا۔ جبکہ ہوٹل میں میں نے کئی بار دیکھا ہے کہ چمچہ اگر گندہ ہو تو بے تمیز بیرے تھوک کر اپنی گندہ قمیص کے ساتھ ان کو صاف کر کے چمکدار بنا دیتے ہیں۔ اور یہ بیوقوف اس پر اتراتا ہے کہ میں نے چمچہ کے ساتھ کھانا کھایا۔ اس غلاظت کے بجائے دھلی ہوئی پاک انگلیوں کے ساتھ کھانا اسے گوارا نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے تو کھانے سے قبل ہاتھ دھو کر کھانے کا حکم دیا ہے۔ اور فارغ ہو کر انگلیاں چاٹنے اور پھر

(۱) ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی خلافت کے زمانے میں آپؓ کا انتقال ہوا تھا۔ (اصلاح الدین)

دھونے کی ترغیب دی ہے۔اوراسی میں برکت کی خبر دی ہے۔

<u>تکریم بنی آدم کی ایک صورت:</u> ہارون الرشیدؒ کے لیے ایک بار کھانا لایا گیا۔اس نے کھانے کے لیے چمچہ لانے کا حکم دیا۔امام ابو یوسفؒ بھی موجود تھے۔انھوں نے فرمایا کہ دیکھو خود تیرے پردادا حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے تو اللہ تعالیٰ کے اس قول ''ولقد کرّمنا بنی آدم'' کی تفسیر میں یہ فرمایا ہے کہ ''جعلنا لهم اصابع یا کلون بها ''یعنی یہ کہ ہم نے انسان کے اکرام کے لیے اسے انگلیاں بخشی ہیں تا کہ ان کے ذریعے وہ کھانا کھائے۔ اور تم چمچہ کے ساتھ کھانا کھانا چاہتے ہو۔یہ سن کر بادشاہ نے چمچہ واپس کیا اور انگلیوں کے ساتھ کھانا کھایا۔

خود نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ کھانے والے کو یہ پتہ نہیں کہ کھانے کے کونسے جزء میں برکت ہوتی ہے(۱)۔یہی وجہ ہے کہ برتن میں جو تھوڑا سا کھانا رہ جاتا ہے۔نبی کریم ﷺ نے اسے کھانے کا حکم دیا ہے اور فارغ ہونے کے بعد انگلیاں چاٹنا بھی آپ ﷺ کا مسنون عمل ہے۔

<u>تین انگلیوں کے ساتھ کھانے کی حکمت:</u> بعض لوگوں کا خیال ہے کہ روایت کے وہ الفاظ جو محمد بن بشارؒ کے سوا دوسرے حضرات نقل کرتے ہیں، میں اس راز کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کھانے میں تمام انگلیوں کا استعمال نہیں کرتے تھے۔بلکہ صرف تین انگلیوں کے ذریعے کھانا کھاتے تھے۔ <u>اس طرح لقمہ چھوٹا زود ہضم اور بے ضرر ہوتا ہے۔نیز پانچ انگلیوں سے کھانا حرص وشرہ کی علامت بھی</u>

(۱) عن جابرؓ قال قال رسول اللہ ﷺ اذا وقعت لقمة أحد کم فلیا خذ ها فلیمط ما کان بها من اذی و لیا کلها و لایدعها للشیطان و لا یمسح یده بالمندیل حتیٰ یلعق أصابعه فإنّه لایدری فی أیّ طعامه البرکة (مسلم باب استحباب لعق الأصابع والقصعه ج۲ ص۱۷۵)

اور یہی وہ اصل علت ہے جس کے لیے انگلیاں چاٹنے کا حکم دیا گیا ہے۔جبکہ بعض حضرات نے یہ علت بتائی ہے کہ نہ چاٹنے سے زیادہ تلوث کا اندیشہ ہوتا ہے۔یعنی دوسری انگلیوں اور ہاتھ پر طعام لگنے کا خطرہ ہوتا ہے۔قاضی عیاضؒ نے یہ وجہ بھی بیان کی ہے کہ انگلیاں چاٹنے سے اس تھوڑے طعام کی قدر دانی ہوتی ہے جو انگلیوں پر لگا ہوتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت استخفاف سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

بعض ماہرین طب کا خیال ہے کہ کھانا کھانے کے بعد انگلیوں کے پوروں پر وٹامن کے (vit k) جمع ہو جاتا ہے اور انگلیاں چاٹنے سے وہ ضائع ہونے کی بجائے جزو بدن جاتا ہے۔(مختار)

ہے(۱)۔ بہر حال تین انگلیوں کے ساتھ کھانا اور کھانے سے فراغت کے بعد ان کو چاٹنا سنت ہے۔ اور اس کا اتباع ہر مسلمان کے لیے قابل فخر بات ہونی چاہیے۔

حضرت سلمان فارسیؓ کے بارے میں آتا ہے کہ آپؓ جن دنوں فارس کے گورنر بنے۔ تو ایک دعوت میں حاضر ہوئے جس میں عجم کے بھی بڑے بڑے کمانڈر اور جرنیل آئے ہوئے تھے۔ کھانے کا وقت ہوا اور حضرت سلمانؓ کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ تو کھانا کھاتے ہوئے ایک نوالہ نیچے گر گیا۔ ساتھ بیٹھے ہوئے دوسرے صحابی کو خیال آیا کہ پیروئ سنت میں حضرت سلمانؓ یہ نوالہ اٹھا کر کھائیں گے۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت اسے رہنے دیں۔ یہ لوگ دیکھ کر ہنسیں گے کہ یہ کیسے حریص لوگ ہیں۔ یہ دیکھ کر آپؓ نے وہ نوالہ اور بھی اہتمام کے ساتھ اٹھایا۔ اور زور سے بولے کہ عجم کے ان کتوں کی خاطر میں اپنے حبیب ﷺ کی سنت نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ میرے رسول ﷺ کی سنت ہے۔ اس کے بعد نوالہ اٹھایا۔ جو گرد وغیرہ لگا تھا اسے ہٹانے کے بعد تناول فرمایا۔

استخفافِ سنت ایک جرم: بہر حال نبی کریم ﷺ کی سنت کو مکروہ سمجھنا کسی مسلمان کا شیوہ نہیں۔ نہ کفار سے مرعوب ہو کر ترک سنت کی جرأت کرنی چاہئے(۲)۔ اب تو بے قدری کا دور آیا ہے حتیٰ کہ عربوں کو

---

(۱) البتہ اگر ضرورت ہو اور تین انگلیوں سے کھانا مشکل ہو تو پھر پانچ انگلیوں کے استعمال میں بھی کوئی حرج نہیں۔ استحباب الأكل بثلاث أصابع من الأبهام والمسبّحة والوسطىٰ ولايضمّ إليها الرابعة والخامسة إلاّ لعذر بان يكون مرقا وغيره مالايمكن بثلاث وغيرذلک من الأعذار(انوار المحمود ۲/ ۴۱۵) شیخ احمد عبدالجواد الرومیؒ نے لکھا ہے قال الشافعيؒ الأكل بإصبع واحدة مقت وباثنين تكبر وبالثلاثة سنة وبأزيدشر(الاتحافات ص ۱۹۹)(مختار)

(۲) قال ابن حجرؒ واعلم ان الكلام فيمن استقذر ذالک (لعق الاصابع)من حيث هو لا مع نسبته النبي ﷺ وإلاّ خشي عليه الكفر. اذ من استقذر شيأمن احواله مع نسبته اليه ﷺ كفر(جمع الوسائل ج ۱ ص ۲۳۴) اور علامہ عینیؒ نے یہ شکایت کی ہے کہ ہمارے زمانے کے لوگ کھانے کے برتن کو صاف نہیں کرتے۔ اور ساتھ اس میں کچھ چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ ایک خلاف سنت اور قبیح عمل ہے۔ اور غیر مسلموں سے مسلمانوں میں منتقل ہو چکا ہے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ انگلیاں چاٹنا یا برتن صاف کرنا حرص کی علامت ہے۔ مگر یہ غلط ہے بلکہ انگلیاں چاٹنا اللہ تعالیٰ کی نعمت عظمیٰ کی قدر دانی ہے۔ اور انگلیاں چاٹنا یا برتن کا انگلیوں سے صاف کرنا تکبر کا علاج بھی ہے۔ اور باعث برکت بھی ہے۔ (مختار)

اللہ تعالیٰ نے دولت دی۔ تو ان کی حالت اس قدر خراب ہوگئی کہ برتن یا انگلیاں چاٹنا تو کجا اب تو وہ میز پر پڑے ہوئے صرف ایک بار استعمال ہونے والے برتن یکجا کر کے بوری میں ڈال دیتے ہیں۔ اور گندگی کے ڈرم میں پھینک دیتے ہیں۔ روزانہ کھانوں کی ایک بڑی مقدار انہیں ہاتھ لگائے بغیر ضائع کر دیا جاتا ہے۔ جبکہ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کے مطابق تو طعام کا ایک چھوٹا ذرہ بھی ضائع نہیں ہونا چاہئے۔

قال أبو عیسیٰ إلیٰ قوله أصابعه الثلٰث ملا علی قاریؒ نے اس روایت کو ترجیح دی ہے(۱)۔ اور اس کی وجہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ علماء نے انگلیاں چاٹنے میں ایک ترتیب بھی لکھی ہے وہ یہ کہ پہلے درمیانی انگلی، پھر سبابہ یعنی شہادت کی انگلی اور بعد میں انگوٹھا چاٹ لینا چاہئے (۲)۔

(۲) حدثنا الحسن بن عليّ الخلّال ثنا عفّان ثنا حمّاد بن سلمة عن ثابت عن أنس قال كان النبيّ ﷺ اذا أكل طعام لعق اصابعه الثلاث(۳).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ جب کھانا کھا لیتے تھے۔ تو اپنی تینوں انگلیوں کو چاٹ لیا کرتے تھے۔

---

(۱) جمع الوسائل ج۱ ص۲۳۲

(۲) اس ترتیب میں طبرانی نے حضرت کعب بن عجرہؓ کی ایک حدیث بھی ذکر کی ہے۔ کما فی جمع الوسائل اور اس میں عقلی حکمت یہ ہے کہ اس طرح دوسری انگلیاں تلوث سے محفوظ رہتی ہیں۔ شیخ زکریاؒ نے اس ترتیب کے ساتھ انگلیاں چاٹنے کے بارے میں فرمایا ہے کہ بیچ کی انگلی لمبی ہونے کی وجہ سے زیادہ ملوث ہوتی ہے۔ اس لئے بھی اس سے ابتداء مناسب ہے۔ اور علامہ مناویؒ نے بھی لکھا ہے **لخبر الطبرانی فی الاوسط انه یاکل بأصابعه الثلاث بالإبهام والتی تلیها والوسطیٰ ثم یلعق أصابعه الثلاث قبل ان یمسحها الوسطیٰ ثمّ تلیها ثمّ الإبهام وفی روایة الحکیم عن کعب بن عجرة قال رأیت رسول اللّٰہ ﷺ لعق أصابعه الثلاث حین اراد ان یمسحها یلعق الوسطیٰ ثمّ التی تلیها ثمّ الابهام قال الزین العراقی فی شرح الترمذی وبدأ بالوسطیٰ لکونها أکثر ها تلوّثاً اذهی أوّل ماینزل الطعام لطولها وهی اقرب إلیٰ الفم حتّی ترتفع.(المناوی علی هامش جمع الوسائل ۱/ ۲۳۲)(مختار)**

(۳) صحیح مسلم ۲/ ۱۸۳، ابو داؤد ۲/ ۱۸۱، کتاب الاطعمة باب اللقمة تسقط(مختار)

لعق أصابعه الثلاث. یہاں بھی اس پر تنبیہ ہے کہ نبی کریم ﷺ انگلیوں کے ذریعے کھانا کھایا کرتے تھے۔اب اگر کوئی شخص ضرورت کی بناء پر چمچوں کے ذریعے کھائے۔مثلاً کھانا نرم ہو جو چمچ کے بغیر کھایا نہ جا سکے۔جیسے کھیر، دہی وغیرہ ہو یا کھانے والا انگلیوں کے ذریعے کھانے سے معذور ہو۔تو چمچ کے استعمال میں حرج نہیں ہے۔اس طرح گوشت کے لیے چھری کے استعمال میں بھی حرج نہیں ہے۔لیکن اگر وہ کافروں کا شعار ہو۔تو پھر مشابہت سے بچنے کی خاطر احتراز کرنا ضروری ہے۔

(۳) حدّثنا الحسين بن عليّ بن يزيد الصدائيّ البغداديّ ثنا يعقوب بن اسحاق الحضرميّ أنا شعبة عن سفيان الثوری عن علی ابن الأقمر عن أبی حجيفة قال قال النبیﷺ امّا أنا فلا آکل متكئا(۱).

حدّثنا محمّد بن بشّار ثنا عبدالرحمان بن مهدی ثنا سفيان عن عليّ ابن الأقمر نحوه.

ترجمہ: حضرت ابو جحیفہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں تو ٹیک لگا کر نہیں کھاتا۔

امّا أنا فلا آکل متكئاً بغیر ضرورت کے ٹیک لگا کر کھانا ٹھیک نہیں ہے۔ایک طرف تو یہ تواضع کے خلاف ہے۔دوسری طرف یہ کثرت اکل کا سبب بھی ہے(۲)۔اور یہ دونوں اسلام میں ناپسندیدہ امور ہیں۔حدیث کی تفصیل باب ما جاء فی تکأة النبی ﷺ میں گزر چکی ہے۔

دانا را اشارہ کافی است: یہاں نبی کریم ﷺ نے یہ تو نہیں کہا کہ تم ٹیک لگا کر نہ کھاؤ۔لیکن عقلمند کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے۔اور پھر عاشق کو تو محبوب کی ہر ادا پر مرنا چاہیے۔لہٰذا صریح نہی کی نسبت اس اشارہ میں زیادہ تاکید ہے۔تو گویا نبی کریم ﷺ نے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ تم بھی میرا اتباع کرتے ہوئے ٹیک لگا کر نہ کھانا۔اور جہاں جہاں نبی کریم ﷺ سے ٹیک لگا کر کھانا مروی ہے۔وہ یا تو عذر کی وجہ سے

---

(۱)صحيح بخاری ۸۱۲/۲ کتاب الاطعمة باب الاکل متكئاً، سنن ابی داؤد ۱۷۳/۲ کتاب الاطعمة باب ماجاء فی الاکل متكئاً دارمی ۱۰۶/۲ (مختار)

(۲)نیز اس میں پیٹ بڑھنے کا اندیشہ بھی ہے۔جیسا کہ امام نخعیؒ سے مروی ہے۔(اصلاح الدین)

ہے۔یا نہی کے ورود سے قبل کی بات ہے۔یا محض بیان جواز پر حمل کیا جائے گا۔

(۴) حدّثنا هارون بن اسحاق الهمدانیّ ثنا عبدة بن سلیمان عن هشام بن عروة عن ابن لکعب بن مالک عن أبیه قال کان رسول الله ﷺ یاکل باصابعه الثلاث و یلعقهنّ(۱).

ترجمہ: حضرت کعب بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تین انگلیوں سے کھانا کھایا کرتے تھے۔اور (فراغت کے بعد) ان کو چاٹ لیا کرتے تھے۔

تین انگلیوں سے کھانا سنت ہے۔ **یاکل بأصابعه الثلاث الخ** اس سے قبل ضمناً یہ بات معلوم ہوگئی تھی کہ نبی کریم ﷺ تین انگلیوں سے کھانا کھاتے تھے۔اس حدیث میں اس ادب کی تصریح ہے(۲) اور یہ دراصل وہی حدیث ہے جو دوسری تعبیر سے باب کی ابتداء میں گزر چکی ہے۔لیکن سعید بن منصورؒ کی ایک مرسل روایت میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ پانچ انگلیوں سے کھانا کھاتے تھے۔اور اگر وہ حدیث صحیح ہو تو دونوں روایتوں میں جمع کیلئے توجیہ یہ ہوگی کہ آپ ﷺ نے بعض اوقات میں ضرورت کے موقع پر پانچ انگلیوں کے ذریعے بھی کھایا ہوگا۔اور یہ اس وقت ہوگا جب کھانا انتہائی نرم ہو اور تین انگلیوں سے نہ کھایا جاسکتے۔

(۵) حدّثنا أحمد بن منیع ثنا الفضل بن دکین ثنا مصعب بن سلیم قال سمعت أنس بن مالک یقول أتی رسول الله ﷺ بتمر فرأیته یاکل و هو مقع من الجوع(۳).

ترجمہ: حضرت انسؓ بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس کھجوریں لائی گئیں۔میں نے آپ کو وہ کھجور تناول فرماتے ہوئے دیکھا۔اس طرح کہ آپ ﷺ

---

(۱) صحیح مسلم ۱۸۳/۲ باب استحباب لعق الاصابع کتاب الاشربة ،شرح السنة ۳۱۵/۱۱ ابواب الاطعمة باب لعق الاصابع(مختار)

(۲) امام شافعیؒ کا قول ہے"الأکل باصبع واحد لقت و باثنین تکبر و بالثلاثة سنة و بازید شره(اصلاح الدین)

(۳) صحیح مسلم ۱۸۳/۲ کتاب الاشربة باب استحباب تواضع الاکل وصفة قعود، سنن ابی داؤد ۱۸۱/۲ کتاب الأطعمة باب ماجاء فی الأکل متکئاً(مختار)

بھوک کی وجہ سے اکڑوں بیٹھ کر کسی چیز پر ٹیک لگائے ہوئے تھے۔

وھو مقع من الجوع: اقعاء ضعف کی بنا پر پیٹھ کی جانب ٹیک لگانے کو کہتے ہیں۔اور یہاں پر یہی معنی مراد ہے۔اس موقع پر نبی کریم ﷺ نے بھوک کی شدت کی وجہ سے عارض ہونے والے ضعف کی بنا پر اقعاء کیا تھا(۱)۔ورنہ بلاضرورت ٹیک لگا کر کھانا۔آدابِ طعام کے خلاف اور ناپسندیدہ عمل ہے۔اقعاء اکڑوں بیٹھنے کو کہتے ہیں۔اس کی دو اور تفسیریں بھی ہیں۔اول یہ کہ سرین زمین کے ساتھ لگے ہوئے ہوں اور گھٹنے اوپر کو اٹھے ہوئے ہوں۔نیز ہاتھ زمین پر ہوں۔نماز میں اقعاء کی یہ صورت مکروہ ہے۔دوم یہ کہ سیرین ایڑیوں پر رکھ کر بیٹھا جائے اور پاؤں پھیلے ہوئے ہوں۔یہاں پر یہ دونوں صورتیں مراد نہیں۔

---

(۱)علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے **ولیس فی ھذا مایدل علی ان الاستناد من أداب الاکل لأنّه إنّما فعله لضرورة الضعف(المواھب اللدنیة ص ۱۱۴)(مختار)**

۲۵۔ باب ما جاء فی صفة خبز النبیؐ ﷺ
نبی کریم ﷺ کی روٹی کا بیان

خبـز کا لفظ خاء کے فتحہ کے ساتھ مصدر ہے۔ روٹی پکانے کو کہتے ہیں۔ اور خاء کے ضمہ کے ساتھ ''شیٔ مخبوز'' یعنی خود روٹی کو کہا جاتا ہے۔ اور یہی معنی مراد ہے۔ گویا یہاں نبی کریم ﷺ کے طرز زندگی کے سلسلے کا ایک باب بیان کیا جائے گا۔ وہ یہ کہ آپ ﷺ کی روٹی کس نوعیت کی ہوتی تھی۔ اور باب میں یہ بات بھی بخوبی ظاہر ہو جائے گی کہ نبی کریم ﷺ کی زندگی عمومی طور پر فقر و فاقہ اور زہد و سادگی میں بسر ہوئی۔ عیش و عشرت اور مرغن و مرغوب غذاؤں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ نیز فقر بھی اختیاری تھی۔ نہیں تو آپ کے لیے ساری زمین سونے چاندی کی بنائی جا سکتی تھی اور جنتوں سے کھانوں کے تیار خوان بھی آ سکتے تھے۔ لیکن آپ ﷺ نے فقراء کی حوصلہ افزائی اور دلجوئی کرتے ہوئے اس بات پر تنبیہ کر دی کہ دنیا داری میری امت کا اہم مقصد نہ ہو۔ اور عملاً مظاہرہ فرمایا کہ سیر شکمی خلاصۂ حیات نہیں ہے۔

<u>کھانا پینا مقصد حیات نہیں:</u> اس کے برعکس آج کی دنیا کا بڑا مقصد روٹی اور اعلیٰ قسم کے کھانے ہوتے ہیں۔ سارا زور پیٹ بھرنے اور اس کے وسائل پر دیا جاتا ہے۔ آج نظام ہائے دنیا کا خلاصہ مادہ پرستی اور معدہ پرستی ہے۔ سوشلزم ہو یا کیپٹلزم، کیمونزم ہو یا مارکسزم سب کے سب پیٹ کی فکر اور پیٹ کی بات کرتے ہیں۔ اور بقول قرآن ''یاکلون کماتاکل الانعام(الآیة)'' کی عملی تفسیر بنے ہوئے ہیں۔ یہی ان کا مذہب ہے یہی ان کے اخلاق ہیں اور یہی تہذیب جدید کا محور ہے۔ ایک بالشت بھر پیٹ نے ساری دنیا کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ عقل، روح، تن بدن، علم، یونیورسٹیاں، کالج، اکیڈمیاں اور تمام ادارے اسی پر قربان ہو رہے ہیں۔

<u>اسیر مالٹا مولانا عزیر گلؒ کی حکیمانہ تنبیہ:</u> ملت کے عظیم مجاہد حضرت مولانا عزیر گلؒ کاکاخیل نے ایک بار مجھ سے فرمایا کہ دوران اسارت ایک انگریز سے ایک دفعہ میری ان بن ہوئی۔ تو میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر کہا کہ تم کون ہو؟ تم تو کھاد کی مشین ہو کھا پی کر تھوڑا سا کھاد نکال دیتے ہو۔ تمہاری ساری انگریزیت، تہذیب و تمدن اور مذہب کا خلاصہ بس پیٹ ہی تو ہے۔

اکبرالہ آبادی مرحوم نے بڑے خوبصورت انداز میں شکم پرستوں پرطنز کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ

کھاڈبل روٹی کلرکی کرخوشی سے پھول جا چندون کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ

بہر حال نبی کریمﷺ نے فقروفاقہ کی زندگی گزار کر یہ تعلیم عملاً ہمیں دیدی کہ کھانا توقـــــوت لایموت کی حدتک ہونا چاہئے۔ یہ اہم ترین مقصد حیات نہیں۔ کسی نعمت کا استعمال اس دنیامیں بطور مقصد نہیں بلکہ بطورضرورت کرنا چاہئے۔ اب تو مسلمانوں پر بھی فراخی کا دور آیا ہے۔ یہ بڑاامتحان ہے۔ مسلمانوں کوتعیشات میں گم نہیں ہونا چاہیے۔

حضوروابل بیت کی فاقہ کشی

(۱) حدّثنا محمّد بن المثنیٰ و محمّد بن بشّار قالا ثنا محمّد ابن جعفر ثنا شعبة عن أبی إسحاق قال سمعت عبد الرحمٰن بن یزید یحدّث عن الأسود بن یزید عن عائشةؓ أنّها قالت ما شبع آل محمّدﷺ من خبز الشعیر یومین متتابعین حتّیٰ قبض رسول اللهﷺ(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریمﷺ کے اہل وعیال نے جوکی روٹی بھی مسلسل دودن پیٹ بھرکرنہیں کھائی۔ یہاں تک کہ آپﷺ وفات پائے۔

ماشبع آل محمد؛ نبی کریمﷺ کے گھر میں گھر کے افراد مسلسل دودن بھی جوکی روٹی سے سیرنہیں ہوئے۔حتی قبض رسول اللهﷺ الخ وفات سے قبل آپﷺ کوجزیرۃ العرب کی فرمانروائی ملی تھی۔اسلامی حکومت کارعب قیصروکسریٰ کے درباروں تک چھا گیا۔پھربھی فقرکی یہ حالت رہی۔

حدیث کی ترجمۃ الباب سے مطابقت: یہاں پر یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ حدیث میں ’’آل محمد‘‘ کی فاقہ کشی کاذکر ہے۔اور باب نبی کریمﷺ کے فقر سے متعلق ہے۔لہٰذا مطابقت مفقود ہے۔لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ عموماً معاش کے سلسلے میں اپنے آپ کی نسبت اہل وعیال مقدم ہوتے ہیں۔ جوملتا ہے پہلے

(۱)صحیح مسلم ۲/۴۱۷ کتاب الزھدوالرقائق، سنن ابن ماجة ۲۴۸/۱، کتاب الأطعمة باب خبز خبز الشعیر (مختار)

ان کو دیتے ہیں۔لہٰذا ظاہر ہے کہ جب آل کو کچھ نہ ملا تو آپ ﷺ کو کیا ملتا۔اور بعض حضرات نے یہ جواب بھی دیا ہے کہ یہاں ''آل'' کا لفظ زائد ہے۔لہٰذا معنی یہ ہوا کہ ''ما شبع محمّد ﷺ ''یعنی خود نبی کریم ﷺ نے مسلسل دو دن جو سے پیٹ بھر کھانا نہیں کھایا۔اور آئندہ ایک اور روایت سے اس توجیہ کی تائید بھی ہوتی ہے۔

ازواج مطہرات کا فقر: دوسرا شبہ اس مقام پر یہ کیا جاتا ہے۔کہ نبی کریم ﷺ کے ذمہ ازواج مطہرات کا نفقہ واجب تھا۔تو آپ ﷺ نے ان کو ان کا حق نہ دے کر بھوکا کیوں رکھا۔اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی تقلید میں ازواج مطہرات نے بھی اختیاری طور پر فقر و فاقہ کو پسند فرمایا تھا۔اور جب پیغمبر خدا کو فقر و فاقہ پسند تھا تو آپ ﷺ کی پاک بیبیوں کو کیونکر پسند نہ ہوتا۔ان کو دنیا کی رنگینیوں سے کیا واسطہ؟ بلکہ خود نبی کریم ﷺ نے ان کو اللہ تعالیٰ کے کہنے پر اختیار بھی دیا تھا کہ اگر وہ چاہیں طلاق لے لیں۔قرآن مجید نے خود اس کا اعلان فرمایا۔ارشاد ہے کہ **یاایّھا النبّی قل لأزواجک ان کنتنّ تردن الحیوۃ الدنیا و زینتھافتعالین امتّعکنّ واسرّحکنّ سراحاً جمیلاً(احزاب ص۲۸)**

ترجمہ: اے نبی ﷺ کہہ دے اپنی بیویوں کو اگر تم چاہتی ہو دنیا کی زندگی اور اس کی رونق۔تو آؤ تمہیں کچھ فائدہ پہنچاؤں اور رخصت کردوں تم کو خوبصورتی کے ساتھ۔

لیکن انہوں نے دنیوی آسائشوں کو خیر باد کہہ کر نبی کریم ﷺ کے ساتھ فاقے گزارنے کو ترجیح دی۔تو گویا خود انہوں نے اپنی مرضی سے نبی کریم ﷺ کو اپنا یہ حق معاف کردیا تھا۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ ان پاک بیبیوں کو اپنا حق کامل دے دیا کرتے تھے۔جو آپ ﷺ کو ملتا تھا بیبیوں کو ان کا نفقہ اس میں سے دیدیتے تھے۔لیکن وہ بھی ایسی کشادہ دل واقع ہوئی تھیں۔کہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے راستے میں صدقہ کردیتی تھیں۔اور ضرورت کی چیز بھی ذخیرہ نہیں کرتی تھیں۔اس لئے وہ ان فاقوں میں آپ ﷺ کی شریک رہیں۔اگر حضرت عائشہؓ اور دیگر ازواج مطہرات کی سخاوت، کشادہ دستی اور قناعت پر نظر ڈالی جائے۔تو حیرت ہوجاتی ہے۔

تیسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ نفقہ میں نبی کریم ﷺ ایک چیز نہیں دیتے تھے۔بلکہ کھجور، جو، گندم

وغیرہ جو بھی میسر آتا دے دیتے تھے۔ اور ان میں سے کسی چیز کی مقدار اتنی نہیں ہوتی تھی کہ مسلسل دو دن تک اسے پیٹ بھر کر کھایا جاسکے۔ لیکن ان توجیہات کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی۔ اصل بات وہی ہے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے اہل خانہ نے اپنی مرضی سے لذات وخواہشات کو ترک فرمایا تھا۔ اور فقر وفاقہ اور قناعت کی زندگی بسر کرنے کو پسند کیا تھا(۱)۔

<u>ضیاع رزق سے احتراز</u>

(۲) حدثنا عبّاس بن محمّد الدوریّ ثنا یحیٰی بن أبی بکیر ثنا حریز بن عثمان عن سلیم بن عامر قال سمعت أبا أمامة الباھلیّ یقول ما کان یفضل عن أھل بیت رسول اللّٰہ ﷺ خبز الشعیر(۲)۔

ترجمہ: حضرت ابو امامہ باہلیؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے گھر والوں سے (کھانا کھانے کے بعد) جو کی روٹی نہیں بچتی تھی۔

سمعت أبا أمامةؓ الخ: حضرت ابو امامہ باہلیؓ مشہور صحابی ہیں۔ مکثرین فی الحدیث میں سے ہیں۔ پہلے مصر اور پھر حمص میں اقامت اختیار کی۔ اور وہیں ۸۶ھ میں اکانوے سال کی عمر میں وفات پائی۔

<u>اشکال اور اس کا جواب:</u> (۱) ایک اشکال یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض روایات میں تو تصریح ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے اہل خانہ کو سال بھر کا نفقہ عنایت فرمایا کرتے تھے۔ تو پھر یہ فاقہ کشی کیسے ممکن تھی۔ بظاہر ان دونوں روایات میں تعارض ہے؟

<u>ازالہ:</u> تو اس اشکال اور تعارض کے کئی جوابات دیئے گئے ہیں۔

(۱) پہلا جواب یہ ہے کہ بعض اہل علم نے اس حدیث لفظ ال کو زائد کو مانا ہے۔ مطلب یہ کہ یہ فاقہ کشی آنحضرت ﷺ کیا کرتے تھے۔ اور یہ روایت آپ ﷺ کی ذات اقدس کی ترجمان ہے۔ (۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ تو اپنی طرف سے ازواج مطہرات کو ایک سال کا نفقہ دیا کرتے تھے۔ مگر ازواج مطہرات شوق ثواب سے اس کو صدقہ کرتی تھیں۔ اس لئے علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے **ولاینافی ذالک أنّہ کان یدخر فی آخر حیاتہ قوت سنة لعیالہ لأنّہ کان یعرض لہ حاجة المحتاج فیخرج فیھا ما کان یدخرہ(المواھب اللدنیة ۱۱۵)** (۳) شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ نے اس کی دو توجیہات کی ہیں (۱) یہ کہ سال بھر کا نفقہ اس حساب سے ہو کہ مسلسل دو دن کی روٹی کا حساب نہ بیٹھتا ہو بلکہ کبھی روٹی، کبھی کھجور اور کبھی فاقہ (۲) دوسری توجیہ یہ ہے کہ وہ نفقہ کیا عجب ہے کہ کھجوریں ہی ہوں اس حدیث میں اس کی نفی نہیں بلکہ یہاں تو صرف روٹی کی نفی ہے۔ (مختار)

(۲) جامع ترمذی ۶۱/۲ کتاب الزھد باب ما جاء فی معیشة النبی ﷺ، مسند احمد ۲۵۳/۵ (مختار)

ما کان یفضل الخ جو کی روٹی بھی گھر میں فاضل نہ بچتی۔ بلکہ جب ملتی تو صرف گزارے کی حد تک میسر ہوتی تھی۔اور **قوت لایموت** میں بچ جانے کی توقع ہی کب کی جاسکتی ہے۔آج کل تو ہمارے ہاں آدھا کھانا بچ کر گل سڑ جاتا ہے۔جو کہ اسلام میں ناپسندیدہ بات ہے۔زیادہ کھانے کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے آپ کے ہاں تھوڑا کھانا پکتا تھا۔یا پھر اس کلام کا مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی آپ کے ہاں کچھ زیادہ اور اضافی کھانا پکتا تو بھی وہ گھر میں بچا کر نہیں رکھا جاتا۔لیکن اول الذکر توجیہ بہتر ہے جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریمﷺ کے دسترخوان سے آپﷺ کی وفات تک روٹی کا کوئی ٹکڑا نہ اٹھایا جاسکا۔**ومارفع عن مائدته کسرة قط.(مسنداحمد۶/۱۵۶)**

(۳) حدّثنا عبداللّٰہ بن معاویة الجمحیّ ثنا ثابت بن یزید عن هلال بن خباب عن عکرمة عن ابن عباسؓ قال کان رسول اللّٰہﷺ یبیت اللیالیّ المتتابعة طاویاً هو وأهله لا یجدون عشاء و کان أکثر خبزهم خبز الشعیر(۱).

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریمﷺ اوران کے گھر والے متعدد راتیں مسلسل بھوکے گزار دیتے تھے۔کہ رات کا کھانا میسر نہیں ہوتا تھا۔اور (جوملتا) تو اکثر جو کی روٹی ہوتی تھی۔

طاویاً الخ **طوی الرّجل** کے معنی ہیں وہ شخص بھوکا رہا۔اس طرح طاویا کے معنی ہوتے ہیں بھوکا۔یا پھر تقدیر عبارت یوں ہے''**طاویاً کشحه علی الجوع**''یعنی پیٹ میں بھوک کو سمیٹ لیا کرتے تھے۔

اپنی بھی یہی حالت ہوتی تھی۔اور گھر والوں کی بھی کہ شام کو کھانے کی کوئی بھی چیز نہیں ملی۔اور بھوکے سو گئے۔پھر بھی استغناء وقناعت کا یہ حال تھا کہ سوال تو کجا،آپﷺ کی طرف سے یا اہل بیت کی طرف سے کسی پر یہ ظاہر بھی نہیں ہوتا تھا۔ورنہ ظاہر ہے کہ آپﷺ کی یہ حالت اغنیاء تو درکنار فقراء صحابہ

---

(۱)جامع ترمذی ۲/۶۱ کتاب الزهدباب ماجاء فی معیشة النبیﷺ،سنن ابن ماجة ۱/۲۴۸ کتاب الاطعمة باب خبز الشعیر، (مختار)

کے لئے بھی قابل برداشت نہ ہوتی۔ لایجدون عشاء عشاء عین کے فتحہ کے ساتھ شام کے کھانے کو کہا جاتا ہے۔ أکثر خبزهم الخ مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات گندم کی روٹی بھی مل جاتی لیکن اکثر جو کی روٹی ہوتی تھی۔ اوراس میں آپ ﷺ اور ازواج مطہراتؓ کی قناعت کا کمال ہے۔

<u>چھانے بغیر روٹی</u>

(۴) حدّثنا عبداللّٰہ بن عبدالرحمٰن ثنا عبید اللّٰہ بن عبدالمجید الحنفی ثنا عبدالرحمٰن و هو ابن عبداللّٰہ بن دینار ثنا أبو حازم عن سهل بن سعد انّه قیل له أکل رسول اللّٰهﷺ النقیّ یعنی الحواریّ فقال سهل مارأی رسول اللّٰهﷺ النقیّ حتی لقی اللّٰه تعالیٰ فقیل له هل کانت لکم مناخل علی عهد رسول اللّٰهﷺ قال ما کانت لنا مناخل فقیل کیف کنتم تصنعون بالشعیر قال کنّا ننفخه فیطیر منه ما طارثمّ نعجنه(۱)۔

ترجمہ: حضرت سہل بن سعدؓ سے کسی نے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی خالص آٹے یعنی سفید میدے کی روٹی کھائی ہے؟ تو آپؓ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے زندگی بھر وفات تک سفید میدہ دیکھا بھی نہیں تھا۔ پھر پوچھا گیا کہ کیا حضور ﷺ کے زمانہ میں آپ کے ہاں چھلنیاں ہوتی تھیں؟ انہوں نے کہا کہ ہمارے پاس چھلنیاں نہیں تھیں۔ سائل نے پھر پوچھا کہ (چھلنیوں کے بغیر) تم لوگ جو کے ساتھ کیسا معاملہ کرتے تھے؟ تو حضرت سہلؓ نے جواب دیا کہ جو میں ہم پھونک ماردیتے تھے۔ تو اس کے موٹے موٹے تنکے بھوسہ اڑ جاتا تھا۔ باقی آٹا گوندکر پکا لیتے تھے۔

---

(۱) جامع ترمذی ۲/۶۱ کتاب الزهد باب ماجاء فی معیشة النبیّ ﷺ، صحیح بخاری کتاب الاطعمة باب النفخ فی الشعیر ۲/۸۱۴،۸۱۵، سنن ابن ماجة کتاب الاطعمه باب خبز الشعیر ۱/۲۴۷ (مختار)

سهل بن سعدؓ: ابو العباس سہل بن سعد بن مالکؓ بن خالد ساعدی انصاری خزرجی صحابی ہیں۔ان کے والد بھی صحابی ہیں۔اصلی نام حزن تھا۔نبی کریمﷺ نے تبدیل کر کے سہل نام رکھا۔وفاتِ نبوی کے وقت ان کی عمر پندرہ برس تھی ۸۸ھ یا ۹۱ھ میں وفات پائی۔مدینہ میں وفات پانے والے صحابہ میں آپ آخری صحابی ہیں۔

یعنی الحوّاریٰ یعنی سائل کی مراد نقی سے حوّاری ہے۔جو واو مشددہ اور الف مقصورہ کے ساتھ میدہ اور خوب چھنے ہوئے آٹے کو کہتے ہیں۔حور سے بنا ہے جس کے معنی سفیدی ہیں۔اور چھاننے کے بعد آٹا بالکل سفید ہو جاتا ہے۔

ما رأیٰ کھانا تو کجا آپﷺ نے چھنا ہوا آٹا دیکھا بھی نہ تھا۔بعض شرّاح نے لکھا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ شام کے اسفار میں آپﷺ نے میدے کی روٹی دیکھی اور کھائی ہو۔خصوصاً بحیرا راہب کی ضیافت کے دوران۔کیونکہ شام میں آٹا چھاننے کا رواج زمانہ قدیم سے تھا۔لہٰذا یہاں پر بعد النبوۃ کی قید ضروری ہے۔اور اسی وجہ سے بخاری شریف کی روایت میں یہ قید موجود ہے کہ ما رأیٰ رسول اللهﷺ منخلا من حین بعثه الله حتی قبضه(۱)۔ یعنی بعثت کے بعد آپﷺ نے چھلنی نہیں دیکھی تھی۔

لیکن چونکہ یہ محض احتمال کی بنیاد پر کہا جاتا ہے۔حقیقی رؤیۃ کی کوئی دلیل نہیں۔نیز حضرت سہلؓ کی یہ نفی خود حضرت سہلؓ کے علم کی بنیاد پر وارد ہے۔اور ان کے علم کے مطابق یہ نفی کلی ہے۔لہٰذا اشکال وارد ہی نہیں ہوتا(۲)۔

هل کانت لکم مناخل الخ مناخل منخل کی جمع ہے۔جو کہ میم کے ضمہ کے ساتھ چھلنی کو کہتے ہیں۔حضرت سہلؓ سے جب سوال کیا گیا کہ کیا عام روزمرہ کے استعمال میں آپ لوگوں کے ہاں چھلنی موجود تھی؟ تو آپؓ نے فرمایا کہ ہمارے ہاں چھلنیاں زیرِ استعمال نہیں تھیں۔اسی وجہ سے بعض اکابر کا مقولہ ہے"اوّل بدعة فی الاسلام المناخل"یعنی اسلام میں پہلی بدعت چھلنی کا استعمال تھا۔جو صحابہؓ کے

---

(۱)بخاری جلد۲ص ۸۱۵(کتاب الاطعمة باب علی ما کان النبیﷺ واصحابه یأکلون) (مختار)

(۲)اس لئے شیخ الجواد الرومیؒ نے فرمایا ہے کہ ولٰکنّ سهلاً لم ینف الأکل فقط بل نفی الرؤیة کذالک(الاتحافات ۲۰۵)(مختار)

دور میں رائج ہوا تھا۔لیکن یہاں بدعت کے معنی بدعت سیئہ نہیں جو نا جائز ہے۔ بلکہ مطلقاً جدت کے معنی میں مستعمل ہے۔

کیف کنتم تصنعون بالشعیر یعنی گندم کا آٹا تو چھانے بغیر بھی کھایا جا سکتا ہے۔لیکن چھلنی نہ ہوتے ہوئے جو کا آٹا کیسے کھاتے تھے۔ کنّا ننفخه الخ یعنی جو (کو کوٹ کر) پہلے اس میں پھونک مار دیتے تھے۔جو بھوسہ تنکے ہوتے اڑ جاتے۔اور جو باقی بچتا اسے گوندھ کر کھا لیتے تھے۔

اس حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ آٹا چھان کر کھانا جائز نہیں ہے۔یہ تو فقط نبی کریم ﷺ کے فقر کا بیان ہے۔اور ترجمۃ الباب سے مطابقت بھی واضح ہے۔

<u>میز نما خوانوں اور پر تکلف برتنوں سے پرہیز</u>

(۵) حدّثنا محمّد بن بشّار أنا معاذ بن هشام قال ثنی أبی عن یونس عن قتادة عن انس بن مالکؓ قال ما اکل النّبیّ اللّٰه ﷺ علی خوان ولا فی سکرّجة ولا خبزله مرقّق قال فقلت لقتادة فعلی ما کانوا یاکلون قال علی هذه السفر قال محمّد بن بشّار یونس هذا الذی روی عن قتادة هو یونس الأسکاف(۱)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی میز نما خوان پر یا چھوٹی پلیٹوں میں کھانا نہیں کھایا۔نہ کبھی آپ ﷺ کی خاطر نرم چپاتی پکائی جاتی تھی۔ یونسؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت قتادہؒ سے پوچھا کہ پھر صحابہ کس چیز پر کھانا رکھ کر کھاتے تھے۔تو انہوں نے کہا کہ انہی چمڑے کے دستر خوان پر (امام ترمذی کے شیخ) محمد بن بشارؒ کہتے ہیں کہ یونسؒ جو قتادہؒ سے روایت کرتے ہیں وہ یونس اسکاف ہیں۔

مــا أکل علــی خوان عجم کے عیاش امراء میز نما خوانوں پر رکھ کر کھانا کھایا کرتے تھے۔تاکہ کھانے کے وقت بھی سرنگوں نہ ہونا پڑے۔آپ ﷺ نے اس طرز سے اجتناب کرتے ہوئے عملاً ایسا نہ

(۱)صحیح بخاری ۲/۸۱۱ کتاب الاطعمة باب الخبز المرقق والاکل علی الخوان، سنن ابن ماجة ۱/۲۴۴ کتاب الاطعمة باب الاکل علی الخوان والسفرة، (مختار)

کرنے کی تعلیم دی۔ کیونکہ اس میں تکبر کے ساتھ ساتھ تشبہ بالکفار کی علت بھی تھی۔

ولا فی سکرجة الخ سکرجہ اس چھوٹے برتن یا پلیٹ کو کہتے ہیں جس میں عموماً مشتہی اور مرغوب غذا ڈال کر کھائی جاتی ہے(۱)۔ جس طرح کہ آج کل بھی یہ رواج ہے کہ درمیان میں کھانے کا ڈونگا یا بڑا برتن رکھا ہوتا ہے۔ اور اردگرد چھوٹی پلیٹیں ہوتی ہیں۔ جن میں کھانا ڈال کر لوگ کھاتے ہیں یا پھر اگر نفیس اور عمدہ قسم کے کھانے مثلاً اچار، چٹنی اور فرنی وغیرہ ہو تو چھوٹی پلیٹوں میں ڈال کر کھانے والوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ نبی کریمؐ پُر تکلف کھانوں سے دور رہتے تھے۔ اس لیے پلیٹوں کی ضرورت ہی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ مزید یہ کہ عموماً عربوں کے ہاں اور پھر بالخصوص نبی کریمؐ کے ہاں ایک برتن میں شریک ہو کر اکٹھا کھانا کھاتے تھے جو چھوٹی رکابیوں میں ممکن نہیں ہوتا۔

<u>چھوٹی موٹی روٹی:</u> **ولا خبز له مرقق** نہ آپؐ کے لیے نرم چپاتیاں پکائی گئیں۔ مرقق چھوٹی اور پتلی روٹیوں کو کہتے ہیں۔ جیسے ہندوستانیوں کے ہاں پکانے کا رواج ہے۔ اسے رقاق بھی کہا جاتا ہے۔ اگر گندم کا آٹا خوب نرم اور چھنا ہوا ہو تو اس سے چپاتی پکائی جاسکتی ہے۔ جبکہ مکئی وغیرہ کے آٹے سے مرقق یعنی پتلی چپاتیاں نہیں پک سکتیں۔ اسی طرح اگر گندم کے آٹے میں بھوسی ہو تو پتلی روٹی نہیں پکائی جا سکتی۔ بہرحال نبی کریمؐ کی روٹی موٹی ہوتی تھی۔ اور وہ بھی دوسرے شرکاء کے ساتھ اکٹھے اور نیچے بیٹھ کر کھاتے تھے۔ میز کرسی کے تکلفات آپؐ کے ہاں نہیں تھے۔ جیسے کہ حضرت یونسؒ کے استفسار پر حضرت قتادہؒ کہتے ہیں کہ "**علی هذه السفر**" سُفر سفرۃ کی جمع (۲) ہے۔ اور حقیقت میں یہ چمڑے کا

---

(۱)**قال ابن العربیؒ: اناءٌ صغیر یوضع فیه الشئی القلیل المشهی للطعام الهاضم له کا لسلطة والمخلل. (المواهب الدنیة ص۱۷۷)(مختار)**

(۱)**جمع سفرة وفی النهایة هی فی الاصل طعام یتخذه المسافر والغالب انه یحمله فی جلد مستدیر فنقل اسمه الی ذالک الجلد(جمع الوسائل)** جبکہ علامہ بیجوریؒ اور علامہ مناویؒ نے چمڑے کے گول دسترخوان کا نام سفرہ رکھنے کی وجہ یہ بھی بتائی ہے کہ "**تضم وتنفرج فتسفر عمّافیها**" یعنی اس کے کھلتے ہی یہ اپنے اندر کی چیزوں کا استفسار اور اظہار کر دیتا تھا۔ اسی وجہ سے اسے سُفرہ کہا گیا۔ جس طرح کہ سفر کو اسی لئے سفر کہا گیا کہ اس میں مسافر کے اخلاق کا کامل مظاہرہ ہو جاتا ہے۔ نیز نامعلوم مقامات اور احوال سے واسطہ پڑ کر ان کا علم ہو جاتا ہے

(اصلاح الدین)

دسترخوان ہوتا ہے جس پر لوگ کھایا کرتے تھے۔ جیسا شاعر نے کہا کہ ؎ سفرۂ زمین خوان اوست ایسی سادگی کی زندگی میں برکتیں ہوتی ہیں۔ ہم اور ہمارے طلبہ نے جب سے سادگی اور جفاکشی کی زندگی ترک کردی ہے۔ برکتیں بھی ساتھ چھوڑ گئی ہیں۔ **یونس الاسکاف** امام ترمذیؒ ایک راوی کا تعارف کرا رہے ہیں۔ اسکاف موچی کو کہتے ہیں۔ گویا پیشہ کے لحاظ سے وہ موچی تھے۔ اور چونکہ مصنف نے اس راوی کی صرف یہی ایک حدیث روایت کی ہے۔ اس لئے تعین وتعارف کی ضرورت پیش آئی۔

(٦) حدّثناأحمد بن منیع ثنا عبّاد بن عبّاد المهلبی عن مجالد عن الشعبیّ عن مسروق قال دخلت علی عائشة فدعت لی بطعام و قالت ما أشبع من طعام فاشاء ان أبکی إلاّبکیت قال قلت لم قالت اذکر الحال التی فارق علیها رسول الله ﷺ الدنیا و الله ما شبع من خبزو لحم مرّتین فی یوم واحد(١) .

ترجمہ: حضرت مسروقؒ کہتے ہیں کہ میں حضرت عائشہؓ کے پاس گیا۔ انہوں نے میرے لئے کھانا منگایا۔ اور فرمایا میں کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھائی۔ مگر میرا دل رونے کو چاہتا ہے تب میں رولیتی ہوں۔ مسروقؒ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ یہ کیوں؟ آپؓ نے فرمایا کہ مجھے نبی کریم ﷺ کی وہ حالت یاد آجاتی ہے جس پر وہ دنیا سے تشریف لے گئے۔ (وہ یہ کہ) خدا کی قسم آپ ﷺ نے کبھی بھی ایک دن میں دو بار روٹی اور گوشت سے پیٹ بھر کر نہیں کھایا۔

مسروق یہ مشہور صحابی ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بھانجے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بچپن میں اسے چرایا گیا تھا۔ اور بعد میں پائے گئے۔ وفات نبوی ﷺ سے قبل اسلام لائے۔ اور صدر اول کے صحابہ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ ۶۲ھ میں کوفہ میں وفات پائی۔

<u>حضرت عائشہ کا ضبط سے بندھن ٹوٹ جانا:</u> **فاشاء ان ابکی الخ** علامہ مناویؒ لکھتے ہیں کہ یہ دراصل حضرت عائشہؓ کی طرف سے گویا اعتذار سا ہے۔ کہ مہمان نوازی کے اصول کے مطابق میں

(١) جامع ترمذی ٢/ ٦١ کتاب الزهد باب ماجاء فی معیشة النبی ﷺ (مختار)

بھی کھانے میں شریک ہوتی تا کہ مہمان بے تکلفی کے ساتھ کھائے۔لیکن میں یہ اہتمام نہیں کرسکتی۔اس لئے کہ میں جب کوئی اچھا کھانا پیٹ بھر کر کھاؤں۔تو دل بھر جاتا ہےاور رونا چاہوں تو رو لیتی ہوں۔اور جب حضرت مسروقؒ نے اس کا سبب پوچھا۔تو آپؓ نے فرمایااذکر الحال التی الخ یعنی پیٹ بھر کر کھانے کے بعد وہ فقروفاقہ اور بھوک یاد آجاتی ہے جس میں نبی کریم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے چلے تھے۔پھر یہ حزن وملال اورافسوس مجھے اپنی گرفت میں لے کر یہ احساس دلاتا ہے۔کہ ہم فقروفاقے کی اس محمود ومحبوب روایت کو کیوں برقرار نہ رکھ سکے۔اورآج اس مرتبہ عالیہ سے ہم کیوں محروم رہے۔لہٰذا رونا آجاتا ہے۔

ماشبع الخ یعنی اگرشاذ ونادرایک وقت پیٹ بھر کرکھانے کومل بھی جاتا تو دوسرے وقت کھانا نہیں ملتا تھا۔اورسرداردوجہاں ﷺ کی یہ تکلیف اورفقروفاقہ یادکر کے حضرت عائشہؓ کارونا بے محل نہیں تھا۔کیونکہ انہوں نے اس تکلیف کا مشاہدہ کیا تھا۔اس کا تصور کر کے تو بہت دور کے لوگوں کا بھی دل بھر جاتا ہے۔یوں اس آخری جملے میں رونے کی ایک اوروجہ کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔

(۷) حدثنا محمود بن غیلان ثنا أبو داود قال ثنا شعبة عن أبی إسحاق قال سمعت عبدالرحمٰن بن یزید یحدّث عن الأسود بن یزید عن عائشةؓ قال ما شبع رسول اللهﷺ من خبزشعیر یو مین متتابعین حتّیٰ قبض(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی جو کی روٹی دو دن مسلسل پیٹ بھر کرنہیں کھائی۔

یومین متتابعین حتی قبض الخ یہاں پرایام کے ساتھ لیالی بھی مراد ہیں۔یعنی دودن رات مسلسل پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔بخاری شریف کی ایک حدیث میں تین دنوں کا بھی ذکر موجود ہے۔لیکن وہاں **خبز الشعیر** کی بجائے **خبز البُر** کاذکر ہے۔حدیث کی تشریح باب کی پہلی حدیث کے ضمن میں گزر چکی

---

(۱)صحیح مسلم کتاب الزھدوالرقائق ۲/۷۱۴، جامع ترمذی ابواب الزھد باب ماجاء فی معیشة النبیؐ ﷺ واھلہ ۲/۶۱ (مختار)

ہے فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں آل محمدﷺ کا ذکر تھا۔ اور یہاں خود نبی کریمﷺ کی بات ہو رہی ہے۔

(۸) حدثنا عبداللّٰہ بن عبدالرحمٰن ثنا عبداللّٰہ بن عمرو أبو معمر ثنا عبدالوارث عن سعید بن أبی عروبة عن قتادة عن أنس قال ما اکل رسول اللّٰہ ﷺ علی خوان و لا اکل خبزا مرقّقا حتّیٰ مات(۱)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریمﷺ نے کبھی بھی خوان پر کھانا تناول نہیں فرمایا۔ اور نہ نرم چپاتی کھائی یہاں تک کہ آپﷺ وفات پائے۔

و لا اکل خبزا مرقّقا الخ مرقق کی تشریح پہلے گزر چکی ہے۔ اس حدیث میں اس بات کی تصریح ہے کہ آپﷺ نے مرقق (نرم) چپاتی نہیں کھائی ہے۔ خواہ وہ آپﷺ کے سوا کسی اور کے لیے کیوں نہ پکی ہو۔ جبکہ اس سے پہلے آپﷺ کے لیے پکانے کی نفی کی گئی تھی۔ آپﷺ کے کھانے کی نفی نہیں تھی۔ (صلی اللّٰہ علی نبیہ محمد والہ واصحابہ اجمعین)

خلاصہ باب

اس باب میں نبی کریمﷺ کی روٹی اور کھانے میں سادگی کا بیان ہے۔ نبی کریمﷺ کی زندگی فقر اختیاری کا بہترین نمونہ تھی۔ عموماً فاقہ کشی رہتی تھی۔ روٹی ملتی تو عموماً گندم کی نہیں ہوتی تھی۔ جو کی ہوتی تھی وہ بھی بغیر چھنے ہوئے آٹے سے پکتی تھی۔ بلکہ چھنا ہوا آٹا تو آپﷺ نے دیکھا بھی نہ تھا۔ پھر جو روٹی ملتی وہ بھی قوت لایموت کی حد تک۔ دسترخوان پر کچھ بھی نہ بچتا تھا۔

پھر کھانے کے لیے تکلفات بالکل نہیں ہوتے تھے۔ میز نہ کرسی، پلیٹیں نہ چمچ۔ سادہ دسترخوان بچھا کر اکٹھے کھانا کھانے کا رواج تھا۔ حتیٰ کہ حضورﷺ کی اس سلسلے میں سادگی بلکہ جفاکشی کو یاد کر کے فاقہ کشی میں شریک عائشہ صدیقہؓ کے ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے تھے۔ اور آنسو بے قابو ہو جاتے تھے۔

---

(۱) صحیح بخاری ۲/ ۹۵۵ کتاب الرقاق باب فضل الفقراء، جامع ترمذی ۲/ ۶۱ کتاب الزهد باب ماجاء فی معیشة النبیﷺ، (مختار)

۲۶. باب ما جاء فی إدام رسول اللہ ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے سالنوں کا بیان

إدام کے مفہوم کی تحقیق: اس باب میں سالنوں کا بیان ہے جو نبی کریم ﷺ استعمال کر چکے ہیں(۱)۔ ادام کے مفہوم کے بارے میں شیخینؒ اور امام محمدؒ کے درمیان اختلاف فقہ کی کتابوں میں قسم کے ابواب میں مذکور ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ادام وہ چیز ہے جس میں صباغۃ اور اصطباغ کا معنی ہو۔ اور روٹی کے ساتھ تبعاً کھائی جا سکے۔ یوں کہ روٹی کے ساتھ گھل مل جائے۔ جیسے شوربہ، سرکہ وغیرہ یا وہ چیز جو اصالۃً نہ کھائی جائے جیسے نمک وغیرہ۔ بالاستقلال کھائی جانے والی چیزیں ادام نہیں ہیں۔ جیسے گوشت، پنیر اور انڈا وغیرہ۔ جبکہ امام محمدؒ اور ایک قول کے مطابق امام ابو یوسفؒ بھی کہتے ہیں کہ إدام مؤادمة بمعنی موافقة سے مأخوذ ہے۔ لہٰذا روٹی کے ساتھ جو چیز بھی کھانے میں موافق ہو۔ وہ سب ادام ہے۔ تو گوشت، پیاز اور گڑ وغیرہ ادام میں داخل ہو جائیں گے۔ بہر حال اس قول کا دارومدار عرف پر ہوگا۔ کہیں کوئی چیز روٹی کے ساتھ کھائی جاتی ہے۔ وہاں وہ ادام ہوگی۔ دوسری جگہ وہی چیز ادام نہیں ہوگی۔ کیونکہ یہ صفت اس میں نہیں ہوگی۔

امام ترمذیؒ کا میلان بھی اس قول کی طرف معلوم ہو رہا ہے۔ کیونکہ اس باب میں وہ تمام چیزیں ذکر ہوں گی جن کو آپ ﷺ نے روٹی کی متابعت میں تناول فرمایا ہے۔ مثلاً گوشت، پنیر، روغن زیتون وغیرہ۔ بلکہ کھجور اور ککڑی کا بھی ذکر موجود ہے۔ گویا امام ترمذیؒ کے ہاں جس چیز میں بھی توافق اور تبعیۃ کا معنی موجود ہو۔ وہ ادام ہے۔ اس باب میں امام ترمذیؒ چونتیس (۳۴) احادیث لا رہے ہیں۔

---

(۱) اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ جو بھی غذا میسر ہوتی تناول فرماتے تھے۔ حافظ ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں لکھا ہے کان هديه ﷺ وسيرته فی الطعام لايرّد موجوداً ولايتكلف مفقوداً فماقرب اليه شئ من الطيّبات إلاّاكله إلاّان تعافه نفسه فيتركه من تحريم وماعاب طعاماً قط ان اشتهاه اكله والاّتركه(زادالمعاد ۱/ ۵۴)(مختار)

(۱) حدثنا محمد بن سهل بن عسکرو عبداللّٰہ بن عبدالرحمٰن قالا ثنا یحیی بن حسّان ثنا سلیمان بن بلال عن هشام بن عروة عن أبیه عن عائشةؓ أنّ رسول اللّٰہﷺ قال نعم الإ دام الخلّ قال عبداللّٰہ بن عبدالرحمٰن فی حدیثه نعم الادم او الإدام الخلّ(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریمﷺ نے فرمایا کہ سرکہ اچھا سالن ہے۔(ترمذیؒ کے شیخ) عبداللہ بن عبدالرحمٰنؒ نے اپنی روایت میں ''نعم الادام او نعم الادم'' کہا ہے۔

نعم الادام الخل یعنی سرکہ بھی بطور ادام استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ دوسرے سالنوں کی طرح یہ بھی ایک پسندیدہ سالن ہے۔ لہٰذا جس گھر میں یہ موجود ہے۔ اس گھر والے یہ نہ کہیں کہ گھر میں سالن نہیں۔ بلکہ سرکہ کو بطور سالن استعمال کریں۔ اور روزانہ مرغن اور تکلفات بھرے سالنوں کی بجائے سرکہ پر قناعت کریں۔

<u>سرکہ اچھا یا سب سے اچھا</u>: اس تشریح کے مطابق یہاں سرکہ کی افضلیت کا بیان مقصود نہیں۔ بلکہ صرف اس کی مدح مقصود ہے۔ اور اس مدح سے غرض یا تو ان نادار قسم کے لوگوں کو قناعت کی تعلیم دینا ہے۔ جن کو صرف سرکہ ہی بطور سالن میسر ہے۔ یا پھر ان لوگوں کی تطییب خاطر کے لیے حضورﷺ نے یہ کلمات کہے ہیں۔ جو کبھی سرکہ بطور ہدیہ پیش کر چکے ہیں۔ تاکہ ان کو ہدیہ کی بے قدری کا احساس نہ ہو۔

نیز یہ بھی ممکن ہے کہ آپﷺ نے جب اپنے گھر میں ادام کی فرمائش کی تو گھر والوں نے صرف سرکہ کی موجودگی کی خبر دیدی۔ اس پر آپﷺ نے گھر والوں کی تسلی اور خاطر داری کیلئے اس پر اکتفاء کی تلقین فرمائی ہو۔ اس توضیح کے مطابق اب اس اعتراض کا محل باقی نہیں رہتا کہ احادیث مبارکہ میں آتا ہے کہ آپﷺ طعام کی مدح سرائی نہیں کرتے تھے(۲)۔ تو یہاں سرکہ کی مدح کیوں فرمائی ہے۔ جواب یہ

---

(۱) صحیح مسلم ۱۸۲/۲ کتاب الاشربة باب فضیلة الخل، جامع الترمذی ۶/۲ کتاب الاطعمة باب ماجاء فی الخل، سنن ابن ماجة ص ۲۴۶ ابو اب الاطعمة باب الایتدام بالخل(مختار)

(۲) غیر أنّه لم یکن یذمّ ذواقا ولا یمدحه(شمائل ترمذی باب کیف کان کلام رسول اللّٰہﷺ.(اصلاح الدین)

ہے کہ طعام کی مدح اشراف اور لالچ کے خوف سے نہیں فرماتے تھے اور اگر کوئی اور مدعا مقصود نظر ہو تو طعام کی مدح کوئی معصیت نہیں ہے۔ جبکہ بعض دیگر شرّاح کے بقول آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی سرکہ کی دوسرے سالنوں سے افضلیت کو واضح کر رہا ہے۔ اور یہی مقصود ہے کہ سرکہ دیگر اداموں کی نسبت بہتر سالن ہے۔

سرکہ میں اچھائی کا پہلو یہ ہے کہ دوسری قسم کے سالنوں میں گھی، مصالحہ وغیرہ لوازمات کے ساتھ ساتھ ایک معتدبہ وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ آگ، برتنوں اور آلات کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ جبکہ سرکہ تیار سالن ہے۔ بنانے میں محنت نہیں کرنی پڑتی۔ وقت اور پیسہ بھی کم صرف ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں علمائے طب نے سرکہ کے کچھ ایسے فوائد کا ذکر کیا ہے جو اس کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً پیٹ کے کیڑوں کے لیے مفید ہے، زہریلے مواد کو ختم کر دیتا ہے، تیزابیت کو مٹاتا ہے، نیز گرم ہوا اور لو کے مضر اثرات کا ازالہ کرتا ہے۔ اس طرح کے بعض دیگر خواص کی وجہ سے مختلف زمانوں میں مختلف انداز سے ڈاکٹروں نے آپ ﷺ کے اس قول کی تائید و تصویب کی ہے۔

علامہ ابن حجرؒ نے اس بات کو رد کیا ہے کہ حدیث شریف سرکہ کی دوسری سالنوں کی نسبت افضلیت پر محمول ہے۔ لیکن ملا علی قاریؒ نے ان پر رد کر کے اس قول کا دفاع کیا ہے(۱)۔ کیونکہ بعض دیگر احادیث بھی سرکہ کی افضلیت کی غماض ہیں۔ مثلاً ایک روایت میں ہے۔ **نعم الادام الخلّ اللّٰھمّ بارک فی الخلّ**(۲)۔ سرکہ بہترین سالن ہے۔ اے اللہ اس میں برکت عطا فرما۔ دوسری روایت میں آتا ہے **فإنّہ کان ادام الانبیاء من قبلی**(۳)۔ سرکہ مجھ سے قبل دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کا بھی سالن تھا۔

---

(۱) قال النوویؒ والصوّاب الذی ینبغی أن یجزم بہ أنّہ مدح للخل نفسہ (عون المعبود ۱۰/۲۱۵)(مختار)

(۲) قال الخطابیّ معنی ھذاالکلام مدح الاقتصادفی المأکل ومنع النفس عن ملاذالاطعمۃ کأنّہ یقول ائتدموابالخل وماکان فی معناہ مماتخف مؤونتہ ولایعزّوجودہ ولاتتأنقوافی الشھوات فإنّھا مفسدللدین مسقمۃ للبدن (عون المعبود ۱۰/۲۱۵) فقہاء کرام نے یہاں سے ایک مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ اگر کوئی شخص قسم کھائے کہ وہ سالن نہیں کھائے گا۔ پھر اس نے سرکہ کے ساتھ روٹی کھائی۔ تو اب یہ شخص حانث ہوگا۔ کیونکہ حدیث پاک میں سرکہ کو سالن کہا گیا ہے۔ (مختار)

(۳) جمع الوسائل ص ۲۴۶

نعم الادام او الادم. اُدُم بضم الدال ادام کی جمع ہے۔تو اس روایت میں اس لفظ کو مفرد اور جمع دونوں طرح روایت کیا گیا ہے۔جبکہ اُدْ م سکون دال کے ساتھ مفرد اور ادام کا ہم معنی لفظ ہے۔لیکن اِدام صرف مفرد ہے(۱)۔

(۲) حدّثنا قتیبة ثنا أبو الأحوص عن سماک بن حرب قال سمعت النعمان بن بشیر یقول ألستم فی طعام و شراب ما شئتم لقد رأیت نبیکم و ما یجد من الدقل ما یملأ بطنه(۲).

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیرؓ کہتے ہیں کہ کیا تم طعام وشراب کی خاطر خواہ نعمتوں میں نہیں ہو۔حالانکہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا تھا۔کہ ان کے پاس ردی قسم کی کھجوریں بھی اتنی مقدار میں نہیں ہوتی تھیں جس سے آپ ﷺ اپنا پیٹ بھر سکیں۔

نعمان بن بشیرؓ انصاری خزرجی صحابی ہیں۔والدین بھی صحابیت کا شرف پا چکے ہیں۔ابو عبداللہ کنیت تھی۔یزید کے زمانہ میں حمص کے والی تھے۔شعر وشاعری کا ذوق بھی تھا۔۶۴ھ کے آخر میں جب مروان نے حکومت کے حصول کے لئے ضحاک فہری سے جنگ لڑی۔تو آپؓ ضحاک کی امداد کے لیے حمص سے نکلے۔اور ضحاک فہری کی طرح آپؓ کو بھی مروان کے ساتھیوں نے قتل کیا۔

ألستم فی طعام و شراب الخ (۳) یعنی کیا آج تم مزوں میں نہیں ہو کہ جو دل چاہے وہی کھانے کو ملے۔تمہارے پیغمبر ﷺ کو پیٹ بھر کر کھانے کیلئے ردّی کھجور بھی نہیں ملتی تھی۔یہ بات شاید آپ نے اپنی ولایت کے زمانہ میں اپنے مصاحب صحابہ یا تابعین کو تحدیث بالنعمۃ اور تذکیر بالآء اللہ کے طور پر کہی ہوگی۔

---

(۱)الادام کل موافق و ملائم جمعه آدامٌ اُدُمٌ و الاُدم مایؤتدم به(منجد)(اصلاح الدین)

(۲)صحیح مسلم ۲/ ۴۰۱ کتاب الزهد والرقاق، جامع الترمذی ۲/ ۶۲ کتاب الزهد باب ماجاء فی معیشة اصحاب النبیّ ﷺ ، سنن ابن ماجة ص ۳۰۶ باب معیشة آل محمد ﷺ(مختار)

(۳)علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے أی الستم متنعمین فی طعام و شراب بالمقدار الذی شئتم من السعة والافراط والخطاب للتابعین أو للصحابة بعده ﷺ والاستفهام للانکار و التوبیخ و القصد به الحثّ علی الاقتصار فی الطعام والشراب علی أقل مایکفی کما کان ذلک شعار المصطفیٰ(المواهب اللدنیة ص ۱۰۵)(مختار)

دقــــل ردی قسم کی کھجور کو کہتے ہیں جب کھجوروں کے ڈھیر سے اوپر کی اچھی کھجوریں چن کر اٹھالی جائیں اوراخیر میں سوکھی، چھوٹی، اور بیکار قسم کی کھجوریں رہ جائیں۔ان کودقل کہا جاتا ہے۔

ترجمۃ الباب کے ساتھ اس حدیث کی مطابقت یہ ہے کہ ہر وقت یہ لازم نہیں کہ سالن اور دیگر تکلفات تک رسائی ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کچھ دیا ہو تو روٹی کے ساتھ کھالو، نہیں تو سوکھی روٹی پر گزارہ کرلینا۔ جیسا کہ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کے عمل کو بیان کرکے شکر وقناعت کی تلقین کی گئی ہے۔ ہر وقت سالن وغیرہ کا تقاضا حضور ﷺ کی سنت کے خلاف ہے۔

(۳) حدثنا عبدة بن عبداللّٰہ الخزاعیّ ثنا معاویة بن هشام عن سفیٰن عن محارب بن دثار عن جابر بن عبداللّٰہ قال قال رسول اللّٰہ ﷺ نعم الإدام الخلّ(۱) .

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ سرکہ اچھا سالن ہے۔

نعم الادام الخل طبی خواص، آسانی کے ساتھ تیار، وقت اور اخراجات کی بچت کے اعتبار سے سرکہ کو اچھا سالن شمار کیا گیا ہے۔ حدیث کی مزید تشریح گزر چکی ہے۔

(۴) حدثنا هنّاد ثنا وکیع عن سفیٰن عن ایّوب عن أبی قلابة عن زهدم الجرمیّ قال کنّا عند أبی موسٰی فاتی بلحم دجاج فتنحیّ رجل من القوم فقال ما لک قال انّی رأیتها تاکل شئیا نتنا فحلفت ان لا اٰکلها قال ادن فانّی رأیت رسول اللّٰہ ﷺ یاکل لحم دجاج(۲).

---

(۱) جامع الترمذی ۲/۶ کتاب الاطعمة باب ماجاء فی الخل، سنن ابن ماجة ص ۲۳۸ کتاب الاطعمة باب الائتدام بالخل، سنن ابی داؤد ۲/۱۷۹ کتاب الاطعمة باب فی الخل،(مختار)
قال البیجوریؒ وهذا حدیث مشهور کادان یکون متواتراً(المواهب اللدنیة ص ۱۰۵)هکذافی جمع الوسائل ۱/۲۴۷ (مختار)

(۲) صحیح مسلم ۲/۴۶ کتاب الایمان باب ندب من حلف یمینا الخ، جامع ترمذی ۲/۴۴۶ کتاب الاطعمة باب ماجاء فی اکل الدجاج،

ترجمہ: حضرت زہدم کہتے ہیں کہ ہم حضرت موسیٰ اشعریؓ کے پاس تھے کہ (کھانے میں) مرغی کا گوشت لایا گیا۔ حاضر لوگوں میں سے ایک شخص کھانا چھوڑ کر ہٹ گیا۔ حضرت موسیٰؓ نے فرمایا کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے (کھانا چھوڑ دیا)۔ اس شخص نے عرض کیا کہ میں نے مرغی کو کوئی (گندی) چیز کھاتے دیکھا تھا۔ پس میں نے قسم کھائی ہے کہ مرغی کا گوشت نہیں کھاؤں گا۔ حضرت ابوموسیٰؓ نے فرمایا۔ قریب آؤ (اور کھاؤ) کیونکہ میں نے نبی کریم ﷺ کو مرغی کا گوشت کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔

ابوموسیٰؓ اور زہدمؒ: ابوموسیٰ زہدم بن منصور کا تعلق جرم قبیلہ سے ہے۔ زہدم اکرم کے وزن پر اور جرم کا جیم مفتوح اور راء ساکن ہے۔ بصری ثقہ تابعی ہیں۔

ابو موسیٰ اشعریؓ بڑے صحابہ میں سے ہے۔ نام عبداللہ بن قیس ہے۔ یمن کے اشعر قبیلہ سے تعلق ہے۔ جو حسن صورت میں مشہور ہے۔ مکہ میں اسلام کے بعد حبشہ کو ہجرت کی۔ اور فتح خیبر کے موقعہ پر اصحاب السفینہ کے ساتھ واپس تشریف لائے ۲۱ھ میں بصرہ کے گورنر مقرر ہوئے۔ اور اہواز کا علاقہ آپ کی ولایت کے دوران فتح ہوا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں بصرہ کی ولایت سے معزول کئے گئے۔ اور کوفہ کے والی مقرر ہوئے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حکومت سے گوشہ نشینی اختیار کی۔ اور مکہ آ کر مستقل رہائش اختیار کی۔ ذی الحجہ ۴۴ھ میں وفات پائی (شذرات الذهب) جبکہ ملا علی قاریؒ نے تاریخ وفات ۵۲ھ لکھی ہے (مرقات ج ۱ ص ۷۸)

کنا عند أبی موسیٰ الأشعریؓ الخ یہ واقعہ بظاہر حکمرانی کے زمانہ کا ہے۔ جب آپؓ کے پاس عموماً مہمان آیا کرتے تھے۔ فاتی بلحم دجاج دجاج کے دال پر تینوں حرکات پڑھنا جائز ہے۔ لیکن فتحہ افصح ہے۔ دجاجۃ کی جمع ہے یعنی دسترخوان پر مرغی کا گوشت بھی رکھا گیا۔ جسے دیکھ کر بنوتیم اللہ کے آدمی (۲) نے اس سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور حضرت ابوموسیٰؓ کے استفسار پر یہ عذر پیش کیا کہ میں نے ایک بار

(۱) علامہ مناویؒ نے لکھا ہے وفیہ مشروعیۃ اجتماع القوم عند صدیقهم (المناوی علی هامش جمع الوسائل ۱/۲۴۸) (مختار)

(۲) بعض شراح نے یہاں ذکر ہونے والے شخص کو زہدم ہی قرار دیا ہے۔ لیکن اکثر شراح نے اس پر رد کیا ہے۔ کیونکہ آنے والی دوسری روایت میں زہدم نے اس شخص کا نسب اور حلیہ بیان کیا ہے۔ اگر وہ زہدم ہوتا تو اس بیان کی گنجائش نہیں بنتی۔ لیکن اس کے باوجود علامہ ابن حجرؒ اور علامہ عینیؒ نے بوجوہ اس پر اصرار کیا ہے۔ یہ کہ زہدم جرمی ہی ہیں۔ (اصلاح الدین)

مرغ کو دیکھا تھا کہ وہ گندی وناپاک چیزیں کھارہا تھا۔اس روز سے قسم کھا چکا ہوں۔ کہ مرغ کا گوشت نہیں کھاؤں گا۔گویا کہ طبعی کراہت(۱) کا عذر پیش کیا۔اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ میزبان اگر دیکھے کہ مہمان کھانا نہیں کھاتا تو اس کا سبب دریافت کرے تاکہ کوئی ظاہری سبب ہو۔تو اس کا ازالہ کرے۔فقال ادن الخ حضرت ابوموسیٰؓ نے نبی کریم ﷺ کے عمل کا حوالہ دیتے ہوئے گوشت کھانے کی دوبارہ دعوت دیدی کہ جب نبی کریم ﷺ نے تناول فرمایا ہے تو تم نے اپنے آپ پر اسے کیوں حرام کیا ہے۔قرآن مجید میں ایسے ہی موقع کے لیے تنبیہاً ارشاد ہے لم تحرّم مااحلّ اللہ لک(الآیۃ) یعنی وہ چیزیں خود پر تم کیوں حرام کرتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے حلال کردی ہیں۔

مباح شرعی کو ضروری نہیں کہ تم استعمال کرو۔لیکن اس کے ساتھ تحریم کا معاملہ کرنا خلاف شرع ہے۔ بلکہ حلال چیزوں سے قسم کھانے کے بعد شرعی حکم یہی ہے کہ قسم توڑ کر کفارہ ادا کردینا چاہیے(۲)۔یہاں بھی صحابی نے اپنے ساتھی کو قسم توڑنے کا مشورہ دیا ہے۔اوراس کا کفارہ بھی وہ یقیناً دے چکے ہونگے۔

اس حدیث میں ترجمۃ الباب سے تعلق اس بات میں ہے کہ راوی کے قول کے مطابق نبی کریم ﷺ نے مرغی کا سالن اور گوشت بھی تناول فرمایا ہے۔مرغی کا گوشت اور سالن بہت مفید ہے۔علماء طب نے بھی اس کے متعدد فوائد لکھے ہیں۔اس میں رطوبت کے ساتھ حرارت بھی ہے۔زود ہضم ہے۔ تازہ خون کی افزائش کرتا ہے۔اخلاط کی اصلاح کرتا ہے۔دماغ کو فائدہ دیتا ہے۔اعضاء رئیسہ اور عقل کو بھی تقویت دیتا ہے۔نیز قوت باہ کے لیے بھی مفید ہے۔آواز کو صاف اور رنگ کو حسن وجلا بخشتا ہے۔

لیکن نبی کریم ﷺ نے ہمیشہ مرغ نہیں کھایا۔بلکہ یہ تو کسی خاص موقع کا ذکر ہے۔محض اتفاق

---

(۱) بعض شراح نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مذکور شخص نے شرعی عذر یعنی جلالہ سمجھ کر مرغی کھانے سے قسم کھائی تھی لیکن ملاعلی قاری وغیرہ نے اس پر رد کیا ہے(راجح جمع الوسائل ج ۱ ص ۲۴۸)(اصلاح الدین)

(۲) عن عبدالرحمان بن سمرہ قال قال رسول اللہ ﷺ اذا حلفت علی یمین فرایت غیر ھا خیرا منھا فکفر عن یمینک وآت الذی ھو خیر(مشکوۃ ۲/ ۲۹۶)(مختار)

سے یا کسی دعوت میں پیش کیا گیا تھا۔ اور آپ ﷺ نے بطور سالن استعمال فرمایا تھا(۱)۔

(۵) حدّثنا الفضل بن سهل الأعرج البغداديّ ثنا إبراهيم ابن عبدالرحمٰن بن مهدي عن إبراهيم بن عمر بن سفينة عن أبيه عن جدّه قال اكلت مع رسول اللّٰه ﷺ لحم حبارىٰ(۲).

ترجمہ: حضرت سفینہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ حباریٰ کا گوشت کھایا ہے۔

حضرت سفینہؓ: عن جدّه ابراہیمؒ کے دادا کا نام حضرت سفینہ ہے جو حدیث کے راوی اور جلیل القدر صحابی ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اصل نام مہران یا کچھ اور تھا۔ ابوعبدالرحمٰن کنیت تھی۔ ایک سفر میں بہت سے لوگوں کا سامان اٹھا کر لے جا رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ کی نظر پڑ گئی۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا "أنت سفينه" تم تو کشتی بنے ہو۔ اس کے بعد یہ لقب پڑ گیا۔ ۷۰ھ کے بعد وفات پائی۔

لحم حباریٰ: حباری کے بہت سے مصداق بتائے جاتے ہیں۔ اس کا اطلاق تیتر، چکور وغیرہ کے اقسام اور نوع پر ہوتا ہے۔ جیسے فاختہ، قمری اور کبوتر وغیرہ قسم کے پرندوں پر حمامہ کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس وجہ سے حباری کی مصداق کی تعیین میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ اس کے مختلف معنی لئے گئے ہیں۔

---

(۱) البتہ وہ مرغی جو جلالہ ہو یعنی نجاست کھانے کی عادی ہو اس کے گوشت کے بارے میں علامہ خطابیؒ نے لکھا ہے واختلف النّاس في أكل لحوم الجلالة والبانها فكره ذلك اصحاب الرأى والشافعي واحمدابن حنبل وقالوا لايؤكل حتى تحبس أياماً وتعلف علفاً غيرهافأذاطاب لحمها فلابأس بأكله وقدروى في حديث أن البقرتعلف أربعين يوماً ثم يؤكل لحمها وكان ابن عمريقول نجس الدجاجة ثلاثة أيام ثم تذبح وقال إسحٰق بن راهوية لابأس أن يؤكل لحمها بعد أن يغسل غسلاجيداً وكان الحسن البصري لايرى بأساباًكل لحوم الجلالة وكذلك قال مالك بن أنس انتهى وقال ابن رسلان في شرح السنن وليس للحبس مدة مقدرة وعن بعضهم في الإبل والبقرأربعين يوماً وفي الغنم سبعة أيام وفي الدجاجة ثلاثة اه.(عون المعبودشرح ابی داؤد ۱۰/۱۸۵)(مختار)

(۲) سنن ابی داؤد ۲/۱۷۶ كتاب الأطعمة باب أكل لحم الحبارى، جامع ترمذی ۲/۴ كتاب الاطعمة باب ماجاء في أكل الحبارى وشرح السنة للبغوی ۱۱/۲۵۱، كتاب الصيد باب اكل الدجاج والحبارىٰ(مختار)

چکور، تیتر، سرخاب، تعذری اور تلور وغیرہ اس میں داخل ہیں۔ لغت والوں میں صاحب منجد کہتے ہیں۔ کہ ’’حباری پالتو مرغی سے قدرے بڑے لمبی گردن والا پرندہ ہے۔ حماقت کی وجہ سے مشہور ہے۔ ایک جگہ انڈے دے کر جب وہاں سے چلا جاتا ہے۔ تو واپسی میں اپنا گھونسلا بھول جاتا ہے اور کسی دوسرے حباری کے انڈوں پر بیٹھ کر اسے سینے سے لگاتا ہے۔ اس کی متعدد قسمیں ہیں‘‘

بعض لوگوں کے بقول یہ ایک خاکی رنگ کا صحرائی پرندہ ہے۔ تیز رفتاری سے اڑتا ہے۔ اور بہت تیز دوڑتا ہے۔ خوراک کے حصول کے لیے بہت دور دور کا سفر بھی روزانہ کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر اس کے پر نکال لیے جائیں تو یہ شدتِ غم سے مرجاتا ہے اس کے پوٹے یا معدے میں ایک قسم کا پتھر کبھی کبھی ملتا ہے۔ اگر وہ پتھر اس شخص کے گلے یا ہاتھ پر باندھ دیا جائے جسے کثرتِ احتلام کا عارضہ ہو تو احتلام نہیں ہوگا۔ اور اگر اسہال کی شکایت ہو تو دست بند ہو جاتے ہیں۔ اس کا گوشت گرم اور دیر سے ہضم ہونے والا ہے۔ محنت کش لوگوں کے لیے اس کا کھانا مناسب ہے۔ علامہ دمیریؒ نے حیوۃ الحیوان میں اس پر مزید بحث کی ہے آج کل کے عرف میں اس کا غالب استعمال تلور(۱) پر ہوتا ہے۔

(٦) حدثنا علیّ بن حجر ثنا إسماعيل بن إبراهيم عن أيوب عن القاسم التيمي عن زهدم الجرمي قال كنّا عند أبي موسٰى قال فقدم طعامه وقدم في طعامه لحم دجاج و في القوم رجل من بني تيم اللّٰه أحمر كانّه مولىً قال فلم يدن فقال له ابو موسٰى ادن فانّي قد رأيت رسول اللّٰه ﷺ اكل منه قال انّي رأيته ياكل شيئا فقذرته فحلفت ان لا أطعمه ابداً(۲).

ترجمہ: حضرت زہدم جرمیؒ کہتے ہیں کہ ہم حضرت ابوموسیٰؓ کے پاس تھے کہ ان کا کھانا حاضر کیا گیا۔ کھانے میں مرغی کا گوشت بھی پیش کیا گیا۔ حاضرین میں بنو تیم

(۱) تلور کو پشتو زبان میں ’’چاڑئے‘‘ کہتے ہیں۔ راقم الحروف نے اسے شکار بھی کیا ہے اور اسکا گوشت بھی کھایا ہے۔ (اصلاح الدین)

(۲) صحیح مسلم ۲/۴۷ کتاب الایمان باب ندب من حلف یمیناً الخ، جامع ترمذی ۲/۱ ۴۴ ابواب الاطعمة باب ماجاء فی أكل الدجاج(مختار)

اللہ کا ایک شخص بھی تھا۔ جس کا رنگ سرخ تھا۔ گویا وہ کوئی عجمی غلام ہو۔ وہ کھانے کے قریب نہ آیا۔ تو ابوموسیٰؓ نے اسے کہا کہ قریب آؤ۔ میں نے خود نبی کریم ﷺ کو اس کا گوشت کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس شخص نے کہا کہ میں نے تو مرغی کو ایک گندی چیز کھاتے دیکھا تھا۔ جس کی وجہ سے مجھے اس سے گھن آنے لگی۔ پس میں نے قسم کھائی کہ میں کبھی بھی اس کا گوشت نہیں چکھوں گا۔

وفی القوم رجل من بنی تیم الخ وہ شخص جس کا مبہم ذکر پچھلی حدیث میں ہو چکا ہے۔ یہاں پر اس عنوان سے مذکور ہے کہ وہ بنی تیم اللہ سے تھا۔ بنو تیم جو بنو بکر کا ایک بڑا قبیلہ ہے۔ مطلق مذکور ہے۔ لیکن یہاں بنو تیم اللہ مراد ہے۔ جو بنو تیم کی ایک شاخ ہے۔ **أحمر کانّه مولی** گویا کہ وہ موالی میں سے تھا۔ اس کی رنگت رومی غلاموں جیسی سرخ تھی۔ باقی یہ وہی حدیث ہے جس میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی مجلس کا واقعہ بیان ہوا تھا۔ **قذرته** یعنی مجھے اس سے گھن اور کراہت آنے لگی۔

(۷) حدّثنا محمود بن غیلان ثنا ابو أحمد الزبیریّ و أبو نعیم قال ثنا سفیان عن عبداللّٰہ بن عیسٰی عن رجل من أهل الشام یقال له عطاء عن أبی أسید قال قال رسول اللّٰہ ﷺ کلوا الزیت وادّهنوا به فانّه من شجرة مبارکة(۱)۔

ترجمہ: حضرت ابواسیدؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ روغن زیتون کھایا کرو۔ اور اس سے مالش بھی کیا کرو۔ کیونکہ یہ مبارک درخت سے نکلا ہوا تیل ہے۔

أبی أسید عبداللہ بن ثابتؓ کی کنیت ہے۔ جو انصاری صحابی ہیں۔ مدینہ میں رہے ہیں۔ صرف یہی ایک حدیث ان سے مروی ہے۔ واضح رہے کہ ابی اسید الساعدیؓ ایک اور صحابی ہیں جو ان کی نسبت قدرے مشہور ہیں۔

---

(۱) جامع ترمذی ۲/۶ کتاب الأطعمة باب ماجاء فی أکل الزیت، السنن الکبریٰ للنسائی ۴/۱۶۳ کتاب الولیمة ابواب الأطعمة باب الزیت، دارمی ۲/۱۰۲ (مختار)

زیتون کے فضائل: کلوا الزیت الخ روغن زیتون کھایا کرو۔ چونکہ روغن زیتون مائع چیز ہے۔ کھایا نہیں جاتا۔ لہٰذا یہاں پر مراد یہ ہے کہ اسے روٹی کے ساتھ ادام بنا کر کھاؤ۔ اس طرح حدیث کی ترجمۃ الباب کے ساتھ مطابقت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ آپ ﷺ نے خود بھی روغن زیتون کا اسی طرح استعمال کیا ہوگا۔

فانّہ من شجرۃ مبارکۃ الخ ایک اور روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ فانّہ شفاء من سبعین داء منہا الجزام گویا یہ طبی فوائد کے لحاظ سے مفید ہے۔ نیز وہ زمین بھی ارض انبیاء اور مبارک زمین ہے جہاں زیتون زیادہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ تخرج من طور سیناء تنبت بالدھن زیتون کا درخت سینا کے کوہ طور میں اگتا ہے۔ اور تیل دیتا ہے۔

بلکہ اس درخت کے مبارک ہونے کی تصریح کی ہے۔ من شجرۃ مبارکۃ لا شرقیّۃ ولا غربیّۃ کہ وہ تیل ایک بابرکت درخت کا ہے۔ جو نہ مشرق کی جانب ہے اور نہ مغرب کی جانب (۱)۔

بہر حال اس درخت میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی برکتیں ڈالی ہیں۔ تمام قدیم وجدید اطباء بھی اس کی افادیت پر متفق ہیں۔ یورپی ممالک میں بھی بڑے اہتمام سے زیتون کا تیل تیار ہوتا ہے اور ڈبوں میں بند کیا جاتا ہے۔ بہت سی بیماریوں میں بھی مفید ہے۔ مغرب کے لوگ صبح کے وقت اسے بطور ناشتہ کھاتے ہیں جو وہاں بند ڈبوں میں ملتا ہے۔ الغرض یہ کھانے کے کام بھی آتا ہے۔ بطور علاج بھی مستعمل ہے۔ اس کی لکڑی سے دباغت کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس سے حاصل شدہ راکھ ریشم صاف کرنے کے کام آتا ہے۔ اس کے ساتھ کچا ریشم دھویا جاتا ہے۔ اس کے بعض درختوں کی عمر ہزار برس تک ہوتی ہے۔ ابتداء چالیس سال کے بعد اس میں پھل لگتا ہے۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے تفسیر فتح العزیز میں "تین و زیتون" کے عجیب وغریب خصائص بیان فرمائے ہیں۔ انہی کثیر منافع کی وجہ سے اسے شجرۃ مبارکہ کہا جاتا ہے۔ علامہ قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سمیت ستر (۷۰) انبیاء کرام علیہم السلام نے اس درخت کیلئے برکت کی دعا فرمائی ہے۔

---

(۱) زیتون کے بارہ میں زیادہ تفصیل حضرت مولانا مدظلہ کے کتاب "اسلام کا نظام اکل وشرب" شرح ترمذی ابواب الاطعمۃ والاشربۃ میں دیکھیں۔ (مختار)

کہا جاتا ہے کہ سانپ عموماً سردی کے موسم میں اندھا ہو جاتا ہے۔ سردی کا موسم گزرنے کے بعد وہ نکلتا ہے تو انجیر یا زیتون کے کسی درخت کے ساتھ آنکھیں مل لیتا ہے۔ جس سے اسکی بینائی عود کر آتی ہے۔ شراح کے بقول زمین پر ابتدائے وجود سے اور پھر طوفانِ نوح کے بعد پہلے اگنے والا درخت بھی زیتون کا تھا۔

(۸) حدّثنا یحییٰ بن موسیٰ ثنا عبدالرزاق ثنا معمر عن زید ابن أسلم عن أبیه عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ کلوا الزیت و ادّھنوا به فانّه من شجرة مبارکة(۱) قال ابو عیسیٰ و کان عبدالرزاق یضطرب فی ھذا الحدیث فربما اسنده و ربما ارسله.

ترجمہ: حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ روغن زیتون کھاؤ۔ اور اس سے مالش بھی کرو کیونکہ یہ مبارک درخت سے نکلتا ہے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ عبدالرزاقؒ اس حدیث کو اضطراب کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ وہ یہ کہ کبھی (حضرت عمرؓ کا ذکر کر کے) اسے مسند بیان کرتے اور کبھی (ان کے ذکر کے بغیر) اسے مرسل لاتے تھے۔

<u>حضرت عمر فاروق اعظمؓ کی شان:</u> عن عمر امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کے والد کا نام خطاب اور لقب فاروق تھا۔ عدوی قریشی صحابی ہیں۔ ابو حفص کنیت تھی۔ حضور ﷺ نے دعا کی تھی کہ عمرو بن ہشام (ابو جہل) اور عمر بن الخطابؓ میں سے کسی ایک کو اسلام نصیب ہو۔ یہ دعا آپؓ کے حق میں قبول ہوئی۔ اور ۵ نبوی اور ایک روایت کے مطابق نبوت کے چھٹے سال آپؓ اسلام لائے۔ آپؓ سے قبل ۳۳ مرد اور چھ عورتیں اسلام لا چکی تھیں۔ آپ چالیسویں مسلمان ٹھہرے اور پھر یہ آیت نازل ہوئی یا ایھا النّبیّ حسبک اللّٰہ و من اتبعک من المؤمنین (الایة) بعض مؤرخین نے آپؓ سے قبل اسلام لانے والوں کی تعداد زیادہ ذکر کی ہے۔ حضرت حمزہؓ بھی آپؓ سے تین دن قبل اسلام لا چکے تھے۔ وہ بھی

---

(۱) جامع ترمذی ۲/۶ کتاب الأطعمة باب ماجاء فی اکل الزیت، سنن ابن ماجة ص ۲۳۸ کتاب الاطعمة باب الزیت(مختار)

حضرت عمرؓ کی طرح شجاعت میں مشہور تھے۔ اور جب آپؓ بھی اسلام سے مشرف ہوئے تو نبی کریم ﷺ بہت خوش ہوئے۔ ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بے پناہ قوت اور حوصلہ ملا۔ اسی روز نبی کریم ﷺ حضرت عمرؓ کے مطالبہ پر ان کے اور حضرت حمزہؓ کی معیت میں مسجد حرام تشریف لے گئے۔ قریش نے دونوں کی مصاحبت دیکھی تو ان کو بہت دکھ ہوا۔ اور نبی کریم ﷺ نے اسی روز آپؓ کو فاروق کے لقب سے نوازا۔ آپؓ کے اسلام لانے کا واقعہ عجیب لیکن مشہور ہے۔ اسلام لانے کے بعد ہر موقع پر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش پیش رہے۔ مدینہ طیبہ کو ہجرت کرتے وقت اعلانیہ نکلے اور قریش کو للکار کر ہجرت کی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے وفات سے پہلے آپؓ کا نام لکھوا کر حضرت عثمانؓ کے ہاتھوں لوگوں سے ان کے لیے بیعت لی۔ اور اس طرح صدیق اکبرؓ کے بعد آپ بالاتفاق خلیفہ مقرر ہوئے۔ سب سے پہلے امیر المؤمنین کا لقب بھی آپؓ کو ملا۔ تقریباً ساڑھے دس سال تک یہ خدمت انجام دی۔ اور اپنے رعب، تدبر، سیاسی بصیرت اور اصابۂ رائے سے اسلام کی اشاعت اور اسلامی حکومت کی توسیع میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ آپؓ کے مناقب کے احاطہ کے لیے کتابیں چاہئیں۔ کل ۹۳۵ اور ایک قول کے مطابق ۵۳۷ احادیث کی روایت آپؓ کے واسطہ سے ہوئی۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے مجوسی غلام ابولولؤ نے آپؓ کو اس خراج میں تخفیف کی فرمائش کی جو وہ حضرت مغیرہؓ کو ادا کیا کرتا تھا۔ آپؓ نے اس کے مطالبہ کو نامعقول کہہ کر بھی حضرت مغیرہؓ سے اس کی سفارش کردی۔ مگر ابولؤلوہ مطمئن نہ ہوا اور ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ کو اس کمبخت نے صبح کی نماز میں آپؓ پر خنجر سے حملہ کردیا جس سے آپؓ شدید زخمی ہوئے اور انہی زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے بعد میں آپؓ نے شہادت پائی۔

کلوا الزیت وادھنوا بہ اس کی تفصیل گزشتہ حدیث میں گزر چکی ہے۔ **یضطرب فیہ عبدالرزاق الخ** یعنی عبدالرزاق سے اس روایت میں اضطراب پایا جاتا ہے۔ جو یہ ہے کہ "**ربما اسندہ و ربما ارسلہ**" یعنی سند میں کبھی حضرت عمرؓ کا ذکر کرتے ہیں اور کبھی چھوڑ دیتے ہیں۔

حدثنا السِّنجی الخ پہلے جس اضطراب کا بیان ہوا۔ اسی کی وضاحت ہے کہ ایک سند کے ساتھ عبدالرزاق نے اس حدیث کو حضرت عمرؓ کے ذکر کے بغیر روایت کیا ہے۔

کدو کی محبوبیت

(۹) حدثنا محمّد بن بشّارثنا محمّد بن جعفر و عبدالرحمٰن ابن مهدی قال ثنا شعبة عن قتادة عن أنس بن مالک قال کان النبیّ ﷺ یعجبه الدباء فاتی بطعام اودعی له فجعلت اتبعّه فاضعه بین یدیه لمّا اعلم أنّه یحبه(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کو کدو بہت پسند تھا۔ ایک دفعہ آپ ﷺ کے سامنے کھانا پیش کیا گیا یا (راوی نے یہ کہا کہ) آپ ﷺ کسی دعوت پر بلائے گئے۔ (کھانے میں کدو بھی تھا) میں کدو کے قتلے ڈھونڈ کر نبی کریم ﷺ کے سامنے رکھنے لگا۔ کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ آپ ﷺ کدو پسند کرتے ہیں۔

یعجبہ الدبآء دبّاء دال کے ضمہ اور بآء مشددہ کے بعد الف ممدودہ کے ساتھ کدو کو کہتے ہیں۔ اسے عربی زبان میں قرع اور یقطین بھی کہا جاتا ہے۔ آخر کا ہمزہ بعض لوگوں کے نزدیک اصلی، بعض کے ہاں زائدہ اور بعض کے خیال میں واو سے بدل کر آیا ہے۔

فجعلت اتبعه یعنی آپ ﷺ کی پسند کا لحاظ کرتے ہوئے میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر کدو کے ٹکڑے نکالتا۔ اور خدمت اقدس میں پیش کرتا رہا۔

اس حدیث سے چند اہم باتیں مستنبط ہو رہی ہیں۔ اول: یہ کہ کدو کا سالن شوربے کی قسم کا تھا۔ اور اسلامی تعلیمات کے مطابق سالن میں پانی زیادہ ڈالنا مستحب ہے۔ تاکہ پڑوسیوں اور دیگر اصحابِ ضرورت کا حصہ بھی ہو سکے۔ دوم: یہ کہ کھانا اکٹھا کھانا مستحب ہے۔ جس طرح کہ یہاں معلوم رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ کھانے میں متعدد افراد شریک تھے۔ سوم: یہ کہ شیخ و مرشد اور استاد و بزرگ کی عزت و اکرام کے لئے ایثار کر کے اس کی پسندیدہ چیز اسے کھانے دی جائے۔ اور اس کے ساتھ عقیدت و محبت کا

---

(۱) دارمی ۱۰۱/۲، شرح السنة للبغوی ۳۰۵/۱۱ کتاب الاطعمة، جامع الترمذی ۶/۲ ابواب الاطعمة باب المرق والدباء (مختار)

مظاہرہ کرنا چاہیے۔ چہارم: یہ کہ نبی کریم ﷺ کو کدو بہت پسند تھا۔ اور یہ بات بہت اہم ہے جو اس حدیث سے بخوبی ظاہر ہو رہی ہے۔

کدو سے آپ ﷺ کی محبت کی ایک وجہ تو اس میں موجود بہت سے طبی فوائد ہیں۔ چنانچہ بقول اطباء اس میں برودت ہے اور عقل اور دماغی قوتوں میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ علاوہ ازیں کدو کا پودا وہی پودا ہے جس نے حضرت یونس علیہ السلام کو اس وقت گرمی اور سردی سے بچانے کے لیے اپنی آغوش میں جگہ دی۔ جب پہلے پہل مچھلی کے پیٹ سے آپ نکلے۔ گویا کہ وہ حضرت یونسؑ کی ماں کے مرتبہ میں ہے۔ اور یونسؑ اور آپ ﷺ میں اخوت کا رشتہ ہے۔ انہی وجوہ کی بناء پر نبی کریم ﷺ نے کدو کو بنظر محبت دیکھا تھا۔

محبوب کی ہر اداء سے محبت: پھر جن لوگوں کا نبی کریم ﷺ سے عشق کا تعلق ہے وہ لوگ بھی ہر دور میں کدو سے ایک محبوب جیسا معاملہ کرتے ہیں۔ خود حضرت انسؓ جب بصرہ میں مقیم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑی جائیداد باغات اور زمینیں دی تھیں۔ آپ کدو بڑے اہتمام کے ساتھ کاشت کرتے تھے۔ اور پھر کدو کے پودے کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کیا کرتے تھے۔

یالک من شجرة ما احبّک إلیّ لحبّ رسول اللّٰہ ﷺ ایاکِ(۱)۔

ترجمہ: اے پودے تو نبی کریم ﷺ کی محبوبیت کی وجہ سے مجھے کتنا عزیز ہے۔

یہ اتباع سنت، عشق نبوی ﷺ اور حقیقی محبت کی دنیا ہے۔ عقل و خرد کے دعویدار تو علامات، یادگاروں اور نسبتوں کے قائل نہیں۔ لیکن یہ خشک مزاج اور قشر پرست فلسفی کیا جانیں کہ عشق کیا ہوتا ہے۔ اور محبوب کی طرف منسوب حقیر ترین چیز بھی عاشق کو کیوں عزیز ہوتی ہے۔ مجنون لیلیٰ کی گلی میں کتے کے پاؤں کو چومتا ہے اور فرہاد کو دودھ کی نہر نکالنے کی کیوں سوجھی۔ ع

عاشقاں را مذہب و ملت جدا است

کدو کی تحقیر کی سزا: ہارون الرشید بڑے جاہ وجلال کے بادشاہ تھے۔ کسی نے دربار میں ایک حدیث پیش کی کہ نبی کریم ﷺ کو کدو بہت پسند تھا۔ درباریوں میں سے ایک بدماغ نے تیوری چڑھائی

(۱) جامع ترمذی ۲/۶ ابواب الاطعمة باب ماجاء فی اکل الدبآء (مختار)

بولا کہ کدو بھی کوئی چیز ہے یہ تو بالکل بے مزہ چیز ہے۔ حدیث کے مقابلے میں اس بد بخت کا یہ قول سنتے ہی حضرت امام ابو یوسفؒ نے جو دربار میں موجود تھے۔ فرمایا "النطع و السیف" یعنی تلوار اور وہ کھال جسے بچھا کر دربار میں قتل کیا جاتا ہے لے آؤ۔

<u>آزادئ عدلیہ کی ایک مثال:</u> عدالت اور عدلیہ کی آزادی اسی کا نام ہے۔ جس کی مثال اسلامی حکومتیں صدیوں تک پیش کر چکی ہیں۔ اور وہی حقیقی چیف جسٹس ہوتا ہے جس کے سامنے ساری انتظامیہ ہیچ تھی۔ خلیفہ وقت بھی عدالت کے سامنے جواب دہ ہوتا تھا۔ حضرت علیؓ، قاضی شریحؒ کی عدالت میں ایک مقدمہ کے سلسلے میں حاضر ہوئے۔ قاضی صاحبؒ کو اسے اپنے پاس بٹھانا چاہئے تھا۔ لیکن وہ تو کجا جب قاضی شریحؒ نے اکراماً کنیت سے خطاب کرتے ہوئے یا ابا الحسن کہا۔ تو آپؓ کا رنگ فق ہو گیا۔ اور اگرچہ مقدمہ اقلیت کے ایک فرد اور ایک یہودی کے ساتھ تھا۔ لیکن عدالت کی نظر میں جب وہ اسلامی حکومت کا شہری ہے تو اس میں اور دوسرے مسلمان میں کوئی تمیز نہیں۔ خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہب اور کسی بھی قوم سے ہو۔

بہر حال عدالت نے فیصلہ یہودی کے حق میں دیا۔ لیکن عدالت برخاست ہونے کے بعد ہی قاضی شریحؒ نے حضرت علیؓ کو اپنے پاس بٹھایا۔ عزت و اکرام سے نوازا۔ اور پوچھا کہ جب عدالت میں میں نے آپؓ مخاطب کیا تو آپ کا رنگ کیوں متغیر ہوا۔ شاید اس لئے کہ ایک یہودی کے ساتھ آپ عدالت کے کٹھرے میں کھڑے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ نہیں۔ بلکہ جب تم نے مجھے کنیت سے پکارا تو مجھے یہ خوف ہوا کہ یہودی کو اس سے تکلیف ہوئی ہوگی۔ اس کے دل میں یہ بات آگئی ہوگی کہ اسلام کے نظام عدل میں یہ عیب ہے کہ اپنوں کو معزز نام سے پکارا جاتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ تم مجھے علی کہہ کر پکارتے۔

بہر حال حضرت امام ابو یوسفؒ نے فیصلہ دیا کہ اس شخص کو بھرے دربار میں قتل کیا جائے کیونکہ اس نے حضور ﷺ کی حدیث کے مقابلے میں ناک بھوں چڑھائی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ کفر کی حد میں پہنچ گیا ہے۔ مگر بعد میں توبہ سے اس کی جان بخشی ہوئی۔

(۱۰) حدّثنا قتيبة بن سعيد ثنا حفص بن غياث عن إسماعيل بن أبي خالد عن حكيم بن جابر عن أبيه قال دخلت على النبيّ ﷺ فرأيت

عـنـده دبـاء يقطع فقلت ماهذا قال نكثربه طعامنا (۱) قال ابو عيسىٰ و جـابـر هـذا هـو جـابـر بـن طـارق و يقال ابن أبی طارق وهو رجل من أصـحـاب رسـول اللهﷺ ولا يعرف له إلاّ هذا الحديث الواحد و أبو خالد اسمه سعد.

ترجمہ: جابر بن الطارقؓ سے روایت ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں کدو کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کئے جا رہے تھے۔ میں نے عرض کیا۔ یہ کیا ہے؟ فرمایا اس طرح ہم اپنے سالن میں اضافہ کرتے ہیں۔

امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ جابر جو یہاں مذکور ہے۔ وہ جابر بن الطارقؓ ہیں۔ اور کبھی جابر بن ابی الطارق بھی بولا جاتا ہے۔ وہ صحابہ میں سے ہیں۔ اور صرف یہی ایک حدیث ہی ان کی معروف ہے۔ نیز (اسماعیل کے والد) ابوخالد کا نام سعدؓ ہے۔

حکیم بن جابر الخ جابر بن الطارق صحابی ہیں۔ کبھی دادا کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ تو جابر بن ابی الطارق بھی کہا جاتا ہے۔ ابی الطارق کا نام نافق ہے۔ جابرؓ احمسی صحابی ہیں۔ ان کا کچھ تعارف امام ترمذیؒ اسلئے کرتے ہیں کہ عموماً جابر کا ذکر ہو تو مشہور صحابی حضرت جابر بن عبداللہؓ مراد لئے جاتے ہیں۔ جو یہاں مراد نہیں۔ جابر بن الطارقؓ کے بیٹے حکیم تابعی ہیں جو ۸۶ھ میں اور ایک قول کے مطابق ۹۲ھ میں وفات پائے۔

فرأيت عنده الدباء يقطع یعنی میں نے دیکھا کہ سالن کی تیاری ہو رہی ہے۔ لیکن خلاف معمول کدو کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹا جاتا ہے۔ اور جب میں نے عرض کیا کہ کدو کو اتنا چھوٹا کیوں کاٹا جا رہا ہے۔ تو جواب ملا۔ نكثربه طعامنا یعنی سالن میں زیادتی کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ اور سالن مقدار سے قدرے زیادہ ہو تو بہتر ہے۔ کیونکہ اگر کبھی اچانک مسافر، مہمان یا فقیر مسکین آجائے تو ان کا کام بھی چل جاتا ہے۔ نیز پڑوسیوں کو بھی اس میں سے حصہ دیا جا سکتا ہے۔ الحدیث اس لفظ کو مرفوع اور

(۱) السنن الكبرىٰ للنسائی ۱۵۶/۴ كتاب الوليمة ابواب الاطعمة باب تكثير الطعام بالقرع، سنن ابن ماجة ص۲۳۷ كتاب الاطعمة باب الدباء، شرح السنة للبغوی ۳۰۵/۱۱ كتاب الاطعمة، باب المرق و الدباء (مختار)

منصوب دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔ کیونکہ یُعرَفُ مجہول کا صیغہ اور نَعرِفُ اور نَعْرِفُ معروف کے صیغے تینوں میں جائز ہیں۔ مؤخر الذکر صورت میں فاعل کا ضمیر راوی کی طرف راجح ہوگا اور الحدیث مفعول بہ منصوب ہوگا۔

(۱۱) حدّثنا قتيبة بن سعيد عن مالك ابن انس عن اسحاق بن عبدالله بن أبي طلحة انه سمع أنس بن مالك يقول إنّ خيّاطاً دعا رسول الله ﷺ لطعام صنعه فقال أنس فذهبت مع رسول الله ﷺ إلىٰ ذلك الطعام فقرب إلىٰ رسول الله ﷺ خبزا من شعير و مرقافيه دباء و قديد قال انس فرأيت النبيّ ﷺ يتتبع الدباء حوالى الصحفة فلم ازل أحبّ الدباء من يومئذ(۱).

غریبوں اور پیشہ وروں کی عزت

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک درزی نے نبی کریم ﷺ کو کھانے پر بلایا۔ جو اس نے (آپ ﷺ کے لیے) تیار کیا تھا۔ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ میں بھی نبی کریم ﷺ کے ہمراہ اس کھانے کے لیے گیا۔ نبی کریم ﷺ کے لیے جو کی روٹی اور شوربہ پیش کیا گیا۔ جس میں کدو اور گوشت کے ٹکڑے تھے۔ تب میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا۔ کہ شوربہ کے برتن کے ہر طرف سے کدو کے ٹکڑے تلاش کر کے کھا رہے ہیں۔ اس دن سے لے کر ہمیشہ مجھے کدو محبوب رہا۔

انّ خيّاطا الخ بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ یہ شخص نبی کریم ﷺ کے غلام تھے۔ اس سے یہ پتہ بھی چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ پیشوں اور دنیوی امتیازات کا لحاظ کئے بغیر ہر چاہنے والے کی دعوت قبول فرماتے تھے۔ کیونکہ اسلام میں جائز پیشوں میں سے کسی پیشے کی وجہ سے تحقیر جائز نہیں۔ نیز اس پر بھی تنبیہ ہے کہ امیروں کی دعوت قبول کرنے کے ساتھ ساتھ غریبوں کا لحاظ بھی ہونا چاہئے۔ اور موچیوں اور درزیوں

(۱) صحيح بخاري ۱/۲۸۱ كتاب البيوع باب الخياط، صحيح مسلم ۱/۱۸۰ كتاب الأشربة باب جواز الأكل السرق الخ سنن ابى داؤد ۲/۱۷۳ كتاب الأطعمة باب فى أكل الدباء، جامع ترمذى ۲/۶ كتاب الأطعمة باب ماجاء فى أكل الدباء (مختار)

وغیرہ کی دعوت سے احتراز کرنا ٹھیک نہیں۔ ذھبت معہ چونکہ حضرت انسؓ نبی کریم ﷺ کے خاص خادم تھے۔اس لئے ساتھ تشریف لے گئے۔اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ خادم خاص اتباع میں شمار ہوتا ہے جیسے آج کل بھی کوئی معزز شخص اپنے سیکرٹری یا کسی خاص شاگرد کو اپنے ساتھ لے جاسکتا ہے۔اگر چہ اس کو دعوت نہ بھی دی ہو کیونکہ عرفاً اس کی اجازت ہوتی ہے۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ دعوت دینے والے نے حضرت انسؓ کو بھی دعوت دی ہو۔ کیونکہ ان کو پتہ ہوگا کہ نبی کریم ﷺ کی خصوصی خدمت کے لیے حضرت انسؓ ہی زیادہ مناسب ہیں۔ مرقافیہ دباء و قدید یعنی اس سالن میں کدو اور گوشت کے تراشے پکائے گئے تھے۔قد کے معنی طولاً کاٹنے کے ہیں۔اس لئے قدید کے معنی مقدد یعنی طولاً کٹے ہوئے گوشت کے ٹکڑے ہونگے۔جو کہ عموماً نمک لگا کر دھوپ میں سکھانے کے لیے رکھ دیئے جاتے ہیں۔حدیث کے اسی حصے میں ترجمۃ الباب سے مطابقت واضح ہے۔تتبع الدباء یعنی نبی کریم ﷺ برتن کے مختلف اطراف سے کدو کے ٹکڑے تلاش کرتے رہے۔

<u>ایک اشکال اور جواب:</u> اب ایک اشکال یہ ہے کہ کھانے کے آداب کے سلسلے میں خود نبی کریم ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ کل مما یلیک یعنی اپنے سامنے سے کھاؤ۔جبکہ یہاں خود نبی کریم ﷺ کا عمل اس کے خلاف ہے۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس مقام پر نبی کریم ﷺ مہمانِ خصوصی ہیں۔یہ سارا کاسۂ طعام انہی کے لیے تو رکھا گیا ہے۔نیز آپ کے اس طرح بلا تکلف کھانے سے میزبان کو مزید مسرت اور اس کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔لہٰذا اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ مہمان کی بے تکلفی عرف میں میزبان پر احسان ہوتا ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ اپنے سامنے سے کھانے کے حکم میں راز یہ ہے کہ کبھی دوسروں کے کھائے ہوئے کھانے سے طبعی طور پر کراہت ہوتی ہے۔اس لیے دوسروں کے آگے سے کھانے سے منع کیا گیا ہے۔لیکن یہ علت نبی کریم ﷺ کے جھوٹے (سور) میں بالکل مفقود ہے۔بلکہ اسے ہمیشہ محبوب اور باعث برکت وشفا تصور کیا گیا ہے۔علاوہ ازیں کبھی کبھی دوسروں کے آگے سے کھانے میں دوسرے شرکائے طعام یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ شخص زیادہ کیوں کھاتا ہے جو کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر چیزیں کھاتا ہے۔لیکن استاد، مرشد اور پیغمبر کے اس قسم کے عمل سے عموماً ہر شریک طعام کو مسرت ہوتی ہے۔لہٰذا ہمارے لئے تو اس طرح کی تلاش ٹھیک

نہیں جبکہ نبی کریم ﷺ کے اس عمل میں کوئی حرج نہیں۔

صحفۃ: صحفۃ اس برتن کو کہتے ہیں جس میں پانچ آدمیوں کا کھانا رکھا جاسکے۔ بعض نسخوں میں قصعہ کا لفظ آیا ہے جس میں دس آدمیوں کے لیے پیٹ بھر کر کھانے کے لیے کوئی چیز رکھی جاسکتی ہے۔

فلم ازل أحبّ الدباء من یومئذ. محبوب کی ہر ادا پسند ہوتی ہے۔ یہی محبت کا تقاضا اور حقیقی محبت کی دلیل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ نے مصلحتوں، معاشرتی اقدار اور رواجی پابندیوں کو بالائے طاق رکھ کر حضور ﷺ کی سنتوں کو محبوب رکھا۔ کاش ہمیں بھی حقیقی محبت کی لذت آشنائی نصیب ہوتی۔

حضور ﷺ کی میٹھی چیز سے محبت:

(۱۲) حدّثنا أحمد بن إبراهيم الدورقيّ و سلمة بن شبيب و محمود بن غيلان قالوا أنا أبو أسامة عن هشام بن عروة عن أبيه عن عائشة قالت كان النبيّ ﷺ يحبّ الحلواء و العسل(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو میٹھی چیز اور شہد پسند تھا۔

حلوا سے کیا مراد ہے:

یحبّ الحلواء و العسل حلوا سے مراد ہمارے ہاں کا معروف حلوا نہیں ہے۔ بلکہ ہر وہ کھانا ہے جس کو میٹھا بنانے میں انسانی صنعت اور کاریگری کا دخل ہو۔ اس تشریح کے مطابق شہد حلوا نہیں ہے اور عطف بلاشبہ درست ہوگا۔

جبکہ بہت سے شراح نے حلوا کی تشریح "کل مافیہ حلاوۃ" سے کی ہے یعنی ہر وہ چیز جو میٹھی ہو۔ حلوا ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری ۲/۸۱۶ کتاب الأطمة باب الحلواء و العسل، صحیح مسلم ۱/۴۷۸ کتاب الطلاق باب وجوب الكفارة على من حرّم إمرته، سنن ابی داؤد ۲/۱۶۶ کتاب الأشربة باب فی شرب العسل، جامع ترمذی ۲/۵ کتاب الأطعمة باب ماجاء فی حب النبیّ ﷺ الحلواء و العسل، ابن ماجة ۲/۵ کتاب الأطعمة باب الحلواء(مختار)

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص تندرست، معتدِل القویٰ اور توانا ہو۔فطری طور پر اس کا دل عام کھانے کے بعد میٹھی چیز کو چاہتا ہے۔لہٰذا یہ نبی کریم ﷺ کے حسنِ صحت، اعتدال قویٰ اور صحیح المزاج ہونے کی دلیل ہے۔ کیونکہ کھٹی اور کڑوی چیزیں فاسد اخلاط کے لوگوں کو مرغوب ہوتی ہیں۔

نبی کریم ﷺ شیرین اشیاء کو پسند فرماتے تھے۔لیکن یہ رغبت کثرت تشہی کی وجہ سے نہ تھی۔نہ ہر وقت میٹھی چیزوں کی خواہش ستاتی رہتی۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ فطرت سلیمہ میٹھی چیزوں کی طرف راغب تھی۔ اور یہ بات زہد وتقویٰ کے منافی بھی نہیں ہے کہ کسی کا دل میٹھی چیزوں یا دوسرے اعلیٰ کھانوں کو پسند کرے۔ وہ بزرگ ولی اور پیغمبر بھی ہوسکتا ہے۔

ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ مذکورہ معنی کو لے کر شہد بھی حلواء کے ضمن میں آتا ہے۔لیکن چونکہ یہ خصوصی اور بہت اہم میٹھی چیز ہے بلکہ تمام شیرینیوں کا سرچشمہ ہے۔ان حلاوتوں کے برعکس جن میں انسان کی صنعت کو دخل ہوتا ہے۔یہ اعلیٰ قسم کی مٹھاس خود اللہ تعالیٰ اور اس کی قدرتِ کاملہ کی صنعت کا مظہر ہے۔ علاوہ ازیں قرآن مجید نے "فیه شفاء للناس (الایة) " کا عظیم مرتبہ اسی حلاوت کو دیا ہے۔اس لئے راوی نے اسے بطور خاص ذکر کیا۔اور یہ عطف الخاص علی العام للاهتمام کے قبیلہ سے ہوگا۔

(۱۳) حدّثنا الحسن بن محمّد الزعفرانی أنا حجّاج بن محمّد قال قال ابن جریج أخبرنی محمّد بن یوسف أنّ عطاء بن یسار أخبره أنّ امّ سلمة أخبرته أنّها قربت إلیٰ رسول اللّٰه ﷺ جنبا مشویّاً فاکل منه ثمّ قام إلیٰ الصلٰوة و ما توضّأ(۱).

ترجمہ: ام المومنین حضرت ام سلمہ کہتی ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو بھنا ہوا پہلو کا گوشت پیش کیا۔آپ ﷺ نے تناول فرمایا پھر آپ ﷺ نماز پڑھنے کے لیے اٹھے۔اور وضوء کی تجدید نہیں کی۔

---

(۱)جامع ترمذی ۲/۵ کتاب الأطعمة باب ماجاء فی اکل الشواء، السنن الکبریٰ للبیهقی ۱/۱۵۴ کتاب الطهارة، شرح السنة للبغوی ۱۱/۲۹۲ کتاب الأطعمة باب اکل الشواء (مختار)

فطرت انسانی اور گوشت خوری: جنبا مشویاً بغل سے نیچے پہلو کو جب کہتے ہیں۔ یہاں پر پسلیاں اور اس کا گوشت مراد ہے۔ جسے بھون کر حضرت ام سلمہؓ نے آپﷺ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اور آپﷺ نے کھایا تھا۔ امام ترمذیؒ اس پر تنبیہ فرماتے ہیں کہ آپﷺ نے گوشت کو بطور ادام تناول فرمایا تھا۔ اور گوشت کھانا فطرت انسانی کی صحت وسلامت کی دلیل ہے۔ کم فہم اور کج فطرت لوگ ہی اس سے انکار کر سکتے ہیں۔ ایک حدیث میں گوشت کو "سیّد طعام اهل الجنة" اور ایک اور روایت میں "سیّد طعام اهل الدنیا و الآخرة" کہا گیا ہے(۱)۔ اور اس کے کھانے میں بہت سے طبی فوائد اور حکمتیں ہیں۔ جس پر ہم ان شاء اللہ آگے بحث کریں گے۔ البتہ گوشت کا بہت زیادہ استعمال کبھی کبھی امراض کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ اس لیے حکیم بقراط کا قول ہے کہ "لا تجعلوا بطونکم مقابر للحیوان (۲)" یعنی پیٹ کو حیوانات کا مقبرہ نہ بناؤ۔

وضوء ممامست النار: ماتوضّأ یعنی آگ پر پکی ہوئی چیز کھا کر بھی آپﷺ نے وضو کی تجدید نہیں کی (۳)۔ جس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ "مامسته النار" کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اور یہی خلفائے راشدین، ائمہ اربعہ اور جمہور علماء کا مسلک ہے (۴)۔ اور وہ احادیث جن سے آگ پر پختہ چیزیں

(۱) وقد روی ابن ماجة وغیره بسند ضعیف اللحم سیدالطعام لاهل الدنیا والاخرة وله شواهد علی سیدطعام اهل الدنیا اللحم والارز(جمع الوسائل ومناوی ج ا ص۲۵۷)(مختار)

(۲) المواهب لدنیه ص۱۲۵

(۳) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے قال المصنف حدیث صحیح فیکون ناسخاً لحدیث توضؤا ممامسته النار(جمع الوسائل ۱/۲۵۸) (مختار)

(۴) قال العلامه البنوریؒ ذهب جمهور الصحابة والتابعین والائمة الاربعة إلی عدم وجوب الوضوء ممامسته النار وروی مالک فی مؤطانه ذلک عن الخلفاء الاربعة الراشدین وکان فیه خلاف فی الصدر الاول ثم استقر الإجماع علی عدم الوضوء منه حکاه فی فتح الباری عن النووی. ویقول الشاه ولی اللّٰه فی شرحه علی المؤطا المسویٰ والمصفیٰ(۱/۳۷)عامة اهل العلم علی أن الوضوء ممامسته النار منسوخ(معارف السنن ۱/۲۸۷) قال ایضاً الخطابی فی معالم السنن (۱/۶۹) أحادیث الأمر محمول علی الاستحباب لاالوجوب وحکاه الحافظ فی الفتح ایضاوالأولیٰ أن یقال إنّه مستحب لخواص(معارف السنن ۱/۲۸۷)(مختار)

کھانے کے بعد وضوء ثابت ہورہا ہے یا تو منسوخ ہیں کیونکہ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا وضوء نہ کرنا آخرالامرین ہے۔اور یا وہاں وضوء لغوی یعنی ہاتھ منہ دھونا مراد ہے۔

(۱۴) حدثنا قتیبة ثنا ابن لهيعة عن سليمان بن زياد عن عبدالله ابن الحارث قال اكلنا مع رسول الله ﷺ شواء فی المسجد (۱).

ترجمہ: عبداللہ بن الحارثؓ سے روایت ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بھنا ہوا گوشت مسجد میں کھایا۔

عبدالله بن الحارثؓ: بظاہر حضرت عبداللہ بن الحارث بن الجزء الزبیدیؓ مراد ہے جو ۸۶ھ میں وفات پائے۔اور مصر میں وفات پانے والے صحابہ میں آخری صحابی ہیں۔

اکلنا مع رسول الله ﷺ شواء شواء آگ کے ذریعے بھنے ہوئے گوشت کو کہتے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق یہاں پر گوشت کے ساتھ روٹی بھی حاضر تھی۔لہٰذا اس سے گوشت کا ادام ہونا ثابت کیا جارہا ہے۔

مسجد میں کھانے کا مسئلہ: فی المسجد حتی الوسع بلاضرورت مسجد میں کھانا کھانے سے احتراز کرنا چاہیے۔کیونکہ اس سے مسجد کے تلوث کے ساتھ ساتھ عبادت میں خلل کا خطرہ ہوتا ہے۔ہاں اگر ضرورت ہو تو جائز ہے۔لیکن چونکہ نبی کریم ﷺ کیلئے تو مسجد ہی مہمان خانہ، دربار، پارلیمنٹ، عدالت اور عبادت خانہ سب کچھ تھا۔اس لئے آپ ﷺ نے مسجد میں مہمانوں کو کھانا کھلایا ہوگا۔اور ایسی صورت میں بلاشبہ مسجد میں کھانا جائز ہے۔البتہ مسجد کو بچانے کیلئے دسترخوان وغیرہ کا بندوبست ہونا چاہیے۔اور چونکہ یہاں صرف گوشت کھلایا گیا ہے۔اس لئے مسجد کے خراب ہونے کا اندیشہ ویسے بھی نہیں ہے۔دوسری بات یہ کہ ممکن ہے کہ نبی کریم ﷺ اعتکاف میں ہوں۔پھر تو مسجد ہی میں کھانا پڑتا ہے۔جبکہ بعض علماء کا خیال ہے کہ

---

(۱)سنن ابن ماجة ص۲۳۸ابواب الاطعمة باب الشواء، شرح السنة للبغوی ۱۱/۲۹۳ كتاب الاطعمة (مختار)

نبی کریم ﷺ نے یہاں صرف بیان جواز کیلئے ایسا کیا ہوگا(۱)۔

(۱۵) حدثنا محمود بن غیلان أنبا نا وکیع ثنا مشعر عن أبی صخرة جامع بن شدّاد عن المغیرة بن عبداللّٰہ عن المغیرة بن شعبة قال ضِفتُ مع رسول اللّٰہ ﷺ ذات لیلة فاتی بجنب مشویٍّ ثمّ اخذ الشفرة فجعل یحزّلی بها منه قال فجاء بلال یؤذنه بالصلٰوة فالقیٰ الشفرة فقال ما له تربت یداه قال و کان شاربه قدوفیٰ فقال له اقصّه لک علی سواک او قصّه علی سواک(۲).

ترجمہ: حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کہتے ہیں۔کہ ایک رات میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ مہمان ہوا۔تو کھانے کیلئے بھنا ہوا پہلو کا گوشت لایا گیا۔جس کے بعد نبی کریم ﷺ نے چھری اٹھائی۔اور مجھے دینے کیلئے اس میں سے (گوشت) کاٹنا شروع کیا۔اسی دوران بلالؓ نے آکر نماز کی تیاری کی اطلاع دی۔آپ ﷺ نے (نماز پڑھنے کے لیے) چھری رکھ دی۔اور فرمایا کہ بلال کو کیا ہوگیا؟ اس کے دونوں ہاتھ خاک آلود ہوں (حضرت مغیرہؓ نے) فرمایا اور ایسا ہوا کہ اس کے مونچھوں کے بال بڑھے ہوئے تھے۔تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ لاؤ مسواک پر رکھ کر میں اسے کتر دوں۔یا یہ کہا کہ مسواک پر رکھ کر خود اسے کتر دو۔

---

(۱) ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے فیه دلیل الجواز اکل الطعام فی المسجد جماعةً وفرادیٰ ومحله ان لم یحصل مایقذر المسجد والّا فیکره، اویحرم ویمکن اکلهم علی زمن الاعتکاف فلایرد انّ الاکل فی المسجد خلاف الاولیٰ(جمع الوسائل ۱/۲۵۸) اور علامہ مناویؒ نے لکھا ہے فیه دلیل لجواز الأکل فی المسجد جماعة وفرادیٰ بشرط امن التقذیر والاحرام(المناوی علی هامش جمع الوسائل ۱/۲۵۸) مطلب یہ ہے کہ مسجد میں کھانا بلاضرورت کراہت سے خالی نہیں کماقال الشامی ویکره..أکل ونوم إلّاللمتعکف وغریب(شامی ۱/) مگر اس میں بھی اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ مسجد میں کھانے کے ریزے گر کر مسجد خراب نہ ہوجائے۔بہتر یہ ہے کہ دسترخوان بچھا کر کھایا جائے۔اس سے مسجد کا فرش خراب اور گندہ ہونے سے بچ جائے گا(مختار)

(۲) سنن ابی داؤد ۱/۲۸ کتاب الطهارة باب فی ترک الوضؤ ممامست النار ، شرح السنة للبغوی ۱۱/۲۸۴ کتاب الأطعمة باب أکل الشواء(مختار)

ضِفتُ مع رسول اللہ ﷺ بعض علماء کے نزدیک یہاں پر ''مع'' کا لفظ زائد یا ''عند'' کے معنی پر ہے۔اور مطلب یہ ہے کہ میں آپ ﷺ کے ہاں مہمان ٹھہرا۔علامہ ابن حجر عسقلانیؒ کہتے ہیں کہ ام المومنین حضرت میمونہؓ کے حجرے میں حضرت مغیرہؓ مہمان بن کر آپ ﷺ کے پاس آئے تھے۔اور بعض لوگ یہ مطلب لیتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو اپنے ہاں مہمان بنایا۔لیکن اس توجیہ کو ملا علی قاریؒ،علامہ مناویؒ اور علامہ بیجوریؒ نے رد کر دیا ہے۔تیسرا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ میں اور نبی کریم ﷺ دونوں کسی اور کے ہاں مہمان بنے۔محدث قاضی اسماعیل نے اس توجیہ کو ترجیح دی ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک صحابیہ حضرت ضباعتہ بنت الزبیر نے یہ دعوت کی تھی۔یہ زبیر بن الحارث بن عبدالمطلب کی بیٹی اور نبی کریم ﷺ کی چچا زاد بہن لگتی تھیں۔

گوشت چھری سے کاٹ کر کھانے کا مسئلہ روایات میں تطبیق: فجعل یحتز معلوم ہوتا ہے کہ سالم جانور کو بھون کر اس دعوت میں پیش کیا گیا تھا۔بعض علاقوں میں میزبان لوگ مہمان کے آگے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے رکھ دیتے ہیں۔عرب کے بعض علاقوں میں آج کل بھی اس قسم کا رواج پایا جاتا ہے۔کہ سالم جانور کو پکا کر کھانے کیلئے رکھ دیتے ہیں۔اور اس کا گوشت کاٹ کاٹ کر کھایا جاتا ہے۔بہر حال اس موقع پر بھی آپ ﷺ کی خدمت میں گوشت کا کوئی بڑا ٹکڑا پیش کیا گیا جو سالم اٹھانے کا نہ تھا۔اس لئے آپ ﷺ اس کو چھری سے کاٹ کر کھانے لگے۔اور صحابہ کرام کو دینے لگے۔لیکن یہاں ایک اشکال ہے۔وہ یہ کہ حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث ہے کہ **لاتقطعوا اللحم بالسکین فانّہ من صنیع الاعاجم. وانھشوہ فانّہ أھنا و امرا**(۱)۔

ترجمہ: چھری کے ذریعے گوشت کاٹ کر نہ کھاؤ۔کیونکہ ایسا کرنا عجمیوں کا کام ہے۔بلکہ دانتوں کے ساتھ کاٹ کر کھاؤ یہ میٹھا اور لذیذ ہوتا ہے۔

چنانچہ چھری کے ذریعے کاٹنے کو خود نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔تو آپ ﷺ کا عمل اس کے متضاد کیوں ہے۔اس اشکال کے متعدد جواب دیئے جاتے ہیں۔

---

(۱)ابوداؤد ج ۲ ص ۱۷۸

(۱) اولاً تو یہ حدیث ضعیف ہے۔ابو معشر راوی کی وجہ سے امام بیہقیؒ نے اس کی تضعیف کی ہے۔اس لئے حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث قطع بالسکین والی حدیث کا معارضہ نہیں کرسکتی۔ جسے امام ترمذیؒ کے علاوہ صحیحین میں بھی روایت کیا گیا ہے۔

(۲) بعض کے خیال میں مذکورہ حدیث حضرت عائشہؓ کی حدیث کیلئے ناسخ ہے۔چنانچہ اب ممانعت نہ ہوگی۔لیکن یہ توجیہ قوی نہیں۔کیونکہ نسخ کیلئے تاریخ کا علم اور منسوخ کا مقدم ہونا ضروری ہے۔دوسری یہ کہ **لاتقطعو اللحم** قولی حدیث ہے۔اور مذکورہ حدیث فعلی ہے۔قولی حدیث قوی اور راجح ہوتی ہے۔اس لئے یہ فعلی سے منسوخ نہیں ہوسکتی۔

(۳) بعض کے خیال میں یہ نبی کریم ﷺ کی خصوصیت ہے کہ ان کے لیے جائز ہے۔اور نہی امت کے لیے ہے۔لہٰذا امت کے لیے ناجائز ہے۔کیونکہ نبی کریم ﷺ میں تشبہ کا سرے سے احتمال نہیں ہے۔

(۴) چوتھا جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ عمل بیان جواز کے لیے کیا ہے۔اور تفصیل یوں ہوگی کہ بلاضرورت چھری کاٹنے سے کھانا ممنوع ہے۔اور اگر ضرورت ہو۔مثلاً ٹکڑا بڑا ہو، جیسے جانور کا سالم پاؤں ہو، جو اٹھایا نہ جاسکے۔یا مثلاً ٹکڑا ایک ہو جس کو ہاتھ میں اٹھانے سے دوسروں کو ضرر ہو۔تو اس میں چھری سے کاٹنے کی اجازت ہوگی۔

(۵) بعض کہتے ہیں کہ چھری کے ساتھ کاٹنے اور اس کے ساتھ کھانے میں فرق ہے منہ تک چھری کی مدد سے لے جانا چھری کے ساتھ کھانا ہوگا۔ جو ممنوع ہے۔اور حضرت عائشہؓ کی حدیث میں بھی وہی مراد ہوگا۔اعاجم کے ساتھ اسی میں تشبیہ ہے۔اور وہی ممنوع ہے جبکہ یہاں یہ صورت نہیں ہے۔ بلکہ ممکن ہے کہ آپ ﷺ چھری کے ساتھ کاٹ کر ہاتھ سے کھاتے رہے ہوں جو ممنوع نہیں۔

(۶) علامہ زمخشریؒ نے کشاف میں **یصنعون** اور **یعملون** کے درمیان میں فرق کا ذکر کیا ہے۔کہتے ہیں کہ **یصنعون** کا معنی یہ ہے کہ کوئی کسی کام کو عادت بنا کر ہمیشہ کرے۔اور **یعملون** کا اطلاق کبھی کبھار کرنے پر ہوتا ہے۔اس فرق کو مدنظر رکھ کر یہاں ایک اور جواب کا احتمال بھی ہے۔اور وہ یہ کہ نبی کریم ﷺ نے ''**من عمل الاعاجم**'' نہیں کہا بلکہ ''**من صنیع الاعاجم**'' کہا۔جس کا مطلب یہ ہے کہ اعاجم کا

یہ شعار ہے۔اور وہ ہمیشہ ایسا کرتے ہیں۔ان کا شعار اپنانا اور ہمیشہ ایسا کرنا بری بات ہے۔ جیسے آج کل انگریز بمت پذیر طبقہ لازماً کھڑے ہو کر اور چھری کانٹے سے کھانے کو تہذیب کہتے ہیں۔اور یہی ان کی صنع، معمول اور عادتِ مستمرہ ہے۔مسلمانوں کے لیے اس کو عادت بنا کر ان کا اتباع ممنوع ہے۔اور اگر کبھی کبھی بر بنائے ضرورت اس بات کی نوبت آجائے تو یہ عمل جائز ہوگا۔

یحز لی بھا منھا حز کا معنی ہے قطع یعنی کاٹا اس نے۔بعض نسخوں میں یحزُ (بالحاء) ہے اور جز کیطرح حزّ بھی کاٹنے کے معنی میں آتا ہے۔دونوں نصر کے باب سے ہیں۔نبی کریم ﷺ کا یہ عمل ایک طرف آپ ﷺ کی تواضع پر دلالت کرتا ہے۔دوسری طرف حضرت مغیرہؓ کی تالیفِ قلب اور تانیس بھی مدنظر ہوگی۔

حضرت بلال حبشیؓ: فجاء بلال ابوعبدالرحمن بلال بن رباح حبشی غلاموں میں سے پہلے اسلام لانے والے صحابی ہیں۔اسلام سے قبل مشرک مالک کے ہاتھوں سخت اذیتیں برداشت کیں۔ بعد میں ابوبکر صدیقؓ نے خرید کر آزاد کر دیا۔غزوہ بدر اور اس کے بعد کے تمام غزوات میں شریک رہے۔اذان کی خدمت آپؓ کے سپرد تھی۔ ۱۸ھ کو تریسٹھ (۶۳) سال کی عمر میں دمشق میں اور ایک قول کے مطابق داریا شام میں وفات پائی۔اور باب الصغیر دمشق میں دفن ہوئے۔

یؤذنہ یہاں افعال کے باب سے مستعمل ہے۔جو اعلام اور اخبار کے معنی میں آتا ہے۔اور اگر یؤذّنہ ہوتا تو پھر اعلام الصلوٰۃ کے معنی میں ہوتا۔اور بالصلوٰۃ ذکر ہونے کے بعد فعل میں تحریر ماننے۔تربت یداہ یہ جملہ بظاہر ایک قسم بددعا ہے۔جس کا معنی یہ ہے کہ اس کا ہاتھ غبار آلود ہو۔یعنی وہ مسکین وفقیر ہو جائے۔کیونکہ فقراء و مساکین کے ہاتھ کام کرنے کے سبب اور بالخصوص زمینوں اور مٹی میں کام کرنے کی وجہ سے غبار آلود رہتے ہیں۔لیکن اکثر ترحّم اور شفقت و محبت کے لیے بھی یہ جملہ مستعمل ہوتا ہے۔جس طرح کہ دوسری زبانوں میں بھی بددعا کے بعض جملے ترحم اور شفقت کے مواقع پر بولے جاتے ہیں۔بعض اوقات محض ملامت کے طور پر بھی یہ کلمہ استعمال ہوتا ہے(۱)۔

---

(۱) اسلئے علامہ جوادرومیؒ نے لکھا ہے جری علی السنۃ العرب لمجرد اللوم لا للدعوۃ علیہ(الاتحافات ۲۱۹)(مختار)

بلال کی دعوت نماز پر ناراضگی کے توجیہات: اب یہ اشکال پیدا ہوگا کہ حضرت بلالؓ نے تو نماز کی طرف بلایا ہے۔تو نبی کریم ﷺ کو اس پر اعتراض کیوں ہے۔اوران کو کیوں ملامت فرمارہے ہیں۔اس کا جواب یہ ہے کہ جیسے پہلے گزر چکا ہے کہ یہ جملہ بددعا، زجر وتوبیخ اور محبت وترحم تینوں مقاصد کے لیے بولا جاتا ہے۔لہٰذا اگر اس کلام کو محبت وترحم کی بجائے زجر وتوبیخ پر حمل کریں گے۔تو توجیہ یہ ہوگی کہ ابھی نماز کے لیے وقت باقی تھا۔لیکن بلالؓ نے نماز کی طرف بلایا۔جس طرح کہ ہمارے ہاں کی مساجد میں بعض اوقات کچھ مقتدی اس قسم کے بھی ہوتے ہیں۔جنہیں بہت جلدی ہوتی ہے۔اور ابھی وقت باقی ہوتا ہے کہ وہ امام کو جماعت کھڑی کرنے پر مجبور کرنا شروع کردیتے ہیں۔یا اس کی تاخیر اور سستی کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔حالانکہ بعض اوقات امام کا کوئی ضروری کام ہوتا ہے۔مثلاً وہ درس دینے میں مصروف ہے یا مہمانوں کے ساتھ بات کررہا ہوتا ہے۔بہر حال ایسے موقعوں پر مقتدیوں کو قدرے صبر وتحمل سے کام لینا چاہیے۔دو چار منٹ کی تاخیر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔تو شاید یہاں بھی ایسا ہی ہو کہ نبی کریم ﷺ کا خیال ہے کہ ادھر میزبان نے کتنی محبت اور محنت سے دعوت کا انتظام کیا ہے۔مہمان ابھی کھارہے ہیں۔اور میزبان ابھی مزید تسلی سے کھلانا چاہتا ہے۔جماعت میں ابھی وقت باقی ہے کہ حضرت بلالؓ آئے کہ جماعت کا وقت ہوگیا ہے۔اور یہ بات یقیناً نامناسب ہے۔اس لئے آپ ﷺ نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے یہ کلمات کہے۔لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ آپ ﷺ نے یہ کلمات زجر کے لیے استعمال نہ کئے ہوں۔بلکہ آپ ﷺ نے بطور محبت ومدح یہ قول کیا ہو کہ خدا بلال کا بھلا کرے کہ انہوں نے نماز کی طرف توجہ دلائی۔ورنہ ہم شاید غفلت میں رہ جاتے۔اور کھانے اور باتیں کرنے میں محو ہو کر نماز کو مؤخر کردیتے۔تو گویا آپ ﷺ نے اس کے اس عمل کی تحسین فرمائی۔

قصِ شوارب میں توجیہات: قال یعنی مغیرہ بن شعبہؓ نے کہا وکان شاربہ قدوفی: قال کی ضمیر مغیرہ بن شعبہؓ کو راجح ہو تو شاربہ کی ضمیر میں تین احتمال ہیں۔اول: یہ کہ خود حضرت مغیرہؓ اپنے آپ بیان کررہے ہیں اور اصل میں شاربی قدوفی (۱) تھا۔لیکن متکلم سے غائب کو التفات ہوا ہے۔دوم: یہ کہ ضمیر

(۱)وقع فی روایۃ ابی داؤد "وکان شاربی قد وفیٰ فقصہ لی علی سواک"(ابوداؤد ۱/۴۷ کتاب الطہارۃ باب ۷۴)(اصلاح الدین)

نبی کریم ﷺ کو راجح ہو یعنی نبی کریم ﷺ کی مونچیں قدرے لمبی ہوگئی تھیں۔ کبھی کبھی آپ ﷺ کو بھی موقع نہیں ملتا تھا۔ ورنہ نبی کریم ﷺ عموماً مونچیں کاٹا کرتے تھے۔ آپ ﷺ مونچیں قینچی سے کترواتے تھے۔ مونڈھتے نہ تھے۔ سوم: یہ کہ ضمیر حضرت بلالؓ کو راجع ہو۔ یعنی بلالؓ کی مونچیں بڑھی ہوئی تھی۔ اور نبی کریم ﷺ نے اسے مخاطب کر کے فرمایا کہ اقصــہ لک اب احتمال اول میں اشکال نہیں ہے۔ کیونکہ لک میں لام منفعت کے لیے ہیں۔ تو اقصّہ لک کا معنیٰ یہ ہوگا کہ لاؤ میں ٹھیک کر دوں تیری نفع کے لیے۔ اور اگر بلالؓ کو ضمیر راجع ہو تو بھی ترجمہ اسی طرح ہوگا اور اشکال نہیں ہوگا۔ لیکن خود نبی کریم ﷺ کو ضمیر راجع ہو تو یہ اشکال ہے کہ اقصّــہ لک کا کیا معنیٰ ہوگا۔ تو اس کی توجیہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا خیال تھا بلکہ یہ ایک حقیقت تھی کہ چونکہ صحابہؓ کو نبی کریم ﷺ کے بال محفوظ رکھنے کا شوق تھا جیسا کہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر نبی کریم ﷺ نے حلق کیا تو صحابہ نے بالوں کو آپس میں بانٹ دیا۔ تو گویا آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگ تو میرے بال نہیں چھوڑتے۔ آؤ تیرے لمبے بال کاٹ دوں۔ تم اسے اپنے پاس بطور تبرک محفوظ رکھ لو۔ تو اس صورت میں لام منفعت کیلئے درست ہے۔

<u>ایک اشکال اور اس کا جواب:</u> ایک اور اشکال یہاں یہ ہے کہ جب نماز کے لیے دعوت ہوئی اور نبی کریم ﷺ نے چھری رکھ کر کھانا بھی چھوڑ دیا۔ تو اس کے بعد فوراً نماز کے لیے جانا چاہیے تھا۔ مونچیں کاٹنے یا دوسرے کاموں کی وجہ سے نماز میں تاخیر ہو جاتی ہے تو یہ ناجائز ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ضروری تو نہیں کہ یہ عین اسی موقع کی بات ہو بلکہ یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ اس وقت نماز پڑھنے گئے ہوں۔ پھر نماز کے بعد یہ واقعہ ہوا ہو۔ گویا یہ محض ایک ضمنی بات تھی جو کہ صحابی نے درمیان میں بتلادی نہ یہ کہ عین اسی موقع پر نماز کے وقت میں یا اذان کے بعد نبی کریم ﷺ نے میرے، دوسرے صحابی یا اپنے بال کاٹنے کا کام بھی کیا۔

<u>مونچیں کترانا چاہیے یا مونڈھنا:</u> اس حدیث سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اس قسم کے لوگ پسند نہ تھے جو مونچھے بڑھا کر رکھتے تھے۔ مونچوں کو لینا تو آپ ﷺ نے

خصالِ فطرت اور سنن الانبیاء میں سے شمار کیا ہے(۱)۔ آپ ﷺ خود بھی نظافت کا بہت اہتمام فرماتے تھے اور صحابہ کو بھی میلا کچیلا رہنے سے منع فرماتے تھے۔

علی سواک یعنی کنگھی وغیرہ نہیں ہے۔ لاؤ مسواک کے ساتھ ٹھیک کردو۔ مطلب یہ ہے کہ مونچھوں کا بال کاٹتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے اس بات کا لحاظ کیا کہ کہیں بال کم یا زیادہ نہ لئے جائیں۔ اس لیے مسواک رکھ کر ان میں توازن قائم کرنے کیلئے مدد لی۔ جس طرح کہ کنگھی سے مدد لی جاتی ہے۔ مونچھوں کو قینچی کے ساتھ کترنا مسنون ہے۔ اور اتنا کترنا چاہیے کہ حلق کے قریب ہو۔ لیکن خود حلق یعنی مونچیں مونڈھنا مسنون نہیں۔ بعض علماء حلق یعنی مونڈھنے کی مسنونیت کے بھی قائل ہیں۔ لیکن اکثر علماء اس کی تصویب نہیں کرتے۔ امام مالکؒ نے تو مونڈھنے والے کی تادیب کا حکم دیا ہے۔ بلکہ اسے مثلہ قرار دیا ہے۔

یہاں ایک اور احتمال بھی ہے کہ قال کا ضمیر مغیرہ بن عبداللہؒ کو راجع ہو۔ اور وہ اپنے استاد مغیرہ ابن شعبہؓ کا بیان کرتے ہوں کہ میری مونچھیں بڑھی ہوئی تھیں۔ تو حضرت مغیرہؓ نے کہا کہ لاؤ میں ٹھیک کردوں۔ لیکن عموماً پہلی توجیہ کو ترجیح دی جاتی ہے۔

(۱۶) حدثنا واصل بن عبدالاعلیٰ ثنا محمّد بن فضیل عن أبی حیان التیمیّ عن أبی زرعة عن أبی هریرة قال اتی النبیُّ ﷺ بلحم فرفع الیه الذراع و کانت تعجبه فنهس منها(۲).

---

(۱)أخرجه الصحاح کلّها. وروی ابن حبان "ذکر لرسول اللهﷺ المجوس فقال إنّهم قوم یوفرون سبالهم ویحلقون لحاهم فخالفوهم....وفی خبر عند أحمد قصّوا سبا لکم ووفّر والحاکم لکن رایٰ الغزالی وغیره أنّه لا باس بترک اسبال اتباعا لعمر وغیره. (بیجوری ص ۱۲۷) وفی الدر المختار عن المجتبیٰ حلق الشارب سنة و قیل بدعة وفی الشامیة و القص منه سنة بالاجماع.(ج ۵ ص ۲۸۸) (اصلاح الدین)

(۲)صحیح بخاری ۱/۴۷۰ کتاب الانبیاء باب قول الله عزوجلّ ولقدارسلنا نوحاً إلی قومه، جامع ترمذی ۲/۵ کتاب الأطعمة باب ماجاء فی أیّ اللحم کان احبّ إلی رسول اللهﷺ، ابن ماجة ص ۲۴۵ کتاب الأطعمه باب احبّ اللحم(مختار)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں گوشت لایا گیا۔ پھر ان کو اگلے پاؤں کی پنڈلی کا گوشت پیش کیا گیا۔ جو ان کو پسند تھا۔ تو آپ ﷺ نے اسے دانتوں سے کاٹ کر تناول فرمایا۔

فرفع الیه الذراع جانور کی اگلی ٹانگ میں گھٹنے سے نیچے کے حصہ کو کہتے ہیں۔

<u>دانتوں سے گوشت کاٹ کر کھانا:</u> و کانت تعجبه نبی کریم ﷺ کو ذراع اس لئے پسند تھا کہ اس کا گوشت لذیذ ہوتا ہے۔ نیز یہ جلدی پک جاتا ہے۔ جیسے کہ آگے ایک اور حدیث میں بھی آتا ہے۔ بعض نسخوں میں یہاں یعجبه تذکیر کے صیغے سے مذکور ہے اور دونوں صحیح ہیں۔ اس لیے کہ اعضاء میں سے جو اعضاء بدن میں دو دو یعنی مکرر ہیں وہ سب مؤنث سماعی ہیں۔ لیکن ذراع اس ضابطے سے مستثنی ہے(۱) اور مذکر بھی استعمال ہوتا ہے۔ فنهش منها یعنی چھری سے نہیں بلکہ منہ لگا کر دانتوں سے گوشت کاٹ کر کھانے لگے۔ نہش سین اور شین دونوں کے ساتھ " اخذ باطراف الاسنان" یعنی دانتوں سے کاٹ کر کھانے کو کہتے ہیں گوشت میں یہ مسنون ہے(۲)۔

(۱۷) حدّثنا محمّد بن بشّارثنا أبو داؤد عن زهير يعني ابن محمّد عن أبي إسحاق عن سعد بن عياض عن ابن مسعود قال كان النّبيّ ﷺ يعجبه الذراع قال وسم في الذراع و كان يرى أنّ اليهود سمّوه(۳)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو ذراع کا گوشت پسند تھا۔ اور ذراع ہی میں آپ ﷺ کو زہر دیا گیا تھا۔ اور خیال یہ تھا کہ یہود نے آپ ﷺ کو زہر دیا تھا۔

---

(۱) اسی طرح ثدی بھی مذکر استعمال ہوتا ہے۔ کبھی کبھی مؤنث استعمال ہوتا ہے (کما صرح بہ النووی ۱/۳۵،۴۳) (مختار)

(۲) آج کل کے جدید سائنس نے بھی اس حکمت کی تائید کی ہے۔ اور کہا ہے کہ اس طرح کرنے سے معدہ کو تقویت ملتی ہے اور انسان بے شمار بیماریوں سے بچ جاتا ہے۔ (مختار)

(۳) سنن ابی داؤد ۲/۱۷۴ کتاب الاطعمة باب اکل اللحم، ابو داؤد الطیاسی ۳۸۸، البتہ مسند احمد میں کان النّبیّ ﷺ کی جگہ کان احب العراق آیا ہے۔ مسند عبداللہ ابن مسعود ۱/۶۵۰ (مختار)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہذلی صحابی ہیں۔ان کے والد بنو زہرہ کے حلیف تھے۔والدہ مسلمان ہوکر صحابیت کا شرف پا چکی ہیں۔آپ بھی سابقین اولین صحابہ میں سے ہیں۔آپ ہی کی ایک روایت کے مطابق آپ چھٹے مسلمان تھے۔آپؓ سے قبل صرف پانچ آدمی ایمان لائے تھے۔پہلے حبشہ اور پھر مدینہ کو ہجرت فرمائی۔بدر اور پھر اس کے بعد تمام غزوات میں بھی شرکت کی۔بدر میں ابو جہل زخمی ہو چکا تھا۔آپؓ نے جا کر اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔اور نبی کریم ﷺ کو خبر دی جس سے نبی کریم ﷺ انتہائی خوش ہوئے۔نبی کریم ﷺ کی ذاتی خدمت میں بھی پیش پیش تھے۔لہٰذا آپ کو صاحب السواک والنعلین والوسادۃ بھی کہا جاتا ہے۔حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ میں اور میرا بھائی جب یمن سے آئے تو عبداللہ ابن مسعودؓ اور ان کی والدہ کا بھی نبی کریم ﷺ کے ہاں کثرت سے آنا جانا دیکھ کر ایک طویل مدت تک یہی خیال رہا کہ یہ دونوں نبی کریم ﷺ کے گھر کے افراد ہیں۔ہجرت سے پہلے حضرت زبیرؓ اور ہجرت کے بعد حضرت سعد بن معاذؓ سے مواخات کا رشتہ نبی کریم ﷺ نے قائم کیا تھا۔

شام کی فتوحات میں بھی شریک رہے۔بعد میں حضرت عمرؓ نے آپؓ کو کوفہ میں معلم بنا کر بھیجا۔اور حضرت عثمانؓ نے آپ کو کوفہ کا امیر مقرر کر دیا۔پھر کچھ مدت کے بعد آپ کو معزول کر کے مدینہ طلب کیا۔کوفہ کے لوگوں نے ٹھہرنے کو کہا لیکن آپ نے اطاعت کا حق ادا کرتے ہوئے ان کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔۳۲ھ میں مدینہ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔خلفائے راشدین کے بعد آپؓ افقہ الصحابہؓ تھے۔اور احناف کے مذہب کا مدار زیادہ تر آپ ہی کے فقہ پر ہے۔کہتے ہیں کہ آپؓ نے غلاموں اور مویشیوں کے علاوہ نوے ہزار (90,000) دینار نقد ترکہ میں چھوڑے تھے۔آپ کے مناقب کے لیے کئی دفتر ناکافی ہیں۔رضی اللہ عنہ وعن الصحابۃ اجمعین۔

وسّم فی الذراع سُمّ مجہول کا صیغہ ہے اور نائب فاعل کا ضمیر نبی کریم ﷺ کو راجع ہے، معنی یہ کہ نبی کریم ﷺ کو ذراع میں زہر دیا گیا تھا۔اور یہ احتمال بھی ہے کہ اس کا نائب فاعل محذوف ہو۔اور تقدیر یوں ہو کہ وسُمّ فی الذراع یعنی اوقع السم فی الذراع معنی یہ ہوگا کہ زہر کو ذراع میں ملایا گیا تھا۔

زہر دینے والا کون؟ وکان یری انّ الیھود سمّوہ یُریٰ مجہول اور یَریٰ معلوم دونوں طرح

پڑھنا جائز ہے۔اور دونوں صورتوں میں یہ یظن معلوم کے معنی میں ہے۔ضمیر حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کو راجع ہے۔معنی یہ ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا خیال تھا کہ یہ زہر یہود نے آپ ﷺ کو دیا تھا۔اور یہ محض خیال نہ تھا بلکہ یہ درحقیقت یہود کی سازش کا نتیجہ تھا کیونکہ زینب بنت الحارث جو سلام بن مشکم کی بیوی تھی نے دیگر یہود کے مشورے سے نبی کریم ﷺ کو زہر دیا تھا۔اس لئے جس روایت میں یہودی عورت کا ذکر ہے وہ اس روایت سے متعارض نہیں ہے۔

فتح خیبر کے موقع پر یہود نے شکست کھائی لیکن یہ خبیث قوم ڈنگ مارنے سے کبھی نہیں چوکتی۔ چنانچہ فتح خیبر کے بعد آپ ﷺ نے وہیں قیام فرمایا تو اس سازش کا شکار ہوئے۔یہود کو معلوم تھا کہ آپ ﷺ اپنے کریمانہ اخلاق کی بدولت امیر غریب،دوست دشمن،اور مرد وعورت سب کی دلداری کرتے ہیں اور دعوت قبول کرتے ہیں۔لہٰذا انہوں نے اس عورت کو تیار کروایا کہ وہ آپ ﷺ کو کھانے کی دعوت دے۔چنانچہ آپ ﷺ نے یہودی عورت کی دعوت کو قبول کرلیا۔اور جب کھانے بیٹھے تو فطری رغبت کے مطابق ذراع کو اٹھایا۔اس میں اتنا خطرناک اور زوراثر زہر ڈالا گیا تھا کہ آپ نے منہ لگایا ہی تھا کہ وحی آئی(۱) اور آپ ﷺ کو اطلاع دی گئی کہ اس میں زہر ہے۔لیکن صرف منہ لگانے کی وجہ سے آپ ﷺ کو مستقبل میں بھی سخت تکلیف رہی۔وفات تک ہر سال اس کے اثرات ظاہر ہوتے تھے۔گرمی کے موسم میں آپ ﷺ پر خاص کر اثر ظاہر ہوتا جس کی وجہ سے آپ ﷺ کو پچھنے لگوا کر خون نکالنا پڑتا۔حتیٰ کہ وفات کے وقت اسی زہر کے اثر سے آپ ﷺ کی رگیں پھٹ پڑیں۔

<u>معنوی شہادت:</u> اور یہ ایک گونہ شہادت بھی تھی جس کے لئے آپ ﷺ کے دل میں ہمیشہ سے ایک تڑپ اور جذبہ عشق موجود تھا۔اور اگرچہ آپ ﷺ حکمت الٰہی کے تحت آخر دم تک لوگوں کے ہاتھوں سے محفوظ رہے لیکن منصب نبوت کی تکمیل کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی اس تمنا کو بھی پورا کر کے شہادت سے سرفراز فرمایا۔ **لوددت ان اقتل فی سبیل اللّٰہ ثمّ احییٰ ثم اقتل(الحدیث)الخ**

---

(۱) بعض روایات میں آتا ہے کہ اس ذراع نے آپ ﷺ سے کلام کر کے زہر کے وجود کی خبر دی۔ممکن ہے کہ ذراع کے اخبار کے بعد اس کی تصدیق کی خاطر جبرئیلؑ نے بھی آکر خبر دی ہو۔اکثر شراح نے یہی تطبیق کی ہے۔(اصلاح الدین)

بعض صحابہ نے بھی یہ زہریلا گوشت کھالیا تھا جن میں سے ایک شخص شہید ہوئے۔ جن کا نام بشر بن براءؓ یا بشیر بن براءؓ تھا۔ بعد میں جب اس عورت سے پوچھ گچھ کی گئی تو اس نے زہر ملانے کا اعتراف کیا(۱)۔ اب بعض روایات میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس عورت کو معاف کردیا۔ جبکہ بعض میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس کو قصاصاً قتل کروایا۔

سوائے ورثاء کے قاتل کو عفو کا کسی کو اختیار نہیں: بظاہر یہ تعارض معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت دونوں روایتیں اپنی جگہ صحیح ہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ نے اسے اپنے حق میں معاف کردیا۔ اور اگرچہ اس عورت نے اقدام قتل کیا تھا۔ لیکن جس طرح آپ ﷺ کی عادت شریفہ تھی کہ آپ ﷺ کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیتے تھے۔ اس لئے اس کو معاف فرمایا لیکن بعد میں جب پتہ چلا کہ ایک صحابی اس عورت کی وجہ سے شہید ہو گئے تو پھر چونکہ قصاص لازم ہو گیا۔ لہٰذا قصاصاً قتل کروایا۔ آپ ﷺ دوسروں کے قصاص معاف کرنے کے مجاز تو نہ تھے۔ کیونکہ اسلام میں گورنر، صدر یا قاضی وغیرہ کو قاتل کے معاف کرنے کا حق نہیں۔ بلکہ قاتل ضرور قتل کیا جائے گا جب تک مقتول کے ورثہ معاف نہ کریں۔

ہمارے ہاں تو الٹی گنگا بہتی ہے۔ قتل کو فوجداری جرم قرار دے کر مقتول کے ورثہ کو تو اس حق سے محروم کردیا گیا ہے لیکن غیروں کو اس کا مجاز ٹھہرایا گیا ہے یہ یہود و نصاریٰ کے وہ کالے قوانین ہیں جو آج تک ہم پر مسلط ہیں۔

قتل عمد اور آلہ جارحہ: یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اگر اسے زہر دے کر قتل کرنے کے سبب قتل کروایا تو اس سے امام شافعیؒ کا مسلک ثابت ہوتا ہے کہ قصاص کے لیے قتل عمد میں آلہ جارحہ شرط نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہؒ تو قتل عمد میں آلہ جارحہ کو شرط مانتے ہیں۔ اور زہر دینا آلہ جارحہ کا استعمال نہیں ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے اسے قصاصاً نہیں بلکہ تعزیراً قتل کروایا ہوگا۔ اور قاضی کے لیے سنگین جرائم میں سیاسۃً و تعزیراً قتل کروانے کا اختیار ہے۔

---

(۱) اس پوچھ گچھ کے بعد مسلمان ہوگئی۔ علامہ جواد الرومی نے لکھا ہے و لقد اسلمت زینب فترکھا رسول اللہ ﷺ لاسلامھا و لانّہ کان لاینتقم لنفسہ (الاتحافات ص ۲۲۱) (مختار)

(۱۸) حدّثنا محمّد بن بشّارثنا مسلم بن ابراهيم ثناأبان بن يزيد عن قتادة عن شهر بن حوشب عن أبی عبيد قال طبخت للنبیّ ﷺ قدراً و كان يعجبه الذراع فناولته الذراع ثمّ قال ناولنی الذراع فناولته ثمّ قال ناولنی الذراع فقلت يا رسول اللهﷺ و كم للشاة من ذراع فقال والذی نفسی بيده لو سكتّ لنا و لتنی الذراع ما دعوت(۱).

ترجمہ: حضرت ابوعبیدؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے لیے ہانڈی پکائی۔ چونکہ نبی کریم ﷺ کو ذراع کا گوشت زیادہ پسند تھا۔لہٰذا میں نے اُنہیں ایک ذراع پیش کی۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے(دوسری)ذراع (بھی) دیدو۔میں نے دے دی۔پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے ایک اور ذراع دے دو۔میں نے عرض کیا کہ حضور ﷺ بکری کی کتنی ذراع ہوتی ہیں؟(یعنی صرف دو ہی تو ہوتی ہیں) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر تو خاموش رہتا تو جب تک میں مانگتا رہتا (ہانڈی سے نکال نکال کر) تو مجھے ذراعیں دیتا رہتا۔

ابــو عبیـدؓ یہ صحابی ہیں۔نبی کریم ﷺ کے آزاد کردہ غلام ہیں۔آپ ﷺ کی خدمت کیا کرتے تھے۔یہی ان کا نام اور یہی کنیت مروی ہے۔اور صرف اسی ایک کتاب میں صرف یہی ایک روایت ان کی موجود ہے۔بعض حضرات نے ان کا نام ابوعبیدۃ یعنی تاء کے ساتھ نقل کیا ہے لیکن صحیح بغیر تاء کے ہے۔

ثـمّ قال ناولنی الذراع اس فرمائش سے ذراع کے گوشت میں آپ کی زیادہ رغبت ظاہر ہوتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ طلب کرنے کے بعد آپ ﷺ اسے اکیلے تو نہیں کھاتے تھے بلکہ دیگر دوستوں کو بھی کھلاتے تھے۔و كـم لـلشـاة الذراع گویا حضرت ابوعبیدؓ کو اس بات پر تعجب ہوا کہ یہ نبی کریم ﷺ کیسی بات کررہے ہیں کہ بکری کے تو صرف دو ذراع ہوتے ہیں۔اور آپ ﷺ دو ذراع لینے کے بعد تیسرا بھی مانگ رہے ہیں۔لہٰذا بطور تعجب پوچھا کہ شاۃ کے کتنے ذراع ہوتے ہیں۔دو تو میں دے چکا ہوں۔

---

(۱) دارمی ۲۲/۱، مسند احمد ۴۸۴/۳، معجم الکبیر للطبرانی ۳۳۵/۲۲ (مختار)

نبی کریم ﷺ کے حکم کے مقابلے میں عقل پرستی: لیکن دراصل اس تعجب اور استبعاد میں ان سے چوک ہوئی۔ کہ مقام تعمیل ارشاد کا تھا۔ یہ سوچنا ہی بے جا تھا کہ نبی کریم ﷺ کا یہ مطالبہ خلاف عقل ہے جب نبی کریم ﷺ کسی بات کا حکم دیتے تھے تو عقل، فلسفہ، اور سائنس کو درمیان میں لانا اور ممکن ناممکن کی گھتیاں سلجھانا ہی غلط ہے۔ وہ پہاڑ اٹھانے کا حکم دیں تو مامور کو کوشش کرنی چاہیے۔ اور اس بات کی تعلیم دینے کے لیے آپ ﷺ نے فرمایا والذی نفسی بیدی لو سکتّ الخ یعنی اگر تم اعتراض نہ کرتے اور خاموشی سے تعمیل ارشاد کرتے۔ تو تم اور ذراع بھی نکال کر دیتے رہتے۔ اور بچشم مشاہدہ دیکھ لیتے کہ ایک جانور کے متعدد ذراع بھی ہو سکتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی زندگی تکثیر طعام کے اس قسم کے معجزات سے بھری پڑی ہے تھوڑا سا کھانا زیادہ بن گیا۔ اور چھوٹے سے برتن میں انگلیاں ڈبو دی ہیں۔ تو اس سے پانی چشموں کی طرح بہنے لگا ہے۔ اور اگر موسیٰ علیہ السلام نے بطور معجزہ ایک پتھر سے چشمے جاری کئے ہیں تو آپ ﷺ نے انگلیوں سے اسی طرح کے چشمے جاری کئے ہیں۔ اور ساری کی ساری فوج اور اس کے جانور اس سے سیر بھی ہو چکے ہیں۔

سنن ابن ماجہ میں متعدد روایات تکثیر طعام کے سلسلے میں موجود ہیں۔ اسی طرح قاضی عیاضؒ نے بھی شفا نامی کتاب میں اس قسم کی متعدد روایات ذکر کی ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے معجزے کا اثر ہی تھا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کھجوروں کے ایک تھیلے سے طویل زمانہ تک کھجوریں کھاتے رہے۔ لیکن اس تھیلے کی کھجوریں ختم نہ ہوئی۔ اور ایسا بھی ہوا کہ کسی صحابی نے آپ ﷺ کو کھانے پر بلایا اس نے صرف آپ ﷺ کے لیے کھانا تیار کیا ہوا تھا۔ لیکن آپ ﷺ نے اپنے ساتھ لشکر روانہ فرمایا۔ اور وہی تھوڑا سا کھانا سارے لشکر کے لیے کافی ہوا بلکہ ان سے باقی بھی بچا۔ جیسا کہ غزوۂ خندق میں ہوا۔

چوں وچرا کرنا برکات سے محرومی کا سبب بنتا ہے: بہر حال اگر صحابی سوال نہ کرتے تو بطور معجزہ اللہ تعالیٰ یہاں بھی کئی ذراع پیدا فرماتے لیکن یہ بات کہ ایسا کیوں نہ ہوا۔ اور یہ معجزہ کیوں منقطع ہو گیا۔ تو اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ صحابی کی طرف سے نبی کریم ﷺ کا انقیادِ تام نہ ہوا۔ اور اس کا اثر نبی کریم ﷺ کے معجزات کے برکات پر بھی پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ جب شاگرد بگڑا ہو تو اس کے استاد کی

روحانیت کو بھی ٹھیس پہنچتی ہے۔ بیٹا خراب ہو تو اس کی برائی باپ پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ ملا علی قاریؒ کا قول ہے کہ اکرام تام کیلئے انقیادِ تام کی ضرورت ہوتی ہے۔ تکثیر طعام یا اس قسم کا دوسرا معجزہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کا اکرام ہوتا ہے۔ اور امتی میں انقیاد تام نہ ہو تو ماحول سارا مکدر ہو جاتا ہے۔ اور معجزے کے ظہور کا سلسلہ بھی منقطع ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں نبی اکرم ﷺ کی کامل توجہات بھی ختم ہو جاتی ہے۔ ایسی برکتیں اور ظاہری یا معنوی فیوضات تب ظہور پزیر ہوتی ہیں جب نبی کی پوری توجہ اور انہماک ہو۔ صحابی نے جب درمیان میں چون و چرا کی تو اس سے توجہ کا وہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ جس طرح کہ بعض اوقات کوئی مقرر عجیب وغریب بیان کرتا ہے۔ پوری تقریر علوم و معارف کا سلسہ ہوتا ہے لیکن درمیان میں کوئی شخص گڑبڑ کرے تو وہ سلسلہ کٹ جاتا ہے۔

توجہ تام کے حصول کیلئے انقیاد تام: ہمارے بزرگ مولانا عبداللہ درخواستی صاحبؒ جسے لوگوں نے سیاست کی نذر کر کے بڑا نقصان کیا۔ عظیم شخصیت، سلف کا نمونہ اور سادگی ومجذوبیت کے پیکر تھے۔ عموماً وہ یہاں آتے رہتے تو جلسے میں تقریر کرتے ہوئے یہ کیفیت کبھی کبھی طاری ہو جاتی اور فرماتے ''تار کٹ جاتی ہے'' تقریر کے دوران کوئی اٹھتا تو فوراً بیٹھ جانے کو کہتے اور فرماتے کہ میرا تار کٹ جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص جب پوری توجہ اور انہماک سے اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی مدد ہوتی ہے۔ مقرر اور مدرس کا شرح صدر ہوتا ہے۔ لیکن درمیان میں گڑبڑ اور آداب مجلس کے خلاف کوئی کام ہو جائے تو یہ سلسلہ کٹ جاتا ہے۔ اس لئے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب اس شخص نے بات کی۔ تو نبی کریم ﷺ کی اس کیفیت اور توجہ واستغراق میں فرق آ گیا۔ جس کی وجہ سے اس معجزہ سے محروم ہونا پڑا۔ ملا علی قاریؒ کہتے ہیں۔ کہ انبیاء علیہم السلام واولیاء کرام کے ہاتھ پر خرق عادت امور کا ظہور حالت فناء میں ہوتا ہے۔ ان کو اس حالت میں اور تو اور خود اپنے آپ کا احساس تک نہیں ہوتا ہے۔ اور جب یہ احساس ختم ہونے لگے۔ توجہ تبدیل ہو جاتی ہے تو خرق عادت امور بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ یہاں بھی خادم سے مکالمہ اور رب سے انقطاع ربط معجزہ کی انتہا کا سبب بنا۔ و اللہ اعلم

(۱۹) حدّثنا بن محمّد الزعفرانیّ ثنا یحییٰ بن عبّاد بن فلیح ابن سلیمان قال حدّثنی رجل من عبّاد یقال له عبدالوهاب بن یحییٰ بن عبّاد عن عبداللّٰه بن الزبیر عن عائشة قالت ما کان الذراع أحبّ اللحم إلیٰ رسول الله و لکنّه کان لا یجد اللحم الاغبًّا و کان یعجل الیها لأنّها أعجلها نضجا(۱)۔

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ذراع کا گوشت (لذت کی وجہ سے) حضور کو زیادہ پسند نہ تھا لیکن چونکہ آپ ﷺ کی رسائی گوشت تک کبھی کبھی ہوتی تھی۔ اور آپ کو گوشت کھانے کی جلدی ہوتی تھی (تاکہ دیگر مشاغل کے لیے جلدی فارغ ہوں) اور گوشت میں ذراع سب سے جلدی پکنے والی ہوتی ہے (اس لیے آپ ﷺ اسے پسند فرماتے تھے)

ذراع کے گوشت سے محبت کا سبب: ماکانت الذراع الخ اس حدیث میں حضرت عائشہؓ اس بات کی نفی نہیں کرتیں کہ آپ ﷺ کو ذراع کا گوشت پسند نہ تھا۔ بلکہ دراصل اس پسندیدگی کی سب سے اہم وجہ بیان فرما رہی ہیں۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ بعض اوقات کوئی شخص لذیذ اور مرغن کھانوں کا ہر وقت شوقین ہوتا ہے۔ اور یہی اس کی زندگی کا اہم مقصد ہوتا ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ ایسے نہ تھے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں جو بھی میسر ہوتیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا فرماتے۔ اس کے باوجود ذراع کی مرغوبیت کی متعدد وجوہ میں سے حقیقی وجہ اور سبب یہ ہے۔ کہ آپ ﷺ کو روز روز گوشت نہیں ملتا تھا۔ کبھی تو دو دو مہینے گھر میں آگ بھی نہ جلتی بلکہ اسودین یعنی کھجور اور پانی پر گزارہ ہوتا تھا۔ شاذ و نادر کبھی گوشت میسر ہوتا جو گھر پکتا۔ یا کہیں دعوت میں واسطہ پڑتا۔ اور انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ جو چیز مدت کے بعد میسر ہو انسان اسے جلد ہی کھانے کو پسند کرتا ہے۔ ایسے موقع پر انتظار کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

---

(۱) جامع ترمذی ۲/۵ کتاب الاطعمة باب ماجاء فی ای اللحم کان احبّ الی رسول اللّٰه ﷺ (مختار)

آج بھی جبکہ گوشت لوگوں کو بکثرت ملتا ہے۔ جب لوگ قربانی کرتے ہیں۔تو جلدی پکنے والا گوشت الگ کر کے جلدی جلدی پکا لیتے ہیں۔باقی گوشت کے پکنے کا انتظار کرنے کی بجائے یہ گوشت پہلے کھا جاتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ بھی ایسی ہی طبعی تقاضے کی بناء پر جلدی پکنے والے گوشت کو کھانے میں مقدم فرماتے تھے۔اور پکنے میں ذراع کا گوشت کم وقت لیتا ہے۔اس لیے آپ ﷺ اس کو پسند فرماتے تھے۔

گوشت خوری فطرۃ انسانی: نبی کریم ﷺ بشری تقاضوں سے عاری نہ تھے۔ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی شکر گزاری میں سب سے پیش پیش تھے۔اور شکر سے پہلے طبعی تقاضوں کی پاسداری کرنی پڑتی ہے۔رہبانیت سے کنارہ کش ہونا پڑتا ہے۔اور گوشت کی طرف دل کی رغبت انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ نہ یہ زہد وقناعت سے متصادم ہے نہ مذہب سے اس کا ٹکراو ہے۔کسی آسمانی مذہب نے کبھی اس سے منع نہیں کیا۔اگرچہ انسانی دماغ کے ایجاد شدہ مذاہب آج بھی گوشت کھانا ناجائز اور مکروہ خیال کرتے ہیں۔ ہمارے قریب ہندوستان ہی میں لاکھوں بلکہ کروڑوں انسان اس قسم کے افکار وعقائد رکھتے ہیں۔گوتم بدھ کی تو ساری تعلیمات کا محور یہی تھا۔کہ گوشت کھانا ظلم اور حیوانات کے ساتھ زیادتی ہے۔

یہ بھی عجیب فلسفہ ہے جس پر ان مذاہب کی بنیاد ہے۔ بلکہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی بعض جاہل توہمات کی دنیا آباد کئے ہوئے ہیں۔پچھلے دنوں جرمنی میں ایک بڑی پارٹی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ گوشت کو چھوڑ کر سبزیاں اور ترکاریاں کھائیں گے۔ کیونکہ گوشت خوری ظلم ہے۔ہم کہتے ہیں کہ اگر تمہارے خیال میں یہ جانوروں پر ظلم ہے تو حیوانات کی طرح نباتات بھی تو آخر شعور رکھتی ہیں اور جدید تحقیقات سے یہ بات قطعی طور پر ثابت کی جاتی ہے کہ نباتات میں ایک قسم کی حیات اور حس موجود ہے۔ بلکہ وہ آوازوں کو سنتے ہیں اور یہ تو مشاہدہ ہے کہ بعض پھول ہاتھ لگتے ہی مرجھا جاتے ہیں یا بند ہو جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں ان میں باقاعدہ تلقیح کا عمل ہوتا ہے۔ان میں ایک گونہ جماع، حمل اور بیج اور تخم کا استقرار تو مسلم باتیں ہیں۔یورپ میں اس بات پر بھی تحقیق کی گئی ہے کہ بعض پودے موسیقی اور گانوں سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔اور یہ ان کی نشو ونما اور وجد ومستی کا سبب بنتی ہیں۔ بہر حال نباتات میں شعور کا وجود اب ایک مسلمہ حقیقت ہے۔لہٰذا ان میں اور جانوروں میں فرق نہیں ہوگا۔ بلکہ زمین میں بھی آخر ایک قسم کا

شعور ہے۔تو اس پر کودنا، چلنا پھرنا اور اسے چیرنا پھاڑنا کیا ظلم نہ ہوگا۔اسی طرح دودھ دہی اور تمام ماکولات اور مشربات یہاں تک کہ پانی بھی جراثیم، بیکٹیریا اور جنین سے بھری ہوئی ہیں جو ذی حیات چیزیں ہیں۔ ایک گلاس دودھ کو خوردبین سے دیکھیں تو کروڑوں اربوں زندہ اشیاء تیرتی نظر آتی ہیں۔

حاصل یہ کہ دوسری مخلوقات سے استفادہ گناہ سمجھا جائے تو پھر تو خدا کی خدائی سے نکلنا پڑے گا کیونکہ ہر مخلوق ایک حد تک باشعور ہے۔

آریہ سماج نے جب گوشت خوری کے خلاف تحریک چلائی اور مسلمانوں کو اس بنا پر ظالم سمجھنے لگے۔تو جواب میں ہمارے اکابر حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ اور اس کے ساتھیوں کو میدان میں آنا پڑا۔ حضرت نانوتویؒ نے اس سلسلے میں ''تحفۂ لحمیہ'' نامی کتاب لکھی۔جس میں گوشت کھانے کے جواز کے دلائل اور فوائد لکھے۔امام غزالیؒ نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ گوشت بدن کو صاف رکھتا ہے اور اخلاق میں حسن پیدا کرتا ہے۔اور جس شخص نے چالیس روز تک مسلسل گوشت نہیں کھایا اس کے اخلاق خراب ہو جاتے ہیں (مواہب لدنیہ ص ۱۲۵، (جمع الوسائل ج ا ص ۲۵۸)

بہر حال گوشت کھانا انسانی فطرت، آسمانی مذاہب اور اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے(۱)۔ اور اسی وجہ سے آپ ﷺ کو گوشت پسند ہوتا تھا۔پھر خصوصاً مذکورہ وجہ کی بنا پر جلدی پکنے والا گوشت زیادہ مرغوب ہوتا تھا۔علاوہ ازیں رسول اللہ ﷺ کی زندگی بہت مصروف ہوتی تھی۔وقت کی پابندی کا بہت خیال رکھتے تھے۔لکل شیئ عندہ عتاد۔کیونکہ آپ ﷺ کے اعمال میں بیک وقت عبادت، جہاد، تعلیم، تبلیغ اسلام اور مملکت وغیرہ کے امور ہوتے تھے۔چنانچہ جس حصہ کے پکنے میں وقت کم لگتا تھا۔وہ اس وجہ سے بھی زیادہ پسند ہوتا تھا۔کہ اس میں وقت کی بچت ہوتی تھی۔

یہاں پر امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے بقول حضور ﷺ کے انتخاب کا سبب سرعۃ نضج یعنی جلدی پکنا ہے۔مگر حضور ﷺ کی محبت کا سبب اس کے ساتھ ساتھ استلذاذ یا دیگر اسباب بھی ہو سکتے ہیں۔گویا اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔کہ ذراع کی محبوبیت کی یہ وجہ حضرت عائشہؓ کی ذاتی رائے ہے۔

---

(۱) مرغی، بھیڑ، بکری، اونٹ، خرگوش اور حباریٰ (تکلور) اور تیتر کا گوشت تناول فرمانا آپ ﷺ سے ثابت ہے۔

(اصلاح الدین)

علامہ ابن حجرؒ نے بھی تصریح کی ہے کہ یہ حضرت عائشہؓ کی ذاتی رائے ہے۔ورنہ سابقہ احادیث سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ گوشت ملے یا نہ ملے۔ذراع سے آپ ﷺ کی طبعی محبت تھی۔

بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ بظاہر حضرت عائشہؓ کا مقصد یہی بیان کرنا ہے کہ نبی کریم ﷺ لذتوں کے پیچھے پڑنے والے نہ تھے۔اور محبوبیت کا مدار استلذاذ نہیں بلکہ سرعۃ نضج تھا۔لیکن حق یہ ہے کہ لذیذ چیز کو لذت کی بنا پر پسند کرنا بھی کوئی عیب نہیں بلکہ بشریت کا تقاضا ہے۔البتہ محض لذت کو سبب ترجیح بنا کر ضروریات پر مقدم کرنا بری بات ہے۔

بایں ہمہ حضرت عائشہؓ کی دقیقہ سنجی اور رفیق حیات کی مزاج شناسی پر اعتماد کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سابقہ احادیث سے پسندیدگی ثابت ہوتی ہے۔جس کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں۔لیکن اس سے یہ لازم نہیں کہ یہ قطعہ لحم باقی تمام اعضاء کی نسبت محبوب تر بھی ہو سکتا ہے کہ محبت واستلذاذ کسی اور قطعہ لحم سے ہو جیسے کہ بعد کی حدیث میں آتا ہے کہ **اطیب اللحم لحم الظھر**۔وہاں اطیب کا لفظ ریڑھ کی ہڈی کے گوشت کو ذراع پر ترجیح دینے میں مصرح ہے۔چنانچہ حضرت عائشہؓ کا تجزیہ معقول ومقبول ہے۔**واللہ اعلم**

(۲۰) حدثنا محمود بن غیلان ثنا ابو احمد ثنا مسعرٌ قال سمعت شیخا من فھم قال سمعت عبداللہ بن جعفر یقول سمعت رسول اللہ ﷺ ان أطیب اللحم لحم الظھر(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ گوشت میں بہتر گوشت پیٹھ کا گوشت ہے۔

شیخا من فھم بنوفہم کے قبیلے کے اس شخص کا نام مجہول ہے۔اس کی تعیین میں محدثین نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی ہے۔بعض کہتے ہیں کہ اس کا نام محمد بن عبداللہ ابورافع فہمی ہے جبکہ بعض کے خیال میں اس کا نام محمد بن عبدالرحمٰن ہے۔

---

(۱) السنن الکبریٰ للنسائی ۱۵۴/۴ کتاب الولیمۃ ابواب الأطعمۃ باب لحم الظھر، سنن ابن ماجۃ ص۲۳۷ باب اطائب اللّحم کتاب الأطعمۃ باب أطیب اللحم، شرح السنۃ للبغوی ص ۲۹۹ ج ۱۱ کتاب الأطعمۃ(مختار)

(۲) تطبیق روایات لحم ذراع ولحم ظہر: ان اطیب اللحم لحم الظھر الخ اس روایت کے مطابق نبی کریم ﷺ کے نزدیک جانور میں سب سے اچھا گوشت پیٹھ کا گوشت ہے۔ پچھلی روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ ذراع کے گوشت کو پسند فرماتے تھے۔ یہاں پیٹھ کے گوشت کو بہترین قرار دیا ہے۔ بظاہر اس تعارض کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ حیثیات اور وجوہ ترجیح مختلف ہوتی ہیں۔ ذراع کا گوشت جلدی پکتا ہے تو پیٹھ کا گوشت عموماً زمین سے دور رہنے کے سبب نرم ہوتا ہے۔ ماہرین کے قول کے مطابق جو گوشت زمین پر نہیں لگتا وہ نرم ہوتا ہے جبکہ پاؤں اور اطراف کا گوشت زمین کے ساتھ لگتا اور رگڑتا ہے۔ اس لئے اس میں قدرے سختی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں پیٹھ کا گوشت میٹھا اور ریشوں سے پاک ہوتا ہے۔ ویسے بھی ہڈیوں کا گوشت دوسرے قسم کے گوشت کی نسبت بہتر ہوتا ہے۔ کیونکہ ہڈی کی لذت، حلاوت اور قوت بھی اس میں شامل ہوتی ہے۔ نیز اسے دانتوں سے نوچ کر کھایا جاتا ہے جس سے لذت دوبالا ہو جاتی ہے۔

اس حدیث میں ریڑھ کی ہڈی کے گوشت کو اطیب کہا گیا ہے۔ جس کے معنی لذیذ ترین، بہترین کئے گئے ہیں۔ بعض شرّاح اطہر اور بعض نے احل کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ تمام معانی اس حصے کے گوشت کی ترجیح پر دلالت کرتے ہیں۔

اس طرح بعض احادیث میں آپ ﷺ سے لحم الرقبۃ یعنی گردن کی ہڈی کے گوشت کی تعریف بھی منقول ہے۔ مختلف مواقع پر مختلف حیثیتوں سے آپ ﷺ نے مختلف اعضاء کو پسند فرمایا ہے۔ لہٰذا اسے تعارض نہیں کہا جا سکتا۔

بعض اعضاء کو آپ ﷺ نے مکروہ کہا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ایک روایت ہے کہ **کان المصطفیٰ یکرہ من الشاۃ سبعا المرارۃ والمثانۃ والحیاء والذکر والانثیین والغدۃ والدم**(۱) نبی کریم ﷺ دنبے میں سات اعضاء تلی، مثانہ، فرج، ذکر، فوطے، غدود اور خون کو مکروہ سمجھتے تھے اسی طرح ایک حدیث میں گردوں کی کراہت کا ذکر بھی آیا ہے۔

(۱) جمع الوسائل ومناوی ج۱ ص۲۶۶ (اصلاح الدین)

(۲۱) حدثنا سفیان بن وکیع ثنا زید بن الحباب عن عبداللّٰہ بن المؤمل عن ابن ابی ملیکۃ عن عائشۃ أنّ النبیّ ﷺ قال نعم الإدام الخل(۱)۔

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سرکہ بہترین سالن ہے۔

خل (سرکہ): نعم الادام الخل یعنی سرکہ بہت اچھا سالن ہے۔ترمذی میں نبی کریم ﷺ کے بارے میں آیا ہے کہ آپ ﷺ اچھے کھانوں کی تعریف اور مدح میں وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ہاں کبھی کبھی میزبان کی دلداری یا مہمان کی خاطر مدارت کے لیے تحسین بھی فرمایا کرتے تھے،لیکن اس مقام پر سرکہ کی مدح کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ سرکہ کو شاید لوگ سالن ہی نہ سمجھیں۔اور سرکہ ملنے کے وقت ناشکری کے مرتکب ہوں۔تو دراصل آپ ﷺ مخاطبین کو یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ سرکہ اگرچہ بظاہر حقیر دکھائی دیتا ہے۔لیکن ایسا نہیں بلکہ یہ تو ایک نعمت ہے۔اور بہت اچھا سالن ہے۔

حدیث کی مزید تفصیل ابتدائی باب میں گزر چکی ہے۔

(۲۲) حدثنا ابو کریب ثنا ابو بکر بن عیاش عن ثابت أبی حمزۃ الثمالیّ عن امّ ھانی قالت دخل علی النبیّ ﷺ فقال اعندک شئی فقلت لا الا خبز یابس و خل فقال ھاتی ماافقر بیت من ادم فیہ خلٌّ(۲)۔

ترجمہ: حضرت ام ہانیؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ (فتح مکہ کے موقع پر) میرے پاس تشریف لائے۔اور فرمایا کہ تیرے پاس کوئی (کھانے کی) چیز ہے میں نے عرض کیا سوکھی روٹی اور سرکہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔فرمایا وہ لے آؤ۔وہ گھر جس میں سرکہ ہو سالن سے خالی نہیں ہے۔

---

(۱)تفرد بہ الإمام الترمذی جامع ترمذی ۲/۲ ابواب الأطعمۃ باب ماجاء فی الخل (مختار)

(۲)جامع ترمذی ۲/۲ کتاب الأطعمۃ باب ماجاء فی الخل، شرح السنۃ للبغوی ۱۱/۳۱۰ رقم حدیث ۲۸۶۷ ابواب الأطعمۃ باب الخل، المستدرک للحاکم ۵۴/۴(مختار)

أمّ ھانی ؓ حضور ﷺ کی چچازاد بہن اور حضرت علیؓ کی بہن ہیں۔ پانچویں باب میں ان کے حالات بیان ہو چکے ہیں۔

دخل علی النبی ﷺ یہ فتح مکہ کے روز کا واقعہ ہے۔ جب نبی کریم ﷺ تھک کر مسجد حرام کے قریب واقع حضرت ام ہانیؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ یہ گھر مسجد حرم میں توسیع کے سبب اب مسجد کا حصہ بن چکا ہے۔ وہاں جا کر آپ ﷺ نے سر سے خود اور پگڑی اتار دی۔ طہارت کے بعد اشراق کی نماز بھی پڑھی کھانے کا تقاضا ہوا تو حضرت ام ہانیؓ کے گھر میں موجود سوکھی روٹی کو پانی میں تر کر کے نمک اور سرکہ ملا دیا اور تناول فرمایا۔ اور ساتھ ساتھ حضرت ام ہانیؓ کی خاطر داری کے لیے سرکہ کی تعریف بھی کر دی۔ دوسری روایات میں اس واقعہ کی مزید تفصیل مذکور ہے۔

بے تکلفی سوال نہیں ہے: **اعندک شئی؟** یہ سوال نہیں بلکہ نبی کریم ﷺ نے بے تکلفی اور قرب رشتہ کی بنا پر التماس کیا۔ جو اسلام میں ممنوع سوال کے زمرے میں نہیں آتا۔ بلکہ رشتہ داروں اور بے تکلف دوستوں کے گھروں میں قرآن مجید نے صراحتہ بغیر اجازت کے کھانے کی بھی اجازت دی ہے کیونکہ ایسے مواقع پر التماس کرنے والا ذلیل نہیں بلکہ اور بھی زیادہ محبوب لگتا ہے۔ اور جس شخص پر بے تکلفانہ اپنی طلب ظاہر کرتا ہے وہ شخص اور بھی زیادہ خوش ہو جاتا ہے۔

لا الا خبز یابس حضرت ام ہانیؓ کا مقصد یہ تھا کہ آپ ﷺ کی شایان شان تو کوئی چیز نہیں۔ ہاں سوکھی روٹی کے کچھ ٹکڑے اور سرکہ موجود ہے۔ **فقال ھاتی الخ** لفظ **ھاتی** بعض کے ہاں **ایتی بہ** کے معنی میں اسم فعل ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ امر کا صیغہ ہے۔ اصل میں **ایتی** تھا ہمزہ ہاء سے بدل گیا ہے۔ جیسے **ھراق** کی ہاء ہمزہ سے بدل کر آئی ہے(۱)۔

فقال ما افقر بیت الخ یعنی جس گھر میں سرکہ ہو۔ اس کو غیر آباد اور سالن سے خالی نہیں سمجھنا چاہیے۔ اقفار کے معنی خالی ہونے کے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کا مادہ قفر ہے۔ قاف کی تقدیم کے ساتھ اور اس

(۱) منجد میں ہے کہ ہاتی دراصل **ھاتئ یھاتی مھاتاۃ** سے امر حاضر کا صیغہ اعطی کے معنی میں ہے۔ اور **مھاتاۃ** کا مادہ **ھتا یھتو ھتوا** ہے۔ ملا علی قاریؒ نے بھی اسے امر حاضر کا صیغہ بتایا ہے اور "**ھاتو برھانکم**" سے استشہاد کیا ہے۔ (اصلاح الدین)

کے معنی ہے خالی ہونا۔ جبکہ بعض فاء کی تقدیم کے ساتھ قفر کو اس کا مادہ کہتے ہیں(۱)۔اور افقر الرجل جس طرح کہ مال سے خالی ہونے کو کہتے ہیں۔اس طرح افقر الدار کا بھی یہی معنی ہوگا کہ وہ گھر غیر آباد اور خالی ہوگیا۔فیہ خل یہ بیت کی صفت ہے۔اور صفۃ وموصوف کے درمیان فصل بالاجنبی بشرطیکہ وہ اجنبی ایسا ظرف ہو جو موصوف کے عامل کا معمول اور اس سے متعلق ہو جائز ہے۔اور یہاں بھی ''من ادم'' اقفر سے متعلق ہوگا۔اور بعض کہتے ہیں کہ من ادم بھی بیت کی صفت ہے۔کیونکہ ادم چمڑے کو کہتے ہیں اور بیت من ادم سے مراد چمڑے کا بنا ہوا خیمہ مراد ہوگا۔اس صورت میں مطلب یہ ہوگا۔کہ چمڑے کا بنا ہوا گھر جس میں سرکہ ہو خالی شمار نہ ہوگا۔لیکن اکثر شراح نے پہلی توجیہ کو ترجیح دی ہے۔

(۲۳) حدثنا محمد بن المثنی قال حدثنا محمد بن جعفر ثنا شعبة عن عمرو بن مرة عن مرة الهمدانیّ عن ابی موسی عن النبی ﷺ قال فضل عائشة علی النساء کفضل الثرید علی سائر الطعام(۲).

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ حضرت عائشہؓ کی دوسری عورتوں پر ایسی فضیلت ہے جیسے ثرید کی فضیلت (دوسرے تمام) کھانوں پر۔

(۲۴) حدثنا علی بن حجر ثنا اسماعیل بن جعفر ثنا عبداللّٰہ بن عبدالرحمٰن بن معمر الانصاری ابو طوالة انّه سمع انس بن مالک یقول قال رسول اللّٰہ ﷺ فضل عائشة علی النساء کفضل الثرید علی سائر الطعام(۳).

---

(۱) لیکن شراح نے روایۃ اور درایۃ اسے غلط کہا ہے۔والتفصیل فی جمع الوسائل ج۱ص۲۶۸ (اصلاح الدین)

(۲) صحیح بخاری کتاب احادیث الأنبیاء باب قول اللّٰہ تعالیٰ وضرب الله مثلاً للذین، السنن الکبریٰ ۵/۲۸۳ کتاب عشرة النساء باب حب الرجل بعض نسائه، جامع الترمذی ۲/۵ کتاب الأطعمه باب ماجاء فی فضل الثرید علی الطعام(مختار)

(۳) صحیح بخاری ۱/۵۳۲ کتاب الفضائل الصحابة باب فضل العائشة، صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابة باب فضل عائشة، جامع ترمذی ۲/۲۲۱ کتاب المناقب باب فضل عائشة، سنن إبن ماجه ص ۲۳۶ کتاب الاطعمه باب فضل الثریدعلی الطعام(مختار)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا حضرت عائشہؓ کی دوسری عورتوں پر ایسی فضیلت ہے جیسے ثرید کی فضیلت (دوسرے تمام) کھانوں پر۔

کفضل الثرید علی سائر الطعام اوپر کی دونوں حدیثوں کی سیاق سے ثرید کی فضیلت معلوم ہوتی ہے کیونکہ آپ ﷺ نے افضل النساء حضرت عائشہؓ کو ثرید سے تشبیہ دی ہے۔ گویا ثرید کی فضیلت تو معلوم ومشاہد ہے اور اس سے یہ بات ضمناً ثابت ہو رہی ہے کہ آپ ﷺ نے ثرید کھایا ہوگا۔ ورنہ پھر تشبیہ کیسے دیدی۔ اور اسی میں ترجمۃ الباب سے مطابقت ہے۔ لہٰذا امام مناویؒ کا یہ قول کہ **وھذا الحدیث بعید المناسبۃ بالباب** مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

ثرید اس کھانے کو کہا جاتا ہے جس میں گوشت اور روٹی کو خوب ریزہ ریزہ کر کے سالن میں ڈال دیا جائے۔ یہ کھانا مقوی لذیذ زود ہضم اور معدے کے لیے غیر مضر ہوتا ہے۔ نیز اس کے کھانے میں سہولت ہوتی ہے اور کھانے والا تھوڑے وقت میں بقدر کفایت کھا کر فارغ ہو جاتا ہے۔ اور انہی اوصاف کی بنا پر ثرید کو فضیلت بھی حاصل ہے۔

<u>فضیلت ام المؤمنین عائشہؓ:</u> دراصل اس حدیث میں تمام عورتوں پر حضرت عائشہؓ کی فضیلت کا بیان ہے۔ ازواج مطہراتؓ بلکہ تمام عورتوں میں ان کو بڑا مقام حاصل تھا۔ اور بہت حیثیتوں سے ان کو دوسری عورتوں پر برتری حاصل ہے۔ حضرت خدیجہؓ اور حضرت فاطمۃ الکبریٰؓ کے فضائل کتب میں مذکور ہیں۔ لیکن آپ کو بھی بے شمار فضائل حاصل ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت خدیجہؓ مرتبہ میں حضرت عائشہؓ سے مقدم تھیں۔ لہٰذا یہاں پر نساء سے مراد "نساء زمانھا" ہے۔ یعنی اپنے زمانہ کی عورتوں پر حضرت عائشہؓ کو فضیلت حاصل ہے۔ اس طرح حضرت خدیجۃ الکبریٰ مفضول عورتوں سے نکل جاتی ہیں کیونکہ وہ تو پہلے وفات پا چکی تھیں اور اپنے زمانہ کے ازواج مطہرات نیز دیگر عورتوں میں آپ کو شرف وفضیلت اور بلند مرتبہ حاصل تھا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہؓ کو امت کی سہولت کی خاطر علم وفضل کی بڑی دولت سے مالا مال کیا۔ اور امت کو آپ سے بڑا فیض پہنچا۔ حضرت فاطمہؓ بھی نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد بہت جلد یعنی صرف

چھ ماہ بعد وفات پا گئیں۔لیکن حضرت عائشہؓ خلافت راشدہ کے تمام ادوار میں زندہ رہیں۔اور لوگوں کی علمی تشنگی بجھاتی رہی۔اس لیے اگرچہ حضرت خدیجہؓ اور حضرت فاطمہؓ بھی بجائے خود عظیم عورتیں تھیں۔لیکن حضرت عائشہؓ کو علمی تبحر کی وجہ سے اپنے زمانہ کی تمام عورتوں پر برتری حاصل ہوئی۔دوسری بات یہ ہے کہ فضیلت کی بہت سی حیثیتیں ہوتی ہیں۔مثلاً حضرت فاطمہؓ کو اس حیثیت سے فضیلت حاصل ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کا جزو ہیں۔اور بضعیۃ کے واسطہ سے جو فضل آپ کو حاصل ہے وہ دوسری عورتوں کو حاصل نہیں۔
اور حضرت خدیجہؓ کو اس حیثیت سے فضیلت حاصل ہے کہ ایسے حالات میں جب نبی کریم ﷺ کا کوئی سہارا نہ تھا تہی دستی کے ان دنوں میں حضرت خدیجہؓ نے اپنا سب کچھ لٹا کر اسلام اور نبی کریم ﷺ کی خدمت کی۔اللہ تعالیٰ نے ووجدک عائلاً فاغنیٰ۔میں آپؓ کے مال ہی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔اسلام لانے میں عورتوں میں تو کوئی بھی آپؓ سے سبقت نہ لے سکی۔جبکہ بعض کا قول ہے کہ مردوں اور عورتوں سب میں پہلی مسلمان حضرت خدیجہؓ ہیں۔

<u>وجوہ ترجیح فضیلتِ عائشہؓ</u>: دوسری طرف حضرت عائشہؓ کو متعدد حیثیتوں سے فضیلت حاصل ہے۔جن میں چند اہم درج ہیں۔

(۱) انتہائی درجہ کی فقاہت اور علمی دسترس کی حامل تھیں۔تبحر علمی اور حافظہ و ذکاوت میں آپؓ اپنی نظیر آپ تھیں۔

(۲) نو عمری ہی میں آپ کو معاملہ فہمی اور دیگر مزایا و کمالات حاصل تھے۔نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ میرے ساتھ بستر میں ہوں۔تب بھی جبرئیلؑ میرے پاس وحی لاتے ہیں۔ازواج مطہرات میں آپؓ کی باری ہوتی تو وحی کثرت سے آتی۔جس کا سبب یہ تھا کہ وحی سے بنی نوع انسان کو علم و فیض پہنچانا ہی مقصود تھا۔اور نبی کریم ﷺ کے پاس کی یہ طالبعلم زیادہ اخاذ اور ذہین تھی۔

(۳) نصف امت یعنی صنف نازک کی تو آپ ہی ترجمان تھیں۔اور ان کے مسائل تو آپ ہی کے طفیل انہیں پہنچے۔بلکہ مردوں کے بہت سے مسائل بھی آپؓ کے توسط سے مردوں کو پہنچے۔چنانچہ وہ ماں ہونے کے علاوہ ہماری شیخ اور استاد بھی ہیں۔

(۴) وہ مکثرین فی الحدیث میں سے ہیں۔ یہ مرتبہ صحابہ میں سے بہت کم صحابہ کو حاصل ہے۔

(۵) ان کی براءت میں تقریباً دو رکوع قرآن مجید نازل ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے براءت کا یہ اعزاز فقط آپ ہی کا حصہ ہے۔ ان رکوعوں میں مذکورہ فضائل کی تفصیل تفاسیر میں مذکور ہے۔

(۶) ان کا نکاح آسمانوں میں طے ہوا۔

(۷) نکاح سے قبل ہی نبی کریم ﷺ کو ان کی تصویر دکھادی گئی۔ جو کہ اس زمانہ کی خرق عادت ٹیلی وژن کی مثال تھی۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جبرائیلؑ نے آکر میرے سامنے ایک رومال کھولا جس میں حضرت عائشہؓ کی تصویر بنی ہوئی تھی (۱)۔ اور بعض کہتے ہیں کہ حضرت جبرئیلؑ نے ہتھیلی دکھلائی جس پر حضرت عائشہؓ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ ساتھ ساتھ جبرئیلؑ نے یہ بھی کہا کہ یہ آپ کی دنیا اور آخرت میں بیوی ہے۔ اور پھر آپ ﷺ سے حضرت عائشہؓ کا نکاح ہوا۔ حالانکہ اس سے قبل جبیر بن مطعم بن عدی (۲) نامی ایک شخص سے حضرت عائشہؓ کے نکاح کی بات ہوئی تھی۔ بلکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس رشتہ کو جلدی طے کرنے کے لیے مطعم بن عدی سے رابطہ کی کوشش بھی کی تھی۔ لیکن چونکہ وہ کافر تھا۔ اس لئے وہ اس بات کو ٹالتا رہا۔ ادھر حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد حضرت خولہؓ جو حضرت عثمان بن مظعونؓ کی بیوی تھی۔ کی مدد سے نبی کریم ﷺ نے آپؓ کا رشتہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے طلب فرمایا۔ اور اس طرح آپ کو ام المؤمنین ہونے کا شرف حاصل ہوا (۳)۔

بہر حال دیگر صحابیاتؓ اور ازواج مطہراتؓ پر بعض وجوہ کی بنا پر آپؓ کی افضلیت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ البتہ ان سیّدات میں سے مطلقاً افضلیت کا شرف کس کو حاصل ہے۔ دلائل کے تعارض کی بنا پر توقف اور تفویض الی اللہ تعالیٰ سب سے مناسب ترین مسلک ہے (۴)۔

---

(۱) عن عائشہ أنّ جبرئیل جاء بصورتھا فی خرقة حریر خضراء إلیٰ النبیّ ﷺ فقال إنّ ھذہ زوجتک فی الدنیا والآخرة ۔ ترمذی ج ۲ ص ۲۲۸ (اصلاح الدین)

(۲) حضرت جبیر بن مطعمؓ حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ سے قبل اسلام لائے۔ (اصلاح الدین)

(۳) ابن حجرؒ نے الاصابہ میں حضرت عائشہؓ کے کچھ دیگر امتیازات وفضائل کا بھی ذکر کیا ہے۔ (اصلاح الدین)

(۴) کما قال الملا علی قاریؒ والحاصل أنّ الحیثیات مختلفة الروایات متعارضة والمسألة ظنیة والتوقف لاضرر فیه قطعاً فالتسلیم اسلم واللّٰه اعلم (جمع الوسائل ۱/۲۷۰) (اصلاح الدین)

(۲۵) حدّثنا قتیبة بن سعید انا عبدالعزیز بن محمّد عن سهیل ابن ابی صالح عن ابیه عن ابی هریرة انّه رای رسول اللّٰه ﷺ توضا من ثور اقط ثمّ رآه اکل من کتف شاة ثم صلی و لم یتوضّأ(۱).

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے پنیر کا ایک بڑا ٹکڑا کھانے کی وجہ سے وضوء فرمایا۔ پھر اس کے بعد اس نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ دنبے کے شانے کے گوشت سے کچھ تناول فرمایا۔ پھر نماز ادا کی اور وضوء کی تجدید نہیں کی۔

من ثور اقط (۲) ثور پنیر کے ٹکڑے یا پنیر کے بڑے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ اور اقط قاف کے ضمہ، کسرہ اور سکون تینوں صورتوں میں پنیر کو کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پنیر کا ٹکڑا کھا لینے کے بعد آپ ﷺ نے وضوء کیا۔

وضوء مما مست النار کا فقہی مسئلہ: ثم صلی اللّٰه علیه وسلم صلّی ولم یتوضا یعنی گوشت کھانے کے بعد آپ ﷺ نے وضوء کئے بغیر نماز ادا کی۔ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضوء لازم ہوتا ہے یا نہیں۔ یہ فقہی مسئلہ ہے۔ جمہور کا مذہب یہ ہے کہ مامسته النار کھانے سے وضوء لازم نہیں ہوتا۔ اس حدیث میں جمہور کیلئے دلیل موجود ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے آخری بار وضوء نہیں کیا گویا یہ حکم کبھی تھا۔ لیکن بعد میں منسوخ ہو گیا تھا۔ بلکہ یہ ممکن ہے کہ ابتداء پنیر سے وضوء کرنے کا کوئی اور سبب ہو۔ مثلاً آپ پہلے سے وضوء سے نہیں تھے یا آپ ﷺ نے استحباباً وضوء کیا ہوگا یا پھر یہاں پر وضوء لغوی مراد ہوگا۔ یعنی آپ ﷺ نے ہاتھ منہ دھویا ہو۔ لیکن نماز کے جواز کیلئے یہ بھی ضروری نہیں بلکہ استحباب کے درجہ میں

---

(۱) شرح معانی الاثار ۱/ ۶۷، ابن ماجة ص۳۷ کتاب الطهارة باب الرخصة فی ذلک، سنن نسائی ۱/ ۱۰۵، ۱۰۶، مسند احمد ۳۶۶ (مختار)

(۲) ثور الخ کے بارے میں علامہ مناویؒ نے لکھا ہے الثور هو قطعة من الشئ لأنّ الشئ اذا قطع من الشئ ثار عنه و ازال وفی القاموس الثور القطعة من الاقط فالاضافة لاغية وهو لبن یجمد بنار (المناوی علی هامش جمع الوسائل ۱/ ۲۷۱ (مختار)

ہوگا۔ان سب توجیہات میں سے سب سے اچھی توجیہ پہلی توجیہ ہے۔یعنی یہ کہ ابتداء آپ ﷺ نے وضوء واجب کہا تھا لیکن بعد میں مامسته النار سے وضوء کا وجوب منسوخ ہو گیا۔اور ثم کا کلمہ اس پر بہترین دلیل ہے۔

(۲۶) حدثنا ابن أبی عمر ثنا سفیان بن عیینة عن وائل بن داود عن أبیه و هو بکر بن وائل عن الزهری عن أنس ابن مالک قال أولم رسول اللّٰه ﷺ علی صفیة بتمرو سویق(۱)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے کھجور اور ستو سے حضرت صفیہؓ کا ولیمہ کیا تھا۔

اولم رسول اللّٰه ﷺ اولم ولم سے ہے جس کا معنی "جمع ہونا" اور "یکجا کرنا" ہے۔نکاح کے بعد بیوی کے پاس جانا بھی ولم ہے۔زندگی بھر کی وابستگی اور بندھن کی خوشی میں جو دعوت ہوتی ہے۔جمع ہونے کی مناسبت سے اسے بھی ولیمہ کہتے ہیں۔تو حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت صفیہؓ کے ساتھ نکاح کے بعد نبی کریم ﷺ نے دعوت کا اہتمام فرمایا۔

ام المؤمنین صفیہؓ اور اس کا ولیمہ: اولم علی صفیة ام المؤمنین حضرت صفیہؓ حیی بن اخطب کی صاحبزادی تھیں۔جو بنی نظیر کے سردار تھے۔نبی کریم ﷺ کے نکاح میں آنے سے قبل حضرت صفیہ یہود میں سلام بن مشکم اور اس کے بعد کنانہ بن ابی الحقیق کے نکاح میں تھی۔دونوں سے کوئی اولاد نہ تھی۔وہ حضرت ہارونؑ کی اولاد میں تھی۔ ۷ھ میں فتح خیبر کے بعد آپ کو قیدیوں میں لایا گیا۔ان کا خاوند کنانہ بن ربیع خیبر کی جنگ میں مارا گیا۔نبی کریم ﷺ نے مال غنیمت سے ان کو منتخب فرمایا۔اور پھر آزاد کر کے ان سے نکاح فرمایا۔

استیعاب میں علامہ ابن عبد البرؒ نے حضرت انسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ جب خیبر میں غنائم جمع

(۱)سنن ابی داؤد ۲/۱۷۰ کتاب الاطعمة باب فی استحباب الولیمة عندالنکاح، جامع ترمذی کتاب النکاح باب ماجاء فی الولیمة، سنن ابن ماجة ص۱۳۷ کتاب النکاح باب الولیمة(مختار)

کی گئیں۔تو حضرت دحیہ کلبیؓ نے نبی کریم ﷺ سے ایک باندی دینے کی درخواست کی آپ ﷺ نے فرمایا جاؤ ایک باندی لے لو۔چنانچہ وہ گئے اور حضرت صفیہؓ پر نظر انتخاب پڑی۔ادھر نبی کریم ﷺ کو بتایا گیا کہ صفیہؓ بنی قریظہ اور بنو نظیر کی سردار زادی ہے۔اور آپ ﷺ کے لائق ہے۔تب نبی کریم ﷺ نے حضرت دحیہؓ کو حکم دیا کہ وہ حضرت صفیہؓ کی جگہ کوئی اور باندی لے لے۔ بلکہ ملا علی قاریؒ اور علامہ بیجوریؒ لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ نے حضرت دحیہؓ کو بدلہ میں سات باندیاں دیدیں۔پھر اس کو آزاد کر کے نکاح کیا اور آزادی ہی کو مہر بنا دیا۔

علامہ ابن حجرؒ الاصابہ میں روایت کرتے ہیں کہ حضرت صفیہؓ نے خیبر میں خواب دیکھا کہ چاند اتر کر میری جھولی میں آگرا ہے۔ یہ خواب انہوں نے اپنی ماں (۱) سے بیان کیا۔تو ماں نے ایک زوردار تھپڑ منہ پر مارتے ہوئے کہا کہ تو چاہتی ہے کہ عرب کے بادشاہ سے بیاہی جائے۔اس تھپڑ کا اثر نبی کریم ﷺ کے نکاح میں آنے تک ان کے چہرے پر موجود تھا۔اس وقت آپؓ کی عمر تقریباً سترہ برس تھی۔اللہ تعالیٰ نے حسن سے بھی نوازا تھا۔پہلی دفعہ مدینہ آنے کے بعد مدینہ کی عورتیں بکثرت دیکھنے کے لیے آپؓ کے ہاں آتی رہیں۔حضرت عائشہؓ بھی نقاب اوڑھ کر اور دیگر عورتوں میں چھپ چھپا کر حارثہ بن نعمانؓ کے گھر دیدار کے لیے گئیں۔ جہاں پر قدومِ مدینہ کے دنوں حضرت صفیہؓ کو رکھا گیا تھا۔

بتمر و سویق نکاح کے موقع پر آپ ﷺ نے راستہ ہی میں صحابہؓ کی دعوت ولیمہ کی۔اور سفر کے دوران ہی ایک جگہ قیام کر کے کھجور اور ستو جو کچھ حاضر تھا حاضرین کو کھلایا۔ بخاری کی روایت میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے حیس کا ولیمہ کھلایا۔حیس ایک قسم کا حلوا ہوتا ہے جو کھجور، ستو، گھی اور پنیر وغیرہ سے بنایا جاتا ہے۔بعض روایات میں پنیر کا ذکر بھی ہے۔لیکن ان روایات میں تطبیق آسان ہے۔ کیونکہ یہ دراصل ایک اجتماعی قسم کی دعوت تھی۔آپ ﷺ نے دستر خوان بچھا کر سب کو دعوت دیدی۔اور آنے والے صحابہؓ اپنے ساتھ کئی چیزیں لائیں۔کوئی کھجور لایا تو کوئی ستو۔کسی نے پنیر کا حصہ شامل کر دیا تو کسی کے پاس حیس ہوگی جو پیش کر چکا ہوگا اور پھر اجتماعی طور پر کھالیا۔اسی لئے روایات میں مختلف اشیاء کا ذکر ہے۔

---

(۱) علامہ بیجوریؒ نے ماں کی جگہ باپ کا ذکر کیا ہے۔لیکن الاصابہ میں ماں کا ذکر ہے۔ (اصلاح الدین)

(۲۷) حدّثنا الحسن بن محمّد البصری ثنا الفضیل بن سلیمان حدّثنی فائد مولیٰ عبیداللّٰہ بن علی بن أبی رافع مولیٰ رسول اللّٰہ ﷺ قال حدّثنا عبیداللّٰہ بن علی عن جدته سلمیٰ أنّ الحسن بن علی و ابن عباس و ابن جعفر أتوھا فقالو ا لھا اصنعی لنا طعاما ممّا کان یعجب رسول اللّٰہ ﷺ ویحسن اکله فقالت یا بُنَی لا تشتھیه الیوم قال بلیٰ اصنعیه لنا قال فقامت فاخذت شیئا من الشعیر فطحنته ثمّ جعلته فی قدرٍ و صبت علیه شیئا من زیت و دقّت الفلفل و التوابل فقرّبته الیھم فقالت ھذا ممّا کان یعجب النبیّ ﷺ و یحسن اکله(۱).

حضور اقدس ﷺ کے ساتھ کھانے کا عملی نمونہ:

ترجمہ: سلمیٰؓ کہتی ہیں کہ حسن بن علیؓ، حضرت عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن جعفرؓ ان کے پاس آئے۔ اور کہا کہ ہمارے لئے وہ کھانا تیار کرلو جو حضور ﷺ کو پسند تھا۔ اور آپ ﷺ اسے رغبت سے کھاتے تھے۔ سلمیٰؓ نے کہا کہ بیٹے! آج تم وہ کھانا پسند نہیں کروگے۔ انہوں نے کہا کہ کیوں نہیں۔ تم ہمارے لیے پکاؤ (تو) وہ اٹھیں اور کچھ جو لے کر اسے پیسا۔ پھر اسے ہانڈی میں ڈالا اور اوپر سے زیتون کا تیل تھوڑا ڈال دیا۔ اور کچھ مرچ مصالحہ بھی پیس کر ملا دیا پھر ان کے سامنے پیش کیا۔ اور کہا کہ یہ کھانا ہے جو نبی کریم ﷺ کو پسند ہوتا تھا اور آپ ﷺ اسے رغبت سے تناول فرماتے تھے۔

حضرت سلمیٰؓ سلمیٰ حضرت صفیہ بنت عبدالمطلبؓ کی آزاد کردہ اور ایک قول کے مطابق خود نبی کریم ﷺ کی آزاد کردہ باندی تھیں۔ اور نبی کریم ﷺ کے آزادہ کردہ غلام حضرت ابورافعؓ کی بیوی تھی۔ نبی کریم ﷺ کی خدمت کیا کرتی تھی۔ بالخصوص کھانا پکانے میں ازواج مطہرات کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ علاوہ ازیں اہل بیت کے بچوں کی خدمت بھی آپؓ کے سپرد تھی۔ حضرت ابراہیم بن النبی ﷺ اور حسنینؓ کی بچپن میں خدمت کی۔ حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد غسل بھی آپؓ نے دیا۔

---

(۱) المعجم الکبیر للامام الطبرانی ۲۹۹/۲۲ (مختار)

یابُنَیّ بعض شرّاح کہتے ہیں کہ یہ باء کے فتحہ اور نون کے کسرہ کے ساتھ جمع کا صیغہ ہے۔ جو یاء متکلم کی طرف مضاف ہے۔ اصل میں بنین تھا۔ لیکن اکثر شرّاح نے اسے مفرد مصغر مضاف الی یاء المتکلم قرار دیا ہے اور یہی راجح بھی ہے۔ کیونکہ بعد میں تشتھیہ کا صیغہ بھی مفرد مخاطب کا ہے۔ گویا حضرت سلمیٰؓ نے تینوں میں سے کسی ایک کو مخاطب کیا جو کہ درخواست پیش کرنے والے تھے۔ یا ان میں سے سے بڑے یعنی حضرت حسن بن علیؓ کو مخاطب کیا تھا۔

لا تشتھیہ الیوم مطلب یہ ہے کہ تم یہ مطالبہ چھوڑ دو۔ تم اُس زمانے کے نہیں ہو۔ وہ تکلیف برداشت نہیں کر سکتے جو کہ نبی کریم ﷺ برداشت کیا کرتے تھے۔ آج تم وہ کھانا کھانا پسند نہیں کرو گے۔ کیونکہ زمانہ بدل گیا ہے۔ وسعت اور فراخی آچکی ہے۔ اس لئے وہ فقر کا کھانا کون پسند کرے گا۔ ہمارے یہاں بھی یہی حالت ہے۔

ہمارے حضرت شیخ الحدیثؒ (والد ماجدؒ) فرماتے تھے کہ چھچھ کے علاقے میں ہم نے طالب علمی کے دوران جوار اور باجرے کی روٹی اور لسی سے روزے رکھے ہیں۔ چارے کا ساگ پکایا کرتے تھے۔ حضرت نانوتویؒ اور حضرت علامہ گنگوہیؒ دہلی میں بھوک کی شدت کی وجہ سے رات کو شہر سے باہر نکلتے اور سبزی فروش جو خراب سبزی باہر پھینک دیتے تھے۔ اس سے قابل استعمال سبزی جمع کر کے پکاتے اور کھا لیتے۔ جبکہ آج ہم نہایت تنعم کی زندگی گزار رہے ہیں۔

بہر حال حضرت سلمیٰؓ نے بھی یہ فرمایا کہ آج تمہارا دل اس کھانے کو نہیں چاہے گا۔ اب تنعم کا زمانہ ہے کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا کے تمام مسلمان اہل بیت پر جان چھڑکتے تھے۔ نبی ﷺ کے ساتھ نسبت کے سبب تمام صحابہ بھی ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ تو چونکہ یہ حضرات لذیذ اور اچھے کھانے دیکھ چکے تھے اس لئے حضرت سلمیٰؓ نے کہہ دیا کہ تم وہ پسند نہیں کرو گے۔ **بلی اصنعیہ لنا الخ** تینوں حضرات نے اپنی فرمائش دہرائی کہ نہیں بلکہ ہمارے لیے وہ کھانا تیار کرو ہم ضرور کھائیں گے۔ جس پر حضرت سلمیٰؓ نے اٹھ کر جو لیا۔ اسے پیسا۔ پھر اسے ہانڈی میں ڈال کر تیل زیتون تھوڑی مقدار میں ملا دیا۔ پھر سیاہ مرچ اور مصالحہ ملا کر اسے ابالا (۱)۔ اس سے جو کھانا تیار ہوا حضرت سلمیٰؓ کے قول کے مطابق یہی نبی کریم ﷺ کی محبوب غذا تھی۔

---

(۱) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مرچ مصالحہ اور لذیذ کھانا خلاف سنت نہیں۔ (مختار)

(۲۸) حدثنا محمود بن غیلان ثنا أبو أحمد ثنا سفیان عن الأسود بن قیس عن نبیح العنزی عن جابر بن عبداللّٰہ قال اتانا النبیّ ﷺ فی منزلنا فذبحنا له شاۃ فقال کانهم علموا انا نحب اللحم و فی الحدیث قصۃ(۱)۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہمارے پاس ہمارے گھر تشریف لائے ہم نے ایک دنبہ ذبح کردیا۔ نبی کریم ﷺ نے (تفرحاً) فرمایا کہ گویا ان لوگوں کو پتہ تھا کہ ہمیں گوشت پسند ہے (امام ترمذی کہتے ہیں کہ) اس حدیث میں قصہ ہے (جو اختصاراً متروک ہے)

فذبحنا له شاۃ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے آنے کے بعد حضرت جابرؓ نے دنبہ ذبح کردیا جبکہ غزوۂ خندق کے قصہ میں تصریح ہے کہ وہاں نبی کریم ﷺ کے آنے سے قبل ہی کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس لیے بعض شرّاح جیسے علامہ مناویؒ وغیرہ نے لکھا ہے کہ یہ کوئی اور واقعہ ہے۔ لیکن ملا علی قاریؒ نے اس کا تین طرح سے جواب دیا ہے۔ اول یہ کہ یہاں **اتانا** سے مراد "**اراد ان یاتینا**" ہوگا۔ دوم: یہ کہ ہوسکتا ہے کہ غزوۂ خندق کے موقع پر جب حضرت جابرؓ نے دیکھا کہ خلاف توقع آنے والے صحابہ بہت زیادہ ہیں۔ تو دوسرا دنبہ نبی کریم ﷺ کی آمد کے بعد ذبح کیا ہو۔ سوم: یہ کہ ہوسکتا ہے اسی روز نبی کریم ﷺ پہلے اتفاقاً یا کسی دوسرے کام کی غرض سے حضرت جابرؓ کے پاس آئے ہوں۔ اور واپسی کے بعد حضرت جابرؓ نے دنبہ ذبح کرکے دوبارہ کھانے پر آپ ﷺ کو بلایا ہو۔

کانّهم علموا الخ یہ محض میزبان کی دلداری اور اس عمل پر اظہار مسرت کے طور پر فرمایا۔

<u>معجزۂ تکثیر طعام</u>: **وفی الحدیث قصۃ الخ** وہ قصہ یہ ہے کہ غزوۂ خندق کے موقع پر حضرت جابرؓ نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ سخت بھوکے تھے۔ تو آپ ﷺ کو کھانا کھلانے کا ارادہ کیا۔ گھر گئے دنبہ ذبح کیا۔ اور

---

(۱) سنن ابی داؤد کتاب الصلوٰۃ باب الصلاۃ علی غیر نحر المرء، مسند احمد ۳/۳۰۳، السنن الکبریٰ للنسائی کتاب الیوم واللیلۃ، سنن دارمی ۲/۲۵۲، صحیح ابن حبان رقم الحدیث ۱ ۵۹ مسند احمد ۳/۳۰۳ (مختار)

بیوی کو کھانا بنانے کا حکم دیا۔خود چھپکے سے نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور انہیں دعوت دی کہ میں نے طعام کا بندوبست کیا ہے۔آپ ﷺ تشریف لے آئیں۔ نبی کریم ﷺ نے تمام صحابہؓ میں اعلان فرمایا کہ حضرت جابرؓ نے دعوت کا اہتمام کیا ہے سب آؤ،اور تقریباً ایک ہزار افراد کو لے کر نبی کریم ﷺ حضرت جابرؓ کے گھر گئے حضرت جابرؓ یہ دیکھ کر سخت پریشان ہوئے کہ میں نے تو ایک چھوٹی سی ہانڈی پکانے اور چند آدمیوں کا کھانا تیار کرنے کا کہا ہے۔اب یہ سینکڑوں آدمیوں کے لیے کیسے کافی ہوگا۔گھر دوڑے آئے بیوی کو ماجرا سنایا اس نے کہا کہ اگر یہ نبی کریم ﷺ نے بلائے ہیں تو خود ہی وہ انتظام بھی فرمائیں گے۔وہ جانے اور اُن کا کام جانے۔اب ہوسکتا ہے کہ گھر آکر حضرت جابرؓ نے دوسرا دنبہ بھی ذبح کیا ہو۔پھر نبی کریم ﷺ آئے تو حکم دیا کہ ہانڈی پر ڈھکنا رکھ دو۔کھانے پر بھی دم کیا۔حضرت جابرؓ نے تمام صحابہ کو کھلایا۔وہ قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ان کی ہانڈی پہلے کی طرح بھری ہوئی تھی یعنی ان کو اس میں کسی کمی کا احساس نہیں ہوا۔

اسمیں تکثیر طعام کا معجزہ بھی ظاہر ہوا جو کئی بار نبی کریم ﷺ سے صادر ہوا ہے۔

(۲۹) حدثنا ابن ابی عمرثنا سفیان ثنا عبداللّٰہ بن محمّد بن عقیل سمع جابرا قال سفیان و انا محمّد بن المنکدر عن جابر قال خرج رسول اللّٰہ وأنا معہ فدخل علی امراۃٍ من الانصار فذبحت لہ شاۃً فاکل منھا و اتتہ بقناع من رطبٍ فأکل منہ ثم توضّا للظھر و صلیٰ ثم انصرف فاتتہ بعلالۃٍ من علالۃ الشاۃ فاکل ثم صلی العصر و لم یتوضّا(۱)۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ایک بار نبی کریم ﷺ گھر سے نکلے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ ایک انصاری عورت کے مکان پر تشریف لے گئے۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے لیے ایک دنبہ ذبح کیا۔ نبی کریم ﷺ نے اس کے گوشت میں سے کچھ کھایا۔ پھر انہوں نے چنگیری میں تازہ کھجور لاکر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش

---

(۱)جامع ترمذی ۱/۱۱۶ کتاب الطھارۃ باب ما جاء فی ترک الوضوء ممّامست النار، السنن الکبریٰ للبیھقی ۱/۱۵۶ کتاب الطھارۃ،مسنداحمد ۳/۲۴۲(مختار)

کی۔تو آپ ﷺ نے اس میں سے بھی کچھ لیا۔اس کے بعد آپ ﷺ نے ظہر کی نماز کے لیے وضوء کیا اور نماز ادا کی۔ پھر آپ ﷺ واپس تشریف لائے تو وہ عورت دنبے کے باقی ماندہ گوشت میں سے کچھ گوشت لے آئی۔ آپ ﷺ نے اسے تناول فرمایا۔ پھر آپ ﷺ نے عصر کی نماز پڑھی اور (دوبارہ) وضوء نہیں فرمایا۔

فدخل علی امرأۃ الخ مدینہ کے گردونواح میں باغ تھے۔اور بعض صحابہ کے گھر بھی تھے۔ جہاں اس عورت کا گھر بھی تھا۔آپ ﷺ شاید اس عورت کی دعوت پر وہاں گئے ہونگے۔یا کسی دوسری غرض سے وہاں گئے تھے۔**قناع من رطب** قناع کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی اس چنگیر کو کہتے ہیں جس میں عموماً کھجور وغیرہ رکھ کر کھائے جاتے ہیں۔**فاتته بعلالة** علالة اس تھوڑے سے کھانے کو کہتے ہیں جو کہ معمول کے کھانے سے قبل محض بھوک مٹانے کی خاطر کھایا جائے۔ جیسے ناشتہ یا مہمانوں کی پہلی بار آمد کے موقع پر چائے بسکٹ وغیرہ یا آج کل سوپ یا سلاد۔لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ چونکہ اس عورت نے دعوت کی ہے۔ آپ ﷺ ایک دفعہ کھانا کھا چکے ہیں لیکن اظہار محبت کی خاطر اس عورت نے مزید کھلانا چاہا۔تاکہ واپس جانے سے قبل آپ ﷺ کچھ اور بھی تناول فرمالیں۔لہٰذا جو گوشت باقی تھا وہ بھی رکھ دیا۔اور آپ ﷺ نے دوبارہ کھالیا۔معلوم ہوا کہ اگر ضرورت ہو تو کسی کی دلجوئی کی خاطر مزید کھانا بھی جائز ہے(۱)۔

(۳۰) حدّثنا العباس بن محمّد الدوری ثنا یونس ابن محمّد ثنا فلیح بن سلیمان عن عثمان بن عبدالرحمٰن عن یعقوب بن أبی یعقوب عن أم المنذر قالت دخل علی رسول اللّٰہ ﷺ ومعه علیّ ولنا دوال معلقة قالت فجعل رسول اللّٰہ ﷺ یاکل وعلیّ معه یاکل فقال رسول اللّٰہ ﷺ لعلیّ مه یا علیّ فانّک ناقه قالت فجلس علیّ

---

(۱)اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت جانور کو ذبح کر سکتی ہے۔اور عورت کے ہاتھ کا ذبیحہ حلال ہے۔اگرچہ وہ حالت حیض یا نفاس میں ہو۔عوام الناس میں یہ غلط مشہور ہے کہ عورت ذبح نہیں کر سکتی۔اور اس کے ہاتھ کا ذبیحہ حرام ہے۔(مختار)

والنبی ﷺ یاکل قالت فجعلت لھم سلقاً و شعیراً فقال رسول اللہ ﷺ لعلی یا علی من ھذا فاصب فانّہ اوفق لک(۱)۔

ترجمہ: ام المنذر ؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ میرے پاس تشریف لائے۔ حضرت علیؓ بھی ساتھ تھے۔ ہمارے یہاں کھجور کے خوشے لٹکے ہوئے تھے۔ نبی کریم ﷺ (ان خوشوں میں سے چن چن کر کھجور) کھانے لگے۔ اور حضرت علیؓ بھی آپ ﷺ کے ساتھ کھانے لگے۔

آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو فرمایا تم مت کھاؤ۔ اے علیؓ تم (بیماری گزار کر) کمزور ہو چکے ہو۔ ام المنذر ؓ کہتی ہیں پس علیؓ بیٹھ گئے اور نبی کریم ﷺ کھاتے رہے۔ کہتی ہیں کہ پھر میں نے ان کے لئے چقندر اور جو کا کھانا تیار کیا۔ تو نبی کریم ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا اے علیؓ اس سے کھاؤ۔ یہ تمہارے لیے مناسب ہے۔

امّ المنذرؓ: ان کا نام سلمیٰ بنت قیس بن عمرو ہے۔ کنیت سے مشہور ہیں۔ مشہور بدری صحابی سلیط بن قیس کی بہن ہیں۔ بیعت رضوان میں بھی شرکت کر چکی ہے۔ باپ کی جانب سے نبی کریم ﷺ کی خالاؤں میں سے تھی۔ انصار کے بنو النجار قبیلہ سے تعلق تھا۔ نبی کریم ﷺ سے کچھ اور روایات بھی ان کے واسطہ سے مروی ہیں۔ علامہ مناویؒ نے ان کا نام سلمۃ بنت قیس لکھا ہے۔ جو اسماء الرجال کی کتابوں میں نہیں ملتا۔

کھانے پینے میں حالۃ صحت و مرض کا خیال: **ولنا دوال معلقۃ دوال دالیہ** کی جمع ہے جو کھجور کے اس خوشے کو کہتے ہیں جسے نیم پختہ حالت میں درخت سے کاٹ کر لٹکایا جائے۔ اور پختہ ہونے پر اس سے کھجور کھائی جائے۔ خود دول کے مادے میں تعلیق کا مفہوم موجود ہے کنویں کے کنارے لٹکی ہوئی بالٹی کو بھی دالیہ کہا جاتا ہے۔ اس لیے بعد میں معلقۃ کا لفظ ذکر کرنے سے دالیۃ میں تجرید ہوگی۔ اور یہ صرف خوشے کے معنی میں لی جائیگی۔ مطلب یہ ہوا کہ کھجور بھرے خوشے باغ میں لٹک رہے تھے۔

---

(۱) جامع ترمذی کتاب الطب باب ماجاء فی الحمیۃ، سنن ابی داؤد ۲/۱۸۳ کتاب الطب باب الحمیۃ سنن ابن ماجۃ ص ۲۴۵ ابواب الطب باب الحمیۃ، مصنف ابن ابی شیبۃ ۷/۴۳۷ (مختار)

مہ یاعلی مہ منع کرنے کے لیے استعمال ہونے والا کلمہ ہے۔فانک ناقہ یعنی تم کمزور ہو۔اس لئے کھجور مت کھاؤ۔نقاہت اس متوسط حالت کو کہتے ہیں جو بیماری سے شفایاب ہو جانے اور صحت کاملہ کے درمیان ہوتی ہے۔شاید حضرت علیؓ اس سے قبل بیمار رہ چکے ہوں۔لہٰذا نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ابھی تو بیماری گزار چکے ہو۔اس لئے فی الحال کھجور جیسی ثقیل اور گرم چیز سے پرہیز کرنا چاہیے۔ جو نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے(۱)۔

سلقا و شعیراً سلق چقندر کو کہتے ہیں۔من ھذا فاصب یعنی یہ کھانا تیرے مزاج کے موافق ہے۔اطباء نے چقندر اور جو کے فوائد بیان کی ہیں۔ برودت اور نرمی کی نقاہت کے لیے یہ بہت مفید ہیں۔

(۱۳۱) حدثنا محمود بن غیلان ثنا بشر بن السریّ عن سفیان عن طلحة بن یحییٰ عن عائشة بنت طلحة عن عائشة أمّ المؤمنین قالت کان النبیﷺ یا تینی فیقول أعندک غداءٌ فاقول لا قالت فیقول إنّی صائم قالت فاتانا یوما فقلت یا رسول اللہﷺ انّہ اھدیت لنا ھدیة قال وماھی قلت حیس قال اما إنّی اصبحت صائماً قالت ثم اکل(۲)۔

ترجمہ: ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ میرے ہاں آکر پوچھتے تھے۔کیا کھانے کے لیے کچھ آپ کے پاس ہے؟ پھر جب میں کہتی کہ نہیں ہے تو آپ ﷺ فرماتے کہ میں روزہ رکھتا ہوں۔ ایک دن وہ میرے پاس تشریف لائے۔تو میں نے کہہ دیا کہ ہمارے پاس ایک ہدیہ بھیجا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا چیز ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حیس ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے تو صبح سے روزہ کا ارادہ کر رکھا تھا۔فرماتی ہیں کہ پھر حضور ﷺ نے اسے تناول فرمایا۔

---

(۱)اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسباب کی رعایت توکل کے منافی نہیں،علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے ویؤخذ من ھذا ان التداوی مشروع ولاینافی التوکل(المواھب اللدنیة ص۱۱۸)(مختار)

(۲)صحیح مسلم ۱/۳۶۴ کتاب الصیام باب جواز صوم النافلة بنیة من النھار قبل الزوال الخ، سنن ابی داؤد ۱/۳۴۰ کتاب الصوم باب فی الرخصة ذلک، سنن النسائی ۱/۳۲۰ کتاب الصیام باب فی باب صیھام المتطوع(مختار)

عائشة بنت طلحة: یہ تابعیہ ہیں۔عائشہ صدیقہؓ کی شاگرد ہیں۔انتہائی حسین وجمیل عورت تھی۔ مصعب بن زبیرؓ نے دس لاکھ درہم (۱) دے کر اس سے نکاح کیا۔ان کے قتل ہونے کے بعد عمر بن عبداللہ تیمی نے ایک لاکھ دینار پر آپؓ سے شادی کی۔اوران کے بعد اپنے چچازاد بھائی عمر بن عبیداللہؓ سے شادی کی۔انھوں نے بھی ایک لاکھ دینار مہر دیا۔

ام المومنین ازواج مطہرات کوام المومنین اس لئے کہاجاتا ہے کہ وہ دیگر مؤمنین پر ماں کی طرح حرام ہیں۔یا اس لئے کہ والدہ کی طرح قابل احترام ہیں۔نیز وہ امت پر والدہ کی طرح رحیم وشفیق بھی ہیں۔

نفلی روزہ کے افطار کا مسئلہ: **أعندک غداء** غداء صبح سے لے کر دوپہر تک کے وقت میں کھانے کا نام ہے۔لیکن کبھی کبھی مطلق کھانے کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔لیکن یہاں اول الذکر متعین ہے کیونکہ روزہ کی نیت اسی وقت میں کی جاسکتی ہے۔چونکہ نبی کریم ﷺ کی حضرت عائشہؓ سے زیادہ محبت کا صحابہؓ کو علم تھا۔اس لیے وہ ہدایا بھیجنے میں حضرت عائشہؓ کی باری (قسم) کا لحاظ رکھتے تھے۔تاکہ نبی کریم ﷺ ہدایا کو ان کے ہاں سے کھائیں۔یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ کو حضرت عائشہؓ کے ہاں کچھ نہ کچھ کھانے کو مل جاتا۔اور یہاں پر حضرت عائشہؓ کی مراد بھی غالباً یہی معلوم ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کھانے کی توقع رکھتے ہوئے فرمائش کر دیتے تھے۔

قلت حَیس حیس ایک قسم کا حلوا ہوتا تھا۔جو کھجور،گھی اور پنیر یا آٹے کو ملا کر بناتے تھے۔**اما إنیّ اصبحت صائما** یعنی اگرچہ صبح سے روزہ کی نیت کر لی تھی لیکن یہ روزہ عموماً بغیر کچھ کھائے رکھا جاتا تھا۔ لہٰذا جب کچھ کھانے کو ملا۔تو اب روزہ افطار کر کے حیس کھالوں گا۔روزہ کی قضاء دوسرے دن ہو جائے گی۔جبکہ بعض شراح نے ترجمہ یہ کیا ہے کہ روزہ تو نہیں رکھا تھا۔البتہ روزہ رکھنے کا ارادہ تھا۔لیکن اب حیس کھانا ہی مناسب سمجھتا ہوں۔یہ ترجمہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ احناف کے نزدیک نفل روزہ شروع کرنے سے واجب ہو جاتا ہے۔تو پہلی تشریح کے مطابق افطار کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

---

(۱) شذرات میں مصعب بن زبیرؓ کی طرف سے دیا جانے والا مہر بھی ایک لاکھ دینار لکھا ہے۔(اصلاح الدین)

لیکن اول الذکر تشریح پر بھی جواب ممکن ہے۔ وہ یوں کہ ضرورت کے وقت نفلی روزہ توڑنا جائز ہے اگرچہ اس کی قضاء لازم ہوجاتی ہے۔ بقیہ مباحث اور دلائل فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں ۔۔۔۔ اس حدیث سے ایک اور مسئلہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص مفطراتِ صوم سے اجتناب کر چکا ہو تو نفلی روزہ کی نیت نصف النہار تک کر سکتا ہے۔ اس طرح یہ حدیث امام مالکؒ پر حجۃ ہوگی جو کہ تبیت یعنی رات ہی سے نیت کرنے کو شرط کہتے ہیں۔

(۳۲) حدثنا عبداللّٰه بن عبدالرحمٰن ثنا عمر بن حفص ابن غيّاث ثنا أبي عن محمّد بن أبي يحيٰى الأسلمّي عن يزيد بن أبيّ أمية الأعور عن يوسف بن عبداللّٰه بن سلام عن عبداللّٰه بن سلام قال رأيت النبي ﷺ أخذ كسرة من خبز الشعير فوضع عليها تمرة ثمّ قال هذه إدام هذه فأكل (۱)۔

ترجمہ: یوسف بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ جو کی روٹی کا ٹکڑا اٹھا کر اس پر ایک کھجور رکھ دی۔ پھر فرمایا کہ یہ کھجور اس روٹی کا سالن ہے۔ اور پھر تناول فرمایا۔

یوسف بن عبداللہؓ: عام نسخوں میں یہ حدیث یوسفؓ سے مروی ہے۔ جبکہ بعض نسخوں میں ''یوسف بن عبداللہ بن سلام عن عبداللہ بن سلام'' ذکر ہے۔ اکثر شراح نے پہلے نسخے کی تصحیح کی ہے۔ علامہ ابن حجرؒ نے الاصابہ میں اور علامہ ابن عبدالبرؒ نے استیعاب میں اس حدیث کو یوسف بن عبداللہؓ کو منسوب کی ہے۔ نیز امام ابوداؤدؒ نے اسے یوسفؓ سے روایت کیا ہے۔

یہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے بیٹے ہیں۔ صغرسنی میں نبی کریم ﷺ کو دیکھا تھا اور کچھ ادائیں محفوظ کر لی تھیں۔ ولادت کے بعد حضرت عبداللہ بن سلامؓ انہیں نبی اکرم ﷺ کے پاس لے آئے۔ آپ ﷺ نے اسے اٹھایا اور اس کا نام یوسف رکھ دیا اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ خلافت میں وفات پائی۔

---

(۱) السنن الكبرىٰ للبيهقي ۱۰/۶۳، المعجم الكبير للطبراني ۲۲/۲۸۶ (مختار)

عبداللہ بن سلامؓ: مشہور صحابی ہیں۔ بنوقینقاع سے تعلق تھا۔ حضرت یوسفؑ کی اولاد میں سے تھے۔ لہٰذا نسبتاً بنی اسرائیلی تھے۔ لیکن خزرج کے حلیف ہونے کی وجہ سے کبھی خزرجی بھی کہا جاتا ہے۔ اصل نام حصین تھا۔ نبی کریم ﷺ نے تبدیل کر کے عبداللہ رکھ دیا۔ یہود کے جید علماء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں نبی کریم ﷺ کی آمد کے بعد حاضر ہوئے تو بے اختیار بول پڑے "ماھذا الوجہ بوجہِ کذاب" پھر اسلام لے آئے۔ اور نبی کریم ﷺ سے کہا کہ میں یہود کا سردار ہوں۔ اور ان سے میں زیادہ علم رکھنے والا ہوں۔ آپ ﷺ ان سے میرے بارے میں ان کو میرے اسلام کی خبر پہنچنے سے قبل پوچھ لیں۔ تو یہود بھی اس کا اعتراف کریں گے۔ گویا یہود کی تعصب پر پہلے دن ہی سے نبی کریم ﷺ کو خبردار کیا۔ نبی کریم ﷺ نے ان کو جنت کی بشارت دیدی تھی۔ ۴۳ھ میں مدینہ میں وفات پائی۔

تعریف ادام نہیں بلکہ قناعت مطلوب ہے: ھذہ ادام ھذہ یعنی یہ تمرۃ (کھجور) بھی سالن ہے۔ نبی کریم ﷺ لغوی یا عرفی امور کو بیان کرنے کے لیے نہ مبعوث ہوئے تھے نہ یہاں یہ مقصد ہے۔ بلکہ مقصد یہاں قناعت کی تعلیم دینا ہے۔ اس لیے حقیقت یہ ہے کہ یہاں پر کھجور کو مجازاً ادام کہا گیا ہے۔ یعنی اگرچہ یہ لغۃً وعرفاً ادام نہیں لیکن قناعت کا تقاضا یہ ہے کہ اسے ادام سمجھ لینا چاہئے۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس حدیث سے شوافع کا مذہب قطعاً ثابت نہیں ہوتا کہ کھجور ادام ہے اور قسم کے باب میں ادام سے قسم کھجور کو شامل ہوگا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو پھر یہ کلام بے مقصد رہ جاتا۔

(۴۳) حدثنا عبداللّٰہ بن عبدالرحمٰن ثنا سعید بن سلیمان عن عبّاد بن العوام عن حمید عن أنس بن مالک انّ رسول اللّٰہ ﷺ کان یعجبہ الثفل قال عبداللّٰہ یعنی ما بقی من الطعام(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ کو بچا ہوا کھانا پسند ہوتا تھا۔

یعجبہ الثفل ثفل کا ترجمہ خود راوی کر رہے ہیں۔ دراصل مائع چیز میں جو مادہ نیچے بیٹھ جاتا ہے اسے ثفل کہتے ہیں۔ لیکن کھانا کھانے کے بعد جو تھوڑا کھانا برتن میں رہ جاتا ہے اسے بھی ثفل کہتے ہیں۔ اور

(۱) مسند احمد ۲۲۰/۳، شرح السنۃ للبغوی ص ۳۰۲ حدیث نمبر ۲۸۵۷ (مختار)

یہاں یہ مراد ہے۔اسے پسند کرنے کی کئی وجوہ ہیں۔مثلاً عموماً یہ زیادہ پختہ اور ہضم کے قریب ہوتا ہے۔لذیذ بھی زیادہ ہوتا ہے۔نیز متکبرین ایسے باقی ماندہ کھانے کو معیوب سمجھتے ہیں۔اس لیے آپ ﷺ کا اسے کھانا تواضع سے زیادہ قریب ہے۔پھر گھی، تیل، چکناہٹ سالن کے اوپر اوپر ہوتا ہے جس کا مضر ہونا معلوم ہے۔اور کم چکناہٹ کی وجہ سے سالن کا نچلا حصہ زیادہ مناسب رہتا ہے۔

بعض لوگوں نے یہاں ثفل کا ترجمہ ثرید سے کیا ہے۔لیکن باوجود یہ کہ ثرید نبی کریم ﷺ کا محبوب تھا۔لیکن اول الذکر ترجمہ اولیٰ ہے۔

(وصلی اللہ تبارک و تعالیٰ علی حبیبہ محمد وعلی آلہ و صحبہ و اتباعہ اجمعین)

خلاصہ باب

اس باب میں ان اشیاء کا بیان ہے جن کو نبی کریم ﷺ نے بطور سالن استعمال فرمایا ہے۔خواہ وہ عرفاً سالن ہو یا نہ ہو۔مثلاً گوشت کا ذکر ہے جس کو آپ ﷺ نے ادام کی حیثیت سے استعمال کیا ہے۔پھر گوشت میں دنبے، مرغی، حباریٰ (تلور) جیسے حیوانات کا گوشت اور دنبے کے گوشت کے بعض ان حصوں کا بیان ہے جن کو نبی کریم ﷺ نے پسند کر کے تناول فرمایا۔مثلاً ذراع (پنڈلی)، پہلو (پسلیوں) اور کمر کا اُبالا ہوا۔اور بھنا ہوا گوشت آپ ﷺ تناول فرما چکے ہیں۔نیز یہ بھی بیان ہے کہ ذراع کا گوشت آپ ﷺ کو پسند تھا مگر کیوں؟

اسی طرح اس باب میں ادام کے سلسلے میں آپ ﷺ کی سادگی اور قناعت کو خوب واضح کر دیا گیا ہے چنانچہ سرکہ، روغن زیتون، شہد، پنیر، ستو کے ساتھ کھجور، کدو، اس کا شوربہ اور جو کی روٹی کے ساتھ کھجور کا بطور سالن استعمال اس باب میں مذکور ہیں جو انتہائی بے تکلفی کا مظہر ہے۔اور اسی اختیاری سادگی کو اجاگر کرنے کے لیے آپ ﷺ نے سرکہ کو بہتر سالن کہا ہے۔اس کو بیان کرنے کیلئے غریبوں کی دعوت قبول کرنے کا ذکر ہے۔اور اس پر تنبیہ کے لیے حضرت سلمیٰؓ اہل بیت کے صاحبزادوں کیلئے نبی کریم ﷺ کے معمول کی غذا حیس کو تیار کرنے سے کترا رہی ہیں۔

البتہ بعض چیزوں میں نبی کریم ﷺ کی طبعی رغبت کا اظہار کر کے آپ ﷺ کی فطرتِ سلیمہ کے حسنِ انتخاب کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔مثلاً ذراع کے گوشت، ثفل، ثرید، شہد اور دیگر میٹھی اشیاء کی پسندیدگی سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ بشری تقاضوں سے بالاتر اور مشتہیات سے مستغنی نہ تھے۔بلکہ اس سلسلے میں طبع سلیم کے مالک تھے۔صرف فقرِ اختیاری اور ذوق قناعت ہی آپ ﷺ کی سادگی کا باعث تھا۔

''اللھم فصل علیه صلوٰةً ترضاھاله''

۲۷۔ باب ما جاء فی صفة وضوء رسول اللهﷺ

حضور اقدس ﷺ کے (وضوء) ہاتھ منہ دھونے کا بیان

وضوء سے مراد اس مقام پر لغوی وضوء ہے۔اصطلاحی وضوء مراد نہیں ہے(۱)۔اور عند الطعام کے معنی کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہیں۔دونوں کا ذکر آئے گا۔

(۱) حدثنا أحمد بن منیع ثنا إسماعیل بن ابراهیم عن أیوب عن ابن ابی ملیکة عن ابن عباسؓ انّ رسول اللهﷺ خرج من الخلاء فقرب إلیه الطعام فقالوا ألا ناتیک بوضوء قال انّما امرت بالوضوء إذا قمت إلی الصلٰوة(۲).

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ بیت الخلاء سے باہر آئے تو آپﷺ کو کھانا پیش کیا گیا۔صحابہؓ نے عرض کیا کہ کیا ہم آپ کے لیے وضوء کا پانی نہ لائیں۔تو آپﷺ نے فرمایا کہ مجھے تو وضوء کا حکم صرف اس وقت دیا گیا ہے جب نماز کا ارادہ کروں۔

من الخلاء خلاء دراصل خالی جگہ کو کہتے ہیں۔لیکن یہاں قضائے حاجت سے کنایہ ہے کیونکہ یہ کام تنہائی میں کیا جاتا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ قضائے حاجت کے بعد جب آپﷺ نے استنجاء کیا تھا۔

---

(۱)وضوء بفتح الواو اس پانی کو کہا جاتا ہے جس سے پاکی حاصل کی جاتی ہے۔اور بضم الواو حصول طہارۃ کے اس مخصوص طریقے کو کہا جاتا ہے جو نماز سے پہلے اپنائی جائے۔مگر یہاں پر وضوء کے بارے میں شیخ جواد الرومیؒ نے لکھا ہے والمراد هنا بالوضؤ اللغوی وهو غسل الیدین والفم لأنّ الوضؤ الشرعی لیس مسنوناً قبل الطعام ولا بعده(الاتحافات ۲۳۲) علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے والمراد بالوضؤ الوضؤ مایشتمل الشرعی واللغوی بدلیل الاخبار الآتیة فارادة الشرعی من حیث بیان عدم طلبه عند الطعام لاوجوباً ولاندباً وإرادة اللغوی من حیث بیان ندبه عند الطعام قبله وبعده(المواهب اللدنیة ۱۲۰) مگر حضرات محدثین نے اسی کو راجح قرار دیا ہے کہ یہاں وضؤ سے مراد وضؤ لغوی ہے۔(مختار)

(۲)سنن ابی داؤد۲/۱۷۲ کتاب الأطعمة باب فی غسل الیدین عندالطعام،سنن النسائی ۱/۱۷ کتاب الطهارة باب الوضؤ لکل صلوٰة، شرح السنة للبغوی ۱۱/۲۸۳) کتاب الأطعمة باب الوضوء عندالطعام (مختار)

واپسی پر کھانے کی کوئی چیز پیش کی گئی۔

ألا نأتیک بوضوء بعض نسخوں میں "**لا نأتیک**" بغیر ھمزہ کے ذکر ہے۔اس صورت میں ھمزہ استفہام مقدر ہوگا۔وضوء اس پانی کو کہتے ہیں جس سے وضو کیا جائے۔صحابہؓ کا یہ سوال شاید اس وہم پر مبنی ہے کہ کھانے سے قبل بھی اصطلاحی وضوء کرنا ہوتا ہے۔

وضوء لغوی نہ کہ اصطلاحی: **انما امرت الخ** یعنی اگر تم اصطلاحی وضوء کروانا چاہتے ہو تو اسے تو اللہ تعالیٰ نے نماز یا وہ کام جو نماز کے حکم میں ہے، کے لیے واجب کیا ہے۔جیسا کہ ارشاد ہے **وإذا قمتم إلى الصلٰوة فاغسلوا وجوهكم وايديكم (الاية)**

اور اگر وضو لغوی مراد ہے تو وہ تو ہو چکا ہے۔حاصل کلام یہ ہوا کہ وضوء اصطلاحی نہ قبل الطعام ضروری ہے اور نہ بعد الطعام اسے واجب کیا گیا ہے۔

(۲) حدّثنا سعيد بن عبدالرحمان المخزوميّ ثنا سفيان بن عيينة عن عمرو ابن دينار عن سعيد بن الحويرث عن ابن عباسؓ قال خرج رسول اللهﷺ من الغائط فاتى بطعام فقيل له الا تتوضّا فقال اصلّى فاتوضّا(۱)۔

ترجمہ: ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ قضائے حاجت سے فارغ ہو کر باہر آئے تو آپﷺ کے پاس کھانا لایا گیا۔آپﷺ سے کہا گیا کہ کیا آپﷺ وضوء نہیں کریں گے۔آپﷺ نے فرمایا کیا میں نے نماز پڑھنی ہے جو وضوء کروں۔

غائط المنخفض من الارض یعنی زیریں زمین اور گہرائی کو کہتے ہیں۔عموماً قضائے حاجت کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔لہٰذا قضائے حاجت پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔لیکن یہاں مکان مراد ہے تاکہ مَخرج کا لفظ حقیقت پر محمول ہو۔

---

(۱) صحيح مسلم ۱/۱۶۲ كتاب الحيض باب اكل المحدث الطعام الخ ،السنن الكبرى للبيهقي ۱/۴۲ كتاب الطهارة (مختار)

ألاتوضّا اصل میں تتوضا تھا تخفیفاً ایک تاء کو حذف کیا گیا۔ فقال أصلی یہاں ہمزہ استفہام محذوف ہے۔ یعنی أأصلی۔ معنی یہ کہ کیا میں نے نماز پڑھنی ہے جو وضوء کروں۔ اور اگر چہ وضوء علی الوضوء بہتر ہے لیکن کھانے کے لیے تو وضوء لازم نہیں ہے۔

(۳) حدّثنا یحییٰ بن موسیٰ ثنا عبداللّٰہ بن نمیر ثنا قیس بن الربیع حدّثنا قتیبة ثنا عبدالکریم الجرجانیّ عن قیس بن الربیع عن أبی هاشم عن زاذان عن سلمان قال قرأت فی التوراة إنّ برکة الطعامه الوضؤ بعده فذکرت ذلک للنبیّ ﷺ وأخبرته بما قرأت فی التوراة فقال رسول اللّٰہ ﷺ برکة الطعامه الوضوء قبله والوضوء بعده(۱)۔

ترجمہ: حضرت سلمان فارسیؓ کہتے ہیں کہ میں نے تورات میں پڑھا تھا کہ کھانا کھانے کے بعد وضوء کرنا برکت کا سبب ہے۔ میں نے نبی کریم ﷺ سے یہ بات کہی اور اپنے تورات پڑھنے کی بات بھی کی۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کھانے کی برکت کا سبب کھانے سے قبل اور کھانے کے بعد وضوء یعنی (ہاتھ منہ دھونا) ہے۔

<u>کھانے سے پہلے اور بعد میں ہاتھ دھونے کی برکت:</u> قرأت فی التورات الخ حضرت سلمان فارسیؓ کو اللہ تعالیٰ نے طویل عمر دی تھی۔ اور بہت سے مذاہب سے گزرے تھے۔ تورات اور انجیل کے عالم تھے۔ تفصیلی حالات گزر چکے ہیں۔ برکة الطعام: یعنی کھانے سے فراغت کے بعد اگر ہاتھ دھو لیے جائیں تو کھانے میں برکت ہوتی ہے۔(۲) کیونکہ دسومت اور وہ آلودگی جو کھانے سے ہاتھ کو لگتی ہے دور ہو کر ہاتھ پاک ہو جاتے ہیں۔ جبکہ اطباء کے بقول اگر دسومت ہاتھ پر باقی رہے۔ تو وہ ایک خاص قسم کی بیماری ''لحم'' پیدا کرتی ہے۔ جو کہ جنوں کی ایک قسم ہے۔

---

(۱) سنن ابو داؤد ۲/۱۷۲ کتاب الأطعمة باب غسل الیدین قبل الطعام، شرح السنة للبغوی ۱۱/۲۸۲ کتاب الأطعمة باب الوضؤ عندالطعام، السنن الکبریٰ للبیهقی ۷/۲۷۵ کتاب الأطعمه، جامع الترمذی ۲/۴۴۸ کتاب الأطعمة باب الوضؤ قبل الطعام وبعده.(مختار)

(۲) علامہ عینیؒ نے لکھا ہے کہ برکت کا مطلب یہ ہے کہ کھانا زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ اور امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ کھانے سے پہلے ہاتھ منہ دھونا اور بعد میں ہاتھ منہ دھونا فقر کو دور کرتا ہے (مختار)

الوضوء بعدہ یعنی یہ درست ہے کہ کھانے کے بعد ہاتھ دھونے میں برکت ہوتی ہے۔لیکن اس بات میں ایک کمی ہے۔وہ یہ کہ کھانے سے قبل بھی ہاتھ دھونا باعث برکت ہے۔اوراس طرح نبی کریمﷺ نے کھانے سے قبل وضوءلغوی کی ترغیب دے کر یا تو شریعت موسوی پر اضافہ کیا ہے۔جو کہ آپﷺ کے مناصب میں سے ہے۔اوریااس تعریض کی طرف اشارہ ہے کہ تورات میں تحریف ہوئی ہے۔ایک قطعہ حکم کوحذف کردیا گیا ہے۔وہاں تو ''قبلہ'' کا ذکر ہے۔لیکن پہلے ہاتھ دھونے کا حکم انہوں نے چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ پہلے ہاتھ دھونے میں بھی برکت ہوتی ہے۔کھانا زہریلے اثرات سے پاک ہوجاتا ہے۔اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے میں برکت کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہضم ہوکر عبادات،تحصیل علم اور جہاد کی قوت پیدا کرتی ہے۔صحیح مصرف میں صرف ہوتا ہے۔اور گناہوں کا سبب نہیں بنتا۔

ہاتھ دھلواتے وقت یہ ادب بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ کھانے سے قبل بچوں اور نوعمروں کو معمر لوگوں سے پہلے ہاتھ دھلوائیں کیونکہ ان کے ہاتھ پر عموماً گندگی یقینی ہوتی ہے۔جبکہ کھانے کے بعد معمر لوگوں کو ہاتھ دھونے میں نوعمروں پر اکراماً مقدم کرنا چاہیے۔

خلاصہ باب

اس باب میں کھانا کھانے کے لیے ضروری اور غیر ضروری صفائی کا ذکر ہے۔احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانا کھانے سے قبل ہاتھ دھونا چاہیے۔اس سے کھانے میں برکت ہوتی ہے۔اسی طرح کھانے کے بعد بھی ہاتھ دھونا باعثِ برکت ہے۔البتہ کھانے سے پہلے اصطلاحی وضوء کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۲۸. باب ما جاء فی قول رسول اللہ ﷺ قبل الطعام و بعد ما یفرغ منه

کھانے سے پہلے اور بعد میں حضور اقدس ﷺ کی دعائیں

یعنی وہ کونسی دعائیں اور ذکر و اذکار ہیں جو کھانا کھانے سے قبل اور اس کے بعد نبی کریم ﷺ سے ثابت ہیں۔ اس باب میں ان کا ذکر ہے۔

کھانا کھانے سے قبل بسم اللہ اور کھانے کے بعد الحمد للہ پڑھنا نبی کریم ﷺ کی سنت ہے۔ لیکن یہاں طعام سے مراد صرف کھانا نہیں بلکہ مشروبات کا پینا بھی اس سے ملحق ہے۔ لہٰذا کھانا اور پینا دونوں مراد ہیں۔

(۱) حدّثنا قتیبة بن سعید ثنا ابن لهیعة عن یزید بن أبی حبیب عن راشد بن جندل الیافعی عن حبیب بن اوس عن أبی أیّوب الأنصاری قال کنّا عند رسول اللّٰه ﷺ یوما فقُرِّب الیه طعام فلم أرطعا ماً کان أعظم برکة منه اوّل ما اکلنا و لا اقلّ برکة فی اٰخره قلنا یا رسول اللّٰه کیف هٰذا قال انّا ذکرنا اسم اللّٰه حین اکلنا ثمّ قعد من اکل و لم یسمّ اللّٰه تعالیٰ فاکل معه الشیطان(۱).

<u>بسم اللہ نہ پڑھنے کی بے برکتی:</u>

ترجمہ: حضرت ابوایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ ایک روز ہم نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر تھے کہ آپ ﷺ کو کھانا پیش کیا گیا۔ میں نے اس روز جیسا کھانا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جو ابتداء میں تو ہمارے کھانے کے وقت نہایت بابرکت ہو۔ اور کھانا ختم ہوتے وقت انتہائی بے برکت ہو۔ ہم نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ یہ کیسے ہوا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہم نے اس وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیا تھا۔ جب ہم کھانا کھانے لگے تھے۔ اس کے بعد ایک ایسا شخص کھانا کھانے بیٹھ گیا جو اللہ کا نام لئے بغیر کھانا کھانے لگا۔ تب شیطان بھی اس کے ساتھ کھانے لگا۔ (جس سے برکت اٹھ گئی)

---

(۱) شرح السنة ۱۱/۲۷۵ کتاب الأطعمة باب التسمیة علی الأکل والحمد فی آخره، کنزالعمال ۱۹/۱۸۶، مسند احمد ۵/۴۱۵ (مختار)

<u>ابو ایوب انصاریؓ:</u> خالد بن زیدؓ نام ہے۔اور کنیت سے مشہور ہیں۔خزرجی انصاری صحابی ہیں۔بیعۃ عقبہ میں شریک تھے۔نبی کریم ﷺ نے ہجرت فرمائی،تو سب سے پہلے آپ کے ہاں ٹھہرے تھے۔اور ایک ماہ تک آپؓ کو نبی کریم ﷺ کی مہمان نوازی کا شرف حاصل ہوا۔حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں یزید بن معاویہ کی سرکردگی میں جہاد کے لیے نکلے۔قسطنطنیہ کے آس پاس بیمار پڑ گئے،تو ساتھیوں کو وصیت کی کہ اگر میں وفات پاؤں تو میری لاش اپنے ساتھ لے چلو۔اور دشمن سے مقابلہ ہو تو اس وقت مجھے اپنی قدموں میں دفن کر دو۔چنانچہ ۵۱ھ کو راستہ میں وفات پائی اور قسطنطنیہ کی فصیل کے پاس ہی دفن کر دیئے گئے۔قبر مبارک آج تک مرجع خلائق ہے۔لوگ حصول شفاء کے لیے بھی بطور تبرک زیارت کے لیے آتے ہیں۔مدینہ میں آپ کے گھر کی جگہ ایک مدرسہ بنایا گیا تھا۔جسے مدرسہ شہابیہ کہا جاتا تھا۔اب یہ سارے مقامات حرم نبوی میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔(شذرات الذہب)

اوّل ما اکلنا الخ ما مصدریہ وقتیہ ہے۔یعنی اول زمان اکلنا۔اسی طرح "**فی آخرہ**" کا معنٰی یہ ہوگا کہ "آخر وقت **اکلنا** یا آخر زمان **اکلنا**" مقصود یہ ہے کہ کھانا شروع کرتے وقت کھانا بہت بابرکت تھا۔پھر ختم ہوتے وقت کھانا بہت بے برکت ہوگیا۔**کیف ھذا** صحابہ کرامؓ کے سوال کا مقصد یہ ہے کہ ابتداء میں تو کھانا ختم ہونے کو نہیں آتا تھا۔یہ آخر میں اسے کیا ہوگیا۔اور کس حکمت اور کس سبب سے یہ ناکافی ہوگیا۔**قال انّا الخ** نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ابتداء میں ہم جتنے بھی لوگ تھے۔کھانے سے قبل بسم اللہ پڑھ چکے تھے۔درمیان میں ایک شخص ہمارے ساتھ بغیر بسم اللہ پڑھے کھانے میں شریک ہوا۔جسکی وجہ سے کھانے کی برکت جاتی رہی۔کیونکہ بسم اللہ نہ پڑھنے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غفلت بلکہ خلاف سنت کام کے ارتکاب کی بناء پر شیطان شریکِ طعام ہوا۔جس کی عادت ہے کہ مکھی کی طرح ہمیشہ گندگی کی طرف لپکتا ہے۔جب اتباع سنت ترک ہوا تو معنوی تکدر کی وجہ سے اسے موقع ملا اور کھانا کھانے بیٹھا۔اس حدیث سے ثابت ہوا کہ کھانے کی ابتداء میں بسم اللہ کہنا سنت ہے۔**ذکرنا اسم اللّٰہ** بعض کا خیال ہے کہ یہاں صرف اللہ کا نام مراد ہے۔اور بعض کہتے ہیں کہ جملہ **بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم** مراد ہے۔دونوں کا احتمال ہے۔لیکن مؤخر الذکر افضل ہے پھر بسم اللہ کا پڑھنا بعض کے نزدیک واجب ہے اور اکثر سنت

موکدہ ہونے کے قائل ہیں جس طرح کے دائیں ہاتھ سے کھانے میں بھی اختلاف ہے۔بعض واجب اور جمہور اسے سنت کہتے ہیں۔

بسم اللہ ہر فرد پڑھے گا یا ایک کا کافی ہوگا: اس حدیث میں یہ بات قابل بحث ہے کہ کیا ہر شخص فرداً فرداً بسم اللہ پڑھے گا یا ایک شخص کا بسم اللہ کافی ہوگا۔اول الذکر جمہور کا مذہب ہے۔لیکن امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ ابتداءً جو لوگ کھانا کھانے اکٹھے بیٹھتے ہیں ان میں سے ایک شخص کی بسم اللہ سب کے لیے کافی ہو جائے گی۔ ہر شخص کے لیے ضروری نہیں۔اگر چہ بہتر تو یہی ہے کہ ہر شخص الگ الگ بسم اللہ پڑھ لے(۱)۔اب امام شافعیؒ کے مذہب پر سوال یہ ہے کہ پھر اس مقام پر یہ نووارد شخص جو آیا اس شخص کے حق میں سابقہ بسم اللہ کیوں کافی نہ ہوا۔تو جواب یہ ہوگا کہ دراصل ایک شخص کی بسم اللہ حاضرین کی طرف سے کافی ہو جاتی ہے غائبین کے لیے نہیں۔اور یہ جو نیا شخص آیا ہے وہ چونکہ غائب تھا۔اس لئے اس کے حق میں وہ بسم اللہ کافی نہ ہوئی۔کیونکہ سابقین کا تسمیہ لاحقین تک متعدی نہیں ہوتا۔بلکہ وہ سابقین کو بھی برکتوں سے محروم کر دیتا ہے۔کہتے ہیں کہ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے۔

اکل شیطان کی نوعیت: فاکل معه الشیطان شیطان کھانا کھاتا ہے۔اور اس کی کیفیت مختلف ہو سکتی ہے۔جو کہ مجہول ہے۔ہر مخلوق کے کھانے کے انداز بھی مختلف ہوتے ہیں۔اور خوراک بھی مختلف ہوتی ہے۔بعض مخلوقات منہ سے کھاتے ہیں۔بعض سونگھ کر، کچھ آنکھوں سے کھاتے ہیں۔اسی طرح شیطان کے کھانے کے بھی اپنے طریقے ہیں۔لہٰذا بعض علماء نے جو اس جملے کی تاویلات کی ہیں۔ان کی تاویلات سے صرف نظر کرنا ہی بہتر ہے۔اور شیطان کا کھانا حقیقت پر محمول ہوگا۔اور جب نبی کریم ﷺ نے ہمیں خبر دی ہے تو کیفیت سے لاعلمی کے باوصف ہمارا اس پر ایمان ہے(۲)۔

---

(۱) بیجوری ۱۳۹، جمع الوسائل ج۱ ص ۲۸۶

(۲) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے **واکل الشیطان محمول علی حقیقته عند جمهور العلماء سلفاً و خلفاً لامکانه شرعاً و عقلاً(جمع الوسائل ۱/ ۲۸۶)** البتہ یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ مسئلہ یہ ہے کہ جب مجلس میں ایک ہی آدمی بسم اللہ پڑھے۔تو وہ سب کیلئے کافی ہے۔پھر شیطان نہیں آئے گا۔تو یہاں کیسے آیا۔حالانکہ اس آدمی کے آنے سے پہلے حاضرین مجلس نے بسم اللہ پڑھی تھی؟ الجواب:اس اشکال کا اہل علم حضرات نے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(۲) حدثنا یحییٰ بن موسیٰ ثنا أبو داؤد ثنا هشام الدستوائی عن بدیل العقیلی عن عبداللّٰه بن عبید بن عمیر عن أمّ کلثوم عن عائشةؓ قالت قال رسول اللّٰهﷺ اذا أکل أحدکم فنسی ان یذکر اسم اللّٰه تبارک و تعالیٰ علی طعامه فلیقل بسم اللّٰه اوّله و اٰخره(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی کھانا کھائے اور اللہ تعالیٰ کا نام لینا بھول جائے (بسم اللہ نہ پڑھے) پھر (کھانے کے دوران یاد آنے کے بعد) ''بسم اللّٰه اوله و آخره'' کہہ دے۔

فلیقل بسم اللّٰه الخ یعنی ''واذکر ربک اذا نسیت'' پر عمل کرتے ہوئے گزشتہ تقصیر کی بقدر امکان تلافی کر لے۔ اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے یہ بعید نہیں۔ کہ اس بسم اللہ کی برکت سے ابتدائے طعام بھی بابرکت ہو۔ وسط طعام اور آخر طعام بھی۔ کیونکہ یہاں پر اول وآخر کنایہ ہے سارے طعام سے۔ لہٰذا وسط طعام خارج نہ ہوگا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اول سے نصف اول اور آخر طعام سے نصف آخر مراد ہو۔ پھر تو واسطہ موجود بھی نہیں ہے(۲)۔

(بقیہ حاشیہ) مختلف جوابات دیئے ہیں۔(۱) بعض فرماتے ہیں ثم قعد کا مطلب یہ ہے کہ ای قعد بعد فراغنا من الطعام اور اس نے بسم اللہ نہیں پڑھی۔ تو ظاہر ہے کہ بے برکتی ہوگی۔ اس نے بسم اللہ نہیں پڑھی تھی۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہ مسئلہ ان افراد کیلئے ہے جو ابتداء اکٹھے کھانے میں شریک ہوں اور ان میں سے کوئی ایک بھی بسم اللہ پڑھے۔ تو سب کیلئے کافی ہے۔ لیکن جو شخص بعد میں کھانے میں شریک ہو جائے تو اس کو بسم اللہ پڑھنی ہوگی۔ اور یہاں ظاہر ہے کہ یہ شخص بعد میں شریک ہوا ہے اور اس نے بسم اللہ نہیں پڑھی۔ اس لئے بے برکتی ہوئی (جمع الوسائل ۲۸۶/۱) (مختار)

(۱) سنن ابی داؤد ۱۷۲/۲ کتاب الاطعمة باب تسمیة علی الطعام، السنن الکبریٰ للنسائی ۷۸/۶ کتاب عمل الیوم واللیة باب مایقول اذانسی تسمیة، دارمی ۹۴/۲، السنن الکبریٰ للبیهقی ۲۷۶/۷. (مختار)

(۲) ابوداؤد اور مشکوٰۃ میں روایت ہے کہ کان رسول اللّٰهﷺ جالساً ورجل یأکل فلم یسمّ حتیٰ لم یبق من طعامه إلاّ لقمة فلمّا رفعها إلیٰ فیه قال بسم اللّٰه أوّله و آخره فضحک النبیﷺ ثمّ قال مازال الشیطان یأکل معه فلمّاذکر اسم اللّٰه استقاء مافی بطنه سنن ابی داؤد (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بسم اللہ پڑھنا سنت ہے یا مستحب: رہی یہ بات کہ بسم اللہ ابتدائے طعام کیلئے سنت ہے یا مستحب۔ تو ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ "والتسمية مستحبة فی الاکل اجماعا" یعنی کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے۔ لیکن یہاں مستحب سے سنت مراد ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس حدیث میں "فلیقل" امر کا صیغہ ہے۔ اسی طرح آئندہ حدیث میں "سمّ" بھی امر کا صیغہ ہے۔ جو کم ازکم سنت ہونے کا فائدہ دیتا ہے۔

(۳) حدّثنا عبداللّٰہ بن الصبّاح الهاشمیّ البصریّ ثنا عبدالاعلیٰ عن معمر عن هشام بن عروة عن أبيه عن عمر بن أبی سلمة أنّه دخل علی رسول اللّٰہ ﷺ و عنده طعام فقال أُدن یا بُنی فسمّ اللّٰہ تعالیٰ و کل بیمینک و کل مما یلیک(۱).

ترجمہ: حضرت عمر بن ابی سلمۃ سے روایت ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ کے پاس کھانا رکھا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بیٹا قریب ہو جاؤ۔ بسم اللہ پڑھو۔ دائیں ہاتھ سے کھاؤ، اور اپنے سامنے سے کھانا کھاؤ۔

عمر بن ابی سلمۃؓ: عمر بن أبی سلمة یہ ام المؤمنین ام سلمۃؓ کے بیٹے اور نبی کریم ﷺ کے ربیب ہیں۔ والد کا نام عبداللہ بن عبدالاسدؓ ہے۔ جو سابقین صحابہ میں سے ہیں۔ اور نبی کریم ﷺ کے رضاعی

(بقیہ حاشیہ) کتاب الأطعمة باب التسمية عند الطعام. علامہ شمس الحق عظیم آبادی نے استقاء مافی بطنہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے استقاء أی الشیطان مافی بطنه ای ممّا أکله والاستقاء استفعال من القیء بمعنی الاستفراغ وهومحمول علی الحقیقة او المرادالبرکة الذاهبة بترک التسمية کأنّها کانت فی جوف الشیطان أمانة فلمّا سمیٰ رجعت إلی الطعام(عون المعبود شرح ابی داؤد ۱۰/۱۷۳)(مختار)

(۱)جامع ترمذی ۲/۷ کتاب الأطعمه باب ماجاء فی تسمية علی الطعام، السنن الکبریٰ للنسائی ۶/۷۷، کتاب عمل اليوم والليلة ما يقول لمن يأكل، مؤطاامام مالک ص۷۱۸ کتاب صفة النبی باب ماجاء فی الطعام والشرب(مختار)

بھائی ہونے کے علاوہ پھوپھی زاد بھائی بھی تھے۔ جنگ احد میں زخمی ہونے کے بعد مدینہ میں وفات پا چکے تھے۔ عمرؓ ان کے والدین کی ہجرت کے دوران حبشہ میں پیدا ہوئے تھے۔ اور نبی کریم ﷺ کی تربیت میں پلے بڑھے۔ جنگ جمل میں حضرت علیؓ کے رفیق رہے۔ اور انہی کی طرف سے بحرین کے والی بھی مقرر ہوئے۔

دائیں ہاتھ سے کھانا وجوب کا قول: فسمّ اللّٰہ الخ نبی کریم ﷺ نے کھانے کے تین سنہرے آداب کی تعلیم دی ہے۔ اول بسم اللہ پڑھنا، دوم دائیں ہاتھ سے کھانا، سوم اپنے سامنے سے کھانا۔ پہلے ادب کی تفصیل گزر چکی ہے۔ جبکہ دائیں ہاتھ سے کھانا جمہور ائمہ کے ہاں سنت مؤکدہ ہے۔

بعض لوگوں نے اسے واجب بھی کہا ہے۔ کیونکہ روایات میں اس کی تاکید اور ترک پر وعید آئی ہے۔ مثلاً ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا۔ لیکن وہ ''لا استطیع'' کہہ کر حیلے بہانے تراشتا رہا۔ آپ ﷺ کی زبان سے نکال ''لا استطعت'' جس سے اس آدمی کا ہاتھ شل ہو گیا۔ حدیث میں آتا ہے کہ ''فما رفعها الی فيه'' (۱) یعنی اس کے بعد اس کا ہاتھ منہ تک نہیں اٹھتا تھا۔ ایک اور حدیث میں بائیں ہاتھ سے کھانے کو شیطان (۲) کا عمل کہا گیا ہے۔ ان وعیدات کی وجہ سے بعض لوگوں نے وجوب کا قول کیا ہے۔ لیکن جمہور اسے سنت مؤکدہ ہی کہتے ہیں۔

اپنے سامنے کھانے کا حکم: اسی طرح اپنے سامنے سے کھانا بھی جمہور کے ہاں سنت ہے۔ اور بعض کے ہاں یہ بھی واجب ہے۔ مگر یہ حکم اس وقت ہے کہ برتن ایک ہو۔ کھانا ایک قسم کا ہو۔ اور اطراف میں فرق نہ ہو اور اگر برتن مختلف ہوں یا کھانے کی مختلف چیزیں مثلاً پھل وغیرہ پڑے ہوں تو پھر اپنی طبیعت کی پسندیدہ چیز دوسرے شخص کے سامنے سے کھانا بھی جائز ہے۔ جس طرح کہ باب الادام میں کدو کے ٹکڑوں کے بارے میں گزر چکا ہے۔

---

(۱) عن سلمة بن الاكوع أنّ رجلا اكل عند النبی ﷺ بشماله فقال كل بيمينک قال لا استطيع فقال ''لا استطعت ما منعه إلاّ الكبر قال فما رفعها الی فيه'' (مسلم ج ۲ ص ۱۷۲) (مختار)

(۲) لاتاكلو بالشمال فانّ الشيطان ياكل بالشمال (مسلم ج ۲ ص ۱۷۲) (مختار)

(۴) حدثنا محمود بن غیلان ثنا أبو أحمد الزبیریّ ثنا سفیٰن الثوری عن أبی ھاشم عن إسمٰعیل بن ریاح عن ریاح بن عبیدۃ عن أبی سعید الخدریّ قال کان رسول اللّٰہ ﷺ اذا فرغ من طعامہ قال الحمد للّٰہ الذی أطعمنا و سقانا وجعلنامن المسلمین(۱).

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کھانا کھانے سے فارغ ہوجاتے تو یہ دعا پڑھتے تھے"الحمد للّٰہ الذی اطعمنا و سقانا وجعلنامن المسلمین "تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں۔جس نے ہمیں کھانا کھلایا، پانی پلایا اور ہمیں مسلمان بنایا۔

نعمت ایمان: و جعلنامن المسلمین کھلانے پلانے کی نعمت تو بڑی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں میں سے سے بڑی نعمت یعنی اسلام کا ذکر بھی نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں۔گویا اگر اسلام کی نعمت نہ ہو تو ہر نعمت عذاب بن جائے۔کیونکہ مرغ پلاؤ وغیرہ جتنے بھی اچھے کھانے ہوں،ان کا حساب بھی اتنا ہی سخت ہوگا اور پھر عذاب بھی سخت ملے گا جتنا جسم پھلا پھولا اور چربی دار ہوگا۔عبدالقفاء واللھازم ہوگا۔اتنی ہی تکلیف زیادہ پہنچے گی۔جبکہ نعمتوں کی تکمیل ایمان سے ہوتی ہے۔کوئی بھی نعمت اس کے بغیر نعمت نہیں۔اسی عظیم نعمت نے مشت خاک کو کندن بنایا۔کسی نے کیا خوب فرمایا ؎

حمد بے حد مر خدائے پاک را آنکہ ایمان داد مشت خاک را

اور اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ اس نعمت کا بھی ذکر کرتے تھے۔اور تمام دیگر نعمتوں کے ساتھ اس کے استحضار کا اہتمام کرتے تھے۔اس کے علاوہ اس حدیث میں اس بات کی تعلیم ہے کہ ہر نعمت کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔کھانا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عظیم نعمت ہے۔اس پر شکر لازم ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ لئن شکرتم لا زیدنکم و لئن کفرتم إنّ عذابی لشدید.اور چونکہ کھانا عموماً پینے سے خالی

---

(۱)سنن ابی داؤد۲/۱۸۲ کتاب الاطعمة باب مایقول الرجل اذاطعم، السنن الکبریٰ للنسائی۶/۸۰ کتاب عمل الیوم اللیلة باب مایقول اذاشرب اللبن، مصنف ابن ابی شیبة۸/۱۲۱ .(مختار)

نہیں ہوتا۔اس لئے وسقانا کا اضافہ بھی کردیا تاکہ تمام نعمتوں کا ذکر ہوجائے۔

نعمت طعام پر حمد:

(۵) حدثنا محمد بن بشّار ثنا یحییٰ بن سعید ثنا ثور بن یزید ثنا خالد بن معدان عن أبی أمامة قال کان رسول اللّٰہ ﷺ اذا رفعت المائدة من بین یدیه یقول الحمد للّٰہ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیه غیر مودّع ولا مستغنی عنه ربّنا(۱)۔

ترجمہ: حضرت ابو امامہ باہلیؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے سے جب دسترخوان اٹھایا جاتا۔تو آپ ﷺ یہ دعا پڑھتے "الحمد للہ حمدا لخ"
ترجمہ:اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہیں۔ایسی تمام تعریفیں جوریا ونمود سے پاک اور برکت والی ہیں۔ایسی تعریفیں جونا قابل ترک ہوں۔نہ اس سے استغنا کیا جاسکتا ہو۔تو ہی ہمارا رب ہے(حمد ودعا سننے والا)

حمد حضور ﷺ اور امت کی خاص پہچان: الحمد اللّٰہ الخ نبی کریم ﷺ حمد کے مواقع تلاش فرماتے تھے۔اور اس کو عجیب تعبیرات اور قسم قسم کے الفاظ سے ادا فرماتے تھے۔ بلکہ حمد تو آپ ﷺ کی امتیازی خصوصیت ہے۔حتیٰ کہ آپ ﷺ کی امت کا نام حمادون یعنی زیادہ حمد کرنے والے ٹھہرا۔نبی کا نام محمد اور احمد ہے۔نبی کا آخری مقام بھی مقام محمود ہے۔قرآن کی ابتداء حمد سے ہوئی۔ جنت میں داخل ہونے کے بعد یہ امت یہی کہے گی کہ الحمد للّٰہ الذی اور ثنا الارض(الآیة)اور نبی کریم ﷺ قبر سے اٹھیں گے تو روایات کے مطابق آپ ﷺ کے ہاتھ میں لواء الحمد یعنی حمد کا جھنڈا ہوگا۔

---

(۱)صحیح بخاری۲/۸۲۰ کتاب الاطعمة باب مایقول اذافرغ من الطعام۲/۸۲۰، سنن ابی داؤد۲/۱۸۲ کتاب الاطعمةباب مایقول الرجل اذاطعم، السنن الکبریٰ للنسائی۶/۷۹ کتاب عمل الیوم واللیلة باب مایقول اذارفعت المائدة، ابن ماجة ۲۴۴ کتاب الاطعمة باب مایقال اذافرغ من الطعام(مختار)

بہر حال یہ ایک اہم صفت ہے۔اور علماء نے مختلف اسالیب سے اس امت پر اس کا حاوی ہونا بیان کیا ہے۔اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ حمد سے سیر نہیں ہوتے تھے۔اور یہاں بھی فرماتے ہیں کہ حمداً کثیراً طیباً۔یعنی حمد ہو زیادہ ہو۔ریا و نمود کی الآئشوں سے پاک اور مبارک ہو۔یعنی پھلے پھولے اور اس کی نشو ونما ہوتی رہے۔غیر مودّع اگر دال پر فتحہ ہو تو یہ حمد سے حال ہوگا۔اور معنی یہ ہوگا کہ غیر متروک ہو۔اور اس سے فراق کبھی نہ ہو۔کبھی اس سے دل نہ بھرے۔اگر چہ کھانا کتنا بھی لذیذ کیوں نہ ہو اس سے دل بھر جاتا ہے۔بلکہ ہر خوبصورت چیز اور محبوب ذات سے ایک نہ ایک دن دل اچٹ جاتا ہے۔

مگر آپ ﷺ کے بقول حمد ایسا ہو جو چھوڑا نہ جاسکے۔اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ لفظِ اللہ سے حال بنے۔اور معنی یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کبھی متروک نہ ہو۔یعنی ہمیشہ کے لیے وہ ہماری عبادت انابت اور دعاؤں کا مرجع رہے۔اور مودِّع کی دال پر کسرہ ہو تو پھر قائل اور حامد سے حال ہوگا۔مطلب یہ ہوگا کہ ایسی حمد کہ میں اسے کبھی ترک نہ کروں۔لیکن یہ احتمال مابعد کے جملہ "و لا مستغنیً عنہ" سے مطابقت نہیں رکھتا۔جو صرف حمد یا لفظِ اللہ سے حال بن سکتا ہے۔

و لا مستغنیً عنہ اس کا بھی یہی مقصد ہے۔یعنی اس حمد سے استغناء اور بے نیازی نہ ہو۔یا اللہ تعالیٰ سے اعراض بے توجہی نہ ہو۔کیونکہ منعم کامل ہونے کی وجہ سے اس کے احسانات سے اغماض ممکن نہیں۔تمام عالم کا نظام ہمارے اوپر ایک بڑا انعام ہے۔عرش سے فرش تک انعامات ہیں۔انسان منعم علیہ ہے۔اور ربّ العالمین منعم حقیقی ان تین چیزوں میں سب کچھ سمٹ گیا ہے۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

ان تمام الفاظ کا خلاصہ یہ ہے کہ حمد دائم ہو۔بار بار ادا ہو۔اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبدیت کا احتیاج اور شکر کی ادائیگی کا رشتہ ہمیشہ استوار رہے۔

ربّنا اس لفظ کے اعراب میں تین احتمالات ہیں۔یا تو مرفوع ہے۔مبتدا مقدر کے لئے خبر ہونے کی وجہ سے یعنی "ھو ربنا" یا "انت ربنا" یا پھر یہ خبر مقدم۔یعنی غیر مودع کے لیے مبتدا ہے۔لیکن اس

تقدیر پر غیر مرفوع پڑھا جائے گا۔تقدیر یوں ہوگی "ربنا غیر مودع" یا منادیٰ ہونے کی وجہ سے منصوب ہوگا۔یا نصب فعلِ مدح۔فعل اختصاص یا فعل اعنی کی تقدیر کی وجہ سے نصب ہوگا۔تیسرا احتمال جر کا ہے۔ یعنی لفظ اللہ سے بدل بن کر مجرور ہے۔

(۶) حدثنا أبوبکر محمّد بن أبان ثنا وکیع عن هشام الدستوائی عن بدیل بن میسرة العقیلیّ عن عبداللّٰه بن عبید بن عمیر عن أم کلثوم عن عائشةؓ قالت کان النبیّ ﷺ یاکل الطعام فی ستّة من أصحابه فجاء أعرابی فأکله بلقمتین فقال رسول اللّٰه ﷺ لو سمّی لکفاکم(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ چھ آدمیوں کی معیت میں کھانا کھا رہے تھے کہ ایک بدوی آیا۔اور سارا کھانا دو لقموں میں ختم کردیا۔تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔اگر یہ بدوی بسم اللہ پڑھتا تو یہ کھانا سب کے کے لئے کافی ہوجاتا۔

جاء اعرابیّ صحرا میں زندگی بسر کرنے والے لوگوں کو اعرابی کہتے ہیں۔جو پانی اور چارے کی تلاش میں کوچ در کوچ کرتے رہتے ہیں۔

لو سمّی لکفاکم یعنی اس نووارد کے بسم اللہ نہ پڑھنے کی وجہ سے کھانے کی برکت جاتی رہی۔ اگر یہ شخص بسم اللہ پڑھتا تو کھانے میں برکت ہوتی۔اور بظاہر یہ تھوڑا سا کھانا تم سب کے لیے کافی ہوجاتا۔ جیسے کئی مواقع پر معجزہ کے طور پر اس قسم کی تکثیر کا مشاہدہ کیا جاچکا ہے۔لیکن جب اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غفلت اور ترک سنت کا ارتکاب ہوا۔تو شیطان کو موقع ملا اور کھانا ختم کردیا۔

(۷) حدثنا هنّاد و محمود بن غیلان قالا حدثناأبو أسامة عن زکریا بن أبی زائدة عن سعید بن أبی بردة عن أنس بن مالک قال قال رسول اللّٰه ﷺ إنّ اللّٰه لیرضٰی عن العبد أن یاکل الاکلة ویشرب

---

(۱) کذافی جمع الوسائل ج ۱ ص ۲۹۳

الشربة فیحمده علیها(۱)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے اس بات پر بہت راضی ہوتے ہیں۔ کہ وہ ایک بار کھانا کھائے، یا پانی پیے اور پھر (شکر ادا کرتے ہوئے) رب ذوالجلال کا حمد بیان کرے۔

ان یاکل الاکلة: أکلة فتح ھمزہ کے ساتھ ہے۔ الفعلة للمرّة یعنی بسبب الا کلة یعنی ہر بار جب وہ کچھ کھاتا ہے۔ اویشرب شربة یعنی ہر بار جب وہ کچھ پیتا ہے۔ صبح ہو، شام ہو، دوپہر ہو یا رات کوئی بھی وقت ہو۔ اور کوئی بھی کھانا ہو۔ ہر نوالے اور ہر گھونٹ کے ساتھ حمد ادا کرے۔ بعض لوگوں نے اُکلة کو بضم ھمزہ پڑھا ہے۔ جو نوالہ کے معنی میں ہے۔ لیکن شربة کے قرینہ سے فتحہ کا احتمال قوی ہے(۱)۔

فیحمده علیها تو وہ اس کھانے پینے پر رب تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔ اس کی حمد بیان کرے۔ تو ضمیر اکلة یاشربة کو بطریق تردید راجح ہے۔

اس حدیث میں بھی دوسری احادیث کی طرح کھانے کے بعد الحمد للہ کہنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم ۲/ ۳۵۲ کتاب الذکر والدعا وباب استحباب حمداللّٰہ تعالیٰ بعدالأکل والشرب، جامع ترمذی ۲/ ۳ کتاب الأطعمة باب ماجاء فی الحمدعلی الطعام اذافرغ منہ، مسنداحمد ۳/ ۱۰۰ .(مختار)

خلاصہ باب

اس باب میں ان اذکار کا بیان ہے جو کھانا کھانے سے پہلے یا بعد میں نبی کریم ﷺ سے مروی ہیں۔کھانا کھانے سے قبل بسم اللہ پڑھنا سنت ہے۔جو کھانے میں برکت کا سبب بنتا ہے۔اور شیطان کے تصرف کے لئے مانع ہے۔اور اگر بھولے سے ابتداء میں پڑھنا رہ جائے۔تو جب بھی درمیان میں یاد آئے تو بھی بسم اللہ پڑھنی چاہیے۔اسی طرح کھانے سے فراغت کے بعد حمد اور شکر کے الفاظ کہنا مسنون ہے۔ جس کے آسان الفاظ یہ ہیں کہ **الحمد للّٰہ الذی اطعمنا و سقانا و جعلنا مسلمین.**

اس کے ساتھ ساتھ ضمناً دائیں ہاتھ سے کھانے،اور اپنے سامنے سے کھانے کی مسنونیت کا بیان بھی ہوا ہے۔

۲۹۔ باب ما جاء فی قدح رسول اللہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے پیالہ کا بیان

جس طرح کھانوں میں نبی کریم ﷺ کی سادگی اور اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کے شکر کا بیان تھا۔

رسول اللہ ﷺ کے گھر کے برتن تکلفات سے پاک تھے: اسی طرح نبی کریم ﷺ کے کھانوں کے برتنوں میں بھی تنوع اور تکلفات نہیں تھے۔آج کل تو صبح کے کھانے کیلئے برتنوں کے الگ سیٹ مہیا کئے جاتے ہیں تو شام کے کھانوں کیلئے الگ سیٹ کا تقاضا ہوتا ہے۔کہیں چائے کا سیٹ ہے تو کہیں شربتوں کا سیٹ ہے۔اس باب میں نبی کریم ﷺ کے کھانے پینے کے برتن کا ذکر ہے۔اور اس پر تنبیہ ہے کہ برتنوں کا اہتمام اصل مقصود نہیں ہوتا۔مقصود تو کھانا ہوتا ہے جس برتن کے ذریعے بھی ہو۔گزشتہ زمانے میں ہمارے طلبہ کا بھی یہی حال تھا کہ جو برتن کھانے کا ہوتا تھا وہی پینے کیلئے بھی استعمال۔جیسا کہ اس باب میں بیان ہوگا کہ نبی کریم ﷺ کے کھانے اور پینے کیلئے ایک ہی پیالہ تھا۔پانی، شربت، لسی اور دودھ وغیرہ سب اسی میں تناول فرماتے۔ہر چیز کیلئے الگ سیٹ موجود نہیں تھے۔

تعیش کے اس دور میں تو مختلف ڈیزائن اور رنگوں کے برتنوں سے الماریاں بھری ہوتی ہیں۔لیکن بیویوں کا پھر بھی مطالبہ ہوتا ہے کہ ڈیزائن اور فیشن بدل چکا ہے۔زمانہ کے ساتھ چلنا ہے۔اس لیے دوسرا سیٹ لینا ضروری ہے۔

(۱) حدّثنا الحسین بن الأسود البغدادیّ ثنا عمرو بن محمّد ثنا عیسیٰ بن طهمان عن ثابت قال أخرج إلینا أنس بن مالک قدح خشبٍ غلیظاً مضبباً بحدید فقال یا ثابت هذا قدح رسول اللّٰہ ﷺ(۱).

ترجمہ: حضرت ثابت کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ نے ہم کو لکڑی کا موٹا پیالہ جس میں لوہے کے پترے لگے تھے نکال کر دکھلایا۔اور فرمایا کہ اے ثابت یہ حضور ﷺ کا پیالہ ہے۔

---

(۱)شرح السنة ۱۱/۳۷۰کتاب الأشربة باب تحریم الشرب من آنیة الفضة(مختار)

رسول اللہ ﷺ کا پیالہ: قدح خشب (۱) چونکہ حضرت انسؓ آپ ﷺ کے خادم تھے اس لئے نبی کریم ﷺ کی متعدد چیزیں آپ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت انسؓ کے پاس رہ گئی تھیں۔ خاص خادم اور خاص شاگرد کے ساتھ بعض اوقات کچھ خاص چیزیں بطور نشانی رہ جاتی ہیں۔ ان اشیاء سے مذکورہ پیالہ آپؓ نے بطور تبرک لیا تھا۔ یہ لکڑی کا بنا ہوا پیالہ تھا (۲)۔ جو آپؓ لوگوں کو دکھایا کرتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کے پیالہ پر پٹیاں: مضببا بحدید یعنی جس پر لوہے کے ضِباب یعنی پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ ضباب ضبۃ کی جمع ہے جو کسی برتن کی مضبوطی کے لیے اس کے گرد لگائی جانے والی دھات کی پٹی کو کہتے ہیں گویا اس پیالہ کے کناروں پر مضبوطی کی غرض سے یا کہیں سے ٹوٹنے کی وجہ سے لوہے کی پٹی لگی ہوئی تھی (۳)۔

---

(۱) علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے قدح خشب ای قدحاً من خشبٍ فالاضافة بمعنی من قوله غلیظاً مضبّبا بالنصب علی انه صفة قدح ورواه فی جامع الاصول غلیظ مضبب بالجر وهو کذلک فی بعض النسخ وهو من قبیل هذا حجر ضب خرب وقوله بحدید متعلق بمضبّباً (المواهب اللدنیة ص ۱۲۵) (مختار)

(۲) رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ عام طور پر لکڑی کے پیالہ میں پانی پیا کرتے تھے۔ کما جاء فی روایة عن انس انه قال لقد سقیت رسول اللّٰه ﷺ من هذا القدح اکثر من کذا و کذا (جمع الوسائل ۱/۲۹۴) (مختار)

(۳) سوال یہ ہے کہ یہ تضبیب رسول اللہ ﷺ نے فرمائی تھی یا حضرت انسؓ نے کی تھی۔ تو علامہ بیجوریؒ نے فرمایا ہے کہ اس میں دونوں کا امکان موجود ہے۔ اور علامہ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے وفی الصحیح ایضاً انّه قد انصدع فسلسل بعضه بعض بفضة فیحتمل أنّ الواصل هو النبی ﷺ أو أنس و کلام العسقلانی یمیل إلی الأول حیث قال هو الظاهر ویؤیّده ما ورد فی الصحیح أنّ قدح النبیّ ﷺ قد انصدع فاتخذ مکان الشعب سلسلة من فضة ثمّ قال ویحتمل ان یکون الواصل أنساً ویؤیّده ما رواه البیهقی عن أنس ولفظه فجعلت مکان الشعب سلسلةً انتهی والظاهر ان یحمل قوله فاتخذ علی انه امر بالاتخاذ علی الاسناد المجازی ویحمل قوله فجعلت علی الاسناد الحقیقی فاتفق الروایتان (جمع الوسائل ۱/۲۹۴) (مختار)

یہ پیالہ حضرت انسؓ کی وفات کے بعد حضرت نضر بن انسؓ کے پاس تھا۔اس کے بعد اسے آٹھ لاکھ درہم میں بیچا گیا۔اور آخر کار اس پیالہ کی قیمت تقریباً دس لاکھ درہم کو پہنچ گئی تھی۔جبکہ بعض لوگ ایک لاکھ بیان کرتے ہیں۔امام بخاریؒ نے عاصم احول سے روایت کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے وہ پیالہ دیکھا تھا۔

بعض تابعین نے اس میں بطور تبرک پانی بھی پیا تھا۔لیکن ان کے بقول اس پر چاندی کا ضبہ یعنی چاندی کی پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔خود امام بخاریؒ نے بصرہ میں اس میں پانی پیا تھا۔اس بظاہر تدافع کی توجیہ یوں کی جاتی ہے کہ ممکن ہے کہ پہلے لوہے کی پٹی ہو اور بعد میں کسی نے مزید مضبوطی کے لیے چاندی کی پٹی لگائی ہو(۱)۔

(۲) حدثنا عبداللّٰہ بن عبدالرحمٰن ثنا عمرو بن عاصم ثنا حمّاد ابن سلمة ثنا حمید و ثابت عن أنس قال لقد سقیت رسول اللّٰہ ﷺ بھذا القدح الشراب کله الماء والنبیذ و العسل واللبن(۲).

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس ﷺ کو اس پیالہ سے پینے کی سب انواع، پانی، نبیذ، شہد اور دودھ پلائی ہیں۔

حدثنا:الشراب کله شراب یہاں مشروب کے معنی میں ہے یعنی میں نے نبی کریم ﷺ کو ہر قسم کی مشروبات پلائے ہیں۔پانی، نبیذ، شہد اور دودھ سب کچھ اسی میں دیا تھا۔گویا نہایت سادگی کا نمونہ پیش کرتے ہوئے آپ ﷺ نے پینے کیلئے تمام مشروبات کیلئے ایک ہی پیالہ کو کافی سمجھا۔

---

(۱)عن عاصم الاحول قال رأیت قدح النبی ﷺ عند انس بن مالکؓ۔ و کان قد انصدع فسلسله بفضّة... وقال ابن سیرین انّه کان فیه حلقة من حدید فارا د أنس ان یجعل مکانها حلقة من ذهب او فضّة فقال له ابو طلحةؓ لا تغیرنّ ما صنعه رسول اللّٰہ ﷺ فترکه(بخاری باب الشرب من قدح النبی ﷺ ج ۲ ص ۸۴۲)(اصلاح الدین)

(۲)صحیح مسلم ۲/۱۶۷ کتاب الاشربة باب اباحة النبیذ الذی لم یشتدولم یصرمسکراً، السنن الکبریٰ للبیهقی ۸/۲۹۹ کتاب الاشربة، المستدرک للحاکم ۴/۱۰۵،ابو داد الطیاسی(مختار)

خلاصہ باب

نبی کریم ﷺ کے استعمال میں آنے والے پینے کے برتنوں کے متعلق اس باب میں امام ترمذیؒ نے دو حدیثیں بیان فرمائی ہیں۔دیگر کتب حدیث میں بھی اس سلسلے میں کچھ روایات موجود ہیں۔

امام بخاریؒ نے ''باب الشرب من قدح النبی ﷺ'' کے عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت انسؓ کے پاس آپ ﷺ کا ایک پیالہ تھا جسے حضرت انسؓ بڑی حفاظت سے رکھا کرتے تھے۔ایک بار یہ ارادہ بھی فرمایا کہ اس پر لگی ہوئی لوہے کی پٹی کی بجائے سونے یا چاندی کی پٹی لگادے۔لیکن ام انسؓ کے خاوند حضرت ابوطلحہؓ کے منع کرنے پر یہ فیصلہ بدل دیا۔بعد میں جب وہ ٹوٹ گیا تو حضرت انسؓ نے اس پر چاندی کا حلقہ لگادیا۔کہتے ہیں کہ حضرت نضر بن انسؓ کی میراث میں سے یہ پیالہ آٹھ لاکھ درہم میں فروخت ہوا۔اسی طرح کا ایک پیالہ حضرت سہل بن سعدؓ کے پاس تھا جس میں نبی کریم ﷺ پی چکے تھے۔حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جس زمانہ میں مدینہ کے گورنر تھے۔اس زمانہ میں یہ پیالہ حضرت سہل سے مانگا اور حضرت سہل نے یہ پیالہ ان کو ہبہ کردیا(۱)۔ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے پاس بھی ایک ایسا پیالہ تھا جو نبی کریم ﷺ کے استعمال میں آچکا تھا۔نبی کریم ﷺ کے ہاں جو پیالے تھے ان میں سے لکڑی کے پیالوں کے علاوہ ایک شیشے کا پیالہ بھی بتایا جاتا ہے(۲)۔اور بعض کیلئے خصوصی نام بھی رکھے گئے تھے۔مثلاً ایک کو ریّان (۳) اور ایک کو مغیث کہا جاتا تھا۔نیز ایک قدح مضبّب بھی تھا۔

---

(۱) بخاری شریف ج ۲ ص ۸۴۲

(۲) عن ابن عباسؓ قال کانت لرسول اللہ ﷺ قدح قوار یر یشرب فیہ(ابن ماجۃ آخر ابواب الاشربۃ ص ۲۵۳) (مختار)

(۳) قال ابن القیم وکان للمصطفیٰ اقداح واحد منها الریّان وآخر الخ. هکذا و جدت فی شرح الشمائل للمناوی علی هامش جمع الوسائل فذکره بالباء واللام اقوال و لعل ذالک من سبق القلم و الصحیح ما ذکرنا انه الریان کما ذکره البیجوریؒ فی شرحه فی هذا المقام وزاد کان للنبی ﷺ قدح من عید ان بفتح العین المهملة والعید انه النخلة السحوق و هوالذی کان یوضع تحت سریره لیبول فیه باللیل (اصلاح الدین عفی عنه)

۳۰. باب ما جاء فی صفة فاکهة رسول الله ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے پھل تناول فرمانے کا بیان

اس باب میں ان پھلوں کا بیان ہے جو نبی کریم ﷺ نے تناول فرمائے ہیں۔"فاکھة" ما یتفکه به الانسان کا نام ہے۔یعنی وہ چیز جو تلذذ کی غرض سے کھائی جائے۔اس کا اطلاق گندم اور چاول جیسی بطور تغذی کھائی جانے والی اشیاء پر نہیں ہوتا۔اس طرح سبزیوں نیز ان چیزوں کو بھی فاکہہ نہیں کہتے جو کہ بطور دوا استعمال ہوتی ہیں بلکہ عموماً کھانے کے بعد تلذذ کی خاطر جو چیز کھائی جاتی ہے فاکہہ کہلاتی ہے۔

فاکہہ کے مفہوم میں اختلاف: ائمہ کے درمیان یہ اختلاف فقہ اور اصول فقہ کی کتب میں تفصیل سے مذکور ہے۔کہ فاکہہ کا مفہوم کن چیزوں کو شامل ہے اور کونسی اشیاء اس سے خارج ہیں۔مثلاً اگر کسی شخص نے فاکہہ یعنی پھل نہ کھانے کی قسم کھائی تو امام ابو حنیفہؒ کے ہاں کھجور اور انار سے حانث نہیں ہوگا۔کیونکہ اول الذکر تغذی اور دوسرا تداوی کے لیے بھی مستعمل ہوتا ہے۔جبکہ فاکہہ وہ ہے جو تغذی یا تداوی کے لیے نہ ہو۔ان کی دلیل اس سلسلے میں یہ ہے کہ قرآن مجید"فیھا فاکھة وّ نخلٌ وّ رُمّان" کہہ کر نخل اور رُمان یعنی کھجور اور انار کو فاکہہ پر عطف کر دیا گیا ہے۔اور عطف مغایرت کا مقتضی ہے۔اگر کھجور اور انار بھی پھل ہوں تو اس کا عطف فاکہہ پر صحیح نہیں ہوگا۔اس کے برعکس صاحبینؒ کے نزدیک دونوں چیزیں فاکہہ میں شمار کی جاتی ہیں۔اور فاکھہ سے قسم کھانے والا شخص کسی ایک کے کھانے سے حانث ہوگا۔گویا ان کے نزدیک فاکہہ میں تغذّی یا تداوی کا نہ ہونا شرط نہیں۔لیکن درست بات یہی ہے کہ اس قسم کا اختلاف زمانہ اور مختلف علاقوں کے عرف پر مبنی ہے۔ویسے بھی ایمان اور قسموں کا دارومدار عرف پر ہے۔

تو گویا جس ملک میں جو چیز بطور تفکّہ کھائی جائے۔وہ فاکھہ ہے۔مثلاً ہمارے ہاں کھجور اور انار میں سے کوئی بھی اتنی مقدار میں نہیں پایا جاتا کہ لوگ اسے بطور تغذی استعمال کریں۔بلکہ تفکہ اور تلذذ کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ فاکہہ میں آئیں گے۔اور جہاں پر کھجور وغیرہ اتنا زیادہ ہو کہ اسے غذا کے طور پر کھایا جائے تو یہ فاکہہ میں شمار نہ ہوگا اور نہ قسم کھانے والا اس کے کھانے سے حانث ہوگا۔

صاحبینؒ کا فتویٰ بھی اس پر مبنی ہے۔رہی یہ بات کہ قرآن مجید میں مذکورہ دونوں پھلوں کو فاکہۃ پر عطف کیا گیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا عطف اہتمام شان کی غرض سے کیا گیا ہوگا۔مثلاً انار کی افادیت اور لذت کو مدنظر رکھ کر اہتمام شان کی وجہ سے اس کی تخصیص کی گئی ہوگی۔جس طرح کہ دوسری جگہ آتا ہے وفاکهة و ابا یہاں ابّا کی تشریح میں عام مفسرین ان اشیاء کا نام لیتے ہیں جو کچی کھائی جاتی ہیں۔اور پھلوں میں سے نہیں۔مثلاً گاجر، مولی اور ککڑی وغیرہ۔لیکن بعض مفسرین نے جن میں ہمارے علامہ مناظر احسن گیلانیؒ بھی ہیں ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ ابا سے آم بھی مراد ہوسکتا ہے جسے آج بھی عربی میں انبہ کہتے ہیں۔اور اس کا ذکر فاکہہ کے بعد زیادہ اہتمام کی وجہ سے کیا گیا ہے ورنہ آم بھی تو پھل ہے۔

(۱) حدّثنا إسمٰعيل بن موسٰى الفزاريّ ثنا إبراهيم بن سعد عن أبيه عن عبداللّٰه بن جعفر قال كان النّبيّ ﷺ يأكل القثّاء بالرطب(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن جعفر سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ککڑی کو کھجور کے ساتھ کھایا کرتے تھے۔

عبداللّٰه بن جعفرؓ کا شمار کم عمر صحابہ میں ہوتا ہے۔باب نمبر ۱۳ میں انکے احوال مذکور ہیں۔

يأكل القثاء بالرطب قثاء کی متعدد قسمیں ہیں۔یہ کھیرے کی طرح کچا کھایا جاتا ہے۔اردو میں اسے ککڑی کہتے ہیں۔نبی کریم ﷺ کے اس عمل سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ مصلحت کے تحت بیک وقت دو چیزیں کھانا ناجائز نہیں۔

مسرفین کی طرح ہر وقت طرح طرح کے کھانے منہ میں ٹھونسنا اور بسیار خوری کی عادت نبی کریم ﷺ کو پسند نہ تھی لیکن نبی کریم ﷺ کا مذکورہ عمل اس کے جواز کے لئے کافی ہے۔گویا کراہت صرف اس صورت میں ہوگی جب اسے عادت بنا دیا جائے۔

---

(۱) صحيح بخاری ۸۱۸/۲ كتاب الأطعمة باب القثاء بالرطب، صحيح مسلم ۱۸۰/۲ كتاب الأشربة باب أكل القثاء بالرطب، ابو داؤد كتاب الأطعمة باب فی الجمع بين الكونين عندالاكل ۱۸۰/۲، ابن ماجة ص ۲۳۸ كتاب الأطعمة باب القثاء و الرطب يجمعان(مختار)

طبی مرکبات سے علاج کا نبوی ﷺ اصول: علاوہ ازیں قوانین طب کی رو سے کسی چیز کی مضر خصوصیت دوسری چیز کے ملانے سے بدل سکتی ہے۔زیادہ تر دوائیں بھی مرکبات کی صورت میں بنتی ہیں۔ تو مفردات کے ساتھ ساتھ علم طب کے مرکبات کا ایک عظیم الشان دروازہ حضور اقدس ﷺ کے اس عمل نے کھولا اور اس کا اصل یہی باب ہے کہ مختلف اشیاء کے ملانے سے اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر ایک چیز میں حرارت زیادہ ہے تو دوسرا جو کہ بارد ہے اس کی حرارت کو کم کر دیتا ہے تو نبی کریم ﷺ نے اس عمل سے اس بات کی طرف بھی اشارہ فرمایا کہ اعتدال مقصود ہو تو ترکیب کرنا چاہیے۔

یہاں بھی کھجور گرم اور ککڑی بارد ہے جبکہ زیادہ گرم یا زیادہ سرد چیز کا کھانا نقصان دہ ہوتا ہے۔اس لیے طبائع اطعمہ اور ان کی خصوصیات کا لحاظ رکھنا اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

ابوداؤد کی روایت(۱) میں تو نبی کریم ﷺ نے اس کی تصریح بھی کی ہے کہ یکسر حر هذا ببرد هذا و برد هذا بحرِ هذا یعنی اس ایک کی گرمی کو دوسرے کی سردی سے اور دوسرے کی سردی کو اس کی گرمی سے توڑا جاتا ہے(۲)۔

(۲) حدّثنا عبدة بن عبداللّٰه الخزاعیّ البصریّ ثنا معاویة بن هشام عن سفیان عن هشام بن عروة عن ابیهٖ عن عائشةؓ أنّ النّبیّ ﷺ یأکل البطیخ بالرطب(۳).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ تربوز کو تازہ کھجور کے ساتھ کھایا کرتے تھے۔

---

(۱)ابو داؤد ۲/۱۸۰ کتاب الأطعمة باب الجمع بین اللونین عند الأکل ج ۲ صف ۱۸۰ (مختار)

(۲)قال النوویؒ فیه جواز أکل الطعامین معاً والتوسع فی الأطعمة ولاخلاف بین العلماء فی جوازہ(جمع الوسائل ۱/۲۹۶)(مختار)

(۳)السنن الکبریٰ للنسائی ۴/۱۶۶ کتاب الولیمة ابواب الأطعمة باب الرطب، سنن ابی داؤد ۲/۱۸۰ کتاب الأطعمة، جامع ترمذی ۲/۶ کتاب الأطعمة باب ماجاء فی اکل البطیخ بالرطب، السنن الکبریٰ للبیهقی ۷/۲۸۱(مختار)

كان يا كل البطيخ (۱)بالرطب یہاں بھی وہی حکمت ملحوظ ہے کہ کھجور کی گرمی کو کم کرنے کے لیے تربوز کو بھی ساتھ ساتھ تناول فرمایا۔

(۳) حدثنا ابراهيم بن يعقوب ثنا وهب بن جرير ثنا ابي قال سمعت حميداًيقول او قال حدّثني حميد قال وهب و كان صديقا له عن أنس بن مالكؓ قال رأيت النبيﷺ يجمع بين الخربز والرطب(۲)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریمﷺ کو خربوزہ اور کھجورا کٹھے کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔

لطیف سندی نکتہ: اوقال حدّثني حميد الخ اس مقام پر راوی وہبؒ کو شک ہے کہ میرے والد جریرؒ نے سمعت حمید کہا یا حدثنی حمید کہا۔ بہر حال یہ اور اس قسم کی توضیحات سے رواۃ حدیث کا روایت میں

(۱) بطیخ کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض نے اس کا معنی خربوزہ لکھا ہے۔ اور بعض نے تربوز فرمایا ہے۔ اگر بطیخ کا معنی تربوز لیا جائے۔ جیسا کہ مشہور ہے۔ تو پھر کوئی اشکال نہیں رہتا۔ لیکن اگر خربوزہ مراد لیا جائے تو پھر اشکال ہوگا کہ اس میں يكسر حر هذا ببرد هذا کیسے ہوگا۔ جیسا کہ ابوداؤد کی روایت میں وضاحت کے ساتھ مذکورہ ہے۔ کہ كان يا كل البطيخ بالرطب فيقول يكسر حر هذا ببرد هذا او برد هذا بحرّ هذا؟ تو علماء کرام نے اس کی مختلف توجیہات کی ہیں۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں برودت سے مراد برودت حسی ہے یعنی ہاتھ لگانے میں ٹھنڈک اگر خربوزہ کو کاٹنے کے بعد تھوڑی دیر کھلا رکھ دیا جائے تو وہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اور بعض حضرات نے یہ توجیہ کی ہے کہ اس سے مراد کچا خربوزہ ہے۔ اس لئے کہ خربوزہ جب کچا ہو تو سرد (ٹھنڈا) ہوتا ہے اور جب پک جائے تو اس کی خاصیت بدل جاتی ہے۔ جیسا کہ آم کے بارے میں مشہور ہے کہ آم جب کچا ہو تو بارد ہوتا ہے اور جب پک جائے تو حار (گرم ہو جاتا ہے) اور بعض کا کہنا ہے یہ برودت امور اضافیہ میں سے ہے کہ بطیخ کی برودت رطب کے اعتبار سے ہیں کیونکہ رطب شدید الحرارۃ ہے۔ یہ توجیہات اس معروف اور مشہور قول کے اعتبار سے ہیں ورنہ شیخ بوعلی سینا سے منقول ہے کہ خربوزہ بھی بارد ہوتا ہے۔ لہٰذا بطیخ سے دونوں معنی مراد لئے جا سکتے ہیں۔ اس لئے مدینہ منورہ میں دونوں (خربوزہ اصفر، تربوز اخضر) پیدا ہوتے تھے۔ اور آئندہ روایت میں رأيت رسول اللهﷺ يجمع بين الخربز والرطب کی تصریح موجود ہے۔ (مختار)

(۲) السنن الكبرىٰ للنسائى ۱۶۷/۴ كتاب الوليمة ابواب الأطعمة باب الجمع بين الخربز والرطب، صحيح ابن حبان رقم حديث ۵۲۵۶۱ (مختار)

انتہائی درجہ کا حزم واحتیاط معلوم ہوتا ہے۔منکرین حدیث جب ان باریکیوں سے چشم پوشی کر لیتے ہیں تو انکار حدیث کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔اور اگرچہ بظاہر ان دونوں میں کوئی بڑا فرق دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن درحقیقت ان میں باریک اور اہم فرق موجود ہے۔

وکان صدیقا له الخ اس جملہ میں حمید سے جریرؒ کا سماع ثابت کرنا مقصود ہے۔کیونکہ جب دونوں دوست تھے تو سماع بھی ضرور ثابت ہوگا۔اور ساتھ ساتھ اس سے جریرؒ کا مرتبہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ معمولی آدمی نہ تھے بلکہ حمیدؒ جیسے امام کے دوست تھے۔چنانچہ اس جملے سے جریرؒ کا تزکیہ اور اس کی توثیق بھی ہوگئی۔اس لحاظ سے ''**وکان صدیقا له**'' کا ترجمہ یہ ہوگا کہ جریرؒ حمیدؒ کا دوست تھا۔اور یہ معنی بھی محتمل ہے کہ حمید جریر کا دوست تھا۔اس سے بھی جریرؒ کی توثیق ہوتی ہے۔لیکن اس طرح کان ضمیر حمیدؒ کو راجح ہوگا۔یہ دونوں ترجمے اس وقت ہیں جب صدیق فتح صاد کے ساتھ ہو۔لیکن ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ ایک نسخہ **صِدّیقا** یعنی صاد کے کسرہ اور دال مشدد مکسور کے ساتھ ہو۔پھر معنٰی یہ ہوگا کہ حمیدؒ جریرؒ کی زیادہ تصدیق کرنے والے تھے۔

<u>خربوزہ یا تربوزہ</u>: **الخربز والرطب** اس مقام پر خربز کے معنی میں اختلاف ہے بعض شارحین کے ہاں اس سے زرد رنگ کا پھل یعنی خربوزہ اور بعض کے ہاں سبز رنگ کا پھل یعنی تربوزہ مراد ہے۔مؤخر الذکر قول اکثر علماء کا ہے۔ان کے خیال میں چونکہ تربوزہ طبعی برودت کا حامل ہے جبکہ خربوزہ خود بھی گرم ہے۔اس لئے کھجور کی گرمی کو توڑنے والا خربوزہ نہیں بلکہ تربوزہ ہو سکتا ہے۔دوسری دلیل وہ گزشتہ روایت کو بناتے ہیں کہ وہاں بطیخ کا ذکر ہے۔تو گویا حضرت انسؓ بھی وہی حضرت عائشہؓ کی حدیث میں مذکورہ واقعہ کا ذکر کرتے ہیں لیکن بطیخ سے تعبیر خربز سے کیا گیا ہے۔اور اگر خربوزہ ہی مراد ہو تو پھر کچا خربوزہ مراد ہوگا جو کھیرے کی طرح طبعی طور پر سرد اور مٹھاس سے خالی ہوتا ہے۔لیکن بعض شراح کے خیال میں خود خربوزہ کا مراد ہونا بھی محتمل ہے کیونکہ وہ اگرچہ گرم ہے لیکن کھجور کی نسبت بارد ہے۔اس لیے ترکیب کے بعد کم از کم کھجور کی حرارت کو ختم کر سکتا ہے۔علامہ مناویؒ نے اس احتمال کو ترجیح دی ہے۔اور حافظ زین عراقیؒ کا قول بھی نقل کیا ہے کہ ''**الخربز اسم للاصفر بارض العراق**''۔

(۴) حدثنا محمّد بن یحییٰ ثنا محمّد بن عبدالعزیز الرملی ثنا عبداللّٰہ بن یزیدبن الصلت عن محمّد بن اسحاق عن یزید بن رومان عن عروة عن عائشةؓ أنّ النبیّ ﷺ اکل البطیخ بالرطب(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ تربوزہ کو ترکھجور کے ساتھ تناول فرماتے تھے۔

اکل البطیخ بالرطب اس حدیث کی تشریح پہلے گزر چکی ہے۔ پہلے دوسری سند سے مصنف اسے لاچکے ہیں۔

(۵) حدثنا قتیبة بن سعید عن مالک بن أنس وحدثنا اسحاق بن موسیٰ ثنا معن ثنا مالک عن سهیل بن أبی صالح عن أبیه عن أبی هریرة قال کان الناس اذا رأوا اوّل التمرجاء وابه إلی النبیّ ﷺ فاذا أخذه رسول اللّٰہ ﷺ قال اللّٰهمّ بارک لنا فی ثمارنا و بارک لنا فی مدینتنا و بارک لنا فی صاعنا و فی مدّنا اللّٰهم إنّ إبراهیم عبدک و خلیلک و نبیک وإنّی عبدک و نبیک وانّه دعاک لمکّة وانّی ادعوک للمدینة بمثل مادعاک به لمکّة و مثله معه قال ثمّ یدعو اصغر و لید یراه فیعطیه ذلک الثمر(۲).

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ جب لوگ کسی فصل آنے پر نئے پھل کو دیکھتے تو اس کو حضور ﷺ کی خدمت میں لاکر پیش کرتے۔ پس جب نبی کریم ﷺ اس کو لیتے تو فرماتے اے اللہ ہمارے لیے ہمارے پھلوں میں برکت عطا فرما اور ہمارے لیے

---

(۱)تفردالامام الترمذی بهذاالحدیث،جامع ترمذی ۲/ ۶ ابواب الاطعمة(مختار)

(۲)صحیح مسلم ۲/ ۴۴۲ کتاب الحج باب فضل المدینة، جامع ترمذی ۲/ ۱۸۳ کتاب الدعوات باب مایقول اذارأی باکورة من الثمر، السنن الکبریٰ للنسائی ۶/ ۸۳ کتاب عمل الیوم اللیلة باب مایقول اذاادعی باول الثمر(مختار)

ہمارے شہر میں برکت عطا فرما۔ اور ہمارے لیے (ہمارے پیمانوں یعنی) صاع اور مد میں برکت عطا فرما۔ اے اللہ بیشک ابراھیمؑ تیرے بندے دوست اور نبی تھے۔ اور بیشک میں تیرا بندہ اور تیرا نبی ہوں۔ اور بیشک انہوں نے شہر مکہ کے لیے تجھ سے دعا فرمائی تھی اور میں تجھ سے مدینہ کے لیے اس جتنا مانگتا ہوں جتنا انہوں نے مکہ کے لیے مانگا تھا۔ اور اس جتنا مزید بھی مانگتا ہوں۔ فرمایا پھر نبی کریم ﷺ کی نظر جس چھوٹے سے چھوٹے بچے پر پڑتی اس کو بلا کر وہ پھل اس کو دے دیتے تھے۔

<u>پہلا پھل حضور اقدس ﷺ کی نذر:</u> جاء وا به إلیٰ النبیؐ ﷺ اہل مدینہ کا رواج تھا کہ جب پہلی بار درخت کا پھل یا کھیت میں سبزی لگ جاتی تو اظہار محبت وعقیدت کے لیے اس کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کرتے تھے۔ اس میں نبی کریم ﷺ کو اپنے اوپر ترجیح، محبت کا اظہار، تعظیم اور ثمرات میں طلب برکات کے علاوہ اس بات پر تنبیہ بھی مقصود ہے کہ رزق الٰہی کا اولین اور سب سے زیادہ مستحق اشرف خلائق نبی کریم ﷺ ہیں(۱)۔

بلکہ ہمارے ہاں بھی یہی رواج بعض علاقوں میں چلتا ہے کہ لوگ عقیدت اور تعظیم کے طور پر علماء ومشائخ کو ایسے مواقع میں خود پر بھی مقدم کر لیتے ہیں۔ بزرگوں کی خدمت میں اس قسم کا پھل پیش کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف اس عمل سے آپ ﷺ اس لئے خوش ہوتے تھے کہ ملک کی معاشی حالت کی بہتری پر ملک کا سربراہ خوش ہوتا ہے۔ آپ ﷺ بھی مدینہ کی ظاہری خوش حالی اور فلاح کے لیے فکرمند رہتے۔ اور دعا فرمایا کرتے تھے کہ

اللّھمّ بارک لنا فی ثمارنا و بارک لنا فی مدینتنا و بارک لنا فی صاعنا و فی مدّنا۔

ترجمہ: اے اللہ ہمارے لیے ہمارے پھلوں میں برکت ڈال اور ہمارے شہر میں برکت ڈال اور ہمارے لئے صاع اور مد (یعنی فصل کے پیمانوں) میں برکت ڈال۔

---

(۱)علامہ بیجوریؒ ویؤخذ منه أنّه یندب الاتیان بالباکورہ لأکبر الصوم علمًا وعملاً (مختار)

جو کہ دراصل معاشی آسودگی کی دعا تھی۔اس لیے کہ باہر کے لوگوں کو کچھ فروخت کرنا ہو تو پیمانوں اور باٹوں سے کیا جاتا ہے چنانچہ ان میں بھی برکت کی دعا کی۔اور ساتھ ساتھ مدینہ میں برکت وہاں پر شعائرِ اسلامیہ کی بقاء کی دعا بھی تھی تا کہ عبادات اور بالخصوص زکوٰۃ اور صدقات جیسے مالی شعائر زندہ رہیں۔ انہی دعاؤں کا اثر آج بھی حرمین میں دکھائی دیتا ہے۔جہاں ہر چیز وافر ہوتی ہے۔پھل کی کمی نہ سبزی کی۔ حالانکہ لاکھوں افرادحج کے موسم میں جا کر یہ چیزیں کھاتے ہیں مگر دکانیں پھر بھی بھری ہوتی ہیں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔**یجبیٰ الیه من کل الثمرات (الآیة)** اور **وارزقهم من الثمرات (الآیة)** کاظہور ہے۔

<u>خلّة ابراهیم</u>: اللّهمّ إنّ إبراهیم علیه السلام حضرت ابراھیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے خلیل تھے بعض کا خیال ہے کہ خلیل خلة سے ہے جس کے معنی حاجت کے ہوتے ہیں۔اور چونکہ دوست سے حاجت پوری ہوتی ہے اس لیے دوست کو بھی خلیل کہتے ہیں۔اور بعض کے نزدیک یہ خُلّہ بضم خاء ہے۔جس کے معنی ایسی محبت کے ہوتے ہیں جو خلال قلب،یعنی قلب کے وسط میں داخل ہو۔اسی طرح خلیل محبوب کے معنی میں ہوگا۔اللہ تعالیٰ بھی خلیل ہے کیونکہ وہی حقیقی حاجت روا اور محتاج الیہ ہے۔اور بندہ خلیل ہے لیکن وہ محتاج ہے۔بہر حال اللہ تعالیٰ نے یہ تمغہ اور خصوصیت حضرت ابراھیمؑ کو دی ہے۔

وانّی عبدک الخ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابراھیمؑ کے لیے نبوت،خلّۃ اور عبدیت تینوں صفات ذکر فرمائیں لیکن خود اپنے لیے خلیل ہونے کا اعزازی لفظ ذکر نہیں کیا۔اپنے بارے میں آپ ﷺ انتہائی تواضع اور عجز وانکساری کی صفات برتتے تھے اور خصوصاً یہ موقع تو دعا کا ہے جس میں عاجزی ہی زیادہ کام آتی ہے۔بایں ہمہ آپ ﷺ رویا کرتے تھے کہ اے اللہ میں نے عبدیت کا حق بھی ادا نہیں کیا۔تو اگرچہ تمام بندوں میں نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہیں اور آپ ﷺ نے سب سے بڑھ کر اس صفة خلّہ سے بھی متصف ہیں لیکن تواضعاً آپ ﷺ نے اسے اپنے لیے استعمال نہیں کیا۔

وانه دعاک لمکّة یعنی پہاڑوں کے درمیان اور ریت کے ٹیلوں نیز لق ودق صحرا میں انہوں نے مکہ کے لیے دعائیں کی تھیں۔ایک بہت ہی غیر آباد مقام کو اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے لیے منتخب فرمایا

تھا۔سوئیزرلینڈ، فرانس، سوات، کشمیر یا مری کی بجائے مکہ میں بیت اللہ بنایا۔اس میں بڑی حکمت ہے کہ اس طرح عشق وعبدیت کی شان باقی رہتی ہے۔خوبصورت مقامات کو تو لوگ سیر کرنے جاتے ہیں۔عشاق کی جگہیں جنگل، صحرا اور بیابان ہوتی ہیں۔ پھول باغات اور دلکش مناظر ان کو راس نہیں آتے۔جبکہ بیت اللہ کی زیارت تو ابتداء سے آخر تک سفر عشق اور محبت کے منازل ہیں۔مکہ بھی ایسے ہی ایک بہت غیر آباد علاقے میں واقع ہے۔اور خصوصاً ابراھیمؑ کی آمد کے وقت تو اور بھی ہو کا منظر تھا۔پانی تھا نہ چارہ۔گھر نہیں تھے، پرانے آثار بھی مٹ چکے تھے۔وہ آئے تو دعا کی جو یہ تھی:

ربّنا اِنّی اسکنتُ من ذریّتی بوادغیر ذی زرع عندبیتک المحرّم. ربنا لیقیموا الصّلوٰة فا جعل افئدةً من الناس تهوی الیهم وارزقهم من الثمرات لعلهم یشکرون.(الایة)

نیز آپ ﷺ نے فرمایا **ربِّ اجعل هذا بلداً آمناً وارزق اهله من الثمرات.(الآیة)**

ترجمہ: اے ہمارے رب میں اپنی اولاد کو تیرے معظم گھر (کعبہ) کے قریب ایک میدان میں جو زراعت کے قابل بھی نہیں آباد کرتا ہوں تا کہ وہ لوگ نماز کا اہتمام رکھیں۔پس آپ کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دیجئے اور ان کو پھل کھانے کو دیجئے تا کہ یہ لوگ شکر کریں۔

اے میرے پروردگار اس جگہ کو امن والا شہر بنادے اور اس شہر والوں کو پھلوں سے رزق دے دے۔

ثمرات کل شیئ کا مطلب: یہ دعائیں تھیں جو سب قبول ہو گئیں۔اور کچھ نہ اگانے والے میدان کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ "**و یجبیٰ الیه ثمرات کل شی**" یہاں **کل شئی** کے معنی یہ نہیں کہ ہر قسم کا پھل ہر ملک سے آتا ہے بلکہ **کل ثمر** کی بجائے **کل شئی** کا ذکر اس لیے کیا کہ تمام دنیا کے متاع زیست کا خلاصہ وہاں لایا جاتا ہے۔مثلاً ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ، گھڑیاں اور کپڑا وغیرہ بھی

سب ثمرات الاشیاء ہیں۔

توثمرة شئی سے مراداس چیز کا حاصل اور پیداوار ہے۔وہ چیز بے جان ہو یا جاندار، پھل ہو یا غلہ، زمین کی فصلیں اور سبزیاں ہوں یا کارخانوں کی مصنوعات ہوں۔ بہر حال دنیا کے تمام ممالک جو بھی کام کی چیز بناتے ہیں وہ بنا کر مکہ مکرمہ پہنچاتے ہیں۔وانی ادعوک الخ یعنی اگر حضرت ابراھیم علیہ السلام نے مکہ کے لیے مانگا تھا تو میں مدینہ کے لیے اس سے دوچند مانگتا ہوں۔اوراس دعا کا اثر آج بھی حجاج کو محسوس ہوتا ہے۔کیونکہ مدینہ میں راحت مل جاتی ہے۔آسائش سکون اور ارزانی وہاں مکہ کی نسبت زیادہ ہے۔جہاں گلی گلی، ذرّہ ذرّہ جمال نبوی ﷺ سے منور اور وجود اطہر سے معطر ہے۔

ثمّ یدعو اصغر ولیدا الخ ایسے موقع پر نبی کریم ﷺ مجلس میں موجود سب سے چھوٹے بچے کو بلا کر بطور ھدیہ لایا جانے والا پھل دے دیتے۔ایک تو نوعمر بچوں کو نئے نئے پھل وغیرہ زیادہ پسند ہوتے ہیں۔اس لیے اس عمل سے ان کی دلجوئی بھی ہو جاتی ہے۔اور بچوں کی دلجوئی ایک نیکی ہے جو دعا کو درگاہ ربوبیت میں قبولیت کے قریب تر کردیتی ہے(۱)۔

نیز ولید اور اس قسم کی چیز کے درمیان ایک معنوی مناسبت بھی ہے۔وہ یہ کہ ولید بھی نوعمر اور نوخیز پھل جیسا ابھی پیدا ہوا ہوتا ہے۔اور یہ لائی ہوئی چیز باکورہ بھی نوخیز اور تازہ پیدا ہوتی ہے۔اس لیے ولید کو دیتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے استحقاق اور ایک لطیف مناسبت کا لحاظ رکھا ہے۔خود اس نئے پھل کو اس لئے نہیں کھاتے تھے کہ اس طرح کھانے میں حرص اور خواہشِ نفس پورا کرنے کا شبہ ہوتا ہے۔نیز اس بات پر تنبیہ کے لیے بھی خود کھانے سے پرہیز کرتے تھے کہ پاکیزہ نفوس اور کامل الاخلاق لوگوں کے لیے نئے پھلوں کا تناول تب کرنا چاہئے جب عوام الناس میں سے تمام یا اکثر کی رسائی ایسے پھل تک ہو جائے۔

---

(۱) ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے وفیہ بیان حسن عشرتہ وکمال شفقتہ ومرحمتہ وملاطفتہ مع الکبیر والصغیر وتنزیل کل احدفی مقامہ ومرتبتہ الائقة بہ(جمع الوسائل ۱/ ۳۰۰) اور یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ اس وقت تک پھل تناول نہ فرماتے تھے جب تک فراوانی نہیں ہوتی تھی۔ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے والنفوس الذکیة لاترکن إلیٰ تناول شئ من الباکورة إلاّبعد ان یعمّ وجودہ ویقدر کل احدعلی اکلہ(جمع الوسائل ۱/ ۳۰۰)(مختار)

(٦) حدّثنا محمّد بن حمید الرازیّ ثنا إبراهیم بن المختار عن محمّد بن إسحاق عن ابی عبیدة بن محمّد بن عمّار بن یاسر عن الرُبیع بنت معوّذ بن عفراء قالت بعثنی معاذ بن عفراء بقناع من رطب وعلیه اجرو من قثاء زغبٌ و کان النبیّ ﷺ یحبّ القثاء فاتیته به و عنده حلیةٌ قد قدمت علیه من البحرین فملأیده منها فاعطانیه(١).

ترجمہ: ربیعؓ فرماتی ہیں کہ مجھے میرے چچا معاذ بن عفراءؓ نے ایک تھال جن پر روئیں دار چھوٹی ککڑیاں بھی تھیں دیکر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ نبی کریم ﷺ ککڑی پسند کیا کرتے تھے۔ جس وقت میں یہ طبق لائی حضور ﷺ کے پاس کچھ زیورات تھے۔ جو بحرین سے آئے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے ان میں سے ہاتھ بھر کر مجھے مرحمت فرمائے۔

ربیع: عن الربیع الخ رائے مضموم با مفتوح اور یائے مشدد مکسور کے ساتھ یہ راویہ کا نام ہے۔ والد کا نام معوذؓ ہے۔ جو میم مضموم اور واو مشدد مکسور کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ معوذ بن حارث مشہور بدری صحابی ہیں جو ابن عفراء کے نام سے مشہور ہیں۔ والدہ عفراء بنت عبیدؓ(٢) مشہور صحابیہ ہیں۔ خود ربیع بنت معوذؓ بن حارث بن رفاعہ مشہور صحابیہ ہیں۔ بیعتِ رضوان میں بھی شرکت کی۔ نبی کریم ﷺ آپ کی شادی کے دوران آپ کے گھر تشریف لائے تھے۔ جس میں دف بج رہا تھا۔ اور بدر کے شہداء کو بھی یاد کیا جا رہا تھا۔ آپ ﷺ بیٹھے سنتے رہے۔ ایک روایت کے مطابق حضرت رُبیع نے آپ ﷺ کو پانی انڈیل کر وضوء بھی کرایا تھا۔ کئی غزوات میں شرکت کی۔ زخمیوں اور شہدا کی خدمت کرتی رہی۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے ایام تک زندہ رہیں۔

معاذ ومعوّذ: بعثنی معاذ: معاذؓ بھی معوذؓ کے بھائی ہیں۔ جلیل القدر بدری صحابی ہیں۔ یہی وہ دو نامور ہستیاں تھیں جنہوں نے نوعمری کے باوجود جنگ بدر میں ابوجہل پر حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دیا تھا۔

(١) تفرد بهذا الحديث الامام الترمذی البغوی فی شرح السنة ١١/٣٣ کتاب الاطعمة (مختار)

(٢) حضرت عفراءؓ وہ واحد صحابیہ ہیں جن کے سات بیٹے جنگ بدر میں شریک تھے۔ کمافی الاصابة (مرتب)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ان دونوں کا قصہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بدر میں صفیں کھڑی ہوگئیں تو میں نے دیکھا کہ میرے دونوں طرف دو نوجوان کھڑے ہیں۔ جنگ کی شدت اور طرفین میں ناتجربہ کار نوجوانوں کی وجہ سے عدم تحفظ کا تصور کر کے میں پریشان ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد ان دونوں نے باری باری ابوجہل کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔ میں نے کہا کہ تم اس کا کیوں پوچھ رہے ہو۔ ابوجہل تو بہت مضبوط شخصیت کا مالک ہے۔ ہم سب مل کر اس کا علاج نہیں کرسکے۔ تم بچے ہو کر کیا کرسکو گے۔ لیکن انہوں نے پھر منت کی۔ میں نے اچانک ابوجہل کو صفیں درست کرتے ہوئے دیکھا تو ان دونوں کو اشارہ سے بتادیا کہ وہ ہے۔ دونوں نوجوان شاہینوں کی طرح جھپٹے اور ابوجہل کو شدید زخمی کردیا۔ پھر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے آکر اس کی گردن کاٹ دی۔

حضرت معوذؓ تو غزوۂ بدر میں شہید ہوگئے تھے اور حضرت معاذؓ کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اپنے بھائی کی طرح بدر میں شہادت پائی۔ جبکہ دوسرے قول کے مطابق آپؓ بدر میں زخمی ہوگئے تھے۔ اور پھر مدینہ منورہ آکر وفات پائی۔ لیکن علامہ ابن عبدالبرؒ اور علامہ ابن حجرؒ نے دونوں روایتوں کو مرجوح قرار دیا ہے۔ صحیح قول کے مطابق آپؓ نے حضرت علیؓ کی خلافت کے زمانے میں وفات پائی تھی۔ البتہ بدر میں آپؓ کا ایک ہاتھ کٹ گیا تھا۔

بقناع من رطب تازہ کھجور کا بھرا ہوا ایک تھال دے دیا۔ **وعلیہ اجرٍ واجرٍ** جِروٌ کی جمع ہے جرؤ دراصل بلی، کتے، درندوں اور مرغی وغیرہ کے چھوٹے بچے کو کہا جاتا ہے لیکن یہاں جرو قثاء سے چھوٹی چھوٹی ککڑیاں (۱) مراد ہیں۔ جن پر عموماً چھوٹے چھوٹے تیز کانٹوں جیسے بال ہوتے ہیں۔ اور پکڑتے وقت انگلیوں میں چبھ جاتے ہیں۔ بہر حال تازہ تازہ ککڑیاں کھجور کے ساتھ رکھی تھیں۔

زُغبٌ یہ لفظ مرفوع ہے۔ اور جرو کی صفت ہے۔ جس طرح کہ آنے والی روایت میں ہے جبکہ بعض

---

(۱) اہل حجاز کے ہاں جرو کا اطلاق ہر چھوٹی چیز پر ہوتی ہے۔ چنانچہ زمخشریؒ ایک شخص سے روایت کرتے ہیں کہ میں مدینہ منورہ میں ایک گلی سے گزر رہا تھا۔ کہ اچانک ایک آدمی کو دیکھا جو سر پر بانس کی گٹھڑی اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ بولا "اعطنی ذالک الجرو" میں نے دیکھا نیچے کتا ہے نہ کتے کا بچہ میں نے کہا "ماھنا جرو" وہ بولا "انت عراقی اعطنی تلک القثاء" تم عراقی معلوم ہوتے ہو میں یہ ککڑی مانگ رہا ہوں۔ (مختار)

کے ہاں مجرور ہے۔اور قناء کی صفت ہے۔ازغب کی جمع ہے جو کہ چھوٹے روؤں والے اور تیز کانٹوں والے کو کہتے ہیں۔

وعنده حِلیةً لحیۃ کے وزن پر حُلِیٌ کی جمع ہے قرآن مجید میں بھی ''وتستخرجون منه حلیةً تلبسونها'' میں مذکور ہے۔زیور کو کہتے ہیں۔مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے پاس بحرین کے خراج کے مال سے کچھ سونے چاندی کے زیور لائے گئے تھے۔

فملأیده الخ چونکہ ہدیہ لانے والی ایک لڑکی تھی۔جن کو فطری طور پر زیورات سے محبت ہوتی ہے۔اس لیے آپ ﷺ نے احسان کا بدلہ مناسب اور ایسے احسان سے دیا جس سے وہ زیادہ خوش ہوتی ہے۔اور زیورات سے تزیّن عورت ہی کیلئے مناسب ہے۔قرآن مجید کہتا ہے کہ

أو من یُنشأ فی الحلیة و هو فی الخصام غیر مبین(زخرف ۱۸)

کیا(خدا کی اولاد ہے)وہ جو کہ عادۃً آرائش میں نشو ونما پائے۔اور مباحثہ میں قوت بیانیہ بھی نہ رکھے۔

(۷) حدّثنا علیّ بن حجر أنا شریک عن عبدالله بن محمّد ابن عقیل عن الربیع بنت معوّذ بن عفراء قالت اتیت النّبیّ ﷺ بقناعٍ من رطب و اجرو زغبٍ فاعطانی ملأکفه حلّیًا او قالت ذهباً(۱).

ترجمہ: ربیعؓ سے روایت ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں کھجور اور چھوٹی روئیں دار ککڑیوں کی چنگیری لے کر حاضر ہوئی۔تو نبی کریم ﷺ نے مجھ کو ایک ہاتھ بھر کر زیور عطا فرمایا۔یا یہ کہا کہ سونا عطا فرمایا۔

اس حدیث کی تشریح بھی پچھلی حدیث جیسی ہے۔صرف ایک مقام پر راوی کے شک کا ذکر ہے کہ حضرت ربیعؓ نے حلیا کہا تھا یا ذہبا۔دونوں حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ بہت زیادہ سخی تھے۔اور احسان کے بدلہ میں محسن(۲) سے بڑھ جاتے تھے۔

---

(۱)تفرد بهذا الحدیث الامام الترمذی(مختار)

(۲)بخاری شریف کی روایت میں ہے کان النبی ﷺ یقبل الهدیة ویثیب علیها بخاری ۱/۳۵۲ کتاب الهبة اعکافأة فی المعیة (اصلاح الدین)

خلاصہ باب

نبی کریم ﷺ کو پھل پسند تھے۔اور ہر قسم کے پھلوں کے ساتھ ذوق سلیم کے مطابق معاملہ فرماتے تھے۔اس باب میں چند اشیاء مثلاً ککڑی، خربوزہ، تربوز اور کھجور کا ذکر ہے۔آپ ﷺ نے ان میں سے کھجور کو دوسرے مذکورہ اشیاء کے ساتھ تناول فرمایا۔کیونکہ اس طرح ان دونوں چیزوں میں طبعی اعتدال پیدا ہو جاتا تھا۔نیز طبی لحاظ سے اس کا فائدہ بھی بڑھ جاتا تھا۔کیونکہ کھجور کے ساتھ سرد چیزوں کا استعمال ہو تو یہ بدن کی نشوونما میں بہت مؤثر اور مقوی ہو جاتا ہے۔حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میری والدہ کی خواہش تھی کہ شادی سے قبل میں فربہ ہو جاؤں۔ان کی یہ خواہش صرف اس وقت پوری ہوئی جب مجھے کھجور کے ساتھ ککڑی کھلائی گئی۔تو میں خوب فربہ ہو گئی(۱)۔

اس کے ساتھ ساتھ ذائقہ میں بھی بہت اعتدال آجاتا ہے۔کیونکہ ککڑی کھجور کی تیز مٹھاس کو کم کر دیتی ہے۔اور کھجور کی وجہ سے ککڑی کا پھیکا پن ختم ہو جاتا ہے اور معتدل ذائقہ بن جاتا ہے۔علاوہ ازیں دیگر روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ انگور بھی تناول کر چکے ہیں۔

(۱)ابوداؤد۲/ ۱۸۹ کتاب الطب باب فی السمنة وابن ماجه ص ۲۴۶ ابواب الاطعمةباب القثاء و الرطب یجمعان (مختار)

۳۱. باب ما جاء فی صفة شراب رسول اللهﷺ

حضور اقدسﷺ کے مشروبات کا بیان

اس باب میں نبی کریمﷺ کے مشروبات کا بیان ہے کہ آپﷺ نے کیا کیا پیا ہے اور کس صفت کے ساتھ مشروبات آپﷺ کو مرغوب ہوتے تھے۔گویا ’’کلّ شراب شربه رسول اللهﷺ‘‘ کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

(۱) حدّثنا إبن أبی عمر ثنا سفیان عن معمر عن الزهری عن عروة عن عائشةؓ قالت کان احب الشراب الی رسول اللهﷺ الحلو البارد(۱)۔

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریمﷺ ٹھنڈے اور میٹھے مشروب کو تمام مشروبات میں سب سے زیادہ پسند فرماتے تھے۔

کان أحبّ الشراب إلیٰ رسول اللهﷺ آپﷺ کا مرغوب ترین مشروب وہ تھا جس میں دو صفتیں ہوں۔اول یہ کہ وہ میٹھا ہو۔دوم یہ کہ ٹھنڈا ہو۔

پانی کی دو مرغوب صفتیں: نعمتوں میں رغبت صحیح وسالم انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔پانی میں پینے کے لحاظ سے مرغوب صفتیں دو ہی ہیں۔یعنی میٹھا ہونا اور ٹھنڈا ہونا۔اس لیے آپﷺ ان دو صفتوں والے پانی کو پسند فرماتے تھے۔آپﷺ کے لیے میٹھا پانی دور کے کنوؤں سے مدینہ منورہ لایا جاتا تھا(۲)۔

---

(۱)جامع ترمذی ۲/ ۱۱ کتاب الاشربة باب ماجاء ای شراب کان أحبّ إلیٰ رسول اللهﷺ، مصنف ابن ابی شیبة۸/ ۳۶۱،شرح السنة ۱۱/ ۳۶۴کتاب الاشربة(مختار)

(۲)اورایک روایت کے مطابق یہ کنواں مدینہ منورہ سے دو دن (یعنی ۳۶ میل) کی مسافت پر تھا۔اور آپﷺ میٹھے اور ٹھنڈے پانی کا اہتمام فرماتے تھے۔اس لئے علامہ ابن بطالؒ نے فرمایا ہے کہ ٹھنڈے پانی کا اہتمام کرنا زہد کے خلاف نہیں۔اور نہ کھارا پانی پینا باعث فضیلت ہے۔امام دارالھجرۃ امام مالکؒ اپنے تلامذہ سے فرمایا کرتے تھے کہ ٹھنڈا پانی پیا کرو۔اس لئے کہ ٹھنڈے پانی کی وجہ سے دل کی گہرائی سے شکر ادا ہوتا ہے۔حافظ ابن قیمؒ نے فرمایا ہے کہ پانی میں جب دو اوصاف (حلاوت اور برودت) پائے جائیں تو ایسا پانی حفظان صحت کا ضامن ہے۔اور تبخیر کو دفع کرتا ہے۔(مختار)

سات مخصوص کنووں کا پانی آپﷺ پسند فرماتے تھے۔ جن کا پانی پینے کے لیے آپﷺ کو مہیا بھی کیا جاتا تھا۔ ان میں بیر سقیا زیادہ مشہور تھا جو مدینہ منورہ سے ایک یا دوسرے قول کے مطابق دو دن کے سفر کے فاصلہ پر تھا۔

یہاں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ میٹھے مشروب سے وہ پانی مراد ہو جس میں شہد، شربت، یا نبیذ ملا دیا گیا ہو جو کہ ایک مستقل نعمت ہے۔ اور نعمت جتنی اعلیٰ ہو، اتنا ہی خلوص حمد و تشکر میں ہوتا ہے اور دل کی گہرائیوں سے الحمدللہ کی صدا اُٹھتی ہے۔

ایسے ہی جب خوب پیاس لگی ہوئی ہو اور ٹھنڈا اور میٹھا پانی ملے تو بے اختیار آدمی کی زبان سے اللہ کا شکر ادا ہوتا ہے۔ اور انہی اسباب کی بنا پر آپﷺ کو اس قسم کا پانی زیادہ پسند ہوتا تھا۔

(۲) حدّثنا أحمد بن منیع ثنا إسماعیل بن إبراهیم أنا علّی بن زید عن عمر هو إبن أبی حرملة عن إبن عباس قال دخلت مع رسول اللّهﷺ انا و خالد بن الولید علی میمونة فجاء تنا باناء من لبن فشرب رسول اللّهﷺ وانا علی یمینه و خالد علی شماله فقال لی الشربة لک فان شئت آثرت بها خالدا فقلت ما کنت لأ وثر علی سورک احداً ثمّ قال رسول اللّهﷺ من اطعمه اللّٰه طعاماً فلیقل اللّهم بارک لنافیه و اطعمنا خیراً منه و من سقاه اللّٰه لبناً فلیقل اللّهم بارک لنا فیه و زدنا منه ثمّ قال رسول اللّهﷺ لیس شئی یجزئ مکان الطعام والشراب غیر اللبن۔

قال أبو عیسیٰ هکذا روی سفیان ابن عیینة هذا الحدیث عن معمر عن الزهری عن عروة عن عائشةؓ ورواه عبداللّٰه بن المبارک و عبدالرزاق و غیر واحد عن معمر عن الزهری عن النبیّﷺ مرسلا ولم یذکر وا فیه عن عروة عن عائشة وهکذاروی یونس وغیر واحد عن الزهری عن النبیّﷺ مرسلا قال ابو عیسیٰ و انّما اسنده ابن

عیینة من بین الناس.

ومیمونة بنت الحارث زوج النبیّ ﷺ هی خالة خالد بن الولید و خالة ابن عباسؓ وخالة یزیدبن الاصم واختلف الناس فی روایة هذا الحدیث عن علیّ بن زید بن جدعان فرویٰ بعضهم عن علیّ بن زید عن عمر ابن أبی حرملة ورروی شعبة عن علیّ بن زید فقال عن عمرو بن حرملة والصحیح عمر بن حرملة(۱).

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں اور خالد بن ولیدؓ دونوں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ حضرت میمونہؓ کے پاس آئے۔ ام المؤمنین ہمارے لیے دودھ کا ایک برتن لائیں۔ نبی کریم ﷺ نے (اس دودھ میں سے) پیا۔ میں نبی کریم ﷺ کے دائیں جانب اور خالد بن ولیدؓ بائیں جانب بیٹھے تھے۔ آپ ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا کہ پینے کی باری تیری ہے۔ اگر تو چاہے تو خالد کو ترجیح دیدے۔ میں نے کہا کہ میں آپ ﷺ کے جھوٹے میں اپنے پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ پھر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ کوئی چیز کھلائے۔ تو وہ یہ دعا پڑھے کہ اے اللہ تو اس (کھائی ہوئی چیز) میں ہمارے لیے برکت عطا فرما۔ اور اس سے بہتر چیز عطا فرما۔ اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ دودھ عطا فرمائے۔ تو وہ یہ دعا پڑھے، اے اللہ تو اس دودھ میں ہمارے لیے برکت عطا فرما۔ اور ہمارے لیے اس میں زیادتی فرما۔ پھر حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دودھ کے سوا کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو کھانے اور پانی دونوں کی کفایت کرے۔ (اس کے بعد امام ترمذیؒ نے دونوں حدیثوں کی سندوں کے بارے میں کچھ توضیحات کی ہیں۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی)

---

(۱)سنن ابی داؤد ۲/۱۶۸ کتاب الاشربة باب مایقول اذاشرب اللبن، جامع ترمذی ۲/۱۸۳ کتاب الدعوات باب ما یقول اذا کل طعاماً السنن الکبریٰ للنسائی ۶/۷۹ کتاب عمل الیوم واللیلة باب مایقول اذاشرب اللبن(مختار)

دخلت الخ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں اور حضرت خالد بن ولیدؓ نبی کریم ﷺ کے گھر گئے۔ اور ام المؤمنین حضرت میمونہ بنت الحارثؓ کے حجرے میں داخل ہوئے۔ حضرت ابن عباسؓ حضرت میمونہؓ کے بھانجے لگتے ہیں۔ کیونکہ وہ حضرت میمونہؓ کی بہن لبابۃ الکبریٰ کے بیٹے ہیں۔ اور ام المؤمنینؓ کی دوسری بہن لبابۃ الصغریٰ چونکہ حضرت خالدؓ کی والدہ ہیں اس لیے وہ حضرت خالدؓ کی بھی خالہ لگتی ہیں۔ اس طرح حضرت یزید بن الاصمؓ کی والدہ بھی حضرت میمونہؓ کی بہن ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہاں حجاب کی رکاوٹیں نہیں ہیں۔

فشرب رسول اللہ ﷺ نبی کریم ﷺ نے خود اپنے آپ کو اس لئے مقدم فرمایا کہ اس طرح دودھ میں برکت پیدا ہوگی۔ اور ساتھ ساتھ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت خالدؓ کی بھی یہی خواہش ہوتی تھی کہ وہ نبی کریم ﷺ کا جھوٹا پی لیں۔

الشِربة لک شین پر تینوں حرکات آتے ہیں۔ اور اس سے معانی بھی بدل جاتے ہیں لیکن پینے کی باری جس کی ہو اس کیلئے کہتے ہیں۔ **له شِربٌ ، یا لَه' شربةٌ** یعنی شین کو مکسور پڑھا جاتا ہے۔ اسی معنٰی پر قرآن میں بھی آتا ہے۔ "**ولها شِرب ولکم شِربُ یوم معلوم**" یعنی اس اونٹنی کے لیے پینے کا معین نمبر اور تمہاری باری کا بھی مقرر دن ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی شین مکسورہ کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔

<u>معاشرتی آداب کی حکیمانہ تعلیم:</u> لہٰذا معنٰی یہاں یہ ہوگا کہ باری تو تمہاری ہے۔ کیونکہ تم داہنی جانب ہو۔ اور ایمن زیادہ مستحق ہوتا ہے۔ لیکن دوسری طرف حضرت خالد بن ولیدؓ ہیں جو عمر میں بزرگ ہیں اور اکبر سناً بھی ایک لحاظ سے زیادہ قابل قدر رہتا ہے۔ اس لئے اگر دونوں سامنے ہوتے پھر تو عمر کا لحاظ کیا جاتا۔ اور اکبر سنا سے ابتداء ہوتی کیونکہ یہی شرعی آداب ہیں۔ لیکن چونکہ ابن عباسؓ دائیں اور حضرت خالدؓ بائیں جانب تھے۔ اس لیے اس حیثیت سے حضرت ابن عباسؓ کو ترجیح ملتی تھی۔ نبی کریم ﷺ کے اس بیان سے ایک معاشرتی ادب کی تعلیم بھی ملتی ہے۔ کہ دائیں جانب کو بائیں جانب پر ترجیح حاصل ہے۔

فان شئت آثرت بها خالداً اس مشورہ اور ارشاد میں نبی کریم ﷺ نے ایک اور ادب کی

طرف اشارہ فرما دیا کہ عمر میں بزرگ کی بھی رعایت کرنی چاہیے۔ آپ ﷺ نے حضرت ابن عباسؓ کو ایثار کرنے کا مشورہ دیا۔

نا قابل ایثار نعمت: حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ میں تو آپ ﷺ کا حکم ماننے اور تعمیل ارشاد کے لیے بسروچشم تیار ہوں۔ لیکن ہر چیز میں تو ایثار بھی نہیں ہوتا۔ لہذا **ما کنت لا وثر علی سورک احداً** یعنی خالد کا احترام مجھ پر واجب ہے۔ لیکن آپ ﷺ کے جھوٹے میں ایثار کر کے کسی کو نہیں دے سکتا۔ خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ کیونکہ یہ تو ہر وقت نہیں ملتا(۱)۔

اسی طرح کے ایک اور واقعہ میں ایک صحابی اور اس کے بیٹے میں یہ نزاع پیدا ہوگی کہ ان میں سے کون جہاد میں شامل ہو جائے۔ اور کون گھر میں رہے۔ دونوں میں قرعہ اندازی کی گئی۔ تو قرعہ بیٹے کا نکل آیا۔ باپ نے منت کی کہ ''**آثرنی**'' یعنی قربانی کر کے یہ باری مجھے دے دو۔ لیکن بیٹے نے فرمایا **لا یؤثر بالجنۃ احدٌ احداً ابداً** یعنی جنت میں ایثار نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر جنت جہاد کے راستے میں ملے۔ تو وہ کسی کو نہیں دے سکتا خواہ باپ (۲) کیوں نہ ہو۔

اب اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ حضرت خالدؓ کو مقدم کر دیتے۔ تو اس میں ایک اور فائدہ بھی تھا کیونکہ اگر وہ پی لیتے تو حدیث کی رو سے اس کا جھوٹا بھی تو شفا تھا کیونکہ ارشاد ہے کہ **فی سور المؤمن شفاء** پھر ساتھ ساتھ نبی کریم ﷺ کا جھوٹا بھی تھا۔ دونوں سور جمع ہو کر فضیلت اور بڑھ جاتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی کوشش یہ تھی کہ عین اس جگہ پر ہونٹ رکھ دے جہاں نبی کریم ﷺ نے لب مبارک رکھے تھے اس دوسری غرض کی وجہ سے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے پیالہ حضرت خالدؓ کو نہیں دیا۔ **ثم قال الخ** پھر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس کو اللہ تعالیٰ طعام دے دے جو بھی پھل وغیرہ نصیب ہو۔ تو وہ تناول کرتے ہوئے یوں کہے۔

---

(۱) یہاں پر یہ مسئلہ بھی قابل توجہ ہے کہ قربات میں ایثار جائز ہے یا نہیں؟ تو شوافع کے ہاں قربات میں ایثار جائز نہیں۔ لیکن حنفیہ کثر اللہ سوادہم کے ہاں جائز ہے۔ بشرطیکہ قربات نافلہ ہوں۔ اور استدلال میں یہی روایت پیش کرتے ہیں کہ اگر ایثار جائز نہ ہوتا تو آنحضرت ﷺ عبداللہ بن عباسؓ کو ایثار کا مشورہ کیوں دیتے۔ (مختار)

(۲) المواہب اللدنیہ ص ۱۴۸

دودھ اعلیٰ ترین نعمت ہے: اللھم بارک لنا فیه واطعمنا خیراً منه. یعنی اللہ ہمارے لیے اس چیز میں برکت ڈال دے۔اور اس سے بہتر چیز ہمیں عطا فرما۔

اور جس نے دودھ پیا وہ یہ کہے کہ اے اللہ ہمارے لیے اس میں برکت ڈال دے۔اور اسے زیادہ فرما۔ کیونکہ دودھ تمام نعمتوں میں اعلیٰ ترین نعمت ہے۔اور دنیا کے تمام ڈاکٹر، سائنس دان اور علم حیوانات و نباتات کے ماہرین اس پر متفق ہیں کہ ہر نعمت سے بڑھ کر ایک اور نعمت بھی ہے سوائے دودھ کے۔لیبارٹریوں کی تحقیقات سے سائنس دودھ کی مکمل غذائیت کا وہی فیصلہ دہرا رہی ہے جو کہ چودہ سو سال قبل نبی کریمﷺ نے کیا تھا۔اور آج بھی محققین کی رائے یہ ہے کہ بچے کیلئے ڈبوں میں بند دودھ یا دوسری دوائیں اتنی مفید نہیں جتنا ماں کا دودھ مفید ہے۔پھر دودھ میں جو حیاتین، پروٹین اور نباتی اجزاء شامل ہیں۔ وہ دوسرے اغذیہ میں کب ملتے ہیں۔اس لئے نبی کریمﷺ نے اعلان فرمایا کہ لیس شیئا یجزی مکان الطعام والشراب غیر اللبن کہ کھانے پینے کی تمام اشیاء کا نعم البدل دودھ کے سوا کوئی اور طعام نہیں ہوسکتا۔

اغذیہ اور کھانوں کا کوئی بھی ماہر چودہ سو سال قبل یہ فیصلہ نہیں کرسکتا تھا۔اس لیے یہ آپﷺ کی نبوت کا بیّن ثبوت ہے۔

مسند اور مرسل کی سندی بحث: قال ابو عیسیٰ الخ امام ترمذیؒ یہاں باب کی دونوں حدیثوں کی سندوں کے بارے میں کچھ تبصرہ کرنا چاہتے ہیں۔پہلی حدیث کی سند پر تبصرے کا حاصل یہ ہے کہ سفیان بن عیینہؒ نے اس حدیث کو مسند روایت کیا ہے۔حضرت عروۃؓ کے واسطے سے حضرت عائشہؓ سے اس روایت کو مسند ذکر کرنے میں وہ متفرد بھی ہیں۔لیکن اس حدیث کی یہ غرابت اس کی صحت کی منافی نہیں ہے۔ دوسری طرف امام زہریؒ جو خود بھی تابعی ہیں۔اس حدیث کو نبی کریمﷺ سے روایت کرتے ہیں اور صحابی یا کسی دوسرے واسطہ کا ذکر بھی نہیں کیا ہے تو صحابی کے ذکر نہ کرنے کی وجہ سے یہ مرسل ہوئی۔لیکن یہ مرسل بھی اجماعاً حجت ہے۔ہمارے ہاں تو مرسل حجت ہے۔لیکن شوافعؒ کے ہاں اس لیے حجت ہے کہ یہ مسند سے مؤید ہے۔امام ترمذیؒ نے جامع میں مرسل کی سند کو مسند کی سند کی نسبت راجح قرار دیا ہے۔علامہ مناویؒ

نے زہریؒ کی سند میں عروہؓ کے ترک کرنے کی وجہ سے حدیث کو منقطع کہا ہے۔لیکن چونکہ زہریؒ خود تابعی ہیں۔لہٰذا یہاں صرف صحابی کا ترک لازم آتا ہے۔

قال ابو عیسیٰ الخ دوسری حدیث کے بارے میں تبصرہ کررہے ہیں۔جس میں ایک تو حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور خالد بن ولیدؓ دونوں کا حضرت ام المؤمنین میمونہؓ کے ساتھ رشتہ کا بیان کررہے ہیں کہ دونوں کی خالہ لگتی ہیں۔لہٰذا ان کا حرم نبویؐ کے ہاں داخلہ قابل اعتراض نہیں ہے۔دوسری یہ کہ اس سند میں علی بن زیدؒ کے استاد کے نام میں اختلاف ہے کہ وہ عمر ہے یا واو کے ساتھ عمرو ہے۔اوران کے والد کی کنیت ابوحرملہ ہے یا نام حرملہ ہے۔تو روایات میں اختلاف ذکر کرنے کے بعد فیصلہ سناتے ہیں کہ یہ نام عمر بن ابی حرملۃ ہے اس کا نام عمرو نہیں ہے۔نہ والد کا نام حرملہ ہے۔

ام المؤمنین میمونہؓ: و میمونة بنت الحارث الخ ام المؤمنین میمونہ کا پہلا نام برّہ تھا۔نبی کریم ﷺ نے نام تبدیل کرکے میمونہ رکھا۔جاہلیت کے زمانہ میں معوذ بن عمرو ثقفی کے نکاح میں تھیں۔اس سے جدائی کے بعد ابورہم نامی شخص سے نکاح کیا۔اس کی وفات کے بعد ذی القعدہ ۷ھ میں عمرۃ القضاء کے سفر کے دوران مکہ سے دس میل کے فاصلہ پر واقع سرف کے مقام پر نبی کریم ﷺ کے نکاح میں آئیں۔اس وقت آپ ﷺ احرام میں تھے۔عمرہ سے واپسی پر اسی جگہ شادی کی تقریب کا اہتمام ہوا۔اور عجیب اتفاق یہ پیش آیا کہ ۵۱ھ یا ایک قول کے مطابق ۶۱ھ کو اسی مقام پر آپؓ کا انتقال بھی ہوا۔اور یہیں دفن ہوئیں۔آپؓ نبی کریم ﷺ کی نکاح میں آنے والی سب سے آخری بیوی تھیں۔عبداللہ بن عباسؓ کی والدہ لبابہ کبریٰ اور خالد بن ولیدؓ کی والدہ لبابۃ الصغریٰ آپؓ کی حقیقی بہنیں تھیں۔علاوہ ازیں نو یا دس اخیافی بہنیں بھی تھیں۔جن میں حضرت اسماء بنت عمیسؓ کا نام بھی ہے جو حضرت علیؓ کی بیوی تھی۔اور حضرت علیؓ سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور اس سے پہلے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی طرف سے بیوہ ہو چکی تھی۔ان تینوں حضرات سے اسماءؓ کی اولاد بھی ہوئی تھی۔

خلاصہ باب

اس باب میں یہ بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ٹھنڈا اور میٹھا پانی بہت مرغوب ہوتا تھا۔ نیز دودھ بھی آپ شوق سے پیتے تھے۔ اور اس کو بڑی نعمت کہتے۔ حتیٰ کہ اس سے بڑی نعمت کا گویا تصور بھی نہیں تھا۔ حتیٰ کہ اس کی دعا کی جائے۔

میٹھے اور ٹھنڈے پانی کی طلب بلکہ اس سلسلے میں تکلف بھی تعیش اور ترفہ کے زمرے میں نہیں آتی۔ نہ یہ زہد کے منافی ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے بھی میٹھے اور کڑوے پانی میں فرق کو اشارہ کیا ہے فرماتے ہیں کہ **هذا عذب فرات سائغ شرابه وهذا ملح اجاج**

شیخ ابوالحسن شاذلیؒ فرماتے ہیں کہ جب میں میٹھا پانی پیتا ہوں۔ تو دل کے وسط سے رب ذوالجلال کے لیے حمد نکل جاتی ہے۔

(فالحمدللّٰہ علی نعمائه الکاملة)

۳۲. باب ما جاء فی صفۃشرب رسول اللہ ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے پینے کے طریقے کا بیان

مشروبات کی کیفیت کے بیان کے بعد اس باب میں نبی کریم ﷺ کے پینے کا طریقہ بیان کیا جاتا ہے۔اور بالخصوص اس بات کی تفصیل ہے کہ کھڑے ہوکر پینا جائز ہے یا نہیں۔عام روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عذر اور مجبوری نہ ہو تو حتی الوسع کھڑے ہوکر پانی پینے سے اجتناب کیا جائے اور اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر پینا چاہیے۔لیکن بعض مواقع میں خود نبی کریم ﷺ سے کھڑے ہوکر پانی پینا ثابت ہے۔ جیسے زمزم کا پانی نبی کریم ﷺ نے کھڑے ہوکر پیا ہے۔یہاں پر امام ترمذیؒ پہلے وہ احادیث لاتے ہیں جن میں کھڑے کھڑے پانی پینا ثابت ہے۔

(۱) حدّثنا أحمد بن منیع ثنا ھشیم انا عاصم الأ حول و مغیرۃ عن الشعبی عن ابن عباس أنّ النبیّ ﷺ شرب من زمزم وھو قائم(۱).

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے زمزم کا پانی کھڑے ہوکر پیا۔

زمزم کیا ہے؟ زمزم حرم پاک میں موجود پانی کا نام ہے جو کہ زمانہ قدیم سے کنویں کی صورت میں موجود تھا۔اس کے لغوی معنی ''بہت زیادہ'' کے ہوتے ہیں۔اور یہ پانی بھی اتنا زیادہ ہے کہ کئی ہزار سال استعمال ہونے کے باوجود یہ ختم ہونے کو نہیں آتا۔حالانکہ یہ اس وادی غیر ذی ذرع میں واقع ہے جہاں میلوں تک گھاس اور پانی نہیں ہے اب تو زمزم کے پانی کو مدینہ تک باقاعدہ پہنچانے کی کوشش جاری ہے۔ مسجد نبوی ﷺ میں تو اب بھی یہ عام ملتا ہے بعض اہل خیر حضرات ٹینکروں سے وہاں یہ پانی پہنچاتے ہیں۔

---

(۱)صحیح بخاری ۱/۲۲۱ کتاب الحج باب ماجاء فی زمزم، صحیح مسلم ۲/۱۷۳ کتاب الأشربۃ باب فی الشرب من زمزم قائماً جامع ترمذی ۲/۱۰ کتاب الأشربۃ باب ماجاء فی الرخصۃ فی الشرب قائماً، سنن النسائی ۲/۳۹ کتاب مناسک الحج باب الشرب من زمزم(مختار)

بعض لوگوں نے وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ حضرت ہاجرہؓ نے جب پہلے پہلے اس پانی کو زمین سے ابلتے ہوئے دیکھا تو جلدی جلدی ادھر ادھر سے مٹی اور پتھر لا کر بند باندھنے لگی۔ اور ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگی "زم زم" جسکا معنی ہے ٹھہر جا ٹھہر جا۔ اسی وجہ سے اس پانی کا نام زمزم پڑ گیا۔

<u>زمزم کی برکات:</u> یہ بہت مبارک پانی ہے۔ پینے والوں کو بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ نیز اس کے پیتے ہوئے جو دعا کی جاتی ہے وہ بھی قبول ہوتی ہے۔ مستجاب وغیرہ ہونے کے سبب صدقِ دل سے کی جانے والی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ علماء کرام اور بزرگان عظام سے اس موقع پر کچھ مخصوص دعائیں منقول ہیں۔ جن کی قبولیت کی شہادت تاریخ دے رہی ہے۔

مثلاً علامہ ابن حجرؒ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے اس مقام پر یہ دعا کی تھی کہ اے اللہ میرا حافظہ علامہ ذہبیؒ کے حافظے جیسا بنادے۔ ایک اور محدث کے بارے میں آیا ہے کہ انہوں نے دعا کی کہ اے اللہ میری تمام زندگی اتباع سنت میں گزرے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ سب سے بہتر دعا یہ ہے کہ اے اللہ مجھے مستجاب الدعوات بنادے۔ بہر حال جہاں دعا قبول ہوتی ہے شربِ زمزم انہی مواقع میں سے ایک ہے(۱)۔ البتہ بہتر دعا کا انتخاب اس کا ملکہ اور اس کا الہامی القاء کسی کسی کو ہوتا ہے۔ ایک ضروری بات یہ ہے کہ دعا اخلاص اور سوز و گداز کے ساتھ ہونی چاہیے۔ سرسری زبان سے اور قلب غافل کے ساتھ دعائیہ کلمات کی ادائیگی مقصود نہ ہو۔ یہ عبادت کی مغز ہے عشق و محبت کے ساتھ ہو۔ جیسے نبی کریم ﷺ کی دعائیں ہیں۔ ملا علی قاریؒ نے "الحزب الاعظم" کے نام سے آپ ﷺ کی مسنون دعاؤں کو جمع کیا ہے۔ جن الفاظ، تعبیرات اور درد کے ساتھ آپ ﷺ نے دعائیں مانگی ہیں کتاب پڑھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ بالخصوص سفر حج و عمرہ اور حرمین میں اس کی کیفیات اور لطف دوبالا ہوجاتے ہیں جس کا پچھلے تیس چالیس سال سے مجھے تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ والحمد للہ

معنوی برکت کے ساتھ ساتھ زمزم میں کچھ ظاہری خصوصیات بھی ہیں۔ یہ کھانے کی بھی کفایت کرتا ہے۔ کیونکہ اس میں غذائیت موجود ہے۔ بہت سے بزرگوں نے طویل عرصہ تک صرف زمزم پی کر گزارہ کیا

---

(۱) عن جابر بن عبداللہ یقول سمعت رسول اللہ ﷺ ماء زمزم لما شرب له ۲۲۰ ابن ماجة ۲۲۰ ابواب المناسک (مختار)

ہے۔جیسا کہ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی کے بارے میں روایت ہے کہ ایک طویل مدت تک آپ نے زمزم پینے کے سوا کچھ نہیں کھایا(۱)۔

<u>پانی پینے کا طریقہ:</u> یہاں پر نبی کریم ﷺ سے قیام کی حالت میں پانی پینا ثابت ہورہا ہے۔یہ حجۃ الوداع کا موقعہ تھا۔نبی کریم ﷺ اس روز سواری پرسوار طواف کررہے تھے۔طواف کے بعد دوگانہ پڑھنے کیلئے آپ ﷺ سواری سے اترے ہونگے۔اوراسی دوران آپ ﷺ نے زمزم کا پانی مانگا ہوگا۔اورحضرت ابن عباسؓ نے پیش کیا ہوگا۔اس تشریح کے مطابق اس باب کی تیسری حدیث اورزیرنظر حدیث میں تطبیق ہوجاتی ہے کہ یہاں تو حضور ﷺ کا خود پینا ذکر ہے۔اوروہاں پر ابن عباسؓ کی طرف سے پیش ہونے کا ذکر ہے۔لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ یہ دونوں الگ الگ واقعے ہوں۔ایک بار آپ ﷺ نے خود پیا ہو۔دوسری بار ابن عباسؓ نے پیش کردیا ہو۔

<u>کھڑے ہوکر پینے کی ممانعت واباحت کا بحث:</u> بہرحال آپ ﷺ نے عملاً کھڑے کھڑے پانی پیا۔جس سے اس عمل کا جواز ثابت ہوتا ہے۔لیکن مسلم شریف کی ایک روایت میں آیا ہے کہ

لایشربنّ احد منکم قائما فمن نسی فلیستقئی(۲)۔

تم میں سے کوئی کھڑے ہوکر پانی نہ پئے۔جس نے بھولے سے پیا۔وہ اسے قے کردے۔

جس سے کھڑے ہوکر پینے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔اس بظاہر تدافع کو دیکھ کر بعض لوگوں نے احادیث نہی کو ناسخ کہہ کر کہا کہ کھڑے ہوکر پینا جائز نہیں۔اور جہاں نبی کریم ﷺ سے کھڑے ہوکر پینا مروی ہے۔وہ یا تو منسوخ ہے۔یا پھر عذر پر محمول ہے۔مثلاً زمزم کا پانی کھڑے کھڑے اس لیے پیا تھا کہ چونکہ اس کنویں کے کنارے بہت ازدحام ہوتا ہے۔پھر اس زمانے میں منڈھیر پر کیچڑ اور پانی بھی ہوتا تھا۔لہٰذا یہاں بیٹھنا مشکل ہوتا تھا۔پرانے زمانے میں زمزم کھلا کنواں تھا۔اوراس پر چرخی لگی ہوئی تھی۔ڈول

---

(۱)حضرت ابوذرؓ جب پہلے پہلے نبی کریم ﷺ کے ساتھ ملاقات کی خاطر مکہ تشریف لائے تو ایک موقعہ پر اپنی روپوشی کی حالت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔"فاختبات بین الکعبة و بین استارھا ولبثت فیھا بین خمس عشرة من یوم ولیلة ومالی طعام و لاشراب الا ماء زمزم. کذافی الاصابة ج ۲ ص ۶۳ (اصلاح الدین)

(۲)مسلم ج ۲ ص ۱۷۳(مختار)

سے پانی نکالا جاتا تھا۔ مشینیں تھیں نہ نلکے۔ بلکہ چرخی اور ڈول تو مشین کے دور تک لگی ہوئی تھی۔ میرے مشاہدے کی ۱۳۸۳ھ کی بات ہے کہ لوگ خود ڈول کے ذریعے پانی نکال بھی سکتے تھے۔ کنویں کے اندر جھانکنا بھی ممکن تھا اور لوگ جھانک بھی لیتے تھے۔ کیونکہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص کنویں میں جھانک کر دیکھے تو تمام گناہ اس میں جھڑ جاتے ہیں(۱)۔

آج کل تو وسیع انتظامات مثلاً جنگلوں، نلکوں، اور مشینوں کے باوجود ازدحام اتنا زیادہ ہوتا کہ نلکوں پر نمبر ملنا مشکل ہوتا ہے۔ ملے بھی تو کھڑے ہو کر پینے کی سہولت ہے۔ اور قیام کی حالت ہی میں پینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ لہٰذا نبی کریم ﷺ نے بھی ضرورت کی بنا پر کھڑے ہو کر زمزم پیا ہوگا۔ ویسے عام حالات میں ایسا کرنا مکروہ ہوگا۔ پانی زمزم کا ہو یا کوئی دوسرا پانی ہو۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینے سے نہی کی حدیث سے زمزم اور وضوء کے پانی کی تخصیص ہو چکی ہے۔ گویا احادیث نہی کی تعمیم منسوخ ہو چکی ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کا عمل اس کے لئے ناسخ ہے اور صرف ان دو موقعوں میں بیانِ جواز کے لیے آپ ﷺ نے ایسا کیا ہے۔ تو گویا عمومی طور پر تو کھڑے کھڑے پینا مکروہ ہوگا۔ البتہ دو جگہ جائز ہوگا۔ کیونکہ زمزم اور وضوء کا پانی عام پانیوں کی طرح نہیں ہے۔ اس کی خصوصیات اور فضائل کی وجہ سے اس کا زیادہ پینا مطلوب ہے۔ اور اس کا مشروع طریقہ بھی یہی ہے کہ قبلہ رو کھڑے ہو کر بتکلف زیادہ پیا جائے (۲)۔

تیسری رائے یہ ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع کرنے کا حکم ارشاد پر مبنی ہے۔ اور نہی تنزیہی ہے۔ کیونکہ کھڑے کھڑے پانی پینے میں دنیوی مفاسد اور طبی نقصانات ہیں۔ لہٰذا شرعی نقطۂ نگاہ سے بیٹھ کر پینا ضروری ہے۔ نہ کھڑے ہو کر پینا مکروہ بلکہ بدن انسانی کے لیے مصالح کی بنیاد پر آپ ﷺ نے

(۱) لم افز بحديث يثبت ذالک الا ما رأيت فی انجاح الحاجة علی ابن ماجة حيث قال "والنظر اليها والطهور منها يحط الخطايا" (ابن ماجة باب الشرب من زمزم)(اصلاح الدين)

(۲) عن ابن عباسؓ قال اذا شربت منها فاستقبل القبلة واذكر اسم الله و تنفس ثلاثا وتضلّع منها فاذا فرغت منها فاحمد الله عزو جل فان رسول الله ﷺ قال انّ آية ما بيننا و بين المنافقين انّهم لا يتضلعون من زمزم(ابن ماجة ص ۲۲۶)ابواب المناسک باب الشرب زمزم(اصلاح الدين)

کھڑے ہوکر پینا منع کردیا ہے۔مثلاً علامہ ابن قیمؒ نے کھڑے ہوکر پینے کی بہت سی آفات لکھی ہیں۔جن میں پیاس کا نہ بجھنا بلا استفادہ کے معدے سے پانی کا گزر جانا(۱)وغیرہ ایک واضح ضرر یہ بھی ہے کہ آدمی بہت زیادہ سیر ہوجاتا ہے۔جس کی وجہ بوجھل اور سست ہوجاتا ہے۔بدن میں بے اعتدالی پیدا ہوجاتی ہے۔لہٰذا علماء کہتے ہیں کہ عموماً تو ایسا نہیں کرنا چاہیے لیکن زمزم کا پانی اپنی برکتوں اور خصوصیات کی وجہ سے جتنا زیادہ پیا جائے بہتر ہے۔لہٰذا اسے کھڑے ہوکر پینا اس لیے افضل ہوگا کہ وہاں تکثیر مضر نہیں مطلوب ہے چنانچہ احادیث میں وارد نہی ارشاد اور تنزیہ پر مبنی ہوگی۔اور عمل بیان جواز کے لیے ہوگا۔

(۲) حدّثنا قتیبة بن سعیدثنا محمّد بن جعفر عن حسین المعلّم عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده قال رایت رسول اللهﷺ یشرب قائماًو قاعداً(۲).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریمﷺ کو کھڑے اور بیٹھے دونوں طرح پانی پیتے دیکھا۔

<u>سندعمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی تحقیق:</u> واضح رہے کہ عمرو کے والد کا نام شعیب ان کے والد محمد اوران کے والد عبداللہ بن عمرو بن العاص ہیں۔اب یہاں پر عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ میں ابیہ کی ضمیر تو بالاتفاق عمرو کو راجع ہے۔لیکن جدہ کی ضمیر میں دو احتمال ہیں۔اگر عمرو کو راجع ہو تو جدہ سے مراد محمد بن عبداللہ بن عمرو ہیں۔جو تابعی ہیں اور اگر ضمیر"اب"یا شعیب کو راجع ہو۔تو اس سے شعیب کے دادا عبداللہ بن عمرو مراد ہونگے۔اول الذکر صورت میں حدیث مرسل ہوگی۔یعنی صحابی متروک الذکر ہوگا۔علاوہ ازیں شعیب کی روایت اپنے والد محمد سے بھی محل نظر ہے۔کیونکہ اس کا کہیں ثبوت نہیں ملتا۔البتہ اگر جد کو جداعلیٰ پر محمول کرکے عبداللہ بن عمرو بن العاص مراد لئے جائیں تو شعیب کی روایت ان سے ثابت ہے۔مؤخرالذکر

---

(۱) شاید مسند احمد کی ایک روایت میں بھی انہی مضرات کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہے **لو یعلم الذی یشرب وهو قائم ما فی بطنه لاستقاء(مسند احمد ج ۲ ص ۲۸۳)(اصلاح الدین)**

(۲)جامع ترمذی ۲/۱۰ کتاب الاشربة باب ماجاء فی الرخصة فی الشرب قائماً، صحیح مسلم ۲/۱۷۳ کتاب الاشربة(مختار)

صورت میں حدیث مسند ہوگی۔لیکن کچھ لوگوں کے ہاں شعیب کی ملاقات عبداللہؓ سے مخفی ہے۔اس لیے یحیٰی بن معینؒ سے مروی ہے کہ یہ سند کمزور ہے۔البتہ اکثر علماء جن میں امام بخاریؒ، امام احمدؒ، اور علی بن المدینیؒ بھی ہیں کے نزدیک مؤخر الذکر صورت میں سند کو متصل قرار دیتے ہیں۔اور شعیب کی ملاقات اپنے دادا سے ثابت کر کے اس سند کو قابل احتجاج مانتے ہیں۔امام بخاریؒ نے کتاب القدر میں اسی سند سے ایک حدیث کی تخریج کی ہے۔اور یہی صورت اقویٰ بھی معلوم ہوتی ہے۔

عبداللہ بن عمرو بن العاص: عبداللّٰہ بن عمروؓ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا اصل نام عاص تھا۔ ایک جنازہ کے دوران نبی کریم ﷺ نے آپؓ کا نام تبدیل کر کے عبداللہ رکھ لیا۔ابو محمد اور ابو عبدالرحمن کنیت تھی۔مکثرین فی الحدیث صحابہ میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت آپؓ سے روایت کرتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے آپ کو حدیث لکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔اور اسی وجہ سے حضرت ابو ہریرہؓ کے بقول آپؓ کے پاس تمام صحابہ سے زیادہ احادیث موجود تھیں۔البتہ عمر کا اکثر حصہ مصر اور شام میں گزارنے کے سبب آپؓ کی روایات بعض دیگر صحابہ کی نسبت کم نقل کی گئیں۔آپؓ اپنے والد عمرو بن العاصؓ سے بھی پہلے اسلام لائے تھے۔ایک روایت کے مطابق آپؓ اپنے والد سے صرف بارہ برس یا گیارہ برس چھوٹے تھے۔

طویل قد اور سرخ رنگت تھی عمر کے آخری حصے میں نظر سے بھی محروم ہو چکے تھے۔تورات کے بھی عالم تھے۔کثرت علم کے علاوہ عبادت کے ایسے شوقین تھے کہ کثرتِ صوم اور تلاوت کی وجہ سے والد صاحب نے نبی کریم ﷺ سے شکایت کی۔چنانچہ آپ ﷺ نے پابندیاں لگادیں۔جنگ صفین میں باپ کے حکم سے شریک تو ہوئے مگر قسم کھاتے ہیں کہ تیر، تلوار یا نیزہ کو کبھی استعمال نہیں کیا۔اور مسلمانوں کے درمیان لڑی جانے والی اس جنگ میں صرف شرکت کی وجہ سے بھی بہت نادم تھے۔اور ہمیشہ استغفار کیا کرتے تھے۔نیز فرماتے ”کاش میں اس واقع سے دس برس قبل ہی مرجاتا“ بہتر سال کی عمر میں ۶۵ھ کو شام میں اور ایک قول کے مطابق ۶۷ھ کو مکہ میں وفات پائی۔

قائماً و قاعداً یعنی کبھی آپ ﷺ کھڑے ہو کر پیتے تھے اور کبھی بیٹھ کر۔بلکہ اکثر بیٹھ کر پیتے

تھے۔ان دوطریقوں کے علاوہ دوسرے اوضاع میں پانی پینا نامناسب ہے۔مثلاً چلتے چلتے، ٹیک لگا کر، لیٹے لیٹے، یا رکوع اور سجدہ کی حالت میں پانی نہیں پینا چاہیے۔

(۳) حدّثنا علیّ بن حجرثنا إبن المبارک عن عاصم الأحول عن الشعبی عن إبن عباس قال سقیت النّبیّﷺ من زمزم فشرب و ھو قائم(۱).

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریمﷺ کو زمزم کا پانی پلایا تو آپﷺ نے کھڑے ہوکر اسے پیا۔

فشرب وھو قائم باب کی پہلی حدیث کی طرح یہاں بھی کھڑے کھڑے پانی پینا ثابت ہورہا ہے۔جس کی تفصیل گزرچکی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ زمزم کی فضیلت اور نبی کریمﷺ کا اہتمام کے ساتھ پینا بھی یہاں ثابت ہورہا ہے۔

(۴) حدّثنا أبو کریب محمّد بن العلاء و محمّد بن طریف الکوفیّ انبانا إبن الفضیل عن الأعمش عن عبدالملک بن میسرة عن النزال عن سبرة قال اتی علیّ بکوز من ماء و ھو فی الرّحبة فاخذ منه کفاً فغسل یدیه و مضمض واستنشق و مسح وجھه وذر اعیه وراسه ثمّ شرب منه و ھو قائم ثمّ قال ھذا و ضوء من لم یحدث ھکذا رأیت رسول اللهﷺ فعل (۲).

ترجمہ: نزال بن سبرہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے پاس پانی کا بھرا کوزہ لایا گیا۔جبکہ آپؓ اس وقت رحبہ میں تھے۔آپﷺ نے اس سے ایک چلو پانی لیا۔جس سے

(۱)صحیح بخاری ۱/۲۲۱ کتاب الحج باب ماجاء فی زمزم، صحیح مسلم ۲/۱۷۳ کتاب الأشربة باب فی الشرب من زمزم قائماً،جامع ترمذی کتاب الأشربة باب ماجاء فی الرخصة فی الشرب ۲/۱۰ قائماً (مختار)

(۲)صحیح بخاری ۲/۱۶۷ کتاب الأشربة باب الشرب قائماً، سنن ابی داؤد کتاب الأشربة باب فی الشرب قائماً سنن النسائی کتاب الطھارة باب صفة الوضؤ من غیر حدث، السنن الکبریٰ للبیھقی ۱/۷۵ کتاب الطھارة(مختار)

دونوں ہاتھ دھوئے۔ پھر کلی کی، ناک میں پانی ڈالا، پھر منہ، بازوں اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر کھڑے ہوکر کوزے کا پانی پیا اور فرمایا یہ اس شخص کا وضوء ہے جس کا وضوء نہ ٹوٹا ہو۔ ایسا ہی میں نے نبی کریم ﷺ کو کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

بکوز من ماء کوزہ میں یہ پانی وضوء کی غرض سے لایا گیا تھا۔ **وھو فی الرحبہ** امیر المؤمنین حضرت علیؓ کھلے میدان میں تھے۔ رحبہ راء مفتوحہ اور حاء کے فتحہ اور سکون دونوں کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ دراصل صحن اور کھلے میدان کو کہتے ہیں۔ اور اس سے مراد مسجد کوفہ کے ساتھ وہ کشادہ جگہ ہے جہاں حضرت علیؓ بیٹھ کر فیصلے بھی سنایا کرتے تھے۔ اور وعظ وتذکیر بھی فرماتے تھے۔ جبکہ بعض شراح کے نزدیک یہاں وہ چبوترہ مراد ہے جو مسجد کوفہ کے اندر حضرت علیؓ کے وعظ اور قضاء کے لیے بالخصوص بنایا گیا تھا۔

فمضمض الخ یہ اخذ پر عطف ہے۔ غسل پر عطف اس لیے درست نہیں ہوتا کہ ایک بار پانی لینے سے ان تمام کاموں کا کرنا عقلاً مستبعد ہے۔ ایک چلو پانی سے ہاتھ بھی دھوئے جائیں اور پھر اسی سے مضمضہ واستنشاق وغیرہ کے سارے کام بھی سرانجام ہوں۔ لہٰذا معنی یہ ہوگا کہ ایک چلو پانی لے کر آپ ﷺ نے ہاتھ دھوئے، پھر منہ، ناک دھویا اور مسح کیا۔

مسح وجھہ و ذراعیہ آپؐ نے پانی لے کر منہ، سر اور ہاتھوں کا مسح کیا۔ تو گویا یہ حقیقی وضوء نہیں تھا۔ ورنہ منہ اور ہاتھوں کا مسح تو بالاتفاق وضوء میں کافی نہیں ہوتا۔ لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ تبرید کے لیے یا گردوغبار صاف کرنے کے لیے آپ ﷺ نے یہ عمل کیا تھا۔ وضوء پہلے سے تھا۔ اور اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ یہاں پاؤں دھونے کا سرے سے ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ پاؤں دھوئے بغیر وضوء نہیں ہوسکتا۔ اور یہ بھی محتمل ہے کہ آپ ﷺ نے غسلِ خفیف کیا ہو جس کو راوی نے مسح کہا۔ اور چونکہ مسئلہ تجدید الوضوء علی الوضوء کا تھا۔ اسی لیے بعض اعضاء کے دھونے کا ذکر ہے پاؤں کا ذکر نہیں کیا۔ اور اعضاء کا دھونا بھی خفیف طریقہ سے ہوا۔ مؤخر الذکر احتمال کو شراح نے ترجیح دی ہے۔

ھکذا رأیت الخ نبی کریم ﷺ کو یہ دونوں عمل کرتے ہوئے دیکھا تھا کہ تجدید وضوء میں ہلکا سا وضوء کیا اور وضوء کے بعد جو پانی بچا تھا وہ کھڑے ہو کر پیا تھا۔ اس طرح بچے ہوئے پانی پینے کی اباحت

بلکہ استحباب بھی ثابت ہوا۔ علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ وضوء کے بعد بچا ہوا پانی کھڑے ہو کر پینا بعض امراض کا علاج ہے(۱)۔ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ یہ مستحب ہے۔ کیونکہ یہ بھی زمزم کی طرح متبرک پانی ہے۔ اور اگر نبی کریم ﷺ کا عمل صرف بیان جواز کیلئے ہوتا تو حضرت علیؓ اس کا اعادہ نہ فرماتے۔

(۵) حدّثنا قتیبة بن سعیدویوسف بن حماد قالا حدّثنا عبدالوارث ابن سعید عن أبی عصام عن أنس بن مالک أنّ النبی ﷺ کان یتنفّس فی الاناء ثلاثا اذا شرب ویقول هو امرء وارویٰ(۱) .

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ برتن میں (پانی پیتے ہوئے) تین مرتبہ سانس لیا کرتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ اس طریقہ سے پینا زیادہ خوشگوار اور خوب پیاس بجھانے والا ہے۔

__پانی کتنے سانسوں میں پینا چاہئے:__ **کان یتنفّس الخ** اس حدیث میں پانی پینے کا ایک اور ادب بیان کرنا مقصود ہے کہ ایک سانس میں پانی نہیں پینا چاہیے۔ بلکہ آرام سے پینا چاہیے۔ درمیان میں سانس لینا چاہیے۔ **فی الإناء** کا مقصد یہ نہیں کہ برتن کے اندر سانس لینا ہے بلکہ برتن کو دور کر دینا چاہیے۔ کیونکہ برتن میں سانس لینا مکروہ ہے۔ اس سے دوسری احادیث میں ممانعت آئی ہے(۲)۔ نبی کریم ﷺ سانس

---

(۱)وفیہ حدیث إنّ فیه شفاء من سبعین داء ادنا ها البهر (دمه) قال الحافظ انه واه وفی شرح هدایة ابن العماد لسیدی عبدالغنی النابلسی و ممّا جربته أنّی اذا اصابنی مرض اقصد الا ستشفاء یشرب فضل الوضوء فیحصل لی الشفاء و هذا دابی اعتماد علی اوّل الصادق ﷺ فی هذا الطب النبوی الصحیح(ردالمحتار ج ۱ ص ۹۲)مطلب فی مباحث الشرب قائما (اصلاح الدین)

(۲)صحیح مسلم ۱۷۴/۲ کتاب الأشربة باب الکراهیة التنفس فی نفس الإناء الخ، سنن ابی داؤد ۱۶۸/۲ کتاب الأشربة باب فی الساقی متی یشرب، جامع ترمذی ۱۰/۲ کتاب الأشربة باب ماجاء فی التنفس فی الإناء(مختار)

(۳)عن ابی سعید الخدریؓ أنّ النبیّ ﷺ نهی من النفخ فی الشراب فقال رجل القذاة اراها فی الاناء فقال اهر قها فقال فانّی لاارویٰ من نفس واحدة قال فا بن القدح اذاً عن فیک. وروی عن ابی قتادةؓ انّ رسول اللّٰه ﷺ قال اذا شرب احدکم فلا یتنفّس فی الاناء. کلا الحدیثین رواهما الترمذی ج ۲ ص ۱۱ وروی الاخیر البخاری ۸۴۱/۲(اصلاح الدین)

لیتے تو برتن کو منہ سے ہٹا دیتے تھے۔ رہی یہ بات کہ اس مقام پر تین مرتبہ سانس لینے کا ذکر ہے۔ آگے حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں مرتین کا ذکر ہے یعنی دو سانسوں کا ذکر ہے۔ اس ظاہری تدافع کا جواب یہ ہے کہ یا تو یہ تعدد واقعات پر محمول ہے کہ بعض اوقات میں دو مرتبہ سانس لیا تھا۔ جبکہ اکثر اوقات میں تین مرتبہ لیا ہے۔ اور یا یہ کہ دو مرتبہ سانس لینا ادنی درجہ کے بیان کے لیے تھا۔ کہ کم از کم دو مرتبہ تو سانس لے لو۔ تیسری توجیہ یہ ہے کہ پینے کے دوران درمیان میں دو مرتبہ سانس لیا ہے۔ اور آخر میں جو سانس لیا جاتا ہے وہ شمار ہو تو تین سانس بنتے ہیں۔

چنانچہ بعض لوگوں نے پینے کے بعد کا سانس بھی شمار کیا ہے۔ اور بعض اسے شمار نہیں کرتے۔ صرف دوران شرب سانس شمار کرتے ہیں جو کہ دو بنتے ہیں۔ ویقول ھوأ مرأ واروی فرماتے ہیں کہ اس طرح پینا بہت خوش گوار ہوتا ہے۔ ہضم ہونے، سیر ہونے اور ذائقہ کے لحاظ سے یہ طریقہ اچھا ہے۔ امـــــرأ خوب ہضم ہونے والی چیز کو کہتے ہیں۔ جو لذیذ ہونے کے ساتھ ساتھ معدہ پر بوجھ نہ بنے۔ اور اروی خوب سیر کرنے والی مشروب کو۔ درمیان میں سانس لینے سے پیاس خوب بجھتی ہے۔ نیز ڈاکٹروں نے اس بات پر بھی تحقیق کی ہے کہ ایک سانس میں پانی پینا نظام تنفس کو نقصان پہنچاتا ہے۔ معدہ اور اعصابی نظام میں بھی خلل کا سبب بنتا ہے(۱)۔

(۲) حدّثنا علیّ بن خشرم أنا عیسیٰ بن یونس عن رشدین بن کریب عن أبیه عن ابن عبّاس أنّ النّبیّ ﷺ اذا شرب تنفّس مرتین(۲).

ترجمہ: ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب پانی پیتے تھے۔ تو (درمیان میں) دو دفعہ سانس لیتے تھے۔

اس حدیث میں دو مرتبہ سانس لینے کا ذکر ہے۔ گزشتہ حدیث سے توافق گزر چکا ہے۔

---

(۱) بلکہ اس بارے میں ایک مرفوع حدیث بھی موجود ہے وقد روی البیهقی وغیرہ اذا شرب احدکم فلیمص الماء مصًا ولا یعبه عبا فانه یورث الکباد (کباد جگر کی بیماری کو کہتے ہیں) ۱۳ باجوری ص ۱۰۲ (مختار)

(۲) جامع ترمذی ۲/۱۵۴ کتاب الأشربة باب ماذکر فی الشرب بنفسین، ابن ماجة ۲۴۴ کتاب الأشربة باب الشرب بثلاثة أنفاس (مختار)

(۷) حدثنا إبن أبی عمر ثنا سفیٰن عن یزید بن یزید بن جابر عن عبدالرحمٰن بن أبی عمرة عن جدته کبشة قالت دخل عليّ رسول اللهﷺ فشرب من فی قربة معلقة قائما فقمت إلیٰ فیها فقطعته(۱).

ترجمہ: حضرت کبشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریمﷺ میرے ہاں تشریف لائے تو آپ نے ایک لٹکے ہوئے مشکیزے کے منہ سے کھڑے ہو کر پانی پیا۔ میں اٹھی اور مشکیزے کے منہ کو کاٹ لیا۔(تا کہ محفوظ رہے)

کبشة علامہ مناویؒ کہتے ہیں کہ یہ حضرت ابوقتادہؓ کی بہو کبشہ بنت کعب بن مالک ہیں۔ جن سے بلی کے جھوٹے کی طہارت والی حدیث مروی ہے۔ لیکن اکثر شراح نے یہاں مذکور کبشہ کو کبشہ بنت ثابت بن المنذرؓ پر محمول کیا ہے۔ جو صحابیہ ہیں اور شاعرِ رسول حضرت حسان بن ثابتؓ کی ہمشیرہ ہیں۔ علامہ ابن حجرؒ نے اس کا ایک لقب برصاء بھی ذکر کیا ہے۔ نیز اسے کبیشہ (تصغیر کے ساتھ) بھی کہا جاتا ہے۔

من قربة معلقة پانی سے بھرے مشک کو عام طور پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایک تو اس پر ہوا لگتی ہے جس سے اس کا پانی ٹھنڈا رہتا ہے۔

دوسری یہ کہ چیونٹیوں اور دیگر حشرات سے بھی ایک حد تک محفوظ ہو جاتا ہے بہرحال آپﷺ نے اوپر لٹکے ہوئے مشک سے کھڑے ہو کر پانی پیا۔ چونکہ یہ مجبوری کی حالت تھی یعنی مشکیزہ اتارنا مشکل تھا۔ اس لیے آپﷺ نے کھڑے ہو کر پانی پیا۔ اور ضرورت کے وقت اس طرح کھڑے ہو کر پینے کی اجازت ہے۔ جبکہ یہ احتمال بھی ہے کہ آپﷺ نے بیان جواز کے لیے ایسا کیا ہو۔ کما سبق

فقطعته یعنی مشکیزہ کے منہ کا وہ حصہ جہاں آپﷺ کا مبارک منہ لگا تھا۔ تبرک اور استشفاء کی خاطر کاٹ لیا تا کہ ضائع ہونے سے محفوظ رہے۔ یا پھر ادباً کاٹ لیا ہوگا۔ یعنی چونکہ دوسروں کے منہ لگنے کا

---

(۱) جامع ترمذی ۲/ ۱۵ ۴ کتاب الأشربة باب ماجاء فی الرخصه سنن ابن ماجة ص ۲۴۴ کتاب الأشربة باب الشرب قائماً شرح السنة للبغوی ۱۱/ ۳۷۸ کتاب الأشربة(مختار)

احتمال تھا جس سے سوءادب کا شائبہ(۱) تھا۔لہٰذا کاٹ لیا اوروں کے منہ اس قابل کہاں

ہزار بار بشویم دہن بمشک وگلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بےادبی ست

(۸) حدّثنا محمّد بن بشارثنا عبدالرحمٰن بن مهدی ثنا عزرة بن ثابت الأنصاری عن ثمامة بن عبداللّٰه قال كان أنس بن مالک یتنفس فی الاناء ثلاثا وزعم انس أنّ النبیّ ﷺ كان یتنفس فی الا ناء ثلثا(۲).

ترجمہ: ثمامہ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ برتن سے پانی پیتے ہوئے تین مرتبہ سانس لیتے تھے۔اور کہتے تھے کہ نبی کریم ﷺ برتن سے پانی پیتے ہوئے تین مرتبہ سانس لیتے تھے۔

وزعم انس یہاں زعم قال کے معنی میں ہے جو احادیث میں کئی جگہ مستعمل ہے۔حدیث کے بقیہ حصوں کی تشریح گزشتہ احادیث کی تشریح کی ضمن میں ہو چکی ہے۔

(۹) حدّثنا عبداللّٰه بن عبدالرحمٰن انا أبو عاصم عن ابن جریج عن عبدالكريم عن البراء إبن زید ابن ابنة أنس بن مالک عن أنس بن مالک أنّ النبیّ ﷺ دخل علی امّ سلیم و قربة معلقة فشرب من فم القربة وهو قائم فقامت امّ سلیم إلی رأس القربة فقطعتها(۳).

---

(۱) دوسرا احتمال یہ ہے کہ آپؓ نے تبرک کیلئے اس حصہ کو کاٹ لیا جہاں آنحضرت ﷺ کا دھن مبارک لگا تھا قال البیجوریؒ قوله فقطعته أی لصیانة عن الابتذال بشرب كل احدمنه وللتبرک وللاستشفاء به فقطعها فم الربة للوجهین المذكورین كماقال النووی فی شرح مسلم(المواهب اللدنية ص۱۳۵)

(۲)صحیح بخاری ۸۴۰/۲ كتاب الأشربة باب الشرب بنفسین اوثلاثة، صحیح مسلم ۱۷۴/۲ كتاب الأشربة باب كراهية التنفس فی نفس الاناء الخ، جامع ترمذی ۱۰/۲ كتاب الأشربة باب ماجاء التنفس فی الإناء، ابن ماجة كتابا الشربة(مختار)

(۳)شرح السنة للبغوی ۳۷۹/۱۱ كتاب الأشربة، ابوداؤد طیاسی، رقم حدیث ۱۶۵۰،سنن دارمی ۱۲۰/۲ (مختار)

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریمﷺ (میری والدہ) ام سلیمؓ کے ہاں تشریف لائے۔ وہاں ایک مشکیزہ لٹکا ہوا تھا۔ آپﷺ نے کھڑے کھڑے اس مشکیزے کے منہ سے پانی کونوش فرمایا۔ام سلیمؓ مشکیزے کے منہ کو کاٹنے کیلئے اٹھیں اوراسے کتر کر(محفوظ) رکھ لیا۔

ام سلیمؓ: ام سلیم بنت ملحان بن خالد انصاریہ حضرت انسؓ کی والدہ ہیں۔ان کا نام سہلہ، رمیلہ، رمیثہ یا کچھ اور تھا۔ مالک بن نضر سے جاہلیت میں نکاح کی۔اور حضرت انسؓ کی ولادت ہوئی۔ پھر خاوند کی اجازت کے بغیر ایمان لائیں۔جس کی وجہ سے مالک ناراض ہوکر شام چلا گیا۔اوروہیں اس کی موت واقع ہوگئی۔اس کے بعد جب ابوطلحہؓ نے آپؓ سے نکاح کی خواہش ظاہر کی تو آپؓ نے کہا کہ میں تم سے مہر بھی نہیں لوں گی۔لیکن تجھے نکاح سے پہلے مسلمان ہونا پڑے گا۔وہ راضی ہوگئے تو ان کے اسلام کے بعد ان سے نکاح کرلیا۔وہ ایک باحوصلہ اور نیک خاتون تھی۔ نبی کریمﷺ آپؓ پر بہت مہربان تھے بکثرت ان کے ہاں جایا کرتے تھے۔اور آپؓ بھی کچھ نہ کچھ تیار کر کے ان کا اکرام کرتی تھیں۔کئی غزوات میں شرکت کی۔عموماً غزوات میں آپؓ اپنے ایک خنجر سے مسلح رہتی تھی۔

ابن ابنة انس یہ براء کی دوسری صفت ہے یعنی براءزید کے بیٹے اور حضرت انسؓ کے نواسے تھے۔

مـن فم القربة اس حدیث اور گزشتہ ایک حدیث میں مشکیزے کے منہ سے پانی پینے کا ذکر ہے۔اس پر یہ اشکال ہے کہ احادیث میں مشکیزے کے منہ سے منہ لگا کر پینے کی ممانعت آئی ہے(۱)۔تو آپﷺ نے عملاً مخالفت کیوں کی ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عمل فی نفسہ خلاف اولیٰ ہے۔مطلقاً ممنوع بھی نہیں ہے۔ لہٰذا ہوسکتا ہے کہ آپﷺ نے بیان جواز کے لیے ایسا کیا ہو۔اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں پر مجبوری کی وجہ سے آپﷺ نے یہ عمل کیا ہو۔کیونکہ مشک کو اتارنا مشکل ہوتا ہے۔اور چھوٹا برتن اس وقت موجود نہ ہوگا۔

نیز یہ احتمال ہے کہ نہی دوسروں کے لیے ہو خود نبی کریمﷺ اس سے مستغنی ہوں۔اوراس کی ایک معقول وجہ بھی ہے وہ یہ کہ دوسرے لوگوں کے جھوٹے سے لوگ نفرت کرتے ہیں۔بالخصوص مشک کے منہ پر

---

(۱)نهیٰ النبیﷺ ان یشرب من فی السقاء(بخاری ج ۲ ص ۸۴۱) (مختار)

منہ لگانے سے کبھی تعفن سا پیدا ہو جاتا ہے۔لیکن آپﷺ کی بات اور ہے آپﷺ کے جھوٹے پر تو لوگ مرتے تھے۔طبعی کراہت، اور تقذر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔لوگ آپﷺ کے جھوٹے کو سعادت سمجھتے تھے،محبت سے پیتے تھے،آپﷺ کے خون کو چاٹا گیا ہے،وضوء کا پانی پیا جا چکا ہے، بلکہ آپﷺ کے بول کو بھی پیا گیا ہے(۱)۔تو دوسروں کے جھوٹے کو نبی کریمﷺ کے جھوٹے پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ نیز اس مقام پر نہی کے دوسرے وجوہ سے بھی کوئی وجہ موجود نہیں تھی۔لہٰذا آپﷺ نے مشک سے پانی پیا۔

(۱۰) حدثنا أحمد بن النصر النیسابوری ثنااِسحاق بن محمّد الفروی حدثتنا عبیدة بنت نائل عن عائشة بنت سعد بن أبی وقّاص عن أبیها أنّ النبیّﷺ کان یشرب قائما و قال ابوعیسیٰ وقال بعضهم عبیدة بنت نابل(۲).

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریمﷺ (کبھی کبھی) کھڑے ہو کر پانی پی لیا کرتے تھے۔

سعد بن ابی وقاصؓ: ان کا نام سعد بن مالکؓ بن اصیب یا وھیب الزہری تھا۔ابواسحٰق کنیت تھی۔قدیم الاسلامی صحابی اور عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔اور ان میں وفات پانے والے آخری صحابی تھے۔عرب کے چوٹی کے شہسواروں اور تیر اندازوں میں آپؓ کا شمار ہوتا تھا۔اس لیے آپ کو"فارس الاسلام" بھی کہا جاتا ہے۔عراق کی فتح میں سب سے آگے تھے۔عمرؓ کے زمانہ میں کوفہ کے امیر بھی رہے بلکہ آپؓ ہی دراصل کوفہ کے بانی تھے۔پھر حضرت عثمانؓ کے زمانے میں دوبارہ کوفہ کے امیر مقرر ہوئے۔نبی کریمﷺ نے آپؓ کے مستجاب الدعوات ہونے کے لیے دعا کی تھی۔اس لیے آپؓ کی کوئی دعا رد نہیں ہوتی تھی۔عمر ستر (۷۰) سے تجاوز کر گئی تھی۔اور مشہور قول کے مطابق ۵۶ھ میں وفات پائی۔اگرچہ تاریخ وفات میں دیگر اقوال بھی ہیں۔

---

(۱)اقول شربته برکة الحبشیة خادمة ام المؤمنین امّ حبیبة بنت أبی سفیان کما ذکره ابن حجرؒ فی الاصابة ج۴ ص ۲۴۹ (اصلاح الدین)

(۲)شرح المعانی الاثار ۲/۳۳۲باب الشرب قائماً،المعجم الکبیر للطبرانی ۱/۱۴۷ (مختار)

اسلام میں سب سے پہلا تیر آپؓ کے کمان سے نکلا۔ایسے ہی موقع پر آپؓ کو نبی اکرم ﷺ نے ''فداک ابی و امّی'' کے امتیازی خطاب سے نوازا تھا۔زہری قبیلہ سے ہونے کی وجہ سے نبی کریم ﷺ آپؓ کو ماموں کہا کرتے تھے۔ بلکہ آپ کے ماموں ہونے پر فخر کرتے تھے۔دین کے معاملہ میں متصلب اور سخت گیر صحابہؓ میں شمار ہوتے تھے۔صحابہ کے درمیان مشاجرات میں مکمل طور پر غیر جانبدار رہے۔آپؓ کے مناقب کیلئے مکمل کتاب ہی کافی ہوسکتی ہے۔

کان یشرب قائما یعنی کبھی کبھی ضرورت کی بنا پر یہ بیان جواز کیلئے کھڑے کھڑے پی لیتے تھے۔ عموماً بیٹھ کر پانی پیا کرتے تھے۔لہٰذا ابوداؤد کی روایت ''نھی عن الشرب قائما'' (۱) نیز مسلم شریف کی روایت ''وزجر عن الشرب قائما'' (۲) اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ''لا یشربّن احد منکم قائما فمن نسی فلیستقی'' (۳) اور ترمذی کی روایت کہ ''انّ النبی ﷺ نھی عن الشرب قائما'' (۴) ہی اصل حکم ہے۔اور گویا کھڑے ہوکر پینا صرف اباحت کے درجہ میں بوقت ضرورت ثابت ہے(۵)۔

قال ابو عیسیٰ الخ امام ترمذیؒ عائشہ بنت سعدؓ کی شاگرد عبیدۃ کے والد میں محدثین کا اختلاف بیان کرتے ہیں کہ مشہور تو نائل ہمزہ کے ساتھ ہے۔لیکن بعض محدثین نے اسے نابل باء کے ساتھ بھی بتایا ہے۔

---

(۱)ابوو داؤد کتاب الاشربہ باب فی الشرب قائما. و مسلم ج ۲ ص ۱۷۳ کتاب الاشربة

(۲)مسلم ج۲ ص ۱۷۳ باب فی الشرب قائما

(۳)ایضاً

(۴)جامع ترمذی ۲/ ۱۰ باب فی النھی عن الشرب قائماً

(۵)ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے ای نادراً لبیان الجواز او حمل النھی عنہ علی التنزیۃ اولضرورۃ او مخصوصیۃ (جمع الوسائل ۱/ ۳۰۸) اور کھڑے ہوکر پانی پینے کے مضرات علامہ مناویؒ نے حافظ ابن قیمؒ کے حوالہ سے لکھا ہے وللشرب قائماً آفات منھا انّہ لایحصل بہ الری التام فی المعدۃ حتی یقسمہ الکبد علی الاعضاء ویلاقی المعدۃ فربّما یردحرارتھا ویسرع النفوذ الی اسافل البدن بغیر تدریج فیضرّ ضرراً بیناً (المناوی علی ھامش جمع الوسائل ۱/ ۳۰۷)(مختار)

خلاصۂ باب

اس باب میں پانی پینے کے کچھ آداب کا بیان ہے۔ مثلاً اول یہ کہ عموماً بیٹھ کر پانی پیا جائے۔ البتہ کچھ شرعی یا طبی مصلحتوں یا مجبوریوں کی بناء پر بعض اوقات کھڑے کھڑے پینے میں کوئی حرج نہیں۔ دوم یہ کہ پانی تین سانسوں سے پینا مستحب ہے۔ یا کم از کم دو سانسوں سے پینا چاہیے۔ ایک سانس میں پانی پینا شرعی اور طبی مصالح کے منافی ہے۔ سوم یہ کہ بڑے مشکیزے اور اس جیسے برتنوں کے منہ سے کبھی کبھی مجبوری کے تحت تو پانی پیا جا سکتا ہے۔ لیکن حتی الوسع اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

علاوہ ازیں پینے سے قبل بسم اللہ پڑھنا اور آخر میں الحمد للہ پڑھنا وہ آداب ہیں جو گزشتہ ابواب سے ثابت ہیں۔ بلکہ بعض روایات میں ہر سانس سے قبل بسم اللہ اور اس کے بعد حمد کا ذکر آیا ہے۔

۳۳. باب ما جاء فی تعطّر رسول اللّٰہ ﷺ

حضور اقدس ﷺ کی خوشبو استعمال کرنے کا بیان

تعطّر(۱) عطر سے ہے۔ **تعطّر الرجل** کے معنی ہیں اس آدمی نے خوشبو استعمال کی۔ نبی کریم ﷺ کا بدن مبارک خود بھی معطّر تھا۔ پھر بھی آپ ﷺ خوشبو لگانا بہت پسند کرتے تھے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ **حبّب الیّ من الدنیا النساء والطیب وجعلت قرة عینی فی الصلوة**(۲)

ترجمہ: مجھے دنیا میں عورتوں اور خوشبو سے محبت ہے۔ اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔

مذکورہ تین چیزوں میں خوشبو کا بھی بطور خاص ذکر ہے۔ نبی کریم ﷺ کو خوشبو، صفائی، پاکیزگی، نظافت اور نفاست سے شغف تھا۔ یہی امور فطرت سلیمہ کی ترجمان ہیں۔ اسی لیے اسلام میں مطلوب ہیں۔ اور کئی مواقع پر ان کا حکم دیا گیا ہے۔

حضور اقدس ﷺ کی ذاتی جسمانی خوشبو: خود نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ایسا معطّر جسم بخشا تھا کہ جس راستے پر سے آپ ﷺ گزرتے صحابہؓ سمجھ لیتے تھے کہ آپ ﷺ یہاں سے گزرے ہیں۔ سارے راستے میں ایک مہک اور خوشبو پھیلی ہوتی تھی جو دیگر خوشبوؤں سے ممتاز ہوتی تھی۔ کئی روایات میں نبی کریم ﷺ کے پسینے کی خوشبو کا بھی ذکر ہے۔ شمائل ہی میں حضرت انسؓ کی حدیث گزری ہیں۔ فرماتے ہیں کہ **ولا شممت مسکا و لا عطراً اطیب من عرق رسول اللّٰہ ﷺ**(۳)۔

ترجمہ: میں نے نبی کریم ﷺ کے پسینے سے زیادہ خوشبودار مشک سونگھی ہے نہ عطر۔

---

(۱) **التعطر استعمال العطر کما أنّ التطیب استعمال الطیب**(جمع الوسائل ۲/۲) عطر بکسر العین خوشبو کو کہا جاتا ہے۔ عرب زیادہ خوشبو لگانے والے شخص کو رجل معطر کہا کرتے ہیں (جمع الوسائل ۲/۲) تو گویا باب کا مطلب ہے **باب بیان الاحادیث الواردہ فی تعطر رسول اللّٰہ ﷺ**(المواهب اللدنیه ص۳۷)(مختار)

(۲) نسائی ج۲ ص ۹۴ باب حب النساء (مختار)

(۳) ملا علی قاریؒ نے حضرت انسؓ کی روایت کے الفاظ یوں نقل کیے ہیں **ماشممت ریحاً قط ولامسکاً ولاعنبراً اطیب من ریح رسول اللّٰہ ﷺ**(جمع الوسائل ۲/۲)(مختار)

ان کی والدہ ام سلیمؓ آپﷺ کے پسینہ سوتے میں جمع کرتی تھیں اور اسے دوسرے تیلوں سے ملاتی تھیں۔ اس جیسا خوشبودار تیل کبھی نہیں ملتا تھا۔ نبی کریمﷺ کے استفسار پر آپؓ کہتی تھیں۔

هذا عرقک نجعله فی طیبنا و هو من اطیب الطیب(۱)

بایں ہمہ آپﷺ خوشبو کا التزام بھی فرماتے تھے تاکہ مہک دوبالا ہو جائے۔ نیز امت کو یہ تعلیم بھی دیتے رہے کہ خوشبو کا استعمال سنت ہے۔

(۱) حدّثنا محمّد بن رافع وغیر واحد قالوا انا ابو احمد الزبیری ثنا شیبان عن عبداللّٰہ بن المختار عن موسیٰ بن انس بن مالک عن أبیه قال کان لرسول اللّٰہﷺ سکة یتطیب منها(۲).

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریمﷺ کے پاس ایک سُکّہ تھا جس میں سے آپﷺ خوشبو لگاتے تھے۔

سکّة یتطیبّ منها(۳) سُکّہ ایک خاص قسم کی سیاہ خوشبو ہے یہ ایک ٹھوس مرکب عطر ہے جس میں مشک ملائی جاتی ہے۔ پھر اس کی گولیاں بنا کر دھاگے میں پرو لیا جاتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی خوشبو میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جبکہ بعض شارحین علماء کا خیال ہے کہ سُکّہ دراصل عطردان کو کہتے ہیں یعنی آپﷺ کے پاس عطر کی ایسی شیشی یا ڈبیا جیسی چیز تھی جس میں آپﷺ عطر رکھتے تھے۔ اور مختلف مواقع پر اسے استعمال فرماتے تھے۔ ان شرّاح نے "مِن" کے کلمہ سے استدلال کر کے یہ کہا ہے کہ مِنْ بتدائیہ ہے۔ اگر سُکّہ کوئی خوشبو ہوتی تو پھر یتطیب بها کہنا چاہیے تھا۔ لیکن اول الذکر شارحین کہتے ہیں کہ مِنْ تبعیضیّہ ہے۔ یعنی "یتطیّب ببعضها"

---

(۱) صحیح مسلم ج۲ ص ۲۵۷ باب طیب عرقه صلی الله علیه وسلم والتبرک به (مختار)

(۲) سنن ابی داؤد ۲/۲۲۰ کتاب الترجل باب ماجاء فی استحباب الطیب، شرح السنة للبغوی ۱۲/۸۵ کتاب اللباس باب التطیب (مختار)

(۳) یہ جملہ ترکیب کے اعتبار سے یا تو حال ہے اور یا استیناف بیان کیلئے ہے۔ (مختار)

(۲) حدّثنا محمّد بن بشار ثنا عبدالرحمان بن مهدی ثنا عزرة بن ثابت عن ثمامة بن عبداللّٰه قال کان انس بن مالک لایرُدّ الطیب وقال انس أنّ النبیّ ﷺ کان لا یردّ الطیب(۱).

__خوشبورد نہ کریں:__

ترجمہ: ثمامہؒ کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ خوشبو کو رد نہیں کرتے تھے اور حضرت انسؓ نے یہ بھی فرمایا کہ نبی کریم ﷺ بھی خوشبو کو رد نہیں فرماتے تھے۔

لا یردّ الطیب الخ حضرت انسؓ خوشبو واپس نہیں فرماتے تھے(۲) محبت سے قبول فرماتے تھے کیونکہ حضرت انسؓ کے بقول نبی کریم ﷺ خوشبو کو رد نہیں فرماتے تھے۔ ابوداؤد شریف کی ایک حدیث میں ہے ''**من عرض علیه طیب فلا یرده فانه طیب الریح خفیف المحمل**

(۳) حدثنا قتیبة بن سعید ثنا ابن ابی فدیک عن عبداللّٰه بن مسلم بن جندب عن ابیه عن ابن عمر قال قال رسول اللّٰه ﷺ ثلث لا تردّ الوسائد والدهن والطیب واللبن.

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تین ہدایا لوٹانے کی نہیں۔ تکیہ، تیل اور خوشبو۔

الوسائد والدهن والطیب جن تین چیزوں کا اس مقام پر ذکر ہے ان کو واپس نہیں کرنا چاہیے۔ ان میں سے ایک وسادہ یعنی تکیہ ہے جب کوئی شخص محبت کے طور پر اسے پیش کر دے تو لیکر اس

---

(۱) صحیح بخاری ۱/۳۵۳ کتاب الهبة باب لایرد من الهدیة، جامع ترمذی ۲/۷ ۵۶ کتاب الادب باب ماجاء فی کراهیة ردالطیب، سنن النسائی ۲/۲۹۳ کتاب الزینة باب الطیب (مختار)

(۲) شمائل کے بعض نسخوں میں الوسائد والدهن والطیب کا ذکر ہے۔ اللبن کا نہیں اور بعض نسخوں میں اللبن کا ذکر ہے الطیب کا نہیں۔ اس روایت میں اگرچہ بظاہر چار چیزیں ذکر ہیں تو ہوسکتا دھن اور طیب ایک ہو۔ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے **ولعل المراد بالدهن هو الذی له طیب فعبّر تارة بالطیب واخری بالدهن**(جمع الوسائل ۲/۴) علماء نے ان تین اشیاء کے رد نہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کا ایک قاعدہ نکالا ہے۔ چونکہ یہ چیزیں ھدیۃ دینے والے پر بار نہیں ہوتی اور بسا اوقات واپسی رنج والم کا سبب بنتا ہے۔ اس لئے اس کے حکم میں وہ چیزیں بھی شامل ہیں جو دینے والے پر بار نہ ہوتی ہوں تو گویا حقیر سے حقیر ہدیۃ کو بھی قبول کرنا چاہئے (مختار)

پر ٹیک لگا دو۔ دوسری چیز تیل اور تیسری خوشبو ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عطر، پھول وغیرہ کوئی پیش کردے تو اسے قبول کرنا چاہیے۔ کیونکہ ان چیزوں میں ہدیہ دینے والے پر بوجھ اور مشقت بھی کم ہے۔ مفرح اور آرام دہ ہیں۔ اور قبول کرنے میں مہدی کی خاطر داری بھی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہدیہ دینے والے کی تطییب قلب کی غرض سے ان کو قبول کرنا چاہیے۔ واپس کرنا مناسب نہیں ہے۔

یہ حدیث میں نے بچپن میں سنی تھی حضرت شیخ الحدیث والد محترمؒ کے ساتھ میں لاہور گیا تھا۔ جامعہ اشرفیہ کے بانی حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ کے پاس ہم گئے جو حضرت تھانویؒ کے خلفاء میں سے تھے۔ ان کا ایک پاؤں کٹ چکا تھا۔ بڑے ولی اللہ اور بزرگ شخصیت تھی۔ ان کو بھی حضرت شیخ الحدیثؒ سے محبت تھی۔ کبھی کبھی سالانہ جلسوں میں بلایا کرتے تھے۔ چنانچہ ہم ان کی خدمت میں نیلا گنبد میں اوپر کی منزل میں گئے۔ وہاں بڑے بزرگ لوگ اور صاحبِ حیثیت حضرات ملاقات کو آتے جاتے تھے۔ اس موقع پر انہوں نے حضرت الشیخ کو اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھایا۔ اور محبت کے ساتھ کئی بار تکیہ ان کو پیش فرمایا۔ حضرت الشیخ ادباً اور تواضعاً واپس ان کی طرف رکھ لیتے تھے۔ بالآخر مفتی صاحبؒ نے جلال کے انداز میں فرمایا ”مولوی صاحب وہ حدیث یاد نہیں **ثلث لا ترد الخ**“ اس کے بعد حضرۃ الشیخ نے اسے قبول کرلیا۔ اس حدیث میں تکیہ، تیل اور خوشبو کا ذکر ہے۔ تیل بھی خوشبو کے ضمن میں آجاتا ہے۔ اسی لیے تو احرام میں تیل لگانا جائز نہیں ہے۔ جبکہ بعض نسخوں میں **لبن** ”دودھ“ کا ذکر ہے کہ اسے بھی واپس کرنا جائز نہیں ہے(۱)۔

(۴)حدثنا محمود بن غیلان ثنا ابوداؤد الحفریّ عن سفیان عن الجریری عن ابی نضرة عن رجل عن ابی ھریرة قال قال

---

(۱) چنانچہ مصنفؒ نے اس حدیث کو جامع ترمذی میں لایا ہے۔ وہاں الفاظ یہ ہیں **ثلاث لاترد الوسائد والدھن واللبن**(ترمذی ج ۲ ص ۱۰۲ باب ماجاء فی کراھیة ردالطیب) اور ظاہر ہے کہ وہاں دہن سے مراد تمام خوشبوئیں ہیں۔ علامہ سیوطیؒ نے ایسی سات چیزوں کا ذکر کیا ہے جن کا پیش ہونے کے بعد رد کرنا مناسب نہیں ہے۔ انہوں نے دو شعروں میں ان اشیاء کو جمع کیا ہے اور اسے قبول کرنا سنت کہا ہے۔

عن المصطفی سبع یسن قبولها اذامابهافقد أتحف المرء خلان

فحلوٌ والبانٌ ودهنٌ وِسادةٌ ورزقٌ لمحتاجٍ وطیبٌ وریحانٌ(مختار)

رسول اللّٰہ ﷺ طیب الرجال ما ظهر ریحه و خفی لونه وطیب النساء ما ظهر لونه وخفی ریحه.

حدّثنا علیّ بن حجر ثنا اسماعیل بن ابراهیم عن الجریری عن ابی نضرة عن الطفاویّ عن أبی هریرة عن النبیّ ﷺ مثله بمعناه(۱).

مردانہ اورزنانہ خوشبو میں فرق:

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مردانہ خوشبووہ ہے جس میں خوشبو غالب ہواوررنگ پھیکا ہو۔اورزنانہ خوشبووہ ہے جس میں رنگ غالب اورخوشبوکم ہو۔

عن رجل اس راوی کی تحقیق آگے آرہی ہے۔طیب الرجال اس حدیث میں اس ارشادکاذکر ہے کہ مردوں کے استعمال میں آنے والی خوشبوایسی ہوجس کی خوشبوتیز ہو تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کی بو سے مستفید ہوسکیں۔وجہ یہ ہے کہ مرد کے لیے جمعوں،عیدوں اور دیگر مجامع میں حاضر ہوناپڑتا ہے ۔لہٰذااس کے لیے مہکدارخوشبواستعمال کرنی چاہیے۔جیسے مشک،عنبر،کافوراورعرق گلاب وغیرہ لیکن چونکہ اس کیلئے رنگ دارخوشبواورخوش رنگ اشیاء سے تزین ممنوع ہے۔اس لیے خوشبوکا رنگ مدھم ہوناچاہیے۔

اس کے برعکس عورتوں کی طیب مدھم خوشبووالی ہو۔جس کا رنگ تیز ہوکیونکہ وہ تزیّن کے طور پر طیب(خوشبو) کااستعمال صرف اپنے خاوند کے لیے کرتی ہے۔لہٰذاایسی خوشبواستعمال کرے جوخاوندکی نظر کو بھائے اوراسی تک منحصر رہے۔تیز بووالی خوشبواس لیے استعمال نہ کرے تاکہ باہر نکلتے وقت راستے پر سے گزرنے والے غیرمردوں کومتوجہ کر کے فتنے اورشہوانی وساوس کا سبب نہ بنے۔

البتہ رنگ تیز اوربھڑکیلا ہومثلاً زعفران اورصندل یامہندی توایسی کوئی خرابی لازم نہیں آتی۔کیونکہ باہر نکلے گی تووہ پردے میں نکلے گی۔اورگھر کے اندراس کافائدہ خاوندکوپہنچے گا۔البتہ اگرعورت گھر کے اندر

(۱)سنن ابی داؤد ۱/۳۰۲ کتاب النکاح باب ماجاء یکره من ذکر الرجل الخ، جامع ترمذی ۲/۵۶۷ کتاب الأدب باب ماجاء فی طیب الرجال والنساء، سنن النسائی ۲/۲۸۱ کتاب الزینة باب الفصل بین طیب الرجال وطیب النساء (مختار)

ہی رہے اور صرف اپنے خاوند کی خاطر تیز خوشبودار چیز استعمال کرے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

حدثنا علی بن حجر الخ یہاں سے اوپر کی حدیث کے لیے ایک اور سند ذکر کررہے ہیں۔ اوپر کی سند میں ابو ہریرہؓ سے روایت کرنے والے شخص کو رجل کہا تھا۔ یہاں پر ''طفاوی'' سے تعبیر کررہے ہیں لیکن پھر بھی یہ رجل مجہول ہی ہے۔ نام وغیرہ کچھ معلوم نہیں ہوتا۔

بایں ہمہ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے جس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ یہ آدمی تابعی ہے اور تابعین میں اتنی سی مجہولیت قابل برداشت ہے۔ حدیث کے لیے مضر نہیں ہے۔

(۵) حدّثنا محمّد بن خلیفة و عمر وبن علیّ قال ثنا یزید بن زریع ثنا حجّاج الصوّاف عن حنّان عن أبی عثمان النهدی قال قال رسول اللّٰه ﷺ اذا اعطی احدکم الریحان فلا یردّه فانّه خرج من الجنة (۱)۔

ترجمہ: حضرت ابوعثمانؓ النہدیؒ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کو گل ریحان دیا جائے۔ تو اسے واپس نہ کرے کیونکہ یہ جنت سے نکلا ہے۔

<u>ابو عثمان النهدی:</u> ان کا نام عبدالرحمٰن بن مل ہے۔ کنیت سے مشہور ہیں۔ بنو قضاء کی ایک شاخ نہد کی طرف منسوب ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی حیات ہی میں مسلمان ہو چکے تھے لیکن شرف ملاقات حاصل نہ ہو سکی۔ ۹۵ھ میں وفات پائی۔ ایک سو تیس برس یا اس سے بھی زیادہ عمر پائی تھی۔ لہٰذا یہ حدیث مرسل ہے کیونکہ صحابی محذوف ہیں۔ **اذا اوتی احدکم الریحان الخ** ریحان پودوں کے اس گروپ کا نام ہے جس کے پھول، پتے، ٹہنیاں اور تخم سب خوشبودار ہوں۔ یہاں پر ذکر ریحان کے پھول کا ہے۔ لیکن ہر قسم کا خوشبودار پھول مراد ہو سکتا ہے۔ گلاب، چنبیلی وغیرہ جو بھی پھول کوئی پیش کرے۔ **فلا یردہ** پس اسے نہیں ٹھکرانا چاہیے۔ یہ نہی کا صیغہ ہے کیونکہ ایسی چیز کے ٹھکرانے سے آدمی کا لالچی ہونے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ گویا اپنے عمل سے وہ ہدیہ دینے والے پر یہ واضح کرنا چاہتا ہے۔ کہ یہ بھی کوئی ہدیہ ہے جو تم پیش کررہے ہو۔ کوئی اہم چیز ہو تو قبول کروں۔ صرف پھول پیش کر کے نہ بہلاؤ۔ اس طرح ہدیہ دینے

---

(۱) سنن ابی داؤد کتاب المراسیل باب ماجاء فی الریحان، جامع ترمذی ۲/۵۶۷ کتاب الأدب باب ماجاء فی کراهیة ردّ الطیب، شرح السنة للبغوی ۱۲/۸۷ باب التطیب کتاب اللباس (مختار)

والے کا بھی دل ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ پتہ نہیں اس نے کتنی چاہت کے ساتھ پھول لائے ہونگے ۔اور یہاں پراس کا تحفہ ٹھکرادیا گیا ہے۔

نعمتوں اور خوشبوؤں کا سرچشمہ جنت: فانہ خرج من الجنة یہ دوسری اوراصل وجہ ہے ٹھکرانے کی عدم مناسبت کی ۔یعنی یہ پھول جنت سے نکلا ہے۔منزل مقصود کی نشانی اور دار حبیب کی علامت ہے۔ لہٰذا سرآنکھوں پررکھ کرقبول کرنا چاہیے۔صرف پھول نہیں بلکہ رنگ وبو، طعام ولباس اور مناکحۃ وغیرہ کی دنیا میں جتنی بھی خوبصورت نعمتیں پائی جاتی ہیں۔سب کا سرچشمہ جنت ہی ہے۔یہ نعمتیں جنت میں اضافوں کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی صورت میں موجود ہونگیں (۱)۔

باقی رہی یہ بات کہ یہ جنت سے کیسی نکلی ہے تو اس کی صحیح کیفیت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ ہمارے لیے اس پر ایمان لانا ہی کافی ہے۔

قال ابوعیسی الخ علامہ عبدالرحمان بن ابی حاتم کی مشہور کتاب جس کا نام ''الجرح والتعدیل '' ہے میں لکھا ہے کہ حنان اسدیؒ مسددؒ کے باب کے چچا ہیں۔جو کہ ابوعثمان النہدیؒ کے شاگرد ہیں۔سمعت ابی یقول ذالک ۔یعنی علامہ عبدالرحمٰنؒ کہتے ہیں کہ حنان اسدی کا مذکورہ تعارف میں نے اپنے والد ابوحاتمؒ سے زبانی سنا تھا۔

(۲) حدّثنا عمر بن اسماعیل بن مجالد بن سعید الھمدانّی ثنا ابی عن بیان عن قیس بن أبی حازم عن جریر بن عبداللّٰہ قال عرضت بین یدی عمر بن الخطاب فالقیٰ جریر رداء ہ و مشیٰ فی ازار فقال لہ خذردا ئک فقال عمر للقوم ما رأیت رجلا احسن صورۃ من جریر الاما بلغنا من صورۃ یوسف علیہ السلام(۲)۔

(۱)قال البیجوریؒ وانما خلق اللّٰہ الطیب فی الدنیا لیذکر بہ العباد طیب الجنة و یرغبون فیھا بزیادہ الاعمال الصالحة والحاصل ان طیب الدنیا نموذج من طیب الجنة والا فطیبھایوجدریحہ من مسیرۃ خمس مأۃ عام کما فی الحدیث ۱۲ المواھب اللّدنیة ص ۱۵۸ (اصلاح الدین)

(۲)تفردالامام الترمذی بھذاالحدیث

ترجمہ: حضرت جریر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ کی خدمت میں (معائنہ) کے لیے پیش ہوا۔ جریرؓ نے (اس موقع پر) اپنی چادر اتار دی اور (صرف) لنگوٹی میں چلنے لگے (معائنہ کے بعد) حضرت عمرؓ نے اسے حکم دیا کہ اپنی چادر (پہننے کے لیے) لے لو۔ پھر حضرت عمرؓ نے حاضرین سے فرمایا کہ میں نے جریرؓ سے زیادہ خوبصورت آدمی نہیں دیکھا ہے سوائے حضرت یوسفؑ کی صورت کے۔ جیسا کہ ہم تک (ان کے حسن کی بات) پہنچی ہے۔

جریر بن عبداللہ: جریر بن عبداللہ بن جابرؓ بجیلہ قبیلہ کے مشہور صحابی ہیں۔ بجیلہ ایک عورت کا نام تھا جس کے نام سے یہ قبیلہ منسوب ہے۔ علامہ ابن عبدالبرؒ نے حضرت جریرؓ کی روایت کے مطابق بیان کیا ہے کہ آپؓ نے نبی کریم ﷺ کی وفات سے صرف چالیس دن قبل اسلام قبول کیا تھا لیکن ابن حجرؒ اسے تسلیم کرنے سے کتراتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ صحیحین میں آپؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر مجھے حکم دیا ''استنصیت الناس'' یعنی لوگوں کو خاموش کر دو۔ واقدیؒ کہتے ہیں کہ آپؓ رمضان ۱۰ھ میں اسلام لانے کی غرض سے مدینہ منورہ تشریف لائے تھے۔ بلکہ علامہ ابن حجرؒ نے بعض شواہد کی بنیاد پر دعویٰ کیا ہے کہ آپؓ ۱۰ھ سے بھی پہلے اسلام لائے تھے۔ علامہ ابن عبدالبرؒ کے قول کی توجیہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ آپؓ نے وفات نبوی ﷺ سے چالیس دن قبل اسلام کی تجدید کی ہو۔ آپؓ کے حاضر ہونے کے بعد نبی کریم ﷺ نے آپؓ کی بہت تکریم کی تھی بلکہ فرمایا ''اذا اتاکم کریم قوم فاکرموہ''

آپؓ انتہائی حسین اور لمبے قد کے آدمی تھے۔ کہتے ہیں کہ آپؓ کا قد چھ ذراع یعنی تین گز تھا۔ اونٹ کے کوہان کو کھڑے ہو کر چھو لیتے تھے۔ حضرت عمرؓ انتہائی حسن کی وجہ سے آپؓ کو ''یوسف ھذہ الامۃ'' کہتے تھے۔ جس کا کچھ بیان زیر نظر حدیث میں بھی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے آپؓ کے قدوم سے قبل ہی فرمایا تھا کہ تمہارے پاس ایک ایسا شخص آرہا ہے کہ ''کان علی وجھہ مسحۃ ملکٍ'' گویا فرشتے نے اس کے چہرے پر تحسین کا ہاتھ پھیرا ہے۔ امام ترمذیؒ نے باب ضحک النبی ﷺ میں آپؓ سے روایت کی ہے کہ ''ما حجبنی رسول اللہ ﷺ منذ اسلمت ولا رآنی الا تبسّم''۔

حضرت علیؓ کی خلافت کے زمانے میں ان کی طرف سے امیر معاویہؓ کے ہاں سفارت کاری کا فریضہ بھی انجام دیا۔لیکن بعد میں دونوں سے علیحدگی اختیار کر کے غیر جانبدار رہے۔پہلے کوفہ اور پھر قرقیساء میں مقیم رہے۔اور ۵۱ھ میں وفات پائی۔

حضرت عمرؓ کا فوجی معائنہ، پریڈ: عرضت بين يدى اس باب میں خوشبو کا بیان ہو رہا تھا۔اسی ضمن میں امام ترمذیؒ حضرت جریرؓ کے بارے میں ان ہی کی روایت سے یہ حدیث لائے ہیں۔اس مقام پر عرض کا مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح آج کل بھی انتظامیہ کے افسران یا فوجی جرنیل اپنے فوجی پلٹنوں کا معائنہ کرتے ہیں۔اور گارڈ آف آنر اور معائنہ کا رواج ہے۔کبھی بھرتی ہوتے وقت فوجیوں کا طبی ٹیسٹ کیا جاتا ہے۔صحت، سینہ، بازو، ٹانگیں اور وزن وغیرہ دیکھے جاتے ہیں۔اسی طرح گزشتہ زمانوں میں بھی فوجیوں کو پرکھا جاتا تھا۔

ایسے اکثر امور کی باقاعدہ ابتداء حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ہوئی تھی۔پولیس، فوج اور انتظامیہ کی باقاعدہ تشکیل اور انتظام بھی آپؓ ہی کے زمانہ میں ہوئی۔جس طرح محاصل مالیہ اور زمین کی پیمائش بھی آپؓ ہی کے زمانہ سے رائج ہوئی تھی۔بہرحال فوجی انتخاب کے لیے آپؓ کے زمانہ میں باقاعدہ معائنہ ہونے لگا تھا۔اور اسی غرض سے سپاہیوں کے ضروری ستر سے زائد کپڑے اتروا دیئے جاتے تھے۔اور انہیں ٹہلنے کا حکم دے کر دیکھا جاتا کہ چاک و چوبند ہے یا نہیں۔نیز اس کی صحت کیسی ہے۔پھر اس کے بعد کس بڑی مہم کے لیے فوجیوں کا انتخاب ہوتا تھا۔

تو حضرت جریرؓ اس موقع پر اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ جب میں حضرت عمرؓ کے سامنے معائنہ کے لیے پیش ہوا تو میں نے اپنی چادر اتار دی اور صرف لنگوٹی کے ساتھ میدان میں گزرنے لگا۔

معائنہ ختم ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ''خذ رداء ک'' یعنی اپنی چادر لے کر پہن لو۔

فقال عمر للقوم الخ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے قوم سے تحسین کے انداز میں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جریرؓ کو بہترین صحت وصورت سے نوازا ہے۔میں نے ایسا خوبصورت آدمی نہیں دیکھا تھا۔ہاں حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں ہمیں جو معلومات پہنچی ہیں ان کے اعتبار سے شاید یوسفؑ کا حسن اس سے زائد ہو۔

حضرت عمرؓ نے اس مقام پر اپنے مشاہدہ کی بات کی ہے کہ انہوں نے جتنے بھی مرد دیکھے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام کے شنیدہ حسن کے علاوہ تمام لوگوں کی نسبت حضرت جریرؓ کا حسن زیادہ ہے۔ لیکن اس کلام سے نبی کریم ﷺ کا استثناء خود بخود ہو جاتا ہے کیونکہ وہ تو بالاتفاق اجمل الخلق ہیں۔ اگر چہ بعض خاص صفات مثلاً صباحت میں حضرت یوسفؑ آپ ﷺ سے زیادہ ہوئے تو حضور اقدس ﷺ ملاحت میں بے مثال تھے۔ لیکن یہ جزوی فضیلت ہے۔ ویسے نبی کریم ﷺ کا حسن مُسلّمات میں سے ہے۔

<u>باب سے مناسبت:</u> بظاہر اس حدیث کی باب سے مناسبت معلوم نہیں ہوتی کیونکہ باب تعطر کے بارے میں ہے اور اس مقام پر معائنہ اور حسن صورت کا ذکر ہے۔ حضرت جریرؓ کی صحت کی نمائش اور حسن کا بیان ہے۔ اس لیے شراح مناسبت کی تلاش میں تکلف سے کام لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس حدیث میں حسن صورت کا ذکر ہے جس کا خوشبو سے قریبی تعلق ہے۔ دونوں حسن و پاکیزگی کے باب سے ہیں۔ پھر ظاہری حسن، خوشبو اور تعطر پر بھی دال ہیں۔ کیونکہ بدصورت آدمی عموماً طیب و خوشبو کا بھی لحاظ نہیں رکھتا۔ اور خوبصورت آدمی نظافت اور خوشبو سے بھی محبت رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے مناسبت غالباً یہی ہے کہ طیب صورت کے ساتھ غالباً طیب ریح بھی ہوتا ہے۔ اور اس حدیث میں طیب صورت کا ذکر ہے۔

لیکن ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ یہاں باب کے الفاظ میں کچھ تغیر ہونا چاہیے۔ اور باب کے الفاظ یہ ہوں "**باب ما جاء فی تعطر رسول اللہ ﷺ و حسن صورۃ الاصحاب و عرضھم علی ابن الخطابؓ**" اور یوں مطابقت حاصل ہو جائے گی۔ **و اللہ اعلم الصواب**

خلاصۂ باب

اس باب میں نبی کریم ﷺ کی خوشبو سے محبت اور اس کے استعمال کا ذکر ہے باوجود یہ کہ آپ ﷺ کو خوشبو کے استعمال کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ۔ حاجتِ مشاطہ نیست روئے دل آرام

لیکن پھر بھی امت کی تعلیم اور طبیعتِ سلیمہ کے تقاضے کو اجاگر کرنے کے لیے آپ ﷺ خوشبو کو استعمال بھی کرتے تھے اور کوئی پیش کرتا تو محبت کے ساتھ قبول کرتے تھے۔ نیز قبول کرنے کی ترغیب بھی دیتے تھے۔ البتہ عورتوں کی فتنہ پردازیوں کی پیش بندی کے لیے زنانہ اور مردانہ خوشبوؤں میں فرق کو بھی واضح فرمایا۔

قال تعالیٰ لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ (الآیۃ)

فکیف وودّی ماحییت ونصرتی لآل رسول اللّٰہ زین المحافل

(حسان ابن ثابتؓ فی مدح ام المؤمنین عائشۃ صدیقۃؓ)

زین المحافل

شرح الشمائل للترمذی

افادات

شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ

استاذ الحدیث ومہتمم جامعہ دار العلوم حقانیہ

جلد دوم

ضبط وترتیب

مولانا اصلاح الدین حقانی

نظر ثانی وحاشیہ

مولانا مفتی مختار اللہ حقانی

ناشر: مؤتمر المصنفین جامعہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

نام کتاب : زين المحافل شرح الشمائل للامام الترمذی

افادات : شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ

استاد الحدیث و مہتمم جامعہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

ضبط وترتیب : مولانا اصلاح الدین حقانی

استاد الحدیث جامعہ اسلامیہ لکی مروت

نظر ثانی وحاشیہ : مولانا مفتی مختار اللہ حقانی

مفتی واستاد شعبہ تخصص فی الفقہ والافتاء جامعہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

کمپوزنگ : محمد اکمل، بابر حنیف جامعہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

صفحات : جلد اول:532 جلد دوم:526

طبع اول : اپریل ۲۰۰۷ء

ناشر : مؤتمر المصنفین جامعہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

طابع : المطبعۃ العربیہ، لیک روڈ پرانی انارکلی لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

۳۴. باب کیف کان کلام رسول اللہ ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے اسلوب کلام کے بیان میں

اس باب میں نبی کریم ﷺ کی باتیں کرنے کے بارے میں احادیث لاکر واضح کیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ کا گفتار اور لہجہ کیسا تھا۔ ہر شخص کا اپنا طرز تکلم ہوتا ہے۔ بعض لوگ تیز بولتے ہیں۔ بعض آہستہ آہستہ بولتے ہیں۔ بعض لوگ جملے درمیان میں کاٹ کر بولتے ہیں ایسے لوگوں کا کلام عموماً مبہم اور مغلق ہوتا ہے۔

<u>داعی کے طرز تکلم کے خصوصیات:</u> بہر حال چونکہ بات سمجھانا بولنے پر موقوف ہوتا ہے۔ اور پیغمبر داعی ہوتا ہے۔ تو ہر داعی کے لیے ہر دور میں کلام پر عبور ہونا چاہیے۔ تاکہ اس کا طرز تکلم مؤثر ہو۔ اس کی تعبیر فصاحت و بلاغت سے بھی کر سکتا ہو۔ گویا داعی کو فصیح اللسان ہونا چاہیے(۱)۔ اس لیے کہ دعوت کی عمارت زبان و کلام اور وعظ و تبلیغ پر کھڑی ہے۔ عوام سے تعلق کی بنا پر نبی کریم ﷺ کو بھی اللہ تعالیٰ نے دعوت کے بہترین طرز تکلم اور ادائے مراد کی ساری خوبیاں عطا فرمائی تھیں۔ فصاحت و بلاغت کے درجہ علیا پر آپ ﷺ فائز تھے۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ کے مخاطبین میں سے جاہل سے جاہل اور غبی سے غبی بھی آپ ﷺ کی بات کو آسانی سے سمجھ لیتا تھا۔ اور سیئی الحفظ (کم حافظے والا) آدمی کو آپ ﷺ کی بات یاد ہو جاتی تھی۔ آپ ﷺ کا کلام اتنا واضح ہوتا تھا کہ ہر ان پڑھ آدمی کے دل و دماغ تک پہنچ جاتا تھا۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ کو یہ بھی منظور تھا کہ آپ ﷺ کی ہر بات قیامت تک محفوظ بھی رہے۔ یہ فقط نبی کریم ﷺ کی خصوصیت تھی۔ حفاظت حدیث کے دیگر انتظامات کے ساتھ ساتھ ایک بڑا حصہ اس بات کا بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے کلام کا اسلوب جداگانہ اور فصاحت درجہ کمال پر ہے۔ آپ ﷺ ہمارے زمانے کے مقررین کی طرح چرچر کرنے والے نہیں تھے بلکہ ٹھہر ٹھہر کر بولتے تھے۔

---

(۱) اسی لیے حضرت موسیٰ نے جب ہارونؑ کے لیے نبوت طلب فرمائی۔ تو فصاحت کو بھی اپنی طلب کا مدار بنایا فرمایا "وأخی هارون هوا فصح منی لسانا فارسله معی ردأ یصدقنی انی اخاف ان یکذبون(قصص آیت ۳۴)مرتب.

آپ ﷺ کا کلام سمجھ میں بہت جلد آتا تھا۔اوراسی وجہ سے علم ادب کے علماء نے آپ ﷺ کا کلام ادب اعلیٰ کے لیے منتخب کیا ہے اور متحیر ہیں۔

<u>حضوراقدس ﷺ کے کلام کا ادبی معیار:</u> نثری ادب میں نبی کریم ﷺ کا کلام جتنا مؤثر و دلنشین ہے۔اور جتنا ادبی جواہر پاروں پر مشتمل ہے۔

زمانہ جاہلیت سے لے کر آج تک کسی بھی ادیب کا کلام اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اور عرب کے بعض علماء نے بھی آپ ﷺ کے کلام واحادیث کا اس تناظر میں استقراء اور تتبع کیا۔ اوراس عنوان پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔جن کو دیکھ کر یہ بات خوب عیاں ہوجاتی ہے کہ آپ ﷺ کا طرز کلام اور بات کرنے کا انداز کتنا خوبصورت تھا۔علماء میں بھی وہی علماء کامیاب ہوتے ہیں جو زمانہ کے انداز اور تقاضوں کے مطابق بات کرسکیں۔دلنشین اور مؤثر انداز کلام ہمارے اکابر کا شعار رہا ہے۔شاہ ولی اللہؒ، مولانا نانوتویؒ اور دوسرے اکابر کو دیکھیں۔جن کے فصیحانہ اور ادیبانہ خطبے آج بھی موجود اور مشعل راہ ہیں۔تو گویا یہ باب کیفیۃ کلام رسول اللہ ﷺ یا اسلوب کلام رسول اللہ ﷺ کی وضاحت کرتا ہے۔

(۱) حدثنا حمید بن مسعدة البصری ثنا حمید بن الأسود عن أسامة بن زید عن الزهریّ عن عروة عن عائشةؓ قالت ما کان رسول اللّٰہ ﷺ یسرد سردکم هذا ولکنّه کان یتکلّم بکلام بین فصلٍ یحفظّه من جلس إلیه(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ تمہاری طرح مسلسل جلدی جلدی باتیں نہیں کرتے تھے۔بلکہ آپ ﷺ واضح اور جدا جدا الفاظ بولا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کا کلام ہر سامع کو یاد ہوجاتا تھا۔

---

(۱)سنن ابی داؤد ۲/۳۱۷ کتاب الادب باب الهدی فی الکلام، جامع ترمذی ۲/۲۰۵ کتاب المناقب باب فی صفة رسول اللّٰہ ﷺ، السنن الکبریٰ للنسائی ۶/۱۰۹ کتاب عمل الیوم واللیلة باب سرد الحدیث(مختار)

ماکان رسول اللہ ﷺ یسرد کلامکم ھذا سَرَد یسرد تسلسل کے ساتھ کسی چیز کو ایک دوسرے کے ساتھ ملانے کو کہا جاتا ہے۔اگر بغیر تحقیق وتشریح کے تیزی کے ساتھ حدیث کی قراءت ہوتی ہے۔تو اسے بھی **سرد الحدیث** کہتے ہیں۔جس طرح کہ ہمارے اکابر کے زمانے تک حدیث کے درس کا طرز یہی تھا۔بہر حال جو شخص تیزی سے درمیان میں سانس لئے بغیر تسلسل کے ساتھ بولے۔اس کے بارے میں ہم کہتے ہیں **فلانٌ یسردُ سرداً**۔

نبی کریم ﷺ کے بارے میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ وہ تمہاری طرح تیز تیز باتیں نہیں کرتے تھے(۱)۔لگاتار بغیر وقفے کے نہیں بولتے تھے۔کہ بعض الفاظ سامع بالکل نہ سمجھ پائے۔جس طرح رمضان میں بعض حافظ لوگ تلاوت کرتے ہیں۔ان کی ایک آیت بھی پوری نہیں سمجھی جاسکتی۔**ولکنّہ کان یتکلّم بکلام** الخ یعنی آپ ﷺ واضح اور بیّن کلام کیا کرتے تھے۔جدا جدا اور مفصول کلام کے ساتھ وقفوں میں بولتے تھے۔قرآن کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ **انہ لقول فصل** یعنی یہ کلامِ فصل ہے۔

اسی طرح قرآن کی آیات کو آیات مفصلات کہا گیا ہے۔

یحفظہ من جلس الیہ الیٰ اس مقام پر عند کے معنی میں ہے۔یعنی **من جلس عندہ** اور جلوس سے بھی حقیقی معنی مراد نہیں ہے۔بلکہ مراد یہ ہے کہ جو بھی شخص ان کے کلام کو سنتا۔اگر چہ وہ کافر نا مراد کیوں نہ ہو۔سنتے ہی وہ آپ ﷺ کے کلام کی تہہ تک پہنچ جاتا۔گویا آپ ﷺ کے ہاں کا متعلم جیسے بھی ہوتا ذہین یا متوسط یا غبی ہر کسی کو آپ ﷺ کی بات یاد ہو جاتی تھی۔جو شخص آرام سے بولتا ہے اس کی بات مخاطبین کو یاد ہو جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ احادیث تمام کی تمام محفوظ ہو چکی ہیں۔

(۲) حدّثنا محمّد بن یحییٰ ثنا أبو قتیبة سلم بن قتیبة عن عبداللّٰہ ابن المثنّٰی عن ثمامة عن أنس بن مالک قال کان رسول اللّٰہ ﷺ یعید الکلمة ثلاثاً لتعقل عنہ(۲)۔

---

(۱) صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث ہے۔فرماتی ہیں **کان یحدث حدیثا لو عدا لعاد لاحصاہ**.(مختار)

(۲) **صحیح بخاری ۱/۲۰ کتاب العلم باب من اعادالحدیث ثلاثاً الخ، جامع ترمذی ۲/۱۰۱ کتاب الاستیذان باب ماجاء فی کراھیة ان یقول علیک السلام، المستدرک للحاکم ۴/۲۷۳ (مختار)**

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ (اہم) بات کو تین مرتبہ دہراتے تھے۔تا کہ بات ذہن نشین ہو سکے۔

<u>داعی کے کلام میں تکرار کی اہمیت:</u> **یعید الکلمة ثلثا** یہ عموماً خطبوں اور وعظ وتقریر کے دوران ہوتا تھا۔آپ ﷺ بات کوئی بار اس لیے دہراتے تھے تا کہ سب لوگ اسے سمجھ لیں۔اور اس میں غور وتدبر کریں(۱) گاہے گاہے مضمون ایسا ہوتا ہے کہ اس کا دماغ میں اہتمام کے ساتھ بٹھانا مقصود ہوتا ہے۔مثلاً ایک بار کبائر کا ذکر کرتے ہوئے آپ ﷺ نے جب **شهادة الزور** (جھوٹی گواہی) کا ذکر کیا۔تو اس کی اہمیت کی بناء پر بار بار فرمایا **وشهادة الزور، وشهادة الزور.** راوی کہتے ہیں کہ حتیٰ کہ ہم آپ ﷺ کے خاموش ہونے کی تمنا کرنے لگے۔تو حسب ضرورت آپ ﷺ کبھی دوبار اور کبھی تین مرتبہ جملے کا تکرار فرما لیتے تھے۔اس لیے کہ ہادی، مبلغ اور داعی کا مقام شفیق باپ جیسے ہوتا ہے۔جو اپنی اولاد کی خیر خواہی کے لیے تکرار واصرار تو کیا اس سے بھی آگے چلا جاتا ہے۔اس کے برعکس قانون کی زبان اور طرح کی ہوتی ہے۔ وہ تو مجمل سے مجمل الفاظ ذکر کرتا ہے۔اور وہ بھی صرف ایک بار اس کے بعد جبر وتشدد کا نمبر آتا ہے۔لیکن جو سمجھانا چاہتا ہے۔وہ تکرار سے تھکتا نہیں۔بار بار سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔اسی تکرار کی تعبیر قرآن میں یوں ہوتی ہے کہ **وصرّفنا الآيات لعلهم يرجعون**(احقاب ۲۷) ترجمہ: اور ہم نے بار بار نشانیاں بیان کردیں تا کہ وہ رجوع کریں۔

کذالک نصرف الآیات لقوم یشکرون. (اعراف ۵۷)

ترجمہ: اسی طرح ہم طرح طرح کی نشانیاں بار بار بیان کرتے ہیں۔ان لوگوں کے لیے جو شکر ادا کرتے ہیں۔

<u>تصریف آیات کی حکمتیں:</u> **تصريف الآيات** قرآن کے موضوعات میں سے ایک مستقل موضوع ہے۔اور بکثرت ایسے امور ہیں۔جنہیں اسی حکمت کے تحت بار بار دہرایا گیا ہے۔مثلاً حضرت آدمؑ کا قصہ بار بار مختلف پیرایوں میں ذکر کیا جاتا ہے۔موسیٰؑ اور فرعون کا قصہ متعدد مقامات میں مذکور ہے۔

---

(۱) قال البیجوریؒ وحکمته انّ الاولیٰ للاستماع والثانیة للوعی وقیل للتنبیه والثالثة للتفکر وقیل للامر(المواهب اللدنیة ص ۱۶۱)(مختار)

تکرار کی اہمیت: ظاہر بین لوگ تو اس تکرار پر اعتراض کریں گے کہ یہ شنیع ہے۔لیکن اس کا جواب وہی ہے کہ تکرار اصول وقوانین کی ترتیب میں شنیع ہو۔تو ہو لیکن مبلغ کے لیے اس میں کوئی عیب نہیں۔وہ تو چاہتا ہے کہ مخاطب میں انقلاب آئے۔اور بات اس کے دماغ میں بیٹھ جائے۔تو وہ اگر سو بار بھی مناسب سمجھے اپنی بات دہراتا رہے گا۔اس سلسلے میں قرآن کا بھی دوسرے کتب سے موازنہ کرنا غلط ہوگا۔کیونکہ یہاں تو دعوت وہدایت مقصود ہے۔اس لیے تکرار کی یہاں گنجائش بلکہ ضرورت ہے۔اور اسی لئے نبی کریم ﷺ بھی تکرار کیا کرتے تھے۔حضرت تھانویؒ نے بعض مواعظ میں ایک مثال کے ذریعے یہ بات واضح فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک بار ایک بوڑھے شخص کا ایک جوان بیٹا تھا اور حسب عادت بڑھاپے کی حالت میں جوان بیٹے والدین سے نالاں رہتے ہیں۔بے حوصلہ ہو جاتے ہیں۔بات بات پر ان کو دھتکارتے رہتے ہیں۔ ایک دن ایک کوّا کہیں بیٹھا تھا۔باپ نے بیٹے سے پوچھا کہ بیٹا یہ کیا ہے؟ بیٹا بولا کوّا ہے۔اس نے پھر پوچھا تو بیٹے نے ذرا زور سے جواب دیا کہ کوّا ہے۔تیسری بار پھر پوچھا تو اس نے کہا کہ بات سمجھتے نہیں بس شور مچا رکھا ہے کیا ہے؟ کیا ہے؟ بیسیوں مرتبہ تو کہہ چکا ہوں کہ کوّا ہے۔پھر جب اگلی مرتبہ اس نے پوچھا تو خوب ڈانٹا۔باپ نے یہ سنا تو بیٹے کو ایک چابی دیدی اور کہا کہ جاؤ وہاں ایک صندوق میں ایک تختی پڑی ہے وہ لے آؤ۔بیٹا تختی لے آیا۔اس پر ایک سو لکیریں تھیں۔باپ نے کہا کہ بیٹا جب تم چھوٹے تھے تو ایک دن میرے ساتھ بیٹھے تھے ایک کوّا آکر سامنے بیٹھا تو تم نے پوچھا یہ کیا ہے میں نے کہا کوّا ہے تم نے پھر پوچھا میں نے پھر بتایا۔اس طرح تم نے سو مرتبہ پوچھا اور میں اسی طرح محبت سے جواب دیتا رہا ساتھ ساتھ ہر جواب کے ساتھ اس تختی پر ایک لکیر بھی کھینچتا رہا۔لیکن آج میں نے تم سے صرف تین بار پوچھا تو چوتھی مرتبہ تم مارنے پر تل گئے۔

بہر حال جب والدین کی شفقت اتنی ہے کہ ایک سو مرتبہ سمجھانے سے نہیں تھکتے۔تو اللہ تعالیٰ کی محبت تو مخلوق کے ساتھ کروڑوں درجہ بڑھ کر ہے۔اسی طرح رسول ﷺ کی شفقت بھی بے مثال ہے۔وہ بھی تو داعی تھے۔اور داعی اپنی دعوت میں بہت حریص ہوتا ہے۔

حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کا جذبہ دعوت: حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے بارے میں آیا ہے کہ ایک

مرتبہ دہلی میں ایک عظیم اجتماع سے خطاب فرمایا۔تقریر ختم ہوئی تو ایک آدمی انہیں ملا۔اس نے بتایا کہ وہ میلوں دور سے صرف آپؒ کی تقریر سننے کے لیے پیدل آیا تھا۔لیکن یہاں پہنچا تو آپؒ کی تقریر ختم ہو چکی تھی۔اس لئے بہت دکھ ہوا۔شاہ صاحب سمجھ گئے کہ دور سے آئے ہیں اور سچے طالب ہیں۔لہٰذا آپؒ نے فرمایا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔میرے ساتھ آؤ۔چنانچہ جب سب لوگ چلے گئے۔تو آپؒ دوبارہ منبر پر بیٹھ گئے اور وہ ساری تقریر جو ابھی کی تھی اسی ایک آدمی کے سامنے اسی لہجے اسی تفصیل اور اسی محبت کے ساتھ دہرائی۔دعوت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی جو مثال ان بزرگوں نے قائم کی تھی۔اس کی نظیر آج کے مقرروں میں کب ملتی ہے۔

یہ مسئلہ ایک ولولہ اور تڑپ کا متقاضی ہے۔دین اور دعوتِ دین کے ساتھ عشق ہو، مشن سے لگاؤ اور جذبہ ہو، تب یہ بات ممکن ہے تو دعوت کی غرض سے نبی کریمﷺ کا بھی یہی انداز تھا کہ کلمہ کو تین بار دہراتے۔

(۳) حدّثنا سفیان بن وکیع أنبانا جمیع بن عمرو بن عبدالرحمٰن العجلی ثنی رجل من بنی تمیم من ولد ابی هالة زوج خدیجة یکنٰی أبا عبداللّٰه عن إبن لأبی هالة عن الحسن بن علی قال سالت خالی هند ابن أبی هالة وکان وصّافاً قلت صف لی منطق رسول اللّٰهﷺ قال کان رسول اللّٰهﷺ متواصل الاحزان دائم الفکرة لیست له راحة طویل السکت لا یتکلّم فی غیر حاجة یفتتح الکلام و یختمه با شداقه و یتکلّم بجوامع الکلم کلامه فصل لا فضول و لا تقصیر لیس بالجافی ولا المهین یعظّم النعمة ان دقّت لا یذمّ منها شیئا غیر أنّه لم یکن یذمّ ذواقاو لا یمدحه ولا تغضبه الدنیا ولا ما کان لها فاذا تعدیٰ الحق لم یقم لغضبه شئی حتی ینتصرله لا یغضب لنفسه ولا ینتصر لها اذا اشار اشار بکفه کلها واذا تعجب قلّبها واذا تحدّث اتّصل بها وضرب براحته الیمنیٰ بطن ابهامه الیسری وإذا غضب اعرض

واشاح وإذا فرح غض طرفه جلّ ضحكه التبّسم يفتّرسن مثل حب الغمام(۱)۔

ترجمہ: حضرت حسن بن علیؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہؓ سے جو نبی کریم ﷺ کے اوصاف کثرت سے بیان کرنے والے تھے۔عرض کیا کہ مجھے نبی کریم ﷺ کی گفتگو کے انداز کے بارے میں بتایئے۔ انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ (امور آخرت کیلئے) بکثرت غم میں مبتلا رہنے والے تھے۔اور ہمیشہ امت کے لیے فکرمند رہتے تھے۔(دنیوی نعمتوں سے) آپ ﷺ کو راحت نہیں ملتی تھی۔ طویل خاموش رہنے والے تھے بلاضرورت بات نہیں کرتے تھے۔ بھرے منہ سے بات شروع اور بھرے منہ سے ختم کرتے تھے۔متکبرین کی طرح ہونٹوں کے نوک پر نہیں بولتے تھے۔یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کے نام سے بات شروع اور اسی پر ختم کرتے تھے۔ کمافی نسخۃ۔(زیادہ معانی پر مشتمل) جامع الفاظ بولتے تھے۔آپ ﷺ کے بولے ہوئے الفاظ اور جملے ایک دوسرے سے ممتاز اور الگ الگ ہوتے تھے۔باتوں میں (بے مقصد) زائد الفاظ ہوتے نہ الفاظ مقصد سے کم تر ہوتے تھے۔ درشت وسخت مزاج نہیں تھے۔نہ کسی کی تذلیل فرماتے تھے کسی بھی نعمت کو اگرچہ وہ تھوڑی ہو بہت بڑی نعمت سمجھتے تھے۔اس کی مذمت نہیں کرتے تھے (بلکہ مدح کرتے تھے) البتہ کھانے کی چیزوں کی مذمت کرتے نہ (زیادہ) تعریف۔ دنیا اور نہ دنیاوی اشیاء آپ ﷺ کو غصہ دلاتی تھیں۔مگر جب حق سے تجاوز کیا جاتا تو اس وقت آپ ﷺ کے غصہ کے سامنے کوئی چیز نہیں ٹکتی تھی۔ جب تک آپ ﷺ اس کا انتقام نہ لیتے تھے۔ اپنی ذات کے لیے نہ غصہ فرماتے تھے نہ اپنی ذات کے لیے انتقام لیتے تھے۔جب اشارہ فرماتے تو پورے ہاتھ سے اشارہ فرماتے تھے۔جب تعجب کا اظہار فرماتے تو

(۱)سبق تخریجه رقم حدیث ۷

ہاتھ پلٹ لیتے تھے۔جب بات کرتے تو (کبھی بات کے ساتھ) ہاتھ کو ہلایا کرتے تھے اور داہنی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے اندرونی حصہ سے لگا لیتے تھے۔جب (کسی سے) ناراض ہوتے تو (حیا اور کرامت نفس کے وجہ سے) اعراض فرماتے تھے۔ اور اس میں مبالغہ کرتے تھے۔ جب خوش ہوجاتے تھے تو آنکھیں (گویاً تواضعاً) بند فرماتے تھے۔آپ ﷺ کی زیادہ تر ہنسی تبسم ہوتی تھی۔(اس وقت) دانت مبارک اولوں کی طرح (سفید آبگین) دکھائی دیتے تھے۔

عن ابن لابی هالة یہاں ابن سے ابن الابن مراد ہے جیسا کہ باب اول کی ساتویں حدیث کی سند کی تشریح میں ذکر کرچکے ہیں۔ان کا نام ہند تھا۔سند کی مزید تشریح پہلے بیان کی جاچکی ہے۔

قلت صف لی منطق الخ یعنی نبی کریم ﷺ کے طرز تکلم کے بارے میں مجھے بتائیں کہ کس موقع پر وہ بولتے تھے اور کیسے بولتے تھے۔کس موقع پر خاموش رہتے تھے۔اور خاموشی کی کیفیت کیا تھی۔

<u>نبی کریم ﷺ اور احساس ذمہ داری:</u> **دائم الاحزان** الخ یعنی اول تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ نبی کریم ﷺ بے فکر آدمی اور غیر ذمہ دار نہ تھے۔جو شخص زیادہ بے فکر ہو۔اسے اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کا احساس نہیں ہوتا۔وہ ہر وقت ہنستا رہتا ہے، تالیاں بجاتا ہے گپ شپ لگاتا ہے۔بڑے لوگ ایسی باتوں کے لیے فارغ نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کی بات بھی حساب سے، اٹھنا بیٹھنا اور ملاقات کرنا سب کام ایک ٹائم ٹیبل کے تحت ہوتے ہیں۔پھر پیغمبر کا ہر قول ایک قانون بنتا جاتا ہے۔اور ہر قول ہدایت اور تبلیغ کا ذریعہ ہوتا ہے۔تو ایسی باتیں جن میں دین و دنیا کا کوئی فائدہ نہ ہو۔ان سے صادر نہیں ہوتی۔وہ فکر مند رہتے ہیں ان کو اپنے مشن اور اپنی امت کا غم ہوتا ہے۔خصوصاً نبی کریم ﷺ کے ساتھ امت کی فکر حد سے زیادہ تھی۔رات کے وقت روتے رہتے تھے۔حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر تنبیہ فرمادی۔**لعلک باخع نفسک علی آثارھم ان لم یؤمنوا بھذا الحدیث اسفا** (**کھف ٦**) یعنی تجھے ان کی اتنی فکر ہے کہ شاید خود کو ہلاک کردو گے۔ اور گھٹ کر مرجاؤ گے۔

بہر حال آپ ﷺ کی فکر مندی کا سبب اپنی ذمہ داری کا احساس اور امت کا غم تھا۔علامہ ابن قیمؒ

اورابن تیمیہؒ نے اسی تشریح کوترجیح دی ہے۔اورظاہرغمزدگی سے انکار کرتے ہوئے متعدد وجوہ اظہارغم کورد کیاہے۔حتیٰ کہ حدیث پربھی جرح کی ہے۔کیونکہ نبی کریم ﷺ کواللہ تعالیٰ نے دنیوی اوراخروی غموں سے محفوظ رکھاتھا۔ساتھ ساتھ روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ ہنس مکھ اورخوش وخرم دکھائی دیتے تھے۔ جیسا کہ اگلے باب میں بھی آرہاہے۔جبکہ دیگر شراح نے تو اصل احزان کوحقیقت پرمحمول کیا ہے۔اور حدیث کی توجیہ یوں کی ہے کہ آپ ﷺ دل ہی دل میں ہمیشہ غمزدہ رہتے تھے۔اس لیے کہ ذات وصفات الٰہی کامشاہدہ جتنا بھی بڑھتا جاتا ہے۔اتنا ہی استغراق بلکہ خوف میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔چنانچہ آپ ﷺ بھی مسلسل ایک گونہ غم اورخوف کی کیفیت میں غرق رہتے تھے۔اگرچہ یہ غم اورفکر چہرۂ اقدس پرکم ظاہرہوتا تھا۔کیونکہ روایات میں آپ ﷺ کی طلاقتِ وجہ اور کشادہ روئی کاواضح بیان موجود ہے۔

لیست له راحة یہ گزشتہ صفات کاایک لازمی نتیجہ بیان کرتے ہیں۔کیونکہ فکرمندی اوراشتغال قلب،راحت وفرحت کے ساتھ جمع نہیں ہوتے۔یعنی آپ ﷺ ان لوگوں کی طرح نہ تھے جن کودنیاوی آسائشوں مثلاً باغ،بنگلہ،موٹر،ہوٹل،سینمااورتفریح گاہ میں خوشی اورراحت محسوس ہوتی ہے۔البتہ آخرت کے کاموں سے آپ ﷺ کومسرت ضرورہوتی تھی۔توگویامعنی یہ ہواکہ **لیست له راحة من امور الدنیا** یعنی دنیاوی آسائشیں آپ ﷺ کی راحت کاباعث نہیں تھی عبادات سے سرورملتاتھا۔فرماتے ہیں کہ ''**جعلت قرّة عینی فی الصلوٰة**(۱) '' میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔نیزفرمایا''**اقم الصلوٰة یا بلال ارحنا بها**(۲) 'اے بلال نماز کے لیے بلاؤ۔اورنماز سے ہمیں راحت دلواؤ۔

<u>بزرگان دین کاانہماک فی الدین:</u> آج بھی بعض بزرگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ امریکہ،ہالینڈ کے عیاشیوں سے بھرے بازاروں میں پھرتے ہیں۔اوران کواس بات کی پرواہ تک نہیں ہوتی کہ یہ بازار ہیں۔عورتیں ہیں مناظر ہیں اورسیرسپاٹوں کامقام ہے۔وہ اپنے بسترے کوکندھے پررکھے اپنی دنیامیں مستغرق ہوتے ہیں۔دنیاکے امور سے انہیں کوئی راحت کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔وہ چاہتے ہیں کہ اپنامشن

---

(۱)نسائی ج۲ ص ۹۲ باب حب النساء(مختار)

(۲)مشکوٰۃ ص۱۱۹ کتاب الصلواة باب القصد فی العمل (مختار)

کسی کے پاس پہنچا دیں۔ جس طرح کسی طالبعلم کو امتحانات تدریس اور تبلیغ دین وغیرہ کی ذمہ داریوں کا احساس، زیب وزینت اور ٹھاٹ بھاٹ سے دور رکھتا ہے۔ جلسے جلوسوں اور احتجاج اور ایجی ٹیشنوں سے کتراتا ہے۔ کتابوں میں محو اور علمی مشاغل میں مگن رہتا ہے اور فضول مشغلوں میں تسکین محسوس نہیں کرتا۔ قرآن میں بھی آتا ہے کہ **ان اللّٰہ لا یحبّ الفرحین** یعنی دنیا سے تلذذ حاصل کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نا پسند کرتا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ نبی کریم ﷺ ہر وقت ترش رو رہتے تھے۔ بلکہ آپ ﷺ ملاقات اور باتوں کے دوران نہایت کشادہ رو نظر آتے تھے۔ لیکن وہ کیفیت بھی نہیں تھی جو دنیا داروں اور فرحین کا خاصہ ہے(۱)۔ آپ ﷺ ایسی بے لگام خوشی کو ناپسند فرماتے تھے۔

فلیضحکوا قلیلا ولیبکوا کثیراً ان کو ہنسا کم اور رونا زیادہ چاہیے۔

طویل السکت ماقبل سے ضمناً آپ ﷺ کی خاموشی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ فکرمندی میں سکوت لازمی ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی صراحۃ اسے ذکر کر دیا۔ اس لیے کہ اصل مقصد اسی بات کا بیان ہے کہ عموماً آپ ﷺ خاموش رہتے تھے۔ اور سکوت غالب تھی بلکہ آپ ﷺ خاموشی کی بہت تاکید کے ساتھ تلقین کیا کرتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ **من کان یؤمن باللّٰہ والیوم الآخر فلیقل خیراً اولیسکت** (متفق علیہ) نیز ارشاد ہے "**من صمت نجا**" (ترمذی) جو خاموش رہا وہ چھوٹ گیا۔

بہرحال آپ ﷺ کی طویل خاموشی سے یہ استبعاد بھی دور ہو جاتا ہے کہ اتنے سارے احادیث عام لوگوں کو کیسے یاد ہوئے۔ وہ یوں کہ جب کوئی شخص اکثر خاموش رہتا ہے۔ کبھی کبھی بولتا ہے۔ تو بولتے ہوئے اس کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ سامعین کو بات اہم لگتی ہے اور اس طرح اس کی باتیں دلوں میں بیٹھتی جاتی ہیں۔

---

(۱) بعض شراح نے **لیست لہ راحۃ** کی تفصیل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ ﷺ پر کوئی وقت بغیر اطاعت الٰہی کے نہ گزرتا تھا۔ اور آپ ﷺ ہمیشہ عبادت میں مشغول ہوتے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اصلاح امت اور حق کی علمبرداری کی ذمہ داریاں اور دین کی سربلندی کے لیے تگ ودو بھی کرنی تھی۔ تو گویا آپ ﷺ ظاہری اور باطنی طور پر مصروف رہتے تھے۔ فراغت اور آرام وراحت کا موقعہ ہی نہیں تھا۔ (اتحافات ص ۲۷۴) (اصلاح الدین)

یختمه باشداقه بعض نسخوں میں **یختمه باسم اللّٰه** مذکور ہے۔اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرنے سے کلام میں برکت اور تاثیر میں اضافہ مقصود ہوتا ہے۔لیکن یہاں بالخصوص بسم اللہ کی جگہ ذکر اللہ سے ابتداء مراد ہونا چاہیے۔جبکہ موجودہ نسخوں میں **باشداقه** کا ذکر ہے۔**اشداق شدق** کی جمع ہے۔

شدق باچھ کو کہتے ہیں مگر **اشداق** جمع سے مراد یہاں پر تثنیہ یعنی **شدقین** لی گئی ہے۔اور مراد یہ ہوگی کہ آپ ﷺ بھرے باچھوں سے بات شروع اور ختم فرماتے تھے۔

بعض اوقات مقرر یا مدرس ابتداء کلام آہستہ اور مدہم لہجے میں کرتا ہے۔حتیٰ کہ پانچ چھ منٹ تک اس کی بات سمجھ ہی نہیں جاتی۔اور بعض لوگ آخر میں بات کو کمزور اور سست لہجے میں کرتے ہیں۔کہ سمجھنا دوبھر ہو جاتا ہے۔یا پھر درمیان میں انداز بیان کو بدل کر بلاضرورت محض تنوع پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اکثر مضر ہوتا ہے اور کبھی کبھی محض تکبر اور رعونت کی وجہ سے باتیں کرنے والا منہ کھولنے کی تکلیف نہیں کرتا۔اور بہت دھیمے انداز سے بولتا ہے۔یہ بھی سامع پر بوجھ بنتا ہے۔آپ ﷺ کی بات ایسی نہیں تھی۔ بلکہ آپ ﷺ کے کلام کی خوبی یہ تھی کہ ٹھہر ٹھہر کر اول سے لیکر آخر تک بات کرتے تھے۔جس کی وجہ سے کلام میں ابہام نہیں رہتا تھا۔اور یہی فصاحت کا تقاضا ہے۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایسا کرنے میں آپ ﷺ مبالغہ سے کام لیتے تھے۔اور بتکلف جوش پیدا کرتے تھے۔جسے تشدق کہتے ہیں۔اور جو بعض مقررین کا انداز ہوتا ہے۔حدیث میں اس سے نہی اور کراہت مذکور ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کا کلام طبعی فصاحت و بلاغت کا حامل ہوتا تھا۔

بجوامع الکلم یعنی آپ ﷺ ایسے کلمات اور جملوں کا اپنے کلام میں استعمال فرماتے تھے۔جن میں نہایت درجہ کی جامعیت اور کثرت معانی ہوتا تھا۔آپ ﷺ کے جوامع الکلم کے کئی مجموعے محدثین حضرات نے جمع فرمائے ہیں۔اس سلسلے میں متعدد تالیفات بھی موجود ہیں۔ایک چھوٹا سا جملہ اتنے دقائق اور باریک نکتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔کہ درجنوں احکام و معانی اور مسائل و حکم اس سے مستنبط ہو سکتے ہیں۔

بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ جوامع الکلم سے قرآن مجید مراد ہے۔جس طرح کہ دوسری جگہ **اوتیت جوامع الکلم** کی ایک توجیہ یہی ہے کہ قرآن مجید مراد ہے۔لیکن ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ

والا ظھر انّ المراد بھا اعم فان المدح بھا اتم یعنی ظاہر یہ ہوتا ہے کہ قرآن کی طرح احادیث بھی جوامع الکلم کا مصداق ہیں۔کیونکہ نبی کریم ﷺ کی مدح احادیث کی جامعیت میں زیادہ ہے۔قرآن مجید تو کلام اللہ ہے۔اس کی جامعیت اور حسن میں تو کلام نہیں ہے۔

لا فضول ولا تقصیر نہ آپ ﷺ کے کلام میں حشو وطویل ہوتا تھا کہ دل اچٹ جائے۔اور ملال کا سبب بن جائے۔اور نہ اتنا ایجاز واختصار ہوتا جو مقصد میں مخل ہو۔اور اظہار مدعا سے قاصر رہے۔ اس جملے کے اعراب میں پانچ احتمالات ہیں۔جیسا کہ لاحول ولاقوۃ میں بیان کیا جاتا ہے۔

لیس بالجا فی جفاء سے اسم فاعل ہے جو براور وفاء کی ضد ہے۔تو معنی یہ ہوگا کہ آپ ﷺ سنگ دل اور بدسلوکی کرنے والے نہ تھے۔بلکہ آپ ﷺ کا حسن سلوک اور نرم دلی اقرباء اور مؤمنین تک بھی محدود نہ تھی۔آپ ﷺ کی رعاتیوں اور حسن سلوک نے تو دشمن کفار کے دل جیت لیے تھے۔ اور یہی داعی کا بڑا وصف ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فبما رحمۃ من اللّٰہ لنت لھم ولو کنت فظّا غلیظ القلب لا نفضّوا من حولک (آل عمران ۱۵۹)

اوراس قسم کی دوسری صفتیں اگرچہ کلام کی صفتیں نہیں ہیں لیکن اخلاق سے تعلق کی بنا پر یہ کلام پر ضرور اثر انداز ہوتی ہیں۔کیونکہ جو آدمی ان اخلاق کا حامل ہوتا ہے اس کے کلام میں درشتی اور خشکی وخشونت نہیں ہوگی۔آپ ﷺ خشک مزاج نہیں تھے۔اس لیے کلام میں بھی درشتی نہیں تھی۔ولا بالمھین الخ میم مضموم ہوتو مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ تحقیر واہانت کرنے والے نہ تھے۔اپنے ہم مجلسوں کے،گویا باتوں میں بھی ایسے الفاظ سے گریز کرتے جن سے کسی کی اہانت ہوتی ہو۔اوراگر میم مفتوح ہوتو پھر معنی یہ ہوگا کہ آپ ﷺ ہلکی اور بے وقار شخصیت کے مالک نہ تھے۔بلکہ آپ ﷺ کی طبیعت میں وقار اور حزم واحتیاط ہوتا تھا۔حقیر نہ تھے۔بلکہ عظمت نفس سے متصف تھے۔اس صورت میں لیس بالجافی کے بعد یہ اضافہ بہت مناسب لگتا ہے۔کیونکہ کبھی یہ تو ہم ہوجاتا ہے کہ جب آپ ﷺ جافی نہ تھے تو معاذ اللہ وقار سے بھی خالی ہونگے۔

یعظّم النعمۃ الخ معمولی نعمت کی بھی بڑائی بیان کرتے تھے۔مثلاً اگر معمولی کھانا ملتا تو اس کی صفت بیان فرماتے اوراس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا فرماتے تاکہ یہ ظاہر ہو کہ یہ نعمت جو مجھے ملی ہے بعض دوسرے لوگوں کو نہیں ملتی۔کسی نعمت کی تحقیر نہیں فرماتے تھے۔ہماری حالت اس کے برعکس ہے۔ہمیں تو اللہ

تعالیٰ نے بڑی نعمتوں سے نوازا ہے۔پھر بھی اپنے سے اونچے معیار زندگی کے لوگوں پر نظر رہتی ہے۔اور اس وجہ سے دی ہوئی عظیم نعمتوں کی بے قدری کرتے ہیں۔

اسی طرح اگر کوئی عقیدت مند بہت زیادہ تکلفات کے ساتھ بھی کھانا یا ہدایا پیش کرے۔ہم کہتے ہیں یہ ٹھیک نہیں تھا وہ ٹھیک نہیں تھا۔کھانے میں خوبیوں کی بجائے خامیاں تلاش کرتے ہیں۔مگر نبی کریم ﷺ ایک شکر گزار بندے کی حیثیت سے ہر چھوٹی بڑی نعمت کا شکریہ ادا فرماتے تھے۔

<u>تمام نعمتیں قابل قدر ہیں:</u> لایذمّ منھا شیئاً یعنی نعمت میں سے کسی چیز کی مذمت نہیں کرتے تھے۔ دنیاوی ہو یا اخروی اپنی ہو یا پرائی ہر نعمت کو قابل قدر اور وجوب شکر کا موجب سمجھتے تھے۔کفرانِ نعمت متکبر و متجبر لوگوں کا شیوہ ہے۔جن سے آپ ﷺ کوسوں دور تھے۔

غیر انہ لم یکن یذمّ ذواقًا ذواق ذوق سے فعل کا صیغہ ہے جو مفعول یعنی مذوق کے معنی میں ہے اور یہ ماکول و مشروب دونوں کو شامل ہے۔یعنی اگرچہ دیگر نعمتوں کی آپ ﷺ حتی الوسع مدح کرتے تھے لیکن کھانوں کے سلسلے میں آپ ﷺ کا رویہ مختلف تھا۔ان کی مذمت سے تو آپ ﷺ اجتناب کرتے ہی تھے۔کیونکہ کھانے نعم خداوندی میں سے عظیم ترین نعمت ہیں۔اور ان کی تحقیر متکبرین ہی کا کام ہوسکتا ہے۔مگر دوسری نعمتوں کے برعکس کھانوں کی مدح سرائی سے آپ ﷺ کتراتے تھے کیونکہ کھانوں کی مدح حریص لوگ کرتے ہیں۔اور لذائذ دنیاوی میں رغبت کے موقعہ پر میزبان کی تطییب خاطر کے لیے کبھی کبھی کھانے کے بارے میں تعریفی کلمات بول لیتے تھے۔لیکن ہر لحہ روٹی، سالن، کھیر، حلوا، پلاؤ، مرغ اور مینڈھے کی باتیں نہیں کرتے تھے۔جو حرص اور شکم پرستی کی علامت ہے۔اگرچہ کفران نعمت اور کھلانے والوں کی دل شکنی کے خوف سے کھانوں کی مذمت سے بھی اجتناب فرماتے تھے۔تو گویا آپ ﷺ کا کلام کھانوں کے حق میں حریصوں اور شکم پرستوں یا ناشکروں اور ناقدروں کا کلام نہ تھا۔

ولا تغضبہ الدنیا الخ دنیا اور دنیاداری کے امور نبی کریم ﷺ کے لیے غیظ و غضب کا سبب نہیں بنتے تھے۔ہم تھوڑی سی چیز اور ایک ٹکے کا نقصان برداشت نہیں کرسکتے اور جلد ہی آپے سے باہر ہوجاتے ہیں۔اس کے برعکس نبی کریم ﷺ کو اگر پتہ چلتا کہ ایک بڑی دولت ہاتھ سے گئی اور عظیم دنیوی راحت اور فائدے سے بھی محروم ہوگیا تو بھی کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ مالی

ولـدنیا ماانا فی الدنیا الا کراکب استظل تحت الشجرة ثم راح وترکھا(۱). مجھے دنیا سے کیاواسطہ میں تو صرف ایک راہ روجیسا ہوں جو کسی درخت کے سائے میں ستانے کے لیے(تھوڑی دیر کے لیے) آ کھڑا ہو۔ پھر اسے چھوڑ کر چلا جائے۔ بہر حال آپ ﷺ میں دنیا پرستی نہ تھی بلکہ دنیا سے بیزاری تھی فرماتے ہیں تعس عبدالدینار و الدرھم(۲). دینار کا بندہ ہلاک ہوا اور درہم کا بندہ ہلاک ہو۔

واذا تعدی الحق الخ دنیا کے مقابلے میں دینی حمیت کا بیان ہے کہ اگر حق سے عملاً یا قولاً تجاوز ہوتا تو پھر آپ ﷺ بے قابو ہو جاتے۔ اور آپ ﷺ کے غصہ کے سامنے کوئی چیز نہیں ٹہرتی تھی جب تک حق کے لیے انتقام نہ لیتے قرار نہ آتا۔ احقاقِ حق اور اعطائے حق کے بعد ہی دم لیتے تھے۔ لا یغضب لنفسه الـــخ اپنے ذاتی نقصان کے لیے انتقام کے طور پر کبھی غصہ نہیں آتا تھا۔ بلکہ عفو و درگزر سے کام لیتے تھے۔ انانیت سے پاک تھے۔ ہماری حالت تو یہ ہے کہ نفس و انا کی بندگی میں لگے ہیں۔ اور یہ ایک ایسا بت ہے جو سیدھا جہنم میں لے جاتا ہے۔

یہ قتل و قتال، یہ جھگڑے سب اسی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ واذا اشار اشار بـکـفه الخ یعنی جب افہام تفہیم اور رفع ابہام کے لیے اشارہ کا ارادہ فرماتے تھے تو اس وقت آنکھوں سے یا صرف انگلی سے اشارہ کی بجائے پورے ہاتھ سے اشارہ فرماتے۔ نبی کریم ﷺ متکبرین کی طرح آنکھوں آنکھوں میں اشارہ نہیں کرتے تھے۔ اس طرح بے موقعہ و محل اشاروں سے بھی پرہیز کرتے تھے۔ جو کہ وقار و تمکنت کے منافی ہے۔ بلکہ آپ ﷺ اشارہ فرماتے تو انگلیوں کی بجائے ہاتھ سے اشارہ فرماتے کیونکہ یہ عرفاً ایک تو تواضع کے قریب تر ہے۔ دوسری یہ کہ ایک انگلی ایک چیز کے لیے مختص تھی۔ کہ غیر اللہ کو ایک انگلی سے اشارہ بھی گوارا نہ تھا اس سے بھی آپ ﷺ کو شرک کی بو محسوس ہوتی تھی۔ کیونکہ سبابہ سے اشارہ عموماً صرف توحید الٰہی کی طرف ہوتا تھا۔

واذا تـعـجّـب الـخ جب آپ ﷺ کو کسی بات پر تعجب ہوتا تو اظہارِ تعجب کے لیے ہاتھ الٹا کر

---

(۱)جامع ترمذی ۲/ ۶۳ ابو اب الزھد. باب بعد ما جاء فی اخذا لمال (مختار)

(۲)صـحـیـح بـخـاری کـتـاب الرقاق ج ۲ ص ۹۵۲ باب ما یتقی من فتنة المال و فی روایة الترمذیؒ لعن عبدالدینارو لعن عبدالدرھمجامع ترمذی ۲/ ۶۳ (مختار)

دیتے تھے یعنی خلاف معمول ہتھیلی کو نیچے سے اوپر کی جانب کر لیتے تھے جیسا کہ عموماً تعجب کے دوران کیا جاتا ہے۔تو یہ آپ ﷺ کی ایک عادت شریفہ کی تصویر ہے۔اتصل بھا الخ یعنی بات کرنے کے دوران تاکیداً اشارہ مناسب خیال فرماتے۔تو چونکہ بات کی تاکید مقصود ہوتی۔لہٰذا آپ ﷺ کی عادت مبارک یہ تھی کہ کلام کے ساتھ ہی اشارہ اور ہاتھوں کی حرکت ہوتی تھی۔

وضرب براحته الیمنی الخ یہ اسی اشارہ کی توضیح ہے جسے پہلے ذکر کیا۔یا پھر ایک اور عادت کا بیان ہے جس کی توضیح یہ ہے کہ عموماً متکلم کسی بات کی اہمیت کا اجاگر کرنا چاہے یا اپنے آپ سے فتور درماندگی دفع کرنا مقصود ہو یا کوئی کلام اس کے ذوق وشوق کو تحریک دیدے۔تو ایسی حالت میں مختلف قسم کے حرکات کا متکلم سے صادر ہونا طبعی امر ہے۔یہ حرکات کبھی تو شعور واختیار کے تحت ہوتی ہیں۔اور کبھی انسان ایسے مواقع میں بے قابو ہو جاتا ہے۔مثلاً مقرر تقریر کے دوران حرکات کرتا ہے۔قاری تلاوت کے دوران سر دھنتا ہے۔اور گانا اور اشعار گانے والا اور سننے والا جھومتا ہے۔یونہی بات کی تاکید کے لیے کبھی متکلم ران پر ہاتھ مارتا ہے۔کبھی میز بجاتا ہے۔کبھی مخاطب پر ہاتھ رکھ لیتا ہے۔ان تمام حرکات میں مناسب ترین حرکت نبی کریم ﷺ کی عادت مبارکہ تھی جو یہاں بیان ہے کہ آپ ﷺ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے باطن پر مارتے تھے۔اس سے خود متکلم اور دوسری طرف مخاطب دونوں کی توجہ، استحضار اور پُر وقار انداز سے تاکید کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔

اعرض واشاح اعراض کے معنی منہ پھیر لینے کے ہیں اور اشاحۃ کے معنی ایک جانب ہونا، پھرنا اور منہ پر انقباض کی کیفیت طاری کرنا ہے۔لیکن شراح کے مطابق یہاں پر اعراض سے عفو ودرگزر کرنا مراد ہے۔جیسے کہ نبی کریم ﷺ کو حکم ہوا ہے۔واعرض عن الجاھلین اور اشاحۃ سے مراد اعراض اور عفو وصفح میں مبالغہ کرنا مراد ہے۔مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ غصہ ہو جاتے تو غیظ وغضب کے اظہار کی بجائے عفو ودرگزر سے کام لیتے۔اور کمال حلم وکرم اور صفح جمیل کا یہ حال تھا کہ مجرم کو آپ ﷺ کے غصہ کا کم احساس ہوتا تھا۔

یا پھر یہاں پر اس حسی عمل کا بیان ہے جو غصہ کے وقت آپ ﷺ فرماتے تھے۔یعنی اظہار غضب کے لیے سیخ پا ہونے کی بجائے آپ ﷺ صرف منہ پھیر لیتے تھے۔اور مجرم سے آنکھیں نہیں ملاتے تھے۔

وفور حیاء کی وجہ سے صرف بے توجہی پر اکتفا فرماتے۔ بایں ہمہ یہ عشاق کے لیے بہت بڑی سزا ہوتی تھی۔ صحابہؓ ایسی بے رخی پر بھی تڑپتے رہ جاتے۔

مثلاً تبوک سے رہ جانے پر حضرت کعب بن مالکؓ جب آپ ﷺ کی ناراضگی کا نقشہ کھینچتے ہیں تو کہتے ہیں کہ میں آکر سلام کہتا تو آپ ﷺ جواب میں کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ آنکھیں نہیں ملاتے تھے۔ میں مسجد کے گوشے میں بیٹھ جاتا۔ پھر کبھی موقع ملتا تو آپ ﷺ چپکے سے میری طرف ننکھیوں سے دیکھتے بھی تھے مگر میں دیکھتا تو اعراض فرماتے۔ یہ ان کے لئے ہجر و وصال کا ایک عجیب عالم ہوتا۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ترجمان القرآن میں اس صورتحال کا عجیب نقشہ کھینچ کر یہ شعر لکھا

؎ بہر تسکین دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر وہ بوقتِ ناز جو جنبش تیری آبرو میں ہے

بلکہ ''وعلی الثلاثة الذین خلّفوا'' کی تفسیر میں مفسرین نے جو نقشہ کھینچا ہے۔ اس کو دیکھ کر رونا آتا ہے۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ میں کبھی بھی اس آیت پر ایسے نہیں گزرا کہ میں چیخ چیخ کر نہ رویا ہوں۔

بہر حال آپ ﷺ کے غصہ کی حالت کا بیان تھا کسی کو ڈانٹ پلانا تو عادتِ شریفہ میں تھی ہی نہیں۔

واذا فرح غضّ طرفه. جب زیادہ خوش ہوتے تو تواضع اور نہایت حیا کی وجہ سے آنکھیں نیچی کر لیتے۔ گویا خوشی کی حالت میں بھی آپ ﷺ اپنے آپ کو آپے سے باہر نہیں ہونے دیتے۔

جلّ ضحکه التبسم آپ ﷺ کی زیادہ ہنسی تبسم ہوتی تھی ٹھٹھہ مار کر ہنسنے کی عادت نہ تھی۔ کیونکہ اسے آپ ﷺ نے قلب کی موت کا سبب بتایا ہے۔ مزید تفصیل آئندہ باب میں آرہی ہے۔

یفترّ عن مثل حبّ الغمام **افترّ یفترّ** جب عن کے ساتھ متعدی ہو تو اس کا معنی خوبصورت ہنسی ہنسنا ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب دانت خوبصورت ہوں تو ہنسی میں دلکشی ہوتی ہے۔ اور **حب الغمام** کا ترجمہ بعض شراح نے موتیوں سے کیا ہے۔ لیکن راجح یہ ہے کہ اس سے اولے مراد ہیں اس کا لغوی معنی ہے بادل کے دانے جو اولوں پر صادق آتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ہنستے وقت آپ ﷺ کے دانت مبارک ظاہر ہوتے تو یوں نظر آتا جیسے یہ سفید اولے ہیں۔ گویا سفیدی، صفائی اور چمک میں دانتوں کو اولوں سے تشبیہ دی ہے۔ جو نہایت ہی مناسب ہے۔

(اللھمّ صلّی علی حبیبک محمّد وعلی آله وصحبه وسلم)

خلاصہ باب

اس باب میں نبی کریم ﷺ کے طرز کلام کو اجاگر کیا گیا ہے۔داعی برحق کو فصاحت و بلاغت بہ حدکمال بخشی جا چکی تھی۔اور باوجود امی ہونے کے آپ ﷺ کا نثری کلام اتنا دلنشین، معیاری اور انداز اتنا خوبصورت تھا کہ غبی سے غبی کے لیے قابل فہم اور ذہین سے ذہین کے لیے کافی ہوتا تھا۔کسی کو سمجھنے میں الجھن نہیں ہوتی تھی۔بلکہ بات دل میں اترتی تھی۔

حتیٰ کہ حضرت عمرؓ کو تعجباً کہنا پڑا **مالک افصحنا ولم تخرج من بین اظهرنا.** یعنی یہ کیا ہے کہ ہمارے درمیان پل بڑھ کر تم ہم سب سے فصاحت میں آگے نکل گئے۔آپ نے فرمایا **کانت لغة اسماعیل درست فجاءنی بها جبرئیل فحفظتها(طبرانی .بیهقی)** یعنی اسماعیلؑ کی فصیح ترین لغت جو کھولا جا چکا تھا کو جبرئیلؑ میرے پاس لائے اور میں نے اسے یاد کرلیا۔

آپ ﷺ کا کلام نہ تو جوشیلے مقررین کی طرح الجھا ہوا متداخل اور نا قابل تحلیل کلام ہوتا تھا۔نہ اظہار بلاغت میں تکلف سے کام لیتے اور نہ متکبرین کی طرح دھیمے دھیمے بولتے تھے۔بلکہ کانوں میں گھلنے والے الفاظ، ادراک و خیال کو مسخر کرنے والے جملے، اور حافظے پر چھا جانے والا بیان مناسب ترین اشارات سے مزین ہو کر دل سے نکل کر سمع کو چیرتا ہوا دل میں بیٹھتا تھا۔

بایں ہمہ تاکید اور تکرار کر کے مزید شفقت فرماتے۔فضول گوئی کی بجائے خاموشی اور لایعنی مشاغل کی بجائے فکر و تدبّر کو ترجیح حاصل تھی۔

<u>شخصیت کیا تھی؟</u> ایک دردمند مبلغ، ایک فکرمند ہادی، مرقع اخلاص، شکرگزار ہوتے ہوئے لذائذ دنیا سے لذت اندوزی سے کنارہ کش، درشتی اور سخت مزاجی سے دور، جس کا غصہ اس کے قابو میں ہو۔جذبہ انتقام کا نام ونشان نہ ہو مگر نصرت حق پر مرمٹنا جانتا ہو۔عفو و درگزر فطرت بن چکی ہو۔نکتہ چینی کی بجائے ناراضگی کا بھی منفرد مشفقانہ انداز ہو۔غم سے مغلوب ہو۔نہ خوشی سے طبیعت سرشار اور حسن وہ جو نظر کی ہر پیاس بجھائے۔

ایک ایسی شخصیت سے جس شیریں کلامی کی توقع کی جا سکتی ہے اس پر دھی فصاحت و بلاغت، اخلاص، شفقت، رأفة ورحمة اور بھرپور پُرکشش اداؤں کی مزید مٹھاس یہ سب جمع کی جائیں تو آپ ﷺ کے کلام کی حقیقی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔

~ فدا ہوں آپ کی کس کس ادا پر ادائیں لاکھ اور بے تاب دل اک

خلاصہ باب

اس باب میں نبی کریم ﷺ کے طرز کلام کو اجاگر کیا گیا ہے۔ داعی برحق کو فصاحت و بلاغت بہ حدکمال بخشی جاچکی تھی۔ اور باوجود امی ہونے کے آپ ﷺ کا نثری کلام اتنا دلنشین، معیاری اور انداز اتنا خوبصورت تھا کہ غبی سے غبی کے لیے قابل فہم اور ذہین سے ذہین کے لیے کافی ہوتا تھا۔ کسی کو سمجھنے میں الجھن نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ بات دل میں اترتی تھی۔

حتیٰ کہ حضرت عمرؓ کو تعجباً کہنا پڑا **مالک افصحنا ولم تخرج من بين اظهرنا**. یعنی یہ کیا ہے کہ ہمارے درمیان پل بڑھ کر تم ہم سب سے فصاحت میں آگے نکل گئے۔ آپ نے فرمایا **كانت لغة اسماعيل درست فجاء نی بها جبرئيل فحفظتها(طبرانی .بيهقی)** یعنی اسماعیلؑ کی فصیح ترین لغت جو کھولا جاچکا تھا کو جبرئیلؑ میرے پاس لائے اور میں نے اسے یاد کرلیا۔

آپ ﷺ کا کلام نہ تو جوشیلے مقررین کی طرح الجھا ہوا متداخل اور ناقابل تحلیل کلام ہوتا تھا۔ نہ اظہار بلاغت میں تکلف سے کام لیتے اور نہ متکبرین کی طرح دھیمے دھیمے بولتے تھے۔ بلکہ کانوں میں گھلنے والے الفاظ، ادراک و خیال کو مسخر کرنے والے جملے، اور حافظے پر چھا جانے والا بیان مناسب ترین اشارات سے مزین ہوکر دل سے نکل کر سمع کو چیرتا ہوا دل میں بیٹھتا تھا۔

بایں ہمہ تاکید اور تکرار کرکے مزید شفقت فرماتے۔ فضول گوئی کی بجائے خاموشی اور لایعنی مشاغل کی بجائے فکر و تدبّر کو ترجیح حاصل تھی۔

<u>شخصیت کیا تھی؟</u> ایک دردمند مبلغ، ایک فکرمند ہادی، مرقع اخلاص، شکر گزار ہوتے ہوئے لذائذ دنیا سے لذت اندوزی سے کنارہ کش، درشتی اور سخت مزاجی سے دور، جس کا غصہ اس کے قابو میں ہو۔ جذبہ انتقام کا نام ونشان نہ ہو مگر نصرت حق پر مرمٹنا جانتا ہو۔ عفوودرگزر فطرت بن چکی ہو۔ نکتہ چینی کی بجائے ناراضگی کا بھی منفرد مشفقانہ انداز ہو۔ غم سے مغلوب ہو۔ نہ خوشی سے طبیعت سرشار اور حسن وہ جو نظر کی ہر پیاس بجھائے۔

ایک ایسی شخصیت سے جس شیرین کلامی کی توقع کی جاسکتی ہے اس پر دھمی فصاحت و بلاغت، اخلاص، شفقت، رأفتہ ورحمۃ اور بھرپور پُرکشش اداؤں کی مزید مٹھاس یہ سب جمع کی جائیں تو آپ ﷺ کے کلام کی حقیقی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔

؎ فدا ہوں آپ کی کس کس ادا پر ادائیں لاکھ اور بے تاب دل اک

۳۵. باب ماجاء فی ضحک النبی ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے ہنسنے کا بیان

ضحک ضاد کے کسرہ اور فتح کے ساتھ جبکہ حاء ساکن ہو یا مکسور، ہنسنے کو کہتے ہیں (۱)۔ ہنسنے کے تین مراتب ہیں۔ سب سے ادنیٰ تبسم ہے۔ پھر ضحک اور اس کے بعد قہقہہ کی باری آتی ہے۔ ضحک یہ ہے کہ خود ہنسنے والا اور اس کے ساتھ موجود لوگ ہنسنے والے کی آواز سن لیں۔

یہاں ترجمۃ الباب میں جس ضحک کا ذکر ہے۔ اس سے کیا مراد ہے؟

رسول اللہ ﷺ صرف تبسم فرماتے تھے: گزشتہ باب کی آخری حدیث میں بھی آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی عام عادت تبسم کی تھی۔ قہقہوں کی آپ ﷺ کو عادت نہ تھی۔ بلکہ کئی احادیث میں تو کثرت ضحک سے منع کیا گیا ہے۔ خود اس باب کی پہلی حدیث میں آپ ﷺ کی ہنسی کو تبسم میں منحصر کر کے آپ ﷺ سے ضحک کی نفی کی گئی ہے۔

لہٰذا یہاں پر ضحک سے مراد تبسم میں مبالغہ ہوگا۔ جو کہ ضحک کے قریب ہو۔ اور نفی ضحک سے وہ ضحک مراد ہوگی جس میں غافلین اور فرحین لوگ مبتلا رہتے ہیں۔ لیکن بعض محدثین کے ہاں اس تاویل کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ سے ضحک کا صدور بلکہ خوب زور سے ہنسنا بھی ثابت ہے۔ البتہ آپ ﷺ کی ہنسی دنیاوی امور کے بارے میں نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ دین کے حق میں کبھی مسرت یا قابل تعجب بات کے ادراک کے موقع پر آپ ﷺ خوب ہنسے ہیں۔

مثلاً جب کبھی اسلام کو غلبہ حاصل ہوا ہے باطل ذلیل خوار ہوا ہے یا آخرت میں رحمت و فضل الٰہی کی بے پایانی کا ذکر ہے۔ ربّ ذوالجلال کی جانب سے بندے پر نوازشوں کا فیضان ہوا ہے۔ اتنا کہ تعجب آئے۔ تو آپ ﷺ خوش ہو کر زور سے ہنسے ہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ صحابہؓ کی دلداری کی خاطر بھی ہنسا کرتے تھے۔ ہاں سیر سپاٹوں کے وقت جو بے قابو طور پر ہنسا جاتا ہے۔ اور دل کا خون کیا جاتا ہے۔ غفلت کی ایسی کیفیات سے آپ ﷺ منزّہ تھے۔

---

(۱) علامہ مناویؒ نے لکھا ہے والضحک خاصۃ للانسان واصلہ من سرور یعرض القلب وقد یضحک غیر المسرور (المناوی علی هامش جمع الوسائل ۲/ ۱۸) (اصلاح الدین)

(۱) حدّثنا أحمد بن منیع ثنا عبّاد بن العوام أنا الحجّاج وھوابن أرطاۃ عن سماک بن حرب عن جابر بن سمرۃ قال کان فی ساقی رسول اللہ ﷺ حموشۃ وکان لایضحک الاّ تبسّماً فکنت إذا نظرت إلیہ قلت أکحل العینین و لیس بأکحل(۱).

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی پنڈلیاں (کسی قدر) باریک تھیں۔ آپ ﷺ صرف تبسم کی ہنسی ہنسا کرتے تھے۔ میں جب نبی کریم ﷺ کو دیکھتا۔تو دل میں یہ گزرتا کہ آپ ﷺ سرمہ استعمال کرچکے ہیں۔ مگر درحقیقت آپ ﷺ سرمہ لگائے ہوئے نہیں ہوتے تھے۔

کان فی ساقی الخ یعنی آپ ﷺ کی پنڈلیاں موٹی نہیں تھیں بلکہ ان میں پتلا پن تھا۔ اگرچہ جسم مضبوط تھا۔اور علم قیافہ والوں نے اس صفت کوانسانی محاسن میں سے شمار کیا ہے۔حمش دقۃ یعنی باریکی کو کہتے ہیں۔بعض لوگوں نے خموشۃ کوخاء معجمہ کے ساتھ بھی پڑھا ہے۔لیکن شراح نے اس پر رد کیا ہے۔

وکان لا یضحک الّا تبسماً. یہاں تقدیر عبارت یوں ہے کہ وکان لا یضحک ضحکا إلاّ تبسّما ۔اس طرح تبسم کوضحک میں داخل کیا گیا ہے(۲)۔اس کی ایک توجیہ تو یہ ہے کہ

(۱)جامع ترمذی ۲/ ۲۸۳ کتاب المناقب باب فی صفۃ النبیّ ﷺ، شرح السنۃ للبغوی ۱۳/ ۲۲۲، کتاب المناقب باب صفۃ النبی ﷺ،المستدرک للحاکم ۲/ ۶۰۶،(مختار)

(۲) ہنسنے کی صورتیں: ہنسنے کے تین صورتیں ہیں (۱) تبسم: ہنسنے کی اس صورت میں صرف ہونٹ کھل کر دانت نظر آتے ہیں۔ مگر آواز نہیں نکلتی۔(۲) ضحک: اس صورت میں منہ کھل کر نواجذ نظر آنے کے ساتھ ہلکی سی ہنسنے کی آواز بھی نکل آتی ہے۔(۳) قہقہہ: ہنسنے کی اس صورت میں انسان کا پورا منہ بھی کھل جاتا ہے۔اور ہنسنے کی زوردار آواز نکلتی ہے۔ہنسنے کے اس قسم کوناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔اور اگر کوئی عاقل بالغ شخص دوران نماز قہقہہ لگائے تو نماز فاسد ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ اور ایسا ہنسنا قساوت قلبی اور غفلت کا سبب ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے لاتکثر الضحک فإنّ کثرۃ الضحک تمیت القلب(جامع ترمذی)اس لئے رسول اللہ ﷺ سے تبسم اور ضحک تو ثابت ہے مگر قہقہہ ثابت نہیں۔(مختار)

ضحک کے لیے مبدا ہونے کی وجہ سے ضحک تبسم کو بھی شامل ہے۔لیکن اگر ضحک کو عام معنی میں لیا جائے جو ہنسی کے تینوں قسموں یعنی تبسم،ضحک، بالمعنی الاخص اور قہقہہ کو شامل ہوتو پھر اشکال ہی نہیں رہتا۔

بہرحال مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ غالب اوقات میں تبسم پر ہی اکتفاء فرماتے تھے۔اور یہ بھی صحابہؓ کی دلداری اور حسن معاشرت کی وجہ سے وہ بشاشت تھی جو ہر لحہ رخ انور پر عیاں ہوتی تھی۔تعلقاتِ عامہ کا تقاضا ہوتا ہے کہ ملاقات کرنے والوں کا استقبال خندہ روئی سے کیا جائے۔

فکنتُ اذا نظرتُ مسکراتے وقت آنکھوں میں چمک اور خوبصورتی دکھائی دیتی ہے اس کا بیان ہے۔یہاں **کنت** میں تاء مضموم (بصیغہ متکلم) اور تاء مفتوح (بصیغہ خطاب) دونوں جائز ہے۔اسی طرح بعد کے نظرت اور قلت میں بھی دونوں احتمال درست ہیں۔**قلت أکحل العینین الخ** ۔یعنی جب ان کی سرگین آنکھیں نظر آتیں تو ان پر سرمہ استعمال کرنے کا گمان ہوتا تھا۔جبکہ درحقیقت آپ ﷺ نے سرمہ استعمال نہیں کیا ہوتا تھا۔ بلکہ فطری طور پر آپ ﷺ کی آنکھیں سرگین تھیں۔تو بادی النظر کے اعتبار سے تو سرمہ کا اثبات ہوتا تھا۔لیکن نفس الامر میں یہ منفی ہیں۔اول مصنوعی طور پر آنکھوں کا سرگیں کرنا،دوم قدرتی طور پر آنکھوں کا سرگین ہونا۔تو یہاں پر اول الذکر کی نفی اور مؤخر الذکر کا اثبات مقصود ہے۔

(۲) حدّثنا قتیبة بن سعیدأنا ابن لهیعة عن عبیداللّٰه بن المغیرة عن عبداللّٰه بن الحارث بن جزء قال مارأیت احداأکثر تبسّما من رسول اللّٰهﷺ (۱).

ترجمہ: عبداللہ بن حارث بن جزءؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے زیادہ تبسم کرنے والا کوئی نہیں دیکھا تھا۔

مارأیت الخ صحابہ کرامؓ کے ساتھ معاشرت اور نشست وبرخاست میں نبی کریم ﷺ بہت شفیق اور ہشاش بشاش تھے۔لہٰذا عمومی حالت یہ ہوتی تھی کہ آپ ﷺ سب سے زیادہ تبسم کرنے والے ہوتے تھے۔یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مومنین پر خصوصی رحمت تھی۔

(۱)جامع ترمذی ۲/۲۸۳ کتاب المناقب باب فی بشاشة النبیﷺ، مسنداحمد ۴/۱۹۰ (مختار)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظاً غليظ القلب لانفضوا من حولک(آل عمران ۵۹) پس اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سبب آپؐ ان کے لیے نرم ہوگئے اور اگر آپؐ (خدانخواستہ) تندخو، سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپؐ کے پاس سے منتشر ہوجاتے۔

یا پھر یہاں کثرتِ تبسم آپؐ کے ضحک کی نسبت ہے۔اور مراد یہ ہے کہ میں نے حضورؐ کے سوا کسی کو بھی نہیں دیکھا جس کا ضحک کم اور تبسم اس کی نسبت زیادہ ہو۔اس طرح اس حدیث میں اور گزشتہ باب کی اس حدیث میں جس میں کہا گیا ہے کہ آپؐ ''متواصل الاحزان'' تھے۔تعارض نہیں ہوگا۔

(۳) حدثنا أحمد بن خالد الخلّال ثنا يحيٰى بن إسحاق السيلحاني ثنا ليث بن سعد عن يزيد بن أبي حبيب عن عبدالله ابن الحارث قال ما كان ضحک رسول اللهؐ إلاّ تبسّماقال ابوعيسیٰ هذا حديث غريب من حديث ليث بن سعد(۱).

ترجمہ: عبداللہ بن حارثؓ کہتے ہیں کہ نبی کریمؐ کی ہنسی صرف تبسم ہی ہوا کرتی تھی۔

إلاّ تبسّماً الخ یعنی ضحک کی نسبت غالب اوقات میں آپؐ کی ہنسی تبسم ہوتی تھی اگرچہ ضحک بھی بعض اوقات میں ثابت ہے۔

قال أبو عيسیٰؒ الخ امام ترمذیؒ اس حدیث کی غرابت بیان کرتے ہیں اور وجہ یہ ہے کہ لیث بن سعدؒ اس میں متفرد ہیں۔لیکن اس کے باوجود حدیث اس لیے صحیح ہے کہ لیثؒ جلیل القدر امام ہیں۔ان کا تفرد صحتِ حدیث کے منافی نہیں۔

(۴) حدثنا أبو عمّار الحسين بن حريث أنبانا وكيع ثنا الأعمش عن المعرورا بن سويدعن أبي ذرؓ قال قال رسول اللهؐ إنّي لأعلم اوّل رجل يدخل الجنّة وأخررجل يخرج من النار يؤتى بالرجل يوم القيامة فيقال اعرضوا عليه صغار ذنوبه وتخبا عنه كبارها فيقال له

---

(۱)جامع ترمذی ۶۸۳/۲ کتاب المناقب باب فی بشاشة النبیؐ(مختار)

عملت یوم کذا کذا و کذا وھو مقرّلا ینکرو ھو مشفق من کبار ھا فیقال اعطوہ مکان کل سیّئۃٍعملھاحسنۃ فیقول إنّ لی ذنوبا لا اراھا ھھنا قال ابو ذرؓفلقدرأیت رسول اللہﷺ ضحک حتی بدت نواجذہ(۱)۔

ترجمہ: حضرت ابوذرؓفرماتے ہیں کہ نبی کریمﷺ نے فرمایا کہ میں اس شخص کو جانتا ہوں جو سب سے اول جنت میں جائے گا۔اوراس کو بھی جسے جہنم سے سب سے آخر میں نکالا جائے گا۔قیامت کے دن (اس مؤخر الذکر یا کسی اور) آدمی کو(اللہ تعالیٰ کے دربار میں) لایا جائے گا۔پھر فرشتوں سے کہا جائے گا کہ اس آدمی پر اس کے چھوٹے چھوٹے گناہ پیش کردو۔اوراس کے بڑے گناہ (حسب ارشادالٰہی) چھپائے جائیں گے۔چنانچہ اس کو کہا جائے گا کہ تم نے فلاں فلاں دن فلاں فلاں گناہ کیئے ہیں۔وہ آدمی اقراری ہوگا۔(اپنے گناہوں سے) انکارنہیں کرے گا۔حالانکہ وہ بڑے گناہوں کے پیش ہونے سے خوفزدہ ہوگا۔پھر حکم ہوگا کہ اس کے ہر کردہ گناہ کے بدلے اسے ایک نیکی دے دیں تب یہ شخص بول اٹھے گا کہ میرے تو (اور بھی) بہت سے گناہ ہیں جو میں یہاں دیکھ نہیں رہا۔حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ پھر خدا کی قسم میں نے نبی کریمﷺ کو دیکھا کہ آپﷺ خوب ہنسے حتیٰ کہ آپﷺ کے دانت مبارک ظاہر ہوگئے۔

<u>حضرت ابوذرغفاریؓ:</u> ابوذرؓ کے نام میں اختلاف ہے لیکن مشہور نام جذب بن خبادہ ہے۔ بنوغفار سے تعلق تھا۔اسلام لانے سے پہلے بھی آپؓ کا شمار عبادت گزار لوگوں میں ہوتا تھا۔نبی کریمﷺ کی بعثت کا علم ہوا تو اپنے بھائی حضرت انیسؓ کو مکہ بھیجا تا کہ صحیح حالات کا پتہ چلے حضرت انیسؓ نے واپس آکر

(۱)صحیح مسلم کتاب الایمان باب اثبات الشفاعۃ واخراج الموحدین من النار، مسنداحمد۵/۱۵۷، شرح السنۃ للبغوی۱۵/۱۹۲ کتاب الفتن باب اخر من یکرض من النار، السنن الکبریٰ للبیھقی۱۰/۱۹۰ (مختار)

حضور اکرم ﷺ کے متعلق کچھ بتایا مگر آپؓ نے فرمایا "ماشفیتنی" تم نے میری تشفی نہیں کی لہٰذا زاداور پانی لے کرخود مکہ تشریف لائے مکہ والوں کی مخالفت کا علم تھا۔اس لیے کسی سے نبی کریم ﷺ کے بارے میں پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔رات ہوگئی تو مسجد حرام آئے۔حضرت علیؓ نے انہیں دیکھا تو انہیں ساتھ لے گئے ۔دوسرادن بھی نبی کریم ﷺ کی تلاش میں گزرا۔مگران کونہیں پہچانا۔پھرحضرت علیؓ نے ان کی مہمان نوازی کی،تیسری رات جب حضرت علیؓ انہیں گھر لے گئے تو ان سے مکہ مکرمہ آنے کا مقصددریافت کیا۔آپؓ نے کہا کہ اگر یہ عہد کروگے کہ میری صحیح رہنمائی کروگے تو بتادوں گا۔انہوں نے وعدہ کیا جس پر آپؓ نے مدعا بیان کردیا کہ یہاں جس شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہےاس سے ملنے آیا ہوں لیکن تاحال اسے پہچان نہ سکا۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ دیکھو میرے پیچھے پیچھے آنا اور اگر کسی کافرکو دیکھ کر مجھے کچھ خطرہ محسوس ہوا تو میں پیشاب کے بہانے بیٹھ جاؤنگا۔اورتم میراانتظار کئے بغیر آگے گزرجانا۔اس طرح حضرت علیؓ آپؓ کولے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضرہوئے ۔اس وقت تک صرف چارآدمی مسلمان ہوچکے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے اسلام پیش کردیا۔اورآپؓ نے کلمہ شہادت پڑھا۔اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے نصیحت کی کہ فی الحال اہل مکہ پراسلام ظاہر کئے بغیر سیدھے گھر چلے جانا۔جب تیرے پاس میرادوسراامر(حکم) آجائے تو آجانا۔مگرآپؓ نے کہا کہ خدا کی قسم میں ان کافروں کے بیچ اسلام کا اعلان کروں گا۔چنانچہ مسجد حرام تشریف لائے اور بلند آواز سے کلمہ شہادت کا اعلان کیا قریش نے اس پر آپؓ کوخوب مارا۔حتیٰ کہ حضرت عباسؓ نے انہیں بچالیا۔دوسرے روز پھراعلان کیا۔اور ماربھی پڑی۔پھراپنے گھرآ کراپنے بھائی اوروالدین کواسلام کی دعوت دی۔وہ سب مسلمان ہوئے۔قوم میں سے بھی کچھ لوگ آپؓ کی دعوت پر مسلمان ہوگئے۔

غزوۂ احداورایک قول کے مطابق غزوہ خندق کے بعدمدینہ تشریف لائے۔اس کے بعد کے تمام غزوات میں شرکت کی۔ نبی کریم ﷺ آپؓ کے بارے میں فرماتے کہ زمین وآسمان کے درمیان ابوذرؓ سے زیادہ سچا آدمی نہیں ہے۔حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ابوذرؓ وہ برتن ہے جسے علم سے بھردیا گیا ہے۔چونکہ انتہائی درجہ کے زاہد تھے۔لہٰذا اہل ثروت لوگوں پر ہمیشہ نکیر فرماتے تھے۔چنانچہ حضرت عثمانؓ نے مدینہ سے باہر ربذہ کے مقام پرگھر بنا کروہاں منتقل ہونے کی درخواست کی۔چنانچہ امیر کے حکم پروہیں سکونت اختیار کی۔

اور۳۱ھ میں اور ایک قول کے مطابق ۳۲ھ میں وہیں وفات ہوئے۔ بہت سے صحابہؓ بھی آپؓ سے روایت کرتے ہیں۔

إنّی لا علم اوّل رجل یدخل الجنة جنت میں علی الاطلاق پہلے داخل ہونے والے شخص خود نبی کریمﷺ ہیں۔ جیسا کہ دوسری روایات میں صراحتاً مذکور ہے(۱)۔ لیکن ممکن ہے کہ یہاں اول رجل یدخل الجنة من عصاة المؤمنین مراد ہو۔ یعنی گناہ گار جہنمی مومنوں میں سے جنت میں پہلا داخل ہونے والا شخص بھی مجھے معلوم ہے۔ جس طرح کہ آخری داخل ہونے والا شخص کا قصہ یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں پہلے شخص کا ذکر صرف اس لیے ہوگا کہ بعد کا قصہ موثق ہو جائے۔ کہ یہ وحی پر مبنی ہے۔

لیکن امام مسلمؒ وغیرہ نے حضرت ابوذرؓ کی یہی حدیث ان الفاظ سے روایت کی ہے "انّی لا علم آخر اهل الجنة دخولا الجنة وآخر اهل النار خروجا منها رجل یؤتیٰ (الحدیث)(۲)" اس لیے ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ یہاں امام ترمذیؒ کو وہم ہوا ہے کیونکہ درست "آخر رجل یدخل الجنّة" ہے۔ اس طرح دونوں جملوں کے مصداق ایک ہی شخص ہوگا۔

یؤتی بالرجل یہاں "رجل" سے مراد میں تین احتمال ہیں۔ یا تو اس سے "اول رجل یدخل الجنة" مراد ہے لیکن پھر اسے اول رجل من المذنبین سے مقید کرنا پڑے گا نہ کہ علی الاطلاق۔ یا پھر آخر رجل یخرج من النار علی الاطلاق مراد ہوگا۔ جیسے کہ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت میں اس کا ذکر ہے یا پھر یہ ایک تیسرا شخص ہے نہ کہ جنت میں داخل ہونے والا پہلا گناہ گار۔ نہ جہنم سے نکلنے والا آخری آدمی۔ بلکہ دونوں کے درمیان جنت میں داخل ہونے والا شخص ہے۔ ملا علی قاریؒ اور مناویؒ وغیرہ نے اس آخری احتمال کو ترجیح دی ہے۔ اور کہا ہے کہ یہ کلام مستانف ہے اور ایک تیسرے شخص کا بیان مقصود ہے۔

---

(۱) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے وحاصله اول رجل یدخل الجنة ممّن یخرج من النار لأنّ اوّل من یدخل الجنّة علی الاطلاق إنّما هو النبیﷺ (جمع الوسائل ۲/ ۲۰) اور یہی بات علامہ عبدالجواد الرومی نے بھی لکھی ہے(الاتحافات ۲۸۰)(مختار)

(۲) مسلم ج ۱ ص ۱۰۶ کتاب الایمان باب إثبات الشفاعة واخراج الموحدین من النار(مختار)

اعطوہ مکان کل سیئة عملها حسنةً یعنی جتنے بھی صغائر ہوں سب کو نیکیوں سے بدل دو۔

اس تبدیل کے حق میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ إلاّمن تاب و آمن وعمل عملاً صالحا فاولئک یبدل اللّٰہ سیأتھم حسنات(فرقان ۷۰) مگر جن لوگوں نے توبہ کیا، ایمان لائے اور نیکیاں کیں۔ پس یہ وہ لوگ ہیں جن کے گناہوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں سے بدل دینگے۔

کفر کی وجہ سے نیکیوں کا ضائع ہونا: اللہ تعالیٰ کے ہاں جس طرح حبط اعمال کا قانون ہے کہ کفر جیسے کسی جرم عظیم کے سبب اعمال اور نیکیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے ہاں تبدیل سیّئات بالحسنات کا بھی قانون ہے۔ کہ کبھی اللہ تعالیٰ کسی دوسرے بڑے عمل کی وجہ سے ''گاہے بدشنام مے بخشد'' کے مصداق بندہ کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیتے ہیں۔

إنّ لی ذنوباً ما اراھاھنا جب بندہ رحمت خداوندی کے وفور کو دیکھے گا۔ اور خوف زائل ہو جائے گا تو وہ کہے گا کہ میں نے تو اور بھی عظیم عظیم گناہ کئے ہیں۔ وہ کہاں چھپا لیے گئے ہیں۔ ان کو بھی نیکیوں میں تبدیل کر دیا جائے۔

قال أبو ذرؓ فلقد الخ یعنی نبی کریم ﷺ نے جب اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم اور اس کے مقابلے میں بندے کا یہ حرص بیان کر دیا۔ تو نبی کریم ﷺ کو میں نے دیکھا کہ ہنستے ہوئے ان کی داڑھیں دکھائی دینے لگیں۔ نواجذ آخر کے دانتوں کو کہتے ہیں لیکن کبھی کبھی اس کا اطلاق آخری سے سامنے والے دانتوں پر بھی ہوتا ہے۔ اب یہ دراصل مبالغہ فی الضحک سے کنایہ ہوگا۔ یعنی آپ ﷺ خوب ہنسے۔ اتنا کہ جہاں تک دانت دکھائی دے سکتے ہیں وہ سب ظاہر ہو گئے۔ البتہ اس قسم کی ہنسی آپ ﷺ کی عادتِ مستمرہ نہ تھی بلکہ بصورت ندرت کبھی کبھی آپ ﷺ سے صادر ہوتی تھی۔ اور جس روایت میں نہی آئی ہے ''لاتکثر الضحک '' تو اس حدیث میں ایسے ہنسی کی اکثار سے منع کیا گیا ہے۔ یعنی کہ ہر وقت آدمی زور سے ہنستا رہے۔ یہ منع ہے کیونکہ اس سے قلب کی موت ہوتی ہے۔ فان کثرة الضحک تمیت القلب

(۵) حدّثنا أحمد بن منیع ثنا معاویة بن عمر و ثنا زائدة عن بیان عن قیس بن أبی حازم عن جریر بن عبداللّٰہ قال ما حجبنی

رسول اللہ ﷺ منذا سلمت ولارآنی الّاضحک(۱).

ترجمہ: حضرت جریر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے میرے مسلمان ہونے کے بعد کبھی بھی مجھے حاضری سے نہیں روکا۔اور کبھی بھی مجھے نہیں دیکھا مگر آپ ﷺ ہنس دیتے تھے۔

قال ما حجبنی گزشتہ ابواب میں حضرت جریرؓ کے حالات مفصل طور پر بیان ہو چکے ہیں۔وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی مجلس میں آنے جانے کی کوئی پابندی مجھ پر نہیں تھی۔لیکن یہاں گھر میں آنا مرادنہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ مجلس نبوی ﷺ میں مجھے کھلی اجازت تھی۔اور ممکن ہے کہ **حجبنی** سے مراد **مَنَعنی** مراد ہو یعنی آپ ﷺ نے میری کوئی درخواست اور گزارش رد نہیں فرمائی۔**الاضحک** یعنی مجھے دیکھتے تو ضرور مسکراہٹ اور ہنسی سے میرا استقبال فرماتے(۲)۔

(۲) حدّثنا أحمد بن منیع ثنا معاویۃ بن عمرو ثنا زائدۃعن إسماعیل بن أبی خالد عن قیس عن جریر قال ما حجبنی رسول اللّٰہ ﷺ منذ اسلمت ولا رانی إلاّ تبسّم(۳) .

ترجمہ: حضرت جریرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے میرے اسلام لانے کے بعد کبھی بھی مجھے حاضری سے نہیں روکا۔اور کبھی بھی مجھے نہیں دیکھا مگر آپ ﷺ نے تبسم ضرور فرمایا۔

إلاّ تبسّم یہ جریرؓ کی گزشتہ حدیث ہی ہے۔صرف **ضحک** کی بجائے تبسم کا ذکر ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ حدیث میں بھی ضحک سے تبسم مراد ہے۔اور اس تبسم کی وجہ شرّاح نے یہ لکھی ہے کہ

---

(۱)صحیح مسلم ۲/۲۹۷ کتاب فضائل الصحابۃ باب فضائل جریر بن عبداللّٰہ، جامع ترمذی ۲/۲۰۷ کتاب المناقب باب مناقب جریر بن عبداللّٰہ،(مختار)

(۲)اوراس کی وجہ ملاعلی قاریؒ نے یہ لکھی ہے لعل وجہ التبسم لہ کل مرۃ فی رؤیتہ إنّہ رأہ مظہر الجمال فإنّہ کان لہ صورۃ حسنۃ علی وجہ الکمال حتی قال عمرؓ فی حقہ إنّہ یوسف ھذہ الامۃ (جمع الوسائل ۲/۲۳)(مختار)

(۳)جامع الترمذی ۲/۲۰۷ کتاب المناقب مناقب جریر بن عبداللّٰہؓ سنن ابن ماجہ ص ۱۵ مناقب جریر بن عبداللہ(مختار)

چونکہ جبریلؑ انتہائی خوبصورت تھے۔حضرت عمرؓ اسی وجہ سے آپؐ کو "یوسف هذه الامة" کہتے تھے۔لہٰذا آپ ﷺ ان کو دیکھ کر بے اختیار تبسم فرماتے تھے۔

(۷) حدّثنا هنّاد بن السری ثنا ابو معاوية عن الأعمش عن ابراهيم عن عبيدة السلمانی عن عبداللّٰه بن مسعودؓ قال قال رسول اللّٰه ﷺ إنّی لا عرف اخر اهل النار خروجا رجل يخرج منها زحفا فيقال له انطلق فادخل الجنّة قال فيذهب ليدخل الجنّة فيجد الناس قد اخذوا المنازل فيرجع فيقول يا رب قد اخذ النّاس المنازل فيقال له أتذكر الزمان الذی كنت فيه فيقول نعم قال فيقال له تمن قال فيتمنىٰ فيقال له فانّ لک الذی تمّنيت و عشرة اضعاف الدّنيا قال فيقول اتسخرنی وانت الملک و قال فلقد رأيت رسول اللّٰه ﷺ ضحک حتّىٰ بدت نواجذه(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں اس شخص کو جانتا ہوں جو سب سے آخر میں جہنم سے نکلنے والا ہے۔وہ ایک ایسا آدمی ہے جو زمین پر سرین کے بل گھسٹتا ہوا جہنم سے نکلے گا۔اسے حکم دیا جائے گا کہ جاؤ جنت میں داخل ہو جاؤ۔وہ جنت میں داخل ہونے کے لیے وہاں جائے گا۔وہاں لوگوں کو جنت کی منزلوں پر قبضہ کئے ہوئے پائے گا۔وہاں سے لوٹ کر کہے گا کہ اے رب لوگوں نے تمام مقامات پر قبضہ جمائے رکھا ہے۔تو اس کو کہا جائے گا کہ کیا تجھ کو دنیا یاد آ رہی ہے (جہاں تنگی تھی۔یا مراد یہ کہ تم دنیا کی وسعت کو یاد کرو) وہ عرض کرے گا

(۱)صحيح بخاری ۲/۹۷۲ كتاب الرقاق باب صفة الجنة والنار، صحيح مسلم ۱/۱۰۵ كتاب الايمان اثبات الشفاعة واخراج الموحدين من النار باب آخر اهل النار خروجاً، جامع ترمذی ۲/۵۳۰ كتاب صفة جهنم، عن رسول الله باب ماجاء ان النّار،سنن ابن ماجة ص ۳۲۱ باب صفة الجنة كتاب الزهد باب صفة الجنة(مختار)

ہاں (یاد ہے) تو اسے کہا جائے گا کہ تو اپنی تمنائیں ظاہر کر۔ تو وہ (اپنی خواہشات) کی تمنا کرے گا پھر اسے کہا جائے گا کہ تمہیں وہ سب تمنائیں اور خواہشات بھی دی جاتی ہیں۔ جو تم نے ظاہر کر دی اور تمام دنیا سے دس گنا زائد بھی دیا جاتا ہے۔ وہ عرض کرے گا۔ کہ اے رب! آپ بادشاہ ہو کر بھی مجھ سے تمسخر کرتے ہیں۔ (حضرت ابن مسعودؓ) کہتے ہیں کہ تب میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ وہ اتنا ہنسے کہ آپ ﷺ کے دانت مبارک ظاہر ہو گئے۔

إنّي لأعرف آخر أهل النار خروجاً. آخری آدمی جو جہنم سے نکل کر جنت میں آئے گا۔ اس کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا بیان ہے کہ وہ ایک ایسا آدمی ہوگا جو جہنم سے گھسٹتا ہوا نکلے گا(۱)۔ وہ جہنم کا اتنا مارا ہوگا کہ مفلوج آدمی کی طرح اٹھنے کی سکت نہیں ہوگی۔ **فیقال له انطلق الخ** اسے جنت میں جانے کا کہا جائے گا۔ دروازے میں آ کر وہ محسوس کرے گا کہ جنت کے تمام گھر تو لوگوں سے بھرے ہیں۔ اس لیے وہ واپس ہوگا۔ اور کہے گا کے اے رب! لوگوں نے تمام گھروں پر قبضہ کر رکھا ہے۔

<u>اتذکر الزمان الذی کنت فیه کا مطلب</u>: اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دنیا اور اس کی وسعتیں جہاں تم رہتے تھے۔ اگر یاد نہ ہو تو یاد کر لو۔ دنیا میں ہفت اقلیم کی وسعت کا تصور ذہن نشین کروا کر اسی کے مطابق احسان کرتا ہے۔ کہ اس سے بھی بڑھ کر میں دوں گا۔ اس صورت میں استفہام امر کے معنی کو متضمن ہوگا۔

اور ایک اور معنی یہ ہے کہ کیا تم کو دنیا یاد آ گئی جہاں کی بڑی سے بڑی عمارت اور جگہ بھی زیادہ ہجوم کی وجہ سے بھر جاتی تھی۔ تو کیا تمہارے خیال میں عالم آخرت بھی ایسا ہے کیا جنت کو بھی اتنا تنگ سمجھ رکھا ہے(۲)؟ حالانکہ یہ نہیں بھرتا۔ جس طرح جہنم نہیں بھرتا۔ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا **یوم نقول**

---

(۱) ایک روایت میں زحفاً کی جگہ حبواً کا لفظ آیا ہے۔ یعنی بچوں کی طرح ہاتھ پاؤں لگاتا ہوا نکلے گا شراح کے مطابق دونوں روایتوں میں تعارض نہیں ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ بعض اوقات میں سرین کے بل سے چلے۔ اور بعض اوقات میں ہاتھ پاؤں لگا کر چلے۔ (اصلاح الدین)

(۲) یہ احتمال راجح معلوم ہوتا ہے کیونکہ بعد میں "نعم" کے کلمہ سے جواب ملتا ہے۔ جو کہ استفہام کے جواب میں آتا ہے۔ نہ کہ امر کے جواب میں۔ علاوہ ازیں استفہام کو حقیقت پر محمول کرنا بھی اولیٰ ہے۔ (اصلاح الدین)

لجهنّم هل امتلأت وتقول هل من مزید(ق ۳۰) اس دن ہم جہنم سے کہیں گے۔کیا تو بھر گیا۔وہ کہے گا۔کیااور ہے۔

بہرحال جنت کی وسعتیں زیادہ ہیں۔اللہ تعالیٰ نے فرمایاو سارعوا إلیٰ مغفرة من ربّکم وجنّة عرضها کعرض السمٰوات والأرض اعدت للمتقین(آل عمران ۲۳۳) اوراللہ کی بخشش اوراس جنت کی طرف تیزی سے آؤ۔جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کی وسعت جیسی ہے۔وہ اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے بنائی گئی ہے۔

<u>کائنات کی وسعت پر سائنسدانوں کا اعتراف</u>: زمین اورآسمانوں کے عرض کا پتہ کوئی نہیں چلاسکتا۔تو اس کا طول کب معلوم کیا جاسکتا ہے۔سائنس دان کہتے ہیں کہ بعض ستارے ایسے ہیں جن کی روشنی یوم تخلیق سے لےکراب تک زمین پر نہیں پہنچی۔حالانکہ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے روشنی سفر کرتی ہے۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہماری یہ کائنات کتنی وسیع ہے۔جبکہ اس میں موجود ستاروں کی تعداد سمندروں کے کنارے ریت سے بھی زیادہ ہے۔اور سب کے سب ان سائنس دانوں کے نزدیک پہلے آسمان کے نیچے ہیں۔ہماری یہ وسیع زمین اس کائنات کا ایک حقیر سیارہ ہے۔خلائی جہازوں سے اس کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔تو یہ بہت معمولی سی مخلوق دکھائی دیتی ہے۔اور سورج سے نسبت لی جائے تو ایک بڑے تنور کے اندر ایک تنکے کی نسبت بھی نہیں بنتی۔پھر کائنات میں فرشتے ہیں۔جن کے بارے میں قرآن کاارشاد ہے کہ وما یعلم جنود ربک الا هو(مدثر ۳۱)اور تیرے رب کے لشکروں کاعلم صرف تیرے رب کے پاس ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ایک روایت ہے کہ عرش کے نیچے ۱۰۰ سوقنادیل معلق ہیں۔اورآسمان وزمین اوراس کے اندرسب کچھ ایک فانوس میں سمائے ہیں۔باقی ننانوے قنادیل کی تو ہمیں کوئی خبر نہیں۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جنت کتنی وسیع ہوگی۔فیقال له تمّن الخ یعنی اس سے کہا جائے گا کہ اپنی تمنا اور خواہش کو ظاہر کردے۔تو جو بھی وہ چاہے گا۔جس کی خواہش بھی اس کے دل میں ابھرے گی اس کو بتایا جائے گا کہ تیری یہ خواہش تو پوری کردی گئی ہے۔

وعشرة اضعاف الدنیا اور پھر اس دنیا کا جس کا استحضار ابھی تم نے کیا۔اس سے دس

گنا جنت تجھے دی گئی۔یہ تضاعف یا تو باعتبار قیمت ہوگی۔یعنی جنت کی نعمتیں مقدار میں کم بھی ہوں۔لیکن قیمت کے لحاظ سے بہت بڑھ کر ہونگیں۔جیسے کہتے ہیں کہ موتی گھوڑے سے کئی گنا زیادہ ہے۔علامہ بیجوریؒ نے یہ توجیہ ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ مساحت کے اعتبار سے دس گنا وسیع جنت کا بھی احتمال ہے۔اور یہی راجح معلوم ہوتا ہے۔کیونکہ بات تنگی اور وسعت میں چل رہی ہے۔نیز خود متعدد روایات میں جنت کی وسعت مذکور ہے۔

فیقول أتسخربی ایک نسخہ میں **أتسخرنی** نون کے ساتھ بھی آیا ہے۔یہ شخص جو جہنم کی مار کھا چکا ہے۔اچانک یہ کرم اور مہربانی اس کے تصور سے بالاتر ہے۔اس لیے وہ کہتا ہے کہ کیا تم میرے سے تمسخر کرتے ہو حالانکہ تیرے ساتھ تمسخر لائق نہیں تیری عظیم ہستی سے ایسا تمسخر مستبعد ہے۔جبکہ تو تو بادشاہ ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب: یہاں یہ اشکال ہوتا ہے کہ تمسخر اللہ تعالیٰ کے حق میں متعذر ہے۔ نیز یہ تو آخرت اور جنت میں دخول کا موقع ہے۔لہٰذا یہ عذر بھی معقول نہیں کہ بندہ کو اللہ کی صفات کا علم نہیں ہوگا۔اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ یہ شخص غیر متوقع انعامات کے حصول اور رب کریم کے کرم سے اتنا خوش ہوگا کہ خوشی سے بدحواس ہو کر بے اختیار یہ جملہ بول پڑے گا۔اگر چہ تمسخر اس کا عقیدہ نہیں ہے۔جیسا کہ نبی کریم ﷺ ایک ایسے شخص کے بارے میں فرماتے ہیں جس نے لق ودق صحراء میں اپنی سواری اور اس پر موجود کھانا، پانی کھو دیا ہو۔تلاش بسیار کے بعد زندگی سے مایوس ہو چکا ہو۔پھر اچانک اپنی سواری کو پالیا ہو۔ تو وہ بدحواس ہو کر کہتا ہے **اللھم انت عبدی و انا ربک**(۱) اے اللہ تو میرا بندہ اور میں تیرا رب ہوں۔

(۱) مسلم کتاب التوبہ ج ۲ ص ۳۵۵ کتاب التوبۃ، واضح رہے کہ امام نوویؒ نے اس مقام پر دو اور جواب بھی ذکر کئے ہیں۔اول یہ کہ چونکہ یہ شخص اس موقع پر کچھ بدعہدیوں کا مرتکب ہو چکا ہوگا۔جیسا کہ بعض روایات میں ان کی تفصیل ہے۔لہٰذا وہ خیال کرے گا کہ میں جنت کا اہل نہیں ہو۔پھر تضاعف مذکور کا اہل کیونکر ہوں گا۔یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے میری وعدہ شکنیوں کی سزا کے طور پر محض اطماع ہے۔اور خلاف واقع لالچ دے کر سزا دی جارہی ہے۔جسے اس نے استہزاء سے تعبیر کردیا۔دوم یہ ہمزہ استفہام انکار کے لیے ہو۔تو معنی یہ ہوگا کہ تم تو یقیناً استہزاء نہیں کررہے۔لیکن بندہ کی نااہلیت اور انعام کی عظمت قابل تعجب اور تمسخر سے مشابہ ہے۔

ملاعلی قاریؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس جملے سے اس شخص کا مخاطب کوئی فرشتہ ہو۔اس تقدیر وانت الملک بفتح لام ہونا چاہیے۔لیکن روایت ملک بکسر اللام کی ہے۔(اصلاح الدین)

فلقد رأیت رسول اللّٰہ ﷺ ضحک لام یہاں بھی موطئہ للقسم ہے۔یعنی خدا کی قسم میں نے نبی کریم ﷺ کوزور سے ہنستے ہوئے دیکھا۔آپ ﷺ کی یہ ہنسی یا تو بندے کی کوتاہ اندیشی سے تعجب کی بنا پر ہے کہ جہنم اور جنت کو دیکھ کر بھی اس کے عقل میں قدرت الٰہی کی بے پایانی کما حقہ نہ سموسکی۔یا پھر بندے کی تواضع اور بدحواسی پر آپ ﷺ کو تعجب ہوا۔یا پھر رب کریم کی رضا اور غلبہ رحمت سے آپ ﷺ خوش ہوکر ہنسے۔

(۸) حدّثنا قتیبة بن سعیدأنبانا أبو الأحوص عن أبی إسحاق عن علیّ بن ربیعة قال شهدت علیًّاؓ اتی بدابة لیرکبها فلمّا وضع رجله فی الرکاب قال بسم اللّٰه فلما استوی علی ظهرها قال الحمد للّٰه ثمّ قال سبحان الّذی سخّر لنا هذا وما کنّا له مقرنین وإنّا إلی ربّنا لمنقلبون ثمّ قال الحمد للّٰه ثلاثا واللّٰه اکبر ثلاثا سبحانک إنّی ظلمت نفسی فاغفر لی فانّه لا یغفر الذنوب إلّا انت ثم ضحک فقلت له من أیّ شئی ضحکت یاامیر المؤمنین قال رأیت رسول اللّٰه ﷺ صنع کما صنعت ثمّ ضحک فقلت من ایّ شئی ضحکت یارسول اللّٰه ﷺ قال إنّ ربّک لیعجب من عبده إذا قال ربّ إغفرلی ذنوبی یعلم إنّه لا یغفر الذنوب احد غیری(۱).

ترجمہ: علی بن ربیعہؒ کہتے ہیں کہ میں حضرت علیؓ کے پاس آیا۔(اسی اثنامیں) ان کے پاس ایک جانور (گھوڑا یا خچر) سواری کے لیے لایا گیا۔جب آپ نے اپنا پاؤں رکاب میں رکھا تو بسم اللّٰہ پڑھی پھر جب پوری طرح سواری کی پیٹھ پر بیٹھ گئے۔تو

---

(۱)سنن ابی داؤد ۱/۳۴۲ کتاب الجهاد باب مایقول الرجل اذارکب، جامع ترمذی ۲/۶۵۷ کتاب الدعوات باب مایقول إذا رکب الناقة، السنن الکبریٰ للبیهقی ۵/۲۵۲، مسندابی داؤد الطیالسی ص ۱۳۲ (مختار)

الحمدللّٰہ کہاپھر یہ دعاپڑھی ''سبحان الّذی سخّر الخ'' ترجمہ: پاک ہے وہ ذات جس نے اس سواری کو ہمارے لیے مسخر کردیا ہے اور ہم (تو) اس کو مطیع بنانے والے نہیں (ہوسکتے) تھے۔اور بے شک ہم اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔اس کے بعد تین مرتبہ الحمدللہ کہا اور تین مرتبہ اللہ اکبر کہا۔ پھر یہ دعا کی ''سبحانک إنّی ظلمت نفسی الخ'' ترجمہ: پاک ہے تو بیشک میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے۔پس اے اللہ میری مغفرت فرما کیونکہ آپ کے سوا کوئی بھی گناہوں کی مغفرت نہیں کرتا۔اس دعا کے بعد حضرت علیؓ ہنسے۔ میں نے عرض کیا۔ اے امیرالمؤمنین آپ کیوں ہنسے۔انہوں نے کہا کہ میں نے نبی کریمﷺ کو دیکھا تھا کہ آپ نے میرے جیسا قول وعمل کیا اور پھر ہنسے۔ میں نے عرض کیا آپ کیوں ہنسے۔تو انہوں نے فرمایا کہ بیشک اللہ تعالیٰ بندے کے اس قول پر کہ ''اے میرے رب میرے گناہوں کو بخش دے'' بہت خوش ہوتا ہے۔حالانکہ وہ جانتا ہے کہ میرے سوا کوئی بھی گناہوں کو معاف نہیں کرسکتا۔

اُتی بدابۃ دابۃ کل ما یدبّ علی الارض یعنی زمین کے اوپر حرکت کرنے والے ہر جاندار کا نام ہے جیسا کہ ''ومامن دابۃ فی الأرض إلّا علی اللّٰہ رزقھا'' میں مستعمل ہے لیکن عرفاً یہ گھوڑے، خچر اور گدھے پر بولا جاتا ہے(۱)۔

قال بسم اللّٰہ الخ حضرت علیؓ کا یہ عمل نبی کریمﷺ کے عمل پر مبنی ہے۔اور نبی کریمﷺ نے شاید نوحؑ کے عمل کو اپنے عمل کا مبنی علیہ بنایا ہے۔انہوں نے بھی کشتی میں سوار ہونے کے بعد اس قسم کی دعائیں پڑھی تھیں۔وما کنا لہ مقرنین یعنی ہم میں یہ قدرت کہاں کہ ہم اپنی طاقت سے اسے قابو کردیں۔اگر ایک گھوڑا سرکش ہوجائے۔تو لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو عاجز کردے ایک بے قابو اونٹ مسخر کرنا کئی آدمیوں کے لیے مشکل ہے۔مگر اونٹوں کی ایک لمبی قطار کو ایک چھوٹا بچہ ایک رسی سے قابو کررہا

(۱) ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے ثم خصّھا العرف العام بذوات الاربع (جمع الوسائل ۲/۲۵)(مختار)

ہے۔وہ آگے جاتا ہے اور بہت سے اونٹ اپنے ساتھ کھینچتا جاتا ہے۔تو اس مٹھی بھر حیثیت والے ضعیف البنیان انسان کی اتنی طاقت کہاں کہ اتنے جانوروں کو مسخر کر سکے۔ بلکہ آگے جاکر اجرام عالم کو تابع بنادے۔دریا چیرے، پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کرے، ستاروں پر کمند ڈالے، لوہا اڑائے اور خلاؤں پر حکمرانی کرے، تو بہر حال یہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت ہے۔جس کی وجہ سے یہ سب کام انسان کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کائنات کی چیزوں سے استفادے کی اجازت بلکہ ترغیب دیتا ہے۔ہاں اتنا ضرور حکم دیتا ہے کہ یہ سوچ لو کہ یہ طاقت کس کی دی ہوئی ہے۔کائنات کی جو چیز بھی مسخر ہو کر تیرے استعمال میں آئے۔اس کے ساتھ اتنا کہو کہ **سبحان الّذی سخّرلنا ھذا**۔

یوں اپنے کمالات کو خالق کی معرفت کا ذریعہ بنادو۔لیکن آج کے لوگوں نے سائنس کو معرفت الٰہی کا ذریعہ بنانے کے بجائے رب سے دوری کا ذریعہ بنادیا ہے۔وہ چاند پر گئے تو کہنے لگے کہ ہمیں تو وہاں خدا نظر نہیں آیا۔حق یہ ہے کہ جو یہاں اندھا ہو وہ چاند پر بھی اندھا ہے۔ بلکہ **فھو فی الآخرۃ اعمٰی** کے مصداق قیامت کے روز بھی اندھا ہے۔جبکہ بعض لوگ تو ایسے بھی ہیں جو چاند پر گئے تو ایمان لے آئے۔کہنے لگے ہم نے وہاں اذان کی آواز سنی۔ایک کا بیان ہے کہ عالم اتنا عجیب تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور خالقیت کے خود بخود قائل ہو گئے۔اور اسلام کی حقانیت دل میں سما گئی۔

بہر حال یہی اصل مقصد ہے کہ انسان تسخیر کائنات کے وقت یہ سوچ لے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے مسخر کردیا ہے۔کیونکہ یہ قوت نظری اور تحلیل وترکیب عناصر کا علم اگر انسان کو حاصل نہ ہوتا تو انسان کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔یہ تو انسان ہی ہے جو علم کے سبب ترقی کرتا جاتا ہے ورنہ گدھا وہی گدھا ہے۔کہیں کچا سا کمرہ بھی اپنے لئے نہ بنا سکا۔شیر وہی شیر ہے۔انسان بھی وہی حیوان ہے جو تھا۔لیکن اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی صلاحیتوں نے اسے اشرف المخلوقات بنادیا۔اور روز نئی نئی چیزوں سے کام لیتا جاتا ہے۔

وانّا إلیٰ ربّنا الخ مبدا کے بعد معاد کا ذکر ہے۔اور اس پر تنبیہ ہے کہ دنیا میں تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت کا استعمال ہے اور پھر واپس اسی کے پاس جانا ہے۔اس استمتاع کی ایک حد بھی ہے۔یہ سفر آخری نہیں بلکہ ایک اور سفر بھی ہے۔خدا کی طرف، آخرت کو رجوع کا سفر، یہ دعا سفر میں ابتداء کرتے وقت

بھی مسنون ہے۔ظلمت نفسی الخ حضرت علیؓ بھی فرماتے تھے کہ میں نے بھی ظلم کیا ہے کیونکہ کون ہے جو نعمتوں کا حق ادا کر سکے۔انسان کو اتنی عجیب نعمتیں اور منافع دیئے گئے ہیں جس کا شکر یہ ادا کرنا ناممکن ہے۔اسی وجہ سے فرمایاانی ظلمت نفسی.قال رأیت الخ یعنی میں نے اس عمل میں نبی کریم ﷺ کا اتباع کیا ہے جنہیں میں نے ایسا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔اور صحابہ کرام تو اتباع سنت میں قول وعمل کا اہتمام کے ساتھ پیروی کرتے تھے۔ بہر حال حضرت علیؓ نے فرمایا کہ بالکل اس طرح نبی کریم ﷺ بھی ہنسے تھے اور میں نے بھی ان سے پوچھا تھا کہ وہ کیوں ہنسے۔تو انہوں نے فرمایاانّ ربّک لیعجب من عبدہ اذاقال الخ یعنی اللہ تعالیٰ بندے کی اس بات سے بہت خوش ہوتا ہے کہ وہ رب سے مغفرت مانگے۔اور وہ اس لیے کہ بندہ مغفرت مانگتے ہوئے یہ اقرار کرتا ہے کہ گناہوں کا بخشنے والا فقط اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں سے باخبر بھی ہے۔یہ بات اسے خوش کر دیتی ہے گویا نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ رب العالمین میرے استغفار سے خوش ہوا۔اس لئے میں ہنسا۔حضرت علیؓ کے بیان کے مطابق حضرت علیؓ بھی اسی وجہ سے ہنسے۔اور ان سے روایت کرنے والے دوسرے راوی بھی اس موقع پر اسی طرح ہنس دیئے۔

علم انّہ لا یغفر الذنوب الخ یہ جملہ قال کی ضمیر فاعل سے حال واقع ہوا ہے۔اور معنی یہ ہے کہ بندہ مغفرت طلب کرتا ہے لیکن غفلت جہالت اور بے یقینی کے ساتھ نہیں بلکہ ''عالماإنّہ لایغفر الخ'' یعنی اس یقین کے ساتھ طلب مغفرت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معاف کرنے والا نہیں ہے۔

اور ممکن ہے کہ یہ جملہ یعجب ضمیر فاعل سے حال ہو۔اور معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی مغفرت سے خوش ہوتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ مغفرت کرنے والا میں ہی ہوں۔میرا بندہ اور کس کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔

یا پھر قائلاً کی تقدیر کے ساتھ یہ یعجب کی ضمیر سے حال ہوگا۔تقدیر یوں ہوگی کہ یعجب ربّک قائلاً ''إنّہ یعلم عبدی أنّہ لا یغفر الذنوب غیری '' یعنی اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے یہ کہتے ہوئے کہ میرا موحد بندہ جانتا ہے کہ میرے سوا کوئی بخشش کرنے والا نہیں۔اس لئے اس کو میں بخش دیتا ہوں۔

تنبیہ: یہ حدیث مسلسل بالضحک کہلاتی ہے مجھے اس کی سند ضحک کے ساتھ مولانا قاری محمد طیبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے واسطے سے ملی ہے۔اوران کوسند مولانا سہارنپوریؒ سے ملی تھی۔مسلسلات کی اور بھی مثالیں ہیں۔مثلاً مسلسل بالماء و التمر وغیرہ۔بہرحال یہاں پر یہ سلسلہ حضرت علیؓ سے شروع ہوا۔پھران کے شاگرد یکے بعد دیگرے یہ حدیث بیان کرتے ہوئے ہنستے ہیں۔

(۹) حدّثنا محمّد بن بشار أنبانا محمّد بن عبداللّٰہ الأنصاری ثنا إبن عون عن محمّدبن محمّد بن الأسود عن عامر بن سعد قال قال سعد لقد رأیت رسول اللّٰہ ﷺ ضحک یوم الخندق حتیٰ بدت نواجذہ قال قلت کیف کان قال کان رجل معہ ترس و کان سعد رامیاو کان یقول کذا و کذابالترس یغطیّ جبھتہ فنزع لہ سعد بسھم فلمّا رفع راسہ رماہ فلم یخطئی ھذہ منہ یعنی جبھتہ و انقلب و شال برجلہ فضحک رسول اللّٰہ ﷺ حتی بدت نواجذہ قال قلت من ایّ شئی ضحک قال من فعلہ بالرّجل(۱)۔

ترجمہ: عامر بن سعدؒ کہتے ہیں کہ میرے والد سعد بن ابی وقاصؓ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ غزوۂ خندق کے موقع پرزور سے ہنسے تھے۔میں نے پوچھا کہ کس بات پر ہنسے تھے۔انہوں نے کہاایک(کافر) آدمی کے پاس ڈھال تھی اورسعدؓ مشہور تیر انداز تھے۔لیکن کافر ڈھال کو ادھر ادھر کرکے خود کو(ان کی تیروں سے)بچاتا تھا حضرت سعدؓ نے ایک مرتبہ تیر نکالا۔پس جونہی اس(کافر) نے (ڈھال سے) سر اٹھایا۔حضرت سعدؓ نے تیرمارا۔تو اس کی پیشانی تیر سے بچ نہ سکی۔وہ شخص الٹا ہوگیا۔پاؤں اوپرکواٹھایا(یہ دیکھ کر) نبی کریم ﷺ (اتنے زور سے) ہنسے کہ آپ ﷺ کے دانت مبارک ظاہرہوگئے۔راوی کہتے ہیں میں نے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کس بات سے ہنسے تھےانہوں نے کہا کہ حضرت سعدؓ کااس کافرکا کام تمام کرنے سے۔

---

(۱)مسند احمد ۱/۱۸۶(مختار)

ضحک یوم الخندق حتی بدت نواجذہ یعنی غزوہ خندق کے موقع پر آپ ﷺ بہت زور سے ہنسے تھے۔قال قلت کیف کان قال کے قائل یا محمد بن محمد ہیں۔جو عامر بن سعدؓ سے پوچھ رہے ہیں۔یا پھر عامر اپنے والد سعدؓ سے پوچھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کیوں ہنسے تھے۔یوں قال کے قائل عامرؒ ہونگے۔وکان سعدر امیاً اگر سائل محمد بن محمدؒ ہو پھر تو معنی ظاہر ہے۔صرف اتنا کیا ہے کہ عامر نے ’’کان ابی‘‘ کی بجائے ’’کان سعد‘‘ کہا ہے۔اور اگر سائل عامر اور جواب دینے والا سعدؓ ہو تو حضرت سعدؓ نے ’’کنت رامیا‘‘ کی بجائے اظہار کی بجائے اضمار کر کے اپنا نام لیا ہے۔یا حضرت عامر نے یہ تبدیلی کر کے روایت بالمعنی کی ہوگی۔بہر حال سند حدیث میں اس قسم کے تصرفات بکثرت موجود ہیں۔مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ کافر اپنی دفاع کرتے ہوئے مسلمانوں کی نگرانی کرتا رہا۔دوسری طرف مشہور تیر انداز حضرت سعدؓ اس تاک میں تھے کہ کس طرح موقعہ ملے تو اس کا کام تمام کردے اور اسے جہنم رسید کر۔یقول کذا وکذا بالترس بظاہر یہاں یقول کا معنی یفعل کیا جاتا ہے۔وہ ڈھال کے ذریعہ یوں یوں کرتا ہے یعنی ڈھال کو دائیں بائیں اوپر نیچے ہلا کر حضرت سعدؓ کی تیروں سے بچتا رہا۔کوئی تیر آتا تو سر اور پیشانی کو ڈھال سے چھپا دیتا تھا۔قول کا استعمال فعل کے معنی میں بکثرت موجود ہے۔

لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ قول اپنے معنی میں ہو۔اور مراد یہ ہو کہ وہ کافر نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کے حق میں یوں یوں کہتا تھا یعنی گالیاں بکتا تھا۔حضرت سعدؓ نے اس کے قبیح کلام کو کنایۃ ذکر کیا اور ’’بالترس‘‘ بعد کے ’’یغطی‘‘ کے ساتھ متعلق ہوگا یعنی ’’وہ شخص ڈھال سے اپنی پیشانی کو چھپا دیتا تھا۔فنزع لہ سعد بسھم حضرت سعدؓ نے شست لگائی جونہی اس نے ڈھال سر کا یا پیشانی تھوڑی سی ظاہر ہوئی حضرت سعدؓ نے تیر چھوڑا۔فلم یخطئی ھذہ منہ ’’ھذہ‘‘ سے اشارہ پیشانی کو ہے جیسے کہ خود روای اس کی تفسیر کرتے ہیں۔تو معنی یہ ہوا کہ پیشانی تیر سے خطا نہ ہوئی یہاں لفظ میں قلب ہوا ہے معنی یہ ہے کہ تیر پیشانی سے خطا نہ ہوا۔نشانے پر لگا کافر گرا، پاؤں اٹھا برہنہ ہو گیا اور مر گیا۔

دوسری طرف نبی کریم ﷺ تماشہ دیکھ رہے تھے۔کافر کی عیاری وچالاکی کے مقابلے میں حضرت سعدؓ کی بیداری اور کامیابی سے آپ ﷺ خوش ہو کر زور سے ہنسے۔

شال بـرجله شول دراصل دم اٹھانے کو کہتے ہیں"شال الفرس بذنبه "یعنی گھوڑے نے بھاگتے ہوئے دم اٹھادیا۔یہاں پر پاؤں کے لیے یہ لفظ استعارۃ مستعمل ہے۔

من ایّ شئی ضحک اس سوال کا مقصد یہ ہے کہ یہاں پر کئی احتمال ہے۔کافر کی موت و بدحالی اور ذلت اس کی عورت کا ظاہر ہونا،اس کے سر کا نیچے اور پاؤں کا اوپر ہونا۔اور حضرت سعدؓ کی مہارت اور تیراندازی میں اصابت۔تو آپ ﷺ ان میں سے کس بات پر ہنسے تھے ظاہر ہے کہ سائل کو یہ بات مستبعد لگی ہے کہ نبی کریم ﷺ کسی کی شرمگاہ ظاہر ہونے کی وجہ سے ہنسے تھے۔چنانچہ پوچھ لیامن فعله بالرجل جواب کا حاصل یہ ہے کہ آپ ﷺ حضرت سعدؓ کی حذاقت اور تیراندازی میں مہارت سے ہنسے تھے کہ اس نے کافر کے ساتھ عجیب معاملہ کیا۔جیسے آج کل کھیلوں میں دیکھا جاتا ہے کہ کوئی کھلاڑی جو ایک گیند بھی صحیح پھینک دیتا ہے تو سارا مجمع اور تماشبین ایک شور برپا کر کے اس کی مہارت کی داد دیتے ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔مزید یہ کہ ایک مسلمان کی کامیابی اور کفر کی شکست بھی خوشی کا باعث تھی۔بہر حال آپ ﷺ کشف عورت یا کسی اور وجہ سے نہیں ہنسے تھے۔

خلاصہ باب

اس باب میں نبی کریم ﷺ کے ہنسی کی کیفیت اوراس کے محل کا بیان ہے۔مجموعی طور پر احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی ہنسی کا سبب یا تو رحمت خداوندی کا وفوراور بندے کی عاجزی و بے بسی جیسے کھری حقیقت ہے یا وہ خوشی اور مسرت ہے جو باطل کی شکست اور غلبۂ حق کی وجہ سے آپ ﷺ کو حاصل ہوئی۔ یا پھر حسن معاشرت اور صحابہ کی دلداری کی وجہ سے آپ ﷺ ہنسے ہیں۔ دنیوی مفرحات،لذائذ، مفادات اور عجائب آپ ﷺ کے وقار کو ہلا نہ سکتی تھی اور نہ مسرتوں سے بے قابو ہو کر بدمست لوگوں کی طرح آپ ﷺ قہقہے لگایا کرتے تھے۔ہنسی ہوتی تو محدود ہوتی اور وہ بھی اکثر و بیشتر تبسم کی صورت میں۔ہاں کبھی خوشی زیادہ ہوتی تو مسکراہٹ سے کچھ آگے بھی بڑھ جاتے تھے۔

بہرحال ہنسی آپ ﷺ کی ترجیحات میں سے نہیں ہے۔اسی لئے اکثر آپ ﷺ اس کی کثرت سے منع بھی فرماتے ہیں۔اوراوروں کو ہنسانے پر تو بری طرح نکیر بھی فرماتے ہیں۔

(اللّٰھمّ ارنا ضحک سنان الحبیب ﷺ یوم القیامة)

۳۶. باب ما جاء فی صفة مزاح رسول اللہ ﷺ
حضور اقدس ﷺ کے مزاح کرنے کا بیان

نبی کریم ﷺ کا مزاج بالکل خشک اور درشت نہ تھا۔ اس لیے آپ ﷺ خوش طبعی بھی فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کی خوش طبعی میں اس بات کی تعلیم بھی تھی کہ غم، فکر اور بوجھ کے باوجود انسان کو چاہیے کہ وہ کشادہ روئی کے ساتھ لوگوں سے تعلقات نبھائے۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ سے گپ شپ کے علاوہ مذاق بھی ثابت ہے جس میں ایذاء نہ تھی۔ صحابہ سے انبساط بھی فرماتے تھے اسی کو مزاح کہتے ہیں۔ اور عموماً ایسا مزاح ہنسی کا سبب بنتا ہے۔ لہٰذا پچھلے باب کے ساتھ مناسبت بھی ظاہر ہے۔

آج کل تو مزاح کو بے قید آزادی دی جا چکی ہے۔ ہر قسم کے گپ شپ بلکہ تمسخر کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ خصوصاً یکم اپریل کو تو اس میں بہت زیادہ ایذاء رسانی ہوتی ہے۔ مثلاً کسی کو فون پر بتایا جاتا ہے کہ تیرا بچہ جل گیا ہے، گھر گر گیا ہے یا باپ مر گیا ہے۔ اس بیچارے پر قیامت آجاتی ہے اور فون کرنے والے کی جھوٹ بولنے کی شکایت کی جائے تو وہ کہتا ہے کہ میں تو اپریل فول کر رہا تھا۔

<u>جائز مزاح کی شرائط:</u> لیکن اسلام میں ہر قسم کا مذاق اڑانا جائز نہیں۔ جس مزاح میں افراط ہو، کسی کی تذلیل و تحقیر ہو یا دوسری طرح کی ایذاء رسانی پر مشتمل ہو، اسلامی نقطۂ نگاہ سے وہ ناجائز ہے۔ اسی طرح اسلام میں مزاح پر مداومت اور اس کی کثرت کو بھی قبیح تصور کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس طرح ہر وقت ہنسنا پڑتا ہے اور کثرتِ ضحک سے مردہ دلی جنم لیتی ہے۔ نیز ضروری مقاصد مثلاً علم، عبادت اور ذکر میں مخل گپ شپ سے احتراز بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔ آج کل تو بعض بے لگام قسم کے واعظین ان شرائط کو ملحوظ نہیں رکھتے۔

بہر حال ان منہیات کی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ **لا تمار اخاک ولا تمازحه و لا تعدّه موعداً فتخلفهٗ**. یعنی اپنے مسلمان بھائی سے جھگڑا نہ کرو۔ نہ اس کا مذاق اُڑاؤ اور نہ اس کے ساتھ ایسا وعدہ کرو جس کو تم پورا نہ کر سکو۔

حضرت سفیان بن عیینہؒ سے کسی نے کہا کہ مزاح تو قابل گرفت عمل ہے۔ آپؒ نے کہا **بل سنة**

ولکن لمن یحسنه ویضعه مواضعه. نہیں مزاح سنت ہے لیکن ان لوگوں کے لیے جو اسے اچھے طریقے سے کرسکیں اور اپنے محل میں نبھا سکیں۔

چنانچہ اسلام میں حدود کے اندر گپ شپ لگانا جائز ہے جسے مزاح لطیف کہتے ہیں۔ نبی کریمﷺ سے خود مزاح ثابت ہے۔ لیکن ایسا مزاح ثابت نہیں جو وقار اور تمکنت کے خلاف ہو۔ جو مزاح کیا ہے وہ کم ہونے کے ساتھ ساتھ بے لاگ حقائق اور حکمتوں سے بھرپور ہے جو محض بظاہر مزاح دکھائی دیتا ہے۔

عرفاً مزاح وہ ہوتا ہے جس کا مفہوم کھوکھلا اور بے حقیقت ہو لیکن آپﷺ کا مزاح اس نوعیت کا نہ تھا بلکہ آپﷺ کے بقول "انی لااقول الاحقا" آپﷺ نے اگر گپ لگائی ہے تو درست اور نفس الامری بات میں لگائی ہے(۱)۔

(۱) حدثنا محمود بن غیلان أنبانا أبو أسامة عن شریک عن عاصم الأحول عن أنس بن مالک قال أنّ النبیّﷺ قال له یاذا الأذنین قال محمود قال أبو أسامة یعنی یمازحه(۲).

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریمﷺ نے اسے مخاطب کر کے فرمایا "یاذا الأذنین" (اے دو کانوں والے) محمود بن غیلانؒ کہتے ہیں کہ ابو اسامہؓ نے کہا کہ حضرت انسؓ کا مقصد یہ ہے کہ نبی کریمﷺ ان کے ساتھ مزاح کرتے تھے۔

---

(۱) علامہ عبدالجواد الرومیؒ نے رسول اللہﷺ کے مزاح کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے سئل بعض السلف عن مزاحهﷺ فقال کانت له المهابة العظمیٰ فلولم یمازح النّاس لماأطاقوا الاجتماع به والتلقی عنه(الاتحافات ۲۸۴) یہی وجہ تھی کہ آپﷺ تہجد کے بعد اپنے اہل خانہ سے کچھ دل لگی کی باتیں فرمایا کرتے تھے۔ امام غزالیؒ نے اس سلسلہ میں فرمایا ہے کہ آنحضرتﷺ کا تہجد کے بعد اہل خانہ سے باتیں کرنا اس لئے تھے تا کہ ان تجلیات کا اثر زائل ہو جائے جن کا تحمل عامۃ الناس نہیں کر سکتے تھے۔(تقریر ترمذی حضرت مدنیؒ ص۸۵۱) امام غزالیؒ کے اس قول سے اگرچہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتﷺ کا مزاح کرنا ضرورۃً تھا۔ اس لئے اس پر قیاس نہ کیا جائے۔ مگر جمہور فقہاء کرام کے ہاں مزاح کرنا ضرورۃً جائز ہے اگرچہ اس کو عادت بنانا درست نہیں (مختار)

(۲) سنن ابی داؤد ۳۳۵/۲ کتاب الادب باب ماجاء فی المزاح، جامع ترمذی ۲/ ۲۶۳ کتاب البرو الصلة باب ماجاء فی المزاح، شرح السنة للبغوی رقم حدیث ۳۶۰۶ (مختار)

ذالاذنین کا مطلب: یاذا الاذنین یعنی آپ ﷺ نے بطور دل لگی فرمایا ''یاذالأذنین'' اگرچہ ہر شخص کے دو کان ہوتے ہیں۔ لیکن آپ ﷺ کے اس مزاح میں مخاطب کا استیناس یعنی مخاطب پر چھا جانے والے رعب کو کم کرنا مقصود تھا۔ اور مانوس کرانا تھا۔ جس سے مزاح کا جواز بھی معلوم ہوتا ہے۔ اور ہوسکتا ہے کہ حضرت انسؓ کا سامعہ تیز ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ نے اسے ذوالاذنین کہا ہو۔ جیسا کہ علامہ بیجوریؒ کہتے ہیں کہ وصفه بذالک مدحاً له لذکاء ہ و فطنته۔ چنانچہ یہ کلام حسنِ استماع سے کنایہ ہوگا۔ جبکہ بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ حضرت انسؓ کانوں کے طول یا کوتاہی یا کسی دوسرے عیب کی وجہ سے ممتاز تھے۔ اس لیے ان کو اس نام سے پکارا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس تعبیر میں بھی بڑا درس ہے۔ اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ اے مخاطب اللہ تعالیٰ نے تجھے دو کان دیئے ہیں تاکہ تم حق سنو اور اس میں غفلت نہ برتو۔ تیرے دماغ کو دوراستے جاتے ہیں۔ تدبر اور تفہم کے بہترین اسباب دیئے گئے ہیں ان سے کام لو۔ اور سنی ہوئی بات کو سماع تدبر سے سن کر اس سے استفادے کے مواقع ضائع نہ کرو۔

(۲) حدّثنا هنّاد بن السريّ ثنا وكيع عن شعبة عن أبي التيّاح عن أنس ابن مالك قال ان كان النبيّ ﷺ ليخالطنا حتّى يقول لاخ لي صغير يـا أبـاعـمـيـر مـا فعل النّغير قال أبو عيسىٰ وفقه هذا الحديث أنّ النبيّ ﷺ كـان يـمـازح وفيه انّه كنّى غلاماً صغيراً فقال له يا أبا عمير وفيه انّ لا بـاس ان يعطى الصّبيّ الطّير ليلعب به وإنّما قال له النبيّ ﷺ ياأبا عمير مافعل النغير لأنّه كان له نغير فيلعب به فمات فحزن الغلام عليه فمازحه النبيّ ﷺ فقال ياأبا عمير ما فعل النغير(۱).

(۱)صحيح بخاری۲/۹۰۵ كتاب الادب باب الاستنباط إلى الناس وصحيح مسلم۲/۲۱۰ كتاب الادب باب ماجاء استحباب نخيل ولمولدعندولادته الخ، جامع ترمذی۱/۸۵ كتاب الصلوٰة باب ماجاء في الصلوٰة على السبط، سنن الكبرىٰ للنسائي كتاب عمل اليوم الليلة، سنن ابن ماجة۱/۲۷۲ كتاب الادب باب المزاح،(مختار)

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہم (چھوٹے بڑوں) سے میل جول رکھتے تھے۔حتیٰ کہ آپ ﷺ میرے ایک چھوٹے بھائی سے (بطور انبساط) فرماتے کہ ''اے ابوعمیر تیرے بلبل کو کیا ہو گیا''

مزاحی جملوں میں بھی حقائق کا سمندر: امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے مستنبط ہونے والے احکام یہ ہیں کہ نبی کریم ﷺ مزاح کیا کرتے تھے۔اس میں یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے چھوٹے بچے کو بھی کنیت سے پکارتے ہوئے''ابوعمیر'' کہا۔اس میں یہ بھی ہے کہ چھوٹے بچے کو کھیلنے کے لیے پرندہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔اور نبی کریم ﷺ نے اس بچے کو''یا أبا عمیر ما فعل النغیر ''اس لیے کہا کہ اس بچے کا ایک بلبل تھا جس سے وہ کھیلا کرتا تھا۔اس کی موت سے وہ بچہ بہت غمزدہ ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے دل لگی کرتے ہوئے کہا کہ ابوعمیر تیرا بلبل کہاں چلا گیا۔

حضرت ابوعمیر: أبو عمیرؓ یہ حضرت انسؓ کے اخیافی بھائی تھے۔ان کے والد حضرت ابوطلحہ زید بن سہل انصاریؓ ہیں۔علامہ ابن حجرؒ نے ان کا نام حفص بتایا ہے۔جبکہ علامہ بیجوریؒ نے کبشہ لکھا ہے۔کم سنی میں نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں وفات پائی۔ان کی وفات کے بعد ان کی والدہ ام سلیمؓ نے گھر والوں کو کہا کہ اس کے والد ابوطلحہؓ کو میرے سوا کوئی وفات کی خبر نہ دے۔چنانچہ شام کو جب ابوطلحہ نے بچے کے بارے میں پوچھا تو ام سلیمؓ نے بتایا کہ آرام سے ہے۔انہوں نے کھانا کھایا۔رات کو بیوی ام سلیمؓ کے ساتھ ہمبستری بھی کی تو صبح کے وقت ام سلیمؓ نے بتلا دیا کہ بچے کی وفات ہو چکی ہے۔لیکن ثواب کی نیت سے صبر کرنا۔نبی کریم ﷺ کو اس بات کا علم ہوا تو دعائیں دیں اور ابوعمیرؓ کے بدلے اللہ تعالیٰ نے عبداللہ بن ابی طلحہ کو پیدا کیا جس میں بڑی برکتیں عطا کی گئی تھیں۔

لیخالطنا یعنی نبی کریم ﷺ ہمارے ساتھ بے تکلف رہتے تھے۔گپ شپ میں شریک ہوتے تھے۔ابوعمیرؓ سے مزاح کا قصہ امام ترمذیؒ کے بیان کے مطابق یوں تھا کہ اس بچے نے ایک پرندہ پال رکھا تھا۔جو مر گیا تھا۔اس کی موت سے اسے دکھ ہوا تھا۔نبی کریم ﷺ نے اس کی خاطرداری کے لیے فرمایا''اے ابوعمیر تیری بلبل کو کیا ہو گیا ہے''یعنی کیا وہ تم سے روٹھ کر مر گیا ہے۔

نغیر چڑیا کی طرح کا ایک چھوٹا سا پرندہ ہے بعض نے چڑیا کے بچے ہی کو نغیر کہا ہے۔کچھ شراح

کہتے ہیں کہ یہ چھوٹے چونچ اور سرخ سروالا ایک چھوٹا سا پرندہ ہے جسے لال یا بلبل کہتے ہیں۔

قال أبو عیسیٰ الخ امام ترمذیؒ فقہ الحدیث کے عنوان سے اس حدیث کی باریکیاں بیان کرتے ہیں کہ اس مقام پر اس کم سن بچے کے ساتھ مزاح میں متعدد امور کو اشارہ ہے۔ مثلاً یہ کہ نبی کریم ﷺ بھی مزاح کیا کرتے تھے اور یہ کہ چھوٹے بچے کو کنیت سے پکارنا جائز ہے(۱)۔ نیز پرندوں کے ساتھ کھیلنا بچوں کا کام ہے۔ اور ان کے لیے جائز بھی ہے۔ بڑوں کو اس سے احتراز کرنا چاہیے۔

بعض مسائل مستنبطہ: بہرحال نبی کریم ﷺ کے جوامع الکلم کا اعجاز تھا کہ آپ ﷺ کے کلام کے لفظ لفظ میں دقائق موجود ہیں۔ بلکہ اس جملہ کے بارے میں بعض علماء کا خیال ہے کہ اس سے سو سے زائد مسائل کا استخراج کیا جاتا ہے(۲)۔ بعض فوائد کو حواشی میں بھی نقل کیا گیا ہے مثلاً

(۱) تکنیۃ الصغیر جائز ہے۔

(۲) چھوٹے بچوں کے لیے پرندوں کے ساتھ کھیلنا جائز ہے بشرطیکہ وہ اسے اذیت نہ دیں۔

(۳) مدینہ منورہ کے شکار کا حکم وہ نہیں جو حرم پاک کے شکار کا ہے یہی جمہور کا مذہب ہے۔

(۴) استفہام کے ادات استعلام کی بجائے دوسرے اغراض کے لیے بھی درست ہیں۔

(۵) تصغیر الاسماء جائز ہے۔

(۶) مسجع کلام کرنا ممنوع نہیں البتہ اس میں تکلف سے بچنا چاہیے۔

(۷) چھوٹے اور عمر رسیدہ لوگوں کی دلجوئی کے لیے ان سے دل لگی کرنا جائز ہے۔

اس طرح ضعفاء کی کمال رعایت کی ترغیب دی گئی ہے۔

---

(۱) یاد رہے کہ کنیت کے لئے حقیقت ضروری نہیں۔ کبھی کبھار تفاؤلاً بھی کنیت رکھی جاتی ہے۔ جیسے ابوالکلام، ابوالحسنات وغیرہ۔ ان دونوں مثالوں سے بالکل واضح ہے۔ اس لئے نہ کلام کا تو باپ ہوتا ہے اور نہ حسنات۔ چونکہ اب کا ایک معنی صاحب یعنی ساتھی کے بھی آتا ہے۔ اس لئے ابوالکلام سے مراد صاحب الکلام اور ابوالحسنات سے صاحب الحسنات مراد ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کی کنیت بھی اسی قبیل سے ہے۔ اس لئے کہ امام ابوحنیفہؒ کی کوئی بیٹی نہیں تھی یہ کنیت تفاؤلاً رکھی گئی تھی۔ تو یہاں پر بھی اس بچے کے لئے آنحضرت ﷺ نے تفاؤلاً کنیت استعمال کی۔ علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے وھو لابأس بہ لأن الکنیّۃ قد تکون للتفاول بانّہ یعیش ویصیر اباً لکونہ یولدلہ(المواھب اللدنیۃ ۱۵۱)(مختار)

(۲)قال البیجوریؒ افردھا(یعنی فوائد ھذاالبحث) ابن القاصؒ بجزء ۱۲ المواھب اللدنیۃ(مختار)

(۳) حدّثنا عباس بن محمّد الدوریّ قال أنا علیّ بن الحسن ابن شقیق أنا عبداللّٰہ بن المبارک عن أسامة بن زید من سعید المقبری عن أبی هریرة قال قالوا یا رسول اللّٰہﷺ إنک تداعبنا قال إنّی لا اقول إلّاحقا تداعبنا یعنی تمازحنا(۱).

ترجمہ: ابوھریرہؓ کہتے ہیں کہ صحابہؓ نے عرض کیا۔ یارسول اللہﷺ آپ تو ہمارے ساتھ مزاح کرتے ہیں۔ تو آپﷺ نے فرمایا۔ میں تو حق بات ہی کہتا ہوں۔ امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ ''تداعبنا'' سے مراد مزاح کرنا ہے۔

انک تداعبنا چونکہ نبی کریمﷺ نے کثرتِ مزاح سے صحابہ کو منع فرمایا تھا اس لیے ان کو یہ بات عجیب لگی کہ خود آپﷺ مزاح فرماتے ہیں۔ مگر نبی کریمﷺ نے جواباً یہ توجیہ پیش کردی کہ میں نے تو اس مزاح سے منع کیا ہے جس میں خلافِ حقیقت باتیں، دروغ گوئی، یا تمسخر ہو۔ جبکہ میں ایسی سچی باتوں سے دل لگی کرتا ہوں جس میں مذکورہ عیوب نہیں ہوتے۔ چنانچہ آپﷺ کا مزاح حق وراستی کا مظہر ہوتا تھا۔ اوراس میں سینکڑوں حکمتیں پنہاں ہوتی تھیں۔

تداعبنا یعنی تمازحنا مداعبه کسی کی دلجوئی کے لیے دل لگی کرنے اور ملیح اور میٹھے بول بولنے کو کہتے ہیں۔

(۴) حدّثنا قتیبة بن سعیدثنا خالد بن عبداللّٰہ عن حمید عن أنس ابن مالک إنّ رجلا استحمل رسول اللّٰہﷺ فقال إنّی حاملک علی ولدناقة فقال یارسول اللّٰہﷺ ما اصنع بولدالنّاقة فقال رسول اللّٰہﷺوهل تلدالابل إلاّالنوق(۲).

---

(۱)الادب المفردللبخاری۷۷ رقم الحدیث۲۶۵ باب المزاح، السنن الکبریٰ للبیهقی۱۰/۲۴۸، شرح السنة رقم الحدیث۳۶۰۲، مسنداحمد۲/۳۶۰(مختار)

(۲)سنن ابی داؤد۲/۳۳۴ کتاب الادب باب ماجاء فی المزاح، جامع الترمذی ۲/۲۶۳ کتاب البروالصلة باب ماجاء فی المزاح، السنن الکبریٰ ۱۰/۲۴۸(مختار)

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبی کریمﷺ سے سواری (کیلئے اونٹنی) طلب کی آپﷺ نے فرمایا کہ میں اونٹنی کا بچہ سواری کے لیے دے دیتا ہوں۔ اس شخص نے عرض کیا کہ میں اونٹنی کا بچہ لے کر کیا کروں گا۔تو آپﷺ نے فرمایا کہ اونٹوں کو اونٹیاں ہی جنتی ہیں۔

ان رجلاً استحمل استحمال "حملوہ" یعنی سواری طلب کرنے کو کہتے ہیں۔**ما اصنع بولدالخ** یہاں سائل کو یہ وہم لاحق ہوا ہے کہ نبی کریمﷺ اونٹنی کا چھوٹا بچہ دے رہے ہیں۔ حالانکہ اسے سوچنا چاہیے تھا کہ کہیں اس عام کے ضمن میں خاص وَلَد تو مراد نہیں ہے۔نبی کریمﷺ نے مذاق میں اسے تنبیہ کردی کہ کسی بات سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے قبل عقلمند آدمی کو اس پر سوچنا چاہیے۔ اور تمام پہلوؤں پر غوروفکر کرنے کے بعد اگر کوئی اشکال باقی رہے تو اس کی وضاحت کے پیچھے پڑنا چاہیے۔

(۵) حدّثنا إسحاق بن منصور ثنا عبدالرزاق ثنا معمر عن ثابت عن أنس بن مالک إنّ رجلا من أهل البادية كان إسمه زاهراً و كان يهدى إلى النبیّ ﷺ هديّة من البادية فيجهّزه النبیّ ﷺ إذا أرادان يخرج فقال النبیّ ﷺ إنّ زاهراً باديتنا و نحن حاضروه و كان رسول اللهﷺ يحبّه و كان رجلا دميما فاتاه النبیّ ﷺ يوماً وهو يبيع متاعه واحتضنه من خلفه ولا يبصره فقال من هذا أرسلنی فالتفت فعرف النبیّ ﷺ فجعل لا يالوما الصق ظهره بصدر النبیّ ﷺ حين عرفه فجعل النبیّ ﷺ يقول من يشتری هذا العبد فقال الرجل يا رسول اللهﷺ إذا والله تجدنی كاسداً فقال رسول اللهﷺ لكن عندالله لست بكاسدٍاو قال أنت عندالله غال(۱).

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ زاہر نامی ایک دیہاتی شخص تھا۔

---

(۱)شرح السنة للبغوی ۱۸۱/۱۳ کتاب الرقاق باب المزاح رقم الحدیث ۳۶۰۴، مصنف عبدالرزاق،مسنداحمد ۱۶۱/۳ (مختار)

وہ نبی کریم ﷺ کو دیہات کے ہدایا (سبزی، پھل اور شہد وغیرہ) لایا کرتے تھے۔ اور جب مدینہ سے واپس جانے کا ارادہ کرتے تو نبی کریم ﷺ کچھ (شہری چیزیں) عطیہ کر کے رخصت فرماتے تھے۔ (ایک بار) نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ زاہر ہمارا دیہات اور ہم اس کے شہر ہیں۔ نبی کریم ﷺ کو اس کے ساتھ محبت تھی۔ زاہر بدصورت بھی تھے۔ ایک دن نبی کریم ﷺ اس کے پاس اس حال میں آئے جب وہ اپنا (دیہاتی) سامان فروخت کر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے اسے پیچھے سے آ کر گود میں لیا۔ یوں کہ نبی کریم ﷺ کو دیکھ نہ سکے۔ حضرت زاہر بولے کون ہے؟ مجھے چھوڑ دے۔ پھر تھوڑا منہ پھیر کر دیکھا تو نبی کریم ﷺ کو پہچان لیا۔ پھر پہچان لینے کے بعد کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اپنی پیٹھ کو نبی کریم ﷺ کے سینے سے ملنے ملانے میں۔ پس نبی کریم ﷺ نے (اعلان کے انداز میں) کہا کون ہے جو اس غلام کو خرید لے۔ اس شخص نے کہا کہ یارسول اللہ ﷺ خدا کی قسم بیچتے ہوئے تم مجھے کم قیمت کا پاؤ گے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں تو تیری قیمت کم نہیں ہے۔ یا یوں فرمایا کہ تو اللہ تعالیٰ کے ہاں بیش قیمت ہے۔

حضرت زاہرؓ اور حضور اقدس ﷺ کی بے تکلفی: زاہر بن حرام الاشجعی حجاز کے دیہات میں رہنے والے تھے۔ ابن عبدالبرؒ نے استیعاب میں اسے بدری صحابی بتایا ہے۔ جبکہ دوسرے علماء ان کے بدری ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ دراصل بدوی کی تصحیف ہے۔ حضرت زاہرؓ نبی کریم ﷺ کے پاس آتے ہوئے کچھ نہ کچھ دیہاتی ہدیہ ضرور لاتے۔ اور آپ ﷺ بھی ان کو عطایا سے نوازتے تھے۔ اس لیے نبی کریم ﷺ انکو "بادية آل محمد" کے نام سے پکارتے تھے۔ عمر کے آخری حصہ میں کوفہ منتقل ہو گئے تھے۔

نبی کریم ﷺ کے ساتھ بے تکلفی کی وجہ سے دونوں طرف سے مزاح کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ اکثر دیہات کے ہدایا پیش کرتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی بازار میں کوئی چیز پسند آتی تو خرید کر نبی کریم ﷺ کی

خدمت میں پیش کردیتے تھے۔اور پھر جب بیچنے والا رقم کا تقاضا کرتا۔تو نبی کریم ﷺ سے کہہ دیتے کہ اس چیز کی قیمت دے دو۔آپ ﷺ فرماتے کہ تم نے تو مجھے ہدیہ دیا ہے۔تو کہہ دیتے کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔آپ ﷺ ہنس کر خود قیمت چکا دیتے تھے۔

بادیہ اور حاضرہ: ھدیۃ من البادیۃ دیہات کا ہدیہ عموماً معمولی ہوتا ہے۔اکثر اوقات میں پھل، پھول، سبزی، مرغی، شہد، انڈوں وغیرہ کی شکل میں ہوتا ہے۔فیجھزہ النبی ﷺ نبی کریم ﷺ بہت غیور اور سخی تھے(۱)۔اس لیے رخصت کرتے وقت شہر کی قیمتی چیزیں بطور عطیہ دے کر رخصت فرماتے۔ان زاھراً بادیتنا یہاں پر یا تو حرف تشبیہ محذوف ہے۔تقدیر یوں ہوگی "کبادیتنا" یعنی وہ ہمارے لیے دیہات کی طرح ہے یا مضاف مقدر ہوگا یعنی "ان زاھراً اھل بادیتنا" یا پھر تاء مبالغہ کے لئے ہے اور بادی بمعنی بدوی کو مبالغۃ بادیۃ کہہ دیا ہے۔جیسے راوی کو راویۃ کہا جاتا ہے۔

ونحن حاضروہ. یعنی زاہرؓ دیہات کی چیزیں ہمارے پاس لاتے ہیں اور ہم ان کی شہری ضروریات پوری کرتے ہیں۔رجلا دمیما دمیم دمامۃ سے صفۃ مشبہ ہے بدصورت کو کہتے ہیں یعنی آپؓ خوبصورت نہیں تھے۔پھر بھی نبی کریم ﷺ کو آپؓ کے اخلاص کی وجہ سے آپؓ سے محبت تھی۔

وھو یبیع متاعہ اس قصہ کو علامہ بیجوریؒ نے کچھ تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے وہ یوں کہ حضرت زاہر ایک بار بازار میں دو مشک لئے ہوئے کچھ فروخت کر رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ کا وہاں سے گزر ہوا۔آپ ﷺ نے آکر ایک مشک کھولنے کی فرمائش کی۔اور اس میں انگلی ڈبو کر اس (کے گھی یا شہد وغیرہ) کو دیکھ لیا۔اور زاہر سے کہا کہ اس کو پکڑلو۔پھر دوسر مشک کھلوا کر اسے دیکھا۔اور زاہر کے دوسرے ہاتھ میں تھما دیا۔اس کے بعد جب زاہر کا دھیان نہیں رہا۔آپ ﷺ چھپ کر پیچھے سے آئے۔اور اس کو گود میں لے کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا تا کہ زاہر کچھ دیکھ نہ سکے۔حضرت زاہرؓ نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر جب پتہ چلا کہ نبی کریم ﷺ نے ان کو پکڑ رکھا ہے۔تو مزید تقرب کی کوشش کرنے لگے۔اور اپنی پیٹھ کو نبی کریم ﷺ کے سینے کے ساتھ ملنے لگے۔اس سے آگے حدیث میں یہاں مذکور ہے۔ولا یالو الخ یعنی پہچان لینے کے بعد زاہر نے اپنی پیٹھ نبی کریم ﷺ کے سینے کے ساتھ ملنے میں کوئی کوتاہی نہ کی (اَلٰی یالو

(۱) کان النبی ﷺ یقبل الھدیۃ و یثیب علیھا (بخاری کتاب الھبۃ ۱/۳۵۲) (مختار)

ألواً کوتاہی کرنے کو کہتے ہیں) یہ اس لیے تا کہ اس قرب سے برکتیں حاصل ہوں۔ جو حسن اتفاق سے آج مل گیا ہے۔ نیز اس قربت میں جو لذت ہے وہ تا دیر قائم رہے۔ ما الصق ظهره ما مصدریہ ہے الصاق ظهر کے معنی میں ہے۔

من یشتری هذا العبد اگرچہ حضرت زاہرؓ غلام نہ تھے لیکن آپﷺ نے ازراہِ مزاح کہا کہ اس غلام کو کون خریدے گا۔ حضرت زاہرؓ گویا تو اس کی بدصورتی کی وجہ سے غلام کہا ہے یا اس کی قابلِ قدر خدمات کی وجہ سے خادم کی جگہ عبد کا لفظ استعمال کیا ہے یا عبد کا لفظ ان کا کاروبار دنیا میں محو ہونے اور غیر اللہ میں مشغولیت سے کنایہ ہے۔ اس طرح مزاح کے ساتھ ساتھ اس جملے میں حضرت زاہرؓ کو اس بات پر تنبیہ بھی ہے کہ وہ بازار میں سودا سلف میں یوں منہمک ہے جیسے کہ دنیا کا بندہ بنا ہوا ہے۔ حالانکہ میرے عشاق کو دنیا میں جی نہیں لگانا چاہیے۔ تا کہ اللہ تعالیٰ سے بُعد لازم نہ آئے۔

لکن عندالله لست بکاسد کسدا لشئی کھوٹا ہونے کو کہتے ہیں۔ اسی طرح کسی چیز کی بازار میں بے قدری اور قیمت میں کمی کو بھی کساد کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کا خیال ہے کہ میری قیمت نہیں لگے گی۔ میرا بیچنا خسارے کا ہوگا۔ تمہارے لیے یہ گھاٹے کا سودا ہوگا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسا نہیں ہے۔ بلکہ عنداللہ تم ایک قیمتی انسان ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ بندے کی صورت اور اس کے مال کو نہیں دیکھتے۔ بلکہ دل اور عمل اللہ تعالیٰ کے ہاں ملحوظ ہوتے ہیں۔ اس لیے گھاٹے کی سودا کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(٦) حدّثنا عبد بن حمیدثنا مصعب بن المقدام ثنا المبارک ابن فضالة عن الحسن قال اتت عجوز النبیّ ﷺ فقالت یا رسول اللهﷺ ادع الله ان ید خلنی الجنّة فقال یاامّ فلان إنّ الجنّة لا تدخلها عجوز قال فولّت تبکی فقال اخبروها إنّها لا تدخلها وهی عجوز إنّ الله تعالیٰ یقول إنّاانشأنا هن انشاءً فجعلنا هن ابکارًا(١).

ترجمہ: حضرت حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ ایک بوڑھی عورت نبی کریمﷺ کے پاس

(١) مصنف ابن ابی شیبۃ مجمع الزوائد ١٠/٣١٩ (مختار)

آئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں داخل فرمائیں۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے ام فلاں جنت میں بوڑھی عورتیں نہیں جائیں گی۔ راوی کہتے ہیں کہ وہ عورت روتی ہوئی لوٹنے لگیں۔تو آپ ﷺ نے (صحابہ سے)فرمایا کہ اس عورت کو بتادو کہ وہ بڑھاپے کی حالت میں جنت میں نہیں جائیگی کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں" ہم (جنت کی) ان عورتوں کوایک خاص طرح کی خلقت سے پیدا کریں گے۔پس ہم ان کو(ہمیشہ کے لیے) کنواری رہنے کی صفت سے پیدا کریں گے۔

الحسن البصری: یہ روایت حسن بصریؒ سے مرسل مروی ہے حضرت حسن بن ابی الحسن یسار بصریؒ اپنے زمانے کے امام اور تابعین کے سرخیل ہیں۔حضرت عمرؓ کی شہادت سے دو سال قبل ولادت ہوئی۔حضرت علیؓ کوخلافت کی سپردگی کے موقع پر آپؒ کی عمر چودہ برس تھی۔آپؒ نے حضرت علیؓ سے علوم سیکھے۔نیز حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت عائشہؓ کے علاوہ صحابہ کی ایک بڑی جماعت سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔انتہائی فصیح اور صاحب مناقب وکمالات تھے ان کے والد یسارؒ حضرت زید بن ثابتؓ کے غلام اور والدہ خیرہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کی باندی رہ چکی تھیں۔بچپن میں جب ان کی والدہ مصروف ہوتی تھی تو آپ کو ام المومنین ام سلمہؓ بہلاتی تھیں بلکہ روتے وقت آپؒ کے منہ میں اپنا پستان دے دیتی تھیں کہا جاتا ہے کہ اسی کی برکت سے آپؒ کو علوم ومعارف اور فصاحت میں بڑا مقام ملا تھا حتیٰ کہ آپ کا کلام انبیاء کے کلام کے مشابہ ہوتا تھا۔دنیوی مباحث آپ کی مجلس میں نہیں ہوتے تھے۔

صورت کے لحاظ سے بھی آپ بہت حسین تھے۔حجاج بن یوسف نے آپ کو قتل کرنے کی کوشش کی مگر ہر بار ناکام رہا۔ ۱۱۰ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔تمام لوگ جنازہ کے لیے نکلے۔حتیٰ کہ اسلامی تاریخ میں پہلی مرتبہ بصرہ کی جامع مسجد میں عصر کی نماز نہیں پڑھی گئی۔

انت عجوز الخ ایک قول کے مطابق یہ بڑھیا آپ ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہ تھیں۔

یـاام فـلان الـخ نبی کریم ﷺ نے بیٹے کی طرف نسبت کرکے ان کو پکارا۔اورقول مذکور کے

مطابق ''ام زبیر'' سے پکارا ہوگا۔مگر راوی سے نام بھول گیا۔اس لئے اس نے ذکر کرتے وقت ام فلاں کہہ دیا۔**فولت تبکی** نبی کریمﷺ کے مزاح کا مطلب نہ سمجھنے کے سبب وہ عورت منہ پھیر کر رونے لگیں۔ **فقال اخبروھا۔** نبی کریمﷺ نے اس بڑھیا کو تسلی دلوانے کا صحابہ کو حکم دیا کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں داخل کرائیں گے۔مگر بڑھاپے کی حالت میں نہیں۔ بلکہ جوان اور ہمیشہ کے لیے کنواری بنوا کر وہ جنت میں داخل فرمائیں گے۔اور ساتھ ساتھ وہ خاوند کی محبوب ان سے محبت کرنے والی اور ہم عمر بھی ہونگیں۔

خلاصۂ باب

نبی کریمﷺ کو اللہ تعالیٰ نے بہت رعب بخشا تھا خود فرماتے ہیں نصرت بالرعب مسیرة شهر یعنی ایک مہینے کے سفر کے فاصلے تک میرا رعب چھایا رہتا ہے۔

شمائل میں یہ حدیث بھی گزری ہے کہ"من رأه بداهةً هابهٗ "یعنی اچانک دیکھنے والے شخص پر آپﷺ کی ہیبت چھا جاتی تھی۔ایسی حالت میں ایک ہادی کے لیے لوگوں کو مانوس کرنا اوران کے اور دیگرلوگوں کے درمیاں حجاب کو زائل کرنا ضروری ہوتا ہے۔تاکہ فیض کا اکتساب ہوسکے اور ہدایت کا سلسلہ آگے بڑھے۔اوراسی لیے آپﷺ انبساط سے کام لیا کرتے تھے۔

خوش طبعی اور کشادہ روئی کوئی عیب نہیں۔بلکہ دینی مقاصد کے حصول کے لیے اور عوام کو دین کی طرف ترغیب دلانے کے لیے ضروری ہے اسی وجہ سے صحابہ کرامؓ اور ائمہ کرام میں بھی مزاح بکثرت پایا جاتا ہے حضرت علیؓ اس سلسلے میں مشہور تھے حضرت عبداللہ بن حذافہؓ سے بھی مزاح بکثرت منقول ہے حضرت سویبطؓ اور حضرت نعمانؓ کے ایک مزاحیہ قصہ کو یاد کر کے نبی کریمﷺ ایک سال تک ہنسا کرتے تھے۔امام شعبیؒ اورابن سیرینؒ بھی مزاح کیا کرتے تھے اس باب میں نبی کریمﷺ کا عمل مذکور ہے مگر آپﷺ کے مزاح کے واقعات صرف انہی واقعات میں منحصر نہیں ہے حضرت عائشہؓ سے ایک قولی روایت بھی مروی ہے وہ کہتی ہیں کہ"انه ﷺ كان يمزح و يقول إنّ اللّٰه تعالىٰ لا يؤخذ المزاح الصادق فی مزاحه"(بیجوری و مناوی) لیکن پھر بھی شریعت نے مزاح کو چند شروط سے مشروط کیا ہوا ہے جو یہ ہیں:

(۱) اسمیں افراط اور مداومۃ نہ ہو کیونکہ کثرتِ مزاح قساوت قلبی کا باعث بنتا ہے نیز ذکر الٰہی کے لیے رکاوٹ ہوتا ہے۔

(۲) کسی کی ایذاء پر مشتمل نہ ہو ورنہ ناجائز ہے۔

(۳) وقار وتمکنت کے خلاف نہ ہو۔

(۴) جھوٹ، بہتان اور غیبت وغیرہ ممنوعات ومحذورات شرعیہ سے خالی ہو۔

۳۷۔ باب ما جاء فی صفة کلام رسول اللّٰہ ﷺ فی الشعر
رسول اللّٰہ ﷺ کا شعر وشاعری سے تعلق کے بیان میں

اس سے قبل مطلق کلام اور اس کے متعلقات جیسے مذاق وغیرہ کا ذکر تھا۔اب شعروشاعری کے ساتھ آپ ﷺ کے تعلق کو بیان کیا جاتا ہے جو کہ کلام کی ایک قسم ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ آپ ﷺ نے شعر کہے ہیں یا نہیں۔اور دوسروں کے اشعار اپنے کلام میں مستعمل فرمائے ہیں یا نہیں۔

شعر کے معنی ہیں"**کلام مقفیٰ موزون قصداً**"یعنی وہ کلام جسے قصداً قافیہ اور وزن کا پابند کردیا گیا ہو۔قافیہ اس کلمہ کو کہتے ہیں جس پر شعر ختم ہو،اور وزن ان خاص بحور کا نام ہے۔جن کے مطابق اشعار کہے جاتے ہیں۔ہاں اس میں قصد واختیار کو دخل ہونا چاہیے۔لہٰذا اگر کسی شخص کی زبان سے بے اختیار کوئی موزوں اور مقفّی کلام نکلے تو نہ کلام شعر ہو گا نہ کہنے والا شاعر کہلانے کا مستحق ہوگا۔

حکمت الٰہی کی وجہ سے آپ ﷺ کا شعر وشاعری سے دور رہنا: نبی کریم ﷺ کا شاعر نہ ہونا قطعی دلائل سے ثابت ہے۔اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں اس کا فیصلہ کرتے ہوئے فرمایا ہے"**وما علّمناہ الشعر و ما ینبغی لہ**"یعنی نہ اس پیغمبر کو ہم نے شعر کی تعلیم دی ہے نہ شعر کہنا اسے زیب دیتا ہے۔

کیونکہ شعر میں عموماً مبالغہ آرائی،جھوٹ اور خلاف حقیقت باتیں آتی ہیں۔شعراء کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ **والشعراء یتبعھم الغاوون الم تر أنّھم فی کل وادٍ یھیمون (الشعراء)**

ترجمہ: اور شاعروں کی اتباع گمراہ لوگ ہی کرتے ہیں کیا تو نہیں دیکھتا کہ وہ کلام کی ہر صنف کی وادی میں متحیر ہو کر پھرتے ہیں۔(طبع آزمائی کرتے ہیں)

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے شعر سے دور رکھا۔علاوہ ازیں شعروشاعری اور کتابت امّیّة کی صفت کے منافی ہے۔اس لئے آپ ﷺ شاعر نہیں ہو سکتے تھے۔اب اگر نبی کریم ﷺ کے کلام میں کچھ ایسے جملے آئے ہیں جو شعر میں داخل ہیں تو وہ یا تو استشہاد اور اقتباس کے طور پر آئے ہیں یعنی آپ ﷺ نے کسی مقصد کے لیے دوسرے شعراء کا کلام نقل کیا ہے اور چونکہ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے بہت بلند ادبی ذوق بخشا تھا شعر کی باریکیوں،بلاغت اور حسن وقبح کو سمجھتے تھے۔اس لیے مضمون کے لحاظ سے اچھے اشعار کو

اپنے خطاب میں استعمال فرماتے تھے اور اگر کسی موقع پر خود نبی کریم ﷺ کی باتوں میں موزوں و مقفی کلام وارد ہوا ہے تو وہ شعر اور وزن کے قصد سے نہ تھا اور نہ ایسے جملے تو اتفاقی طور پر ہر شخص کی زبان و قلم سے تقریر و تحریر کے موقع پر نکلتے ہیں۔ جو وزن پر پورا اترتے ہیں لیکن قصد و ارادہ نہ ہونے کے سبب ہم اسے شاعر نہیں کہتے۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے کلام میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ آپ ﷺ کا شاعر نہ ہونا بوجہ عجز نہیں کیونکہ جب بلا قصد آپ ﷺ سے ایسے کلمات نکلتے ہیں جو وزن و قافیہ پر پورا اتریں تو اگر قصد و ارادہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید ہوتی تو پھر آپ ﷺ کے اشعار کی نظیر نہ ہوتی۔ لہٰذا آپ ﷺ کا شاعری سے دور رکھنا حکمتِ الٰہی کے سبب ہے۔ کہ یہ چیز پیغمبر ﷺ کے شایان شان نہیں۔

<u>شعر کا حسن مرتبہ اس کے مضمون پر منحصر ہے:</u> رہی یہ بات کہ شعر و شاعری کا شریعت میں ہمارے لیے کیا حکم ہے۔ اس کا اصل جواب یہ ہے کہ تقریباً ہر چیز میں حسن بھی ہوتا ہے۔ اور دوسری جہت سے قبح بھی ہوتی ہے اگر حسن کی جہت سے استعمال ہو تو وہ حَسن اور اچھا ہے لیکن قبح کی جہت سے یہی چیز بُری بھی ہو سکتی ہے تو شعر کے بارے میں بھی علماء کا فیصلہ وہی ہے کہ ''حَسَنه حسن و قبیحه قبیح (۱)'' جو اچھے اشعار ہیں۔ مثلاً جن سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، رسالت اور دین کا دفاع ہو وہ حسن ہے۔ یا پھر محض منظر کشی ہے، مبالغہ آرائی، جھوٹ اور فحاشی نہیں تو وہ اشعار بھی جائز ہیں۔ لیکن جو خرافات ہیں جیسے امرأالقیس یا متنبی کے بعض رومانی یا ہجو یہ کلام، تو وہ قبیح ہیں۔ اسی کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ

لان یمتلی جوف رجل قیحا یریه خیر من ان یمتلی شعراً (۲)

کسی آدمی کا دل پیپ سے بھر کر اس کا زہر اس کے دل کو فاسد کر کے کھا جائے یہ بہتر ہے اس سے کہ اس کا دل شعر سے بھر جائے۔

حضرت عمرؓ نے اس قسم کے بعض شعراء کو جلا وطن کر دیا تھا۔ گویا شعر ایک ہتھیار ہے جسے دشمن کی سرکوبی اور اپنے دفاع کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اور ایک بے گناہ پر ظلم کرنے کے لیے بھی

---

(۱) اور ایسا ہی علامہ عبدالجواد الدومیؒ نے حضرت عائشہؓ کے حوالہ سے کہا ہے کہ حضرت اقدس ﷺ سے شعر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ الشعر کلام حسنه حسن قبیحه قبیح (الاتحافات ص ۲۹۰) (مختار)

(۲) رواہ مسلم عن ابی ہریرةؓ و ابی سعید الخدریؓ ج ۲ ص ۲۴۸ (۱۲ مرتب)

استعمال کیا جا سکتا ہے۔حاصل یہ کہ شعر کے حسن وقبح کا فیصلہ کلام کے دوسرے اصناف کی طرح مضمون کے اعتبار سے ہوگا۔تو اس میں حرام،مکروہ،خلاف اولیٰ اور باعث اجر وثواب ہر قسم پایا جاتا ہے۔

<u>حضور اقدس ﷺ کی بعض شعراء کی قدر افزائی:</u> خود نبی کریم ﷺ نے بھی بعض شعراء کی تحسین فرمائی ہے۔حضرت حسان بن ثابتؓ کی آپ ﷺ بڑی قدر کرتے تھے بلکہ حکم دیتے تھے کہ اُھجھم۔یعنی کافروں کی ہجو کرو۔نیز فرمایا کہ جب تک تم رسول اللہ ﷺ کی جانب سے دفاع کرتے ہو اللہ تعالیٰ جبرئیلؑ کے ذریعے تیری تائید کرتا ہے۔نیز فرمایا کہ رزمیہ اشعار کافروں پر تیروں کی بارش سے بھی زیادہ سخت لگتے ہیں۔آپ ﷺ کے بہت سے صحابہؓ نے شعر کہے ہیں۔خلفائے راشدین سب کے سب شعر کہتے تھے(۱)۔ حضرت علیؓ تو ان سب میں بڑھے ہوئے ہیں۔حضرت تھانویؒ نے صحابہؓ کے اشعار ایک مستقل کتاب کی شکل میں جمع کئے ہیں۔جس کا نام کلام الملوک رکھا ہے۔اس کا نسخہ دیوان حماسہ اور دیوان متنبی کے قریب ہے۔ اور اس میں حضرت عائشہؓ کے بھی اشعار ہیں۔حضرت امام شافعیؒ کا اپنا مستقل دیوان ہے۔یہ شعر بھی انہی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ ؎

ولو الشعر بالعلماء یزری لکنت الیوم اشعر من لبیدؓ

ہمارے اکابر میں حضرت نانوتویؒ،حضرت شیخ الہندؒ،حضرت شاہ کشمیریؒ اور حضرت گنگوہیؒ سب کے اشعار اردو،فارسی اور عربی میں پائے جاتے ہیں۔

(۱) حدّثنا علیّ بن حجرثنا شریک عن المقدام بن شریح عن أبیہ عن عائشة قالت قیل لھا ھل کان النبیّ ﷺ یتمثّل بشیئی من الشعر قالت کان یتمثل بشعر ابن رواحة و یتمثّل ویقول و یاتیک بالاخبار من لم تزوّد(۲).

(۱)الاتحافات میں حضرت عمرؓ کا یہ مقولہ مذکور ہے کہ تعلموا الشعر فانّ فیہ محاسن تبتغی ومساوی تتقی(الاتحافات ص ۲۹۰)(مختار)

(۲)الادب المفرد للبخاری ۲۲۴ رقم الحدیث ۸۶۷، جامع ترمذی ۵۷۳/۲ کتاب الاستئذان والادب باب ماجاء فی انشاء الشعر، شرح السنة للبغوی ۳۷۳/۱۲ کتاب الاستیذان باب الشعر الرجز رقم الحدیث ۳۴۰۲(مختار)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے کسی نے پوچھا کہ کیا نبی کریم ﷺ کبھی کسی دوسرے شخص کے شعر کو بطور استشہاد پڑھتے تھے؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ (ہاں کبھی کبھی) ابن رواحہؓ کے شعر کو مثال میں پیش فرماتے تھے اور کبھی (شاعر کے) اس قول سے تمثل فرماتے۔''ویأتیک بالأخبار من لم تزوّد ''(یعنی کبھی وہ شخص تیرے پاس خبریں لائے گا۔ جسے تم نے کوئی راستے کا خرچ نہیں دیا ہوگا۔

__عبداللہ ابن رواحہؓ:__ عبداللہ بن رواحہ بن ثعلبہ انصاری خزرجی صحابی ہیں۔بیعت عقبہ میں شریک ہوئے۔اس کے بعد بدر اور غزوۂ موتہ تک کے تمام غزوات میں شرکت کی۔صلح حدیبیہ اور عمرۃ القضاء میں بھی شریک رہے۔جاہلیت میں بھی آپ کو سردار کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔اسلام میں آپ کا شماران عظیم شعراء میں ہوتا ہے جو کہ کافر شعراء کا مقابلہ اپنے اشعار سے کرتے تھے۔''والشعراء یتبعھم الغاوون '' سے آپ کی اور آپ کے دو ساتھیوں حضرت حسانؓ اور کعب بن مالکؓ کی استثناء کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی'إلاّ الذین آمنوا و عملوا الصالحت و ذکر واللّٰہ کثیراً الآیة'' جرأت اور دلیری میں بھی آپ بے مثال تھے۔جنگ میں سب سے پہلے جاتے تھے اور سب سے آخر میں لوٹتے تھے۔۸ھ میں شامیوں کے ساتھ لڑی جانے والی جنگ غزوۂ موتہ میں جعفر بن ابی طالبؓ اور زید بن حارثؓ کی شہادت کے بعد فوج کی قیادت سنبھالی اور درج ذیل اشعار پڑھے

یانفس ان لم تقتلی تموتی   ھذا حمام الموت قد صلیتِ

وماتمنیت فقدا عطیتِ   ان تفعلی فعلھما ھدیتِ

اے مری جان اگر تو قتل نہ کی جائے تو مرنا تو ہوگا ہی   یہ موت کی حمام ہے جس میں تو داخل ہو چکی ہے

مری جان تیری ہر تمنا پوری کی جا چکی ہے

اب اگر تو نے ان دونوں (جعفرؓ اور زیدؓ) جیسا کام کیا تب ہی تو ہدایت یافتہ ہوگی

پھر تلوار لے کر خوب لڑے۔درمیان میں تھوڑی دیر ستانے کے لیے گھوڑے سے اترے تو چچا زاد بھائی نے گوشت پیش کیا تا کہ کھا کر کچھ جان میں جان آئے۔گوشت کو منہ سے لگایا۔ادھر ایک جگہ لشکر

میں مڈبھیڑ نظر آئی پھر کہا ''تعجب ہے تو ابھی دنیا میں رہتا ہے'' یہ کہتے ہوئے گوشت پھینک کر دشمن میں گھس گئے اور لڑتے ہوئے شہادت سے سرفراز ہوئے۔

آپ فی البدیہہ شعر کہا کرتے تھے اور ایسے بہت سے واقعات ہیں جب نبی کریمﷺ کی فرمائش پر آپ نے بڑا قابل فخر کلام پیش کر دیا۔ ایک مرتبہ اپنی ایک باندی کے پاس بیوی سے چھپ کر آئے اور اس کے ساتھ مجامعت کی۔ بیوی نے ہمبستری کرتے دیکھ لیا تو فراغت کے بعد اس کو ملامت کرنے لگیں۔ آپؓ نے ہمبستری سے انکار کر دیا تاکہ بیوی ناراض نہ ہو۔ بیوی نے کہا کہ اگر تم سچے ہو تو قرآن کریم کی تلاوت کرو (کیونکہ جُنُبْ شخص کے لیے قرآن کی تلاوت کرنا جائز نہیں ہے) آپؓ نے فوراً یہ اشعار پڑھے۔

شهدت بان وعدالله حق	وإنّ النار مثوى الكافرينا
وإنّ العرش فوق الماء حق	وفوق العرش رب العالمينا
و تحملهٗ ملائكة غلاظٌ	ملائكة الاله مسوّمينا

چونکہ بیوی کو قرآنی آیات یاد نہیں تھیں اور مذکورہ اشعار قرآنی آیات ہی میں تھوڑی تغیر کر کے بنائے گئے تھے۔ لہٰذا بیوی کو تسلی ہوئی اور بولیں ''صدق الله و كذبت عيني'' اللہ تعالیٰ سچ فرماتے ہیں اور میری آنکھ ہی دھوکہ کھا چکی ہے۔ آپؓ کے مناقب بے شمار ہیں۔

تـمثّل بشیئ کسی کے کلام کو اپنے مقصد کے ثبوت اور شہادت کے طور پر پیش کرنے کو تمثل کہتے ہیں یعنی آپﷺ کسی مقصد کی وضاحت اور ثبوت کے لیے شعر کو بطور مثال پیش کرتے تھے۔

ويتمثّل ويقول یعنی عبداللہ بن رواحہؓ کے شعر کے علاوہ بھی آپﷺ بطور تمثل شعر نقل کرتے تھے۔ مثلاً اس شعر سے بھی تمثل کرتے تھے ''ويأتيك الخ''۔ بعض نسخوں میں ''ويتمثّل بقوله'' لکھا ہے اس میں بقولہ کا ضمیر عبداللہ بن رواحہؓ کو راجع نہیں ہے بلکہ مطلقاً شاعر کو راجع ہے۔ یعنی وہ دوسرے شاعر کے اس قول کو بھی استشہاداً پیش فرماتے تھے۔ اور یہ توجیہ اس لئے ضروری ہے کہ مذکورہ شعر عبداللہ بن رواحہؓ کا نہیں ہے بلکہ طرفہ بن عبد بکری جاہلی شاعر کا ہے جو اس کے معلقہ ہی سے ماخوذ ہے۔ اور حضرت عائشہؓ کو عرب کے جاہلی شعراء کے کلام کا بہترین علم حاصل تھا(۱)۔ اس لیے یہ بعید از امکان ہے کہ خانہ کعبہ میں لٹکے

(۱)عن عائشةؓ قالت رويتُ للبيد اثنى عشر الف بيت(الاستيعاب على هامش الاصابة ج۳ ص ۳۲۸)

ہوئے مشہور معلقہ کے اشعار کی نسبت عبداللہ بن رواحہؓ کی طرف کریں۔

ستُبدی لک الایام ما کنت جاھلاً　　　ویاتیک بالاخبار من لم تزوّد

یہ شعر طرفۃ بن العبد جاہلی شاعر کا ہے جس کا سبعہ معلقہ میں دوسرا قصیدہ ہے اور وفور معانی کی وجہ سے آپ ﷺ اس کو پڑھا کرتے تھے۔

زمانہ بڑا معلم ہے: اس شعر کے پہلے مصرع کا مقصد یہ ہے کہ زمانہ بڑا معلم ہے وہ اپنے تجربات سے تجھے وہ چیزیں بتادے گا جو تجھے معلوم نہ تھیں۔ انسان کے علم وتجربہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً آج تو وہ توحید کو نہیں مانتا آخرت اور رسول کی رسالت کا منکر ہے لیکن قبر میں اور آخرت میں بلکہ دنیا ہی میں ایک دن اس پر یہ ظاہر ہو جائے گا اور ان حقائق پر یقین ہو جائے گا۔ اس شعر میں اس حقیقت کو اشارہ کیا گیا ہے اور نبی کریم ﷺ بھی اسی مقصد کے لیے اس شعر کو پیش کرتے تھے۔

بغیر زادواجرۃ خبر رسانی:

دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ تجھے خبر دیں گے جن کو تم نے زادراہ نہیں دیا ہوگا۔ یہ فتنہ وفساد کا دور ہوگا۔ بغیر مطلب اور درخواست کے تیرے ہاں خبریں پہنچائی جائیں گی۔ جس طرح آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ذرائع ابلاغ مختلف قسم کی خبریں بغیر درخواست کے پہنچا کر پریشانی کا سبب بنتی ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی وژن، اخبار اور ٹیلی فون وغیرہ سب تجھے پریشان کرر ہے ہیں۔ آدھے فساد، شر اور ہنگامے اسی روز ختم ہو جائیں گے جب اعلان ہوگا کہ کل سے کوئی اخبار نہیں چھپے گا۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ نے لکھا ہے کہ ساری دنیا میں اگر اخبار بند ہو جائیں تو کافی امن ہو جائے گا۔ اور یہ بات ڈھکی چھپی نہیں پہلے تو مہینوں بعد کسی مصیبت کا علم ہوتا اور اس وقت تک یقین ہو چکا ہوتا کہ سب کچھ ٹل چکا ہے لیکن اب تو اعصابی نظام اس وجہ سے مختل ہو چکے ہیں کہ گھر میں پرائے غموں کے انبار پڑے ہوتے ہیں۔ بٹن دباتے ہی میڈیا آپ کو براہ راست خبریں دکھاتا ہے اور میڈیا میں فساد کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ دوسرے مصرع سے تمثیل کا مقصد یہ ہو کہ حضور نبی کریم ﷺ اپنے بارے میں وضاحت کرر ہے ہوں کہ دیکھو تمہارے پاس اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے مخبر صادق کو نبی بنا کر بھیجا ہے جسے تم کوئی بھی زادِراہ اجرت اور فیس وغیرہ نہیں دیتے۔ اور وہ عالم آخرت تک کی خبریں لاتے ہیں۔ دنیا کی

فلاح ونجات اور عروج وزوال کی بنیادیں بھی وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں پھر وہ تمہارا نوکر بھی نہیں ہے ان کی اس خیر خواہی کا اس کو کوئی بدلہ تمہاری طرف سے نہیں ملتا۔ اور وہ یہی صدا لگاتا پھرتا ہے" ان اجری الا علی اللہ "بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس شعر کو پڑھتے ہوئے ترتیب بدل دی اور یوں پڑھا کہ "ویأتیک من لم تزوّد بالاخبار"

ابوبکر صدیقؓ نے تصحیح کر کے صحیح ترتیب بتائی تو آپ ﷺ نے فرمایا "ما انا بشاعر "یعنی میں شاعر نہیں ہوں۔

(۲) حدّثنا محمّد بن بشّار ثنا عبدالرحمٰن بن مهدی قال ثنا سفیان عن عبدالملک بن عمیر ثنا أبو سلمة عن أبی هریرة قال قال رسول اللّٰه ﷺ إنّ أصدق کلمة قالها الشاعر کلمة لبید الا کلُّ شئی ما خلا اللّٰه باطل و کاد امیّة بن أبی الصلت ان یسلم(۱).

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سب سے زیادہ سچی بات جو کسی شاعر نے کہی ہو لبیدؓ کی یہ بات ہے "الا کل شئی ما خلا اللّٰه باطل (۲) "(یعنی خبردار کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز فانی ہے) اور قریب تھا کہ امیہ بن الصلت اسلام لے آتے۔

<u>لبیدؓ اور اس کی حق شناسی:</u> أصدق کلمة الخ کلمہ سے کلام مراد ہے یعنی شعراء کے کلام میں سب سے سچا کلام لبیدؓ کا مذکورہ قول ہے کیونکہ اگر چہ شعراء اور بالخصوص جاہلی شعراء کے کلام میں جھوٹ اور مبالغہ ہوتا ہے لیکن اس سے بڑی سچائی بھی ان کے کلام میں نہیں جو کہ شاعر نے بیان کی ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی

(۱) صحیح بخاری ۱/ ۵۴۱ کتاب المناقب باب ایام الجاهلیة، صحیح مسلم ۲/ ۲۴۷ کتاب الشعر، جامع ترمذی ۲/ ۵۷۳ کتاب الاستذان و الادب باب ماجاء فی انشاء الشعر، سنن ابن ماجة ص ۲۶۶ کتاب الادب باب الشعر .(مختار)

(۲) مکمل شعر کچھ اس طرح ہے

ألا کل شئ ماخلااللّٰه باطل	و کل نعیم لامحالة زائل
نعیمک فی الدنیا غرور وحسرة	وأنت قریباً عن مقیلک راحلُ (مختار)

ذات کو بقاء حاصل ہے(۱)۔دنیا کی تمام نعمتیں اور تمام باقی ممکنات زوال پذیر ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی شان پر غلبہ توحید کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جس شعر میں توحید کا مغز اور حاصل ہے آپ ﷺ اس کی تحسین فرمارہے ہیں۔

لبید بن ربیعہؓ بڑے شاعر تھے۔سبعہ معلقہ میں چوتھا معلقہ انہی کا ہے۔نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔جاہلیت کے دور میں مایہ ناز شاعری کرتے تھے لیکن اسلام لانے کے بعد قرآن مجید کے اعجاز اور فصاحت و بلاغت کے سامنے گردن نہاد ہوئے۔قلم توڑ دیا اور شاعری چھوڑ دی۔کیونکہ وہی لوگ قرآن کے اعجاز کو خوب سمجھتے تھے۔اسی وجہ سے لبیدؓ نے اسلام لانے کے بعد شعر نہیں کہے۔وہ فرماتے تھے کہ اعجاز تفہیم معانی اور فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے میرے لئے قرآن مجید کافی ہے۔

حضرت عمرؓ نے ایک بار کوفہ کے عامل کو آپؓ کے پاس بھیجا تاکہ اسلام کے زمانہ میں ان کے کسی شعر کا پوچھے تو فرمایا کہ **أبدلني الله بالشعر سورة البقرة وال عمران**.''اللہ نے مجھے اشعار کے بدلے سورۃ بقرۃ اور آل عمران یعنی قرآن دیدیا۔اب شعر وشاعری سے کیا سروکار''

ایک سو چالیس سال تک زندہ رہے(۲)۔

<u>غیر مسلم شاعر کی مؤمنانہ کلام کی تحسین:</u> **وقال الخ** یعنی شاعروں پر تبصرہ اور ان کے کلام کی تحسین کے سلسلے میں آپ ﷺ نے امیہ بن صلت کی بھی تعریف کی۔نبی کریم ﷺ کا ادبی ذوق بہت بلند تھا۔عرب کے شعر وشاعری سے بے خبر نہ تھے۔امیہ بن صلت کے اشعار میں توحید اور بعث بعد الموت کے بارے میں حکیمانہ کلام ملتا تھا۔علاوہ ازیں وہ ایک عبادت گزار کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔اس لئے فرمایا کہ قریب تھا کہ وہ مسلمان ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل نہ تھی۔نبی کریم ﷺ کا زمانہ پایا لیکن اسلام نہیں لایا۔اور طائف کے محاصرے کے دوران کفر کی حالت میں مرا۔ایمان کے قریب ہوتے ہوئے

---

(۱) یہی کچھ قرآن پاک نے بیان کیا ہے **کل من علیها فان ویبقیٰ وجه ربک ذوالجلال والاکرام(الرحمن)** اور دوسرے مقام پر ہے **کل شئ هالک الاوجهه (الآیة)(مختار)**

(۲) بعض روایات میں ۱۵۴ اور بعض میں ۱۵۷ سال کا ذکر ہے۔انتہائی بہادر شہسوار اور سخی شخص تھے۔ہر سال بڑی تعداد میں اونٹ ذبح کر کے لوگوں کو کھلاتے تھے۔(اصلاح الدین)

بھی بدبختی آڑے آئی(۱)۔

(۳) حدّثنا محمّد بن المثنیٰ قال أنبانا محمّد بن جعفر ثنا شعبة عن الأسود بن قیس عن جندب بن سفیان البجلیّ قال أصاب حجرٌ إصبع رسول اللہ ﷺ فدمیت فقال.

هل أنت إلاّ إصبع دمیت و فی سبیل اللّٰه مالقیت(۲).

(۴) حدّثنا ابن ابی عمرؒ ثنا سفیان ابن عیینة عن الأسود بن قیس عن جندب بن عبداللّٰه البجلیّ.

ترجمہ: حضرت جندب بن (عبداللہ بن) سفیان بجلیؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی انگلی کو ایک پتھر لگ گیا جس کی وجہ سے وہ (زخمی ہوکر) خون آلود ہوگئی تو آپ ﷺ نے کہا کہ تو ایک خون آلود ہونے والی انگلی ہی تو ہے اور جو مصیبت تجھے پہنچی ہے وہ بھی اللہ کے راستے میں پہنچی ہے۔

جندب بن سفیان یہ دراصل جندب بن عبداللہ بن سفیان بجلیؓ ہیں یہاں دادا کی طرف اور اگلی سند میں والد کی طرح منسوب ہیں۔ بجلیہ قبیلہ سے تعلق ہے۔ ابتداء میں کوفہ میں رہتے تھے۔ جہاں آپؓ کو جندب بن سفیان کہا جاتا تھا پھر بصرہ میں سکونت اختیار کی۔ بصری لوگ آپؓ کو جندب بن عبداللہ کہا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کو جندب الخیر اور جندب الفاروق بھی کہا جاتا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں میں نوجوانی کی ابتدائی ایام میں تھا۔ حضرت ابی بن کعبؓ اور حذیفہؓ سے بھی آپؓ روایت کرتے ہیں۔

---

(۱) بعض روایات میں ہے آمن شعره و کفر قلبه (الاتحافات ۲۹۲) کہ اس کے اشعار تو اسلام لائے مگر یہ خود مسلمان نہیں ہوا۔ اس کی وجہ علامہ عبدالجواد الدومیؒ نے لکھا ہے کہ کان یطمع ان یکون نبی الامة (الاتحافات ۲۹۲) کہ نبوت تو میرا حق تھا محمد ﷺ کیسے نبی ہے۔ (مختار)

(۲) صحیح بخاری ۱/۳۹۳ کتاب الجهاد باب من ینکب فی سبیل اللّٰه، صحیح مسلم ۲/۱۱۶ کتاب الجهاد والسیر باب مالقی النبیّ ﷺ من اذی المشرکین والمنافقین، جامع ترمذی ۲/۶۴۵ کتاب تفسیر القرآن باب ومن سورة الضحیٰ، (مختار)

اصاب حجر الخ یہ جنگ احد کا واقعہ ہے۔اور بعض کی رائے میں ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے جب آپ ﷺ کو ایذائیں پہنچائی گئیں اور مختلف طریقوں سے لوگ آپ ﷺ کو تنگ کرتے تھے۔بہر حال اس جہاد میں یا کسی دوسرے موقع پر آپ ﷺ کے پاؤں مبارک کی انگلی مبارک کو پتھر لگا وہ خون آلودہ ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے یہ کہا کہ هل انت الا اصبع دميتِ وفی وسبيل الله مالقيتِ

گویا خود کو تسلی دیتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ انبیاء تو تبلیغ حق میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ انہیں آروں سے چیرا گیا۔مختلف عذاب دیئے گئے اور یہ تو ایک انگلی ہے تو اگر کٹ جائے پھر بھی حق ادا نہ ہوا۔ابھی تو صرف خون بہا ہے

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

پھر جو تکلیف ملی ہے وہ بھی تو اللہ کے راستے میں ہے جس کا ثواب ملے گا خون بیکار نہیں بہا۔

<u>آپ ﷺ کے کلام کو موزون یا شعر کہنے کے توجیہات:</u> لیکن اس مقام پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ یہ تو ایک شعر ہے جو نبی کریم ﷺ نے کہا ہے حالانکہ آپ ﷺ کو شاعر کہنا ٹھیک نہیں ہے۔اس کے متعدد جواب دیئے گئے ہیں۔

اول یہ کہ اگر بلا قصد وارادہ کوئی موزوں ومقفی کلام کسی کی زبان پر آئے تو اسے شعر نہیں کہتے۔

دوم یہ کہ اگر شعر بھی ہو تو ایک آدھ شعر کہنے سے کوئی شاعر نہیں کہلایا جا سکتا۔شعر کا تو مستقل ملکہ ہوتا ہے جس کے حاصل ہونے کے بعد شعر کہنے والے کو شاعر کہتے ہیں۔

سوم یہ کہ بعض لوگ کہتے ہیں یہ شعر نہیں بلکہ ایک رجز ہے جو جنگی آواز یا ترانے کو کہتے ہیں۔جس طرح سیاسی تحریکوں میں نعرہ بازی ہوتی ہے۔اور مختلف آوازوں اور ترانوں کے ذریعے لوگوں کے جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

چہارم یہ کہ یہاں دمیت اور لقیت کی تاء کو ساکن پڑھا گیا ہے جس سے وزن ٹوٹ جاتا ہے اور یہ کلام شعر نہیں رہتا۔

پانچواں جواب یہ ہے کہ بعض مؤرخین کی رائے کے مطابق یہ خود نبی کریم ﷺ کا کلام نہ تھا بلکہ بطور تمثل آپ ﷺ نے کسی دوسرے شاعر کا کلام نقل کیا ہے۔چنانچہ واقدیؒ کے قول کے مطابق یہ ولید بن

ولید کا شعر ہے اور ابن ابی الدینار کے قول کے مطابق یہ ابن رواحہؓ کا کلام ہے(۱)۔ جس کے بارے میں پہلے آیا ہے کہ آپ ﷺ ان کے کلام سے تمثل کیا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ غزوۂ موتہ میں انہوں نے اپنی شہادت سے قبل جو اشعار کہے تھے ان میں سے یہ شعر بھی ہے۔ ان اشعار کو ہم اس باب کی ابتداء میں ابن رواحہؓ کے احوال بیان کرتے ہوئے ذکر کر چکے ہیں۔ البتہ اس سے یہ لازم آئے گا کہ انگلی کٹنے کا واقعہ غزوہ موتہ کے بعد ہو۔

حدثنا ابن أبی عمر الخ امام ترمذیؒ اس حدیث کے لیے دوسری سند لا رہے ہیں۔ اس سند کے مطابق حضرت جندب کی نسبت اپنے والد کی طرف ہو چکی ہے جبکہ گزشتہ سند میں دادا کی طرف نسبت کی گئی تھی۔

(۵) حدّثنا محمّد بن بشار ثنا یحییٰ بن سعید ثنا سفیان الثوری ثنا أبو إسحاق عن البراء بن عازب قال قال له رجل أفررتم عن رسول اللّٰه ﷺ یا أبا عمارة فقال لا واللّٰه ما ولّی رسول اللّٰه ﷺ ولکن سرعان النّاس تلقّهم هوازن بالنّبل ورسول اللّٰه ﷺ علی بغله وأبو سفیان بن الحارث بن عبدالمطلب اٰخذ بلجامها ورسول اللّٰه ﷺ یقول.

أنا النّبیّ لا کذب أنا ابن عبدالمطلب(۲).

---

(۱) علامہ عبدالجواد الدومیؒ نے لکھا ہے اخرج ابن أبی الدنیا فی کتاب محاسبة النفس أنّ جعفراً حین قتل بمؤتة دعاالنّاس بابن رواحة فأقبل وقاتل فأصیب فی إصبعه فارتجز وجعل یقول.

هل أنت إلاّ إصبع دمیت وفی سبیل اللّٰه مالقیت

یانفس إلاّ تقتلی تموتی هذاحیاض الموت قدصلیت

وماتمنیت فقدلقیت ان تفعلی فعلهماهدیت

ثم ثبت حتّیٰ استشهدوتمثّل النبیّ ﷺ بقوله(الاتحافات ۲۹۳)(مختار)

(۲) صحیح بخاری ۱/ ۴۰۲ کتاب الجهاد باب بغلة النبیّ البیضاء، صحیح مسلم ۲/ ۱۰۷ کتاب الجهاد والسیر باب فی غزوة حنین، جامع ترمذی ۱/ ۲۳۰ کتاب الجهاد باب ماجاء فی الشباب عندالقتال(مختار)

ترجمہ: حضرت براء بن عازبؓ سے کسی شخص نے پوچھا کہ اے ابوعمارۃ! کیاتم لوگ نبی کریم ﷺ کو چھوڑ کر (جنگ حنین میں) بھاگ چکے تھے۔انہوں نے جواب دیا کہ نہیں خدا کی قسم نبی کریم ﷺ نے جنگ میں پیٹھ نہیں پھیری تھی۔ بلکہ لشکر کے کچھ جلد باز لوگ بھاگ نکلے تھے۔جن کا استقبال بنو ہوازن نے تیروں سے کیا تھا۔اس وقت نبی کریم ﷺ اپنے خچر پر سوار تھے۔ابوسفیان بن الحارث بن عبدالمطلب نے خچر کے لگام کو پکڑا تھا اور نبی کریم ﷺ یہ رجز پڑھتے تھے "أنا النبیّ لا کذب أنا ابن عبدالمطلب" یعنی میں نبی ہوں۔اس میں کوئی شبہ نہیں اور میں عبدالمطلب کا بیٹا (پوتا) ہوں۔

غزوۂ حنین میں آپ ﷺ کا کلام رزمیہ: لا واللّٰہ الخ یعنی مسلمانوں کی وہ پسپائی جو حنین میں ہوئی تھی ہماری یعنی قدیم صحابہ کی پسپائی نہیں ہوئی تھی بلکہ کچھ دن پہلے کے یہ نومسلم صحابہ کے سبب ہوئی جو کہ غیر تربیت یافتہ تھے۔کمانڈروں اور امیروں کے امر کا لحاظ نہیں رکھتے تھے۔جذباتی لیکن بے ترتیب اور غیر منظم تھے۔حوصلہ اور جنگی دماغ میں نہ تھی۔قربانی پیش کرنے کے جذبہ میں ڈسپلن کا لحاظ نہ رکھا جائے اور بدنظمی پیدا ہو جائے وہاں نتیجہ شکست کے طور پر نکل ہی آتا ہے۔جیسے کہ احد میں بھی شکست کی وجہ یہی تھی۔کہ بعض صحابہ کرامؓ نے امیر کی اطاعت نہیں کی تھی اور نہایت اہم جنگی مقام سے غفلت برت کر اسے چھوڑ دیا۔ یہاں بھی ادھر نومسلم جذباتی لوگ تھے دوسری طرف مقابلے میں بنو ہوازن تھے جن کی تیراندازی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔انہوں نے تیر پھینکے تو اس طرف بعض مسلمانوں میں افراتفری پھیلی لیکن نبی کریم ﷺ اپنے خچر پر اسی طرح سوار تھے بھاگے نہیں۔لگام حضرت سفیانؓ کے ہاتھ میں تھی اور بڑے حوصلہ اور شجاعت کے ساتھ یہ رجز کہتے جاتے تھے کہ

أنا النبیّ لا کذب أنا ابن عبدالمطلب

غزوۂ حنین کی مجموعی حالت: فتح مکہ کے بعد قبیلہ بنو ہوازن نے اپنے حلیفوں کو جمع کیا اور مسلمانوں کا مقابلہ کرنا چاہا۔مکہ سے طائف کی طرف دس میل کے فاصلے پر حنین کی وادی ہے۔وہاں پر بیس ہزار سے

زائد لشکر جمع کر کے مسلمانوں کو للکارا۔ وہ اپنی عورتیں، بچے اور مال میدان میں لائے تھے۔ تا کہ فرار کی بجائے بے جگری سے لڑیں۔ ۶ شوال ۸ھ کو بارہ ہزار اسلامی فوج لے کر نبی کریم ﷺ بھی ان کی سرکوبی کے لیے نکلے اس فوج میں اکثریت نو مسلم افراد کی تھی بلکہ بعض لوگ کفر کی حالت میں محض غنیمت کے حصول کے لیے یا تماشائی بن کر شامل ہوئے۔ چند دن قبل رمضان میں مکہ معظمہ فتح ہوا تھا۔ ابھی شاید نو مسلموں پر بیس دن بھی نہیں گزرے تھے۔ ایک تنگ گھاٹی سے گزر کر اسلامی فوج کا مقدمۃ الجیش جس میں بنو سلیم اور مکہ کے نو مسلم جوانوں کی اکثریت تھی جب حنین کے میدان میں داخل ہوا تو بنو ہوازن نے بظاہر پسپائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کو آگے بڑھنے دیا۔ جب یہ لوگ پہاڑی چوٹیوں کے حصار میں آگئے تو ہوازن کے ماہر تیر اندازوں نے پہاڑی پناہ گاہوں سے نکل کر اچانک تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دی جس سے مقدمۃ الجیش کے مجاہدین بوکھلا کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ اس وقت تک جیش کا مرکزی حصہ ''قلب'' بھی میدان میں آگیا تھا۔ جس میں خود نبی کریم ﷺ بھی موجود تھے مقدمۃ الجیش کے انتشار کی وجہ سے قلب کا لشکر بھی انتشار کا شکار ہوا لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے کسی کو کچھ سجھائی نہ دیا کہ کیا کیا جائے کیونکہ دشمن دور ہی سے صرف تیروں کی بارش کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ تقریباً ایک سو صحابہؓ رہ گئے۔ مگر آپ ﷺ نے پیش قدمی جاری رکھی ادھر بنو ہوازن نے بھی پلٹ کر پیش قدمی شروع کر دی جن کو مورچہ زن تیر اندازوں کی مدد حاصل تھی۔ افراتفری کی وجہ سے مسلمانوں کی پیش قدمی رک گئی صرف نبی کریم ﷺ ہی تھے جو حضرت عمرؓ حضرت عباسؓ اور حضرت ابوسفیان بن الحارثؓ کی معیت میں آگے بڑھتے رہے۔ اور حدیث میں مذکور رزمیہ اشعار بھی لب پر وارد ہو رہے تھے۔ دیگر ساتھیوں کی تعداد کم ہوتی گئی حتیٰ کہ ایک موقع ایسا آیا کہ نبی کریم ﷺ اپنے خچر جس کا نام بیضاء یا دلدل تھا سے اتر گئے اور تن تنہا آگے بڑھے کنکریوں اور ریت سے مٹھی بھر کر ''شاهت الوجوه ارجعوا'' کہتے ہوئے کفار کی فوج پر پھینک دی۔ انتشار کی اس کیفیت میں کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ نبی کریم ﷺ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں صرف چند فدائین ہی آپ ﷺ کے پاس رہ گئے تھے اس لئے تجربہ کار پرانے مسلمان بھی بدحواسی کے عالم میں تھے۔ نو مسلم اور جذباتی مسلمان میدان سے ہٹ چکے تھے۔ اس دوران حضرت عباسؓ کو حکم دیا کہ وہ مہاجرین،

انصار اور اصحابِ بیعت صحابہ کو آواز دیکر میدان میں بلائیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا کیا تب ہی مسلمانوں کو نبی کریم ﷺ کے مقام کا پتہ چلا۔ اور انصار و مہاجرین کی جماعت نے آگے بڑھ کر بنو ہوازن کو آڑے ہاتھوں لیا۔ بنو ہوازن اس ضرب کاری کا مقابلہ نہ کر سکے اور بہت سامالِ غنیمت، عورتوں اور بچوں کو چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مخلص سرفروش صحابہ کرامؓ نبی کریم ﷺ کو چھوڑ کر بھاگے نہیں تھے بدحواسی کی وجہ سے بعض منتشر ضرور ہوئے تھے اور نظم میں نقصان کے سبب نبی کریم ﷺ ان سے بچھڑ گئے تھے جبکہ خود نبی کریم ﷺ کی مسلسل، دلیرانہ اور تیز پیش قدمی جاری رہی(۱)۔

لہٰذا حضرت براءؓ کے جواب کا خلاصہ یہی ہے کہ صحابہ کرامؓ نے اس روز نبی کریم ﷺ کو چھوڑ کر پیٹھ نہیں دکھائی تھی البتہ نومسلم جذباتی مسلمان انتشار کا شکار ضرور ہوئے تھے۔

انا النبی لا کذب   انا ابن عبدالمطلب

یہ کلام بھی وزن و قافیہ سے مقید تھا۔ لیکن اس سے آپ ﷺ کا شاعر ہونا لازم نہیں ہوتا جس طرح کہ ہم آگے بیان کریں گے۔

<u>تفاخر بالنسب کی حقیقت:</u> لیکن یہ وہم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہاں نسب اور نبوت سے تفاخر کیا ہے۔ جس کا جواب یہ ہے کہ اس کلام میں ایک حقیقت کا بیان محض توثیق کے لیے کیا گیا تھا۔ گویا نبی کریم ﷺ یہ کہنا چاہتے تھے کہ میں سچا پیغمبر ہوں یہ عارضی شکست حق کو مٹا نہیں سکتی۔ اس کی پرواہ نہیں۔ نیز ''میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں'' یہ حقیقت بھی اسی لئے بیان ہوئی تھی کہ اس سے یہ تنبیہ ہو کہ میں سچا پیغمبر ہوں کیونکہ بعض کتب سماویہ میں آپ ﷺ کے دادا کا نام موجود تھا۔ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ بشارات

---

(۱) ملا علی قاریؒ، علامہ بیجوریؒ اور مناویؒ نے لکھا ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ آپ ﷺ کبھی شکست کھا کر نہیں بھاگے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص آپ ﷺ کی تنقیص کرتے ہوئے کہے کہ نبی کریم ﷺ جنگ سے بھاگے ہیں تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔ اور تنقیص کے طور پر نہ کہے تو امام شافعیؒ کے ہاں اس کو تعزیر دی جائے گی۔ جبکہ امام مالکؒ کے ہاں اسے قتل کر دیا جائے گا۔ (اصلاح الدین)

میں اس کا ذکر آیا تھا گویا آپ ﷺ نے بھی ان بشارات کی طرف اشارہ کیا کہ میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔اور بشارۃ کا مصداق سچائی ہو۔

نیز یہ بھی ہوسکتا ہے کہ والد کی بجائے دادا کی طرف نسبت کرنے کی وجہ یہ ہو کہ آپ ﷺ کے والد عرب میں مشہور نہیں تھے بلکہ جوانی میں وفات پائے تھے جبکہ دادا قریش کے سرداراور مکہ کے رئیس تھے۔اسی وجہ سے لوگ بھی آپ ﷺ کو ابن عبدالمطلب کہتے تھے۔اور ممکن ہے کہ صرف سجع کی رعایت کے لیے ابن عبداللہ کی بجائے آپ ﷺ نے ابن عبدالمطلب کہا ہو۔

اب اس شعر کے کہنے پر آپ ﷺ کا شاعر ہونا لازم نہیں آتا۔بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس لئے کہ یہ شعر نہیں رجز ہے جو جذباتی نثر میں سے شمار ہوتا ہے۔بعض کہتے ہیں اس لئے کہ یہ شعر بھی دراصل ایک اور شخص کا ہے جنہوں نے آپ ﷺ کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ

"انت النبیّ لا کذب انت ابن عبدالمطلب"

آپ ﷺ نے صرف انت کی ضمیر انا سے بدل دی تھی لیکن سب سے بہتر جواب یہ ہے کہ شعر کی تعریف میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ قصدیت شرط ہے اگر بالقصد وزن وقافیہ کے تحت کلام کو لایا جائے تو شعر ہوگا ورنہ نہیں۔جبکہ یہاں یہ شرط مفقود ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ صرف اپنے جذبات واحساسات کا مظاہرہ کرتے ہیں مقفیّ کلام اتفاقاً زبان پر وارد ہوا ہے اس کا قصد نہیں کیا گیا۔

(٦) حدّثنا إسحاق بن منصور عبدالرزاق ثنا جعفر بن سليمان أنبانا ثابت عن أنس إنّ النبيّ ﷺ دخل مكة في عمرة القضاء و ابن رواحة يمشي بين يديه و هو يقول.

خلّوا بني الكفار عن سبيله. اليوم نضربكم على تنزيله

ضربا يزيل الهام عن مقيله و يذهل الخليل عن خليله

فقال له عمر يا ابن رواحة بين يدى رسول اللهﷺ و في حرم الله تعالىٰ تقول شعراً فقال النبيّ ﷺ خلّ عنه يا عمر فلهي أسرع فيهم

من نضح النّبل(۱)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ عمرۃ القضاء (کے سفر) میں مکہ مکرمہ داخل ہوئے اس حال میں عبداللہ بن رواحہؓ یہ کہتے ہوئے آپ ﷺ کے آگے آگے جا رہے تھے "خلّوا بنی الکفار الخ" یعنی "اے کفار کے بیٹو! نبی کریم ﷺ کے راستے سے ہٹ جاؤ۔ آج ہم تمہیں نبی کریم ﷺ پر نازل ہونے والے قرآن (کے حکم) سے ایسی ضرب لگائیں گے۔ جو کھوپڑیوں کو اپنی قرار گاہوں سے جدا کردے گی۔ اور جو دوست کو اپنے دوست سے غافل کردے گی۔" اس پر حضرت عمرؓ نے اسے کہا کہ اے ابن رواحہؓ کیا تم نبی کریم ﷺ کے سامنے اور (پھر) اللہ تعالیٰ کے حرم میں شعر پڑھتے ہو۔ تب نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے عمرؓ! ابن رواحہ کو منع نہ کرو۔ کیونکہ اس کے اشعار کفار پر اثر انداز ہونے میں تیر برسانے سے بھی زیادہ سخت ہیں۔

عمرۃ القضاء اور ابن رواحہؓ کے اشعار: فی عمرۃ القضاء الخ ذی القعدہ ۷ھ میں نبی کریم ﷺ نے عمرہ ادا کرنے کی غرض سے مکہ کا سفر کیا کیونکہ ۶ھ میں قریش نے آپ ﷺ کو عمرہ ادا کرنے سے روکا تھا تو ۷ھ کا عمرہ دراصل اسی چھوٹے ہوئے عمرہ کی قضاء ہی ہے۔ اسی لئے اسے عمرۃ القضاء کہا جاتا ہے۔ چونکہ شوافع کے نزدیک نفل نماز اور روزہ توڑنے کی قضاء لازم نہیں ہوتی۔ اسی طرح محصر پر حج یا عمرہ کی قضاء لازم نہیں ہوتی۔ اگر احصار کی وجہ سے وہ عمرہ یا حج کا احرام کھول دے۔ اس لئے وہ "عمرۃ القضاء" کی وجہ تسمیہ میں کہتے ہیں کہ قضاء، "مقاضاۃ" یعنی مصالحت کے معنی میں ہے اور چونکہ ۷ھ کا یہ عمرہ مصالحت کے بعد ادا کیا گیا تھا اس لئے اسے عمرۃ القضاء کہتے ہیں۔ لیکن یہ تاویل اس لئے بعید لگتی ہے کہ اس میں قضاء کو ایک غیر معروف معنی میں لیا گیا ہے۔ جبکہ ہمارے نزدیک قضاء سے معروف معنی یعنی ادا کی ضد مراد ہے۔ اور یہ نام ہی اس پر بخوبی دلالت کرتا ہے کہ بصورت احصار عمرہ اور حج کی قضاء واجب ہوتی ہے۔

---

(۱) جامع ترمذی ۵۷۳/۲ کتاب الادب باب ماجاء فی إنشاء الشعر، سنن النسائی ۶۹/۲ کتاب مناسک الحج باب انشاء الشعر فی الحرم والمشی بین یدی الامام، السنن الکبریٰ للبیهقی ۲۲۸/۱۰ کتاب الشهادات باب لاباس باستماع الحداء ونشید الاعراب کثر اوقل (مختار)

خلّوا بنی الکفار الخ چونکہ اس عمرہ کے دوران کفار مکہ پہلے سے مکہ چھوڑ کر نزدیک کی پہاڑیوں پر جابیٹھے تھے۔اس لئے یہاں پر **خلّوا بنی الکفار** سے مراد یہ ہوگی کہ اس ترکِ مکہ پر ثابت وقائم رہو۔ ہمارے لیے رکاوٹ بننے کی کوشش نہ کرنا۔

الیوم نضربکم یہ محض ایک دھمکی اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کے جذبات کا مظاہرہ تھا ورنہ **عمرۃ القضاء** کے سفر میں مسلمانوں کے ہاتھوں کسی کو ذرہ برابر تکلیف نہیں پہنچی۔وعدہ کے مطابق پر امن طریقے سے آئے عمرہ ادا کیا اور واپس تشریف لے گئے۔

علی تنزیلہ ضمیر نبی کریم ﷺ کو راجع ہے۔یعنی اگر تم لوگوں نے نقض عہد کر کے نبی کریم ﷺ کو مکہ نازل ہونے کے باوجود عمرہ سے روکنے کی کوشش کی تو اس تنزیل پر ہم تمہاری خبر لیں گے۔اس بار گزشتہ برس کی طرح ناکام واپس نہیں ہونگے۔یوں ''**علی**'' کا لفظ تعلیلیہ ہوگا۔یعنی **بناء علی تنزیلکم ایاہ** ۔۔یا پھر **تنزیل** سے قرآن مراد ہوگا۔اور مضاف مقدر ہوگا یعنی ''**بناءً علی حکم تنزیلہ ای قرآنہ**''۔مطلب یہ ہوگا کہ اس پر نازل شدہ قرآن کے حکم کی بناء پر تمہاری پٹائی کریں گے۔

یزیل الھام ہام ہامۃ کی جمع ہے۔جو کھوپڑی کو کہتے ہیں۔

عن مقیلہ **مقیل قال یقیل قیلولۃ** سے مصدر میمی ہے۔جس کے معنی ہے آرام اور نیند۔تو معنی یہ ہوگا کہ ایسی ضرب سے ماریں گے کہ کھوپڑیاں آرام بھول جائیں گی یا پھر یہ ظرف کا صیغہ ہے جائے قرار اور آرام گاہ کے معنی میں ہے۔یعنی سروں کو ان کی آرام گاہ یعنی گردنوں سے جدا کر کے گرادیں گے۔

أفی حرم اللّٰہ تقول الشعر حضرت عمرؓ کی اس بات کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے جذبات تو قابل قدر ہیں لیکن احترام حرم اور احترام رسول ﷺ کا تقاضا کچھ اور ہے۔اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں **لاترفعوا اصواتکم فوق صوت النبیّ** ﷺ (الآیۃ) گویا ان کے خیال میں نبی کریم ﷺ کے سامنے اور پھر حرم کے اندر اشعار کہنا سوء ادب تھا۔علاوہ ازیں یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ ابھی تو امن سے عمرہ ادا کرنے کا موقعہ ملا ہے اگر تیرے اشعار سے کفار کے جذبات بھڑک اٹھے تو پھر ممکن ہے کہ ہم کفار کے حملے کی وجہ سے عمرہ تسلی کے ساتھ ادا نہ کرسکیں۔

مگر نبی کریم ﷺ نے عمرؓ کو منع فرمایا اور کہا کہ اسے چھوڑ دو۔کہ اپنے جذبات کا اظہار کرتا رہے ان

کا یہ کام جہادلسانی ہے کیونکہ جس طرح تلوار کے ذریعے جہاد ہوتا ہے قلم اور زبان سے بھی جہاد ہوسکتا ہے۔ رہے کفار تو وہ ہمارے جہاد اوران کے اشعار سے ایسے مرعوب ہو چکے ہیں کہ ان کو سامنے آنے کی جرأت نہیں ہوگی۔

بہرحال یہاں پر نبی کریم ﷺ نے جو اجازت فرمائی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ اشعار سارے قبیح نہیں ہوتے بلکہ مضمون اچھا ہو تو ان میں حسن بھی ہوتا ہے۔

أسرع من نضح النبل الخ النبل تیروں کے پھینکنے کو کہتے ہیں۔مطلب یہ ہے کہ تیروں کی برسات ان کو اتنا زخمی اور بے قرار نہیں کرسکتی جتنا کہ یہ کلمات اور ابیات ان کا ستیاناس کررہی ہیں(۱) جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے کہ جراحات السنان لها التيام ولا يلتام ما جرح اللسان

(۷) حدّثنا عليّ ابن حجر أنبانا شريک عن سماک ابن حرب عن جابر بن سمرة قال جالست رسول الله ﷺ اكثر من مائة مرة و كان أصحابه يتنا شدون الشعر و يتذاكرون أشياء من أمر الجاهلية وهو ساكت و ربّما تبسّم معهم(۲).

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہؓ کہتے ہیں کہ میں سو بار سے زیادہ نبی کریم ﷺ کی (ایسی) مجلسوں میں بیٹھا ہوں جبکہ آپ ﷺ کے صحابہ(ان مجالس میں) ایک دوسرے سے اشعار سنتے تھے۔اور جاہلیت کے قصے سناتے تھے۔ نبی کریم ﷺ خاموش (ہوکر سنتے) تھے۔اور کبھی کبھی ان کے ساتھ تبسم بھی فرماتے تھے۔

<u>حضوراقدس ﷺ کے مجالس میں شعروشاعری:</u> يتنا شدون الشعر تناشد ایک دوسرے کے سامنے شعر کہنے اور ایک دوسرے سے سننے کو کہتے ہیں۔تو گویا نبی کریم ﷺ کی مجلس خشک اور

(۱) کفار کو ایذاءرسائی کے لئے فقہاء اسلام نے یہاں تک لکھا ہے کہ لشکر اسلام دارالحرب کے سانپوں اور بچھوؤں کو بھی قتل نہ کرے تاکہ وہ کفار کی ایذارسائی کے لئے موجود رہیں۔(مختار)

(۲) جامع ترمذی ۲/۳/۵۷ ابواب الاستذان والادب باب ماجاء فی إنشاء الشعر، مسنداحمد ۵/۸۶، السنن الکبریٰ للبیهقی ۱۰/۲۴۰، صحیح ابن حبان ۷/۵۱۵ (مختار)

بے لچک نہ تھی۔ ہر وقت عقل وحکمت اور احکام شریعت کا ذکر نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ کبھی کبار دل لگی اور گپ شپ بھی ہوتی تھی۔ شعر گوئی ہوتی تھی اور آپ ﷺ منع کرنے کی بجائے سنتے رہتے تھے۔ بلکہ کبھی مسکرا کران کی طبع آزمائی کی تحسین بھی فرماتے تھے۔

ظاہر ہے کہ ان اشعار میں جھوٹ، غیبت، اور فضول گوئی، ہجو اور مبالغہ آرائی نہیں ہوتی تھی۔ ورنہ آپ ﷺ ضرور منع فرماتے۔ یہ صحابہؓ کی دلداری ان کی تالیف قلبی اور ان کے ساتھ اختلاط اور بے تکلفی تھی جو کہ ایک داعی کے لیے ضروری امر ہے۔ گویا آپ ﷺ اپنی مجلسوں میں تحمیض پیدا فرماتے تھے۔ تفریح طبع کے امور میں مشغول ہو جاتے تھے۔ جبکہ شعر گوئی عربوں کے لیے فطری طور پر محبوب چیز تھی۔ حمضوا مجالسکم۔

من امر الجاهلية الخ یعنی جاہلیت کے زمانے کے واقعات کا بھی ذکر ہوتا تھا۔ ظاہر ہے اس سے تاریخی مباحث چھڑ جاتے تھے۔ کہ فلاں واقعہ کب اور کیونکر ہوا۔ اور فلاں واقعہ کیسے ہوا۔ و تبسم معهم آپ ﷺ کی تحسین کا یہی انداز ہوتا تھا۔ آج کل کے مشاعروں کی طرح واہ واہ۔ مکرر مکرر اور نعروں سے نہیں۔ بس مسکراہٹ سے سبھی سمجھ جاتے تھے کہ یہ شعر آپ ﷺ کو پسند آیا ہے اور یہ بات بار خاطر نہیں ہے

(۸) حدّثنا علیّ ابن حجر انبانا شریک عن عبدالملک بن عمیر عن أبی سلمة عن أبی هريرة عن النبی ﷺ قال اشعر کلمة تکلّمت بها العرب کلمة لبيد ألا کلّ شئی ما خلا اللّٰه باطل(۱)۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ عرب کے کلام میں سب سے زیادہ پُر حکمت کلام لبیدؓ کا یہ جملہ ہے

ع **الا کلّ شی ما خلا اللّٰه باطل(۲)**

---

(۱) علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے ویؤخذ منه جوازبل ندب انشاء الشعر واستماعه اذا کان فيه مدح الاسلام والحث علی صدق اللقاء مبایعة النفس للّٰه تعالیٰ (المواهب اللدنية ۱۵۹)(مختار)

(۲) صحيح بخاری ۲/۵۷۳ کتاب المناقب باب ایّام الجاهلية، صحيح مسلم ۲/۲۴۷ کتاب الشعر، جامع ترمذی ۲/۵۷۳ کتاب الاستذان والادب باب ماجاء فی إنشاء الشعر، سنن ابن ماجة ص ۲۶۶ کتاب الادب باب الشعر۔(مختار)

اشعر کلمة اشعر شعور سے ہے جو علم کو کہتے ہیں۔ لہٰذا معنی یہ ہوا کہ بڑی عقلمندی اور دانائی کی بات جو عربوں کے ہاں کہی گئی ہے۔ وہ جملہ ہے جو حسن اور دقتِ لفظی کے ساتھ ساتھ ایک بہترین اور نفس الامری کو سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ حدیث اس باب میں دوسرے نمبر پر گزر چکی ہے۔

(۹) حدّثنا أحمد بن منیع ثنا مروان بن معاویة عن عبداللّٰہ ابن عبدالرحمٰن الطائفیّ عن عمرو بن الشرید عن أبیه قال کنت ردف رسول اللّٰہ ﷺ فانشدته مائة قافیة من قول امیّة بن ابی الصلت کلّما انشدته بیتا قال لی النبی ﷺ هیه حتیّ انشدته مائة یعنی بیتا فقال النبیّ ﷺ ان کا دلیسلم(۱).

ترجمہ: حضرت شریدؓ سے روایت ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ سواری پر آپ ﷺ کے پیچھے بیٹھا تھا (اس دوران) میں نے نبی کریم ﷺ کو امیہ بن الصلت کے ایک سو اشعار سنائے۔ جب بھی کوئی شعر سناتا۔ نبی کریم ﷺ فرماتے "ھیـــــہ" اور سناؤ۔ یہاں تک کہ میں نے ایک سو اشعار ان کو سنا دیئے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ قریب تھا کہ امیہ مسلمان ہو جائے۔

الشــــرید شرید بن سوید ثقفیؓ مشہور صحابی ہیں۔ طائف میں رہتے تھے۔ مدینہ میں بھی رہ چکے ہیں۔ بیجوریؒ اور ملا علی قاریؒ نے اصل نام عبدالملک بن سوید لکھا ہے۔ لیکن علامہ ابن حجرؒ کے ہاں اصل نام مالک بن سوید ہے۔ شرید لقب ہے۔ بیعتِ رضوان میں شریک ہو چکے تھے۔

مأة قافیة اس سے یا تو کامل قصیدہ مراد ہے لیکن راجح یہ ہے کہ اس سے مراد سو شعر ہیں اور قافیہ جو جزء ہے کا ذکر کر کے اس کا کل یعنی بیت مراد ہے۔

---

(۱) السنن الکبریٰ للنسائی ۲۴۸/۶ کتاب العمل الیوم واللیلة باب مایقول اذا استرات الخیر، سنن ابن ماجة ۲۶۶ کتاب الادب باب الشعر، مصنف ابن ابی شیبة ۴۰۲/۸ السنن الکبریٰ للبیهقی ۲۲۶/۱۰ کتاب الشهادة باب لابأس باستماع الحداء ونشید الاعراب (مختار)

غیر مسلم شاعر امیۃ بن صلت کے ایمان افروز کلام کی تحسین: من امیّة بن أبی الصلت یعنی من قصائد امیّة بن أبی الصلت یہ بنوثقیف کے مایہ ناز شعراء میں سے تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا زمانہ پایا۔ مگر ایمان سے محروم رہے۔ حقائق اور عقائد صحیحہ سے اس کے اشعار بھرے پڑے ہیں۔ توحید اور بعثت کی حقانیت دنیا کی بے ثباتی اس کے کلام کی روح ہے حتی کہ نبی کریم ﷺ نے اس کے بارے میں فرمایا "آمن لسانه و کفر قلبه" یعنی اس کی زبان مؤمن کی زبان ہے لیکن دل کافر ہے۔ تورات اور انجیل کے عالم ہونے کی وجہ سے اس کو آخری نبی کے علامات کا بھی بخوبی علم تھا۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ وہ اسی طمع میں عبادت اور تصوف میں مشغول رہتا مگر جب نبی کریم ﷺ کو نبوت بخشی گئی تو وہ حسد کی آگ میں جلنے لگا اور یقین کے باوجود کفر کرنے لگا۔ سب سے پہلے "باسمک اللھمّ" کا استعمال بھی اسی سے منقول ہے۔

هیه: یہ کلمہ اسم فعل ہے اور کسی کلام کے استحسان کے بعد مزید مطالبہ کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس لئے اس کا معنی ہے "زد" یعنی اور سناؤ۔ اس کی وجہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ امیہ کا کلام توحید بعثت اور دیگر عقائد اسلامیہ پر مشتمل ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں دقیق معانی اور فصاحت میں بھی ممتاز تھا۔

ان کـــا دلیســلـم ان مخفف من المثقل ہے۔ ضمیر شان محذوف ہے جو اسم انّ ہے یعنی انــه کـادلیسـلم۔ قریب تھا کہ وہ مسلمان ہو جائے کیونکہ زبان تو اسلامی ہے۔ بس دل سے انانیت نکل جاتی تو کفر باقی نہ رہتا کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اس کا یہ شعر سن کر یہ تبصرہ فرمایا تھا

لک الحمد و النعماء و الفضل ربنا　　فلا شئی اعلی منک حمداً و لا مجدا

(اے ہمارے رب تیرے لئے ہی تمام تعریفیں ہیں۔ تیری طرف سے تمام نعمتیں اور تیرے لیے ہی سب فضیلتیں ہیں بس تجھ سے زیادہ کوئی تعریف کے قابل ہے نہ تجھ سے کوئی بزرگ تر۔)

(١٠) حـدّثنا إسماعیل بن موسیٰ الفزاریّ و علیّ بن حجر و المعنی واحد قالا أنبانا عبدالرحمان بن أبی الزناد عن هشام بن عروة عن أبیه عن عائشةؓ قالت کان رسول اللهﷺ یضع لحسان بن ثابت منبراً فی الـمسـجد یقوم علیه قائماً یفاخر عن رسول اللهﷺ اوقال ینافح عن رسـول الـلـه ﷺ ویـقـول رسول اللهﷺ إنّ الله یؤید حسّان بروح

القدس ما ینافع او یفاخر عن رسول اللہ ﷺ(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت حسان بن ثابتؓ کے لیے مسجد میں منبر رکھوا دیتے تھے۔ جس پر وہ بیٹھ جاتے تھے اور نبی کریم ﷺ کی طرف سے فخریہ اشعار پڑھتے تھے یا (یہ کہا کہ) نبی کریم ﷺ کی مدافعت میں (قریش کے اشعار کے جواب میں) اشعار پڑھتے تھے۔ نبی کریم ﷺ ایسے موقع پر فرماتے کہ اللہ تعالیٰ روح القدس سے حضرت حسانؓ کی امداد فرماتے ہیں جب تک وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے دفاع کرتے ہیں۔ یا یہ کہا کہ ان کی طرف سے مفاخرہ کرتے ہیں۔

حسان بن ثابت اوران کی جہادی شاعری کی تحسین: حسان بن ثابت ابوالولید حسان بن ثابت انصاری خزرجیؓ مشہور صحابی ہیں۔ شعراء اسلام میں سب سے ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ حضرت ابو عبیدہؒ کا قول ہے کہ عرب کا اس پر اجماع ہے کہ حسانؓ ''اشعر اهل المدر'' ہیں۔ یعنی شہری علاقوں میں رہنے والے شعراء میں سب سے بہترین شاعر ہیں۔ نیز یہ بھی ابوعبیدہؒ کا قول ہے کہ حسانؓ کی فضیلت دیگر شعراء پر تین وجوہ سے ہیں۔

(۱) وہ جاہلیت میں شاعر الانصار تھے۔

(۲) زمانہ نبوت میں شاعر رسول اللہ ﷺ تھے۔

(۳) اسلام کے زمانہ میں شاعر یمن تھے۔

جب قریش کے بعض منہ پھٹ شاعروں نے نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کی ہجو میں اشعار کہے تو لوگوں نے حضرت علیؓ سے جواب کہنے کی درخواست کی۔ انہوں نے کہا کہ نبی کریم ﷺ اگر اجازت دیں تو جواب دوں گا تو لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے حضرت علیؓ کے لیے اجازت طلب کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا

(۱) سنن ابی داؤد ۲/۳۳۵ کتاب الادب باب ماجاء فی الشعر، جامع ترمذی ۲/۵۷۳ کتاب الاستذان والادب باب ماجاء فی الشعر، المستدرک للحاکم ۳/۴۸۷، مسند احمد ۶/۷۲ (مختار)

کہ جوقوم نبی کریم ﷺ کی تلواروں سے مدد کرتی آئی ہے وہ زبانوں سے اس کی نصرت کیوں نہیں کرتی۔ اس پر حضرت حسانؓ نے حامی بھرلی کہ یہ کام میں کروں گا۔ نبی کریم ﷺ نے دریافت فرمایا کہ تم قریش کی ہجو کیونکر کروگے حالانکہ میں انہی میں سے ہوں اور وہ میرے بھائی بندے ہیں۔ حضرت حسانؓ نے کہا کہ میں آپ ﷺ کو اس طرح ان سے نکال لونگا جیسے گندھے ہوئے آٹے سے بال کو نکالا جاتا ہے۔ چنانچہ آپؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے پاس جا کر قریش کے انساب کا پتہ لگایا اور پھر بنو ہاشم اور مسلمان خاندانوں کو چھوڑ کر دیگر قریش کی خوب درگت بنائی۔

آپؓ کو بڑی طویل عمر بخشی گئی تھی۔ ایک سو بیس سال تک زندہ رہے۔ اس میں ۶۰ سال کفر میں اور ۶۰ سال اسلام میں گزارے۔ بلکہ ان کے والد، دادا اور پردادا بھی ایک سو بیس سال تک زندہ رہے تھے۔ آپؓ کی تاریخ وفات کے بارے میں مختلف اقوال ہیں ۴۰ھ یا ۵۰ھ یا ۵۴ھ کو وفات پائے۔

یضع لحسان یعنی آپ ﷺ کسی کو حکم دے کر مسجد میں منبر رکھواتے تھے تاکہ حسانؓ اس پر چڑھ کر قریش کے اشعار کا مقابلہ کریں۔

او قال ینافح راوی کو شک ہوا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے **یفاخر** کا لفظ بولا تھا۔ یا **ینافح**۔ **یفاخر** معنی تو واضح ہے اور ینافح کا معنی یخاصم اور یدافع ہے۔ یعنی آپؓ قریش کی ہجو کا جواب دیکر نبی کریم ﷺ کی مدافعت فرماتے تھے اور مقابلے میں ہجو کرنے والوں کی ہجو کرتے تھے۔

نبی کریم ﷺ کا یہ اہتمام فخر و تکبر کی بنیاد پر نہ تھا(۱) بلکہ چونکہ کفار سے ہر میدان میں مقابلہ مقصود ہوتا تھا۔ ان کی حوصلہ شکنی اور زبان بندی بھی جہاد کا حصہ تھی۔ اس لئے حضرت حسانؓ کے اس عمل کو جہاد باللسان قرار دیکر آپ ﷺ ان کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے اور مدحیہ اشعار کہلواتے تھے۔

یؤیّد حسان بروح القدس روح القدس جبرئیلؑ کا لقب ہے اور اس کی تائید کا معنی یہ ہے کہ وہ حسان بن ثابتؓ کو بلیغ کلام اور منہ توڑ جواب کا الہام فرماتے ہیں۔ نیز دشمنوں اور دیگر آفات و بلیات سے ان کی حفاظت فرماتے ہیں۔

---

(۱)فإنّ التکبر علی الکافرین قربة و علی سائر المتکبرین صدقة(جمع الوسائل ج ۲ ص ۵۶)(مختار)

بہرحال اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اشعار کا کہنا ناجائز نہیں بلکہ اگر نبی کریم ﷺ کی مدح، کفر کی ہجو، اسلام کی حمایت اور کفر کی مذمت پر مشتمل ہو تو موجب ثواب ہے حتی کہ مسجد میں برسرمنبر کہنے سے نبی کریم ﷺ راضی ہوتے ہیں۔

(۱۱) حدثنا إسماعيل بن موسیٰ و علی بن حجر قالا ثنا ابن ابی الزناد عن ابیه عن عروة عن عائشةؓ عن النبی ﷺ مثله(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کی سابقہ روایت لفظاً و معنی ایک دوسری سند سے مذکور ہے۔

مثله یعنی انہی الفاظ کو دوسری سند سے بھی روایت کیا گیا ہے۔امام ترمذیؒ محض سابقہ روایت کی تائید وتقویت کے لیے یہ دوسری سند لارہے ہیں۔

---

(۱)سنن ابی داؤد ۲/ ۳۳۵ کتاب الادب باب ماجاء فی الشعر، جامع ترمذی ۲/ ۵۷۳ کتاب الاستئذان والادب باب ماجاء فی الشعر، مسند احمد ۶/ ۷۲، المستدرک للحاکم ۳/ ۴۸۷ (مختار)

خلاصۂ باب

نبی کریمﷺ شاعرنہیں تھے۔مگر شعرفہی کے ملکہ اوراد بی ذوق سے بہرہ مند تھے۔خودشعرگوئی کے بارے میں آپﷺ سے مختلف قسم کی روایات مروی ہیں۔ چنانچہ بعض روایات میں شعرکوزہر سے بھی بدتر کہا گیا ہے۔قرآن نے تو شعراءکوگمراہوں کے لیڈروں کا خطاب دیا ہے۔ملاعلی قاریؒ نے ایک حدیث بیان کی ہے کہ ابلیس لعین کو جب زمین پر اتارا گیاتو اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ اے رب مجھے بھی ایک قرآن (یعنی کتاب پڑھنے کے لیے) عطافرما۔تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ"قرآنک الشعر" کہ تیرا قرآن شعر ہے۔ایک دفعہ نبی کریمﷺ نے ایک شاعرکوگاتے ہوئے دیکھاتو فرمایا"خذوا الشیطان اوقال امسکوا الشیطان "یعنی اس شیطان کوروکو۔اسی طرح مسجد میں اشعار کہنے سے آپﷺ نے منع فرمایا ہے۔

دوسری طرف یہ بھی ثابت ہے کہ صحابہ کرامؓ آپﷺ کی مجلس میں اشعار کہتے تھے۔آپﷺ سنتے تھےتقریباًمسکراتے تھے۔پرحکمت اشعارسنانے کی خودفرمائش بھی کرتے تھے۔اورشعر کہنے والے کو دعائیں دیتے تھے۔جبرئیل امینؑ کی مدد کا یقین دلاتے تھے۔خودمسجد ہی میں بڑے اہتمام کے ساتھ منبرلگوا کرشاعرِرسولﷺ کوکلام پیش کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ بلکہ ہجوبالشعرکومؤمن کا جہاد کہا کرتے تھے۔اور کافروں کی تذلیل سے خوش ہوتے تھے۔خودبطورتمثیل واستشہادشعراءِجاہلیت کا کلام نقل کرتے تھے۔اور کافرشعراء کے اچھے کلام کوحکیمانہ کہہ کراس کی مدح بھی کرتے تھے۔

تصویر کے دونوں رخ دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں رہتا کہ شعردوقسم کے ہوتے ہیں۔اول زہر میں بجھے ہوئے اشعارقبیح اشعار،جن میں ناجائزجنسی اوررومانی مضامین،تغزل یامدح وہجو سے متعلق جھوٹ ہو۔یاپھرعصبیت اورقوم پرستی اوراختلافات کوہوادینے والی رزمیہ باتیں ہوں۔اول الذکراحکام ایسے اشعار سے متعلق ہیں جبکہ مؤخرالذکراحکام ان اشعارکے بارہ میں ہیں۔جوحسن ہوتے ہیں۔ان میں حق کی حمایت،اللہ اوررسول کی مدح سرائی اورخدا کے دشمنوں کی زبان بندی،جھوٹ،مسلمانوں کی اذیت،بیہودہ

اور فحش مضامین سے یہ پاک ہوتے ہیں۔

اس باب میں جتنے بھی احادیث وارد ہوئے ہیں۔اس میں شعر کے ساتھ مثبت تعلق معلوم ہوتا ہے۔اس طرح کہ مستحسن اشعار کی تحسین کی گئی ہے اور اچھے اشعار سنانے کی فرمائش آپ ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمائی ہے۔

پھر جو اشعار خود آپ ﷺ کی زبان مبارک پر وارد ہوئے ہیں۔وہ یا تو دوسرے شعراء کے اشعار ہیں جو بطور تمثل آپ ﷺ نے پیش فرمائے ہیں۔یا پھر ایک ایسا کلام آپ ﷺ کی زبان پر بلا قصد وارد ہوا ہے جو اتفاق سے موزوں بھی ہے۔لہٰذا عدم قصد کی وجہ سے وہ شعر کی تعریف میں داخل نہیں ہے اور بعض الفاظ رجز کے قبیلے سے ہے جو نثر میں داخل مانا جاتا ہے۔

(اللھم صلی علی افصح العرب صاحب جوامع الکلم بعدد من تکلم)

۳۸. باب ما ء جاء فی کلام رسول اللہ ﷺ فی السمر

رسول اللہ ﷺ کے قصہ سنے اور سنانے کے بیان میں

اس سے قبل نبی کریم ﷺ کے مطلق کلام کا ذکر ہوا۔ پھر نبی کریم ﷺ کی بشاشت، حسن خلق اور اس کے بعد شعر وشاعری کے ساتھ آپ ﷺ کے کلام کا تعلق بیان ہوا۔ اب نبی کریم ﷺ کے کلام کے ایک دوسرے صنف مسامرہ کا ذکر ہے جو کہ حدیث اللیل یعنی رات کے وقت یاروں دوستوں یا بیوی بچوں کے ساتھ گپ شپ کو کہتے ہیں۔

یہ سمر سکون میم یا سمر میم مفتوحہ سے ہے۔ اور اس کے اصل معنی چاندنی کے ہوتے ہیں چونکہ عرب لوگ عموماً صحراؤں اور خیموں میں رہا کرتے تھے۔ اس لئے ان کی رات کی مجلسیں عموماً چاند کی روشنی میں منعقد ہوتی تھیں۔ آج کل بھی دیہاتی پٹھان لوگ گاؤں سے باہر کشادہ فضا میں گپ شپ کیلئے نکلتے ہیں کیونکہ چاند کی روشنی میں یہ مجالس بہت دلچسپ اور پر لطف ہوتی ہیں۔ اور چونکہ رات یا چاندنی کا وقت اس مخصوص قصہ گوئی اور گپ شپ کیلئے ظرف زمان ہوتا ہے۔ اس لئے ظرفیت کے اس علاقہ کی بنا پر سمر کا اطلاق خود ان مجلسوں پر ہونے لگا۔

<u>رات کی قصہ گوئی اور حدیث اللیل کی کراہیت میں تطبیق:</u> اس باب میں یہ بیان کیا جارہا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے رات کو باتیں کی ہیں اور دوسروں سے سنی ہیں۔ لہٰذا یہ جائز ہے۔ لیکن یہاں یہ اشکال ضرور وارد ہوتا ہے کہ بعض روایات میں حدیث اللیل کی کراہت بھی مذکور ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ

وکان (النبی ﷺ) یکرہ النوم قبلھا (یعنی قبل صلوٰۃ العشاء) والحدیث بعدھا(۱).

تو نبی کریم ﷺ نے خود اس کا ارتکاب کیوں کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ مسامرہ ممنوع ہے جو خرافات لغو باتوں، فضول گوئی یا غیر شرعی اور مذموم اقوال وافعال پر مشتمل ہو۔ یا پھر اس حد تک اس میں منہمک ہوجائے کہ نیند کا سارا وقت اس میں صرف ہو۔ اور پھر نماز تہجد کیلئے اٹھنا تو در کنار صبح کی نماز کیلئے اٹھنے میں بھی تکلیف ہو۔ دن کو تعلیم وتعلم اور دوسرے واجبات کیلئے رکاوٹ بنے۔ چونکہ اس طرح کی قصہ

---

(۱) متفق علیہ بحوالہ مشکوٰۃ جلد ۱ صفحہ ۶۲

گوئی دینی امور میں حرج کا باعث ہے اس لئے ممنوع ہے۔ بہتر صورت یہ ہے کہ رات کوجلدی سویا جائے اور صبح سویرے اٹھا جائے۔ یہ صحت، دماغ اور دیگر مقاصد کیلئے بہت مفید ہے۔ بعض دیہاتوں میں جہاں رات کو کھانا کھانے کے بعد جلد ہی نماز عشاء پڑھی جاتی ہے اور پھر لوگ سوجاتے ہیں۔ وہاں لوگوں کی صحتیں قابل رشک ہوتی ہیں۔ صبح سویرے اٹھنا بھی مشکل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس نئی تہذیب وتمدن کے مطابق لوگ ساری رات سینماؤں، کلبوں اور بیٹھکوں میں جاگ کر گزار دیتے ہیں۔ اور صبح قریب ہوتے ہی سوجاتے ہیں۔ پھر دوپہر دس گیارہ بجے تک نیند پوری نہیں ہوتی۔ اس سے ایک طرف تو ترک فرائض کے سبب سارا دن نحوست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں جسمانی طور پر بھی بشاشت، نشاط اور تازگی مفقود ہوتی ہے۔

سمر میں اعتدال: ان تمام حکمتوں کے سبب رسول اللہﷺ نے سمر سے منع فرمایا۔ لہٰذا وہ ساری گپ شپ جو تھکاوٹ اور ملال کا سبب ہوگی اور دین واخلاق کیلئے مضر ہوگی جائز نہیں۔ لیکن دراصل اس باب میں نفس جواز کی طرف اشارہ ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص تھوڑی دیر کیلئے اپنی بیوی بچوں کے ساتھ ان کی دلجوئی کیلئے گپ شپ اور دل لگی کرے۔ یا دوست آپس میں عمومی گفتگو یعنی غیر باطل کلام کے ذریعے گپ شپ لگائیں تو کوئی حرج نہیں۔ علاوہ ازیں دینی مجالس اور مذہبی تقاریر پر بھی مسامرہ کا اطلاق نہیں ہوگا۔ اگر چہ وہ جلسے جو رات گئے تک منعقد ہوتے ہیں مضرات سے خالی نہیں کیونکہ اس طرح آدمی دن کے وقت کسی کام کا نہیں رہتا۔ بلکہ تجربہ یہ ہے کہ اگر ایک رات جاگ کر کسی جلسے اور پھر خصوصاً سیاسی جلسے میں گزار دی جائے تو دس دن تک دماغ کو اعتدال نصیب نہیں ہوتا اور طبیعت نہیں کھلتی۔ لہٰذا افراط تو بہر حال ممنوع ہے۔ لیکن حدود کے اندر اور شرعی پابندیوں کے اندر سونے سے قبل خوش طبعی کیلئے باتیں کرنا جائز ہے بلکہ بعض علماء نے حسن معاشرت کے انداز میں بیوی یا دیگر گھر والوں کی تفریح طبع کیلئے اسے مسنون کہا ہے۔ اس بارے میں دو حدیث اس باب میں بیان کئے جاتے ہیں۔ جن میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ نبی کریمﷺ کی زندگی میں رہبانیت اور کلی طور پر دنیا سے انقطاع نہیں بلکہ آپﷺ کبھی کبھی گپ شپ بھی لگایا کرتے تھے۔

(۱) حدّثنا الحسن بن صبّاح البزّار ثنا أبوالنصر ثنا أبوعقيل الثقفيّ عبدالله بن عقيل عن مجالد عن الشعبي عن مسروق عن عائشة قالت حدّث رسول اللهﷺ ذات (۱) ليلة نساء ه حديثا فقالت امرءة منهنّ كان الحديث حديث خرافة فقال أتدرون ما خرافة إنّ خرافة كان رجلا من عذرة أشرته الجنّ في الجاهليّة فمكث فيهم دهرا ثمّ ردّوه إلى الإنس فكان يحدّث الناس بما رأى فيهم من الاعاجيب فقال الناس حديث خرافة(۲).

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کہتی ہیں کہ ایک رات کو نبی ﷺ نے اپنی بیویوں کوایک قصہ سنایا۔ان بیبیوں میں سے ایک نے کہا کہ یہ قصہ تو حیرت اور چاشنی میں بالکل خرافہ کی باتوں جیسا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کیاتم جانتی ہو کہ خرافہ کون تھا (پھر بتاتے ہوئے فرمایا) خرافہ بنوعذرہ کا ایک آدمی تھا۔ جسے جاہلیت کے زمانہ میں جنات پکڑ کر لے گئے تھے۔ایک عرصہ تک وہ جنات کے درمیان ٹھہرا رہا۔پھر جنات نے اسے لوگوں میں واپس کردیا۔پھر وہ لوگوں کووہ عجیب وغریب باتیں جواس نے جنات میں دیکھی تھیں سنایا کرتا تھا۔اسی وجہ سے لوگ (کسی عجیب بات کوسن کر) کہتے ہیں کہ یہ خرافہ کی بات ہے۔

حدّث رسول اللهﷺ الخ اس حدیث میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے وہ یاتو امم ماضیہ کا کوئی قصہ تھا یا جنت دوزخ یا دیگر اقوام وملل کا کوئی دلچسپ واقعہ تھا۔اس مجلس میں بہت سی بیبیاں بیٹھی ہوتی تھیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ ساری بیویوں کی دلجوئی بھی فرمایا کرتے تھے اور اجتماعی طور پر بھی ان کے ساتھ نشست وبرخاست اور گپ شپ لگایا کرتے تھے۔جس طرح کہ اس موقع پر ساری

(۱) عربی لغت میں ذات کے متعدد معانی ہیں (۱) ذات بمعنی حال (۲) بمعنی شب وروز کا کوئی سالحہ (۳) بمعنی انسان (۴) بمعنی نفس (۵) بمعنی ارادہ وعزائم۔یہاں پر دوسرا معنی یعنی دن ورات میں سے کوئی لحہ (مختار)

(۲) مسنداحمد ۶/ ۱۵۷

بیویاں اس قصہ کو سن رہی تھی۔

خرافۃ اوراس کی باتیں: کان الحدیث حدیث خرافۃ ان ازواج مطہرات میں سے ایک نے کہا کہ یہ قصہ تو خرافہ کے قصوں کی طرح معلوم ہوتا ہے اور خرافہ کے قصوں سے تشبیہ محض عجیب اور حیران کن ہونے کے لحاظ سے ہے۔ دلچسپ وعجیب اور غیر مانوس بات کو خرافہ کی بات سے تشبیہ دے سکتے ہیں کیونکہ خرافہ ایسی باتیں کیا کرتا تھا جو کہ انسانوں کی باتیں نہ تھیں بلکہ عجیب اور بے سروپا باتیں ہوتی تھیں۔ تو یہ بی بی بھی آپ ﷺ کی باتوں کو محض عجیب ہونے کے سبب خرافہ کی بات سے تشبیہ دے رہی ہیں۔ جھوٹ ،افسانویت، یا بیہودگی میں تشبیہ مقصود نہیں ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا کلام ان امور سے پاک ہوتا تھا۔

عورتوں کو صیغۂ مذکر سے خطاب: اتدرون ما خرافۃ الخ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم نے تشبیہ تو دی لیکن کیا تمہیں خرافہ کا کچھ پتہ بھی ہے کہ خرافہ کون تھا۔ بیبیوں کو خطاب کی وجہ سے یہاں اُتدرین چاہیے تھا۔ لیکن عورتوں کو مردوں کے صیغہ تخاطب کے ساتھ خطاب کیا جو کبھی کبھی کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید اور حدیث میں اس کی نظیریں موجود ہیں۔ مجد وشرف اور اعزاز کے طور پر عورتوں کو مردوں کے خطاب سے بھی پکارا جاتا ہے۔ یہ کبھی تو تغلیب کی وجہ سے کیا جاتا ہے یعنی عورتوں اور مردوں کی مخلوط جماعت کو مخاطب کیا جاتا ہے اور مردوں کو تغلیب دینے کی بناء پر مذکر کا صیغہ لایا جاتا ہے۔ اور یہ نہ بھی ہو تو صرف عورتوں کو بھی اعزاز واکرام کے طور پر اس قسم کا خطاب ناجائز نہیں۔ اس بات پر تنبیہ کیلئے کہ عورتیں اگر چہ ناقصات العقل والدّین ہیں۔ لیکن تم مخاطب کامل العقل والدّین ہو۔ اور اس مقام پر تو خصوصی طور پر یہ بات زیادہ ملحوظ ہوگی کیونکہ عائشہ رضی اللہ عنہ وغیرہا کو کون ناقصۃ العقل کہہ سکتا ہے؟ تو آپ نے شرف، کمال علم اور شرف ملازمہ کیوجہ سے ان کو مردوں کا درجہ دیگر مردوں کے صیغہ سے مخاطب کیا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ ان عورتوں کی جماعت کی تاویل اشخاص سے کر کے آپ ﷺ نے جمع مذکر کا صیغہ استعمال فرمایا۔ قرآن میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''و کانت من القانتین'' اس میں حضرت مریم علیہ السلام کو قانتات کی بجائے قانتین سے گنا گیا ہے۔ دوسری جگہ ازواج مطہرات کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا انّما یرید اللّٰہ لیذھب عنکم الرجس أھل البیت ویطھّرکم تطھیرا حالانکہ یہاں پر عنکن اور یطھّرکن

چاہیے تھا۔سورۃ القصص میں موسیٰ علیہ السلام کی ماں کے بارے میں فرمایا ان کادت لتبدی به لولا ان ربطنا علی قلبها لتکون من المؤمنین.(الآیة)

چنانچہ مؤمنات کی جگہ مؤمنین کا ذکر ہوا۔ایک شاعر اپنی بیویوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ

ع ولوشئت طلقت النساء سواکم. اگر میں چاہوں تو تمہارے سوا سب عورتوں کو چھوڑ دوں

حالانکہ یہاں سواکن چاہیئے تھا(۱)۔

قبیلہ عذرہ: من عذرہ الخ عذرہ یمن کے ایک قبیلہ کا مقام ہے۔اس قبیلہ کی عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ بہت محبت کرتی تھیں۔ایک مؤرخ لکھتا ہے کہ میں عذرہ قبیلہ میں گیا تو وہاں کوئی بوڑھا مجھے نظر نہ آیا۔مجھے تعجب ہوا میں نے پوچھا تو لوگ کہنے لگے کہ ہماری بیویاں بہت حسین وجمیل ہیں اور خاوندوں کے ساتھ ایسی محبت سے پیش آتی ہیں کہ آدمی کو سرے سے بوڑھا نہیں ہونے دیتیں۔حقیقت بھی یہی ہے کہ بیوی اگر ٹھیک نہ ہو تو مرد کو بہت جلد بوڑھا کر دیتی ہے۔جب پریشانیاں زیادہ ہوتی ہیں تو بڑھاپا جلدی آتا ہے(۲)۔

عربوں میں محاورہ کے طور یہ بات بھی مستعمل ہے کہ "فی العذر معذرةٌ" اس میں بھی عذر سے یہی عذرہ کا قبیلہ مراد ہے۔اور مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی بنو عذرہ میں کہیں دل لگا بیٹھے تو وہ قابل ملامت نہیں بلکہ افراط حسن اور کثرۃ خلوص کے باعث معذور سمجھا جائے گا۔قصیدہ بردہ کے ایک شعر میں

---

(۱) اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر آتے ہوئے کوہ طور آئے۔تو اپنی بیوی سے فرمایا کہ امکثوا إنّی آنست ناراً لعلی آتیکم بخبرٍ (الآیة) حالانکہ امکثی اور آتیک کہنا چاہیے تھا۔بخاری شریف میں آتا ہے إنّ بعض ازواج النبیّ ﷺ قلن للنبیّ ﷺ اینا أسرع طوقاقال أطولکن یداً فاخذوا قصبةً یذرعونها فکانت سورة الحدیث . حالانکہ یہاں فاخذن قصبةً یذرعن ہونا چاہیے تھا۔(۱۲اصلاح الدین)

(۲) قصیدہ بردہ کے شارحین نے اس حکایت کو قدرے تغیر کے ساتھ تحریر کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ اس قبیلے کے لوگ عموماً جوانی کے ایام میں فرط عشق کی وجہ سے مرجاتے تھے تو ایک عذری سے اس کے متعلق پوچھا گیا۔اس نے جواباً کہا "فی قلوبنا خفة و فی نساء ناعفة" (شیخ زادہ) یعنی ہمارے دلوں میں وفور عشق کی وجہ سے میلان زیادہ ہوتا ہے۔اور کمال حسن کے باوجود ہماری عورتیں فحش وزنا سے عفیف اور پاکدامن رہتی ہیں۔

(شرح عمر الخرپوتی وشرح شیخ زادہ علی البردہ ص۲۴)(اصلاح الدین)

علامہ شرف الدین محمد بن سعید بوصیریؒ نے عذرہ قبیلہ کی اسی محبت کی طرف اشارہ فرمایا ہے(۱)۔

أسرته الجن الخ جنات کا وجود حق ہے۔جاہلیت کے زمانے میں جنات کا غلبہ زیادہ ہوتا تھا۔اسلام کے بعد ان کے فاسد اثرات کا سلسلہ بہت حد تک رک گیا۔اگر چہ اب بھی کچھ کچھ باقی ہے لیکن اب وہ اسلامی مارشل لاء کے تحت ہیں تا کہ وہ اسلامی نظریات وتعلیمات میں گڑبڑ نہ کرسکیں۔اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی تدلیس وتلبیس سے اس دین حق کو محفوظ رکھنا تھا۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے جنات پر پہرے بٹھادیئے۔سورۃ الجن میں اس پابندی کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔

بما رأیٰ فیھم من الاعا جیب الخ جنات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد وہ وہاں کے عجیب مشاہدات مرچ مصالحہ لگا کر بیان کرتا تھا۔اس قسم کی عجیب روایات راوی کے نام کی وجہ سے خرافات کہلانے لگیں۔فقال الناس حدیث خرافة الخ یعنی پھر جو بے سند لایعنی اور فضول سی باتیں ہوتی تھیں۔لوگ کہتے کہ یہ خرافہ کی بات ہے۔گویا تشبیہ کے سبب حیرت انگیز واقعات پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔مثلاً اگر کوئی کہے کہ میں نے ایک گھوڑا دیکھا جس کے دس کان بیس پاؤں اور پانچ دم تھے۔میں اس پر سوار ہو گیا وغیرہ وغیرہ۔

ابوالعلاء مصرع عظیم شاعر گزرے ہیں متقدمین میں علم ادب کے امام ہیں۔مادرزاد اندھے تھے۔ کہتے ہیں کہ وہ ملحد بھی تھا اور آخرت کا منکر تھا۔اپنی بیوی کو مخاطب کر کے وہ کہتے ہیں۔

حیاة ثم موت ثم بعث　　حدیث خرافة یا امّ عمرو

---

(۱)فرماتے ہیں　یالائمی فی الھویٰ العذری معذرة　منیّ الیک ولوانصفت لم تلم

ترجمہ: ای عذری محبت میں مجھے ملامت کرنے والے میری طرف سے تجھے عذر پیش ہے اور اگر تو انصاف کرتا تو مجھے ملامت نہ کرتا۔

قصیدہ بردہ کے شارحین نے لکھا ہے کہ اصمعیؒ اس قبیلہ کے بارے میں جانتے تھے۔اس کی روایت کے بارے میں عذرہ کا ایک عاشق اس وقت مرگیا جب اس نے محبوبہ کے قافلے کی گرد دیکھی۔مولانا افتخار علی دیوبندی عطر الوردہ میں لکھتے ہیں کہ بنو عذرہ کی عمریں فرط عشق کی بناء پر تیس سال سے تجاوز نہیں کرتیں اور جب ایک عذری سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تو وہ کہنے لگا فی قلوبنا رقة و فی نساء ناجمال و عفة ترجمہ: ہمارے دلوں میں رقت اور عورتوں میں خوبصورتی اور پاکدامنی ہے۔(اصلاح الدین)

یعنی کیا زندگی اس کے بعد موت اور پھر دوبارہ زندہ ہونا حق ہے۔اے ام عمرو یہ تو خرافہ والی بات ہے یعنی بے سروپا اور غیر متوزان سی بات ہے۔ بعد میں خرافہ کے نام سے مشتق افعال بھی استعمال ہونے لگے اور اسی وجہ سے اس مادے میں دماغی عدم توازن کا مفہوم پایا جاتا ہے کہتے ہیں کہ خَرِفَ الرجُلُ جب وہ الٹی سیدھی اور بے سروپا باتیں کرنے لگے(۱)۔

اس کے بعد حدیث ام زرع کا بیان ہے۔

حدیث ام زرع: یہ حدیث اس باب کی دوسری حدیث ہے اور اس میں بھی رات کو قصہ گوئی کا ذکر ہے مگر اس حدیث کو مستقل عنوان دیا گیا ہے کیونکہ اس میں گیارہ عورتوں کا اپنے شوہروں کے بارے میں بیان ہے خوب فصیح و بلیغ انداز سے وہ شوہروں کے ساتھ انداز معاشرت کا اظہار کرتی ہیں اور خصوصا آخری عورت ام زرع کا بیان نہایت اہم ہے اس حدیث پر مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں اور شارحین نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اسکی تشریحات کی ہیں۔عربی ادب اور لغت کے اعتبار سے اسمیں بہت اہم مواد موجود ہے۔ گیارہ عورتوں میں سے آخری عورت ام زرع کا بیان چونکہ نہایت مفصل اور جامع مانع ہے پھر نبی کریم ﷺ نے بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی تشبیہ ام زرع سے دی تھی۔یعنی ابوزرع کے ہاں ام زرع کا جو مقام تھا اور جو حیثیت تھی اسی طرح کی محبت آپ ﷺ کو حضرت عائشہ رضی اللہ سے تھی تو اس خصوصیت اور اہتمام کی

(۱) شیخ عبدالجواد الدومیؒ نے حدیث مبارک سے عشاء کے بعد اپنے اہل وعیال سے اچھی اور دلجوئی کی باتیں کرنے اور دل لگی کرنے کے جواز کا استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے ویؤخذ من الحدیث حسن معاشر الرجل لاھله وسمرة معھم واخبارہ لھم بالخفیف من الامور وقصته علیھم القصص المفیدة اقتداء به ﷺ فإن التشبه باھل الفلاح فلاح(الاتحافات ۲۹۸، ۲۹۹) البتہ جن روایات میں عشاء کے بعد قصہ گوئی اور گفتگو سے منع وارد ہے۔اس سے مراد بیہودہ کلام ہے۔علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے والنھی الوارد عن الکلام بعدالعشاء محمول علی مالایعنی عن الکلام بعدالعشاء ولذالک قال فی المنھج و کرہ نوم قبلھا وحدیث بعدھا الافی خیر(المواھب اللدنیة ۱۶۲) اور علامہ ملاعلی قاریؒ نے دونوں متعارض روایات کے مابین تطبیق کرتے ہوئے لکھا ہے۔فالنھی الوارد محمول علی کلام الدنیا مالایعنی فی العبقیٰ والحکمة ان یکون خاتمة فعله وقوله بالحسنیٰ ومکفرة لما وقع له فیما مضیٰ(جمع الوسائل ۵۸/۲)(مختار)

وجہ سے اس کے نام سے اس حدیث کو معنون کردیا گیا ورنہ یہاں تو گیارہ عورتیں ہیں سب نے شوہروں کا بیان کیا ہے۔

قطعی طور پر ان عورتوں کے نام معلوم نہیں ہو سکے اگر چہ بعض مورخین نے ان کے ناموں اور شجروں پر بحث کی ہے کہ یہ عورت فلاں قبیلے کی فلاں خاتون تھیں۔ خطیب بغدادی تو ان کے اسماء کا مسئلہ مبہمات میں سے شمار کرتے ہیں جنہوں نے آٹھ عورتوں کے ناموں کی تعین کی ہے ام زرع کا نام عاتکہ بتایا ہے عرب صحرائی اور خانہ بدوش زندگی گزارنے کے عادی تھے یہ عورت بھی ایک دیہاتی عورت تھی جس کا تعلق مکہ، یمن یا جمار کے دیہاتی علاقوں سے تھا۔ مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

(۲) حدّثنا عليّ بن حجر قال أنا عيسٰى بن يونس عن هشام ابن عروة عن أخيه عبدالله بن عروة عن عروة عن عائشةؓ قالت جلست احدىٰ عشرة امرلةً فتعا هدن و تعاقدن ان لاّ يكتمن من أخبارازواجهنّ شيئاً (۱)فقالت الاولى زوجي لحم جمل غث على راس جبل وعرٍ لا سهلٍ فيرتقىٰ ولاسمينٌ فينتقىٰ(۲) قالت الثانيةزوجي لا ابثّ خبره إنّي أخاف ان لا اذره ان اذكره اذكر عجره وبجره(۳) قالت الثالثةزوجي العشنق ان انطق أُطلق فان اسكت اعلّق(۴) قالت الرابعةزوجي كليل تهامة لاحرّ ولا قرّ ولامخافة ولاسامة(۵) قالت الخامسةزوجي ان دخل فهدوان خرج اسد ولايسال عمّا عهد (٦)قالت السادسة زوجي ان اكل لفّ وان شرب اشتّف وان اضطجع التّف ولايولج الكفّ ليعلم البث(۷) قالت السابعةزوجي عيا ياء اوغياياً طباقاء كل داء له داءٌ شجّك او فلّك اوجمع كلّالك (۸)قالت الثامنةزوجي المسُّ مسّ ارنب والريح ريح زرنب(۹) قالت التاسعةزوجي رفيع العماد عظيم الرّماد طويل

النّجاد قريب البيت من النّاد(١٠) قالت العاشرةزوجی مالک وما مالک مالک خيرٌ من ذلک له ابل كثيرات المبارک قليلات المسارح اذا سمعن صوت المزهر ايقنَّ إنّهنّ هوالک (١١)قالت الحادیةعشرة زوجی أبوزرع و ما أبو زرع اناس من حلیّ اذنیّ وملاثمن شحم عضدیّ وبحجنی فبجحت إلیّ نفسی وجدنی فی اهل غنيمة بشقٍّ فجعلنی فی اهل صهيل واطيط ودآئس ومنقّ فعنده اقول فلا اقبّح وارقد فاتصبّح واشرب فاتقمّح امّ أبی زرع فما امّ أبی زرع عكومها رِداح وبيتها فساح ابن أبی زرع فما ابن أبی زرع مضجعه كمسل شطبة و تشبعه ذراع الجفرة بنت أبی زرع فما بنت أبی زرع طوع ابيها وطوع امّها وملاكسائها و غيظ جارتها جارية أبی زرع فما جارية أبی زرع لاتبثّ حديثنا تبثيثا ولاتنقث ميرتنا تنقيثا ولا تملأً بيتنا تغشيشا قالت خرج أبوزرع والاوطاب تمغض فلقی امراةً معها ولدان لها كالفهدين يلعبان من تحت خصرهابرمّانتين فطلّقنی فنكحت فنكحت بعده رجلا سريّاركب شريّا واخذ خطّيّا واراح علّی نعما ثريّا واعطانی من كلّ رائحة زوجا وقال كلی امّ زرع و ميری اهلک فلو جمعت كلّ شئی اعطانيه مابلغ اصغرانية أبی زرع قالت عائشة فقال لی رسول اللہﷺ كنت لک كأبی زرع لامّ زرع(١).

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ گیارہ عورتیں اکٹھی بیٹھ گئیں اور اپنے درمیان اس معاہدہ اور عہد پر اتفاق کرلیا کہ وہ اپنے خاوندوں کے حالات میں سے کچھ بھی نہیں چھپائیں گی (بلکہ ٹھیک ٹھیک بیان کریں گی) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ

(١)صحيح بخاری ٧٧٩/٢ كتاب النكاح باب حسن المعاشره مع الاهل، السنن الكبرىٰ للنسائی ٣٥٤/٦ كتاب عشرة النساء ابواب حقوق الزوج باب شكر المرأة لزوجها(مختار)

کہتی ہیں کہ تب (پہلی عورت بولی) کہ میرا خاوند کمزور ناکارہ اونٹ کے گوشت جیسا ہے(اور وہ بھی) پہاڑ کی چوٹی پر رکھا ہو نہ اس پہاڑ کا راستہ ہموار اور آسان ہے تا کہ اس پر چڑھ کر گوشت سے مستفید ہو سکیں اور نہ گوشت چربی والا ہے تا کہ (رغبت کی وجہ سے) اسے کھانے کیلئے چنا جائے (یا پہاڑ کی چوٹی سے اتار کر کھایا جائے)۔(دوسری کہنے لگی) کہ میں اپنے خاوند کی خبریں فاش نہیں کرتی میں ڈرتی ہوں کہ میں اسے (خاوند یا اس کی بات کو) نہ چھوڑ سکوں گی۔ اگر میں اس کا ذکر کروں گی تو اس کے ظاہری اور باطن عیوب سب کچھ ہی ذکر کروں گی۔(تیسری بولی) میرا خاوند لمبا تڑنگا آدمی ہے اگر میں بولتی ہوں تو مجھے طلاق دی جاتی ہے۔ اور اگر چُپ رہتی ہوں تو (ضروریات زندگی سے محروم رہ کر گویا) معلق رہتی ہوں۔(چوتھی بولی) میرا خاوند تہامہ کی رات کی طرح معتدل مزاج ہے نہ اس میں گرمی زیادہ ہے نہ ٹھنڈک۔ نہ اس سے خوف لاحق ہوتا ہے نہ دل اچاٹ ہوتا ہے۔(پانچویں بولی) میرا خاوند جب گھر میں داخل ہوتا ہے تو چیتا بن جاتا ہے اور جب باہر جاتا ہے تو شیر بن جاتا ہے۔اور (گھر میں) جو کام اس سے متعلق ہوتا ہے اس کا نہیں پوچھتا اگر سوتا ہے تو (کپڑے یا لحاف میں) سمٹ کر سو جاتا ہے اور (میری طرف) ہاتھ بھی نہیں بڑھاتا تا کہ اسے میری کچھ پراگندگی معلوم ہو سکے۔(چھٹی بولی) کہ میرا خاوند اگر کھاتا ہے تو سب نمٹا دیتا ہے۔ اور جب پیتا ہے تو سب چڑھا دیتا ہے۔اور جب سوتا ہے تو اکیلے ہی کپڑے میں لپٹ جاتا ہے۔میری طرف ہاتھ بھی نہیں بڑھاتا۔ جسے میری پراگندگی معلوم ہو سکے۔ساتویں بولی کہ میرا شوہر سست و درماندہ یا نامرد ہے یا یوں کہا کہ احمق و گمراہ ہے بھاری بھرکم (یا انتہائی سردمہر) ہے ہر بیماری اس میں موجود ہے(جب مارنے پر آئے) تو تیرا سر پھوڑ دے یا ہڈیاں توڑ دے یا دونوں کام کر ڈالے۔ (آٹھویں بولی) میرا خاوند چھونے میں خرگوش کی طرح نرم اندام ہے اور اس کی

خوشبو(خوشبودار بوٹی) زرنب جیسی ہے۔(نویں بولی) میرا خاوند(حسب وشرافت میں)بلند ستونوں والا(سردار) ہے بہت زیادہ راکھ کا مالک (سخی) ہے (تلوار کی)لمبی کاٹھی والا ہے۔ اس کا مکان مجلس (قومی جائے مشاورت) کے قریب ہے۔(دسویں بولی) میرا خاوند مالک(نامی شخص) ہے اور مالک کیا ہے؟ وہ اس (نویں عورت کے شوہر سے یا مذکورہ تمام شوہروں سے یا میری طرف سے آگے بیان ہونے والی صفات) سے بہتر ہے اس کے اونٹ ہیں جو اکثر مکان کے قریب بندے ہوئے اور کم ہی چراگاہ میں چرنے والے ہیں جب وہ اونٹ ساز کی آواز سن لیتے ہیں تو ان کو یقین ہوجاتا ہے کہ وہ ذبح کئے جانے والے ہیں۔ (گیارویں بولی) میرا خاوند ابوزرع تھا ابوزرع کیا تھا؟(ایک عظیم شخص تھا) اس نے زیوروں سے (پہنا کر) میرے دونوں کان جھکادیئے تھے اور میرے دونوں بازو چربی سے بھردیئے تھے مجھے اتنا خوش وخرم رکھا کہ میں خود کو پسند کرنے لگی۔اس نے مجھے جفاکش بکریوں والے(غریب) خاندان میں پایا جو تنگی کے دن رات بسر کرتا تھا پھر وہ مجھے ایسے خوشحال خاندان میں لے آیا جہاں ہنہناتے گھوڑے، بلبلاتے اونٹ، فصل کو گاہنے والے بیل اور اسے صاف کرنے والے نوکر چاکر (بکثرت) تھے(ان کی ناز برداری کی وجہ سے) میں ان کے ہاں جو بھی کہتی مجھے کوئی برانہیں کہتا تھا۔ میں سوتی تو دن چڑھے تک سوتی رہتی تھی، پیتی تو خوب سیر ہونے کے بعد بھی بتکلف پیتی تھی۔ (میری ساس)ابوزرع کی ماں بھلا وہ کون تھی اس کے کھانے کے بڑے برتن ہمیشہ بھرے رہتے تھے۔اس کا گھر نہایت وسیع تھا۔ابوزرع کا بیٹا وہ کون تھا (دبلا پتلا نوجوان) کہ اس کے سونے کی جگہ باریک چھڑی کی طرح تھی بکری کے بچے کا ایک دست اس کے پیٹ بھرنے کے لئے کافی ہے۔ابوزرع کی بیٹی بھلا وہ کون تھی؟ وہ اپنے باپ کی تابعدار اور اپنی ماں کی فرمانبردار تھی اور (موٹائی کے باعث) اپنے

کپڑوں کو بھرنے والی تھی (حسن و جمال اور کمال کی وجہ سے) اپنی سوکن کو غیظ و غضب میں مبتلا کرنے والے تھی۔ ابوزرع کی باندی کیا تھا وہ ہماری باتیں گھر کے باہر ظاہر نہیں کرتی تھی اور کھانے کی اشیاء میں ہیر پھیر نہیں کرتی تھی۔ ہمارے گھر کو (چغلخوری کرکے یا گندگی پھیلا کر) کھوٹ سے نہیں بھرتی تھی۔

ام زرع بولی کہ (لطف کی ایسی حالت میں) ایک دن ابوزرع (صبح سویرے) جبکہ دودھ کے برتن بلوئے جارہے تھے۔ گھر سے نکلا تو ایک عورت سے ملا جس کے ساتھ چیتوں جیسے (پھرتیلے) دو بچے تھے، دونوں بچے (لیٹی ہوئی) ماں کے پہلو کے نیچے سے دو انار لڑھکا کر آپس میں کھیل رہے تھے (یا اس کے انار جیسے پستانوں سے کھیل رہے تھے) تو (اس عورت کو دل دے کر) ابوزرع نے مجھے طلاق دیدی اور اس عورت سے نکاح کرلیا (اس سے طلاق لے کر) میں نے اس کے بعد ایک سردار شخص سے نکاح کیا جو ایک تیز رو گھوڑے پر شہسواری کرتا تھا اور نیزے کا حامل (جنگجو) تھا۔ اس نے مجھے بہت جانور دیکر مالا مال کردیا اور ہر شام کو گھر آنے والے (اونٹ، بیل، بھیڑ اور بکریوں) سے ڈبل ڈبل مہیا کردیئے۔ مجھے (اجازت دیتے ہوئے) کہا کہ اے ام زرع خود بھی کھاؤ اور اپنے میکے کو بھی کھلاؤ۔ مگر پھر بھی اگر وہ تمام مال اور نعمتیں جو اس شخص نے مجھے دے دیں جمع کردوں تو بھی ابوزرع کے چھوٹے سے چھوٹے برتن کو نہ بھرسکیں گے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کہتی ہیں کہ (اس قصہ کو سننے یا سنانے کے بعد) نبی کریم ﷺ نے مجھے فرمایا کہ میں تیرے لئے ایسا ہی ہوں جیسا کہ ابوزرع ام زرع کیلئے تھا۔

عن عائشہ رضی اللہ عنہا مصنف رحمۃ اللہ نے اس مقام پر اور اسی طرح بخاریؒ و مسلمؒ نے اس حدیث کو موقوف ذکر کیا ہے لیکن علامہ طبرانیؒ نے اسے مرفوع بھی روایت کیا ہے۔ چنانچہ ان کی روایت کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ میرے پاس ایک رات تشریف لائے

اورفرمایا کہ میں تیرے لئے ایسا ہوں جیسے ابوزرع ام زرع کیلئے تھا۔ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ ابوزرع اورام زرع کی کیابات تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جلست احدیٰ عشرۃ امرأۃ الخ" (۱)

اسی طرح اس حدیث کے آخرمیں "کنت لک کابی زرع لامّ زرع" سے بھی حدیث کا مرفوع ہونا معلوم ہورہاہے"

جلست احدیٰ عشر ا مرأۃ الخ عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ جب بھی موقع پاتی ہیں ایک دوسرے کوخاوندوں کے قصے،ان کے عیوب یاان کے محاسن بیان کرتی ہیں۔تو یہ عورتیں بھی ایسی تھیں کہ اکثر اپنے شوہروں سے تنگ تھیں۔

<u>عورتوں کے جبلّی خواہش کی پاسداری:</u> ان کے خاوند اپنے کسب معاش کیلئے یا جنگوں اور لوٹ مار کیلئے مہینوں غائب رہتے۔جیسے آج کل لوگ اکثر ابوظہبی، دبئی،قطروغیرہ مما لک میں جا کر برسوں رہتے ہیں ادھرعورتیں بیچاریاں پریشانی اورفراق کی زندگی بسرکرتی ہیں۔روزگار کی تلاش اورعرب کے پٹرول کے خزانوں کی وجہ سے آج بھی ہزاروں معاشرتی،اخلاقی اورمعاشی برائیاں پیداہوگئی ہیں۔خصوصاً مردوں کی غیرحاضری سے یہ مسائل جنم لیتے ہیں۔سلف صالحین نے اس مسئلہ کو بڑی سنجیدگی سے لیاہے۔ ایک روزحضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک گھر کے قریب سے گزرے اندر سے عورت کی آوازسنی جو کچھ اشعار گارہی تھی جن کا مفہوم یہ تھا کہ اگر خدا کا خوف نہ ہوتا میں یہ چارپائی توڑدیتی۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کرگلی میں کھڑے ہوگئے۔خاتون کی بات سے حیرت ہوئی۔پتہ چلا کہ یہ ایک نوجوان عورت ہے جس کا خاوند جہادکوگیاہے۔فطری طلب نے اسے یہ اشعار کہنے پرمجبورکیاہے۔آپ رضی اللہ عنہ کو بہت دکھ ہوا۔ سوچا کہ یہ توعظیم مسئلہ ہے۔اس کے بعدتفتیش کی کہ ایک عورت کتنے دنوں تک خاوند کا فراق گوارا کرسکتی ہے۔معلوم ہوا کہ تین ماہ تک گزارہ کیا جاسکتا ہے۔اس کے بعدآپ رضی اللہ عنہ نے اعلان فرمایا کہ تین ماہ میں ہرشادی شدہ مجاہدکولازماً گھرجانا ہوگا۔انسانی حقوق کی اس انداز سے پاسداری جدید نظام میں ہرگز موجودنہیں نہ روس میں نہ امریکہ میں نہ کسی اورملک میں ہے۔

---

(۱)المواھب اللدنیہ ص ۱۸۶ وکذا ذکرہ النسائی مرفوعاً کما نقل عنہ علی القاری فی الجمع ج۲ ص ۳۷ (اصلاح الدین)

بہرحال یہ عورتیں جو مکہ اور حجاز کی رہنے والی تھیں یا ایک قول کے مطابق یمن کے بنوخثعم قبیلہ سے تعلق رکھتی تھیں جمع ہوئیں اور اس قسم کی پریشانیوں میں غم غلط کرنے کیلئے آپس میں طے کیا کہ آؤ اپنے شوہروں کے بارے میں باتیں کریں۔ لیکن پہلے آپس میں قسمیں کھائیں کہ اپنے مردوں کے حالات نہیں چھپائیں گی ہر ایک اپنا راز ضرور ظاہر کریں گی۔ خاوندوں کی اچھائی اور برائی میں سے جو بھی حقیقت ہو بیان کریں گی۔

<u>پہلی عورت کا جامع تبصرہ</u>: زوجی لحم جمل غث الخ پہلی عورت اپنے خاوند کا ذکر کرتی ہے۔ غثٌ سخت کمزور چیز کو کہتے ہیں۔ غث اللّحم کا معنی ہے فسد اللحم یعنی گوشت سڑ گیا۔ غثت الشاۃ کا معنی ہے نحفت وضعفت یعنی کمزور اور ضعیف ہو گیا۔ لہٰذا غـــثٌ فاسد، ردی اور بیکار یا نحیف اور لاغر کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ اس مقام پر اسے جر سے پڑھا جائے تو یہ جمل کی صفت ہوگا۔ یعنی ایسے اونٹ کا گوشت ہے جو کمزور اور لاغر ہے۔ اسکو ملا علی قاریؒ نے روایت مشہورہ، اور علامہ بیجوریؒ اور مناویؒ نے راجح قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس طرح غثٌ قریب ترین موصوف کیلئے صفت بن جائیگا اور اگر غث کو مرفوع پڑھا جائے تو یہ لحمٌ کی صفت ہوگا۔ اور فاسد اور ردی گوشت کا معنی دے گا۔ اصل میں غث سمینٌ کی ضد واقع ہوا ہے۔ صحیح اور غلط میں تمیز نہ کرنیوالے کے بارے میں عرب کہتے ہیں ''فلانٌ لایعرف الغث من السمین''

علی راس جبل وعر: وعر ضرب، سمع اور کرم تینوں ابواب سے آتا ہے۔ سخت ہونے کے معنی پر مستعمل ہے۔ جبل وعر اس پہاڑ کو کہتے ہیں جو سخت ہو۔ اس پر بیٹھنا اور چڑھنا دشوار ہو۔ ''علی راس جبل'' اگرچہ جمل کی صفت بھی ہو سکتا ہے لیکن لحم کی صفت ہونا بظاہر راجح معلوم ہوتا ہے۔ لاسمین سمن سے صفت مشبہ ہے جس کا معنی ہے چربی والا ہونا۔ معنی یہ ہے کہ گوشت چربی والا بھی نہیں ہے۔

فینتقیٰ انتقاء کے معنی خالص اور صاف چیز چننا۔ جبکہ بعض شراح نے لکھا ہے کہ یہ نقی سے ہے جو ہڈی کے درمیان گودے اور مغز کو کہتے ہیں۔ پھر ترجمہ یوں ہوگا کہ اچھا گوشت نہیں ہے کہ اس کا گودا نکال کر کھایا جا سکے۔ اور بعض روایات میں فینقل مروی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چربی والا نہیں کہ گھر استعمال کیا جاسکے بلکہ بیکار ہے۔

اس عورت نے مختصر، جامع اور فصیح ادبی الفاظ میں خاوند پر تبصرہ کیا ہے۔وہ زمانہ ادب کے لحاظ سے عربوں کیلئے سرمایہ افتخار تھا۔بعد کے دیگر تبصرے بھی بلند ادبی مقام رکھتے ہیں۔

یہ عورت دراصل خاوند کی مذمت کرتی ہے۔خاوند کو اونٹ کے گوشت سے تشبیہ دی ہے اور کھائے جانے والے جانوروں میں سب سے زیادہ بے کار اور سخت گوشت اونٹ کا گوشت ہوتا ہے۔نہ آسانی سے پکتا ہے نہ لذت کے لحاظ سے مرغوب ہے مطلب یہ ہے کہ میرا خاوند قابل محبت شخص نہیں۔اور خصوصاً جب اونٹ بھی کمزور اور بے کار سا ہو۔تو اس کا گوشت اور بھی بے فائدہ ہوتا ہے۔علاوہ ازیں اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ میرا خاوند جنسی اعتبار سے بھی کمزور ہے۔کیونکہ یہاں تشبیہ گوشت کے ساتھ دی ہے اور ذبیحہ کے گوشت میں حیات نہیں ہوتا مردہ ہوتا ہے۔گویا وہ حقوق زوجیت کی ادائیگی میں بھی کام کا نہیں۔اس میں کچھ بھی ذوق وشوق اور محبت وگرمی نہیں۔رڈی بے خیر مردہ اور جامد سا ہے۔اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ مجھ سے دور رہتا ہے پھر بھی اچھا ہوتا اگر کبھی ہاتھ آتا مگر ایسا بھی نہیں وہ تو گویا دشوار گزار چڑھائی والے پہاڑ کے سرے پر ہے۔ہماری رسائی وہاں نہیں ہوسکتی کیونکہ اس پر چڑھنے کا کوئی طریقہ نہیں یا وہ متمرد اور متکبر بھی ہے۔کیونکہ ”فلان علی راس جبل“ تکبر اور سرکشی کیلئے بھی بطور کنایہ استعمال ہوتا ہے پھر اونٹ کا گوشت بھی اگر چربی والا ہوتا تو اس سے انتخاب کیا جاسکتا تھا۔اس کا بہتر حصہ کام میں لایا جاسکتا تھا یا اگر ممکن ہوتا تو بتکلف پہاڑ سے اتار لیا جاتا مگر وہ اس کا بھی اہل نہیں بہت بیکار ہے۔اس میں گویا خیر کی کوئی جہت نہیں ہے۔

<u>دوسری عورت کا ذو معنی کلام:</u> قالت الثانیہ زوجی لا ابث خبرہ الخ،نصر کے باب سے بث یبث کا معنی ہے افشاء کر کے پھیلانا اور منتشر کرنا اس کی ضد جمعیت اور اجتماع ہے،سخت بیماری، بدحالی اور غم کو بھی بث کہتے ہیں۔قرآن مجید میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے قول کی حکایت ہے ”انما اشکو بثی وحُزنی الی اللہ“ یعنی میں اپنی بدحالی اور غم کی شکایت اللہ تعالیٰ ہی سے کرتا ہوں۔معنی یہ ہے کہ میں اپنے خاوند کی باتیں ظاہر نہیں کرسکتی۔حضور اقدس ﷺ کی دعا ہے اللّٰھم الیک الشکوا بثی وحزنی الخ۔

إنّی أخاف ان لا أذرہ الخ وذر یذر باب سمع سے ترک کے معنی میں ہے۔ذرنـــــــــی

والمکذبین اور کلاّ لاوذر بھی اسی سے ہے۔ معنی یہ ہے کہ مجھے ڈر ہے کہ میں اسے نہیں چھوڑ سکوں گی۔ اذرہ کی ضمیر یا تو زوجہ کو راجع ہے۔ شراح کہتے ہیں کہ پھر لا زائدہ ہے اور معنی یہ ہے کہ مجھے ڈر ہے کہ اسے چھوڑ دوں گی۔ یعنی اس کی باتیں بتانے کی صورت میں طلاق سے ڈرتی ہوں اور یا یہ ضمیر خبر زوج کو راجع ہے پھر معنی یہ ہوگا کہ مجھے ڈر ہے کہ اس کی بات بتانے لگوں تو اسے چھوڑ نہیں سکوں گی۔ کیونکہ اس کے عیوب بہت ہیں اور بیان کرنے سے ختم نہ ہو سکیں گے۔۔

ان أذکرہ الخ ضمیر یا تو زوج کو راجع ہے یا خبر کو۔ **اذکر عجرہ وبجرہ عجر عجرۃ** کی جمع ہے۔ اور بجر بجرۃ کی جمع ہے۔ انسانی جسم میں اللہ تعالیٰ نے عجیب بیماریاں اور نقائص بھی پیدا کی ہیں۔ چاند بھی بے داغ نہیں۔ اس طرح انسانی جسم بھی عیوب سے پاک نہیں۔ ان میں سے بعض عیوب نظر بھی آتی ہیں۔ مثلاً بعض لوگوں کے گردنوں یا گلوں میں ورم ہوتا ہے گردن کے اس ظاہری ورم کو ہی دراصل عجرۃ کہتے ہیں۔ لیکن کبھی بالعموم جسم کے کسی بھی حصہ میں گلٹی یا ورم ہو۔ اس پر عجرۃ کا اطلاق ہوتا ہے۔ حاصل یہ کہ یہاں تمام جسمانی ظاہری عیوب عجر کے زمرے میں آئیں گی۔ جبکہ بعض عیوب چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ قمیص شلوار وغیرہ سے مستور ہوتے ہیں۔ مثلاً بعض لوگوں کے ناف غلط طریقے سے کٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور ایک گانٹھ کی سی شکل اختیار کرتے ہیں۔ جو تمام عمر بدنما دکھائی دیتے ہیں۔ ناف، پیٹھ یا اس طرح کے دوسرے پوشیدہ مقامات پر مخفی عیوب بجرۃ کہلاتی ہیں۔ بہرحال اس عورت نے اعتراف کیا کہ میرے خاوند میں ظاہری اور مخفی عیوب ہیں۔ اگر بیان کرنے لگوں تو وہی بیان کروں گی۔

اکثر شراح (۱) کے نزدیک یہ عورت بھی اپنے خاوند کی عیب جوئی کر رہی ہے۔ اس کی مذمت میں گویا کہتی ہے کہ میں تو اس کے عیوب شمار نہیں کر سکتی بیان کرونگی تو ڈر ہے کہ ختم ہونے کو نہ آئیں۔ یہ بڑی داستان اور نہ ختم ہونے والا موضوع ہے کیونکہ عیوب بہت زیادہ ہیں۔ اس تقدیر پر ''ان لا اذرہ'' میں لا زائدہ نہ ہوگا۔

---

(۱) بعض شراح نے اس عورت کے کلام کو مدح پر حمل کرنے کیلئے یہ کہا ہے کہ عجر اور بجر سے عیوب مراد نہیں بلکہ عجر و بجر ''الامر کلہ'' کے معنی میں ہے اور عورت کا مطلب یہ ہے کہ میرے خاوند میں بے انتہا خوبیاں ہیں بیان کرنے کی صورت میں ختم ہونے کو نہ آئیں گی۔ اس لئے میں اس کی بات نہیں کرتی۔ لیکن شراح نے اس تاویل کو بعید کہا ہے (اصلاح الدین)

اوربعض کہتے ہیں کہ ان لا اذرہ میں حکمۃ لازائدہ ہےاورعورت یہ کہنا چاہتی ہے کہ میں مجبور ہوں خاوند کو چھوڑنہیں سکتی۔اس لئے حالات بیان نہیں کرتی۔میری تو اس سے محبت ہے یا مجھے اس کی ضرورت ہے۔اگر چہ وہ غافل اور معیوب ہے۔اولاد،نفقہ،سکنی یا دل کے تقاضوں کی وجہ سے میں اسے نہ چھوڑ سکنے پر مجبور ہوں اور اگر اسے پتہ چلا کہ میں نے اس کے نقائص بیان کئے ہیں تو وہ مجھے طلاق دے دیگا۔لیکن اس تشریح پر یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ اس عورت نے تو عہد اور قسم کی مخالفت کی تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس عورت نے تو سب سے جامع طرز پر خاوند کے عیوب سے پردہ اٹھایا ہے۔اس کے ہاں تو اس کا زوج مجسمہ عیوب اور سراپا نقائص ہے۔بقول اس کے اگر گنتی کی جائے تو بات طویل ہوجائے گی۔لہٰذا تصریح کے مقابلے میں اجمال وکنایہ کا سہارا لیا۔

تیسری عورت کی رائے: قالت الثالثة زوجی العشنق الخ عشنق دبلے پتلے اور لمبے تڑنگے شخص کو کہتے ہیں۔جو دبلا ہونے کی وجہ سے بدصورت دکھائی دیتا ہے۔اسے اردو میں لم ڈھینگ بھی کہا جاتا ہے۔اور اس طول کے ساتھ عموماً حماقت بھی ہوتی ہے۔جبکہ بعض شراح کہتے ہیں کہ عشنق بداخلاق آدمی کو کہتے ہیں۔جو عموماً بیوقوفی کی بناء پر ہوتی ہے۔اور اسی کا بیان بعد میں کررہی ہے۔

ان أنطق اطلق یعنی اگر بولوں آہ وفریاد کروں تو طلاق دیتا ہےاور اگر چپ رہوں تو معلق رہ جاتی ہوں۔حاجات کا تقاضا نہ کروں تو بھوکی پیاسی مرتی ہوں۔رزق،نان ونفقہ اور کپڑا وغیرہ ضروریات زندگی کیلئے ترستی ہوں تو گویا بظاہر خاوند ہوتے ہوئے بھی میرا سہارا نہیں ہوتا نہ اس کی بیوی جیسی ہو۔دوسرے کسی سے نکاح ممکن ہوتا ہے۔قرآن میں ہے''فتذروھا کالمعلقة ''اس عورت نے بھی خاوند کی تنقیص کی ہے گویا وہ ایک اچھا خاوند نہیں ہے۔حماقت کے ساتھ ساتھ بیوی کے حقوق واجبہ بھی ادا نہیں کرتا۔

چوتھی عورت: قالت الرابعة کلیل تھامة الخ تہامہ حجاز کا خاص علاقہ ہے جس میں مکہ بھی واقع ہے۔اس لئے نبی کریم ﷺ کو تہامی بھی کہتے ہیں۔یہ علاقہ نجد کی نسبت زیریں اور سمندر کے قریب واقع ہے۔اس علاقے کی رات بڑی خوشگوار ہوتی ہے۔رات کو معتدل ہوا چلتی ہے۔مچھر وغیرہ موذی چیزیں

بھی نہیں ہوتیں۔مکمل سکون اورراحت ہوتی ہے۔

لاحرّ و لاقرّ الخ حرّ گرمی اورقرّ فتح قاف کے ساتھ ٹھنڈک اورسردی کو کہتے ہیں۔یہ لیل کا بیان ہے یعنی ایسی معتدل رات کی طرح ہے جس میں گرمی ہونہ سردی۔اوریایہ زوج کی توصیف ہےاورحرّ سے شدت اورقرّ سے طبعی برودت اوربیوی میں بے رغبتی مراد ہو۔توگویایہ کہنا چاہتی ہیں کہ مراخاوند ہرلحاظ سے پسندیدہ خاطرمزاج کامالک ہے۔

ولاسآمة باب سمع سے سَئم سآمۃً دل کی تنگی اوردل اچٹ جانے کو کہتے ہیں۔یہ عورت خاوندکی تعریف کرتی ہے کہ میراخاوندحسین مزاج مقبول السیر ۃ اورمعتدل طبیعت کا مالک ہے۔اس کی صحبت سے کسی کوملال نہیں ہوتا۔خوش اخلاقی کی وجہ سےاس کی رفاقت اذیت سے پاک ہوتی ہے۔

<u>پانچویں کی معنی خیز باتیں:</u> قالت الخامسة زوجی ان دخل فهد فہدیاتوسمع کےوزن پرفعل کا صیغہ ہے کہتے ہیں کہ فہدالرجل ای صارکالفہد یعنی آدمی چیتے جیسابنا۔اوریہ بھی ممکن ہے کہ فعل کی بجائے یہ اسم ہو۔اورمبتدامحذوف کی خبرہو۔ترکیب یوں ہوگی زوجی ان دخل فہوفہد۔یعنی وہ گھرآتاہےتوشیرہوتا ہے۔چیتاسست نکاامل اوربہت زیادہ سونے والاجانورہےلیکن حملے کےدوران اس کی تیزرفتاری اورپھرتی بھی ضرب المثل ہے۔نیزیہ درندوں میں سرکش بھی زیادہ ہے۔

اس عورت کےکلام میں تین جملے ہیں اورتینوں ذوالوجہین ہیں۔ان میں مدح کاپہلوبھی ہے۔اور مذمت کاپہلوبھی۔زیرنظرجملےکواگرمدح کے پہلوسےلیاجائے۔تویہ عورت اپنے شوہرکی گرمجوشی اورجماع کےوقت پھرتی کوبیان کرتی ہے۔کہ ایسی حالت میں وہ چیتابن جاتاہے۔اسی طرح گھرمیں کمی بیشی آجائےان سے بھی تغافل اورتسامح برتتاہے۔جیسے چیتاعموماًاپنی جگہ میں سویاہواہوتاہے۔اسی طرح وہ بھی گھرکےاندرسویارہتاہے۔ایسانہیں کہ ٹکے ٹکے کاحساب لیکرگھروالوں کاناک میں دم کررکھاہو۔

اوراگرمذمت کاپہلولیں تومطلب یہ ہوگاکہ میرےشوہرمیں بہیمیت کااتناغلبہ ہےکہ گھرآکر چیتےجیساحملہ آورہوجاتاہے۔کسی تحقیق وتفتیش کےبغیرمجھےپیٹنےلگتاہے۔اوراگرحقوق زوجیت کی ادائیگی کا وقت ہوتوپھرچیتےکی طرح لمبی تان کرسوجاتاہے۔گھروالوں سےتعلق اورمحبت میں کوئی گرمی نہیں ہےنہ ان

کے نان ونفقہ کی فکر ہوتی ہے بس سویا پڑا رہتا ہے۔

وان خرج اسد اُسد میں بھی فہد کی طرح دواحتمال ہیں۔ایک یہ کہ فعل ہو بمعنیٰ صار کالاسد اور دوسرا یہ کہ اسم ہو۔مبتدا محذوف کی خبر ہو۔یعنی فہواسد۔معنی یہ کہ گھر کے باہر شیر بن جاتا ہے۔اس جملے کے مراد میں بھی دو احتمال ہیں۔اول یہ کہ مدح پر محمول ہو تو معنی ہوگا کہ گھر میں شرافت اور چشم پوشی کے باوجود باہر جاکر شیر کی طرح جرأت وشجاعت کی داد حاصل کرتا رہتا ہے۔کسی کے سامنے نہیں جھکتا۔شیر کی طرح گھر کے باہر ہی بہادری کا مظاہرہ کرتا ہے۔اور اگر مذمت کی جہت لیں تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ گھر میں چیتے جیسا سست اور باہر شیر کی طرح بہادر بن جاتا ہے۔لوگوں کے ساتھ غضب اور تجبّر سے پیش آتا ہے اور حماقت کی بناء پر انجام کی پرواہ نہیں کرتا۔

ولایسال عما عهد عہد یعہد سمع کے باب سے علم کے معنی میں آتا ہے یعنی جس امر کا اس کو علم ہو۔اس کے بارے میں کسی سے دریافت نہیں کرتا۔اس جملے میں بھی دو جہت ہیں۔مدح کی جہت لیں تو مطلب یہ ہوگا کہ میرا شوہر وسیع الظرف اور کریم ہے۔گھر میں اخراجات زیادہ ہوں۔یا کوئی نقصان ہو گیا ہو اسے پتہ چلے تو بھی احتساب اور نکتہ چینی سے کام نہیں لیتا۔گویا گھر کے داخلی امور میں وزیر داخلہ یعنی بیوی کو اختیارات سپرد کی ہیں۔

مذمت کا پہلو لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میرا شوہر خانگی امور میں باوجود علم کے بے حسی کا مظاہرہ کرتا ہے یہ نہیں پوچھتا کہ گھر والوں پر کیا گزر رہی ہے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ بلکہ تغافل وتکاسل کی عادت ہے۔

<u>چھٹی کی ادیبانہ باتیں:</u> تینوں جملوں میں مدح اور مذمت دونوں پہلوؤں کے باوجود بعض شراح نے مدح کے پہلو کو ترجیح دی ہے اور اسے اقرب کہا ہے۔

قالت السادسة زوجی ان اکل لفّ لِفَ یلفّ لفًا(باب سمع) سمیٹنے اور لپیٹنے کو کہتے ہیں۔لفافہ بھی اسی سے ہے اور لفیف کا مادہ بھی یہی ہے۔یہاں مقصود یہ ہے کہ مختلف قسم کے کھانوں کو اکٹھا کھا جاتا ہے کثیر الاکل ہے۔شف یہ لفظ شین اور سین دونوں کے ساتھ مروی ہے۔اشف شین کے ساتھ ہو تو

اس کا معنی ہے''شرب الشفافة'' شفافہ اس تھوڑے سے پانی کو کہتے ہیں جو پینے کے بعد برتن میں رہ جاتا ہے تو گویا مطلب یہ ہے کہ پانی وغیرہ آخری قطرے تک پی جاتا ہے۔ برتن میں کچھ رہنے نہیں دیتا۔اوراگر سین کے ساتھ ہوتو معنی یہ ہوگا کہ بہت زیادہ پی لینے کے باوجود سیر نہیں ہوتا مزید تقاضا بھی کرتا ہے۔

وان اضطجع التف الخ التفّ لفّ یلفّ سے افتعال کا صیغہ ہے جو سمٹ جانے اور جمع ہونے کے معنی میں مستعمل ہے۔

ولایولج الکف ۔یولج ولوج سے باب افعال کے مضارع کا صیغہ ہے۔داخل کرنے کے معنی میں ہے۔اور کف کا معنی ہے منع کرنا۔اور ہاتھ چونکہ دوسری چیزوں کے منع کرنے اور دوسری اشیاء سے حفاظت کرنے میں استعمال ہوتا ہے۔اس لئے اس کو بھی کف کہتے ہیں۔

لیعلم البث بث پراگندہ حالی اور پریشانی کو کہتے ہیں نیز بیماری پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ قال اللّٰہ تعالیٰ ''انّما اشکو بثیّ وحزنی إلیٰ اللّٰہ'' جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔یہ عورت عام شراح کے نزدیک شوہر کی مذمت بیان کرتی ہے لیکن بعض کے ہاں اس کے بیان میں تعریف کا پہلو بھی نکلتا ہے۔

اول الذکر صورت میں اس عورت کے مطابق اس کا خاوند پیٹو ہے۔دستر خوان پر جو کچھ ملے اسے کھا جاتا ہے بچوں اور بیوی کیلئے کچھ نہیں چھوڑتا۔اور اگر پیتا ہے تو ہر برتن کو خالی کر کے چھوڑتا ہے سب کچھ پی جاتا ہے خواہ وہ شراب ہو، خواہ وہ دودھ ہو، لسی ہو یا کوئی اور پینے کی چیز کچھ نہیں چھوڑتا۔اور سوتے وقت سمٹا کر سو جاتا ہے کسی کام کا نہیں۔ بیوی کا حق ادا نہیں کرتا۔اس کی طرف ہاتھ بھی نہیں بڑھاتا تا کہ اس کی بے چینی، پریشانی، بدحالی اور تشنگی کا اسے پتہ چل سکے۔اس کی بے چینی اور محبت و پیار کی طلب کا اسے احساس نہیں ہوتا نہ اس کی بیماری میں اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔اس تشریح کے مطابق یہ مذمت کا پہلو ہوا۔اور دوسری توجیہ یہ ہے کہ میرا خاوند نہایت سخی مالدار اور باوقار آدمی ہے۔ساتھ ساتھ عظیم اخلاق کا مالک ہے۔گھر کی چھوٹی موٹی باتوں میں نیز بیوی بچوں کے معاملات سے لاتعلق رہنے کی کوشش کرتا ہے۔کھانے کا معاملہ ہو تو ایک قسم کے کھانے پر اکتفاء نہیں کرتا۔بلکہ مختلف انواع کے کھانے دستر خوان پر چنے جاتے ہیں۔اور وہ کھا پی کر خوب سیر ہو جاتا ہے۔افلاس زدہ آدمی کی طرح بچت کا عادی

نہیں۔اور سوتا ہے تو بے فکری کی نیند میں سمٹ کر سوجاتا ہے کسی بات کا غم نہیں ہوتا۔دشمنوں کا خوف نہیں ہوتا کوئی پریشانی اسے نہیں ستاتی۔ساتھ ساتھ یہ کہ خامیوں کی تفتیش نہیں کرتا تاکہ پریشانی کی کوئی بات معلوم کرلے۔نکتہ چین اور شکی مزاج شخص ہر وقت گھر میں جھگڑتا رہتا ہے۔آنے جانے والوں کے بارے میں پوچھتا ہے۔خرچ واخراجات کا حساب لیتا ہے۔اس طرح وہ گھر کے اندر بہت سی کمزوریاں پاکر خواہ مخواہ پریشان رہتا ہے۔اس کے برعکس یہ شخص اپنی بیوی کے بیان کے مطابق اس طرح کا وہمی مزاج نہیں بلکہ بیوی پر اعتماد ہونے کے سبب بات بات پر نہیں بگڑتا۔نہ تحقیق وتفتیش اس کی عادت ہے مگر عام شراح نے مذمت کی جہت کو ترجیح دی ہے۔

<u>ساتویں عورت کی دوٹوک باتیں:</u> قالت السابعة زوجی عیایا ء اوقال غیایاء عیایاء عیّ سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔یہ مادہ سمع کے باب سے تھکاوٹ کے معنی میں مستعمل ہے۔قرآن مجید میں ہے ولم یعیی بخلقهن. یعنی اللہ تعالیٰ آسمانوں کو پیدا کرنے سے تھکا نہیں۔لہٰذا عیایاء وہ شخص ہوگا جس میں بہت زیادہ درماندگی اور سستی ہے۔بعض شراح نے اس کا ترجمہ عنین یعنی نامرد سے کیا ہے کیونکہ عیایاء اصل میں اس اونٹ کو کہتے ہیں جو کہ اونٹنی کے ساتھ جفتی پر قادر نہ ہو۔

جبکہ غیایاء غیّ اور غوایۃ سے ہے۔جو کہ گمراہی، ضلالت اور جہل کے معنی میں مستعمل ہے۔اس لئے غیایاء وہ گمراہ اور جاہل ہوگا جو ہر جگہ نامراد ہے۔یا یہ کلمہ غیایۃ سے ہے جس کا معنی اندھیرا ہے یعنی وہ اندھیرے میں ہے اور جس مقصد کی طرف بڑھے ناکامی کا منہ دیکھے۔طباقاء ایک چیز کو دوسری چیز پر رکھنے کو طبق کہتے ہیں۔اسی سے تطبیق مطابقۃ اور انطباق ہے تو طباقاء اس شخص کو کہا جاتا ہے جو نہایت سرد مہر ہو۔چستی نام کی نہ ہو جہاں بیٹھے گویا اس جگہ سے چپک گیا ہو بعض شراح کے مطابق طباقاء کا معنی ہے "الذی ینطبق علیه الامور" یعنی وہ شخص جس پر امور معاملات میں ابہام آئے۔کوئی مشکل نہ سمجھا سکے۔بعض شراح نے طباقاء اس شخص کو کہا ہے جو بھاری ہونے کی وجہ سے جماع کے وقت بیوی سے چپک جائے اور اس پر بوجھ بن جائے۔بعض نے لکھا ہے کہ جمل طباق اس اونٹ کو کہتے ہیں جو جفتی پر قادر نہ ہو۔بعض نے لکھا ہے کہ طباقاء وہ شخص ہے جو بات کرنے سے عاجز ہو گویا اس کے ہونٹ آپس میں چپک گئے ہیں۔

کل داء له داء ہر بیماری اس کی بیماری ہے یعنی متعدد بیماریوں کا مریض ہے۔ شجّکِ الخ شج زخم اور خصوصاً چہرے اور سر کے زخم کو کہتے ہیں اور فلّکَ فلول سے ہے جو کہ کُند کرنے کو کہتے ہیں تلوار، چھری اور چاقو وغیرہ کی دھار ٹوٹنے کو فلول کہتے ہیں اور انسان کی نسبت اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ ہڈی یا کوئی عضو توڑ دیتا ہے۔

جمع کلاّ لک یعنی کلاّ من الشج و الفلّ۔ یہ عورت بھی خاوند کی بھرپور مذمت کرتی ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ میرا خاوند ہر وقت تھکا ماندہ، عنین سست اور کاہل ہوتا ہے یا بہت جاہل اور گمراہ ہے۔ اچھے برے کی تمیز نہیں کرتا اس پر مستزاد یہ کہ طباقاء ہے جہاں کہیں پڑا رہا تو اٹھنے اور سرکنے کا نام نہیں لیتا۔ گویا جسمانی لحاظ سے بھاری بھرکم اور غیر مناسب ہے۔ یا معنی یہ کہ احمق ہے ہر قسم کے معاملات اس پر پیچیدہ اور الجھے رہتے ہیں۔ معمولی مسئلہ کا سلجھانا بھی اس کے لئے مشکل اور ناقابل حل ہوتا ہے۔ نیز طباقاء کا یہ معنی بھی محتمل ہے کہ ازدواجی تعلق کے وقت بیوی پر بھاری بھرکم ہونے کی وجہ سے بوجھ بنتا ہے۔ جسمانی طور پر بیماریوں اور امراض وعلل کا مجسمہ ہے بدخلق اتنا کہ اگر بات کرو تو سر پھوڑ دے یا ہڈیاں توڑ دے۔ یا دونوں تکلیف پہنچادے۔

آٹھویں عورت: قالت الثامنة اس عورت کا نام ناشرہ بنت اوس بتایا جاتا ہے۔ زوجی المس مس ارنب مس اور لمس دونوں کا ایک معنی ہے ہاتھ لگانے کو کہتے ہیں اور ارنب خرگوش کو کہتے ہیں جو کہ بہت نازک وملائم جانور ہے۔ یہاں تقدیر عبارت یوں ہوگی "له مسّ کمسّ ارنب" یا " ومسّه کمسّ ارنب" اس صورت میں المس کا الف لام مضاف الیہ سے عوض ہے اور اداۃ التشبیہ محذوف ہونے کی بنا پر تشبیہ بلیغ ہے۔

والریح ریح زرنب یعنی "له ریح کریح زرنب" یا "وریحه کریح زرنب" زرنب بہت خوشبودار بوٹی ہے اس سے مہک اٹھتی ہے۔ اور بعض کے نزدیک اس سے زعفران مراد ہے یہ عورت اپنے خاوند کی مدح کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ظاہری اور معنوی لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے میرے خاوند کو بہت اچھے صفات سے نوازا ہے۔ حسن و جمال اور ملائمت میں گویا وہ خرگوش ہے۔ یعنی خوش

اندام اور نازک بدن ہے جبکہ اس کا کلام، وضع قطع اور اخلاق زرنب کی مہک جیسی ہیں۔اور اس کے ساتھ ساتھ مقبول صحبت ومعاشرت ہے۔بعض شراح نے لکھا ہے کہ ریح زرنب سے تشبیہ شہرت اور نیک نامی سے کنایہ ہے۔اس کے برعکس بعض شراح نے اس عبارت کو مذمت پر حمل کیا ہے گویا یہ عورت اپنے شوہر کو کمزور، مردانی سے محروم اور زنانہ صفات کا مالک بتاتی ہے۔

<u>نویں کی مدحت انگیز رائے:</u> وقالت التاسعة زوجي رفيع العماد عماد بڑے ستون کو کہتے ہیں جس پر عمارت قائم ہو۔اس کی جمع عمد اور اعمد ہے۔معنی یہ کہ وہ بلند ستونوں والا ہے۔کثیــــر الــرمــاد رماد راکھ کو کہتے ہیں۔اس کے گھر میں راکھ زیادہ ہوتی ہے۔کیونکہ مہمانوں کی کثرت ہوتی ہے۔ طويل النجاد نجاد تلوار کی کاٹھی کو کہتے ہیں یہ دراصل رفعتِ قد کیلئے استعارہ ہے کیونکہ تلوار کی کھائی تب طویل ہوتی ہے جب آدمی خود دراز قد ہوتا ہے۔علاوہ ازیں لمبی تلواروں کا استعمال امیر، سردار اور جنگجو بہادر لوگ کرتے ہیں۔

قريب البيت من الناد یہ اصل میں نادی ہے۔نادی، نادیہ اور ندوہ تینوں مجلس کے معنی میں مستعمل ہیں۔دار الندوہ مقام مشاورت واجتماع کو کہتے ہیں یہ یا تو ندیٰ یندو ندوا سے ہے۔جس کے معنی جمع ہونا اور مجلس میں حاضر ہونا ہیں۔یا یہ ندی یندی ندیً ونداوۃً سے ہے۔جس کے معنی تر اور گیلا ہونا ہے۔ چونکہ مجلسوں اور اجتماع گاہوں میں عموماً خورد ونوش اور شراب کا دور چلتا رہتا تھا اس لئے وہاں زمین نم آلود اور گیلی رہتی تھی۔اسی سے مقام اجتماع اور مجالس پر نادی کا اطلاق ہونے لگا(۱)۔اس جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ قوم کے دار المشاورت اسمبلی اور پارلیمنٹ کے قریب ہی میرے خاوند کا گھر ہے جو کہ سیادۃ وحکومت کی علامت ہے۔

یہ عورت بھی خاوند کی مدح کرتی ہے۔مطلب یہ ہے کہ میرا خاوند بہت امیر وسردار ہے اور بلند ستونوں والے بڑی عمارتوں کا مالک ہے۔یا معنی یہ کہ بلند جگہ اور منفرد مقام پر اس کا محل ہے۔اس جملے میں

---

(۱) صاحب جلالین نے ایک وجہ تسمیہ یہ بھی ذکر کی ہے کہ "لانہ ینتدیٰ فیہ" یعنی مجلس میں چونکہ ایک دوسرے کو بلایا جاتا ہے۔اور آوازیں دی جاتی ہیں۔لہذا اسے نادی کہا جانے لگا۔ولیراجع الی جلالین سورۃ علق۔(اصلاح الدین)

عظمت اور خاندانی وجاہت کو بھی اشارہ ہے۔ کیونکہ عرب لوگ حسب ونسب کی شرافت اور شہرت سے تعبیر کرتے ہوئے عمود کو کنایۃً استعمال کرتے ہیں۔ جس طرح کہ فرزدق کہتا ہے کہ

إنّ الذی سمک السماء بنی لنا بیتا دعائمہٗ اعزّ واطول

ترجمہ: اس ذات نے جس نے آسمان کو بلندی عطا کی ہے ہمارے لیے (مجد وشرف کا) ایسا گھر بنایا ہے جس کے ستون مضبوط اور بلند ہیں۔

اس عورت کے بیان کے مطابق مہمانوں کی کثرت کے باعث ہر وقت کھانا پکانے کے لئے آگ جلتی رہتی ہے جس کے سبب راکھ کثرت سے پیدا ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں عرب کے سخی لوگوں کی یہ بھی عادت تھی کہ رات کو اونچی جگہ آگ روشن کرتے تھے تا کہ مسافر لوگ اس طرف آئیں اور وہ ان کی ضیافت کریں۔ اس وجہ سے بھی راکھ کی کثرت ہوتی تھی۔ طویل قد وقامت اور جسمانی ساخت کے لحاظ سے ممتاز، بہادر اور شجاع ہے۔ نیز یہ لفظ اقتدار اور سلطنۃ سے بھی کنایہ ہوسکتا ہے یعنی وہ لمبی تلوار والا حاکم ہے جیسے ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ فلاں کا ہاتھ لمبا ہے یعنی ہر جگہ رسائی ہے۔ مجلس اور دار المشورہ کے قریب رہتا ہے۔ جو کہ سربراہی اور سرداری کی علامت ہے کیونکہ اس کے مشورہ کے بغیر فیصلہ نہیں کیا جاتا۔ گویا اس بات کو اشارہ ہے کہ سردار اور ذی رائے ہے۔ اس کی رائے کو اہمیت دی جاتی ہے اور یہ معنی بھی محتمل ہے کہ مجلس کے قریب گھر ہونے کی وجہ سے تمام مہمانوں کی ضیافت اس کو کرنی پڑتی ہے لیکن سخاوت کا علم چونکہ پہلے ''کثیر الرماد'' سے ہو چکا ہے۔ لہٰذا پہلا معنی لینا افضل ہے۔

<u>دسویں کی مدح سرائی:</u> قالت العاشرۃ زوجی مالک ما لک اس شخص یعنی دسویں عورت کے خاوند کا نام ہے وما مالک الخ یہ اور اس قسم کے دیگر استفہامات تعظیم وتفخیم کیلئے ہوتے ہیں۔ یعنی تمہیں کیا پتہ ہے کہ مالک کیا چیز ہے۔ جیسے القارعۃ ما القارعۃ اور الحاقۃ ما الحاقۃ میں ہے۔ مراد یہ ہے کہ تم اس کی شان وشوکت اور عظمت کو کیا جانتے ہو۔ مالک خیر من ذالک مالک ان مذکورہ خاوندوں میں سب سے بہتر ہے۔ یا پھر ذالک میں اشارہ صرف نویں عورت کے خاوند کو ہے کیونکہ اس سے قبل تو بعض خاوندوں کی مذمت کی گئی تھی۔ ان سے افضلیت تو واضح ہے۔ لہٰذا صرف زوج تاسع کو اشارہ ہوگا۔ یعنی

میرا خاوند اس زوج تاسع سے اچھا ہے(۱)۔له ابلٌ کثیرات المبارک الخ۔مبارک مبرک کی جمع ہے جو بروک سے ظرف ہے۔اور سرح یسرح سے ظرف ہے۔جس کے معنی ہیں آزاد چھوڑنا۔جانوروں کو چراگاہ میں چرنے کیلئے آزاد چھوڑنے کو سرح اور چراگاہ کو مسرح کہتے ہیں۔

تو مطلب یہ ہوا کہ ان اونٹوں کا مبارک کے ساتھ تعلق مسارح کے ساتھ تعلق کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔اذا سمعن صوت المزهر الخ مزہر چنگ ورباب اور ساز کے آلات کو کہتے ہیں۔یا پھر ان میں سے ایک خاص قسم کے رباب کو کہتے ہیں۔لیکن مراد یہی آلات طرب ہیں۔اسی طرح مزہر کا اطلاق غلیل کے مانند ایک لکڑی پر بھی ہوتا ہے جس کے ذریعے آگ جلایا کرتے تھے وہ بھی مراد ہوسکتا ہے۔تو معنی یہ ہوگا کہ ساز کی آواز یا آتش دان میں آگ جلانے کی آواز سن کر وہ اونٹیاں یقین کر لیتی ہیں۔کہ ان کی ہلاکت کا وقت آن پہنچا ہے۔

یہ عورت بھی خاوند کی مدح کرتی ہے۔اس کے بیان کا مطلب یہ ہے کہ میرا خاوند سخی اور مالدار ہے۔اس کے بہت اونٹ ہیں۔جنہیں وہ چراگاہ نہیں بھیجتا بلکہ یہیں باندے رکھتا ہے۔اس لئے کہ وہ گھر میں ان کو پالنے کی خوب استطاعت رکھتا ہے۔صحرائی چراگاہوں میں چرانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔اور اس لئے بھی کہ کسی وقت بھی ضرورت پڑسکتی ہے تو پکڑ کر ذبح کرنے میں آسانی ہو۔اور مہمانوں کو دودھ پیش کرنے کیلئے بھی جانور ہر وقت گھر پر موجود ہوں۔

چراگاہوں میں اس شخص کے اونٹ چرتے رہتے ہیں جس کے مہمان نہ ہوں۔اور ذبح کرنے کا موقع نہ آئے بلکہ تجارت اور کمائی کیلئے اونٹ رکھتا ہو۔مالک کی سخاوت کی بناء پر اونٹ بھی اتنا سمجھ چکے ہیں کہ ساز کی تھوڑی سی آواز سن لیں تو سمجھ لیتے ہیں کہ اب وہ ذبح کئے جائینگے۔گویا کثرت تجربہ کی وجہ سے ان کو اس بات کا شعور ہو چکا ہے۔ساز کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ سرداروں کے ہاں مہمان آتے تو مجالس کو نغموں، چنگ ورباب اور مجروں سے خوب گرم کر لیتے تھے۔وہ اپنی داشتہ لونڈیوں کو مہمانوں کی خوشی کی خاطر ہی

---

(۱) یہ بھی ممکن ہے کہ ذالک میں اشارہ بعد میں آنے والی توصیف کو ہو تو عبارت کی تاویل یوں ہوگی کہ "مالک خیر من ذالک الذی اقوله فی حقه و سنذکره بعد" مطلب یہ ہوگا کہ بعد میں میں جو تعریف کرنے والی ہوں وہ بہت کم ہے۔وہ تو اس سے بھی بڑھ کر ہے۔وقد اشار الی ذالک کثیر من الشراح .(اصلاح الدین)

رقص وسرود کی تعلیم دیتے تھے۔اور دیگر طریقوں کے علاوہ اس لحاظ سے بھی ان کا اکرام کرتے تھے۔ بہرحال ساز کی آواز مہمانوں کی آمد اونٹوں کی ہلاکت کی علامت ہوتی تھی۔یا پھر مزہر سے آتش دان مراد ہے۔جس میں آگ جلنے کی آواز کان میں پڑتی۔اور آگ جلنے لگتی تو اونٹوں کو شعور ہوجاتا تھا کہ اب ہم میں سے کوئی تو ذبح کیا جانے والا ہے۔

<u>گیارویں عورت حدیث کی محور امّ زرع:</u> قالت الحادیة عشرة یہ آخری عورت ام زرع ہے اور یہ بھی خاوند کی مدح کرتی ہے۔زوجی أبوزرع الخ اس خاوند کا نام ابوزرع ہے اور تفخیم وتجیل کیلئے اس عورت نے بھی وما ابوزرع کا استفہام کیا ہے۔اس کنیت میں بھی ثروت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ زرع فصل کو کہتے ہیں اور اس شخص کی بھی زمینیں، جائداد اور فصلیں تھیں یا یہ معنی کہ یہ شخص کثیرالاولاد تھا۔اور اولاد بھی ایک قسم کی فصل ہے۔تو ممکن ہے اس کنیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہو۔

اناس من حُلّیٍ اذنیّ اناس ینوس اناسة حرکت دینے اور ہلانے کے معنی میں ہے۔یہ نوس سے ہے۔جس کے معنی بھاری چیز کو ہلانے کے ہیں جسطرح کہ کنویں میں بھری بالٹی کو حرکت دی جاتی ہے۔اسے نوس کہتے ہیں اور حُلِیّ حاء کے ضم اور لاء مکسور کے ساتھ حَلْیٌ (حاء مفتوحہ اور سکون لام) کی جمع ہے جو زیور کو کہتے ہیں۔اُذنَیّ اَناسَ کا مفعول بہ ہے یعنی اس نے بھاری زیور میرے کانوں کیلئے بنوا کر ان کو ہلا کے رکھدیا۔تو گویا وہ مالدار ہونے کے ساتھ ساتھ مجھ پر مہربان بھی تھا۔وملأ من شحم الخ یعنی میں گھر سے آئی تھی تو لاغرسی تھی لیکن ان کے ہاں ایسے کھانے ملے کہ میرے بازو چربی سے بھر گئے۔

عضدیّ عضد کہنی کے اوپر ہاتھ کو کہتے ہیں۔یہاں تثنیہ متکلم کی یاء کی طرف مضاف ہے اور علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ بازوؤں کا ذکر خصوصی طور پر اس لئے کیا ہے کہ ان پر سب سے آخر میں گوشت اور چربی آتی ہے اس لئے مطلب یہ ہوگا کہ میں ساری چربی سے بھر گئی حتیٰ کہ بازو بھی بھر گئے۔

وبجّحنی، بجح فتح کے باب سے فرح اور عظم دونوں کے معنی میں آتا ہے۔یہاں پر تفضیل کا صیغہ مستعمل ہے۔جس کا معنی یہ ہے فرّحنی یا عظّمنی یعنی اس خاوند نے مجھے بے حد خوش کیا۔یا میری تعظیم کی۔اور قدر و منزلت بڑھادی۔

حتی بجحت الیٰ نفسی یعنی حتیٰ کہ میں خود پر عاشق ہوگئی۔خود پسندی اورغرور کے سبب قریب تھا کہ اپنی حقیقت بھول جاؤں یااس جملے کا معنی یہ ہوگا کہ عظّمنی فعظمت الی نفسی یا فعظمت الیَّ نفسی۔

وجدنی فی اھل غنیمۃ الخ غنیمۃ غنم کی تصغیر ہے غنم بھیڑبکریوں کے گلے کو کہتے ہیں لہذا غُنیمۃ چند بھیڑوں یا بکریوں کو کہا جائیگا۔بشــــق شق یا شین کے فتح کے ساتھ ناحیہ اور طرف کو کہتے ہیں یعنی دوردراز، بادیہ وصحرا کے ایک غریب گھرانے میں مجھے پایا۔یا یہ ایک مخصوص جگہ کا نام بھی ہوسکتا ہے۔اسی طرح شق شین کے کسرہ کے ساتھ مشقت وتکلیف کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔جیسے قرآن میں ہے کہ ولم تکونوا بالغیۃ الّا بشق الانفس. دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہوگا کہ مجھے اس نے ایک غریب گھرانے میں پایااور پسند آنے پر بیوی بنایا۔اھل صھیل صہیل گھوڑوں کی آواز کو کہتے ہیں۔واطیت اطیت اصوات الابل کو کہتے ہیں یعنی وہاں سے اٹھا کرایسے گھر میں مجھے لایا۔ جہاں گھوڑے اور اونٹ کثرت سے تھے۔ادھر گھوڑے ہنہناتے تو ادھر اونٹ بلبلاتے جاتے تھے۔دائــس و منــق دائس داس یدوس دوس سے اسم فاعل ہے جو کہ روندنے کو کہتے ہیں۔خصوصاً غلہ صاف کرنے کیلئے فصل اگاھنے کو کہتے ہیں۔اور منقٍ روایت کے مطابق تنقیہ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔غلہ کو بھوسہ سے صاف کرنے والے جانور یا چھلنی کے ذریعے صاف کرنے والے غلام مراد ہیں۔تو معنی یہ ہوا کہ میں ایسے گھر میں آئی جہاں فصل گاہنے کیلئے بیل اور صاف کرنے کیلئے غلام اور جانور موجود تھے۔گویا یہ گھر بہت مالدار اور زمینداری کا گھر تھا۔صاف ستھرا غلہ کھانے کو ملتا تھا۔اس کے علاوہ نــقّ جب فعل مستعمل ہوتو اس کا معنی آواز نکالنا بھی ہے کہتے ہیں۔نقّت الدجاجۃ مرغی نے آواز لگائی گویا کہ اس گھر میں اس کام کیلئے بھی نوکر چاکر موجود تھے کہ فصلوں سے مرغیوں اور دیگر نقصان دہ پرندوں کو بھگائیں یا ذبح کرنے کیلئے مرغیوں کو پکڑیں جس سے مرغیاں شور مچائیں۔الغرض بھرا گھر تھا۔ٹھاٹ بھاٹ اور امیرانہ طرز زندگی میں میں ایک غریب گھرانے سے منتقل ہوگئی۔

فعنده اقول فلا اُقبَّح الخ تقبیح سے مضارع مجہول کا صیغہ ہے۔جس کے معنی ہیں کسی کی قباحت بیان کرنا یعنی اگر چہ ایک دیہاتی عورت ہونے کی وجہ سے میری باتیں نامناسب ضرور ہوتی تھیں مگر

وہ لوگ محبت سے پیش آ کر میری سب باتوں کو قبول کر لیتے تھے۔ مجھے برا بھلا نہیں کہا جاتا تھا۔ وارقد فاتصّبح تصبح کے معنی ہیں صبح دن چڑھے تک نیند کرنا۔ تو معنی یہ ہوا کہ میں سو کر صبح کو دیر سے اٹھتی تھی۔ اور خاوند مجھے نیند سے نہیں جگاتا تھا کیونکہ محبت کی وجہ وہ مجھ سے خدمت نہیں لیتا تھا۔ نیز خدمت کے لئے دیگر نوکر چاکر موجود ہوتے تھے۔

اشرب فاتقمح بخاری اور مسلم کی روایت میں فاتقح آیا ہے۔ قمح اور قح دونوں فتح کے باب سے آتے ہیں۔ دونوں کا مفہوم ایک ہے جب پیتے پیتے آدمی کسی مشروب سے سیر ہو جاتا ہے۔ پھر بھی بادل ناخواستہ وہی مشروب پینے لگتا ہے۔ اسی کو قمح الرجل اور قنح کہتے ہیں اور باب تفعل سے ہو کر بھی دونوں کا مطلب لغت کی کتابوں نے یہ لکھا ہے کہ ''تکارہ علی الشّربِ بعد الرّی ''یعنی پانی سے سیر ہونے کے بعد بھی بادل ناخواستہ پیتا رہا۔ یہاں پر نیند اور مشروبات میں توسع اور کثرت کا بیان ہے جیسا کہ کھانوں میں توسع کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

یہاں تک ام زرع نے جو کچھ کہا ہے اس میں اپنے خاوند کی محبت مہربانیاں اور عنایت والتفات کا تذکرہ ہے وہ کہتی ہیں کہ ابوزرع نے مجھے اتنے زیور پہنائے کہ کان جھومنے لگ جاتے کھانوں سے خوب فربہ ہوگئی تھی۔ غریب گھرانے سے اٹھا کر عیاشی کے گھر لے آیا جہاں ہر نعمت موجود تھی اور ہر لحاظ سے مجھ پر فراوانی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ میری ناز برداری بھی کی جاتی تھی۔ خاوند کی چہیتی ہونے کی وجہ سے میری ہر بات قبول کی جاتی تھی۔ آرام اور نیند میں خلل اندازی نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ نہ مجھے ڈانٹا جاتا تھا اور سوتی تو بے فکر سوتی رہتی تھی کوئی جگاتا بھی نہ تھا۔ کیونکہ گھر بار، غلوں اور جانوروں کیلئے نوکر چاکر موجود تھے اور کھانے پینے کو اتنا ملتا کہ خوب پیٹ بھر کر کھاتی پیتی تھی۔ حتیٰ کہ دل بھر جاتا تھا۔ امّ أبی زرع الخ گھر میں ایک عورت کیلئے اس کا خاوند ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا تعلق خاوند کی ماں، اس کی بہن بھائیوں اور اگر اس کی دوسری شادی یا اس کی اولاد ہو ان سے بھی ہوتا ہے۔ اس طرح گھر کی کیفیت سے بھی اس کا واسطہ پڑتا ہے۔ کبھی خاوند مہربان اور محبت کرنیوالا ہوتا ہے لیکن ساس اور نندیں جینا حرام کر دیتی ہیں۔ اب وہ اس گھر کی ہر طرح سے توصیف کرتی ہے کہ صرف ابوزرع ہی مہربان نہ تھا بلکہ ایں خانہ ھمہ آفتاب است کے مصداق سب اچھے تھے۔ چنانچہ پہلے وہ اپنی ساس کا ذکر کرتی ہے کہ وہ بھی مہربان اور عظیم عورت تھی۔

فما ام ابی زرع یہ استفہام تعظیم کیلئے ہے جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔عکو مھا رداح الخ علکم کی جمع ہے جو طعام اور کھانے کے برتن کو کہتے ہیں۔مختلف قسم کی برتنوں میں کھانے کی چیزیں رکھی جاتی ہیں۔کسی میں آٹا،کسی میں چنا دال کسی بھی آلو ٹماٹر وغیرہ۔تو ان اوعیۃ الطعام کو عکوم کہتے ہیں۔رداح راء کی فتحہ کے ساتھ صفت کا صیغہ ہے مفرد ہے مگر جمع کی خبر اس لئے واقع ہوا ہے کہ مبتداء میں کل علکم مراد ہے۔علاوہ ازیں غیر ذوی العقول کی جمع سے خبر اور صفت مفرد بھی واقع ہوتی ہے جیسے لقد رأی من آیات ربہ الکبریٰ۔ردح خوب بھرنے لب ریز ہونے اور ساتھ ساتھ وسعت وعظیم کے معنی کا بھی حامل ہے۔امرأۃ رَدَاحٌ ای عظیمۃ الاکفال والالیتین یعنی اس عورت کو کہتے ہیں جس کے کولہے اور سرین پُر گوشت اور خوب بھرے ہوئے ہوں۔

وبیتھا فساح فاء مفتوحہ اور مضمومہ دونوں کے ساتھ مروی ہے۔فسح کشادگی اور وسعت کو کہتے ہیں۔اور ایک روایت میں فیاح آتا ہے۔اسکا معنی بھی فراخی اور وسعت ہے چونکہ گھر کی مالکن عموماً ساس ہوتی ہے۔کھانوں وغیرہ پر وہ عموماً اپنا اختیار جتاتی ہے۔اور اسی وجہ سے اکثر بہو کو شکایت بھی ہوتی ہے لیکن یہ عورت ساس کی تعریف کرتے ہوئے کہتی ہے کہ وہ کنجوس نہ تھی۔اس کے کھانے کے برتن بڑے وسیع اور خوب بھرے ہوئے تھے۔گھر بھی کشادہ تھا۔

ابن ابی زرع خاوند کے بیٹے کی تعریف کرتی ہے۔مضجعہ کمسل شطبہ مضجع بستر ے اور خصوصاً اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں انسان کا پہلو بستر ے سے ملتا ہے اور مسلّ سلّ یسل سے ہے۔جس کے معنی باہر نکالنے کے ہیں۔مسل یہاں مسلول کے معنی میں مستعمل ہے۔اور شطبہ شین کے فتحہ کے ساتھ شطب یشطب (نصر) سے اسم ہے جو طولاً کاٹنے کو کہتے ہیں۔ شطبۃ اور شطیبۃ "قطعۃ تقطع طولا" یعنی کسی چیز کا وہ قطعہ جو لمبائی میں کاٹا جائے۔اس کا اطلاق کھجور کی شاخ سے جدا کئے جانے والے لمبے ٹکڑے پر بھی ہوتا ہے۔اور کھجور کے پتوں پر بھی جو کہ شاخ سے الگ کردی جائیں۔ جبکہ تلوار کیلئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔مسل شطبۃ میں صفت کی اضافت موصوف کو ہوئی ہے۔لہٰذا یہ شطبۃ مسلولۃ کے معنی میں ہے۔اور مراد یہ ہے کہ کھجور کی شاخ سے جدا کی جانیوالی ٹہنی کی طرح باریک اور تھوڑی سی جگہ اس کا بستر ہ ہے۔موٹا اور بھاری بھر کم نہیں ہے کہ سارے بستر کو بھرلے۔اور عربوں کے ہاں مردوں

میں یہ صفت ممدوح ہے۔وتشبعہ ذراع جفرۃ تشبع اشباع سے مضارع کا صیغہ ہے بھرنے اور سیر کردینے کو کہتے ہیں۔ذراع جانور کے اگلے پاؤں کو کہتے ہیں اور جفرہ بکری کے بچے لیلے کو کہتے ہیں جو ماں کا دودھ پینا چھوڑدے۔بعض شراح کے ہاں جب چار ماہ کا ہوجائے تو اسے جفرہ کہتے ہیں غلام جفرؔ اس بچے کو کہا جاتا ہے جس کے پہلو بڑے ہوجائیں۔یہاں مقصود یہ ہے کہ وہ کم کھانے والا ہے۔لیلے کے صرف ایک ہاتھ سے سیر ہوجاتا ہے۔جس پر گوشت بھی کم ہوتا ہے۔اس کلام کا مطلب یہ ہے کہ ابوزرع کا بیٹا چاک وچوبند نوجوان تھا۔چست اور پھرتیلا تھا کھانا بھی کم کھاتا تھا۔زیادہ کھانا بیداری اور چستی کو ختم کرتا ہے اور سستی پیدا کرتا ہے۔علاوہ ازیں دولتمندی اور تعیش کو بھی اشارہ ہے کہ وہ نفیس اور قیمتی کھانا کھاتا ہے۔

بنت أبی زرع الخ دوسری بیوی سے ابوزرع کی بیٹی کی تعریف کرتی ہے۔فمابنت ابی زرع یہاں بھی استفہام تعظیم کیلئے ہے یعنی وہ بھی عظیم اور شریف عورت تھی۔طوع أبیہاوطوع أمّہا الخ طوع مصدر ہے مبالغۃ فاعل کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔جیسے زید عدل زید عادل کے معنی میں ہے۔یہاں مطلب یہ ہوگا کہ مطیعۃً لوالدیہا کثیرۃ الاطاعۃ۔گویا والدین کے بارے میں سراپا اطاعت تھی نافرمان نہ تھی۔اوراسی مبالغہ کیلئے والدہ کے ساتھ دوبارہ طوع کا لفظ لائی ہے ورنہ ابیہا پر عطف کرنا بھی کافی تھا۔وملأ کساء ھا ملا یملا سے مصدر ہے۔جس کے معنی بھرنے کے ہوتے ہیں۔یہاں اسم فاعل کے معنی میں ہے یعنی مالئۃ کساء ھا اپنے کپڑوں اور برقعہ کو بھرنے والی یعنی خوب فربہ اندام تھی(۱)۔وغیظ جارتھا. غیظ کے معنی کسی کو غصہ دلانا اور ناراض کرنا ہے یعنی مغیظۃً لجارتھا. اور جارۃ اس مقام پر ضرّۃ یعنی سوکن کے معنی میں ہے۔ایک روایت میں عقر جارتھا آیا ہے۔جس کا معنی ہے کہ وہ سوکن کی موت تھی۔مطلب یہ ہے کہ وہ اتنی حسین فربہ اور خوش اندام تھی کہ اس کی سوکن ہمیشہ اس سے جلتی رہتی تھی۔اسے دیکھنا گوارا نہیں کرتی تھی۔گویا ابوزرع کی بیٹی اس کے لئے غیظ وغضب کا سبب بنی رہتی تھی۔جاریۃ أبی زرع الخ اب گھر کی خادمہ کی تعریف کرتی ہے کہ وہ بھی بہت اچھی تھی۔

(۱) بعض روایات میں یہاں ایک اور صفت کا اضافہ بھی مروی ہے۔وہ ہے ”وصفر رداء ھا“ یعنی اس کی رداء خالی ہوتی تھی اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کا سینہ اور نچھلا حصہ گوشت سے بھرا ہوتا تھا جبکہ پیٹ پتلی تھی جس کی وجہ سے درمیان میں رداء خالی رہتی تھی البتہ رداء کا اوپری حصہ اور ازار فربہی کی وجہ سے بھرا رہتا تھا۔(اصلاح الدین)

لیکن یہاں فرق مراتب کی وجہ سے تعظیم واستفہام کا کلمہ نہیں لائی (۱)۔تو ابوزرع کی خادمہ کی مدح کرتے ہوئے کہتی ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ نے ایسے دی تھی کہ لاتبث حدیثنا تبثیثا الخ بث اور تبثیث دونوں نشر کرنے اور پھیلانے کو کہتے ہیں تبثیث مفعول مطلق من غیر باب الفعل ہے۔یعنی وہ ہماری گھر کی بات اور راز کو ظاہر و شائع نہیں کرتی تھی۔ بلکہ راز کو راز رکھتی تھی۔ و لاتنقث الخ نقث (باب نصر) ایک چیز کو دوسری جگہ چوری چھپے یا علانیہ طور پر لے جانے کو کہتے ہیں۔گڑھی ہوئی چیز کو نکال کرلے جانے کو بھی کہتے ہیں۔تو لاتنقث کا معنی ہوا لا تنقل میرتنا ماریمیو کھانے پینے کی چیزیں لے جانے اور راشن پہنچانے کو کہتے ہیں۔گھی، غلہ، آٹا، نمک، تیل وغیرہ ضرورت کی چیزوں کی رسد کو میرہ کہتے ہیں۔قرآن مجید میں ہے۔''ونمیر اھلنا'' یعنی گھر کیلئے راشن لائیں گے۔حاصل کلام یہ ہوا کہ وہ خادمہ خائنہ نہ تھی کہ راشن کی چیزوں میں ہیر پھیر کرکے خیانت کرے۔اور جب کھانے پینے کی چیزوں میں خیانت نہ ہو تو دوسری چیزوں میں بطریق اولیٰ خیانت نہیں کرتی ہوگی۔

و لاتملا بیتنا اور ایک نسخہ میں بیننا ہے یعنی ہمارے درمیان یا ہمارے گھر میں کھوٹ نہیں ملاتی تھی تغشیش غش سے ہے جو ملاوٹ دھوکہ اور فریب کو کہتے ہیں اور اگر یہ لفظ تعشیش ہو تو عُش سے ہے جس کا معنی گھونسلا ہوتا ہے اور وہ بھی تنکوں، پروں، پتوں وغیرہ سے بنتے ہیں۔تو تعشیش کے معنی ہیں۔کوڑا کرکٹ اور تنکے وغیرہ جمع کرنا پہلی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ عموماً برے خدمتگار گھر میں بڑے بڑے فساد پیدا کرتے ہیں ایک کی باتیں دوسرے تک پہنچا کر گھروں میں جھگڑے پیدا کرتے ہیں رازوں کو فاش کرتے ہیں۔لیکن یہ خادمہ ان نقائص سے پاک تھی۔ساس نندوں اور میرے درمیان آگ نہیں بھڑکاتی تھی۔بعض شراح نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ وہ عفیف الفرج تھی اور کسی کو خود پر قابو نہیں دلاتی تھی۔اور تعشیش عین کے ساتھ ہو تو معنی یہ ہوگا کہ ہمارے گھر کو گھاس، پھوس کوڑا کرکٹ سے نہیں بھرتی تھی تاکہ ایک اور خادم صفائی کیلئے رکھنا پڑے۔صاف ستھرا رکھتی تھی۔بہر حال گھر کے تمام افراد بہت اچھے تھے اور گھر جنت کا نمونہ تھا۔

(۱) واضح رہے کہ بخاری، مسلم اور تمام شروح میں ''جارية ابی زرع فما جارية ابی زرع'' آیا ہے۔ البتہ ترمذی کے ساتھ چھپنے والے شمائل کے نسخے میں ''فما جارية ابی زرع'' کا کلمہ نہیں ہے اور حضرت شیخ استاد محترم کی توجیہ اسی کیلئے ہے۔(اصلاح الدین)

<u>امِّ زرع کا دوسرا شوہر:</u> خرج أبو زرع الخ اس کے بعد اپنی کامیاب اور خوشحال زندگی کا زوال بیان کرنے لگی ہے۔ والا طاب تمخض الخ اوطاب وطب کی جمع ہے جو دہی اور لسی کے برتن کو کہتے ہیں اس کا ترجمہ اسقیۃ اللبن سے کیا جاتا ہے اور لبن آج کل دہی کو کہتے ہیں۔ جبکہ دودھ کو حلیب۔ مخض جھٹکے اور شدت سے کسی چیز کو ہلانے کا نام ہے عورت کا جس وقت بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کو جھٹکے لگتے ہیں۔ ان جھٹکوں کے بعد بچے کی ولادت ہوتی ہے۔ اس وجہ سے دردزہ کو بھی مخاض کہتے ہیں اور دہی بلونے کو بھی مخض اس لئے کہتے ہیں کہ دہی بلوتے وقت اوطاب کو دھچکے دیئے جاتے ہیں۔ وہ فصیح و بلیغ لوگ تھے سویرے نکلنے کیلئے یہ جملہ بطور کنایہ استعمال کرتی ہے اور دراصل یہ سفر پر نکلنے سے کنایہ ہے کیونکہ سفر پر جاتے وقت آدمی کو سویرے اٹھ کر گھر سے جانا ہوتا ہے ایک شاعر کہتا ہے۔

مسافر شب کو اٹھتے ہیں جو جانا دور ہوتا ہے جوانی میں عدم کے واسطے سامان کر غافل

اس کے ساتھ اس جملے میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ وہ ایسے دنوں میں نکلا جب دودھ زیادہ ہوتا ہے۔ یہ عموماً عربوں کے تجارت کے ایام ہوتے تھے۔ پرانے زمانے میں عورتیں سویرے اٹھتی تھیں تا کہ صبح سویرے جب دہی ٹھنڈا ٹھنڈا ہوتا ہے اسے بلوئے۔ اس طرح مکھن زیادہ نکلتا ہے۔ اس لئے فجر سے بھی پہلے یہ عورتیں اٹھ کر دہی بلوتی تھیں۔ اب تو مغربی تہذیب نے عورتوں کو محنت اور کام کاج سے آزاد کردیا۔ سورج چڑھنے تک سارے لوگ سوئے رہتے ہیں۔ بہرحال ابو زرع صبح سویرے جب کہ عورتیں ابھی دہی بلونے میں لگی ہوئی تھیں گھر سے نکلا۔

فلقی امرأۃ الخ یعنی میری شامت جو آئی تو اس سفر میں اسے ایک عورت ملی جس کے ہمراہ دو بچے تھے۔ کالفھدین وہ ایسے چست اور چاک وچوبند تھے جیسے کہ چیتے ہوں اچھلتے اور کودتے تھے گویا چیتوں کے ساتھ کھیل اور پھرتی میں تشبیہ ہے۔

یلعبان من تحت الخصر برما نتین الخ اس جملے میں منظر کی دلکشی کے بیان کے ساتھ ساتھ مذکورہ عورت کی نسوانی حسن کی طرف بھی اشارہ ہے کیونکہ اس عورت کی کمر پتلی اور سینہ اور سرین کا حصہ بھرا ہوا اور فربہ تھا۔ وہ لیٹی ہوئی تھی اور اس کے سینہ اور سرین کے درمیان جو خلا سا پیدا ہوتا تھا پتلی کمر کی

وجہ سے اسی کوتحت الخصر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہاں اس کے دو بچے دواناروں کے ساتھ کھیل رہے تھے یعنی اس کے پہلو کے نیچے سے انار ادھرادھر پھینکتے جاتے تھے۔ یہ دلربا منظر دیکھ کراس آدمی کو تعجب ہوا۔ اور ایک توجیہ یہ بھی ہے کہ اس جملہ میں رمانتین عورت کے دو پستانوں کیلئے استعارہ کے طور پر مستعمل ہے۔ جیسا کہ بعض روایات میں تحت صدرہا اور دوسری میں تحت درعہا سے اس توجیہ کی تائید ہوتی ہے۔ پستانوں کو اناروں کے ساتھ تشبیہ دی ہے یعنی یہ دو بچے اس عورت کے پستانوں کے ساتھ کھیل رہے تھے اور اس قسم کی تشبیہ متعارف بھی ہے۔ ایک شاعر کا مصرع ہے ع وغصناٍ فیه رمّانٌ صغارٌ. یعنی وہ محبوبہ ایک ٹہنی کی طرح ہے جس پر دوانار لگے ہوئے ہیں۔

فطلّقنی الخ یعنی اس عورت کے حسن سے متاثر ہوا اور بیٹوں کی پھرتی سے نجابت کا علم ہوا تو ابوزرع نے مجھے طلاق دیکر اس عورت سے نکاح کرلیا۔ فنكحتُ بعدهُ الخ اس زمانہ میں عورت کیلئے دوسرے مرد کے ساتھ شادی کوئی معیوب بات نہ تھی بلکہ آج بھی عرب معاشرے میں حالت تقریباً یہی ہے اور یہ عین اسلامی طریقہ بھی ہے اس میں نہ مرد کیلئے کوئی مسئلہ ہے نہ عورت کو مشکلات۔ الغرض عورت نے اس کے بعد اس مرد سے نکاح کیا۔

رجلا سریا رکب شریا سریٌّ سردار کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ اور جاری نہر کو بھی کہتے ہیں۔ اسی وجہ سورۃ مریم کی آیت قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تحتك سريّا کا ایک معنی تو یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے نزدیک ہی نشیب میں ایک چشمہ یا نہر جاری کردیا۔ اور دوسرا معنی یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ سے ایک بڑے سردار کو جنم دینے کا انتظام کردیا ہے یعنی وجیه فی الدنیا والآخرة۔ پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا فرمایا ہے اور شریّ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو کہ خاص انداز سے مستی اور دلکی چال چلے۔ نیز مسلسل سفر کرتا جائے اور سفر کے دوران رکنے کا نام نہ لے۔ اخذ خطیّا الخ نیزے کی صفت ہے۔ یعنی رمحاً خطّیاً. خط جزیرۃ العرب کے جنوب مشرقی علاقے میں عمان کا ایک ساحلی شہر ہے جس میں بنائے جانے والے نیزے بہت اعلیٰ ہوتے تھے جسطرح کہ آج کل بعض ممالک کا اسلحہ بہت مشہور ہوتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ابوزرع کے بعد میں نے ایک ایسے شخص سے نکاح کیا جو نہ صرف سردار تھا بلکہ سرکش گھوڑے پر سوار ہوتا تھا جنگجو اور نیزہ باز بھی تھا۔ واراح علی نعما ثریا اراح یریح رواح سے

افعال کا صیغہ ہے۔شام کے وقت کوئی چیز لا کر دینے کو کہتے ہیں۔شام کو گھر واپس آنے والے جانوروں کو رائحہ جانور کہتے ہیں۔نعم کا اطلاق اونٹ،بیل اور بھیڑ بکریوں پر ہوتا ہے۔بعض نے اونٹوں کے ساتھ اسے خاص کہا ہے لیکن یہ درست نہیں ہے۔اور ثریا ثروۃ سے کثرت کے معنی کا حامل ہے۔یعنی بہت زیادہ مویشی اور جانور مجھے مہیا کر دیئے۔شام کو گھر آتے تو گھر بھر جاتا تھا۔

واعطانی من کل رائحة زوجاً رائحہ سے ہر راحت کی چیز مراد ہے۔یا شام کے وقت گھر آنے والے جانور مراد ہیں مطلب یہ ہے کہ گائے بھیڑ بکری وغیرہ دیئے۔بعض روایات میں ذال کے ساتھ ذابحہ کا لفظ آیا ہے۔یعنی **مایجوز ذبحه** (ذبح ہونے والے جانور) مجھے کئی دیئے ایک پر اکتفاء نہیں کیا۔

ومیری اهلک میری ماریمیر سے امر حاضر واحد مونث کا صیغہ ہے میرۃ راشن پہنچانے کو کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ گھر والوں یعنی رشتہ داروں،والدین کو بھی دیتی رہو پرواہ نہ کرو یعنی والدین اور میکے والوں کے پاس کچھ بھیجنے سے مجھے رنج نہیں ہوگا۔ہر عورت اس بات سے خوش ہوتی ہے کہ اس کا خاوند اس کے میکے کو قدر کی نظر سے دیکھے۔ام زرع بھی اس بات سے اپنے خاوند کی کشادہ دلی بیان کر رہی ہے۔

فلوجمعت الخ تمام نعمتوں اور احسانات کے باوصف ام زرع ابوزرع اور اس کی محبت کو یاد کر رہی ہے۔اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ اگر زوج ثانی کے تمام احسانات اور اس کی نعمتیں جمع کر دوں تو ابوزرع کے احسانات کے چھوٹے سے برتن میں سما جائیں۔بلکہ اس تک بھی نہ پہنچ سکیں۔وفاداری کی یہ عادت بعض لوگوں میں ہوتی ہے کہ علیحدگی کے باوجود بھی وہ پہلے خاوند کو یاد کرتی ہے اور خوشحالی کے باوجود اسی کا ذکر کر رہی ہے(۱)۔

---

(۱) یہی درحقیقت پہلی محبت کا جذبہ بھی ہے جس کی طرف ابوتمام نے یوں اشارہ کیا ہے۔

نقل فؤادک حیث شئت من الھویٰ مالحب الا للحبیب الاول

کم منزل فی الارض یا لفة الفتیٰ وحنینه ابداً لاوّل منزل

اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ" الشیب نصف المراۃ " کیونکہ پوری نہ ہو تو کم از کم آدھی محبت وہ پہلے خاوند کو دے دیتی ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی محبوبیت اور ام زرع کا مقام دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ واحد کنواری تھیں جو آپ ﷺ کے پاس تھیں۔(اصلاح الدین)

حضرت عائشہؓ نگاہ رسول ﷺ میں: قالت فقال رسول اللہ ﷺ الخ قصہ ختم ہوجانے کے بعد نبی کریم ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی دلجوئی بے مثال انداز سے فرماتے ہیں کہ میں تیرے لئے ابوزرع کے مرتبے میں ہوں یعنی اس طرح کی محبت میں تیرے ساتھ کرتا ہوں جس طرح کی محبت کوام زرع آخردم تک یادکرتی رہی۔اورایک روایت میں ہے غیر انی لم اطلقک (۱) یعنی میری محبت تو ویسی ہی ہے لیکن ابوزرع نے بے وفائی کرکے بیوی کوطلاق دے دی اور میں یہ کام نہیں کروں گا۔بعض روایات کے الفاظ یوں ہیں کنت لک کابی زرع لام ذرع فی الالفة والوفاء (۲) ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ آپ ﷺ میرے لئے ابوزرع سے ہزاروں درجہ بڑھ کر ہیں ابوزرع کیا تھا(۳)۔کیونکہ وہ تو صرف دنیوی لذات مہیا کرتا رہااور پھر طلاق بھی دیدی لیکن نبی کریم ﷺ نے اس کے ساتھ اخروی منافع سے بھی مالامال فرمایا۔

حدیث سے مسائل مستنبطہ: اس حدیث سے علماء نے متعدد مسائل مستنبط کئے ہیں لیکن امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ حدیث اس مقصد کیلئے لائے ہیں کہ ایک دائرے کے اندراور حدود شریعت کا پابند رہتے ہوئے حسن معاشرت کی خاطررات کے وقت سونے سے پہلے قصہ گوئی جائز ہے۔جس طرح کہ نبی کریم ﷺ کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے اس کے علاوہ اس حدیث سے دیگر مسائل بھی مستنبط کئے گئے ہیں مثلاً

(۱) فضیلت عائشہ رضی اللہ عنہ اور نبی کریم ﷺ کے ہاں ان کا مرتبہ اسی وجہ سے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کے فضائل کے باب میں ذکر کیا ہے(۴)۔

(۲) بیویوں کے ساتھ محبت اور حسن معاشرت کا اہتمام کرنا۔اسی لئے بخاری شریف میں اس حدیث کو باب حسن المعاشرة مع الاہل کے تحت لایا گیا ہے(۵)۔

---

(۱) جمع الوسائل ج۲ص۲۷

(۲) نقله القاری فی الجمع عن بعض الکتب ج ۲ ص ۲۷

(۳) زادالزبير إلاّ أنه طلّقها وإنّي لاأطلّقک فقالت عائشة رضی اللّٰہ عنها بابی انت وامی لانت خیر لی من أبی زرع لامّ زرع. تو شیخ علی حاشیة البخاری ج ا ص ۷۸۰(اصلاح الدین)

(۴) مسلم شریف ج۲ص۲۸۷

(۵) بخاری شریف ج۲ص۷۷۹

(۳)امم سابقہ کے واقعات کا بیان اور تاریخ گوئی کا جواز

(۴) یہ کہ مشبہ اور مشبہ بہ میں تمام وجوہ میں مماثلت شرط نہیں جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے خود کو ابوزرع سے تشبیہ دی لیکن خود ہی بعض صفات کی نفی بھی کر دی۔

(۵) اگر محکی عنہ غیر معروف ہو اور اس کی حکایت سے اس کی بے عزتی نہ ہو تو اس کے عیوب کا بیان غیبت کے زمرے میں نہیں آتا۔

خلاصہ باب

اس باب میں نبی کریم ﷺ سے رات کو قصہ گوئی نقل کی گئی ہے۔جس سے بظاہر اس کا جواز معلوم ہو رہا ہے اور ابتدائے باب میں ہم لکھ چکے ہیں کہ جہاں کراہت کا ذکر آیا ہے اس کا اپنا محمل ہے۔

نبی کریم ﷺ سے ان دو احادیث کے علاوہ دیگر احادیث میں بھی سمر یعنی رات کی قصہ گوئی اور بات چیت منقول ہے۔ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی رات کو نماز کے بعد کبھی کبھی مشورہ اور باتیں کرتے تھے جس کا روایت میں ذکر موجود ہے۔

خلاصہ یہ کہ رات کو قصہ گوئی جائز اور نبی کریم ﷺ کے عمل سے ثابت ہے۔لیکن اس کے ساتھ ان دونوں احادیث میں مزید بے شمار احکام کو بھی اشارہ ہے۔جن کو ہم دوران تشریح بیان کر چکے ہیں۔

۳۹. باب ما جاء في صفة نوم رسول اللهﷺ

حضور اقدسﷺ کے نیند کا بیان

گزشتہ باب میں نیند سے پہلے قصے سنانے کا ذکر تھا چونکہ ایسی قصہ گوئی کے بعد نیند ہوتی ہے اس لئے اس باب میں نیند کا ذکر کیا جاتا ہے۔نوم(۱) ذہول کی اس کیفیت کا نام ہے جس میں حواس اپنا کام چھوڑ دیتے ہیں اور علم ومعرفت اور ادراک ماند پڑ جاتی ہے۔اس لئے اسے اخوالموت یعنی موت کا بھائی کہا جاتا ہے۔اس سے قبل کچھ دیگر کیفیات بھی ہوتی ہیں جن کے لیے عربی میں اپنے نام ہیں۔مثلاً سِنَةٌ اس کیفیت کو کہا جاتا ہے جس میں صرف سر بھاری ہوجاتا ہے۔اس کے بعد جب آنکھیں بھاری ہوکر بند ہونے لگتی ہیں تو اسے نعاس کہتے ہیں۔اور جب یہ کیفیت دل تک پہنچ جاتی ہے تو نوم کہلاتی ہے۔

<u>نیند کی کیفیت اور دعائیں:</u> اس باب میں نبی کریمﷺ کی نیند کی کیفیت کے ساتھ وہ دعائیں بھی منقول ہیں جو آپﷺ نے اس سے پہلے یا اس کے بعد پڑھی تھیں۔

(۱) حدّثنا محمّد بن المثنىٰ أنبأنا عبدالرحمٰن بن مهديّ أنا إسرائيل عن أبي إسحاق عن عبدالله بن يزيد عن البراء بن عازب إنّ رسول اللهﷺ كان اذا اخذ مضجعه وضع كفّه اليمنىٰ تحت خدّه الأيمن وقال ربّ قني عذابک يوم تبعث عبادک(۲).

ترجمہ: حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ جب نبی کریمﷺ اپنے بستر پر لیٹ جاتے تھے تو اپنا ہاتھ رخسار کے نیچے رکھ کر لیٹ جاتے تھے۔اور یہ دعا فرماتے

(۱) نوم کا لغوی معنی ہے سونا،اونگھنا اور مرنا اور اصطلاح میں غشية ثقيلة تهجم على القلب فتقطعه عن المعرفة بالاشياء(المواهب اللدنية ص ۱۶۹)اور علامہ مناویؒ نے یوں تعریف کی ہے والنوم حالة طبعية تتعطل معها القوىٰ تسير في البخار إلىٰ الدماغ(المناوی علی هامش جمع الوسائل ۲/۴۷)(مختار)

(۲)السنن الكبرىٰ ۶/۱۸۸ كتاب عمل اليوم والليلة باب مايقول اذا أوىٰ إلى فراشه جامع ترمذی ۲/۶۵۰ ابواب الدعوات باب ماجاء في الدعا اذا اوىٰ الى فراشه،الادب المفرد للامام البخاری ۳۱۳ رقم الحديث ۱۲۱۶ مصنف ابن ابی شيبة ۹/۷۶(مختار)

تھے کہ" رب قنی عذابک یوم تبعث عبادک "یعنی اے میرے رب مجھے اس دن کے عذاب سے بچا جس دن تو اپنے بندوں کو زندہ کر کے اٹھائے گا۔

إذا اخذ مضجعه مضجع ضَجَعَ سے ظرف کا صیغہ ہے۔مضجع لیٹنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ بستر مراد ہے۔وضع کفه الیمنی کف سے ہتھیلی مراد ہے۔اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ دائیں کروٹ سویا کرتے تھے۔اس طرح کے سونے میں ایک تو دائیں جانب کی تفضیل ہے۔آپ ﷺ کرامت کے کاموں میں دائیں کو بائیں پر ترجیح دیا کرتے تھے اور یہی وجہ سب سے بہتر وجہ ہے۔دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ دائیں کروٹ سونے سے دل پر دیگر اعضاء کا بوجھ نہیں ہوتا کیونکہ دل سینے میں بائیں جانب کو ہے۔اس لئے ایسی نیند میں استغراق نہیں ہوتا۔اور بائیں جانب لیٹنے سے دل نیچے دب جاتا ہے۔جس کی وجہ سے نیند سے بیداری میں وقت ہوتی ہے۔لیکن یہ توجیہ اس وقت درست ہوگی جب کسی کو دائیں جانب لیٹنے کی عادت نہ ہو۔ورنہ بکثرت دائیں جانب لیٹنے سے جب اس کی عادت پڑ جاتی ہے تو اسی طرف کروٹ لیٹنے میں مزہ آتا ہے۔اور اسی جانب لیٹنا امت کی تعلیم کے لیے ہوگا(۱)۔ورنہ آپ ﷺ کا دل سوتے میں بھی بیدار رہتا تھا۔لہٰذا آپ ﷺ کے لیے دائیں بائیں سے فرق نہیں پڑتا تھا۔

ربّ قنی عذابک اس دعا میں نبی کریم ﷺ نے نہایت تواضع سے کام لیا ہے ورنہ عذاب سے بچنے کی دعا کی ضرورت آپ ﷺ کے لیے نہیں تھی۔یا پھر تعلیمِ امت کے لیے آپ ﷺ نے یہ دعا فرمائی۔یوم تبعث عبادک چونکہ نیند موت کی طرح اور بیداری بعث بعد الموت سے مشابہ ہے۔لہٰذا

(۱)اس روایت سے یہ بات ثابت ہے کہ دائیں کروٹ سونا مستحب ہے اور چت لیٹنا یا بائیں پہلو پر لیٹنا یا الٹا لیٹنا مکروہ ہے۔علامہ عبدالجواد الدومیؒ نے لکھا ہے وهذادلیل علی استحباب النوم علی الشق الایمن، وقد کره العلماء النوم علی الظهر و البطن و علی الجانب الایسر (الاتحافات ۳۰۶) طبی لحاظ سے بائیں جانب سونا اگرچہ نظام ہضم کے لئے فائدہ مند ہے مگر دوسری طرف دل پر اثرانداز ہوتا ہے تو نقصان دہ ہے۔شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ نے لکھا ہے کہ بعض اطباء نے بائیں جانب سونے کو اچھا بتایا ہے کہ گہری نیند آنے سے ہضم بہتر ہوتا ہے اور یہ صحیح ہے لیکن اس میں ایک مضرت بھی ہے جس کی طرف ان کا ذہن نہیں گیا وہ یہ کہ جب دل نیچے کی جانب ہوگا تو تمام بدن کا زور اس پر پڑے گا اور بدن کا مواد اس پر اثر کرے گا دل اعضائے رئیسہ میں اہم عضو ہے اس پر مواد کا تھوڑا سا اثر ہونا بھی بہت سے امراض کا سبب اس لئے بائیں کروٹ سونے میں اگر طبی مصلحت ہے تو ایک طبی مضرت بھی ہے اور مضرت سے بچنا زیادہ اہم ہے اس لئے طبی حیثیت سے بھی دائیں کروٹ پر سونا بہتر ہے۔(خصائل ۲۰۸،۲۰۹)(مختار)

نیند کے ساتھ بعثت کی یاد فطری بات تھی۔

(۲) حدّثنا محمّد بن المثنٰی أنبانا عبدالرحمٰن انا إسرائیل عن أبی إسحاق عن أبی عبیدة عن عبداللّٰہ مثله و قال یوم تجمع عبادک.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی اسی طرح کی حدیث مروی ہے (صرف یہ فرق ہے) کہ آپ نے فرمایا ''یوم تجمع عبادک '' یعنی جب تم بندوں کو جمع کرو گے۔

عن ابی عبیدة عن عبداللّٰہ ابوعبیدۃ حضرت ابن مسعود کے بیٹے ہیں۔اپنے والد سے حضرت براءؓ کی طرح کی حدیث نقل کرتے ہیں صرف یوم تبعث کی بجائے یوم تجمع کہا ہے۔جمع بعثت کے بعد قیامت کے روز ہی ہوگی(۱)۔

(۳) حدّثنا محمود بن غیلان ثنا عبدالرزاق أنا سفیان عن عبدالملک بن عمیر عن ربعی بن حراش عن حذیفة قال کان النبیّ ﷺ اذا آوی الی فراشه قال اللهمّ باسمک أموت و أحییٰ وإذا ستیقظ قال الحمد للّٰہ الذی أحیانا بعد ماأماتنا و إلیه النشور(۲).

ترجمہ: حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب بستر پر لیٹتے تو یہ کہتے ''اے اللہ تیرے ہی نام سے مرتا (سوتا) ہوں اور تیرے ہی نام سے زندہ ہوتا (جاگتا) ہوں۔اور جب جاگ جاتے تو فرماتے ''تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں موت کے بعد زندگی بخشی اور اسی کی جانب ہم نے رجوع کرنا ہے۔

(۱) پہلی روایت میں یوم تبعث ہے اور اس میں یوم تجمع ہے اس کی وجہ علامہ بیجوریؒ قال یوتجمع عبادک أی بدل یوم تبعث عبادک و لابدمن تحق البعث و الجمع معافاکتفیٰ فی کل حدیث بأحدهمالأنّه یکون البعث ثمّ الجمع ثمّ النشور کما ورد(المواهب اللدنیة ص ۱۷۰)(مختار)

(۲)صحیح بخاری ۹۳۴/۲ کتاب الدعوات باب مایقول اذانام، سنن ابی داؤد ۳۴۰/۲ کتاب الادب باب مایقول عندالنوم، جامع ترمذی ۱۵۲/۲ کتاب الدعوات باب منه، السنن الکبریٰ للنسائی ۱۸۷/۶ کتاب عمل الیوم واللیلة باب ما یقول اذا ارادأن ینام (مختار)

إذا آوی الی فراشہ الخ حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ جب آپ ﷺ اپنے بستر کو آتے تو مذکورہ دعا پڑھتے۔ایواء حفاظت کی جگہ کو پہنچنے کو کہتے ہیں۔ٹھکانے کو ماُویٰ کہتے ہیں۔قرآن مجید میں ہے آو آوِ یْ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیدٍ. حضرت لوطؑ فرماتے ہیں کہ کاش میرا بھی مضبوط ٹھکانہ اور مرجع ہوتا جہاں میں سر چھپاتا اور جن سے دشمنانِ دین کے خلاف مدد حاصل کرتا۔

اللھّم باسمک اموت (۱) واحییٰ الخ یعنی تیرے نام کو متحضر کرتا ہوں میرا ایمان ہے توحید پر۔اور اسی حالت میں سوتا ہوں۔نیند ایک لحاظ سے موتِ اصغر ہے۔

نیند کی موت سے مشابہت: کیونکہ اس میں حواس معطل ہوجاتے ہیں۔نیز موت کا اطلاق تعطل اور زوالِ حواس پر بھی ہوتا ہے۔کہتے ہیں النوم اخو الموت. واحییٰ اور تیرے نام کے ساتھ زندہ ہوتا ہوں۔یعنی جاگتا ہوں۔اور حواس کا تعطل ختم ہونے کو حیاۃ کہا ہے۔

اس سارے جملے میں حضرت ابراہیمؑ کے قول کی طرف اشارہ ہے۔انہوں نے فرمایا کہ ان صلاتی ونسکی ومحیای و مماتی للّٰہ ربّ العالمین ۔نیز اس بات پر تنبیہ ہے کہ نیند سے پہلے یہ تصور کرنا چاہیے کہ شاید یہ آخری نیند ہو اور اسی میں روح قبض ہو۔لہٰذا حسن خاتمہ کے لیے اللہ تعالیٰ کا ذکر چاہیے۔اور بیدار ہونے کے بعد ادراک اور حس وحرکت دوبارہ ملنے پر خداوندِ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

لیکن یہ سب کچھ ظاہری اعتبار سے ہے ورنہ حقیقت میں نبی کریم ﷺ کے نزدیک موت ہی بیداری ہے۔نیند نہیں۔اور ہم زندگی کی حالت میں نیند میں ہیں۔مرجائیں گے تب ہی بیدار ہونگے۔ انتبھوا کہ زندہ لوگ خوابیدہ ہیں جب مرینگے تب بیدار ہونگے۔الناس نیام اذا ماتوا انتبھوا کیونکہ اس وقت سارے حقائق محسوسات کی طرح منکشف ہوجائیں گے۔اور یہی وجہ ہے کہ مومن زندگی کے تکالیف سے نہیں ڈرتا۔وہ بڑی مصیبتوں کو صبر واستقامت سے جھیل سکتا ہے کیونکہ خواب کی تکلیف درحقیقت

(۱) ملاعلی قاریؒ نے موت کے مختلف معانی نقل کیے ہیں (۱) سکون (ٹھہرنا) وقیل الموت فی کلام العرب یطلق علی السکون یقال ماتت الریح إذا سکنت (۲) جہالت وقد یستعمل فی زوال القوّۃ العاقلۃ وھی الجھالۃ کقولہ تعالیٰ اومن کان میتاً فأحییناہ (الایۃ) (۳) احوال شاقۃ وقد یستعار الموت للاحوال الشاقۃ کالفقر والذل والسوال والھرام والمعصیۃ وغیرذلک (جمع الوسائل ۲/۷۵)(مختار)

تکلیف ہے ہی نہیں۔ جاگنے کے بعد ساری کدورت دور ہو جاتی ہے۔ جبکہ کافر و فاسق دنیا میں مزے اڑائیں تو کیا؟ ابھی موت آئی آنکھیں کھلیں اور مار پڑنے لگی تو زندگی کے خواب میں مزوں سے کیا فائدہ۔ جب جاگنے کے بعد کدورت ہی کدورت ہے۔

<u>نیند سے بیداری کی بعثت سے مشابہت:</u> والیہ النشور (۱) نیند سے بیدار ہونے کے بعد آخرت کی بعثت اور اللہ تعالیٰ کے ہاں حاضری کا دھیان ہونا چاہیے۔ اور اعمال کے حساب کو یاد کرنا چاہیے۔ تاکہ استقامت میں فرق نہ آئے۔

(۴) حدّثنا قتیبة بن سعیدثنا المفضّل بن فضاله عن عقیل اراه عن الزّهری عن عروة عن عائشة قالت کان رسول اللهﷺ إذاأوی إلیٰ فراشه کلّ لیلة جمع کفّیه فنفث فیهما وقرأفیهما قل هو اللّٰه احد و قل أعوذ برب الفلق وقل أعوذ برب النّاس ثم مسح بهما ما استطاع من جسده یبدء بهما راسه ووجهه و ما أقبل من جسده یصنع ذلک ثلاث مرات(۲).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریمﷺ ہر رات کو جب بستر پر لیٹتے تو دونوں ہاتھوں کو ملا کر ان پر دم فرما دیتے تھے۔ اور (تین سورتیں) قل ھو اللّٰہ احد، قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھ لیتے تھے۔ جہاں تک ان

---

(۱) علامہ ملا علی قاریؒ الیہ النشور کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں ای والیہ المرجع فی نیل الثواب ممّا نکتسبه فی حیاتناهذه (جمع الوسائل ۷۵/۲) اور علامہ نوویؒ نے نشور سے بعث بعد الموت لیا ہے وقال النوویؒ المراد باماتتنا النوم وامّا النشور هوالاحیاء للبعث یوم القیامة فنبهﷺ باعادة الیقظة بعدالنوم الذی هوشبیه بالموت علی اثبات البعث بعد الموت اور بعض نے نشور سے مراد التفرق فی امر المعاش کا لافتراق حال المعاد لیا ہے (جمع الوسائل ۷۵/۲) (مختار)

(۲) صحیح بخاری ۷۵۰/۲ کتاب فضائل القرآن باب فض المعوذات، سنن ابی داؤد ۳۴۰/۲ کتاب الادب باب مایقول عندالنوم، جامع ترمذی ۱۷۵/۲ کتاب الدعوات باب ماجاء فیمن یقرأ القرآن عندالمنام، السنن الکبریٰ للنسائی ۱۹۰/۶ کتاب عمل الیوم واللیلة باب مایقول من یفزع فی منامه، سنن ابن ماجة ص ۲۷۶ کتاب الدعاء باب مایدعوبه إذا اوی إلی فراشه. (مختار)

کے ہاتھ پہنچتے اپنے ہاتھوں کو بدن پر پھیر لیتے تھے۔ سر اور چہرے سے شروع کر کے بدن کے اگلے حصے پر پہلے ہاتھ پھیرتے تھے۔ تین مرتبہ آپﷺ ایسا کرتے تھے۔

دم ڈالنا اور پھونک مارنا: فنفث فیھما نفخ پھونک مارنے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ لعاب نہیں ہوتے۔ نفث بھی بعض لوگوں کے ہاں اسی معنی میں ہے اور کچھ لوگوں کے ہاں نفث میں تھوڑا سا لعاب ہوتا ہے جبکہ تفل تھوکنے کو کہتے ہیں۔ امام نوویؒ نے اہل اللغت سے نقل کیا ہے کہ النفث لطیف بلاریق یعنی نفث نرم پھونک کو کہتے ہیں جس میں لعاب شامل نہ ہو۔ عموماً دم کرتے وقت ایسا ہی کیا جاتا ہے۔ اس سے مقصود برکت ہوتی ہے۔ تو آپﷺ ہاتھوں کو جمع کر کے اس میں نفث فرماتے تھے۔

یعنی کچھ پڑھ کر دونوں ہاتھوں پر دم کرتے تھے گویا ذکر کی وجہ سے منہ میں اور پھر لعاب اور پھونک کے واسطے سے ہاتھوں میں برکت آجاتی ہے۔ وقرأ فیھما یہاں واو مطلق جمع کے لیے ہے کیونکہ نفث عموماً قراءۃ کے بعد ہوتا ہے(۱)۔ بعض روایات میں فقرأ فاء کے ساتھ آیا ہے لیکن فاء کو بھی واو کے معنی میں لیا گیا ہے(۲)۔ آپﷺ قرآن مجید کی آخری تین سورتیں پڑھتے اور بعض روایات میں مسبحات کا ذکر

(۱) اور یہی جمہور کی رائے ہے۔ لأنّ النفث ینبغی ان یکون بعد التلاوة لیوصل برکة القرآن إلیٰ بشرته(حاشیه شمائل ترمذی) اور ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے لأنّ تقدیم النفث علی القرأة ممّالم یقل به احدٌ(جمع الوسائل ۲/۷۷) اگرچہ بعض حضرات نے اولاً نفث اور پھر قرأۃ کو ترجیح دی ہے جیسا روایت بالا سے بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ قال العلامه البیجوری(قوله وقرأفیھما)وفی روایة فقرأبالفاء ومقتضی الروایة الاولیٰ أنّ تقدیم النفث علی القرأة وعکسه سیان حیث کانابعدجمع الکفین ومقتضیٰ الروایة الثانیة أن النفث یکون قبل القرأة وبه جزم بعضهم وعلّل ذلک بمخالفة السحرة فانّهم ینفثون بعد القرأة (المواهب اللدنیة ص ۱۷۱)لکنّ ظاهر کلام الشیخ ابن حجرؒ أنّ الاولیٰ تقدیم القرأة علی النفث فانّه حمل روایة الفاء علی أنّ قوله فنفث فیھما فقرأة معناه فأرادالنفث فیھما فقرأ فنفث بالفعل (المواهب الدنیة ص ۱۷۱) مگر علامہ بیجوریؒ نے اس توجیہ کی تردید کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ ولایخفی ما فی هذا الحمل من التکلف لأنّه خلاف ظاهر(المواهب اللدنیة ص ۱۷۱) اور امام فراءؒ نے فرمایا ہے کہ الفاء لاتفید الفاء الترتیب واحتجّ بقوله تعالیٰ اهلکناهافجاء ها بأسنابیاتاًوهم نائمون(جمع الوسائل ۲/۷۷) مگر جو توجیہ مولانا صاحب مدظلہ نے ذکر فرمائی ہے وہ زیادہ وزنی ہے اس لئے کہ قاموس میں ہے انّ الفاء تأتی بمعنی الواو(جمع الوسائل ۲/۷۷) اور یہ توجیہ تکلف سے بھی خالی ہے۔(مختار)

(۲) فاء والی روایت کی ایک توجیہ علامہ ابن حجرؒ نے بھی کی ہے۔(مختار)

بھی ہے یعنی وہ سورتیں جن کی ابتداء میں تسبیح وارد ہوئی ہے جیسے سبحٰن الذی أسریٰ الخ ۔یا سَبَّحَ لِلّٰہ الخ ۔ان روایات میں تعارض نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ ایک وقت میں ایک سورۃ پڑھتے اوردوسرے وقت میں دوسری سورۃ پڑھتے ۔ما استطاع یعنی جہاں تک ہاتھ پہنچتا اور ممکن ہوتا یعنی سر سے شروع کرتے پھر جسم کے مقدم حصے پر ہاتھ پھیرتے پھر پیٹھ پر پھیرتے اور تین بار یہ عمل دہراتے ۔تاکہ کمال برکت حاصل ہو اگرچہ نفس برکت ایک بار سے حاصل ہوجاتی ہے۔

(۵) حدّثنا محمّد بن بشّار ثنا عبدالرحمٰن بن مھدی ثنا سفیان عن سلمة بن کھیل عن کریب عن ابن عبّاس أنّ رسول اللّٰہ ﷺ نام حتّٰی نفخ و کان إذا نام نفخ فاتاہ بلال فاذنه بالصّلٰوۃ فقام وصلّیٰ ولم یتوضّأ وفی الحدیث قصّة(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سوئے تو خراٹے لینے لگے اور آپ ﷺ کی یہ عادت تھی جب سوتے تو خراٹے لیتے تھے۔پھر بلال آئے اور نماز کی تیاری کی اطلاع دی چنانچہ آپ ﷺ نے نماز پڑھی اوروضوء کی تجدید نہیں کی۔

نیند میں خرّآٹے: حتی نفخ الخ یہاں تک کہ آپ ﷺ خراٹے لینا شروع کر دیتے تھے ۔وہ صحت مند انسان جس کا سینہ مضبوط ہوتا ہے۔ عموماً سوتے وقت خراٹے لینا شروع کر دیتا ہے ۔آپ ﷺ بھی خراٹے لیتے تھے(۲)۔

---

(۱)صحیح بخاری کتاب الدعوات باب الدعاء إذاأنتبه من الیل، صحیح مسلم کتاب الحیض باب غسل الوجه والیدین اذااستیقظ من النوم، سنن ابی داؤد کتاب الادب باب فی النوم علی طهارۃ، سنن ابن ماجة کتاب الطھارۃ باب وضؤالنوم(مختار)

(۲) جدید طب کے اندازوں کے مطابق خراٹوں کا اصل سبب یہ ہے کہ بیماری یا کھانے کی زیادتی کی وجہ سے تھالو ڈھیلا پڑجاتا ہے اس لئے نیند کی حالت میں سانس لیتے وقت اس کی تھرتھراہٹ سے خراٹوں کی آواز پیدا ہوتی ہے۔یہ آواز منہ کے ذریعے سانس لیتے وقت پیدا ہوتی ہے۔اگر ناک کے ذریعے سانس لی جائے تو خراٹوں کی آواز نہیں نکلتی۔اگر پہلو کے بل سویا جائے تو بھی یہ آواز پیدا نہیں ہوتی۔اسی وجہ سے پرانے لوگ اس کے علاج کے طور پر پشت پر کوئی پتھر بندھواتے تھے تاکہ مجبوراً پہلو کے بل سویا جائے۔بعض ماہرین نفسیات کے مطابق خراٹے ایک لاشعوری عمل ہے۔(بقیہ اگلے صفحہ پر)

ولم يتوضأ نبی کریم ﷺ کی نیند بالاتفاق ناقض وضوء نہیں تھی۔ یہ آپ ﷺ کی خصوصیت ہے آپ ﷺ فرماتے ہیں **تنام عینا ی و لاینام قلبی**(۱) اوراس میں حکمت یہ تھی کہ آپ ﷺ کے لیے وحی کی خاطر ہردم بیدار ہونا ضروری تھااور اصل بیداری دل ہی کی ہوتی ہے۔قرآن مجید کا پاک ارشاد ہے کہ

نزّله علی قلبک یعنی جبریل امین نے قرآن کو تیرے دل پر اتارا۔تو اگر قلب میں بیداری نہ ہو۔تو وحی کا اخذ اور حفاظت کیونکر ہو۔اسی وجہ سے تو انبیاء کے خواب بھی وحی ہوتے ہیں۔حضرت ابراہیمؑ کو سوتے میں حضرت اسماعیلؑ کو ذبح کرنے کا حکم ملا اوراس پر عمل بھی کیا۔

وفی الحدیث قصة الخ اس حدیث میں مزید قصہ وہ ہے جو حضرت میمونہؓ کے گھر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو پیش آیا یہ واقعہ بالتفصیل اگلے باب میں آرہا ہے۔اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کی نیند کی ایک نئی حیثیت ثابت ہوئی کہ آپ ﷺ نیند میں خراٹے بھی لیتے تھے۔

(۶) حدّثنا إسحاق بن منصور ثنا عفان ثنا حمّاد بن سلمة عن ثابت عن أنس بن مالک أنّ رسول اللهﷺ کان إذا أوی الی فراشه قال الحمد لله الذی أطعمنا وسقانا وکفانا وآوانا فکم ممّن لا کافی له ولا مؤوی(۲).

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷) پرانے زمانے میں انسان مضر جانوروں کو ڈرانے کے لیے اس قسم کی آوازیں جاگتے ہوئے نکالتا تھا۔ پھر یہی آوازیں وہ نیند کی حالت میں بھی لاشعوری طور پر نکالنے لگتا تھا۔اور رفتہ رفتہ یہ آوازیں انسان کی فطرت کا جزو بن گئیں (از بی بی سی)

لیکن طب اور نفسیات کی ان تخمینی باتوں کا وزن اس وقت کم ہو جاتا ہے جب ہم یہ حدیث پڑھتے ہیں۔کیونکہ نبی کریم ﷺ کی صحت آخر دم تک قابل رشک تھی۔ بلکہ مشاہدہ بھی یہی ہے کہ خوب صحتمند لوگ خراٹے لیتے ہیں۔اگر چہ وہ بھوکے کیوں نہ سوئیں۔اور اگر فطرت کی بات ہوتی تو کمزور لوگوں کی فطرت کا جزو کیوں نہ بنتیں (اصلاح الدین)

(۱)بخاری کتاب التراویح باب ۱ ، اور کتاب التهجد باب ۱۶ (مختار)

(۲)صحیح مسلم ۳۵۶/۲ کتاب الذکر والدعاوالتوبة باب الدعا عندالنوم ، سنن ابی داؤد ۳۴۰/۲ کتاب الأدب باب مایقول عندالنوم، جامع ترمذی ۶۵۰/۲ کتاب الدعوات باب ماجاء فی الدعا إذا أویٰ إلیٰ فراشه، السنن الکبریٰ للنسائی ۱۹۰/۶ کتاب عمل الیوم واللیلة باب مایقول من یفرغ من منامه.(مختار)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب اپنے بستر ے میں تشریف لائے تو یہ دعا فرمائی (ترجمہ) تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے ہمیں کھلایا، پلایا، ہماری ضروریات کی کفایت فرمائی۔ اور سونے کے لیے ٹھکانہ دیا۔ کتنے لوگ ہیں جن کا کفایت کرنے والا کوئی نہیں اور نہ کوئی ٹھکانہ دینے والا ہے۔

کفران نعمت سے بچنے کا علاج: الحمد للّٰہ الخ دنیا کی نعمتوں میں اگر انسان کسی بدحال شخص پر نظر ڈالے تو اپنی خوشحالی پر دل کے اندر سے شکر نکلتا ہے۔ اس کے برعکس اعلیٰ معیار زندگی گزارنے والوں پر نظر پڑتی ہے تو کفران نعمت میں مبتلا ہونے کا خوف ہوتا ہے۔ یہاں پر نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر گزاری کی تعلیم دی ہے اور اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اپنی خوشحالی کا تصور کر کے شکر ادا کرنا چاہیے۔

روٹی کپڑا اور مکان صرف خدا دیتا ہے: اطعمنا و سقانا نیند کے وقت کھانے پینے کی نعمت کا تذکرہ اس لئے فرمایا کہ تینوں زندگی کے لیے ایک جیسے ضروری ہیں۔ علاوہ ازیں نیند تب ہی آتی ہے جب آدمی بھوکا پیاسا نہ ہو۔ اس لئے نیند کے ساتھ ہی دیگر دو نعمتیں بھی یاد آجاتی ہیں۔ بلکہ نیند کے لیے فراغِ خاطر بھی چاہیے۔ اس لئے کھانے پینے کے بعد ضرورتوں کا پورا ہونا اور پناہ گاہ کا میسر ہونا بھی ذکر فرمایا۔ لیکن چونکہ رزق عام ہے اس سے کوئی محروم نہیں رہتا۔ البتہ ضروریات کی کفایت اور پناہ گاہ سے بکثرت محرومی پیش آتی ہے اس لئے مؤخر الذکر دونوں کی نفی بعض مخلوقات سے کرنی پڑی۔

و کفانا یعنی ہماری ضروریات کی کفایت کی اور پیش آنے والے حوادث میں رحم فرما کر حفاظت فرمائی۔ ہمارے لاکھوں مسائل میں وہی ذات ہمارے لئے کافی ہوا۔ اور دشمنوں، شرور و آفات و بلیات میں دستگیری فرمائی۔ ہمیں علم بھی نہیں ہوتا۔ اور مسائل حل ہو چکے ہوتے ہیں اور حادثات و مصائب میں نجات مل چکی ہوتی۔ ذالک بان اللّٰہ مولیٰ الذین آمنوا و ان الکافرین لا مولیٰ لھم۔

و آوانا اور ہمیں ٹھکانا اور پناہ دی۔ فٹ پاتھ اور سڑک پر تو نہیں رہنے دیا۔ جبکہ آج بھی ہزاروں لاکھوں انسان جنگلوں، خیموں اور سڑکوں پر پڑے ہوتے ہیں۔ بستر ہ تو کجا سر چھپانے کی جگہ میسر نہیں۔ مصائب کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انہی لوگوں کا ذکر نبی کریم ﷺ نے ان الفاظ میں فرمایا ”فکم ممن لا

کافی لہ ولا مؤوی لہ ''وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم پر یہ احسان کیا کہ ہماری کفایت کردی اور پناہ وٹھکانہ دیا۔ نبی کریم ﷺ نے اس مقام پر روٹی کپڑا اور مکان کے بارے میں واضح کردیا کہ تینوں اللہ تعالیٰ ہی دیتے ہیں توفکم ممن لا کافی الخ دراصل حمد کے لیے تعلیل ہے۔یعنی ان بدحالوں کا احساس ہوتا ہے تو نعمتوں پر شکر دل سے نکل جاتا ہے۔

(۷) حدّثنا الحسین بن محمّد الجریری ثنا سلیمان بن حرب ثنا حمّاد بن سلمة عن حمید عن بکربن عبداللّٰہ المزنّی عن عبداللّٰہ ابن رباح عن أبی قتادة أنّ النبی ﷺ کان إذا عرس بلیل اضطجع علی شقّہ الأیمن وإذا عرّس قبیل الصبّح نصب ذراعیہ ووضع راسہ علی کفّہ (۱).

ترجمہ: حضرت قتادہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ رات کے آخری حصہ میں (صبح سے بہت پہلے) آرام کے لیے پڑاؤ ڈالتے۔تو دائیں پہلو لیٹ جاتے تھے۔اوراگر صبح سے کچھ پہلے آرام کا ارادہ فرماتے تو کہنی رکھ کر ہاتھ کھڑا کردیتے تھے اوراس پر سر رکھ کر قدرے آرام فرمالیتے تھے۔

ابو قتادةؓ: حضرت ابوقتادہؓ انصاری مشہور خزرجی صحابی ہیں۔کنیت سے پہچانے جاتے ہیں۔نام میں اختلاف ہے بعض نے حارث بن ربعی بتایا ہے بعض کے خیال میں عمرو بن ربعی یا نعمان بن عمرو ہے۔آپؓ کو فارس رسول اللہ ﷺ بھی کہا جاتا ہے۔بدر کے سوا تمام غزوات میں شریک رہے۔ایک قول کے مطابق حضرت علیؓ کی خلافت میں کوفہ میں وفات پائی تھی لیکن صحیح یہ ہے کہ آپؓ نے ۵۴ھ میں مدینہ میں وفات پائی کیونکہ مروان بن الحکم سے مدینہ میں آپؓ کی ملاقات ثابت ہے۔

تعریس باللیل کے بعد وقت کالحاظ: اذا عرّس بلیل عموماً عرب لوگ زمانہ قدیم میں رات کو سفر کیا کرتے تھے۔آپ ﷺ کی بھی عادت شریفہ یہی تھی کہ دور کا سفر مقصود ہوتا تو عصر کے قریب سفر

(۱)صحیح مسلم ۱/ ۹۹ کتاب المساجد ومواضع الصلوٰة باب قضاء الصلوٰة الفائتة الخ المستدرک للحاکم ۱/ ۴۴۵،صحیح ابن حبان ۸/ ۱۱۸، مسنداحمد ۵/ ۲۹۸ (مختار)

شروع کر دیتے تھے رات کے اکثر حصے میں سفر کرتے رہتے تھے۔رات کے آخری حصے میں کسی جگہ پڑاؤ ڈال دیتے تھے۔

اس قسم کے آرام کو جو رات کے آخر میں ہوتا ہے تعریس کہتے ہیں۔اس لئے کہ یہ عُرس سے ہے جو کہ شادی کو کہتے ہیں۔اور عروس دلھا اور دلھن کو کہتے ہیں کیونکہ یہ دونوں رات کے وقت ہی ملتے ہیں اور عموماً شب بیداری کے بعد صبح کو آرام کا موقعہ ملتا ہے۔بہر حال ایسی رات کو جب آپ ﷺ کو یقین ہوتا کہ ابھی کافی وقت ہے نماز قضا نہیں ہوگی تو اطمینان کے ساتھ دائیں کروٹ سو جاتے تھے اور اگر وقت کم ہوتا تو صرف آرام کرتے نیند کی صورت میں نماز کے جانے کا اندیشہ ہوتا۔لہٰذا ہاتھ سے تکیہ لگا کر لیٹ جاتے تھے۔جو کہ بروقت بیداری میں زیادہ ممد ہے۔اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نیند کے نظام الاوقات میں ایسی ترتیب ہونی چاہیے کہ سفر،نماز،اور دیگر مشاغل بھی بروقت ادا ہوں۔

۴۰. باب ما جاء فی عبادة رسول اللہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے عبادت کے بیان میں

عبادت کا معنی اقصیٰ غایة الخضوع و التذلل یعنی زیادہ سے زیادہ عاجزی اور خشوع وخضوع ہے(۱)۔

لیکن شریعت میں ان اعمال پر بھی اسکا اطلاق ہوتا ہے۔ جو اس تذلل کا مظہر ہیں جیسے نماز روزہ غیرہ۔

تمام انسانوں اور خصوصاً نبی کریم ﷺ کی اصل صفات معنوی صفات ہیں۔ ایک خلقی خوبیاں ہوتی ہیں ان کا تعلق ظاہر سے ہے اور جو دکھائی دیتی ہیں۔ اس قسم کی خوبیاں بھی اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو بدرجۂ اتم عطا فرمائی تھیں۔ ان محاسن کے کچھ نمونے ہم پڑھ چکے ہیں لیکن عظیم صفات وہ معنوی صفات ہیں جو اخلاق کہلاتی ہیں۔

<u>صفتِ عبدیت:</u> ان تمام باطنی صفات میں سب سے اعلیٰ صفت عبدیت کی صفت ہے۔ آپ ﷺ اعبدُ الناس یعنی سب سے زیادہ بندگی کرنے والے بشر تھے۔ اللہ تعالیٰ کی بندگی آپ ﷺ کی رگ وریشہ

(۱) خواہ وہ عجز وانکساری بطور عادت ہو یا عبادت، اگر چہ اصلی معنی عبادت کا امتثال امر ہے۔ اس لئے علماء کرام نے فرمایا ہے کہ بعض عادات بھی عبادات بن جاتی ہے۔ البتہ بعض اشیاء ایسی ہیں جن کی مشروعیت صرف عبادت کے لئے ہے۔ اور بعض افعال واعمال ایسے ہیں جن کی مشروعیت حوائج انسانیہ کیلئے ہوئی مگر وہ نیت کی وجہ سے عبادت بن جاتے ہیں۔ لفظ عبادت اگر چہ عام ہے۔ یعنی فرض، واجب اور نوافل سب کو شامل ہے۔ مگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عبادات نافلہ مراد ہیں جن پر عام لوگوں کو اطلاع نہیں۔ فرائض پر تو ہر ایک کو اطلاع ہوتی ہے (تقریر ترمذی مع شمائل ترمذی حضرت مدنیؒ ص ۸۷۱) آنحضرت ﷺ کے نوافل کے بارے میں انعقاد باب کی وجہ اور غرض یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ باوجود معصوم ہونے اور قد غفر اللہ ماتقدّم و ماتأخر کا خطاب ملنے کے نوافل کا اور خصوصاً رات کے وقت نوافل کا کس قدر اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ علامہ عبدالجواد الدومیؒ نے لکھا ہے ستعرف فی ھذا الباب کیف کانت عبادة النبی ﷺ و کیف داوم علیھا حتیّ ورمت قدماہ (الاتحافات ۳۱۱) اور پھر باب نوم کے بعد اس باب کو لانے کی وجہ علامہ مناوی نے یہ لکھا ہے کہ لانّ نومہ عبادة او لانّہ کان یعقب نومہ بعبادتہ (المناوی علی ھامش جمع الوسائل ۲/۹۷) جبکہ بعض نسخوں میں یہ باب باب النوم سے قبل ہے۔ اس کی وجہ علامہ بیجوریؒ نے یہ لکھی ہے وفی بعض النسخ فی عبادة النبی ﷺ وعضب باب النوم بباب العبادة لأنّ نومہ ﷺ من أجل العبادات وأکمل الطاعات (المواھب اللدنیة ص ۱۷۲)(مختار)

میں سما گئی تھی اور اسی وجہ سے قرآن میں جہاں دوسرے انبیاء کے نام آتے ہیں وہاں آپ ﷺ کا ذکر "عبدٗ" سے ہوتا ہے۔اس سے پتہ چلا کہ بندوں میں کامل عبدیت کی صفت کے حامل اور عبد کا فرد کامل نبی کریم ﷺ ہیں۔ کیونکہ ضابطہ یہ ہے کہ جو چیز مطلق ذکر ہو اس سے فرد کامل مراد لیا جاتا ہے۔

مثلاً سبحن الذی أسریٰ بعبدہ لیلا من المسجد (الایة) اور وانّہ لما قام عبداللّٰہ(الایة) اوراس قسم کی متعدد(۱) آیتیں ہیں جن میں آپ ﷺ کا نام لینے کی بجائے آپ ﷺ کو عبد کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔اسی صفت پر آپ ﷺ فخر بھی کیا کرتے تھے۔ کیونکہ انسانیت کی فضیلت وحریت اور کمال بھی عبدیت ہی میں مضمر ہے۔عبدیت سے تجاوز کرنے کی کوشش کرنا انسانیت سے نکلنا ہے۔اور دیگر مذاہب میں افراط وتفریط کا سبب بھی یہی ہے کہ کسی نے تو عبد (کسی پیغمبر) کو عبدیت سے نکال کر الوہیت کی طرف پہنچادیا اور کسی نے اس کو عبدیت سے بھی نیچے گرادیا۔ بہرحال عبدیت کی یہ صفت آپ ﷺ میں بدرجہ اتم موجود ہے۔اب بطور نمونہ مختلف اوقات میں نبی کریم ﷺ کی عبادات کا بیان ہے۔

<u>بعثت سے قبل عبادت کی نوعیت:</u> نبوت سے پہلے بھی آپ ﷺ عبادت کیا کرتے تھے۔البتہ اس میں اختلاف ہے کہ آپ ﷺ نبوت سے قبل کسی شریعت کی تقلید کیا کرتے تھے یا نہیں۔کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ ﷺ شریعت ابراہیمی پر تھے۔بعض نے شریعت موسوی اور بعض نے شریعت عیسوی کا نام لیا ہے۔

لیکن صحیح قول یہ ہے کہ آپ ﷺ کسی بھی سابقہ شریعت کے مقلد نہیں تھے کیونکہ سابقہ تمام شریعتیں حضرت عیسیٰؑ کی شریعت سے منسوخ ہوچکی تھیں اور حضرت عیسیٰ کی شریعت تحریف کا شکار ہوچکی تھی۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ما کنت تدری ماالکتاب و لاالایمان(الآیة) یعنی ایمان کے شرائع واحکام کا تجھے وحی سے قبل پتہ نہیں تھا۔البتہ اس پر ملاعلی قاریؒ نے یہ شبہ کیا ہے کہ عیسیٰؑ بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے تھے۔اس لئے بنی اسماعیل کیلئے ابراھیمؑ کی شریعت باقی ہوسکتی ہے۔

ملاعلی قاریؒ لکھتے ہیں کہ اس پر اجماع ہے کہ نبی کریم ﷺ نبوت سے قبل بھی مؤمن تھے۔کبھی بھی بت پرستی نہیں کی۔البتہ ان کی عبادت کا انداز ہمیں معلوم نہیں۔

---

(۱) قرآن مجید میں دس مقامات پر آپ ﷺ کو عبد کہا گیا ہے جبکہ نام سے صرف چار بار یاد کیا گیا ہے۔

پھر کچھ مزید تفصیل لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ظاہر یہی ہے کہ نبوت سے قبل آپ ولی تھے پھر نبی اور پھر رسالت سے مشرف ہوئے(۱)۔ ملا علی قاریؒ نے جمع الوسائل میں بھی اس موضوع پر طویل بحث کی ہے کہ جمہور کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کسی بھی شریعت کے مقلد نہیں تھے ورنہ کہیں تو یہ بات نقل ہوتی نیز جو تابع ہوتا ہے وہ متبوع کیسے بنتا۔ جبکہ امام الحرمینؒ نے اس سلسلے میں توقف کو اختیار کیا ہے۔ جبکہ بعض لوگ آپ ﷺ کو سابقہ شریعت کے تابع کہتے ہیں۔ پھر ان لوگوں میں سے بعض نے آدمؑ بعض نے نوحؑ بعض نے ابراہیمؑ بعض نے موسیٰؑ اور بعض نے عیسیٰؑ اور بعض نے تمام شرائعین کے اتباع کا قول کیا ہے۔ پھر کچھ مزید تفصیل اور اقوال ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی عبادت باطنی اعمال مثلاً ذکر قلبی اور صفات الٰہی میں تفکر نیز آفاقی، نفسی آیات اور مصنوعات میں سوچ کے قبیلے سے تھے۔ نیز رحم، شفقت، تحمل، صبر وشکر، رضاء بالقضاء، تسلیم وتفویض، توکل اور فناء وبقاء کے احوال کی رعایت جیسے اخلاق عالیہ سے آپ متصف تھے۔ جیسا کہ اولیاء واصفیاء کی حالت کاملہ ہوتی ہے(۲)۔ واللہ اعلم۔

(۱) حدّثنا قتيبة بن سعيدوبشربن معاذ قالاأنا أبوعوانة عن زياد ابن علاقةعن المغيرة بن شعبة قال صلّى رسول اللّٰه ﷺ حتّىٰ انتفخت قد ماه فقيل له اتتكلّف هذاوقد غفر اللّٰه لک ماتقدّم من ذنبک و ماتاخّرقال أفلاأكون عبداً شكوراً(۳).

ترجمہ: حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے نوافل پڑھیں۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ کے پاؤں میں ورم آگیا۔ کسی نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ آپ اس قدر مشقت اٹھا کر عبادت کرتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے

---

(۱) مرقات علی المشکوۃ ج۳ ص۳۰۸ (مختار)

(۲) جمع الوسائل ج۲ ص۷۹، ۸۰ مختصراً (مختار)

(۳) صحیح بخاری ۱/ ۱۵۲ کتاب التهجد باب قيام النبی ﷺ الليل، صحيح مسلم ۲/ ۳۸۵ كتاب صفات المنافقين واحكامهم باب اكثار الاعمال والاجتهاد فی العبادة، سنن نسائی ۱/ ۲۴۳، سنن ابن ماجة ص ۱۰۲ كتاب اقامة الصلوٰة والسنة فيها باب ماجاء فی قيام شهر رمضان (مختار)

آپ ﷺ کے گزشتہ اور آئندہ تمام گناہ معاف کر دیئے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ پھر (اتنے انعام کے بعد) کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

عبادت میں مبالغہ اور مشقت شکراً تھا: فقیل لہ اکابر صحابہ میں سے بعض نے عرض کیا کچھ شراح نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام لیا ہے کہ یہ عرض انہوں نے کی تھی۔

أتتكلف بهذا یہاں تکلف سے تصنع مراد نہیں بلکہ بمشقت کام کرنا مراد ہے(۱) مطلب یہ ہے کہ کمال عفو اور مغفرت کے وعدے کے باوجود آپ ﷺ عبادت میں اتنی مشقت اٹھاتے ہیں جبکہ خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ طٰہٰ ما انزلنا علیک القرآن لتشقٰی. یعنی ہم نے قرآن کو اس لئے نازل نہیں کیا کہ تم خود کو تھکا دو۔ بلکہ رات کے بعض حصوں میں آرام کر کے تخفیف سے کام لو۔ لتشقٰی کا معنی جلالین نے "لتتعب بما فعلت بعد نزوله من طول قيامک بصلوٰة الليل " سے کیا ہے یعنی ساری رات تہجد پڑھ کر کھڑے رہنے کیلئے ہم نے تم پر قرآن کو نازل نہیں کیا ہے۔ صاحب کمالین نے اس مقام پر یہ محاورہ بھی نقل کیا ہے کہ سيد القوم اشقاهم یعنی قوم کا سردار زیادہ تھکا ہوا ہوتا ہے۔ آرام کا موقع اسے نہیں ملتا۔ وقد غفر الله لک الخ سائل کے سوال کا منشاء یہ ہے کہ عبادت میں مبالغہ تو خدا کو راضی کرنے اور اپنے گناہوں کی معافی کیلئے کیا جاتا ہے جبکہ آپ ﷺ کے اول تو گناہ ہیں نہیں۔ اور اگر بالفرض ہوں تو وہ بھی پہلے سے معاف ہو چکی ہیں۔ لہٰذا عبادت میں اتنی مشقت بلاضرورت ہے۔ یہاں یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ تو معصوم ہیں ان کے گناہ نہیں ہیں تو مغفرت کا کیا معنی؟ اس کے مفسرین نے متعدد جواب دیئے ہیں مثلاً یہ کہ اس سے مراد ذنوبِ امت ہیں نہ کہ خود نبی کریم ﷺ کے گناہ۔

بعض نے یہ کہا ہے یہ فرض پر مبنی ہے یعنی اگر بالفرض تیرے گناہ ہونگے بھی تو وہ بخش دیئے گئے ہیں۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ یہاں پر وہ خلاف اولیٰ باتیں مراد ہیں جو نبی کریم ﷺ سے گاہے گاہے

(۱) اس لئے کہ تکلف کی دو قسمیں ہیں۔ علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے التكلف نوعان ان يفعل الانسان فعلا بمشقة وهو ممدوح وهو المراد هنا اويفعل فعلاً تصنعاً وهو مذمومٌ وهذا ليس مراداًهنا (المواهب الدنية ص ۱۷۳) اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے انا و امتی براء من التكلف (جمع الوسائل ۲/۸۰) اور قرآن کریم نے فرمایا ہے وماانامن المتكلفين (سورة ص ۸۶) (مختار)

بتقاضائے بشریت صادر ہوسکتی تھیں۔بعض کہتے ہیں کہ سلوک الی اللہ میں تقصیرات کواشارہ ہے جو کہ آپﷺ سے بوجہ دیگر مصروفیات صادر ہوسکتی تھیں وغیرہ وغیرہ۔

أفلا اکون عبداً شکوراً یعنی یہ تو ہم غلط ہے کہ عبادت میں مبالغہ کاصرف ایک سبب یعنی گناہ معاف کرواناہے۔بلکہ دراصل اللہ تعالیٰ کا نبی کریمﷺ پرانعام بہت بڑاتھا۔جس کا ذکرخود سائل نے بھی کیاہےاورانعام کا تقاضا یہ ہے کہ اس کاشکرادا کردیا جائے اورشکراس بات کا متقاضی ہے کہ عبادت میں خوب انہماک ہو۔تو میری عبادت شکراًہے گناہ معاف کرانے کیلئے نہیں ہے۔اوراسی کواشارہ کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ **ان قوما عبدوا رغبةً فتلک عبادة التجار وان قوماً عبدوا شکراً فتلک عبادة الاحرار.** یعنی کچھ لوگوں نے تو اللہ تعالیٰ کی عبادت جنت اورنعمتوں کی رغبت کیلئے کی۔یہ تاجروں کی عبادت ہے کچھ لوگوں نے اللہ تعالیٰ سے خوف کی بناء پرعبادت کی یہ غلاموں کی عبادت ہے(جوڈنڈے کے زور پر کام کرتے ہیں)اور کچھ لوگوں نے خدا کی عبادت بطورشکر کی۔یہی آزادلوگوں کی عبادت ہے۔

تورّم وانتفاخ قدمین:

(۲) حدّثنا أبوعمّار الحسین بن حریث أنا الفضل بن موسیٰ عن محمّد بن عمرو عن أبی سلمة عن أبی هریرةؓ قال کان رسول اللّٰهﷺ یصلّی حتیٰ ترم(۱) **قدماه قال فقیل له تفعل هذا وقد جاءک انّ اللّٰه تعالیٰ قدغفرلک ماتقدم من ذنبک وما تاخّر قال أفلا أکون عبداًشکوراً**(۱).

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ نے اتنی نفل نمازیں پڑھیں کہ آپﷺ کے قدم مبارک پھول گئے۔آپﷺ سے کہا گیا کہ کیا آپﷺ اتنی عبادت کرتے ہیں؟ حالانکہ آپﷺ کے پاس تو یہ وحی آچکی ہے کہ

---

(۱)فتفرد الامام الترمذی بهذاالحدیثﷺفی نسخة حتیٰ تورّم(مختار)

اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف فرمائے ہیں۔آپﷺ نے فرمایا تو
کیا میں عبادت چھوڑ دوں اور اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

حتی ترِمَ ورم یرم حسب یحسب کے باب سے مضارع معلوم کا صیغہ ہے اور ان کی تقدیر کی وجہ سے منصوب ہے پھول جانے کو کہتے ہیں۔ثلاثی مجرد کا صیغہ کم ہی استعمال ہوتا ہے۔عموماً تورّم باب تفعل سے مستعمل ہوتا ہے بلکہ ایک نسخہ میں تورّم بھی آیا ہے۔جو ماضی کا صیغہ ہے یا مضارع کا صیغہ ہے اور ابتداء میں ایک تاء تخفیفاً حذف کیا گیا ہے(۱)۔

افلا اکون الخ ھمزۂ استفہام کا مدخول محذوف ہے اور فاء عطف کیلئے ہے۔یعنی أأترک المبالغة فی التعبدا فلا اکون عبداً شکورا. کیا عبادت میں انہماک ترک کرلوں اور شکر گزار نہ بنوں۔

(۳) حدّثنا عیسیٰ بن عثمان بن عیسیٰ بن عبدالرحمان الرملیّ ثنی عمّی یحییٰ بن عیسیٰ الرملیّ عن الأعمش عن أبی صالح عن أبی هریرةؓ قال کان رسول اللهﷺ یقوم یصلیّ حتّیٰ یتنفخ قد ماه فیقال له یارسول اللّٰه أتفعل هذا وقدغفر اللّٰه لک ماتقدّم من ذنبک وماتاخّر قال أفلاأکون عبداًشکورا(۲).

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ نماز اتنی طویل پڑھتے تھے کہ آپﷺ کے پاؤں پھول جاتے تھے۔آپ سے کہا جاتا تھا کہ یارسول اللہ آپ اتنی عبادت کرتے ہیں حالانکہ آپ کے سب اگلے پچھلے گناہ معاف کردیئے گئے ہیں۔آپﷺ فرماتے کہ کیا میں عبادت میں مبالغہ ترک کردوں اور ایک شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

---

(۱)علامہ مناویؒ نے لکھا ہے کہ عبادات میں حتی الوسع مشقت برداشت کرنا مستحب ہے۔والغرض من سیاق هذا الحدیث بیان انّه اعظم الخلق طاعة لربّه وفیه ندب تشمیر ساق الجدفی العبادة وان اوی لمشقة مالم یفض إلیٰ ملال (المناوی علی هامش جمع الوسائل ۲/ ۸۱)(مختار)

(۲)سنن ابن ماجة ص ۱۰۲ کتاب اقامة الصلوٰة والسنة فیها باب ماجاء فی قیام شهر رمضان ص ۱۰۲ (مختار)

حتّیٰ تنتفخ قدماہ: انتفاخ سے مضارع منصوب ہے یہ بھی تورّم کے معنی میں ہے۔اوپر کی دونوں حدیثوں کا مفہوم اس باب کی پہلی حدیث سے ملتا جلتا ہے۔

(۴) حدّثنامحمّد بن بشّار أخبرنامحمّد بن جعفر ثنا شعبة عن أبي إسحاق عن الأسود بن يزيد قال سالت عائشة عن صلوٰة رسول اللهﷺ بالليل فقالت كان ينام أوّل الليل ثم يقوم فاذا كان من السحرا وترثمّ أتىٰ فراشه فإذا كانت له حاجة الَمّ بأهله فاذا سمع الاذان وثب فان كان جنبا أفاض عليه من الماء وإلاّ توضّأ وخرج إلى الصلوٰة(۱).

صلوٰۃ اللیل اور عبادۃ میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی رعایت:

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حضرت اسود بن یزیدؒ نے نبی کریمﷺ کی رات کی نماز (تہجد) کے بارے میں پوچھا۔تو حضرت عائشہ رضی اللہ نے فرمایا کہ نبی کریمﷺ رات کے ابتدائی حصہ میں آرام فرماتے تھے۔نماز پڑھنے کیلئے قیام فرماتے تھے پھر جب صبح قریب ہوجاتی تھی۔تو وتر کی نماز پڑھ لیتے تھے پھر اپنے بستر ے پر تشریف لاتے تھے۔اور اگر ضرورت اور رغبت ہوتی تو اہلیہ کے پاس جاکر صحبت فرماتے۔پھر جب اذان کی آواز سنتے تو پھرتی کے ساتھ اٹھ جاتے تھے۔اگر آپﷺ جنب ہوتے تو غسل فرماتے ورنہ وضوء فرما کر نماز کیلئے (مسجد) تشریف لے جاتے تھے۔

عن صلاة الخ رات کی نماز کے بارے میں پوچھا بات کی نماز تہجد اور وتر دونوں کو شامل ہے۔ یعنی یہ پوچھا کہ تہجد کتنی اور کن کن اوقات میں پڑھتے تھے۔نیز وتر کس وقت ادا کرتے تھے۔اول اللیل

(۱)صحیح بخاری ۱/۱۵۴ کتاب التهجد باب من نام اوّل الليل الخ، صحيح ابن حبان ۴/۱۲۷، شرح معاني الآثار، السنن الكبرىٰ للبيهقي. (مختار)

رات کے پہلے نصف تک عموماً نفل پڑھتے تھے۔فاذا کان من السحر اوتر یعنی رات کے آخری حصے میں وتر ادا کردیتے تھے۔جس سے دن رات کی ساری نمازیں وتر یعنی طاق بن جاتیں۔اور ابھی مسئلہ ایسا ہی ہے جو شخص یہ یقین رکھے کہ رات کے آخری حصے میں وہ جاگے گا۔تو وتر عشاء کی نماز کے ساتھ نہ پڑھے بلکہ لمن یثق بالانتباہ کیلئے وتر موخر کردینا چاہیے(۱)۔

ثمّ اتی فراشہ یعنی صبح کی نماز کیلئے تازہ دم ہونے اور احیاء اللیل کا اثر زائل کرنے کیلئے قدرے آرام فرماتے(۲)۔المّ باھلہ یعنی ازواج کے حقوق پورا فرماتے۔آپ ﷺ حقوق اللہ،حقوق العباد،حقوق نفس اور حقوق الازواج سب پورا فرماتے اور اس کیلئے بہترین نظام الاوقات بنادیا تھا۔جس میں حقوق اللہ کو دیگر حقوق پر مقدم رکھا کرتے تھے۔دوسری طرف رہبانیت اور تبتل سے آپ ﷺ نے ہمیشہ اجتناب کیا بلکہ خلوت میں جلوت اور جلوت میں خلوت ہوتی تھی۔اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ رات کے اوقات میں بھی عبادت اکثر اور غالب رہتی تھی۔والاکوضا یعنی فجر کی نماز کیلئے یا خوب تازہ ہونے کیلئے یا وضوء علی الوضوء کی فضیلت کے حصول کیلئے وضوء کرکے سنت پڑھ لیتے تھے اور مسجد تشریف لے جاتے۔

(۵) حدّثنا قتیبة بن سعید عن مالک بن أنس ثنا إسحاق ابن موسیٰ الأنصاری ثنا معن عن مالک عن مخرمة بن سلیمان عن کریب عن ابن عبّاسؓ أنّه أخبره أنّه بات عند میمونة وھی خالته قال فاضطجعت فی عرض الوسادة واضطجع رسول اللّٰہ ﷺ فی طولھا

(۱)اس روایت میں وتر کی کوئی کیفیت بیان نہیں کی گئی۔احناف کثر اللہ سوادھم کے ہاں وتر تین رکعات ہیں۔علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے وکان رسول اللّٰہ ﷺ یوتر بثلاث یقرأفیھنّ بتسع سورمن المفصل یقرأ فی کل رکعة ثلاث سور آخرھنّ قل ھواللّٰہ احدوفی روایة أنّه کان یقرأ فی الاول سبح اسم ربک الاعلیٰ وفی الثانیة قل یاایّھاالکافرون وفی الثالثة قل ھواللّٰہ احدوالمعوذتین رواہ ابوداؤد ۱/۲۰۸ والمصنف(ترمذی)(المواھب الدنیة ص ۱۷۴)(مختار)

(۲)لیقوّی بھا علی صلوٰة الصبح ومابعدھا من وظائف الطاعات ولانّه یدفع صفرة السھر عن الوجه(جمع الوسائل ۲/۸۲)(مختار)

فنام رسول اللهﷺ حتیٰ اذا انتصف اللیل اوقبله بقلیل فاستیقظ رسول اللهﷺ فجعل یمسح النوم عن وجهه ثمّ قرأ العشر الآیات الخواتیم من سورة اٰل عمران ثمّ قام إلیٰ شن معلّق فتوضّأ منه فاحسن الوضوء ثمّ قام یصلّی قال عبدالله بن عباس فقمت إلیٰ جنبه فوضع رسول الله ﷺ یده الیمنیٰ علی راسی ثمّ اخذ باذنی الیمنی ففتلها فصلّی رکعتین ثمّ رکعتین ثمّ رکعتین ثمّ رکعتین ثمّ رکعتین ثمّ رکعتین قال معن ست مرات ثمّ اوترثمّ اضطجع ثمّ جاء ه المؤذن فقام فصلّی رکعتین خفیفتین ثمّ خرج فصلّی الصبح(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے ایک رات حضرت میمونہ رضی اللہ عنہ کے ہاں گزاری۔ وہ ان کی خالہ لگتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ پس میں سرہانے کی چوڑائی والے حصہ پر سر رکھ کر سویا۔ اور نبی کریمﷺ اس کے طول والے حصے پر سر رکھ کر لیٹ گئے۔ نبی کریمﷺ سوئے رہے۔ حتیٰ کہ رات آدھی بیت گئی یا اس سے تھوڑا پہلے یا تھوڑا بعد کہ نبی کریمﷺ بیدار ہوگئے۔ پھر نبی کریمﷺ اپنے رخ انور سے نیند بھگانے کیلئے اس پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ اور سورۃ آل عمران کی آخری دس آیات (ان فی خلق السمٰوات الخ) پڑھیں۔ پھر ایک لٹکے ہوئے مشک کی طرف بڑھے۔ پس اس سے وضوء فرمایا اور کامل وضوء فرمایا۔ پھر نماز پڑھنے کھڑے ہوگئے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں بھی (وضوء کرکے) ان کے (بائیں) جانب (آپﷺ کے ساتھ نماز پڑھنے) کھڑا ہوگیا۔ حضورﷺ نے

---

(۱)صحیح بخاری ۱/ ۳۰ کتاب الوضؤ باب قرأة القرآن بعدالحدث، صحیح مسلم ۱/ ۲۶۰ کتاب صلوٰة المسافر وقصرهاباب الدعاء فی کتاب صلوٰة اللیل وقیامه، سنن ابی داؤد ۱/ ۱۹۹ کتاب الصلوٰة باب فی الصلوٰة اللیل، سنن النسائی ۱/ ۲۴۱ کتاب قیام اللیل وتطوع النهار باب ذکرمایستفتح به القیام، (مختار)

اپنا دایاں ہاتھ میرے سر پر رکھا، پھر مجھے میرے دائیں کان سے پکڑا اسے مروڑا (تاکہ میری نیند دفع ہوجائے یا تاکہ مجھے داھنے جانب کھڑا کردیں) پھر آپ ﷺ نے دو رکعت نماز پڑھی، پھر دو رکعت پڑھیں، پھر دو رکعت پڑھیں پھر دو پڑھیں، پھر دو پڑھیں، پھر دو پڑھیں۔ راوی معنؒ نے چھ مرتبہ دوگانہ کا ذکر کیا۔ پھر آپ ﷺ نے وتر پڑھی۔ پھر (تھوڑی دیر) لیٹ گئے۔ اس کے بعد مؤذن (صبح کی نماز کیلئے) بلانے آئے تو آپ ﷺ اٹھے دو رکعت مختصر قرات سے پڑھیں۔ پھر مسجد کی طرف نکلے اور صبح کی نماز پڑھی۔

ابن عباسؓ میں حضور اقدس ﷺ کے اعمال کے تعلیم و تعلم کا جذبہ: انّہ بات عند میمونۃؓ
حضرت ابن عباس اس وقت نوجوان تھے مگر دین کے تعلم کا جذبہ اور تڑپ تھی جو نبی کریم ﷺ کی عبادت کو جاننے کیلئے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں لے آیا۔ رات کے وقت نبی کریم ﷺ کس وقت اٹھتے ہیں اور کیا کیا معمولات کی عادت ہے۔ اس تجسس نے رات کو نیند کی حاجت بھی بھلادی۔ اسی جذبے کا نتیجہ تھا کہ حبر الامۃ کا مقام عالی حاصل کیا۔

وھی خالتہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے حالات تفصیل کے ساتھ ۳۱ نمبر حدیث نمبر ۲ کی ضمن میں گزر چکے ہیں۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے چچازاد بھائی ہیں تو حضرت میمونہ رضی اللہ عنہ کے بھی بھانجے ہیں اور ان کے بھی ذی رحم محرم ہیں۔

فاضطجعت الخ بعض لوگوں نے وسادہ سے بسترہ لیا ہے۔ لیکن بظاہر تکیہ یا سرہانہ ہی مراد ہے یعنی ایک ہی سرہانہ یا تکیہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے طول کی جانب اس پر سر رکھدیا اور ابن عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کی جانب سے۔ سادہ سی زندگی تھی۔ زمین پر سویا کرتے تھے۔ اور سر تکیے میں بھی عموماً کھجور کی چھال بھری ہوتی تھی۔ مسلم شریف کی روایت میں تصریح ہے کہ نبی کریم ﷺ اور حضرت میمونہؓ دونوں ایک ساتھ لیٹے۔ اور حضرت ابن عباس بھی عرض تکیہ پر سر رکھ کر سو گئے۔ اس سے اس بات کی جواز کی طرف بھی اشارہ ہے کہ بیوی کے محارم میں سے کسی کی موجودگی میں اس کے ساتھ ہی بسترے پر سویا جائے اگرچہ اس کا محرم

ممیز ہو۔ کیونکہ بیوی کے ساتھ سونا اس کا حق ہوتا ہے اور آپ ﷺ اس سلسلے میں بہت حساس تھے۔ بیوی سے الگ بستر ے میں سونا عجم کی عادت ہے جس کی بنا تعلیٰ اور تکبر پر ہے۔ لہٰذا اس کی تقلید نہیں کرنا چاہیئے۔ البتہ محرم ممیز کیلئے یہ بات جائز نہیں کہ میاں بیوی کی خلوت میں مخل ہو۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت میمونہ اس رات حیض کی حالت میں تھیں۔ جیسا کہ بعض روایات میں مصرّح ہے۔ بخاری کی ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ اکٹھے لیٹ کر آپ ﷺ نے تھوڑی دیر کیلئے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہ سے باتیں بھی کیں پھر سو گئے۔ جس سے سمر فی اللیل بھی ثابت ہوتا ہے۔

<u>قیام اللیل میں مجاہدۂ نفس:</u> **یمسح النوم من وجهه** یعنی نیند کا غلبہ ہٹانے کیلئے چہرے پر ہاتھ پھیرا کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو نیند کا تقاضا بھی ہوتا تھا۔ اشتیاق بھی تھا۔ لطف اور مزہ بھی نیند میں ملتا تھا۔ یہ نہ تھا کہ نیند نہ آئی تو اٹھ کر تہجد پڑھی۔ بلکہ نفس کے ساتھ مقابلہ اور مجاہدہ کرنا پڑتا تھا۔

اسی طرف اللہ تعالیٰ نے یوں اشارہ فرمایا کہ **ان ناشئة الليل هي أشدّ وطأ وأقوم قيلا** (مزمل ٦) یعنی رات کو اٹھنا سخت روندنے والی چیز یعنی بھاری ریاضت ہے۔ اور اس میں بات سیدھی نکلتی ہے۔ یعنی ذکر کرتے ہوئے دل وزبان موافق ہوتے ہیں اور عبادت کا یہی مفہوم ہے کہ نفس کے تقاضوں کو چھوڑ کر اسے خالق کا تابع بنانے کیلئے اس کے ساتھ جہاد کرو۔ **العشر الايات الخ** یعنی **ان في خلق السمٰوت والارض (الاية)** دس آیتیں پڑھتے ان آیات میں آفاقی اور انفسی دلائل توحید کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے۔ اور انسانی تدبر و تفکر کو دعوت دی گئی ہے۔ نیند سے جاگ کر گویا انسان کو نئی زندگی ملتی ہے۔ لہٰذا اٹھتے ہی اسے آیات اللہ میں تدبر و تفکر کرنا چاہیے۔ کہ دنیا و کائنات میں اللہ تعالیٰ کے وجود و وحدانیت کے کتنے لاتعداد دلائل ہیں۔ سائنس کے جدید انکشافات سے تو اور بھی ان کی دلالت واضح ہو چکی ہے۔

ثمّ قام إلىٰ شنّ معلّق شن پرانے مشک کو کہتے ہیں۔ جس کا پانی زیادہ ٹھنڈا ہوتا ہے کیونکہ اس کے مسامات زیادہ کشادہ ہوتے ہیں۔ بالخصوص جب اسے لٹکایا جائے۔ **فتوضا منها** ایک نسخہ میں منہ آتا ہے جو ظاہر ہے لیکن اگر شن کی تاویل قربة سے کی جائے تو مؤنث کی ضمیر راجع کرنا بھی جائز ہے۔ **فاحسن**

الوضوء یہاں پر اسباغ اور اکمال کو احسان الوضوء سے تعبیر کیا ہے۔ صحیحین میں ہے کہ فتوضا وضوءاً احسناًبین الوضوء من لم یکثر وقد ابلغ ۔یعنی پانی بھی زیادہ استعمال نہیں کیا لیکن اعضاء مکمل دھولئے۔فقمت الی جنبہ مسلم اور بخاری میں تصریح ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے وضوء کرکے نیت باندھی۔

<u>ابن عباسؓ کے کان مروڑنے کی حکمتیں:</u> ایک روایت میں آتا ہے فقمت عن یسارہ ففتل الخ نبی کریم ﷺ نے اس کا کان مروڑ کر اسے دائیں جانب کھڑا کردیا۔اس حدیث میں اس قصہ کی تفصیل موجود ہے۔جس کا ذکر گزشتہ باب کے حدیث نمبر۴ میں اجمالاً ذکر کیا گیا تھا۔سر پر ہاتھ رکھنے اور کان مروڑنے کی وجہ کیا تھی؟

ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی متعدد وجوہ ذکر کی ہیں۔مثلاً یہ کہ ہاتھ رکھنے کی برکت سے ابن عباس رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ کے اقوال وافعال خوب یاد ہوجائیں۔یہ کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی نیند اڑجائے اور بیدار ہوکر حالات کا خوب ادراک کرسکیں۔بائیں جانب کھڑے ہوکر مخالفت سنت پر اس کو تنبیہ ہوجائے اور تاکہ بائیں سے دائیں جانب آنے میں ابن عباس رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی اطاعت کریں۔

علامہ بیجوری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ معلم شاگرد کو کان سے پکڑ کر تھوڑا مروڑے تو اس سے شاگرد میں ذکاوت پیدا ہوتی ہے۔حضرت ربیع رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ایک دن گھوڑے پر سوار ہوگئے میں ساتھ کھڑا ہوگیا تو انہوں نے میرا کان پکڑ کر مروڑا مجھے اس سے تعجب ہوا۔لیکن بعد میں جب ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ مجھے معلوم ہوا تو پتہ چلا کہ امام رحمہ اللہ کوئی ایسا کام نہیں کرتے جس کی کوئی اصل نہ ہو۔

قال معن ست مرات چھ مرتبہ دو دو رکعت کا ذکر کیا یوں آپ ﷺ نے بارہ رکعت تہجد کے پڑھے۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ تہجد میں افضل یہ ہے کہ بارہ رکعت پڑھی جائیں۔ویسے اس میں توسع ہے جتنی بھی سہولت اور نشاط میں پڑھی جائیں کافی ہیں۔

ثم اضطجع نبی کریم ﷺ رات کے آخری چھٹے حصے میں آرام فرماتے تھے۔تاکہ صبح کی نماز

کیلئے تازہ دم ہوسکیں اوررات کی تھکاوٹ دور ہو(۱)۔

(۱)فجر کی سنتوں کے بعد استراحت: فجر کی سنتوں کے بعد استراحت کے بارے میں اہل علم کے مختلف اقوال ہیں۔علامہ بنوریؒ نے لکھا ہے الضجعة بعد رکعتی الفجر قداختلف فیهاالصحابة والتابعون ومن بعدهم علی ثمانیة اقوال(۱)الاول إنّها سنة وإلیه ذهب الشافعی وأصحابه قال النوویؒ فی شرح المهذب هوالمختار(۲)والثانی: إنّها مستحبة ورویٰ ذلک عن جماعة من الصحابة منهم أبوموسیٰ، رافع بن خدیج وأبی هریرة وأنس وروی عن فقهاء المدینة السبعة وابن سیرین(۳)والثالث: انّها واجبة لاتصحّ الصلوٰة الفجربدونهاوهوقول ابن حزم فقد جعلها شرطاً فی صحة صلوٰة الصبح وقدبالغ ابن العراقی فی شرح التقریب فی الردّعلیه وقال هذا غلوٌّ فاحشٌ..الخ (۴)الرابع: إنّهابدعة وروی عن ابن مسعود وابن عمرو الأسودابن یزیدوابراهیم النخعی..والیه ذهب مالک من الائمة وحکاه القاضی عیاض عنه وعن جمهور العلماء(۵)والخامس: إنّهاخلاف الأولیٰ روی عن الحسن البصری(۶)السادس: انّها لیس مقصودة لذاتها وانّما الغرض الفصل امّا بضجعة أوحدیث أوغیرهاوحکی ذلک عن الشافعی (۷)السابع: انّهامستحبه فی البیت دون المسجدویروی عن ابن عمرویقول الحافظ فی الفتح وقواه بعض شیوخنا (۸)الثامن: إنّهامستحبة لمن یقوم اللیل لأجل الاستراحة لامطلقاً واختاره ابن العربی ویشهدله حدیث عائشة عندعبدالرزاق والطبرانی لم یضطجع سنة ولکنّه کان یدأب لیلة فیستریح(معارف السنن ۴/۶۸تا۶۹) مذهب الحنفیة کما یقول ابن عابدین فی ردالمحتار۔

ان آٹھ اقوال میں احناف کا مذہب آٹھویں قول کے موافق ہے اس لئے کہ احناف فرماتے ہیں کہ یہ آنحضرتﷺ کی سنت عادیہ ہے سنت تشریعیہ نہیں۔علامہ شامیؒ نے لکھا ہے وحاصله أنّ اضطجاعه علیه الصلوٰة والسلام إنّماکان فی بیته للاستراحة لاللتشریع(ردالمحتار ۲/۲۱) البتہ جہاں تک حدیث امر عن ابی هریره اذاصلیٰ احدکم رکعتی الفجر فلیضطع علی جنبه الایمن کا تعلق ہے تو اس بارے میں علامہ شامیؒ نے لکھا ہے وإنّ صحّ حدیث الأمر بهاالدال علیٰ انّ ذلک للتشریع یحمل علی طلب ذلک فی البیت فقط توفیقاً بین الأدلة(ردالمحتار ۲/۲۱) اورمزید لکھا ہے فالمطلق محمول علی المقیدعلی أنّه لوکان هذا فی المسجد شائعاً فی زمانهﷺ لماکان یخفی علی هولاء الاکابرالأعیان أرادبالمقیدمامرّمن قوله بعدرکعتی الفجرفی بیته(ردالمحتار ۲/۲۱) مذہب احناف کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ آنحضرتﷺ سے اضطجاع کا یہ عمل کب ثابت ہے۔تو اس بارے میں امام زہریؒ(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس حدیث میں اس بات کی تصریح ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے ساتھ نفل میں شریک ہوگئے تھے۔ ہمارے احناف نے یہ کہا ہے کہ نفل کی جماعت علیٰ سبیل التداعی ہوتو مکروہ ہے۔ بعض فتاویٰ میں یہ جائز ہے۔ تین ہوں تو اختلاف ہے اور اگر مقتدی چار ہوجائیں تو باتفاق احناف مکروہ ہے(۱)۔ واللہ اعلم بالصواب.

(۶) حدّثنا أبو كريب محمّد بن العلاء ثنا وكيع عن شعبة عن أبى جمرة عن ابن عباس قال كان النبىّ ﷺ يصلّى من الليل ثلث عشرة ركعة(۲) .

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ رات کو تیرہ رکعت نماز پڑھتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ ص۱۴۹) کے شاگردوں کا اختلاف ہے۔ امام اوزاعی ،ابن ابی الذئب عُقیل، یونس، شعیب اور ان کے اکثر شاگردوں نے یہ نقل کیا ہے یہ لیٹنا رکعتی الفجر کے بعد ہوتا ہے جبکہ امام مالکؒ نے مؤطا میں نقل کیا ہے۔۔۔ثمّ اوتر ثمّ اضطجع حتّىٰ جاءه المؤذن فصلّىٰ ركعتين خفيفتين ثمّ خرج فصلّى الصبح(مؤطاامام مالک ص ۱۰۴) یعنی یہ لیٹنا رکعتی الفجر سے پہلے ہوا کرتا تھا۔ حافظ ابن عبدالبرؒ نے اس روایت کو ترجیح دی ہے۔ اگرچہ دوسرے اہل علم نے امام زہریؒ کے دوسرے تلامذہ کی روایت کو ترجیح دی ہے۔ کیونکہ وہ اکثریت میں ہیں مگر امام مالکؒ کی روایت کو ترجیح ہوجانے کے بعد حنفیہ کے اس قول کی اورزیادہ تائید ہوجاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی اضطجاع صلوٰۃ اللیل سے تعب کی بناء پر تھا۔ اور آپ ﷺ کے اس عمل کی حیثیت سنت عادیہ کی سی تھی نہ کہ سنت تشریعی کی سی۔ (مختار)

(۱) ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے اقول وقد صرّح فى الفروع اتفاق الفقهاء لكراهية الجماعة فى النوافل اذاكان سوى الامام اربعة قال فى الكافى إنّ التطوع بالجماعة انّما يكره إذاكان على سبيل التداعى واما لو اقتدىٰ واحدبواحداواثنان بواحدلايكره وان اقتدى ثلاثة بواحداختلف فيه وان اقتدىٰ اربعة بواحدكره اتفاقاً واماماذكره فى شرح النقاية من جواز الجماعة فى النوافل مطلقاً نقلاً عن المحيط وكذاماذكرفى الفتاوىٰ الصوفية ونحوهما فمحمول على أنّ المراد بالجواز الصحة وهى لاتنافى الكراهة (جمع الوسائل ۸۶/۲)(مختار)

(۲) صحيح بخارى ۱۵۳/۱ كتاب التهجد باب كيف صلوٰة النبىّ ﷺ ،صحيح مسلم ۲۶۱/۱ كتاب صلوٰة المسافرين وقصرهاباب الدعا فى صلوٰة الليل وقيامه، سنن النسائى باب الوتر بثلاث عشرة ركعة ۲۵۱/۱ كتاب الصلوٰة ، جامع ترمذى ۱۰۰/۱ كتاب الصلوٰة باب منه.(مختار)

صلوٰۃ اللیل میں تعداد رکعات: ثلاث عشرۃ رکعۃً اس سے قبل بارہ رکعت تہجد کا ذکر ہے اور وتر کے ساتھ پندرہ بنتے ہیں۔ اور یہاں مجموعہ تیرہ بتایا گیا ہے۔ لہٰذا تہجد دس اور وتر کی تین رکعتیں ہوئیں تو گویا آپ ﷺ نے مختلف اوقات میں حسب گنجائش مختلف تعداد میں تہجد کی نماز پڑھی ہے۔

احناف کے نزدیک صرف آٹھ رکعت پڑھنے پر بھی اکتفاء جائز ہے کیونکہ اگر مجموعہ تیرہ ہو تو اس میں سے تین وتر اور دو فجر کی سنتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا تہجد کی کل آٹھ رکعتیں باقی بچیں۔ لیکن ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بارہ رکعتوں والا قول مختار ہے۔ جیسا کہ بعد کی روایت میں آتا ہے۔

(۷) حدثنا قتیبة بن سعیدثنا ابو عوانة عن قتادة عن زرارة بن اوفی عن سعد بن هشام عن عائشة أنّ النبیّ ﷺ کان اذا لم یصل باللیل منعه من ذلک النوم اوغلبته عیناه صلّی من النّهار ثنتی عشرة رکعة(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب رات کو تہجد نہ پڑھ سکتے۔ نینداس کے لئے رکاوٹ بنتی یا یہ کہا کہ آنکھ لگ جاتی تو (تہجد کے بدلے) دن کو بارہ رکعت نفل پڑھ لیتے تھے۔

منعه من ذالک النوم یعنی نیند کی وجہ سے رہ گئیں۔ اوغلبته عیناه راوی کا شک ہے کہ الفاظ کونسے تھے لیکن مطلب دونوں کا ایک ہے(۲)۔ صلّیٰ من النّهار الخ اس میں ایک تو اس بات پر تنبیہ ہے کہ آپ ﷺ عبادۃ کا کتنا اہتمام کرتے تھے۔ کہ قضاء نہیں ہونے دیتے تھے۔ اگر رات کو تہجد قضاء

(۱)صحیح مسلم ۱/۲۵۶ کتاب صلوٰة المسافرین وقصرهاباب ماجاء فی صلوٰة اللیل ومن نام عنه جامع ترمذی کتاب الصلوٰة باب اذانام عن صلوته باللیل صلّیٰ بالنهار، سنن النسائی ۱/۲۵۵ کتاب قیام اللیل وتطوع النهار باب کم یصلّی من نام عن الصلوٰة اومنعه.(مختار)

(۲)علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے کہ فالمقصودبه بیان سبب عدم صلوته فی اللیل أو للشک من الراوی أو للتقسیم والفرق بینهما أن الاوّل محمول علی ماإذااراد النوم مع امکان ترکه اختیاراً والثانی محمول علی ماإذاغلبه النوم بحیث لایستطیع دفعه(المواهب اللدنیة ۱۷۶)(مختار)

ہوجاتی تو دن کو اس کا اعادہ فرماتے(۱) اور ساتھ ساتھ اس حدیث سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو تقویۃ بھی ملتی ہے کہ نماز تہجد کی رکعات کی تعداد بارہ ہے۔ جیسا کہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے باقی وتر کی قضاء اس حدیث سے بطریق اولیٰ معلوم ہورہی ہے۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ﷺ وتر کو کبھی قضاء نہ ہونے دیتے تھے یا قضاء کی صورت میں صبح کی نماز سے پہلے ہی قضاء کرلیتے تھے۔ دن تک نہیں رہنے دیتے تھے۔

(۸) حدثنا محمّد بن العلاء انا ابو اسامة عن هشام يعنى ابن حسان عن محمّد ابن سيرين عن أبى هريرة عن النبىّ ﷺ قال اذا قام احدكم من الليل فليفتتح صلوٰته بركعتين خفيفتين(۲).

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ تم میں سے جب کوئی رات کو تہجد کیلئے اٹھے تو اپنی نماز کی ابتداء دو مختصر رکعتوں کے ساتھ کرے۔

عبادت میں تدریج وتخفیف: فليفتتح الخ کوئی بھی کام شروع کرنا ہو تو فطری طور پر اس میں ابتداءً تخفیف ہونی چاہیے۔ گاڑی بھی آہستہ رفتار سے چل کر بتدریج تیز ہوتی جاتی ہے تو نبی کریم ﷺ بھی عبادت میں ایک نفسیاتی طریقے کی طرف رہنمائی فرماتے ہیں۔ کہ پہلے دو رکعتیں خفیف پڑھ لو۔ پھر آہستہ آہستہ طبیعت میں نشاط اور آمادگی پیدا ہوجائیگی۔ نیز شیطان کا جو اثر ہوتا ہے۔ وہ بھی زائل ہوجاتا ہے۔ اور سستی زائل ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد نفس پر بوجھ بڑھایا بھی جاسکتا ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ نبی کریم ﷺ تہجد سے قبل دو رکعت تحیۃ الوضوء کا حکم دے رہے ہیں۔ جو

---

(۱) ملا علی قاریؒ نے اس روایت سے دو مسائل کا استنباط کیا ہے لکھتے ہیں وفيه دليل على جواز قضاء النافلة بل على استحبابه لئلا يعتاد النفس بالترك وعلى أنّ صلوٰة الليل ثنتاعشرة ركعة كماهو المختار عند ابى حنيفة(جمع الوسائل ۲/۸۸)(مختار)

(۲) صحيح مسلم ۱/۲۶۲ كتاب صلوٰة المسافرين وقصرها باب الدعا فى صلوٰة الليل وقيامه، شرح السنة للبغوى كتاب الصلوٰة رقم الحديث۹۰۷، سنن ابى داؤد ۱/۱۹۴ كتاب الصلوٰة باب افتتاح صلوٰة الليل بركعتين، السنن الكبرىٰ للبيهقى ۳/۶ كتاب الصلوٰة (مختار)

مختصر قرات کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔ جبکہ بعض شراح نے وتر سے پہلے دو رکعتوں پر اس حدیث کو حمل کیا ہے لیکن صلوٰۃ اللیل کو وتر کے ساتھ منحصر کرنا بعید معلوم ہو رہا ہے جبکہ یہاں پر مطلق صلوٰۃ کا ذکر ہے۔ لہٰذا تہجد کی نماز سے پہلے کی دو نفل لینا اولیٰ ہے۔

(۹) حدّثنا قتيبة بن سعيد عن مالک بن أنس ثنا إسحاق بن موسیٰ ثنا معن ثنا مالک عن عبدالله بن أبی بکر عن أبيه أنّ عبدالله بن قيس بن مخرمة أخبره عن زيد بن خالدالجهنی أنّه قال لا رمقنّ صلوٰة رسول اللهﷺ فتوسدت عتبته اوفسطاطة فصلّیٰ رسول اللهﷺ رکعتين خفيفتين ثمّ صلّیٰ رکعتين طويلتين طويلتين طويلتين ثمّ صلّیٰ رکعتين وهما دون اللتين قبلهما ثم صلّیٰ رکعتين وهما دون اللتين قبلهما ثمّ صلّیٰ رکعتين وهما دون اللتين قبلهما ثم صلّیٰ رکعتين وهمادون اللتين قبلهما ثمّ اوترفذلک ثلث عشرة رکعة(۱).

ترجمہ: حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک رات کو یہ ارادہ کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی نماز کو آج غور سے ضرور دیکھوں گا۔ میں آپ ﷺ کی چوکھٹ پر یا یہ کہا کہ آپ ﷺ کے خیمہ کی چوکھٹ پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ نبی کریم ﷺ نے (پہلے) دو مختصر رکعتیں پڑھیں۔ پھر دو رکعتیں خوب طویل پڑھ لیں۔ پھر دو رکعتیں پڑھ لیں جو کہ پہلے طویل رکعتوں سے کم تھیں۔ پھر دو رکعتیں پڑھ لیں جو کہ ان سے پہلے پڑھی جانیوالی دو رکعتوں سے کم تھیں۔ پھر دو رکعتیں پڑھیں جو کہ ان پہلے پڑھی جانے والی دو رکعتوں سے بھی کم تھیں۔ پھر دو رکعتیں پڑھی جو ان پہلے پڑھی جانے والی دو رکعتوں سے بھی کم تھیں۔ پھر وتر پڑھیں تو یہ تیرہ رکعتیں ہو گئیں۔

---

(۱) صحيح مسلم ۱/۲۶۲ كتاب صلوٰة المسافرين وقصرهاباب الدعافی صلوٰة الليل وقيامه، سنن ابی داؤد ۱/۲۰۰ كتاب الصلوٰة باب صلوٰة الليل، سنن ابن ماجة ص۹۷ كتاب اقامة الصلوٰة والسنة فيها باب ماجاء فی کم يصلّی بالليل. (مختار)

زیدبن خالد: زیدبن خالد الجھنی رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں۔ابوزرعہ،ابوعبدالرحمان یا ابوطلحہ کنیت تھی۔صلح حدیبیہ میں شریک رہے۔فتح مکہ کے دن اپنے قبیلہ جھینہ کے علمبردار تھے۔۹۷ھ میں پچاسی سال کی عمر میں وفات پائی جبکہ بعض نے تاریخ وفات ۶۸ھ تحریر کی ہے۔مدینہ میں وفات پائی(۱)۔

لارمقنّ (۲) صلوٰۃ الخ دینی علوم کے بارے میں صحابہ کے حرص اور تجسس کا بہترین نمونہ اس حدیث میں موجود ہے۔جب بھی موقع ملاتو اپنے منہوم فی العلم ہونے کا ثبوت دیا۔

گھروں میں تاک جھانک: فتوسدت عتبتہ توسد کے معنی وسادہ بنانا یعنی بطور سرہانہ استعمال کرنا ہے۔عتبہ دروازے کی چوکھٹ کی نچلی پٹی کو کہتے ہیں لیکن اس سے گھر کا دروازہ مراد نہیں کیونکہ اس قسم کا تجسس تو ممنوع ہے کہ کسی کے گھر کے اندر جھانکا جائے اگرچہ مقصد نیک ہو لیکن ناجائز ہے۔بلکہ باہر سے تین بار اجازت لینا ضروری ہے۔اگر جواب نہ ملے یا نفی میں ملے تو واپس لوٹنا لازم ہے۔اس لئے عتبہ سے مراد بھی خیمے کے دروازے کی چوکھٹ ہے اور یہ کسی سفر ہی کا واقعہ ہے۔اسی احتمال کو ملا علی قاری،علامہ مناوی اور علامہ بیجوری رحمہم اللہ نے ظاہر کیا ہے۔

بہرحال صحابہ آپ ﷺ کے گھر میں تاک جھانک نہیں کرتے تھے۔بلکہ چونکہ نبی کریم ﷺ کی زندگی کا ایک معتد بہ حصہ اسفار میں اور گھر سے باہر بھی گزرا ہے۔جن میں جہاد، حج اور عمرے کے اسفار قابل ذکر ہیں۔تو ایسے دنوں میں صحابہ کرام آپ کی عبادت اور اعمال معلوم کرنے کے متلاشی ہوتے تھے۔ عتبتہ او فسطاطہ عتبہ چوکھٹ کو کہتے ہیں اور فسطاط بڑے خیمے کو کہتے ہیں۔دوسری صورت میں بھی عتبہ کا لفظ مقدر رہیگا۔یعنی اوعتبۃ فسطاطہ۔یعنی خیمے کی چوکھٹ پر۔راوی کو یہاں شک ہے۔

حضوراقدس ﷺ کی عبادت شب کے کچھ نمونے: بہرحال آپ ﷺ جہاں مقیم تھے۔اس مکان کے دروازہ یا اس خیمے کے دروازے پر آپ ﷺ کی نماز کا انتظار کرنے لگا۔فذالک ثلث عشرہ رکعۃ الخ اس سے قبل بارہ رکعت کا ذکر کیا۔اور اب وتر کے ساتھ تیرہ رکعت بتائے گئے۔یہاں یہ بات

---

(۱) کذافی الاصابة وقال عبدالروف المناویؒ مات ۸۸ھ وله ۸۵ سنة واللہ اعلم.

(۲) الرمق هو به النظر إلى الشئ على وجه المراقبة والحافظة(المواهب اللدنية۱۷۷)

کہ وتر ایک رکعت ہے یا تین رکعت، محل بحث نہیں، کیونکہ یہ مسئلہ کتاب الصلوٰۃ میں خوب تحقیق کے ساتھ گزر چکا ہے۔ یہاں آپ ﷺ کی عبادت کا محض ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ لہٰذا وتر کے ساتھ تیرہ رکعت مقصود ہو۔ تو تہجد دس رکعت بنتے ہیں۔ اور پہلے کے دو رکعت تحیۃ الوضوء ان میں شمار نہیں ہیں۔ بصورت دیگر بارہ رکعت تہجد کے ساتھ تین رکعت ملا کر کل پندرہ رکعت بنتے ہیں۔

(۱۰) حدّثنا إسحٰق بن موسیٰ ثنا معن ثنا مالک عن سعید بن أبی سعید المقبری عن أبی سلمة بن عبدالرحمان أنّه أخبره أنّه سأل عائشة کیف کان صلوٰة رسول اللهﷺ فی رمضان فقالت ماکان رسول اللّٰهﷺ لیزید فی رمضان ولافی غیره علی احدی عشرة رکعة یصلّی اربعا لاتسأل عن حسنهنّ وطولهنّ ثمّ یصلّی اربعا لاتسأل عن حسنهنّ وطولهنّ ثمّ یصلّی ثلاثا قالت عائشة قلت یارسول اللّٰه أتنام قبل ان توتر قال یا عائشة إنّ عینی تنامان ولاینام قلبی(۱).

ترجمہ: ابوسلمہ بن عبدالرحمان رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کی نماز تہجد رمضان میں کیسی تھی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ گیارہ رکعت تہجد سے زیادہ نہ تو رمضان میں پڑھتے تھے اور نہ غیر رمضان میں۔ آپ اولاً چار رکعت نماز (ایک سلام سے) پڑھتے تھے۔ ان چار رکعتوں کے حسن کا اور طول کا مت پوچھنا۔ پھر مزید چار رکعت نفل پڑھتے تھے۔ ان چار رکعتوں کے حسن اور طول کا مت پوچھنا۔ پھر تین رکعت (ایک سلام سے) پڑھتے

---

(۱) صحیح بخاری ۱/ ۱۵۴ کتاب التهجد باب قیام النبیﷺ باللیل فی رمضان وغیره، صحیح مسلم ۱/ ۲۵۴ کتاب الصلوٰة المسافرین وقصرهاباب صلوٰة اللیل وعددرکعات النبیﷺ فی اللیل، سنن ابی داؤد ۱/ ۱۹۶ کتاب الصلوٰة باب فی الصلوٰة اللیل، سنن النسائی ۱/ ۲۴۸ کتاب قیام اللیل وتطوع انهارباب کیف الوتربثلاث(مختار)

تھے۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا۔کہ کیا آپ ﷺ نماز وتر سے پہلے بھی سوتے ہیں(کیا وہ اس طرح قضاء نہیں ہوگی)تو آپ نے فرمایا کہ میری آنکھیں سوتی ہیں اور دل جاگتا ہے(یوں قضاء ہونے کا خطرہ نہیں ہوتا)

نماز تہجد کے رکعات اور اضطراب روایات: کیف کانت صلوٰۃ الخ یہاں پر نماز تہجد کے بارہ میں سوال کیا گیا ہے جوکہ نیند کے بعد ادا کی جاتی ہے۔اس لئے آپؓ نے جواب دیتے وقت ''ولا فی غیرہ'' کا اضافہ کردیا ہے۔اب نیند سے قبل پڑھی جانے والی نماز جوکہ تراویح کی صورت میں آپ نے پڑھی تھیں گیارہ سے زیادہ ہوسکتی ہیں۔چنانچہ اس حدیث سے تراویح کے آٹھ ہونے پر استدلال لغو ہے۔ وہ الگ نماز ہے اور جمہور صحابہ کا اس پر اجماع منعقد ہوچکا ہے۔کہ وہ بیس رکعت پڑھی جائیں گی۔اور یہی ائمہ اربعہ کا مذہب ہے(۱)۔یہاں پر سوال کا منشا اصل میں یہ تھا کہ چونکہ رمضان شریف میں نبی کریم ﷺ عموما عبادت میں عام دنوں کی نسبت اضافہ فرماتے تھے۔لہٰذا ابوسلمہؓ نے رمضان شریف میں تہجد کے بارے میں دریافت کیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رمضان شریف میں بھی آپ ﷺ کی نماز تہجد معمول کے مطابق ہوتی تھی۔

---

(۱)اور یہی بیس رکعات تراویح سنت مؤکدہ ہیں۔بعض لوگ اس سے انکار کرتے ہیں مگر ان کا انکار کم فہمی اور لاعلمی پر مبنی ہے۔افادہ کے لئے ناچیز کا ایک تفصیلی فتویٰ جو ماہنامہ الحق میں شائع ہوا ہے۔یہاں پر بھی پیش کیا جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے بیس (۲۰) رکعات تراویح پڑھنے کی تحقیق

محترم جناب ایڈیٹر ماہنامہ ''الحق'' اکوڑہ خٹک۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

جناب! ماہنامہ الحق ستمبر۲۰۰۴ء جلد نمبر ۳۹ ص ۳۲ میں درج ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بنفس نفیس ۲۰ رکعات تراویح کی نماز ادا فرمائی ہے......حالانکہ علمائے احناف اس کے خلاف فرماتے ہیں۔

۱۔ امام ابوحنیفہؒ: آپ ﷺ نماز عشاء سے لے کر نماز فجر تک آٹھ رکعت اور تین وتر پڑھتے تھے(کتاب الآثار ص ۲۶)

۲۔امام محمد تلمیذ ابوحنیفہ رسول اللہ ﷺ رمضان میں یا اس کے علاوہ گیارہ رکعات پر اضافہ نہیں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

احدیٰ عشر رکعة بعض دیگرروایات میں تیرہ رکعات اور بعض میں اس سے بھی زیادہ کاذکر موجود ہے بلکہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث گزرگئی ہے۔جس میں بارہ رکعات تہجد کی طرف اشارہ ہے۔کیونکہ آپ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رات کو کبھی فوت ہونے کے بعد آپ دن کو بارہ رکعات پڑھ لیتے تھے۔اور بارہ رکعات کے ساتھ وتر کی تین رکعات ملائی جائیں تو پندرہ بنتی ہیں۔

(بقیہ حاشیہ ص۱۵۶) کرتے تھے (موطاء امام محمد مترجم ص۱۲۲) ۳۔ امام ابن ہمام حنفیؒ: ہدایہ کی شرح فتح القدیر میں لکھتے ہیں۔تراویح کی مسنون تعداد گیارہ رکعات ہے (ص۴۰۷ ج۱) ۴۔ علامہ بدرالدین عینیؒ: (عمدہ القاری ص۱۷۷ ج۱) ۵۔ملاعلی قاری حنفیؒ: (مرقاۃ المفاتیح ص۱۹۶ ج۲) ۶۔ مولانا عبدالحی لکھنویؒ: (التعلیق الممجد ص۱۶۱) ۷۔ انورشاہ کاشمیریؒ (العرف الشذی ص۱۶۶ج۱)

۸۔جلال الدین السیوطی: (المصابیح فی رکعات التراویح ص۱۶) ۹۔ عبدالحق دہلوی: (ماثبت بالسنۃ ص۲۱۷ ۱۰۔قاضی شمس الدین (القول الفصیح ص۵) ۱۱۔ طحطاوی شرح درمختار جلد نمبر۱ص ۲۹۵ ان النبی ﷺلم یصلها عشرین بل ثمانیاً ۱۲۔ ابوالسعود شرح کنزالدقائق ص۱۶۵۔ج۱مصری لأن النبی ﷺلم یصل عشرین بل ثمانیاً. ۱۳۔ الشیخ عبدالحق دہلوی اپنی کتاب "فتح سرالمنان فی تائید مذہب النعمان" کے صفحہ نمبر۳۲۷ میں لکھتے ہیں۔ ولم یثبت روایة عشرین منه ﷺ کما هوالمتعارف :(مروجہ ۲۰ رکعت نبی ﷺ سے ثابت نہیں......) تو جناب آپ کے پاس کوئی نص ہے تو بندہ کی رہنمائی فرمائیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ۲۰ رکعت تراویح ادا کی ہے۔امید ہے ضرور جواب دیں گے۔ دعاگو عبیدالرحمان یزدانی (لائبریرین)

الجواب وبالله التوفیق

آنجناب کاوالہ نامہ بتاریخ ۱۹اکتوبر۲۰۰۴ء بمطابق ۴رمضان المبارک ۱۴۲۵ھ کوموصول ہوا۔پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ آنجناب نے احقر کے مضمون کابغورمطالعہ کیا ہے۔اورپھرایک مقام (آنحضرت ﷺ نے خود بنفس نفیس بیس رکعت تراویح پڑھی ہے) کے اصل ماخذ کے بارے میں مزید وضاحت طلب کی۔اوراس روایت کورد کرنے کے لئے چنداقوال اوربعض کتابوں کے حوالجات بھی تحریرفرمائی ہے۔آنجناب نے جس حدیث کے بارے میں وضاحت طلب کی ہے وہ حدیث مصنف ابن ابی شیبہ۲/۳۹۴اورسنن بیہقی ۲/۴۹۶/ باب ماروی فی عدد رکعات الصیام فی شهر رمضان میں مذکورہ ہے۔مصنف ابن ابی شیبہ کے الفاظ یہ ہیں: حدثنا یزید بن هارون أخبرنا إبراهیم ابن عثمان عن الحکم عن مقسم عن ابن عباسؓ أنّ رسول اللهﷺ کان یصلّی فی رمضان عشرین رکعة والوتر (مصنف ابن ابی شیبہ۲/۳۹۴) (بقیہ اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۵۷)اورسنن بیہقی میں یصلی فی رمضان بغیر جماعة عشرین رکعة والوتر کے الفاظ مذکور ہے۔اسی طرح اس روایت کو عبد بن حمید نے مسند عبد بن حمید میں علامہ بغویؒ نے اپنی شرح السنۃ میں اور امام طبرانیؒ نے معجم کبیر میں روایت کیا ہے(التعلیق الحسن علی آثار السنن ۲۵۴ واعلاء السنن ۸۲/۷)مگر عموماً اس حدیث پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے اس لئے اس سے استدلال کرنا درست نہیں' اور گمان غالب ہے کہ آنجناب نے بھی اسی اعتراض کی وجہ سے مضمون میں درج شدہ مفہوم حدیث کے اصل مأخذ کی وضاحت طلب کرنے کے لئے مکتوب ارسال فرمایا' اور یہ بات قرین قیاس ہے۔اس لئے کہ جب کسی کو اس مسئلہ کے بارے میں اتنی کتابوں کا علم ہو تو اس کو اس روایت کا اصل مأخذ کیسے معلوم نہ ہوگا' لازماً اسی اعتراض کی وجہ سے مضمون میں یہ روایت انوکھی لگی' مگر اس اعتراض کی حقیقت اور جواب سے قبل چند مقدمات کو ذہن نشین کرنا نہایت ہی ضروری ہے' جب ہی اشکال واعتراض کی حقیقت معلوم ہوگی تو جواب سمجھ میں آئیگا۔ (1)مقدمہ اولیٰ: کسی حدیث کے قابل عمل ہونے کے لئے صرف اس حدیث کی سند کا صحیح ہونا ضروری نہیں یہ اس لئے کہ اگر اس شرط کو ضروری قرار دیا جائے تو پھر بہت ساری احادیث کا ترک کرنا لازم آئے گا' حالانکہ ان احادیث مبارکہ کو باوجود سند کے اعتبار سے غیر صحیح ہونے کے فقہاء کرام اور محدثین عظام نے معمول بہ بنائے ہیں۔اور اسی پر عمل کرکے چلے آرہے ہیں۔مثلاً (۱) آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ لاوصیة لـــلــــوارث (الـحـديـث) کہ وارث کے لئے وصیت نہیں۔اس بارے میں امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس کو اہل حدیث ثابت نہیں کہتے۔لیکن عامہ علماء نے اس کو قبول کرلیا ہے۔اور اس پر عمل کرتے ہیں۔یہاں تک انہوں نے اس حدیث کو آیت وصیت کا ناسخ قرار دیا ہے۔

(۲) اسی طرح العینان و کاء السه(الحدیث) آنکھیں سرین کے تسمے ہیں۔یہ روایت بھی سنداً ضعیف ہے مگر اس کے باوجود بعض محدثین اور فقہاء کرام نے اس کو معمول بہ قرار دیا ہے۔

(۳) اس کےعلاوہ الـمـاء طهـور لاينـجسـه شئی إلاّماغلب علی ريحه اوطعمه (الحديث) کے بارے میں امام نوویؒ نے کہا ہے کہ اس روایت کے ضعیف ہونے پر علماء امت کا اتفاق ہے' مگر اس کے باوجود اہل مدینہ اور دوسرے فقہاء کرام نے اس کو معمول بہ قرار دیا ہے۔

(۴)اسی طرح کہ مـن جـمـع بيـن الـصـلاتيـن مـن غيـر عـذر فـقداتی باباً من ابواب الكبائر(ترمذی ۳۰۴/۱) اس روایت کے بارے میں امام ترمذیؒ فرماتے ہیں:قـال ابـو عيسـی حـنـش هذا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت زید بن خالد جہنی کی روایت میں تیرہ رکعات کا ذکر ابھی ابھی گزر چکا ہے۔ بلکہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بعض روایات میں تیرہ رکعات کا ذکر بھی آیا ہے۔تو گویا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایات اس باب میں مضطرب ہیں۔

اس لئے ہم کہتے ہیں کہ بارہ رکعتوں والی روایات کو ترجیح دی جاتی ہے۔کیونکہ وہ غیر مضطرب ہیں یا پھر دونوں میں تطبیق کی جائیگی۔یوں کہ تہجد میں اکثر اوقات میں آپ ﷺ کی عادت بارہ رکعات پڑھنے کی تھی۔لیکن کبھی کبھی آٹھ پر اکتفاء بھی کر لیتے تھے۔اور ہو سکتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں عام معمول یہی ہو۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۵۸)هو بو علی الرحبی وهو حنش بن قيس وهو ضعيف عنداهل الحديث ضعّفه احمد وغيره لیکن اس کے باوجود والعمل على هذا عنداهل العلم ان لايجمع بين الصلاتين إلاّ في السفر اوبعرفة (الجامع الترمذی ۱/۳۰۳)

امام ترمذی فرماتے ہیں: حنش یہ ابو علی الرحبی ہے اور اس کا نام حسین بن قیس ہے اور یہ راوی محدثین کے ہاں ضعیف ہے۔ امام احمد اور دوسرے ائمہ جرح وتعدیل نے اس کی تضعیف کی ہے۔لیکن اس کے باوجود اہل علم کا اس پر عمل ہے اور ان کے ہاں سفر اور عرفہ کے علاوہ جمع بین الصلاتین جائز نہیں۔

(۶) اسی طرح کہ طلاق الامة ثنتان وعدتها حيضتان (الحديث) اس روایت کے بارے میں امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ حديث غريب والعمل عليه عندأهل العلم من اصحاب رسول الله ﷺ وغيرهم ترمذی اور امام دارقطنیؒ فرماتے ہیں کہ قال قاسم و سالم عمل به المسلمون وقال مالک شهرة الحديث بالمدينة تغني عن صحة سنده (۲/ ۴۴۱)

یہ حدیث غریب ہے اور اس پر آنحضرت ﷺ کے اہل علم صحابہ کرام اور دوسرے اہل علم کا عمل ہے امام قاسم اور امام سالم کہتے ہیں کہ اس پر مسلمانوں کا عمل ہے اور امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ مدینہ منورہ میں کسی حدیث کی شہرت سند کی صحت سے مستغنی کر دیتی ہے۔اسی طرح امام ترمذیؒ نے کئی مقامات پر فرمایا ہے کہ یہ حدیث سند کے لحاظ سے ضعیف ہے مگر اس پر اہل علم کا عمل ہے۔اور آج تک ان پر عمل چلا آ رہا ہے۔

(2) مقدمہ ثانیہ: دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جس طرح حدیث مبارک سند کی وجہ سے درجہ صحت اور درجہ حسن تک پہنچتا ہے تو اسی طرح امت مسلمہ کے تلقی بالقبول سے بھی وہ روایت باوجود سنداً ضعیف ہونے کے درجہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حسن وطول صلوٰۃ: لاتسأل الخ یہ حسن میں مبالغہ کا بیان ہےاور نماز میں حسن اور عدم حسن انہی کو معلوم ہوتا ہے۔جو کہ نماز کے عشاق ہیں۔ان کو لذتوں اور نماز کے دقائق معلوم ہوتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کیلئے نماز کی دنیا دوسری دنیا تھی۔تیروں،تلواروں اور نیزوں کی بارش میں وہ نماز پڑھتے تو حرکت نہیں کرتے تھے۔یصلی اربعاً یہ چونکہ نفل ہیں۔اس لئے ان کو دو دو پڑھنا اور چار چار پڑھنا برابر ہیں۔

(بقیہ حاشیہ ص۱۵۹) صحت وحسن کا مقام پالیتا ہے اسی لئے محدثین عظام نے فرمایا ہے: قال بعضهم يحكم للحديث بالصحة اذا تلقاه الناس بالقبول و ان لم يكن له اسناد صحيح (تدریب الراوی ۱/۶۷) بعض نے کہا ہے کہ حدیث پر صحیح کا حکم اس وقت بھی لگایا جائے گا۔جب امت اس کو قبول کرے اگرچہ اس کی سند ضعیف ہو۔

اوراسی وجہ سے محقق ابن ہمامؒ نے فتح القدیر ۱/۴۶۱) میں فرمایا ہے کہ اذا تأيد الضعيف بما يدل على صحته من القرائن كان صحيحاً کہ جب کسی ضعیف روایت کی صحت پر قرائن شرح دال ہوں تو وہ حدیث صحیح ہے۔

اوراسی بناء پر محدثین اور فقہاء نے کافی سارے ذخیرہ احادیث کو صحیح کہا ہے اوران کو معمول بہا قرار دیا ہے۔

۱۔مثلاً الاستذکار میں علامہ ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں کہ لما حكى عن الترمذى انّ البخارى صحّح حديث البحر هو الطهور ماؤه و اهل الحديث لا يصححون مثل اسناده لكن الحديث عندى صحيح لان العلماء تلقوه بالقبول (بحوالہ مقدمہ اعلاء السنن/۶۱۔وتدریب الراوی ۱/۶۵) امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ البحر هو الطهور ماءه کو صحیح فرماتے ہیں اور دوسرے محدثین اس روایت کو سند کی وجہ سے صحیح نہیں کہتے مگر میرے نزدیک یہ روایت صحیح ہے اس لئے کہ علماء نے اس روایت کو قبول کیا ہے

۲۔اسی طرح علامہ محقق ابن ہمامؒ ۔ قول الترمذى (والعمل عليه عنداهل علم) يقتضى قوة أصله وإن ضعف خصوص من هذه الطريق (فتح القدیر ۱/۲۱۷) کہ امام ترمذی کا قول کہ اہل علم کے ہاں اس روایت پر عمل ہے اس روایت کے اصل کی قوت (صحت) کا تقاضہ کرتا ہے اگرچہ انہوں نے سند کی وجہ سے اس کو ضعیف کہا ہو۔

اور کتاب الطلاق کے فصل اول میں لکھا ہے ومما يصحّح الحديث ايضاً عمل العلماء على وفقه وقال الترمذى عقيب رواية حديث طلاق الامة ثنتان...... حديث غريب والعمل عليه عنداهل العلم من أصحاب رسول الله ﷺ وغيرهم (فتح القدير ۳/۱۴۳) علماء کا عمل بھی ان امور میں سے ہے جس کی وجہ سے حدیث کو صحیح کہا جاتا ہے۔امام ترمذی نے طلاق الامة ثنتان وعدتها حيضتان کے بعد فرمایا ہے یہ حدیث غریب ہے مگر صحابہ کرام اور دوسرے اہل علم کے ہاں اس پر عمل ہے۔

اسی طرح علامہ سیوطیؒ نے تعقبات میں ایک اور مثال ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے: وقال الترمذى (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۰)فقدرأی ابن المبارک وغیرہ .

۳۔ صلوٰۃ التسبیح وذکروا الفضل فیه قال البیهقی فان عبدالله بن المبارک یصلیها وتداوله الصالحون بعضهم عن بعض وذلک تقویة للحدیث المرفوع (مقدمہ اعلاء السنن /۶۲)'' کہ عبداللہ بن مبارک اور دوسرے اہل علم نے صلوٰۃ تسبیح کی ترغیب دی ہے۔امام بیہقی '' فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن مبارک صلوٰۃ تسبیح پڑھا کرتے تھے اور صالحین کے ہاں یہ نماز چلی آ رہی ہے۔اوراسی وجہ سے اس حدیث مرفوع کو تقویت ملی۔''

یہ چند روایات بطور نمونہ ذکر کیے گئے ورنہ اور بھی کافی ساری روایات ذخیرہ کتب حدیث میں موجود ہیں۔جو سنداً ضعیف ہیں مگر تلقی بالقبول کی وجہ سے علماء نے ان کو صحیح کہا ہے۔تلقی الامۃ بالقبول ایسی دلیل صحت ہے کہ کبھی کبھی خبر تلقی الامۃ بالقبول کی وجہ سے ضعیف روایت تواتر کے حکم میں ہوجاتا ہے۔چنانچہ علامہ ابوبکر الجصاص الرازیؒ نے احکام القرآن میں لکھا ہے۔ وقد استعملت الامة هذین الحدیثین وان کان وروده من طریق الاحاد فصار فی خبر التواتر لأن ما تلقاه الناس من اخبار الاحاد بالقبول فهو عندنا فی معنی التواتر

(احکام القرآن ۱/ ۳۸۶ بحواله مقدمه اعلاء السنن / ۶۲)

ان دونوں احادیث کو امت نے معمول بھا بنایا ہے اگر چہ ان کا ورود بطریق الاحاد ہو چکا ہے مگر اس تعامل سے یہ روایات تواتر کے حکم میں داخل ہوئے' اس لئے کہ لوگوں کا اخبار احاد کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا ہمارے ہاں تواتر کے معنی میں ہے۔تلقی الامۃ بالقبول سے حدیث ضعیف کا قابل احتجاج ہونے کا اصول علامہ صدیق بن حسن خان القنوجیؒ نے الروضۃ الندیۃ ۱/ ۶ میں بھی لکھا ہے۔

(3) مقدمہ ثالثہ: تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ جس طرح حدیث صحت سند اور تلقی الامۃ بالقبول کی وجہ سے صحت اور حسن کا مرتبہ پاتا ہے تو اسی طرح دوسرے قرائن شرع' مثلاً اجماع امت' شواہد اور توابع وغیرہ کی وجہ سے بھی ضعف روایت صحت کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔

اس لئے علامہ ابوالحسن بن الحصار المالکیؒ نے تقریب المدارک علی مؤطا مالک میں لکھا ہے: قد یعلم الفقیه صحة الحدیث اذا لم یکن فی سنده کذّاب بموافقة آیة من کتاب الله او بعض اصول الشریعة فیحمله ذلک علی قبوله والعمل به (تدریب الراوی ۱/ ۶۸) کبھی فقیہ کسی حدیث کی صحت کو صرف اس وجہ سے جان لیتا ہے کہ وہ روایت قرآنی آیت یا اصول شرعیہ کے موافق ہے اور وہ اس روایت کو قبول کر کے اس پر عمل کر لیتا ہے بشرطیکہ اس روایت کی سند میں کوئی کذّاب راوی نہ ہو۔اور حافظ ابن حجرؒ نے اپنے استاد حافظ عراقیؒ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص۱۶۱) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان یتفق العلماء علی العمل بمدلول حدیث فانّه یقبل حتیٰ یجب العمل به (بحوالہ التعلیقات الحافلۃ علی الاجوبۃ الفاضلۃ ص۲۳۱)

علماء امت مدلول حدیث پر عمل کرنے پر متفق ہیں اور اس کو قبول کرتے ہیں حتیٰ کہ اس پر عمل کرنے کو واجب اور ضروری سمجھتے ہیں' اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ روایت اصول شرع کے موافق ہو اگر چہ اس کی سند میں کوئی کمزوری ہو تب بھی وہ روایت ان کے ہاں معمول بہا ہوتی ہے۔ اور اسی وجہ سے محقق بن ہمامؒ نے لکھا ہے کہ فان ضعف الاسناد غیر قاطع ببطلان المتن بل ظاهر فیه فاذا تاید بما یدل علی صحته من القرائن کان صحیحاً (فتح القدیر۲/۸۷)

سند کا ضعیف ہونا متن کے بطلان کی دلیل نہیں' بلکہ اس میں ظاہر ہے کہ جب اس صحت پر قرائن شرع میں سے کوئی قرینہ دلالت کرے تو وہ روایت صحیح کہلاتی ہے۔

(4)۔ مقدمہ رابعہ: چوتھا مقدمہ یہ ہے کہ کسی بھی حدیث کو قطعی طور پر اس وقت تک ضعیف اور غیر معمول بہا نہیں کہا جاسکتا جب تک اس کے بارے میں پوری تحقیق نہ ہو۔ علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں: واذا قیل هذا حدیث صحیح فهذا معناه ای ماا تصل سنده مع الاوصاف المذکورة فقبلنا عملاً بظاهر الاسناد لاانّه مقطوع به فی نفس الامر لجواز الخطاء والنسیان عن الثقة واذا قیل هذا حدیث غیر صحیح (ضعیف) فمعناه لم یصح إسناده علی الشرط المذکور لانّه کذب فی نفس الامر لجواز صدق الکاذب واصابة من هو کثیر الخطاء (تدریب الراوی بحوالہ مقدمہ اعلاء السنن/۵۶)

جب یہ کہا جائے کہ یہ روایت صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ روایت ہے جس کی سند صفات مذکورہ کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے' تو ہم اس کو ظاہر سند کی وجہ سے قبول کرتے ہیں۔ لیکن اس کے بارے میں قطعی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ نفس الامر میں بھی یہ روایت صحیح ہے اس لئے کہ ثقہ راوی سے بھی خطاء اور نسیان کا احتمال ہے' اور جب کہا جائے کہ یہ حدیث صحیح نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس روایت کی سند مذکورہ شرائط کے ساتھ ہم تک نہیں پہنچا لیکن اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ نفس الامر میں بھی یہ جھوٹ ہے اس لئے کہ جھوٹے سے بھی سچ اور اصابت رائے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی ضعیف حدیث بھی صحیح بن جاتا ہے جب اس کی صحت پر کوئی قرینہ دلالت کرے اور جب قرائن اس کے خلاف ہو تو صحیح حدیث پر بھی عمل ترک کیا جاتا ہے (اعلاء السنن/۵۶) (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۲)

لہٰذا اب ان مقدمات کو ذہن نشین کرنے کے بعد اس روایت پر ضعف کا جو اعتراض کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہیں کہ یہ روایت سنداً ضعیف ہے' اس لئے کہ اس روایت کی سند میں ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان العبسی ہے اور اس کو محدثین نے ضعیف کہا ہے۔ چنانچہ امام بیہقی فرماتے ہیں۔ **تفرد به أبو شيبة ابراهيم بن عثمان العبسي وهو ضعيف** کہ ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان عبسی اس روایت میں متفرد ہے۔ اور وہ ضعیف ہے (السنن الکبریٰ ۲/۴۹۶)

شیخ الاسلام علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں' **ابراهيم بن عثمان ابو شيبة العبسي الكوفي قاض بواسط وجد ابي بكر بن ابي شيبة مروى عن زوج امه الحكم بن عتيبة وغيره كذّبه شعبة لكونه روى عن الحكم عن ابن ابي ليلى انه قال شهد صفين من اهل بدر سبعون فقال شعبة كذب والله لقد ذكرت الحكم فما وجدنا شهد صفين. احداً من اهل بدر غير حزيمة:**

قلت سبحان الله ' اما شهدها عليٌّ ! اما شهد ها عمارٌ روى عثمانٌ لادارمي عن ابن معين ! ليس بثقة وقال احمد ضعيف وقال البخاري سكتو عنه وقال النسائي متروك الحديث .... الخ (ميزان الاعتدال ۱/۴۸)

ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان العبسی الکوفی واسط کا قاضی ہے اور ابوبکر بن ابی شیبہ کے دادا' آپ نے اپنی ماں کے شوہر حکم بن عتیبہ وغیرہ سے روایت کی۔ امام شعبہ نے آپ کی تکذیب اس وجہ سے کی ہے کہ آپ نے حکم بن عتبہ عن ابن ابی لیلیٰ کی سند سے ذکر کیا ہے کہ جنگ صفین میں ۷۰ بدری صحابہ شریک ہوئے تھے' امام شعبہ فرماتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے' میں نے خود حکم بن عتیبہ سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے حضرت خزیمہؓ کے علاوہ کسی بدری صحابی کا صفین میں شرکت کا ذکر نہیں کیا۔ علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ سبحان اللہ کیا حضرت علیؓ بھی شریک نہیں ہوئے تھے اور حضرت عمارؓ نے بھی شرکت نہیں کی تھی' عثمان دارمی نے امام ابن معین سے نقل کیا ہے کہ ابوشیبہ ثقہ نہیں ہے' امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ابوشیبہ ضعیف راوی ہے' امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ محدثین ابوشیبہ سے خاموش ہے اور نسائی نے کہا ہے کہ ابوشیبہ متروک الحدیث راوی ہے۔ یہ وہ اعتراض ہے جس کی وجہ سے بعض حضرات اس کی اصلیت سے انکار کر بیٹھے۔ مگر اس اعتراض کے جواب کے بارے میں علامہ محمد حسن فیض پوریؒ رسالہ تحفۃ الاخوان فی صلوٰۃ رمضان میں لکھتے ہیں۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۳)

ابراہیم بن عثمان کی توثیق: (الجواب) اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ اہل حدیث نے اس کو مجروح اور ضعیف کہا ہے اور اس کے ضعف پر اصرار کیا ہے مگر اس عاجز ہیچ مداں کے نزدیک یہ تمام جروحات خام اور غیر موثر ہیں اور افسوس صد افسوس ان اہل علم پر جن سے یہ حرکت سرزد ہوئی اور کسی نے مخالف اور موافق سے غور اور تامل نہ کیا تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ چند اسباب جرح کے متعدد اور متکثر ہیں مگر مآل اور انجام کار ان سب کا دو امر پر ہے۔ اول جرح باعتبار عدالت اور تقویٰ کے اور دوسری جرح باعتبار حفظ اور ضبط کے اور میرے ناقص فہم میں ان محدثین کے جروحات سب کے سب عدالت کی طرف راجح ہیں۔ حفظ اور ضبط کی طرف نہیں کیونکہ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری کے ۷ اصفحہ ۶۸ میں اس کو حافظ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور اس کی عبارت یہ ہے : **ابراهيم بن عثمان ابو شيبة الحافظ انتهى** لہٰذا جب اس کے بارے میں لفظ حافظ مسلم ہوا تو اب باقی جروحات ان اہل حدیث کے سب عدالت کی طرف راجح ہے' جبکہ یہی امر معہود متعین ہو چکا تو میں کہتا ہوں کہ جرح باعتبار عدالت کے بھی اس کے حق میں خام اور غیر موثر ہے' اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جن اہل علم نے عدالت کے رو سے اس کو متروک اور ضعیف کہا ہے' تو وہ سب جروحات مبہم اور غیر مفسر ہیں اور مدار ان سب کا مفسر طور پر فقط ایک ہی جرح پر ہے وہ یہ کہ ان میں سے شعبہ بن حجاج نے سب سے مقدم اور مبین السبب جرح فرمائی ہے' یعنی جو کہ شیخ الاسلام علامہ ذہبیؒ نے لکھی ہے' **وهو قوله كذبه شعبة لكونه روى عن الحكم عن ابن ابى ليلىٰ انه قال شهد صفين من اهل بدر سبعون فقال شعبة كذب والله لقد ذاكرت الحكم فما وجدنا شهد صفين من اهل بدر غير حزيمة** اور باقی محدثین شعبہ کے تبع اور مقلد ہیں اور سب کے سب اسکے بعد ہیں۔ کوئی جارح ابو شیبہ کا معاصر نہیں بجز شعبہ کے تو جروحات عدالت کا مدار شعبہ کی کلام پر رہا جب یہی امر مہد متعین ہو چکا تو میں کہتا ہوں کہ یہ جرح اگرچہ مفسر اور مبین السبب ہے مگر اس قدر کی جرح سے ابو شیبہ متروک قرار دینا اور من کل الوجوہ ضعیف کہنا غلط اور بے انصافی ہے' کیونکہ اس قسم کی جرح از قبیل سہو اور نسیان ہے اور وہ چنداں خارج نہیں ورنہ ابن حجاج بلکہ خود حکم بن عتیبہ کذاب اور متروک قرار دیا جاوے گا کیونکہ ان سے بھی اس قسم کی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ اسلئے شعبہ اور حکم اس بات کے قائل ہیں کہ صفین میں بجز خزیمہؓ کے اہل بدر میں سے کوئی معاصر نہ تھا حالانکہ حضرت علیؓ اور حضرت عمارؓ دونوں صحابہ کرام بھی موجود تھے' اس واسطے شیخ الاسلام علامہ ذہبیؒ نے شعبہ کے جواب میں کہا کہ **سبحان الله أما شهدها عليٌّ اما شهدها عمارٌ** انتھی اب اگر اس قدر سہو اور ذہول کے سبب ابو شیبہ متروک قرار دیا جائے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۴) تو چاہیے کہ شعبہ بن حجاج اور حکم بن عتیبہ بھی متروک قرار دے جاوے للعلة الواحدة الجامعة فیهم وهی عدم حفظ اصحاب بدر' اب شعبہ بن حجاج کوامیرالمومنین قرار دینا اور حکم بن عتیبہ کو اجماعی امام ثقہ کہنا اور ابو شیبہ کو ضعیف قرار دینا مع اتحاد سبب الجرح فیھم انصاف سے بعید ہے۔اور میں کہتا ہوں کہ ابو شیبہ کی بہ نسبت شعبہ اور اسکے شیخ حکم بن عتیبہ کی غلطی سخت ہے اور اسکی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان ایام میں بہت سارے بدری صحابہ کرامؓ زندہ تھے۔

منهم رفاعة بن رافع مات فی اولّ خلافة معاویة ' ابولبابة الانصاری عاش الی خلافة علی ' أبوطلحة الانصاری مات سنة اربع و ثلاثین و قال ابوزرعة عاش بعد النبی ﷺ اربعین سنة ' سعید بن زید بن عمرو بن نفیل مات سنة خمسین او بعد ها ' سهل بن حنیف مات فی خلافة علی' عبدالله بن مسعود مات سنة اثنین وثلاثین ' أبو مسعود البدری مات قبل الاربعین' عبادةبن الصامت مات سنة ثلاثین ' عتبان بن مالک مات فی خلافة معاویة' مالک بن ربیعة ابوالسید مات سنة ثلاثین او بعدها اب یہ تمام صحابہ اوران کے سواء دوسرے بدری صحابہ زندہ تھے کل ذلک من التقریب'

اوردوسری وجہ یہ ہے کہ بنسبت اور بدریوں کے حضرت علیؓ اور حضرت عمارؓ کا صفین میں ہونا اظهر من الشمس تھا اور ہرفرد بشر ادنیٰ اور اعلیٰ ذی علم میں سے اس بات کا خوب واقف ہے اور شعبہ اور حکم ان سے بھی غافل ہیں۔ اب باوجود ایسی سخت غلطی کے جب شعبہ اور حکم مجروح نہیں تو ابوشیبہ بھی مجروح نہ ہو۔ وهوالمطلوب اسی واسطے خاتم المحدثین اور ہمارے پیران پیر اور شیخ شیخ الشیخ اعنی شاہ عبدالعزیز محدث دھلویؒ نے رسالہ تراویح میں لکھتے ہیں کہ حالانکہ ابوشیبہ ان قدر ضعف ندارد کہ روایت او مطروح ساختہ شود اور میں کہتا ہوں کہ یہ بات خاتم المحدثین کی راست اور درست ہے۔ (رسائل ستہ ضروریہ ص ۲۰۰ تا ۲۰۲)

اور میں کہتا ہوں کہ علامہ فیض پوریؒ کا یہ کلام قرین قیاس ہے۔اس لئے کہ ابراہیم بن عثمان ابوشیبہ کو مجروح ثابت کرنے میں کچھ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔اس لئے کہ امام ابن عدیؒ آپؒ کے متعلق فرماتے ہیں له احادیث صالحة وهو خیر من ابراهیم بن ابی حیه (تہذیب التہذیب ۱/۱۴۵) اسی طرح امام بخاریؒ کے استاد الاستاذ یزید بن حارون جو نہایت ثقہ اور اعلیٰ درجہ کے حافظ حدیث ہیں۔ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان کے بڑے مداح تھے آپ فرمایا کرتے تھے ماقضیٰ علی الناس یعنی فی زمانه اعدل فی قضاء منه (تہذیب التہذیب ۱/۱۴۵)

یعنی ہمارے زمانے میں ان سے زیادہ عادل کوئی قاضی نہیں تھا۔یہاں یہ بات گوش گزار کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یزید بن ہارون سے بڑھ کر ابراہیم بن عثمان کا پرکھنے والا اور ان کے حالات سے باخبر ان (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص۱۶۵) جارحین میں کوئی بھی نہیں ہے۔اس لئے کہ یزید بن ہارون ان کے محکمہ میں کاتب یعنی ان کے منشی تھے۔وہ ابوشیبہؒ کی عدالت' تقویٰ' للٰہیت سے خوب واقف تھے۔اس لئے یزید کی شہادت ابراہیم بن عثمان ابوشیبہ کے علم اور دیانت داری دونوں میں زبردست شہادت ہے۔اور ویسے بھی کسی راوی کی روایت کو قبول کرنے کے لئے دو باتیں لازمی طور پر دیکھی جاتی ہیں۔ایک تدین (دینداری)' دوم اس کا قوت حافظہ' یزید بن ہارون کی شہادت کے بعد اب تو ابراہیم بن عثمان کے تدین میں تو کوئی شک باقی نہیں رہا۔اور حافظ ابن حجرؒ اور ابن عدیؒ کی شہادت سے اس کا حافظہ بھی معلوم ہوا۔ان دونوں امور کے ثابت ہونے کے بعد اس کو اس حد تک ضعیف قرار دینا جس کی وجہ سے اس کی روایت کردہ حدیث کو نا قابل استدلال قرار دیا جائے۔اس کے علاوہ امام شعبہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ہمیشہ ثقہ راویوں سے روایت لیتے تھے'اور تہذیب التہذیب میں یہ بھی لکھا ہے کہ ابوشیبہ سے امام شعبہ نے روایت لیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شعبہ نے اپنی جرح سے رجوع کرلیا ہوگا' اب اگر شعبہ کے رجوع کو مان لیا جائے تو راوی ابوشیبہ ثقہ ہوا اور اگر رجوع ثابت نہ مانا جائے تو راوی مختلف فیہ ہوا جس کی وجہ سے وہ درجہ حسن میں آئے گا اور درجہ حسن کی روایت بھی قابل احتجاج ہے۔اس لئے یہ روایت صرف شعبہ کے جرح سے نا قابل استدلال قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اس کے علاوہ اگر بالفرض ان حضرات کی جرح کو مان لیا جائے اور ان کی وجہ سے ابراہیم بن عثمان کو ضعیف قرار دیا تو صرف اس سے روایت کو ضعیف نہیں کہا جاسکتا۔اس لئے کہ اس کی تائید میں عہد فاروقی کے مسلمانوں کا علانیہ عمل اور ائمہ مجتہدین کے اتفاق رائے جیسے قوی اور ٹھوس دلائل موجود ہیں۔جس کی وجہ سے یہ روایت قابل احتجاج ہے' مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ نے خود ایک موقعہ پر اعتراف کیا ہے کہ بعض ضعیف ایسے ہیں جو امت کی تلقی بالقبول سے رفع ہوگئے ہیں (اخبار اہل حدیث مورخہ ۱۹/اپریل ۱۹۰۷ء بحوالہ بیس تراویح کا ثبوت ص۴)

<u>غیر مقلدین کی ناانصافی:</u> تلقی بالقبول پر مزید تفصیلی بحث کرنے سے قبل حضرات غیر مقلدین کی ناانصافی بتانا ضروری ہے' کہ تراویح کے مسئلہ میں تو احناف کے مستدل حدیث بالا پر ورق کے ورق سیاہ کرتے ہیں کہ ابراہیم بن عثمان ابوشیبہ سخت ضعیف ہے'اس سند کو پیش کرنا بدنامی اور حماقت ہے۔مگر نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کے ثبوت میں مشہور غیر مقلد حکیم محمد صادق سیالکوٹی نے اپنی کتاب صلوۃ الرسول کے صفحہ ۴۳۴ پر اسی راوی کی روایت بحوالہ ابن ماجہ پیش کی ہے۔وعن ابن عباس أنّ النبیّ ﷺ قرأ علی الجنازة بفاتحة الکتاب (ابن ماجة) کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھی ہے۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۶)اور ابن ماجۃ میں اس روایت کی سند یوں ہے حدثنا أحمد بن منیع ثنا زید بن الحباب ثنا إبراهیم بن عثمان عن الحکم عن مقسم عن ابن عباس أنّ النبیّ ﷺ قرأ علی الجنازۃ بفاتحۃ الکتاب

(ابن ماجہ ص ۱۰۷)

گزشتہ تفصیل سے معلوم ہوگا کہ ابراہیم بن عثمان ابوشیبہ ضعیف راوی نہیں لیکن اگر ان محدثین کی بات مان لی جائے تو بعض کے توثیق اور بعض کی تضعیف سے اس کو مختلف فیہ راوی مان لیا جائے گا۔ جیسا کہ ہم نے مقدمہ ثانیہ میں ذکر کیا کہ ایک ضعیف روایت تلقی بالقبول کی وجہ سے بھی قابل استدلال اور صحیح قرار دیا جاتا ہے۔ یہاں پر بھی اس روایت کو امت مسلمہ نے معمول بھا قرار دیا ہے اور دور صحابہ سے لے کر آج تک اسی روایت پر عمل ہوتا رہا ہے۔ اور بیس رکعات تراویح کا عمل خیر القرون سے آج تک منقول ومشاہد ہے' خلفاء راشدین' صحابہ کرام' تابعین' تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین کے اقوال' افعال اور فتاویٰ اس روایت کے مؤید ہیں ہم نے مقدمہ ثالثہ میں یہی ذکر کیا ہے کہ ایک حدیث ضعف سند کے باوجود قرائن شرع کی تائید سے صحیح اور قابل احتجاج بن جاتا ہے اور یہاں پر قرائن شرع یعنی اجماع صحابہ' تعامل امت اور ان کا اتفاقی عمل اس روایت کے مؤید ہیں' ذیل میں بعض آثار اور تائیہ قرائن ذکر کئے جاتے ہیں تا کہ مزید وضاحت ہو سکے۔

دورِ فاروقی میں بیس رکعات تراویح: امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ خلافت میں باقاعدہ طور پر نماز تراویح باجماعت کا اہتمام کیا گیا اور اس وقت سے لوگوں نے باقاعدہ طور پر بیس رکعات تراویح کا اہتمام کرنا شروع کیا۔

(۱) چنانچہ حضرت سائب بن یزید فرماتے ہیں: کنّا نقوم فی زمان عمر بن الخطاب بعشرین رکعۃ والوتر . حضرت عمرؓ کے خلافت کے زمانہ میں بیس رکعات تراویح اور تین وتر پڑھتے تھے۔ (معرفۃ السنن للبیہقی ص ۳۶۷) اس روایت کی سند پر امام نوویؒ کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے (شرح المھذب) علامہ سبکیؒ علامہ جلال الدین سیوطیؒ ملا علی قاریؒ نے بھی اس کی سند کی تصحیح کی ہے۔

(۲) اسی طرح یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں کہ أنّ عمر بن الخطاب امر رجلاً یصلّی بھم عشرین رکعۃ بیشک حضرت عمرؓ نے ایک آدمی کو مقرر کیا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعات تراویح پڑھائے۔

(۳) اسی طرح یزید بن رومان سے مروی ہے کان الناس یقومون فی زمان عمر بن الخطاب فی رمضان بثلاث وعشرین رکعۃ (موطا امام مالک ص ۴۰) کہ لوگ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں رمضان میں بیس (۲۰) رکعات تراویح اور تین وتر پڑھتے تھے۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص۱۶۷)(۴)عن الحسن أنّ عمر بن الخطاب جمع الناس علی ابی بن کعب فکان یصلّی بھم عشرین رکعة حضرت عمرؓ نے لوگوں کو حضرت ابی بن کعبؓ کی اقتداء میں جمع کیا اور وہ لوگوں کو بیس رکعات تراویح پڑھاتے تھے۔

(۵) عن ابی بن کعب ان عمربن الخطاب امرہ ان یصلّی باللیل فی رمضان فصلّی بھم عشرین رکعة (کنزالعمال ۲۶۴/۸) حضرت ابی بن کعبؓ سے روایت ہے کہ بیشک حضرت عمرؓ نے اسے حکم دیا کہ وہ لوگوں کو رمضان میں رات کو (تراویح) پڑھائے اس لئے اس نے لوگوں کو بیس رکعات پڑھائے۔

حضرت ابی بن کعبؓ کے بیس رکعات پڑھانے کی تحقیق کے ثبوت کے بارے میں شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں قدثبت أنّ ابی بن کعب کان یقوم بالناس عشرین رکعة ویوتر بثلاث فرای اکثر من العلماء أنّ ذالک ھو السنة لامة قام بین المھاجرین والانصار ولم ینکرہ منکر (فتاوی ابن تیمیہ ۱۱۲/۲۳)

یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ حضرت ابی بن کعب لوگوں کو بیس رکعات تراویح اور تین وتر پڑھائے تھے۔اس لئے علماء کی اکثریت کی رائے میں بیس ہی سنت ہے کیونکہ حضرت ابی بن کعبؓ کے پیچھے مہاجرین اور انصار (بیس رکعات پڑھتے تھے)اور کسی منکر نے بھی انکار نہیں کیا۔

دورعثمانی میں بیس رکعات تراویح: حضرت سائب بن یزید فرماتے ہیں کہ عہد فاروقی میں لوگ بیس رکعات تراویح پڑھتے تھے اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں بھی اور لوگ لمبے قیام کی وجہ سے لاٹھیوں پر سہارا لیتے تھے (السنن الکبریٰ ۲۹۲/۴) اسی طرح علامہ عینیؒ نے لکھا ہے وفی روایة لہ (سائب بن یزید) وعلی عھد عثمان وعلیؓ مثلہ (البنایہ ۱۰۱/۳) کہ حضرت سائب بن یزید سے روایت کہ لوگ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانہ میں بھی بیس رکعات پڑھتے تھے دورفاروقی کی طرح عہد عثمانی میں بھی کسی نے بیس رکعات تراویح پر تنقید نہیں کی اور نہ اس کو بدعت کہا ہے گویا اس دور میں سب مسلمانوں کا بیس رکعات تراویح پر اتفاق رہا۔

دورمرتضوی میں بیس رکعات تراویح: اسی طرح دورمرتضوی (حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت) میں بھی اسی پر مواظبت رہا حضرت علیؓ نے خود قراء کو بیس رکعات تراویح پڑھانے پر مامور فرمایا تھا۔(۱) عن أبی عبدالرحمن السلمیؒ عن علیّ قال دعا القراء فی رمضان فامر منھم رجلاًیصلّی بالناس عشرین رکعة وکان علی یوتربھم (سنن کبریٰ للبیہقی ۴۹۶/۲) کہ حضرت علیؓ نے قاریوں کو بلایا اوران میں سے ایک آدمی کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعات پڑھایا کرے اور خود حضرت علیؓ لوگوں کو وتر پڑھاتے تھے۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۸)(۲) عن ابی الحسن ' انّ علیّا امر رجلاً یصلّی بھم فی رمضان عشرین رکعة. (مصنف ابن ابی شیبہ ۲/۳۹۳) ابوحسن سے روایت ہے کہ بیشک حضرت علیؓ نے ایک آدمی کو مامور کیا کہ وہ رمضان میں لوگوں کو بیس رکعات تراویح پڑھائے۔

<u>دیگر صحابہ کرام وتابعین کا عمل:</u> دور خلفاء ثلاثہ کے علاوہ بعد کے ادوار میں بھی قریباً جمیع صحابہ کرام کا بیس رکعات پڑھنے کا عمل تھا۔ چنانچہ امام حسن بصریؒ عبدالعزیز بن رافع سے روایت کرتے ہیں:

۱. کان أبی بن کعب یصلّی بالناس فی رمضان بالمدینة بعشرین رکعة ویوتر بثلاث (مصنف ابن ابی شیبة ۲/۲۸۵) ''کہ ابی بن کعبؓ مدینہ منورہ میں رمضان مبارک میں لوگوں کو بیس رکعات تراویح اور تین رکعات وتر پڑھایا کرتے تھے۔''

۲. عن عطاء قال ادرکت الناس وھم یصلون ثلاثا وعشرین رکعة بالوتر (مصنف ابن ابی شیبہ ۲/۲۹۳) ''حضرت عطاء بن ابی رباحؒ فرماتے ہیں کہ میں نے لوگوں کو بیس رکعات تراویح اور تین وتر پڑھتے پایا ہے۔'' اس روایت میں الناس سے مراد صحابہ کرام اور تابعین ہیں۔

۳۔ ابوحنیفة عن حماد عن ابراھیم أنّ الناس کانوا یصلّون خمس ترویحات فی رمضان (کتاب الاثار لابی یوسف ۴۱) ''ابراہیم نخعی فرماتے ہیں کہ سب لوگ (تابعین وتبع تابعین) رمضان میں بیس رکعات پڑھا کرتے تھے۔''

ان آثار اور تعامل کے علاوہ مزید روایات وآثار کے لئے مصنف ابن ابی شیبہ، قیام اللیل، سنن کبریٰ للبیھقی اور آثار السنن مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ ان کے علاوہ اور بھی بہت سارے صحابہ کرامؓ کے آثار کتب حدیث میں موجود ہیں۔ اسی وجہ سے شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ فرماتے ہیں: قلت والاثار فی الباب اکثر من ان تحصی (اوجز المسالک ۲/۵۳۵) میں کہتا ہوں کہ اس باب میں اتنے آثار ہیں جو گنے نہیں جاسکتے (یعنی بہت زیادہ ہیں)

<u>اجماعی ثبوت:</u> اور اسی پر صحابہ کرامؓ، تابعین اور ائمہ مجتہدین کا اجماع ہے۔ چنانچہ علامہ بدرالدین العینیؒ نے لکھا ہے: والیہ ذھب من التابعین ابن ابی ملیکة، وعطاء وابو البختری والحارث الھمدانی وسعید ابن ابی الحسن ' اخو الحسن البصری وعبد الرحمن بن ابی بکر وغیرھم قالا ابن عبدالبر وھو قول جمھور العلماء وبة قال الکوفیون والشافعی واکثر الفقھاء وھو الصحیح عن ابی بن کعب من غیر خلاف من الصحابة (بحواله معارف السنن ۵/۵۴۲)

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۹) بیس تراویح کی طرف تابعین میں سے ابن ابی ملیکہ، عطاء بن ابی رباح، ابوالبختری، حارث سعید بن ابی الحسن اخوالحسن البصری، عبدالرحمٰن بن ابی بکراور دوسرے حضرات گئے ہیں، علامہ ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں کہ یہ جمہور علماء کاقول ہےاور یہی رائے کوفیوں، امام شافعی اوراکثر فقہا کرام کی ہے، حضرت ابی بن کعبؓ سے یہی صحیح طریقے سے نقل ہے اوراس میں کسی بھی صحابی سے اختلاف مروی نہیں اورعلامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں، أنّ عمر جمع اصحاب رسول اللّٰہ ﷺ فی شهر رمضان علی ابی بن کعب فصلّی بهم کل لیلة عشرین رکعة ولم ینکر علیه احد فیکون اجماعاً منهم علی ذلک. ابن قدامۃ نے المغنی کے ۸۰۲/۱ پرلکھاہے کہ وهذا کالا جماع (بحوالہ معارف السنن ۵۴۳/۵) بیشک حضرت عمرؓ نے آنحضرت ﷺ کے صحابہ کرام کورمضان المبارک کے مہینے میں حضرت ابی بن کعبؓ کی اقتداء میں جمع کیااور آپؓ نے ان کو ہررات بیس رکعات تراویح پڑھایا کرتے تھےاور کسی نے اس پرنکیر نہیں کی، گویااسی پران کااجماع ہوا، علامہ ابن قدامہؒ نے المغنی میں لکھاہے کہ(صحابہ کرام کانکیرنہ کرنا)اجماع کی طرح ہے۔

اسی طرح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ الدسوقی علی الشرح الکبیر کے حوالہ سے لکھتے ہیں: وهی ثلاث وعشرون رکعة بالشفع و الوتر کما کان علیه عمل الصحابة و التابعین وجریٰ علیه العمل سلفاً و خلفاً (اوجز المسالک ۵۳۴/۲)

بیس رکعات تراویح دو رکعات کے ساتھ اورتین رکعات وتر پرصحابہ کرام تابعین کاعمل رہااوراسی پرسلفاوخلفاً عمل ہوتارہاہے۔

اسی طرح ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں: أجمع الصحابة علی أنّ التراویح عشرون رکعة (مرقات ۱۹۴/۳)صحابہ کرام کابیس رکعات پراجماع تھا۔

صاحب اتحاف سادۃ المتقین فرماتے ہیں: وبالاجماع الذی وقع فی زمن عمرؓ اخذ ابوحنیفة والثوری والشافعی واحمد والجمهور واختار ابن عبدالبر (اتحاف سادۃ المتقین ۴۲۴/۳) بیس رکعات تراویح جو حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں اجماعاً ثابت ہے۔اسی کوامام ابوحنیفہؒ ،امام سفیان ثوریؒ ،امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ اور جمہورنے لیاہےاوراسی کوحافظ ابن عبدالبرؒ نے بھی اختیارکیاہے۔

<u>بیس رکعات تراویح پرمذاہب اربعہ کااتفاق:</u> جس طرح صحابہ کرام تابعین اورتبع تابعین کابیس رکعات تراویح پراتفاق تھا۔اسی طرح مذاہب اربعہ میں بھی یہ مسئلہ اتفاقی ہے،کسی بھی مذہب کےامام نےآٹھ تراویح کاقول نہیں کیا۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص۱۷۰)ا۔ امام ترمذیؒ نے جامع ترمذی میں لکھا ہے: واختلف اھل العلم فی قیام رمضان فرای بعضھم ان یصلّی احدی واربعین رکعة مع الوتر وھو قول اھل المدینة والعمل علی ھذا عندھم بالمدینةواکثراھل العلم علی ماروی عن علی وعمر و غیرھما من اصحاب النبیﷺعشرین رکعة وھو قول سفیان الثوری وابن المبارک والشافعی وقال الشافعی وھکذا ادرکت ببلد نا بمکة یصلون عشرین رکعة وقال احمد روی فی ھذا الوان لم ینص فیه بشئی وقال اسحاق بل نختار احدیٰ واربعین رکعة علی ماروی عن ابی بن کعب. (جامع ترمذی ۱/۱۱۲)

رمضان المبارک کے مہینے میں قیام کا مسئلہ اہل علم کے ہاں مختلف فیہ ہے' بعض اہل علم وتر کے ساتھ اکتالیس رکعات کے قائل ہیں اور یہی اہل مدینہ کا قول ہے اور اسی پر ان کا عمل ہے' اور اکثر اہل علم بیس رکعات کے قائل ہیں اور یہ رائے آنحضرتﷺ کے صحابہ کرام مثلاً حضرت علیؓ حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ کے مرویات کے موافق ہے' اور یہی سفیان ثوریؒ عبداللہ بن مبارک اور امام شافعی کا قول ہے۔ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شہر مکہ میں بیس رکعات پڑھتے دیکھا ہے۔ اور امام احمد حنبلؒ کا کہنا ہے کہ تراویح میں مختلف روایات میں (بیس سے لے کر اکتالیس تک) اسی پر کوئی حکم نہیں لگایا۔ اور امام اسحاق فرماتے ہیں۔ کہ ہم اکتالیس رکعات کو اختیار کرتے ہیں' اور یہی حضرت ابی بن کعبؓ کی روایت کے موافق ہے' امام ترمذیؒ کی عبارت پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ صحابہ' تابعین، تبع تابعین کے زمانہ میں کہیں بھی کوئی جماعت یا فرد مشہور آٹھ رکعات تراویح کا قائل نہیں تھا۔ ورنہ امام ترمذیؒ اس کا تذکرہ ضرور کرتے' ان کا ذکر نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان ادوار میں آٹھ رکعات تراویح کا کوئی رواج ہی نہیں تھا۔ اور نہ لوگ آٹھ رکعات تراویح پڑھتے تھے۔

اس لئے علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں: ولم یقل احد من الائمة الاربعة باقل من عشرین رکعة فی التراویح والیه جمھور الصحابة رضوان اللہ عنھم. (العرف الشذی ۱/۱۶۶) ائمہ اربعہ میں سے کسی نے بھی بیس رکعات تراویح سے کم کے متعلق نہیں کہا ہے' اور یہی عمل جمہور صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے۔

جب ان دلائل شرع کی تائید اس روایت کو حاصل ہے تو یہ اس بات کی بالکل واضح دلیل ہے کہ جس روایت کو اعتراض کا نشانہ بنایا گیا ہے وہ اعتراض غلط اور صحیح نہیں ہے بلکہ وہ درست اور قابل استدلال حدیث ہے۔ اس لئے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ فرماتے ہیں: لاشک فی أنّ تحدید التراویح فی عشرین رکعة لم یثبت مرفوعاً عن النبیﷺ بطریق صحیح علی اصول المحدثین وما وردفیه من روایة (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۱) ابن عباس متکلم فیها علی اصولهم لکن مع هذا لایمکن الانکار عن ثبوته بفعل عمر و سکوت الصحابة علی ذلک واجماعهم علی قبوله بمنزلة النص علی ان له اصلاً عندهم
(اوجز المسالک ۲/۵۳۴)

اس میں کوئی شک نہیں کہ بیس رکعات تراویح آنحضرتﷺ سے محدثین کے اصول کے مطابق مرفوعاً صحیح طریقے سے ثابت نہیں اور جو روایت (بیس رکعات) کی عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے' محدثین کے اصول کے مطابق متکلم فیھا ہے۔لیکن اس کے ثبوت سے انکار کرنا حضرت عمرؓ کے فعل اور صحابہ کرامؓ کے سکوت سے ممکن نہیں۔ان کا حضرت عمرؓ کے فعل کو قبول کرنے پر اتفاق کرنا نص کی طرح ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے ہاں اس فعل (بیس رکعات کی تراویح) کے لئے اصل موجود ہے۔اور یہی بات علامہ انور شاہ کشمیریؒ صاحب فتاویٰ تاتارخانیہ کے حوالہ سے نقل کر کے فرماتے ہیں: ففی التاتارخانیة: سأل ابویوسف ابا حنیفة ان اعلان عمر بعشرین رکعة هل کان له عهد منه ﷺ قال ابو حنیفة ماکان عمر مبتدعاً ای لعله یکون له عهد فدل علی ان عشرین رکعة لابدمن ان یکون لها اصل منه ﷺ وان لم یبلغنا بالاسناد القوی . (العرف الشذی ۱/۱۶۶)
تاتارخانیہ میں ہے کہ امام ابو یوسفؒ نے امام ابوحنیفہؒ سے سوال کیا کہ حضرت عمرؓ کے بیس رکعات کے اعلان کے لئے آنحضرتﷺ کے زمانہ میں کوئی اصل ہے۔امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ بدعتی نہیں تھے'اس کا مطلب یہ ہے کہ اس بیس رکعات تراویح کے لئے آنحضرتﷺ کے زمانہ میں اصل موجود ہے اگر چہ وہ ہم تک قوی سند کے ساتھ نہیں پہنچا ہے۔جب یہ بیس رکعات تراویح کا ثبوت آنحضرتﷺ سے بنفس نفیس ثابت ہوا۔جمیع صحابہ کرام' تابعین' تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین سلفاً و خلفاً اسی پر عمل کرتے چلے آرہے ہیں تو اس کے بعد آٹھ رکعات کا قائل ہونا' بیس رکعات کو بدعت اور ناجائز کہنا خرق للاجماع ہے۔ چنانچہ علامہ بنوریؒ لکھتے ہیں وبالجملة :العشرون من التراویح و ثلاث الوتر هوالذی استقر علیه الامر أخیرا کما یقوله الشعرانی فی کشف الغمة والسیوطی فی المصابیح فمن احدث خلافاً بعد هذا الاتفاق یکون خارقاً للاجماع (معارف السنن ۵/۵۴۶)

بیس رکعات تراویح اور تین وتر پر اخیر میں استقرار (دوام) ہوا۔جیسا کہ علامہ شعرانیؒ نے کشف الغمۃ اور علامہ سیوطیؒ نے المصابیح میں لکھا ہے' پس جس کسی نے بھی اس اتفاق کے خلاف کہا تو اس نے اجماع کو پامال کیا۔جب کسی روایت کو صحابہ کرامؓ کے اجماع خلفاء راشدین کا تعامل' تابعین' تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین اور اجماع امت کا تعاون حاصل ہو تو پھر بھی صرف ایک فرد کی وجہ سے اور وہ بھی اس وجہ سے جو حقیقتاً سبب جرح بھی نہیں پورے کو (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۲) ضعیف اور نا قابل احتجاج قرار دینا انصاف نہیں۔

احناف کی بعض کتابوں کے حوالہ جات کا جواب: اور جو حوالہ جات آنجناب نے اپنے مکتوب میں تحریر فرمائے ہیں ان کے بارے میں لکھنے سے قبل یہ بات ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ فقہ حنفی کی کتابوں میں درج شدہ جزئیات میں سے صرف ان جزئیات کا اعتبار کیا جاتا ہے جو فقہاء امت کے ہاں راجح ہوں یا ان کا تعلق ظاہر الروایہ سے ہو‘ اس لئے جو جزئیات ان دونوں میں سے الگ ہوں تو وہ فقہ حنفی شمار نہیں ہوگا۔ اس لئے اگر کسی حنفی عالم نے اس قسم کی کوئی بات لکھی دی ہو وہ اس کا تفرد اور ذاتی رائے شمار ہوتی ہے‘ فقہ حنفی شمار نہیں ہوگی۔ محقق العصر علامہ ابن عابدین شامیؒ نے اپنے منظوم کلام میں لکھا ہے۔

لہٰذا اس اصول کو ذہن نشین کرنے کے بعد جو حوالہ جات آنجناب نے اپنے مکتوب میں پیش کئے ہیں۔ وہ ان حضرات کی یا تو ذاتی رائے ہے اور یا انہوں نے کسی سے روایت نقل کی ہے اور آنجناب نے اس مقام کو سمجھنے کی سعی نہیں فرمائی۔ کہ آیا واقعی یہ اس مصنف کا قول ہے بھی جس کا خط میں حوالہ دیا جا رہا ہے‘ اور یہ قول اس مذہب حنفی میں رہتے ہوئے کہی ہے۔ یا اس نے کسی کا حوالہ یا روایت نقل کی ہے۔

آنجناب نے کتاب الاثار کے حوالہ سے جو عبارت نقل کی ہے اس میں کہیں یہ ذکر نہیں کہ آپ ﷺ نے آٹھ رکعات تراویح پڑھی تھی‘ اور نہ اس میں رمضان کا ذکر ہے‘ اس لئے اس کو تراویح کی تعداد پیش کرنا نامناسب ہے۔ اس روایت کو امام محمدؒ نے باب الصلوۃ تطوعاً میں ذکر کیا ہے۔ اس سے مراد قیام اللیل یعنی تہجد ہے جو رمضان وغیر رمضان دونوں میں جائز اور مستحب ہے۔

ضروری تنبیہ: ۱۔ اگر آنجناب نے اس روایت سے استدلال اس لئے کیا ہے کہ اس میں لفظ کان ذکر ہے اور کان دوام اور استقرار کے معنی میں آتا ہے تو مقصد یہ ہوا کہ یہ اس سے مراد صلوۃ تراویح ہے اور آنحضرت ﷺ رمضان میں بھی آٹھ رکعات پڑھا کرتے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ کان عموماً اور کلیۃ استقرار کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ موقع اور محل کے اعتبار سے اس میں دوام پایا جاتا ہے۔ ہر وقت دوام کے لئے نہیں ورنہ پھر اس روایت کے متصل روایت کہ کان عبداللہ بن عمرؓ یصلی التطوع علی راحلته کا معنی ہوگا کہ عبداللہ بن عمرؓ ہمیشہ نفل سواری کے اوپر پڑھا کرتے تھے۔ حالانکہ آپؓ عموماً ایسا نہیں کرتے تھے بلکہ یہ کیفیت آپؓ کی صرف حالت سفر میں ہوتی تھی کہ آپ سواری کے اوپر نفل پڑھتے تھے‘ اس سے معلوم ہوا کہ کان عموماً دوام کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ اور اس کے اور بھی نظائر موجود ہیں جہاں لفظ کان مضارع پر داخل ہوا مگر وہاں کسی نے دوام کا معنی نہیں لیا۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۳) ۲۔اسی طرح دوسرا جواب یہ ہے کہ آنجناب نے جو عبارت امام محمدؒ کی کتاب المؤطا کے حوالہ سے نقل کیا ہے وہ دراصل حضرت عائشہؓ کی روایت کا حصہ ہے' امام محمدؒ کا اپنا قول نہیں اور حضرت عائشہؓ کی روایت تہجد کی نماز پر محمول ہے۔

۳۔ اسی طرح امام ابن ہمامؒ کے حوالہ سے جوبات مکتوب میں نقل کی گئی ہے تو وہ ابن ہمامؒ کا اپنا اجتہاد اور تفرد ہے' اس کو علماء احناف نے قبول نہیں کیا ہے' اور میں نے پہلے ذکر کیا ہے کہ فقہ حنفی میں مذہب کے حوالہ سے انفرادی رائے قبول نہیں ہوتی۔اور ابن ہمامؒ کے تفردات کے بارے میں ان کے شاگرد علامہ قاسم بن قطلوبغا فرماتے ہیں۔ **تفردات شیخنا لا تقبل** کہ میرے شیخ کے تفردات مقبول نہیں' اس لئے اس کو فقہ حنفی پر لاگو نہیں کیا جاسکتا۔

۴۔ اسی طرح آنجناب نے جو حوالہ عمدۃ القاری کا دیا ہے اس میں کہیں یہ مذکور نہیں کہ یہ احناف کثر اللہ سوادھم یا خود علامہ عینیؒ کی رائے اور فتویٰ ہے' بلکہ علامہ صاحب تو تفصیلی بحث میں آنجناب کے حوالہ کے خلاف فرماتے ہیں **وقیل عشرون وحکاہ الترمذی عن اکثر اهل العلم فانه روی عن عمرو علی وغیرهما من الصحابة وهو اصحابنا الحنیفة** (عمدہ القاری ۱۱/۱۲۶)

تراویح کی تعداد کے بارے میں ایک رائے بیس رکعات کی ہے۔اور اسی کو امام ترمذیؒ نے اکثر اہل العلم سے نقل کیا ہے' اسی طرح حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ سے مروی ہے اور یہی ہمارے احناف کی رائے ہے۔

آنجناب نے کیسے آٹھ رکعات کی نسبت علماء احناف کی طرف کردی۔اور اس کو علامہ عینیؒ کا قول اور رائے قرار دیا گیا۔

۵۔ اسی طرح یہی حال ملا علی قاریؒ کے مرقات کے حوالہ کی ہے' اگرچہ اختلاف فی المسئلہ کے بیان میں انہوں نے آٹھ کا ذکر کیا ہے' لیکن وہاں یہ بھی فرماتے ہیں۔ **لکن اجمع الصحابة علی أن التراویح عشرون رکعة** (مرقات ۳/ ۳۸۲) کہ بیس رکعات تراویح پر تمام صحابہ کرامؓ متفق ہو چکے ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ مکتوب میں درج شدہ حوالہ کی عبارت ملا علی قاریؒ کا فتویٰ یا رائے نہیں۔

۶۔ اسی طرح آنجناب نے علامہ عبدالحیؒ کے التعلیق الممجد کا حوالہ دیا ہے' اس حوالے کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے بناء بر حکایت حدیث ۱۱ رکعات نقل کی ہے لیکن اس سے ہرگز یہ مطلب نہیں کہ یہ علامہ کی رائے ہے بلکہ علامہ صاحب "دونوں طرح کی روایات کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ **اذلاشک فی صحة حدیث عائشة وضعف حدیث ابن عباس لکن الاخذ بالراجح وترک المرجوح إنّما یتعین اذا تعارضاتعارضاًلایمکن الجمع وههنا الجمع ممکن بأن یحمل حدیث عائشة علی انه اخبار عن حالة الغالب کما صرّح به الباجی فی شرح الموطا وغیره ویحمل حدیث ابن عباس علی انه کان ذلک** (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص۱۷۴)احیاناً (التعلیق الممجد علی الموطا للامام محمد ۱/۲۲۱)

حضرت عائشہؓ کی روایت کی صحت اور ابن عباسؓ کی روایت کی ضعف میں کوئی شک نہیں لیکن راجح کو لینے اور مرجوع کو ترک کرنے کا سوال تب پیدا ہوگا جب دونوں میں ایسا تعارض ہو کہ دونوں کا جمع کرنا ممکن ہی نہ ہو اور یہاں جمع کرنا ممکن ہے وہ اس طرح کہ حضرت عائشہؓ کی روایت غالب احوال کے متعلق ہے جیسا کہ علامہ باجیؒ نے موطا کی شرح وغیرہ میں لکھا ہے اور حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت أحیاناً کے متعلق ہے۔

بلکہ علامہ صاحب اپنی دوسری تصنیف میں فرماتے ہیں: قلت اکتفاء النبیﷺ علی ثمان رکعات فی التهجد، لو ثبت انه لم یزد علیه شیئاً فی وقت ما، لیس من قبیل التحدید الالتزامی، بحیث لایجوز الزیادة علیه فکیف وقد قال النبیﷺ الصلاة خیر موضوع فمن شاء فلیقلل ومن شاء فلیستکثر فلما جازت الزیادة و واظب علی الزیادة الخلفاء کانت سنة بالنسبة الینا لا مرلزوم سنتهم

(تحفة الاخبار باحیاء سنة سید الابرار . ص ۱۲۷)

میں کہتا ہوں کہ آنحضرتﷺ کا آٹھ رکعات پر اکتفاء کرنا تہجد میں تھا، البتہ اگر ثابت ہو جائے کہ آنحضرتﷺ نے (رمضان میں) آٹھ رکعات پر کسی بھی وقت زیادتی نہیں کی تو یہ تحدید التزامی نہیں جس پر زیادتی جائز نہ ہو اور یہ عدم جواز کیسے ہو سکتا ہے کہ آنحضرتﷺ نے تو فرمایا ہے کہ نماز بہترین عمل ہے، جو چاہیے اس میں کمی کرے اور جو چاہیے زیادہ پڑھے۔ جب نماز کی تعداد رکعات میں زیادتی جائز ہے اور خلفاء راشدین نے (رمضان میں اس پر زیادتی کرتے بیس رکعات) پر مواظبت کی تو ہمارے لئے خلفاء راشدین کی تعداد سنت ہے۔ اس لئے کہ ان کی سنت پر عمل کرنے کے لزوم کا حکم ہو چکا ہے۔

اور حدیث ابن عباس پر بحث کرتے ہوئے خود علامہ صاحبؒ فرماتے ہیں۔

لایقال هذا حدیث غیر مقبول کما صرّح به ائمة الفن علی ماسبق ذکره لانا نقول لم یصرّح احد منهم بانّه موضوع بد غایة ماقیل أنّه حدیث منکر والمنکر لیس من اقسام الموضوع بل هو من اقسام الضعیف ولیس کل ضعیف ولا کل منکر کالموضوع الذی لایحل نقله والتایید به

(تحفة الاخبار باحیاء سنة سید الابرار ص ۱۲۷)

اور نہ یہ کہا جائے کہ یہ حدیث مقبول نہیں جیسا کہ ائمہ الفن نے تصریح کی ہے جس کی تفصیل پہلے ذکر ہو چکی ہے۔ اس لئے کہ ہم کہتے ہیں کہ ان ائمہ میں سے کسی نے بھی اس روایت کو موضوع نہیں کہا ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ انہوں نے اس روایت کو منکر قرار دیا ہے۔ اور منکر موضوع کے اقسام میں سے نہیں بلکہ منکر ضعیف کے اقسام میں سے ہے اور نہ ہر ضعیف موضوع کے مانند ہے اور نہ ہر منکر جن کا نقل اور ان سے تائید حاصل کرنا جائز نہیں ہو۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۵) علامہ صاحب کے مذکورہ بالا عبارات اور تصریحات سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ علامہ صاحب نہ خود آٹھ رکعات تراویح کے قائل ہے اور نہ وہ آٹھ رکعات احناف کا مذہب قرار دیتے ہیں۔ بلکہ ہدایہ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ آٹھ رکعات پڑھنے والا سنت موکدہ کا تارک ہے (حاشیہ ھدایہ ۱/۱۰۱)

۷۔ اسی طرح یہی حال آنجناب کے العرف الشذی کے حوالہ کا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اگرچہ آٹھ رکعات کا ذکر العرف الشذی میں کیا ہے مگر اس میں یہ کہیں نہیں کہ یہ حضرت شاہ صاحبؒ کی ذاتی رائے یا انہوں نے اس کو احناف کی طرف منسوب کیا ہے۔ بلکہ انہوں نے تو آٹھ رکعات پر اکتفا کرنے والوں کو سخت الفاظ سے یاد فرمایا ہے' چنانچہ فرماتے ہیں: **واما من اکتفی بالرکعات الثمانیة وشذ عن السواد الاعظم وجعل ترمیهم بالبدعة فلیر عاقبته** (فیض الباری ۴/۱۸۱)

کہ جو آٹھ رکعات پر اکتفا کرتا ہے تو گویا اس نے سواد اعظم سے علیحدگی اختیار کی اور جو ان کو (بیس رکعات تراویح کے قائلین) کو بدعتی کہتے ہیں وہ اپنی عاقبت (انجام) کو دیکھ لے۔

علی ھذا القیاس یہی حال ان حوالجات کا بھی ہے جو آنجناب نے مکتوب میں احناف کا مذہب ظاہر کرتے ہوئے تحریر فرمائی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی نہ ذاتی طور پر اور مذہباً آٹھ رکعات تراویح کا قائل ہے اور اگر بالفرض کوئی ہو بھی تو وہ اس کی ذاتی انفرادی رائے ہوگی۔ مذہب کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں' ان کی ذاتی رائے کو ہم جمہور کی رائے اور ترجیح کے مقابل بلاضرورت نہیں قبول کر سکتے' ان وضاحتوں کے باوجود یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ کتاب میں کسی عبارت کو نقل کرنے اور اپنے مذہب کے خلاف قول کی حکایت کرنے سے یہ ہرگز لازم نہیں کہ یہ رائے ناقل کی ذاتی یا اس کے مسلک کا مفتی بہ قول ہے۔ ورنہ اگر کسی قول کا نقل کرنا ناقل کی ذاتی رائے یا مذہب تصور کیا جانا صحیح ہو پھر تو غیر مقلدین حضرات کی کتابوں میں اس قسم کے اقوال وآراء بہت سارے ہیں جو ان کی رائے کے خلاف ہیں وعلی القیاس۔

اس لئے یہ واضح ہو کہ آٹھ رکعات تراویح نہ صحابہ کرامؓ کا مذہب رہا ہے اور نہ اسلاف واخلاف کا اور نہ مذاہب اربعہ میں سے کوئی آٹھ رکعات کا قائل ہے۔ بلکہ یہ آٹھ رکعات تہجد کی نماز ہے جو آنحضرت ﷺ رمضان اور غیر رمضان دونوں میں پڑھا کرتے تھے اگر اس کو تراویح قرار دیا ہے تو تراویح تو صرف رمضان میں ہوا کرتی ہے' غیر رمضان میں نہیں ہوتی جبکہ حضرت عائشہؓ کی روایت میں رمضان اور غیر رمضان دونوں میں آٹھ رکعات کا ذکر ہے۔

حضرت عائشہؓ کی یہی تصریح واضح کرتی ہے کہ اس روایت کا تعلق قیام اللیل (تہجد) کے ساتھ ہے۔ اور تراویح الگ نماز ہے جس کی تعداد آنحضرت ﷺ کے عمل مبارک سے جو بروایت عبداللہ بن عباس ذکر ہوا اور خلفاء راشدین اور صحابہ کرام' تابعین کے تعامل سے بیس رکعات ثابت ہے۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

البتہ ترجیح کے لحاظ سے امام صاحب اور صاحبین کا اختلاف ہے۔امام اعظم رحمۃ اللہ عنہ فرماتے ہیں۔دن کی طرح رات کو بھی چار چار نفل پڑھنا اولیٰ ہے۔جبکہ صاحبین رحمہا اللہ فرماتے ہیں کہ رات کو دو دو نفل پڑھنا اولیٰ ہے۔

ثم یصلی ثلاثا نسائی شریف کی روایت میں بھی آتا ہے **ویوتر بثلاث** (۱)۔ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے تین رکعات وتر پڑھنے کے جواز پر اجماع نقل کیا ہے(۲) البتہ ایک رکعت کے جواز میں اختلاف ہے۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ اسے جائز نہیں سمجھتے اور دیگر ائمہ اسے جائز سمجھتے ہیں۔حضرت حسن بصریؒ کو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ تو ایک رکعت الگ پڑھتے ہیں تو فرمایا کہ ان کے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے بڑے عالم تھے اور وہ وتر کی تین رکعتیں ایک سلام سے پڑھتے تھے۔بلکہ اس سلسلے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت امام ابوداؤدؒ نے روایت کی ہے جس میں تصریح ہے کہ آپ تہجد کو کم یا زیادہ پڑھتے تھے۔لیکن وتر کو ہمیشہ تین پڑھتے تھے(۳)۔

<u>انبیاء کی نیند:</u> **اتنام الخ** حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے استفسار کا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو آپ ﷺ دیگر لوگوں کو وتر کا امر دیتے ہیں۔جو کہ وجوب کی دلیل ہے لیکن دوسری طرف خود وتر پڑھے بغیر سو جاتے ہیں۔اس کی کیا وجہ ہے۔**ان عینی تنامان ولا ینام قلبی** آپ ﷺ نے جو جواب دیا۔اس کا

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۶) آخر میں اللہ جل شانہ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق بات سمجھنے، حق بولنے اور حق پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہم سب کو تعصب، عناد اور زیغ وضلال سے محفوظ و مامون رکھے۔(آمین) اس کے علاوہ الفاظ، تعبیر اور تحریر کی غلطی کا معذرت خواں ہوں۔ وھو الموفق

(مفتی) ابوطلحہ مختار اللہ حقانی

خادم دار الافتاء واستاذ رئیس بجامعہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

۲/ رمضان المبارک ۱۴۲۵ھ

(۱) نسائی ج ا ص ۲۴۹

(۲) جمع الوسائل ج ۲ ص ۹۲

(۳) قالت (عائشہ رضی اللہ عنہا) کان یوتر باربع وثلاث. وست وثلاث وثمان وثلاث و عشر وثلاث.ابوداود ج ا ص ۱۹۳ .(مختار)

حاصل یہ ہے کہ میری نیند غفلت کی نیند نہیں ہوتی بلکہ میرا دل جاگ رہا ہوتا ہے۔اس بنا پر میری نسبت سے وتر کے قضاء ہونے کا احتمال نہیں ہے۔ بلکہ وتر کے وقت کا ادراک ہو جاتا ہےاور یہ بات تمام انبیاء کا خاصہ ہے کہ ان کے دل نیند کی حالت میں بھی بیدار ہوتے ہیں تا کہ وحی اور عبادات سے غفلت نہ رہے۔

باقی لیلة التعریس کی رات جو غفلت نبی کریمﷺ پر طاری ہوئی اور صبح کی نماز جاتی رہی اس کے حق میں بعض شراح تو یہ کہتے ہیں کہ طلوع فجر کا تعلق ادراک بالبصر سے ہےاور آنکھوں کے بارے میں تو آپﷺ خود فرماتے ہیں کہ وہ سوتی رہتی ہیں جبکہ بعض شراح کے خیال میں وہ خود اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی۔تا کہ امت کو تعلیم دی جائے کہ نماز کی قضاء کیسے ہو۔اگر وہ غلبہ نوم نہ ہوتا تو قضاء کے متعدد احکام ہمیں کیسے پہنچتے۔ بہر حال ان حکمتوں کی وجہ سے آپﷺ پر گاہے گاہے نیند کا غلبہ ہوا کرتا تھا۔تو گویا نیند کی حالت میں کبھی کبھی آنکھ کی طرح آپ کا قلب بھی سو جاتا تھا۔

(۱۱) حدّثنا إسحاق بن موسیٰ ثنا معن ثنا مالک عن ابن شهاب عن عروة عن عائشة أنّ رسول اللهﷺ کان یصلّی من اللیل احدی عشرة رکعة یوتر منها بواحدة فاذا فرغ منها اضطجع علی شقه الأیمن.

(۱۲) حدّثنا ابن أبی عمران معن عن مالک عن ابن شهاب نحوه وثنا قتیبة عن مالک عن ابن شهاب نحوه(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ رات کو گیارہ رکعات نماز پڑھتے تھے ایک رکعت سے وہ نماز کو وتر بنا لیتے تھے پھر جب وہ ان سے فارغ ہو جاتے تھے تو دائیں کروٹ پر لیٹ جاتے تھے۔

---

(۱)صحیح مسلم ۱/۲۵۳ کتاب صلوٰة المسافرین وقصرهاباب صلوٰة اللیل وعدد رکعات النبیﷺ فی اللیل، سنن ابی داؤد ۱/۱۹۵ کتاب صلوٰة المسافرین باب صلوٰة اللیل، سنن النسائی ۱/۱۹۴ کتاب قیام اللیل تطوع النهارباب کیف الوتر باحدی عشرة رکعة ۱۲ .(مختار)

<u>ایک رکعت نماز نہیں:</u> یوتر منھا بواحدۃ جولوگ ایک رکعت وتر کے قائل ہیں۔ وہ اس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ ایک رکعت وتر پڑھ کر رکعتوں کو طاق بنا دیتے تھے لیکن ہم جواب میں کہتے ہیں کہ اس قول کا یہ معنی نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ تم نے اگر آٹھ رکعتیں پڑھی ہیں۔ اور آخر میں تین رکعتیں پڑھ لیں۔ تو وتر تو ایک رکعت سے ہوئی باقی تو سب رکعتوں کے شفعات یعنی جوڑے ہیں۔ تو مطلب یہ ہوا کہ آخر میں طاق نماز تین رکعات کی پڑھتے اور اس میں ایک رکعت ہی طاق بننے کا سبب بنتی۔ اور اگر اس حدیث کی یہ تاویل نہ بھی کریں تو بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ حدیث معمول بہ نہیں بن سکتی کیونکہ نبی کریم ﷺ نے صراحت کے ساتھ ایک رکعت سے منع فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے فرماتے ہیں۔

أنّ النبی ﷺ نھیٰ عن البتیراء(۱) نبی کریم ﷺ نے ایک رکعت کی نماز سے منع فرمایا۔

اس طرح حضرت حسن بصریؒ نے صحابہ کرام کا اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ ایک رکعت نماز نہیں اور ناجائز ہے۔ بہرحال اس بات پر مستقل دلائل موجود ہیں کہ ایک رکعت نماز نہیں اور یہ کہ وتر تین رکعات ہیں۔

(۱۳) حدّثنا ھنّادثنا ابوالأحوص عن الأعمش عن إبراھیم عن الأسود عن عائشۃ قالت کان رسول اللہ ﷺ یصلّی من اللیل تسع رکعات.

(۱۴) حدّثنا محمود بن غیلان ثنا یحیی بن ادم ثنا سفیٰن الثوری عن الاعمش نحوہ(۲).

---

(۱)قال علی القاریؒ وقیل کون الوتر واحدۃ منسوخ للنھی عن البتیراء ۱۲ جمع الوسائل ج۲ ص۹۲

(۲)جامع ترمذی ۱/۱۰۳ کتاب الصلوٰۃ ،سنن النسائی ۱/۱۹۳ کتاب قیام اللیل وتطوع النھار باب کیف الوتر بتسعٍ ، سنن ابن ماجۃ ص۹۸ کتاب اقامۃ الصلوٰۃ والسنۃ فیھا باب ماجاء فی کم یصلّی باللیل، سنن ابی داؤد باب صلوٰۃ اللیل ۱/۱۹۸ ، السنن الکبریٰ ۲/۴۷۱،۴۷۲

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ رات کو نو رکعات نماز پڑھتے تھے۔

یصلّی من اللیل تسع رکعات الخ اس کا یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ آپﷺ عشاء کی نماز پڑھتے جس کی تعداد نو رکعات بنتی ہے۔ لیکن راجح معنی یہ ہے کہ چھ رکعات تہجد کی پڑھتے اور تین وتر کی۔ بہر حال تہجد بھی مختلف اوقات میں مختلف تعداد میں آپ نے پڑھی ہے(۱)۔

نحوہ اسی سابقہ حدیث کو دوسری سند کے ساتھ لائے ہیں۔

(۱۵) حدّثنا محمّد بن المثنیٰ ثنا محمّد بن جعفر ثنا شعبة عن عمروبن مرّة عن أبی حمزة رجل من الأنصار عن رجل من بنی عبس عن حذیفة بن الیمان أنّه صلّی مع رسول اللهﷺ من اللیل قال فلمّا دخل فی الصلٰوة قال اللّٰه اکبر ذوالملکوت والجبروت والکبریاء والعظمة قال ثمّ قرأ البقرة ثمّ رکع فکان رکوعه نحوا من قیامه وکان یقول سبحان ربی العظیم سبحان ربی العظیم ثمّ رفع راسه وکان قیامه نحوا من رکوعه وکان یقول لربی الحمدلربی الحمدثمّ سجد فکان سجوده نحوامن قیامه وکان یقول سبحان ربی الأعلیٰ سبحان ربی الأعلیٰ ثمّ رفع راسه فکان مابین السجدتین نحوامن السجود وکان یقول ربّ اغفرلی ربّ اغفرلی حتیّ قرأ البقرة وال عمران والنساء والمائدة او الأنعام شعبة الذی شکّ فی المائدة والأنعام قال

(۱) جیسا کہ حضرت ابوداؤدؒ نے خود حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے۔وقدمر ماآنفا(اصلاح الدین) اور علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے والحاصل انّ فی روایة ثلاث عشرة وفی روایة احدیٰ عشره وفی روایة سبعاً ولعل اختلاف الروایات بحسب اختلاف الاوقات والحالات من صحة ومرض وقوّة وضعف ولذلک قال الشیخ ابن حجرؒ الصواب حمله علی اوقات متعددة واحوال مختلفة فکان تارة یصلّی کذاوتارة یصلّی کذالذلک اولتنبیه علی سعة الامرفی ذلک(المواهب اللدنیة ۱۷۹)(مختار)

أبـوعيسـىٰ وأبـوحـمـزة اسمه طلحة بن زيد وأبوجمرة الضبعیؒ أسمه نصر بن عمران(۱).

ترجمہ: حضرت حذیفہ بن الیمان کہتے ہیں کہ انہوں نے ایک رات نبی کریمﷺ کے ساتھ نماز پڑھی۔ حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ جب آپﷺ نے نماز شروع کی تو فرمایا''اللّٰـه اکبر ذوالملکوت والجبروت والکبریاء والعظمۃ(اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے۔ بڑی بادشاہی والی ذات ہے۔ بڑے غلبہ والی ذات ہے اور بڑی بزرگی اور عظمت والی ذات ہے)'' پھر(سورۃ فاتحہ کے بعد) سورۃ بقرہ کی قرآت فرمائی پھر رکوع فرمایا تو آپﷺ کا رکوع آپﷺ کے قیام کے برابر تھا۔ آپ اس میں''سبحان ربی العظیم'' پڑھتے رہے پھر سر اٹھایا تو آپ کا قومہ بھی رکوع جیسا تھا۔ اس میں آپ''لـربـی الحمد'' کہتے رہے۔ پھر سجدہ کیا تو وہ بھی آپ کے قومہ جتنا تھا۔ آپ اس میں''سبحـان ربـی الاعلیٰ'' دہراتے رہے پھر سجدے سے سر اٹھا کر بیٹھے تو آپ کا جلسہ سجدے جتنا تھا۔ آپ اسمیں''رب اغـفـرلـی'' بار بار پڑھتے رہے۔ حتیٰ کہ آپ نے اپنی اس نماز میں سورۃ البقرہ، سورۃ آل عمران، سورۃ النساء اور سورۃ مائدہ یا انعام میں سے ایک سورۃ پڑھی۔ اخیر کی دو سورتوں میں شک کرنے والے شعبہؒ ہیں۔

تسبیح وتحمید: فـلـمـادخـل فـی الـصلوٰۃ قال اللّٰہ اکبر علامہ مناویؒ کہتے ہیں کہ دخل یہاں پر ارادالـدخـول کے معنی پر ہے۔ اور تکبیر سے تکبیر تحریمہ ہی مراد ہے جبکہ ملا علی قاریؒ نے کہا ہے کہ بظاہر تکبیر تحریمہ کے بعد بطور ذکر پھر سے تکبیر ذکر کرنا مراد ہے۔ ذوالملکوت والجبروت دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں۔ پہلا ملک میں اور دوسرا جبر میں مبالغہ ہے یعنی بڑے ملک بادشاہی والا اور بڑے غلبہ اور قہر و جبر والا ہے

(۱)سـنن ابی داؤد ۱/۱۳۳ کتاب الصلوٰۃ باب مایقول الرجل فی رکوعه وسجوده، مصنف ابـی شیبة ۱/۲۲٦ کتـاب الـصـلوٰۃ سنن دارمی ص۳۰۳، المستدرک للحاکم ۱/۲۷۱ کتاب الصلوٰۃ(مختار)

جبکہ کبریاء تکبر و ترفع کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں پر چونکہ آپ نوافل پڑھ رہے تھے۔ اس لئے فرائض میں جو معہود تسبیح ہے۔ اس کے بغیر تسبیح کے دیگر الفاظ سے تسبیح ادا فرمائی۔ حتی قرأ البقرہ یعنی سورۃ فاتحہ پڑھ کر سورۃ بقرہ بھی تمام پڑھ لی۔ ابوداؤد کی روایت میں سورۃ فاتحہ کی قرأۃ کی تصریح موجود ہے۔ ویسے ظہور کی وجہ سے راوی نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ سورۃ بقرہ کی طرح دیگر رکعتوں میں اگلی طویل سورتیں پڑھ لیں۔

فکان رکوعه نحوا من قیامه الخ رکوع کا قیام جتنا ہونا یا تو اپنے ظاہری معنی پر محمول ہے یعنی اتنا لمبا رکوع کیا جتنا سورۃ بقرہ پڑھنا۔ اور یا مطلب یہ ہے کہ جس طرح قرأت معمول سے زیادہ طویل تھی یونہی رکوع بھی معمول کی رکوع سے طویل تھی۔ عام رکوع سے لمبا تھا۔

او الانعام الخ یعنی چوتھی سورۃ میں شک ہے کہ سورۃ مائدہ پڑھی ہے یا انعام۔ لیکن مسلم کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک رکعت میں پہلی تین سورتیں اور دوسری میں وہی تین پڑھ لی ہیں۔ بہرحال ممکن ہے کہ یہ اختلاف تعدد مواقع پر مبنی ہو۔ ایک موقع پر ان سورتوں کو دو رکعتوں میں اور دوسرے موقع پر چار رکعتوں میں پڑھ چکے ہوں۔ لیکن عبادت کا یہ انداز سید الکونین ﷺ کی شایان شان ہی ہوسکتی ہے۔

قال ابو عیسیٰ ابو حمزة الخ امام ترمذی رحمۃ اللہ یہاں ایک راوی کے نام کے بارے میں تبصرہ کررہے ہیں۔ مذکورہ حدیث میں جس راوی کو حمزہ (حاء کے ساتھ) ذکر کیا گیا ہے اس کا نام طلحہ بن زید بتایا ہے لیکن نسائیؒ نے طلحہ بن یزید کہا ہے اور یہی راجح معلوم ہوتا ہے علامہ ابن حجرؒ نے بھی طلحہ بن یزید لکھا ہے(۱)۔ جبکہ دوسرا راوی جس کا ذکر امام ترمذی کررہے ہیں۔ وہ ابو جمرہ (جیم کے ساتھ) ہیں۔ ان کا نام نصر بن عمران ہے(۲)۔ یہ ضبعی ہیں۔ چونکہ جیم اور حاء کے نقطوں پر کبھی کبھی دھیان نہیں رہتا۔ لہٰذا عموماً التباس کا اندیشہ رہتا ہے اور کبھی کبھی ناسخین کی غفلت سے نقطے ادھر ادھر ہوجاتے ہیں۔ اس لئے امام ترمذیؒ نے احتیاطاً دونوں کے نام ذکر کرکے بتادیا ہے کہ یہاں راوی ابو حمزہ حاء کے ساتھ پڑھا جائے جیم

---

(۱) طلحة بن یزید الایلی ابوحمزة مولیٰ الانصار نزل الکوفة وثقه النسائی من الثالثة ۱۲ تقریب التهذیب ج ۱ ص ۳۸۰.(مختار)

(۲) نصر بن عمران بن عصام الضبعی ابو جمرة بالجیم البصری نزیل خراسان مشهور بکنیته. ثقة ثبت من الثالثة مات سنته ثمان وعشرین. ۱۲ تقریب التهذیب ج ۲ ص ۳۰۰.(مختار)

کے ساتھ نہ پڑھا جائے۔ بعض نسخوں میں غلطی سے ابو جمرۃ کو ابو حمزہ لکھا گیا ہے۔ فلیتنبہ

پوری رات نماز میں آیت کی تلاوت:

(۱٦) حدّثنا ابوبکر محمّد بن نافع البصریّ ثنا عبدالصمد ابن عبدالوارث عن إسماعیل بن مسلم العبدی عن أبی المتوکل عن عائشةؓ قالت قام رسول اللهﷺ بایة من القرآن لیلة(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ فرماتی ہیں کہ نبی کریمﷺ ایک رات کو تہجد میں صرف ایک آیت نماز میں بار بار دہرا کر کھڑے رہے۔

قام بآیة من القرآن لیلة لیلۃ سے تمام رات مراد ہے یعنی ساری رات ایک ہی آیت پڑھ کر قیام کیا۔ ابن حجرؒ نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ ساری رات ایک ہی رکعت میں قیام کرکے پڑھتے رہے۔ دوسری رکعت نہیں کی لیکن ملا علی قاریؒ نے اس پر رد کیا ہے کہ ایک رکعت نماز ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ ساری رات ایک ہی آیت کو اہتمام کے ساتھ نماز کے ارکان میں پڑھتے رہے(۲) جیسا کہ ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس کی تصریح ہے کہ نبی کریمﷺ ایک رات نماز پڑھنے کھڑے ہوگئے۔ ساری رات صبح تک ایک ہی آیت کو پڑھتے رہے۔ قیام میں بھی، رکوع میں بھی اور سجدے میں بھی یہی آیت پڑھتے رہے۔ لوگوں نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ وہ کونسی آیت تھی تو انہوں نے کہا کہ وہ آیت یہ تھی جو آپ تمام ارکان میں پڑھتے رہے(۳)۔

---

(۱)جامع ترمذی ۱/۱۰۰، ۱۰۱ کتاب الصلوٰة باب ماجاء فی قرأة اللیل، سنن ابن ماجة ص۹٦، ۹۷ کتاب الصلوٰة، مصنف ابن أبی شیبة ۲/۴۷۷ کتاب الصلوٰة.(مختار)

(۲)ولعل ذالک کان قبل النهی عن القراءة فی الرکوع والسجود فلا ینافیه خبر مسلمؒ نهیت ان اقرء القرآن راکعا وساجدا علی أنّ النهی للتنزیه فیکون فعله لبیان الجواز . کذاقال البیجوریؒ ومثله عندعلی القاریؒ(اصلاح الدین).

(۳)علامہ بیجوریؒ نے اس روایت سے ایک مسئلہ کا استنباط کیا ہے ویؤخذ منه جواز تکرار الآیة فی الصلوٰة(المواهب اللدنیة ۱۸۱)(مختار)

قدرت کاملہ اور صفت رحمۃ کا استحضار: ان تعذبهم فإنهم عبادک و ان تغفرلهم فإنک أنت العزیز الحکیم(مائدة ۱۱۸) اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تمہارے بندے ہیں اور اگر تو ان کو معاف کر دے تو تو ہی زبردست حکمت والا ہے۔

گویا آپ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا استحضار کرتے کہ اگر تمام بندوں کو جہنم میں ڈال دیا تب بھی کوئی پوچھنے والا نہیں اور اگر سب کو بخش دیا تب بھی وہ ہی بخشنے والا ہے۔ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی صفت مغفرت سے زیادہ دلچسپی تھی۔ ہر طرح سے اپنی امت کو بخشوانے کی کوشش کرتے۔ زیادہ حرص کی بناء پر اس کیلئے آپ اکثر روتے رہتے۔ ایک دوسرے موقع پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے تلاوت کروائی تو سورۃ النساء کی اس آیت کو سن کر رو پڑے اور فرط رحمت سے تاب نہ لا کر ابن مسعودؓ کو چپ کرایا(۱)

فكيف اذا جئنا من كل امةٍ بشهيدٍ وجئنا بک علی هؤلاء شهيداً(نساء ۴۱) جب ہر ہر امت میں سے ایک ایک گواہ کو حاضر کریں گے اور آپ کو ان لوگوں پر گواہی دینے کیلئے حاضر لائیں گے۔

(۱۷) حدثنا محمود بن غيلان ثنا سليمان بن حرب ثنا شعبة عن الأعمش عن أبی وائل عن عبدالله قال صليت ليلة مع رسول اللهﷺ فلم يزل قائما حتى هممت بامر سوء قيل له وما هممت به قال هممت ان اقعد وادع النبیﷺ.

(۱۸) حدثنا سفيان بن وكيع ثنا جرير عن الاعمش نحوه (۲).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک رات میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی۔ آپ لمبے وقت تک کھڑے رہے حتیٰ کہ میں نے ایک برے کام کا ارادہ کیا۔ کسی نے پوچھا وہ کونسا برا کام تھا جس کا تم نے ارادہ کیا۔ تو بولے کہ میں نے ارادہ کیا کہ میں بیٹھ جاؤں اور نبی کریم ﷺ کو تنہا چھوڑ دوں۔

---

(۱)شمائل باب ماجاء فی بکاء النبیﷺ.

(۲)صحیح بخاری باب طول الصلوٰة فی قیام اللیل ۱/۱۵۲ کتاب التهجد، صحیح مسلم ۱/۲۶۴ کتاب صلوٰة المسافرین وقصرها باب استحباب تطویل القرأة فی صلوٰة اللیل، مسند احمد ۱/۳۸۵(مختار)

قالت هممت ان اقعدوادع الخ اسکے تین مطلب ہوسکتے ہیں۔اول یہ کہ نبی کریم ﷺ کوچھوڑکرنماز ہی توڑدوں اور چلاجاؤں۔اس کی برائی تو واضح ہے۔لیکن یہ احتمال شراح کےنزدیک ضعیف ہے کیونکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہے اسے علم ہے کہ یہ کام انتہائی برا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں لاتبطلوا اعمالکم.

دوم یہ کہ نبی کریم ﷺ کی اقتداء تو بحال رہے لیکن اسے کھڑا چھوڑکر خود بیٹھ کر ان کی اقتداء کروں یہ کام برا اس لئے ہے کہ اس میں سوءادب ہے۔اگر چہ فی نفسہ نفل میں ایسا کرنا جائز ہے۔سوم یہ کہ یہ ارادہ کیا کہ جس شفع میں اقتداء کیا ہے۔اسے پورا کرنے کے بعد دوسرے شفع میں نیت ہی نہ باندھوں۔اور نبی کریم ﷺ کوچھوڑدوں وہ خود ہی نماز پڑھیں۔یا میں الگ نماز کی نیت باندھوں اور مختصر نوافل پڑھوں۔اور آپ ﷺ کوچھوڑوں۔اپنی نماز پڑھتے رہیں یہ بھی اگر چہ جائز ہے لیکن نبی کریم ﷺ کی مفارقت کی وجہ سے بری بات ہے۔بالخصوص ابن مسعود رضی اللہ عنہ کےنزدیک اس کی برائی واضح ہے۔

<u>بوجہ ضعف بیٹھ کرنماز:</u>

(۱۹) حدّثنا إسحاق بن موسیٰ الأنصاری ثنا معن ثنا مالک عن أبی النضر عن أبی سلمة عن عائشة أنّ النبیّ ﷺ کان یصلّی جالسا فیقرأ و هو جالس فاذابقی من قراء ته قدرمایکون ثلثین اوأربعین آیة قام فقرأ وهوقائم ثمّ رکع وسجدثمّ صنع فی الرکعة الثانیة مثل ذلک(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ بیٹھ کرنماز پڑھتے تھے اور بیٹھ کر ہی قرأت فرماتے تھے۔اور جب مقروءہ سورۃ کی تیس چالیس

(۱)صحیح بخاری ۱/ ۱۵۰ کتاب تقصیر الصلوٰة باب إذاصلّی قاعداً الخ، صحیح مسلم ۱/ ۲۵۲ کتاب صلوٰة المسافرین وقصرها باب جواز النافلة قائماً الخ، سنن ابی داؤد کتاب الصلوٰة باب فی صلوٰة القاعد والامام جامع ترمذی ۱/ ۸۵ کتاب الصلوٰة باب فی من یتطوع جالساً، سنن النسائی ۱/ ۱۸۷ کتاب قیام اللیل تطوع النهار باب کیف یعمل اذاافتح الصلوٰة قائماً.(مختار)

آیات رہ جاتی تھیں تو کھڑے ہو کر تلاوت فرمانے لگتے۔ پھر (وہیں سے) رکوع میں اور پھر سجدے میں چلے جاتے تھے۔ پھر دوسری رکعت میں بھی ایسا ہی کرتے تھے۔

کان یصلّی جالساً الخ بخاریؒ اور مسلمؒ کی روایت میں حضرت عائشہؓ سے یہ تصریح منقول ہے۔ کہ یہ وہ زمانہ تھا جب نبی کریم ﷺ کی عمر مبارک کا بیشتر حصہ گزر چکا تھا۔ اور بڑھاپے، کمزوری، ضعف و بیماری وغیرہ کے عوارض لاحق تھے۔ قدر مایکون ثلاثین الخ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی آپ ﷺ سورہ بقرہ وغیرہ کی لمبی سورتیں پڑھتے جس کا بڑا حصہ بیٹھ کر پڑھ لیتے تھے۔

<u>ایک ہی نماز قائماً و قاعداً پڑھنے کا مسئلہ:</u> رکع وسجد الخ اس کا مقصد یہ ہے کہ رکوع اور سجدے کی نوبت آتی تو قیام کی حالت سے رکوع اور سجدے کی طرف انتقال فرماتے کیونکہ رکوع اور سجدہ تو قائماً ہو سکتے تھے۔ اس حدیث سے نفل نماز کے بارے میں ائمہ اربعہ کا یہ مسلک ثابت ہوتا ہے کہ بعض رکعات کھڑے اور بعض بیٹھ کر ادا کی جائیں تو یہ جائز ہے۔ یا ایک رکعت کا بعض حصہ کھڑے ہو کر اور بعض حصہ بیٹھ کر ادا کیا جائے یا پہلے بیٹھ کر ادا کیا جائے پھر کھڑا ہو جائے۔ یہ تمام صورتیں جائز ہیں۔ بعض مالکیہ نے اس صورت کو ناجائز کہا ہے کہ کھڑے ہو کر نفل کی نیت کی جائے پھر بیٹھا جائے۔

اس طرح بعض حنفیہ اور بعض مالکیہ نے کہا ہے کہ نفل نماز کی ابتداء قیام کی حالت میں کی تو قیام ہی سے رکوع و سجدہ کیا جائے گا۔ اور قعود کی حالت میں کی تو قعود ہی سے رکوع اور سجدہ ادا کیا جائے گا۔ دوسری صورت جائز نہیں جس طرح کہ اگلے حدیث میں آتا ہے۔ لیکن زیر نظر حدیث سے اس مذہب پر رد ہوتا ہے کیونکہ اس میں ابتداء بیٹھ کر کرنے کے بعد بھی رکوع و سجدہ قیام کی حالت سے مروی ہے۔ بہر حال نوافل میں اس قسم کی باتوں کا توسع ہے لیکن فرائض میں بغیر مجبوری کے بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں ہے۔

(۲۰) حدّثنا أحمد بن منيع ثنا هشيم أناخالدالحذاء عن عبدالله بن شقيق قال سالت عائشة عن صلوة رسول الله ﷺ عن تطوّعه فقالت كان يصلّى ليلًا طويلًا قائماً وليلاً طويلاً قاعداً فاذاقرأ وهوقائم ركع

وسجدوھوقائم واذا قرأ وھو جالس رکع وسجد وھو جالس(۱).

ترجمہ: عبداللہ بن شقیقؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے نبی کریمﷺ کے نوافل کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ نبی کریمﷺ رات کے ایک طویل حصے تک کھڑے ہوکر اور رات کے ایک طویل حصے تک بیٹھ کر نوافل ادا کرتے تھے اور جب کھڑے ہوکر قرأت فرماتے تو قیام کی حالت سے رکوع اور سجدے میں جاتے تھے اور جب بیٹھ کر قرأت فرماتے تو قعود کی حالت ہی سے رکوع اور سجدے میں جاتے تھے۔

آپﷺ پر تہجد فرض تھی یا نفل: عن تطوعہ بعض لوگ اس لفظ سے اس بات پر استدلال کرتے ہیں کہ تہجد کی نماز نبی کریمﷺ پر فرض نہیں تھی بلکہ امت کی طرح آپﷺ کیلئے نوافل کے درجہ میں تھی۔ کیونکہ یہاں اسے تطوع کہا گیا ہے۔اور یہ ظاہر بھی ہے کہ خواہ مخواہ آپ پر زائد بوجھ ڈالنا مناسب نہیں۔اور آیت تہجد میں جو لفظ ''نافلة لک'' وارد ہوا ہے۔تو اس کا معنی زائد فرض نماز نہیں بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ یہ نماز تیرے لیے ایک زائد اعزاز و اکرام اور فضیلت ہے۔ پھر عبدیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کے سبب نبی کریمﷺ باوجود عدم فرضیت کے اس نماز کا بڑا اہتمام کرتے تھے حتیٰ کہ چھوٹ جانے پر دن کے وقت اس کی قضاء بھی لاتے تھے۔

نوافل کا اہتمام اور توسع: کان یصلّی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوافل میں بہت توسع ہے۔بیٹھ کر پڑھنا بھی جائز ہے۔اگرچہ عذر نہ ہو۔اس لئے آپ نے اسے مختلف انداز سے ادا کئے ہیں۔ایک رات کھڑے ہوکر تو دوسری رات بیٹھ کر۔یا مراد یہ ہے کہ ایک ہی رات کے کچھ حصے میں دیر تک کھڑے کھڑے نماز پڑھتے تھے اور بعض حصے میں بیٹھ کر پڑھتے تھے۔تاکہ امت کو سہولت ہو۔

لیلا طویلا یا تو زمنا محذوف کی صفت ہے اس صورت میں یہ لیلا سے بدل بعض واقع ہوا

---

(۱)صحیح مسلم ۱/۲۵۲ کتاب صلوۃ المسافرین وقصرھاباب جوازالنافلة قائماًوقاعداً، جامع ترمذی ۱/۸۶ کتاب الصلوۃ باب ماجاء فی من یتطوع جالساً، سنن ابی داؤد ۱/۱۸۵ کتاب الصلوۃ ابواب التطوع الخ(مختار)

ہے اور محذوف موصوف کا قائم مقام ہے یا پھر یہ صلاۃ محذوف کی صفت ہے حذف محذوف کے بعد طویلۃ کی تاء کی حذف ہوئی۔ اس صورت میں یہ مفعول مطلق کا قائم مقام ہے۔ تقدیر یوں ہوگی ''کان یصلی لیلا صلوٰۃ طویلۃ''

رکع وسجد وھو قائم یعنی قیام کی حالت سے رکوع اور سجدے کو منتقل ہوتے تھے۔ یہی تاویل رکع وسجد وھو جالس میں ہوگی۔ وجہ یہ کہ قیام یا جلوس کی حالت میں تو رکوع اور سجدہ ممکن نہیں البتہ قیام یا جلوس کی حالت سے منتقل ہوکر رکوع اور سجدہ ممکن ہے۔ بہر حال اس حدیث سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ نوافل میں توسع ہے اور جس حالت میں بھی سہولت ہو اور جب بھی طبعی نشاط ہو ادا کرنا چاہیے۔ حتی الوسع نوافل کا اہتمام کرنا چاہیے۔ جبکہ نبی اکرم ﷺ کے حق میں دونوں صورتوں میں فرق نہیں پڑتا۔ وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ بیٹھ کر بھی پڑھیں تو تعلیم امت کا فریضہ ادا ہوتا جاتا ہے۔

(۲۱) حدّثنا اسحاق بن موسیٰ الأنصاری ثنا معن ثنامالک عن ابن شھاب عن السائب بن یزید عن المطلب بن أبی وداعۃ السھمیّ عن حفصۃ زوج النبیّ ﷺ قالت کان رسول اللہ ﷺ یصلّی فی سبحتہ قاعداً و یقرأ بالسورۃ ویرتّلھا حتّی تکون أطول من أطول منھا(۱).

ترجمہ: حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنی نفل نماز میں بیٹھ کر نماز ادا فرماتے تھے اور ایک سورۃ کو تلاوت فرماتے اور ایسے آرام سے تلاوت فرماتے تھے کہ وہ اس سورۃ سے طویل سورۃ کی نسبت بھی لمبی ہوجاتی تھی۔

ام المؤمنین حفصہ ؓ: عن حفصۃ ام المومنین سیدہ حفصۃ بنت عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے قبل خنیس بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ (۲) کے نکاح میں تھیں جو بدری صحابی ہیں اور احد میں شہادت پائی۔

---

(۱) صحیح مسلم ۱/ ۲۵۲ کتاب صلوٰۃ المسافرین وقصرھا باب جواز النافلۃ قائماً و قاعداً، جامع ترمذی ۱/ ۸۵،۸۶ کتاب الصلوٰۃ باب ماجاء فی الرجل یتطوع جالساً، مؤطاامام مالک ۱/ ۱۳۷ (مختار)

(۲) علامہ ابن حجرؒ نے الاصابہ میں خنیس کی جگہ حصن بن حذافہ لکھا ہے لیکن خود ہی تقریب وغیرہ میں خنیس لکھا ہے دیگر کتب میں بھی ان کا نام خنیس لکھا ہے۔ (اصلاح الدین)

بیوہ ہونے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ان کا نکاح کرنا چاہا۔وہ خاموش ہو گئے پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے نکاح کرنے کو کہا چونکہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی وفات کا زمانہ قریب تھا۔لہٰذا انہوں نے کہا کہ ابھی میں نکاح نہیں کروں گا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات نبی کریم ﷺ کو بتائی تو آپ ﷺ نے فرمایا"**یتزوج حفصة من هو خير من عثمان ويتزوج عثمان من هو خير من حفصة**"یعنی حفصہ سے نکاح کرنے والا عثمان رضی اللہ عنہ سے بہتر ہوگا اور عثمان سے نکاح کرنے والی (ام کلثومؓ) حفصہ سے بہتر ہوگی۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ۳ھ کو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔ایک دفعہ کسی بات پر نبی کریم ﷺ نے ان کو طلاق بھی دیا تھا جس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بہت صدمہ ہوا۔پھر حضرت جبرئیل علیہ سلام نبی کریم ﷺ کے پاس تشریف لائے اور سفارش کی کہ"**ارجع حفصة فانها صوامة قوامة وانها زوجتک فی الجنة**"یعنی حفصہ سے رجوع کرو کیونکہ وہ بہت زیادہ روزے رکھنے والی اور بہت نوافل پڑھنے والی ہیں۔اور وہ جنت میں بھی آپ ﷺ کی بیوی ہونگیں۔چنانچہ آپ ﷺ نے ان سے رجوع فرمایا۔ جمادی الثانیہ ۴۱ھ میں اور ایک قول کے مطابق ۴۵ھ میں وفات پائی علامہ ابن حجرؒ نے تقریب میں قولِ ثانی کو ترجیح دی ہے۔

فی سبحته سے اس مقام پر نفلی نمازیں مراد ہیں اور نفلی نماز کو تسبیح سے تشبیہ کی بنیاد پر سبحہ کہا جاتا ہے کیونکہ تسبیح بھی نفل ہے لیکن کبھی کبھی فرض نماز پر بھی تسبیح کا اطلاق ہوتا ہے جیسے"**فسبّح بحمد ربّک**" کا ترجمہ فصلّ سے کیا جاتا ہے۔

قاعداً بیٹھ کر نماز پڑھنا عمر کے آخری حصے میں ہوتا تھا کیونکہ مسلم کی روایت میں آتا ہے(۱)۔کہ **مارأيت رسول الله ﷺ فی سبحته قاعداً حتی اذا کان قبل موته بسنة فکان يصلّی فی سبحته قاعداً.** میں نے نبی کریم ﷺ کو نفل نماز بیٹھے ہوئے پڑھتے نہیں دیکھا تھا یہاں تک کہ جب آپ ﷺ کی وفات سے ایک سال قبل کا زمانہ تھا کہ آپ ﷺ نماز بیٹھ کر پڑھنے لگے۔

ویرتلها یعنی آپ ﷺ آرام اور سکون واطمینان کے ساتھ قرات فرماتے تھے۔تجوید کی رعایت

(۱)مسلم ج ۱ ص ۲۰۳ (مختار)

فرماتے تھے۔اطول من اطول منھا یعنی جوسورۃ آپﷺ ترتیل کے ساتھ پڑھتے تھے وہ اتنا وقت لے لیتی تھی کہ اگر بغیر ترتیل کے پڑھی جائے تو اس سورۃ سے لمبی سورت اتنا وقت نہیں لیتی تھی یوں وہ اپنے سے لمبی سورت سے بھی باعتبار وقت کے لمبی ہو جاتی تھی۔

(۲۲) حدّثنا الحسن بن محمّدالزعفرانیّ ثناالحجاج بن محمّد عن ابن جریج قال أخبرنی عثمان بن أبی سلیمان أنّ أباسلمة ابن عبدالرحمان أخبره أنّ عائشةؓ أخبرته أنّ النبیّ ﷺ لم یمت حتّیٰ کان أکثرصلوته وھو جالس(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ ابھی وفات نہیں پائے تھے (بلکہ قریب الوصال تھے) کہ ان کی اکثر نماز بیٹھ کر ہوتی تھی۔

لم یمت الخ یعنی مرض وفات میں اکثر نمازیں حالت قعود میں پڑھیں اوراس میں حرج نہیں لیکن عزیمت پر عمل کی حالت یہ تھی کہ اس حالت میں بھی نماز نہیں چھوڑی(۲)۔

سنن مؤکدہ کی تعداداورزوائد:

(۲۳) حدّثنا أحمد بن منیع ثنا إسماعیل بن إبراھیم عن أیوب عن نافع عن ابن عمرقال صلیت مع رسول اللهﷺ رکعتین قبل الظھر ورکعتین بعدھاورکعتین بعد المغرب فی بیته ورکعتین بعد العشاء فی بیته(۳).

(۱)صحیح مسلم ۱/ ۲۵۲ کتاب صلوٰۃ المسافرین وقصرھاباب جواز النافلة قائماً وقاعداً، السنن النسائی ۱/ ۱۹۷ کتاب قیام اللیل وتطوع النھار باب صلوٰۃ القاعدفی النافله.(مختار)

(۲)بعض لوگوں نے اس حدیث کوفرض ونفل دونوں پر محمول کیا ہے لیکن اکثر شراح نے لکھا ہے کہ یہ نفل ہے جوکہ آپﷺ نے عمر کے آخری حصے میں بکثرت بیٹھ کر پڑھی تھیں کیونکہ ام المومنین ام سلمہؓ کی روایت ہے"والذی نفسی بیده مامات رسول اللهﷺ حتی کان اکثرصلوته قاعدا الاالمکتوبة"(رواہ النسائی وابن ماجة)(اصلاح الدین)

(۳)جامع ترمذی ۱/ ۹۶ کتاب الصلوٰۃ باب ماجاء فی الرکعتین بعدالظھر، صحیح مسلم ۱/ ۲۵۲ کتاب الصلوٰۃ باب فضل السنن الراتبة قبل الفرائض. (مختار)

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ دو رکعات ظہر سے قبل، دو رکعات ظہر کے بعد اور دو رکعات مغرب کے بعد ان کے گھر میں پڑھیں۔ اور دو عشاء کے بعد بھی ان کے گھر میں پڑھیں۔

رکعتین قبل الظهر الخ نبی کریم ﷺ محض فرضوں پر اکتفاء نہیں کرتے تھے بلکہ وقتی نمازوں کے ساتھ بطور مکملات و متممات دوسری نمازیں بھی پڑھتے جن میں سے بعض پر تو اہتمام کے ساتھ مداومت کی ہے۔ اس نے تو سنت موکدہ کا مقام لیا۔ اور بعض کو کبھی ادا کیا ہے کبھی ترک کیا ہے وہ زوائد ہیں۔

یہاں ظہر سے قبل دو رکعتوں کا ذکر ہے۔ اس لئے کہ وہ چار رکعتیں جو سنت موکدہ ہیں یہاں مذکور نہیں بلکہ یہ غیر موکدہ نفل کا بیان ہے یا یہ تو تحیۃ المسجد ہیں یا صلوٰۃ حاجت، جنہیں آپ مسجد میں ادا فرماتے تھے۔ علاوہ ازیں معہ کا بھی یہ معنی نہیں کہ جماعت کے ساتھ پڑھے ہیں یہاں صرف متابعت کی معیت مراد ہے یعنی آپ پڑھتے تو ہم بھی پڑھتے تھے۔

ورکعتین بعدها الخ یہ سنت موکدہ ہیں۔

ورکعتین بعد المغرب یہ بھی اور اس طرح عشاء کے بعد بھی دو رکعات سنت مؤکدہ ہیں جو آپ ﷺ پڑھتے تھے تو ہم بھی پڑھتے تھے۔

فی بیته اس کا تعلق یا تو صرف آخری مذکور شام کی دو رکعتوں سے ہے اور یہ احتمال ظاہر معلوم ہوتا ہے جیسے کہ بعد میں عشاء کی سنتوں کے ساتھ الگ "فی بیته" کا اضافہ کیا ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ پہلے کے تینوں سنتوں سے اس کا تعلق ہو۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ سنت نماز عموماً گھر میں پڑھتے تھے یہی دیگر نوافل کا بھی حکم ہے حتی کہ جوف کعبہ یعنی کعبہ کے اندر کی نسبت بھی گھر میں نوافل پڑھنے کا زیادہ ثواب ہے۔ اس میں اخلاص زیادہ ہوتا ہے اور یہ عمل ریاء سے بعید تر ہوتا ہے۔

اس حدیث میں بعض سنن مؤکدہ کا ذکر ہے۔ دوسری احادیث میں تصریح ہے کہ سنن مؤکدہ کی تعداد مجموعی طور پر بارہ رکعات بنتی ہیں جن میں سے ظہر سے قبل چار رکعات اور صبح کی نماز سے قبل دو رکعات بھی ہیں۔

(۲۴) حدّثنا أحمد بن منیع ثناإسماعیل بن إبراهیم ثناأیوب عن نافع عن ابن عمرؓ قال ابن عمر وحدّثتنی حفصة انّ رسول اللهﷺ کان یصلّی رکعتین حین یطلّع الفجر وینادی المنادی قال أیوب اراه قال خفیفتین(۱).

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے مجھے کہا کہ نبی کریمﷺ دو رکعات نماز (سنت) اس وقت پڑھتے تھے جب فجر طلوع ہوجاتا تھا جس وقت مؤذن اذان دیتا۔ حضرت ایوبؒ کہتے ہیں میرا خیال ہے کہ حضرت نافعؒ نے یہ بھی کہا کہ دو مختصر رکعتیں پڑھتے تھے۔

وحدثتنی حفصة رضی الله عنهاواو کے بارے میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ زائدہ ہے جبکہ بعض نے عاطفہ قرار دیا ہے۔ اس صورت میں معطوف علیہ مقدر ہوگا تقدیر یوں ہوگی کہ "حدثنی غیر حفصة وحدثتنی حفصة" (۲) یعنی مجھ کو کچھ حفصہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ دیگر لوگوں نے بیان کیا اور کچھ حفصہ رضی اللہ عنہا نے یہ کہا کہ آپﷺ طلوع فجر کے بعد دو رکعات سنت پڑھا کرتے تھے۔

(۲۵) حدّثناقتیبة بن سعیدثنا مروان بن معاویة الفزاریّ عن جعفر بن برقان عن میمون بن مهران عن ابن عمرقال حفظت من رسول اللهﷺ ثمانی رکعات رکعتین قبل الظهر ورکعتین بعدها ورکعتین بعدالمغرب ورکعتین بعدالعشاء قال ابن عمروحدثتنی حفصة برکعتی الغداة ولم اکن أراهما من النبیّﷺ(۳).

(۱)صحیح بخاری ۱/۸۷ کتاب الاذان باب اذان بعدالفجر، صحیح مسلم ۱/۲۵۰ کتاب صلوٰة المسافرین وقصرهاباب استحباب رکعتی سنة الفجر، سنن النسائی ۱/۶۷ کتاب المواقیت باب الصلوٰة بعد طلوع الفجر سنن ابن ماجة ص۸۰ کتاب اقامة الصلوٰة والسنة فیها باب ماجاء فی رکعتین قبل الفجر(مختار) (۲)اقول ویحتمل ان یکون حدیث نافع هو حدیث میمون الآتی. وح فالتقدیر حفظت من رسول اللهﷺ ثمان رکعات وحدّثتنی حفصة . اقول ولااعلم لم لم یذهب الشراح الی هذا الاحتمال.(مختار) (۳)جامع ترمذی ۵۹۰ ط رحمانیه

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے (فرض نماز کے علاوہ) آٹھ رکعات یاد کی ہیں۔ دو رکعات نماز ظہر سے قبل دو رکعات اس کے بعد، دو رکعات مغرب کے بعد اور دو رکعات نماز عشاء کے بعد۔ ابن عمرؓ کہتے ہیں اور میری بہن حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے صبح کی دو رکعتوں کے بارے میں مجھے بتایا جن کو میں خود نبی کریم ﷺ سے نہیں دیکھ سکا تھا۔

صلوٰۃ فجر کی سنتیں: ولم اکن اراھما یعنی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ صبح کی بھی دو سنتیں ہیں یہ میں نبی کریم ﷺ سے سیکھ چکی ہوں لیکن ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا کہ مجھے یہ معلوم نہیں کہ حضرت نبی اکرم ﷺ بھی یہ ادا کرتے تھے۔ گویا میں اس کا مشاہدہ نہ کر سکا چونکہ نبی کریم ﷺ مختلف حجروں میں قیام فرماتے تھے۔ اس لئے ممکن ہے آپ کو اس حدیث کے بیان کرنے تک اس بات کا علم نہ ہو۔ بعد میں پتہ چلا ہو کہ نبی کریم ﷺ بھی ان دو رکعتوں کو ہمیشہ پڑھتے بلکہ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے خود نبی کریم ﷺ کے اس معمول کا مشاہدہ کیا تھا۔ ابتداء میں اس لاعلمی کا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ عموماً گھر میں ہی صبح کی سنتیں پڑھا کرتے تھے۔ جن کا حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو پتہ تھا کہ آپ ﷺ مواظبت کے ساتھ ان کو پڑھتے ہیں۔ جب انہوں نے اپنے بھائی کو بتایا تو ان کو بھی علم ہوا کہ یہ مؤکدہ ہیں اور پھر خود اس کا مشاہدہ بھی کیا۔ لہٰذا یہ حدیث اس حدیث کے منافی نہیں جس میں آیا ہے کہ میں نے ایک ماہ تک نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ وہ صبح کی سنتیں سورۃ الکافرون اور سورۃ الاخلاص کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔

سنت مؤکدہ میں تمام سنتوں کی نسبت زیادہ مؤکدہ سنت صبح کی سنتیں ہیں حتیٰ کہ بعض علماء نے اسے واجب بھی کہا ہے۔ اس لئے ان کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اور اسی وجہ سے علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگرچہ دیگر سنتوں کی قضاء نہیں ہے۔ صبح کی سنتوں کی قضاء پڑھنی چاہیے۔

(۲۶) حدثنا أبو سلمة یحیٰی بن خلف ثنا بشر بن المفضل عن خالد الحذاء عن عبداللّٰہ بن شقیق قال سألت عائشةؓ عن صلوٰة

النبیّﷺقالت کان یصلّی قبل الظھر رکعتین وبعدھا رکعتین وبعد المغرب رکعتین وبعد العشاء رکعتین وقبل الفجر ثنتین(۱).

ترجمہ: عبداللہ بن شقیقؒ کہتے ہیں میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نبی کریمﷺ کی سنت نماز کے بارے میں پوچھا۔توانہوں نے کہا کہ نبی کریمﷺ ظہر کی نماز سے پہلے دو رکعتیں،اس کے بعد دو رکعتیں مغرب کے بعد دو رکعتیں عشاء کے بعد اور فجر سے قبل دو دو رکعتیں (سنت) پڑھتے تھے۔

یصلی قبل الظھر رکعتین یہاں ظہر سے قبل دو رکعتوں کا ذکر ہے۔بعد میں حضرت علیؓ کی روایت میں چار رکعات کا ذکر آرہا ہے۔اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بہت سی دیگر روایات میں بھی چار کا ذکر ہے(۲)۔اسی وجہ سے علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اکثر حالات میں ظہر سے قبل آپﷺ نے چار اور بعض حالات میں دو رکعات پڑھی ہیں۔اگلے باب کی آخری احادیث میں چار رکعات کی تصریح ہے۔

(۲۷) حدّثنا محمّد بن المثنیٰ ثنا محمّد بن جعفر ثنا شعبة عن أبی إسحاق قال سمعت عاصم بن ضمرة یقول سألنا علیّاًؓ عن صلوٰة رسول اللہﷺ من النھار قال إنّکم لاتطیقون ذلک قال قلنا من اطاق منّا ذلک صلّی فقال کان إذا کانت الشمس من ھٰھنا کھیئتھا من ھٰھنا عند العصر صلّی رکعتین وإذا کانت الشمس من ھٰھنا کھیئتھا من ھٰھنا عند الظھر صلّی أربعا ویصلّی قبل الظھر أربعا وبعدھا رکعتین وقبل العصر أربعا یفصل بین کل رکعتین بالتسلیم علی الملئکة

(۱)صحیح مسلم ۱/۲۵۲ کتاب صلوٰة المسافرین وقصرھا باب جواز النافلة قائماً وقاعداً،سنن ابی داؤد ۱/۱۸۵ کتاب الصلوٰة ابواب التطوع ورکعات السنة،مسنداحمد۳۰/۶(مختار)

(۲)رویٰ مسلم عن عائشةؓ کان یصلی فی بیته قبل الظھر اربعا. بل رویٰ الشیخان کان لایدع اربعا قبل الظھر.۱۲ اجمع الوسائل ج۳ ص ۱۰۳ (مختار)

المقربین والنبیّن ومن تبعهم من المؤمنین والمسلمین(۱)۔

ترجمہ: عاصم بن حمزہ کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت علیؓ سے نبی کریم ﷺ کے دن کے نوافل کے بارے میں پوچھا۔ عاصم کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم لوگ ان نوافل کی طاقت نہیں رکھتے۔ عاصم کہتے ہیں ہم نے عرض کیا ہم میں سے جس کو توفیق ہو وہ تو پڑھ لے گا (اس لئے آپ بتادیں) تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ صبح کے وقت جب سورج اس طرف (مشرق کو) اتنا اوپر چڑھ جاتا جتنا کہ اسطرف (مغرب کو) عصر کی نماز کا وقت ہوتا ہے تو نبی کریم ﷺ دو رکعات (اشراق کی) نماز پڑھتے تھے۔ اور جب سورج اس طرف (مشرق کو) اتنا اوپر چڑھتا جتنا کہ اس طرف (مغرب کو) ظہر کی نماز کے وقت ہوتا ہے تو چار رکعات (چاشت کی) نماز پڑھتے تھے۔ جن کے دونوں شفعوں کے درمیان (تشہد میں) مقرب فرشتوں، انبیاء کرام اور ان کے متبع مؤمنوں اور مسلمانوں پر سلام بھیج کر فصل کرتے تھے۔ (یا یہ کہ دونوں شفعوں کے درمیان سلام پھیرتے تھے۔)

سالنا علیا الخ رات کے تہجد کے بارے میں پہلے سے علم ہوگا۔ اس لئے صرف دن کے نوافل کا پوچھا اور چونکہ حضرت علیؓ سمجھ گئے کہ یہ سائلین تقلید کا عزم کر کے ہی نوافل کا پوچھ رہے ہیں۔ اس لئے آپؓ نے فرمایا کہ تمہارے بس کی بات نہیں۔

انکم لا تطیقون ذالک الخ یعنی دن کے وقت آپ ﷺ کے نوافل اور عبادت زیادہ اہتمام

(۱) ابوداؤد کی روایت عن ابی ایوب عن النبی ﷺ قال اربع قبل الظهر لیس فیهنّ تسلیم تفتح لهنّ ابواب السماء سنن ابی داؤد ۱/۸۷ باب الاربع قبل الظهر وبعدها وعن علیّ کان النبی ﷺ یصلّی قبل الظهر اربعاً وبعد رکعتین (جامع ترمذی ۱/۹۹ کتاب الصلوٰة باب ماجاء فی الاربع قبل الظهر کیف الصلوٰة باب کیف کان تطوع النبیّ ﷺ بالنهار، سنن النسائی ۱/۱۰۱ کتاب الامامة باب الصلوٰة قبل العصر، ابن ماجة ص ۸۱ کتاب اقامة الصلوٰة والسنة فیها باب ماجاء فیها یستحب من التطوع بالنهار، مصنف ابن ابی شیبة ۲/۲۰۱ (مختار)

اور ایسے طریقے سے تھی کہ آپ لوگ اس پر عمل نہیں کرسکتے وہ خشوع وخضوع اور دوام والتزام جو نبی کریم ﷺ کے ہاں تھا تمہارے ہاں نہیں ہے اور حصول علم تو عمل کیلئے ہوتا ہے محض علم سے کیا فائدہ۔ علم برائے علم تو فضول بات ہے بلکہ علم عمل کا تقاضا کرتا ہے۔ عمل نہ ہو تو وہ بے فائدہ ہوتا ہے بلکہ باقی بھی نہیں رہتا۔

من اطاق ذالک منا الخ یعنی کسی کی طاقت اور توفیق تو بن جائے گی۔ اس لئے آپ بیان کریں تاکہ اگر کوئی عمل کا ارادہ کرے تو مشکل پیش نہ آئے۔ کچھ تو معلوم ہو۔ علاوہ ازیں جس کی بس سے باہر ہو ان کے لئے علم بھی غنیمت ہے کسی اور کو تو پہنچادیگا جو عمل کرسکے گا۔

قال إذا كانت الشمس الخ آپ نے پہلے مشرق کی طرف اشارہ کیا۔ پھر مغرب کی طرف اور کہا کہ جب ادھر یعنی مشرق کی جانب سورج اتنا چڑھتا جتنا ادھر مغرب کی طرف عصر کے وقت یہ ہوتا ہے۔ یعنی جب سورج ایک دو نیزے چڑھ آتا تو دو رکعتیں پڑھ لیتے یہ صلوٰۃ ضحیٰ تھی جو اشراق کی نماز کہلاتی ہے۔ آئندہ باب میں اس کا تفصیلی ذکر آئے گا۔

واذا كانت الشمس الخ پھر اس طرح کے دو اشارے کرتے ہوئے یہ ظاہر فرمایا کہ ظہر کے وقت مغرب کی جانب سورج جتنا بلند ہوتا ہے جب مشرق کی جانب دوپہر کو اتنا چڑھتا تو چار رکعات پڑھ لیتے یہ چار رکعتیں چاشت کی نماز تھی۔ اسے حدیث میں صلوٰۃ الاوّابین بھی کہا گیا ہے۔ یہ زوال سے قبل ضحوہ کبریٰ کے وقت پڑھی جاتی ہے۔ عین زوال کے وقت تو نماز مکروہ ہوتی ہے۔ **قبل الظهر اربعا الخ** یہ سنت مؤکدہ ہیں اور زوال کے بعد پڑھی جاتی ہیں جو کہ ہمارے ہاں بھی مؤکدہ ہیں۔ **وبعدها ركعتين** یہ بھی سنت مؤکدہ ہیں۔ **قبل العصر الخ** یہ سنن زوائد میں سے ہیں۔ **يفصل بين كل الخ** یعنی ہر دو رکعتوں کے بعد تشہد پڑھتے تھے جس میں ملائکہ انبیاء اور عباداللہ پر سلام موجود ہے۔

اسی ترجمہ کو ملا علی قاریؒ نے ترجیح دی ہے اور **يفصل بين كل الخ** کو اس توجیہ کیلئے قرینہ قرار دیا گیا ہے کیونکہ سلام التحلیل میں تو مذکورہ **مسلم عليهم** کا حاضر ہونا مناسب ہے۔ جبکہ حدیث کا لفظ عام ہے۔ وہ حاضر ہو یا نہ ہوں جبکہ سلام تشہد میں حاضری ضروری نہیں ہے۔

علامہ ابن حجرؒ نے اس تسلیم کو سلام تحلل پر محمول کیا ہے۔ان کے نزدیک معنیٰ یہ ہے کہ دو دو رکعتوں پر سلام پھیرتے اور سلام کے وقت مقتدیوں، فرشتوں اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی نیت کی جاتی ہے۔بہر حال جولوگ کہتے ہیں کہ صلاۃ النہار اربعا اربعا وہ پہلی تاویل کرتے ہیں اور جو مثنیٰ مثنیٰ کے قائل ہیں وہ دوسری تاویل کرتے ہیں۔ وصلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم۔

خلاصہ باب

اس باب کو نبی کریم ﷺ کی عبادت کا عنوان دیا گیا ہے اور احادیث کو مدنظر رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ عبادت سے نفلی عبادت مراد ہے فرض مراد نہیں ہے اگر چہ نوافل کے اہتمام سے فرائض کا اہتمام بطریق اولیٰ معلوم ہوتا ہے لیکن مقصود نوافل میں مبالغہ اور اہتمام ہے بالخصوص نماز میں آپ کا شغف اور اپنی مشکوریت کا ثبوت وہ امر ہے جس کی تقلید ممکن نہیں ہے۔ اس لئے تو حضرت علیؓ فیصلہ سناتے ہیں "لاتطیقون ذالک" عجز و تواضع اور راز و نیاز کے جس تعلق کو عبادت کہا جاتا ہے وہ آپ ﷺ کس کیفیت، استحضار، خشوع و خضوع اور ہمہ تن یکسوئی کے ساتھ کرتے تھے۔ بقول حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وہ ناقابل بیان ہے حتیٰ کہ قرأت میں ترتیل اول سے آخر تک برقرار رہتی اور جذب کی ایسی حالت کہ کبھی تو ایک آیت پڑھتے پڑھتے رات بیت گئی۔ مشقت اور جفاکشی کا حال بھی بے مثال ہے۔ پاؤں کھڑے کھڑے پھول جاتے ہیں۔ رات کا اکثر و اغلب حصہ اور کبھی ساری رات اس تملق اور حسن تعلق کی نذر ہو جاتا ہے۔ سب سے طویل ترین سورتیں صرف ایک رکعت میں بلکہ کبھی تو کئی طویل ترین سورتیں صرف ایک رکعت میں پڑھ لیتے ہیں۔ حتیٰ کے صحابہ میں سے بہت جفاکش صحابہ بھی حوصلہ ہار کر آپ ﷺ کو چھوڑنے کا قصد کر لیتے ہیں۔ پھر یہ ایک دو دن کی بات بھی نہیں عمر بھر اس پر دوام رہا۔ بلکہ التزام کا یہ حال کہ کبھی عذر کی بنا پر چھوٹ جائے تو دن کو اس کے بدلے نوافل پڑھ لیں۔ عمر کے آخر حصے میں قیام کی طاقت نہ رہی تو بیٹھ کر بھی ہدیہ عبدیت پیش فرمایا۔

بہر حال کمال بندگی کا جو نمونہ آپ ﷺ نے امت کے سامنے پیش کیا۔ وہ امت کیلئے ناقابل تقلید ضرور ہے۔ لیکن ایک مغفور بندے کی اس قسم کی عبدیت کو دیکھ کر عبادت میں رغبت اور جذبہ اتباع میں تحریک ضرور پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عبدیت اور عظمت کے اس مینار کے لائے ہوئے راہ راست پر چلنے کی توفیق اور دنیا و آخرت میں اس کا قرب نصیب فرمائے۔ آمین۔

وصلّی اللہ علی خیر خلقه و نور عرشه

۴۱. باب صلوٰۃ الضحیٰ

حضوراقدس ﷺ کے اشراق کی نماز کا بیان

ضحیٰ اور ضحوہ: سورج نکلنے کے بعد جب اس کی روشنی پھیل جائے تو اس وقت کو ضحوہ اور ضحیٰ کہا جاتا ہے۔اس کے دو حصے ہیں۔ابتدائی جو کہ عین ارتفاع شمس کے ابتدائی وقت میں یعنی مکروہ وقت گزر جانے کے بعد ہوتا ہے۔اس وقت کی نماز کو اشراق کی نماز کہتے ہیں۔ یہ دن کے ربع اول میں اداء ہوتی ہے۔دوسرا وہ حصہ جو زوال سے کچھ پہلے ہوتا ہے۔اسکو ضحوۂ کبریٰ کہتے ہیں۔اور اس وقت ادا کی جانے والی نماز کو چاشت کی نماز کہتے ہیں(۱)۔صوفیہ کے نزدیک فرق معتبر ہے لیکن فقہاء اور محدثین ان دونوں نمازوں کو صلوٰۃ ضحیٰ کہتے ہیں جنکا ابتدائی وقت سورج کا منور ہونا اور آخری وقت زوال سے قبل کا وقت ہے۔

صلوٰۃ ضحیٰ بھی عبادات کے زمرے میں آتی ہے لیکن چونکہ بعض وجوہ سے اس نماز کو خصوصی اہمیت حاصل ہے اسلئے اسکو مستقل باب کی صورت میں ذکر کیا ہے۔جس میں آٹھ حدیثیں ذکر کی ہیں۔

(۱) حدثنامحمود بن غیلان ثنا ابو داؤد الطیالسیؒ انا شعبة عن یزید الرشک قال سمعت معاذة قالت قلت لعائشة أكان النبیﷺ یصلّی الضحیٰ قالت نعم اربع رکعات ویزید ماشاء اللّٰہ عزّوجلّ(۲) .

ترجمہ: معاذہؒ کہتی ہیں کہ انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ کیا نبی کریم ﷺ نماز ضحیٰ پڑھتے تھے۔تو انہوں نے کہا کہ ہاں چار رکعات پڑھتے تھے۔اور

---

(۱)اس نماز کو صلوٰۃ الاوّابین بھی کہا جاتا ہے اگرچہ مغرب کے بعد چھ رکعات نفل نماز کو بھی صلوٰۃ اوابین کہا گیا ہے۔اوابین کا معنی اللہ کی طرف رجوع کرنے والے کے ہیں۔گویا صلوٰۃ اوابین کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والوں کی نماز۔مغرب کے بعد چھ رکعات نفل نماز کے بارے میں سنن ابن ماجۃ میں روایت ہے کہ جو لوگ ایمان اور اخلاص کے ساتھ مغرب کے بعد چھ نوافل ادا کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کو بارہ سال کی نماز کا ثواب عطا فرماتے ہیں۔شرعاً یہ سب نمازیں چاہئے اشراق ہو یا چاشت کی یا اوابین مستحب ہیں۔(مختار)

(۲)صحیح مسلم ۱/۲۴۹ کتاب صلوٰۃ المسافرین وقصرھا باب استحباب صلوٰۃ الضحیٰ الخ، سنن ابن ماجة ص ۹۹ کتاب اقامة الصلوٰۃ والسنة فیھا باب ماجاء فی الصلوٰۃ الضحیٰ، السنن الکبریٰ للبیھقی ۳/۴۷ کتاب الصلوٰۃ(مختار)

اس سے زیادہ جتنا اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تھا، پڑھ لیتے تھے۔

رشک کسے کہتے ہیں: یزید الرشک رشک کے کئی معانی منقول ہیں(۱) آگے باب صوم النبی ﷺ کی ساتویں حدیث میں مصنفؒ نے کہا ہے کہ اہل بصرہ کی اصطلاح میں رشک قسام (تقسیم کرنے والے) کے معنی میں مستعمل ہے۔ اور یہ یزید بن ابی یزید ضبعی کا لقب ہے۔ اس لئے کہ وہ اس کام میں ماہر تھے اور حکومت کی طرف سے تقسیم اراضی وغیرہ کا کام ان کے سپرد تھا۔ (۲) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ رشک بڑی داڑھی والے کو کہتے ہیں اور یزیدؒ کی داڑھی اتنی بڑی تھی کہ ایک مرتبہ ایک بچھو اس میں گھس گیا۔ اور تین دن کے بعد نکالا جاسکا۔ (۳) بعض شراح کہتے ہیں کہ رشک بچھو کو کہتے ہیں اور مذکورہ واقعہ کی وجہ سے ان کو یزید الرشک کہا گیا۔ (۴) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ رشک فارسی میں غیور کو کہتے ہیں اور چونکہ یزید بھی مجسمہ غیرت تھے۔ اس لئے ان کو رشک کہا جاتا ہے۔

اربع رکعات یہاں چار رکعات کا ذکر ہے لیکن دو پر اکتفاء بھی جائز ہے۔ یہ نوافل ہیں۔ عملاً زیادہ سے زیادہ بارہ رکعات تک ثابت ہیں۔ جبکہ آٹھ رکعتوں کی بھی زیادہ ترغیب آئی ہے۔ بہر حال آپ ﷺ نے عموماً چار رکعت ادا فرمائے ہیں۔ لیکن تعداد میں اختلاف اختلافِ اوقات واحوال پر محمول ہوگا۔ حضرت عائشہؓ نے بھی ''ویزید ماشاء اللّٰہ عزوجل'' میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ثبوت صلوٰۃ الضحیٰ اور ابن عمر کے بدعت کہنے کی توجیہات: بہر حال صلوٰۃ ضحیٰ روایات سے ثابت ہے۔ حضرت عائشہؓ کی اس روایت کے علاوہ دیگر اُنیس (۱۹) صحابہؓ سے اس نماز کے بارے میں روایات منقول ہیں۔ بلکہ بعض نے تو پچیس (۲۵) صحابہ سے اسے نقل کیا ہے(۱)، ان روایات کی تفصیل اوجز المسالک میں درج ہے۔ مسلم شریف کی ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ انسانی بدن میں جتنے جوڑ ہیں ہر ہر جوڑ کیلئے صلوٰۃ ضحیٰ صدقہ بن جاتا ہے(۲)، اور اس کثرت روایات کے سبب اس میں مذاہب بھی مختلف

(۱) حتّی قال محمّد بن جریر الطبری إنّها بلغت حد التواتر ۱۲ جمع الوسائل ج ۲ ص ۱۰۷

(۲) عن ابی ذرؓ عن النبیّ ﷺ انّه قال یصبح علی کل سلامیٰ من احدکم صدقة فکل تسبیحة صدقة و کل تحمیدة صدقة و کل تهلیلة صدقة و کل تکبیرة صدقة و امر بالمعروف صدقة ونهی عن المنکر صدقة ویجزی من ذالک رکعتان یرکعهما من الضحی. ۱۲ مسلم ج ۱ ص ۲۵۰ (اصلاح الدین)

ہیں۔بعض لوگ وجوب کے قائل ہیں۔اور بعض سنت مؤکدہ بتاتے ہیں۔لیکن احناف کے نزدیک یہ مستحب ہے۔

البتہ یہاں پر ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے صلوٰۃ ضحیٰ کو بدعت کہا ہے۔نیز یہ کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت تک کوئی بھی ان کو پڑھنے والانہیں تھا۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کو شاید صلوٰۃ ضحیٰ کے بارے میں حدیث نہ پہنچی ہوں اور چونکہ یہ نوافل ہیں جو عموماً گھر کے اندرادا کی جاتی ہیں۔اس لئے وہ کسی کو پڑھتے ہوئے بھی نہ دیکھ سکے۔یاان کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس پر دوام نہیں فرمایا۔اگرچہ پڑھناان کے نزدیک بھی ثابت ہوگا یا اس کے کلام کا معنی یہ ہوگا کہ مسجد میں جمع ہوکر بصورت اجتماع صلوٰۃ ضحیٰ کا پڑھنابدعت ہے۔اور ظاہر ہے کہ اسلاف نے چاشت کی نماز پڑھی ہے لیکن بصورت تداعی اوراجتماع کے نہیں پڑھی۔

اور یہ بھی محتمل ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کی مراد یہ ہو کہ آپ ﷺ نے اسے واجب سمجھ کرنہیں پڑھی۔ جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ ﷺ پر چاشت کی نماز واجب تھی۔تو ان پر رد کرنے کیلئے فرمایا کہ پڑھی ہونگیں مگر وجوب کے انداز سے نہیں پڑھیں۔

(۲) حدّثنا محمّد بن المثنیٰ ثنی حکیم بن معاویة الزیادیّ ثنازیادبن عبیداللّٰہ بن الربیع الزیادیّ عن حمید الطویل عن أنس ابن مالک أنّ النبیّ ﷺ کان یصلّی الضحیٰ ست رکعات(۱)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ چاشت کی نماز چھ رکعات پڑھا کرتے تھے۔

ست رکعات عام معمول تو نبی کریم ﷺ کا چار رکعات پڑھنے کا تھا لیکن کبھی اس پر اضافہ فرماتے جیسے کہ گزشتہ حدیث میں بتایا گیا ہے۔یہاں پر اضافے کی ایک صورت بیان ہے۔

(۳) حدّثنا محمّد بن المثنیٰ ثنامحمّد بن جعفر اناشعبة عن عمروبن مرّة عن عبدالرحمان ابن أبی لیلیٰ قال ماأخبرنی احدأنه رای

---

(۱)تفردالامام الترمذی بهذاالحدیث(مختار)

النبیّ ﷺ یصلّی الضحیٰ إلاّامّ ھانی فانّھاحدثت أنّ رسول اللہ ﷺ دخل بیتھا یوم فتح مکۃ فاغتسل فسبّح ثمانی رکعات مارأیتہ ﷺ صلوۃ قط أخفّ منھا غیر أنّہ کان یتمّ الرکوع والسجود(۱).

ترجمہ: حضرت عبدالرحمان بن ابی لیلیٰؒ کہتے ہیں کہ مجھے (صحابہ میں سے) ام ہانی کے سوا کسی نے یہ خبر نہیں پہنچائی کہ نبی کریم ﷺ نے صلوۃ ضحیٰ پڑھی تھی۔ البتہ ام ہانیؓ نے یہ حدیث بیان کی کہ نبی کریم ﷺ فتح مکہ کے دن ان کے گھر تشریف لائے۔ وہاں غسل کیا اور آٹھ رکعات نماز پڑھی۔ میں نے ان آٹھ رکعات سے زیادہ مختصر نماز پڑھتے ہوئے نبی کریم ﷺ کو نہیں دیکھا تھا۔ مگر پھر بھی آپ ﷺ رکوع اور سجدہ مکمل طور پر ادا فرماتے تھے۔

عبدالرحمان بن أبی لیلیٰ الأنصاری تابعی ہیں۔ پہلے مدینہ میں اور بعد میں کوفہ میں رہائش اختیار کی۔ حضرت عمرؓ سے آپ کی سماع میں اختلاف ہے۔ لیکن دیگر بہت سے صحابہ سے ان کی سماع ثابت ہے۔ ۸۶ھ کو وقعۃ الجماجم میں وفات پائی جبکہ بعض کے نزدیک آپ نے پانی میں ڈوب کر وفات پائی۔

إلاّ امّ ھانی حضرت ام ہانی حضرت علیؓ کی ہمشیرہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو لمبی عمر عطا فرمائی تھی۔ حضرت علیؓ کی وفات کے بعد وفات پائیں۔

<u>ابن ابی لیلیٰ کے قول کا مطلب:</u> حضرت ابن ابی لیلیٰؒ کے اس قول کا معنی یہ نہیں کہ اسے کسی دوسرے شخص نے اس کے بارے میں نہیں بتایا کیونکہ صلوٰۃ ضحیٰ کثرت روایات سے ثابت ہے بلکہ معنی یہ ہے کہ صحابہ میں سے اور بالخصوص نبی کریم ﷺ کے صلوۃ ضحیٰ کا مشاہدہ کرنے والے صحابہ میں سے صرف ایک صحابیہ نے اس کے بارے میں حضرت ابن ابی لیلیٰؒ کو بتایا ہے۔ نفس اثبات اور تابعین کی زبانی اثبات تو ابن ابی لیلیٰؒ کو بہت سے طرق سے پہنچا ہے۔ مسلمؒ کی روایت میں تصریح ہے سألت وحرصت علیٰ أنّ

(۱) صحیح مسلم ۱/۲۴۹ کتاب صلوٰۃ المسافرین وقصرھاباب استحباب صلوٰۃ الضحیٰ الخ، سنن ابی داؤد ۱/۱۹۰ کتاب الصلوٰۃ باب الضحیٰ، مؤطاامام مالک ۱۵۲ کتاب الصلوٰۃ، ابن مصنف ابن ابی شیبۃ ۲/۳۱۲ کتاب الصلوٰۃ(مختار)

احداً من الناس یخبرنی أنّ النبیّ ﷺ تسبّح سبحة الضحیٰ فلم یخبرنی احد غیر امّ هانی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن ابی لیلیٰؒ کوان نوافل کے اثبات کا تو یقین تھا لیکن نبی کریم ﷺ کے عمل کی تحقیق باقی تھی۔اس بارے میں تسلی کرنا چاہتے تھے۔

فسبّح ثمانی رکعات الخ یعنی آٹھ رکعات نفل نماز پڑھ لی۔یہ ساری نماز یا تو صلوٰۃ ضحیٰ تھی یا پھران میں چار چاشت کی اور چار فتح مکہ کے شکرانہ میں پڑھی تھیں اوراگر چہ عین ارتفاع شمس کے موقعہ پر نفل پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔لیکن فارغ ہوتے ہی زوال سے پہلے پہلے پھر بھی ادافرمائے۔اس سے معلوم ہوا کہ صلوٰۃ ضحیٰ کا وقت زوال تک ہے۔أخفّ منها چونکہ فتح مکہ کے موقع پر ضروریات ومصروفیات زیادہ تھیں وقت کم تھا۔اس لئے آپ ﷺ نے نماز میں تخفیف کی۔لیکن تعدیل ارکان کو پھر بھی نقصان نہیں پہنچایا۔رکوع اور سجدوں میں طمانیت بہت اہم ہے۔اس لئے اسے ملحوظ رکھا۔

(۴) حدّثنا ابن ابی عمر ثنا وکیع ثنا کهمس بن الحسن عن عبداللّٰه بن شقیق قال قلت لعائشة أکان النبیّ ﷺ یصلّی الضحیٰ قالت لا إلاّ ان یجئی من غیبة(۱)۔

ترجمہ: عبداللہ بن شقیق کہتے ہیں میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ صلوۃ ضحیٰ پڑھتے تھے۔آپؓ نے فرمایا کہ نہیں الا یہ کہ آپ سفر سے واپس لوٹتے (تو پڑھتے تھے)

حضرت عائشہؓ کی صلوٰۃ ضحیٰ کی نفی کی توجیہ: لا الاّ ان یجئی من غیبة. اس میں یہ اشکال ہے کہ حضرت عائشہؓ صلوٰۃ ضحیٰ کی نفی کیسے کرتی ہیں حالانکہ یہ انیس (۱۹) صحابہ کی روایات سے بلکہ خود حضرت عائشہؓ کی روایات سے ثابت ہے۔تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ نفی دوام ہے یعنی یہ کہ فرض اور واجب کی طرح التزام سے نہیں پڑھتے تھے۔کہ کبھی بھی ترک نہ ہو۔یہاں سائل کے سوال کا تو ہمیں اندازہ نہیں کہ کس مقصد سے سوال

(۱)صحیح مسلم ۱/۲۴۸ کتاب صلوٰۃ المسافرین وقصرها باب استحباب علیها، مصنف ابن ابی شیبة ۲/۴۰۷ کتاب الصلوٰۃ، السنن الکبریٰ للبیهقی ۳/۵۰ کتاب الصلوٰۃ(مختار)

کیا ہے لیکن شاید حضرت عائشہؓ سمجھی ہیں کہ سائل پوچھ رہے ہیں۔ کہ آپ ﷺ نے ہمیشہ یہ نماز پڑھی ہے یا نہیں۔ چنانچہ امام بیہقیؒ نے مذکورہ بالا جواب دیا ہے اور یہ دراصل سوال کی اس توجیہہ پر مبنی ہے۔
دوسرا جواب بعض شراح نے یہ دیا کہ سائل کا مطلب اس مخصوص نماز کے بارے میں استفسار تھا جو کہ اس زمانہ میں اجتماعی طور پر رائج تھا اور لوگ اسے التزاماً مسجد میں پڑھا کرتے تھے۔ جس طرح آج کل بھی بعض لوگ صبح کی نماز سے اشراق تک مسجد میں بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں اور سورج نکلنے کے بعد اشراق پڑھتے ہیں۔ یہ درست ہے لیکن اسے اجتماعی حیثیت سے اور اہتمام والتزام اور اجتماع کے ساتھ ادا کرنا درست نہیں۔ حضرت ابن مسعودؓ نے ایک دفعہ ایسے لوگوں کو مسجد سے بھگا دیا تھا جو کہ اجتماعی طور پر مسجد میں نماز کے بعد اشراق تک بیٹھتے اور پھر اشراق کیلئے اکٹھے اٹھ جاتے۔ دین میں جہاں احداث اور غلو آتا ہے وہ قبیح ہے۔

تو گویا سائل یہ پوچھ رہا ہے کہ کیا یہ ضروری ہے کہ اشراق کو اہتمام کے ساتھ مسجد میں ادا کیا جائے۔ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ نہیں۔ آپ ﷺ اشراق کی نماز پڑھتے تھے مگر گھر کے اندر باہر مسجد میں صرف ایسی صورت میں پڑھتے جب اتفاقاً آپ اشراق کے وقت سفر سے واپس آجاتے اور حسب عادت سیدھے مسجد میں جاتے تھے۔ تو وہیں نماز بھی ادا فرماتے تھے۔

بعض حضرات نے یہ جواب بھی دیا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث مرجوح ہے کیونکہ صحیحین میں دیگر صحابہ کرام سے چاشت کی نماز کا اثبات مروی ہے۔ لیکن یہ توجیہ درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ یہ تب ہوتا کہ حضرت عائشہؓ نماز چاشت سے منکر ہوتیں۔ حالانکہ دوسری طرف خود ان سے یہی نماز مروی ہے۔ جیسا کہ اس باب کی پہلی حدیث میں انہی کی روایت سے اثبات ہو رہا ہے۔

(۵) حدّثنا زیاد بن أیوب البغدادیّ ثنا محمّد بن ربیعة عن فضیل بن مرزوق عن عطیّة عن أبی سعید الخدریّ قال کان النبیّ ﷺ یصلّی الضحیٰ حتیّ نقول لایدعها ویدعها حتّی نقول لا یصلّیها(۱).

---

(۱) جامع ترمذی ۱/۱۰۸ کتاب الصلوٰة باب ماجاء فی صلوٰة الضحیٰ، شرح السنة للبغوی ۱۳۶/۴ باب صلوٰة الضحیٰ رقم الحدیث ۱۰۰۲، (مختار)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ (کبھی تو) نماز چاشت (ایسے اہتمام ودوام کے ساتھ) پڑھتے تھے کہ ہمارا خیال ہوتا کہ آپ ﷺ اسے چھوڑیں گے نہیں اور (کبھی ایسے) چھوڑ دیتے تھے حتیٰ کہ ہم کہتے کہ پھر نہیں پڑھیں گے۔

<u>مواظبت اور ترک ضحیٰ کی حکمتیں:</u> حتیّ نقول یعنی آپ ﷺ کی مواظبت اور طویل زمانہ تک صلوۃ ضحیٰ پر مداومت کو دیکھ کر ہم صحابہ اپنے دلوں میں کہتے تھے یا یہ کہ ہم آپس میں ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ **لایدعها** یعنی اب آپ ﷺ اس نماز کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ **حتی نقول لا یصلّیها** یعنی پھر طویل زمانہ تک ترک کو دیکھ کر ہم کہتے کہ دوبارہ شروع کرنے والے نہیں ہیں۔ لیکن ہمارے دونوں خیال غلط نکلتے اور آپ ﷺ پڑھتے پڑھتے چھوڑ دیتے تھے اور پھر چھوڑنے کے بعد شروع کر دیتے تھے۔

جہاں تک آپ ﷺ کے چھوڑنے کا تعلق تھا۔ تو اس کا سبب یہ ہوتا تھا کہ کہیں دیکھنے والے یہ تو ہم نہ کر بیٹھیں کہ یہ نماز فرض یا واجب ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کے شوق کو دیکھ کر اسے حقیقتاً واجب نہ کر دیں۔ تیسری وجہ بعض لوگوں نے یہ لکھی ہے کہ اگر آپ ﷺ مداومت فرماتے تو پھر یہ واجب یا کم از کم سنت موکدہ بن جاتی۔ یوں اس امت کیلئے ایک نماز زائد ہو جاتی۔ لہٰذا آپ ﷺ نے شفقت فرماتے ہوئے اس سے امت کو معاف فرمایا۔

بہر حال آپ ﷺ کے عمل سے کم از کم اس نماز کا مستحب ہونا معلوم ہو رہا ہے اور یہی احناف رحمہم اللہ اور جمہور کا مسلک ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس نماز کے بہت سے فضائل بھی ذکر کی ہیں جو کہ حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں (۱)۔

<u>(۱) صلوٰۃ ضحیٰ اور بے بنیاد عوامی باتیں:</u> بعض شروح کے مطابق عوام میں یہ بات مشہور ہے کہ جو شخص صلوۃ ضحیٰ پڑھنا شروع کر دے پھر اسے چھوڑ دے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے۔ یونہی عورتوں کے درمیان یہ بات مشہور ہے کہ جو عورت اس نماز کو پڑھتی رہے اور پھر چھوڑ دے تو وہ نوجوان بھی ہو لیکن اس کو حیض اور نفاس آنا بند ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ نماز آئسہ عورتیں پڑھیں تو پڑھیں لیکن جوان عورتوں کو یہ نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ لیکن یہ دونوں باتیں بے بنیاد ہیں۔ شیطانی دھوکہ ہیں۔ اور ایک بڑے ثواب سے مردوں اور عورتوں کو محروم رکھنے کیلئے گھڑی گئی ہیں۔ کیونکہ خود نبی کریم ﷺ سے ثابت ہو چکا ہے کہ وہ اس نماز کو پڑھتے بھی تھے اور پھر ترک بھی کر لیتے تھے۔ لہٰذا پڑھنے کے بعد چھوڑنے میں بھی کسی قسم کے وبال کا کوئی خطرہ نہیں۔ کذا فی المجمع (اصلاح الدین)

(٦) حدّثنا احمد بن منیع عن هشیم اناعبیدۃ عن ابراھیم عن سھم بن منجاب عن قرثع الضبّی او عن قزعۃ عن قرثع عن أیوب الأنصاریّ أنّ النبیّ ﷺ کان یدمن أربع رکعات عندزوال الشمس فقلت یارسول اللہ ﷺ إنک تدمن ھذہ الأربع الرکعات عندزوال الشمس فقال أنّ أبواب السماء تفتح عند زوال الشمس فلاترتجّ حتیّ تصلّی الظھر فاحبّ ان یصعد لی فی تلک الساعۃ خیرقلت أفی کلّھنّ قراءۃ قال نعم قلت ھل فیھنّ تسلیم فاصل قال لا۔

حدّثنا احمد بن منیع ثنا ابومعاویۃ ثنا عبیدۃ عن إبراھیم عن سھم بن منجاب عن قزعۃ عن القرثع عن أبی أیّوب عن النبیّ ﷺ نحوہ(١)۔

ترجمہ: حضرت ابوایوب الانصاریؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ زوال کے وقت ہمیشہ چاررکعات پڑھتے تھے۔میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ ﷺ زوال کے وقت چاررکعتوں پر دوام فرماتے ہیں(اس کی کیاوجہ ہے)تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ آسمان کے دروازے زوال کے وقت کھول دیئے جاتے ہیں۔پھر ظہر کی نماز تک بندنہیں کیے جاتے۔اس لئے میں چاہتاہوں کہ میرا کوئی نیک عمل اس وقت آسمان پر چڑھ جائے۔میں نے عرض کیا کہ کیااس نماز کی تمام رکعتوں میں قراءت ہے۔تو آپ ﷺ نے فرمایاہاں۔میں نے پھرعرض کیا کہ کیاان چاروں کے درمیان سلام ہے۔آپ ﷺ نے فرمایانہیں۔

کان یدمن ادمن یدمن ادمان کسی کام کومداومت سےاور ہمیشہ کرنا۔یعنی آپ ﷺ صلوۃ ضحیٰ کوہمیشہ پڑھا کرتے تھے۔

---

(١)وبمعنی الحدیث فی سنن ابی داؤد ١٨٧/١ کتاب الصلوٰۃ باب الأربع قبل الظھروبعدھا، وبمعنی الحدیث فی سنن ابن ماجۃ ص ٨٢ کتاب اقامۃ الصلوٰۃ والسنۃ فیھا باب فی الاربع رکعات قبل الظھر، السنن الکبریٰ للبیھقی ٢/٤٨٨ کتاب الصلوٰۃ(مختار)

عندزوال الشمس کا مطلب اور باب سے تطبیق: عندزوال الشمس الخ عند کا لفظ ''مع'' ''قبل'' اور ''بعد'' کے معنی میں مستعمل ہے۔اب یہاں کونسا وقت مراد ہے اور نماز سے کونسی نماز مراد ہے۔بعض شراح نے لکھا ہے کہ عند کا لفظ یہاں قبل کے معنی میں اور زوال سے پہلے پڑھی جانے والے چاشت کی نماز اس کا مصداق ہے۔یوں یہ حدیث ترجمۃ الباب سے موافق ہوجائے گا۔لیکن اکثر شراح کے نزدیک عند اس مقام پر بعد کے معنی میں ہے۔اور اس نماز سے مراد بظاہر ظہر کی سنتیں ہیں۔

کیونکہ اس وقت ظہر کی سنتوں کے سوا اور کوئی نماز نبی کریم ﷺ سے علی سبیل الدوام ثابت نہیں ہے۔نیز اسی باب کی آئندہ تمام احادیث بھی اس بات کی تائید کررہی ہیں کہ آپ اس وقت ظہر کی سنتیں پڑھتے تھے۔اور زوال کے بعد کا وقت اس مقام پر مراد ہے۔

البتہ اس پر یہ اعتراض ضرور وارد ہوتا ہے کہ اس صورت میں باب کے ساتھ ان احادیث کی مطابقت نہیں رہتی۔اس کے جواب میں ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے کہ چونکہ زوال کے بعد پڑھی جانے والی نماز اس سے قبل پڑھی جانے والی نماز سے بالکل قریب ہے۔اس لئے بعد الزوال سنتوں کو بھی صلوٰۃ الضحی کہا گیا ہے۔اور یہاں جر جوار کی نوعیت کی متابعت سے گویا بعد کی نماز قبل الزوال کی نماز کی تابع ٹھہری۔

جبکہ علامہ بیجوریؒ نے دو اور جواب ذکر کئے ہیں۔اول یہ کہ دراصل یہ چاروں احادیث اس باب کے نہیں بلکہ باب عبادۃ النبی ﷺ کی احادیث ہیں۔کسی ناسخ نے اپنے نسخہ میں غلطی سے اسے اپنی جگہ سے مؤخر کر کے یہاں ذکر کیا ہے۔اور باب العبادۃ کے ساتھ ان احادیث کا تعلق واضح ہے۔دوم یہ کہ دراصل یہاں پر باب العبادۃ کے عنوان سے صرف ایک ہی باب اصل کتاب میں موجود تھی۔اور باب صلوٰۃ الضحی، باب التطوع اور باب ماجاء فی صوم النبی ﷺ والے تین ابواب کے الگ الگ عنوان اصل نسخوں میں موجود ہی نہیں بلکہ یہ ساری احادیث عبادات کے ضمن میں مذکور تھیں۔اگر یہ بات تسلیم کرلی جائے پھر تو سرے سے اعتراض کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

فاحِبُّ ان یصعدلی الخ صعود سے مراد صرف قبول ہے۔رفع الی مقام القبول نہیں ہے کیونکہ اعمال ظہر کے وقت پیش نہیں ہوتے بلکہ فرشتے اعمال کو صبح اور عصر کی نماز کے بعد آسمان پر اٹھا کر لیجاتے ہیں۔

عن سھم بن منجاب عن قزعۃ عن القرثع دوسری سند میں امام ترمذیؒ دراصل یہ بتانا

چاہتے ہیں کہ سہم بن منجاب اور قرثع کے درمیان قزعہ کا واسطہ ثابت ہے۔اس میں شک نہیں ہونا چاہیے جبکہ سابقہ سند میں اس بات کو شک کی صورت میں بیان کیا گیا تھا کہ منجاب قرثع سے بلاواسطہ یا پھر قزعہ کے واسطے سے روایت کرتے ہیں۔

(۸) حدّثنامحمّد بن المثنٰی اناابو داؤ دثنامحمّد بن مسلم بن أبی الوّضاح عن عبدالکریم الجزریّ عن مجاھد عن عبداللّٰہ بن السائب أنّ رسول اللّٰہ ﷺ کان یصلّی اربعاً بعدان تزول الشمس قبل الظھروقال إنّھاساعة تفتح فیھا ابواب السماء فاحبّ ان یصعدلی فیھا عمل صالحٌ(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن سائبؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ زوال کے بعد ظہر سے قبل چار رکعات نماز پڑھتے تھے۔اور یہ بھی فرمایا کہ یہ وہ وقت ہے جس میں آسمان کے دروازے کھلتے ہیں۔ چنانچہ میرا دل چاہتا ہے کہ اس وقت میرا کوئی نیک عمل قبولیت کا مقام پائے۔

بعدان تزول الشمس یہ تصریح ہے کہ جو چار رکعات نبی کریم ﷺ وقت کی رعایت کی خاطر پڑھتے تھے۔وہ زوال کے بعد ہوتے تھے۔البتہ باب سے عدم مطابقت کے اعتراض کا گزشتہ صفحات میں ہم جواب لکھ چکے ہیں۔

(۹) حدّثناأبوسلمة یحییٰ بن خلف ثناعمربن علّی المقدّمی عن مسعر بن کدام عن أبی إسحاق عن عاصم بن ضمرة عن علیّ أنّہ کان یصلّی قبل الظھر أربعا و ذکرأنّ النبیّ ﷺ کان یصلّیھا عندالزوال ویمدُّ فیھا(۲).

---

(۱)جامع ترمذی ۱/۱۰۸ کتاب الصلوٰۃ باب ماجاء فی الصلوٰۃ عندالزوال، مسنداحمد۳/۱۱۴، شرح السنة للبغوی ۳/رقم الحدیث ۸۹۰(مختار)

(۲)وبمعنی الحدیث فی جامع ترمذی ۱/۹۶ کتاب الصلوٰۃ باب ماجاء فی الأربع قبل الظھر، سنن ابن ماجة کتاب اقامة الصلوٰۃوالسنة باب فی الاربع رکعات قبل الظھر ۸۲(مختار)

ترجمہ: حضرت علیؓ ظہر سے قبل چار رکعات نماز پڑھتے تھے۔اور انہوں نے بتایا کہ نبی کریم ﷺ بھی اسے زوال کے وقت پڑھتے تھے۔اور اس میں طویل قرأت پڑھتے تھے۔

أنّ النبیّ ﷺ کان یصلّیھا الخ ظہر کی ان چار سنتوں کی فضیلت میں دیگر احادیث بھی مروی ہیں۔ایک حدیث میں آتا ہے''اربع قبل الظھر وبعد الزوال تحسب بمثلھنّ فی السحر (۱)(الحدیث)''یعنی زوال کے بعد ظہر سے پہلے چار رکعات ثواب کے لحاظ سے صبح سے پہلے (تہجد) کی نماز کے برابر شمار کی جاتی ہیں۔

اس مبارک وقت کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ رحمت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔اور تہجد کے وقت کے بارے میں نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ ہر رات نصف شب کے بعد رب تعالیٰ زمین پر نزول فرماتے ہیں۔

زیر نظر حدیث اور اس سے پہلے دیگر احادیث سے یہ بات بھی بخوبی معلوم ہو رہی ہے کہ ظہر سے پہلے چار رکعات پڑھنا سنت ہے۔دو پر اکتفاء نہیں کرنا چاہیے۔جیسا کہ گزشتہ باب کی آخری احادیث میں ہم بیان کر چکے ہیں۔

ویمدّ فیھا آپ ﷺ ان چار رکعتوں میں طویل قرأت پڑھتے تھے۔یعنی فجر کی سنتوں کی طرح ان میں تخفیف نہیں فرماتے تھے۔امام غزالیؒ تو فرماتے ہیں کہ ان رکعتوں میں سورۃ بقرہ یا ایسی ہی لمبی سورت پڑھنی چاہیے۔

---

(۱) ترمذی شریف ج ۲ ص ۱۴۱

خلاصہ باب

نبی کریم ﷺ جس طرح راتوں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ راز و نیاز میں مشغول رہتے تھے۔اس طرح دن کے وقت بھی تقرب کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔اوراس باب میں اسی مبارک عادت کا بیان ہے کہ آپ ﷺ اشراق اور چاشت کے وقت نوافل پڑھتے تھے اور پڑھنے کی ترغیب بھی دیا کرتے تھے۔

اس نماز میں رکعتوں کی تعداد میں اختلاف ہے۔دو رکعتوں سے لیکر بارہ رکعتوں تک کی روایات موجود ہیں۔اکثر واغلب چار رکعتیں آپ ﷺ نے پڑھیں ہیں۔آٹھ رکعتوں کی روایات بھی کثیر ہیں۔ لیکن کوئی حتمی عدد متعین نہیں فرمائی۔البتہ آپ ﷺ نے تقریباً اسے مواظبت کے ساتھ پڑھا ہے اگر چہ کبھی کبھی استحباب کے بیان کیلئے یا خوف وجوب کی بنا پر آپ ﷺ اس نماز کو ترک بھی کیا کرتے تھے۔شمائل کے علاوہ کتب حدیث میں اس نماز کے فضائل میں متعدد احادیث مروی ہیں۔

۴۲۔ باب صلوٰۃ التطوع فی البیت

نفل نماز گھر میں پڑھنے کا بیان

اس سے پہلے نبی کریم ﷺ کی عبادت اوراس کی کچھ مخصوص انواع کا ذکر تھا۔ یہاں پر نفلی عبادت کا مناسب انداز میں بیان کیا جاتا ہے کہ اگر نماز فرض ہو وہ تو مسجد میں پڑھنا اولیٰ ہے۔ لیکن نوافل کا مسجد کی نسبت گھر میں پڑھنا اولیٰ ہے۔ اس باب میں ایک حدیث لائی گئی ہے۔

(۱) حدثنا عباس العنبری ثناعبدالرحمان بن مهدیّ عن معاویة ابن صالح عن العلاء بن الحارث عن حرام بن معاویة عن عمّه عبداللّٰه ابن سعد قال سالت رسول اللّٰه ﷺ عن الصلوٰة فی بیتی والصلوٰة فی المسجدقال قد تری ماأقرب بیتی من المسجد فَلَأنْ أصلّی فی بیتی أحبّ إلیّ من ان أصلی فی المسجد إلاّأن تکون صلوٰة مکتوبة(۱)۔

ترجمہ: عبداللہ بن سعدؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ میری نفل نماز میرے لیے گھر میں بہتر ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم دیکھتے ہو کہ میرا گھر مسجد کے کتنے قریب ہے پھر (بھی) گھر میں نماز پڑھنا مجھے مسجد میں نماز پڑھنے کی نسبت زیادہ پسند ہے۔ البتہ اگر فرض نماز ہو (تو وہ مسجد میں پڑھتا ہوں)

عبداللّٰہ بن سعدؓ انصاری صحابی ہیں بنوحرام سے تعلق ہے۔ حرام بن معاویہ بن سعد جوان سے روایت کرتے ہیں کے چچا ہیں۔ بعض لوگوں نے اسے قرشی اموی کہا ہے۔ جنگ قادسیہ میں ان کی شرکت بھی منقول ہے۔ دمشق میں رہتے تھے۔ بعض لوگوں نے اسے ازدی کہا ہے اور بعض نے بنی تیم اللہ کی طرف اسے منسوب کیا ہے۔ امام ابوداوُدؒ نے غسل میں بھی ان کی ایک حدیث روایت کی ہے۔ جس میں غسل کے موجبات کے بارے میں آپؓ نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا ہے(۲)۔

---

(۱)سنن ابن ماجة۹۸ کتاب اقامة الصلوٰة والسنة فیها باب ماجاء فی التطوع فی البیت، مسنداحمد۳۴۲/۴ شرح معانی الاثار ۲۳۶/۱ کتاب الصلوٰة باب التطوع فی المساجد(مختار)

(۲)الاصابة۳۱۸/۲ (مختار)

فلان اصلّی فی بیتی الخ یعنی میرا گھر مسجد سے بالکل متصل ہے۔ازواج مطہرات کے حجروں کے دروازے مسجد نبوی ﷺ کے ایک حصے میں کھلتے ہیں۔اس قرب کے باوجود گھر میں نفل پڑھنا مجھے محبوب ہے۔اس سے کہ مسجد میں نفل نماز پڑھوں۔

عبادات میں فرض عبادات کے بارے میں یہ حکم ہے کہ ان کو علانیۃ ادا کیا جائے کیونکہ یہ شعائر اسلام ہیں۔اور اسلامی شعائر کا اخفاء ناجائز اور اعلان مطلوب ہے۔مثلاً فرض نماز، حج زکوٰۃ وغیرہ جہراً اور علانیۃً ادا کرنا چاہیے۔اس طرح وہ نوافل جن کی مشروعیۃ مسجد میں یا علانیۃ ہوئی ہے وہ بھی چھپ کرادانہیں کرنا چاہیے۔مثلاً تحیۃ المسجد،طواف کی دو رکعتیں،نماز تراویح،عیدین،اور خوف وکسوف کی نمازیں۔

اس کے برعکس جو نمازیں خالص نفل ہیں ان کو گھر میں تنہا ادا کرنا افضل ہے۔اور گھر میں ادائیگی کا رجحان کئی وجوہ سے ہے۔

(۱) اس طرح ریا سے آدمی بچ سکتا ہے۔

(۲) خود پسندی اور تکبر سے آدمی محفوظ رہتا ہے۔

(۳) منافقین کی مخالفت اور مؤمنین صادقین کے ساتھ مشابہت ہوجاتی ہے۔

(۴) گھر میں فرشتوں کا ورود اور شیاطین سے حفاظت ہوجاتی ہے۔

(۵) گھر اور گھر والوں میں برکت ہوتی ہے۔اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے **''اجعلوا فی بیوتکم من صلوتکم ولا تتخذوھا قبوراً''** (متفق علیہ)

<u>خلاصہ باب</u>

اس باب میں نفل نماز کو گھر میں پڑھنے کی تعلیم دی گئی ہے۔جس کے فوائد ہم بیان کر چکے ہیں۔ بخاری شریف کی ایک حدیث میں آیا ہے۔

''افضل صلوٰۃ المرأ فی بیتہ إلاّ المکتوبۃ'' مزید کلام واضح ہے(۱)۔

---

(۱) سنتیں بھی گھر میں پڑھنا افضل ہے۔لیکن اگر گھر میں مشغولیت کا خدشہ ہو تو مسجد ہی میں پڑھ لی جائیں۔چونکہ آج کل سستی کا غلبہ ہے۔اس لئے مسجد میں پڑھنے پر فتویٰ دیا گیا ہے۔(مختار)

۴۳۔ باب ماجاء فی صوم رسول اللہ ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے روزوں کا بیان

یہاں پر بعض نسخوں میں صیام اور بعض میں صوم مذکور ہے۔لغۃً دونوں صام یصوم کے مصدر ہیں۔صوم کا لغوی معنیٰ امساک یعنی رکنا ہے۔بات کرنے سے رکنے اور ترک کلام کو بھی صوم کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ ''اِنِیّ نَذَرتُ للّرحمٰنِ صَوْماً'' میں مذکور ہے۔

شریعت میں اس کا معنیٰ ''الامساک عن المفطرات من طلوع الفجر الیٰ غروب الشمس بنیّۃٍ'' سے کیا گیا ہے۔

اس باب میں کل سولہ احادیث ذکر کی جائیں گی جن میں اصالۃً تو آپ ﷺ کے نفل روزوں کا بیان مقصود ہے۔لیکن تبعاً فرض روزوں کا بھی ذکر ہے۔روزوں کے بہت سے فضائل ہیں اس سلسلے میں شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریاؒ نے فضائل رمضان میں متعدد احادیث کو جمع فرمایا ہے۔رمضان شریف کے روزے ۲ھ میں فرض ہوئے ہیں۔اس سے قبل آپ ﷺ عاشورے کا روزہ التزام سے رکھتے تھے (۱)۔

(۱) حدّثنا قتیبة بن سعید ثنا حمّاد بن زید عن أیوب عن عبداللّٰہ بن شقیق قال سألت عائشة عن صیام رسول اللّٰہ ﷺ قالت کان یصوم حتیّٰ نقول قد صام ویفطر حتّی نقول قد افطر قالت وما صام رسول

(۱) روزوں کی مشروعیت تخلیق آدم سے ہے۔حضرت آدمؑ ایام بیض یعنی چاند کی ۱۳، ۱۴، ۱۵ تاریخ کو روزہ رکھتے تھے۔ حضرت نوحؑ نے اس دن روزہ رکھا جب کشتی مقام جودی پر ٹھہری۔حضرت داؤدؑ ایک دن روزہ اور ایک دن افطار کیا کرتے تھے۔حضرت موسیٰؑ نے کوہ طور پر قیام کے دوران چالیس دن روزے رکھے۔اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کا معمول تھا کہ ایک دن روزہ اور دو دن افطار کیا کرتے تھے اور اسی تسلسل کی وجہ سے امت محمدیہ کو بھی روزوں کا حکم دیا گیا کما قال تعالیٰ کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم (الآیۃ)

یہ نہیں ہندوؤں میں بھی روزہ رکھنے کا رواج ہے اور پارسی مذہب میں بھی روزے کا حکم موجود ہے گویا روزہ ہر مذہب چاہے آسمانی ہو یا غیر آسمانی سب میں روزہ روحانیت کا نسخۂ مجرب ہے۔(مختار)

اللہ ﷺ شهرا كاملا منذقدم المدينة إلاّ رمضان(۱)۔

ترجمہ: عبداللہ بن شقیقؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے نبی کریم ﷺ کے روزہ رکھنے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کبھی مسلسل روزہ رکھتے تھے حتیٰ کہ ہم یہ خیال کرتے کہ (اس ماہ کے سارے) روزے رکھیں گے پھر کبھی مسلسل روزہ چھوڑ دیتے تھے۔ حتیٰ کہ ہم یہ خیال کرتے کہ (اس ماہ کے سارے ایام) افطار کریں گے۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ جب سے نبی کریم ﷺ مدینہ تشریف لائے ہیں آپ ﷺ نے رمضان کے سوا کسی بھی مہینہ کے تمام روزے نہیں رکھے۔

كان يصوم، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ مسلسل روزے رکھتے تھے اور قدصام کا معنی یہ ہے کہ ہمارا خیال ہوتا کہ آپ ﷺ سارے مہینے کے روزے رکھنے والے ہیں۔ کوئی روزہ نہیں چھوٹے گا۔

منذقدم المدينة، چونکہ عام احکام کا نزول ہجرت کے بعد مدینہ میں ہوا تھا، اس لئے یہ قید لگادی ورنہ مدینہ آنے سے پہلے بھی آپ ﷺ نے مکمل مہینہ کے روزے نہیں رکھے۔

اس حدیث میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ نبی کریم ﷺ رمضان کے سوا کسی دوسرے مہینے کے تمام روزے تو نہیں رکھتے تھے، لیکن کوئی مہینہ بھی روزے رکھے بغیر نہیں گزرتا تھا۔ اس طرح آپ ﷺ مہینہ کے اول، وسط یا آخر کو متعین بھی نہیں فرماتے تھے بلکہ نفل روزے آپ حسب اتفاق رکھا کرتے تھے۔ آئندہ آنے والے احادیث میں آپ ﷺ کے نفل روزوں کے بارے میں مزید تفصیل منقول ہے۔

رمضان کا وجہ تسمیہ: الّا رمضان، رمضان کا لفظ رمض سے نکلا ہے جو سخت گرمی کے معنی میں مستعمل ہے۔ اس مہینہ کا یہ نام کیسے پڑا۔ اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔

(۱) سب سے پہلے جب مہینوں کے نام وضع کئے گئے تو یہ ماہ سخت گرمی کے موسم میں پڑتا تھا اس لئے اسے رمضان کہا جانے لگا۔

---

(۱) صحيح مسلم ۱/۳۶۴ كتاب الصيام باب اكل الناسى وشربه الخ، جامع ترمذى ۱/۱۵۹ كتاب الصوم باب ماجاء فى سرد الصوم (مختار)

(۲) اگر واضع لغت خود اللہ تعالیٰ ہو، تو مہینوں کے نام کے الہام کے وقت رمضان گرمی میں آرہا تھا۔

(۳) یہ رمض الصائم سے ہے جس کا معنی ہے کہ روزہ دار کے سینہ کی گرمی شدید ہوگئی۔

(۴) یہ مہینہ روزہ دار کے گناہ کو جلا دیتا ہے(۱)۔

(۵) رمضان اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ہے اور خصوصی عبادات کی وجہ سے اسے شہر رمضان یعنی خدا کا مہینہ کہا گیا ہے۔

(۲) حدّثنا علیّ بن حجرثنا إسمٰعیل بن جعفر عن حمیدعن أنس ابن مالک أنّه سئل عن صوم النبیّ ﷺ فقال کان یصوم من الشهرحتّی نری ان لا یریدان یفطر ویفطرمنه حتّی نری ان لا یرید ان یصوم منه شیئاو کنت لاتشاء ان تراه من اللیل مصلّیاًإلاّان رأیته مصلّیاو لانائما إلاّرأیته نائماً(۲)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے رسول اللہ ﷺ کے روزوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؓ نے کہا کہ نبی کریم ﷺ بعض مہینوں کے روزے (اتنے تواتر سے) رکھتے

---

(۱) اسی وجہ سے مالکیہ کا کہنا ہے کہ رمضان کا اطلاق غیر اللہ پر بغیر قید کے جائز نہیں۔ اور اکثر شافعیہ فرماتے ہیں کہ اگر غیر اللہ پر اطلاق کے لئے قرینہ موجود ہو تو بغیر قید کے بھی رمضان کا استعمال جائز ہے ورنہ بغیر قید کے رمضان کا اطلاق غیر اللہ پر مکروہ ہے۔ مگر مذکورہ حدیث پاک اور دوسرے روایات ان دونوں آراء کے خلاف ہیں۔ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے **وقال الشارح من علمائنا فیه دلیل للمذهب الصحیح المختار الذی ذهب إلیه البخاری و المحققون أنّه یجوزان یقال رمضان من غیرذکرالشهر بلاکراهة وقالت طائفة لایقال رمضان بانفراده بحال انّما یقال شهررمضان....** اور آگے شافعیہ کے قول کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں **قلت فیه قرینة صارفة ایضاً وهی تنزیه اللّٰه تعالیٰ عن المجیٔ الدخول وقدجاء فی حدیث صحیح اذجاء رمضان فتحت ابواب الجنة فینبغی ان یمثل احبّ رمضان ونحوهُ(جمع الوسائل ۱۱۷/۲)(مختار)**

(۲)جامع ترمذی ۱۵۹/۱ کتاب الصوم باب ماجاء فی سردالصوم، صحیح بخاری ۲۶۵/۱، السنن الکبریٰ کتاب الصیام، باب من کره ان یتخذ الرجل صوم شهریکمله من بین الشهور اوصوم یوم من بین الایام(۲۹۹/۴)للبیهقی ۱۷/۳ کتاب الصوم(مختار)

تھے۔ کہ خیال ہوتا کہ نبی کریم ﷺ کا ارادہ روزے کے ترک کا نہیں ہے۔ پھر بعض مہینوں میں (اتنا طویل) افطار فرماتے کہ یہ گمان ہوجاتا کہ اس ماہ میں روزے کا ارادہ ہی نہیں ہے۔ نیز اگر تم رات کے کسی حصے میں نبی کریم ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھنا چاہتے۔ تو ان کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیتے اور اگر اس میں سوتا ہوا دیکھنا چاہتے تو سوتا ہوا دیکھ لیتے۔

فقال کان یصوم من الشهر حتی نری، نون کے ساتھ یہ لفظ نَرَی بھی مروی ہے۔ پھر معنی یہ ہوگا کہ ہم خیال کرتے اور تَـــری تاء کے ساتھ بھی صحیح ہے۔ پھر مطلب یہ ہوگا کہ تجھے لگتا کہ نبی کریم ﷺ اس ماہ میں افطار کرنے والے نہیں۔

نفل صوم وصلوٰۃ میں معمول کے اختلاف کی حکمتیں: بہرحال اس حدیث میں بھی اس بات کا بیان ہے کہ نفل روزوں میں نبی کریم ﷺ کا معمول تمام مہینوں میں یکساں نہیں رہتا تھا۔ اور اس اختلاف معمول کا سبب یا تو یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ مہینے کی مختلف تاریخوں میں روزہ رکھ کر تمام تاریخوں میں برکت کے حصول کی کوشش فرمایا کرتے تھے، دوسری طرف حقوق نفس کی ادائیگی بھی ملحوظ ہوتی تھی۔ اس لئے افطار بھی فرمایا کرتے تھے اور یا یہ کہ اس طرح نفس کسی خاص معمول کا عادی نہیں بنتا تھا۔ اور یوں عبادت میں نفس کی مشقت بحال رہتی، جس سے روح کو سکون ملتا ہے۔

علاوہ ازیں روزہ نفس کیلئے ایک دوا اور علاج بھی ہے جو کہ بوقت ضرورت کم یا زیادہ استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی یا دیگر عوارض کی وجہ سے ترک کیا جاتا ہے۔ روزے کے ساتھ یہی معاملہ برتنا عین قرین قیاس ہے تا کہ اعتدال برقرار رہے۔

وکنت لاتراہ من اللّیل مُصلیًاالخ، یہاں روزے کے بارہ میں سوال ہوا تھا لیکن نفل نماز کا بھی حکم زیادۃ فی الافادۃ کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ نیز اس بات پر تنبیہ کیلئے بھی کہ سائل کو نماز کا بھی اہتمام کرنا چاہئے۔ خلاصہ یہ کہ آپ تہجد کے ساتھ بھی تقدیم وتاخیر اور کمی وبیشی کا معاملہ روزے کی طرح کیا کرتے تھے اور اس جگہ بھی معمول میں اختلاف کی تقریباً وہی حکمتیں ہیں جو وہاں ہیں۔

مداومت اعمال اور ترک اعمال کے روایات میں تطبیق: یہاں ایک اعتراض ہوتا ہے کہ متعدد احادیث میں اس بات کا ذکر ہے کہ آپ ﷺ اعمال میں دوام کو پسند فرماتے تھے چنانچہ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ **کان اذاصلّی داوم علیها**، ایک اور روایت میں ہے کہ **کان عمله دیمةً**، ایک اور روایت میں ہے کہ **احبّ الأعمال إلی اللّٰه مادیم علیه**، اور ظاہر ہے کہ زیر نظر احادیث میں اس کے برعکس مذکور ہے۔ اس کا جواب علامہ ابن حجرؒ نے تو یوں دیا ہے کہ جس دوام کا ذکر کیا گیا ہے وہ واجب اعمال کے بارے میں ہے اور نوافل میں آپ دوام نہیں کرتے تھے لیکن علامہ میرک نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ یہ جواب تسلی بخش نہیں ہے۔

ملا علی قاریؒ نے کہا ہے کہ تہجد کو آگے پیچھے کرنے اور کبھی اول شب میں اور کبھی آخر شب میں پڑھنے کا دوام سے منافات ہی نہیں ہے۔ لہٰذا سرے سے یہ اعتراض بے جا ہے۔

(۳) حدّثنا محمود بن غیلان ثنا أبو داؤد ثنا شعبة عن أبی بشر قال قال سمعت سعید بن جبیر عن ابن عبّاس قال کان النبیّ ﷺ یصوم حتیّ نقول مایرید ان یفطر منه ویفطر حتیّ نقول مایرید ان یصوم وماصام شهرا کاملا منذ قدم المدینة إلاّ رمضان(۱)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کبھی کسی مہینے کے روزے مسلسل رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ ہم یہ سمجھتے کہ (اس ماہ میں) افطار کا ارادہ نہیں ہے۔ اور کبھی کسی ماہ میں مسلسل افطار فرماتے حتیٰ کہ ہم یہ سمجھتے کہ (اس ماہ میں) روزے رکھنے کا ارادہ نہیں ہے۔ اور جب سے آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے آپ ﷺ نے رمضان کے سوا کسی بھی مہینہ کے تمام روزے نہیں رکھے۔

---

(۱) صحیح بخاری ۱/۲۶۷ کتاب الصیام باب یذکر من صوم النبیّ ﷺ وافطاره، صحیح مسلم ۱/۳۶۵ کتاب الصیام باب صیام النبیّ ﷺ وغیره رمضان سنن النسائی ۱/۲۵۰ کتاب الصیام باب صوم النبی ﷺ (مختار)

<u>نفل اعمال میں میانہ روی:</u> وماصام شهراً كاملاً الخ، اس حدیث میں بھی اس بات پر تنبیہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے نفل روزے افراط وتفریط سے خالی اور اعتدال پر مبنی ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے جب بعض صحابہ نے صوم الدھر یعنی ہمیشہ کیلئے روزے رکھنے کا عزم ظاہر کیا۔ تو آپ ﷺ نے اس پر انکار فرمایا اور اپنی میانہ روی کو قابل تقلید بتایا(۱)۔

(۴) حدّثنا محمّدبن بشارثنا عبدالرحمان بن مهدىّ عن سفيان عن منصورعن سالم بن أبى الجعد عن أبى سلمة عن امّ سلمة قالت مارأيت النبىّ ﷺ يصوم شهرين متتابعين إلاّشعبان ورمضان(۲).

قال ابوعيسىٰ هذااسنادصحيح وهكذاقال عن أبى سلمة عن امّ سلمة وروىٰ هذاالحديث غيرواحدٍ عن أبى سلمة عن عائشة عن النبىّ ﷺ

---

(۱) مسلسل روزوں کے بارے میں علامہ بنوریؒ نے مختلف مذاہب لکھے ہیں فرماتے ہیں ذهب الجمهور إلىٰ جوازه وهومستحب عندالشافعى إذاأطاقه ولم يؤدإلىٰ فوات حق وإلىٰ كراهته ذهب اسحق والظاهرية وأحمد فى رواية وشذّابن حزم فقال يحرم كمافى الفتح قال ابن قدامة الذى يقوى عندى أن صوم الدهر مكروه وعزاالنووى الكراهة إلى أبى يوسف وغيره من أصحاب الامام ولم يذكرالبدر العينى فى العمدة خلاف أبى حنيفة ولا صاحبه وقد صرّح فى البدائع بمايدل على كراهته عندأبى يوسف،راجعه (۲. ۷۹)قال ابن الهمام فى "فتح القدير" ويكره صوم الدهر لأنه يضعفه، أو يصير طبعاً له، ومبنى العبادة على مخالفة العادة اه. وصرح فى "الدر" بكراهته تنزيهاً، والكراهة هى المذكورة فى "البدائع" ويستفاد من "الفتاوى الهندية" أن صوم الدهر وصوم الوصال واحد، حيث قال: ويكره صوم الوصال وهو أن يصوم السنة كلها ولايفطرفى الأيام المنهى عنها، وإذا أفطرفى الأيام المنهية المختار أنه لا بأس به، كذا فى "الخلاصة" (معارف السنن ۵/۳۵۴)(مختار)

(۲)جامع ترمذى ۱/۱۵۵ كتاب الصوم باب ماجاء فى وصال صيام شعبان برمضان، سنن ابن ماجة ۱۱۹ كتاب الصيام باب ماجاء وصال صيام شعبان برمضان، مصنف ابن ابى شيبة۳/۲، كتاب الصيام، من رخص ان يصل رمضان بشعبان(۲/۳۳۸)،السنن الكبرىٰ للبيهقى ۴/۲۱۰ كتاب الصيام باب الرخصة فى ذلك(اى فى رخصة الصيام اذاانتصف شعبان) بماهواصح من حديث العلاء(۴/۲۱۰)(مختار)

ویحتمل ان یکون ابوسلمة بن عبدالرحمان قدروی هذاالحدیث عن عائشة وامّ سلمةجمیعا عن النبیؐ ﷺ.

ترجمہ: ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو شعبان اور رمضان کے سوادو مہینے مسلسل روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔

امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ یہ سند درست ہے اور اسی طرح حضرت سالم بن ابی الجعدؒ نے یوں کہا کہ **عن ابی سلمة عن عائشةؓ عن النبی ﷺ**، یہ بھی ممکن ہے کہ ابوسلمۃ بن عبدالرحمان نے اس حدیث کو حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ دونوں کے واسطہ سے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہو۔

<u>وجہ تسمیہ شعبان:</u> **الأشعبان ورمضان**، شعبان کو شعبان دووجوہ سے کہا گیا ہے اول یہ کہ عرب لوگ اس ماہ میں پانی کی تلاش میں متشعب یعنی متفرق ہو گئے تھے دوم یہ کہ ماہ رجب کا مہینہ انکے ہاں محترم تھا، رجب گزرنے کے بعد وہ غارات اور لوٹ مار کیلئے ادھر ادھر نکل جاتے تھے چنانچہ یہ مہینہ انکے تشعب اور تفرق کا تھا۔

<u>تعارض روایات کی توجیہ:</u> اس حدیث پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس باب کی احادیث میں یہ بات مصرح ہے کہ آپ ﷺ رمضان کے علاوہ کسی بھی مہینے کے روزے کامل نہیں رکھتے تھے تو اس حدیث میں شعبان کے سارے روزے رکھنے کی بات کیوں کر درست ہوسکتی ہے۔ اس کا جواب متعدد وجوہ سے دیا گیا ہے۔

اول: اس حدیث میں اکثر کوکل کے قائم مقام بنایا گیا ہے چونکہ شعبان میں افطار کے نسبت روزے زیادہ ہوتے تھے۔ اس لئے گویا سارے ماہ کے روزے رکھنے کی خبر ہے۔ جیسا کہ اگلے حدیث میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

دوم: یہاں شعبان کے سارے روزے رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ کبھی اول عشرے میں، کبھی دوسرے عشرے میں، کبھی تیسرے عشرے میں آپ ﷺ اس کے روزے رکھتے تھے۔ اس طرح کئی سالوں میں اس کے سارے روزے رکھ لیتے تھے۔

سوم: حضرت ام سلمہؓ کی حدیث مثبت ہے اور دیگر احادیث نافی ہیں تو شاید ام سلمہؓ کو اس کا علم ہو چکا ہو۔ اور دیگر صحابہؓ کو علم نہ ہو۔

چہارم: یہ کہ ہوسکتا ہے کہ شعبان کے سارے روزے رکھنے کا قصہ مکی زندگی کا واقعہ ہو۔ اور دیگر احادیث مدنی زندگی کے متعلق ہوں جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی پچھلی حدیث میں ''منذقدم المدینه'' کے قید سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مدینہ آنے کے بعد آپ ﷺ نے رمضان کی تخصیص کا اہتمام کیا تھا، مکہ میں کسی اور مہینے کے سارے روزے رکھے ہوں تو بعید نہیں ہے۔

رمضان کے روزے تو فرض ہیں لیکن شعبان میں بھی آپ بکثرت روزے رکھتے تھے بلکہ اس حدیث کی طرح اگلی حدیث اور دیگر احادیث سے یہ بات صراحۃً ثابت ہے کہ شعبان میں تقریباً سارا مہینہ آپ روزے رکھتے تھے۔ اس اہتمام کی متعدد وجوہ ذکر کی گئی ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے:

۱) ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ شعبان میں بندہ کے سال بھر کے اعمال اللہ کے حضور پیش کیے جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے اعمال ایسی حالت میں اللہ کے دربار میں پیش ہوں کہ میں روزے سے ہوں۔

۲) نبی کریم ﷺ ہر مہینے تین دن کے روزے رکھتے تھے جبکہ بعض ایام مثلاً پیر اور جمعرات کو بھی اکثر روزے کا اہتمام فرماتے لیکن کبھی کبھی سفر، جہاد یا دوسری وجوہ کی بناء پر روزے رہ جاتے تھے چنانچہ شعبان بھر کے روزے رکھ کر آپ ﷺ وہ کمی پورا فرماتے تھے۔

۳) ایک روایت میں ہے کہ شعبان کے روزے رمضان کی تعظیم کی وجہ سے افضل ہیں۔

۴) ایک روایت میں آپ ﷺ نے شعبان میں بکثرت روزے کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ اس مہینے میں سال بھر میں مرنے والوں کے نام درج کیے جاتے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ میری موت ایسی حالت میں لکھی جائے جب کہ میں روزہ دار ہوں۔

۵) بعض علماء نے لکھا ہے کہ چونکہ رمضان میں نفل روزے رکھنا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا آپ ﷺ رمضان شریف کے مہینے کے نفل روزے پیشگی شعبان میں رکھ لیتے تھے اور دوسرے مہینوں کی نسبت زیادہ رکھ لیتے تھے۔

ویحتمل ان یکون ابوسلمة الخ، امام ترمذیؒ نے جو احتمال ذکر کیا ہے دوسری کتب حدیث سے اس احتمال کو تقویت ملتی ہے۔

(۵) حدّثناھنّادثناعبدة عن محمّدبن عمروثناأبوسلمة عن عائشة قالت لم أررسول اللہ ﷺ یصوم فی شھرأکثرمن صیامه فی شعبان کان یصوم شعبان إلّاقلیلا بل کان یصوم کلّه(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کوشعبان کی نسبت کسی مہینہ میں زیادہ روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔سوائے چندایام کے آپ ﷺ تمام شعبان کے روزے رکھتے تھے بلکہ گویا تمام شعبان کے روزے رکھتے تھے۔

یصوم فی شھر الخ، ترکیب میں یہ "لم أر" کے مفعول سے حال واقع ہوا ہے یعنی اس حالت میں کہ نبی کریم ﷺ کسی ماہ کے روزے رکھتے تھے۔ یہ تشریح اس وقت ہے جب "لم آر" سے رویت بصری مراد ہو اور اگر رویۂ علمی ہو تو "یصوم فی شھر "مفعول ثانی بن جاتا ہے۔اکثر من صیامه یعنی لَمْ آرَہُ یصوم صیاماً اکثر من صیامه الخ، اس طرح اکثر صیاماً کی صفت ہے جو مفعول مطلق مقدر ہے۔

بل کان یصوم الخ ،بل ترقی کیلئے ہے یعنی پہلے تو چند دن کی استثناء کردی لیکن یہ دن اتنے کم ہوتے تھے گویا کالعدم ہوں اور تمام مہینے روزے سے ہوں باقی شعبان کے روزوں کی اہمیت کے اسباب پہلے ذکر کئے جاچکے ہیں۔

(۶) حدّثناالقاسم بن دینار الکوفیّ ثناعبیداللہ بن موسیٰ وطلق ابن غنام عن شیبان عن عاصم عن زرّ عن عبداللہ قال کان رسول اللہ ﷺ یصوم من غرّة کل شھر ثلاثة ایّام وقلّ ماکان یفطر

(۱)صحیح بخاری ۱/۲۶۴ کتاب الصوم باب صوم شعبان،صحیح مسلم ۱/۳۶۵ باب صیام النبی ﷺ فی غیررمضان واستحباب ان لایخلی شھرمن صوم، جامع ترمذی ۱/۱۵۵ کتاب الصوم باب ماجاء فی وصال شعبان برمضان، سنن ابن ماجة باب ماجاء فی وصال شعبان برمضان(۱/۱۹۹) ابواب ماجاء فی الصیام ،السنن الکبریٰ للبیھقی ۴/۲۹۲ کتاب الصوم باب فضل صوم شعبان(مختار)

یوم الجمعة(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہر ماہ کے ابتداء کی تین ایام کے روزے رکھا کرتے تھے اور بہت کم جمعہ کے دن کا روزہ چھوڑتے تھے۔

ہر ماہ کے ابتداء کے تین اور جمعہ کا روزہ: یصوم من غرة کل شهر ثلثه ایام، اس روایت میں ابتدائی تین دنوں کا ذکر ہے جبکہ بعض روایات میں ایام بیض کے تین دنوں کے روزوں کا اہتمام کا ذکر ہے اور بعض میں آخر مہینہ کا بھی ذکر ہے۔گویا آپ ﷺ غیر متعین تین روزے ہر مہینے میں رکھتے تھے اور یہی بات آئندہ صراحۃً مذکور ہے۔ بہر حال اگر روزے کا دس گنا بدلہ مل جائے تو تین روزہ رکھنے سے سارے مہینے کے روزوں کا ثواب مل جائے گا۔اور گویا ہر ماہ تین دن روزہ رکھنے والا ثواب کے لحاظ سے صائم الدھر بن جاتا ہے۔

وقلّما كان يُفطِرُيوم الجمعة، صرف جمعہ کا روزہ رکھنا مندوب ہے، یا مکروہ اس بارے میں مذاہب مختلف ہیں۔شوافع اور حنابلہ کے نزدیک کراہت کا قول راجح ہے۔ اگرچہ ندب کا قول بھی موجود ہے۔ مالکیہ کے نزدیک جمعہ کا روزہ مندوب ہے جبکہ احناف کے ہاں ایک قول کراہۃ تنزیہی اور دوسرا ندب کا ہے۔

البتہ اگر جمعرات یا سنیچر کا روزہ ملا کر جمعہ کا روزہ رکھا جائے تو بالاتفاق مندوب ہوگا۔ ہوسکتا ہے یہاں بھی جمعہ کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ ایک اور روزہ بھی ملا کر رکھتے ہوں گے۔

(۷)حدثنا محمود بن غیلان ثنا أبو داؤد انا شعبة عن یزید الرشک قال سمعت معاذة قالت قلت لعائشة أكان النبیّ ﷺ یصوم ثلاثة ایّام من کل شهر قالت نعم قلت من ایّه کان یصوم قالت کان لایبالی من أیّه صام(۲).

(۱)سنن ابی داؤد ۱/۳۳۹ کتاب الصوم باب فی صوم الثلاث من کل شهر دون مافی آخره، جامع ترمذی ۱/۱۵۷ کتاب الصوم باب ماجاء فی صوم یوم الجمعه، السنن النسائی ۱/۲۵۱ کتاب الصوم، سنن ابن ماجة ۱/۱۲۳ کتاب الصیام باب فی صیام یوم الجمعة(مختار)

(۲) بعض نسخوں میں حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث موخر کر کے بارہویں نمبر پر لائی گئی ہے اور اکثر شراح نے بھی اسی نسخے پر اعتماد کیا ہے۔(مختار)

قال ابو عیسیٰ ویزیدالرشک هویزیدالضبعی البصریّ وهوثقة وروی عنه شعبة وعبدالوارث بن سعید وحمّاد بن زیدوإسماعیل ابن إبراهیم وغیرواحدمن الائمة وهویزیدالقاسم ویقال القاسم والرشک بلغة أهل البصرة هوالقسّام(۱).

ترجمہ: حضرت معاذہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ کیا نبی کریم ﷺ ہر ماہ کے تین روزے رکھتے تھے۔انہوں نے فرمایا کہ ہاں، میں نے پوچھا کہ مہینے کے کن ایام کا روزہ رکھتے تھے۔فرمایا کہ اس کی پرواہ نہیں فرماتے تھے کہ مہینے کے کونسے روزے رکھے۔

امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ(سند میں)یزیدالرشک یزید ضبعی بصری ہیں۔جو ثقہ راوی ہیں، امام شعبہؒ، امام عبدالوارثؒ بن سعید، امام حمادؒ بن زید امام اسماعیل بن ابراہیمؒ اور متعدد ائمہ حدیث نے ان سے روایت کی ہے۔اسی یزید کو القاسم اور القسام بھی کہتے ہیں اور الرشک کے معنی بھی اہل بصرہ کی زبان میں قسام(تقسیم کرنے والے)کے ہیں۔

<u>روایات تعین وعدم تعین ایام میں تطبیق:</u> **کان لایبالی الخ،** حضور ﷺ کے نوافل اور بالخصوص نفل روزوں کا علم حضرت عائشہؓ کو سب سے زیادہ ہوسکتا ہے۔اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ گزشتہ حدیث میں مہینہ کے صرف ابتدائی ایام کا جو ذکر تھا وہ اکثر واغلب پر محمول ہوگا۔یا یہ کسی زمانہ میں تخصیص اور کسی میں عدم تعین کا طریقہ آپ نے اپنایا ہو، اور دونوں صورتوں میں الگ الگ مصالح بھی ہیں علاوہ ازیں ہو سکتا ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ کے علم میں تخصیص وتعین ہو لیکن حضرت عائشہؓ دیگر ایام میں آپ ﷺ کے روزوں کو جانتی ہوں اسلئے ان سے تعمیم مروی ہے۔

---

(۱)صحیح مسلم ۱/۳۶۷ کتاب الصیام باب استحباب صیام ثلاثة ایّام من کل شهرسنن ابی داؤد ۱/۳۳۹ کتاب الصوم باب من قال لایبالی من أیّ الشهر، جامع ترمذی ۱/۱۵۹ کتاب الصوم باب ماجاء فی ثلاثة ایّام من کل شهر، سنن ابن ماجة ۱/۱۲۲ کتاب الصیام باب ماجاء فی صیام ثلاثة من کل شهر.(مختار)

قال أبو عیسیٰ الخ ،امام ترمذیؒ ایک راوی امام شعبہؒ کے استاد یزید الرشک کا تعارف کرا رہے ہیں لیکن یہاں ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ اس راوی کا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے اوران کی روایت باب صلوٰۃ الضحیٰ کی ابتداء میں بھی مذکور ہے۔ تو وہاں ان کا تعارف کیوں نہیں کیا۔اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل امام ترمذیؒ کو یہاں تعارف کی ضرورت کا احساس اس لئے ہوا کہ اس روایت کا گزشتہ روایت سے تدافع معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ سابقہ روایت میں مہینے کے ابتدائی تین ایام کا تعین اوراس میں عدم تعین کا ذکر ہے۔ لہٰذا یہ تو ہوسکتا ہے کہ یہ روایت کمزور ہو اوراس میں یزید الرشک ضعیف ہوں تو امام ترمذی نے تعارف کے ضمن میں یہ تصریح کردی کہ یہ راوی ثقہ ہیں۔ رہا تدافع کا قضیہ تو وہ ہم پہلے نمٹا چکے ہیں۔ نیز یزید الرشک کے احوال بھی پہلے باب نمبر ۴۰ میں گزر چکے ہیں۔

(۸) حدثنا أبو حفص عمرو بن علیّ ثنا عبداللّٰہ بن داود عن ثور ابن یزید عن خالد بن معدان عن ربیعة الجرشی عن عائشة قالت کان النبیّ ﷺ یتحرّی صوم الاثنین و الخمیس(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سوموار اور جمعرات کے دنوں کا روزہ رکھنے کی کوشش فرمایا کرتے تھے۔

پیر اور جمعرات کے روزے اور عرض اعمال: **یتحرّی الصوم**، تحرّی کا معنی ہے "طلب الاحریٰ" یعنی مناسب ترین امر کو ترجیح دینا، تو مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ مذکورہ دو دنوں کو قصداً عمداً روزہ رکھنے کی کوشش فرماتے تھے۔ ان دو دنوں کی تخصیص کی وجہ کی طرف بھی احادیث میں اشارات موجود ہیں۔ مثلاً (۱) یہ کہ ان ایام میں اعمال کی پیشی ہوتی ہے اور روزہ کی حالت میں روزہ دار کا روزہ بھی پیش ہوگا۔ (۲) پیر کے روز نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت بھی ہوئی تھی اور پیر کے روز قرآن شریف کی پہلی

(۱) جامع ترمذی ۱/۱۵۷ کتاب الصوم باب ماجاء فی صوم الاثنین و الخمیس، سنن ابن ماجة ص ۱۲۵ کتاب الصیام باب صیام یوم الاثنین و الخمیس، صحیح ابن حبان ۵/۲۶۱ کتاب الصوم ذکر تحری المصطفی ﷺ صوم الاثنین و الخمیس رقم الحدیث[۳۶۴۵](مختار)

وحی نازل ہوئی تھی۔(۳) پیر اور جمعرات کے روز مسلمانوں کی عمومی مغفرت ہوتی ہے صرف وہ دو شخص اس مغفرت سے محروم رہتے ہیں جن کے درمیان عداوت اور بغض کی وجہ سے ترک کلام ہو۔

(۹) حدثنا ابو مصعب المدینیّ عن مالک بن أنس عن أبی النظر عن أبی سلمة بن عبدالرحمان عن عائشة قالت ماکان رسول اللّٰہ ﷺ یصوم فی شھر اکثر من صیامه فی شعبان(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ شعبان کی نسبت کسی بھی دوسرے مہینہ میں زیادہ روزے نہیں رکھتے تھے۔

ماکان الخ، حضرت عائشہؓ کی اس طرح کی حدیث ابھی گزر چکی ہے جس کی تشریح وہاں ملاحظہ فرمائیں۔اس حدیث کو بھی بعض نسخوں میں کچھ تاخیر کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

(۱۰) حدثنا محمّدبن یحییٰ ثنا ابو عاصم عن محمّدبن رفاعة عن سھیل ابن أبی صالح عن أبیه عن أبی ھریرة أنّ النبی ﷺ قال تعرض الأعمال یوم الاثنین والخمیس فاحبّ ان یعرض عملی وانا صائم(۲).

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ (اللہ تعالیٰ کے ہاں) بندوں کے اعمال پیر اور جمعرات کو پیش ہوتے ہیں۔لہٰذا میرا دل چاہتا ہے کہ میرے اعمال ایسی حالت میں پیش ہوں کہ میں روزہ سے ہوں۔

<u>عرض اعمال کے ایام واوقات کا تعدد</u>: **تعرض الاعمال یوم الاثنین الخ،** پیر اور جمعرات کے دن اعمال کو پیشی کی وجوہ تو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں لیکن مسلم شریف کی ایک روایت میں یہ آتا ہے "یرفع الیه

(۱) صحیح بخاری ۱/۲۶۴ کتاب الصوم شعبان، صحیح مسلم ۱/۳۶۵ کتاب الصیام باب صیام النبیّ ﷺ وغیر رمضان الخ، سنن ابی داؤد ۱/۳۳۸ کتاب الصوم باب کیف کان یصوم النبیّ ﷺ، سنن النسائی ۱/۲۵۱ کتاب الصیام باب صوم النبی ﷺ الخ، مؤطاامام مالک ۱/۳۰۹ کتاب الصوم،(مختار)

(۲) جامع ترمذی ۱/۱۵۷ کتاب الصوم باب ماجاء فی صوم الاثنین والخمیس، سنن ابن ماجة کتاب الصیام باب صیام یوم الاثنین والخمیس، سنن الدارمی ۲/۲۰ کتاب الصوم(مختار)

عمل اللیل قبل عمل النهار وعمل النهار قبل عمل اللیل(۱) ''یعنی روزانہ دن آنے سے پہلے اور پھر رات چھا جانے سے پہلے دو مرتبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اعمال پیش کئے جاتے ہیں۔ تو جب روزانہ دو بار رفع عمل ہوتا ہے تو پھر ہفتے میں دو بار اعمال کی پیشی کا کیا فائدہ ہے۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ روزانہ دو بار رفع عمل ہوتا ہے عرض عمل کا ذکر نہیں ہے اور پھر ان اعمال کا عرض ہفتے میں دو بار ہوتا ہے دوسرا جواب یہ ہے کہ بار بار عرض عمل میں بھی بہت سی حکمتیں ہوسکتی ہیں۔ مثلاً یہ مصلحت کیا کم ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ فرشتوں پر نیک عمل کرنے والوں کی شرافت ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ انسان کی خلقت وخلافت کی حکمت ان پر عیاں ہو جائے کہ وہ صرف فساد کرنے والے نہیں بلکہ نفس امارہ کے باوجود بڑے بڑے نیک اعمال بھی روزانہ وہاں سے آتے رہتے ہیں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تو عرض اعمال کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔ وہ تو علیم وخبیر ہے روزانہ اور ہفتہ وار عرض کے علاوہ سالانہ عرض بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ روایت میں لیلۃ البراءت اور لیلۃ القدر میں بھی عرض اعمال کا ذکر ہے۔ نیز یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بعض اوقات عرض اعمال تفصیلی اور بعض اوقات اجمالی ہو۔

(۱۱) حدثنا محمود بن غیلان ثنا أبو أحمد ومعاویة بن هشام قالا ثنا سفیان عن منصور عن خیثمة عن عائشة قالت کان رسول اللہ ﷺ یصوم من الشهر السبت والاحد والاثنین ومن الشهر الآخر الثلاثاء والأربعاء والخمیس(۲)۔

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کبھی ایک مہینے میں ہفتے اتوار اور پیر کے روزے رکھ لیتے تھے تو دوسرے مہینے میں منگل بدھ اور جمعرات کے روزے رکھتے تھے۔

---

(۱)مشکوۃ شریف ج ۱ ص ۱۲ کتاب القدر

(۱)جامع ترمذی ۱/۱۵۷ کتاب الصوم باب ماجاء فی صوم یوم الاثنین والخمیس ومنه(مختار)

امۃ کی سہولت کے لئے تعدد وتعین ایام میں توسّع: کان یصوم فی الشھر الخ، اس حدیث میں ہفتے کے چھ دنوں کا ذکر ہے جبکہ حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث میں جمعہ شریف کے دن کا ذکر بھی گزر گیا ہے اور یوں آپ ﷺ نے ہفتے کے ساتوں دن روزے کی فضیلت کی طرف اشارہ فرمادیا ہے۔ آپ ﷺ نے ایام کی تعین اس لئے نہیں فرمائی تا کہ امت پر توسّع ہو اور جن ایام میں بھی ان کو روزہ رکھنے میں سہولت ہو، انہی ایام میں روزہ رکھیں اور نبی کریم ﷺ کی اقتداء میں مشکل پیش نہ آئے۔

(۱۲) حدّثناهارون بن إسحاق الهمدانيّ ناعبدة بن سليمان عن هشام بن عروة عن أبيه عن عائشة قالت كان عاشوراء يوماً يصومه قريشٌ في الجاهلية وكان رسول اللّٰهﷺ يصومه فلمّا قدم المدينة صامه وامر بصيامه فلمّاافترض رمضان كان رمضان هوالفريضة وترك عاشوراء فمن شاء صامه ومن شاء تركه(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ عاشور (دس محرم) کے دن کا روزہ قریش زمانہ جاہلیت میں رکھتے تھے اور نبی کریم ﷺ بھی یہ روزہ رکھتے تھے۔ پھر جب آپ ﷺ مدینہ ہجرت کر کے تشریف لائے تو اس دن کا روزہ خود بھی رکھا اوردوسروں کو بھی یہ روزہ رکھنے کا حکم دیا پھر جب رمضان کی فرضیت نازل ہوئی تو صرف رمضان ہی فرض روزہ رہا۔اورآپ نے عاشورے کا روزہ (فرض رکھنا) چھوڑ دیا اب جس کا دل چاہے یہ روزہ رکھے اور جس کا دل چاہے اسے چھوڑ دے۔

عاشوراء، یہ دس محرم کیلئے مخصوص نام ہے۔اس میں لیلۃ عاشوراء تھا لیکن غلبہ اسمیت کی وجہ سے اس کا موصوف ذکر نہیں کیا جاتا۔جیسے الدنیا اور الآخرۃ کا موصوف الدار ذکر نہیں کیا جاتا۔

(۱)صحیح مسلم ۱/۳۵۷باب صوم یوم عاشورآء، جامع ترمذی ۱/۱۵۸ کتاب الصوم باب ماجاء فی الرخصة فی ترک صوم عاشوراء، سنن ابی داؤد ۱/۳۳۸ باب صوم یوم عاشورآء، مؤطاامام مالک کتاب الصوم باب صیام یوم عاشورآء(۲۴۰)، السنن الکبریٰ للبیھقی ۴/۲۸۸ کتاب الصوم باب من زعم ان صوم عاشوراء کان واجباً ثم نسخ وجوبه.(مختار)

قریش کے نزدیک صوم عاشوراء کی اہمیت: یصوم قریش فی الجاهلية، قریش جاہلیت کے زمانے میں یہ روزہ کیوں رکھتے تھے۔شراح نے لکھا ہے کہ چونکہ حضرت نوحؑ یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعتوں میں یہ روزہ فرض تھا۔اس لئے وہ ان کی اتباع میں اس روزہ کو واجب سمجھتے تھے۔حضرت نوحؑ کی کشتی اس روز کنارے پر لگی تھی اور ابراہیمؑ کی ولادت بھی اسی روز ہوئی تھی۔علاوہ ازیں دس محرم کو قریش خانہ کعبہ کے غلاف پوشی کرتے تھے۔ اس وجہ سے بھی یہ دن ان کے ہاں معظم تھا۔ ایک روایت میں مذکور ہے کہ حضرت عکرمہؓ سے کسی نے اس روزہ کے بارے میں دریافت کیا تو آپؓ نے کہا کہ قریش سے جاہلیت میں ایک گناہ سرزد ہوا تھا جس کا ان کو شدت سے احساس ہوا۔کسی نے ان سے کہا کہ اگر عاشورے کا روزہ رکھ لو تو یہ گناہ معاف ہو جائے گا۔چنانچہ انہوں نے یہ روزہ رکھنا شروع کر دیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے یہود کی اتباع میں اس دن کو اہمیت دی ہو۔

دس محرم کے یادگار واقعات: حضرت نوحؑ کی کشتی کے نجات اور ابراہیمؑ کی ولادت کے علاوہ یہ دن اور بھی بہت سے واقعات کی وجہ سے یادگار دن ہے۔چنانچہ حضرت آدمؑ کے توبہ کی قبولیت،موسیٰؑ کی فرعون سے نجات اور فرعون کی غرقابی،عیسیٰؑ کی ولادت اور رفع آسمانی،یونسؑ کی مچھلی کے پیٹ سے نجات،حضرت یوسفؑ کا کنویں سے نکلنا،حضرت ایوبؑ کی صحتیابی،حضرت ادریسؑ کا آسمان پر اٹھایا جانا،حضرت سلیمانؑ کا حکومت پر فائز ہونا اور دیگر بہت سے عظیم واقعات اسی دن ظہور پذیر ہوئے۔کہا جاتا ہے کہ اس دن وحشی جانور بھی روزہ رکھتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

یہود کے ہاں اس دن کی عظمت: قریش کے اس اہتمام کے علاوہ یہود بھی اس دن کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔چنانچہ بخاری ومسلم دونوں میں آیا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو یہود کے بارے میں علم ہوا کہ وہ عاشورے کا روزہ رکھتے ہیں۔آپ ﷺ نے ان سے اس کی وجہ پوچھی۔تو انہوں نے بتایا کہ چونکہ اسی دن موسیٰؑ کو فرعون سے نجات ملی تھی اور فرعون غرق ہوا تھا۔لہٰذا موسیٰؑ نے بطور شکر یہ روزہ رکھا تھا۔ ہم بھی اپنے پیغمبر کی پیروی میں یہ روزہ رکھتے ہیں۔تو آپ ﷺ نے فرمایا"نحن احق بموسیٰ منکم "یعنی ہم لوگ موسیٰؑ کی اتباع کے تم سے زیادہ مستحق ہیں۔چنانچہ

آپ ﷺ نے یہ روزہ رکھااور امت کو بھی اس کا حکم دیا۔

<u>فرضیت رمضان سے قبل اور بعد میں صوم عاشور کی نوعیت:</u> کان رمضان هو الفريضة،

یعنی اس کے بعد فرضیت صوم رمضان میں منحصر ہوگئی اس جملے سے یہ بات بخوبی معلوم ہو جاتی ہے کہ رمضان کی فرضیت سے قبل عاشورے کے روزے کو وجوب کا مقام حاصل تھا اور یہی احناف کا مسلک ہے جبکہ جمہور شوافع کہتے ہیں کہ عاشورے کا روزہ نہ پہلے واجب تھا نہ بعد میں۔ بلکہ پہلے تاکید کے ساتھ مستحب تھا بعد میں استحباب باقی رہا تاکید جاتی رہی، لیکن خود علامہ ابن حجرؒ نے اس رائے کی تردید کی ہے اور کئی قرآئن سے یہ ثابت کیا ہے کہ عاشورے کا روزہ واجب تھا۔ فرضیت رمضان کے بعد وجوب منسوخ ہو کر صرف استحباب مؤکد باقی رہا۔ وجوب کے درج ذیل دلائل کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے۔

۱) آپ ﷺ سے اس کا امر ثابت ہے جیسا کہ زیر نظر حدیث میں آیا ہے۔

۲) تاکید کے لئے آپ ﷺ نے اس کا اعلان بھی فرمایا جیسا کہ مسلم کی حدیث میں حضرت سلمہ بن الاکوعؓ سے مروی ہے۔

۳) جو لوگ یہ روزہ نہ رکھ سکے۔ ان کے لئے بھی اعلان فرمایا کہ شام تک امساک کریں کھانا پینا چھوڑ دیں۔

۴) ماؤں کو حکم دیا کہ وہ بچوں کو دودھ نہ پلائیں۔

۵) حضرت عائشہؓ اور ابن عباس سے روایت ہے کہ رمضان کی فرضیت کے بعد عاشورے کا روزہ چھوڑ دیا گیا اور چونکہ استحباب تو ترک نہیں ہوا بلکہ وفات تک آپ ﷺ نے اس کا اہتمام فرمایا۔ تو یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ترک وجوب کا ہوا، نہ کہ استحباب کا۔

<u>متابعت یہود کے وجوہات:</u> شیخین کی جس حدیث کا ذکر ہم نے کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہود سے پوچھ کر اس روزے کو اپنایا تھا۔ اس پر بظاہر یہ اشکال ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہود کی متابعت کیوں فرمائی تو اس کے متعدد جواب دیئے گئے ہیں۔

اول یہ کہ نبی کریم ﷺ نے یہود میں سے مسلمان ہونے والوں سے یہ بات دریافت کی ہوگی نہ کہ کافر یہودیوں سے۔

دوم ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان یہود کی تصدیق نازل ہونے کے بعد اس روزے کا حکم مستقل نازل ہوا ہو۔

سوم یہ خبر سن کر آپ ﷺ نے اجتہاد کیا ہو اور سبب التزام اجتہاد ہی ہو نہ کہ اتباع یہود۔

چہارم یہ کہ عاشورے کا روزہ بجائے خود ایک مستحسن امر اور انبیائے سابقین کی روایت رہی تھی۔ آپ ﷺ نے یہود کی اتباع نہیں کی بلکہ انبیاء اور بالخصوص موسیٰ کی تقلید کی تھی اور اس خبر ملنے سے پہلے کی تھی حدیث مذکور کے الفاظ اس بات پر شاہد ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا "نحن احق بموسیٰ منکم" البتہ جو روزہ آپ ﷺ پہلے سے رکھتے تھے اتفاقاً یہود بھی رکھتے تھے۔ جس کا علم آپ ﷺ کو بعد میں ہوا۔

پنجم یہ کہ آپ ﷺ نے یہود کے استیلاف اور اسلام کی طرف رغبت دلانے کی خاطر ان سے موافقت کا ظاہری قول کیا ہو تا کہ وہ نبی کریم ﷺ کے قریب آنے سے نہ کترائیں لیکن جب وہ اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے تو آپ ﷺ نے ان کی مخالفت اور تباعد کا فیصلہ فرمایا اور اخیر عمر میں ان کے ساتھ عبادات میں مشابہت بھی ناگوار رہا۔

بلکہ ایک حدیث میں یہود کے عدم اتباع کا عندیہ ہی آپ ﷺ سے مروی ہے چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں آئندہ سال زندہ رہا تو نو (۹) محرم کا روزہ بھی دس محرم کے ساتھ رکھوں گا۔ اور ایک حدیث میں لوگوں کو بھی حکم دیا ہے کہ یہود کی مخالفت کرو اور دسویں کے ساتھ نویں یا گیارھویں کا روزہ رکھا کرو۔

(۱۴) حدّثنا محمّدبن بشّار ثناعبدالرحمان بن مهدیّ ثناسفیان عن منصورعن إبراهيم عن علقمة قال سالت عائشة أكان رسول اللهﷺ يخصّ من الأيّام شيئاقالت كان عمله ديمةً وايّكم يطيق ماكان رسول اللهﷺ يطيق(۱).

---

(۱)صحیح بخاری ۱/۲۶۷ کتاب الصوم باب هل یخصّ شیئاً من الایّام، صحیح مسلم ۱/۲۶۶ باب فضیلة العمل الدائم من صیام اللیل، سنن ابی داؤد کتاب الصلوٰة باب ما یؤمر به القصد فی الصلوٰة ۱/۲۰۱ کتاب الصلوٰة باب مایؤمر به من القصة فی الصلوٰة. (مختار)

ترجمہ: حضرت علقمہؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ کیا حضور اقدس ﷺ بعض ایام کو عبادت کیلئے مخصوص فرمایا کرتے تھے؟ تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ (نہیں) نبی کریم ﷺ کا عمل دائمی ہوتا تھا اور تم میں سے کون اس عمل کی طاقت رکھتا ہے جس (عمل کی) حضور ﷺ طاقت رکھتے تھے۔

اعمال میں دوام واستقامت: کان عملهٗ دیمةً، دیمةٌ دوام سے فِعلةٌ کا صیغہ ہے۔ اصل میں سردیوں میں آرام سے مسلسل برسنے والی بارش کو کہتے ہیں جو عموماً دن یا رات کے ایک تہائی حصے پر محیط ہوتا ہے بلکہ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ یہ اس کی کم از کم مقدار ہے۔ علامہ ابن اثیر نہایہ میں لکھتے ہیں "هو المطر الدائم فی السكون(۱)"

یہاں آپ ﷺ کے مسلسل عمل کو اس قسم کی بارش سے تشبیہ کے طور پر دیمہ کہا ہے یعنی آپ کا عمل برسات کی موسلا دھار بارش کی طرح نہیں تھا جو کہ گرج چمک کے ساتھ تھوڑی دیر برس کر تھم جاتی ہے بلکہ مسلسل برسنے والی بارش کی مانند غیر منقطع سلسلہ ہوتا تھا۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ روزہ رکھنے کیلئے ہفتے کے دنوں میں سے کسی دن کی تخصیص نہیں فرماتے تھے یہ مطلب نہیں کہ سال کے دنوں میں جن ایام کو ایک گونہ شرف حاصل ہے ان کا بھی لحاظ نہیں رکھتے تھے کیونکہ عرفہ کے دن اور عاشورے کی تخصیص روایات میں مصرّح ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ ماہوار روزوں کا جو معمول تھا۔ ان کے لئے آپ ﷺ ایام بیض کو مخصوص نہیں کرتے تھے۔

بلکہ کبھی مہینے کی ابتداء اور کبھی آخر میں بھی تین روزے رکھتے تھے۔ لیکن حدیث کے الفاظ میں تعمیم ہے گویا آپ ﷺ کا تمام عبادات میں یہی طرز عمل تھا کہ ان پر دوام اور استقامت کے ساتھ عمل کرتے تھے۔

(۱۴) حدثنا هارون بن إسحاق عن عبدة عن هشام بن عروة عن ابيه عن عائشة قالت دخل عليّ رسول الله ﷺ وعندی امرأةٌ فقال من هذه قلت فلانة لاتنام الليل فقال رسول الله ﷺ عليكم من الأعمال

(۱) نهاية لابن الاثير ج۲ ص۳۶۵

ماتطیقون فواللّٰہ لایملّ حتیّ تملّوا و کان أحبّ ذلک إلی رسول اللّٰہ ﷺ الذی یدوم علیہ صاحبہ(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ میرے پاس تشریف لائے اس حال میں کہ میرے پاس ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھیں آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ یہ کون ہے؟ میں نے کہا یہ فلاں عورت ہے جو رات بھر نہیں سوتیں (عبادت کرتی ہیں) آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نفل اعمال کو اتنا کرو جتنا تحمل ہو سکے خدا کی قسم اللہ تعالیٰ ثواب دینے سے کبھی تنگ نہیں آئے گا حتی کہ تم خود تنگ آجاؤ گے۔

وعندی امرأۃ ، اس عورت کا نام حولاء بنت تویت بن حبیب بن اسد بن عبدالعزی ہے۔ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ کے قبیلہ سے تعلق ہے۔ بخاری اور مسلم دونوں نے اس کی تعین کی ہے۔ یہ نہایت پرہیز گار خاتون تھیں عبادت میں انہماک غایت درجہ کا تھا۔ بخاریؒ نے کتاب الایمان ج۱ص۱۱پر بھی حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث ذکر کی ہے۔

<u>اللہ کے لئے لفظ ملال کے اطلاق کا مطلب:</u> **فواللّٰہ لایملّ حتّی تملّوا**، یہ ملال سے ہے جو کہ "**استثقال الشئ ونفور النفس عنہ بعد محبۃ**" یعنی کسی چیز میں رغبت کے بعد بے رغبتی اور دل تنگی کا نام ہے **لایملّ** کا فاعل مقدر ہے۔یعنی **لایملّ اللّٰہ حتّی تملّوا**،اس جملے کا صریحی معنی تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس وقت تک تنگ نہیں آتا جب تک تم تنگ نہ آؤ۔لیکن اس ترجمے میں ایک اشکال ہے کہ حتیٰ کا تقاضا تو یہ ہے کہ بندہ کے تنگ آنے کے بعد اللہ تعالیٰ تنگ آجاتے ہیں حالانکہ ملال، استثقال اور تنگی اللہ تعالیٰ کے حق میں متعذر و محال ہے۔اس لئے بعض حضرات نے تو یہاں یہ جواب دیا ہے کہ یہ صرف مشاکلت اور مشابہت پر مبنی ہے اور بندہ کے ملال کے بعد اللہ تعالیٰ کے ثواب نہ دینے کو ملال سے تعبیر کیا گیا ہے۔

---

(۱)صحیح بخاری کتاب التھجد باب مایکرہ من التشدید فی العبادۃ ۱/۱۵۴،صحیح مسلم ۱/۲۶۷ باب فضیلۃ العمل الدائمن من قیام اللیل وغیرہ والامر بالاقتصاد فی لعبادۃ وھوان یاخذ منھا مایطیق الخ،السنن الکبریٰ للبیھقی ۳/۱۷ کتاب الصلوٰۃ باب القصد فی العبادۃ والجھد فی المداومۃ(مختار)

جیسے نسوا اللّٰه فنسی هم میں ہے۔جبکہ بعض شراح نے کہا ہے کہ حتیٰ واو کے معنی میں ہے پھر معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تنگ نہیں آتے اور تم تنگ آجاؤ گے جبکہ بعض شراح نے اسے حین کے معنی میں لیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اس وقت بھی تنگ نہیں آتے جب تم تنگ آجاتے ہو۔اور ایک بہتر توجیہ یہ ہے کہ لایمّل کا معنی ''لایقطع فضله وثوابه'' سے ہونا چاہئے۔یعنی اللہ تعالیٰ تم کو نیک عمل کا ثواب اس وقت تک دیتا ہے جب تم اس کو رغبت سے کرتے رہو اور اگر تم ملول ہو کر بے دلی سے کرو گے تو فضل الٰہی متوجہ نہیں رہے گا۔اس جملے میں خطاب عام مومنین کو ہے۔اس لئے جمع مذکر کا صیغہ لایا ہے اور اگرچہ بظاہر عورتیں ہی حاضر مجلس ہیں لیکن حکم چونکہ عام ہے۔لہٰذا مومنین کو مومنات پر تغلیب دی ہے۔

وکان احبّ ذالک الخ، صحابہ کرام کو عبادت سے بے انتہا محبت تھی۔اس لئے کئی صحابہ اس میں حد سے زیادہ غلو کر جاتے تھے جس کو عموماً نبھانا مشکل ہو جاتا ہے۔اس لئے نبی کریم ﷺ ایسی عبادت کو پسند نہیں فرماتے تھے۔امام بخاریؒ نے اس تعمق کی ممانعت میں بہت سی ابواب منعقد کی ہیں۔فلیراجع اليه(۱).

(۱) بخاری شریف ج ۱ ص ۶۶۳،۶۶۴،۶۶۵،۶۶۶،

اسی ممانعت کی طرح اللہ تعالیٰ نے نصاریٰ کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا ''ورهبانية ابتدعوها فمارعوها حقّ رعايته'' علامہ مناوی رحمہ اللہ کہتے ہیں۔اعلم انّ الناس فی العبادة علی طبقات اعلاها وأسناها طريقة المصطفیٰ ﷺ هذه المشار اليها بقوله''كنت لاتشاء الخ'' ونفس الانسان هی دابة التی يسير عليها الی ربّه فمنهم من قام لدابته لماتحتاجه من علف وسقی واصلح عنانها بالمعروف واستعملها فيما هو بصدره وهو التوسل بها علی الصراط المستقيم إلیٰ اللّٰه تعالیٰ، وهذه أعلیٰ المنازل، ومنهم من أجاعها فما أسرع أن يهلک. ومنهم من رفعها فعلفها أحسن علف فاوردها أعذب مورد وجلّلها بانواع الزينة وقطع أوقاته فی خدمتها فهذا بينه وبين الوصول حجاب وقد طرد عن الباب ومنهم من انقطع عن العبادة واعطی نفسه شهواتها وقضیٰ بذالک مراده تعس خادم الحمار تعس عبدالدرهم والدينار والهدیٰ كله فی أتباع طريق المصطفیٰ ﷺ التی هی اوسط الطرق واعدلها وافضلها.(۱۲ مناوی علی هامش جمع الوسائلج ۲ ص ۱۱۸)(اصلاح الدين)

(۱۵) حدّثنا أبو هشام محمّد بن یزید الرفاعی ثنا ابن فضیل عن الأعمش عن أبی صالح قال سالت عائشة و امّ سلمة أیّ العمل کان احبّ إلی رسول اللّٰه ﷺ قالتا مادیم علیه و ان قلّ(۱)۔

ترجمہ: حضرت ابوصالحؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کو کونسا عمل زیادہ پسند ہوتا تھا۔ دونوں نے فرمایا کہ وہ عمل جس کو ہمیشہ کیا جائے اگر چہ وہ تھوڑا کیوں نہ ہو زیادہ پسند ہوتا تھا۔

مادیم علیه ان قلّ: گزشتہ دونوں حدیثوں اور زیر نظر حدیث میں اگر چہ روزے کا ذکر نہیں ہے لیکن چونکہ روزہ بھی ایک عمل ہے۔ اس لئے اس کا حکم بھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفل روزوں کو بھی اس حد تک رکھا جائے جس حد تک نبھایا جا سکے۔

(۱۶) حدّثنا محمّد بن إسماعیل ثنا عبداللّٰه بن صالح ثنی معاویة ابن صالح عن عمرو بن قیس أنّه سمع عاصم بن حمید قال سمعت عوف ابن مالک یقول کنت مع رسول اللّٰه ﷺ لیلة فاستاک ثمّ توضّأ ثمّ قام یصلّی فَقُمْتُ معه فبدأ فاستفتح البقرة فلایَمُرُّ بآیة رحمة إلاّ وقف فسال ولایمُرُّ بآیة عذاب إلاّ وقف فتعوّذ ثمّ رکع فمکث راکعاً بقدر قیامه ویقول فی رکوعه سبحان ذی الجبروت والملکوت والکبریاء والعظمة ثمّ سجد بقدر رکوعه ویقول فی سجوده سبحان ذی الجبروت والملکوت والکبریاء والعظمة ثمّ قرأ آل عمران ثم سورة سورة یفعل مثل ذلک(۲)۔

---

(۱) مسند احمد ۶/ ۲۸۹، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث ۴۰۹۱، سنن ابن ماجہ رقم حدیث ۱۲۲۵

(۲) سنن ابی داؤد ۱/ ۱۳۴ کتاب الصلوٰة باب مایقول الرجل فی رکوعه و سجوده، مسند احمد ۶/ ۲۴ (مختار)

ترجمہ: عوف بن مالکؓ کہتے ہیں کہ میں ایک رات کو نبی کریم ﷺ کے پاس تھا حضوراقدس ﷺ نے مسواک فرمائی پھر وضوفرمایا پھر نماز پڑھنے کھڑے ہوگئے۔ میں بھی ساتھ (نیت باندھ کر) کھڑا ہوگیا۔ آپ ﷺ نے (نماز میں) سورۃ بقرہ شروع فرمائی پڑھتے ہوئے کسی بھی رحمت والی آیت پر گزرتے تو آپ ﷺ ٹھہر جاتے اور (رحمت کی) دعا فرماتے اور کسی بھی عذاب والی آیت پر گزرتے تو آپ ﷺ ٹھہر جاتے اور (عذاب سے) پناہ مانگتے تھے۔ پھر آپ ﷺ رکوع میں چلے گئے اور قیام کے مقدار آپ ﷺ رکوع میں ٹھہرے رہے۔ رکوع میں "سبحان ذی الجبروت والملکوت والکبریاء والعظمة" (باربار) پڑھتے رہے۔ پھر رکوع کے بقدر سجدہ کیا اور سجدے میں بھی "سبحان ذی الملکوت والجبروت والکبریاء والعظمة" پڑھتے رہے۔ پھر (دوسری رکعت میں) آپ ﷺ نے سورۃ آل عمران پڑھی۔ پھر (اگلی دو رکعتوں میں) ایک ایک سورۃ پڑھی۔ (رکوع اور سجدے میں بھی) وہی عمل کرتے رہے۔

عوف بن مالکؓ: ابو عبدالرحمن یا ابو محمد عوف بن مالک بن ابی عوفؓ کا تعلق اشجع قبیلے سے تھا مؤرخین کے مطابق فتح مکہ کے دن اپنے قبیلے کا جھنڈا انہی کے پاس تھا ۷ھ میں اسلام سے مشرف ہوئے۔ نبی کریم ﷺ نے ان کے اور حضرت ابوالدرداءؓ کے درمیان مواخاۃ قائم کی تھی۔ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد حمص یا دمشق میں رہتے تھے۔ اور وہیں ۷۳ھ میں عبدالملک کے زمانے میں وفات پائی۔ آپؓ بہت غیور تھے ایک یہودی کی اس لئے خوب پٹائی کردی کہ اس نے ایک مسلمان عورت سے چھیڑ چھاڑ کی تھی۔ حضرت عمرؓ شام تشریف لائے تو اس یہودی نے شکایت کردی ان کو بہت غصہ آیا۔ لیکن تفتیش کی تو یہودی واقعی مجرم ٹھہرا۔ چنانچہ حضرت عوف بن مالکؓ کو کچھ نہ کہا۔ الٹا یہودی کو یہ کہتے ہی پھانسی دیدی کہ ہم نے ایسی حرکتوں کیلئے تم لوگوں سے صلح نہیں کی تھی۔

الاوّل وقف وتعوّذ، نماز کے اندر طلب رحمت اور پناہ طلبی پر اشکال کا جواب دیتے ہوئے علامہ حنفیؒ

نے کہا ہے کہ شاید یہ منسوخ ہو چکا ہے۔یا پھر یہ نبی کریم ﷺ کی خصوصیت ہوگی لیکن ملاعلی قاریؒ کہتے ہیں یہ دونوں احتمال ضعیف ہیں۔ بلکہ چونکہ یہ نفل کا واقعہ ہے۔اور نفل میں ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے فرض میں ممانعت ہے اور وہ یہاں مراد نہیں۔

ثم قرء آل عمران ثم سورة سورة ، یعنی" **ثم قرء فی الثالثہ سورة وفی الرابعة سورة** "باب العبادۃ میں مذکور حضرت حذیفہؓ کی روایت میں تصریح ہے کہ تیسری رکعت میں سورۃ نساء اور چوتھی میں مائدہ کی قراءت فرمائی **یفعل مثل ذالک** یعنی جس طرح پہلی رکعت میں طویل رکوع، قومہ اور طویل سجدہ کیا تھا اگلی رکعت میں وہی طریقہ اختیار کیا یونہی آپ آیۂ رحمت کے وقت سوال اور آیت وعید کے وقت تعوذ بھی کرتے رہے۔

<u>حدیث طول قراءۃ کا ترجمۃ الباب سے مناسبت:</u> اس حدیث کی مناسبت بظاہر معلوم نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے علامہ قسطلانیؒ نے تو یہ کہہ دیا کہ یہ حدیث ناسخوں کی غلطی کی وجہ سے اس باب میں لایا گیا ہے۔دراصل یہ حدیث باب العبادۃ یا باب صلوٰۃ التطوع میں لانی چاہیے تھی بعض شراح نے یہ جواب دیا ہے کہ دراصل صحیح معنوں میں باب صلوٰۃ الضحٰی، باب التطوع اور باب الصوم کے عنوانات سرے سے موجود نہیں بلکہ ان ابواب کی تمام احادیث مشترکہ طور پر باب العبادۃ کے عنوان کے تحت ہیں اگر یہ درست ہو پھر تو سرے سے اشکال ہی نہیں ہے۔

جبکہ بعض شراح نے اس حدیث کی مناسبت یوں بیان کی ہے کہ گزشتہ احادیث میں عبادت میں اعتدال اور عدم غلو کا ذکر کیا گیا ہے تا کہ عبادت سے ملال پیدا نہ ہو۔اب اخیر میں یہ بیان فرماتے ہیں کہ شوق کے غلبہ کی وجہ سے کبھی کبھی اعتدال سے بھی بڑھ کر عبادت میں مبالغہ ہو جائے تو شدت اشتیاق کی وجہ سے یہ مذموم نہیں ہے۔ہاں اس قسم کے غلو کا التزام اس لئے درست نہیں ہے کہ اسے نبھانا کارے دارد۔

خلاصۂ باب

اس باب میں دراصل آپ ﷺ کے نفل روزوں کا ذکر مقصود ہے جبکہ ضمناً آپ ﷺ کی دیگر عبادات میں طرزِ عمل کا ذکر ہے۔حتیٰ کہ فرض روزوں بلکہ نماز وغیرہ میں بھی اعتدال کا بیان ہے۔

آپ ﷺ نے رمضان کے بغیر کسی بھی مہینے کے سارے روزے نہیں رکھے اور نہ یہ کہ خود روزوں پر مداومت نہیں فرمائی۔ بلکہ امت کو بھی ایسے روزوں سے منع فرمایا۔یہی معاملہ آپ ﷺ نے شب بیداری کے حق میں بھی برتا۔ساری رات قیام سے آپ ﷺ منع فرمایا کرتے تھے۔البتہ آپ ﷺ سال کے بعض ایام کے روزوں کا دیگر ایام کی نسبت زیادہ اہتمام فرماتے تھے جن میں شعبان کا مہینہ اور عاشورے کا دن قابل ذکر ہے۔علاوہ ازیں ایام بیض اور مہینے کے اول اور آخر کو بھی دیگر ایام کی نسبت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

پھر جو عبادات بشمول روزہ آپ ﷺ شروع فرماتے تھے۔تو اس پر دوام آپ ﷺ کو محبوب ہوتا تھا۔حتیٰ کہ کسی عذر کی وجہ سے اگر روزہ چھوٹ جاتا تو اس کی قضاء کا بھی اہتمام فرماتے تھے۔

۴۴. باب ماجاء فی قرأة رسول اللہ ﷺ

حضوراقدس ﷺ کی قرآن پاک پڑھنے کی کیفیت کا بیان

اس باب میں نبی کریم ﷺ کی قرآن پڑھنے کی کیفیت کا بیان ہے کہ آپ ﷺ کس انداز سے قرآن کریم پڑھتے تھے۔باب میں آٹھ حدیثیں ذکر کی گئی ہیں۔

(۱) حدّثنا قتیبة بن سعید ثنا اللیث بن شهاب عن ابن أبی ملکیة عن یعلی ابن مملک أنه سال امّ سلمة عن قراء ة رسول اللهﷺ فاذاهی تنعت قراء ة مفسّرة حرفا حرفا(۱).

ترجمہ: حضرت یعلیٰ بن مملک کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت ام سلمہؓ سے نبی کریم ﷺ کی قرأۃ کے بارے میں پوچھا تووہ آپ ﷺ کی قرأۃ مفسّر یعنی ایک ایک حرف جدا جدا کرکے بیان کرنے لگیں۔

<u>ایک ایک حرف ادا کرکے پڑھنا:</u> **فاذاهی تنعت** ،یعنی حضرت ام سلمہؓ نے نبی کریم ﷺ کی قرأۃ کی نقل اتارتے ہوئے توضیح فرمائی۔اورایک ایک حرف کوصاف اور علیٰحدہ علیٰحدہ ادا کرنا شروع کردیا۔ اکثرشراح نے اس عملی تشریح کواظہر کہاہے۔اگرچہ یہ احتمال بھی ہے کہ اُمّ سلمہؓ نے زبانی توضیح کی ہو،عملی نمونہ پیش نہ کیا ہو۔لیکن اس باب کی تیسری حدیث میں پہلی صورت کا وضاحت کے ساتھ بیان ہے۔

(۲)حدّثنا محمّد بن بشّار ثنا وهب بن جریر ابن حازم ثنا ابی عن قتادة قال قلت لانس بن مالک کیف کان قراء ة رسول اللهﷺ قال مدّاً(۲).

---

(۱)سنن ابی داؤد ۱/۲۱۴ کتاب الصلوٰة باب کیف یستحبُّ الترتیل فی القرأة، جامع ترمذی ۲/۵۸۵ ابواب فضائل القرآن باب ماجاء کیف کان قرأة النبیّﷺ، السنن الکبریٰ للنسائی ۵/۲۲ کتاب فضائل القرآن باب الترتیل، السنن الکبریٰ للبیهقی ۳/۱۳ کتاب الصلوٰة(مختار)

(۲)صحیح بخاری ۲/۷۵۴ کتاب فضائل القرآن باب مدالقرأة،سنن ابی داؤد ۱/۲۱۳ کتاب الصلوٰة باب کیف یستحب الترتیل فی القرأة ،سنن النسائی ۱/۱۵۷ کتاب الافتتاح باب مدّالصوت بالقرأة ، سنن ابن ماجة ص ۵۹ کتاب اقامة الصلوٰة والسنة فیها باب ماجاء فی القرأة فی صلوٰة اللیل، السنن الکبریٰ للبیهقی ۲/۵۲ کتاب الصلوٰة(مختار)

ترجمہ: حضرت قتادہؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالکؓ سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کی قرأۃ کیسی تھی؟ انہوں نے کہا کہ آپ (قرآن کی حروف مدکو) کھینچ کر پڑھتے تھے۔

<u>حروف مدّہ کالحاظ:</u> مَدّاً، یعنی کانت قراء ته ذات مدّ او المعنی یَمُدُّ حروف المدّمداً مطلب یہ ہے جن حروف کو کھینچنا ہوتا ان کو کھینچ کر پڑھتے تھے لیکن حروف مدّہ کی تطویل میں بھی اعتدال ہوتا۔لہٰذا وصل اور درج کلام میں مدّ ایک الف سے زیادہ نہ ہو۔اور وقف کی صورت میں مدّ دو الف یا زیادہ سے زیادہ تین الف(۱) ہو۔تفصیل کیلئے قرأ حضرات اور ان کی کتب سے مراجعت ضروری ہے۔

(۳) حدثنا علّی بن حجرثنایحیٰی بن سعیدالاموی عن ابن جریج عن ابن أبی ملیکة عن امّ سلمةؓ قالت کان النبیّ ﷺ یقطع قراء ته یقول الحمدللّٰه رب العٰلمین ثمّ یقف ثمّ یقول الرحمٰن الرحیم ثمّ یقف و کان یقرأمالک یوم الدین(۲).

<u>وقفوں کے ساتھ قراءت:</u>

ترجمہ: حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ قرآن قطعہ قطعہ کرکے پڑھتے تھے(اس طرح کہ) الحمدللّٰه ربّ العالمین پڑھتے پھر وقف کرلیتے تھے۔پھر الرحمان الرحیم کہتے پڑھ کر ٹھر جاتے تھے اور(اگلی آیت میں اسم فاعل کے صیغے سے)مالک یوم الدین پڑھتے تھے۔

عن ابن أبی ملیکة الخ، اس حدیث کو امام ترمذی نے جامع ترمذی میں روایت کیا ہے لیکن وہاں یہ کہا ہے کہ یہ حدیث منقطع ہے کیونکہ اسی روایت کو ابن ابی ملیکہؒ دوسری سند کے ساتھ روایت کرتے

---

(۱)واٌمّاماابتدعه قرّاء زمانناحتّی ائمة صلواتناانّهم یزیدون علی المدّالطبعی الی ان یصل قدر الفان واکثروربّمایقصرون المدّالواجب فلامدّاللّٰه فی عُمُرهم ولاامدّفی امرهم قاله القاریؒ،

(۲)سنن ابی داؤد ۲۱۴/۱ کتاب الحروف القراء ت، جامع ترمذی ۵۸۶/۲ ابواب القراء ت عن رسول اللّٰه ﷺ باب فی فاتحة الکتاب، مصنف ابن ابی شیبة ۵۲۰/۲، کتاب الصلوٰة سنن دارقطنی ۳۰۷/۱(مختار)

ہیں۔لیکن یعلی بن مملکؒ کے واسطے سے نہ کہ بلاواسطہ،لہٰذا بلاواسطہ روایت کرنا ایک راوی یعلیؒ کو چھوڑ دینا ہے لیکن شراح حدیث امام ترمذیؒ کی اس بات سے اتفاق نہیں کرتے کیونکہ ابن ابی ملیکہؒ مشہور تابعی ہیں۔ کم از کم تیس صحابہ سے ملاقات ہوچکی ہے(۱)،اُم سلمہؓ کے ساتھ ملاقات کی خود انہوں نے تصریح بھی کردی ہے۔اسی وجہ سے یہ احتمال بہت قوی ہے کہ اس حدیث کو ابن ابی ملیکہ نے پہلی بار یعلی بن مملکؒ کے واسطے سے سنا ہوگا پھر خود ام سلمہؓ سے سن لیا ہوگا۔چنانچہ وہ کبھی اسے بالواسطہ روایت کرتے ہیں اور کبھی بلاواسطہ حضرت ام سلمہؓ سے نقل کرتے ہیں۔اس لئے زیر نظر حدیث منقطع نہیں ہے۔

یقول الحمدللہ الخ،سورۃ فاتحہ کے بیان میں بسم اللہ نہ پڑھنا اور الحمد للہ سے ابتدا کرنا ہم احناف کے مذہب کیلئے تائید ہے۔کہ بسم اللہ سورۃ فاتحہ کا جزء نہیں ہے۔

ثم یقف الخ، جب آیت تام ہو لیکن مابعد کا کلام اس سے متعلق ہو جیسا کہ الرحمان الرحیم ماقبل کیلئے صفت ہے تو اس صورت میں آیت پر وقف اولیٰ ہے یا وصل؟

علامہ سجاوندیؒ اور جمہور نے اول الذکر کو افضل اور علامہ جزریؒ نے موخر الذکر کو اولیٰ قرار دیا ہے لیکن جواز وقف میں شک نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس جگہ خود نبی کریم ﷺ سے ہر آیت پر وقف مروی ہے اور آپ ﷺ سے زیادہ بہتر قراءۃ کسی کی نہیں ہوسکتی۔

<u>مالک اور ملک کی قراءت:</u> **وکان یقراء ملک یوم الدین**، حضرت ام سلمہؓ یہاں پر''ملک'' کے تلفظ کا ذکر کرنا چاہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ مالک اسم فاعل یا ملک صفۃ مشبہ کے صیغہ سے پڑھتے تھے۔ اگرچہ دونوں قراءتیں متواتر ہیں۔اول الذکر کا معنی مالک اور موخر الذکر کا معنی بادشاہ ہوتا ہے لیکن ام سلمہؓ کی اس روایت میں کس طرح ادا کیا گیا ہے۔اس میں کتب حدیث کا اختلاف ہے۔امام ابوداؤدؒ، امام احمدؒ، امام بیہقیؒ، اور شمائل کے اس نسخہ میں مالک یعنی میم کے بعد الف سے روایت کیا گیا ہے۔جبکہ امام ترمذیؒ نے جامع ترمذی میں اور امام حاکمؒ نے اس لفظ کو ام سلمہؓ کی اس روایت میں الف کے بغیر یعنی ملک بمعنی بادشاہ روایت کیا ہے۔

---

(۱)قال ابن أبی ملیکۃ ادرکت ثلاثین من اصحاب النبیؐ ﷺ کلھم یخافہ النفاق علی نفسہ الخ(بخاری ج۱ ص ۱۲)(مختار)

(۴)حدثنا قتیبة بن سعیدثنا اللیث عن معاویة بن صالح عن عبداللّٰہ ابن أبی قیس قال سألت عائشة عن قراء ة النبیّ ﷺ أکان یسرّ بالقراء ة ام یجهر قالت کل ذلک قد کان یفعل رُبّما اسرّ وربّما جهر قلت الحمدللّٰہ الذی جعل فی الامر سعة(۱).

ترجمہ: عبداللہ بن ابی قیسؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے نبی کریم ﷺ کی قراءۃ کے بارے میں پوچھا کہ آپ قرآن آہستہ پڑھتے تھے یا جہراً۔تو آپؓ نے فرمایا کہ دونوں طرح پڑھتے تھے۔کبھی آہستہ پڑھتے تھےاور کبھی زور سے۔میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے اس سلسلے میں (بھی) سہولت فرمائی ہے۔

<u>قراءۃ جہراًاور سراًمیں اعتدال:</u> سألت عن قراء ة النبیّ ﷺ الخ، جامع ترمذی میں ابواب الوتر سے تھوڑا پہلے اسی حدیث کوامام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔وہاں یہ تصریح ہے کہ عبداللہ ابن ابی قیسؒ نے سوال صلوٰۃ اللیل یعنی تہجد کی نماز میں قراءۃ کے بارے میں کیا تھا۔اور تہجد میں دونوں قسم کی قراءۃ جائز ہے۔بمقتضائے حال کبھی آہستہ پڑھنا بہتر ہوگا اور کبھی جہراً اولیٰ ہوگا۔مثلاً اگر سونے والوں یادوسری عبادت کرنے والوں یا مریض وغیرہ کو تکلیف ہوتو سراً بہتر ہے۔اوراگرآدمی تنہا ہواور نشاط اوراستحضار پیدا کرنا مطلوب ہوتو جہراً اولیٰ ہوگا۔البتہ اعتدال کا التزام ضروری ہے۔چنانچہ حضرت ابوبکرصدیقؓ آہستہ قراءۃ فرمایا کرتے تھے جبکہ حضرت عمرؓ جہراً قرأۃ فرماتے تھے۔آپ ﷺ نے دونوں کے موقف کے بارے میں پوچھااور پھر دونوں کواعتدال کا حکم دیاابوبکرؓکو ذرا جہر سےاور عمرؓ کوتھوڑا آہستہ پڑھنے کاارشادفرمایا۔

(۵) حدثنا محمودبن غیلان ثنا وکیع ثنا مسعرعن أبی العلاء العبدیّ عن یحییٰ ابن جعدة عن امّ هانی قالت کنت اسمع قراء ة

---

(۱)صحیح مسلم ۱/۲۴۲ کتاب الحیض باب جوازنوم الجنب واستحباب الوضؤله الخ، سنن ابی داؤد ۱/۲۱۰ کتاب الصلوٰۃ باب فی وقت الوتر، جامع ترمذی ۱/۲۱۲ کتاب الصلوٰۃ باب ماجاء فی قرأۃ اللیل ، السنن الکبریٰ للبیهقی ۳/۱۲ (مختار)

النبیّ ﷺ باللیل و اناعلی عریشی(۱).

ترجمہ: حضرت ام ہانی سے روایت ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کی قراءت رات کے وقت سنتی تھی اس حالت میں کہ میں اپنی چارپائی پر لیٹی ہوتی تھی۔

عریش: وانا علی عریشی الخ ،عریش مکان کی چھت،تخت یا چارپائی،انگور کے پودے چڑھانے کیلئے جنگلے اور کلُّ مایُستظل به یعنی سایہ دار چھپر یا کچے چھت پر بولا جاتا ہے۔یہاں پر ملا علی قاریؒ نے سریر یعنی چارپائی سے ترجمہ کیا ہے۔اور بعض شراح نے مکان کی چھت کا معنی لیا ہے۔ابوداودؒ نسائیؒ اور ابن ماجہؒ کی روایت میں ''کنت أسمع و أنا نائمة علی فراش '' کے الفاظ ہیں جو پہلے ترجمہ کی تائید کرتی ہیں۔یہ مکہ کا واقعہ ہے جب آپ ﷺ حرم میں نماز پڑھتے تھے حضرت ام ہانیؓ کا گھر حرم سے متصل تھا۔

(۲) حدثنا محمود بن غیلان ثنا أبو داود أنبانا شعبة عن معاویة ابن قرّة قال سمعت عبد اللّٰه بن مغفّل یقول رأیت النبیّ ﷺ علی ناقته یوم الفتح وهو یقرأ انّا فتحنا لک فتحا مبینا لیغفر لک اللّٰه ما تقدّم من ذنبک وما تأخّر قال فقرأ ورجّع قال وقال معاویة ابن قرّة لو لا ان یجتمع النّاس علیّ لاخذت لکم فی ذلک الصوت وقال اللحن(۲).

ترجمہ: عبداللہ بن مغفلؓ فرماتے ہیں کہ میں نے فتح مکہ کے دن نبی کریم ﷺ کو اپنی اونٹنی پر سوار اس حالت میں دیکھا کہ آپ ﷺ ''انّا فتحنا لک فتحاً مبیناً

(۱)سنن ابن ماجة ۹۶ کتاب اقامة الصلوٰة و السنة فیها باب ماجاء فی صلوٰة اللیل، مصنف ابن ابی شیبة ۱/۳۶، شرح السنة للبغوی ۴/۳۰ باب کیف القرأة باللیل رقم الحدیث ۹۱۸، (مختار)

(۲)صحیح بخاری ۲/۶۱۴ کتاب المغازی باب این رکز النبیﷺ، صحیح مسلم کتاب صلوٰة المسافرین وقصرها باب ذکر قرأة النبیﷺ، سنن ابی داؤد ۱/۲۱۴ کتاب الصلوٰة باب کیف یستحب الترتیل فی القرأة مصنف ابن ابی شیبة ۲/۴۷۸ کتاب الصلوٰة، السنن الکبریٰ للنسائی ۵/۲۲ کتاب فضائل القرآن باب الترجیح الخ(مختار)

لیغفرلک اللّٰہ ماتقدّم من ذنبک وماتاخّر ''پڑھ رہے تھے۔حضرت عبداللہ بن مغفّل کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہ سورۃ ترجیع کے ساتھ پڑھی۔ معاویہ بن قرۃؒ (حضرت عبداللہ کے شاگرد) کہتے ہیں کہ اگرلوگوں کے مجھ پر جمع ہونے کا خوف نہ ہوتا تو میں اسی آواز اور لہجے میں تمہارے سامنے پڑھنے لگ جاتا۔

عبداللہ بن مغفلؓ : ان کی کنیت ابوسعید، ابوعبدالرحمان یاابوزیادتھی۔مزنی صحابی ہیں بیعت رضوان میں حاضر تھےغزوہ تبوک میں تنگدستی کی وجہ سے شریک نہ ہوسکے۔جس کی وجہ سے رویا کرتے تھے اور''تولّواواعینھم تفیض من الدّمع '' کےمصداق بنے۔حضرت عمرؓ نے نو دیگر صحابہ کی معیت میں ان کو بصرہ بھیجاتا کہ وہاں پرلوگوں کودین کی تعلیم دے سکیں اور وہیں پر ۵۹ھ یا ۶۰ھ میں وفات پائی۔مرتے وقت وصیت فرمائی کہ میرا جنازہ حضرت ابوبرزہ اسلمیؓ پڑھائیں۔ چنانچہ وصیت کی تعمیل کی گئی۔رضی اللہ تعالیٰ عنہ

وھویقرء انّافتحناالخ، یہ آیت صلح حدیبیہ سے واپسی کے موقع پر نازل ہوچکی تھی لیکن فتح مکہ چونکہ صلح حدیبیہ سے وابستہ ہوچکی تھی اس لئے اس دن ان آیات کی تلاوت بہت مناسب تھی۔

مسئلہ ترجیع: وھو یرجّع،ترجیع دراصل ردّ الصوت فی الحلق یعنی آواز کوحلق سے اتار چڑھاؤ کے ساتھ نکالنے کو کہتے ہیں اس کا ترجمہ تحسین الصوت سے بھی کیا جاتا ہےاور اشباع مدّ سے بھی۔کیونکہ جس تردید کا ہم ذکر کر چکے ہیں اس کے ساتھ تحسین اوراشباع آہی جاتا ہےلیکن عبداللہ بن مغفلؓ سے اس مقام پرخود ہی ترجیع کی صورت منقول ہے۔وہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ آ آ آ کرتے ہوئے پڑھتے تھے۔ اب یہاں ترجیع سے مراد کیا ہے اورآیا آپ ﷺ بالقصد ترجیع کرتے تھے یااضطراری طور پرآپ ﷺ سے یہ صادر ہوا تھا۔اس سلسلہ میں شراح کے اقوال مختلف ہیں۔بعض حضرات نے اسے ایک اختیاری عمل قرار دیا ہےاور تحسین الصوت کا معنی لیا ہے۔یعنی آپ ﷺ قصداً قرآن کوخوبصورت آواز میں پڑھا کرتے تھے۔

خوش آوازی سے پڑھنا: دوسرے احادیث میں اس عمل کو بیان بھی کیا گیاہے۔ چنانچہ ارشاد ہے

"زیّنوا القران باصواتکم" یعنی قرآن کو خوش آوازی سے پڑھ کر مزین کرو۔"لکلّ شی حلیۃ وحلیۃ القرآن حسن الصوت "یعنی ہر چیز کا ایک زیور ہوتا ہے اور قرآن کا زیور خوبصورت آواز ہے۔ بلکہ فرمایا"لیس منّامن لم یتغنّ بالقرآن "یعنی جس نے قرآن کو خوش آوازی سے نہ پڑھا وہ ہم میں سے نہیں۔ حضرت ابوموسیٰؓ قرآن خوش آوازی سے پڑھتے تو آپ فرماتے"لقد اوتیت مزماراً من مزامیر اٰل داؤد" تجھے تو داودی خوش آوازی بخشی گئی ہے۔

اور ظاہر ہے کہ نبی کریم ﷺ فتح مکہ کے روز انتہائی خوش اور بڑی نشاط کی حالت میں تھے۔ ایسی حالت میں ان آیات کا جذب وکیف کے ساتھ پڑھنا مزید خوش الحانی کا سبب بنتا تھا۔

غیر اختیاری ترجیع: لیکن دوسری طرف بعض شراح نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی جس ترجیع کا یہاں ذکر ہے وہ اضطراری تھا۔ چونکہ آپ ﷺ اونٹنی پرسوار تھے اور وہ مسلسل حرکت میں تھی زمین ناہموار تھی۔ نشیب وفراز کے وجہ سے اونٹنی کے ہچکولے کھانے کی وجہ سے آپ کی آواز نہ سنبھل سکی۔ اور جہاں کوئی مدّہ آتا وہاں آ آ آ کی آواز نکل جاتی تھی۔ علامہ ابن الاثیرؒ نے اس رائے کو اختیار فرمایا ہے۔ جہاں تک عبداللہ بن مغفل کی طرف سے اس کی توضیح آ آ آ کے ساتھ منقول ہے۔ تو محض حکایت اور نبی کریم ﷺ کے آواز کی تصویر ہے نہ یہ کہ اس طرح بالاختیار کرنا قابل تقلید عمل ہے۔

لولاان یجتمع الناس علیّ، یہ معاویہ بن قرّہ کا کلام ہے۔ عبداللہ بن مغفّل سے ترجیع کی نقل سننے کے بعد انہوں نے یہ بات کہہ دی۔ یعنی اگر لوگوں کے اجتماع کا خوف نہ ہوتا تو میں اس آواز کی توضیح کیلئے اس قراءۃ کی نقل اتار دیتا۔ لیکن ڈر ہے کہ میری آواز سن کر کچھ لوگ فتنہ اور معصیت کا شکار ہونگے۔ مثلاً کوئی نبی کریم ﷺ کی اس ہیت کو منکر سمجھے یا استہزاء کرے تو مفتون ہوگا۔ کوئی اس کی بے جا تقلید کرنے لگے تو منکر کا شکار ہوگا۔ اور ہوسکتا ہے کہ ازدحام کی وجہ سے کچھ لوگوں کو تکلیف ہو۔

بہرحال اس سے یہ حکم بھی واضح ہوجاتا ہے کہ جگہ جگہ مجمع لگانا۔ اور ہر بات کو مجمع میں سنانا قرین مصلحت نہیں ہے۔ جہاں تک تلاوت قرآن پاک کی بات ہے تو اسے طبعی تحسین کے ساتھ بے تکلف اور آداب کے ساتھ پڑھنا مستحسن ہے۔ لیکن تکلف کے ساتھ قوالوں، نعت خوانوں اور گویوں کی سُروں سے

پڑھنا جائز ہے۔

(۷) حدثنا قتیبة بن سعید ثنا نوح بن قیس الحدّانیّ عن حسام ابن مصکّ عن قتادة قال مابعث اللّٰہ نبیاً إلّا حسن الوجه حسن الصوت وکان نبیّکم ﷺ حسن الوجه حسن الصوت وکان لایرجع(۱).

ترجمہ: حضرت قتادہؓ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی بھی نبی مبعوث نہیں فرمایا جوخوبرو اور خوش گلو نہ ہو۔ اور تمہارا نبی ﷺ بھی خوبرو اور خوش آواز تھے (مگر آپ ﷺ ترجیع نہیں کرتے تھے۔

قتادة ، ابوخطاب حضرت قتادہ بن دعامہ سدوسیؒ مشہور تابعی ہیں۔ کہتے ہیں کہ مادرزاد نابینا تھے۔ بکر بن عبداللہ مزنی کہتے ہیں کہ ان سے زیادہ حافظے والا ہمارے علم میں نہیں ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ میری کان نے جو سنا محفوظ کرلیا۔ ۱۱۷ھ کے بعد وفات پائی۔

یہ حدیث حضرت قتادہ پر مقطوع ہے۔ علاوہ ازیں حسام بن مصک راوی بھی ضعیف بلکہ بقول طبرانیؒ متروک راوی ہیں اور ان کی زیر نظر حدیث منکر حدیث ہے۔

<u>تعارض روایات ترجیع:</u> **کان لایرجع**، گزشتہ حدیث سے یہ حدیث متعارض ہے چنانچہ بعض علماء نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیکر گزشتہ حدیث کو اس پر ترجیح دی ہے۔ بعض نے یہ جواب دیا ہے کہ یہاں بالقصد ترجیع کی نفی ہے جبکہ گزشتہ حدیث میں غیر اختیاری ترجیع کا ذکر ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ آپ ﷺ گویوں جیسے ترجیع نہیں کرتے تھے جبکہ تحسین الصوت تو جائز بلکہ مندوب ہے۔ گزشتہ حدیث میں متأخر الذکر معنی مراد ہے۔ یا ترتیل کے معنی میں ہے۔ علامہ بیجوریؒ نے یہ بھی کہا ہے کہ ممکن ہے کہ آپ ﷺ بعض اوقات میں ترجیع کرتے ہوں۔ جس کا ذکر گزشتہ حدیث میں ہوا ہے اور بالعموم نہ کرتے ہوں۔

(۸) حدثنا عبداللّٰه بن عبدالرحمان ثنا یحییٰ بن حسان ثنا عبدالرحمان بن أبی الزناد عن عمرو بن أبی عمرو عن عکرمة عن

---

(۱) فتح الباری ۷/۰ ۲۱

ابن عبّاس قال کان قرأۃ النبیّ ﷺ ربّما یسمعھامن فی الحجرۃ وھو فی البیت(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی قراءۃ کبھی کبھی صحن میں موجودلوگ سن سکتے تھے جبکہ آپ کمرے کے اندر ہوتے تھے۔

یسمعھا من فی الحجرۃ وھوفی البیت ،حجرہ دراصل مکان محجور یعنی پتھروں سے محصور جگہ کو کہتے ہیں یوں اس کا اطلاق صحن پر بھی ہوسکتا ہےاور خود کمرے پر بھی اگراول الذکر مراد ہوتو معنی یہ ہوگا کہ کمرہ میں قراءۃ کرتے ہوئے آپ زور سے قرآن پڑھتے۔لیکن اتنا کہ صرف صحن میں سننا ممکن ہوتا تھا اس سے آگے نہیں سنا جاسکتا تھا۔اوراگر موخرالذکر معنی مراد ہوتو پھر مراد یہ ہوگی کہ آپ کمرے کے اندر آہستہ آہستہ تلاوت فرماتے تھے یہاں تک کہ آپ ﷺ کی آواز کمرے سے باہر نہ نکلتی تھی البتہ کمرے کے اندر کبھی سنائی جانے لگتی۔

قراۃ بلندآواز سے ہو یا آہستہ حدیث نمبر۴ میں اس بارے میں کلام ہو چکا ہے۔

---

(۱)سنن ابی داؤد ۱/۱۹۳ کتاب الصلوٰۃ باب فی رفع الصوم بالقرأۃ فی الصلوٰۃ اللیل، السنن الکبریٰ للبیھقی ۳/۱۰ کتاب الصلوٰۃ، شرح السنۃ ۴/۲۹ باب کیف قرأۃ باللیل رقم الحدیث ۹۱۷، مسنداحمد ۱/۲۷۱(مختار)

خلاصۂ باب

اس باب میں نبی کریم ﷺ کی قراءت کا بیان ہے مجموعی طور پر روایات باب سے آپ ﷺ کی قراءت میں درج ذیل خوبیاں ظاہر ہورہی ہیں:

۱) آپ ﷺ مسلسل پڑھنے کی بجائے وقفوں کے ساتھ یعنی ٹہر ٹہر کر قرآن پڑھتے تھے۔

۲) حروف مدّہ کو آپ ﷺ کھینچ کر پڑھتے تھے۔

۳) جہر واخفاء میں آپ ﷺ اعتدال سے کام لیتے تھے جہر کرتے بھی تھے لیکن اتنا زور سے بھی نہیں پڑھتے تھے کہ دوسروں کو ناگوار گزرے۔

۴) خوش آوازی کے ساتھ پڑھتے تھے اور اصول وضوابط کے ساتھ حدود کے اندر رہ کر خوش آوازی سے پڑھنے کو پسند بھی فرماتے تھے۔

۵) حدود کے اندر ترجیع کو جائز سمجھتے تھے لیکن اختیاری طور اس سے کتراتے تھے۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے خداوند کریم جل جلالہ کے دربار میں ایک انتہائی قابل توجہ بات یہ بتلائی کہ نبی خوش آوازی کے ساتھ کلام الٰہی کی قراءت کرے۔ چنانچہ فرمایا "ماأذنَ اللّٰہ لشیءٍ ماأذِن لنبیّ یتغنیّ بالقرآن" (متفق علیہ)

یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں تمام باتوں سے زیادہ توجہ نبی کی خوش الحانی کے ساتھ کلام الٰہی کی تلاوت پر ہے۔ البتہ موسیقی کی لے میں قرآن پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اور اگر تغیر کلمات کو مفضی ہو تو حرام ہے۔

۴۵. باب بکاء النبی ﷺ

نبی کریم ﷺ کے رونے کا بیان

بکاء بکی یبکی کا مصدر ہے۔ یہ بکا الف مقصورہ کے ساتھ بھی آتا ہے۔ اور بکاء الف ممدودہ کے ساتھ بھی مستعمل ہے۔ ملا علی قاریؒ اور علامہ مناویؒ دونوں میں فرق کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ الف مقصورہ کے ساتھ یہ ''خروج الدمع مع الحزن'' یعنی غم کی وجہ سے آنسو بہنے میں مستعمل ہے۔ جبکہ الف ممدودہ کے ساتھ بلند آواز کے ساتھ رونے کو کہتے ہیں۔ صاحب قاموس نے دونوں کو برابر سمجھا ہے۔ جبکہ بعض لوگوں نے یہ فرق بتایا ہے کہ اگر آواز غالب ہو تو الف ممدودہ اور اگر حزن غالب ہو تو الف مقصورہ استعمال ہوتا ہے۔

<u>رونے کی دس قسمیں:</u>

علامہ بیجوریؒ وغیرہ شراح نے رونے کی دس قسمیں لکھی ہیں۔ جس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

(۱) کسی پر رحم اور شفقت کی وجہ سے رونا۔ جیسے ماں بچے کی تکلیف پر روتی ہے۔

(۲) خوف وخشیہ یعنی کسی کے ڈر کے وجہ سے رونا۔ مثلاً خوفِ خدا اور توبہ کے وقت کا رونا۔

(۳) محبت اور اشتیاق کا رونا۔ جیسے ابراہیمؑ اور نبی اکرم ﷺ کا بعض مواقع پر رونا۔

(۴) خوشی کا رونا۔ یہ انتہائی درجہ خوشی کے موقعہ پر ہوتا ہے۔

(۵) بے صبری کا رونا۔ جیسے مریض درد کی برداشت سے عاجز ہو کر روتا ہے۔

(۶) غم کی وجہ سے جیسے عزیزوں کی موت پر عموماً رویا جائے۔

(۷) بکاء مستعار جیسے عورتیں کبھی کبھی دوسروں کے لئے روتی ہیں۔

(۸) اجرت ومزدوری کے لئے رونا۔ جیسے پیشہ ور نائحات نوحہ کرتے وقت کمائی کے لئے روتی تھیں۔

(۹) موافقت کا رونا۔ جیسے بغیر سبب معلوم کئے کسی اور کو روتا ہوا دیکھ کر کبھی رویا جاتا ہے۔

(۱۰) بکاء کذب۔ جب کوئی گناہ گار گناہ پر مصر بھی ہو اور اس پر روئے بھی تو اسے جھوٹا رونا کہا جاتا ہے۔

اسے بکاء نفاق بھی کہتے ہیں۔

(۱) حدّثنا سوید بن نصر أناعبداللّٰہ بن المبارک عن حمّاد بن سلمة عن ثابت عن مطرف و ھوابن عبداللّٰہ بن الشّخیر عن أبیه قال أتیت رسول اللّٰہ ﷺ وھو یصلّی ولجوفه ازیز کازیز المرجل من البکاء(۱).

ترجمہ: عبداللہ بن الشخیرؓ کہتے ہیں کہ میں نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا۔ آپ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔ رونے کی وجہ سے آپ ﷺ کے سینے سے ایسی آواز نکل رہی تھی جیسے ہانڈی کے جوش کے وقت نکلتی ہے۔

عبداللّٰہ بن الشخیرؓ، عبداللہ بن عوف بن کعب قبیلۂ قریش سے تھے۔ بنوعامر بن صصعہ کی شاخ سے ان کا تعلق ہے۔ اس لئے ان کو عامری کہتے ہیں۔ بصرہ میں سکونت پذیر تھے۔ فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے۔ ان کے دو بیٹے مطرف اور یزید فضلاء تابعین میں سے ہیں۔ امام بخاریؒ کے سوا دیگر اصحاب صحاح نے ان سے احادیث روایت کی ہیں۔

ازیز اور مرجل کے معنی: **ولجوفه ازیز الخ،** ازیز جوش کو بھی کہتے ہیں اور جوش کے وقت نکلنے والی آواز کو بھی کہتے ہیں۔ یہاں دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔

کازیز المرجل، مرجل کے متعلق اہل لغت کا اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ پیتل کی ہانڈی کو کہتے ہیں۔ بعض کا خیال پتھر اور بعض کے ہاں لوہے سے بنی ہانڈی کو کہتے ہیں۔ لیکن علامہ ابن حجر عسقلانیؒ کے ہاں یہ مطلقاً ہانڈی کو کہتے ہیں(۲)۔

مطلب یہ ہے کہ آپ کے سینے سے جو ہچکیاں اٹھتی تھیں۔ ان کی آواز ابلتے ہانڈی کی آواز جیسی

---

(۱)سنن ابی داؤد ۱/۱۳۷ کتاب الصلوٰۃ باب البکاء فی الصلوٰۃ، صحیح ابن حزیمه رقم حدیث ۹۰۰، صحیح ابن حبان رقم حدیث ۵۲۲، السنن الکبریٰ للبیهقی ۲/۲۵۱، شرح السنة رقم حدیث ۷۲۹ (۲)اور اس کو مرجل اس لئے کہا جاتا ہے لانه إذا نصب فکانه أقیم علی رجلین(المواهب اللدنیة ۲۳۲)

تھی۔آپ ﷺ کوخوف وخشیۃ (۱) کی یہ کیفیت سیدنا ابراہیمؑ سے وراثت میں ملی تھی۔ان کے بارے میں منقول ہے کہ ان کی سینے کے جوش کی آواز ایک میل تک سنائی دیتی تھی(۲)۔اوراسی وجہ سے ان کو اوّاہ کہا گیا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ رونا شوق اور محبت کی وجہ سے ہو۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کا عشق،شوق،وصال اور وفور تعلق آپ ﷺ کے ہاں انتہائی درجہ میں تھا۔

وجداورخوف کی حالت: شراح لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ پر وجداورخوف کی یہ حالت تب طاری ہوتی تھی۔جب مناجات کے موقع پرآپ ﷺ پرصفات جلال کے ساتھ صفات جمال کی تجلّی ہوتی تھی۔ورنہ صرف صفات جلال کی برداشت تو کسی کے بس کی بات ہی نہیں۔اورصرف صفات جمال کی تجلّی کے موقع پرآپ ﷺ پرسروروانبساط اورنورانیت کا انتہائی پرکشش مظاہرہ ہونے لگتا تھا۔اوراس وجہ سے اہل سلوک خوف ورجااور جمال وجلال کے بین بین چلنے کی ترغیب دیا کرتے ہیں۔

(۲) حدثنا محمود بن غیلان ثنا معاویة بن هشام ثنا سفیان عن الأعمش عن إبراهیم عن عبیدة عن عبدالله بن مسعود قال قال لی رسول الله ﷺ اقرأ علیّ فقلت یارسول الله ﷺ أقرأ علیک وعلیک انزل قال إنّی أُحبُّ ان أسمعه من غیری فقرأت سورة النسآء حتّیٰ بلغت وجئنابک علیٰ هؤلاء شهیداً قال فرأیت عینی النبی ﷺ تهملان(۳).

(۱)اس لئے رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگتے تھے اللّٰهمّ إنّی أسئلک قلباً خاشعاً اوردوسری روایت میں ہے أعوذبک من قلب لاتخشع(الحدیث) رسول اللہ ﷺ کے رونے کے بارے میں لکھتے ہیں وکان بکاءہ صلّی الله علیه وسلم تارة رحمة للامت وتارة خوفاً علی أمّته وتارة من خشیة الله وتارة عندسماع القرآن الخ(المناوی علی هامش جمع الوسائل ۲/۱۴۴)(مختار)

(۲)جمع الوسائل ج۲ص۱۴۴

(۳)صحیح بخاری۲/۶۵۹ کتاب التفسیر سورة النساء باب کیف اذاجئنابک علی هولاء شهیداً، سنن ابی داؤد۲/۱۵۹ کتاب العلم باب فی قصص،سنن ابن ماجة ص۳۰۹ کتاب الذهد باب الحزان البکاء ، السنن الکبریٰ للبیهقی۱۰/۲۳۱(مختار)

ترجمہ: عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ مجھے قرآن سناؤ۔ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ میں قرآن مجید آپ کو کس لئے سناؤں حالانکہ قرآن آپ ﷺ پر نازل ہوا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہاں میں چاہتا ہوں کہ کسی اور سے سنوں۔ میں نے سورۃ النساء کی تلاوت شروع کی۔ یہاں تک کہ میں اس آیت پر پہنچا و جئنابک علیٰ ھؤلاء شھیدا، تو میں نے نبی اکرم ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہوئے دیکھے۔

کسی اور سے قرآن سننے کے فوائد: اقرأ علیّ، بخاری شریف اور مسلم شریف کی روایت میں تصریح ہے کہ اس وقت آپ ﷺ ممبر پر جلوہ افروز تھے جب ابن مسعودؓ کو قرآن سنانے کا حکم دیا تھا۔

أقرءُ علیک وعلیک انزل، یعنی قرآن اترا ہی آپ پر ہے۔ اب اس کا علم ہم سے زیادہ آپ ہی کو ہے۔ تو میری قرأت آپ پر بے فائدہ، خلاف حکمت اور خلاف ادب معلوم ہوتی ہے۔

أحبّ ان أسمعه من غیری (۱)، کسی اور سے سننے میں چونکہ کچھ خاص فوائد ہیں۔ اس لئے آپ ﷺ نے اس کا تقاضا کیا۔

مثلاً اول یہی ہے کہ سنتے سنتے قرآن میں خوب تدبر اور معانی ومفاہیم پر یکسو ہو کر سوچا جاسکتا ہے۔ جو کہ خود قرآن پڑھنے کے وقت نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ قاری الفاظ کی تصحیح اور اپنے حافظہ کی طرف توجہ میں مشغول ہوتا ہے۔

دوم یہ کہ نبی اکرم ﷺ کو جبرئیلؑ سے قرآن سننے کی عادت پڑ گئی تھی اور عادت طبعی طور پر مرغوب ہوتی ہے۔

سوم یہ کہ امت کو قرآن سننے سنانے کی اہمیت معلوم ہو جائے اور تنبیہ ہو کہ عرض القرآن یعنی قرآن مجید کا دور ایک سنت عمل ہے۔

---

(۱) اس روایت سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ کسی فاضل کا مفضول سے استفادہ میں استنکار نہیں کرنی چاہئے۔ اسلاف میں روایت الاکابر عن الاصاغر کی بہت ساری مثالیں ہیں۔ اس لئے علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے فقد کان کثیراً من السلف یستفیدون من طلبتھم (المواھب الدنیة ۲۳۲)

آپ ﷺ کا گواہوں کا گواہ بننے کے شدت احساس سے رونا: اس دن لوگوں کا کیا حال ہوگا جس دن ہر پیغمبر اور اس کی امت کو حاضر کیا جائے گا۔اور ان کا نبی ان پر یہ گواہی دے گا کہ انہوں نے میری دعوت کو قبول کیا تھا یا نہیں۔

دوسرے نبیوں کی طرح نبی اکرم ﷺ بھی اپنی امت کے لئے گواہ ہونگے۔

حضرت تھانویؒ اس آیت کے خلاصۂ تفسیر میں فرماتے ہیں:

سو اس وقت بھی کیا حال ہوگا جبکہ ہر امت میں سے ایک ایک گواہ کو حاضر کریں گے۔اور آپ کو ان لوگوں پر (جن کا آپ سے سابقہ ہوا ہے) گواہی دینے کے لئے حاضر فرمائیں گے (یعنی جن لوگوں نے خدائی احکام دنیا میں نہ مانے ہوں گے) ان کے مقدمہ کی پیشی کے وقت بطور سرکاری گواہ کے انبیاء علیہم السلام کے بیانات سنے جائیں گے۔جو جو معاملات انبیاء کی موجودگی میں پیش آئے تھے۔سب ظاہر کردیں گے۔اس شہادت کے بعد ان مخالفین پر جرم ثابت ہوکر سزا دی جائے گی۔

(اگلی آیت میں اس حال کا ذکر ہے) چنانچہ فرمایا اس روز یہ حال ہوگا کہ جن لوگوں نے کفر کیا ہوگا۔اور رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی ہوگی۔وہ اس بات کی آرزو کریں گے کہ کاش ہم زمین کے پیوند ہوجائیں۔اور وہ اللہ تعالیٰ سے کسی بات کو نہیں چھپائیں گے۔

فرأیت عینی رسول اللہ ﷺ، دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت ابن مسعودؓ کو مزید قرأت سے منع فرمایا۔(قال حسبک الان) یعنی بس یہی کافی ہے(۱)۔دوسری طرف آپ رو رہے تھے۔(۲)

(۱) اس جملہ سے اس مسئلہ کا استنباط ہوتا ہے کہ مصلحت کے تحت تلاوت کلام پاک بند کرنے کو کہا جاسکتا ہے۔علامہ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے فیہ جواز امر السامع للقاری بقطع القرأۃ اذا عرض له امر (جمع الوسائل ۱۴۶/۲) اس کے علاوہ چونکہ صحیحین میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ منبر پر تشریف فرما تھے۔اس لئے علامہ مناویؒ اور ملا علی قاریؒ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص منبر یا اونچی جگہ پر بیٹھا ہو تو وہ نیچے بیٹھنے والے کی تلاوت سن سکتا ہے۔شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں۔(جمع الوسائل والمناوی علی حامش جمع الوسائل ۱۴۶/۲)(مختار)

(۲) علامہ نوویؒ نے لکھا ہے کہ تلاوت کلام پاک کے دوران رونا مستحب ہے۔یہ عارفین کی علامت اور صالحین کی عادت ہے(کتاب الاذکار ص۹۰)(مختار)

<u>استماع قرآن سے رونے کے اسباب:</u> رونے کے متعدد اسباب بیان کیے گئے ہیں۔

(۱) اس وقت آپ استماع قرآن کی وجہ سے رونے لگے تھے اور قرآن مجید سنتے وقت رونا اہل اللہ کی شان ہے۔جیسے ارشاد ربّانی ہے کہ **اذاتتلی علیهم ایت الرحمٰن خرّوا سُجدًا وبُکیا.** (جب ان پر رحمٰن کی آیتیں پڑھی جاتی ہے تو وہ زمین پر سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے گر جاتے ہیں)(مریم ۵۸)

إنّ الذین اوتوا العلم من قبله اذایتلی علیهم یخرون للاذقان سجّداًویقولون سجن ربنا ان کان وعدربنا لمفعولا ویخرّون للاذقان یبکون ویزیدهم خشوعاً.(الأسراء ۱۰۷ تا ۱۰۹)

(بیشک جن لوگوں کو اس سے پہلے کتاب دی گئی ہے جب ان پر کتاب اللہ پڑھی جاتی ہے۔تو وہ ٹھوڑیوں کے بل گرتے ہیں۔روتے ہوئے)

(۲) ممکن ہے کہ آپ ﷺ کا رونا محشر کے حالات کے تصور اور شدائد کے استحضار کی وجہ سے تھا۔جن کا ان آیات میں ذکر ہے۔

(۳) بعض مفسرین کے نزدیک گواہی کی شدت کا احساس کرکے آپ روئے۔کیونکہ یہ گواہی عظیم دربار میں ہوگی۔دوسری طرف گواہی تمام امت پر ہے جن میں حاضر وغیر حاضر سب شامل ہیں۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ سے یہی مروی ہے کہ اے اللہ جو لوگ میرے سامنے موجود نہیں ان پر کیسے گواہی دوں گا۔

(۴) یہ احتمال بھی ہے کہ گناہ گاروں کے حال پر شفقت کی وجہ سے آپ روئے تھے کیونکہ آپ ﷺ کی گواہی کی وجہ سے کچھ لوگ جہنم میں بھی جائیں گے۔

اور یہ رؤف اور رحیم پیغمبر کے لئے ناقابل برداشت ہے۔اگرچہ اللہ کے حکم کی وجہ سے آپ گواہی بھی ضرور دیں گے۔

<u>تنبیہ:</u> نبی اکرم ﷺ اگرچہ سماع قرآن کے وقت روئے تھے لیکن جلد ہی آپ ﷺ نے ابن مسعودؓ کو تلاوت سے روکا۔اس کی وجہ علماء نے یہ لکھی ہے کہ سماع کے وقت وجد اور انفعال کی کیفیت کبھی کبھی مقاصد میں آڑے آتی ہے۔

اس لئے آپﷺ نے امت کو یہ تعلیم دی کہ صبر اور برداشت اور وقار وسکون کا دامن ایسی حالت میں بھی نہ چھوٹے۔آپ کی یہی صفت اور یہی تعلیم ابوبکر صدیقؓ نے قبول کی تھی۔اور وفات نبوی کے موقعہ پر نہایت متانت اور صبر واستقامت کے ساتھ آپﷺ نے امت کو سنبھالا دیا۔مگر عمرؓ برداشت نہ کر سکے۔ فراقِ حبیب کے صدمہ کی وجہ سے ان کا برا حال ہو گیا تھا۔

(۳) حدّثناقتيبة ثناجريرٌ عن عطاء بن السائب عن أبيه عن عبدالله ابن عمرو قال انكسفت الشّمس يوماً على عهدرسول اللّهﷺ فقام رسول اللّهﷺ يصلّى (۱) حتّىٰ لم يكدان يركع ثمّ ركع فلم يكدان يرفع راسه ثمّ رفع راسه فلم يكدان يسجد ثمّ سجدفلم يكدان يرفع رأسه فجعل ينفخ ويبكى ويقول ربّ الم تعدنى ان لا تعذّبهم وانافيهم ربّ الم تعدنى الاتعذبهم وهم يستغفرون ونحن نستغرك فلمّا صلّى ركعتين انجلت الشّمس فقام فحمداللّه تعالىٰ واثنى عليه ثمّ قال إنّ الشّمس والقمر ايتان من ايات اللّه فاذاانكسفافافزعواالى ذكراللّه تعالىٰ(۲)۔

ترجمہ: عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرمﷺ کے زمانہ میں ایک دن سورج گرہن ہوا تو نبی اکرمﷺ (مسجد میں) نماز پڑھنے کے لئے چلے گئے اور

---

(۱)صلوٰۃ کسوف کے حکم کے بارے میں علامہ بنوریؒ نے لکھا ہےثم اختلف فى حكمها فالجمهور على أنّها سنة مؤكدة ذهب مشائخ الحنفية إلى وجوبهاونصّ به صاحب الأسرار وصرّح به أبوعوانة وعن مالك أنه أجراهامجرى الجمعة وقيل فرض كفاية كذا فى العمدة واستبعد الأخير(معارف السنن ۵/۲) جمہور کے نزدیک سنت مؤکدہ بعض کے نزدیک واجب،امام مالک نے جمعہ کی طرح فرمایا ہے جبکہ بعض کے نزدیک فرض کفایہ ہے۔(مختار)

(۲)سنن ابى داؤد ۱/۱۷۶ كتاب الصلوٰة باب من قال يركع ركعتين، مصنف ابن ابى شيبة ۲/۴۶۷، صحيح ابن حزيمة رقم حديث ۱۳۷۹، المستدرك للحاكم ۱/۳۲۹(مختار)

نماز پڑھنا شروع کی۔اور اتنی دیر تک قیام کیا کہ قریب تھا کہ رکوع نہ کریں۔پھر رکوع میں (اتنی دیر لگادی کہ) قریب تھا کہ رکوع سے سر نہ اٹھائیں۔پھر سر اٹھا کر (اتنی دیر تک) کھڑے رہے کہ قریب تھا کہ سجدہ میں نہ جائیں۔پھر سجدہ میں جا کر (اتنی دیر تک) پڑے رہے کہ قریب تھا کہ سجدے سے سر نہ اٹھائیں۔پھر سجدے سے سر اٹھ کر (اتنی دیر تک) بیٹھے رہے کہ قریب تھا کہ دوسرے سجدے میں نہ جائیں۔پھر دوسرے سجدے میں جا کر (اتنی دیر تک) پڑے رہے کہ قریب تھا کہ سجدے سے سر نہ اٹھائیں۔(پھر اس طرح دوسری رکعت ادا کرنے کے بعد آخری سجدے میں) زور زور سے سانس لیتے رہے اور یہ کہتے ہوئے روتے رہے کہ اے میرے رب! کیا تم نے میرے ساتھ یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ میری موجودگی میں آپ میری امت کو عذاب نہ دوگے۔اے میرے رب! کیا آپ نے میرے ساتھ یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ آپ ان کو عذاب نہ دوگے جب تک وہ استغفار کرتے رہیں گے اور ہم سب کے سب استغفار کرتے رہے۔جب نبی اکرم ﷺ دو رکعات نماز سے فارغ ہوگئے (تو سورج گرہن ختم ہو کر) سورج روشن ہو چکا تھا۔اس کے بعد نبی اکرم ﷺ اٹھے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا کہ سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں جب ان (میں سے کسی ایک) پر گرہن آئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف (پناہ لینے کے لئے) متوجہ ہو جایا کرو۔

<u>کسوف اور خسوف:</u> **انکسف الشمس الخ، کسفت الشمس** اور **انکسفت** دونوں کا استعمال درست ہے۔**فرّاء** نے **انکسف** کے استعمال کو غلط بتایا ہے۔لیکن حدیث میں استعمال کے بعد اسے غلط کہنا غلط معلوم ہوتا ہے۔البتہ اس میں اختلاف ضرور پایا جاتا ہے کہ کسوف اور خسوف میں کونسا لفظ سورج گرہن کے لئے اور کونسا چاند گرہن کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ لغت میں دونوں لفظ دونوں مفاہیم میں مستعمل ہوتے ہیں۔

علامہ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ فقہاء کے ہاں کسوف سورج اور خسوف چاند گرہن کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جوہریؒ نے اسے افصح اور بعض نے اسے متعیّن کہا ہے۔قرآن مجید میں بھی خسف چاند کے لئے استعمال ہوا ہے(اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فاذابرق البصر وخسف القمر)اوریہی استعمال سائنسی تحقیق سے زیادہ اقرب ہے۔ کیونکہ لغت میں خسف زمین میں دھنسنے کو کہتے ہیں۔اور چاند گرہن کے وقت چاند پر زمین کا سایہ ہوتا ہے۔جبکہ کسف چہرے پر کسی چیز کے پڑنے کو کہتے ہیں۔اور سورج گرہن کے موقع پر سورج اور ہمارے درمیان چاند حائل ہوجاتا ہے جو سورج کے چہرے کو چھپادیتا ہے۔علامہ مناویؒ نے بھی اس تحقیق کوذکر کیا ہے(۱)۔

ابراہیم کی وفات: علیٰ عھد رسول اللہ ﷺ ،یہ وہ دن تھا جب سیدنا ابراہیم بن رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تھا۔اس کی صحیح تاریخ کیا ہے۔اس کے بارے میں اہل تاریخ کا اختلاف ہے۔جمہور کا خیال ہے کہ ان کی وفات ربیع الاول ۱۰ھ میں ہوئی تھی۔بعض نے رمضان ۱۰ھ کا ذکر کیا ہے۔جبکہ بعض نے ذی الحجہ ۱۰ھ کا ذکر کیا ہے۔لیکن مؤخر الذکر غلط ہے۔کیونکہ ذی الحجہ ۱۰ھ میں نبی اکرم ﷺ مکہ میں تھے۔ جبکہ ابراہیم کی وفات بالاتفاق مدینہ میں ہوئی تھی۔بعض حضرات نے سیدنا ابراہیم کی وفات ۹ھ کو اور امام نوویؒ نے سن حدیبیہ یعنی ۶ھ کو بھی ذکر کیا ہے(۲)۔

---

(۱) مناوی ج۲ص۱۴۹

(۲) حضرت سیدنا ابراہیم بن النبی ﷺ کی تاریخ وفات میں ملاعلی قاریؒ کی عبارات میں تفاوت پایا جاتا ہے۔انہوں نے جمع الوسائل ج۲ص۱۴۹ پر تمریض کے صیغے قیل سے ۹ھ کو تاریخ وفات بتلایا ہے لیکن چند صفحات بعد ص۱۵۵ پر لکھتے ہیں "ولدت (ماریۃ)ابراھیم فی ذی الحجۃ سنۃ ثمان ومات ولہ سبعون یوما علی خلاف فیہ" یعنی ابراہیم کی ولادت ذی الحجہ ۸ھ میں ہوئی اور ان کی وفات ستر دن بعد ہوئی۔دوسری طرف مرقاۃ کے حوالے سے مشکوٰۃ کے حاشیہ پر منقول ہے کہ "ابراہیمؑ ذی الحجہ ۸ھ میں پیدا ہوئے اور چھ ماہ کی عمر میں وفات پائی جبکہ بعض نے اٹھارہ ماہ بعد (جمادی الثانی ۱۰ھ میں وفات پانے کا ذکر کیا ہے۔اور بعض نے منگل دس ربیع الاول ۱۰ھ کو ان کی تاریخ وفات بتلائی ہے" واللہ اعلم بالصواب . ۱۲ (اصلاح الدین) جبکہ ماہر فلکیات محمود پاشا نے زائچے اور جنتری سے حساب لگایا ہے۔اس کے مطابق یہ واقعہ ۲۸ یا ۲۹ رشوال ۱۰ھ بمطابق ۲۷ جنوری ۶۳۲ء آٹھ بج کر تیس منٹ پر ہوا۔(فتح الملہم ۴۵۲/۲)(مختار)

البتہ امام نوویؒ اور ملا علی قاریؒ نے اس پر محدثین کا اتفاق ذکر کیا ہے کہ صلوٰۃ کسوف آپ ﷺ نے صرف ایک بار مدینہ میں ادا کی تھی۔صحیح ابن حبان میں روایت ہے کہ ۵ ھ میں خسوف قمر ہوا تھا۔اس میں بھی آپ ﷺ نے اور دیگر صحابہؓ نے نماز خسوف پڑھی تھی اور اس کو اسلام کا پہلا خسوف کہا گیا ہے۔

فلم یکن ان یسجد ثم سجد، یعنی طویل رکوع کے بعد طویل قومہ کیا اور سجدہ میں گئے۔اس حدیث میں تصریح ہے کہ صرف ایک رکوع کرنے کے بعد آپ ﷺ نے سجدہ کیا تھا۔یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ صلوٰۃ کسوف میں ایک رکوع ہے یا متعدد بعض روایات میں متعدد رکوعات ذکر ہے۔اور اس کو تعدد واقع پر محمول نہیں کیا جاتا ہے۔کیونکہ مکہ میں نماز کسوف الشمس صرف ایک بار پڑھی جانے پر محدثین کا تقریباً اتفاق ہے۔ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

<u>کسوف وخسوف کی حکمتیں:</u> اللہ تبارک وتعالیٰ سورج چاند ستاروں کو ایک نظام الاوقات کے تحت جاری رکھے ہوئے ہیں۔ان میں ہمارے لئے عظیم فوائد رکھے ہیں۔لیکن کبھی کبھی گرہن کی وجہ سے عارضی طور پر سورج کی روشنی اور کبھی چاند کی روشنی سے محروم کر دیتے ہیں۔اس معروضی حالت میں حکمت بندوں کو تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس حالت کو مستمر کرنے پر قادر ہیں۔اور اگر ان میں سے کسی بھی جرم کی روشنی پر مستقل پابندی لگ جائے تو یہ انسان کے لئے عظیم خسارے کا باعث ہے۔جیسا کہ طبیعات کے ماہرین کا اس پر اتفاق ہے۔چنانچہ سورج گرہن ایک عبرتناک تازیانہ ہے۔آگے حدیث میں بھی اسے ''آیۃ'' کہہ کر تنبیہ کی گئی ہے۔

اب اگر گردش کے اصول اور طبعی اسباب گرہن کا سبب بن جائیں تو بھی اس کے علامت ہونے میں کوئی استبعاد نہیں۔اور پھر بھی ان اجرام میں گرہن ایک عبرتناک نشانی ہے۔کیونکہ اصل متصرف سے اغماض اور ماورائے اسباب علۃ کی تاثیر سے صرف نظر نا مناسب بلکہ ناممکن ہے۔جیسے رات دن کی تبدیلی میں اللہ تعالیٰ نے صراحتاً فرمایا ہے کہ یہ قدرت الٰہیہ کی نشانات ہیں۔

<u>صلوٰۃ کسوف وخسوف اور فقہاء کے آراء:</u> پھر کسوف وخسوف کے موقعہ پر کیا کرنا چاہئے۔ ہمارے نزدیک اگر نماز جمعہ کے شرائط موجود ہوں تو امام کے لئے دو رکعات نماز باجماعت پڑھنا سنت

مؤکدہ ہے۔اور اگر جمعہ کے شرائط موجود نہ ہوں تو لوگ انفرادی طور پر دو رکعات نماز پڑھیں۔البتہ یہ نماز عام نماز کی طرح ہوگی۔ ہر رکعت ایک رکوع اور دو سجدوں پر مشتمل ہوگی۔ یہی مذہب ابراہیم نخعیؒ، سفیان ثوریؒ، ابن ابی لیلیؒ، ابن زبیرؓ اور ابن عباسؓ سے بھی مروی ہے۔

لیکن ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ہر رکعت میں دو دو رکوع اور دو دو سجدے ہوں گے۔ بلکہ امام احمدؒ کے نزدیک ہر رکعت میں تین تین رکوع کرنا بھی جائز ہے۔

<u>اس کی رکوع کی تعداد اور کیفیت میں وارد روایات:</u> صلوٰۃ کسوف میں رکوع کی تعداد اور کیفیت میں وارد روایات پانچ قسم ہیں۔

(۱) امام ترمذیؒ نے عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں ایک رکوع ہر رکعت میں مذکور ہے۔اس طرح امام احمدؒ کے ہاں محمود بن بسیدؓ کی حدیث میں بھی ہر رکعت میں ایک رکوع ذکر ہے۔امام ابوداؤدؒ اور امام نسائیؒ نے سمرہ بن جندبؓ سے بھی یہی کیفیت روایت کی ہے۔نیز دونوں نے قبیصہ بن مخارق ہلالیؓ سے روایت کیا ہے۔جس کے الفاظ یہ ہیں "**فصلّوا کأحد صلوٰۃ صلیتموھا من المکتوبۃ**" عبداللہ بن مسعودؓ، مغیرہ بن شعبہؓ، ابوبکرؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور نعمان بن بشیرؓ بھی ہر رکعت میں ایک رکوع روایت کرتے ہیں۔

(۲) بخاری اور مسلم میں حضرت اسماءؓ وغیرہ سے دو دو رکوع ہر رکعت میں مروی ہیں۔

(۳) مسلم اور ابوداؤد کی بعض روایات میں تین تین رکوع ہر رکعت میں ذکر ہیں۔

(۴) چار چار رکوع ہر رکعت میں ابوداؤد اور مسلم کی روایات میں مذکور ہیں۔

(۵) پانچ پانچ رکوع فی رکعت بھی ابوداؤد کی ایک روایت سے معلوم ہوتی ہے۔

اور حق یہ ہے کہ یہ تمام روایات ایک ہی موقع کے متعلق مروی ہیں۔ کیونکہ تمام واقعات میں سیدنا ابراہیم کی وفات کے دن سورج گرہن کا ذکر ہے۔

جمہور کے نزدیک دو رکوع فی رکعت والی احادیث قوی اور معمول بہا ہیں۔ان کے علاوہ دیگر روایات کو وہ ضعف کی وجہ سے معلول اور غیر معمول بہ قرار دیتے ہیں۔

<u>احناف کے دلائل:</u> جبکہ احناف ؒ بوجوہ ایک رکوع والی احادیث کو معمول بہا قرار دیتے ہیں۔ اس لئے کہ

(۱) اولاً تو ہماری احادیث آثار صحابہ سے مؤید ہیں۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے عبداللہ بن زبیرؓ کا اثر ذکر کیا ہے۔ جبکہ طبرانی اور مسند احمد وغیرہ میں حضرت عثمان بن عفانؓ کا اثر مذکور ہے۔ اور دونوں حضرات توحدِ رکوع کے قائل ہیں۔

(۲) پھر جب تفردِ رکوع اور تعددِ رکوع کے بارے میں روایات مختلف قسم کے وارد ہیں تو صلوٰۃ کسوف کو دیگر معتاد نمازوں پر قیاس کرنا ہی افضل اور اچھا لگتا ہے۔

(۳) علاوہ ازیں جب دو سے زیادہ رکوع والی روایات بھی موجود ہیں تو صرف دو رکوع والی احادیث کو لینا اور باقی کو چھوڑنا ایک خاص عذر کا تقاضا کرتا ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو وہی عذر ہمارے لئے بھی دو رکوع والی احادیث کے چھوڑنے میں دلیل ہوگی۔

(۴) نیز ہماری احادیث قولی ہیں جو فعلی پر راجح ہیں۔

(۵) علاوہ ازیں متعدد رکوع والی روایات مستورات یا صغار صحابہ سے مروی ہیں جبکہ کبار صحابہ توحد رکوع روایت کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ مستورات اور صغائر پر اشتباہ زیادہ ممکن ہے۔ کیونکہ وہ آخری صفوں میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے ہیں۔

(۶) بعض احناف نے ان روایات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ مبسوط اور بدائع میں یہ کہا گیا ہے کہ دراصل نبی اکرم ﷺ نے طویل رکوع کیا تھا۔ جیسا کہ زیرِ نظر شمائل ترمذی کی حدیث میں صراحۃً مذکور ہے۔ تو اگلی صف کے کچھ لوگوں کو شبہ ہوا کہ شاید نبی کریم ﷺ سر اٹھا چکے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پچھلی صف والوں نے اگلی صف کی اتباع میں رکوع سے سر اٹھایا۔ پھر اگلی صف والے نبی اکرم ﷺ کو دیکھ کر واپس رکوع میں گئے۔ تو پچھلے صف والوں نے سمجھا کہ شاید دوبارہ نبی کریم ﷺ رکوع میں چلے گئے۔ حالانکہ یہ نبی اکرم ﷺ کی وہی پہلی رکوع تھی۔ پھر ہوسکتا ہے کہ دوبارہ ایسی نوبت آئی ہو اور پچھلے صف والوں نے اسے تکرار پر محمول کر کے تیسرا رکوع سمجھا ہو۔ اور یہی رکوع کی تعددؔ کی روایت کا

منشأ بنا۔

(۷) کچھ احناف کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے جب طویل رکوع کیا تو صف اول سے تعبیر تکرار رکوع کی صورت میں صحابی نے کی ہو۔ جیسے زید بن خالد جہنیؓ کی حدیث میں آتا ہے کہ فصلّی رکعتین خفیفتین ثمّ صلّی رکعتین طویلتین طویلتین طویلتین. تو اس سے مراد طول ہے تکرار نہیں ہے۔ یہاں بھی صرف طول سے تعبیر تکرار رکوع کی صورت میں کی گئی ہے۔

(۸) جبکہ بعض کہتے ہیں کہ دوسری رکوع نماز کی رکوع نہیں تھی۔ بلکہ بعض آیات غریبہ کے مشاہدہ کی وجہ سے تھی۔ جیسے کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ اس نماز میں آپ ﷺ کو جنت اور جہنم کا مشاہدہ کروایا گیا تھا۔ تو ہوسکتا ہے کہ آیات کے مشاہدہ کے بعد آپ ﷺ تواضعاً دوبارہ رکوع میں گئے ہوں۔ اس طرح یہ تعدد نبی ﷺ کی خصوصیت بھی ہوسکتی ہے۔ دیگر لوگوں کا یہ حکم نہیں ہوگا۔

<u>نفخ اور بکاء:</u> ثمّ رفع رأسه فلم یکدان یسجد، یعنی دونوں سجدوں کے درمیان میں بھی بہت طویل جلسہ کیا۔ حتیٰ کہ قریب تھا کہ دوسرے سجدے کو نہ جائیں۔ سجدوں کے درمیان طویل جلسہ صرف اسی ایک حدیث میں مروی ہے۔ اور جمہور ائمہؒ کے نزدیک یہ طوالت غیر مختار ہے۔ امام غزالیؒ کہتے ہیں کہ اس پر آئمہ کا اتفاق ہے۔

فجعل ینفخ ویبکی، اس میں ترجمۃ الباب سے مطابقت ہے۔ یعنی آپ ﷺ سجدے میں بڑے بڑے جوش کے ساتھ سانس لیتے تھے اور روتے رہتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ ثمّ نفخ فی آخر سجوده فقال اف اف الخ (۱)۔ اس پر ایک اشکال ہے کہ ایسا جوش کے ساتھ سانس لینا جس سے حروف پیدا ہوں مفسد صلوٰۃ ہے۔ تو آپ ﷺ سے کیسی صادر ہوسکتی ہیں۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں ایسی پھونکیں مراد نہیں ہے جس سے آواز یا حروف پیدا ہوں بلکہ یہ صرف ان سانسوں سے تعبیر ہے۔ جو زور سے نکل رہی تھیں۔ ان کو اگر نفخ کہا گیا ہے تو وہ بھی صرف حکایۃً کہا گیا ہے۔ اور اگر اف اف کہا گیا تو

(۱) ثمّ سجد فلم یکن یرفع ثمّ رفع وفعل فی الرکعۃ الاخری مثل ذالک ثم نفخ فی آخر سجوده فقال اف اف ثمّ قال رب ألم تعدنی الخ (ابوداؤد ج ۱ ص ۱۷۶)

وہ بھی صرف تعبیر کی ضرورت کی وجہ سے۔ جیسے عرب لوگ کوّے کی آواز سے غاق کہہ کر تعبیر کرتے ہیں۔ حالانکہ وہاں کوئی عین الف یا قاف کا حرف ادا نہیں ہوتا۔

نزول مصائب میں استغفار وانابت: رب الم تعدنی ان لا تعذبهم وانافیهم الخ، یہ اس قرآنی وعدہ کا ذکر ہے جس کو انفال کی اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ "وما کان الله لیعذبهم وانت فیهم وما کان الله معذبهم وهم یستغفرون (انفال ۳۲)

یعنی اللہ تعالیٰ ان کو آپ کی موجودگی میں اور استغفار کرتے ہوئے عذاب نہیں دے گا۔

پھر فرمایا کہ "ونحن نستغفرک" یعنی اس وقت تو میری موجودگی میں میری امت اور میں سب استغفار کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا اس کا تقاضہ یہ ہے کہ ہمیں عذاب سے محفوظ فرما۔

چونکہ خسوف کسوف کبھی کبھی عذاب کی علامت ہوتی ہے اور کبھی کبھی عذاب کی عموم کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس لئے آپ ﷺ نے تضرع سے دعا کی۔ نیز اس دعا میں امت کو ایک تعلیم بھی مقصود تھی کہ مصائب کے نزول کے وقت انابت اور رجوع الی اللہ ضروری ہے۔ پھر اگر چہ یہاں موجودہ صورت میں رفع عذاب موعود تھا۔ لیکن ہر وعدہ کچھ شرائط سے مشروط اور بعض قیود کے ساتھ مقید ہوتا ہے۔ اس لئے پھر بھی نزول عذاب یا عموم عذاب کا خطرہ تھا۔ اس وجہ سے دعا کی ضرورت تھی۔ جو آپ ﷺ نے فرمادی۔

اوہام جاہلیت کی تردید کے لئے خطبہ: فقام فحمد الله، یعنی نماز اور گرہن کے خاتمے کے بعد آپ ﷺ منبر پر وعظ فرمانے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ اور جہالت کے اوہام کے ابطال کے لئے ارشاد فرمایا کہ انّ الشمس والقمر آیتان من آیات الله الخ، جاہلیت کے اوہام میں سے ایک وہم تو یہ تھا کہ سورج یا چاند گرہن صرف اس روز ہوتے ہیں جب کوئی عظیم ہستی پیدا ہوئی ہو یا وفات ہونے والی ہو۔ دوسری طرف کواکب پرستی کے زیر اثر علم نجوم والوں کا کہنا تھا کہ سورج، چاند اور دیگر اجرام سماوی میں تغیرات زمین میں واقعات وحوادث کے لئے حقیقی علتیں ہیں۔

چونکہ اتفاق ایسا پیش آیا کہ جس روز مذکورہ سورج گرہن ہوا تھا اسی روز حضور اقدس ﷺ کے چھوٹے بیٹے سیدنا ابراہیم کا وصال ہوا تھا جو کہ جاہلیت کے ان غلط اوہام کے لئے ایک مؤید اور مزید گمراہ

کن تصورات وخیالات کا منشا بن سکتا تھا۔ آپ ﷺ کی حساس اور اوہام پرستی سے متنفر طبیعت نے اس خطرے کو تاڑ دیا۔لہٰذا فوراً اس کے ازالے کے لئے کھڑے ہو گئے۔اور لوگوں کو تنبیہ فرمائی کہ دیکھو سورج چاند اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور تصرف نافذہ کی علامتیں ہیں۔ان کا گرہن اس بات کی عظیم دلیل ہے کہ جو کچھ عالم میں ہوتا رہتا ہے وہ خدائے ذوالجلال کے ارادے سے ہو رہا ہے۔کبھی تو ان اجرام سماوی سے روشنی بکھیرنے کا کام لے رہا ہے اور کبھی ان کے عجز و مجبوری کا معائنہ کروانے کے لئے ان کی روشنی چھین لیتا ہے۔تو جب اسباب تکوین سے لیس یہ اجرام مجبور و مقہور ہیں تو ان سے نفع وضرر کی امیدیں باندھنا اور حوادث ارضی میں ان کو دخیل سمجھنا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔

اس مضمون کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں آیا ہے

انّ الشمس والقمر لاینکسفان لموت احدو لالحیاته ولکنّهما آیتان من آیات اللّٰہ و انّ اللّٰہ اذاتجلّی لشیٔ من خلقه خشع له(جمع الوسائل ج ۲ ص ۱۰)

سورج یا چاند گرہن کسی کی موت یا ولادت سے نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ اللہ کی قدرت کاملہ کی نشانیاں ہیں۔اور جب اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے کسی چیز پر تجلّی فرماتے ہیں تو وہ عاجزی اختیار کر لیتی ہے۔

اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ ان دونوں کا گرہن اللہ تعالیٰ کے لئے عاجزی اور خشوع کا سبب ہے اور اس کا راز یہی ہے کہ جب رب ذوالجلال اپنی صفت جلال کی تجلّی فرماتے ہیں تو عالم کا جمال حسی جو نور کی شکل میں ہے عظمت الٰہی اور ہیبت کے مارے دب جاتا ہے۔اس حکمت کا ادراک کر کے حضرت طاؤسؒ نے جب سورج گرہن دیکھا تو روتے روتے فرمایا "ھی اخوف لِلّٰه منّا" یعنی سورج ہم سے زیادہ خدا سے ڈر رہا ہے۔

یا پھر کلام نبوی ﷺ کا مطلب یہ ہے کہ سورج گرہن اور چاند گرہن کے بارے میں اہل جاہلیت کے خیالات باطل ہیں اور ان کے ساتھ خوف ورجا کا تعلق فاسد خیال ہے۔

آیات اللہ کے ذریعہ تخویف عباد: دراصل ان کی روشنی چھین کر رب کائنات صرف یاددہانی کرارہا ہے۔ کہ قوت ونور کے یہ خزانے سارے کے سارے میری ملک اور زیر تصرف ہیں۔ اگر وہ چاہے تو اس کے نور کو چھین لے اور انسان عظیم نعمتوں سے محروم ہو جائے کیونکہ ظاہر ہے سورج چاند کے بغیر زندگی اجیرن ہو کر رہ جائے گی۔ اس طرح ان کا بے نور ہونا عذاب الٰہی کی علامت اور اللہ سے باغیوں کے لئے ذریعہ عبرت ہے۔ اسی مضمون کو ایک حدیث میں صراحۃً بیان فرمایا ہے:

إنّماھذہ الآیات یخوف اللّٰہ بھا فاذا کسفافافزعوا الیٰ الصلوٰۃ (۱)

ان نشانیوں سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈراتے ہیں۔ لہٰذا ان کا گرہن ہو جائے تو نماز پڑھا کرو۔

بخاری شریف میں ہے "ولکن یخوف اللّٰہ بھا عبادہ فاذا رأیتم شیئا من ذالک فافزعوا الیٰ ذکر اللّٰہ ودعاءہ واستغفارہ (۲)

بلکہ انہوں نے تخویف عباد کے عنوان سے ترجمۃ الباب قائم کیا ہے (بخاری ج ۱ ص ۱۴۵)

نسائی کی ایک روایت میں ہے کہ "فاذا رأیتموھا فصلوا وتذکروا الخوف" زیر نظر حدیث میں نبی اکرم ﷺ کا تضرع اور استغفار بھی لحوق خوف کی واضح دلیل ہے۔

لہٰذا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ علامت سے مراد علامت عذاب اور قہر الٰہی ہے۔

کسوف کے وقت خطبہ مسنون ہے یا نہیں: اس حدیث میں مذکور ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے نماز کسوف کے بعد امت کو کچھ ارشادات فرمائے۔ دیگر احادیث بھی اس پر شاہد ہیں کہ آپ ﷺ نے اس روز وعظ فرمایا تھا۔ اس وجہ سے شوافع کے ہاں نماز کسوف میں خطبہ مستحب عمل ہے۔ جبکہ احناف، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ کے نزدیک صلوٰۃ کسوف میں خطبہ نہیں ہے۔ بلکہ نماز کے بعد اس وقت تک ذکر دعا اور استغفار کرنا مسنون ہے جب تک سورج گرہن ختم نہ ہو۔ صاحب ہدایہ اور علامہ حصکفیؒ نے اس کی تصریح

---

(۱)ابوداؤد ج ۱ ص ۱۷۳

(۲)بخاری شریف ج ۱ ص ۱۴۵

کی ہے۔لیکن علامہ شامیؒ نے خلاصہ اور قاضی خان کے حوالہ سے نماز کسوف کے بعد خطبہ پر اتفاق کا قول بھی نقل کیا ہے۔ کما فی فتح الملھم ج ۲ ص ۴۵۴

ملا علی قاریؒ نے حدیث میں خطبہ کے ذکر سے جواب یوں دیا ہے۔ کہ دیکھو نبی اکرم ﷺ نے کسوف کے دوران مسنون اعمال کا تفصیل سے حکم دیا ہے جن میں نماز ہے، صدقہ ہے، اعتاق ہے، ذکر ہے، دعا ہے، استغفار ہے۔ لیکن کسی بھی حدیث میں خطبہ کا حکم نہیں دیا ہے۔ جہاں تک کہ آپ ﷺ کے خطبہ کا تعلق ہے۔تو وہ کسوف کے لئے نہیں تھا بلکہ اس سے پیدا ہونے والے اوہام کے ابطال کی کوشش تھی۔ اس لئے اسے نماز کسوف کا حصہ نہیں بنانا چاہیے۔

کائنات کے طبعی اصول وضوابط قدرت الٰہی کے منافی نہیں: یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ سورج یا چاند گرہن کے لئے تو طبعی اسباب موجود ہیں۔ دونوں کی گردش سے پیدا ہونے والی مخصوص حالت کی وجہ سے یہ حوادث رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اور علم ہیئت والوں نے بعض اصول وضوابط کی بنیاد پر اس کا طبعی ہونا ثابت کردیا ہے۔ لہٰذا ان کو تازیانۂ الٰہی کہنا یا علامات ونشانیاں کہنا درست نہ ہوگا۔ لیکن یہ شبہ انتہائی بے جا ہے۔ کیونکہ کسی حادثے کا کسی سبب کے تحت ہونا اور طبعی ضوابط سے مقید ہونا نہ تو قدرت الٰہی کے کمال پر دلالت کے منافی ہے نہ تخویف اور تنبیہ سے۔ قرآن مجید نے سماوی اور ارضی مخلوقات، اجرام کا طلوع وغروب ان میں تغیرات اور الٰہی تصرفات کو بارہا بطور استدلال اور بطور عبرت پیش کیا ہے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ اہل طبیعات اگر ظاہر پرستی کی مرض سے جانبر ہوجائیں تو۔

برگ درختان سبز درنظرِ ہوشیار   ہر ورقے دفتریست زمعرفت کردگار

ایک عارف باللہ ان حوادثِ روزگار کو دوسری نظر سے دیکھ رہا ہے۔ جن کو طبعیات کا عالِم محض ایک عادی اور ماتحت الاسباب تغیرات سمجھ رہا ہے۔

اللہ جل جلالہ نے ان آیات کو اولی الابصار کے لئے آیات ٹھہرایا ہے۔ بصیرت سے محروم عقل کے اندھوں کے لئے نہیں۔

(۴) حدثنا محمود بن غیلان ثنا أبو أحمد ثنا سفیان عن عطاء ابن

السائب عن عكرمة عن ابن عباس قال أخذ رسول اللّٰه ﷺ إبنة له تقضى فاحتضنهافوضعها بين يديه فماتت وهى بين يديه وصاحت أمّ أيمن فقال يعنى النبيّ ﷺ أتبكين عند رسول اللّٰه ﷺ فقالت الست اراک تبکی قال انی لست ابکی انّما هی رحمة إنّ المؤمن بكل خير على كل حالٍ إنّ نفسه تنزع من بين جنبيه وهو يحمداللّٰه تعالىٰ(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی قریب الوفات بیٹی کو گود میں لیا۔ پھر اسے اپنے سامنے رکھا۔ (اسی حالت میں) حضور اقدس ﷺ کے سامنے اس کی وفات ہوگئی۔ (حضوراقدس ﷺ کی باندی) ام ایمنؓ روتی ہوئی چلائی۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔ کیا رسول خدا کے ہوتے ہوئے تم چلاتی ہو۔ وہ بولیں کہ یارسول اللہ میں تجھے بھی تو روتا ہوا دیکھتی ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں (تیری طرح رونا) نہیں روتا۔ میرے آنسو تو رحمت کے آنسو ہیں۔ بیشک مؤمن ہر حال میں خیر ہی میں رہتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی روح اس کی پہلوؤں کے درمیان سے نکل جاتی ہے۔ اور وہ اللہ کی حمد ادا کرتا رہتا ہے۔

<u>حضوراقدس ﷺ کے سامنے مرنے والی بیٹی سے کیا مراد ہے:</u> **اخذرسول اللّٰه ابنة له،** اس لڑکی سے کون مراد ہے۔ چونکہ نبی اکرم ﷺ کی تمام بیٹیاں بڑی ہو کر وفات پائی ہیں۔ اس لئے ان کا حقیقۃً بیٹی ہونا بھی بعید ہے۔ اور اگر مجازاً کسی بیٹی کی بیٹی مراد ہو تو وہ اگرچہ لغۃً تو محتمل ہے۔ مگر تاریخی لحاظ سے یہ بھی محل نظر ہے کیونکہ آپ ﷺ کی زندگی میں آپ ﷺ کی نواسی کا انتقال ثابت نہیں۔ اگرچہ مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ کے پاس امامہ بنت ابی العاص جو زینبؓ کی بیٹی تھیں۔ نزع کی حالت میں لائی گئی۔ مگر دوسری روایات میں مذکور ہے کہ امامہ بنت زینبؓ تو حضرت علیؓ کی عقد میں آئی تھیں۔ لہٰذا وہ تو نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد بھی زندہ تھیں۔

---

(۱)مجمع الزوائد۱۸/۳ ،مصنف ابن ابی شیبة۳/۳۹۴، مسنداحمد ۲۶۸/۱، صحیح ابن حبان رقم ۷۴۶(مختار)

اس کے تین جوابات منقول ہیں۔

اول یہ کہ یہاں پراسی امامہؓ کا واقعہ مذکور ہو مگر وہ مری نہیں تھی۔اور نبی ﷺ کی دعاؤں کی وجہ سے پھر جانبر ہوگئیں۔زیر نظر حدیث میں وفات سے قرب وفات مراد ہے۔اور حضرت ام ایمن کا رونا اس لئے تھا کہ وہ سمجھی کہ وفات پا چکی ہیں۔

دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں پر دراصل ابنہ کا لفظ تھا۔کسی راوی کے وہم کی وجہ سے اسے ابنۃ بنا دیا گیا ہو۔اور نبی اکرم ﷺ کے فرزندان کی زندگی میں کم سنی کی حالت میں وفات پائے تھے۔

تیسرا جواب بعض حضرات نے یہ دیا ہے کہ دراصل یہاں ''ابن ابنۃ '' تھا۔کسی راوی کو وہم ہوا اور اسے ابنۃ بنا دیا گیا ہے۔یعنی نبی اکرم ﷺ کا کوئی نواسا وفات ہونے والا تھا اور آپ ﷺ اس کی وجہ سے روئے تھے۔اور یہ بات بھی تاریخ کے لحاظ سے درست ہے کیونکہ بعض روایات کے مطابق عبداللہ بن عثمان جو حضرت رقیہ کے فرزند تھے صغرسنی میں آپ ﷺ کے سامنے وفات پائے تھے۔اور آپ ﷺ ترحماً روئے تھے۔نیز مسند بزار میں مروی ہے کہ حضرت فاطمہؓ کے بیٹے حضرت محسنؓ صغرسنی میں وفات پائے تھے۔اور حضرت فاطمہؓ نے آپ کو بھی وفات کے وقت بلایا تھا۔

تقضی: قضی یقضی سے واحد مؤنث کا صیغہ ہے۔جو موت کے معنی میں مستعمل ہے۔لہٰذا تقضی کے معنی ہیں تموت یعنی وفات پانے والی تھی۔بعض حضرات کا قول ہے کہ یہاں موت کے معنی میں نہیں بلکہ اشراف علی الموت یعنی قریب موت میں مستعمل ہے۔کیونکہ موصوفہ کی وفات نہیں ہوئی تھی۔جبکہ بعض حضرات کا خیال ہے کہ قضیٰ کا اصل معنی انقطاع شیء اور انتہاء ہے۔یہاں معنی یہ ہوگا کہ ختم ہونیوالی تھی۔

فاحتضنها ،احتضان سے ہے۔جو بغل میں لینے کو کہتے ہیں۔یعنی آپ ﷺ نے اسے پہلو میں لیا۔لیکن مجازاً گود میں لینے کے لئے مستعمل ہے۔کیونکہ حضن پہلو کی جانب سینے کے زیرین حصے کو کہتے ہیں(۱)۔

---

(۱)الحضن هو الصدر ممّا دون الابط الى الكشح و من كل شئ ناحيته و جانبه (المعجم الوسيط)

نسائی کی روایت میں ہے وضمھا الیٰ صدرہ

أمّ ایمنؓ: فصاحت أمّ ایمن، یعنی جب بیٹی کی وفات ہوئی۔تو ام ایمن چیخ مار کر روئیں۔ام ایمنؓ نبی اکرم ﷺ کو والد سے میراث میں ملی تھیں۔حضرت خدیجہؓ سے نکاح کے بعد آپ ﷺ نے اسے آزاد کر دیا۔اور اپنے متبنیٰ زید بن حارثہؓ سے اس کا نکاح کر دیا۔حضرت ام ایمنؓ غزوۂ احد میں بھی شرکت کر چکی تھیں۔اور حضرت عمرؓ کی شہادت کے بیس دن بعد وفات پا گئیں۔ان کے بیٹے ایمنؓ اور اسامہؓ دونوں کا شمار عظیم صحابہ میں ہوتا ہے۔

أمّ ایمن اور حضور اقدس ﷺ کے رونے میں فرق: ألستُ اراک تبکی، کیا میں آپ کو روتا ہوا نہیں دیکھتی؟ ام ایمنؓ کے خیال میں رونے کی تمام صورتیں یکساں تھیں۔اس لئے آپ ﷺ کے آنسو بہنے اور اپنی چیخوں کے درمیان فرق نہ کر سکیں۔

انی لست ابکی ،میں نہیں روتا۔آپ ﷺ کے کلام کے دو معنی ذکر کئے گئے ہیں۔اول یہ کہ تیری طرح ناجائز اور ممنوع رونا نہیں روتا۔ بلکہ میرا رونا صبر و رضا کے ساتھ ہے۔جبکہ تیری چیخوں میں جزع اور بے صبری ہے۔دوم یہ کہ تیرا رونا اختیاری فعل ہے جبکہ میرا رونا بے اختیار اور جوش رحمت سے مغلوبیت کی بناء پر ہے۔اس لئے میں اپنے اختیار سے نہیں روتا اور تم اپنے اختیار سے روتی ہو۔

انما ھی رحمۃ، "ھی" کا ضمیر بکاء کو راجع ہے۔جو مصدر ہے اور مصادر مذکر و مؤنث دونوں طرح مستعمل ہوتے ہیں۔یا پھر یہ ضمیر خبر کی رعایت کی وجہ سے مؤنث لایا گیا ہے۔جو مؤنث ہے یہ بھی محتمل ہے۔یہ قطرۃ اور دمعۃ کو راجع ہو۔بہر حال اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ کا رونا مذکور ہے۔اور اس میں ترجمۃ الباب کے ساتھ موافقت ہے۔

لیکن اس پر اشکال ہے کہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ

مابکی رسول اللہ ﷺ علیٰ میت إنّما غایۃ حُزنہ ان یمسک لحیتہ

نبی اکرم ﷺ کبھی بھی کسی میت پر نہیں روئے۔آپ ﷺ انتہائی غم میں زیادہ سے زیادہ داڑھی کو پکڑ لیتے تھے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کبھی بھی تاسف اور جزع کا رونا نہیں روئے۔ حزن ورحمت کے آنسو کی نفی مقصود نہیں۔ جو متعدد روایات سے ثابت ہیں۔

انّ نفسه تنزع من بين جنبيه وهو يحمد الله، اس کا مطلب یہ ہے کہ مؤمن کے لئے ایسا ہونا چاہئے کہ روح نکلتے ہوئے بھی رضائے الٰہی اور شغل بالحق میں محو ہو۔ اور اللہ کی حمد وثنا میں مستغرق ہو۔ موت کو بھی محبوب کی طرف سے تحفہ سمجھ کر خندہ روئی سے قبول کرلے۔

(۵) حدّثنا محمّد بن بشّار ثنا عبدالرحمٰن بن مهدی ثنا سفيان عن عاصم بن عبيدالله عن القاسم بن محمّد عن عائشة أنّ رسول الله ﷺ قبّل عثمان بن مظعون وهو ميت وهو يبكی اوقال وعيناه تهرقان(۱)۔

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے عثمان بن مظعونؓ کو اس وقت بوسہ دیا جب وہ وفات پاچکے تھے۔ اس حالت میں کہ آپ ﷺ رورہے تھے۔ یا راوی نے یہ کہا کہ آپ ﷺ کے آنسو ٹپک رہے تھے۔

<u>حضرت عثمان بن مظعونؓ:</u> قبّل عثمان بن مظعونؓ، حضرت عثمان بن مظعونؓ جلیل القدر صحابی ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے رضاعی بھائی بھی ہیں۔ ابتدائے اسلام کے زمانہ میں صرف تیرہ مسلمانوں کے بعد مسلمان ہوئے۔ زمانہ جاہلیت میں بھی کبھی شراب کو منہ نہیں لگایا۔ اسلام کے بعد سب سے پہلے حبشہ اور پھر مدینہ منورہ ہجرت کی(۲)۔ اور یہیں شعبان ۲ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ مدینہ میں مہاجرین میں سب سے

---

(۱)سنن ابی داؤد ۹۵/۲ کتاب الجنائز باب فی تقبیل المیت، جامع الترمذی ۳۱۸/۱ کتاب الجنائز باب ماجاء فی تقبیل المیت، سنن ابن ماجة ص ۱۰۵ کتاب الجنائز باب ماجاء فی تقبیل المیت، السنن الکبریٰ للبیهقی ۴۰۷/۳(مختار)

(۲)رسول اللہ ﷺ نے ان کا بھائی چارہ حضرت ابوالہیثم بن التمان کے ساتھ کیا۔ غزوۂ بدر میں بھی شریک ہوئے۔ اور واپسی پر بیمار ہوئے اور ۲ھ کو وفات پاگئے۔ جب آپ ؓ کا جنازہ اٹھایا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا طوبی لک یا عثمان لم تلبسک الدنیا ولم تلبسها(جمع الوسائل ۱۵۳/۲) اے عثمان تیرے لئے بشارت کہ نہ تو نے دنیا پہنی اور نہ دنیا تجھے پہن سکی۔ (مختار)

پہلے انتقال آپؓ کا ہوا تھا۔حضور اقدس ﷺ کو بہت عزیز تھے۔ان کے وفات کے بعد ان کا بوسہ لیا اور روئے۔نیز آپ ﷺ نے فرمایانعم السلف هولنا

هو یکی، آپ ﷺ بہت روئے یہاں تک کہ روایات کے مطابق آپ ﷺ کے آنسو حضرت عثمانؓ کے چہرے پر بھی ٹپکنے لگے(۱)۔

او قال عینان تهراقان، راوی کو شک ہے کہ ان دونوں جملوں میں سے کونسا جملہ کہا گیا ہے۔ لیکن مطلب ایک ہی ہے۔تهراقان میں راء کے بعد الف مروی ہے۔اس کی صرفی تحقیق میں کچھ تفصیل ہے۔اس کلمہ کا اصل اراق یُریق اراقة ہے۔جو مائع چیز کے گرانے کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔پھر کبھی کبھی اراق کا ہمزہ ہاء سے بدل دیا جاتا ہے۔اور هراق يهريق بولا جاتا ہے۔کبھی کبھی اهرق يهرق اهراقاً مستعمل ہوتا ہےاور کبھی اهراق يهريق اهراقةً استعمال ہوتا ہے۔مؤخر الذکر تعریف کے لئے دو توجیہ کی جاتی ہیں۔

<u>لفظ اراق اوراھراق کی تحقیق:</u> اول یہ کہ دراصل اہراق ارق ہی تھا۔لیکن اراق میں تعلیلات کی کثرت کی وجہ سے بنائے کلمہ ضعیف ہوگئی تھی۔کیونکہ اراق اروق یااریــق سے بنا ہے۔جس میں پہلے حرف علت کو ساکن کر کے حرکت راء کو منتقل کی گئی۔پھر حرف علت کو الف سے بدل دیا گیا۔کلمہ کے وہن کو دور کرنے کے لئے ایک ہاء کو زائد لایا گیا۔لہٰذا اہراق بن گیا۔پھر اس زیادت کو پورے باب کا حصّہ بنا دیا گیا۔جبکہ بعض کہتے ہیں کہ اراق کے ہمزہ کو ہاء سے بدل دیا گیا۔ہراق بنا، پھر بدل اور مبدل منہ دونوں کو جمع کرتے ہوئے، ہمزہ محذوفہ کو دوبارہ لایا گیا۔بہر حال یہ کلمہ ہر لحاظ سے صرفی قوانین کو بالائے طاق رکھ کر مستعمل ہوتا ہے۔یہاں بعض نسخوں میں تہرقان الف کے بغیر منقول ہے۔یہ اهــرق يهــرق سے ہے۔اور علامہ جوہری نے اسے اراق کی طرح مستقل لغۃ قرار دیا ہے۔

---

(۱) ملاعلی قاریؒ نے ابن الجوزی کی کتاب الوفاء کے حوالہ سے حضرت عائشہؓ کی روایت نقل کی ہے۔قالت لما مات عثمان بن مظعون کشف النبیّ ﷺ الثوب عن وجهه وقبّل بین عینیه ثمّ بکیٰ طویلاً فلما رفع عن السریر قال طوبیٰ لک یا عثمان لم تلبسک الدنیا ولم تلبسها (جمع الوسائل ۱۵۳/۲)(مختار)

(۶) حدّثنا إسحاق بن منصور أنا أبوعامر ثنا فليح وهوابن سليمان عن هلال بن عليّ عن أنس بن مالک قال شهدنا ابنة لرسول اللّٰه ﷺ ورسول اللّٰه ﷺ جالس على القبر فرأيت عينيه تدمعان فقال أفيكم رجل لم يقارف الليلة قال أبوطلحة أنا قال انزل فنزل في قبرها(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم نبی اکرم ﷺ کی ایک صاحبزادی کی نماز جنازہ میں شریک تھے۔ نبی اکرم ﷺ قبر کے پاس تشریف فرما تھے۔ میں نے دیکھا آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جس نے آج رات جماع نہیں کیا ہو۔حضرت ابوطلحہؓ نے عرض کیا کہ میں ہوں۔آپ ﷺ نے حکم دیا کہ تم قبر میں (مرحومہ کی تدفین کے لئے) اتر جاؤ۔چنانچہ وہ قبر میں اتر گئے۔

<u>مرنے والی بیٹی رقیہ تھی یا ام کلثوم:</u> **شهدنا ابنة لرسول اللّٰه ﷺ،** بعض لوگوں نے ابنة الرسول ﷺ کا مصداق حضرت رقیہؓ بتایا ہے۔لیکن یہ درست نہیں ہے۔کیونکہ حضرت رقیہؓ کی تدفین میں نبی اکرم ﷺ کو شرکت کا موقعہ نہیں ملا۔ان کی وفات کے موقعہ پر آپ ﷺ غزوۂ بدر میں مشغول تھے۔ بعد میں آپ ﷺ نے اُم کلثومؓ کا نکاح حضرت عثمانؓ سے کردیا تھا۔اس لئے اکثر شراح نے حضرت اُم کلثومؓ کو اس کا مصداق ٹھہرایا ہے۔آپ ﷺ کی یہ دونوں صاحبزادیاں یعنی رقیہؓ اور ام کلثومؓ ابولہب کے بیٹوں عتبہ اور عتیبہ کے نکاح میں تھیں۔جب "تبت یدا ابی لهب" نازل ہوئی تو والدین کے حکم سے دونوں نے ان کو طلاق دیدی۔رقیہؓ رمضان ۲ھ میں وفات ہوئیں تو ۳ھ میں آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ام کلثومؓ کا نکاح حضرت عثمانؓ سے کردیا۔ام کلثومؓ اور فاطمہؓ میں کونسی چھوٹی تھیں۔اس میں اہل سیر کا اختلاف ہے۔ام کلثومؓ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔

(۱)صحيح بخاري ۱/۱۷۱ كتاب الجنائز باب قول النبيّ ﷺ يعذب الميت ببكاء اهله عليه، شرح السنة رقم حديث ۱۵۱۳،السنن الكبرىٰ للبيهقي ۵۳/۴ كتاب الجنائز (مختار)

<u>لفظ مقارفۃ سے مراد:</u> أفیکم رجل لم یقارف اللیلۃ، قارف یقارف مقارفۃ کے معنی گناہ کاارتکاب کرنا ہیں۔نیز یہ جماع کرنے کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔

ابن اثیرؒ نے نہایہ میں دونوں معنوں کاذکر کیا ہے۔کہتے ہیں"قارف الذنب اذا دناہ وقارف امرأتہ اذاجاء ھا "الخ

امام بخاریؒ نے ابن المبارکؒ کے حوالہ سے فلیحؒ سے یہ تفسیر ذکر کی ہے کہ اراہ یعنی الذنب تواس تقدیر میں لم یقارف کامفعول بہ الذنب مقدر ہے۔اور ترجمہ یہ ہوگا کہ تم میں سے کوئی ہے جس نے آج رات کوئی گناہ نہیں کیا ہو۔البتہ اس پر اشکال کیا جاتا ہے کہ جواب میں ابوطلحہؓ کا یہ کہنا کہ میں ہوں۔اعجاب اورخودستائی کے زمرے میں آئے گا۔نیز ضمناً دوسرے حاضرین کے لئے ارتکاب معصیت کا اثبات بھی ہوجائے گا۔حالانکہ دونوں باتیں بعید از قیاس ہیں۔اس لئے صاحب نہایہ نے بھی یہاں دوسرے معنی کو ترجیح دیتے ہوئے کہا ہے"ومنہ الحدیث فی دفن ام کلثومؓ"

علامہ ابن حزمؒ نے بھی اس کو ترجیح دی ہے۔اوراس کی تائیداس روایت سے بھی ہوتی ہے جسے امام بخاریؒ نے تاریخ اوسط میں اورامام حاکم نے مستدرک میں ذکر کیا ہے۔

"لایدخل القبر احد قارف اھلہ البارحۃ فتنحیٰ عثمان" اوراکثر شراح نے اس ترجمہ کوزیادہ راجح قراردیا ہے۔

<u>جماع نہ کرنے والوں کوترجیح میں حکمت:</u> مگراس میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ جماع نہ کرنے والوں کودوسروں پر ترجیح دینے میں کونسی حکمت پوشیدہ ہےاس کی دووجہ ذکر کی گئی ہیں۔

اول یہ کے جوشخص زمانہ قریب میں جماع سے محفوظ ہواس کانفس ترکِ قضائے شہوت کی وجہ سے مطمئن ہوتا ہے۔

گویاوہ مردانہ تقاضوں اوررغبتوں کو ماضی بعید کا حصہ جان کر بھول چکا ہے۔اورقبر کے ساتھ یہ حالت بہت ہی انسب ہے۔

علامہ مناویؒ لکھتے ہیں۔وجہ یہ ہے کہ

إنّ الحديث العهد بالجماع قد يتذكر ذالک فيذهل عما يطلب من احكام الالحاد و احكامه(۱)

تازہ جماع کئے ہوئے شخص کو کبھی کبھی یہ کام یاد آجاتا ہے تو وہ تدفین کے احکام سے غافل اور اس کو احسن طریقہ سے انجام دینے سے قاصر رہتا ہے۔

<u>حضرت عثمانؓ پر لطیف تعریض:</u> دوسری وجہ جسے اکثر شرّاح نے ترجیح دی ہے وہ یہ ہے کہ دراصل اس میں حضرت عثمانؓ پر تعریض اور ان کے قصور پر تنبیہ مقصود ہے۔ ہوا یوں کہ جس رات کو سیدہ ام کلثومؓ کا انتقال ہوا تھا اسی رات کو سیدنا عثمانؓ نے اپنی ایک لونڈی سے ہمبستری کی تھی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے یہ حکم دیا کہ جماع نہ کرنے والے قبر میں اتریں۔ یہ سیدنا عثمانؓ کو تنبیہ تھی۔ کہ جماع میں شغل کی وجہ سے حضور اقدس ﷺ کی لخت جگر کی مرض وفات میں جس کے نکاح کا حکم جبرئیلؑ لائے تھے۔ تیمارداری سے غفلت ضرور ہوئی ہوگی۔ لہٰذا آپ ﷺ نے عتاباً انہیں قبر میں اترنے سے روکا۔

لیکن ظاہر ہے کہ عتاب کسی گناہ پر نہیں تھا۔ کیونکہ ام کلثومؓ طویل المیعاد مرض میں مبتلا تھیں۔ اور کس کو علم تھا کہ اس رات کو وہ وفات پانے والی ہیں۔ اس لئے اگر حضرت عثمانؓ اس رات ایک جائز عمل میں مشغول ہوئے تو اسے گناہ تو نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ حضرت عثمانؓ سے وفور محبت اور شدت تعلق کی بناء پر آپ ﷺ نے بغیر جرم کی یہ لطیف تنبیہ کی ہو جو ہمیشہ اپنے اور صرف محبّین ومحبوبین کو ہوا کرتی ہے تو کچھ بعید نہیں ہے۔

<u>غیر محرم کی عمل تدفین میں شرکت کا حکم:</u> یہ بھی واضح رہے کہ قبر میں اترتے وقت حضرت ابوطلحہؓ اکیلے نہیں تھے بلکہ اس خدمت میں حضرت علیؓ، حضرت فضل بن عباسؓ اور اسامہ بن زیدؓ بھی شریک تھے (۲) ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ محارم کی موجودگی میں بھی غیر محرم کسی عورت کو قبر میں اتار سکتے ہیں۔ اور شاید نبی اکرم ﷺ نے بیان جواز کے لئے ہی یہ عمل ان سے کروایا ہو۔ البتہ مستحب یہی ہے کہ یہ خدمت محارم خود انجام دیں۔ **کمافی البحر الرائق**

---

(۱) شرح الشمائل للمناوی علی هامش جمع الوسائل ۲/۱۵۴

(۲) الاصابة ج۷ ص ۳۶۹

امام طحاویؒ کی توجیہ: گزشتہ طویل بحث اور اشکالات وجوابات کی وجہ سے امام طحاویؒ سے یہ مروی ہے کہ زیر نظر حدیث میں دراصل تصحیف کی گئی ہے اور یہ لفظ لم یقارف کی بجائے لم یقاول تھا۔ جس کا معنی یہ ہے کہ جس شخص نے کسی دوسرے کے ساتھ مقاولہ یعنی بحث اور تو تو میں میں نہ کی ہو۔ اور چونکہ عشاء کے بعد سمر یعنی گپ شپ سے نہی مروی ہے۔ اس لئے کلام کا معنی یہ ہوگا کہ جو شخص آج رات عشاء کے بعد کسی سے بحث ومباحثہ اور گپ شپ سے باز رہا ہو وہ قبر میں اترے اور تدفین کا کام کرے۔ لیکن حق یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ پر تعریض یا دوسری مصلحتوں کی خاطر آپ ﷺ کی مراد جماع ہو۔ تو اس میں کوئی استبعاد نہیں اور امام طحاویؒ بلاوجہ تکلفات پر اتر آئے ہیں۔

حضور اقدس ﷺ کی اولاد: نبی اکرم ﷺ کے صاحبزادوں کے بارے میں اہل سیر کا اختلاف مروی ہے۔ اس سلسلے میں آٹھ نام لئے جاتے ہیں۔

(۱) قاسم (۲) ابراہیم (۳) عبداللہ (۴) عبد مناف (۵) الطیّب
(۶) المطیب (۷) الطاہر (۸) المطہر

ان میں اول الذکر دو پر اتفاق ہے۔ اکثریت کے قول کے مطابق آپ ﷺ کے تیسرے بیٹے کا نام عبداللہ تھا۔ بقیہ پانچ کے بارے میں راجح بات یہ ہے کہ یا تو ثابت نہیں یا قاسم اور عبداللہ کے القاب کے طور پر مروی ہیں۔ ان میں سے قاسم اور عبداللہ حضرت خدیجہؓ اور ابراہیم حضرت ماریہ قبطیہؓ کی بطن سے تھے۔

صاحبزادیوں میں حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت فاطمہؓ اور حضرت ام کلثومؓ تمام کی تمام حضرت خدیجہؓ کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں۔ ان میں صرف حضرت فاطمہؓ آپ ﷺ کی وفات کے بعد چھ ماہ تک زندہ رہیں۔ دیگر صاحبزادیاں آپ ﷺ کی حین حیات وفات پائی تھیں۔

پھر آپ ﷺ کی بڑی صاحبزادی زینب کی بیٹی امامہ بھی زمانہ شباب کو پہنچ چکی تھیں۔ لیکن حضرت فاطمہؓ کی اولاد کو فضیلت حاصل ہے۔ جن میں حسنین اور ان کی اولاد سب سے افضل اور ان کے بعد عبداللہ بن جعفرؓ کی وہ اولاد افضل ہے جو کہ زینب بنت علی (زینب بنت فاطمہؓ) کے بطن سے ہوئی تھی۔

فصلی اللہ علی نبیہ وعلی آلہ الطیبین الطاہرین

خلاصۂ باب

دنیا میں رہتے ہوئے انسان کا واسطہ خوشی اور غم دونوں سے پڑتا ہے۔اسی طرح ہنسی مذاق اور رونے دھونے کی دونوں کیفیتیں انسان کو عارض ہوتی ہیں۔لیکن حق یہ ہے کہ مسرّتوں اور مستیوں میں وہ فائدے نہیں ہیں جو شکستہ دلی میں حاصل ہوتی ہیں۔اسی حکمت کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے ؎

نہ بچا بچا کے رکھو اسے کہ یہ آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

جتنا بھی انسان حقیقت شناسی سے قریب تر ہوتا ہے اور اپنے عجز و بے بسی کا تماشہ دیکھتا ہے۔اتنا ہی اس پر انکسار اور غلبہ بکاء زیادہ ظاہر ہوتا ہے۔نبی کریم ﷺ نے ایک حدیث میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے **لوتعلمون مااعلم لضحکتم قلیلاً ولبکیتم کثیراً** (۱)۔

ترجمہ: اگر ان حقائق کا تم کو علم ہو جائے جن کا مجھے پتہ ہے تو تم ہنسو گے کم اور روؤ گے زیادہ۔

اس کے مقابلے میں کثرت ضحک کو آپ ﷺ نے موتِ قلب کا ذریعہ کہا ہے۔ظاہر ہے نبی اکرم ﷺ سے زیادہ حقائق شناسی کسی کو نہیں ہے۔اس لئے آپ ﷺ کی ہنسی مذاق بہت محدود تھی۔اور رونے کے مواقع بکثرت تھے۔آپ ﷺ کے رونے کے لئے شراح نے متعدد وجوہات ذکر کی ہیں۔مثلاً

(۱) رحمت وشفقت: جیسے میت پر آپ ﷺ کا رونا ثابت ہے۔اور باب کی مؤخر الذکر احادیث میں اس کا ذکر ہے۔

(۲) امت پر خوف کی وجہ سے: جیسی دوسری حدیث میں آپ ﷺ کا رونا مذکور ہے۔

(۳) خوف الٰہی اور خشیۃ کے غلبہ کی وجہ سے: جیسے کسوفِ شمس کے وقت ہوا تھا۔

---

(۱) بخاری شریف ج۱ص۱۴۲،ج۲ص۷۸۶

(۴) اشتیاق ومحبت کی وجہ سے: جیسے استماع قرآن کے وقت یا دورانِ نماز مناجات کے وقت ہوتا تھا۔

(۵) رنج وحزن کی وجہ سے بھی آپ ﷺ روئے ہیں۔ جیسے ابراہیمؓ کی وفات کے وقت آپ ﷺ نے فرمایا"انابفراقک یاابراھیم لمحزونون"(۱)

بایں ہمہ آپ ﷺ کارونا جزع وفزع اور بے صبری کارونا نہیں تھا۔ جس سے آپ ﷺ عموماً منع فرمایا کرتے تھے۔

---

(۱) بخاری شریف ج ۱ص ۱۷۴

۴۶. باب ماجاء فی فراش رسول اللّٰہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے بستر کا بیان

فراش فعال کے وزن پر مفعول یعنی مفروش کے معنی میں ہے۔جیسے لباس بمعنی ملبوس ہے۔ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو بیٹھنے یا لیٹنے کیلئے بچھائی جائے۔یعنی نبی کریم ﷺ کی بستر کے بارے میں یہاں احادیث لائی جائیں گی۔مصنف نے دو احادیث کا یہاں ذکر کیا ہے۔

(۱) حدثنا علیّ بن حجر انا علیّ بن مسهر عن هشام بن عروة عن أبيه عن عائشة قالت إنّما كان فراش رسول اللّٰه ﷺ الذی ينام عليه من ادم حشوه ليف(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہے کہ نبی کریم ﷺ کا وہ بستر ہ جس پر آپ ﷺ آرام فرمایا کرتے تھے، چمڑے کا تھا، جو کھجور کی درخت کی چھال سے بھرا ہوا تھا۔

کان فراش الخ نبی کریم ﷺ کے بارے میں یہ بات پہلے بھی ذکر کی جا چکی ہے کہ آپ ﷺ کا فقر اختیاری تھا۔ اور اس میں حکمتیں تھیں۔لباس، کھانے پینے اور مسکن کی طرح بستر ے میں سادگی اور فقر عیاں تھا۔چمڑے کا بستر ہ اور اندر سے کھجور کی چھال سے بھرا ہوا تھا۔یہ اس زمانے میں استعمال کئے جانے والے عام بستروں کی نسبت زیادہ سادہ تھا۔علامہ عصام کہتے ہیں کہ اگر ازواج مطہرات کا خیال نہ ہوتا تو شاید نبی کریم ﷺ اس بستر ے کو بھی اختیار نہ فرماتے بلکہ زمین پر سونے کو ترجیح دیتے۔

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ اگر چہ ایسے بستر ے کا استعمال جائز ہے جسے ملائم بنانے کیلئے اندر سے بھرا گیا ہو لیکن زیادہ ملائم اور گداز بستر ہ نیند کے غلبہ کا باعث بنتا ہے۔جو عبادت میں خلل انداز ہوتا ہے۔لہٰذا اس سے احتراز کرنا چاہیے۔

---

(۱)صحیح مسلم ۲/۲۰۲ کتاب اللباس والزینة باب التواضع فی اللباس الخ، جامع ترمذی ۱/۴۳۹ ابواب اللباس باب ماجاء فی فراش النبیّ ﷺ، مسنداحمد ۶/۴۸ ومصنف ابن ابی شیبة(مختار)

اَدم ادیم کی جمع ہے جو پختہ چمڑے یا بالخصوص سرخ چمڑے کو کہتے ہیں۔حشوہ لیف حشو محشو کے معنی میں ہے اور لیف لیــفة کی جمع ہے۔کھجور کے تنے پر اس کی شاخ کے اگنے کی جگہ جو جالی نما چھال ہوتی ہے۔لیفة کہلاتا ہے۔

(۲) حدّثنا ابو الخطّاب زیاد بن یحییٰ البصریّ ثنا عبداللّٰہ بن میمون انا جعفر بن محمّد عن أبیه قال سئلت عائشة ما کان فراش رسول اللّٰہ ﷺ فی بیتک قالت من اَدَم حشوہ لیف و سئلت حفصة ما کان فراش رسول اللّٰہ ﷺ فی بیتک قالت مسحاً نثنیه ثنیتین فینام علیه فلمّا کان ذات لیلة قلت لو ثنیته اربع ثنیات کان اوطاله فثنیناه باربع ثنیات فلمّا اصبح قال مافرشتمونی اللیلة قالت فقلنا هو فراشک إلاّ انّا ثنیناه باربع ثنیاتٍ قلنا هو اوطالک قال ردوّہ لحالته الاولیٰ فانّه منعتنی وطاته صلوتی اللیلة.

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ آپ کے حجرے میں نبی کریم ﷺ کا بستر ہ کیسا تھا۔بولیں چمڑے کا تھا جس کے اندر کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔اور حضرت حفصہؓ سے پوچھا گیا کہ آپ کے حجرے میں نبی کریم ﷺ کا بستر ہ کیسا تھا۔وہ بولیں کہ ایک ٹاٹ تھا جس کو دوھرا کر کے ہم بچھا لیتے تھے اور آپ ﷺ اس پر آرام فرماتے۔ ایک رات کو میں نے سوچا کہ اگر اس بستر ے کو میں چوھرا کر کے بچھادوں تو یہ مزید آپ ﷺ کیلئے نرم (اور آرام دہ) ہو جائے گا۔چنانچہ میں نے اسے چوھرا کر کے بچھا دیا۔صبح ہوئی تو آپ ﷺ نے پوچھا کہ آج رات تم لوگوں نے میرے لئے کیسے بستر ہ لگایا تھا۔ہم نے عرض کیا کہ وہ تو آپ ﷺ کا وہی بستر ہ تھا صرف ہم نے اسے چوھرا کر کے بچھایا تھا۔ہمارا خیال تھا کہ یہ آپ ﷺ کیلئے زیادہ نرم ہوگا۔آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اسے واپس پہلی حالت پر لگادو۔کیونکہ اس کی نرمی نے آج رات مجھے تہجد کی نماز سے منع کیا۔

جعفربن محمد: حضرت جعفر سے امام جعفرالصادقؒ اور ان کے والد محمد بن علی امام باقرؒ مراد ہیں۔جوامام زین العابدین علی بن الحسین کے فرزند ہیں لیکن چونکہ امام محمد باقرؒ کی ملاقات عائشہؓ سے نہ ہوئی ہے نہ حفصہ سے۔اس لئے یہ حدیث منقطع ہے لیکن امام باقرؒ جیسے ثقہ کا ارسال،حدیث کی صحت میں مضر نہیں ہے۔

مِسحا مسح کھردرے ٹاٹ کو کہتے ہیں۔

فلما کان ذات لیلة کان تامہ ہے ذات کا لفظ مقحم اور زائد ہے اور اس تقدیر پر ذاتُ لیلةٍ فاعلیت کی بنا پر مرفوع ہے۔

مافرشتمولی یہاں صیغہ جمع مذکر کا ذکر کیا ہے لیکن مخاطب صرف حضرت حفصہؓ ہیں۔اس کا ایک جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ یہ صیغہ تعظیماً استعمال کیا ہے جیسے موسیٰؑ نے اپنی بی بی کو خطاب فرمایا تھا۔قال لاھلہ امکثوا انیّ آنست نارا ۔اور دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ شاید خدام کو خطاب ہو جن میں مرد غلام بھی ہوسکتے ہیں۔اور انہی کو تغلیب دیکر یہ صیغہ لایا گیا ہے۔

منعتنی وطاته صلواتی یعنی گداز ہونے کے سبب نیند غفلت کی آئی اور آنکھ نہ کھل سکی۔اس حدیث میں حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ سے بستر ے کے بارے میں پوچھا گیا ہے۔دوسری امہات المومنین کا ذکر نہیں ہے، اس کا سبب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ،حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی صاحبزادی ہیں۔دونوں کا مقام نبی کریم ﷺ کے ہاں بہت بڑا ہے۔جس کی وجہ سے ان کے حجروں میں دیگر ازواج مطہرات کی نسبت پُرتکلف بسترہ ہونا چاہئے تھا۔اس سے بھی زیادہ ناقص بسترہ ہونا ظاہر بات ہے۔

آپ ﷺ کے بستروں کے بارہ میں روایات: اس باب میں نبی کریم ﷺ کے دو بستروں کا بیان ہے۔ایک چمڑے کا جبکہ دوسرا ایک ٹاٹ کی صورت میں تھا۔دوسری احادیث میں آپ ﷺ کے بسترے کے بارے میں مزید تفصیل بھی مذکور ہے۔مثلاً بخاری شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ صرف چٹائی پر بھی سوئے ہیں جو کہ آپ ﷺ کے پہلو میں نشانات چھوڑ دیتا تھا۔بیہقی میں ہے کہ ایک عورت آپ ﷺ کے

لئے اون سے بھرا ایک بستر ہ ہدیہ کر گئیں۔ آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے اصرار کر کے بستر ہ واپس کروایا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے آپ ﷺ کے پہلو میں چٹائی کے نشانات دیکھے۔ تو عرض کیا کہ اس سے کوئی بہتر بستر ہ بنانے کی ہمیں اجازت دیجئے لیکن آپ ﷺ نے منع فرمایا۔ حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ آپ ﷺ کو چٹائی پر لیٹے ہوئے دیکھا تو روئے اور بولے کہ قیصر و کسریٰ تو نفیس بستروں پر آرام کر لیتے ہیں اور آپ ﷺ کیلئے بستر ہ نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تو اس پر راضی نہیں کہ اُن کیلئے دنیا اور ہمارے لئے آخرت ہو۔ اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت ابن مسعودؓ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ زمین پر سوتے تھے۔ زمین پر بیٹھتے اور کھانا کھاتے تھے۔

ان روایات سے بستر ے کے حق میں آپ ﷺ کی بے تکلفی خوب ظاہر ہوتی ہے۔ تعداد کے لحاظ سے بستر ے کے حق میں آپ ﷺ نے تحدید کا بھی ارشاد فرمایا ہے چنانچہ مسلم شریف کی ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ (گھر میں) ایک بستر ہ آدمی کا، ایک اس کی بیوی کا، ایک مہمان کیلئے اور ایک شیطان کیلئے ہوتا ہے۔ یعنی ضرورت سے زائد بستر ہ اسراف وتبذیر بن کر شیطان کی خوشی کا باعث بنتا ہے۔

۴۷. باب ماجاء فی تواضع النبی ﷺ

رسول اللہ ﷺ کی تواضع وانکساری کا بیان

تواضع کا معنیٰ: تکبر وخود پسندی سے اجتناب اور اپنے آپ کو دوسروں کی نسبت کم تر اور دوسروں کو اعلیٰ وبرتر سمجھنا تواضع ہے۔ یہ وہ عظیم صفت ہے جو بلندی اور عظمت اور رفعت کا سبب بنتا ہے۔ تواضع دراصل وضع یضع سے تفاعل کا مصدر ہے۔ جس میں تکلف کی خاصیت موجود ہے یعنی تواضع بتکلف خود کو وضیع اور ادنیٰ ظاہر کرنے کو کہتے ہیں(۱)۔

نبی کریم ﷺ میں یہ صفت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ سینکڑوں واقعات اس پر شاہد ہیں۔ یہاں مصنف بطور نمونہ چند کا ذکر فرماتے ہیں۔

(۱) حدّثنااحمد بن منیع وسعیدبن عبدالرحمٰن المخزومیّ وغیر واحدقالواناسفیان بن عیینة عن الزهریّ. عن عبیداللّٰه عن عبداللّٰه ابن عباس عن عمربن الخطّاب قال قال رسول اللّٰه ﷺ لاتطرونی کماأطرت النصارٰی عیسیٰ بن مریم إنّماانا عبداللّٰه فقولواعبداللّٰه ورسوله(۲).

ترجمہ: حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری توصیف میں حد سے نہ بڑھو جیسا کہ نصارٰی حضرت عیسیٰؑ کی تعریف میں حد سے گزر گئے ہیں۔

---

(۱) اور صوفیہ کے ہاں تواضع تذلل القلوب لعلاّم الغیوب بالتسلیم لمجاری احکام الحق(جمع الوسائل ۲/ ۱۶۱) سے عبارت ہے اور عرفاً خروج الانسان عن مقتضیٰ جاهه وتنزله عن مرتبة أمثاله اور محققین کے ہاں التواضع هوأن لایری العبد لنفسه مزیة ویری الحالة التی هوفیها اعظم من أن یستقحا(الاتحافات ۳۵۲)(مختار)

(۲) صحیح بخاری ۱/ ۴۹۰ کتاب احادیث الانبیاء باب قول اللّٰه واذکرفی الکتاب مریم الخ دارمی ۲/ ۳۲۰،مسنداحمد ۱/ ۲۳(مختار)

میں تو اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں تم (بھی میرے بارے میں) یہی کہو۔ کہ وہ اللہ کا بندہ اور رسول ہے۔

لاتطرونی کمااطرت النصاریٰ عیسیٰ بن مریم اطراء مدح سرائی میں حد سے تجاوز کرنے کو کہتے ہیں۔ کسی کی جائز اور مناسب تعریف کرنا بری بات نہیں ہے۔ لیکن کسی کے مرتبے کو اتنا بڑھا کر پیش کرنا جس کا وہ مستحق نہ ہو۔ اطراء کہلائے گا۔ مثلاً کسی عام قسم کے عالم کو غزالی دوران، رازیٔ زمان اور ابوحنیفہؒ وقت کہا جائے۔

فرعونیت کی وبا اور اس کی پہچان: آج ہمارے طبقہ میں یہ مرض ہے کہ ان کے لئے اگر القاب کم استعمال ہوں تو ناراض ہو جاتے ہیں۔ اگر اشتہار میں نام دوسرے نمبر پر یا تیسرے نمبر پر یا چھوٹا لکھا جائے یا دوران جلسہ استقبال اور ستائش میں مبالغہ نہ کیا جائے تو خفا ہو جاتے ہیں۔

ایک دفعہ اسلام آباد میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے ساتھ گورنمنٹ ہاسٹل میں بیٹھا تھا۔ انہوں نے اسی عیب کے بارے میں فرمایا کہ یہ ایک بڑی اور عجیب فرعونیت ہے۔ خصوصاً علماء میں بہت زیادہ ہے۔ پھر فرمایا آؤ یہ سوچیں کہ آیا یہ ہم میں بھی ہے یا نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اگر جلسہ میں استقبال کم ہو۔ سپاسنامہ زوردار اور مبالغہ آمیز نہ ہو اور ستائش کے نعرے کم لگائے جائیں تو کیا ہمیں اس پر غصہ آتا ہے؟ انہوں نے فرمایا واقعی اس عیب کا معلوم کرنا بڑا مشکل کام ہے ہر شخص کہتا تو یہ ہے کہ میں اس سے پاک ہوں۔ لیکن درحقیقت یہ مہلک مرض اس میں ہوتا ہے۔ جو عالم کیلئے موت ہے اور اسی اطراء کی وجہ سے علماء کی کوششوں میں برکتیں معدوم ہوتی جارہی ہیں۔

بہرحال مدح میں حد سے تجاوز اور مبالغہ آرائی کرنا اطراء ہے۔ مثلاً یہ کہ نبی کریم ﷺ بشر نہیں نور ہیں۔ عالم الغیب ہیں۔ ان کی ذات اللہ تعالیٰ کی ذات میں تحلیل ہے الگ نہیں۔ بریلویت کے اس قسم کے خرافات اطراء کے زمرے میں آتے ہیں۔

کمااطرأت النصاریٰ عیسی ابن مریم یعنی جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰؑ کی مدح میں مبالغہ آمیزی کی اس کو عبدیت سے نکال کر الوہیت کی صفات سے متصف کیا تم لوگ ایسے نہ کرنا۔

حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں عیسائی عقیدہ: عیسائیوں کا حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ کہنا نیز ثالث ثلاثہ کہنا اطراء ہے۔ آپﷺ نے صحابہؓ کو اس ممکنہ اطراء سے منع کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ مجھے عبداللہ اور رسول اللہ کہا کرو۔ اس سے آگے نہ بڑھو۔

(۲) حدثنا علیّ بن حجر انا سوید بن عبدالعزیز عن حمید عن أنس بن مالک إنّ امراة جاء ت إلٰی النبیّﷺ فقالت إنّ لی الیک حاجة فقال اجلس فی ایّ طریق المدینة شئت اجلس الیک(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک عورت نبی کریمﷺ کے پاس آئی اور عرض کیا کہ مجھے آپﷺ سے ایک بات (تنہائی میں) کہنی ہے۔ آپﷺ نے فرمایا کہ مدینہ کی کس گلی میں تم بیٹھو۔ میں (وہیں آکر) تیری بات سننے کیلئے بیٹھوں گا۔

نبی کریمﷺ تواضع کے پیکر: إنّ لی عندک حاجة الخ ایک عورت نبی کریمﷺ کے پاس آئیں(۲)۔ اور کہا کہ میرا تو ایک کام ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ کام ایسا ہے جو کہ عورت حاضرین سے چھپانا چاہتی تھی گویا یہ عورت نبی کریمﷺ کو اپنے ساتھ اٹھنے کا کہہ رہی تھیں۔ ایسے میں عموماً بڑے لوگوں کو غصہ آتا ہے لیکن آپﷺ نے یہ بات محسوس کرنے کی بجائے جواب دیا کہ تم تو یہاں آئی ہو تم جہاں بھی چاہو کسی بھی گلی کوچے میں بیٹھ جاؤ۔ میں وہیں آؤں گا۔ یہ شرم کی بات ہی نہیں کہ ایک ادنیٰ درجے کی عورت کے پاس سردار کونینﷺ آئیں۔ روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ اس عورت کی عقل میں کچھ فتور تھا۔ وہ مدینہ کی گلیوں میں بیٹھا کرتی تھی۔ اسی وجہ سے نبی کریمﷺ نے گلی میں بیٹھنے کا کہا۔ اور ہوسکتا ہے کہ

---

(۱) سنن ابی داؤد ۲/۳۱۵ کتاب الادب باب فی الجلوس فی الطرقات، مسند احمد ۳/۹۸ (مختار)

(۲) علامہ عبدالجواد الدومی نے لکھا ہے لم یقف الشرّاح علی اسم المرأة الاتحافات ۳۵۷، البتہ علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے وفی بعض الحواشی الشفاء اسمها ام زفر ماشطه خدیجة ونوزع فیه وکان فی عقلها شیٔ کمافی مسلم(المواهب الدنیة ۲۰۵)(مختار)

نبی کریم ﷺ نے اس کے عقل کے فتور کی وجہ سے ازواج مطہرات سے دور رکھنا چاہا۔اس لئے گھر کی بجائے اس کے ساتھ گلی میں ملنے کا کہا۔اور ممکن ہے کہ ایسا آپ ﷺ نے اس عورت کی حاجت روائی میں عجلت کرنے کی غرض سے کیا ہو۔بہرحال روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ آپ نے اٹھ کر اس کے ساتھ ملاقات کی۔اور صحابہ کی جماعت سے ہٹ کر اس کی بات سن لی۔

سیدالکونین کی اس تواضع کی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ ایک فاتر العقل خاتون کا بھی اتنا لحاظ رکھا۔بخاری شریف کی روایت میں تصریح ہے کہ یہ انصاری عورت تھی اور بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ عورت حضرت خدیجہؓ کی خادمہ ام زفرؓ تھیں۔بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ اس وقت اس کے ساتھ اس کا چھوٹا بچہ بھی تھا۔ حضرت انسؓ کی روایت میں آیا ہے۔کہ مدینہ کی کوئی باندی آ کر نبی کریم ﷺ کا ہاتھ پکڑ لیتی تھی اور جہاں مرضی ہوتی لے جاتی تھی۔نسائی کی روایت میں ہے کہ مسکین مرد اور عورتوں کی ضروریات پوری کرنے میں آپ ﷺ نہیں شرماتے تھے۔بعض روایات کے مطابق جب کوئی شخص آپ ﷺ کے ساتھ ہاتھ ملاتا۔ تو آپ ﷺ اس وقت تک ہاتھ نہیں چھوڑتے تھے۔جب تک وہ خود نہ چھوڑتا۔آپ ﷺ نے مروت، حیا اور کریمانہ اخلاق کے یہ بھی خلاف سمجھا کہ ہاتھ کھینچیں تا کہ اس شخص کو یہ احساس نہ ہو کہ نبی کریم ﷺ میرے آنے اور ملنے کی وجہ سے کبیدہ خاطر ہیں۔اگرچہ بعض اوقات تو جلدی بھی ہوتی ہے اور مجبوریاں بھی ہوتی ہیں۔لیکن آئندہ روایات آئیں گی کہ آپ ﷺ کے اخلاق کریمانہ ایسے تھے کہ کوئی بھی آپ ﷺ سے ملاقات کرتا تو جب تک وہ شخص منہ نہ پھیرتا آپ ﷺ منہ نہیں پھیرتے تھے۔مجلس میں بیٹھتے تو حاضرین کی طرف کبھی پاؤں نہیں پھیلاتے تھے بلکہ اپنے زانو بھی دوسروں کے آگے نہیں بڑھاتے تھے۔آپ ﷺ کی آمد کے موقعہ پر اہل مجلس میں سے کوئی تعظیماً اٹھنے کی کوشش کرتا تو آپ ﷺ منع کرتے ہوئے فرماتے ''لاتقوموا کمایقوم الاعاجم''یعنی میں عجمیوں کی طرح پروٹوکول کا دلدادہ نہیں۔میں تو عبد ہوں۔

(۳) حدثنا علیّ بن حجر انا علی بن مسھر عن مسلم الاعور عن أنس بن مالک قال کان رسول اللہ ﷺ یعود المریض ویشھد الجنازۃ ویرکب الحمار ویجیب دعوۃ العبد وکان یوم بنی

قريظة على حمار مخطوم بحبل من ليف عليه إكاف من ليف(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ بیمار لوگوں کی عیادت فرماتے تھے۔ جنازے میں شریک ہوتے تھے۔ گدھے پر سواری فرماتے تھے۔ غلام کی دعوت بھی قبول فرماتے تھے۔ بنوقریظہ کے ساتھ لڑائی کے دن آپ ﷺ گدھے پر سوار تھے۔ جس کی لگام کھجور کی چھال سے بنی ہوئی رسی تھی اور اس پر کاٹھی بھی کھجور کی چھال کی تھی۔

نبی کریم ﷺ کا کافر کی عیادت کرنا: **یعود المریض** بیماروں کی عیادت کرتے جنازہ میں شمولیت فرماتے۔ ایک یہودی نوجوان بلکہ عبداللہ بن ابی کی بھی عیادت کی تھی اور اس کے جنازہ میں بھی شریک ہوئے۔ نادار صحابہ کی عیادت تو معمول کی بات تھی۔ بوقت ضرورت گدھے کی سواری کرتے۔ غلاموں کی دعوت بھی قبول کرتے۔ یہ سب ایسے ادنیٰ کام ہیں۔ جو کہ عرفاً بادشاہوں کو زیب نہیں دیتے۔ نہ امیر لوگ یہ گوارا کرتے ہیں۔ خصوصاً دشمن پر حملہ کرتے وقت تو خوب شان و شوکت کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ تاکہ ان پر رعب چھا جائے۔ لیکن آپ ﷺ میں یہ تعلّی نہ تھی۔

آپ ﷺ نے عین اس حالت میں بھی گھوڑے اور شان و شوکت کے دوسرے سامان کا طلب نہ کیا۔ حالانکہ اس وقت ایک اشارہ سے ہر چیز مہیا ہوسکتی تھی۔ چنانچہ بنوقریظہ پر حملے کے روز آپ ﷺ گدھے پر سوار تھے۔ جس کی لگام بھی کھجور کی چھال سے تھی۔ اور اس پر پالان بھی کھجور کی چھال کا بنا ہوا پڑا تھا۔ اس حالت میں آپ ﷺ اپنی عبدیت اور تواضع کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

حضرت عمرؓ کی تواضع کی مثال: حضرت عمرؓ نے فتح بیت المقدس کے موقعہ پر اس سنت کی اقتداء کا بہترین نمونہ پیش فرمایا۔ ان کے ہمراہ ان کا غلام اسلم تھا۔ ایک ہی سواری تھی۔ حالانکہ شام کی فتح کا عظیم الشان کارنامہ انجام پایا تھا۔ اور وہ جنگ جیتی جا چکی تھی۔ جس کے ہر ہر معرکے میں سینکڑوں رومی کام آتے

---

(۱) سنن ابن ماجة ص۱٦٦ کتاب التجارات باب ما للعبدان يعطي ويتصدق، جامع ترمذي ۱/۱۹۷ كتاب الجنائز،(مختار)

تھے۔دوسری طرف سے روم کے بادشاہ، سپہ سالار اور جرنیل شان وشوکت سے آتے۔سب سونے چاندی میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے۔حتیٰ کہ ان کی زرہیں بھی سونے کی ہوتی تھیں۔تلوار جواہرات سے دمک رہی ہوتی تھیں۔واقدی نے فتوح الشام میں ان کی حالت کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔لیکن ایسے لوگوں کا مقابلہ کر کے اور انہیں شکست دے کر فاتحانہ انداز سے حضرت عمرؓ شام آتے ہیں۔ ایک سواری پر آپؓ اور غلام باری باری سوار ہوتے ہیں۔جب قریب آئے اس وقت اتفاق سے غلام کی باری تھی۔غلام نے منت کی کہ اب آپ سوار ہو جائیں کیونکہ آپ علیہ فاتح اعظم کی حیثیت سے شام میں داخل ہونے والے ہیں لیکن آپ نے انکار کر دیا۔اور آپ غلام کو سوار کئے خود لگام پکڑے بیت المقدس میں داخل ہوئے۔

حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ کمانڈر انچیف تھے۔استقبال کیلئے آئے تھے۔درخواست کی اب تو کچھ شان وشوکت کی ہیئت ہونی چاہیے۔پیوند بھرے کپڑوں کو تبدیل کر دیں کیونکہ ہرقل اور دیگر صنادید روم آپ سے ملنے آئیں گے۔آپؓ نے بڑی بے دلی سے کچھ دیر کیلئے کپڑے بدلے۔لیکن پھر فوراً واپس کر دیئے۔اور فرمایا نحن قومٌ اعزّنا الله بالاسلام۔یعنی ہم لوگوں نے اسلام کی وجہ سے عزت پائی ہے۔اب اسلام کے سوا عزت کے دوسرے ذرائع سے اجتناب کرنا چاہیے۔کہا جاتا ہے کہ بعض کتب الھیہ میں یہ پیش گوئی کی گئی تھی کہ بیت المقدس کا فاتح پھٹے پرانے کپڑوں میں غلام کی سواری کا لگام تھامے ہوئے آئے گا۔اس لئے آپ کے دل میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات ڈال دی تا کہ یہ پیش گوئی پوری ہو سکے۔اگر آپ ٹھاٹ بھاٹ سے آتے تو یہ پیش گوئی غلط ہو جاتی اور لوگ تردد میں ہوتے کہ یہ اس پیش گوئی کے مصداق ہے یا نہیں۔بہر حال حضرت عمرؓ نے اس بات میں نبی کریم ﷺ کی تاسی کی تھی۔اور اسی تواضع نے انہیں دنیوی لحاظ سے بھی بام عروج پر پہنچایا۔

<u>ایک فقہی اشکال:</u> ویجیب دعوة العبد یہاں پر ایک فقہی اشکال ہوتا ہے کہ غلام تو مال کا مالک نہیں بن سکتا۔اس کے قبضے میں سارا مال اس کے مالک کا مملوک ہوتا ہے۔تو اس کی دعوت قبول کر کے نبی کریم ﷺ نے بلا اجازت غلام کے مالک کا مال کیسے کھایا۔

اس اشکال کی وجہ سے بعض لوگوں نے "ویجیب دعوة العبد" کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ آپ ﷺ

کسی غلام کے بلانے پر لبیک کہتے تھے۔یعنی اگر وہ مدد کیلئے پکارتا تو آپ ﷺ حاضر ہو جاتے تھے لیکن حدیث کے سیاق وسباق کی وجہ سے اس معنی کا بُعد ظاہر ہے۔ بلکہ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو تواضع کے باب میں لایا ہے تو یہی معنی ہی مستنبط ہونے چاہئیں جبکہ مذکورہ توجیہ میں تواضع کی جہت مفقود ہے۔

اس لئے علامہ مناوی نے تو یہ جواب دیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے۔ کہ آپ جس کے مال کو جس وقت بھی چاہیں لے سکتے ہیں اور اس میں تصرف کر سکتے ہیں۔اس لئے مالک کی لاعلمی یا اس کے اجازت کے نہ ہونے سے آپ ﷺ کے حق میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ"النبی اولیٰ بالمؤمنین من أنفسهم"(الایۃ)

مگر اس جواب کی بہ نسبت ملاعلی قاریؒ نے جو دیگر جوابات کئے ہیں راجح معلوم ہوتے ہیں۔جو یہ ہیں اول(۱) یہ کہ یہاں ماذون لہ غلام کا ذکر ہے۔اور ماذون لہ کیلئے جائز ہے کہ وہ معروف طریقے سے مہمان کی مہمان نوازی کرے۔اسی لئے بعض روایات میں"ویجب دعوة المملوک"کے الفاظ مروی ہیں۔دوم(۲) یہ کہ یہاں پر آزاد شدہ غلام مراد ہے۔اور"ما کان" یعنی زمانہ گزشتہ کے اعتبار سے اسے غلام کہا گیا ہے اور یہ بھی تواضع ہے کہ معاشرے کے اس ادنیٰ طبقہ کی دعوت بھی قبول فرمائی۔سوم(۳) یہ کہ ہوسکتا ہے کہ یہاں مراد یہ ہو کہ مالک کے گھر اس کی غلام کی دعوت پر بھی جاتے تھے۔یعنی اگر مالک خود دعوت دینے کی بجائے غلام کو بھیج دیتا تو بھی قبول فرماتے تھے یہ استنکاف نہ تھا کہ خود کیوں نہیں بلایا۔

(۴) حدّثنا واصل بن عبدالاعلی الکوفیّ ثنا محمّد بن فضیل عن الأعمش عن أنس بن مالک قال کان رسول اللّٰه ﷺ یدعی الی خبز الشعیر و الاهالة السنخة فیجیب ولقد کانت له درعٌ عند یهودی فما وجد ما یفکّها حتّی مات(۱).

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو جو کی روٹی اور باسی چربی کھانے کی دعوت بھی اگر دی جاتی تو آپ ﷺ قبول فرماتے تھے۔اور آپ ﷺ

(۱) السنن الکبریٰ للبیهقی ۳۶/۶ کتاب الرهن باجواز الرهن، مسند احمد ۱۰۲/۳ (مختار)

کی ایک زرّہ ایک یہودی کے پاس (رہن) تھی آپ ﷺ نے موت تک اتنا مال نہیں پایا۔ کہ وہ زرہ چھڑا سکیں۔

<u>رسول اللہ ﷺ کا ہر کسی کے دعوت پر جانا:</u> خبز الشعیر کسر نفسی اور نہایت بے تکلفی کی وجہ سے لوگ آپ ﷺ کو جو کی روٹی اور ناقص کھانے پر بلانے کی جرأت بھی کرتے تھے اگر لوگ سمجھتے کہ آپ تکلفات اور اعزاز و اکرام کے خواہشمند ہیں مرغ پلاؤ وغیرہ کے بغیر کسی کے ہاں نہیں جاتے۔ تو ہر کسی کو دعوت کی ہمت نہ ہوتی۔ لیکن چونکہ آپ ﷺ کی تواضع کا ہر کسی کو علم تھا کہ آپ ﷺ فقیری پسند فرماتے ہیں۔ اور غریب و امیر ہر کسی کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں۔ لہٰذا آپ ﷺ کو انتہائی ناقص کھانے کی دعوت بھی اگر دی جاتی تو آپ ﷺ قبول کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں فرماتے تھے۔

والاھالۃ السنخۃ اھالۃ چربی یا پگھلی ہوئی چربی کو کہتے ہیں لوگ اسے سالن کی طرح بھی استعمال کرتے ہیں جبکہ سَنَخ اور زَنَخ کا معنی تغیّر وفسدَ یعنی بدبودار ہونا ہے۔ چربی اور چربی ملا سالن وقت گزرنے سے باسی اور بدبودار ہو جاتا ہے۔

لیکن یہاں یہ شبہ ہوتا ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ یا انس ؓ کو دعوت دیتے وقت کیسے پتہ چلا کہ جو کی روٹی یا باسی چربی پر بلایا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ تواضع ثابت ہو سکے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ دعوت دینے والے نے تصریح کر دی ہو کہ کھانا اس قسم کا ہے اور ممکن ہے کہ نبی کریم ﷺ نے داعی کی حالت زار اور روز مرہ کے کھانے سے یہ اندازہ لگایا ہو کہ اس داعی کے ہاں ملے گی تو صرف یہی چیز ملے گی اور کچھ نہیں ہوگا۔

<u>نبی کریم ﷺ کا زرع گروی رکھوانا:</u> ولقد کانت لہ درع عندیھودی الخ اس زرہ کا نام ذات الفضول تھا جو حضرت سعد ابن عبادہؓ نے آپ ﷺ کو ہدیہ کیا تھا اور جس یہودی کے پاس گروی رکھا تھا اس کا نام ابوالشحم بن الارس تھا۔ آپ ﷺ نے تیس صاع جو اور ایک روایت کے مطابق بیس صاع جو لیکر زرہ کو اس کے پاس گروی رکھا تھا۔ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے اسے واگزار کر کے حضرت علیؓ کو دیدی۔ جبکہ بعض روایات کے مطابق خود حضرت علیؓ نے یہودی سے یہ زرہ چھڑا لی تھی۔

<u>صحابہ کرام کی بجائے یہودی سے قرض:</u> یہاں یہ اشکال ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کی بجائے یہودی سے قرض لے کر رہن کیوں رکھا تھا۔ حالانکہ صحابہ کرام میں بھی تو دولتمند صحابہ موجود تھے۔ بالخصوص نبی کریم ﷺ کی زندگی کے آخری حصہ میں صحابہ اتنے نادار بھی نہیں تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بیان جواز کیلئے یہ عمل کیا ہو کہ کافر اور یہودی کے ساتھ اس قسم کا معاملہ جائز ہے۔ اگرچہ وہ ''اکّالون للسحت'' (حرام خور) قوم سے تعلق رکھتا ہو یا ہوسکتا ہے کہ صحابہ کرامؓ میں کوئی شخص بھی ایسا نہ ہو جس کے پاس ضرورت سے زیادہ غلّہ موجود ہو جبکہ یہود کے ہاں ذخیرہ اندوزی اور منافع خوری ایک عادت تھی وہاں غلّہ مل جانا آسان تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے اس لئے قرض نہ مانگا کہ صحابہ آپ ﷺ کو قرض دینے کی بجائے مفت میں غلہ لینے پر مجبور کرتے۔ اور قیمت یا دوسرا عوض لینے سے بھی انکار کرتے اور یہ حمیت نبوی اور استغناء محمدی سے خلاف ہوتا۔ لہٰذا آپ ﷺ نے یہودی سے قرض لے کر رہن رکھا۔ اور ظاہر ہے کہ زندگی میں دولتمند صحابہ کو اس کی اطلاع بھی نہیں دی ورنہ وہ زرہ واپس کروا لیتے تھے۔

اب بظاہر یہ بات دل میں کھٹکتی ہے کہ حدیث کے آخری حصے کا ترجمۃ الباب سے تعلق ظاہر نہیں ہوتا یعنی اس میں تواضع کا اثبات نہیں ہے اور یہی بات بعض شراح نے کہہ دی ہے کہ آخری حصہ میں تواضع کی کوئی بات نہیں صرف اتمام حدیث کیلئے اس کو ذکر کیا ہے لیکن ملا علی قاریؒ اور دیگر شراح نے لکھا ہے کہ اس عمل میں بھی تواضع متحقق ہے اس لئے کہ بظاہر اگر نبی کریم ﷺ صحابہ کرامؓ کے سامنے زرہ بطور رہن پیش کر کے غلہ کا تقاضا فرماتے تو اول تو رہن نہ لیتے اور لیتے بھی تو زیادہ غلہ بطور قرض بلکہ مفت دیتے جس سے نبی کریم ﷺ کی قدر افزائی کا اظہار ضرور ہوتا۔ بایں ہمہ آپ ﷺ نے اپنے منصب وعظمت اور صحابہؓ کے دلوں میں وقعت سے صرف نظر کر کے ان کی بجائے ایک یہودی سے قرض کی درخواست کی۔ جو تواضعاً بھی ہوسکتا ہے بلکہ یہ جہت اس عمل میں اقوی ہے۔

فما وجد مایفکّھا الخ ۔یعنی وفات تک اتنا کچھ ہاتھ نہیں آیا کہ رہن چھڑا سکے۔ اور اگر ہاتھ آیا بھی ہو تو بھی صدقہ کر چکے ہونگے۔ اس لئے کہ قرض کی مدت ابھی باقی ہوگی۔

(۵) حدّثنا محمود بن غیلان ثنا أبو داؤد الحفریّ عن سفیان عن الربیع بن الصبیح عن یزید بن أبانٍ عن أنس بن مالک قال حجّ رسول اللّٰه ﷺ علی رحل رثٍ علیه قطیفة لاتساوی اربعة دراهم فقال اللّٰهمّ اجعله حجّالاً ریاء فیه و لاسمعة(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک بوسیدہ پالان پرسوار ہوکر حج کیا۔اس پالان پر ایک جھالروالا کپڑا تھا جو چار درہم کے برابر بھی نہ تھا آپ ﷺ نے دعا مانگی اے اللہ اس حج کو ایسا حج بنادے جس میں نمائش ہو نہ شہرت۔

عن الربیع بن صبیح عن یزید بن أبان یہ دونوں راوی ضعیف ہیں جس کی وجہ سے علامہ ابن حجر وغیرہ نے اس حدیث کوضعیف کہا ہے اوراگر چہ اس کے بعض شواہد بھی ہیں لیکن وہ بھی ضعیف ہیں۔

<u>نبی کریم ﷺ نے صرف ایک حج کیا:</u> علی رحل رث نبی کریم ﷺ نے آخری اور ایک حج کیا ہے۔ اسلامی مملکت قائم ہو چکی تھی۔جزیرۃ العرب اسلامی پرچم تلے آچکا تھا۔ملک کے گوشے گوشے سے مسلمان آنیوالے تھے۔ ایسے موقعہ پر تو چاہیے تھا کہ خوب شان وشوکت سے حج کیلئے آئیں تا کہ عظمت ظاہر ہو جائے اور اطراف وقبائل کے نومسلم مسلمانوں نیز دیگر اقوام پر اسلامی حکومت کی دھاک بیٹھ جائے لیکن اس سفر میں بھی آپ ﷺ ایک بوسیدہ پرانے پالان میں سوار ہوکر حج کو آئے اور اس پالان پر کپڑے کا ایک ٹکڑا تھا جو کہ چار درہم کے برابر بھی نہ تھا۔ یہاں پر بعض شراح نے علیہ قطیفۃ کی ضمیر نبی کریم ﷺ کوراجع کی ہے لیکن ملا علی قاریؒ وغیرہ نے اس کا پرزور رد کیا ہے اس باب میں آئندہ ایک حدیث اور دیگر احادیث بھی اس کے منافی ہیں۔ ویسے آدمی پر پڑے ہوئے کپڑے کو قطیفہ نہیں کہتے بلکہ قطیفہ اس کپڑے کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو ڈھانپنے کیلئے ہو اور اس کے جھالر وغیرہ بھی ہوں۔اور یہ مردوں کے لباس میں نہیں ہوتا۔

---

(۱)سنن ابن ماجة۲۰۷ کتاب المناسک باب الحج علی الرحل، مصنف ابن ابی شیبة۱۰۶/۴ کتاب المناسک، الحلیلة الاولیاء لابی نعیم۵۴/۳(مختار)

لاریاء فیہ ولاسمعۃ ایسی حالت میں بھی ریاونمود اور شہرت سے پناہ مانگی۔ ریاء دکھلاوے کو کہتے ہیں یعنی کسی کو دکھانے کے غرض سے عمل کرنا جبکہ سمعۃ کا معنی ہے کسی کو سنوانا۔ یعنی تشہیر کی غرض سے عمل کرنا۔ لیکن مقصد کے لحاظ سے دونوں ایک ہیں یعنی للہیت کے بغیر کوئی نیک عمل کرنا۔ نبی کریم ﷺ کے عمل میں ریاء اور سمعۃ کا احتمال بھی نہیں ہوتا تھا۔ آپ ﷺ نے امت کی تعلیم کیلئے یہ دعا فرمائی تھی تا کہ وہ ریاء وسمعۃ سے محفوظ رہنے کی کوشش اور دعا کریں۔

<u>دورحاضر کے لیڈر اور شہرت پسندی:</u> سبحان اللہ۔ آج کے لیڈر تو معمولی کام بھی کریں تو اخباروں اور ٹی وی پر اعلان کرواتے ہیں۔ حج سے آنے سے قبل ایک ماہ پہلے کارڈ چھاپے جاتے ہیں۔ تمام لوگوں کو اطلاع دی جاتی ہے حج کرنیوالا واپسی میں کراچی میں بیٹھ جاتا ہے لوگوں کو اطلاع دیتا ہے اور وقت بتادیتا ہے تا کہ خوب انتظامات اور استقبال کا بندوبست ہوجائے بعد کے اسلامی بادشاہوں کا حال بھی نبی کریم ﷺ کے اس عمل سے کوسوں دور رہا۔ کہتے ہیں کہ غالباً ہشام بن عبدالملک جب حج کو آیا تو چارسو اونٹوں پر اس کا صرف لباس اور دیگر ضروریات کولادا گیا تھا۔ اور اسی وجہ سے اسلامی حکومت کا نقشہ بدلنے لگا۔ اور بالآخر زوال پر منتج ہوا۔

اس کے برعکس نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے حج میں تو بیش قیمت قربانی پیش کی۔ خود نبی کریم ﷺ نے ایک سو اونٹ قربانی کر کے مساکین میں تقسیم کیے۔ حضرت عمرؓ نے ایسے اونٹ کی قربانی دی جس کو تین سو دینار کے عوض آپؓ سے طلب کیا گیا تھا۔ مگر آپؓ نے بیچنے سے انکار کردیا۔ دوسرے صحابہ کا اخلاص بھی قابل داد ہے لیکن نمائش اور شہرت سے پناہ طلبی بھی ساتھ رہی۔

(۶) حدثنا عبداللہ بن عبدالرحمٰن انا عفان انا حمّاد بن سلمۃ عن حُمید عن أنس قال لم یکن شخص أحبّ الیھم من رسول اللہ ﷺ قال وکانوا اذا رأوہ لم یقوموا لما یعلمون من کراھیتہ لذلک(۱).

---

(۱) جامع ترمذی ۲/۱۰۴ کتاب الادب باب ماجاء فی کراھیۃ قیام الرجل، مسنداحمد ۳/۱۳۲ (مختار)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ صحابہ کرامؓ کو نبی کریم ﷺ کی نسبت کوئی شخص زیادہ محبوب نہیں تھا۔اس کے باوجود جب صحابہ نبی کریم ﷺ کو دیکھتے تو کھڑے نہیں ہوتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ نبی کریم ﷺ اس کو ناپسند فرماتے ہیں۔

قیام تعظیمی کا حکم: لمایعلمون من کراهیته لذالک یہ کراہیۃ تواضعاً تھی۔ورنہ وہ سیدالبشروخیرالخلق ہیں۔ جب دوسروں کیلئے قیام مطلقاً ناجائز نہیں تو آپ ﷺ کیلئے بھی ناجائز نہیں تھا لیکن تواضعاً آپ ﷺ ناپسند فرماتے تھے۔اور صحابہ کرامؓ بھی اپنی محبت وعقیدت کے مقابلے میں آپ ﷺ کی مرضی کو ترجیح دیتے تھے۔ اگرچہ کبھی کبھی آپ ﷺ کیلئے صحابہ کا کھڑا ہونا بھی ثابت ہے۔لیکن کھڑے ہونے کا نہ تو صحابہ نے التزام کیا تھا نہ نبی کریم ﷺ کو یہ پسند ہوتا تھا ہاں صحابہ خود اپنی محبت ظاہر فرمادیتے تھے۔

کسی کی تعظیم کیلئے کھڑے ہونے میں فقہاء نے چند صورتیں لکھی ہیں۔بعض مقامات ایسے ہیں جہاں کھڑا ہونا حرام ہے۔مثلاً وہ جگہ جہاں اس شخص میں جس کے لئے کھڑا ہوا جائے یقیناً تکبر پیدا ہوتا ہو تو وہاں کھڑا ہونا ناجائز ہے۔قاضی عیاضؒ نے لکھا ہے کہ اگر بڑا آدمی بیٹھا ہو اور اتباع تعظیماً کھڑے رہیں تو یہ صورت بھی ناجائز ہے۔ اور اگر تکبر کا اندیشہ اور احتمال ہے تو مکروہ ہے اور اگر تکبر کا احتمال بھی نہیں تو جائز ہے۔اور اگر سرے سے تکبر کا نام نہ ہو محض خدمت واکرام ہو تو مستحب بھی ہے۔مثلاً کوئی مہمان باہر سے آئے تو کھڑا ہونا چاہیے۔اس طرح امام نوویؒ نے فرمایا کہ مشائخ اور اہل علم کیلئے اکراماً کھڑے ہونا چاہیے۔کیونکہ یہ دراصل کسی ذات کا نہیں بلکہ علم وتقویٰ کا احترام ہوتا ہے۔

ابوداؤدؒ کی روایت میں ہے کہ **کان رسول اللہ ﷺ یجلس معنافی المسجد فاذا قام قمناقیاماً حتی نراہ قددخل بعض بیوت ازواجه.** یعنی آپ ﷺ ہماری مجلس سے اٹھتے تو جب تک کسی حجرے میں داخل نہ ہوتے ہم کھڑے رہتے (اخرجه عن ابی هریرة) اسی طرح نبی کریم ﷺ نے انصار کو حضرت سعد بن معاذؓ کیلئے کھڑے ہونے کا حکم دیا تھا۔قوموا الیٰ سیدکم

لہٰذا شیخ عالم اور استاد کو تو چاہیے۔کہ وہ اپنے عقیدتمندوں سے کھڑے ہونے کی طمع نہ کرے۔

لیکن طالب علم، مرید اور چھوٹوں کو چاہیے کہ وہ شیوخ اور بڑوں کا احترام کریں اور ہمیشہ نہیں تو کبھی کبھی اس کی آمد کے موقع پر احتراماً کھڑے ہوں۔ کیونکہ بڑا اپنے نفس کو قابو کرنے پر مامور ہے۔ جبکہ چھوٹا ادب واحترام پر مامور ہے۔

(۷) حدّثنا سفیان بن وکیع ثنا جمیع بن عمر بن عبدالرحمٰن العجلّی ثنی رجل من بنی تمیم من ولدابی هالة زوج خدیجة یکنّی أباعبداللّٰه عن ابن لابی هالة عن الحسن بن علیّ رضی اللّٰه عنهما قال سالت خالی هندبن أبی هالة وکان وصافاً عن حلیة النبیّﷺ وأنا أشتهی أن یصف لی منها شیئاً فقال کان رسول اللّٰهﷺ فخماًمفخّماً یتلألو وجهه تلألؤالقمر لیلة البدرفذکر الحدیث بطوله قال الحسن فکتمتها زماناثمّ حدّثته فوجدته قدسبقنی الیه فساله عمّاسالته عنه ووجدته قدسال أباه عن مدخله وعن مخرجه وشکله فلم یدع منه شیئاً قال الحسین فسالت أبی عن دخول رسول اللّٰهﷺ فقال کان إذا أوی إلیٰ منزله جزّء دخوله ثلاثة أجزاء جُزءً لِلّٰه عزّوجلّ وجزءً لاهله وجزءً لنفسه ثمّ جزّءَ جزءه بینه وبین الناس فیردّذلک بالخاصة علی العامة ولایدّخرعنهم شیئًا وکان من سیرته فی جزء الامّة ایثاراهل الفضل باذنه وقسّمه علی قدرفضلهم فی الدین فمنهم ذوالحاجة ومنهم ذوالحاجتین ومنهم ذوالحوائج فیتشاغل بهم ویشغلهم فیمایصلحهم والامّة من مسئلتهم عنه واخبارهم بالذی ینبغی لهم ویقول لیبلّغ الشّاهدمنکم الغائب وابلغونی حاجة من لایستطیع ابلاغها فانّه من أبلغ سلطاناحاجة من لایستطیع ابلاغها ثبّت اللّٰه قدمیه یوم القیٰمة ولایذکرعنده إلاّذلک ولایقبل من

احـدغیـره یـدخـلـون روّاداً ولایـفترقون إلاّعن ذواق ویخرجون ادلّة
یعنی علی الخیرقال فسألته عن مخرجه کیف کان یصنع فیه قال کان
رسـول الـلّٰهﷺ یخزن لسانه إلافیمایعنیه ویؤلّفهم ولاینفرهم ویکرم
کـریـم کـل قوم ویولیه علیهم ویحذرالناس ویحترس منهم من غیران
یـطـوی عـلـی احـد مـنـه بشره ولاخلقه ویتفقداصحابه ویسأل الناس
عـمّـافـی الـناس ویُحسّن الحسن ویقوّیه ویقبّح القبیح ویوهّیه معتدل
الامـرغیـرمـختـلف ولایـغـفـل مخافة ان یغفلواویملوالکل حال عنده
عتـادلایـقـصـر عـن الـحـق ولایـجاوزه الذین یلونه من الناس خیارهم
أفـضـلهم عنده أعمّهم نصیحة وأعظمهم عنده منزلة أحسنهم مواساة
ومـوازرة قال فسألته عن مجلسه فقال کان رسول اللّٰهﷺ لایقوم
ولایـجـلـس الاعـلـی ذکـر واذا انتهیٰ الـی قوم جلس حیث ینتهی به
الـمـجـلس ویامربذلک یعطی کل جلسائه بنصیبه لایحسب جلیسه
ان احـدأاکـرم عـلیـه مـنـه مـن جالسه اوفاوضه فی حاجة صابرة حتّیٰ
یـکون هوالمنصرف منه ومن سأله حاجته لم یردّه إلابهاااوبمیسورمن
القول قدوسع الناس بسطه وخلقه فصارلهم اباًوصاروا عنده فی الحق
سـواء مـجـلسـه مجلس علم وحیاء وصبروامانة لاترفع فیه الأصوات
ولاتـوبـن فیـه الـحـرم ولاتـنثی فلتاته متعادلین یتفاضلون فیه بالتقویٰ
متـواضـعیـن یـوقّـرون فیــه الـکبیـر ویـرحمون فیـه الصغیر ویؤثرون
ذاالحاجة ویحفظون الغریب.

(۱)صحیح بخاری لم اجده فی هذاالباب کتاب العلم باب من اعادالحدیث ثلاثا، جامع ترمذی لم اجده فـی هـذا البـاب کتـاب الاستیـذان بـاب مـاجـاء فـی کـراهیة ان یقول علیک السلام، مسنداحمد۳/۲۱۳(مختار)

ترجمہ: امام حسنؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے ماموں ہندبن ابی ہالہ سے(نبی کریم ﷺ کے حلیہ) کے بارے میں پوچھاوہ نبی کریم ﷺ کے حلیہ مبارکہ کے بیان میں ماہر تھے۔ مجھے ان سے حلیہ کے بارے میں سننے کا اشتیاق تھا۔(میرے پوچھنے کے بعد)انہوں نے کہا کہ نبی کریم ﷺ ذاتی طور پر باعظمت اور لوگوں کی نظروں میں بلند مرتبہ تھے۔آپ ﷺ کا چہرہ چودھویں رات کی چاند کی طرح چمکتا تھا۔اس حدیث کوامام حسن نے پوری طرح سنادیا۔ حضرت حسنؓ کہتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث(بوجوہ) ایک مدت تک (اپنے بھائی) حسینؓ سے چھپائے رکھی پھر اس حدیث کو میں نے حضرت حسینؓ کے سامنے بیان کیا تو معلوم ہوا کہ مجھ سے بھی پہلے حضرت حسینؓ کی رسائی اس حدیث تک ہوچکی تھی۔وہ اپنے ماموں سے اس حدیث کے بارے میں خود دریافت کرچکے تھے(بلکہ) یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اپنے والد(حضرت علیؓ) سے بھی حضوراقدس ﷺ کے گھر کے اندر اور گھر سے باہر کے طور طریقے اور دیگر عادات واطوار کے سلسلے میں معلوم کرچکے تھے اور قابل بیان چیز نہیں چھوڑی تھی چنانچہ حضرت حسینؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والدؓ سے حضور ﷺ کے درون خانہ حالات دریافت کیے تو انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ جب مکان کے اندر تشریف لے جاتے تو اوقات کو تین حصوں میں تقسیم فرماتے تھے۔ایک حصہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے مخصوص فرماتے، دوسرا حصہ اہل خانہ کے حقوق کی ادائیگی کیلئے اور تیسرا حصہ خود اپنے راحت وآرام کیلئے مختص فرماتے تھے۔

پھر اپنے حصے کو دو حصوں پر اپنے اور لوگوں کے درمیان تقسیم فرماتے تھے۔(اس طرح افادۂ عام کیلئے)خواص صحابہ کے ذریعے اس جزء کو عوام تک پہنچادیتے تھے اور عوام وخواص سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رکھتے تھے(بلکہ ہر قسم کا افادہ عام فرماتے تھے)امت کے اس جزء میں آپ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ اہل علم وفضل

کو(ملاقات کی اجازت) میں دوسروں پر ترجیح دیتے تھے۔اور دینی وعلمی فضیلت کے اعتبار سے اس وقت کو اہل فضل پر تقسیم کیا کرتے تھے۔اہل فضل میں سے کوئی تو ایک ضرورت لیکر حاضر ہوتا اور کوئی دو کام لیکر آتا اور کوئی متعدد حاجات لیکر پیش ہوتا۔ آپ ﷺ ان کی حاجت براری میں مصروف ہوجاتے اوران کو بھی ایسے امور میں مشغول فرماتے جوخودان کیلئے اور دیگر امت کیلئے مفید ہوں بسبب صحابہ کرام کے سوال اور نبی کریم ﷺ کی طرف سے مناسب جواب کے آپ ﷺ یہ بھی فرماتے تھے(مجھ سے استفادہ کرنے والے) حاضرین غائب لوگوں تک پہنچادیا کریں۔اور فرماتے کہ اُن ضرورتمندوں کی حاجتیں مجھ تک پہنچایا کروجو(کسی وجہ سے) اپنی حوائج مجھ تک نہیں پہنچاسکتے۔کیونکہ جو شخص کسی بااختیار تک کسی ایسے شخص کی حاجت پہنچاتا ہے جوخوداپنی حاجت اس تک نہیں پہنچاسکتا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو ثابت قدم رکھیں گے۔حضوراقدس ﷺ کے پاس انہی(مفید) باتوں کے علاوہ کسی (فضول) بات کا تذکرہ نہیں ہوتا تھا اور نہ آپ ﷺ کسی سے کارآمد باتوں کے علاوہ کوئی بات سنتے۔صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کی مجلس میں طالب(خیروارشاد) بن کرآتے اوروہاں سے بغیر کچھ چکھے نہیں ٹلتے تھے مجلس سے نکلتے وقت یہ لوگ رہنما بن کر نکلتے۔ یعنی رشدوہدایت کے رہنما۔

حضرت حسینؓ کہتے ہیں کہ پھر میں نے اپنے والد سے حضوراقدس ﷺ کی خارجی زندگی کے بارے میں پوچھا کہ گھر کے باہران کے طورطریقے کیسے تھےتو حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ آپ ﷺ بامقصد باتوں کے سوااپنی زبان کی حفاظت فرماتے تھے۔ (لایعنی باتیں نہیں کرتے تھے) وہ اپنے صحابہؓ میں الفت ومحبت پیدافرماتے تھے۔اور ہرقوم کے عزتمند اشخاص کوخصوصی عزت دیتے تھے اورانہی کوان کے قوم پر عہدہ داربنادیتے تھے۔اسی کواس قوم پر متولی بناتے تھے۔لوگوں کو(عذاب الٰہی سے

یادوسرے بدقماش لوگوں سے) ڈراتے تھے(۱)اور خود بھی لوگوں سے بچنے کی کوشش فرماتے۔

بایں ہمہ کسی کو بھی اپنی خندہ پیشانی اورخوش اخلاقی سے محروم نہیں رکھتے تھے۔ غیر حاضر ساتھیوں کے بارے میں دریافت فرماتے تھے۔لوگوں کے حالات کے بارے میں لوگوں سے پوچھتے تھے۔ ان کے اچھے کاموں کی تحسین اور تائید وتقویت فرماتے اور بری باتوں کی مذمت کر کے ان کا ازالہ فرماتے تھے۔آپ ﷺ اپنے کاموں میں اعتدال سے کام لیتے تھے اور اختلاف (افراط وتفریط اور رنگارنگی) سے بچتے تھے۔آپ ﷺ لوگوں کی اصلاح سے غافل اور بے فکر نہ بنتے۔اس خوف کی وجہ سے کہ پھر وہ بھی دین سے غافل ہو جائیں گے۔یا پھر بے اعتدالی کی وجہ سے دین سے اکتا جائیں گے(یاتن آسانی کا شکار ہوکر دین چھوڑ دینگے)ہر کام کیلئے آپ ﷺ کے پاس خصوصی تیاری تھی۔حق کی اقامت میں کبھی کوتاہی نہ برتنے دیتے نہ حق سے تجاوز فرماتے۔جولوگ آپ ﷺ کی قربت اختیار کر چکے تھے وہ لوگوں میں سے سب سے بہتر اشخاص تھے۔آپ ﷺ کے نزدیک وہی شخص سب سے افضل تھا جس کی خیرخواہی سب سے زیادہ لوگوں کے لئے ہوتی۔اور سب سے عظیم المرتبہ شخص وہ ہوتا تھا جولوگوں کی مؤاسات وغمخواری اور ان کی معاونت میں سب سے بڑھ کر ہو۔

حضرت حسینؓ کہتے ہیں کہ پھر میں نے اپنے والد سے نبی کریم ﷺ کی مجلس کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کی ذکر کے ساتھ ہی اٹھتے اور ذکر کے ساتھ ہی بیٹھتے۔اور جب کسی مجمع میں تشریف لے جاتے تو جہاں

---

(۱) یہ ترجمہ اس صورت میں ہوگا کہ یحذر کا صیغہ ذال کی تشدید کے ساتھ باب تفصیل سے ہواور اگر یہ ثلاثی مجرد سے ہوتو یاء اور ذال مفتوح ہونگے اور مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ بدقماش لوگوں سے بچتے۔یوں بعد کا جملہ محض تاکید کیلئے لایا گیا ہے۔ ولیراجع الی الشروح فانّ فی اللفظ احتمالات وروایات (اصلاح الدین)

تک (بلاتکلف) رسائی ہوتی وہیں بیٹھ جاتے تھے۔اور لوگوں کو بھی اس کا حکم فرماتے تھے (کہ جہاں پر جگہ ملے بیٹھیں) اپنے ہم نشینوں میں سے ہر ایک کو اس کے استحقاق کے مطابق حصہ دیتے تھے ان کا کوئی ہم نشین یہ نہیں سمجھتا تھا کہ (حاضرین میں سے) کوئی شخص اس کی نسبت نبی کریم ﷺ کے ہاں زیادہ قابل احترام ہے۔ جو شخص آپ ﷺ کے پاس بیٹھتا یا کسی ضرورت میں آپ ﷺ سے مراجعت کرتا۔ تو نبی کریم ﷺ اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ اس کے پاس بیٹھے رہتے یہاں تک کہ وہ شخص خود ہی واپس چلا جاتا۔ اور جو شخص آپ ﷺ سے کوئی چیز مانگتا تو آپ ﷺ اس کی مطلوب چیز بخشش فرما کر اسے لوٹاتے۔ یا پھر شائستہ کلام کے ساتھ اسے واپس فرماتے۔ آپ ﷺ کی خندہ روئی اور کریمانہ اخلاق تمام لوگوں کیلئے تھی۔ سو آپ ﷺ امت کے لئے باپ کی طرح تھے اور سب لوگ حقوق کی وصولیابی میں آپ ﷺ کے ہاں برابر تھے۔

آپ ﷺ کی مجلس علم، حیاء، صبر اور امانت کی مجلس ہوتی تھی۔ اس میں ایک دوسرے پر آوازیں بلند نہیں کی جاتی تھیں نہ اس میں کسی کی حرم پر تہمتیں باندھی جاتی تھیں نہ اس مجلس میں صادر ہونے والے لغزشوں کی تشہیر کی جاتی تھی۔ اہل مجلس سب کے سب آپس میں برابر شمار ہوتے تھے۔ البتہ تقویٰ کی بنیاد پر ان کو ایک دوسرے پر فضیلت حاصل ہوتی تھی حالت یہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کے لئے عاجزی اختیار کرتے تھے۔ صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کی مجلس میں بڑوں کی عزت کیا کرتے تھے۔ چھوٹوں پر شفقت کرتے تھے حاجت مندوں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے اور مسافروں کی رعایت واکرام کیا کرتے تھے۔

<u>حضرت جمیع بن عمیر:</u> حدثنا جمیع بن عمیر جُمیع تصغیر کے صیغہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ اس کے والد کا نام بھی مصغر ''عمیر'' ہے۔ یہاں بعض نسخوں میں ''عُمَر'' اور بعض میں ''عمروٌ'' آیا ہے یہ دونوں

درست نہیں ہیں(۱) زوج خدیجة یہ ابو ہالہ سے بدل واقع ہوا ہے۔نہ کہ رجل من بنی تمیم سے۔ عن ابن لابی ھالة ابو ہالہ کے بیٹے سے یہاں اس کے پوتے مراد ہیں۔اس کا نام عمر ہے جبکہ ملا میرکؒ نے اس کا نام ہند بتلایا ہے۔جبکہ اس کے والد کا نام بھی ہند بن ابی ہالہ ہے بلکہ ابو عبیدؒ نے تو ابو ہالہ کا نام بھی ہند بتایا ہے یوں اس راوی اس کے والد اور اس کے دادا تینوں کا ایک ہی نام بنتا ہے(۲)۔باب خلق النبی ﷺ کی ساتویں حدیث میں اس سند کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ہند بن ابی ہالہ نبی کریم ﷺ کے لے پالک بیٹے اور حضرت خدیجہؓ کے بھی بیٹے ہیں۔یہ حضرت حسنؓ کے سوتیلے ماموں لگتے ہیں۔

وکان وصّافاعن حلیة رسول اللہ ﷺ ہمارے ماموں حضور اقدس ﷺ کی شکل وشباہت کی باریکیاں اور باریک سے باریک عادات وصفات بیان کرتے تھے گویا وہ اس علم شمائل کے سپیشلسٹ تھے۔وانا اشتھی ان یصف لی شیأ منھا دوسری جگہ اس کے ساتھ ایک جملہ اور بھی ہے کہ أتعلق بہ یعنی میرے نانا جان کی عادات واخلاق کی تفصیل معلوم کروں اور یہ اس لئے کہ میں ان باتوں کو حجت اور سند بتاؤں اس علم سے وابستہ ہوجاؤں۔تاکہ اگر ممکن ہو تو اسے اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کروں گویا صحابہؓ کا سوال بھی اور علم بھی برائے علم نہیں بلکہ علم برائے عمل تھا۔

حضرات حسنینؓ کی مسابقت: حضور اقدس ﷺ کے وصال کے وقت حسن اور حسینؓ دونوں بھائی چھوٹے تھے۔حسنؓ کی عمر سات سال کی تھی اور حسینؓ کی اس سے بھی کم تھی۔تو حضور ﷺ کی وصال کے بعد اجلہ صحابہؓ کے پاس جاجا کر دونوں بھائی تفصیلات معلوم کیا کرتے تھے۔اس میدان میں دونوں بھائیوں میں مسابقت رہتی تھی جب کہ علم اور دین میں یہ مسابقت اور یہ حرص ورشک محمود ہے تو ہر بھائی یہ چاہتا تھا کہ میرے پاس حضور اقدس ﷺ کی کچھ امتیازی معلومات ہوں اور میں فرسٹ آجاؤں۔چنانچہ ایک عرصہ سے ایک نے دوسرے سے حدیث چھپائے رکھی تاکہ اسے دوسرے نمبر پر لے جاؤں۔الغرض حضرت ہند

(۱)جمیع بن عمیر بن عبدالرحمٰن العجلی ابوبکر الکوفی ضعیف رافضی من الثامنة(تقریب ۱۶۵/۱) لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے والد کا اصل نام تو عمر تھا چونکہ یہ غالی شیعہ تھا لہٰذا اس نے ازخود والد کا نام تبدیل کرکے عمیر کردیا تاکہ عمر فاروقؓ کا ہمنام نہ ہو۔کما قال المناوی ۳۸/۱،(اصلاح الدین)

(۲)جمع الوسائل ۳۹/۱

نے حضرت حسنؓ کو یہ حدیث سنائی کہ کان رسول اللہ ﷺ فخماً مفخماً وہ اپنی ذات میں بھی عظیم تھے اور لوگوں کی نگاہ میں بھی عظیم تھے۔ ذاتی عظمت بھی تھی اور لوگوں کے اوپر بھی چھا جاتے تھے۔ ایسی عظمت وشوکت اور دبدبہ اللہ تعالیٰ نے دیا تھا۔

یتلألأ وَجھہٗ تلألؤ القمر لیلۃ البدر جیسے چودھویں کا چاند روشن ہوتا ایسے چہرۂ انور چمکتا تھا۔ اور اس بارے میں علماء کا اتفاق ہے کہ حضور ﷺ کے ان محاسن میں کوئی مبالغہ آرائی یا شاعرانہ تخیلات نہیں ہیں۔ جہاں حضور ﷺ کی کوئی تشبیہ آتی ہے وہ تشبیہ پوری نہیں بلکہ ادھوری ہے۔ پھر اللہ نے پورے حسن وجمال کو ظاہر بھی نہیں کیا کیونکہ پھر نگاہوں میں دیکھنے کی تاب نہ ہوتی۔ صحابہ کرامؓ صرف انہی جلوؤں میں مدہوش ہو جاتے تو تعلیمات نبوت کو کیسے ملحوظ ومحفوظ رکھتے۔ درحقیقت مذکورہ تشبیہات صرف تمثیلات ہیں اس سے کہیں بڑھ کر حضور ﷺ کا حسن وجمال تھا۔ مثلاً چاند کو دیکھنے والے صحابی کی ایک نظر چاند پر دوسری رُخ انور پر ہوتی ہے تو قسم کھا کر کہتے ہیں کہ چہرۂ انور چاند سے بڑھ کر حسین تھا۔ سورج تو گویا آپ ﷺ کے چہرے کے اندر ہی جاری وساری ہے۔ یہ روایات وضاحت سے اس بات کی دلیل ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا چہرۂ سورج چاند سے زیادہ حسین تھا۔ فذکر الحدیث بطولہ وہ تفصیلی حدیث اس کتاب میں بھی متفرق ذکر کیا گیا ہے کچھ حصہ پہلے باب میں اور کچھ دوسرے ابواب میں لائے گئے ہیں۔

قال الحسن فکتمتھا الحسین زمانا میں نے وہ حدیث اپنے بھائی حسینؓ سے ایک عرصہ تک چھپائے رکھی تا کہ اچانک ظاہر کروں گا تو مجھے فضیلت اور اولیت حاصل ہو گی(۱)۔

ثمّ حدثتہ فوجدتہ قدسبقنی الیہ مگر مجھ سے صبر نہ ہو سکا کہ صحابہ علم کو چھپاتے نہیں تھے

---

(۱) اس حدیث کو پوشیدہ رکھنے میں شراح نے اور بھی حکمتیں بتائی ہیں۔ مثلاً اول یہ کہ اپنے چھوٹے بھائی حضرت حسینؓ کا امتحان لینا مقصود تھا کہ وہ از خود تحصیل علم کا شوقین بھی ہے یا نہیں۔ دوم یہ کہ حضرت حسینؓ کو یہ موقع فراہم ہو جائے کہ وہ اس حلیہ کو سند عالی سے یعنی خود ماموں سے حاصل کرے۔ سوم یہ کہ حضرت حسینؓ کی طرف سے طلب اور استفسار کا حضرت حسنؓ کو انتظار تھا کہ وہ پوچھے گا تو بتاؤں گا۔ کیونکہ جو چیز طلب کے بعد حاصل ہو جائے وہ زیادہ قابل قدر ہوتی ہے۔(اصلاح الدین)

ایک دن یہ حدیث بیان ہی کردی حسینؓ کو میں نے بتادیا کہ میرے پاس تو نانا جان کی یہ حدیث بھی ہے۔ حسینؓ نے سن کر کہا ارے بھائی تم کس گمان میں ہو مجھے تو تم سے بھی پہلے یہ حدیث مبارک حاصل ہوئی اور اس سے بڑھ کر مجھے اور بھی معلومات ہیں۔ ماموں جان ہندؓ کے علاوہ میں نے تو ابا جان حضرت علیؓ سے بھی اس قسم کی باتیں پوچھی تھیں۔ فسالہ عما سألتُه فوجدته قدسال اباه عن مدخله وعن مخرجه الخ، انہوں نے تو اپنے والد سے پوچھ لیا تھا کہ حضور ﷺ کی داخلی زندگی (مدخل) گھریلو زندگی، بیوی بچوں کے ساتھ رہنا، خلوت کی زندگی، نجی زندگی کیسی تھی نیز (مخرج) خارجی زندگی عوامی زندگی سٹیج کی زندگی جلوت کی زندگی کیسی تھی۔

وشکله شکل وصورت مراد نہیں بلکہ شاکلہ بمعنی الطریقة المسلوکة سے ہے۔ تمام طور طریقے اس میں آگئے۔ فلم یدع منه شیئاً ضمیر حضرت علیؓ کو راجع ہے یعنی انہوں نے کوئی چیز بیان کرنے میں نہ چھوڑی۔ یا پھر حضرت حسینؓ کو راجع ہے یعنی حضرت حسینؓ نے کوئی بات پوچھنے سے نہیں چھوڑی تھی جو اسے محفوظ نہ ہو۔ خانگی زندگی کے بارے میں بھی پوچھا، باہر کی زندگی تو صحابہ کرامؓ کو معلوم ہی تھی۔

گھر میں ٹائم ٹیبل: کان اذااوی الی منزله جزء دخوله، دخول سے زمانہ دخول مراد ہے جب حضور ﷺ گھر تشریف لاتے تو جتنا وقت گزارنا ہوتا مثلاً چھ گھنٹے وقت ملا تو ان چھ گھنٹوں کو تین حصوں میں بانٹ لیتے۔ گویا ایک نظام الاوقات تھا ہماری طرح بغیر پروگرام اور ڈسپلن کی زندگی نہ تھی۔ ہر چیز کا ٹائم ٹیبل تھا تو حضور ﷺ گھر کے اس وقت کا بھی ٹائم ٹیبل بنا لیتے۔ جزءً ا لله عزوجل، ایک حصہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کیلئے مخصوص کر لیتے۔ کہ دو گھنٹے نوافل تلاوت ذکر وغیرہ اللہ کی عبادت اور مناجات میں گزارتے۔ اور جزءً لاهله ایک حصہ اہل وعیال کیلئے یعنی ان کی حالت جاننے اور تسکین وتسلی کی کوشش فرماتے۔ یہ نہیں کہ سارا وقت عبادت میں گزر جائے اور گھر والوں کی حق تلفی ہو۔ وجزءً لنفسه، تیسرا حصہ اپنی ضرورت اور راحت وآرام کیلئے رکھتے تھے یہ نہیں کہ آرام ہی نہ کیا جائے۔ ہر چیز میں اعتدال ملحوظ تھا۔ تبتل اور رہبانیت سے اجتناب فرمایا کرتے۔

وجہ تعارف اورذوق عبادت: ایک صحابیہ خاتون(ا) حضورﷺ کے گھر میں حاضر تھیں کہ حضوراقدس ﷺ تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ یہ کون خاتون ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ حضورﷺ یہ فلاں ہے۔ اور ساری ساری رات عبادت میں گزارتی اور جاگتی ہے۔

گویا صحابہؓ کے ہاں تعارف بھی ان چیزوں (عبادت) سے ہوتا تھا۔ یہ نہیں کہ یہ فلاں نواب ہے یہ فلاں جاگیردار ہے یہ فلاں افسر ہے یہ ڈی سی اور اے سی ہے بلکہ اتنی نماز پڑھتا اور اتنے روزے رکھتا ہے اتنا جہاد کیا ہے یہ اعمال یہ عبادات وہ کرتا ہے یہ باتیں صحابہؓ کے لئے قابل اہمیت اور ذریعۂ تعارف تھیں۔ تو فرمایا یہ بے چاری صبح تک جاگتی ہے اور پلک تک نہیں جھپکتی۔ بلکہ عبادت میں ہی مصروف رہتی ہے۔ حضورﷺ نے فرمایا کہ میں تو سوتا بھی ہوں اور عبادت بھی کرتا ہوں۔ بیوی کا بھی تم پرحق ہے، آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے۔ تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے۔ جسم اور آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے اور ان کو آرام کی ضرورت ہے تمہیں ہر چیز اعتدال پر رکھنی ہے۔

رہبانیت کی سیاہ تاریخ: ورنہ رہبانیت ہو جائے گی جس کی بڑی سیاہ تاریخ ہے اور جو بھی فطرت کے خلاف طریقے اختیار کئے جائیں جو فطرت کے ساتھ نہ چل سکیں تو ان کا ردعمل بھی آگے چل کر نہایت شدید ہوتا ہے رہبانیت بھی آگے چل کر فحاشی اور بے حیائی کا عظیم ذریعہ بنا۔

یہ کلیسائی نظام یہ پاپائیت اسی کی ایک بھیانک شکل ہے۔ تو حضوراقدس ﷺ فرماتے ہیں کہ میں تو سوتا بھی ہوں، میں تو کھاتا پیتا بھی ہوں، میں تو بوقت ضرورت بازاروں میں جاتا ہوں، میں تو شادیاں بھی کرتا ہوں یہ تو کوئی کمال کی بات نہ ہوئی کہ انسان زندگی سے فرار اختیار کر لے اور غاروں میں بیٹھ جائے۔ اسلام میں تبتل اور رہبانیت کی گنجائش نہیں۔ کوئی بھولے بھالے بزرگ ہوں تو آتے ہی گھر میں ایک طرف بیٹھ جاتے۔ بیوی بچوں سے کہتے کہ جاؤ آرام کرو مجھے تو عبادت ہی سے فرصت نہیں۔

(ا) ان کا اسم گرامی حولاء بنت تویتؓ ہے جن کا ذکر باب صوم النبی ﷺ میں ہو چکا ہے۔ لیکن وہاں نبی کریم ﷺ کے الفاظ یوں منقول ہیں "فقال رسول اللہ ﷺ علیکم من الاعمال ماتطیقون فو اللّٰہ لایملّ اللّٰہ حتی تملّوا و کان احبّ ذالک الی رسول اللہ ﷺ الذی یدوم علیه صاحبه. (اصلاح الدین)

ساری رات میں نے عبادت میں گزارنی ہے سارا وقت تبلیغ ہی کے لئے ہے۔نہیں بلکہ حضور اقدس ﷺ نے اوقات بانٹ دیئے تھے۔ایک حصہ اللہ تعالیٰ کا،ایک حصہ اپنے اہل وعیال کیلئے تا کہ بیوی بچوں سے پیار کی باتیں ہوں ان کی دلجوئی ہو۔ان کی ضروریات وحوائج معلوم کی جائیں۔گھر کے مسائل پر بات چیت کی جائے اور انہیں نمٹایا جائے۔''وجزءً لنفسہ''یعنی ایک حصہ اپنے لئے مخصوص فرماتے یعنی آرام، سونا اور قیلولہ۔پھر اپنے حصہ میں حتی الوسع ایثار فرماتے اور کوشش کرتے کہ کچھ اوقات ولمحات اس سے بھی امت کی صلاح وفلاح کے کاموں میں صرف ہوں۔

اصلاح امت کی فکر: **ثمّ جزّءہ بینہ وبین النّاس فیردذلک بالخاصۃ علی العامۃ،**

اس اپنے حصہ کو بھی دوحصوں میں تقسیم فرمایا یعنی اس کا آدھا حصہ بھی باقی لوگوں کے درمیان تقسیم فرمادیتے اس طرح کہ خصوصی صحابہؓ اس وقت داخل ہوتے۔ان خواصِ امت کے ذریعہ سے اس وقت کے علوم ومضامین اور مشوروں کا بھی فائدہ عام امت کو پہنچتا۔حضور ﷺ کی تو ساری زندگی امت کیلئے تھی۔زندگی ایک عجیب گھٹن میں گزاردی۔کڑھتے تھے،اندر اندر سلگتے تھے،امت کے غم میں،کہ کسی طرح اصلاح ہوجائے امت کی،نہ آرام،نہ راحت،یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ خود ذکر کیا کہ **لعلّک باخعٌ نفسک** کیا تم غم سے اپنا گلہ گھونٹنا چاہتے ہو۔امت کی فکر میں ایسے کڑھتے ہو۔ایسا غم کرتے ہو کہ تمہیں تو جیسا پھندا لگ گیا ہو۔جیسے کسی شدید غم کی وجہ سے گلے میں پھندا سا لگ جاتا ہے،نہ کچھ نگل سکتا ہے نہ بات چیت کرسکتا ہے اور شدید غم کی وجہ سے بسا اوقات گھٹ کر آدمی مرجاتا ہے۔تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اتنا غم کیوں کرتے ہو تم تو امت کا حق ادا کررہے ہو۔تو اتنی فکر تھی حضور ﷺ کو امت کی۔اس لئے اپنے آرام کے اوقات بھی بانٹ لیا کرتے تھے کہ چلئے اس میں سے بھی کچھ وقت بنی نوع انسان کی بھلائی میں خرچ کردوں۔خواص کے ذریعے عوام کو فائدہ پہنچادوں۔صورت یہ ہوتی کہ حضرت ابوبکرؓ آتے ہیں، حضرت عمرؓ آتے ہیں،حضرت خالدؓ ہیں،حضرت علیؓ آتے ہیں کوئی کسی فوجی مہم کے امیر ہیں۔کوئی اہم ذمہ داری والے صاحب ہیں۔ضرورت ہوتی کہ وہ لوگ کسی مخصوص وقت میں مشورہ حاصل کرسکیں تو ان میں سے ایک ایک کو بلاتے اس طرح ان سے بھی جو بات ہوتی وہ کیا ہوگی؟اسی امت کی صلاح وفلاح سے

متعلق امور ہی ہوں گے۔تو وہ وقت بھی اس طرح بٹ جاتا اور ان کے واسطے سے ساری امت کو پہنچ جاتا جواب قیامت تک مستفید ہو رہی ہے۔

ولا یدخر عنهم شیئاً،اور حضور اقدس ﷺ کوئی چیز امت سے اور لوگوں سے چھپا کر نہیں رکھتے تھے یہ ایک باطل تصور ہے بعض لوگوں اور فرقوں کے ہاں مشہور کہ ہمارے پاس مخصوص اسرار و علوم ہیں ایسا ہرگز نہ تھا حضور ﷺ کسی سے کوئی علم کی بات مخفی نہ رکھتے تھے۔علوم الٰہیہ علوم دینیہ سب عام ہوتے۔ دوسرا مطلب اس جملے کا یہ بھی ہے کہ گھر میں جو کچھ بھی ہوتا کسی نہ کسی چیز سے ملاقاتیوں کی تواضع فرماتے۔ادخار اور ذخیرہ اندوزی نہ فرماتے کہ یہ چیز کل میرے کام آجائے گی بلکہ جو آیا حضور ﷺ نے میزبانی میں تقسیم کر دیا خرچ کر دیا۔ **وکان من سیرته فی جزء الامة ایثار اهل الفضل باذنه وقسمه علی قدر فضلهم فی الدین**، اس خاص وقت میں یا پھر عام وقت میں جو ملاقاتوں کا ہوتا تو سینکڑوں کا ہجوم ہوگا۔ کھلے بندوں ہر شخص بات بھی نہیں کرنا چاہتا تو ملاقاتیوں کی ترتیب ملحوظ رکھنی ہوتی ہے۔اسی حکمت عملی کو آپ ﷺ روبہ عمل لاتے۔

<u>فرق مراتب:</u> تو حضور ﷺ فرق مراتب ملحوظ رکھتے۔ایک ایک کو بلاتے تھے یہ نہ تھا کہ جو پہلے آیا وہ پہلے ملا بلکہ''**ایثار اهل الفضل الخ**''جو فضیلت والے تھے علم میں تقویٰ میں دین میں اور جو اسلام کی خدمات اور قربانیوں میں بڑھ کر تھے اس کا مقام علمی لحاظ سے اونچا ہے۔فضل کے معنی دنیاوی معیار نہ ہوتا بلکہ اہل فضل ہوتے اللہ والے۔مخلوق کی بھلائی کے لحاظ سے جس کا جتنا اونچا مقام ان چیزوں میں ہوتا تھا ملنے میں ان کو ترجیح دیتے تھے۔پھر ملاقات کا وقت بھی اسی مناسبت اور مرتبہ کے لحاظ سے طے ہوتا۔یہ نہیں کہ ہر ہمہ شما سب کو دو دو منٹ بلکہ جس کا مقام اور فضل جتنا اونچا ہے اس کو وقت بھی زیادہ ملتا جو کم ہے تو کم وقت یا اس کے مسائل کم ہیں تو کم اور زیادہ ہوتے تو زیادہ وقت کسی دینی مہم میں کوئی جاتا تو زیادہ وقت کسی ذاتی مسئلہ میں آیا ہے تو منٹوں میں نمٹا لیا جاتا۔تو فضیلت فی الدین اور ضروریات کے لحاظ وہ وقت تقسیم ہوتا۔

فمنهم ذوالحاجة ومنهم ذوالحاجتین ومنهم ذوالحوائج کسی کے پاس ایک فائل ہے کسی کے پاس دو فائل ہیں۔کوئی بہت سی حاجتیں لے کر آیا ہے۔کوئی کم اور امت کے سارے مسائل

ضروریات اور حاجات کی مرجع آپ ﷺ کی ذات تھی تو وہ مسائل کے پلندے لے کرآتے مگر حضور ﷺ کوکوئی ناگواری محسوس نہ ہوتی نہ یہ کہ اس وقت صرف ایک درخواست پیش کرنی ہے بلکہ سارے مسائل اور حاجات پیش کرنے کی اجازت ہوتی۔ **فیتشاغل بھم ویشغلھم فیمایصلحھم والامة** ،الامة کالفظ عام ہے۔حاضرین حاجت مندوں کو بھی شامل ہے اور قیامت تک آنے والی انسانیت کو بھی تو یہ عطف العام علی الخاص کے قبیلے سے ہے تاکہ شمول وعموم مستفاد ہو۔پس حضور ﷺ پوری توجہ سے ان کے ساتھ مشغول ہوجاتے پھران کوایسے کاموں میں مشغول رکھتے کہ جن سے ان کوفائدہ ہو۔ان کی اصلاح ہوتی ہو اوران کے ذریعہ سے آگے چل کرساری امت کی بھی اصلاح ہوتی ہو۔دنیاوی دھندوں، سیروتفریح،فضول گپ شپ اورتعیشات میں صحابہؓ کومصروف نہ ہونے دیتے اورسربراہ مملکت ایسا ہی باہر جاکر کرتے ہیں وفد ساتھ ہوتا ہے اگرچند منٹ بھی ہوتے ہیں تو بڑے لوگوں کے ہاں لمٹ (Limit) یعنی محدود وقت ہوتا ہے تو صدرصدر کے ساتھ مذاکرات میں مصروف ہوجاتا ہے۔وزیرخارجہ،وزیرخارجہ کے ساتھ اور ہرشعبہ کا سربراہ اپنے شعبوں سے متعلقہ افراد کے ساتھ مذاکرات میں مصروف ہوجاتا ہے تاکہ اس دورے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے۔تو حضور ﷺ کے پاس اتناوقت تو نہ تھا کہ کوئی آیا تو گپ شپ اورلایعنی باتوں میں لگے رہیں بلکہ یک دم کام کی باتیں شروع ہوجاتیں اوروں کیلئے بھی یہی حکم تھا کہ جن چیزوں میں تمہارافائدہ ہو۔انہی باتوں میں لگے رہو۔اوروہ باتیں کس قسم کی ہوا کرتی تھیں؟ **من مسئلتھم عنه واخبارھم بالذی ینبغی لھم** ،بعض شراح نے من کو بیانیہ قراردیا ہے تو یہ بیان ہے مایصلحھم کیلئے۔ مطلب یہ ہے کہ امت کی بہبود اور دین ودنیا کی سرخروئی کی باتیں سب کا مشغلہ ہوتی تھیں۔وہی جو صحابہ آپ ﷺ سے دریافت فرماتے تھے اورآپ ﷺ ان سائلین کے احوال واستفسارات کے مطابق جوابات مرحمت فرماتے تھے لیکن علامہ ابن حجرؒ نے اس کوردکرتے ہوئے کہا ہے کہ یہاں من تعلیلیہ ہے۔مطلب یہ ہے کہ ان امور کی افادیت صحابہ کرامؓ کے سوال اورآپ ﷺ کی طرف سے جوابات کی وجہ سے ہے۔ظاہر ہے کہ صحابہ کرامؓ دینی امور کے بارے میں حضور ﷺ سے سوالات کرتے اورحضور ﷺ ان کوان طریقوں سے آگاہ کرتے جوان کیلئے یعنی امت کیلئے زیادہ مناسب ہوتے تھے اورجن میں ان کی بھلائی ہوتی۔

ویقول لیبلغ الشاهد منکم الغائب، پھر یہ بھی تاکید فرماتے کہ جو کام کی باتیں تمہیں معلوم ہوئیں۔ مسائل کا جو حل معلوم ہوا، جو علم حاصل کیا۔ یہ چیزیں جن تک نہیں پہنچیں ان تک بھی پہنچاؤ۔ یہ علم اپنے ساتھ مخصوص نہ رکھو۔ شاہد یعنی جو حاضر ہیں عالم ہیں وہ غائب تک پہنچائیں۔ اگر صحابہ کو یہ حکم نہ ہوتا اور اس پر عمل نہ کرتے تو یہ حدیث ہم تک نہ پہنچتی اور یہی درحقیقت ''**یشغلهم فی مایصلحهم والامة**'' کی اہم ترین صورت ہے کہ پیغمبر کے وارث بن کر اس کی تعلیمات کی اشاعت کریں۔ پھر فرمایا **وابلغونی حاجةً من لایستطیع ابلاغها**، ملاقاتیوں کو بھی یہ تاکید فرماتے کہ جو بے چارے دور ہیں کسی مجبوری کی وجہ سے اپنی ضروریات مجھ تک نہیں پہنچا سکتے تو جب تم لوگ میرے پاس آیا کرو تو ایسے لوگوں کی ضروریات و مسائل بھی مجھ تک پہنچادیا کرو مثلاً کوئی دور ہے، غلام ہے بیمار ہے یا پردہ نشین ہے، کوئی ہیبت اور رعب یا حیا کے مارے سامنے نہیں آسکتا۔ تو ان کی ضروریات بھی مجھ تک پہنچادیا کرو۔ خواہ وہ دینی ضرورت ہو یا دنیاوی حاجت۔ ہمارے حکام تو ایسے آدمی کو ڈانٹ دیتے ہیں کہ تمہیں اوروں کی کیا پڑی ہے اپنی بات کرو۔ مگر حضور ﷺ ایک ایک کو فرماتے کہ جہاں جہاں کوئی محتاج ہو، مستحق ہو، مصیبت زدہ ہو مسائل کا شکار ہو، تو ان کے مسائل مجھ تک پہنچادیا کرو۔ اس لئے کہ **فانّه من ابلغ سلطاناً حاجة من لایستطیع ابلاغها اثبت الله قدمیه یوم القیامة**، سلطان صرف بادشاہ کو نہیں کہتے ہر بااختیار سلطان ہے۔ اگر ڈی سی ہے، اے سی ہے، گورنر ہے اس کو اپنے دائرے میں سلطان کہیں گے یعنی تسلط اور اختیار والا۔ اگر اس کو کسی نے کسی محتاج و غریب اور ضعیف کا مسئلہ پہنچادیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے ثابت قدم رکھے گا اسکے بدلے کہ اس نے ڈگمگانے والوں کو دنیا میں سہارا دیا۔ مشکلات کی دلدل سے نکال دیا۔ تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن پل صراط پر اسے ثابت قدم رکھے گا۔

<u>جائز ناجائز سفارش کی نوعیت:</u> یہ سفارش ہے مگر وہ سفارش نہیں جو ہم کرتے ہیں کہ فلاں کا حق ہے لیکن اس کا حق مار کر اس کو دے دیں۔ باقی اگر ایک شخص مستحق ہے اور وہاں پہنچ نہیں سکتا۔ اپنا مسئلہ گورنر کے پاس، ڈی سی کے پاس، صدر کے پاس اور آپ کسی کی حق تلفی اس سے نہیں کرنا چاہتے اور اس کی سفارش کرلیں آپ کے چند جملوں سے اس کا کام ہوجائے تو اس کا اللہ تعالیٰ آپ کو اجر دے گا۔ ہم تو سفارش

کا معنیٰ یہ لیتے ہیں کہ فلاں دیانتدار اور مستحق ہے اس عہدے کیلئے اس کو ہٹا کر دوسرے کو یہ منصب دے دو حالانکہ مستحق کا حق اس کو دینا چاہئے اگر دیانت دار کوئی اور آدمی ہے۔اس کے پاس اہلیت اور سب کچھ ہے لیکن تم کہتے ہو کہ یہ حق فلاں کو دے دو۔یہ سفارش جو ہے مذموم ہے۔باقی یہ سفارش جو حضور ﷺ نے بیان فرمائی اس کی تو بڑی فضیلت حضور ﷺ نے خود فرمائی **و لا یذکر عنده إلاّ ذلک**،حضور ﷺ کی مجلس میں باتیں بھی صرف یہی دین و دنیا کی ضرورت کی باتیں ہوتی تھیں۔دنیوی فضول باتیں نہیں بلکہ دین و دنیا کی ضروری اور مفید باتیں ہوتی تھی۔

و لایقبل من احدٍ غیره،اور میل جول رکھنے والوں میں سے اس کے علاوہ اور باتیں پسند بھی نہ کرتے تھے۔یہ ماقبل کیلئے تاکیدی جملہ ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ دنیوی باتیں، جہاد کے امور، مملکت کے متعلق امور، ڈسپلن کے انتظامی امور سے متعلق یہ باتیں بھی گناہ نہیں یہ بھی عبادت ہیں لیکن بے ہودہ فضول باتیں اور بے مقصد نہ کرنے دیتے۔**یدخلون رُوّادًا**،ہر ایک طالب بن کر آتا۔کسی نہ کسی چیز کا طلب گار۔کوئی مسائل لے کر آتا،کوئی دین سیکھنے کے لئے آتا، روّاد جمع ہے رائد کی رائد کہتے ہیں اس شخص کو جو قافلہ کے آگے آگے چل کر قافلے والوں کیلئے پانی اور جانوروں کیلئے چارے کی تلاش کرتا ہے۔یہاں پر ان صحابہؓ کو جو خود اپنے لئے اور امت کیلئے مہبط وحی اور منبع ہدایت سے آب حیات اور زاد آخرت حاصل کرنے آتے روّاد کہا گیا کیونکہ وہ بھی منافع اور حکمتوں کے طالب ہوتے تھے۔

و لایفترقون الاّعن ذواق،حضور ﷺ سے الگ نہ ہوتے ان سے واپس نہ جاتے مگر کچھ چکھا ہوتا۔ذواق مذوق (چکھی ہوئی چیز) یا مصدر یعنی چکھنے کو کہتے ہیں جبکہ ''عن'' بعد کے معنیٰ میں آیا ہے یعنی بعد ذواق۔اس کے دو مطلب ہیں۔ایک یہ کہ حضور ﷺ کے گھر میں ہر وقت فقر تھا لیکن پھر بھی کسی نہ کسی چیز سے مہمان کی تواضع فرماتے۔حضور ﷺ کی اتنی غیرت اور حمیّت تھی اور مہمان نوازی کا یہ عالم کہ ٹھنڈا پانی اگر ہے اور ایک کھجور ہے کم از کم وہ چکھ لو،کوئی ملنے والا ان سے بغیر کچھ چکھے نہیں جا سکتا تھا۔معلوم ہوا کہ گھر پر آیا ہوا کوئی بھی مہمان ہو۔اسے اس طرح نہیں واپس کرنا چاہئے۔اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ کچھ نہ کچھ رشد و ہدایت اپنے دامن میں لے کر جاتے تو ذواق علم و ہدایت سے کنایۃ ہے وہ خالی دامن آتے اور

دامن بھر کے لے جاتے اپنے اپنے ظرف اور اپنے اپنے دامن کی وسعت کی بات تھی۔تو جو کوئی آتا بالکل محروم نہ جاتا کچھ نہ کچھ حصہ علم کا اور کچھ دین کے فائدے لے کر جاتا۔ویخرجون ادلّة،اور پھر جب وہ واپس جاتے تو ہر ایک ایک عظیم رہنما ہوتا۔دلیل کا معنی ہے دلالت علی الخیر کرنے والا، ہر ایک روشنی کا مینار بن کر چلا جاتا۔خیر اور بھلائی، رہنمائی کی باتیں بیان کرنے والا۔چنانچہ آپ ﷺ فرماتے ہیں اصحابی کالنجوم بایّهم اقتديتم اهتديتم۔جبکہ بعض نسخوں میں اذلّة یعنی ذال کے ساتھ بھی آیا ہے کہ وہ جو ہدایت سن لیتے تھے۔اس کے لئے سرنگوں اور قبول کرنے والے ہوتے تھے۔اس کے لئے گردن نہاد ہو جاتے تھے۔قال سالته عن مخرجه،فرمایا پھر میں نے ان سے پوچھا۔حضور اقدس ﷺ کی عوامی زندگی کیسی تھی جب باہر تشریف لاتے تھے، سٹیج پر جلسے میں، اجتماع میں۔ کیف کان یصنع فیه،تو اس وقت حضور ﷺ کے کیا معمولات تھے گھر کے باہر آپ ﷺ کی معاشرتی اور سیاسی زندگی اور مدبرانہ طرز عمل کی حسین تصویر ملاحظہ فرمائیں۔

<u>لایعنی باتوں سے احتراز:</u> كان رسول الله يخزن لسانه الافی مايعنيه ،حضور ﷺ باہر بھی اپنی زبان محفوظ رکھتے تھے سوائے ضروری باتوں کے۔"مایعنی" ان باتوں کو کہتے ہیں جن سے کوئی دینی فائدہ ہو یا دنیوی فائدہ ہو۔بامقصد باتوں میں تو قوت گویائی صرف کرتے تھے اور لایعنی (بے مقصد بے کار) باتوں سے اجتناب کرتے تھے۔زبان کو قیمتی خزانہ کی طرح رکھتے تھے۔زبان تو ایک قیمتی خزانہ ہے۔اس کو بے مقصد ضائع نہیں کرنا چاہئے اس کو اگر ہم نے صحیح مصرف پر لگایا تو بہت عظیم چیز ہے اور غلط جگہ پر خرچ کیا تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات انسان گپ شپ میں ایسی بات کہہ جاتا ہے کہ اسے احساس تک نہیں ہوتا اور جہنم کے آخری اور نچلے درجے میں پہنچ جاتا ہے۔اکثر لوگ زبان قینچی کی طرح چلاتے ہیں کسی کی آبروریزی کی، کسی کی غیبت کی، کسی پر تہمت لگائی، کسی پر الزام تراشی کی، اس کو پرواہ بھی نہیں ہوتی لیکن تباہی کے کنارے پہنچ جاتا ہے۔ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے اس قسم کی باتوں کو حصائدالالسنة کہا ہے۔حصد کہتے ہیں کھیت کاٹنے کو، اب گندم جس سے ہم کاٹتے ہیں اسے ہم پشتو میں لور کہتے ہیں یعنی درانتی،تو یہ زبان درانتی ہے اور کیا کاٹتی ہے جتنی عبادات اس نے کی ہیں۔نمازیں، روزے، حج جو اخلاق،

جواعمال جونیکیاں تھیں وہ کاٹ دیں اسی درانتی نے اس وجہ سے ہم کامیاب نہیں ہوتے کیونکہ جس طرح درانتی چلاتے ہیں اس طرح زبان بھی استعمال کرتے ہیں اور سارے کئے کرائے پر پانی پھیر لیتے ہیں تو یہاں حضوراقدس ﷺ کے بارے میں ارشاد ہے کہ وہ کسی جگہ بلامقصد ایک جملہ بھی نہیں استعمال کرتے تھے۔

مجسمۂ حیاوپیکرعفت: ویؤلفھم حضورﷺ ملنے والوں کو اپنی رعایا کواوراپنے زیراثرلوگوں کو مانوس فرماتے تھے و لاینفرھم، ان کواپنے سے متنفراورمتوحش نہیں کرتے تھے۔ان کی تالیفِ قلب کا انتظام کرتے تھے۔ان کواپنے قریب لاتے تھے۔ایسانہیں کہ کوئی آیا، ذرانامناسب بات دیکھی تو اسے ڈانٹا اوردھمکایا کہ تو نے یہ جرم کیا ہے میرے قریب مت آ، تیرے اندرفلاں عیب کیوں ہے۔جیسے بعض حضرات کسی کودیکھتے ہی شور مچاتے ہیں کہ داڑھی کیوں مونڈھی ہے یاسر کے بال ایسے کیوں رکھے ہیں اورتم نے فلاں جرم کل کیا تھا کل تم نے چوری کی تھی اور پھر بھرے مجلس میں اسے رسوا کرتے ہیں۔تو حضوراقدس ﷺ مجلس میں کسی پر تنقید نہیں کرتے تھے مجسم حیا تھے اور عفت ومروت کے پیکر تھے۔آنکھوں میں آنکھیں ڈال کربات نہیں کرتے تھے۔حدیث میں آتا ہے کہ جیسے ڈولی میں دُولہن ہوتی ہے۔جس حالت میں گھونگھٹ میں ہوتی ہے۔اس سے زیادہ حضورﷺ کا حیا تھارو بروکسی کوسنانا بڑی بات تھی اتنا شرمیلا پن تھا کہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کرمخاطب نہیں ہوتے تھے عموماً نیچے دیکھتے مجسم حیا تھے۔

ایک صحابیؓ آئے ان کے کپڑوں پر حضورﷺ نے کچھ رنگ وروغن دیکھا جو مردانہ لباس کے ساتھ مردانگی کے ساتھ مناسب نہیں تھا۔جب وہ مجلس سے اٹھ کر چلے گئے تو حضورﷺ نے دوسروں سے کہا تم لوگ اسے سمجھاتے کیوں نہیں۔تم اسے سمجھادو تو بہتر ہوگا یعنی خود روبرو تنقید بھی گوارا نہ کرتے (۱)۔

آج کے مولوی صاحب ممبر پر بیٹھے ہوتے ہیں اور وعظ میں سب کوایک ہی ڈنڈے سے ہانک رہے ہیں اورگالی گلوچ دے رہے ہیں اس سے کیا فائدہ؟ ہر شخص میں خامیاں تو ہوتی ہیں۔مجلس میں بیٹھتے

(۱) آپ ﷺ کی اس خوبی کا بیان قرآن میں بھی موجود ہے قال تعالیٰ: ولو کنت فظا غلیظ القلب لانفضوا من حولک.(اصلاح الدین)

ہی اسے ملحد اور زندیق بنا دیا تو وہ دوسرے دن کیا آئے گا؟ ہرگز نہیں، جب کوئی ملاقاتی آپ کے پاس آیا اور آپ نے درشت لہجہ میں اور سختی سے اس سے بات چیت کی تو آئندہ وہ آپ کے پاس کیسے آئے گا؟ آپ کیسے اپنے فرائض سے سبکدوش ہوں گے۔ دوسری جگہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

تلقین، تبشیر اور تنفر: "بشــرًا وَلاتــنــفّــروا" لوگوں پر آسانی پیدا کرو لوگوں پر تنگی نہ لاؤ۔ جو کامیاب مصلحین ہیں وہ تو جو بھی آتا ہے ان کو پتہ بھی ہے کہ بدترین گنہگار اور مجرم ہے مگر وہ ان کو سینے سے لگاتے ہیں ان پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے ہیں وہ ان کے ساتھ محبت کرتے ہیں اور وہ کہتا ہے کہ بھئی تم تو بہت بڑے ولی ہو۔ پاک ہو تو وہ خود اپنے دل میں سوچنے لگتا ہے نادم ہوتا ہے اور کچھ کر چلا آتا ہے۔ تو حضور اقدس ﷺ کے پاس جو بھی آتا بڑے سے بڑا ملحد اور فاسق و فاجر وہ ایسا کچھ کر آتا کہ پھر وہیں کا ہو جاتا یہ صرف تالیف قلب کا ثمرہ تھا "یولّفهم" کا ایک معنی یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ لوگوں کے درمیان الفت و محبت پیدا کرتے تھے اور ان کو باہمی انتشار اور نفرت سے بچاتے تھے تاکہ قومی وحدت کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے۔ یعنی "یولّف اصحابه فیمابینهم" خود آپس میں صحابہ کو شیر و شکر فرماتے تھے۔ ویکرم کریم کل قوم ویولّیه علیهم، عوامی زندگی کا ایک پہلو سیاسی ہوتا ہے۔ آپ ﷺ اس کو بھی بڑے تدبر سے نبھاتے تھے۔

قومی رہنما کا احترام: جس قوم کا جو معزز ہوتا تھا حضور ﷺ اسے بھی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہمارا نظامِ سیاسی اسی وجہ سے ابتر ہے ہنگامے اس وجہ سے ہوتے ہیں کسی قوم نے ایک شخص کو اپنا ملک بنایا، خان بنایا، سردار بنایا اسے منتخب کیا اور سارا قبیلہ اس پر راضی ہے کہ یہ ہمارا رہنما ہے، ممبر ہے، ہمارا نواب ہے یہ ہمارا افسر ہے ادھر ملکی انتظامیہ اسے گھاس نہیں ڈالتی، اس کے برعکس حضور ﷺ ڈنڈا لیکر قومی معززین کو پس منظر میں جانے پر مجبور نہیں کرتے تھے کہ میں نے جب مکہ فتح کر لیا ہے اور اسلام آگیا تو تم کون ہو ہٹ جاؤ، اس منصب سے معزول ہو جاؤ۔ میں اپنے افراد کو تم پر حاکم بناؤں گا۔ عرب کا نظام قبائلی نظام تھا۔ اگر ذرا بھی ان کے رہنما اور سردار کی طرف ٹیڑھی نظر سے دیکھتے تو وہ حضور ﷺ کے دشمن ہو جاتے اور نہ اسلام پھیلتا تو کسی قوم کا جو معزز ہے اس کی عزت فرماتے تھے کیونکہ وہ قوم دیکھتی ہے کہ فلاں افسر ہے۔

فلاں حاکم ہے۔وہ ہمارے اس سردار کے ساتھ نمائندگی کا کیا معاملہ کرتا ہے۔ویولیه علیهم ، پھر جب وہ علاقہ مقبوضہ ہوجاتا تھا اور وہ شخص شرعاً نااہل نہ ہوتا قوم نے اسے نمائندہ بنایا ہوا ہوتا تو حضور ﷺ بھی اعلان فرمادیتے کہ ہماری طرف سے بھی یہی والی ہے کیونکہ کسی دوسرے کو قومی نمائندے پر ترجیح دینے سے بڑے فسادات کا خطرہ ہوتا ہے۔مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں۔بنگلہ دیش(۱) والوں نے منتخب کیا شیخ مجیب الرحمٰن کو، اب انہوں نے اسے معزز سمجھا تو انہوں نے کہا کہ ہمارا حاکم اور والی یہی ہوگا اور ادھر سے شور مچ گیا کہ نہیں ادھر تم ادھر ہم۔ پھر وہ جب کہتا ہے کہ میں پاکستانی ہوں اور پارلیمنٹ ایک ہوگا مجھے اپنی قوم نے چنا ہے تو تم کون ہو مجھے ہٹانے والے۔ اس سے سارا بحران آیا کتنا عظیم بحران کہ پاکستان دو ٹکڑے ہوگیا۔ پھر یہاں صوبہ سرحد میں لوگوں نے ایک پارٹی کو منتخب کیا اور بلوچستان میں دوسری کو منتخب کیا اور ادھر بھٹو صاحب نے اعلان کیا کہ ان کے گورنروں کو میں نہیں رہنے دیتا۔ان کے گورنر ہٹادیئے۔آپ کو پتہ ہے کہ دوسرا عظیم بحران اسی سے شروع ہوا۔اور یہ ساری رسہ کشی اب تک جاری ہے ورنہ جمعیت علماء اسلام، عوامی نیشنل پارٹی اور پیپلز پارٹی کا اتحاد ہوتا اور آگے یہ بحران نہ پیدا ہوا ہوتا تو سات سال کتنے استحکام اور ترقی سے گزرے ہوتے ملک کا نقشہ ہی اور ہوتا۔راتوں رات آرڈر آگیا کہ فلاں قوم کا حاکم ہٹادیا گیا۔ بزنجو ہٹ گیا اور ادھر وہ ناراض ہوگئے کہ یہ کون ہوتا ہے ہم نے جسے چنا ہے۔خراب ہے یا صحیح ہے۔ برا ہے یا اچھا ہے۔اب تم بھی اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھو۔ یہی صورت اگر حضور ﷺ کے فیصلوں میں ہوتی تو مسلمانوں کا شیرازہ تہس نہس ہوجاتا۔تو یہ بڑے قیمتی الفاظ ہیں''ویکرم کریم کل قوم'' حضور ﷺ ہر قوم کے معزز اور سردار، خان اور ملک جوان کا بڑا ہوتا اس کا احترام کرتے ویولیه علیهم اور اسی کو پھر ان کا نگران اور نمائندہ اور والی بناتے کہ چلو یہی گورنر ہے یہی نمائندہ ہے ہمیں بھی منظور ہے۔ جمہوریت، خوداختیاری اور شخصی ووٹ کا کتنا احترام کیا۔آپ ﷺ کا یہ رویہ ایک ادنیٰ سی جھلک ہے اور سبق ہے کہ ایک قوم نے ایک شخص کو منتخب کیا تو آپ ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں۔جب تک وہ بنیادی مقاصد کے خلاف نہ ہو تو اور اس کے ساتھ چلتے رہیں تب تو آپ کامیاب ہوں گے۔اگر آپ نے لاٹھی لی کہ نہیں ایسا نہیں

(۱) سقوط بنگلہ دیش کے المناک واقعات کو اشارہ ہے۔(اصلاح الدین)

ہوسکتا۔تو پھر وہ سیاست کامیاب نہیں ہوسکتی۔

اللہ کے عذاب سے ڈرانے والا: ویحذر الناس اور لوگوں کوڈراتے بھی تھے۔اللہ کے عذاب سے برائیوں سے اور ظلم سے کہ اس کے نتائج خراب ہیں۔ بداعمالی کے نتائج خراب ہیں۔محتاط رہو چوراچکوں سے محتاط رہو، تمام مضرچیزوں سے بھی محتاط رہا کرو۔ایسے سادہ لوح مت بنو کہ کوئی بکس اٹھا کرلے جائے کوئی کپڑے اٹھا کرلے جائے کوئی زمین پر قبضہ کرے، ہروقت محتاط اور بیداررہو، ویحترس منھم،خودبھی حضورﷺ بہت محتاط رہتے خودکولوگوں کے تکلیف یا نقصان سے محفوظ رکھتے تھے۔ ملاقاتی ہزاروں قسم کے آتے تو آپ دیکھتے کہ بُرے ارادہ سے تو نہیں آیا، یاکوئی ایسی بات میں کہوں کہ راز ظاہر ہوجائے اور کل یہ دوسری جگہ ساری بات پہنچادے تو آپ کے ساتھ تو ساری زندگی میں عوامی زندگی میں ایسے لوگ آئیں گے تو صحیح حکمران اور ایڈمنسٹریٹر وہ ہے جولوگوں کے بارے میں محتاط رہے۔اپنے آپ کی بھی حفاظت کرے بعض آدمی ہر قسم کی بات کہہ جاتا ہے ہر شخص کو یکدم دوست بنالیتا ہے ہر شخص کواپنا رازدان بنالیتا ہے آگے جاکراس کوٹھوکرلگتی ہے حالانکہ المومن لایخدع و لایُخدع کہ مومن نہ دھوکہ دیتا ہے اور نہ دھوکہ کھاسکتا ہے۔تو حضورﷺ خودبھی محتاط رہتے تھے اگرکسی کے بارے میں معلوم ہے کہ دشمن ہے اور خطرناک ہے پھراس کے سامنے میں کیوں ادھرادھرکی باتیں کروں لیکن آگے مکارم اخلاق کی ایک عجیب بات بھی ہے کہ جب ایک شخص آیا مشتبہ قسم کا ان کو پتہ بھی ہے کہ یہ گڑبڑقسم کا آدمی ہے ملاقات میں محتاط تو ہوگئے لیکن بشاشت میں اور ظاہری خلق میں اور چہرے کی بشاشت میں کوئی فرق نہ آتا۔ اسی طرح تپاک سے ملتے،اسی طرح محبت سے ملتے،اسی کو بیان فرمایا کہ ''من غیر ان یطوی عن احدٍ الخ'' کریمانہ رویئے میں بخل نہیں کرتے تھے۔

خوش خلقی اور بداخلاقی: حضورﷺ حضرت عائشہؓ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کسی نے کہا کہ فلاں شیخ آیا ہے ملاقات کیلئے تو حضورﷺ نے کہا کہ یہ بدترین آدمی ہے اپنی قوم کا شریرترین آدمی ہے۔تھا وہ خطرناک قسم کا،مطلب یہ بھی تھا کہ حضرت عائشہؓ بھی محتاط ہوجائیں کوئی ایسی ویسی بات نہ کریں حکومت تھی، نظام تھا۔غیبت کی نیت سے نہیں کہا بلکہ یہ کہا کہ یہ کس قسم کا آدمی ہے؟ پھر حضرت عائشہؓ پردے میں چلی

گئیں اور اس شخص کو بلایا جب وہ آیا تو حضور ﷺ بڑے تپاک سے ملے اور بڑے اخلاق عالیہ سے ملے جب وہ باہر چلا گیا حضرت عائشہؓ نے یہ منظر دیکھ لیا تھا تو حضور ﷺ سے کہا کہ آپ ﷺ نے تو فرمایا تھا کہ بڑا خطرناک آدمی ہے مگر آپ ﷺ تو اس سے بڑی محبت سے ملے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ بدترین آدمی وہ ہے جسے لوگ اس وجہ سے چھوڑ دیں کہ اس کا میل جول ٹھیک نہیں اس کی پیشانی پر بل آجاتے ہیں اور بدخلقی سے پیش آتا ہے۔

تو آپ ﷺ یہ نہیں کرتے تھے کہ ملتے وقت پیشانی پر بل آجائے چہرہ متغیر ہوجائے اور اخلاق میں فرق محسوس ہوجائے بلکہ کھلی پیشانی سے اور ہنسی سے محبت سے ملتے۔ ویتفقد اصحابه، اور غیر حاضر صحابہ کرامؓ کے حالات بھی دریافت فرماتے تھے جو صحابی نہیں آیا تو پوچھا کہ فلاں صحابی نظر نہیں آیا ان کی طبیعت کیسی ہے، ان کے گھر میں مریض تھا ان کا کیا حال ہے؟ ان کا فلاں مقدمہ تھا۔ ان کا فلاں مسئلہ تھا تو سارے ملک اور رعایا اور صحابہؓ ایک ایک کو کرید کرید کر حالات معلوم کرتے پھر کسی کی بیماری یا کسی تکلیف کا علم ہوتا تو حتی المقدور مدد فرمایا کرتے تھے اس تحقیق و تفتیش کو تفقد کہتے ہیں۔ جو مکارم اخلاق سے ہے۔

<u>بھلائی کی تحسین اور حالات حاضرہ سے اپنے آپ کو باخبر رکھنا:</u> ویسئل النّاس عمافی النـاس ،لوگوں سے یہ بھی پوچھتے کہ باہر حالات کیا ہیں جیسے آج کی اصطلاح میں کہیں کہ اخبار بھی پڑھتے، انٹیلی جنس کی رپورٹیں بھی اور یہ ساری معلومات تو ایک حکمران کیلئے ضروری ہیں تو حضور ﷺ کی مجلس میں جو بھی آتا اس سے پوچھتے کہ بھئی فلاں علاقہ میں اور فلاں قبائل میں گندم کا نرخ کیا ہے، خشک سالی تو نہیں ہے، بارش ہوئی ہے یا کوئی نئی صورت حال تو نہیں ہے اور بازار کے نرخ کیسے ہیں؟ اخلاقی حالت کیسی ہے، دینی حالت کیسی ہے، ملک کیسے حالات میں ہے، کہاں تک ترقی ہوئی ہے۔"یسئل النـاس عمافی الناس " یہ نہیں کہ ایک مولوی جو مسجد کے ایک گوشے میں بیٹھ جائے اور باہر سے آنکھیں بند کرلے بلکہ ایک صحیح بیدار اور منظم نظام تھا۔

<u>حزب اختلاف اور اختلاف میں اعتدال:</u> ویحسن الحسن ویقویه ،اچھی بات کی تحسین فرماتے اور اس کو تقویت پہنچاتے، یہ انسان کی ایک بڑی خوبی ہے ہم لوگ تو حزب اختلاف میں ہوجاتے

ہیں تو پھر لاٹھی لے لیتے ہیں کہ کوئی فرشتہ بھی ہے بس مارو کہ یہ خبیث سے بڑھ کر خبیث ہے اگر اس نے اچھا کام بھی کیا تو اچھا نہ کہیں کہ کوئی اچھائی نہیں مانتے اور اگر حزب اقتدار میں ہیں یا اس کے دوست ہیں تو اس کی ہر برائی اچھی اور قابل داد سمجھتے ہیں۔ تو حضور ﷺ یہ نہیں کرتے تھے۔ بھلائیوں کی تائید کرتے اور تحسین کرتے تھے۔ اچھائیوں پر شاباش دیتے، انعامات سے نوازتے اور حوصلہ افزائی کرتے۔ **ویقبح القبیح**، اگر برائی دیکھتے، قبیح دیکھتے، غلط کام دیکھتے تو اس کی تقبیح کرتے اس پر آنکھیں بند نہ کرتے، اچھے کو اچھا کہنا اور برے کو برا کہنا، اگر یہ دونوں پہلو ہیں تو پھر آپ اعتدال میں ہیں اور آپ کی بات کا اثر بھی ہوگا ورنہ لوگ کہیں گے یہ تو تعصب کی وجہ سے ہر وقت لاٹھی اٹھائے ہوئے ہے اور اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔

ویقبح القبیح، اور برائیوں اور قباحتوں کی تقبیح فرماتے، **ویوھیہ**، اور اسے کمزور کرنے کی کوشش کرتے کہ برائی کمزور ہو جائے اگر مٹ نہ سکے تو کچھ اس پر ضرب لگادو کسی حد تک تو اس کو کنٹرول کردو کچھ بریک تو اس کو لگادو۔ **معتدل الامر غیر مختلف**، دونوں لفظوں کا معنی قریب ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضور ﷺ سارے معاملات میں اعتدال میں ہوتے تھے میانہ روی ہوتی تھی اور بے اعتدال زندگی نہیں تھی۔ غیر مختلف اور متوازن شخصیت کے مالک تھے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ہر معاملہ توازن تھا نہ کہ تلون کہ آج کچھ کہا اور کل دوسری بات کہہ دی۔ اور بات کے بھی پکے تھے۔ بعض آدمی ہوتے ہیں صبح کو ایک فیصلہ کرتا ہے شام کو پھر دوسرا، دوپہر کو تیسرا لوگ کہتے ہیں کہ فلاں صاحب کان کے کچے ہیں اس کی یہی صورت ہے کہ رائے پر قائم نہیں رہ سکتا۔ ایک بات کر لیتا ہے بیچارہ دوسرا ملاقاتی آیا اس نے اس کا دماغ ادھر بدل دیا، تیسرا آیا ادھر یہ عموماً عقل کی کمی اور اخلاقی کمزوری کا اثر ہوتا ہے جو مداہنت اور عدم استقامت پر منتج ہوتا ہے۔ حضور ﷺ میں ایسی بات نہیں تھی مختلف نہ تھے اور پھر جب عزم کر لیا، ایک معاملے کو طے کر لیا پھر تردد نہیں ہوتا تھا، تلون مزاجی نہیں تھی۔ حضور ﷺ میں توازن اور تصلب واستقامت تھی۔

<u>حاکم کی ذمہ داری:</u> **ولا یغفل مخافۃ ان یغفلوا**، حضور ﷺ کسی وقت بھی امت کی خیر خواہی تذکر وارشاد اور دینی و دنیوی مصالح سے غافل نہیں ہوتے تھے ورنہ خطرہ تھا کہ امت بھی غفلت کا شکار ہو جائے کیونکہ چھوٹا بڑے کی متابعت کرتا ہے اسی سے سیکھتا ہے اگر حکمران اور حاکم اور اصلاح کرنے

والا لمبی تان کر سو جائے تو امت خود بخود غافل ہو جائے گی وہ کب بیدار ہو گی اور اگر حکمران بے غم اور بے فکر ہے اور ادھر روس اور امریکہ کیا کیا منصوبے بنا رہا ہے سرحدات کے اندر کیا اور سرحدات کے باہر کیا کیا سازشیں ہو رہی ہیں۔اس سے بے خبر ہو جائے تو قوم اور رعایا کب بیدار رہ سکے گی۔

<u>امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا لطیفہ:</u> ہمارے سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ صاحب کا ایک لطیفہ ہے عجیب شخصیت تھی بڑے انقلابی انسان تھے عظیم کام کیا۔امیر شریعت ان کو کہتے تھے تو یہ عوام دیہاتی کسان ''امیر شریعت'' وغیرہ الفاظ کو تو جانتے نہیں۔عمر بھر حضرت شاہ صاحبؒ بیچارے دین کے فکر میں لگے رہے جیلوں اور ریلوں میں زندگی گزاری۔شاہ صاحبؒ کی زندگی آزادی کی جدوجہد، دین کی تبلیغ اور ختم نبوت کی اشاعت میں گزری۔تو شاہ صاحبؒ نے فرمایا میں نے ان سے خود یہ لطیفہ سنا تھا کہ ایک دفعہ ایک جگہ میں سویا ہوا تھا تو ایک دو دیہاتی کاشتکار قسم کے لوگ آئے ملنے کیلئے۔انہوں نے جھانک کر دیکھا تو کہا کہ ''شریعت ستی پئی اے'' کہ شریعت تو سوئی پڑی ہے اب شاہ صاحبؒ نے کہا کہ میں نے سن لیا تو اس جملے سے مجھ پر ایسی چوٹ لگی کہ گویا کسی نے چھرا گھونپ دیا ہو۔میں نے اللہ کی طرف سے یہ بات سمجھ لی کہ اچھا اگر ہم اسی طرح لمبی تان کر سو جائیں اور غافل ہو جائیں اور عیش و عشرت میں لگ جائیں تو پھر تو ساری شریعت سو جائے گی۔اگر مولوی صاحب معاشرے سے بالکل بے فکر ہو گیا تو شریعت کا کیا ہو گا؟ اسی طرح ایک حکمران نے اگر اپنے علاقے میں غفلت برتی یا کوئی افسر بے فکر سو گیا، دروازہ بند کر دیا کہ چلو یار جانے دو تو کیا حالت ہو جائے گی۔

تو حضور ﷺ کے بارے میں فرمایا کہ **ولا یغفل مخافة ان یغفلوا**، حضور ﷺ کسی لمحہ بھی غافل نہیں ہوتے تھے کہ مبادا سارے لوگ بھی غافل ہو جائیں گے۔

اویـمـلّـوا، ایک نسخہ میں ویملّوا ہے۔یعنی امت کی غفلت کے خوف سے اور امت کی سُستی اور تھک جانے کے خوف سے خود بھی غفلت سے بچتے تھے۔مطلب یہ ہے کہ اگر آپ ﷺ مسلسل امت کی ڈھارس نہ باندھیں تو وہ بھی حوصلہ ہار بیٹھیں گے اور تکلیفات شرعیہ سے درماندگی کا مظاہرہ کر لیں گے جبکہ بعض نسخوں میں اویملّوا ہے ''او'' یہاں تنویع کیلئے ہے کہ کچھ لوگ غفلت اور کچھ درماندگی کا شکار ہو جائینگے

بعض نسخوں میں اویملوا ہے،جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ غفلت برت کر مسلسل دستگیری نہ فرمائیں تو امت جادۂ حق سے باطل کی طرف اور دیگرادیان کی طرف مائل ہوجائے۔اس لئے آپ ﷺ کبھی بھی ان کو مہمل چھوڑنے پرآمادہ نہ ہوئے۔

جبکہ بعض نسخوں میں ہے کہ ''ولایفعَل مخافة ان یفْعلوا فیملوا ''یعنی''ولایفعل العبادہ مخافة الخ ''پھر مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ عبادات میں اعتدال سے کام لیتے اورغلو سے اس لئے پرہیز کرتے کہ صحابہ بھی آپ ﷺ کی اتباع میں غلو سے کام لیتے اور پھر بالاخر عاجز آکر اسے چھوڑدیتے۔جس طرح ایک حدیث میں آتا ہے کہ خذوامن الاعمال ما تطیقون فان اللّٰہ لایملّ حتی تملّوا۔

لکل حال عندہ عتاد،عتاد عین کے فتح کے ساتھ اورعدۃ عین مضموم کے ساتھ ہم معنی الفاظ ہیں۔اس کے معنی تیاری کے بھی آتے ہیں کسی کام کوسرانجام دینے کے اسباب ووسائل پربھی اس کا اطلاق ہوتا ہے مثلاً جنگ کیلئے سامان جنگ عُدہ اورعتاد ہے۔

اب معنی یہ ہے کہ زندگی کے مدارج طے کرنے میں آپ ﷺ کے پاس ایک لائحہ عمل اور منظم تیاری تھی۔یہ نہیں کہ جیسے گزرے گزارا کرنا ہے۔بعض لوگوں نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ احکام اسلام میں سے ہر حکم کیلئے آپ ﷺ کے پاس ایک دلیل موجودتھی۔بعض نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ عبادات ومعاملات میں سے ہرچیز کیلئے آپ ﷺ تیاررہتے اورایک منظم زندگی گزارتے تھے یعنی ہرکام کیلئے آپ ﷺ کے ہاں ایک خاص انتظام تھا۔ہرچیز کیلئے حضور ﷺ کا ایک ٹائم ٹیبل تھا لوگوں کومعلوم ہوتا کہ اس منٹ پر جاگتے ہیں اس منٹ پرسوتے ہیں اس منٹ پر باہرتشریف لاتے ہیں یعنی ہرچیز ڈسپلن کے مطابق ہوم خواہ سفر ہو یا حضر، جنگ ہویاامن لایقصرعن الحق ولایجاوزہ ،حق کہنےاوراسے قائم کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے تھے اورنہ حق سے تجاوز کرتے۔حق کے حدود متعین تھے لیکن ایک لحہ اس سے متجاوز نہیں ہوتے تھےاورنہ کسی اور کوحق سے تجاوز کرنے دیتے تھے۔توامرحق میں کسی طرح کوتاہی تھی نہ حد سے تجاوز فرماتے۔یاپھرحق سے استحقاق مراد ہوتو معنی یہ ہے کہ صاحب حق اگرحق طلب کرتے تو اس میں کوتاہی نہیں کرتے تھے لیکن استحقاق سے زیادہ بھی نہیں دلواتے تھے۔

افضلیت،ہم نشینی کامعیار: الذین یلونه من النّاس خیارهم ،جوحضورﷺ کے زیادہ قریب تھے بیٹھنے میں اور تعلقات اور دوستی میں وہ لوگ ہوتے تھے۔جو نیک ترین ہوتے تھے جولوگ بہترین اور خیر اور دینی لحاظ سے،علمی لحاظ سے،اخلاقی لحاظ سے اونچا مقام رکھتے تھے وہ قریب ترین ہوتے تھے۔حضورﷺ نے درس میں بھی یہ حکم دیا تھا''لیلنی منکم اولوا الاحلام و النهی'' جوذہین ہیں جوعقل وفکر والے ہیں جومدبر ہیں وہ مجھ سے قریب ترین بیٹھا کریں کیونکہ ذہین اور عقلمند طلبہ علوم زیادہ حاصل کر سکتے ہیں۔ افضلهم عنده اعمهم نصیحة،حضورﷺ کی نگاہ میں لوگوں میں اچھااور افضل اور پسندیدہ کون ہوتا؟ کیایہ معیار تھا کہ جس کی موٹریں بہت ہوں یا کارخانہ دار ہو، یا بہت بڑا افسر ہو یا کوئی سرکش غنڈہ ہے طاقت والا ہو بدمعاش ہو؟ نہیں ہرگز نہیں۔ہم تو انہی لوگوں کو دوست بناتے ہیں حضورﷺ کی نگاہ میں افضلیت کا یہ معیار تھا کہ جس کی خیرخواہی عام ہو جس کا فیض لوگوں کوزیادہ پہنچتا۔جس کا خیر عام ہوتا وہ حضورﷺ کے قریب ترین ہوتا۔نصیحت کہتے ہیں خیرخواہی کو تو مخلوق کی خیرخواہی اور بھلائی کیلئے جوزیادہ دوڑ دھوپ کرتا تھا،جوزیادہ محنت کرتا تھا جس کا فیض زیادہ پہنچتا تھا وہ حضورﷺ کی نگاہ میں سب سے زیادہ افضل ہوتا واعظمهم عندهٗ منزلةً احسنهم مواساةً وموازرةً اور حضورﷺ کی نگاہ میں افضل انسان، اونچا انسان وہ ہوتا تھا قدرومنزلت کے لحاظ سے جوان سب لوگوں میں اچھا ہوتا تھا غم خوارگی اور معاونت کے لحاظ سے۔

مواساۃ دراصل مہموز ہے ہمزہ واو سے بدل دیا جاتا ہے آسیٰ یؤاسی مواساة تسویةً کے معنی میں بھی مستعمل ہے کسی کو اپنے ساتھ برابر کرنا مؤاسات ہے آسیٰ بماله کا معنی مالی امداد سے کسی کو اپنا ہمسر بنانا نیز آسیٰ فلاناً بمصیبةٍ کا معنی کسی کی مصیبت میں اس کوتسلی دینا بھی ہے چونکہ یہاں مطلقاً مستعمل ہے۔اس لئے مراد یہ ہوسکتا ہے کہ کسی کی پریشانی کو اپنی پریشانی سمجھ کر اس کی مدد کرنا۔

جبکہ موازرۃ اَزَرَ سے ہے جس کے معنی قوت کے ہیں یہ بھی مہموز ہے۔قرآن میں ہے''اشدد به ازری'' یعنی ہارونؑ کی نبوت سے میری قوت میں اضافہ کیجئے۔حدیث میں ورقہ بن نوفل کا قول ہے''انصرک نصراً مؤزرًا''یعنی نصراً شدیداً قویًا یہاں تقویت اور معاونت مراد ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جو شخص مخلوق خدا کی ہمدردی، غمگساری اور لوگوں کی معاونت میں پیش پیش ہوتا جو تکلیف و پریشانی میں غریبوں اور غمزدہ لوگوں کی مدد کرتا وہ ہی نبی کریم ﷺ کی نظر میں سب سے عظیم المرتبہ انسان ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب دوسروں میں یہی خوبیاں آپ ﷺ کو پسند تھیں تو خود ان اوصاف کو بدرجۂ اتم اپنائے ہوئے ہونگے۔

قال فسألته عن مجلسه، پھر حضرت حسینؓ نے فرمایا کہ میں نے اپنے ابا سے پوچھا کہ حضور ﷺ مجلس میں تشریف فرما ہوتے تو کیا طور طریقے اختیار فرماتے۔ ظاہر ہے کہ نبی کریم ﷺ میں بے انتہا عاجزی تھی وہ اپنے لئے شان و شوکت پسند نہیں کرتے تھے اور باوجود اس کے کہ آپ ﷺ سربراہ مملکت ہو گئے تھے۔ آپ ﷺ تکبر و رعونت سے پاک تھے۔

<u>مصنوعی پروٹوکول:</u> سارے پروٹوکول ہم نے جو اپنے لئے مصنوعی بنا رکھے ہیں۔ اپنے اور اپنی رعایا کے درمیان اتنے بڑے بڑے حجاب اور دیواریں کھڑی کر دی ہیں اور جو بیوروکریسی کا نظام ہم نے بنایا ہے یہ سب چیزیں اپنے لئے حضور ﷺ پسند نہیں فرماتے تھے بلکہ جب صحابہؓ ان کیلئے اٹھتے تھے تو حضور ﷺ فرماتے ''لاتقوموا کما تقوم الاعاجم '' وہ اس پر خوش نہیں ہوتے تھے کہ لوگ میرے آنے پر اٹھیں جیسا عجمی لوگ اٹھتے ہیں۔ اسی طرح سلامیں اور سلوٹیں مزاج مبارک کے خلاف تھیں غالب شان شان عبدیت تھی۔ حضور ﷺ کی عظمتیں آسمانوں تک، عرش تک پہنچتی تھیں لیکن شان و شوکت کسی چیز میں پسند نہیں۔ راستہ میں حضور ﷺ صحابہ کے ساتھ چلتے۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ضروری نہیں تھا کہ وہ آگے چلیں اور ہم پیچھے پیچھے بلکہ کبھی ہمارے ساتھ ساتھ چلتے کبھی اتفاقاً آگے چلتے کبھی پیچھے چلتے۔ کسی سفر میں جب قافلہ کسی منزل پر ٹھہر جاتا جب صحابہؓ کام کاج میں لگ جاتے تو صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم منع کرتے لیکن حضور ﷺ بھی ہمارے ساتھ کام میں لگ جاتے تھے۔ لکڑی جمع کر رہے ہیں، لکڑی جلا رہے ہیں، پانی بھر کر لا رہے ہیں سب کاموں میں صحابہؓ کے ساتھ شریک ہیں۔ یہ بتانے کیلئے کہ میں بھی تمہاری طرح ایک انسان ہوں تو اب جب منزل یعنی کسی مجلس میں اور نشست گاہ میں تشریف لاتے اور اٹھنا بیٹھنا ہوتا تو وہ کیسے ہوتا؟ فقال کان رسول اللہ لایقوم ولایجلس الاّ علیٰ ذکر ، حضور ﷺ کا اٹھنا بیٹھنا سب کچھ اللہ کے کاموں

کیلئے دین کیلئے تھا۔مسلمانوں کی بھلائی کیلئے تھا۔یہ بھی ذکراللہ ہے لیکن شراح نے یہاں لسانی ذکرمراد لی ہے یعنی اٹھتے بیٹھتے آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کو یاد فرماتے جو کہ بڑی عبادت ہے۔

مجلس میں بیٹھنے کے آداب: **واذاانتھٰی الی قوم**، جب کسی مجلس میں تشریف لے آتے اور پہلے سے اور لوگ بیٹھے ہوتے **جلس حیث ینتھی بہِ المجلس** ،جہاں مجلس کا آخری سرا ہوتا وہیں بیٹھ جاتے۔ یہ نہیں کہ لوگوں کے کاندھوں پر پھلانگ کرآگے جاتے اور خصوصی نشست تک لازماً پہنچتے بلکہ کسی مجلس میں حضور ﷺ تشریف لاتے تو جہاں جگہ خالی ہوتی وہیں بیٹھ گئے۔یہ الگ بات ہے کہ جہاں وہ بیٹھ گئے تو وہی میر مجلس ہوتے تھے اور وہی جگہ صدارت کی مسند بن جاتی۔**ویامرُ بذٰلک**، باقی لوگوں کو بھی منع کرتے کہ جب تم کسی مجلس میں آؤ تو یہ نہ کرو کہ تم لوگوں کے کاندھوں پر پھلانگ جاؤ اور جاکر اپنی مخصوص نشست پر، اسٹیج پر اور کرسی پر بیٹھ جاؤ بلکہ جہاں جگہ ملے وہیں بیٹھ جاؤ۔سب انسان برابر ہیں اس کو تخطی رقاب کہا گیا ہے جو ناجائز ہے تو خود بھی اسی پر عمل تھا اور دوسروں کو بھی یہی امر تھا(۱)۔

وفود کے ساتھ انداز تخاطب: **یعطی کل جلسائہ بنصیبہ** "یعطی" کا مفعول ثانی خود بنصیبہ ہے اور اس کا باء زائد ہے۔تحسین کلام کیلئے آیا ہے جبکہ بعض شراح نے مفعول ثانی پر باء کے زیادت کو مستبعد قرار دیا ہے۔

لایحسب جلیسہ ان احدااکرم علیہ منہ ،یہ خاص بات ہے کہ اخلاق عالیہ کی وجہ سے ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ میں حضور ﷺ کے سب سے زیادہ قریب ہوں۔ہر شخص یہ کہتا تھا کہ میرے ساتھ خصوصی دوستی ہے اور مجھ سے بڑھ کر کوئی ان کو عزیز نہیں۔اس رویئے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ صحابہ کرام میں تحاسد و بغض پیدا نہیں ہوا۔جیسا کہ عموماً بادشاہوں کے مصاحبوں میں پیدا ہوتا ہے۔جب ہر کسی کو یہ خیال ہو کہ میں ہی نبی کریم ﷺ کا چہیتا ہوں،عزیز ہوں،تو حسد کس کیساتھ ہوگی۔یہ معمولی چیز نہیں ہے مکارم

---

(۱)احادیث میں آپ ﷺ نے اس کا صراحۃً امر دیا ہے مثلاً طبرانی اور بیہقی نے شیبہ بن عثمان سے روایت کیا ہے کہ "**اذاانتھیٰ احدکم الی المجلس فان وسع لکم فلیجلس والاّ فلینظر الی اوسع مکان یراہ فلیجلس فیہ**"(جمع ۲/۱۸۰)(اصلاح الدین)

اخلاق کی انتہا ہے کہ ہر ایک کے ساتھ ایسا سلوک اور ایسا برتاؤ ہو کہ وہ انسان یہ سمجھے کہ بس میں ہی سب سے زیادہ محبوب اور مقرب ہوں۔

<u>صبر کا عمدہ نمونہ:</u> من جالسه او فاوضه فی حاجةٍ صابرة حتی یکون هوالمنصرف ،

مفاوضہ کا معنی یہاں مراجعت کے ہیں یعنی اگر کوئی شخص حضور ﷺ کے پاس آ کر بیٹھ گیا مہمان بن کر یا کسی معاملہ میں کوئی ضرورت لیکر حضور ﷺ کے پاس چلا آیا اب حضور ﷺ کی تو عظیم مصروفیات تھیں۔ایک طرف امور مملکت ہیں، جہاد کے امور ہیں، مسلمانوں کے حالات تجاویز و مشورے عبادت گھریلو مسائل، وفود کا آنا جانا ایسے شخص کا تو ایک ایک منٹ قیمتی ہوتا ہے۔لیکن ادھر صبر کا یہ عالم ہے اور اخلاق اتنے اونچے ہیں کہ ایک شخص بھی اگر آ کر بیٹھ گیا جیسے بعض آدمی آ کر دھرنا مار کر بیٹھ جاتے ہیں۔اب اس کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ میں کتنے عظیم شخص کے پاس بیٹھا ہوں وہ تو اپنے گپ شپ میں لگا رہتا ہے اور پھر سمجھتا ہے کہ چلئے آج ہی موقعہ ملا ہے تو عموماً مصروف لوگ تو جلدی سے کہہ دیتے ہیں کہ دو منٹ ہیں ملاقات کے ادھر گھنٹی بجاتے ہیں کہ بس اٹھو مگر حضور کو ہم سے زیادہ ہزاروں ذمہ داریاں تھیں اور ضروریات اور مسائل تھے باوجود اس کے وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ چلئے مجلس برخاست ہے۔پریشانی بھی ہوتی تھی لیکن مروت وحیا کی وجہ سے جب تک وہ بیٹھا رہتا تھا حضور ﷺ بھی اپنے نفس پر قابو رکھتے۔صابرہ(۱) کے لفظ میں یہ سب کچھ موجود ہے کہ مشکل کام ہے لیکن صبر کرتے تھے سخت حالات پر بھی صبر جب تک ملاقاتی نہ کہتا کہ میں جاتا ہوں تو حضور ﷺ نہیں کہتے تھے کہ چلئے جناب میرے اور بھی تو کام ہیں۔کسی نے اگر ہاتھ ملایا حضور ﷺ کے ساتھ تو حدیث میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے خود ہاتھ نہیں کھینچے جب تک اس نے ہاتھ نہیں کھینچا تاکہ وہ محسوس نہ کرے کہ ان کے ہاں میری اہمیت نہیں۔

تو آپ ﷺ اپنے نفس کو روکے رکھتے تھے کہ جب تک وہ خود اٹھ کر نہ جاتے حضور ﷺ کے چہرہ مبارک اور پیشانی پر کوئی بل بھی نہ آتا نہ یہ کہتے کہ بس آپ کا کام ہو گیا اب جائیں۔

---

(۱) صابرہ مصابرۃ سے ہے اکثر شراح نے مفاعلہ کو مغالبہ کیلئے لیا ہے یعنی آپ ﷺ ایسے وقت میں دوسروں پر صبر میں غالب آجاتے تھے۔لیکن شاید حضرت الاستاذ کو ملا علی قاری کی رائے پسند ہو جنہوں نے یہاں پر مفاعلہ کو مغالبہ کی بجائے مبالغہ کیلئے لیا ہے۔واللہ اعلم (اصلاح الدین)

ایک بڑھیا نے آواز دی کہ میرا ایک کام ہے۔آپ کے ساتھ بوڑھی عورت تھی۔حضور ﷺ نے کہا اے ماں مکے کی جس گلی میں تو مجھے پکارے گی میں خود پہنچ کر آجاؤں گا۔رات کو بلائے گی دن کو بلائے گی جس جگہ تمہارا گھر ہے بس مجھے اطلاع دینے کی ضرورت ہے۔آنے کی تکلیف مت کیا کرو، میں خود پہنچ جاؤنگا۔

سائل کی حاجت برآری: من سالہ حاجۃ لم یردّہ الابھا، اگر کسی شخص نے کوئی چیز مانگی کوئی حاجت لے کر آیا کوئی مسئلہ لے کر آیا۔حضور ﷺ کوشش کرتے کہ وہ اس کی حاجت پوری کر کے اسے واپس کردے۔بغیر مقصد برآری کے اس کو نہیں چھوڑتے تھے۔کسی نے کپڑے مانگے، کسی نے کھانا مانگا۔تو جو بس میں ہوتا تھا وہ دے دیتے۔اور کبھی کبھی انسان کے بس میں کچھ بھی نہیں ہوتا یا طالب حاجت کی ضرورت صحیح نہیں ہوتی۔مطالبہ غلط ہوتا ہے یا پورا نہیں کر سکتے ہیں تو پھر ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔ مگر آپ ﷺ ہرگز ایسا نہیں کرتے تھے بلکہ اوبمیسور من القول (۱)، جب کچھ نہ ہوتا تو پیار اور محبت کی باتوں کے ساتھ اس کو رخصت کرتے تھے۔نرمی اور یسر کے ساتھ ان کو سمجھا دیتے کہ یہ چیز ہمارے بس کی نہیں نہ ہم پوری کر سکتے ہیں اور اس کو اچھے طریقے سے واپس کر دیتے تھے۔

قدوسع الناس بسطہ و خلقہ، خلاصہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کی بشاشت اور رحمت اور کھلی پیشانی تمام عالم پر محیط ہوگئی تھی۔اس نے گویا سارے بنی نوع انسانیت کو اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔ان کے اخلاق اور ان کی بشاشت ساری مخلوق کو سمو چکی تھی کوئی اس سے محروم نہیں رہا۔

حضور ﷺ نوع انسانیت کیلئے بمنزلہ باپ: فصار لھم ابًا ،حضور ﷺ تمام بنی نوع انسان کیلئے شفقت ورحمت میں باپ کی طرح بن گئے۔

---

(۱) المیسور مصدر علی وزن المفعول ضدالمعسور یسر کے معنی میں ہے یہاں صفت واقع ہوا ہے یعنی قول میسور کے ساتھ واپس کرتے مطلب یہ ہے کہ ”قل لھم قولا میسوراً“ پر عمل کرتے ہوئے آسان اور خوبصورت انداز سے واپس کر دیتے۔مثلاً اگر مطلوب چیز موجود نہ ہو تو وعدہ کر دیتے کہ جب میرے پاس کوئی چیز موجود ہوگی تو بخش دوں گا۔اسی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلافت کے پہلے ایام ہی میں حضور ﷺ کے ڈھیر سارے وعدوں کو پورا کرنے کا شرف حاصل ہوا۔(اصلاح الدین)

وصاروا عنده فی الحق سواء ،اور سارے انسان حضور ﷺ کی نگاہ میں حقوق کے لحاظ سے برابر تھے۔ یہ نہیں کہ ایک کا حق تو پورا ہو جائے اور دوسرا محروم رہے۔ وہ میرا قریب ہے یا عزیز ہے اس کے تعلقات ہیں اس کی دوستی ہے۔ اگر کسی کا کوئی حق ہے تو اس کو ضرور ملتا۔ تو سارے انسان ان کے نگاہ میں بالکل برابر ہیں یعنی کوئی ترجیح اور کسی کو محروم کرنا اور کسی کو نوازنا نہیں تھا۔

مجلسه مجلس علم وحیاء وامانة وصبر ،مجلس کیا تھی مجلس علم تھی ،لوگوں کی حجروں میں اور بیٹھکوں میں جو یہ گپ شپ یہ ہنگامے اور یہ خرافات ہوتے ہیں تو یہ باتیں نہ تھیں بلکہ حضور ﷺ کی مجلس اور صحابہ کی مجلس علم کی مجلس تھی حیا اور امانت کی مجلس تھی اور صبر کی مجلس تھی یہ نہیں کہ ایک بات کرتا ہے ابھی اس نے بات ختم نہیں کی دوسرا شور مچاتا ہے۔ ایک کہتا ہے میں پوچھتا ہوں دوسرا کہتا ہے میرا پہلا حق ہے اور ایک کہتا ہے میں تنگ ہو گیا ہوں بابا، باہر جاتا ہوں تو یہ صورت نہیں تھی بلکہ پورے وقار، ادب اور سکون کا ماحول ہوتا تھا۔

<u>اقوام عالم کی تاریخی اسمبلی:</u> ایک روایت میں آتا ہے حضور ﷺ کے ہاں قطع کلامی نہیں تھی جب ایک صحابی بات کرتا تھا تو سارے خاموشی سے سنتے تھے ایسی پارلیمنٹ اور ایسی اسمبلی اقوام عالم کی تاریخ میں نہیں ملتی وہاں قطع کلامی نہیں ہوتی تھی وہاں غصے میں آپے سے باہر ہو کر ایک آدمی دوسرے پر حملہ نہیں کرتا تھا۔ گالی گلوچ نہیں کرسیاں نہیں چلتیں۔ جو کچھ یورپ کی بنائی گئی اسمبلیوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ ممبر لوگ تشنیع وتنقید بڑی بے صبری سے کرتے رہتے ہیں۔ یہاں ہر شخص پر سکون اور پر وقار ہے۔ حقیقت میں یہ مثالی پارلیمنٹ ہے۔ بڑے بڑے مسائل ہیں مگر اس پارلیمنٹ کی یہ حالت ہے نیز فرمایا کہ وہ امانت کی مجلس ہوتی تھی ایک اور روایت میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ مجالس بھی امانت ہیں (۱)۔

مال و دولت سونا چاندی یہ امانت ہیں تو ہر مجلس ایک امانت ہے۔ امانت میں خیانت کرنا عظیم ظلم ہے۔ مجلس میں بھی ہزاروں باتیں پیش آتی ہیں۔ کسی کی خامیاں سامنے آجاتی ہے۔ آپ مجھے مجلس میں کسی

---

(۱) المجالس بالامانة مرفوع حدیث ہے۔ اخرجه الخطیب فی تاریخه عن علیؓ وروی ابو ذر عن جابرؓ مرفوعاً المجالس بالامانة الا ثلاثة مجالس سفک دم حرام او فرج حرام او اقطاع مال بغیر حق نیز امام ترمذیؒ نے ابواب الادب میں ترجمۃ الباب میں اس کا ذکر کیا ہے۔ (اصلاح الدین)

کا راز اور کسی کی خامی اور کمزوری بتا دیتے ہیں اور میں اسے آؤٹ کردوں یہ میں نے گویا امانت میں خیانت کردی۔ مجلس کی باتیں باہر نہیں پھیلائی جاتیں۔ خلاصہ یہ کہ آپ ﷺ کی مجلس میں علم حیاء امانت اور صبر کا کامل نمونہ دیکھنے کو ملتا۔ بعض نسخوں میں علم کی جگہ حلم کا لفظ پایا جاتا ہے جس کا معنی برداشت اور عقلمندی سے کیا گیا ہے۔

لاترفع فیہ الاصوات، اس مجلس میں اس پارلیمنٹ میں ایک وسرے پرآوازیں اونچی نہیں ہوتی تھیں یہ نہیں کہ ایک باتیں کررہا ہے دوسرا اس کی بنسبت زور زور سے اور چیخ چیخ کر بولتا ہے کہ پہلے مجھے باری دوتا کہ میری تقریر یہ لوگ سن لیں اور دوسرے کی آواز دب جائے۔ موجودہ دور کی اسمبلیوں والی صورت نہ تھی۔ صحابہ کرامؓ کی کیفیت مجلس میں کیسی ہوتی تھی ایک حدیث میں آتا ہے **کانّما علی رؤوسھم الطیر**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **یاایھاالذین اٰمنوا لاترفعوا اصواتکم فوق صوت النبیّ (الایۃ)** کہ نبی کی آواز سے تیری آواز اونچی نہ ہونے پائے۔

ولاتؤبن فیہ الحرم، عزت اور آبرو ایک دوسرے کی داغدار نہیں کی جاتی تھی۔ **أبن یابن أبناً** کے معنی ہیں عیب بتلانا اور حُرم حُرمہ کی جمع ہے جس کا معنی ہے ہر قابل احترام اور قابل حفاظت چیز عموماً اس کا اطلاق گھر والی اور دیگر اہل وعیال پر ہوتا ہے۔ چنانچہ دست درازی اور زبان درازی سے کسی کی عزتوں، عصمتوں، آبروؤں کو داغدار بنانے کو تابین کہتے ہیں گویا اس مجلس میں عیب جوئی اور نکتہ چینی نہیں کی جاتی تھی۔ آپس میں ایک دوسرے کی عزت اور حرمت پر۔

ولاتنثیٰ فلتاتہ، نثاینثو پھیلانے، اشاعت وتشہیر کو کہتے ہیں۔ اور فلتات فلتۃ کی جمع ہے جس کے معنی ہفوات اور خلاف ادب باتوں کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ لغزشیں ہر مجلس میں ہوتی ہیں۔ کوتاہی ہر انسان سے ظاہر ہوتی ہے تو مجلس کی لغزشیں وہیں دبادی جاتی تھیں یہ نہیں کہ ہم نے ایک خامی یہاں ایک مجلس میں دیکھی اور پھر باہر اس کو پھیلاتے رہے دہراتے رہے۔ اس کے پھیلانے کو نثو کہتے ہیں۔ مثلاً کسی کی سبقت لسانی کی وجہ سے غلط لفظ نکل گیا یا کسی ساتھی سے مجلس میں کوئی شرمناک قسم کا کام ہوگیا تو یہ نہیں کہ اب سارے جاکر باہر ڈھول پیٹ رہے ہیں کہ فلاں نے اس مجلس میں ایسی حرکت کی بلکہ کوئی لغزش کوتاہی تقریر

میں عمل میں کسی سے ہوتی تو وہ وہیں دب جاتی تھی۔اس کمرے سے باہر وہ بات نہیں پھیلائی جاتی تھی لیکن بعض شراح نے یہ لکھا ہے کہ یہاں پر خود فلتات کی نفی مقصود ہے تو گویا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مجلس میں سرے سے فلتات یعنی ہفوات اور نامناسب بات ہوتی ہی نہ تھی۔اسی لئے اس مجلس کی کوئی بیہودہ قسم کی بات پھیلانے کا کسی کو بھی موقع نہیں ملتا تھا۔

متعادلین بل کانوا یتفاضلون فیہ بالتقویٰ متواضعین، ''متعادلین'' کانوا مقدر کا خبر واقع ہوا ہے یعنی کانوا متعادلین ،تعادل سے اسم فاعل ہے جس کا معنی ہے ایک دوسرے کو برابر سمجھنا، مطلب یہ ہے کہ صحابہ مجلس میں ایک دوسرے کو برابر جانتے تھے۔ان میں نسبی تعلق اور خاندانی برتری کا گھمنڈ نہیں تھا بلکہ تقویٰ ہی سبقت کی بنیاد تھا۔''**متواضعین**''منصوب ہے ترکیب میں حال واقع ہوا ہے۔ **یتفاضلون** کی ضمیر سے یعنی اس حال میں کہ ایک دوسرے کیلئے تواضع اور عاجزی اختیار کرتے تھے۔اس کلام کا خلاصہ یہ ہوا کہ آپس میں بالکل عدل وانصاف کرنے والے تھے۔ ایک کو دوسرے پر برتر سمجھنے والے نہ تھے کہ کوئی دوسرے کو نیچا سمجھے حسب اور نسب کے لحاظ سے کسی کو اونچا سمجھنا کسی کو نیچا سمجھنا یا مال و دولت کی وجہ سے درجہ بندی کرنا کہ یہ فسٹ کلاس ہے اور یہ سیکنڈ کلاس ہے یہ تھرڈ کلاس ہے تو یہ چیزیں نہیں تھیں۔سب متعادلین تھے دولت اور مادی چیزوں کے لحاظ سے یہ امتیازات قائم نہیں کرتے تھے سب صحابہ برابر تھے ہاں **یتفاضلون فیہ بالتقویٰ** ایک کو دوسرے پر اگر فضیلت تھی، احترام کیا جاتا تھا،اور اہمیت تھی تو تقویٰ کے لحاظ سے جو اللہ سے زیادہ ڈرتا تھا اور اس میں خوف خداوندی ہوتا تھا اس کو فضیلت والا اور اس کو کلاس ون سمجھا جاتا تھا اور کوئی دوسری حیثیت درجہ بندی نہیں کرتی تھی۔

یوقرون فیہ الکبیر ،اس پارلیمنٹ اور مجلس میں احترام کیا جاتا تھا۔بڑوں کا کوئی بوڑھا آتا ہے، کوئی معمر آتا ہے، بزرگ آتا ہے، تو صحابہ کرامؓ احترام کے ساتھ پیش آتے۔حضور ﷺ نے خاص اہتمام سے بڑوں کے ادب کا حکم دیا ہے کہ ان کی عزت کرو اور فرمایا **من لم یؤقر کبیرنا فلیس منا** ، دوسری جگہ فرمایا کہ جس نے ہمارے چھوٹوں پر شفقت نہ کی اور بڑوں کی عزت نہ کی تو ہم میں سے نہیں۔تو یہاں صحابہؓ سب ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے اور بڑوں کا احترام تھا۔**ویرحمون فیہ الصغیر** ،

اور جو چھوٹے ہوتے تھے ان پر رحم اور شفقت فرماتے تھے۔ ویوثرون ذا الحاجة، اور اگر کوئی محتاج ہو ضرورت مند ہو تو اس کو ترجیح دیتے تھے۔ مثلاً ایک شخص آیا ہے وہ ایمرجنسی میں مبتلا ہے اور پریشانی میں ہے تو وہ کہتے تھے کہ بھائی پہلے اس کا نمبر ہے اس کی ضرورت مقدم ہے۔ صحابہ دیکھ لیتے تھے کہ اس کی حاجت زیادہ ہے تو فیصلہ کرتے تھے کہ یہ اپنا معاملہ پہلے پیش کردے کیوں کہ اس کی ضرورت زیادہ اہم ہے۔ ہم بعد میں ملاقات کرلیں گے۔

ویحفظون الغریب ، اور جو پردیسی اس مجلس میں آجاتا تھا اور اجنبی اور مسافر اور نئے لوگ تو ان کی پوری نگہداشت اور حفاظت کرتے تھے یعنی ان کے آرام وراحت اور کھانے کا انتظام کرنا گھروں میں لے جانا ان مسافروں کا حق سمجھا جاتا تھا اور اس کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ یا یہ مقصد ہے کہ صحابہ تلاش میں ہوتے تھے کہ کسی پردیسی مسافر اور اعرابی کو لے آئیں تا کہ وہ کچھ بات پوچھے۔ صحابہ کرام حضور ﷺ کے ساتھ بہت سی باتیں کرنا چاہتے تھے لیکن ادب اور عظمت اور حرمت ایسی تھی کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ جیسے صحابہ کو بھی ہمت نہیں ہوتی تھی دیہاتی اور گنوار قسم کے لوگ سب کچھ پوچھ لیتے تھے۔ وہ تو آداب سے بے خبر سیدھے سادے تھے۔ صحابہ انتظار میں ہوتے کہ آج نئی باتیں معلوم ہوں گی۔ پردیسی تو اس ڈھنگ وآداب کو نہیں سمجھتے۔ باہر سے کھڑے ہو کر زور زور سے پکارتے یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ''اخرج الینا'' اے محمد (ﷺ) باہر نکلو ہمیں بتلا دو کہ فلاں مسئلہ کیسا ہے۔ کوئی آکر پوچھتا اور کہتا کہ سیدھی سادی باتیں بتادو لمبی چوڑی نہیں بس دو جملے۔ دور دراز سے آیا ہوں ایسی باتیں کہ میں اس کو حفاظت سے یاد رکھ سکوں اور اس پر عمل کرسکوں۔ تو دیہاتی لوگ اس انداز میں ایسے ایسے سوال کرجاتے تھے تو صحابہؓ خوش ہوجاتے تھے کہ ہم سے تو یہ نہیں ہوسکتا تھا لیکن آج انہوں نے ہماری معلومات اور علم میں نئی باتوں کا اضافہ کردیا تو یہ بھی حفاظت غریب ہے پردیسی مسافر مہمان کو غریب کہا جاتا ہے یعنی صحابہؓ پردیسی لوگوں کی آمد کا انتظار کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کے اخلاق عالیہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اس حدیث کے کچھ اور حصے بھی ہیں۔ وہ بڑے عجیب ہیں۔ یہ روایت کئی ٹکڑوں میں ہے۔ ایک ٹکڑا ابتداء میں گزر چکا ہے۔ حضور ﷺ کا عجیب انداز وہاں بھی مفصل مذکور ہے۔

وہ بھی حضرت حسینؓ کی یہی روایت ہے۔ حضرت علیؓ سے آگے بھی کچھ حصہ آئے گا۔ اگلے باب میں کچھ تفصیل ذکر ہے۔

(۸) حدّثنا محمّد بن عبداللّٰہ بن بزیع ثنابشربن المفضّل ثنا سعید عن قتادة عن أنس بن مالک قال قال رسول اللّٰہ ﷺ لوأهدی إلیّ کراع لقبلت ولو دعیت علیه لاجبت(۱).

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر مجھے بکری کا ایک پایہ بھی ہدیہ کیا جائے تو میں قبول کروں اور اگر اس کی دعوت پر مجھے بلایا جائے تو میں ضرور جاؤں۔

لو اهدی الیّ کراع، کراع جانور کی پچھلی ٹانگ کے ٹخنوں سے بھی نیچے کے حصے کو کہتے ہیں۔ اور بعض شراح نے پنڈلی کے گوشت سے خالی حصے کو کراع کہا ہے۔ بہر حال یہ کھانے کے لحاظ سے بیکار قسم کا حصہ ہوتا ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر چہ یہ حصہ بہت ادنیٰ درجے کا ہے لیکن میں اس کو بطور ہدیہ اور بطور دعوت قبول کروں گا کیونکہ قبول نہ کرنے کا مطلب تعلّی وتکبر ہے۔ اور اس طرح ہدیہ دینے والے اور دعوت پر بلانے والے کی دل آزاری ہوگی۔

(۹) حدّثنا محمّد بن بشّار ثنا عبدالرحمٰن ثنا سفیان عن محمّد بن المنکدر عن جابر قال جاء نی رسول اللّٰہ ﷺ لیس براکب بغل ولابرذون(۲).

---

(۱)جامع ترمذی ۱/۲۴۸کتاب الاحکام فی قبول الهدایة، السنن الکبریٰ ۱/۱۶۰، مصنف ابن ابی شیبة۶/۵۵۶(مختار)

(۲)صحیح بخاری ۲/۸۴۶کتاب المرضیٰ باب عیادة المریض راکباً الخ، سنن ابی داؤد ۲/۸۵ کتاب الجنائز، باب المشی فی العیادة، جامع ترمذی ۲/۲۲۴کتاب المناقب باب فی مناقب جابر بن عبداللّٰہ، (مختار)

ترجمہ: حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ (میری عیادت کرنے) تشریف لائے نہ خچر پر سوار تھے اور نہ تُرکی گھوڑے پر۔ (بلکہ پیادہ تھے)

لیس براکب بغل ولا برذون، بغل خچر کو اور برذون تُرکی یا فارسی گھوڑے کو کہتے ہیں۔ آپ ﷺ امراء وسلاطین کے برعکس بلاضرورت سواری پر سوار نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ پیادہ چلنے کے عادی تھے اور یہی اس حدیث کو باب تواضع میں ذکر کرنے کی وجہ ہے۔ یہ حدیث بخاری شریف میں ذرا تفصیل کیساتھ ذکر ہے۔ جس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی معیت کا ذکر بھی ہے۔ نیز حضرت جابرؓ کی بے ہوشی، نبی کریم ﷺ کا وضوء کے پانی کو ان پر چھڑکنا اور حضرت جابرؓ کا میراث کے بارے میں سوال کا بھی ذکر ہے۔

(۱۰) حدثنا عبداللّٰہ بن عبدالرحمٰن انا ابونعیم ثنا یحی بن ابی الهیثم العطّار قال سمعت یوسف بن عبداللّٰه بن سلام قال سمّانی رسول اللّٰه ﷺ یوسف واقعدنی فی حجره ومسح علی راسی(۱).

ترجمہ: یوسف بن عبداللہ بن سلامؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے میرا نام یوسف رکھا مجھے اپنی گود میں بٹھایا اور میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔

یوسف بن عبداللّٰه، باب نمبر ۲۶ کی حدیث نمبر ۳۲ کے ضمن میں یوسف اوران کے والد کے احوال کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ امام بخاریؒ کے نزدیک یوسفؓ صحابی ہیں جبکہ بعض نے اسے تابعی کہا ہے۔ زیر نظر حدیث امام بخاریؒ کی تائید کرتی ہے۔

فی حجره، حجر گود کو کہتے ہیں جبکہ بعض لوگوں نے حجر کا ترجمہ حجرہ بھی کیا ہے۔ اس حدیث میں تبرک کے طور پر بچوں کو بزرگوں کے ہاں پیش کرنے اور ان سے نام رکھوانے کا عمل ثابت ہوتا ہے۔ صحابہ کرامؓ بھی اس بات کی کوشش کرتے تھے جیسا کہ احادیث میں آیا ہے اور نبی کریم ﷺ ان کی فرمائش کو پورا کرتے تھے۔ یہ استنکاف نہ تھا کہ پیغمبر ہو کر کیسے دوسروں کے بچوں کو اہمیت دوں۔

(۱۱) حدثنا إسحاق بن منصور ثنا أبوداؤد أنبانا الربيع وهوابن صبيح ثنا يزيد الرقاشيّ عن أنس بن مالك أنّ النبيّ ﷺ حجّ على

---

(۱) مسند احمد ۴/ ۲۰ ۶ حدیث نمبر ۱۵۹۲۹ (مختار)

رحل رث و قطیفة کنّانری ثمنها اربعة دراهم فلمّا استوت به راحلته قال لبیک بحجّة لاسمعة فیها ولارياء(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک بوسیدہ کجاوے اور جھالروں والے ایک ایسے کپڑے پر حج کیا جس کی قیمت ہمارے خیال میں (صرف) چار درہم تھی۔ پھر جب آپ ﷺ کو اٹھا کر آپ کی اونٹنی سیدھی کھڑی ہوگئی تو آپ ﷺ نے دعا فرمائی "اے میرے رب میں تیرے لئے حاضر ہوں ایک ایسے حج کے ساتھ جس میں نام ونمود نہیں ہے۔"

کنانُری ثمنها الخ، یہ حدیث اسی باب کی پانچویں حدیث ہے جو امام ترمذیؒ نے محمود بن غیلان کے واسطے سے روایت کی ہے لیکن اس میں ایک اشکال ہے کہ وہاں تو یہ آیا تھا کہ اس قطیفہ کی قیمت چار درہم بھی نہیں تھی اور یہاں چار درہم قیمت بتارہے ہیں۔ اس کا جواب اکثر شارحین نے یہ دیا ہے کہ دراصل اس کمبل کی قیمت چار درہم سے کم ہی تھی لیکن یہاں پر تقریبی قیمت بتائی گئی ہے(۲)۔

لاسمعة فیها ولارياء، علامہ بیجوریؒ نے اس جملے سے بھی تواضع کا اثبات کیا ہے۔ کہ باوجود معصوم ہونے کے آپ ﷺ نام ونمود کی نفی کی دعا کرتے ہیں یہ سب تواضعاً ہے۔ حدیث کی مزید تشریح پہلے گزر چکی ہے۔

---

(۱) سنن ابن ماجة ۲۰۷ کتاب المناسک باب الحج علی الرحل، مصنف ابن ابی شیبة ۱۰۶/۴ الحلیة الاولیاء لابی نعیم ۵۳/۳ (مختار)

(۲) اقول یمکن ان یکون عندالنبیّ ﷺ فی هذا الحج قطیفتان احدهما علی الرحل تحت النبی ﷺ وکانت قیمتها اربعة دراهم. وثانیتهما ارخص منها وکانت علی النبی ﷺ کماینبئ علیه لفظ الروایة السابقة. وحینئذٍ الضمیر فی قوله"وعلیه قطیفة" راجعاً علی النبی ﷺ (فی الروایة السابقة) کمارجحه الحنفیّ والمناویّ خلافاً للقاریؒ، اما فی هذه الروایة فلفظ القطیفة عطف علی الرحل لاغیر. فکانت تحت النبی ﷺ واقول إنّ التواضع علی هذا التوجیه لمعنی آخر ایضاوهوأنّه علیه السلام جلس علی الغالیة والقی علیه القطیفة الرخیصة وذلک تواضع منه ونفی الریاء والسمعة خلافاً لماهو داب المترفین المتکبرین.

ثم اعلم ان هذ التوجیه من مقترحات قریحتی لم اره عند احدفان وافقنی احدفالحمدللّٰه علی ذلک وان ردّه اهل العلم فلایسؤنی ان یرمی به علی وجهی.(اصلاح الدین الحقانی)

(۱۲) حدثنا إسحٰق ثنا عبدالرزاق ثنا معمر عن ثابت البنانیّ وعاصم الأحول عن أنس بن مالک أنّ رجلا خیّاطا دعا رسول اللّٰہ ﷺ فقرّب لہ ثریدا علیہ دبّاء وکان رسول اللّٰہ ﷺ یاخذ الدباء وکان یحبّ الدباء قال ثابت فسمعت أنسا یقول فما صنع لی طعام اقدر علی ان یصنع فیہ دباء إلاّ صنع(۱)۔

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ ایک درزی نے نبی کریم ﷺ کی دعوت کی۔ اس نے آپ کو ثرید پیش کیا جس پر کدو رکھا ہوا تھا۔ نبی کریم ﷺ کدو کے ٹکڑے اٹھاتے رہے کیوں کہ آپ ﷺ کو کدو پسند تھا۔ حضرت ثابتؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انسؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اس کے بعد میرے لئے کوئی ایسا کھانا تیار نہیں کیا گیا۔ جس میں مجھے کدو ڈلوانے کی قدرت ہو مگر اس میں کدو ضرور ڈالا گیا۔

ان رجلاً خیّاطاً ، یہ شخص نبی کریم ﷺ کا آزاد شدہ غلام تھا۔ جیسا کہ باب ادام النبی ﷺ کی گیارہویں حدیث میں گزر چکا ہے۔

فقرب لہ ثریدا ، یہاں پر یہ بات آئی ہے کہ اس درزی نے ثرید آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کی جبکہ باب ادام میں آیا ہے کہ ''فقرب الی الرسول ﷺ خبزاً من شعیر ومرقا'' بظاہر یہ تعارض معلوم ہوتا تھا لیکن تطبیق ممکن ہے۔ کہ دونوں چیزیں ہوں یا ثرید کو پہلی حدیث میں روٹی شوربا کہا گیا ہو۔ کیونکہ ثرید اسی سے مرکب ہوتا ہے۔ البتہ وہاں پر کدو کے ساتھ قدید یعنی گوشت کے ٹکڑوں کا بھی ذکر ہے۔ یہاں پر ثرید کے ضمن میں ان کا ذکر ہو رہا ہے۔ کیونکہ ثرید میں گوشت کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کے ایک غلام کی دعوت پر اور وہ بھی جو کی روٹی اور کدو کے سالن پر جانے کا ذکر ہے۔ جو آپ ﷺ کی تواضع کی بیّن دلیل ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری ۲/ ۸۱۷، صحیح مسلم ۲/ ۱۸۰ کتاب الاشربۃ باب جواز اکل المرق الخ جامع ترمذی ۲/ ۶ کتاب الاطعمۃ باب ماجاء فی اکل الدباء، سنن ابن ماجۃ جلد باب الدباء ص ۲۳۷، مؤطا امام مالک، السنن الکبریٰ ۷/ ۲۷۳، دارمی ۲/ ۱۰۱ (مختار)

(۱۳) حدّثنا محمّدبن اسمٰعیل ثناعبداللّٰہ بن صالح حدّثنی معاویة بن صالح عن یحیی بن سعید عن عمرة قالت قیل لعائشة ماذاکان یعمل رسول اللّٰہ ﷺ فی بیته قالت کان بشراً من البشر یفلی ثوبه ویحلب شاته ویخدم نفسه(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ نبی کریم ﷺ گھر میں کیا کام کیا کرتے تھے۔انہوں نے جواب دیا کہ نبی کریم ﷺ انسانوں میں سے ایک انسان تھے۔(گھر میں ضرورت ہوتی تو وہ) اپنے کپڑوں میں جوئیں تلاش کرتے تھے۔بکری کا دودھ دوھتے تھے۔اوراپنے کاموں میں خود لگے رہتے تھے۔

کان بشراً من البشر، یعنی آپ ﷺ بنیادی طور پرانسان ہی تھےاورانسانیت نبوت کے منافی نہیں ہے۔مشرکین کوآپ ﷺ کی انسانیت پراعتراض تھا۔لہٰذاوہ کہتے تھے **مالهٰذا الرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق**، یعنی ایسا بھی کوئی رسول ہوتا ہے۔جوکھانا کھائےاور بازاروں میں پھرے۔لیکن حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آپ ﷺ بشری تقاضوں سے مبرانہیں تھے۔بلکہ گھر میں بھی انسانی ضروریات کوخود پورافرماتے تھے۔

یفلی ثوبه، بعض روایات میں آیا ہے کہ جویں نبی کریم ﷺ کواذیت نہیں دیتی تھیں تو پھر جویں تلاش کرنے کا کیا مطلب؟ علامہ مناویؒ لکھتے ہیں۔کہ نبی کریم ﷺ کا پسینہ خوشبودار تھا۔جبکہ جویں توتعفن کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔اس لئے آپ ﷺ میں جوؤں کا ہونا مستبعد لگتا ہے لیکن اس کے متعدد جواب دیئے گئے ہیں۔کہ نبی اکرم ﷺ میں جویں نہیں تھیں یہاں توصرف تلاش کرنے کا ذکر ہے جوامت کی تعلیم کیلئے بھی ہوسکتا ہے۔اور یہ بھی احتمال ہے کہ نظافت اورخوشبو کی وجہ سے خودآپ ﷺ کے بالوں میں جویں پیدانہیں ہوتی تھیں لیکن کبھی دوسرے لوگوں کی جویں آپ ﷺ کے سرمبارک میں گھس جاتی تھیں۔پھر بھی یہ جویں آپ ﷺ کواذیت نہیں دیتی تھیں لیکن آپ ان کوگندہ سمجھ کرخودنکال دیتے تھے۔

---

(۱)مصنف عبدالرزاق رقم حدیث ۲۰۴۹۲،شرح السنة ۱۳/۲۴۳ کتاب المناقب باب فی شیبه وخضابه ﷺ رقم الحدیث ۳۶۷۶، مسنداحمد ۶/۱۰۶ (مختار)

ویخدم نفسہ ،مثلاً بعض روایات میں آیا ہے کہ آپ ﷺ اپنے کپڑوں کی سلائی کرلیا کرتے تھے۔ پھٹے کپڑوں کو پیوند لگانا، جوتوں کی مرمت کرنا، خود ہی وضوء کا پانی اپنے لئے مہیا کرنا، اور خود ہی پانی ڈالنا آپ ﷺ کا معمول تھا۔ ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ ''ویعمل عمل البیت'' یعنی آپ ﷺ گھر کے کام کاج خود کیا کرتے تھے۔

الغرض درون خانہ اور گھر کے باہر ہر جگہ آپ ﷺ تواضع کا مظاہرہ فرماتے تھے۔ اور دوسروں کی نسبت خود کو اعلیٰ و برتر سمجھ کر امتیازات کی طلب اور جستجو سے اجتناب فرماتے تھے۔

خلاصۂ باب

اس باب میں نبی کریم ﷺ کی فروتنی اور تواضع کا بیان ہے۔ ضابطہ یہ ہے کہ آدمی جتنا عظیم المرتبہ ہوتا ہے۔ اتنا ہی اس میں احساس عبدیت اور فروتنی زیادہ ہوتی ہے اور جتنی عاجزی زیادہ ہوتی ہے۔ بندہ اتنا ہی بلندی اور مقام عروج کے قریب تر ہوتا ہے۔ تکبر صرف اور صرف واجب الوجود اور رب العالمین کا خاصہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ میں تواضع حد درجہ کی تھی۔ جتنا مقام بلند تھا اتنی ہی فروتنی تھی۔

بدیں وجہ آپ ﷺ صحابہ کرام کو مبالغہ آمیز ستائش سے منع فرماتے تھے۔ اگر وہ محبت کی وجہ سے بھی کھڑے ہونے کی کوشش فرماتے تو آپ ﷺ پر گراں گزرتا۔ غلاموں، باندیوں بلکہ فاتر العقل عورتوں کے ساتھ ملنے اور ان کے تقاضے پورے کرنے سے استنکاف نہیں فرماتے تھے۔ نشست و برخاست، ملاقات، سلام وکلام، کھانے، لباس، بسترے، سواری اور مکان وغیرہ میں سادگی برتنا آپ ﷺ کا وطیرہ تھا۔

بیماروں کی عیادت کرنا، جنازوں میں شرکت، سادہ دعوتوں کو قبول کرنا، گھر کے کام کاج میں شرکت کرنا، اپنی خدمت کسی اور سے نہ کروانا، سرراہ سائلوں کی حاجت براری کرنا وغیرہ ایسے کام اس بات کی غماز ہیں کہ آپ ﷺ اپنی ذاتی عظمت اور منصب سے پوری طرح صرف نظر فرمایا کرتے تھے۔ اور خود کو ایک عام آدمی کی طرح پیش فرماتے تھے۔ مسند احمد میں حضرت حسنؓ کی ایک روایت میں آپ ﷺ کی تواضع کا نقشہ یوں ذکر کیا گیا ہے۔

لاواللّٰہ ماکانت تغلق دونہ الابواب ولاتقوم دونہ الحجاب ولایغدیٰ علیہ بالجفان ولایراح علیہ بہا، ولکنہ کان بارزاً من ارادان یلقیٰ نبی اللّٰہ لقیہ. کان یجلس بالارض ویوضع طعامہ بالارض ویلبس الغلیظ ویرکب الحمار ویردف ویلعق واللّٰہ یدہ،

ترجمہ: نہیں خدا کی قسم آپ کے پیچھے دروازے بند نہیں کئے جاتے تھے نہ آپ پر پہرہ بٹھایا جاتا تھا، نہ صبح کے وقت آپ کے پاس کھانے کے برتن لے جائے جاتے تھے نہ شام کو۔ بلکہ آپ ﷺ کھلم کھلا پھرتے تھے جو بھی چاہتا کہ پیغمبر خدا کے ساتھ ملے مل لیتا تھا۔ زمین پر بیٹھ جاتے تھے ان کا کھانا بھی زمین پر رکھ دیا جاتا تھا۔ موٹا کپڑا پہنتے تھے۔ گدھے پر سواری کر لیتے تھے۔ دوسرے کو بھی پیچھے بٹھالیتے تھے۔ اور خدا کی قسم انگلیاں بھی چاٹ لیتے تھے۔

یہ تھی مینار عظمت کی کسر نفسی اور فروتنی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اتباع کی توفیق بخشے۔ آمین

۴۸. باب ماجاء فی خُلق رسول اللہ ﷺ
رسول اللہ ﷺ کے اخلاق مبارکہ کا بیان

حقیقت اخلاق: خُلق خاء کے ضمہ اور لام کے سکون نیز دونوں کے ضمہ کے ساتھ طبیعت اور نفس کے باطنی اوصاف و معانی کا نام ہے۔ جس طرح کہ انسان کی ظاہری صورت ہوتی ہے۔ اس صورت میں محاسن بھی ہوتے ہیں۔ اور قبائح بھی اسی طرح نفس انسانی کیلئے باطنی صورت بھی ہوتی ہے۔ اس صورت میں بھی محاسن اور قبائح دونوں ہو سکتے ہیں۔ باطنی صفات اور معانی میں سے وہ صفات جو خدا اور سلیم الفطرت انسانوں کے ہاں مقبول اور محمود ہوں اور جو ظاہری اعمال مستحسنہ کیلئے بنیاد بنتی ہوں اخلاق حسنہ کہلاتی ہیں۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ظاہری صورت و ہیئت کی کوئی قیمت نہیں۔ اس لئے ثواب اور مقبولیت کا دارومدار انہی باطنی صفات اور اخلاق حسنہ پر ہوتا ہے اور انسان کے کمال کا بڑا وسیلہ اخلاق ہی ہیں۔

حسن خلق کا مصداق: اخلاق حسنہ کے مصداق میں علماء شرع کے مختلف اقوال منقول ہیں۔ حافظ عسقلانیؒ کہتے ہیں کہ فضائل کی تحصیل اور رزائل کے ترک کا نام ہے۔ قاضی عیاضؒ کہتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ شائستہ رویہ رکھنا، خندہ پیشانی، نرم مزاجی، برداشت، شفقت، صبر جیسی صفات کو اپنانے نیز تکبر، لوگوں کی بے عزتی، غیظ و غضب اور مؤاخذہ سے تجنب کا نام حسن خلق ہے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں حسن خلق کا مصداق احسان کرنا، اذیت دینے سے اجتناب اور خندہ روئی ہے۔ امام احمدؒ کہتے ہیں کہ حسن خلق یہ ہے کہ غضب اور حسد تم میں نہ ہو۔ امام ترمذیؒ نے ابواب البر میں عبداللہ بن مبارک کا قول نقل کیا ہے کہ حسن خلق کشادہ روئی، احسان کرنا اور اذیت سے اجتناب ہے۔

اخلاق کسبی ہیں یا وہبی: پھر اس میں بھی دو قول ہیں کہ اخلاق کسبی ہیں یا وہبی ہیں۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ طبعی اور فطری صفات ہوتی ہیں۔ کیونکہ بخاری شریف کی روایت میں ہے "ان اللّٰہ قسّم بینکم اخلاقکم کما قسّم ارزاقکم "بعض لوگوں کے خیال میں کچھ کسبی بھی ہیں۔ جیسا کہ اشج عبدالقیس منذر بن عائذؓ جب حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اِنّ فیک خصلتین یحبّھما اللہ الحلم و الاناۃ "اشج عصریؓ نے کہا کیا یہ مجھ میں پہلے سے تھیں یا بعد میں ملی

ہیں۔تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ دونوں خصلتیں قدیم سے ہیں۔چنانچہ علامہ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ منذرؓ کا سوال کرنا، پھر نبی کریم ﷺ کا سوال کو رد نہ کرنا بلکہ جواب دینا اس بات کی دلیل ہے کہ کچھ اخلاق وہبی اور فطری ہوتی ہیں۔مگر کچھ ''حدیث'' یعنی کسبی بھی ہوتی ہیں۔اور اسی وجہ سے اخلاق حسنہ کے اکتساب کا حکم بھی دیا جاتا ہے کیونکہ یہ اختیاری ہیں۔

لیکن ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ اخلاق تمام تر دراصل تو جبلّی صفات ہوتی ہیں۔البتہ یہ زیادت اور نقصان کو قبول کرتی ہیں۔اسی لئے علمی اور عملی امور پر مبنی ریاضات اور جدو جہد سے ان کو کم و کیف کے اعتبار سے بڑھایا جاتا ہے اور کبھی غفلت کی وجہ سے ان میں نقص آنے لگتا ہے(۱)۔

اخلاق نبوی ﷺ کا کمال: نبی کریم ﷺ انسانیت کے عروج پر بلکہ تمام مخلوقات میں اکمل و افضل ہیں۔اور اس کی سب سے بڑی وجہ بھی آپ ﷺ کے اخلاق کا کمال ہے۔خود اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اخلاق کے معراج پر قرار دیا ہے۔''اِنّک لعلیٰ خلق عظیم ''،انّ،جملہ اسمیہ،لام تاکید اور عظیم سے توصیف کر کے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے اخلاقی عظمت کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔

حضرت عائشہؓ جو حضور ﷺ کے ظاہر و باطن کو شاید تمام لوگوں کی نسبت سب سے زیادہ جاننے والی تھیں۔خود کو اخلاق نبوی ﷺ کے بیان سے عاجز جیسی تصور کر کے فرماتی ہیں ''کان خلقه القرآن ''یعنی جس طرح قرآن مجید کے معانی،محاسن اور خوبیوں کا استقصاء ممکن نہیں اسی طرح آپ ﷺ کے اخلاق جمیلہ کے احاطہ سے کلام عاجز ہے۔اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو انسانوں کے ہر طبقے، جنات کے تمام انواع بلکہ بقول ملا علی قاریؒ ملائکہ، نباتات و جمادات کیلئے نبی بنا کر بھیجا۔

خلاصہ یہ کہ اخلاق جمیلہ باطنی فضائل سے اتصاف اور رزائل سے اجتناب کا نام ہے۔نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اس صفت میں بھی اکمل بنا کر بھیجا۔اور اگر چہ کسی شخص کیلئے اخلاق نبوی ﷺ کی صحیح تصویر کشی ممکن نہیں ہے لیکن امام ترمذیؒ نے مشت نمونہ خروار کے طور پر ان کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ

---

(۱) امام غزالیؒ نے فرمایا کہ اخلاق گو جبلی ہیں البتہ ان پر جو آثار مرتب ہوتے ہیں وہ اختیاری ہیں اس لئے امر و نہی ان آثار پر ہوا ہے مثلاً کسی کی جبلّت میں غصہ رکھا ہوا ہے، یہ غیر اختیاری ہے۔اس پر جو گالی دے بیٹھا یہ امر اختیاری ہے اور اسی پر مؤاخذہ ہوگا۔(تقریر ترمذی حضرت مدنیؒ و شمائل ترمذی ص ۸۹۴)(مختار)

"ما لایدرک کله لایترک کله" یعنی سب کچھ نہ ملے تو کچھ کچھ ہی کافی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں پندرہ احادیث ذکر کر کے انہوں نے اپنی ذمہ داری کو نبھایا ہے۔

(۱) حدثنا عبّاس بن محمّد الدوریّ ثنا عبداللّٰہ بن یزید المقرئ ثنا لیث بن سعد حدثنی أبو عثمان الولید بن أبی الولید عن سلیمان ابن خارجة عن خارجة بن زید بن ثابت قال دخل نفر علیٰ زید بن ثابتٍ فقالوا له حدثنا أحادیث رسول اللّٰہ ﷺ قال ماذا احدّثکم کنت جاره فکان اذا نزل علیه الوحی بعث الیّ فکتبته له فکنّا اذا ذکرنا الدنیا ذکرها معنا و اذا ذکرنا الأخرة ذکرها معنا و اذا ذکرنا الطعام ذکره معنا فکل هذا احدّثکم عن النبیّ ﷺ(۱).

ترجمہ: حضرت زید بن ثابتؓ کے پاس کچھ لوگ آئے اور درخواست کی کہ نبی کریم ﷺ کی کچھ باتیں سنائیں۔ انہوں نے کہا کہ کچھ سناؤں؟ میں ان کا پڑوسی تھا جب آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی تو مجھے بلوا لیتے تھے۔ میں (حاضر ہو کر) وہ وحی لکھ لیتا تھا(۲)۔ پھر جب ہم (صحابہ) دنیا کی باتیں کرتے تو آپ ﷺ بھی ہمارے ساتھ (ہماری دلداری کی خاطر) دنیا کی باتیں کرتے تھے اور جب ہم آخرت کو یاد کرتے تو آپ ﷺ بھی ہمارے ساتھ آخرت کو یاد فرماتے۔ اور اگر ہم کھانے پینے کی

---

(۱) شرح السنة للبغوی ۲۴۵/۳ کتاب المناقب باب فی تواضعه ﷺ رقم الحدیث ۳۶۷۹، الدلائل النبوة للبیهقی ۳۲۴/۱ مجمع الزوائد ۵۷۸/۸ کتاب علامات النبوة باب فی حسن خلقه و حیائه الخ(مختار)

(۲) کاتبین وحی کی تعداد میں علماء کا اختلاف نو پر تو سب متفق ہیں البتہ بعض نے ۱۹ بتائی ہے۔ علامہ عبدالجواد الدومیؒ نے لکھا ہے متفرق افراد کے اسماء ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے و **کتاب الوحی هم زید و عثمان و علی و أبی و معاویة و خالد بن سعید و حنظلة بن الربیع و العلاء بن الحضرمی و ابان بن سعید(الاتحافات ۳۲۹)** اگرچہ بعض حضرات نے امیر معاویہؓ کے بارے کہا ہے کہ آپ صرف مراسلات لکھتے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ کاتبین وحی میں شمار ہیں (مختار)

بات کرتے تو آپ ﷺ بھی اس کا ذکر فرماتے تھے۔ یہ سب کچھ میں نبی کریم ﷺ
کے حالات بیان کر رہا ہوں۔

زید بن ثابتؓ: حضرت زید بن ثابت بن لوذان بنوالنجار کے انصاری صحابی ہیں۔ کنیت ابوسعید اور ابوخارجہ تھی۔ ہجرت کے دن آپؓ کی عمر گیارہ برس تھی نبی کریم ﷺ کیلئے خطوط نویسی کے ساتھ ساتھ وحی کی کتابت بھی کیا کرتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں جن چار صحابہ کو پورا قرآن حفظ تھا ان میں آپؓ کا نام اس لحاظ سے اہم ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جمع قرآن کی خدمت کیلئے انہی کو منتخب فرمایا تھا۔ پھر حضرت عثمانؓ نے اشاعت قرآن کی غرض سے مصحف صدیقی سے قرآن مجید جس کمیٹی سے نقل کروایا، اس میں بھی آپؓ کو منتخب فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے امتیازی علم بخشا تھا بالخصوص علم فرائض میں آپؓ سب سے آگے تھے۔ وفات کے روز حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا "دفن الیوم علم کثیر" آج بڑا علم دفن کیا گیا۔ ۴۵ھ یا ۴۸ھ میں وفات پائی۔

احاطہ اخلاق نبوی ﷺ ناممکن: فقال ماذا احدثکم ، جب ساتھیوں نے نبی کریم ﷺ کے حالات سنانے کی فرمائش کی تو حضرت زید بن ثابتؓ نے بطور تعجب فرمایا کہ کیا کیا سناؤں، گویا تم تو نبی کریم ﷺ کے احوال، افعال واقوال کا احاطہ چاہتے ہو حالانکہ یہ ناممکن امر ہے۔ آپ ﷺ کے اخلاق وشمائل کا بیان تو کجا اس کے عشر عشیر کا ادراک بھی محال ہے۔

آپ ﷺ کے حق میں مدح جتنی بھی کی جائے کم ہے بلکہ ایک شاعر کے بقول ؎

تجاوز حق المدح حتّٰی کانّہ باحسن مایثنیٰ علیہ یعاب

یعنی آپ ﷺ مدائح اور تعریفوں کے حدود سے آگے جا چکے ہیں کہ یہاں تک کہ اگر کچھ سے بہتر تعریف وتوصیف سے آپ ﷺ کی مدح کی جائے وہ بھی آپ ﷺ کیلئے عیب جیسی ہے۔

؎ دفتر تمام گشت وبپایاں رسید عمر ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

بہرحال حضرت زیدؓ کا مقصد یہ ہے کہ سب کچھ بیان کرنا مشکل ہے البتہ محبوب کا ذکر آئے اور کچھ بھی نہ کہا جائے یہ بھی عشق کی ناقدری ہے۔ اس لئے آپؓ نے رسول کریم ﷺ کے اخلاق کا ایک پہلو اجاگر کر دیا کہ کس طرح آپ ﷺ اپنے صحابہ کی دلداری کیا کرتے تھے ایسے موضوع اور باتوں میں بھی

شرکت فرماتے تھے جو صحابہ کرامؓ کی نظر میں دنیاداری کے امور تھے۔

ذکرھا معنا، ہمارے ساتھ دنیا کا بھی ذکر کر لیتے تھے۔ دنیا کے ذکر سے مراد یہ نہیں کہ دنیا کی محبت وتنافس میں مبتلا ہو کر بولتے تھے بلکہ مراد یہ ہے کہ ہمیں دنیا کی باتوں سے منع کرنے کی بجائے اس میں بھی شریک ہوجاتے تھے۔ البتہ ایسے رخ کی طرف اسے موڑ دیتے جس سے صحابہ کی توجہ دین کی جانب مبذول ہوجاتی تھی۔ مثلاً تجارت کے اصول اس کی برکتیں، دولت کے فوائد ونقصانات، اسے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی ترغیب دنیا ہی کی باتیں ہیں۔ مضمون وموضوع سے خروج بھی نہیں اور رخ بھی دین کی جانب ہے۔ اس طرح کھانے پینے کی بات ہوتی تو بھی آپ ﷺ کھانے کے فوائد نقصانات اس کے آداب، بعض کھانوں کی حلت وحرمت دوسروں کو کھلانے کی فضیلت وغیرہ امور کا تذکرہ کر لیتے تھے۔

جیسا کہ احادیث کی کتابیں اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہیں یوں صحابہ کو وحشت بھی نہ ہوتی تھی نہ کسی بات کو کرنے کیلئے مجلس نبوی ﷺ سے نکلنے کی ضرورت پڑتی۔ ساتھ ساتھ منصب نبوت کا حق بھی ادا ہوتا تھا اور اگر یہاں ذکر سے مراد احکام ومعارف نہ بھی لیں تو بھی یہ فائدہ کیا کم ہے کہ صحابہ کو انس حاصل ہو۔ نیز یہ پہلو بھی سامنے آیا کہ امیر عوام کے ساتھ مجالس میں شریک ہوسکتا ہے۔

فکل ھذا احدثکم عن رسول اللہ، کل مرفوع مبتداء ہے اور احدثکم خبرہ ہے۔ "ایاہ" ضمیر اس میں مقدر ہے جو مبتداء کو راجع ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ منصوب ہو، اور مفعول بہ مقدم ہو۔ اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ پڑوسی اور مقرب ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کے ہر قسم کے حالات مجھے یاد ہیں۔ اس لئے ان کے بارے میں جو بھی سناؤں وہ دیدہ وشنیدہ باتیں ہیں اور تم جو کچھ پوچھو گے وہی سناؤں گا۔

(۲) حدّثنا إسحاق بن موسیٰ ثنا یونس بن بکیر عن محمّد ابن إسحاق عن زیاد بن أبی زیاد عن محمّد بن کعب القرظیّ عن عمرو بن العاص قال کان رسول اللّٰہ ﷺ یقبل بوجھہ وحدیثہ علی اشرّ القوم یتألّفھم بذلک فکان یقبل بوجھہ وحدیثہ علیّ حتیّ ظننت أنّی خیر القوم فقلت یارسول اللہ انا خیر او ابوبکر فقال ابوبکر فقلت یارسول اللّٰہ انا خیر ام عمر فقال عمر فقلت یارسول اللہ انا خیر ام

عثمان فقال عثمان فلما سألت رسول اللہ ﷺ فصدقنی فلوددت أنّی لم اکن سألته(۱).

ترجمہ: حضرت عمرو بن العاصؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ لوگوں میں بدترین شخص کی طرف بھی اپنی توجہ مبذول فرماتے تھے۔ آپ ﷺ (اس رویئے سے) ان کو مانوس فرماتے تھے۔ چنانچہ اپنی توجہ اور باتوں سے مجھے بھی نوازتے تھے۔ حتیٰ کہ میں سمجھنے لگا کہ میں (ان کے نزدیک) تمام لوگوں میں سے بہتر ہوں۔ اس لئے میں نے ایک دن پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ میں بہتر ہوں یا ابوبکر۔ آپ ﷺ نے فرمایا ابوبکر بہتر ہیں۔ پھر میں نے پوچھا کہ میں بہتر ہوں یا عمر۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا عمر، پھر میں نے پوچھا کہ میں بہتر ہوں یا عثمان۔ آپ ﷺ نے فرمایا عثمان، تو جب میں نے آپ ﷺ سے بے تکلف یہ سب کچھ دریافت کیا تو آپ ﷺ نے بھی لگی لپٹی بغیر سچ سچ بتایا (کہ میں فضیلت میں بہت سے صحابہ کے بعد ہوں) تو اب مجھے افسوس ہے کہ کاش میں یہ نہ پوچھتا (تاکہ حضور ﷺ سے قریبی تعلق کا احساس برقرار رہتا)

<u>عمرو بن العاص:</u> عمرو بن العاصؓ، بن وائل سہمی صحابی ہیں ۵ھ میں اسلام لائے۔ علامہ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ صلح حدیبیہ کے سال یعنی ۶ھ میں اسلام لائے جبکہ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ آپؓ اور حضرت خالد بن ولیدؓ دونوں صفر ۸ھ کو فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے تھے۔ آپؓ انتہائی زیرک سیاستدان اور مدبر تھے۔ اس لئے آپؓ کو داھیۃ العرب بھی کہا جاتا ہے۔ غزوہ ذات السلاسل میں نبی کریم ﷺ نے آپؓ کو امیر مقرر کیا۔ بعد میں آپؓ کو عمان کا والی مقرر کیا۔ اور حضور ﷺ کی وفات تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مصر کو فتح کیا۔ اور انہوں نے مصر پر آپؓ کو والی مقرر کیا۔ پھر حضرت عثمانؓ نے آپ کو معزول کر دیا لیکن حضرت معاویہؓ کے عہد میں آپؓ دوبارہ مصر کے والی مقرر ہوئے اور وفات تک مصر میں رہے۔ آپؓ کی وفات ۴۳ھ میں عید الفطر کی رات کو ہوئی۔ جبکہ بعض لوگوں نے ۵۰ھ کے بعد وفات ہونے کا لکھا ہے۔ اس وقت آپؓ کی عمر نوے سال تھی۔ مصر میں آپؓ کے نام سے مشہور جامع عمرو بن

---

(۱) مجمع الزوائد للهیثمی ۵۷۵/۸ کتاب علامات النبوة باب فی حسن خلقه وحیائه الخ(مختار)

العاص آج بھی موجود ہے۔

تالیف قلب کی حکمت: یتألفھم بذلک ، چونکہ اشرّ القوم معنًی کے لحاظ سے جمع ہے۔اس لئے یتالفھم کی ضمیر اشر القوم کو بھی راجع ہوسکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ضمیر قوم کو راجع ہو۔پہلی صورت میں معنًی یہ ہوگا کہ قوم کے بدترین افراد پر بھی ان کی تالیف قلب کے لئے توجہ فرماتے تھے۔دوسری صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ قوم کے صلحاء اور اخیا تو ویسے بھی نبی کریم ﷺ سے مانوس تھے۔ان پر اتنی توجہ کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

البتہ اشرار پر خصوصی توجہ کر لیتے تھے۔تو اس طرح ساری قوم بلا استثناء تابع ہوجاتی تھی یا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ جب نیک لوگ اشرار کے ساتھ آپ ﷺ کا رویہ اور حسن خلق دیکھ لیتے تھے تو نبی کریم ﷺ کی عظمت اور محبت اور بھی دل میں بڑھ جاتی تھی۔ساتھ ساتھ اشرار کو بھی انس ہوجاتا تھا۔لہٰذا یتالفھم کی ضمیر قوم کو راجع کرنا درست ہوجائے گا۔

خندہ پیشانی نہ کہ مدح سرائی: لیکن یہ بات یاد رہے کہ نبی کریم ﷺ صرف باتوں کا رخ ایسے لوگوں کی طرف موڑتے یا خندہ پیشانی کے ساتھ توجہ فرماتے تھے جہاں تک ان لوگوں کی مدح سرائی اور ثنا وتوصیف ہے وہ کہیں بھی ثابت نہیں ہے کیونکہ ان کی تعریفیں کرنا،اور ایسے لوگوں کے غلط افعال کی تقریر کرنا پیغمبر کے شان کے منافی ہے بلکہ مداہنت متصور ہوگی جو شرعاً مفاسد پر مشتمل ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عمرو بن العاص ؓ نے پوچھ لیا تو آپ ﷺ نے دوسرے صحابہ ؓ کو ان پر ترجیح دے دی۔

فقلت یارسول اللّٰہ أناخیر او أبوبکر، یہ سوال حضرت عمرو بن العاص ؓ نے اپنے ظن کے مطابق اور نبی کریم ﷺ کی کثرت توجہ سے متاثر ہو کر کیا۔فصدقنی ،یعنی آپ ﷺ نے جواب میں کسی لچک کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ ٹھیک بتادیا کہ دیگر صحابہ تم سے افضل ہیں اور کسی قسم کی تردد اور مداہنت سے کام نہیں لیا۔

فلوددت أنّی لم اکن سألتہ، اپنے سوال پر ندامت کی وجہ دراصل یہ تھی کہ اس سے قبل اپنے بارے میں ایک حسن ظن قائم تھا کہ میں نبی کریم ﷺ کو بڑا پیارا اور تمام صحابہ کی نسبت زیادہ مقرب ہوں لیکن سوال کے بعد وہ حسن ظن جاتا رہا۔اور اصل حقیقت معلوم ہوگئی کہ آپ ﷺ نے مجھے استیناس اور

تالیف قلب کی وجہ سے مرکز توجہ بنایا ہے۔دراصل میرا نمبر بہت پیچھے ہے۔

(۳) حدّثنا قتیبة بن سعید ثنا جعفر بن سلیمان الضبعیّ عن ثابت عن أنس بن مالک قال خدمت رسول اللّٰہ ﷺ عشر سنین فما قال لی افٍ قط وماقال لشیٔ صنعته لم صنعته ولالشیٔ ترکته لم ترکته وکان رسول اللّٰہ ﷺ من احسن الناس خلقا ولامسست خزاو قطُّ لاحریراً ولاشیئا کان ألین من کفّ رسول اللّٰہ ﷺ ولاشممت مسکاً قط ولاعطرا کان اطیب من عرق رسول اللّٰہ ﷺ(۱)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے دس سال تک نبی کریم ﷺ کی خدمت کی۔اس دوران انہوں نے کبھی بھی مجھے (ناراضگی اور بیزاری کا لفظ) اف تک نہیں کہا۔نہ کسی کام کے کرنے پر یہ فرمایا کہ کیوں ایسا کیا نہ کسی کام کے چھوڑ جانے پر یہ کہا کہ کیوں نہیں کیا۔اور نبی کریم ﷺ کے اخلاق تمام لوگوں سے بہتر تھے۔میں نے کبھی کسی ریشمی کپڑا، ریشم اور نہ کسی اور ملائم چیز کو ہاتھ لگایا جو نبی کریم ﷺ کے ہاتھ سے زیادہ نرم ہو۔اور نہ میں نے کبھی کوئی ایسا مشک یا عطر سونگھا ہے جو نبی کریم ﷺ کے پسینہ سے زیادہ خوشبودار ہو۔

فماقال لی اف قط ،اُف،ہمزہ کے تینوں حرکات کے ساتھ منوّن اور غیر منوّن بولا جاتا ہے۔ بلکہ بعض ائمہ نے اس میں دس لغات اور بعض نے اس سے بھی زیادہ کا ذکر کیا ہے۔یہ اسم فعل ہے جو تـزجر اور کراہت کے دوران بولا جاتا ہے۔اس کا اصل لغوی معنی ناخنوں اور کانوں کی گندگی ہے جس سے کراہت ہوتی ہے۔پھر یہ ایسے موقعوں پر بولا جاتا ہے جہاں مخاطب کی کوئی چیز ناپسند اور طبیعت پر بھاری ہو۔اور شکایت کا اظہار کرنا ہو۔

---

(۱)صحیح بخاری باب صفة النبی ﷺ کتاب المناقب ۱/۵۰۳، صحیح مسلم کتاب الفضائل، باب حسن خلقه ﷺ ۲/۲۵۳،سنن ابی داؤد کتاب الادب باب فی الحلم واخلاق النبیّ ﷺ ۲/۳۱۰، جامع ترمذی کتاب البر والصلة باب ماجاء فی خلق النبی ﷺ ۲/۲۱(مختار)

عنایت نبوی ﷺ خدام پر: حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ اس دس سالہ (۱) خدمت کے دوران ناممکن ہے کہ مجھ سے کوئی قصور نہ ہوا ہو۔ بایں ہمہ آپ ﷺ کی طرف سے کوئی شکایت یا ڈانٹ ڈپٹ دیکھنے میں نہیں آئی۔ ظاہر ہے کہ یہ آپ ﷺ کے اخلاق عالیہ کی وجہ سے ہے۔ لیکن یادر ہے کہ آپ ﷺ کی یہ خاموشی اور درگزر خدمت کے سلسلے میں تھی ورنہ اگر حضرت انسؓ سے کوئی کوتاہی امور شرعیہ میں ہوتی تو آپ ﷺ ضرور مؤاخذہ فرماتے جیسا کہ دیگر روایات میں تصریحات ہیں کہ حق کے لئے آپ ﷺ غصہ بھی فرماتے تھے۔ البتہ حضرت انسؓ کی منقبت کی طرف بھی اس حدیث میں اشارہ موجود ہے کہ باوجود صغرسنی کے آپؓ نے خدمت کے دوران کوئی شرعی قصور نہیں کیا۔ حضرت انسؓ سے مروی بعض روایات میں آیا ہے کہ اگر کسی قصور پر کوئی اور شخص بھی کسی کو عتاب کرتا تو بھی آپ ﷺ منع فرما کر کہتے کہ چھوڑو بس یہی اللہ تعالیٰ کو منظور تھا اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو کوتاہی نہ ہوتی گویا ایسے موقع پر آپ ﷺ رضاء بقضائے الٰہی کی تعلیم دیتے تھے۔

وکان النبیّ من أحسن النّاس خُلقا، شاید مطلب یہ ہے کہ میرے ساتھ جو حسن اخلاق کا رویہ تھا وہ میری خصوصیت نہیں تھی بلکہ آپ ﷺ فطری طور پر اخلاق حسنہ کے حامل تھے اور ہر کسی سے یہی معاملہ تھا۔

ولامسست خزًّا الخ، حسن اخلاق کے بعد آپ ﷺ کی خلقی حسن کا بیان ہے کہ آپ ﷺ ظاہری طور پر بھی بہت خوبیوں کے مالک تھے "خز" بعض لوگوں کے ہاں ایک جانور (۲) کا نام ہے جس کا اون بہت ملائم ہوتا ہے اس کے اون سے بنے ہوئے کپڑے کو بھی خز کہا جاتا ہے۔ علامہ ابن اثیرؒ نے نہایہ میں لکھا ہے کہ خز اون اور ریشم سے مرکب کپڑے کو کہتے ہیں۔

مسکاً ولاعطراً، عطر کا ذکر مشک کے بعد ذکر العام بعد الخاص کے قبیلے سے ہے۔

(۱) اس روایت میں دس سال کی خدمت کا ذکر ہے لیکن بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت انسؓ کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کرنے والے حضرت ابوطلحہؓ تھے جو حضرت انسؓ کی والدہ ام سلیمؓ کے شوہر ہیں اور ابوطلحہ کا ام سلیمؓ سے نکاح اور اسلام دونوں ہجرت نبوی ﷺ کے کچھ ماہ بعد واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے یہ مدت دس سال سے قدرے کم ہوگی اور اسی وجہ سے بعض روایات میں کسر کے الغاء کر کے "تسع سنین" یعنی نو سال ذکر ہے۔ (اصلاح الدین)

(۲) بعض شراح کے خیال میں یہ ایک دریائی جانور ہے جسے قندس بھی کہا جاتا ہے اس پر ریشم کی طرح ملائم اون ہوتا ہے۔ (اصلاح الدین)

کان أطیب من عرق رسول اللّٰہ ﷺ، یعنی نبی کریم ﷺ کے پسینے سے زیادہ خوشبودار کوئی بھی چیز نہیں دیکھی۔اس میں کوئی مبالغہ آمیزی نہیں بلکہ روایات اس پر شاہد ہیں کہ بعض صحابیات آپ ﷺ کے پسینے کو جمع کرتی تھیں اور اس کو دوسری خوشبوؤں میں ملاتیں تو وہ خوشبو بھی بے مثال بن جاتی تھی(۱) اس کے باوجود آپ ﷺ مصنوعی خوشبو بھی زیادہ استعمال فرماتے تھے تاکہ ملائکہ سے ملاقات اور مجامع المسلمین میں حاضری کے وقت فرشتے اور لوگ زیادہ محظوظ ہوں۔اسی وجہ سے آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے، حبّب الیّ من دنیا کم ثلاث النساء والطیب وقرة عینی فی الصلوٰة، یعنی بیویاں اور خوشبو سے مجھے محبت دی گئی ہے اور نماز تو میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

(۲) حدّثنا قتیبة بن سعید واحمد بن عبدة هو الضبیّ والمعنی واحد قالا حدّثنا حمّاد بن زید عن سلم العلوی عن أنس بن مالک عن رسول اللّٰه ﷺ أنّه کان عنده رجل به اثر صفرة قال وکان رسول اللّٰه ﷺ لایکادیواجه احداً بشیء یکرهه فلمّا قام قال للقوم لوقلتم له یدع هذه الصفرة(۲)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک شخص بیٹھا تھا جس کے کپڑے پر زعفران کا رنگ لگا ہوا تھا نبی کریم ﷺ کی عادت تھی کہ آپ ﷺ کسی کی منہ پر ایسی بات نہیں کہتے تھے جو اسے ناگوار ہو جب وہ شخص مجلس سے اٹھ کر چلا گیا

---

(۱) بلکہ ایک روایت میں ہے حضرت انسؓ کی والدہ نے رسول اللہ ﷺ سے آپ ﷺ کے پسینے کے بارے میں عرض کیا یارسول اللّٰہ ﷺ نرجوبرکته لصبیاننا قال اصبتِ (الحدیث) ملاعلی قاریؒ اس روایت سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے وفیه استحباب التبرک والتقرب بآثار الصالحین قیل لما حضر أنس بن مالک الوفاة اوصی ان یجعل فی جنوبه من ذالک الطیب (مرقات ..مشکوٰة)(مختار)

(۲) سنن ابی داؤد ۲/۲۲۳ ایضا کتاب الادب باب حسن المعاشرة ۲/۲۱۳ کتاب الترجل باب فی الخلوق للرجل، السنن الکبریٰ للنسائی ۶/۶۷ کتاب عمل الیوم واللیل باب ترک مواجهة الانسان بمایکره الادب المفرد للبخاری ۱۱۷ رقم الحدیث ۴۳۷ (مختار)

تو آپ ﷺ نے حاضر لوگوں سے فرمایا کہ اگر تم لوگ اس شخص سے کہہ دو کہ وہ یہ رنگ استعمال کرنا چھوڑ دے تو بہتر ہوگا۔

لایکادیواجہ احداً بشیئ یکرھہ، یعنی کسی پر روبرو اعتراض کرنے سے غالباً کتراتے تھے کہ مبادا حضور ﷺ کا اعتراض اسے ناگوار گزرے یا اعتراض پر اعتراض کردے اور انکار صادر ہو تو پھر کفر کا خدشہ ہے لہٰذا آپ ﷺ اس اعتراض کو کسی دوسرے موقعہ کیلئے مؤخر کردیتے تھے یا بالواسطہ اس کو تنبیہ فرماتے تھے۔ اور مزاج پر حیا کا اتنا غلبہ تھا کہ کسی سے سخت بات نہیں کر سکتے تھے۔

اعتراض نہ کرنے کے حدود: لیکن آمنے سامنے اعتراض نہ کرنا، آپ ﷺ کی غالب عادت تھی اور وہ بھی مذکورہ خدشات کی وجہ سے تھی اگر مخاطب کی طرف سے اطمینان ہوتا کہ بات بری نہیں لگے گی تو آمنے سامنے بھی منع فرماتے تھے جیسے کہ سرخ رنگ کپڑا پہننے کی وجہ سے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ پر گرفت فرمائی۔ بلکہ پہنے ہوئے کپڑے کو جلانے کا حکم بھی مروی ہے۔

لیکن آپ ﷺ کا یہ وقتی اغماض ایسے امور میں ہوتا تھا جو شرعاً حرام اور ناجائز نہ ہوں بلکہ ایسے موقع پر تنزیہی کراہت کے حامل اور خلاف اولیٰ باتوں کو برداشت کرتے تھے۔ محرمات کے بارے میں تو آگے حدیث میں آرہا ہے کہ۔۔۔۔ "**فاذاانتھک من محارم اللّٰہ تعالیٰ شیئ کان من أشدّھم فی ذالک غضباً**" ایک اور روایت میں ہے "**فاذاتعدّی الحق لم یقم لغضبہ شیئ**" اب ایک اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ زعفران کی خوشبو لگانا مردوں کیلئے اس کے رنگ کی وجہ سے ممنوع اور ناجائز ہے۔ تو آپ ﷺ نے اسے کیونکر برداشت کیا ضابطے کے مطابق تو اس شخص کو منع کرنا چاہئے تھے کیونکہ وہ شرعاً ناجائز کام کا مرتکب تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ ابھی تک "صفرۃ" کے استعمال سے نہی نازل نہ ہوئی ہو۔ آپ ﷺ نے صرف نسوانی عادت سمجھ کر اس کو طبعی طور پر ناپسند فرمایا اور صرف مکروہ تنزیہی کے درجے میں سمجھ کر اس پر انکار نہیں فرمایا ہو، یا یہ کہ یہ صفرۃ اس درجے کی نہ ہو جہاں حرمت کا حکم لگایا جاسکے۔ بلکہ زعفران کے رنگ کا پھیکا سا اثر باقی ہو جیسے کہ حدیث کے لفظ میں "اثر صفرۃ" کا ذکر ہے "صفرۃ" مذکور نہیں ہے ورنہ آپ ﷺ مجلس ہی میں اس پر انکار فرماتے۔

(۵) حدّثنا محمّد بن بشّار ثنا محمّد بن جعفرثنا شعبة عن أبی إسحاق عن أبی عبداللّٰہ الجدلیّ واسمہ عبدبن عبدعن عائشة أنّھا قالت لم یکن رسول اللّٰہ ﷺ فاحشا ولامتفحّشاً ولاصخّاباً فی الأسواق ولایجزی بالسّیّئة السّیّئة ولکن یعفوویصفح(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نہ طبعی طور پر فحش گو تھے نہ بتکلف فحش گوئی فرماتے تھے نہ بازاروں میں چلا چلا کر بات کرنے والے تھے برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے تھے بلکہ معاف فرماتے اوراعراض فرماتے تھے۔

وَلاَمتفحشاً، تفحّش الرّجلِ کا معنی ہے کہ فحش گوئی اور بدکلامی کی عادت تو نہ ہولیکن عوارض کی وجہ سے تکلفاً برا بھلا کہا جائے تو گویا نبی کریم ﷺ بدکلامی کے دونوں قسموں سے مبرّا تھے۔نہ عادت تھی اور نہ کبھی تکلفاً بیہودہ بات کرتے تھے۔ولاصخّابافی الاسواق، علامہ زمخشری کہتے ہیں کہ یہ اصل میں سخاب سین کے ساتھ ہے۔سین صاد سے بدلا گیا ہے۔یہاں بھی سین اور صاد دونوں کے ساتھ مروی ہے۔صخب چیخنے چلانے کو کہتے ہیں چونکہ بازار میں شوروغل ہوتا ہے اس لئے وہاں چیخنے چلانے کا موقع زیادہ ہوتا ہے مگر نبی کریم ﷺ وہاں بھی نرم اور میٹھی آواز سے بولتے تھے۔دوسری جگہ تو بطریق اولیٰ آواز پست ہوتی تھی۔صخاب اس مقام پر صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ شور کرنے والے نہ تھے۔اس میں مبالغہ کی نفی نہیں۔ بلکہ نفس صخب یعنی شور کی نفی مقصود ہے۔بعض علماء کہتے ہیں کہ فعال کے صیغے کی نفی سے نفی المبالغہ نہیں بلکہ مبالغہ فی النفی مقصود ہے مطلب یہ ہے کہ شور کرنا آپ ﷺ سے شدومد سے منفی تھا۔نہ یہ کہ زیادہ شور نہیں کرتے تھے اور کم شور کیا کرتے تھے۔ولکن یعفوویصفح ،یعنی برائی کو معاف فرماتے تھے اور صفح فرماتے تھے صفح کا معنی ہے ''اعراض بصفحة الوجه ''جس کا لفظی معنی منہ پھیرنا ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کسی کی برائی کا ذکر اس کے روبرو

(۱)جامع ترمذی ۲/۲۱ وصحیح البخاری کتاب المناقب باب صفة النبیّ ﷺ، کتاب البروالصلة باب ماجاء فی خلق النبی ﷺ، مصنف ابن ابی شیبة ۸/۳۳۰ سنن ابی داؤد الطیالسی رقم الحدیث ۱۵۲۰،صحیح ابن حبان۸/۱۲۰ (مختار)

نہیں فرماتے تھے نہ اس کا اثر آپ ﷺ کے چہرہ انور پر ظاہر ہوتا تھا یعنی برائی کے بدلہ پر قادر ہوتے ہوئے بھی اس کا بدلہ نہیں لیتے تھے۔ یہ محض دعویٰ نہیں بلکہ ہزاروں واقعات اس کے شاہد ہیں۔ کفار نے آپ ﷺ کو کتنی اذیتیں پہنچائیں۔ مگر آپ ﷺ نے ذاتی تکلیف کے مقابلے میں ان کیلئے بددعا تک گوارہ نہیں کی البتہ جہاں دین حق کو نقصان پہنچا تو ان لوگوں کیلئے آپ ﷺ بددعا بھی دیتے تھے بلکہ عملاً ان کے ساتھ قتل وقتال روا رکھتے تھے۔

<u>بے مثال حلم اور دریا دلی کی مثالیں:</u> ملا علی قاریؒ نے یہاں پر دو واقعے آپ ﷺ کی کشادہ دلی اور اعراض کے بیان کئے ہیں۔ ایک واقعہ یہودیوں کے ایک عالم کا لکھا ہے جو کہتے ہیں کہ میں نے نبوت کی تمام علامات نبی کریم ﷺ کے چہرۂ انور میں دیکھتے ہی محسوس کر لئے تھے سوائے دو علامتوں کے۔ ان دو علامتوں کا امتحان لینے کیلئے میں موقع کی تلاش میں تھا ایک یہ کہ "یسبق حلمه جهله" یعنی آپ ﷺ کی برداشت آپ ﷺ کے غصے پر غالب ہوگی، دوم یہ کہ "لایزید شدة الجهل علیه الاحلما" یعنی ان کے ساتھ جتنا بھی زیادہ جہالت کا رویہ اختیار کیا جائے اس سے ان کی برداشت اور زیادہ ہوگی۔ چنانچہ ایک موقع پر میں نے آپ ﷺ سے کھجور کا سودا طے کیا میں نے رقم دے کر کچھ کھجوران سے خریدے۔ کھجور کی ادائیگی میں ابھی دو تین دن باقی تھے کہ میں آپ ﷺ کے پاس آیا اور ان کے قمیص اور چادر کو ہاتھ سے کھینچ کر ترشروئی اور سختی سے کہا کہ اے محمدؐ کیا تم میرا حق ادا نہیں کرتے۔ خدا کی قسم تم سب بنی عبدالمطلب قرضخواہوں کو ٹالنے والے ہو۔ حضرت عمرؓ نے میری بات سن کر کہا کہ اے خدا کے دشمن تم رسول اللہ ﷺ سے ایسی باتیں کرتے ہو۔ خدا کی قسم اگر نبی کریم ﷺ کی (موجودگی کی وجہ سے ان کی تکلیف) کا خوف نہ ہوتا تو میں تیرا سر تلوار سے اڑا دیتا۔ اس دوران نبی کریم ﷺ حضرت عمرؓ کی طرف بہت سکون اور اطمینان کے ساتھ ہنستے ہوئے دیکھتے رہے۔ پھر فرمایا، کہ اے عمر! میں اور یہ یہودی (تیرے اس رویے کے بجائے) ایک اور بات کے زیادہ محتاج ہیں وہ یہ کہ تم مجھے حسن ادائیگی اور اس کو حسن طلب کی تلقین کرتے۔ اب جاؤ تم اس کا قرضہ ادا کرو۔ اور بیس صاع تم اس کو اپنے حق سے زیادہ دے دو کیونکہ تم نے اس کے ساتھ جھگڑا کیا ہے۔ چنانچہ جب حضرت عمرؓ نے میرا قرضہ ادا کر دیا اور زائد بھی دے دیا تو میں نے ان سے کہا کہ اے عمرؓ میں نے نبی اکرم ﷺ میں نبوت کی تمام علامات دیکھ لی تھیں سوائے دو علامتوں کے وہ یہ کہ "یسبق

حلمه جهله و لایزید شدة الجهل علیه الاحلما ''اب میں نے ان دونوں کا مشاہدہ بھی کرلیا۔لہٰذا تم گواہ رہو کہ میں ایمان لاتا ہوں اور خدا کی ربوبیت اسلام کی حقانیت اور محمد ﷺ کی نبوت پر راضی ہوں۔

دوسرا واقعہ یہ لکھا ہے کہ ایک اعرابی آپ ﷺ کے پاس آیا اور آپ ﷺ کی چادر کو اس زور سے کھینچا کہ آپ ﷺ کی گردن مبارک میں اس کا اثر ظاہر ہوگیا۔اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ میرے دو اونٹوں پر غلہ لاد کر مجھے دیدو کیونکہ تم مجھے اپنے اور اپنے باپ کے مال سے تو نہیں دیتے۔آپ نے ازراہ ملاطفت فرمایا کہ جب تک میری گردن میں چادر کھینچنے کا بدلہ مجھے نہیں دوگے میں غلہ نہیں دونگا۔اس نے کہا کہ خدا کی قسم میں بدلہ نہیں دونگا۔آپ ﷺ نے تبسم فرمایا اور درگزر فرماتے ہوئے ایک آدمی کو حکم دیا کہ ایک اونٹ پر کھجور اور دوسرے پر جو لاد کر اس کے حوالے کردو۔

بہرحال آپ ﷺ کو ذاتی تکلیف پہنچانے کا آپ ﷺ انتقام نہیں لیتے تھے بلکہ کشادہ دلی سے معاف فرماتے تھے اور مجرم کے سامنے اس کا کوئی تذکرہ تک نہیں فرماتے تھے۔

(٦) حدّثنا هارون بن اسحاق الهمدانیّ ثنا عبدة عن هشام ابن عروة عن أبیه عن عائشة قالت ماضرب رسول اللهﷺ بیده شیئاً قطّ إلاأن یجاهد فی سبیل الله ولاضرب خادماً ولاامرأةً(١).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے ہاتھ سے جہاد کے علاوہ کسی موقع پر کسی بھی چیز کو نہیں مارا نہ خادم کو نہ کسی عورت کو۔

إلاأن یجاهد الخ، یعنی میدان جہاد میں جو مار ہوتی ہے وہ تو نبی اکرم ﷺ سے صادر ہوئی ہے جیسا کہ احد میں آپ ﷺ نے ابی بن خلف لعین کو نیزہ مارا تھا۔اس کے علاوہ کسی اور موقع پر آپ ﷺ نے کسی چیز کو نہیں مارا۔بعض لوگوں نے حدود وتعزیرات میں مارنے کو بھی جہاد کے ساتھ ملحق کیا ہے کہ وہ بھی

---

(١)صحیح مسلم ٢/٢٥٦ باب مباعدته ﷺ للآثام واختیاره من المباح اسهله الخ، کتاب الفضائل، السنن الکبریٰ للنسائی کتاب عشرة النساء باب ضرب الرجل زوجته، مصنف ابن ابی شیبة ٨/٣٦٨، سنن ابن ماجة ابواب النکاح باب ضرب النساء ص ١٤٢ واخرجه ابوداؤد فی سننه ٢/٣١٢ کتاب الادب باب فی التجاوز.(مختار)

اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر ضرب ہے لیکن یہ نہیں لکھا کہ حدود وقصاص میں بھی خود آپ ﷺ سے مار صادر ہوچکی ہے یا نہیں۔

ولاضرب خادماًو لاامرأة، شی کا لفظ عموم کی وجہ سے خادم اور عورت کو بھی شامل ہے۔تو گویا یہ دونوں ضمناً مذکور ہیں لیکن عموماً ان دونوں کی مار بکثرت ہوتی ہے۔لہٰذا ان کا ذکر خصوصی طور پر کیا گیا نیز ان کا مارنا تادیب کے طور پر اگرچہ جائز ہے لیکن آپ ﷺ کے اخلاق عالیہ نے یہ بھی گوارا نہیں فرمایا کہ تادیب کیلئے بھی ان پر ہاتھ اٹھائے۔البتہ اولاد کی اخلاقی ودینی تربیت کیلئے آپ ﷺ نے مارنے کا حکم دیا ہے۔یہاں اگر اشکال ہوجائے کہ بعض روایات میں نبی کریم ﷺ کا کچھ صحابہ کو مارنے کا ذکر ہے کسی کو سینہ پر مارا۔کسی کو پاؤں سے مارا۔اسی طرح حضرت جابرؓ کے بیمار اونٹ کو بھی مارا تھا۔اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مارنے سے مراد یہ ہے کہ اپنے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کیلئے آپ ﷺ نے کسی کو تکلیف پہنچائی ہو اور مذکورہ واقعات میں ایسا نہیں ہوا۔بلکہ آپ ﷺ نے کسی بیمار کے استشفاء کیلئے یا پھر کسی کو ایصال برکت کیلئے مارا ہے تو اسے مار نہیں کہتے بلکہ یہ تو عین ترحّم ہے۔

(۷) حدّثنا احمد بن عبدة الضبّیّ ثنا فضیل بن عیّاض عن منصور عن الزهریّ عن عروة عن عائشة قالت مارأیت رسول اللّٰہ ﷺ منتصراًمن مظلمة ظلمها قطّ مالم ینتهک من محارم اللّٰہ تعالیٰ شیٔ فاذا انتهک من محارم اللّٰہ تعالیٰ شیٔ کان من أشدّهم فی ذلک غضباً وماخیّر بین امرین إلاّاختار ایسرهما مالم یکن ماثما(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے کبھی بھی نبی کریم ﷺ کو کسی ایسے ظلم کا بدلہ لیتے ہوئے نہیں دیکھا جو (ذاتی طور پر) آپ ﷺ پر کیا گیا ہو۔الاّ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی حرمتوں میں سے کسی حرمت کا ہتک ہوا۔پھر جب حرمات الٰہی میں سے کسی حرمت

(۱)صحیح بخاری ۱/۵۰۳ کتاب المناقب باب صفة النبی ﷺ، صحیح مسلم ۲/۲۵۶ کتاب الفضائل باب مباعدة النبی ﷺ،سنن ابی داؤد ۲/۶۱۲باب فی التجاوز کتاب الادب باب فی التجاوز فی الامر،مسنداحمد۶/۸۵(مختار)

کی اہانت ہوتی تو آپ ﷺ اس کی وجہ سے سب سے زیادہ غضبناک ہوتے تھے۔ نیز نبی کریم ﷺ کو کبھی بھی دو باتوں کے درمیان اختیار نہیں دیا گیا مگر آپ ﷺ نے ان میں سے آسان تر کا انتخاب فرمایا جب تک کہ وہ (آسان تر) گناہ نہ ہوتا۔

منتصراً، انتصار سے اسم فاعل ہے جس کا معنیٰ انتقام اور بدلہ لینے کے ہیں۔ **مظلمۃ** لام کے کسرہ کے ساتھ اس چیز کو کہتے ہیں جو ظالمانہ طور پر لوٹی گئی ہو اور لام کے فتحہ کے ساتھ ظلم کے معنی میں مصدر ہے۔ **ظلمھا** مجہول کا صیغہ ہے نائب فاعل کی ضمیر نبی کریم ﷺ کو اور منصوب ضمیر مظلمۃ کو راجع ہے۔ مفعول کی طرف تعدیہ پر اعتراض ہوسکتا ہے جس کا جواب شرّاح نے یہ دیا ہے کہ یہاں حرف جر مقدر ہے یعنی ''ظلم بہا''۔

<u>انتقام لغت نبوی میں نہیں ہے:</u> اب کلام کا معنیٰ یہ ہوا کہ نبی کریم ﷺ ایسے ظلم کا انتقام نہیں لیتے تھے جو آپ ﷺ پر کیا گیا ہو خواہ وہ بدنی ظلم ہو، مالی ہو یا آپ ﷺ کی بے حرمتی کا ارتکاب ہوا ہو مثلاً **بسید بن الاعصم** یہودی نے آپ ﷺ کو زہر دیا جس کا اثر آپ ﷺ کی وفات تک باقی رہا۔ احد میں عتبہ نے آپ ﷺ کو پتھر مارے۔ طائف والوں نے آپ ﷺ کو لہولہان کردیا۔ کئی بدبخت شعراء نے آپ ﷺ کی ہجو کی آپ ﷺ کے حرم مبارک پر بھی انگلیاں اٹھائی گئیں مگر آپ ﷺ نے رواداری سے بڑھ کر فیاضی کے ساتھ سب کچھ معاف کردیا۔

مالم ینتھک، مجہول کا صیغہ ہے **نھک** سے افتعال مجرد کے معنیٰ میں بھی آتا ہے۔ ''**نھک الامر فلاناً**'' کا معنیٰ ہے کہ یہ چیز اس شخص پر غالب آئی اور اس کو تھکا دیا۔ **انتھاک الحرمات** کا معنیٰ ارتکاب حرمات ہے ناجائز کام میں ہاتھ ڈالنے کو کہتے ہیں۔ **من محارم اللہ، محارم محرم** کی جمع ہے دراصل مصدر میمی ہے جو مفعول کے معنیٰ میں آیا ہے۔ یہاں مراد وہ امور ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حرام کردی ہوں۔ **کان من اشدھم فی ذلک غضباً،** ارتکاب محرم کی وجہ سے آپ ﷺ سب سے زیادہ غضبناک ہوتے۔ اور انتقام بھی لیتے تھے اور یہی دراصل اعتدال ہے۔ اخلاق عالیہ کا کہ ذاتی اذیت میں کمال حلم وصبر اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کمال بے صبری تھی نہ ہر جگہ غیظ وغضب اور نہ ہر جگہ درگزر اور نظر اندازی تھی۔

نبی کی بے حرمتی سے صرف نظر کیوں: یہاں یہ اعتراض ہوتا ہے کہ نبی ﷺ پر ظلم بھی تو انتہاک حرمت ہے یعنی یہ بھی تو ایک بڑے حرام کام کا ارتکاب اور عظیم جرم ہے تو آپ ﷺ نے اس نظر سے اس جرم کو کیوں نہیں دیکھا۔ اوراس کا انتقام کیوں نہیں لیا اس کا جواب شرّاح یوں دیتے ہیں کہ ٹھیک ہے کہ یہ بھی ایک دینی جرم اور حق الٰہی کا ضیاع ہے لیکن پیغمبر کی اذیت کبھی کبھی نادانستہ طور پر یا سادگی یا دیہاتی گنوار پن کی وجہ سے کسی سے صادر ہو۔ تو اس صورت میں اغماض اور عفو کا معاملہ برتنا زیادہ مناسب ہے جیسا کہ بعض اعراب مخلص ہو کر بھی گستاخی کر جاتے تھے رہے منافقین اور کفار تو ان کے حق میں آپ ﷺ کی چشم پوشی دراصل تالیف قلب اور دیگر لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کرنے کیلئے بھی ہوتی تھی ورنہ نبی کی بے حرمتی کی نسبت زیادہ بڑا جرم تو وہ کفر صریح کی صورت میں کر رہے تھے۔ خلاصہ یہ کہ جہاں مصلحت ہوتی وہاں آپ اغماض سے کام لیتے خواہ وہ کفار کے ساتھ ہو یا مسلمانوں کے ساتھ اور اگر حقوق الٰہی کے ضیاع کا مسئلہ ہوتا اور سزا ہی مناسب ہوتی تو آپ ﷺ غصہ بھی ہوتے تھے اور انتقام بھی لیتے تھے مگر ذاتی تکلیف کی وجہ سے نہیں بلکہ حقوق الٰہیہ کے ضیاع کی وجہ سے۔

اولین ترجیح امت پر سہولت: مالم یکن ماثما، ماثم اثم کے معنی میں مصدر میمی ہے بخاری شریف روایت میں ہے۔ فان کان اثماً کان ابعدالناس منه، مطلب یہ ہے کہ جن دو امور میں آپ ﷺ کو اختیار دیا جاتا تھا اگر ان میں سے ایک سہل اور دوسرا مشکل ہوتا تھا۔ تو آپ ﷺ امت کی سہولت کو ترجیح دیتے تھے تاکہ امت کو تکلیف سے بچا سکیں۔ مثلاً کسی جنایت کی وجہ سے دو سزاؤں میں اختیار دیا گیا تو آسان تر کو ترجیح دیتے۔ کفار کے قتل اور جزیہ یا فدیہ میں قتل کا انتخاب نہیں فرماتے تھے۔ عبادت میں مجاہدہ اور اقتصاد دونوں کی اجازت ہوتی تو آپ ﷺ اقتصاد کو ترجیح دیتے۔ اس لئے کہ امت پر آسانی اور ان کو مشقت سے بچانے کی آپ ﷺ ہمیشہ فکر کرتے تھے اور اسی وجہ سے لوگوں کی دلوں میں آپ ﷺ کی عزت و محبت بھی بڑھ جاتی تھی۔

ہمارے بعض فضلاء اور بالخصوص نئے نئے فارغ ہونے والے عوام میں جا کر تشدد کی انتہا کر جاتے ہیں۔ ہر ہر بات پر گرفت ہوتی ہے چھوٹے بڑے گناہ پر جنت کو حرام کر دیتے ہیں۔ عوامی

رواجوں اور علاقائی روایات پر بدعتوں کے فتوے لگا لگا کر اور مستحبات کے ترک پر وعیدات سنا کر لوگوں کا ناک میں دم کر لیتے ہیں اس طرح لوگ ان سے دور دور رہتے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی اس کیلئے ماحول اتنا تلخ ہوجاتا ہے کہ گزارہ مشکل ہوجاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا رویہ عوام کے ساتھ خیر خواہانہ ہوتا تھا اور ان کو ہر پریشانی سے بچانے کی فکر میں رہتے تھے۔ اس لئے آسانی کو ترجیح دیتے تھے۔ البتہ اگر وہ جہت جو آسان ہو، شرعاً گناہ اور ناجائز ہوتی تو آپ ﷺ اس کے قریب بھی نہ جاتے تھے۔ ایسی صورت میں مشکل جہت کا انتخاب ناگزیر ہوتا تھا۔

(۸) حدّثنا ابن أبی عمر ثنا سفیان عن محمّد بن المنکدر عن عروة عن عائشة قالت استاذن رجل علی رسول اللہ ﷺ وأنا عنده فقال بئس ابن العشیرة او اخ العشیرة ثمّ اذن له فألان له القول فلمّا خرج قلت یارسول اللہ ﷺ قلت ماقلت ثم النت له القول فقال یا عائشة إنّ من شرّ الناس من ترکه الناس او ودعه الناس اتّقاء فحشه(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کے پاس آنے کی اجازت چاہی آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ شخص بہت برا آدمی ہے اپنے قبیلے کا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے اس شخص کو آنے کی اجازت دیدی۔ پھر اس کے ساتھ نرم کلامی سے بات کرنے لگے جب وہ آدمی باہر چلا گیا تو میں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ ﷺ نے اس شخص کے بارے میں وہ بات کہی جو کہی (یعنی اس کی مذمت کی) پھر (کیوں) بات کرنے میں نرمی فرمائی؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے عائشہؓ وہ شخص بدترین لوگوں میں سے ہے جسے دیگر لوگ اس کی بدکلامی کے ڈر کی وجہ سے چھوڑ دیں۔

---

(۱) صحیح بخاری ۸۹۱/۲ کتاب الادب باب لم یکن النبی ﷺ فاحشا ولامتفاحشاً، صحیح مسلم ۳۲۲/۲ کتاب البر والصلة والادب باب مدارة من یتقی فتحشه، سنن ابی داؤد ۳۱۲/۲ کتاب الادب باب فی حسن العشیرة، جامع ترمذی کتاب البر والصلة باب ماجاء فی المداراة(مختار)

استأذن رجل، اس شخص کی تعیین میں تین ناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱) عیینہ بن حصن الفزاری، جس کو الاحمق المطاع بھی کہا جاتا تھا نبی کریم ﷺ کے زمانے میں اس کی بدمعاشی اور اذیتوں سے لوگ تنگ تھے۔

۲) حضرت مخرمہ بن نوفل الزہریؓ (مسورؓ کے والد) جو ابتداء میں مؤلفۃ القلوب میں سے تھے اور انتہائی زبان دراز تھے لیکن ان کے صحیح الاسلام ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔

۳) خزیمہ

مؤخر الذکر کا نام ایک انتہائی ضعیف روایت میں وارد ہے اس لئے یہ احتمال بھی ضعیف ہے۔

حضرت مخرمہؓ قریش کے معزز صحابی ہیں اس لئے بعض شراح نے تو اس کا انکار کیا ہے البتہ بعض حضرات کا خیال ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اسلام لانے سے قبل جب وہ مؤلفۃ القلوب میں سے تھے اس دور میں یہ واقعہ ہوا ہو۔

جبکہ اکثر شراح کا خیال یہ ہے کہ یہ عیینہ بن حصن فزاری ہے یہ منہ پھٹ قسم کا آدمی تھا فتح مکہ سے پہلے مسلمانوں میں شامل ہوا تھا اور فتح مکہ کے دوران مولفۃ القلوب میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں مرتد ہوا پھر گرفتار ہو کر ابوبکرؓ کے سامنے پیش ہوا اور توبہ سے جان بخشی ہوئی لیکن حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں بھی اس کے ناجائز حرکات کا سلسلہ جاری رہا۔ بلکہ ابن حجرؒ نے کتاب الام للشافعیؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس کو حالت ارتداد میں قتل کر دیا تھا۔ اس صورت میں تو اس کی صحابیت ہی ختم ہو جاتی ہے لیکن بعض حضرات نے اسے صحابی کہا ہے۔ اور یہ کہ اس کی موت حضرت عثمانؓ کے زمانے میں واقع ہوئی۔

<u>کیا نبی کریم ﷺ نے غیبت کی؟</u> بئس ابن العشیرۃ اوقال اخو العشیرۃ، عشیرہ سے خود اس آنے والے شخص کا قبیلہ اور خاندان مراد ہے اور عربی زبان میں خاندان کی طرف نسبت ''ابن'' اور ''اخ'' دونوں طریقوں سے ہوتی ہے۔ اس جملے پر بعض ظاہر پرستوں نے یہ اشکال کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا یہ کلام غیبت کے زمرے میں آتا ہے کیونکہ اس شخص کی غیر حاضری میں آپ ﷺ نے اس کی تنقیص کی ہے اس کا

ایک جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے حاضرین اور خصوصی طور پر حضرت عائشہؓ کو خبردار کرنے کیلئے آنے والے کی برائی بیان کی تا کہ وہ محتاط رہیں اور آنے والے کی ضرر سے محفوظ رہ سکیں۔اس کے سامنے راز کی بات نہ کہدیں بلکہ احتیاط سے کام لیں نیز اس کی بدزبانی سے پریشان نہ ہوں اور کسی شریر کی شر سے بچانے کیلئے لوگوں کو خبردار کرنا غیبت محرمہ نہیں ہے۔چنانچہ علامہ ابن حجرؒ نے اس عیینہ بن حصن کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ جب نبی کریم ﷺ کے پاس آیا پردے کا حکم ابھی نازل نہیں ہوا تھا حضرت عائشہؓ ساتھ بیٹھی تھیں اس نے پوچھا کہ یہ کون بیٹھی ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ عائشہ بنت ابی بکرؓ ہیں وہ بولا کہ کیا میں تیرے لئے اپنے بیٹوں کی ماں (بیوی) نہ چھوڑوں جو اس (عائشہ) سے بہتر ہے جس پر حضرت عائشہؓ کو بہت غصہ آیا۔ نبی کریم ﷺ نے عیینہ کو باہر نکل جانے کا حکم دیا اور جب حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا"**هذا الاحمق المطاع**" یہ اپنی قوم کا بیوقوف سربراہ ہے۔

دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ کسی فاسق معلن کے فسق کو بیان کرنا غیبت نہیں ہے۔اور عیینہ کم از کم ان دنوں جہراً بدمعاشی کا ارتکاب کرتا رہتا تھا چنانچہ ٦ھ میں نبی کریم ﷺ کے بیس اونٹوں کو چرا کر لے جانے والوں میں عیینہ اور اس کے بیٹے ملوث تھے جن کے تعاقب میں نبی کریم ﷺ نے لشکر بھیجا اور غزوہ ذات قرد واقع ہوا۔

فالان لہ القول، نبی کریم ﷺ نے رواداری اور مدارات کے طور پر اس کے ساتھ کلام میں نرمی اور ملاطفت فرمائی تا کہ اسے اور اس کی قوم کو اسلام کی طرف راغب کر سکیں اور اس کے شر سے لوگوں کو بچا سکیں۔ **قلت ماقلت ثم النت الخ،** حضرت عائشہؓ نبی کریم ﷺ کے عمل میں حکمت جاننا چاہتی ہیں کہ جب ایک بار اس شخص کو قوم کا برا آدمی قرار دیا تو پھر برے آدمی کی طرح رویہ بھی ہونا چاہئے تھا۔باتوں میں لچک اور نرمی تو کم از کم نہیں ہونی چاہئے حالانکہ آپ ﷺ نے تو اس کے ساتھ بڑی نرمی سے باتیں کیں اس میں کونسی حکمت ہے؟

<u>حکمتوں پرمبنی مدارات:</u> **ان من شر الناس من ترکہ الناس او ودعہ الناس اتقاء فحشہ،** ودع یدع کے معنیٰ ہیں ترک کرنا لیکن عرب کے اکثر لغات میں اس کا ماضی استعمال نہیں ہوتا۔

مضارع اورامر کے صیغے مستعمل ہیں کہتے ہیں کہ "امات الناس ماضی یدع ویذر" کہ لوگوں نے ودع یدع اور وذر یذر میں ماضی کومروادیا ہے۔یعنی متروک الاستعمال ہے۔اس لئے بعض لوگوں نے تو یہ کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا اس مقام پر ودعہ کہنا شاذ ہے لیکن ملا عصامؒ کہتے ہیں کہ یہ کلام ان لغات عرب پرمبنی ہے جن میں اماتۃ اورترک نہیں ہے جملے کا معنی یہ ہے کہ جس شخص کولوگ اس کی بدزبانی کی وجہ سے چھوڑدیں وہ بدترین لوگوں میں سے ہے اس جملے کا مطلب کیا ہے؟ اس سلسلے میں دوقول منقول ہیں۔

کلام نبوی ﷺ کا مقصد: اول یہ کہ نبی کریم ﷺ اس حکمت کو بیان کرتے ہیں جس کے بارے میں سوال ہوا ہے اوراپنے رویّے کیلئے توجیہ اورعلت بیان کررہے ہیں حاصل کلام یہ ہے کہ میں تواس شخص کے ساتھ نرم رویہ صرف بطورمدارات اورسیاست دینیہ کے اختیارکررہاہوں اگرچہ یہ شرالناس ہی ہے لیکن اس کی بدزبانی اوراس کے قوم کی شر سے بچنے کیلئے اورقوم کے تالیف قلب کیلئے اس کے ساتھ اچھارویہ اپنایا ہے اور یہ بلا ریب جائز بلکہ مستحسن اور مندوب ہے۔اس سے بڑھ کرآپ ﷺ ایسے لوگوں کو بڑے بڑے اموال بھی دیتے تھے یہ مداہنت اور منافقت نہیں تھی نہ دینی اقدارکودنیا کی خاطر داؤپرلگاناتھا نہ اس میں آنے والے شخص کی کوئی صفائی اورتائیدتھی بلکہ "بئس ابن العشیرہ" بھی اپنی جگہ سچی بات تھی۔

دوسری توجیہ بعض شراح نے یہ کی ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت عائشہؓ سے یہ کہتے ہیں کہ تیرے کلام سے تویہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی برے لوگوں کے ساتھ بدزبانی اورگالی گلوچ کارویہ اپناؤں گا حالانکہ مجھ سے یہ توقع بے جا ہے۔کیونکہ بدزبان آدمی توشر الناس ہوتاہے اورمیں شرّالناس نہیں بنناچاہتا۔اوراگرچہ یہ شخص تلخ کلامی کا مستحق بھی ہے لیکن مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کیونکہ پھر لوگ مجھے اس فحش گوئی کی بناء پر چھوڑدیں گے اس لئے اس قسم کارویہ اپنایا ہے اوریہ مستحسن امر ہے۔اسے کچھ لوگ مدارات، کچھ مصانعت، کچھ عقل وحکمت اورکچھ تقیہ کانام دیتے ہیں۔

واضح رہے کہ ملاعلی قاریؒ نے دوسری توجیہ کواس مقام کی تشریح کے طورپرنامناسب بلکہ خطا کہا ہے اورپہلی توجیہ کوترجیح دی ہے۔

(۹) حدثنا سفیان بن وکیع ثنا جمیع بن عمر بن عبدالرحمٰن

العجليّ حدّثني رجل من بني تميم من ولدابي هالة زوج خديجة يكنّىٰ أباعبدالله عن ابن لأبي هالة عن الحسن بن علي رضي الله عنهما قال قال الحسين بن عليّ سألت أبي عن سيرة رسول اللهﷺ في جلسائه فقال كان رسول اللهﷺ دائم البشر سهل الخلق ليّن الجانب ليس بفظٍّ ولاغليظٍ ولاصخّابٍ ولافحّاشٍ ولاعيّابٍ ولامشّاحٍ يتغافل عمّالايشتهي ولايؤئس منه ولايجيب فيه قد ترك نفسه من ثلاث المراء والاكبار ومالايعنيه وترك الناس من ثلاث كان لايذّم احداً ولايعيبه ولايطلب عورته ولايتكلّم إلاّفيما رجا ثوابه واذا تكلّم اطرق جلسائه كانّما على رؤسهم الطيرفاذاسكت تكلّموا لايتنازعون عنده الحديث ومن تكلّم عنده انصتواله حتّى يفرغ، حديثهم عنده حديث اوّلهم يضحک ممّا يضحكون منه ويتعجّب ممّا يتعجّبون ويصبر للغريب على الجفوة في منطقه ومسألته حتّى ان كان اصحابه ليستجلبونهم ويقول اذا رأيتم طالب حاجة يطلبها فارفدوه ولايقبل الثناء إلاّمن مكافئ ولايقطع على احدحديثه حتّى يجوز، فيقطعه بنهي اوقيام.

ترجمہ: حضرت حسنؓ کہتے ہیں کہ مجھے (میرے بھائی) حسینؓ نے بتایا کہ میں نے اپنے والدمحترم (حضرت علیؓ) سے نبی اکرمﷺ کے اہل مجلس کے ساتھ رویے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ نبی کریمﷺ ہمیشہ خندہ پیشانی اورنرم اخلاق والے رہتے تھے۔نرم اخلاق والے اورجلدی مہربان ہونے والے تھے۔نہ آپﷺ سخت گو تھے نہ سنگ دل، نہ چیخنے چلانے والے تھے نہ بدزبان تھے، نہ عیب چین تھے نہ بخیل تھے، غیرمرغوب چیزوں سے غفلت برتتے تھے اوراس سے دوسروں کومایوس بھی

نہیں کرتے تھے اور خود اس کو آپ ﷺ نے تین باتوں کے بارہ میں خود کو روک رکھا
تھا۔جھگڑے سے، تکبر اور لایعنی کاموں سے اور تین چیزوں سے لوگوں کو بچا رکھا تھا۔
آپ ﷺ کسی کی مذمت نہیں کرتے تھے اور نہ کسی کی برائی بیان کرتے تھے نہ عیب
جوئی کرتے تھے۔کسی سے بات کرتے تو وہی بات کرتے جو باعث اجر وثواب ہو۔
اور جب آپ ﷺ بولتے تو ہم نشین سر جھکا کر (بغور) سنتے تھے جیسے ان کے سروں پر
پرندے بیٹھے ہوں۔جب آپ ﷺ چُپ ہو جاتے تھے تو تب وہ بات کرتے۔

آپ ﷺ کے سامنے وہ کسی بات میں نزاع نہیں کرتے تھے۔آپ ﷺ کے ہاں کوئی بات کرتا تو سب حاضرین خاموش ہو کر سنتے۔حتیٰ کہ وہ اپنی بات سے فارغ ہو جاتا۔آپ ﷺ کی مجلس میں ہر ایک کی باتیں قابل قدر سمجھی جاتی تھیں جیسا کہ وہ پہلا بولنے والا اور پہلا مقرر ہو۔جس بات پر صحابہ ہنستے آپ ﷺ بھی ہنستے اور جس بات پر وہ تعجب کرتے آپ ﷺ بھی تعجب فرماتے تھے۔مسافر لوگوں کی باتوں میں اور مانگنے والوں کے درشت لہجہ کو برداشت کرتے تھے۔یہاں تک کہ صحابہ کرامؓ ایسے پردیسی لوگوں کو آپ ﷺ کی مجلس میں کھینچ کر لاتے تھے آپ ﷺ صحابہ کو حکم دیتے کہ جب کسی حاجت مند کو حاجت طلب کرتے ہوئے دیکھو تو اس کی مدد کیا کرو صرف ان لوگوں سے تعریف قبول کرتے تھے جو آپ ﷺ کی شان کے لائق تعریف کرتے تھے کسی کی قطع کلامی اس وقت تک نہ کرتے تھے جب تک وہ حدّ اعتدال سے تجاوز نہ کرتا اور اگر کرتا تو اسے روک کر اس کی بات کاٹ لیتے تھے یا خود اٹھ کر چلے جاتے تھے۔

<u>بشاشت نبوی ﷺ:</u> **کان رسول اللہ ﷺ دائم البشر الخ،** بشر چہرے کے اس حصے کو کہتے ہیں جو ظاہر ہو اور عام حالات میں اس پر نظر پڑے۔اسی حصہ پر غم اور خوشی کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں بشریٰ بمعنی خوشخبری بھی اسی سے نکلا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے جو تغیر آتا ہے وہ بھی سب سے پہلے چہرے پر ظاہر ہوتا ہے اور محسوس کیا جا سکتا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ آپ ﷺ کے رخ انور پر ہمیشہ بشاشت ہوتی تھی اور آپ ﷺ ہمیشہ ہنس مکھ رہتے تھے اور آپ ﷺ کی یہ بشاشت ہر ایک کیلئے ہوتی تھی اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس سے پہلے شمائل میں گزر چکا ہے کہ آپ ﷺ متواصل الاحزان تھے یعنی ہمیشہ غم اور فکر میں

رہتے تھے۔شراح نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ آپ ﷺ کی پریشانی اور فکر مندی تو امور آخرت کے سلسلے میں ہوتی تھی اور امت کو قیامت کی ہولنا کی سے اور جہنم کے عذابوں سے نجات کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہتی تھی لیکن دنیوی امور میں کمال توکل اور زہد کی بناء پر آپ ﷺ کو کوئی فکر نہیں ہوتی تھی اور ظاہری طور پر ہشاش بشاش نظر آتے تھے کہ ہمنشین آپ ﷺ سے تنگ نہیں ہوتے تھے اور یہ اخلاق نبوی ﷺ کا کمال ہے۔

سهل الخلق لين الجانب الخ، نرم اخلاق ،نرم خوئی کی وجہ سے ہر ایک پر جلدی سے مہربان ہو جاتے تھے اور لوگوں کے دلوں کو موہ لیتے تھے۔**لیس بفظ و لاغلیظ** ،فظ سخت طبیعت کے آدمی کو کہتے ہیں اور تقریباً یہی معنیٰ غلیظ کے بھی ہیں۔لیکن اول کو زبان کی سختی اور دوسرے کو دل کی سختی پر محمول کیا گیا ہے۔ قرآن میں بھی غلیظ کی اضافت قلب کو ہوئی ہے۔اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے دونوں صفات کی نفی کی ہے اور اسے آپ ﷺ کی مقبولیت کا راز بتایا ہے۔فرماتے ہیں **ولو کنت فظاً غلیظ القلب لانفضّوا من حولک**، اگر آپ ﷺ سخت اور سنگدل ہوتے تو صحابہؓ آپ ﷺ سے منتشر ہو جاتے لیکن یہ صفت مومنین کے حق میں مطلوب تھی جبکہ کفار کے حق میں آپ ﷺ کو حکم تھا کہ ''**واغلظ علیهم**'' ان کے ساتھ شدّت سے پیش آؤ۔**لاصخّاب و لافحّاش و لاعیّاب**،عیاب کے معنیٰ عیب بیان کرنے والے۔بخاری ومسلم میں روایت ہے کہ "**ماعاب طعاماً قط**" کہ آپ ﷺ کبھی کسی کھانے میں عیب نہیں نکالتے تھے کیونکہ اس طرح کھانا بنانے والے کی دل شکنی ہوتی ہے اور یہ مکارم اخلاق سے بعید ہے۔البتہ اگر کسی کی تربیت اور تادیب مقصود ہو تو پھر تنقید کی جاسکتی ہے۔یہاں جن صفات کی نفی کی گئی ہے بظاہر مبالغہ کے صیغوں کی نفی ہے لیکن یہ صرف مبالغہ کی نفی نہیں مبالغہ **فی النفی** کیلئے ہے یعنی یہ صفات آپ ﷺ میں بالکل نہیں پائی جاتی تھیں یہ معنیٰ نہیں کہ کم کم تو موجود ہوں اور بکثرت واقع نہ ہوں۔

بہر حال آپ ﷺ نکتہ چینی اور عیب جوئی بھی نہیں کیا کرتے تھے۔بعض لوگ ہر وقت دوسروں کے عیوب کی تلاش میں رہتے ہیں۔محاسن کی طرف ان کی نظر اٹھتی ہی نہیں۔دوسروں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ان سے دوست، استاد، پڑوسی، والدین اور اہل محلہ میں سے کسی کی عزت محفوظ نہیں رہتی۔دراصل اس بدباطن شخص کا اپنا آئینہ خراب ہوتا ہے جس میں عکس صحیح نہیں پڑتا۔صحیح انسان تو وہی ہے جو دوسروں کے

محاسن کی تلاش میں ہو۔حسن ظن کے حامل ایسے بزرگ بھی ہیں جنہیں کوئی بھی شخص برانہیں لگتا۔مثلاً ہمارے والد ماجد حضرت شیخ الحدیث نوراللہ مرقدہ کواگر ساری دنیا کہے کہ فلاں ایسا برا آدمی ہے فلاں اتنا گناہوں میں ڈوبا ہوا ہے مگر حضرت کو گویا یہ بات سرے سے سمجھ میں نہیں آتی۔انہیں ہر شخص پاکیزہ نظر آتا ہے زاہد و متقی اور عادل نظر آتا ہے۔بہر حال عیب گیری بجائے خود بڑا عیب ہے۔لوگ ایسے شخص کی مجلس سے دور بھاگتے ہیں۔

ولامشّاح،شح سے باب مفاعلہ کے اسم فاعل کا صیغہ ہے شح بخل کی نسبت عام معنیٰ پر بولا جاتا ہے جس میں مال،عہدے وغیرہ پر بخل آجاتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ سے ہر قسم کا بخل منفی تھا کیونکہ بخیل آدمی کے پاس دو سال کے بعد جائیں تو بھی چیں بجبیں ہوجاتا ہے۔اس لئے لوگوں سے اس کا رابطہ کٹ جاتا ہے۔بعض نسخوں میں مدّاح کا لفظ آیا ہے۔شراح نے اسے بھی صحیح کہا ہے یعنی آپ ﷺ زیادہ مدح کرنے والے نہ تھے مثلاً کھانے،مکان،لباس وغیرہ کی مدح میں مبالغہ سے گریز کرتے تھے کیونکہ ان اشیاء کی زیادہ مدح ان چیزوں سے محبت پر مبنی ہوتی ہے جس سے آپ ﷺ بری تھے۔البتہ کبھی کبھی آپ ﷺ تھوڑی سی مدح کرلیا کرتے تھے۔

یتغافل عما لایشتھی الخ، اکثر لوگ اپنی مرضی کے مطابق قسم قسم کے پروگرام بناتے ہیں جو مباح ہونے کے باوصف بعض حضرات کو پسند نہیں ہوتے ایسے موقع پر حکمت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کو منع کرنے کی بجائے خود لاتعلق ہوجاؤ۔اور اس پروگرام سے اپنی بے تعلقی نبھاؤ۔اگر ساتھی مشترک طور پر کوئی پروگرام بنائیں۔تو ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے انہیں مت ٹوکیں۔اور اگر ان کے ساتھ شریک نہ ہونا چاہیں تو بتکلف انجان بن جاؤ۔آپ ﷺ ایسے موقعوں پر خود تو انہماک سے حصہ نہیں لیتے تھے لیکن وسعت ظرفی کا مظاہرہ کرکے دوسروں کو مایوس نہ کرتے۔

اور اس جملے کا یہ معنیٰ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی غیر مناسب بات کی فرمائش کرتا جو آپ ﷺ کا ناپسند ہوتا تو اول تو خود کو انجان بنادیتے۔لیکن اس کو اپنے کرم و سخاوت سے بالکل مایوس بھی نہیں ہونے دیتے تھے بلکہ خاموشی کے ساتھ اس کی بات کو ٹال دیتے تھے۔

تو یتغافل عما لایشتھی ،کامعنی ہے کہ جو بات یا جو کام آپ نہیں چاہتے تھے اس کے کرنے سے بتکلف غفلت برتتے تھے۔ و لایؤیس منه، یاء کے ضمہ کے ساتھ ایاس سے ہے یعنی کسی اور کوایسے غیر مرغوب فعل سے مایوس نہیں کرواتے تھے یعنی اگر کوئی ایسا کام کرتا جو مباح ہو لیکن آپ ﷺ کے نزدیک قابل رغبت نہ ہو تو اس کو کرنے دیتے اور کرنے والے کی رغبت کو ملحوظ رکھتے لیکن اپنی عدم رغبت کا مظاہرہ زبان سے کرنے کی بجائے بصورت تغافل اور عدم توجہ فرماتے۔

بعض شراح نے ''منه'' کاضمیر عما لایشتھی کی بجائے نبی کریم ﷺ کو راجع کیا ہے پھر مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ لوگوں کو اپنی طرف سے مایوس نہیں کرتے تھے اگر کوئی آپ ﷺ سے کسی کام کی توقع رکھتا تو آپ ﷺ اس کو کورا جواب دے کر مایوس نہیں کرتے تھے بلکہ اگر وہ کام آپ ﷺ نہ کرتے تو بھی ان کو کرنے دیتے اور نفرت کا اظہار نہ کرتے البتہ، و لایجیب فیه ،اگر کوئی دعوت دیتا تو ایسے غیر مرغوب کام میں شامل نہ ہوتے بلکہ خوش اخلاقی اور نرم گفتار سے اس کو واپس کردیتے تھے۔ بعض علماء حضرات بھی لوگوں کے جائز کھیل کود اور مشاغل کو ایسے انداز میں لے لیتے ہیں جیسے وہ گناہ کبیرہ کررہے ہوں۔ جس کی وجہ سے وہ لوگوں سے دور ہوجاتے ہیں ایسا کرنے کی بجائے مباح کاموں میں لوگوں کی خواہشات کا کشادہ دلی سے لحاظ کرنا چاہئے یہ ٹھیک ہے کہ بعض اس طرح کے کام علماء کی حیثیت سے قابل ترک اور وقار کے منافی ہوتے ہیں اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ ان کو ترک کیا جائے مگر اس کے کرنے والوں کو جہنم کی وعیدیں سنانا بھی مصلحت کے خلاف ہوتا ہے نہ شرعاً اس کی کوئی راہ نکلتی ہے۔

قد ترک نفسه من ثلاث، ترک منع کے معنی کو متضمن ہے یعنی تین باتوں کو اپنی ڈائری سے نکال دیا تھا اور ان باتوں کے قریب بھی نہیں جاتے تھے۔ المراء، بعض شراح نے اس کا ترجمہ الجدال بالباطل کیا ہے لیکن ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ مطلق جدال مراد ہے۔ یعنی بحث ومباحثہ اور کٹ حجتی پسند نہ تھی۔ جیسے کہ ہمارے بعض طالب علم وقت اور استعداد کو سیاسی بحثوں میں ضائع کردیتے ہیں یہ کوئی نتیجہ خیز بحث نہیں ہوتی بلکہ محض دماغی تھکان اور وقت کا ضیاع ہوتا ہے ساتھ ساتھ محبتوں کو نفرتوں میں تبدیل کرنے کا موجب بنتا ہے۔

والاکبــــار، باء کے ساتھ یہ تکبر یعنی خود کو بڑا ظاہر کرنے کو کہتے ہیں یعنی آپ ﷺ نشست وبرخاست اور آمدورفت میں خود کو امتیازی مقام دینے سے کتراتے تھے۔ جہاں تک ''انا سید ولد آدم'' اور اس جیسے کلمات ہیں۔ تو وہ تحدیث نعمت کے طور پر آپ ﷺ نے ذکر فرمائے ہیں۔ فخر ومباہات کیلئے نہیں۔ بعض نسخوں میں اکبــار کی جگہ اکثــار ثاء کے ساتھ منقول ہے اس کا معنی ہے کثرت کلام یعنی آپ ﷺ زیادہ بولنے سے بچتے تھے۔ و مالایعنیه، یعنی جو چیزیں دین و دنیا میں بے فائدہ ہوتی تھیں اس سے بھی آپ ﷺ دور رہتے ہیں۔

وتــرک النــاس من ثلاث، پہلے تین امور کو تو نبی کریم ﷺ نے اپنی رعایت کرتے ہوئے چھوڑا تھا لیکن ان تین امور کو دیگر لوگوں کی رعایت کرتے ہوئے چھوڑ دیا تھا، کــان لایــذم احــداً ولایـعیبه، یعنی دوست ہو یا دشمن کسی کی مذمت اس کے روبرو نہیں کرتے تھے نہ اس کی غیر حاضری میں اس کے عیوب بیان کرتے تھے یا معنی یہ کہ کسی شخص کے اختیاری افعال پر اس کی مذمت نہیں کرتے تھے اور نہ کسی کے فطری اور طبعی عیوب پر انگشت نمائی فرماتے تھے جبکہ بعض شراح نے کہا ہے کہ یہاں پر ذم اور عیب دونوں ہم معنیٰ ہیں اور ولایعیبہ صرف تاکید کے طور پر کہا گیا ہے مگر یہ بات یاد رہے کہ آپ ﷺ کی یہ رعایت ان لوگوں کیلئے تھی جو معصیت کے مرتکب نہ ہوں نہ حدود شرعیہ سے تجاوز کر گئے ہوں۔ ولایطلب عورته، نہ کسی شخص کے مستور امور اور پردوں کے پیچھے پڑتے تھے عورت سے مراد وہ امور ہیں جن کا اظہار موجب رنج وخفت ہو۔ تو گویا کسی کے عیوب کا اظہار کرنے سے کتراتے تھے ہم لوگ ہر وقت دوسروں کے حالات کریدنے کی کوشش کرتے ہیں یہ بری عادت ہے ہمارے حکمران تو ہر اہم شخصیت کی فائل بناتے ہیں ڈکٹیٹروں میں یہی بڑا عیب ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کے عیوب کا ریکارڈ رکھتے ہیں تا کہ انہیں بلیک میل کر کے ان کی سرگرمیاں قابو میں رکھیں آپ ﷺ اس سے احتراز کرتے اور دوسروں کو اس سے احتراز کی ترغیب بھی دیتے تھے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ من تتبع عورة اخیه المسلم تتبع اللّٰه عورته ومن یتّبع اللّٰه عورته یفضحه ولوفی جوف رحله(۱)،

---

(۱)جامع ترمذی ۲/۲۷ ۴ باب ماجاء فی تعظیم المؤمن(ابواب البروالصلة) ۱۲ (مختار)

جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے پردے کے پیچھے پڑا اللہ تعالیٰ اس کے پردے کے پیچھے پڑ جائے گا۔اور جس کے پردے کے پیچھے اللہ تعالیٰ پڑ جائے اس کو اللہ تعالیٰ رسوا کر دے گا اگر چہ وہ اپنے کجاوے کے اندر ہو یا وہ اپنے گھر کے بیچوں بیچ رہے۔

و لایتکلم الاّفیمار جاثوابه، یہ تیسری بات ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی سے بات کرتے تو ایسے امور کے بارے میں کرتے جن میں متکلم اور مخاطب کے ثواب کی توقع ہو۔بے مقصد بات نہیں کرتے تھے نہ دنیوی مقاصد میں منہمک رہتے بلکہ لوگوں کے اخروی منافع ملحوظ ہوتے تھے۔اس صورت میں ثوابہ کا ضمیر احد من الناس کو راجع ہے اور اسی کو ملا علی قاریؒ نے ترجیح دی ہے۔

<u>شوق استماع:</u> **اطرق جلساء ہ**، اطراق کا معنی ہے سر جھکانا یعنی آپ ﷺ بولتے تو صحابہ کرامؓ سر جھکا کر غور سے سنتے تھے۔اور یوں ساکت وصامت اور ہمہ تن متوجہ رہتے "**کانّ علیٰ رؤسهم الطّیر**" گویا سروں پر پرندے بیٹھے ہیں اور ان کے اڑنے کے خوف سے وہ حرکت نہیں کرتے ہوں۔اس طرح یہ کمال استماع سے کنایہ ہے جو کہ آپ ﷺ کی ہیبت رعب اور صحابہؓ کے کمال ادب کی وجہ سے تھا۔

بعض شراح نے اس جملے کو استلذاذ سے کنایہ ٹھہرایا ہے یعنی صحابہؓ آپ ﷺ کے کلام سے لذت حاصل کرتے تھے اور اس کی تفصیل یوں کی ہے کہ کوّے اور مینا وغیرہ بعض پرندے اونٹ کے سر پر بیٹھ کر اس کے سر سے جوئیں اور دیگر تکلیف دہ کیڑے چن چن کر کھاتے ہیں اس صورت میں اونٹ سر کو بالکل ساکن کر کے رکھ دیتا ہے تاکہ پرندے یہ موذی کیڑے چن لیں اور اس کو راحت ملے یونہی صحابہ کرامؓ کو آپ ﷺ کی باتوں میں لذت اور روحانی سکون ملتا تھا۔لہٰذا وہ سرنگوں ہو کر سنتے تھے۔اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دوران تعلیم درس کو خاموشی سے سننا چاہئے کوئی اشکال ہو تو اختتام درس کے بعد استاد سے پوچھنا چاہئے۔

لایتنازعون عنده الحدیث، آپ ﷺ کی مجلس میں ایک دوسرے کی بات مداخلت اور قطع کلامی نہیں کرتے تھے یا مطلب یہ ہے کہ باتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑتے نہیں تھے۔**ومن تکلّم عنده الخ**، یہ "**لایتنازعون**" کی تفسیر ہے۔

حدیثھم عندہ حدیث اوّلھم، "اوّلھم" کا معنی ہے سب سے پہلا۔اس کے مصداق تین قول ہیں۔ پہلا یہ کہ یہاں مراد پہلے بولنے والا ہے یعنی آپ ﷺ کی مجلس میں ہر بولنے والے کو اس طرح سنا جاتا تھا جس طرح کہ سب سے پہلے بولنے والے کو توجہ، ہمہ تنی اور التفات سے سنا جاتا تھا۔

ہر بولنے والے کی قدر: عموماً جلسوں میں آپ کو یہ تجربہ ہو چکا ہوگا کہ ابتداء میں تو سامعین میں جوش ہوتا ہے اور بات جیسے بھی ہو سن لیتے ہیں لیکن جوں جوں وقت گزرتا ہے وہ تھک کر کھسکتے رہتے ہیں۔ آخر میں لوگ تنگ آجاتے ہیں خصوصاً جب ایک ہی موضوع پر بولا جاتا ہے۔تو لوگ اٹھ اٹھ کر مجلس چھوڑتے ہیں لیکن حضور ﷺ کی مجلس میں ایسا نہیں ہوتا تھا بلکہ تمام حاضرین کی بات پہلے بولنے والے کی بات جیسے قابل قدر سمجھی جاتی تھی، سنی جاتی تھی اور تنگ دلی کا مظاہرہ نہیں ہوتا تھا تاکہ اس کی دل شکنی نہ ہو۔ دوسرا یہ کہ اول سے مراد پہلے آنے والا ہو پھر مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کی مجلس میں پہلے آنے والے کو پہلے بولنے کا حق ملتا تھا۔بعد میں آنے والے بعد میں بولتے تھے گویا کسی کا استحقاق مجروح نہیں ہوتا تھا۔تیسرا یہ کہ اول سے مراد اشرف وافضل ہو پھر مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کی مجلس میں افضل واشرف لوگوں کو پہلے بولنے کا موقعہ دیا جاتا تھا اور لوگ ان کے بات کو اصل بات سمجھ کر توجہ سے سنتے تھے گویا عام صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اکابر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی رعایت کرتے تھے۔

یضحک مما یضحکون ویتعجب مما یتعجبون، جس بات پر صحابہؓ ہنستے آپ ﷺ بھی اس پر تبسم فرماتے اور جس بات سے وہ لوگ تعجب کرتے آپ ﷺ بھی تعجب فرماتے تھے گویا یہ آپ ﷺ کے حسن اخلاق کی تصویر کشی ہے کہ آپ ﷺ ایسے امور میں صحابہؓ کی دلجوئی کی خاطر ان کے ساتھ حتی المقدور گُھل مل کر شرکت کی کوشش فرماتے تھے۔

تحمل کا نمونہ: ویصبر للغریب علی الجفوۃ، عرب کے بعض صحرائی لوگ آداب معاشرت سے لابلد ہونے کے سبب ناقابل برداشت حد تک نامناسب رویہ اپناتے تھے ان کی باتوں میں درشتی، نشست وبرخاست میں بے ادبی اور کھانے پینے میں گنوار پن ہوتا تھا۔ مانگنے کا انداز تحکمانہ تھا بلکہ مسائل پوچھتے ہوئے سوء ادب کا ارتکاب کرلیتے تھے مگر بایں ہمہ آپ ﷺ ان کے ان عیوب کو ان کی فطرت پر محمول

کر کے ان کو برداشت کر لیتے تھے اوران کی اکھڑ پن کے باوصف ان کی فرمائشیں بھی پوری فرماتے تھے۔

دیہاتیوں کے برعکس مہذب، متمدن اور تعلیم یافتہ لوگوں کے طرز طریقے اور قسم کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح صحابہ کرامؓ کو تو آداب مجلس اور اطوار مصاحبت معلوم تھے لیکن صحراؤں اور پہاڑوں سے آنے والے نو وارد حضرات عموماً آپ ﷺ کے ساتھ انداز تخاطب نیز دیگر تکلفات وآداب سے ناواقف ہوتے تھے وہ نام لے کر دور سے چیخ کر پکارتے تھے اس طرز تخاطب میں باوجود اخلاص کے بات کرنے کا ڈھنگ آداب سے خالی ہوتا تھا۔ بایں ہمہ آپ ﷺ ان لوگوں کی سخت اور بے ڈھنگ باتوں کا برا نہیں مانتے تھے۔ ان کے درشت انداز کو برداشت کرتے۔

<u>شوقِ علم:</u> حتیٰ ان کان اصحابه یستجلبونهم، إنّ مخففه من المثقل ہے اور استجلاب کا معنی ہے کھینچ کر لانا اس کے متعدد معانی بیان کئے گئے ہیں۔

اول یہ کہ صحابہ کرامؓ بدوی صحرائی لوگوں کی آمد کی تمنا کرتے تھے کہ کاش وہ آ کر الٹی سیدھی باتیں پوچھیں تا کہ نبی کریم ﷺ سے ان باتوں کے بارے میں علم حاصل ہو جن کے بارے میں صحابہ کرام ادب اور رعب کی وجہ سے نہ پوچھ سکے کیونکہ بدوی اور اجڈ قسم کے لوگ ادب واحترام کو مسائل کیلئے حجاب نہیں بناتے تھے۔

دوم یہ کہ صحابہ کرامؓ بدوی لوگوں کو باہر سے نبی اکرم ﷺ کی مجلس میں کھینچ کر لاتے تا کہ وہ کچھ پوچھیں اور صحابہ استفادہ کر سکیں۔

سوم یہ کہ بدوی لوگ نبی کریم ﷺ کی مجلس سے کتراتے تو صحابہ کرامؓ صحرائی لوگوں کیلئے نبی کریم ﷺ کی خصوصی رعایت اور صبر بیان کر کے ان کو مجلس میں آنے کی ترغیب دیتے تھے تا کہ وہ حاضر ہو کر کچھ حاصل کر سکیں۔

چہارم یہ کہ صحابہ کرامؓ بدوی لوگوں کی بے ادبی کو دیکھ کر ان کو مجلس نبوی ﷺ سے کھینچ کر باہر نکالتے تا کہ مزید بے ادبی نہ کریں اور نبی کریم ﷺ کے عتاب کا نشانہ نہ بنیں لیکن موخر الذکر توجیہہ کو شراح نے نامناسب توجیہہ قرار دیا ہے۔

فارفدوہ، ارفاد کے معنی ہیں معاونت کرنا، صحابہ کرامؓ کو ہدایت تھی کہ ضرورتمندوں کی حاجت برآری میں ان کے ساتھ تعاون کریں خواہ وہ مالی ہو بدنی ہو یا بصورت سفارش ہو۔

ولایقبل الثناء إلاّمن مکافیٍ، مکافی مکافات کا اسم فاعل ہے مکافات کفو، بمعنی ہمسر سے مفاعلہ ہے جس کے معنی مماثلت ہیں تو معنی یہ ہوگا کہ آپ ﷺ مکافات ومماثلت کرنے والے سے تو اپنی تعریف قبول کر لیتے تھے کسی اور سے نہیں پھر اس کلام کے مطلب میں ملاعلی قاریؒ کہتے ہیں کہ مماثل سے مراد "**مقارب فی مدحه غیر مجاوز به عن حدمثله ولامقصّر به عمّا رفعه اللّٰه الیه**" ہے یعنی وہ شخص جو آپ ﷺ کی مدح میں اعتدال برتتا ہو مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ قصیدے اور مدائح نہیں سنتے تھے روبرو مدح سرائی سے ناراض ہو جاتے تھے۔ سپاسنامے اور القابات قبول نہیں کرتے تھے ہاں حقیقت حال بیان کرنے والے کی تعریف بھی سن لیتے تھے مکافی کفو سے ہے جو برابری اور ہمسری کے معنی میں آتا ہے یعنی اس شخص کی مدح پر کان دھرتے جو کہ برابر برابر مدح کرتا تھا۔ حد سے تجاوز کرنے کی بجائے عین حقیقت حال کہتا اور مبالغہ آمیزی سے اجتناب کرتا مثلاً اگر کوئی آپ ﷺ کو خدا، مشکل کشا یا عالم الغیب کہتا اس قسم کی توصیفات سے آپ ﷺ خفا ہوتے تھے اور اگر آپ ﷺ کو عبداللہ یا رسول اللہ ﷺ کے ناموں سے پکارا جاتا تو آپ ﷺ خوش ہوتے تھے۔ اطراء وتنقیص دونوں کو ناپسند فرماتے تھے۔

جیسا کہ ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری مدح میں مبالغہ آرائی نہ کرو جیسے عیسائیوں نے عیسیٰؑ کی مدح میں کی ہے۔ مجھے اللہ کا بندہ اور رسول ہی کہو۔ یہی معنی علامہ مناویؒ نے بھی لیا ہے اور علامہ میرکؒ نے تعبیر یوں کی ہے کہ نفس الامر اور واقع سے مطابقت رکھنے والی مدح قابل قبول ہوتی باقی نہیں۔ جبکہ بعض حضرات نے ترجمہ یہ کیا ہے کہ مکافی کا معنی ہے بدلہ دینے والا۔ تو مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی آپ ﷺ کے احسان کے بدلے میں بطور شکریہ کے مدح کرتا تب تو آپ ﷺ کے ہاں مدح قبول ہوتی ورنہ نہیں لیکن علامہ میرکؒ نے اسے رد کیا ہے اور ابن حجرؒ نے وجہ یہ بیان کی ہے کہ آپ ﷺ کے احسانات تو تمام عالم پر ہیں پھر کسی سے مدح قبول نہ کرنے کی صورت نہیں بنتی۔

بعض حضراتؒ نے مکافی کا معنی برابر اور ہمسر سے کیا ہے اور مطلب یہ نکالا ہے کہ آپ ﷺ

ایمان میں اپنے ساتھ برابر شخص کی مدح سنتے اور کافروں اور منافقوں کی مدح قبول نہ فرماتے۔ بہر حال جو مدح آپ ﷺ کو نا گوار ہوتی تھی اس سے مدح کرنے والے کو منع فرماتے تھے۔

ولایقطع علی احد حدیثه، کسی کی قطع کلامی نہ فرماتے، حتی یجوز، بعض نسخوں میں حتیٰ یجور راء کے ساتھ ہے جو جور سے ہے یعنی جب وہ ظلم اور کج روی نہ کرتا تب تک بولنے دیتے تھے لیکن راجح حتیٰ یجوز ہے یعنی جب تک کوئی حد اعتدال سے تجاوز نہ کرتا اور اگر کرتا تو آپ ﷺ اس کو ٹوک کر اس کی بات کو قطع کر لیتے یا پھر اٹھ جاتے تاکہ وہ خود بات چھوڑ دے آج کل تو سپیکروں کی وجہ سے اسمبلیوں کا براحال ہے ہر ایوان میں بدنظمی ہوتی ہے ٹھیک اور جائز بات بھی نہیں کرنے دیتے اور اگر بدتہذیبی اور خلاف شرع بات ہو تو اس کو موقع دیدیا جاتا ہے۔ فإلیٰ الله المشتکیٰ.

(۱۰) حدّثنا محمّدبن بشّار ثنا عبدالرحمٰن بن مهدی ثنا سفیان عن محـمّد بن المنکدر قال سمعت جابر بن عبدالله یقول ماسئل رسول اللهﷺ شیئاً قطّ فقال لا(۱).

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ سے کسی بھی چیز کا تقاضا نہیں کیا گیا جس پر آپ ﷺ نے "نہ" کہا ہو۔

فـقـال لا ، مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی بھی کسی سائل کو نہ کہہ کر واپس نہیں کیا بلکہ یا تو اس کا مطالبہ پورا فرماتے یا آئندہ کیلئے وعدہ کر کے رخصت فرماتے یا اس کو مستغنی کرنے کیلئے اس کے حق میں دعا فرماتے اور بقول فرزدق

ماقال لاقطّ الافی تشهُّدهٖ لولاالتشهُّد کانت لاءہ نعم

یعنی صرف تشہد میں تو لا کہہ دیتے اگر تشہد نہ ہوتا تو ان کی ہر "لا" کی جگہ "نعم" یعنی ہاں ہی ہوتا۔

(۱)صحیح بخاری ۲/ ۸۹۱ کتاب الادب باب حسن الخلق او السخاء، صحیح مسلم کتاب الفضائل باب فی سخائه، مصنف ابن ابی شیبة ۱۱/ ۵۱۵ کتاب الفضائل، مسنداحمد ۳/ ۳۰۷(مختار)

اس پر ایک اعتراض ہوتا ہے کہ غزوۂ تبوک کے دوران جب ابوموسیٰ اشعریؓ اوران کے قبیلے والوں نے سواریوں کا تقاضا کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا"واللّٰہ لااحملکم" اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے یہاں پر جو"نہیں" کا لفظ بولا ہے وہ بطور تادیب یا بطور اعتذار ہے منع اور انکار کے طور پر نہیں ہے یعنی آپ ﷺ نے یا تو اشعریوں کو عذر کے طور پر کہا کہ میرے پاس چونکہ اس وقت سواری نہیں ہے۔اس لئے میں دینے سے معذرت کررہاہوں جیسا کہ قرآن مجید میں صراحۃً عذرہی کے الفاظ سے بیان ہے"قلت لاأجدمااحملکم "یعنی آپ نے عذرکیا کہ میرے پاس سواری نہیں ہے یاپھر مطلب یہ ہے کہ جب باربار عذرپیش کرنے کے باوجود اشعری لوگ اصرار کرنے لگےتو آپ ﷺ نے ان کی توقع ہی کو ختم کرنا چاہا۔اور"واللہ لااحملکم" کہہ دیا جس پر وہ تقاضا چھوڑ گئے مگر جب آپ ﷺ کو اونٹ میسر ہو گئے تو انکاراور قسم کے باوجود آپ ﷺ نے پانچ اونٹ عطا فرمائے(۱)۔

(۱۱) حدّثنا عبداللّٰہ بن عمران ابوالقاسم القرشیّ المکیّ ثناإبراھیم بن سعدٍ عن ابن شھاب عن عبیداللّٰہ عن ابن عبّاسؓ قال کان رسول اللّٰہ ﷺ أجود الناس بالخیر وکان أجود مایکون فی شھررمضان حتیّ ینسلخ فیاتیہ جبریل فیعرض علیہ القرآن فاذالقیہ جبریل کان رسول اللّٰہ ﷺ أجودبالخیر من الریح المرسلۃ(۲).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ تمام لوگوں کی نسبت ایصال خیر میں زیادہ سخی تھے پھرآپ ﷺ رمضان شریف میں تو اختتام مہینہ تک اوربھی زیادہ فیاض ہوجاتے تھے پس (رمضان میں) آپ ﷺ کے پاس جبرئیل آتے

---

(۱)بخاری شریف ج۲ ص ۶۳۰

(۲)صحیح بخاری باب کیف کان بدء الوحی ۱/۳کتاب البدء الوحی باب مکااجودماکان النبی ﷺیکون فی رمضان، صحیح مسلم ۲/ ۲۶۱کتاب الفضائل باب کان النبی ﷺاجودالناس بالخیر،السنن الکبریٰ للنسائی کتاب فضائل القرآن باب عرض جبرئیل القرآن، مصنف ابن ابی شیبۃ، السنن الکبریٰ للبیھقی ۴/ ۳۰۵کتاب الصیام باب الجودو الافضال فی شھررمضان(مختار)

اورآپ ﷺ کوقرآن مجید سناتے جب بھی آپ ﷺ کی ملاقات جبرئیل سے ہوجاتی
تو آپ ﷺ نفع رسانی میں بارش لانے والی ہوا سے بھی زیادہ فیاضی فرماتے۔

عــن عبیــدالـلّـــــه، اسی تابعی کی تعیین میں تین قول ہیں۔(۱) عبیداللہ بن عیاضؒ (مناوی) (۲) عبیداللہ بن ابی رافعؒ حضرت علیؓ کے کاتب (مناوی) (۳) عبیداللہ بن عتبہ بن مسعودؒ، ملاعلی قاریؒ، ابن حجرؒ اور علامہ عینی وغیرہ نے موخرالذکر کوترجیح دی ہے۔بعض لوگوں نے عبیداللہ بن ابی ملیکہ کاذکرکیا ہے لیکن شراح نے اس کی تردید کی ہے۔

أجودالناس بالخیر ،خیر سے مراددنیوی اوراخروی منافع ہے۔اس لئے یہ آپ ﷺ کی طرف مالی، حالی، اخلاقی، علمی اور عملی نفع رسانی کوشامل ہے اور یہ نفع رسانی صرف انسانوں تک محدودنہیں بلکہ حیوانات، نباتات اور جمادات تک متعدی ہے۔

وکــان اجــود مایکون فی شهررمضان،اجودمیں اگرچہ نصب بھی جائز ہے لیکن رفع راجح ہے اور ابن حاجبؒ نے اس کے لئے پانچ وجوہ ذکرکی ہیں۔سب سے بہترتوجیہ یہ ہے کہ یہ کان کااسم ہے اور مامصدر یہ ہے یہ اجود کا مضاف الیہ بنتا ہے جبکہ فی شہررمضان حال کے مرتبے میں ہے اور خبرکا قائم مقام ہے جو محذوف ہے تقدیر عبارت یوں ہوگی ’’وکــان اجــوداکـوانـــه حـال کـونـه فی شهررمضان حــاصلاً ‘‘ حتــی ینســلخ ،یعنی اختتام ماہ تک تو بے تحاشاجودہوتی تھی لیکن اس کے بعد اپنی اصلی فطری سخاوت عودکرآتی جودیگرلوگوں کی سخاوت سے پھربھی بڑھ کرتھی۔

رمضان اور سخاوت میں اضافے کا سبب: رمضان شریف میں سخاوت میں اضافے کے متعدد اسباب ہیں اول تو یہ کہ رمضان شریف خود بھلائیوں کا موسم ہے۔دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فضل وعنایتیں بھی اس مہینے میں بارشوں کی طرح برستی رہتی ہیں اور حضور ﷺ تو تخلق باخلاق الرب کانمونہ ہیں۔ سوم یہ کہ دین وتقویٰ میں صحبت صالحین کا خصوصی اثرہوتا ہے اکابرکہتے ہیں ’’لـقـاء اهـل الـخیر عمارة الـقـلوب ‘‘یعنی صلحاء کی ملاقات سے ہی دلوں کی تعمیر ہوتی ہے توجب جبرئیل علیہ السلام سے آپ ﷺ کی ملاقات ہوتی تو آپ ﷺ کی فیاضی کا اضافہ بھی قرین قیاس ہے۔چہارم یہ کہ رمضان شریف قرآن کے

نزول کا زمانہ ہے"شھر رمضان الذی انزل فیه القرآن"اس لئے آپ ﷺ تحدیث نعمت کے طور پر بھی زیادہ سخاوت فرماتے تھے۔فیعرض علیه القرآن، یعرض فاعل کا ضمیر نبی کریم ﷺ کو اور علیہ کا ضمیر جبرئیلؑ کو راجع کرنا اور اس کے برعکس دونوں جائز ہیں کیونکہ بخاری شریف کی روایت میں فیدارسه القرآن آیا ہے بعض دیگر روایات میں "یعارضنی بالقرآن" آیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جبرئیلؑ نبی کریم ﷺ کو سناتے اور نبی اکرم ﷺ جبرئیل علیہ السلام کو سناتے تھے۔

لیکن اکثر روایات میں نبی اکرم ﷺ کا جبرئیلؑ کو سنانے کا ذکر ہے۔اس لئے یہاں شراح نے یعرض کا فاعل کا ضمیر نبی اکرم ﷺ کو راجع کرنے کو ترجیح دی ہے۔

لقاء جبریل کے اثرات: فاذالقیه جبریل کان رسول اللّٰه أجود بالخیر من الریح المرسلة، یعنی عمومی سخاوت کے علاوہ رمضان شریف میں خصوصی سخاوت ہوتی تھی لیکن جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ ملاقات کے بعد تو اور بھی سخاوت میں اضافہ ہوجاتا تھا۔اور آپ ﷺ بارش لانے والی ہوا سے بھی زیادہ سخی ہوجاتے تھے۔یہاں ہوا کے ساتھ تشبیہ دو وجوہ سے ہے۔اول اس لئے کہ عموماً ایسی ہوا تیز چلتی ہے ہر جگہ تک جلدی رسائی کرلیتی ہے یونہی آپ ﷺ بھی انتہائی سرعت سے ایصال خیر فرماتے تھے۔دوم یہ کہ ایسی ہوا کی نفع رسانی عام ہوتی ہے اور ہر کس و ناکس تک بارش اور اس کے منافع پہنچادیتی ہے۔اسی طرح نبی کریم ﷺ کی نفع رسانی بھی عام ہوجاتی تھی۔

ہواؤں سے تشبیہ ناقص ہے: ملاعلی قاریؒ نے علامہ کرمانیؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ہوا اور بارش کی منفعت ظاہری اور محدود ہے صرف مادی حیات کا سبب بنتے ہیں جبکہ نبی اکرم ﷺ ویران دلوں کی آبیاری کرکے حیات جاودان بخشتے ہیں اور فانی رونق کے مقابلے میں دائمی اور حقیقی نعمتوں سے مالامال کرتے ہیں۔اس لئے یہ تشبیہ ناقص اور صرف تفہیم کیلئے ہے ورنہ آپ ﷺ کی سخاوت کے مقابلے میں ہوا، بارش، سورج، چاند وغیرہ کی نفع بخشی ہیچ ہے(۱)۔

حضور اقدس ﷺ کی مادی سخاوت اور فیاضی کی مثالیں: خلاصہ یہ ہے کہ آپ ﷺ خداوند عالم کے بعد عالم میں سب سے زیادہ سخی تھے۔حتیٰ کہ آپ ﷺ کی صرف مادی سخاوت دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے

---

(۱)فانّ من جودک الدنیا وضرّتها ومن علومک علم اللّوح والقلم (بردہ)

مثلاً ایک عورت نے ایک چادر ہدیہ کردی ضرورت کی وجہ سے پہن لی، صحابہؓ میں سے کسی نے مانگ لی اور اتار کر دیدی۔ ایک آدمی کو بھیڑ، بکریوں کا ایک بڑا ریوڑ جو دو پہاڑوں کے درمیان چر رہا تھا سارے کا سارا بخش دیا۔ جعرانہ کے مقام پر ایک ایک آدمی کو سوسو اونٹ دیتے رہے۔ حکیم بن حزامؓ کو سو درہم دیئے، انہوں نے اور مانگے تو فوراً سو اور دیدیئے۔ ایک مرتبہ نوے ہزار درہم آئے۔ فوراً ہی چٹائی پھیلا کر تقسیم شروع کردی اور سب کے سب تقسیم کردیئے۔ بحرین سے علاء بن الحضرمیؓ نے ایک لاکھ درہم (۱) بھیج دیئے۔ مسجد میں پھیلا دیئے اور تقسیم کرتے رہے۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ **فما قام رسول اللہ ﷺ وثمہ منہادرھم** (۲) یعنی آپ ﷺ وہاں سے اٹھے تو ایک درہم بھی باقی نہیں تھا۔

حنین کے روز ایک عورت کو اتنا مال دیا جس کی قیمت پچاس کروڑ درہم کے برابر تھی (۳)، دوسری طرف خوف فقر و فاقے کی حالت ہوتی تھی۔ مہینے بھر گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔ پیٹ پر بھوک سے پتھر باندھ لیتے تھے جَو کی روٹی معمول کا کھانا ہوتا تھا لیکن جب کوئی مانگ لیتا تھا تو قرض لے کر بھی دے دیتے تھے۔

(۱۲) حدثنا قتیبہ بن سعید ثنا جعفر بن سلیمان عن ثابت عن أنس ابن مالک قال کان النبیّ ﷺ لایدخر شیئا لغد (۴)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کوئی بھی چیز دوسرے دن کیلئے (اپنی خاطر) ذخیرہ نہیں کرتے تھے۔

<u>کمال توکل کے وجہ سے عدم ادخار:</u> **لایدخر شیئاً لغد**، یعنی اپنے لئے کوئی چیز نہیں رکھتے تھے جو آپ ﷺ کی سخاوت اور رب العالمین پر اعتماد و توکل کا بیّن ثبوت ہے۔ البتہ یہاں ایک اعتراض ہوتا ہے کہ بخاری و مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ اپنے اہل خانہ کیلئے ایک برس کا نفقہ ذخیرہ کیا کرتے تھے۔ اس کے

(۱) فتح الباری ج۱ص۶۸۰

(۲) بخاری ج۱ص۶۰

(۳) مناوی ج۳ص۲۱۰

(۴) جامع ترمذی ۲/۶۰ ۵ کتاب الزھد باب ماجاء فی معیشۃ النبی ﷺ س ۱۱ ۵، صحیح ابن حبان، شرح السنۃ للبغوی (مختار)

جواب میں کئی اقوال ہیں۔اول یہ کہ یہ ادخار اپنے لئے نہیں بلکہ اہل خانہ کے حقوق کی ادائیگی کیلئے تھا۔ ان کیلئے ذخیرہ کر لیتے تھے اور وہ بھی بسا اوقات اس نفقہ کو جلد ہی تقسیم کر لیتی تھیں۔دوم یہ کہ آپ ﷺ تعلیماً للامة اور بیان جواز کیلئے یہ ادخار فرمایا کرتے تھے۔سوم یہ کہ غالب اوقات میں ادخار کی عادت نہ تھی کبھی کبھی کرتے بھی تھے۔چہارم یہ کہ غزوۂ خیبر سے قبل تو آپ ﷺ ایک سال کیلئے ادخار کیا کرتے تھے لیکن فتح خیبر کے بعد ادخار نہیں کی اور حضرت انسؓ کی یہ حدیث فتح خیبر کے بعد کے زمانہ پر محمول ہے۔

(۱۳) حدّثنا هارون بن موسىٰ بن أبى علقمة الفروىّ المدنىّ حدّثنى أبى عن هشام بن سعد عن زيد بن أسلم عن أبيه عن عمر ابن الخطاب أنّ رجلاً جاء إلىٰ رسول اللّٰه ﷺ فسأله ان يعطيه فقال النبىّ ﷺ ماعندى شئ ولكن اتبع علىّ فاذاجاء نى شئ قضيته فقال عمر يارسول اللّٰه قداعطيته فما كلّف اللّٰه مالاتقدرعليه فكره النبىّ ﷺ قول عمر فقال رجل من الأنصار يارسول اللّٰه انفق ولاتخف من ذى العرش إقلالافتبسّم رسول اللّٰه ﷺ وعرّف البشر فى وجهه لقول الأنصارى ثمّ قال بهذا امرت(۱).

ترجمہ: حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا اور کچھ دینے کا سوال کیا۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس کوئی چیز موجود نہیں ہے لیکن تم میرے نام سے قرضہ لے کر خرید لو جب میرے پاس کچھ آجائے گا میں قرضہ اتار دوں گا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ اس سائل کو (مقدور بھر) دے چکے ہیں اور جو آپ کے طاقت سے باہر ہے اس کے دینے پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مکلّف نہیں فرمایا۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت عمرؓ کی بات کو ناپسند فرمایا۔تب ایک انصاری صحابی نے عرض کیا، یارسول اللہ مال (اللہ کی رضا کی خاطر) خرچ کیجئے اور

(۱)تفرد الامام الترمذی بھذا الحدیث

عرش والے سے کسی کمی کا خوف نہ کیجئے (یہ سن کر) نبی اکرم ﷺ نے تبسم فرمایا اور انصاری کی بات کی وجہ سے آپ ﷺ کے رخ انور پر بشاشت ظاہر ہونے لگی پھرارشاد فرمایا کہ اسی (انفاق) کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔

ولکن ابتع الخ، ابتیاع سے امر کا صیغہ ہے لیکن اشتراء کے معنی میں مستعمل ہے یعنی خریدلو علیّ عبارت مقدر ہے یعنی ''ابتع المطلوب بثمن یکون دیناً علیّ'' اپنے مطلوب کوخریدلواور قیمت کی ذمہ داری مجھ پرڈال دو۔

قداعطیته، تم اس آدمی کودے چکے ہومفعول ثانی محذوف ہے۔اس کی تعیین میں اقوال ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ **قداعطیته ماعلیک من القول المیسور**،یعنی تم اس شخص کو اچھی بات کہہ چکے ہو۔اب مزیداسے ٹال دو اور قرض لے کر دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ تکلیف بمالایطاق ہے یہی احتمال محققین شراح پسند کر چکے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ''قداعطیته، مرة بعداخری'' ہونا چاہئے یعنی سائل کواس سے قبل ہی آپ بار بار کافی مال دے چکے ہیں۔اب قرض لے کر دینا مناسب نہیں بعض لوگوں کا خیال ہے ایک مرتبہ آپ ﷺ نے نوے ہزار درہم تقسیم کردیئے اس کے بعدایک شخص آیااورمدد مانگی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے نام خرید کر مطلوب چیز لے لوتو گویااس شخص کو پہلے بھی مال سے حصہ مل چکا تھا مزید مانگنے پرآپ ﷺ نے یہ پیشکش کردی۔

بعض شراح نے لکھاہے کہ تقدیر یوں ہوگی کہ ''**قداعطیته سواله وجعلته دیناً فی ذمتک فلاتفعل غیرذلک**''یعنی اس شخص کے مطلوب کی قیمت اپنے ذمے لے کرآپ ﷺ نے اس شخص کا مطلوب تواس کودے دیا۔اب اس سے آگے بڑھ کر مزید سخاوت نہ کرنا کہ یہ آپ ﷺ کی وسعت سے باہر ہے۔لیکن اس موخرالذکرتوجیہ کواکثرشراح نے ردکیاہے۔

<u>انفاق میں احتیاط کی ناپسندیدگی:</u> **فکره النبیّ ﷺ قول عمرؓ**،حضرت عمرؓ کی بات بری لگنے کا سبب یہی تھا کہ یہ کمال سخاوت کا تقاضا نہیں تھا اگرچہ شریعت سے مخالف نہ تھا مگرآپ ﷺ کی فطرت میں جو سخاوت کوٹ کوٹ کربھری ہوئی تھی اس کا مقتضیٰ کچھ اورتھا جو کہ انصاری صحابی نے بیان کیا۔**و لاتخف من**

ذی العرش اقلالاً، اقلال قلت سے افعال ہے کم ہونے کو کہتے ہیں۔ جملے کا مطلب یہ ہے کہ جو بے انتہا سخاوت آپ ﷺ کو عطا کی گئی ہے اس کے تقاضے کے مطابق بے خطر مال صرف کرتے رہتے اور اسی صفت پر ثابت قدم رہتے۔ حضرت عمرؓ نے اگرچہ بطور خیر خواہی کے مشورہ شریعت کے مطابق دیا ہے مگر اس کی بنیاد بظاہر عرش کے مالک کی طرف سے کم ملنے کے خطرہ پر ہے جو متوکلین اور بالخصوص انبیاء اور پھر سید الانبیاء ﷺ کے شایان شان نہیں ہے۔ بهٰذا امرت، ہذا میں اشارہ انفاق وتوکل کو ہے یا پھر قول میسور عند فقدان المال کو ہے۔

(۱۴) حدّثنا علیّ بن حجر ثنا شریک عن عبداللّٰہ بن محمّد ابن عقیل عن الربیع بنت معوّذ بن عفراء قالت اتیت النبیّ ﷺ بقناع من رطب واجرو زغب فاعطانی ملأکفّه حلیًّا و ذهباً(۱).

ترجمہ: ربیعؓ بنت معوذؓ کہتی ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس ایک چھنگیر میں کھجور اور پتلی پتلی ککڑی لائی تو آپ ﷺ نے مجھے مٹھی مبارک بھر کر زیور اور سونا عطا فرمایا۔

یہ حدیث باب نمبر ۲۹ باب فاکهة رسول اللہ ﷺ میں چوتھی اور پانچویں حدیث ہے وہاں تفصیل کے ساتھ ذکر ہے کہ معاذ بن عفراءؓ نے یہ ہدیہ آپ کے پاس بھیجا تھا اور آپ ﷺ نے بحرین سے آئے ہوئے مال سے حضرت ربیعؓ کو زیور بخشا تھا۔

(۱۵) حدّثنا علیّ بن خشرم وغیرواحد قالوا انا عیسیٰ بن یونس عن هشام بن عروة عن أبیه عن عائشة أنّ النبیّ ﷺ کان یقبل الهدیّة ویثیب علیها(۲).

---

(۱) مسند احمد ۶/۳۵۹

(۲) صحیح بخاری باب المکافأة الخ ۱/۳۵۶ کتاب الهبة باب مکافاة فی الهبة، سنن ابی داؤد ۲/۱۴۲ کتاب الاجارة باب فی قبول الهدایا، جامع ترمذی ۲/۲۲ ا کتاب البر والصلة باب ما جاء فی قبول الهدیة ص ۴۵۹، مصنف ابن ابی شیبة ۶/۵۵۱ (مختار)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہدیہ قبول فرماتے تھے اوراس کا بدلہ بھی دیتے تھے۔

ویثیب علیھا ، جہاں تک ہدیہ کے قبول کرنے کا مسئلہ ہےتو وہ تو مکارم اخلاق میں سے ہے کیونکہ اس سے ہدیہ دینے والے کی دلداری ہوتی ہے۔اوراس کا بدلہ مطلقاً واجب تو نہیں لیکن آپ ﷺ اس کا بدلہ دیتے تھے جوکم ازکم ہدیہ کے برابر ہوتا تھا بلکہ کبھی کبھی تو دس گنا تک بدلہ بڑھ جاتا تھا۔

کیاہدیہ کابدلہ واجب ہے؟ یہاں پر یہ مسئلہ قابل تحقیق ہے کہ کیا ہدیہ کا بدلہ واجب ہے یا نہیں۔ملاعلی قاریؒ نے یہ تحقیق کی ہے کہ اگرکوئی شخص طیب خاطر کے ساتھ ہدیہ دے تب تو قبول کرنا چاہئے اور بدلہ بھی واجب نہیں ہے اوراگرکوئی شخص ہدیہ دیکر کوئی کام نکالنا چاہے یاشرم ورواج کی وجہ سے ہدیہ دے مثلاً کبھی حاجی لوگ مبارکباد کیلئے آنے والوں میں بادل ناخواستہ ہدایا تقسیم کرتے رہتے ہیں یاکسی اور مجبوری سے ہدیہ دینا چاہےتواس صورت میں ہدیہ لیناجائزنہیں اوراگروہ بھی شرم کی وجہ سےقبول کرےتو اس کابدلہ اس پرواجب ہےکم ازکم ہدیہ کے قیمت کے مساوی بدلہ دے۔

صورت اول میں اگرچہ بدلہ واجب نہیں لیکن اگر ہدیہ قبول کرنے والاایسے انداز سے ہدیہ دینے والے کابدلہ چکائے کہ اسے بدلہ کااحساس نہ ہو بلکہ اسے محبت پرحمل کردےتو یہ بہتر ہے کیونکہ اس سے محبت میں مزیداضافہ ہوجاتا ہے۔

خلاصۂ باب

اخلاق نبوی ﷺ کے بارے میں ابتدائے باب میں ہم تحریر کرچکے ہیں کہ ان کا احاطہ ناممکن ہے۔خود جمال نبوی ﷺ کا مشاہدہ کرنے والے صحابہ اس کے بیان سے عاجزی کا اظہار کرتے ہیں۔البتہ اس باب میں جو چیدہ چیدہ باتیں بظاہرنظرآتی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کا اپنے صحابہ کرامؓ سے

رویہ انتہائی شفیقانہ تھا خدام کے ساتھ حد درجہ کی نرمی اور خدمت میں سستی اور کوتاہی کے باوجود آپ ﷺ ان کی ڈانٹ ڈپٹ نہیں فرماتے تھے۔عمر بھر کسی خادم یا بیوی کو مارا نہیں۔فحش گوئی گالم گلوچ تو کجا بے وقار بات سے بھی اجتناب فرماتے تھے۔بازار کے اندر آپ ﷺ زور سے بولتے نہ تھے۔عفوودرگزر کی یہ حالت تھی کہ کبھی کسی سے ذات کیلئے انتقام نہیں لیا۔غزوات کے سوا کسی کو تھپڑ تک نہیں مارا۔البتہ خداوند کریم یا انسانوں کی حق تلفی پر غصہ فرماتے تھے۔بدزبان اور بداخلاق لوگوں کے ساتھ بھی مدارات کے طور پر حسن اخلاق سے پیش آتے تھے تاکہ ان کو اپنی کمی کا احساس ہو حتیٰ کہ بدترین شخص کے ساتھ ایسا رویہ ہوتا تھا کہ وہ خود کو بہترین سمجھنے لگتا تھا۔صحابہ کی دلداری کی خاطر آپ ﷺ ان کی گپ شپ میں شریک رہتے تھے۔ان کے ساتھ ہنستے، تعجب فرماتے، ساتھ ساتھ ان کی تربیت فرماتے، ان کے جائز مرغوبات سے نفرت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔نہ اپنی پسند کو کسی پر مسلط فرماتے تھے۔

کلام میں شیرینی تھی حتیٰ کہ صحابہ کرام بے چینی اور شوق سے سنتے تھے۔شرکائے مجلس کی پسند کا لحاظ فرماتے۔ان کی توقعات کے مطابق بولتے۔بدوی لوگوں کے سخت رویئے کے مقابلے میں تحمل و برداشت سے کام لیتے تھے۔خندہ پیشانی اور نرمی عموماً غالب رہتی تھی۔تکبّر، لایعنی باتوں، عیب جوئی، عیب چینی اور مذمت سے کوسوں دور تھے۔سخاوت کوٹ کوٹ کر بھری تھی کسی بھی سائل کیلئے آپ ﷺ کے پاس ''نہیں'' کا لفظ نہیں تھا۔ سخاوت پسند کرنے والوں کو پسند فرماتے اور اس سلسلے میں احتیاط کی تلقین ناقابل قبول سمجھتے تھے۔عمومی طور پر نفع رسانی میں پیش پیش اور ضرورتمندوں کی حاجت روائی میں خصوصی طور پر انتہائی حساس تھے۔حتیٰ کہ دوسروں کو بھی اس کا حکم فرماتے تھے۔کمال توکل کی پاسداری فرماتے تھے اور فقر کو ترجیح دیتے ہوئے آئندہ کیلئے نفقہ تک ذخیرہ کرنے سے کتراتے تھے۔جو ہدایا پیش ہوتے دینے والوں کی دلداری کیلئے قبول فرمالیتے مگر اس سے کئی گنا زیادہ بخش دیتے تھے۔اور بایں ہمہ اپنی تعریف ناپسند تھی بلکہ اس میں مبالغہ آرائی کرنے والوں کو منع فرماتے تھے۔

۴۹. باب ماجاء فی حیاء رسول اللہﷺ

رسول اللہﷺ کے حیاء کے بیان میں

حیاء کالغوی اور اصطلاحی معنی: حیاء الف ممدودہ کے ساتھ ہے۔اس کالغوی معنی ہے "تغیر وانکسار یعتری الانسان من خوف مایعاب به "یعنی حیاء وہ تغیر اور دلشکنی ہے جو ملامت اور عیب چینی کے خوف سے لاحق ہو۔یہ انسانی فطرت کا حصہ ہے اور عموماً غیر اختیاری ہوتا ہے لیکن یہاں پر یہ معنی مراد نہیں ہے کیونکہ نبی اکرمﷺ کی تعلیمات کے مطابق حیاء اخلاق حسنہ کے قبیلے سے ایک اختیاری فعل ہے۔شریعت میں اس کی تعریف یوں کرتے ہیں "الحیاء هو خلق یبعث علیٰ اجتناب القبیح ویمنع من التقصیر فی حق ذوی الحق (۱) "یعنی حیاء وہ خلق ہے جو قبیح کام کے ارتکاب سے اور صاحب حق کے حق کی ادائیگی میں کوتاہی سے بچائے اخلاق میں اس کا مرتبہ بہت اہم ہے۔نبی اکرمﷺ فرماتے ہیں الحیاء من الایمان (۲)،ایک حدیث میں ہے الحیاء خیر کلّه (۳)،ایک اور روایت میں ہے الحیاء لایاتی إلاّبخیر (۴)،اسی اہمیت کی وجہ سے اس کیلئے مستقل باب کا انعقاد کیا گیا ہے۔اس باب میں دو حدیثوں کا ذکر ہے۔

(۱) حدثنا محمود بن غیلان ثنا أبو داؤد ثنا شعبة عن قتادة قال سمعت عبدالله ابن أبی عتبة یحدّث عن أبی سعید الخدریؓ قال کان رسول اللهﷺ أشدّ حیاء من العذراء فی خدرها وکان اذا کره شیئا عرفناه فی وجهه(۵).

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرمﷺ پردہ میں بیٹھی ہوئی

---

(۱)علامہ بیجوریؒ حیاء کی شرعی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں هو خلق یبعث علی تجنب القبیح ویحض علی ارتکاب الحسن ومجانبة التقصیر فی حق ذی الحق(المواهب الدنیة ص)(مختار)

(۲)صحیح بخاری

(۳)صحیح مسلم

(۴)صحیح بخاری (۵)صحیح بخاری ۱/۵۰۳ کتاب المناقب باب صفة النبیﷺ،سنن ابن ماجة ص۳۰۸ کتاب الزهدباب الحیاء، مصنف ابن ابی شیبة۸/۳۳۵،مسنداحمد۳/۷۱(مختار)

کنواری لڑکی سے بھی بڑھ کر حیاء کرنے والے تھے۔آپ ﷺ کسی بات کو ناپسند فرماتے تو ہم آپ ﷺ کے چہرۂ انور سے آپ ﷺ کی ناگواری محسوس کر لیتے تھے۔

حیاء اور پردہ فطری عمل ہے: من العذراء فی خدرها، خدر اس پردے کو کہتے ہیں جو کنواری لڑکیوں کو اجنبیوں کے ساتھ اختلاط سے بچانے کیلئے بنایا جاتا تھا۔عرب کے معاشرے میں مردوزن کا اختلاط عام تھا لیکن بعض معزز کنواری لڑکیوں کو پھر بھی ایک پردہ لگا کر اجنبی مردوں بلکہ بعض اوقات اجنبی عورتوں سے بھی پردہ کرایا جاتا تھا۔ظاہر ہے کہ عورت جو طبعی طور پر باحیا ہوتی ہے جب اختلاط سے بھی محفوظ ہو تو اور بھی زیادہ حیادار ہوتی ہے مگر نبی اکرم ﷺ کی حیا اس سے بھی بڑھ کر تھی حتیٰ کہ بعض روایات میں ہے کہ آپ ﷺ شدت حیاء کی وجہ سے کسی کے چہرہ پر نظر ثبت نہیں فرماتے تھے۔

بعض شراح نے "العذراء فی خدرها" کا ترجمہ نئی نئی بیاہی ہوئی عورت سے کیا ہے جو شب زفاف کو پردے میں تنہا کر دی گئی ہو لیکن ملا علی قاریؒ نے اس احتمال کو ضعیف قرار دیا ہے۔

عرفناه فی وجهه ،یعنی آپ ﷺ کسی ناپسندیدہ بات پر ناپسندیدگی بوجہ شدت حیاء کے زبان سے ظاہر نہیں فرماتے تھے بلکہ رخ انور پر تغیر سے ہمیں پتہ چل جاتا تھا کہ یہ چیز ناگوار خاطر ہے۔جس طرح شمس وقمر کے سامنے غبار آجاتا ہے اور روشنی مدھم پڑ جاتی ہے یونہی چہرے کے نور میں تغیر آجاتا تھا۔اسی طرح کنواری لڑکی بھی اپنی پسند ناپسند کا اظہار نہیں کرتی۔زیادہ سے زیادہ قرائن سے کام لیا جاتا ہے۔شریعت نے بھی اس کے سکوت کو رضا ٹھہرایا ہے کیونکہ وہ بعض امور میں بصراحت بولنے سے شرماتی ہے۔

(۲) حدثنا محمود بن غیلان ثنا وکیع انا سفیان عن منصور عن موسیٰ بن عبداللہ بن یزید الخطمیّ عن مولیً لعائشة قال قالت عائشة مانظرت إلٰی فرج رسول اللہ ﷺ اوقالت مارأیت فرج رسول اللہ ﷺ قطّ(۱).

---

(۱)سنن ابن ماجة ص۴۸ کتاب الطهارة ابواب التیمم باب نهی ان یریٰ عورت اخیه، مصنف ابن ابی شیبة ۱/۱۰۶ کتاب الطهارة، مسند احمد ۶/۶۳،السنن الکبریٰ۷/۹۴ کتاب النکاح باب ماتبدی المرأة من زینتها للمذکورین فی الایة(مختار)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ (کی حیاء کی وجہ سے) میں نے کبھی بھی ان کی شرمگاہ نہیں دیکھی۔

<u>نبی کریم ﷺ حیاء کے پیکر تھے:</u> ماںظرت إلیٰ فرج الخ (۱)، حضرت عائشہؓ کا مقصد یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کامل الحیاء تھے اور تستّر میں اتنا مبالغہ فرماتے تھے کہ ہمیں کبھی بھی آپ ﷺ کے شرمگاہ کی طرف نظر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ باحیاء آدمی کے سامنے دوسرے بھی حیاء سے رہتے ہیں اور دوسروں کی بے حیائی سے مصاحبین کو بھی بے حیائی کی جرأت ہوتی ہے۔

یہ بھی واضح بات ہے کہ جب حضرت عائشہؓ کمال محبوبیت اور بے تکلفی کے باجود آپ ﷺ کی شرمگاہ نہ دیکھ سکیں تو دوسری ازواج مطہرات تو بطریق اولیٰ یہ کام نہ کرسکیں۔ دنیا کا کوئی بھی شخص شاید یہ دعویٰ نہ کرسکے کہ اس کی بیوی اور اس کے درمیان ایسا پردہ رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں ھنّ لباس لکم و انتم لباس لھنّ، اور ظاہر ہے کہ لباس میں شدید اتصال ہوتا ہے نہ لباس سے پردہ ممکن ہے اگرچہ وہ ساتر ہے اس کی وجہ سے دوسرے عیوب چھپ

---

(۱) اولیٰ اور بہتر یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی اور بیوی اپنے شوہر کی شرمگاہ کو نہ دیکھے لیکن اگر دیکھنا چاہے تو دیکھ سکتے ہیں اس میں کراہت نہیں۔ کما قال ابن نجیم وینظر الرجل إلیٰ فرج امته وزوجته یعنی عن شھوة وغیر شھوة قال علیه الصلوٰة والسلام غضّ بصرک إلاّ عن زوجتک وأمتک ومارویٰ عن عائشة قالت کنت اغتسل أنا ورسول اللہ ﷺ فی إناء واحد ولأنّه یجوزله المس والغشیان فالنظر أولیٰ إلاّ أنّ الاولیٰ أن لاینظر کل منهما إلی عورة صاحبه. لقوله علیه الصلوٰة والسلام إذاأتی احدکم فلیستترمااستطاع ولایتجردان تجرد البعیر لأن النظر إلی العورة یورث النسیان(البحر الرائق ۳۵۸/۸) صاحب ہدایہ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے کہ آپؐ کے ہاں میاں بیوی کا ایک دوسرے کی شرمگاہ دیکھنا بہتر ہے۔ مگر علامہ شامیؒ نے علامہ بدرالدین عینیؒ کے حوالہ سے اس نسبت کی تردید فرمائی ہے۔ وکان ابن عمرؓ یقول الأولیٰ أن ینظر لیکون أبلغ فی تحصیل معنی اللذة لکن فی شرح الهدایة للعینی أنّ هذالم یثبت عن ابن عمر لابسند صحیح ولابسند ضعیف(ردالمحتار ۳۶۷/۶) البتہ امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ سألت أباحنیفة عن الرجل یمسّ فرج أمرأته وهی تمسّ فرجه لیتحرک علیهاهل تریٰ بأساً قال لاوأرجوان یعظم الأجر(ردالمحتار ۳۶۷/۶) خلاصہ یہ ہے کہ نہ دیکھنا بہتر ہے۔(مختار)

جاتے ہیں بالکل اسی طرح شادی سے بھی عیوب چھپ جاتے ہیں لیکن بیوی سے پردہ نہیں رہتا بایں ہمہ نبی کریم ﷺ کا حیاء میں وہ مقام ہے کہ حضرت عائشہؓ اس قسم کا دعویٰ کرتی ہیں۔

آج کل کی طرح اس زمانہ میں روشنیاں اور بجلی نہیں تھی اندھیرا بھی ہوتا تھا آج تو برسرعام بلکہ سینماؤں اور ٹیلی وژن پر بہت فحش قسم کے کام کیے جاتے ہیں اور نبی کریم ﷺ کا وہ قول صادق ہوتا جاتا ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم یہود ونصاریٰ کا اتباع کروگے حتیٰ کہ ان کی طرح سڑکوں کے کنارے پر ایک دوسرے سے ملوگے پھر جب بیویوں میں یہ حالت ہے تو دوسرے لوگوں سے اپنی پردہ پوشی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ بخاری شریف میں اس کی تصریح ہے کہ سوائے ایک موقع کے آپ ﷺ کا پردہ کبھی نہیں دیکھا گیا۔ ہوا یوں کہ جب آپ ﷺ کی نوجوانی میں خانہ کعبہ کی تعمیر ہورہی تھی تو آپ ﷺ بھی دوسرے لوگوں کی طرح پتھر اٹھا کر لایا کرتے تھے۔ ایک ہی دھوتی بندھے ہوئے تھے اور کوئی کپڑا بدن پر نہ تھا۔ حضرت عباسؓ ساتھ تھے انہوں نے کہا کہ آپ ﷺ دھوتی کھول کر کندھوں پر ڈالیں تاکہ بھاری پتھر اٹھانے سے اذیت نہ ہو چونکہ عرفاً عرب میں مردوں کیلئے برہنگی کوئی معیوب بات نہ تھی۔ لہٰذا آپ ﷺ نے بھی دھوتی کھول دی۔ معاً آپ ﷺ بے ہوش ہوکر گر پڑے۔ چچا نے پردہ چھپایا۔ راوی کہتے ہیں کہ "فما رأى بعد ذلک عریاناً (۱)" اس کے بعد آپ ﷺ کبھی بھی برہنہ نہیں دیکھے گئے۔ اسی طرح دوسروں کے پردوں پر نظر سے بھی مکمل اجتناب کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ ہی کی روایت ہے کہ "مارایت منہ ولا رأى منی" نہ میں نے آپ ﷺ کا پردہ دیکھا نہ انہوں نے میرا پردہ دیکھا اور ظاہر ہے کہ دوسروں کا پردہ تو بطریق اولیٰ آپ ﷺ نے نہیں دیکھا۔

---

(۱) بخاری ج ۱ ص ۵۲

(۲) مناوی ج ۲ ص ۲۱۸

خلاصہ باب

اس باب میں نبی اکرم ﷺ کی حیاء کا ذکر ہے کہ آپ ﷺ میں یہ صفت بدرجہ اتم موجود تھی۔ اس سلسلے میں آپ ﷺ سے قولی احادیث بھی مروی ہیں اور فعلی بھی یہاں امام ترمذی بطور نمونہ دو حدیث لائے ہیں۔

نوجوانی میں صرف ایک مرتبہ آپ ﷺ برہنہ ہو کر بے ہوش ہوئے تھے اس کے بعد کبھی بھی برہنہ نہیں ہوئے بلکہ حضرت ابن عباس ؓ کہتے ہیں کہ **فکان اوّل شیئ رأیٔ من النبوۃ ان قیل لہ "استتر" فما رأیت عورتہ من یومئذ**، یعنی احکام سماویہ میں سب سے پہلا حکم (قبل نبوت) آپ ﷺ کو یہی ملا تھا کہ "پردہ چھپاؤ" اور اسی روز سے آپ ﷺ کا پردہ کبھی نہیں دیکھا گیا۔

بہر حال اس بات میں نبی اکرم ﷺ کے اخلاق عالیہ کا ایک گوشۂ زریں نمایاں کیا گیا ہے۔

۵۰. باب ماجاء فی حجامة رسول اللّٰہ ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے پچھنے لگوانے کا بیان

علاج توکل کے خلاف نہیں: حجم اور احتجام پچھنے اور سینگ لگوانے کو کہتے ہیں اس کا اصل معنی مص یعنی چوسنا ہے۔ حجامة اسی حجم سے اسم ہے یہ نبی کریم ﷺ کے علاج کے طریقوں میں ایک طریقہ تھا۔ شمائل میں اس باب کے لانے کیلئے علامہ مناویؒ نے یہ لکھا ہے کہ چونکہ کمال توکل نبی اکرم ﷺ کے اخلاق عالیہ کا حصہ تھا جبکہ توکل کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہوئے علاج اور دم تعویذ وغیرہ سے پرہیز کیا جائے تو امام ترمذیؒ نے اس توہم کو دفع کرتے ہوئے یہ باب منعقد کیا تا کہ تنبیہ کردیں کہ حجامت بلکہ کوئی بھی علاج خلاف توکل نہیں اور نہ کمال توکل کے منافی ہے۔ اس باب میں مصنفؒ نے چھ حدیثیں بیان کی ہیں جن میں نبی اکرم ﷺ کے معمول کا بیان ہے۔

حجامت مجرب طریقہ علاج: خون کی صفائی کیلئے اور اس کے جوش اور دباؤ کو کم کرنے کیلئے زمانہ قدیم سے خون کا کوئی حصہ نکالنا بطور علاج رائج تھا۔ اس نوعیت کا علاج کئی مقامات پر جھونکیں لگوانے سے بھی زمانہ قریب تک رائج رہا اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ خون نکالنے سے علاج کیسے ہوسکتا ہے؟ اس لئے کہ آج کل طب جدید میں بھی خون کی بیماریوں میں ڈاکٹر اور حکیم حضرات اسی نوعیت کے علاج تجویز کرتے ہیں۔

لہٰذا خون کی کمزوری، بلڈ پریشر اور جوش کو اگر حجامت کے ذریعے ختم کیا جائے تو کیا حرج ہے خون اگر سخت اور گاڑھا ہو یا اس میں چربی کے ذرات شامل ہوں اور یہ شریانوں میں بسہولت جاری نہ ہو تو آج کل بھی ڈاکٹر لوگ دواؤں اور اخراج خون کے ذریعے خون کو نرم کرواتے ہیں جس سے خون شریانوں میں تیزی کے ساتھ دوڑنے لگتا ہے غیر ترقی یافتہ دور میں اسی وجہ سے احتجام کو مقبول طریقہ علاج تصور کیا جاتا تھا۔ ابن سینا اور دوسرے مسلم وغیر مسلم اطباء نے اس طریقہ کی تحسین وتائید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ بھی علاج کے طریقوں میں سے بہترین طریقہ ہے۔ آج بھی سعودی عرب مدینہ منورہ وغیرہ میں یہ طریقہ علاج بہت اہتمام سے جاری ہے اور اس کے بڑے ماہرین سے عرب پچھنے لگواتے ہیں۔

(۱) حدّثنا علیّ بن حجر ثنا إسماعیل بن جعفر عن حمید قال سئل أنس بن مالک عن کسب الحجام فقال أنس احتجم رسول اللّٰہ ﷺ حجمہ ابوطیبة فامر لہ بصاعین من طعام و کلّم اھلہ فوضعوا عنہ من خراجہ وقال إنّ افضل ما تداویتم بہ الحجامة و إنّ من أمثل دوائکم الحجامة(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے حجام کی کمائی کے جواز اور عدم جواز کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے خود پچھنے لگوائے تھے ابوطیبہ نامی ایک غلام نے آپ ﷺ کو پچھنے لگائے تھے آپ ﷺ نے اس غلام کو دو صاع کھانا (کھجور) بخشنے کا حکم دیا اور اس کے آقاؤں سے بات کر کے اس کے اوپر خراج (ٹیکس) میں کمی کرادی۔ نیز فرمایا کہ تمہارے علاجوں میں سے بہترین علاج حجامت ہی ہے یا یہ فرمایا کہ حجامت تمہارے بہترین دواؤں میں سے ہے۔

حجامت پر اجرت: کسب الحجام الخ ،حجام یعنی پچھنے لگانے والے کی کمائی کے بارے میں حضرت انسؓ سے دریافت کیا گیا حجام سے ہمارے ہاں کا متعارف حجام یعنی نائی مراد نہیں یہ شاید اس لئے مشہور ہوا ہو کہ اکثر اوقات نائی ہی پچھنے لگایا کرتے تھے نیز پچھنے لگانے سے قبل حجام سر مونڈتے تھے یا پچھنے لگانے کے جگہ سے بال مونڈتے تھے۔ اس لئے سر مونڈنے والوں کو بھی حجام کہا جانے لگا ویسے عربی زبان میں آج کل نائی کو حلاّق کہتے ہیں۔

یہاں سائل نے حجام کی کمائی کے بارے میں پوچھا کہ کیسی ہے اس سوال کا منشاء یہ ہے کہ حجام کا کام چونکہ بظاہر گندہ ہے لہذا سائل کو شبہ ہو گیا ہوگا کہ اس کی کمائی بھی درست نہ ہوگی یا پھر یہ سوال اس لئے

---

(۱)صحیح بخاری ۱/ ۲۸۳ باب ذکر الحجامة کتاب البیوع، جامع ترمذی ۱/ ۱۵۳ ابواب البیوع باب ماجاء فی الرخصه فی کسب الحجام سنن ابی داؤد ۲/ ۱۲۸ کتاب الاجارات باب فی کسب الحجام، مسنداحمد۳/ ۱۰۰ ، مصنف ابن ابی شیبة۶/ ۲۶۵،السنن الکبریٰ للبیهقی ۹/ ۳۳۷، مؤطاامام مالک(مختار)

کیا کہ نبی کریم ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ "کسب الحجام خبیث" یعنی حجام کی کمائی خبیث ہے۔

احتجم رسول اللہ ﷺ الخ ، حضرت انسؓ نے جواب دیا کہ یہ کمائی حلال ہے کیونکہ ابوطیبہ نامی حجام نے نبی کریم ﷺ کو پچھنے لگائے تھے اور خود آپ ﷺ نے اسے اجرت میں دو صاع طعام کے دیئے تھے۔ چنانچہ یہ جائز ہے۔ اب بظاہر جو دونوں حدیثوں میں تعارض معلوم ہورہا ہے تو اس کی تطبیق یوں ہوگی کہ محل جواز وہ ہے جہاں اجرت اور عمل دونوں معلوم ہوں اور محل زجر وہ ہے جہاں اجرت مجہول ہو کہ حجام کو کتنا ملے گا یا عمل مجہول ہو یعنی یہ پتہ نہ ہو کہ کتنے پچھنے لگیں گے۔ امام طحاویؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابتداء میں حجام کی اجرت ناجائز تھی بعد میں اباحت کا حکم نازل ہوا تھا جبکہ امام احمدؒ تطبیق میں فرماتے ہیں کہ یہ فرق حر اور عبد میں ہے یعنی حر کیلئے تو یہ پیشہ اختیار کرنا جائز نہیں اور نہ اسے کمائی لینا جائز ہے الا یہ کہ وہ اس کمائی کو غلاموں اور چوپایوں پر خرچ کرے تو درست ہے جبکہ غلاموں کیلئے یہ عمل اور کمائی مطلقاً جائز ہے اور اس کی کمائی سے کھانا بھی درست ہے لیکن اکثر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نہی تنزیہی ہے اور یہ عمل اور اس کی اجرت لینا ہر کسی کیلئے جائز ہے کسی کیلئے مضائقہ نہیں اور یہی باقی ائمہ کا مسلک بھی ہے کیونکہ اگر حرام ہو تو پھر حر و عبد میں فرق نہیں ہونا چاہئے اور حلال ہو تو بھی دونوں کیلئے حلال ہوگا۔ اسلام نے عبد کو انسانیت اور تکلیف کے دائرے سے کب نکالا ہے حتیٰ کہ اسے حیوانات سے ملا کر اس کے اور آزاد آدمی کے درمیان احکام میں فرق کیا ہو۔ اسلام حتی الوسع اسے انسانیت کے تمام تقاضوں میں آزاد کے برابر شمار کرتا ہے بلکہ اسلام انسان کی غلامی کا روادار ہی نہ تھا لیکن دوسری طرف دوسرے انسان کے حقوق مالیہ کا لحاظ کر کے مجبوراً باقی رکھنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے غلامی کو محدود کر دیا غلام کو پستی سے نکال کر معاشرے میں قابل لحاظ رعایتیں دینے کے ساتھ ساتھ اس کی آزادی کے مختلف راستوں کی ترغیب دلائی۔ بہرحال غلام اور آزاد میں فرق کی بات غیر معقول نظر آتی ہے۔ لہٰذا اصل جواب یہی ہونا چاہئے کہ نہی تنزیہی ہو اور ایک نجس چیز (خون) کے ساتھ تلبس کی وجہ سے محض احتیاطاً نبی کریم ﷺ نے کسب الحجام خبیث کا حکم لگایا ہو اور اس میں راز کی بات یہ ہے کہ بعض اوقات حجام خون کو منہ سے چوستا ہے جس سے خون کے نگلنے کی نوبت آسکتی ہے۔ آج کل بھی خون ٹیسٹ کرنے کی لیبارٹری میں سرنج پر منہ لگا کر خون کھینچتے ہیں۔ اسی طرح

اس کے جسم اور لباس کو ویسے بھی خون عموماً لگ جاتا ہے جو شرعاً اور طبعاً ایک قبیح امر ہے لیکن کثرت ملابست کی وجہ سے حجام کی طبعی نفرت جاتی رہتی ہے اس لئے شرعاً قباحت کی بقاء اور اظہار کیلئے آپ ﷺ نے اس فعل کی تقبیح کی۔ رہی جواز کی بات تو اس سلسلے میں خود آپ ﷺ سے عملاً حجامت کروانا بھی ثابت ہے اور اجرت دینا بھی۔ مذکورہ حدیث بھی اسی کی شہادت دیتی ہے بعض حضرات نے یہ تطبیق بھی کی ہے کہ حجامت کا عمل اور اس کی اجرت لینا تو جائز امر ہے لیکن اسے بطور کاروبار اپنانا اور پیشہ بنانا مکروہ ہے اور نہی کی حدیث کا محمل بھی وہی ہے جبکہ بعض حضرات نے نہی کی وجہ یہ بتائی ہے کہ چونکہ بیمار شخص کی حجامت کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اس سے ہمدردی کر کے مفت میں علاج کرنا چاہئے نہ یہ کہ ایسی حالت میں اس سے پیسے کمائے جائیں۔

و کلّم اھلہ، ابوطیبہ یا تو ماذون غلام تھا اس کا مالک حضرت محیصہ بن مسعود انصاریؓ تھا۔ یا بنی حارثہ میں سے کسی اور کا غلام تھا جو اس سے تین صاع ٹیکس لیتا تھا۔ آپ ﷺ نے اس کی سفارش کی اور اس کیلئے مالکوں سے ایک صاع کی رعایت حاصل کی۔ اس کے نام میں متعدد اقوال منقول ہیں۔ بعض نے نافع بعض نے میسرہ اور بعض نے دینار لکھا ہے لیکن ملا علی قاریؒ نے موخر الذکر دوناموں کو درست قرار نہیں دیا الغرض اس کے اہل یعنی مالکوں سے بنی حارثہ اور بالخصوص محیصہ بن مسعود انصاریؓ مراد ہیں۔

او ان من امثل دوائکم الحجامة، او، یہاں شک کیلئے ہے راوی کو الفاظ کی تعیین میں شک ہے نبی اکرم ﷺ نے حجامت کی تحسین فرمائی ہے جو ایک مفید طریقہ علاج ہے بالخصوص عرب کے گرم علاقے میں اس کی افادیت مسلم ہے کیونکہ وہاں حرارت کی شدت کی وجہ سے خون کی کثافتیں بدن کی ظاہری حصہ میں جمع ہوجاتی ہیں جس کی وجہ سے مختلف قسم کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ حجامت سے یہ کثافتیں خارج ہوجاتی ہیں۔ ابن سینا حکیم کا قول ہے

ومن تکن عادته الفصادة ۔۔۔ فلایکن قطع تلک العادة

ترجمہ: جس کو رگ مارنے کی عادت ہو اس کیلئے یہ عادت چھوڑنا نہیں چاہئے۔

ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

ووفّر علی الجسم الدماً فانّه ۔۔۔ لصحة جسم من احل الدعائم

ترجمہ: جسم سے خون کثرت سے بہاؤ کہ یہ جسمانی صحت کیلئے بڑا استون ہے۔

البتہ بڑے بوڑھوں کو اس عمل سے پرہیز کرنا چاہئے کیونکہ ان کے جسم میں تولید خون کا نظام کمزور پڑ جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ حجامت کو برداشت نہیں کرسکتے اسی طرح روزہ دار کو بھی اگر کمزوری یا نقصان کا خوف ہو تو پچھنے لگوانے سے پرہیز کرنا چاہئے۔

(۲) حدثنا عمرو بن علیؒ ثنا ابو داؤد ثنا ورقاء بن عمر عن عبدالأعلیٰ عن أبی جمیلة عن علیّ أنّ النبیّﷺ احتجم وأمرنی فاعطیت الحجام اجره(۱).

ترجمہ: حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرمﷺ نے پچھنے لگوائے اور مجھے اجرت دینے کا حکم دیا پس میں نے حجام کو اس کی اجرت ادا کی۔

وأمرنی اس حدیث سے بھی حجامت کا جواز اور حجام کو اجرت دینے کا جواز ثابت ہو رہا ہے۔

(۳) حدثنا هارون بن إسحاق الهمدانیّ ثنا عبدة عن سفیان الثوریّ عن جابر عن الشعبیّ عن ابن عبّاس أظنّه قال أنّ النبیّﷺ احتجم فی الاخدعین وبین الکتفین واعطیٰ الحجّام اجره ولو کان حراما لم یعطه(۲).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرمﷺ نے گردن کے دونوں جانب اور دونوں کندھوں کے درمیان پچھنے لگوائے اور حجام کو اس کی مزدوری دے دی۔ اگر کسب حجام حرام ہوتا تو آپﷺ اس کو مزدوری نہ دیتے۔

---

(۱)سنن ابن ماجة ص۱۵۶ کتاب التجارات باب کسب الحجام، مسنداحمد ۱/۹۰، مصنف ابن ابی شیبة۶/۲۶۴ کتاب الاجارات. (مختار)

(۲)صحیح بخاری ۱/۳۰۴ کتاب الاجارات باب خراج الحجام، صحیح مسلم ۲/۳۰ کتاب البیوع باب حل اجرة الحجامة، مصنف ابن ابی شیبة۶/۲۶۶، سنن ابی داؤد۲/۱۳۹ کتاب الاجارات باب کسب الحجام، مسنداحمد ۱/۲۱۵ (مختار)

علی الاخدَ عین و الکاھل، اخدَ عین گردن کے دونوں جانب موجوددورگوں کا نام ہے جبکہ کاہل کندھوں کے درمیان پیٹھ کے بالائی حصہ کو کہتے ہیں جو ریڑھ کے ہڈی کے اوپر کے چھ مہروں پر مشتمل ہےاور پیٹھ کا تقریباً ایک تہائی حصہ ہے۔

حجامت کئی بیماریوں کا علاج ہے: اہل طب کہتے ہیں کہ اخدَ عین یعنی گردن کے دونوں جانب پچھنے لگوانے سے سر، منہ، کان، آنکھ اور دانت کے امراض ختم ہوجاتے ہیں جبکہ کندھوں کے درمیان پیٹھ کے بالائی حصے میں پچھنے لگوانا کندھوں اور حلق کے درد میں مفید ہے۔اسی طرح بعض دوسرے مخصوص اعضاء پر پچھنے کچھ مخصوص امراض میں فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کو بھی سر درد کا عارضہ بکثرت ہوتا تھا بلکہ مرض وفات میں بھی زیادہ تکلیف سر درد کی ہوتی رہی اور اس کا سبب محققین کے ہاں وہ زہریلا گوشت چکھنا ہے جو سلام بن مشکم یہودی کی بیوی اور مشہور یہودی پہلوان مرحب کی بہن زینب بنت الحارث نے آپ ﷺ کو پیش کر کے کھلایا تھا۔اس کا اثر تمام سر یا آدھے سر کے درد کی صورت میں اخیر زندگی تک باقی رہااور ہر سال یہ دورہ آپ ﷺ پر لوٹ کر آتا آپ ﷺ اس کا علاج پیٹھ پر حجامت کے ذریعے کرواتے تھے۔

ولو کان حراماًلم یعطه، یعنی جب کام جائز ہوگا تب اس کی اجرت بھی جائز ہوگی اور کام کے بارے میں تو نبی کریم ﷺ نے امثل وافضل کہا۔لہٰذا اجرت کیوں حرام ہو۔علاوہ ازیں نبی کریم ﷺ نے خود اجرت دی ہے تو حرام کیسے ہوگی اس لئے نہی کی احادیث میں تاویل واجب ہوگی۔

یہاں کوئی یہ نہ کہے کہ اس حدیث کی رو سے حجامت ہر بیماری کیلئے علاج ہونا چاہئے اس لئے کہ حجامت ایک علاج ہے اور ہر علاج اور دوا ایک خاص مرض کیلئے ہوتی ہے جو کہ خاص حالات بلکہ خاص موسموں میں خصوصی پرہیزوں کے ساتھ کیا جاتا ہے ورنہ پھر وہی علاج مضر بھی ہوسکتا ہے۔حجامت بھی ہر مرض کیلئے اور ہر حال میں نہیں کیا جاتا مثلاً اگر کوئی شخص خون کی قلت کا مریض ہے اور اس حدیث کے پیش نظر اس سے مزید خون بھی نکال لیا جائے تو اسے تو موت کے منہ میں پہونچا دیا جائے گا۔اسی طرح اگر سرد علاقوں میں جہاں بدن میں خون کی کثرت اور گرمی کی ضرورت ہوتی ہے تم احتجام سے کسی مریض کا

علاج کروگے تو اس مریض کی موت کا خطرہ ہے۔اس صورت میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ نبی کریم ﷺ کا علاج غلط تھا بلکہ دراصل علاج بے موقعہ و بے محل ہونے کے سبب نقصان دہ ہوگا۔کیونکہ یہ علاج گرم علاقوں کی گرمی میں خون کی حدت کے دوران کیا جائے تو مفید ہوگا ہر جگہ اور ہر موسم میں نہیں۔جس طرح کہ اکثر علاجوں میں علاقہ،موسم،مرض اور مریض کی حالت کو مدنظر رکھنا لازم ہے۔اسی وجہ سے اطباء جماع کرنے،غسل،زیادہ کھانا کھانے،اورزیادہ بھوک کی حالت میں حجامت کو مضر کہتے ہیں۔

(۴) حدّثنا هارون بن إسحاق ثنا عبدة عن ابن أبی لیلیٰ عن نافع عن ابن عمر أنّ النبیّ ﷺ دعا حجّاما فحجمه وسأله کم خراجک فقال ثلاثة آصعّ فوضع عنه صاعا واعطاه اجره(۱).

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک حجام کو بلایا اس نے آپ ﷺ کو پچھنے لگائے۔آپ ﷺ نے اس سے پوچھا کہ تجھ پر کتنا خراج (ٹیکس) مقرر ہے۔اس نے عرض کیا کہ تین صاع آپ ﷺ نے اس کے مالک سے اس پر ایک صاع ٹیکس کم کروایا اور اسے اجرت بھی دے دی۔

دعا حجاما، یہ غالباً ابوطیبہ ہی ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ آپ ﷺ کی سفارش پر اس کے مالکوں نے ٹیکس کم کر دیا تھا۔

فقال ثلاثة آصع، ماذون له، غلاموں کو خدمت سے چھوٹ دیکر کاروبار کی اجازت دے دی جاتی تھی اور عموماً ان پر یومیہ یا ماہوار محصول لگایا جاتا تھا وہ معین محصول آقاؤں کو ادا کرتے تھے اور وہ آزاد لوگوں کی طرح کاروبار کرتے تھے۔یہ غلام بھی اپنے آقاؤں سے تین صاع پر اس قسم کا عقد کر چکا تھا جس میں نبی کریم ﷺ کی سفارش پر ایک صاع کی تخفیف کر دی گئی۔

بعض شراح نے یہاں یہ اشکال کیا ہے کہ صاع کی جمع صیعان یا اصوع تو لغت کی کتابوں میں مذکور ہے لیکن آصع خلاف قیاس ہے پھر اس کا جواب یہ دیا ہے کہ آصع دراصل اصوُع تھا۔صاد کے بعد کا

(۱)مصنف ابن ابی شیبة۲۶۶/۶،مسنداحمد۳۵۳/۲(مختار)

ہمزہ قلب کے قاعدے سے صاد سے پہلے منتقل ہوگیا اور پھر الف سے بدل دیا گیا اس طرح آصح بن گیا۔

(۵) حدثنا عبدالقدوس بن محمّد العطّار البصریّ ثنا عمرو ابن عاصم ثنا همّام وجریر بن حازم قالا ثنا قتادة عن أنس بن مالک قال کان رسول اللهﷺ یحتجم فی الاخدعین والکاهل وکان یحتجم لسبع عشرة وتسع عشرة واحدی وعشرین(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرمﷺ گردن کے دونوں جانب اور کندھوں کے درمیان پچھنے لگواتے تھے اور(اکثر) سترھویں، انیسویں یا اکیسویں تاریخ کو پچھنے لگواتے تھے۔

علاج کیلئے مناسب وقت ہونا چاہئے: **کان یحتجم لسبع عشرة الخ،** علاج اور خصوصاً جراحی اور آپریشن کے معاملے میں اب بھی ڈاکٹر موسم کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔گرمی اور سردی نیز مریض کی حالت کا لحاظ رکھتے ہیں۔اسی طرح آپﷺ بھی حجامت کیلئے وقت کا خیال رکھتے تھے۔ مہینے کی ۱۷، ۱۹ اور ۲۱ تاریخوں میں کرتے تھے یہ دراصل چاند کے ایام اور اس کی تاریخوں کا اعتبار تھا چاند بھی مدوجذر اور موسم کی کیفیت پر اثر انداز ہوتا ہے۔اس لئے آپﷺ نے بھی ان ایام میں جو اعتدال کے ایام ہیں علاج کروایا۔ابن سینا نے بھی قانون میں اس کی تصریح کی ہے کہ علاج کیلئے صحیح وقت کا انتخاب کرنا چاہئے تو آپﷺ کا یہ اہتمام گویا محض ایک رسم اور بدعت کے طور پر نہ تھا بلکہ حِکَم اور مصالح پر مبنی تھا۔اور وہ یہ کہ چاند طلوع ہونے کے بعد دوران خون میں عموماً ہیجان آجاتا ہے ایسی حالت میں حجامۃ میں ضرورت سے زائد خون بہنے کا خطرہ ہوتا ہے جبکہ مہینے کے آخر میں خون کا دوران مدھم پڑ جاتا ہے۔اس لئے حجامت کے باوجود فاسد مواد کا اخراج نہیں ہوتا۔لہٰذا حجامت کا سب سے بہتر وقت مہینے کا ربع ثالث بتایا گیا ہے پھر ان ایام میں طاق ایام کا انتخاب شاید اس وجہ سے ہو کہ آپﷺ جفت کی نسبت طاق اعداد کو ترجیح دیتے

(۱)سنن ابی داؤد ۲/ ۱۳۰ کتاب الاجارات باب کسب الحجام، جامع ترمذی ۲/ ۲۶۸ کتاب الطب باب ماجاء فی الحجامة،مسنداحمد ۳/ ۱۱۹ (مختار)

تھےاور فرماتے تھے کہ ''انّ اللّٰہ وترّ ویحبّ الوتر '' یعنی اللہ تعالیٰ خود بھی وتر ہیں اور وتر اعداد کو پسند کرتا ہے۔

(۶) حدّثنا إسحاق بن منصور انا عبدالرزاق عن معمر عن قتادة عن أنس ابن مالک أنّ رسول اللّٰہ ﷺ احتجم وھو محرم بملَلٍ علی ظھر القدم(۱)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ملل کے مقام پر پچھنے لگوائے جبکہ آپ ﷺ محرم تھے۔

بـمـلـل، ملل مدینہ سے تقریباً سترہ میل دور مکہ کے راستے میں ایک مقام کا نام ہے جہاں احرام کی حالت میں آپ ﷺ نے پچھنے لگوائے تھے۔

علماء کہتے ہیں کہ حالت احرام میں احتجام جائز ہے لیکن اس کیفیت سے ہو کہ بال نہ کاٹنے پڑیں۔ کیونکہ بال کاٹنے سے احرام ٹوٹنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ ویسے علاج تو حالت احرام میں بھی ممکن اور جائز ہے۔ لیکن بالوں کے ساتھ احتیاط ضروری ہے۔ ہاں اگر بال دور کرنا ضروری ہو پھر اسے بھی دور کرنا اضطراراً جائز ہوگا۔ لیکن بال کاٹنے کی جنایت ادا کرنی ہوگی۔ بہرحال بال کاٹنے سے حتی المقدور احتراز کیا جائے تو احتجام جائز ہے۔ یہ احناف کا مسلک ہے۔ جبکہ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ مکروہ ہے نبی کریم ﷺ نے ضرورت کی بنیاد پر شاید کیا ہو۔ لیکن احناف کے ہاں یہ پچھنے پاؤں کے ظاہری حصہ پر لگائے گئے تھے۔ جس میں بالوں کو کاٹنے کی نوبت نہیں آئی۔ نہ فدیہ واجب ہوا۔

---

(۱)سنن ابی داؤد ۱/ ۲۶۲ کتاب المناسک باب المحرم یحتجم، السنن الکبریٰ للنسائی کتاب الطب، مسنداحمد ۳/ ۱۶۴ (مختار)

۵۱۔ باب ماجاء فی اسماء رسول اللہ ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے ناموں کا بیان

اس باب میں نبی کریم ﷺ کے بعض اسماء مبارکہ کا بطور نمونہ مختصراً بیان کیا جاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ پر کن الفاظ کا اطلاق ہوا ہے۔اسماء سے عرفی معنی یعنی اعلام مراد نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ بطور اعزاز اور بصورت القاب آپ ﷺ کو کن وصفی ناموں سے پکارا گیا ہے۔آپ کا علم اور اسم ذاتی تو محمد ﷺ اور احمد ﷺ ہے۔

<u>نبی کریم ﷺ کے اسماء پر مستقل کتابیں:</u> جبکہ آپ کیلئے توصیف کی خاطر جو اسماء بولے جاتے ہیں بعض حضرات نے ان کا استقراء اور تتبع بھی کیا ہے۔اور اس سلسلے میں مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ بعض کتابوں میں یہ القاب وخطابات ہزاروں کی تعداد میں بتائی گئی ہیں۔امام سیوطیؒ نے اس سلسلے میں **البہجة السنیہ فی الاسماء النبویة** کے نام سے ایک رسالہ تحریر کیا ہے جس میں آپ ﷺ کے تقریباً پانچ سو نام جمع کئے گئے ہیں۔ملاعلی قاریؒ نے ننانوے نام ذکر کئے ہیں۔اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کی طرح نبی کریم ﷺ کے بھی عجیب خطابات والقاب ہیں۔قرآن مجید میں بھی آپ ﷺ کے متعدد اسماء گرامی کا بار بار ذکر ہوا ہے۔مثلاً محمد،عبداللہ،احمد، نبی،رسول،مزمل اور مدثر وغیرہ۔

اس کے علاوہ احادیث وآثار میں بھی متعدد اسماء وارد ہوئے ہیں نیز کتب سماویہ میں بھی مختلف ناموں سے حضور ﷺ کے بارے میں بشارتیں نازل ہوئی ہیں۔ان اسماء کے معانی بھی اللہ تعالیٰ نے قرن اول میں آپ ﷺ کے لئے ایک طرح سے ثابت کرکے اس بات کی نشاندہی کی کہ یہی شخصیت ہی ان مذکورہ ناموں کا حقیقی مصداق ہے۔اس باب میں بھی جو نام ذکر ہیں ہر نام کی مخصوص تشریحات اور برکات شروح میں موجود ہیں۔ملاعلی قاریؒ کہتے ہیں کہ ناموں کی کثرت مسمّیٰ کی عظمت وشرف کی غماض ہے۔

(۱)　حدثنا سعید بن عبدالرحمٰن المخزومیّ وغیر واحد قالوا ثنا سفیان عن الزهریّ عن محمّد بن جُبیر بن مطعم عن أبیه قال قال

---

(۱) علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے والقاعدة أنّ کثرة الأسماء تدلّ علی شرف المسمّٰی(المواهب الدنیة)(مختار)

رسول اللہ ﷺ إنّ لی اسماءً انا محمّد وأنا احمد واناالماحیّ الذی یمحواللہ بی الکفر واناالحاشر الذی یحشر الناس علی قدمی واناالعاقب والعاقب الذی لیس بعدہ نبیّ(۱)۔

ترجمہ: جبیر بن مطعمؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میرے کئی نام ہیں۔ میں محمد ہوں، میں احمد ہوں، میں ماحی (مٹانے والا) ہوں میرے ذریعے اللہ تعالیٰ کفر کو مٹاتا ہے میں حاشر ہوں کیونکہ (قیامت کے دن) تمام لوگوں کو میرے قدموں میں جمع کیا جائے گا اور میں عاقب (آخری) ہوں جس کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

حضرت جُبیر بن مطعمؓ: جبیر بن مطعم بن عدی بن نوفل ہیں جبیر کے والد کا دادا نوفل اور نبی اکرم ﷺ کے والد کے دادا ہاشم بن عبد مناف آپس میں بھائی ہیں۔قریش کے بڑے لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا انساب کا بھی ماہر تھا جو انہوں نے ابوبکر صدیقؓ سے سیکھی تھیں ابوبکر صدیقؓ کو انسب العرب کہا کرتے تھے۔بدر کے قیدیوں کو چھڑانے کیلئے جبیرؓ مکہ سے مدینہ آئے تھے تو نبی اکرم ﷺ کو سورہ طور پڑھتے ہوئے سنا۔آپؓ کہتے ہیں کہ اسی وقت اسلام نے میرے دل کے اندر گھر کر لیا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے بھی آپؓ کی عزت افزائی فرمائی اور کہا کہ اگر مطعم بن عدی (جبیر کے والد) زندہ ہوتے اور ان قیدیوں کی سفارش کرتے تو میں ان قیدیوں کو چھوڑ دیتا۔ پھر صلح حدیبیہ کے بعد فتح مکہ سے پہلے جبیر اسلام لائے۔آپؓ نے ۵۷ھ، ۵۸ھ یا ۵۹ھ میں وفات پائی۔

إنّ لی أسماء، یعنی میرے لئے کچھ مخصوص نام ہیں یہاں ظرف کی تقدیم اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ نام آپ ﷺ سے پہلے کسی اور کو نہیں دیئے گئے اور شاید اسی وجہ سے ان پانچ ناموں کو خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے۔علاوہ ازیں یہ نام آپ ﷺ کے اسماء گرامی میں سب سے زیادہ معظم ہیں نیز دیگر امتوں کے درمیان بھی سب سے زیادہ مشہور ہیں۔

(۱)صحیح بخاری کتاب المناقب باب ماجاء فی اسماء رسول اللہ ﷺ، صحیح مسلم ۲/۲۶۱ کتاب الفضائل باب فی الاسماء، جامع ترمذی ۲/۱۱۱ کتاب الادب باب ماجاء فی اسماء النبی ﷺ، مسند احمد ۴/۸۰ (مختار)

امت پرخصوصی رنگ احمد کا حاوی ہے: أنا محمّد الخ، میں محمد ہوں اس نام کا لغوی معنی بھی یہ ہے کہ بہت زیادہ حمد وستائش کیا ہوا۔ اور چونکہ حمد کمالات اور اخلاق کریمہ کے مقابلے میں ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں آپ ﷺ کے بہت سے خصال حمیدہ کا حامل ہونے کی طرف اشارہ ہے یا پھر آپ ﷺ کو محمد اس لئے کہا گیا کہ خود اللہ تعالیٰ نے اور پھر انبیاء کرام، فرشتوں اور اولیاء نے آپ ﷺ کی مدح وتوصیف کی ہے بلکہ ہر کسی سے زیادہ آپ ﷺ کی تعریف کی جا چکی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ گھر والوں نے تفاؤلاً آپ ﷺ کا یہ نام رکھا ہوتا کہ مستقبل میں آپ ﷺ کی صفت کی جائے اور ان کی توقعات سو فیصد پوری بھی ہوئیں۔

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ مخلوقات کی پیدائش سے بھی دو ہزار برس قبل آپ ﷺ کو محمد کے نام سے موسوم کیا گیا تھا یہی نام عرش کے ستون، ساتوں آسمانوں، جنت کے محلات، حوروں کے سینوں، جنت کے پودوں اور طوبیٰ اور سدرۃ المنتہیٰ کے پتوں پر لکھا گیا ہے۔ علماء نے اس کے بہت سے فضائل اور برکات کا تذکرہ کیا ہے۔

أنا أحمد، احمد کا لغوی معنی ہے سب سے زیادہ حمد کرنے والا، اور نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ حمد کرنے والے تھے۔ اس امت پر اللہ تعالیٰ نے ایک عمومی رنگ کو حاوی کر دیا ہے اور وہ حمد سے تعلق ہے یہی "صبغۃ اللہ" کا مطلب ومقصود ہے۔ چنانچہ حمد کے ساتھ اسی مناسبت کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کا نام محمد اور احمد ہے نیز اس امت کا نام حمادون ہے۔ اس امت کے پیغمبر فرماتے ہیں بیدی لواء الحمد. کہ قیامت کے دن میرے ہاتھ میں حمد کا جھنڈا ہوگا۔ علاوہ ازیں اس امت کو جو کتاب ہدایت دی گئی ہے۔ اس کی ابتداء بھی حمد سے کی گئی ہے اور نبی کریم ﷺ کے مقامات عالیہ کی انتہاء بھی مقام محمود پر ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے عسیٰ ان یبعثک ربّک مقامامحموداً. قریب ہے کہ آپ کا رب آپ کو مقام محمود میں جگہ دے گا (بنی اسرائیل ۷۹ پارہ نمبر ۱۵)

شفاعت کبریٰ کے بارے میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ اس وقت جب سجدے میں جائینگے تو اللہ تعالیٰ ایسے مخصوص محامد کا القاء سجدے میں فرمائینگے جو آپ ﷺ سے پہلے کسی کو معلوم بھی نہ ہوں گی۔ نیز اہل جنت کے قول آخر کا بیان کرتے ہوئے قرآن مجید کہتا ہے کہ واٰخر دعوٰھم ان الحمدللہ ربّ العالمین (یونس

۱۰پارہ۱۱)''جنت میں'' انکی اخیر بات یہ ہوگی کہ''الحمدللّٰہ ربّ العٰلمین ''الغرض اس امت کو ابتداء سے انتہاء تک حمد سے جوڑا گیا ہے۔احمد کا نام کتب سابقہ میں بھی مذکور ہے جسکی طرف قرآن مجید نے بھی اشارہ کیا ہے فرمایامبشرًا برسول یأتی من بعدی اسمہ أحمد(الصّف : ۶)

یعنی میں (عیسیٰؑ) میرے بعد آنے والے پیغمبر کی بشارت دینے والا ہوں جن کا نام احمد ہے۔

کتب سابقہ میں اگر چہ اسی مفہوم کو دوسرے الفاظ سے ادا کیا گیا ہے یعنی احمد کے لفظ کی بجائے وہاں اس کا ہم معنی لفظ''فارقلیط'' کا ذکر ہے اس لفظ اور اس کے معنی مراد کو بدلنے کیلئے عیسائی پادریوں اور راہبوں نے ہزارہا تحریفات وتاویلات کا سہارا لیا لیکن تحقیقات کے مطابق اس کا صحیح صحیح مفہوم''احمد'' ہی کا مفہوم ہے اور انصاف پسند مستشرقین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ احمد کے سوا فارقلیط کا دوسرا کوئی معنی بنتا ہی نہیں۔بہر حال قرآن مجید اور دیگر کتب سماویہ میں محمد اور احمد کے دو نام مذکور ہیں۔

<u>مٹانے والا، ماحی:</u> وانا الماحیّ، آپ ﷺ کے وصفی اسماء میں سے ایک نام ماحی (مٹانے والا) ہے۔جو کہ محا یمحو سے ہے اس سے قبل کے دو نام چونکہ آپ ﷺ کیلئے علم کے مرتبہ میں ہیں اس لئے ان کی وجہ تسمیہ بیان نہیں فرمائی۔لیکن باقی تین وصفی نام ہیں۔اس لئے ان کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔یمحو اللّٰہ بی الکفر،یعنی اللہ تعالیٰ میرے ہاتھ سے شرک وکفر اور ظلم وجہالت کو مٹاتا ہے جزیرۃ العرب میں تو آپ ﷺ کے حین حیات میں کفر کا نام نہ رہا جبکہ سارے عالم میں بھی کفر کا اضمحلال اور عیسیٰؑ کے زمانۂ نزول میں اس کا خاتمہ مسلّم بات ہے۔قرآن کا ارشاد ہے ھو الذی أرسل رسولہ، بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدّین کلہ(فتح ۲۸ وصف ۹) (ترجمہ) وہی ہے جس نے اپنے رسول کو بھیجا سیدھی راہ اور سچے دین پر تا کہ غالب کرے اسے ہر دین پر۔

دوسری جگہ ارشاد ہے کہ واللّٰہ متمّ نورہ ولو کرہ الکافرون(صف ۸) (ترجمہ) اور اللہ اپنے نور کو کمال تک پہنچا کر ہی رہے گا گو کافر لوگ کیسے ہی ناخوش ہوں۔

بعض روایات میں ایک اور وجہ بھی اس نام کیلئے ذکر کی گئی ہے وہ یہ''فإن اللّٰہ یمحوبہ سیّئات من تبعہ ''یعنی اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کے طفیل آپ ﷺ کی امت کی گناہوں کو مٹا دیں گے۔کافروں کو ایمان سے سرفراز فرمائیں گے۔اور مؤمنوں کے حق میں شفاعت قبول فرمائیں گے۔

بنی نوع انسان کو جمع کرنے والا: و أنا الحاشر ،فرماتے ہیں میں جمع کرنے والا ہوں۔حشر جمع کرنے کو کہتے ہیں۔آپ ﷺ اپنی قیادت میں اطراف واکناف کے منتشر لوگوں کوایک صراط مستقیم پر جمع کرنے والے ہیں۔تمام بنی نوع انسان کوآپ ﷺ کے قدموں کی اتباع کا حکم ملا۔اورتمام ادیان کوچھوڑ کردین حق کی اتباع کی دعوت دی گئی جووحدت کی ضمانت ہے آپ ﷺ سے اعلان کروایا گیا کہ وانّ ھذا صراطی مستقیماً فاتبعوہ ولاتتّبعوا السبّل فتفرّق بکم عن سبیلہٖ (انعام۱۵۳)(ترجمہ)یہ دین میرا راستہ ہے جوکہ سیدھا ہے پس اس راہ پر چلواور دوسرے راستوں پر مت چلوکہ وہ راہیں تم کواللہ کی راہ سے جداکردیں گی۔

اورجس طرح اللہ تعالیٰ کی توحید انسانیت کیلئے وحدت کا ذریعہ ہے۔اسی طرح آپ ﷺ کی رسالت بھی بنی نوع انسان کے اتفاق واتحاد کا پیغام ہے۔یورپی ملحدین کومذاہب پراعتراض ہے کہ مذاہب انسانیت میں تفرقہ پیدا کرتے ہیں لیکن جب دیگر مذاہب کوختم کرکے اسلام نے اتفاق واتحاد کی دعوت دی توپھر تفرقہ کا کیاسوال؟ آپ ﷺ کوختم نبوت کا تمغہ دیا گیا تو اب دوسرے ادیان کوختم کرکے تمام لوگوں کو متحد ہونا ہےاوریہی حشرِ انسانیت کی صورت ہے جودنیا میں ہونا ہے۔

علاوہ ازیں قیامت کے روزبھی نبی کریم ﷺ سب سے پہلے میدان حشر(۱) میں نکلیں گے۔اور پھردوسرے لوگ ان کے پاس جمع ہونگے اس لحاظ سے بھی آپ ﷺ پر حاشر کا اطلاق ہوسکتا ہے۔

آخری نبی: وانا العاقب، عاقب کے معنی آخر میں آنیوالے ہیں۔اورآپ بھی انبیاء کرام کے سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی تھے۔آپ ﷺ کے بعدکوئی نبی نہیں۔اب اگرلفظ خاتم النبیین کے ہزاروں تاویلات بھی کی جائیں۔تو یہ لفظ العاقب اوراس قسم کے ہزاروں تصریحات ختم نبوت کے واضح دلائل ہیں۔ختم نبوت کے منکر خاتم کا معنی مہر لگانے والے سے کرتے ہیں لیکن خودآپ ﷺ کی احادیث اس پرناطق ہیں کہ خاتم کا یہ معنی نہیں بلکہ اس کا معنی آخر ہے مثلاً اس جگہ بھی لیس بعدی نبی فرمایا۔اوردوسرے

(۱)أنااوّل من تنشق عنہ الارض رواہ الترمذی ۲۰۲/۲عن أبی ھریرۃ فی ابواب المناقب باب فضل النبیؐ ﷺ، ورواہ البخاری ۳۲۵/۱عن ابی سعیدؓ فی کتاب الخصومات ولفظہ فاکون اوّل من تنشق عنہ الأرض الخ وکذارواہ أحمد والدرامی وابوداودوغیرھم ۱۲ (اصلاح الدین)

مقام پر فرمایا لانبی بعدی، اگر کوئی تحریف اور دجل و تلبیس کرے تو اس کا تو کوئی علاج نہیں۔ایک متنبی خبیث نے نبوت کا دعویٰ کیا اور دعویٰ سے قبل ہی وہ خود کو ''لا'' کا لقب دے چکا تھا اور اپنی نبوت پر لانبیّ بعدی سے استدلال کرتے ہوئے کہتا تھا کہ ''لانبیٌّ بعدی'' کا معنی یہ ہے کہ ''لا'' میرے بعد پیغمبر ہوگا۔ مرزا غلام احمد لعین بھی کچھ اس قسم کی تحریفات کرتا رہتا تھا۔اب اس قسم کے تعنت کا تو کوئی علاج نہیں ہے البتہ احادیث میں آپ ﷺ نے ختم نبوت کی ناقابل تاویل تصریحات بھی کی ہیں۔

(۲) حدّثنا محمّد بن ظریف الکوفیّ ثنا أبوبکر بن عیّاش عن عاصم عن أبی وائل عن حذیفة قال لقیت النبیّ ﷺ فی بعض طرق المدینة فقال أنا محمّد وأنا أحمد وأنا نبیّ الرحمة ونبیّ التوبة وأنا المقفیّ وأنا الحاشر ونبیّ الملاحم(۱).

ترجمہ: حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کہتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ مدینہ کی ایک گلی(۲) میں ملا۔تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں محمد ہوں اور میں احمد ہوں میں نبی الرحمۃ ہوں، میں نبی التوبہ ہوں، میں مقفّی ہوں میں حاشر ہوں اور میں نبی الملاحم ہوں

نبی الرحمة، کا معنی رحمت والا نبی، نبی التوبة (۳) توبہ والا نبی، مقفّی پیچھا کرنے والا، مُقفّٰی پیچھا کیا ہوا، حاشر جمع کرنے والا، نبی الملاحم جنگوں والا نبی۔

رحمۃ کائنات: أنا محمد، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں محمد ہوں احمد ہوں اور نبی الرحمۃ ہوں، رحمت ہونے کی بھی بہت تفصیلات بیان کی جاچکی ہیں۔قرآن مجید میں ہے وما ارسلنک إلاّرحمةً للعٰلمین.

---

(۱)مصنف ابن ابی شیبة ۱۱/۴۵۸، مجمع الزوائد ۸/۲۸۴، مسنداحمد ۵/۴۰۵، الحلیة الاولیاء لابی نعیم ۵/۹۹ (مختار)

(۲)اس حدیث کو ابو نعیمؒ نے حضرت حذیفہؓ اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے طرق المدینہ کی بجائے فی سکة من سکک المدینة کے لفظ سے روایت کیا ہے اس لئے ترجمہ میں گلی کا لفظ ذکر کیا ہے۔(اصلاح الدین)

(۳)ملاعلی قاریؒ نے توبہ کے لئے تین ارکان لکھے ہیں۔وارکان التوبة علی ماقاله العلماء ثلاثة الندم والقلع والعزم علی ان لایعود ولاجدجعل الاستغفار اللسانی شرطاً للتوبة نعم للتوبة باعتبار تعلقها بحقوق العباد وببعض حقوق الله شروط(جمع الوسائل ۲/۲۲۷)

آپ ﷺ تمام عالموں کیلئے رحمت ہیں یعنی مسلمانوں کیلئے، کفار کیلئے یہود ونصاریٰ کیلئے حتیٰ کہ جانوروں اور نباتات، شمس وقمر اور سماوات وارضین کیلئے بھی آپ ﷺ رحمت ہیں۔ اس سلسلے میں علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں مثلاً قاضی سلیمان منصور پوری کی تین جلدوں کی کتاب ''رحمۃ للعالمین'' اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ اسی طرح ''نبی الرحمۃ'' تین جلدوں میں مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحبؒ نے لکھی ہے نیز مفسرین نے بھی اس صفت کی عجیب عجیب تفصیلات بیان کی ہیں۔ آپ ﷺ کافروں کیلئے رشدوہدایت ہونے کے علاوہ اس لحاظ سے بھی رحمت ہیں کہ انکو خسف مسخ اور دیگر عمومی عذابوں سے آپ ﷺ کے طفیل امن ملا ہے لیکن امۃ مسلمۃ کیلئے تو آپ ﷺ رحمت کامل ہیں۔ جن کیلئے قرآن مجید نے آپ ﷺ کا منصب یوں بیان کیا ہے۔ **یتلو علیهم آیاته ویزکّیهم ویعلّمهم الکتاب والحکمة** (جمعہ۲) جو انکو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور انکو پاک کرتے ہیں اور انکو کتاب اور دانشمندی کی باتیں سکھلاتے ہیں۔ نیز فرمایا **وبالمؤمنین رؤف الرحیم** (توبہ:۱۲۸) اور ایمانداروں کیساتھ بڑے ہی شفیق ومہربان ہیں۔

<u>توبہ کے حقیقی راستے:</u> بہرحال آپ ﷺ کی صفت رحمت تمام عالم خصوصاً تمام بنی نوع انسان کیلئے ایک مسلّم بات ہے۔ **أنا نبیّ التوبة**، مطلب یہ ہے کہ میں نے توبہ کے دروازے کھول دیئے۔ جو اگرچہ کبھی بند نہ تھے لیکن تحریف وتاویل کرنے والوں نے غلط نظریات اور مذموم مقاصد سے اس کو بند پیش کیا عیسائیوں نے اسے بند سمجھ کر گناہوں کے کفارے کی ضرورت پر زور دیا۔ اور اسی وجہ سے عیسیٰؑ کو بطور کفارہ مصلوب مانا۔ اور بعض مذاہب والوں کے ہاں تو سرے سے گناہگار کیلئے معافی نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے توبہ کے حقیقی راستوں کو پھر سے زندہ کردیا کہ اگر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی جائے اس کے دربار میں رویا جائے تو اللہ تعالیٰ معاف فرمادے گا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات سے مایوسی کو کفر بتایا۔ آپ ﷺ کی بعثت سے قبل لوگوں پر مایوسی کی گھٹائیں چھائی رہیں اور چاروناچار لوگ خود کو اپنے گناہوں کا بڑے ظالمانہ اور راہبانہ طریقوں سے سزادیتے تھے آپ ﷺ نے اس کا خاتمہ کیا۔ علاوہ ازیں آپ ﷺ کو نبی التوبۃ کہنے کی اور بھی وجوہات ہیں مثلاً یہ کہ بعض امتوں کے توبہ کی قبولیت کیلئے قتل نفس وغیرہ سخت شرائط لگائی گئیں لیکن آپ ﷺ کی امت سے سیدھے سادے توبہ کا مطالبہ کیا گیا یا یہ کہ آپ ﷺ اپنی امت کو کثرت سے توبہ کی

تعلیم دیتے تھے یا یہ کہ آپ ﷺ خود بکثرت استغفار فرمایا کرتے تھے نیز آپ ﷺ کی امت کو بھی اللہ تعالیٰ نے تائبین کہا ہے۔

تابع ومتبوع: وانا المقفی، مقفّی اسم مفعول ہوتو معنیٰ یہ ہوگا کہ میں متبوع ہوں۔ دوسرے لوگ میرے پیچھے آرہے ہیں گویا بنی نوع انسان کیلئے آپ ﷺ کے نقش قدم پر چلنا ضروری ہے اور قیامت تک کوئی اور ایسا شخص نہیں آئے گا جس کا اتباع مطلقاً لازم ہو اور اگر یہ لفظ اسم فاعل ہو تو پھر معنیٰ یہ ہوگا کہ میں دوسرے انبیاء کا اتباع کرنے والا ہوں کوئی دوسرا راستہ ایجاد نہیں کیا بلکہ ان کی تعلیم میری تعلیم ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اولٰئک الذین ھدی اللّٰہ فبھداھم اقتدہ (انعام:۹۰) یہ حضرات ایسے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی تھی سو آپ بھی انہی کے طریقہ پر چلئے۔

انبیاء کرام کا سلسلہ ہادیین ومہدیین کا سلسلہ تھا اور آپ ﷺ کو اصول دین یعنی توحید اور مکارم اخلاق وغیرہ میں ان کی اقتداء کا حکم مل چکا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض فروعی مسائل میں ادیان سابقہ سے اختلاف ضرور ہے۔ لیکن اس سے وہ اقتداء مجروح نہیں ہوتا جس کا نبی کریم ﷺ دعویٰ کررہے ہیں۔ بعض شراح نے مقفّی کا معنیٰ پیچھے اور آخر میں آنے والے سے کیا ہے۔ اس طرح یہ عاقب کا ہم معنیٰ ہوگا جو گزشتہ حدیث میں ذکر ہو چکا ہے۔

جہاد کو زندہ کرنے والے: وأنا نبی الملاحم، ملاحم ملحمہ کی جمع ہے جو کہ شدید جنگ اور قتل وقتال کو کہتے ہیں بلکہ لام حاء اور میم کے مادے میں شدت اور مضبوطی کا معنیٰ ہوتا ہے جیسے لحم یعنی گوشت اور التحام بمعنیٰ ازدحام میں بھی یہ معنیٰ ہوتا ہے چونکہ جنگ میں بھی لوگ ایک دوسرے میں گھس جاتے ہیں اسلئے اسے بھی ملحمہ کہتے ہیں یا اس لئے کہ اس میں لحم یعنی گوشت گرتا رہتا ہے اسے ملحمہ کہتے ہیں۔ اس میں نبی کریم ﷺ اپنی ایک اور صفت یعنی جہاد کی علمبرداری کو اشارہ فرمارہے ہیں اور اس بات پر تنبیہ ہے کہ میرے دین میں جہاد بھی دعوت کے دوش بدوش کارفرما ہے۔ مجرد رحمت ورافت نہیں بلکہ میں مجاہد ہوں اب باطل کے مقابلے میں تلوار سے دین حق کا تحفظ کیا جائے گا۔ آپ ﷺ سے پہلے حضرت عیسیٰؑ کے مذہب میں یہ بات نہ تھی۔ بلکہ ان کے ہاں تو حکم یہ تھا کہ کوئی ایک گال پر مارے تو اس ظلم کا بدلہ نہ لو بلکہ دوسرا رخ

بھی اس کے سامنے پھیردو۔ دور جدید میں گاندھی ازم بھی اہنساء کا علمبردار رہا۔ جو ہندی کا لفظ ہے اور اس کا معنی عدم تشدد ہے۔ ہندوؤں میں یہ دراصل بدھ مت کا اثر تھا۔ تو نہ بدھ مت میں جہاد تھا نہ گاندھی ازم میں اور نہ عیسیٰ علیہ السلام کے مذہب میں جہاد تھا۔ جہاد کو آپ ﷺ نے زندہ کیا۔ اور جہاد کا حکم ملنے کے بعد مدنی زندگی کے مختصر دورانیہ میں آپ ﷺ ابن سعد کی روایت کے مطابق ستائیس مرتبہ بنفس نفیس جہاد پر گئے جبکہ جن فوجی مہمات میں آپ ﷺ نے صحابہ کو روانہ فرمایا ان کی تعداد ستر تک بتائی گئی ہے چنانچہ اسی جہاد ہی نے اسلام کو حیات جاودانی بخشی۔ آپ ﷺ نے فرمایا **الجهاد ماض إلى يوم القيامة**(۱)، جہاد قیامت کے دن تک جاری رہنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو خطاب ہے **ما كان لنبيٍّ ان يكون له اسرىٰ حتىّٰ يثخن في الأرض**(انفال ۶۷) نبی کے شان کے یہ لائق نہیں کہ اپنے ہاں قیدی رکھے جب تک وہ زمین میں اچھی طرح خونریزی نہ کرلیں۔

بہرحال اسلام کا یہ ایک عظیم اور قابل فخر پہلو ہے کہ حق کے راستے میں قوۃ کا استعمال ہونا چاہیے یہ کوئی قابل شرم بات نہیں حتیٰ کہ بیکار قسم کی توجیہات کا سہارا لینا پڑے کہ اسلام جارحانہ جنگ نہیں بلکہ دفاعی جنگ کی ترغیب دیتا ہے۔

دراصل جب جسم میں فاسد مادہ زیادہ ہوجائے مریض اس کی وجہ سے مرنے لگے تو اس فاسد مادے کو نکالنا بلکہ بعض اوقات کسی خراب عضو کو کاٹنا بھی ضروری ہوتا ہے اور واضح بات ہے کہ کفر معاشرے میں ناسور کی طرح ہے اس سے بچاؤ اور معاشرے کی تطہیر کیلئے اسلام نشتر چلانے کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ تو اس صورت میں ہوا کہ ملحمہ سے شدت کا معنی لیا گیا ہو اور اگر ملحمہ سے التحام مراد ہو تو اس کا معنی اجتماع بھی ہوسکتا ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ میں اجتماعیت کا پیغمبر ہوں لوگوں کو منتشر نہیں کرتا بلکہ ان کو جمع کرتا ہوں اور نفرتوں کے اندھیروں میں محبتوں اور وحدت کا پیغام لایا ہوں۔

حدّثنا اسحاق بن منصور الخ، اسی حدیث کیلئے دوسری سند لا رہے ہیں۔

---

(۱) الجهاد ماض منذ بعثني الله الى ان يقاتل آخر أمتّي الدّجال(ابوداود ۳۵۰/۱ كتاب الجهاد باب في الغزو مع ائمة الجور) (اصلاح الدین)

خلاصہ باب

اس باب میں نبی اکرم ﷺ کے اسماء مبارکہ کا ذکر ہے جو ویسے تو بہت زیادہ ہیں جیسا کہ باب کی ابتداء میں ہم ذکر کر چکے ہیں لیکن یہاں صرف چند اہم اور ان مخصوص ناموں کا ذکر ہے جو کتب سابقہ میں بھی آپ ﷺ کیلئے ثابت ہیں جو درج ذیل ہیں:

محمد،احمد،ماحی،حاشر،عاقب،نبی الرحمۃ،نبی التوبۃ،مقفّٰی ؒ،اور نبی الملاحم.

فصلیّ اللّٰہ تبارک وتعالیٰ علی مسمّا ھا وسلّم تسلیما کثیرا

۵۲. باب فی عیش النبی ﷺ
حضوراقدس ﷺ کی گزاراوقات کا بیان

<u>اکل وشرب لازمۂ حیات مگراعتدال اورسادگی:</u> اللہ تعالیٰ کی عبادت اورحق شناسی علم وعمل کا نام ہے لیکن علم وعمل کا فرض نبھانے کے لئے بدن کی سلامتی ضروری ہےاور بدن کی سلامتی کیلئے ضروری ہے کہ اس کی بنیادی ضروریات روٹی، کپڑااور مکان کا خیال رکھاجائے تا کہ وہ تندرست اور مطمئن رہ کر رب کے ساتھ تعلق جوڑسکے۔اسی وجہ سے بعض بزرگوں کا مقولہ ہے کہ ''الاکل من الدین'' یعنی کھانا بھی دین ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ''کلوامن الطّیّبات واعملوا صالحاً ''پاک چیزیں کھاؤاور نیک عمل کرو۔لیکن جوشخص عبادت کیلئے تیاری کے تصور سے کھائے وہ اپنے نفس کو جانوروں کی طرح صرف خورونوش کیلئے وقف نہ کرے بلکہ شریعت کی پابندیوں اورآداب کے ساتھ کھائے پیئے۔ضرورت سے زائد نفس کے خواہشات کوقابومیں رکھے بلکہ کم کھائے پیئے۔حدیث میں ہے''من کثر تفکرہ قلّ مطعمہ ومن کثر مطعمہ قلّ تفکرہ وقساقلبہ''جوفکرمندرہتا ہے وہ کم کھاتا ہےاور جو زیادہ کھاتا ہےاس کا تفکرکم ہوجاتا ہےاوردل سخت ہوجاتا ہے۔بالخصوص علم کے حصول کے لئے بھی پیٹ بھرکرکھانا مضر ہے۔ کسی شاعر نے کہاہے کہ

تھی زحکمتی بہ علّت آں   کہ پُری از طعام تابینی

بہرحال اس باب میں نبی کریم ﷺ کی کم خوری،لباس،مسکن میں سادگی اوراختیاری فقرکا بیان ہے۔آپ ﷺ متاع دنیامیں انہماک سےکوسوں دوراپنے رب سے تعلق میں مگن رہتے تھے۔

اس عنوان سےایک اورباب''باب ماجاء فی خف رسول اللّٰہ ﷺ '' سےقبل لایا گیاتھا وہیں لفظ عیش کی تشریح بھی گزرچکی ہےالبتہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس باب کومکرر کیوں لایا گیا ہے۔بعض شراح نے تو اسے ناسخین کا تصرف قراردیا ہے اوربعض نے یہ عذرکردیا ہے کہ زیرنظرباب میں متنوع احادیث لانے سے تکرار کا شبہ زائل ہوجاتا ہے جبکہ بعض شراح نے لکھاہے کہ مصنفؒ نے اس موضوع کی

اہمیت واضح کرنے کیلئے قصداً ایسا کیا ہوگا۔اس سلسلے میں بعض دیگر توجیہات اسی چھوٹے باب کی ابتداء میں ہم پیش کر چکے ہیں۔

(۱) حدّثناقتیبة بن سعیدثناأبو الأحوص عن سماک بن حرب قال سمعت النعمان بن بشیر یقول السُتم فی طعام وشراب ماشئتم لقدرأیت نبیکم ﷺ ومایجد من الدقل مایملأبطنه(۱).

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیرؓ اپنے ساتھیوں سے کہتے تھے کیاتم دل پسند کھانے پینے میں مصروف نہیں ہو؟ میں نے تمہارے نبی ﷺ کو بھی دیکھا تھا یوں کہ ان کو بے کارقسم کی کھجوریں بھی پیٹ بھر کر میسر نہیں تھیں۔

ماشئتم ماموصولہ ہے یعنی "**بالقدر الذی شئتم**" جتنا کھانا پینا چاہو کر سکتے ہو۔ملاعلی قاریؒ کہتے ہیں کہ مامصدریہ بھی ہوسکتی ہے یعنی مقدار مشیّتکم،دونوں صورتوں میں درحقیقت اپنے ساتھیوں کی تنبیہ مقصود ہے کہ تم دل پسند کھانے پینے میں مشغول ہو۔حالانکہ نبی اکرم ﷺ نے فقر کو ترجیح دی تھی(۲)۔

ومایجدمن الدقل،دقل چھوارے یعنی خشک اور بےذائقہ کھجور کو کہتے ہیں۔یہ حدیث باب ادام رسول اللہ ﷺ میں گزر چکی ہے۔وہیں مزید تشریح گزر چکی ہے۔

(۲) حدّثناهارون بن اسحاق ثناعبدة عن هشام بن عروة عن أبیه عن عائشة قالت ان کنّاآل محمدنمکثُ شهرامانستوقدبنارٍ ان

---

(۱)صحیح مسلم ۴۱۰/۲ کتاب الزهدوالرقائق، جامع ترمذی ۵۱۲/۲ کتاب الزهد باب ماجاء فی معیشة اصحاب النبی ﷺ،سنن ابن ماجة ص۳۰۶ ابواب الذهد باب معیشة أل محمد ﷺ، مسنداحمد ۲۶۸/۴ (مختار)

(۲) بعض اہل اللہ سے مروی ہے **جوّعوا انفسکم بولیمة الفردوس(المواهب اللدنیة ص ۲۳۲)** مگر یاد رہے کہ بسیارخوری وہ مذموم ہے جو علم وعمل کی تحصیل میں سستی کاباعث بنے ورنہ اگر تقویت کاباعث ہو پھر تو مطلوب ہے۔**قال البیجوریؒ والمذموم إنّما هوالشبع المثقل الموجب للکسل المانع من تحصیل العلم والعمل وأماالأکل المعین علی العبادة فهو مطلوب لاسیمااذاکان بقصدالتقوی علی الطاعة (المواهب الدنیة ۲۳۲)(مختار)**

هو الا التمر و الماء(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ بیشک ہم محمد ﷺ کے گھر والے پورا مہینہ آگ جلائے بغیر گزار لیتے تھے۔ ہمارا کھانا صرف کھجور اور پانی ہوتا تھا۔

اہل بیت کی تنگدستی: ان کنا آل محمد، ان مخففہ من المثقلہ ہے اصل میں ''انا کنا'' تھا اور آل محمد ''کنا'' کی ضمیر سے بدل واقع ہوا ہے اگر مرفوع پڑھا جائے۔ اور اگر منصوب ہو تو ''اعنی'' کی تقدیر کے ساتھ مفعول بہ ہوگا یا پھر منصوب علی المدح ہوگا۔ کنا کی خبر نہیں ہے۔

یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کی عیش کا بیان نہیں بلکہ گھر والوں کی تنگدستی کا ذکر ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آل محمد سے مراد بشمول رسول اللہ ﷺ تمام گھر والے ہیں۔ یا جواب یہ ہے کہ یہ فطری بات ہے کہ مرد کھانے پینے اور لباس کے سلسلے میں گھر والوں کو خود پر مقدم رکھتا ہے۔ لہٰذا واضح بات ہے کہ جب گھر والوں کی یہ حالت ہے تو نبی کریم ﷺ کی حالت اس سے بھی ابتر ہوگی۔

نمکث شهرا، یہاں ایک مہینے کا ذکر ہے بعض دیگر روایات میں بھی ایک مہینے تک آگ نہ جلنے کا ذکر ہے جبکہ بعض روایات میں پندرہ دن اور بعض میں تین ماہ کا بھی ذکر ہے کہ آپ ﷺ کے گھر میں آگ جلنے کی نوبت نہیں آئی۔ شاید یہ مختلف مواقع کا بیان ہے جیسا کہ ملا علی قاریؒ نے بیان کیا ہے۔

پھر اس دوران اکثر تو آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے گھر والوں کا کھانا کھجور اور پانی کی صورت میں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی پڑوسیوں کی طرف سے دودھ بھی پینے کو مل جاتا مگر وہ پیٹ بھر کر نہیں ہوتا تھا۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ آپ ﷺ کا یہ فقر اختیاری ہوتا تھا ورنہ آپ ﷺ کو دنیا کے خزانوں کی چابیاں پیش کی جا چکی تھیں مگر آپ ﷺ نے خود ہی پسند فرمایا کہ ''اشبع یوماً و أجوع یوماً'' ایک دن

---

(۱) صحیح بخاری ۲/۹۵۶ کتاب الرقاق باب کیف کان عیش اصحاب النبی ﷺ، صحیح مسلم ۲/۴۱۰ کتاب الزهد والرقاء، سنن ابن ماجة ص ۳۰۶ ابواب الذهد باب معیشة ال محمد ﷺ (مختار)

کھانا کھاؤں تو دوسرے روز بھوکا رہوں(۱)۔

فقراختیاری: علامہ مناویؒ لکھتے ہیں کہ آپﷺ کے بعد لوگ چار طرح کے ہوگئے۔اول وہ لوگ جنہوں نے دنیا کو چاہا نہ دنیا نے ان کو جیسے ابوبکر صدیقؓ، کہ ان کی زندگی بھی نبی اکرمﷺ کی طرح فقر میں گزری۔ دوم وہ جنہوں نے دنیا کو نہ چاہا مگر دنیا نے ان کو چاہا جیسے حضرت عمرؓ کہ ان کے زمانہ میں دولت کی فراوانی ہوئی مگر انہوں نے زہد سے کام لیا، سوم وہ لوگ جنہوں نے دنیا کو چاہا اور دنیا نے ان کو چاہا جیسے عمر بن عبدالعزیز کے سوا اموی اور عباسی خلفاء۔ چہارم وہ لوگ جنہوں نے دنیا کو چاہا مگر دنیا نے ان کو نہ چاہا جیسے دنیا سے محبت کرنے والے فقیر لوگ(۲)۔

(۳) حدثنا عبداللّٰه بن ابی زیاد ثنا سیار ثنا سهل بن اسلم عن یزید ابن ابی منصور عن أنس عن أبی طلحة قال شکونا الی رسول اللّٰهﷺ الجوع ورفعنا عن بطوننا عن حجرٍ حجرٍ فرفع رسول اللّٰهﷺ عن بطنه عن حجرین قال أبو عیسیٰ هذا حدیث غریب من حدیث أبی طلحة لانعرفه إلاّ من هذا الوجه و معنی قوله ورفعنا عن بطوننا عن حجر حجر کان احدهم یشدُّ فی بطنه الحجر من الجهد و الضعف الذی به من الجوع(۳)۔

ترجمہ: حضرت ابوطلحہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے نبی اکرمﷺ سے بھوک کی شکایت کی اور کپڑا اٹھا کر پیٹ پر بندھا ہوا ایک ایک پتھر دکھایا تو نبی اکرمﷺ نے پیٹ سے کپڑا اٹھا کر دو پتھر دکھائے۔

---

(۱)عن أبی أمامةؓ عن النبیﷺ قال..عرض علیّ ربی لیجعل لی بطحاء مکة ذهباً قلت لایارب ولکن أشبع یوماً وأجوع یوماً اوقال ثلاثاً اونحو هذا فاذاجعت تضرّعت الیک وذکرتک فاذاشبعت شکرتک وحمدتک(ترمذی ج۲ ابواب الزهد ص۵۰۹ باب ماجاء فی الکفاف والصبرعلیه)(اصلاح الدین) (۲)مناوی ج۲ ص۲۲۳(اصلاح الدین)

(۳)جامع ترمذی ۲/۲۱۵ کتاب الزهد باب ماجاء فی معیشة اصحاب النبیﷺ، شرح السنة ۱۴/۲۷۶ باب یف کان عیش رسول اللّٰهﷺ کتاب الرقاق رقم الحدیث ۴۰۷۹(مختار)

پیٹ پر پتھر: توجیہات: رفعنا عن بطوننا عن حجر حجر، یعنی ہم نے پیٹ پر بندھا ہوا ایک ایک پتھر دکھایا۔ قدیم عرب اور بالخصوص اہل مدینہ کی عادت تھی کہ بھوک کی شدت میں پیٹ پر پتھر باندھتے تھے تاکہ خالی ہونے کی وجہ سے پیٹ لٹکنے نہ پائے۔ نیز پیٹ خالی ہونے کی وجہ سے کمر جھک کر کام کاج میں رکاوٹ پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا تھا اور کبھی کبھی ہوا بھر جانے کا احتمال ہوتا ہے نیز انتڑیوں کے اتر جانے کا خدشہ ہوتا ہے پتھر باندھنے سے یہ خطرہ بھی ٹل جاتا تھا۔

علاوہ ازیں پیٹ خالی ہونے کی وجہ سے پیٹ کی طبعی حرارت اور تند وتیز رطوبات غذا نہ پا کر معدے اور آنتوں کیلئے مضر بن جاتا ہے۔ پتھر باندھنے سے ایک حد تک ٹھنڈک پیدا ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے حرارت اور رطوبات کی حدت کم ہوجاتی ہے۔

صاحب ازہار نے لکھا ہے کہ یہ مدینہ کے بعض پتھروں کی خصوصیت تھی جن کو پیٹ کے اوپر باندھنے سے بھوک کی تکلیف ختم ہوجاتی تھی ان کو مُشبعہ کہا کرتے تھے لیکن دیگر شراح نے ایسے خاص پتھروں کے وجود سے انکار کیا ہے جبکہ بعض شراح نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ محض ایک کنایہ ہے پتھروں کا پیٹ پر باندھنے سے صبر کا مظاہرہ مقصود ہے جیسے صبر کی تلقین کے دوران کہا جاتا ہے کہ "اربط علی قلبک حجراً" "دل پر پتھر رکھ لو" گویا راوی کا مقصد یہ ہے کہ ہماری نسبت نبی اکرم ﷺ کی جفاکشی اور بھوک کی برداشت بڑھ کر تھی۔ لیکن امام ترمذیؒ نے اس عمل کو ظاہر پر محمول کیا ہے جیسا کہ حدیث کے آخر میں وہ خود وضاحت کررہے ہیں اور یہی راجح بھی ہے۔

حضور اقدس ﷺ کو بھوک کے احساس پر اشکال اور جواب: فرفع... عن حجرین، یعنی آپ ﷺ نے بھوک کی شدّت کی وجہ سے پیٹ پر دو پتھر باندھ رکھے تھے۔ اس حدیث پر بعض شارحین حدیث نے یہ اشکال کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو بھوک کی شدت کا احساس کیسے ہوا۔ حالانکہ جب آپ ﷺ کئی دن تک بغیر افطار کئے مسلسل روزہ رکھ لیتے تھے تو بعض صحابہؓ نے ان کی تقلید میں ان کی طرح صوم الوصال پر عمل کرنا چاہا۔ آپ ﷺ نے ان کو منع کردیا۔ تو انہوں نے عرض کیا کہ آپ ﷺ خود تو صوم الوصال رکھ رہے ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اِنّی لست کاحدکم اِنّی لست کھیئتکم اِنّ ربی

یطعمنی ویسقینی(۱)

اسی وجہ سے علامہ ابن حبانؒ نے پیٹ کے اوپر پتھر باندھنے والی احادیث کا انکار کیا ہے بلکہ یہ بھی کہا ہے کہ یہ لفظ حُجر نہیں بلکہ حُجز ہے جو تہہ بند باندھنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔

لیکن محققین نے ان کی رائے کی تصویب نہیں فرمائی کیونکہ آپ ﷺ کیلئے بھوک کا ثبوت اور بھوک کی وجہ سے تکلیف اور اس تکلیف کا چہرے وغیرہ سے دوسروں کو احساس ایک دو نہیں کئی احادیث سے ثابت ہے۔ جیسا کہ آئندہ حدیث میں اس کی تصریح ہے پھر پتھر باندھنے اور دو پتھروں کا ذکر بھی روایات میں موجود ہے۔ لہٰذا بلا ضرورت ان تمام روایات کی تاویل نامناسب ہے۔

جہاں تک ربّی **یطعمنی ویسقینی** ،والی بات ہے تو وہ روزے کی مواصلت کی صورت میں ہے یعنی جب نبی کریم ﷺ ایک روزے کے بعد افطار کئے بغیر دوسرا روزہ بھی رکھ لیتے تھے تو ایسی صورت میں مسلسل بھوک آپ ﷺ کیلئے تکلیف دہ نہیں رہتی تھی بلکہ رب کی طرف سے کھانا پینا میسر ہوتا تھا۔

بغیر صوم وصال کے آپ ﷺ سے بھوک کی نفی خلاف عقل ونقل ہے۔ بلکہ بھوک تو خود نبی کریم ﷺ کا مطلوب تھا جیسے کہ ہم روایت ذکر کر چکے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ **ولکنّ أجوع یوماً وأشبع یوماً** ظاہر بات ہے کہ شکر بھی دل سے تب ہی نکل سکتا ہے جب بھوک کے بعد کچھ کھایا جائے۔

بعض حضرات نے دیگر جوابات بھی ذکر کئے ہیں مثلاً یہ کہ ابتدائی زمانہ میں آپ ﷺ کو بھوک لاحق ہوتی تھی آخری زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے اس تکلیف سے آپ ﷺ کو محفوظ رکھا تھا لیکن اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ زیر نظر حدیث تو ابو ہریرہؓ کے ایمان کے بعد کی حدیث ہے اور وہ ۷ھ میں ایمان لائے تھے اگر چہ بعض شراح نے یہ لکھا ہے کہ یہ حدیث فتوحات سے قبل کی حدیث ہے کیونکہ فتوحات کے بعد ایسے فاقوں کی نوبت نہیں آئی جیسے کہ حدیث میں ذکر ہے لیکن ملا علی قاریؒ اور دیگر شراح نے اس پر رد کیا ہے کہ حدیث کے راوی ابو ہریرہؓ کا تعلق فتح خیبر کے بعد نبی اکرم ﷺ کے ساتھ قائم ہوا ہے اور یہ قرینہ ہے کہ یہ واقعہ آخری زمانہ کا ہے۔

---

(۱) بخاری ج۱ص۲۶۳

بعض محققین نے یہ جواب بھی دیا ہے کہ بھوک کا اثر نبی اکرم ﷺ پرنہیں ہوتا تھا لیکن پتھروں کا باندھنا امت کی تسلی وتشفی اور فقراء ومساکین کے ساتھ تشبہ اور شرکت کی بناء پر تھا تا کہ امیر کودیکھ کر وہ بھی دلجمعی سے کام کریں لیکن یہ توجیہ بھی کچھ بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ پتھروں کا واقعہ غزوہ خندق کا ہے اور اسی غزوۂ خندق کے موقع پر حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رأیت بالنبی ﷺ خمصاً شدیداً جس کی وجہ سے انہوں نے حضوراقدس ﷺ کی دعوت کا انتظام کیا اور تھوڑے سے کھانے پر آپ ﷺ ایک ہزار صحابہ کو لے کر گئے(۱)۔

(۴)حدّثنامحمّدبن اسمٰعیل ثناآدم بن أبی ایاس ثناشیبان أبومعاویة ثنا عبدالملک بن عمیر عن أبی سلمة بن عبدالرحمٰن عن أبی هریرة قال خرج النّبیّ ﷺ فی ساعة لایخرج فیها ولایلقاه فیهااحدٌ فاتاه أبوبکر فقال ماجاء بک یا ابابکر فقال خرجت القی رسول اللّٰه ﷺ وانظر فی وجهه والتسلیم علیه فلم یلبث ان جاء عمر فقال ماجاء بک یاعمر قال الجوع یارسول اللّٰه فقال النّبیّ ﷺ واناقد وجدت بعض ذلک فانطلقواالی منزل أبی الهیثم بن التیهان الانصاری وکان رجلا کثیر النخل والشجروالشاء ولم یکن له خدمٌ فلم یجدوه فقالوالامرأته این صاحبک فقالت انطلق یستعذب لنا الماء فلم یلبثو ان جاء ابوالهیثم بقربة یزعبها فوضعها ثم جاء یلتزم النّبیّ ﷺ یفدیه بابیه واُمه ثمّ انطلق بهم إلیٰ حدیقته فبسط لهم بساطاً ثمّ انطلق الی النخلة فجاء بقنوفوضع فقال النّبیّ ﷺ أفلاتنقّیت لنا من رطبه فقال یا رسول اللّٰه ﷺ إنّی اردت ان تختاروااوتخیّروا من رطبه وبسره فاکلواوشربوامن ذلک الماء فقال النّبیّ ﷺ هذا والذی نفسی بیده

(۱)بخاری شریف ج۲ص ۵۸۹

من النعیم الذی تسئلون عنه یوم القیامة ظلٌ باردٌ ورطبٌ طیّب وماءٌ
باردفانطلق أباالهیثم لیصنع لهم طعاماً فقال النّبیّﷺ لاتذبحنّ لنا
ذات درّ فذبح لهم عناقاً اوجدیاً فاتاهم بها فاکلوافقال النبیﷺ هل
لک خادمٌ قال لاقال فاذااتاناسبیٌ فاتنا فاتی النبیﷺ برأسین لیس
معهما ثالث فاتاه ابوالهیثم فقال النبیﷺ اختر منهما فقال یانبی اللّٰه
اخترلی فقال النبیﷺ إنّ المستشار مؤتمن خذ هذا فإنّی رأیته
یصلّی واستوص به معروفا فانطلق أبوالهیثم إلیٰ امرأته فاخبرها بقول
رسول اللّٰهﷺ فقالت امرأته ماانت ببالغ مال فیه النّبیّﷺ إلاّ ان
تعتقه قال فهو عتیق فقال النّبیّﷺ ان اللّٰه تعالیٰ لم یبعث نبیًا
ولاخلیفة إلاّوله بطانتان بطانة تأمره بالمعروف وتنهاه عن المنکر
وبطانةٌ لاتألوخبالا ومن یوق بطانةَ السُّوء فقدوقی(۱)۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ ایک مرتبہ گھر سے ایسے وقت نکلے جس میں عموماً وہ گھر سے نہیں نکلتے تھے نہ کوئی شخص آپﷺ سے اس وقت ملاقات کرنے آتا تھا ایسے میں ابوبکرصدیقؓ بھی تشریف لائے آپﷺ نے ابوبکرؓ سے پوچھا کہ تیرے آنے کا سبب کیا ہے وہ بولے کہ (بھوک نے ستایاتو) رسول اللہﷺ کی ملاقات، رخ انور پرنظرڈالنے اور سلام عرض کرنے کیلئے نکل آیا۔تھوڑی دیرگزری تھی کہ حضرت عمرؓ بھی حاضر ہوئے۔حضوراقدسﷺ نے پوچھاتم کیوں آئے اے عمر؟ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہﷺ بھوک لگی تھی (سوچا کہ دیدار سے مٹاؤں) نبی اکرمﷺ نے فرمایا کہ مجھے بھی کچھ بھوک محسوس ہورہی ہے۔اس کے بعد

(۱) سنن أبی داؤد ۲/۳۵۱ کتاب الادب باب المشورة، جامع ترمذی ۲/۵۱۲ کتاب الزهد باب ماجاء فی معیشة اصحاب النبیﷺ، سنن ابن ماجة ص۲۶۷ کتاب الادب باب المستشار مؤتمن(مختار)

تینوں حضرت ابوالھیثم بن التیھان انصاریؓ کے مکان پر تشریف لے گئے۔ وہ کھجور کے درختوں اور مویشی کے مالک (دولتمند صحابی) تھے لیکن (چونکہ) خادم ان کا کوئی نہیں تھا اس لئے انہوں ان کو گھر پر نہیں پایا۔ انہوں نے اس کی بیوی سے دریافت کیا کہ تیرا خاوند کہاں ہے؟ وہ بولیں کہ وہ تو میٹھا پانی لانے کیلئے گئے ہیں۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ابوالہیثمؓ (بھاری) مشک بدقت اٹھائے ہوئے گھر آ گئے۔ مشکیزہ رکھا پھر آ کر نبی اکرم ﷺ سے لپٹ گئے اور ان پر ماں باپ نثار کرنے لگے۔ اس کے بعد ان سب کو اپنے باغ میں لے چلے۔ بچھونا بچھا کر ان کو بٹھایا۔ اور کھجور کے ایک درخت کی طرف گئے اس سے ایک خوشہ لا کر (مہمانوں کے سامنے) رکھ دیا۔ (یہ دیکھ کر) نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم نے (درخت کے اوپر ہی سے) ہمارے لئے پکی کھجوریں کیوں نہیں چنیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ میرا خیال تھا کہ تم لوگ خود ہی پختہ یا نیم پختہ (من پسند) کھجوریں چن لو (تو اچھا ہوگا) انہوں نے کھجوریں کھائیں۔ پانی پیا تو نبی اکریم ﷺ نے فرمایا اس رب کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ یہ نعمتیں ان نعمتوں میں سے ہیں جن کے بارے میں قیامت کے روز تم سے سوال کیا جائے گا۔ یہ ٹھنڈا سایہ یہ میٹھے کھجور اور یہ ٹھنڈا پانی۔ تسئلن یومئذٍ عن النعیم (الآیۃ)

بعد ازاں ابوالھیثمؓ مہمانوں کیلئے کھانا تیار کرنے جانے لگے تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہمارے لئے دودھ دینے والا جانور ذبح نہ کرنا (یہ سن کر) انہوں نے بکری کا یک مادہ یا نر بچہ ذبح کیا اور (پکا کر) لے آیا۔ تینوں مہمانوں نے اسے تناول فرمایا۔ پھر نبی اکرم ﷺ نے پوچھا کہ کیا تیرا کوئی خادم (غلام یا کنیز) ہے عرض کیا نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب ہمارے پاس جنگی قیدی آ جائیں تو تم میرے پاس (اپنی حاجت یاد دلانے کیلئے) آ جانا اس کے بعد نبی اکرم ﷺ کے پاس دو غلام لائے گئے جن کے ساتھ تیسرا نہیں تھا (صرف دو تھے) تو ابوالھیثمؓ ان کے پاس آئے۔ نبی

اکرم ﷺ نے (حسب وعدہ) فرمایا کہ ان دونوں میں سے ایک چن کر لے جاؤ۔ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ ہی میرے لئے ایک کو پسند فرمائیں تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ بیشک جس سے مشورہ طلب کیا گیا ہو اس کو امانت سپرد کی گئی ہے (امین کی طرح درست مشورہ دینا چاہئے) یہ غلام لے لو کیونکہ میں نے اسے نماز پڑھتے دیکھا ہے لیکن اس کے ساتھ بھلائی کا معاملہ برتنے کی وصیت بھی مجھ سے قبول کرلو۔ ابوالہیثمؓ اپنے گھر بیوی کے پاس (غلام لے کر) آئے اور نبی اکرم ﷺ کے فرمان کا ذکر کیا۔ بیوی نے کہا کہ تم اس غلام کے حق میں نبی اکرم ﷺ کے ارشاد کو پورا نہیں کرسکتے سوائے اس صورت کے کہ تم اسے آزاد کردو۔ ابوالہیثمؓ نے فرمایا کہ پھر تو یہ آزاد ہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو بھی نبی یا خلیفہ منتخب کیا اس کیلئے دو رازدار ساتھی ہوتے ہیں۔ ایک رازدار ساتھی اسے نیکیوں کا مشورہ دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے۔ اور دوسرا رازدار ساتھی اس کے فساد اور خسارے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔ اور جو بھی شخص برے ساتھی سے بچایا گیا۔ اس کو درحقیقت خسارے سے بچایا گیا۔

و لایلقاہ فیہ احد، یعنی عادتاً اس وقت میں آپ ﷺ سے کسی کی ملاقات نہیں ہوتی تھی یہ نہیں کہ آپ ﷺ نے ملاقات پر پابندی لگائی تھی ورنہ پھر اسی وقت میں شیخین آپ ﷺ کی ملاقات کی جرأت کیونکر کرتے۔ عموماً گرمی کے موسم میں دوپہر کے وقت دوسروں سے ملاقات عادتاً نہیں ہوتی۔ بس اسی کا ذکر ہے۔

<u>شیخینؓ کی تنگدستی:</u> **فقال خرجت القی الخ،** یعنی اُریدان القیٰ یالعلّی القیٰ اور و التسلیم علیہ فعل کی تقدیر کے ساتھ القیٰ پر عطف ہے یعنی و اتشرف بالتّسلیم علیہ مطلب یہ ہے کہ میں اس وقت گھر سے نکلا ہوں اس بناء پر کہ شاید نبی اکرم ﷺ سے ملاقات ان کی دیدار اور ان پر سلام کا شرف حاصل ہو جائے۔ شراح کہتے ہیں کہ ابوبکر صدیقؓ کو بھی بھوک ہی نے ستایا تھا۔ مگر ان کی بھوک ملاقات محبوب سے

مٹ جاتی تھی اوراسی وجہ سے انہوں نے یہ تعبیر فرمائی۔ادھر دوقالب یک جان کے مصداق نبی اکرم ﷺ کو بھی نورنبوت سے یہ علم ہوا کہ صدیقؓ کوبھوک نے ستایاہےاسے غذا کی ضرورت ہے۔چنانچہ آپ ﷺ نے گھر سے باہرنکل کران کا استقبال کیاپھرحسن ادب کاتقاضا تھا کہ صدیقؓ نے بھوک کی شکایت تو نہیں کی البتہ تحدیث بالنعمۃ کےطورپرحضوراقدس ﷺ سے ملاقات پرمسرّت کا اظہارفرمایا۔

فلم یلبث ان جاء عمر ،یلبث کی ضمیر نبی کریم ﷺ کو یاابوبکرصدیقؓ کوراجع ہے۔یعنی تھوڑی دیربعدحضرت عمرؓ تشریف لائے۔

قال الجوع یا رسول اللہ، نبی اکرم ﷺ کے استفسار پرانہوں نے کہہ دیا کہ بھوک کی وجہ سے آپ ﷺ کے پاس آیاہوں۔حضرت عمرؓ کی مرادبھی بالکل وہی تھی جوصدیق اکبرؓ کی تھی یعنی بھوک نے ستایاتو آیاتاکہ رخ انور کے دیدار سے بھوک مٹ جائے۔البتہ انہوں نے اصل سبب کا ذکر کیا کیونکہ ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس جب کچھ کھانے کونہیں تھاتو نبی اکرم ﷺ کے پاس کھانے کاموجودہوناعادتاً بعید تھا۔

وأنا قد وجدت بعض ذلک، یعنی مجھے بھی بھوک لگی ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کوبھوک لگنااورطبعی طورپراس کا تکلیف دہ ہونامستبعد نہیں اوررب کی طرف سے خوردونوش ملنے کے باوجودآپ ﷺ کوبعض مواقع پراس کاشدیداحساس بھی ہوتاتھامگرہم پہلے عرض کرچکے ہیں کہ یہ سب کچھ اختیاری تھااورشیخین بھی اسی طرز کوبالاختیاراپنائے ہوئے تھے۔پھرنبی اکرم ﷺ نے شیخین پرترحم فرماتے ہوئے ان کے کھانے کاانتظام فرمایا۔

ابوالہیثم: فانطلقوا إلیٰ منزل ابی الهیثم الخ، ابوالہیثم بن التیہان بن مالک بن عتیک بن عمروانصاری صحابی ہیں۔ بنو اوس سے ان کاتعلق ہے۔کنیت سے مشہور ہیں۔بقول ابن حجرؒ ان کانام مصنف عبدالرزاق میں عبداللہ مذکور ہے۔لیکن ملاعلی قاریؒ لکھتے ہیں کہ خود ابوالہیثم کانام مالک بن عمرو بن الحارث یامالک بن عتیک بن عمرو ہے۔ بیعت عقبہ میں شرکت فرمائی بلکہ اوس کے بنوعبدالاشہل کی طرف سے آپؓ اوراسید بن حضیرؓ کونقیب شمار کیاجاتا ہےلیکن ابن اسحاقؒ کاخیال ہے کہ ابوالہیثمؓ کاتعلق بنوقضاعہ سے ہے وہ بنوعبدالاشہل کے حلیف تھے۔اسی وجہ سے ان میں سے گنے جاتے ہیں۔ بعثت نبوی سے قبل آپؓ

نے عیسائی مذہب کے مطابق رھبانیت اختیار کی تھی۔اسلام قبول کرنے کے بعد اسے خیر باد کہا۔

نبی اکرم ﷺ نے ان کے اور حضرت عثمان بن مظعونؓ کے درمیان مواخات قائم کی تھی۔غزوۂ بدر اور اس کے بعد تمام غزوات میں شریک رہے۔آپؓ کی روایات کم ہیں بلکہ علامہ ابن حجرؒ نے ان سے مروی صرف دو روایات کی نشاندہی کی ہے اور ان پر بھی سنداً کلام کی طرف اشارہ کیا ہے۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ قدیم الوفات صحابہ میں سے ہیں۔اکثر مؤرخین کے ہاں آپؓ ۲۰ھ میں وفات پائے تھے۔بعض نے ۳۷ھ کا بھی ذکر کیا ہے جبکہ بعض نے کہا ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں وفات پائے تھے لیکن ۲۰ھ یا ۲۱ھ کا قول راجح معلوم ہوتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے ساتھ آپؓ کی محبت کا اندازہ زیر نظر حدیث سے تو ہو ہی جاتا ہے لیکن ایک شعر میں آپ نے اپنے دل کی ترجمانی یوں کی ہے ؎

لقدجدعت آذاننا وانوفُنا غداة فُجعنا بالنبیّ محمّدﷺ

یعنی جس روز ہمیں محمد ﷺ کی فراق کا صدمہ پہنچے اسی روز ہم اپنی کانوں اور ناک سے محروم ہو جائیں۔

فانطلقوا الی منزل أبی الھیثم بن التیھان،بعض دیگر روایات میں ابوایوب انصاری(۱) کا ذکر ہے۔علامہ مناویؒ نے لکھا ہے کہ نبی اکرم ﷺ ابتداءً کسی خاص شخص کے پاس جانے کیلئے نہیں نکلے تھے بلکہ توکل کر کے گھر سے نکلے اور اتفاقاً ابوالہیثم کے باغ کا رخ کیا یہ سعادت انہی کیلئے مقدر تھی۔

وکان رجلاً کثیر النخل والشاہ الخ، شاء شاۃ کی جمع ہے جس کی اصل شاھۃ ہے۔اس کی جمع شیاہ بھی آتی ہے یعنی وہ کھجور کے بہت سے درختوں اور بہت سے مویشی کے مالک تھے البتہ ان کے پاس خادم یعنی غلام اور کنیز کوئی نہیں تھا۔کام کاج خود کرنا پڑتا تھا۔

---

(۱)وفی روایة عندالطبرانی وابن حبان فی صحیحه أبی أیوب أنصاری فالقضیة متعددة. وفی روایة لمسلم رجلاً من الأنصار وھی محتمله لھما وعلی کل ففیه منقبة عظیمة لکل منھما اذأھّله ﷺ لذٰلک ۱۲ جمع الوسائل ج۲ ص۲۳۷ (اصلاح الدین)

فقالوا لامرأته این صاحبک، صاحب سے مراد خاوند ہے(۱)۔فقالت انطلق یستعذب الماء یعنی پینے کیلئے میٹھا پانی لانے کیلئے گئے ہیں۔ مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ فلما رأته قالت مرحباً واھلاً یعنی خاتون خانہ نے ان معزز مہمانوں کو دیکھ مرحبا کہا وہ نیک خاتون تھی۔ نبی اکرم ﷺ اور شیخین کو بن بلائے گھر میں پایا تو بڑی سعادت سمجھ کران کا استقبال کیا ۔

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے   کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

پھر شوہر کے بارے میں بتایا۔وہ بھی تھوڑی ہی دیر بعد گھر آ گیا۔

زعب کا مطلب: جاء بقربة یزعبھا، زعب یزعب باب فتح سے ہے۔اس کے متعدد معانی منقول ہیں۔اول یہ کہ زعب القربۃ کا معنی ہے ملأ القربۃ یعنی مشک بھرنا۔دوم یہ بھرے ہوئے مشک کو اٹھانے کے معنی میں مستعمل ہے۔سوم بعض حضرات جیسے صاحب نہایہ نے یہ معنی بھی کہا ہے کہ زعب ٹھیک اور مضبوطی سے تھام کر اٹھانے کو کہتے ہیں لیکن صحاح وغیرہ میں اس کا معنی سیلاب کیلئے بولا جاتا ہے جو وادی کے کناروں سے ٹکراتا ہوئے چلے۔عموماً پانی سے بھرا ہوا بڑا برتن کا سنبھالنا مشکل ہوتا ہے اور اٹھاتے ہوئے ادھر ادھر جھٹکے لگتے ہیں۔اسی کو زعب کہتے ہیں گویا بڑا بھاری مشک اٹھائے ہوئے۔

ابوالہیثمؓ کی مہمان نوازی: حضرت ابوالہیثمؓ گھر آئے۔ویفدیہ الخ،یعنی حضور اقدس ﷺ کو دیکھ لپیٹ گئے اور فداک ابی وامی (میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں) کہنے لگے۔

إلیٰ حدیقته (۲)، حدیقہ اس باغ کو کہتے ہیں جن کی چار دیواری تعمیر کی گئی ہو لیکن توسعاً بغیر چار دیواری والے پر بھی بولا جاتا ہے۔

---

(۱)اس روایت سے معلوم ہوا کہ اگر فتنہ کا خوف نہ ہو تو اجنبی مردوں کا اجنبی عورت سے پردہ کے پیچھے گفتگو یعنی سوال وجواب کرنا جائز ہے کما قال العلامة بیجوریؒ یؤخذ منه حل تکلم الأجنبیة وسماع کلامها مع أمن الفتنة وان وقعت فیه مراجعة ثمّ انّا هذه المرأة تلقتهم احسن تلقی وانزلتهم اکرم الانزال وفعلت مایلیق بذلک الجناب الافخم والملاذ الأعظم یؤخذ منه جواز اذن المرأة فی دخول منزل زوجها اذاعلمت رضاه وجواز دخول الضیف منزل الشخص باذن زوجته مع علم رضاه حیث لاخلوة محرمة(المواهب اللدنیة ۲۳۵)(مختار)

(۲)اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مہمان کی ضیافت احسن اور بہتر کھانے سے کرنی چاہئے۔ویؤخذ من الحدیث أنّه ینبغی للمضیف ان یقدم إلیٰ الضیف أحسن ماعنده(المواهب اللدنیة ۲۳۵)(مختار)

أفلاتنقیت لنامن رطبه، یعنی تم نے سارا خوشہ توڑ کر پیش کر دیا اب ہم کچھ کھا لیں گے لیکن باقی ضائع ہو جائے گا۔اس کی بجائے صرف پختہ کھجوریں چُن کر ہمیں لا دیتے تو اچھا ہوتا۔

اردت ان تختاروا اوتخیروا، راوی کو شک ہے معنی دونوں کا ایک ہے تخیّر وا اصل میں تتخیّر وا تھا علامۃ مضارع تخفیفاً حذف ہو چکی ہے۔مطلب یہ ہے کہ میں نے سوچا کہ مہمان حضرات اپنی مرضی سے چن چن کر کھائیں تو بہتر ہے ممکن ہے کسی کو پختہ، کسی کو نیم پختہ اور کسی کو خشک کھجور پسند ہوں۔اب جب سارا خوشہ سامنے پڑا ہے تو من پسند لے لیں۔اس عمل میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میزبان کھانا لانے سے قبل کچھ ایسی چیز مہمان کے سامنے پیش کر دے جو بصورت بھوک اس کی بھوک کو کم کر دے جیسا کہ عموماً ہمارے ہاں چائے بسکٹ سے مہمان کی تواضع کی جاتی ہے لیکن میٹھی چیز سے اور خصوصاً پھل سے تواضع سب سے بہتر ہے کیونکہ یہ زود ہضم ہوتا ہے۔

من النعیم الذی تسئلون، یعنی جب کھجور کھا کر ٹھنڈا پانی پیا تو آپﷺ نے فرمایا کہ یہ جو کچھ ملا یہ وہ نعمتیں ہیں جن کے بارے میں پوچھا جائیگا جیسا کہ سورۃ التکاثر میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ثم لتسئلنّ یومئذٍ عن النعیم، نبی اکرمﷺ ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں حلالها حساب وحرامها عقاب" یعنی حلال مال کے حساب اور حرام کے عقاب کا سامنا کرنا ہوگا۔یہاں حلال مال ہے لیکن اس کا بھی حساب ہوگا کہ کہاں سے کمایا اور کہاں صرف کیا۔

ظل بارد ورطب طیب وماء بارد، یہ یا تو ہذا کیلئے خبر ثانی ہے یا مبتدا مقدر کیلئے خبر ہے ابن حجرؒ نے اسے مبتداء یعنی ہذا سے بدل قرار دیا ہے لیکن ملا علی قاریؒ نے اسے درست قرار دینے سے انکار کیا ہے۔

کھجور طعام ہے فاکھۃ: فانطلق أبو الهیثم لیضع لهم طعاما اس جملے سے شوافع نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ کھجور طعام نہیں بلکہ فاکھہ ہے کیونکہ یہاں کھجور کھانے کے بعد کہا گیا ہے کہ ابوالہیثم کھانا تیار کرنے کیلئے جانے لگے مگر خود ملا عصامؒ نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ دلیل درست نہیں۔اس حدیث سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ کھجور تیار کیا ہوا طعام نہیں ہے۔مطلق طعام ہونے کی نفی پر حدیث دلالت نہیں کرتی۔امام ابوحنیفہؒ کے ہاں کھجور فاکھہ یعنی پھل نہیں بلکہ غذا ہے دلیل قرآن مجید کی آیت فیھا فاکھة ونخل ورمّان(الآیة) ہے کیونکہ نخل کھجور کو فاکھہ پر عطف کیا گیا ہے اور یہ مغائرت کا

مقتضی ہے تفصیل فقہ اور اصول فقہ کی کتابوں میں آپ پڑھ چکے ہیں۔

دودھ والے جانور کی ذبح: لاتذبحنّ لنا ذات درّ درّ دودھ کو کہا جاتا ہے دودھ والے جانور کو ذبح کرنے سے نبی اکرم ﷺ نے منع فرمایا اس نہی سے ایسے جانور کے گوشت کو حرام یا مکروہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ نہی صرف ارشاد اور شفقت پر مبنی ہے یعنی جب ذبح کیلئے اور جانور بھی موجود ہیں کیونکہ میزبان ''کثیر الشاۃ'' ہے تو دودھ والی بکری کا ذبح کرنا تکلف باردہ بلکہ مال کو ضائع کرنے کے مترادف ہوگا۔ اب اگر کسی نے مہمان کیلئے دودھ دینے والا جانور ہی ذبح کردیا تو بالاتفاق اس کا کھانا جائز ہوگا۔

فذبح لھم عناقاً او جدیاً بکری کے مادہ بچے کا جو چار ماہ کو ہو عناق اور اسی عمر کے نر بچے کو جدی کہا جاتا ہے۔ بعض اہل لغت کے ہاں سال سے کم بکری کے بچے کو عناق اور جدی کہا جاتا ہے۔

ھل لک خادم ، نبی اکرم ﷺ نے غلام کو نہ پاکر بھی یہ سوال اس لئے کیا کہ ممکن ہے کہ غلام یا کنیز تو ہو لیکن اس وقت حاضر نہ ہو۔

فاذااتاناسبیٔ جنگ میں قیدی بننے والوں کا عموماً استرقاق کیا جاتا تھا۔ اس لئے یہ فرمایا کہ جب ہمارے پاس قیدی بصورت غلام اور کنیز کے آئیں تو مجھے یاد دلانا تاکہ گھر کی خدمت کیلئے کوئی غلام یا کنیز دے دوں۔

مشورہ امانت ہے: المستشار موتمن، یعنی مشورہ طلب کرنے والے نے مستشار پر اعتماد کرکے اس سے مشورہ طلب کیا اور اس پر عمل کرنے کا ارادہ کیا گویا اس نے اپنے اختیار کو اس کے ہاں امانت رکھ دیا۔ اب وہ ٹھیک اور مصلحت کے موافق مشورہ دے گا تو امانت پوری طرح ادا ہوگی اور اگر قصداً خلاف مصلحت مشورہ دے گا تو اس نے گویا مشورہ طلب کرنے والے کے ساتھ خیانت کا معاملہ کیا۔ حدیث کا یہ قطعہ کئی صحابہ سے مروی ہے اور تقریباً تواتر کے درجہ میں ہے۔

معیار افضلیت: خُذھذافانّی رایتہ یصلی (۱) خادم کے انتخاب میں نبی اکرم ﷺ نے نماز

---

(۱) علامہ بیجوریؒ نے اس سے دو مسائل کا استنباط کیا ہے (۱) یؤخذ منہ أنّہ یستدل علی خیریۃ الانسان بصلاتہ قال تعالیٰ إنّ الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر (۲) یؤخذ ایضاً انّہ ینبغی للمستشار ان یبیّن سبب اشارتہ بأحد الامرین لیکون اعون للمستشیر علی الامتثال (المواھب ۲۳۷) (مختار)

کومعیار ٹھہرایا ہے۔ افسوس ہے کہ آج نماز کو ایک عیب کی نظر سے دیکھا جارہا ہے۔ ہمارے ایوانوں میں نمازیوں کو قدامت پسند، رجعت پسند اور دقیانوسی خیال کیا جاتا ہے جبکہ تارک صلوٰۃ وصوم کو معزز گردانا جاتا ہے لوگ انتخابات میں بھی اس کا خیال نہیں رکھتے۔ غنڈوں، کرپٹ، بدکردار اور چوروں کو ووٹ دے کر آگے لے آتے ہیں اور پھر نتیجہ سامنے ہے کہ ان کم بختوں کے پیٹ کا جہنم بھرتے نہیں بھرتا۔ دفتروں میں یہی حال ہے داڑھی والے ملازموں اور نمازی افسروں کو ٹھکانا نہیں ملتا۔ دفتر سے اس کو بھگا دیا جاتا ہے۔ اس سے دوسرے دفتر کو فارغ کردیا جاتا ہے کیونکہ وہ نماز پڑھتا ہے۔ حالانکہ نبی اکرم ﷺ کے ہاں ملازمت کی معیار نماز ہونا ہے۔

<u>وصیت اور قبول وصیت:</u> **واستوص به معروفا** اس جملے کے دو مطلب بیان کئے جاتے ہیں۔ اوّل یہ کہ استیصاء وصیت کا معنی یہ ہوگا کہ اس غلام کو خیر کی وصیت کرنا، بھلائی کا حکم دینا۔ دوم یہ کہ استیصاء کا معنی طلب وصیت اور قبول وصیت ہو۔ پھر مطلب یہ ہوگا کہ اس غلام کے بارے میں میری طرف سے شفقت اور خیر خواہی کی وصیت قبول کرلو موخر الذکر احتمال کو ملا علی قاریؒ نے اظہر کہا ہے۔

ما انت ببالغ فیه الخ نیک دل بیوی نے شوہر کو مشورہ دیا کہ اگر چہ گھر میں انتہائی ضرورت ہے مگر جب رسول اللہ ﷺ نے اس غلام کی تعریف کی ہے اور اس کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے تو ایسے غلام کو غلام رکھنا ہی مناسب نہیں آزاد کردینا چاہئے۔

<u>اچھی بیوی دنیا کی بڑی نعمت:</u> **إنّ اللّٰه لم یبعث نبیا و لا خلیفةً الا وله بطانتان** اور جب نبی کیلئے اور اس کے خلیفہ کیلئے **بطانتان** کو لازم ٹھہرایا تو اولیاء، علماء، امراء اور عوام کے لئے تو بطریق اولیٰ یہ بطانتان ہونگے۔ بطانہ ظہارہ کی ضد ہے دراصل اس کپڑے کو کہتے ہیں جو اوپری تہہ کے نیچے پہنا جائے اور بدن سے لگا رہے۔ ایسے کپڑے پر بدن کے راز مخفی نہیں رہتے بلکہ جلد کی رنگت اس کے بالوں، عیوب اور محاسن کا علم ہوتا ہے۔ تو جس کے اخلاص پر اعتماد کرکے آدمی اس کے اوپر اپنے راز ظاہر کرتا ہے اسے بطانہ کہا جاتا ہے۔

یہاں پر ابوالہیثمؓ کی بیوی کی مدح مقصود ہے کہ وہ ایک مخلص راز دان اور خیر میں معاون بیوی ہے اور

اسی کو"خیر متاع الدنیا"بھی کہا گیا ہے یعنی اچھی بیوی دنیا کا بہترین سرمایہ ہے۔

اچھا اور بُرا ساتھی: ایک دوسری حدیث میں ہر انسان کے ساتھ دو ساتھیوں کا ذکر ہے۔جن میں سے ایک ملہم فرشتہ اور دوسرا وسوسہ ڈالنے والا شیطان ہے۔فرشتہ اسے خیر کی دعوت دیتا ہے اور شیطان دوسری طرف لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔

وبطانة لاتألوه خبالا تو قصور اور کوتاہی کے معنی میں آتا ہے اور خبال فساد کو کہتے ہیں پھر اُلا یأ لو چونکہ منع یا نقص کے معنی کو متضمن ہے اس لئے یہ دو مفعول کو متعدی ہوتا ہے یہاں بھی معنی یہ ہوگا کہ بطانۃ لا تمنعه و لاینقصه من الخبال یعنی ایک رازدارہ ہوتا ہے جو اپنے ساتھی کو فساد پر آمادہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔

(۵) حدّثناعمربن إسماعيل بن وقاص يقول إنّي لأول رجل اهرق دمًافي سبيل اللّٰه وإنّي لاوّل رجل رمى بسهم فى سبيل اللّٰه لقد رأيتنى اغزوفى العصابة من أصحاب محمّدﷺ مانا كل الآورق الشجرو الحبلة حتّى تقرحت اشداقنا حتّى أنّ احدنا ليضع كما تضع الشاة و البعير و أصحبت بنواسدٍ يعزروننى فى الدين لقدخبت اذاً ضل عمل(۱).

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کہتے ہیں کہ میں پہلا مسلمان ہوں جس نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں کسی کافر کا خون بہایا ہو۔اور میں پہلا مسلمان ہوں جس نے اللہ کے راستے میں کافروں کو تیر مارا ہو۔اور خود نبی اکرمﷺ کے صحابہ کی ایک جماعت کی معیت میں جہاد کرتے ہوئے یہ دیکھا تھا کہ ہمارے کھانے پینے کے لئے سوائے درخت (کے پتوں) اور کیکر کے تخم کے اور کوئی چیز نہیں ہوتا تھا یہاں تک کہ ہماری

---

(۱)صحیح بخاری ۱/۵۲۸ کتاب فضائل الصحابه باب مناقب سعد بن ابی وقاص، صحیح مسلم ۲/۴۰۸ کتاب الزهد و الرقائق باب فی ذکر مامضی علی الصحابة رضی الله عنهم من الزهادة فی الدنیا الخ، جامع ترمذی ۲/۵۱۱ کتاب الزهد باب ماجاء فی معیشة النبیﷺ.(مختار)

باچھیں پھٹ کر زخمی ہوگئیں اور یہاں تک کہ ہم میں سے ایک شخص بکری اور اونٹ کی طرح پاخانہ کرتا تھا پھر بھی بنواسد کے لوگ دین (نماز) کے بارے میں مجھے کوستے ہیں (اگر میں دین سے بےفکر رہا) پھر تو حقیقۃً نامراد رہا اور میری مساعی رائیگاں گئیں۔

<u>حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ پہلا تیر انداز:</u> إنی لاوّل رجل الخ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ متقدمین فی الاسلام صحابہ میں سے ہیں۔ ابتداء میں صحابہ مشرکین کے خوف سے چھپ کر نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر جب صحابہ کرام ؓ ایک گھاٹی میں نماز ادا کر رہے تھے۔ مشرکین آئے اور صحابہ کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ صحابہ کرام ؓ اور ان کے درمیان تو تو میں میں نے طول پکڑا اور ہاتھا پائی تک نوبت آئی۔ حضرت سعد ؓ نے اونٹ کے جبڑے سے ایک کافر پر وار کر دیا جس سے وہ زخمی ہوا اور یہ کسی کافر کا سب سے پہلا خون تھا جو کسی مسلمان کے ہاتھ سے بہا ہو۔ اسی کا ذکر حضرت سعد ؓ بیان کر رہے ہیں۔

وانی لاوّل رجل رمیٰ بسھم الخ، علامہ مناویؒ لکھتے ہیں کہ ۲ھ شوال ۱ھ کو نبی اکرم ﷺ نے اپنے چچازاد بھائی عبیدہ بن الحارث ؓ (شہید بدر) کو جھنڈا دے کر ۶۰ مجاہدین کے ساتھ (رابغ کی طرف) مشرکین کے خلاف روانہ کیا۔ مشرکین سے آمنا سامنا ہوا جن کی قیادت ایک قول کے مطابق ابوسفیان کے ہاتھ میں تھی۔ اس میں اگرچہ باقاعدہ جنگ تو نہیں ہوئی لیکن ایک دوسرے پر تیروں سے حملہ کیا گیا۔ مسلمانوں کی طرف سے سب سے پہلا تیر حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ نے چلایا۔ یہاں حضرت سعد ؓ اسی کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

لیکن فتح الباری وغیرہ میں آیا ہے کہ ہجرت کے تقریباً ایک سال بعد صفر میں نبی اکرم ﷺ خود قریش کے مقابلے میں نکلے اور ابواء یا وڈان کے مقام تک گئے۔ یہیں سے آپ ﷺ نے عبیدہ بن الحارث ؓ کے سریہ کو بھیجا۔ جس میں حضرت سعد ؓ نے سب سے پہلے تیر چلایا(۱)۔

---

(۱) فتح الباری ج ۷ ص ۳۵۵

غزوۃ خبط وسیف البحر: وقد رایتنی اغزو فی العصابۃ الخ، عصابہ دس سے چالیس تک کی جماعت کو کہتے ہیں۔ان حملوں میں حضرت سعدؓ جس غزوہ کا ذکر کرتے ہیں اسے غزوۂ خبط اور غزوۃ سیف البحر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔علامہ ابن حجرؒ ابن سعدؒ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے رجب ۸ھ میں بنو جھینہ کی سرکوبی کیلئے حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ کو تین سو صحابہ کے ساتھ ساحلی شہر قبلیہؔ کی طرف بھیجا۔ علامہ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ صحیحین کی روایت میں یہ آتا ہے کہ یہ سریہؔ قریش کے قافلے کیلئے بھیجا گیا تھا۔اسلئے یہ ۶ھ کے اواخر سے پہلے کا واقعہ ہونا چاہئے رجب ۸ھ میں تو قریش کے ساتھ صلح کا زمانہ تھا الاؔ یہ کہ قریش کے قافلے کی بنو جھینہ سے حفاظت کیلئے آپ ﷺ نے لشکر بھیجا ہو۔

اس غزوہ میں تین سو مجاہدین کو ایک بوری کھجور بطور زاد دیا گیا تھا۔راستے میں رفتہ رفتہ یہ زاد ختم ہو گیا اور مجاہدین کیکر کے پتوں اور اس کے تخم کھانے پر مجبور ہو گئے جس کی وجہ سے صحابہ کے ہونٹ پھٹ گئے اور ان کی قضائے حاجت بھی بھیڑ بکریوں کی مینگنیوں کی طرح نکلنے لگی۔ بعد میں انہوں نے ساحل سمندر پر ایک بہت بڑی مچھلی پائی جس کا گوشت وہ تقریباً اٹھارہ دن تک کھاتے رہے بلکہ مدینہ واپسی تک اسی سے گزارا چلتا رہا۔یہیں سے ترجمۃ الباب کا استنباط بھی ہوتا ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ صحابہ کرامؓ کی زندگی جب اتنی تنگ تھی تو اس سے نبی اکرم ﷺ کی تنگدستی کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

سعدؓ پر نکتہ چینی کا پس منظر: ثم اصبح بنو اسد یعزّروننی فی الدین الخ، یعنی باوجود قدیم الاسلام ہونے انتہائی صعوبتیں برداشت کرنے اور نبی اکرم ﷺ کی قریبی مصاحبت کے بنو اسد مجھے دین (نماز) کے سلسلے میں کوستے ہیں۔

بنو اسد بن خزیمہ بن مدرکہ بنو مضر کی ایک شاخ ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد یہ قبیلہ مرتد ہو گیا تھا اور طلیحہ بن خویلد الاسدی کی متابعت اختیار کر لی تھی جو نبوت کا دعویٰ کر چکا تھا۔حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو ان کے مقابلے کیلئے بھیجا۔طلیحہؓ اور ان کے ساتھیوں نے توبہ کی ان کی اکثریت کوفہ میں آباد تھی۔طلیحہ جنگ نہاوند میں ۲۱ھ کو شہید ہوئے۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں حضرت سعدؓ کوفہ کے امیر مقرر ہوئے۔بنو اسد حضرت سعدؓ سے ناراض

ہوئے۔انہوں نے حضرت عمرؓ کے پاس شکایات کیں جن میں سے ایک شکایت یہ بھی تھی کہ حضرت سعدؓ نماز اچھی طریقہ سے نہیں پڑھ سکتے (۱)۔

حضرت عمرؓ نے باز پرس کیلئے حضرت سعدؓ کو مدینہ بلوایا۔جواب طلبی کی تو آپؓ نے یہ بیان دیا کہ بنواسد کوتو میری نماز پر اعتراض ہے کیا یہ ممکن ہے کہ میرے جیسے شخص کو نماز کا بھی علم نہ ہو۔

حضرت عمرؓ نے مزید تحقیق کیلئے دو آدمی کوفہ بھیجے۔جنہوں نے ہر محلے کی مسجد میں جا کر حضرت سعدؓ کے بارے میں دریافت کیا کسی کو بھی آپ پر حرف گیری کی جرأت نہیں ہوئی۔صرف ایک شخص نے ان کے بارے میں کہا کہ حضرت سعدؓ میں تین عیب ہیں (۱) جہاد کیلئے نہیں نکلتے (۲) مال کی تقسیم میں برابری نہیں کرتے (۳) فیصلوں میں انصاف نہیں کرتے۔حضرت سعدؓ کو علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ اس شخص نے تین شکایات کی ہیں۔اس لئے میں تین بددعائیں کرتا ہوں اے اللہ اگر یہ شخص جھوٹا ہے محض شہرت کیلئے یہ تنقید کی ہے تو اس کی عمر طویل کردے اس کی فقر میں اضافہ کردے اور اسے فتنوں میں مبتلاء کردے۔حدیث کا راوی کہتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ اس شخص کی ابروئیں بڑھاپے کی وجہ سے آنکھوں پر جھکی ہوئی تھیں۔فقر کی وجہ سے وہ بھیک مانگتا تھا اور گلیوں میں چھوٹی بچیوں کو چھیڑا کرتا تھا۔کوئی اس حال کے بارے میں پوچھتا تو اقرار کرتا کہ مجھے سعدؓ کی بددعا لگ گئی ہے۔

لقدخبت اذًاالخ، یعنی اگر میں باوجود اتنی مشقتیں جھیلنے کے دین بھی نہ سیکھ سکا۔نماز پڑھنا بھی نہ سیکھ سکا تو پھر تو دنیا وآخرت میں میری نامرادی ظاہر ہے۔

(۶) حدّثنامحمّدبن بشّارثنا صفوان بن عیسیٰ ثناعمرو بن عیسیٰ ابونعامة العدی وقال سمعت خالد بن عمیر وشویسا اباالرقادقالا بعث عمربن الخطاب عتبة بن غزوان وقال انطلق انت ومن معک حتی اذا کنتم فی اقصی ارض العرب وادنی بلاد ارض العجم فاقبلوا حتی اذا کانوا بالمربد وجدوا هذا الکذّان فقالوا ماهذه قالوا هذه البصرة

(۱) وکانوا اوشوا به إلیٰ عمر قالوا لایحسن یصلّی(بخاری ج ۱ ص ۵۲۸) ۱۲ (اصلاح الدین)

فساروا حتی اذابلغوا حیال الحسر الصغر فقالوا ههنا امرتم فنزلوا فذکروا الحدیث بطوله قال فقال عتبة بن غزوان لقد رأیتنی وانی لسابع سبعة مع رسول اللّٰہ ﷺ مالنا طعام الاورق الشجر حتی تقرحت اشداقنا فالتقطت بردة فقسمتها بینی وبین سعد فمامنا من اولئک السبعة احدا لاوھو امیر مصر من الامصار ویستجربون الامراء بعدنا(۱)۔

ترجمہ: راوی (خالدؒ اورشویسؒ) کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عتبہ بن غزوانؓ کو (بصرہ کی طرف) روانہ کیا اور نصیحت کی کہ تم اور تمہارے ساتھی جاؤ۔ جب تم عرب کی زمین کے آخری کنارے اور عجم کی زمین کے قریب پہنچو (تو وہیں ڈیرہ ڈال دو) چنانچہ یہ لوگ آئے۔ جب وہ مربد کے مقام پر پہنچے تو انہوں نے یہ (عجیب) سفید نرم پتھر دیکھے۔ انہوں نے آپس میں پوچھا دوسروں نے جواب دیا کہ یہ بصرہ (سفید نرم پتھر) ہیں پھر وہ کچھ آگے بڑھے۔ جب وہ چھوٹے پل کے برابر آئے تو یہ طے پایا کہ یہی وہ جگہ ہے جس جگہ (حضرت عمرؓ کی طرف سے) ٹھہرنے کا حکم ملا ہے۔ چنانچہ وہیں اس لشکر نے پڑاؤ ڈالا۔ اس کے بعد راویوں (خالد اور شویس) نے تفصیل کے ساتھ قصہ ذکر کردیا۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر عتبہ بن غزوانؓ نے فرمایا کہ میں نے خود کو دیکھا تھا جب میں سات میں سے ساتواں شخص نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تھا۔ ہمارے پاس کھانے کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی سوائے درختوں کے پتوں کے حتیٰ کہ (پتے کھانے سے) ہماری باچھیں پھٹ کر زخمی ہوگئیں۔ (ایک دفعہ) مجھے ایک چادر ملی میں نے اسے اور سعدؓ کے درمیان دو حصوں میں بانٹ دیا۔ ان سات صحابہؓ میں سے

---

(۱) صحیح مسلم ۲/۴۰۹ کتاب الزھد والرقائق، مصنف بن ابی شیبة ۱۳/۵۴، جامع ترمذی ۲/۵۳۷ کتاب صفة جھنم باب ماجاء فی قعر جھنم، مسنداحمد ۴/۱۷۴ (مختار)

کوئی بھی نہیں رہا وہ کسی علاقہ کا امیر بن چکا ہے اور ہمارے بعد ہی تم (برے) امراء کا تجربہ بھی کرلوگے۔

حضرت عمرؓ کا بعثت عتبہ: بعث عمر بن الخطابؓ یہ واقعہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت کا ہے۔ کیونکہ اس میں بصرہ کی آبادکاری کا ذکر ہے جو ۱۴ھ میں تعمیر ہوگیا تھا(۱)۔ حضرت عمرؓ نے عتبہ بن غزوان کو جس مہم پر روانہ کیا تھا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کو اطلاع ملی کہ یزدجرد نے ہندوستان کے بادشاہوں سے مدد کا مطالبہ کیا ہے تاکہ وہ مسلمانوں کے خلاف لڑائی لڑیں چونکہ عجم کیلئے عربوں پر حملہ کرنے کا یہی راستہ متعین تھا۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے اس کی ناکہ بندی کیلئے حضرت عتبہؓ کو تین سو مجاہد لیکر پہرہ دینے کا حکم دیا۔

عتبہ بن غزوانؓ: عتبہ بن غزوانؓ ابن جابر بن وھب مازنی صحابی ہیں۔ جو بنی عبد شمس یا بنی نوفل کے حلیف تھے۔ ابتدائی زمانہ نبوت میں ہی اسلام سے سرفراز ہوئے۔ حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی پھر وہاں سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ بدر اور بعد کے تمام غزوات میں شریک رہے۔ حضرت عمرؓ نے مشرقی سرحد کی طرف بھیجا تو دریائے دجلہ پہنچنے کے بعد پڑاؤ ڈالا۔ وہاں صاحب فرات سے مڈبھیڑ ہوئی جو چار ہزار کا لشکر لے کر آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت سے مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔

شہر بصرہ کا قیام: ان سے فراغت کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس قاصد بھیجا کہ اس جگہ ایک ایسا شہر ہونا چاہئے جو مسلمانوں کا مرجع ہو تاکہ فراغت کے اوقات میں وہ سکون کے ساتھ وہاں رہ سکیں۔ حضرت عمرؓ نے اجازت دیدی۔ بشرطیکہ وہ جگہ پانی اور چارے کے قریب ہو۔ چنانچہ آپؓ نے بصرہ کی جگہ کا انتخاب کیا اور وہاں فوجی نقشہ کے مطابق شہر کی بنیاد ڈالی۔ ابتداء میں بانس اور لکڑی سے گھروں کی تعمیر کی جو وہاں بکثرت ہوتے تھے۔ مسجد بھی بانسوں سے بنائی گئی اور ۱۴ھ میں یہاں مجاہدین کی ایک چھاونی آباد ہوگئی۔

---

(۱)قال فی الجمع ثم البصرہ بناھا عتبہ بن غزدان فی خلافة عمرؓ سنہ ۱۷ھ وقیل ۱۸ھ قیل ولم یعبد بارضھا ضم ویقال لھا قبة الاسلام وخزانة العرب(جمع ج ۲ ص ۲۴۵)ھذاولکن رایت فی شذرات الذھب ج ۱ ص ۳۴ ان عتبةؓ مصرّھا سنہ ۱۴ھ والیہ ذھب المؤرخون ولعلّہ الراجح فان عتبةؓ مات سنہ ۱۷ھ علی الراجح،(اصلاح الدین حقانی)

حضرت عتبہؓ حسین اور بلند قد وقامت کے مالک تھے، انتہائی جفاکش تھے۔ اخیر عمر میں حضرت عمرؓ کے پاس آئے تاکہ امارت سے معذرت کرلیں مگر حضرت عمرؓ نے استعفیٰ قبول نہیں کیا چنانچہ واپس ہوئے راستے ہی میں ۱۷ھ کو وفات پائی۔ جبکہ بعض روایات کے مطابق ۲۰ھ کو وفات پائی۔

حتی اذا کانوا بالمربد مربد بصرہ میں ایک جگہ کا نام ہے۔ اصل میں مربد اونٹ باندھنے کی جگہ کو بھی کہتے ہیں نیز کھجور سکھانے کے خرمن کو بھی مربد کہا جاتا ہے۔ **وجدوا ھذا الکذان** کذان اس سفید قسم کے پتھر کو کہتے ہیں جو نرم بھی ہو۔ یہی بصرہ کا لغوی ترجمہ بھی ہے۔

فساروا حتی بلغوا حیال الجسر الصغیر، حیال، مقابل اور برابر کے معنی میں ہے یعنی یہ مجاہدین بصرہ کے اس مقام سے کچھ آگے بڑھے یہاں تک کہ دریائے دجلہ کے چھوٹے پل کے برابر آئے جسر صغیر کو جسر کبیر کے مقابلے کی وجہ سے صغیر کہا گیا کیونکہ جو پل بغداد کے مقام پر تھا وہ جسر کبیر تھا۔ یہ نسبتاً چھوٹا تھا جو دریا دجلہ پر بنایا گیا تھا۔

فذکروا الحدیث بطولہ، فذکروا کی جمع کا ضمیر خالد اور شویس کو باعتبار مافوق الواحد راجح ہے بعض نسخوں میں فذکرا تثنیہ کے صیغے سے ہے اور وہی راجح اور ظاہر ہے جبکہ بعض نسخوں میں فذکر مفرد کے صیغے سے ہے۔ پھر ضمیر محمد بن بشار کو راجع ہوگی۔ جو امام ترمذیؒ کے شیخ ہیں۔

<u>کافر حاکم صاحب فرات سے جہاد:</u> اس حدیث کو علامہ طبریؒ نے کچھ مزید تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب عتبہؓ سرحد پر ٹھہرے تو وہاں کے کافر حاکم "صاحب فرات" کو پتہ چلا۔ اس نے چار ہزار کا لشکر لے کر مسلمانوں کا رخ کیا۔ جب پہنچ کر اس نے دیکھا کہ مسلمان صرف تین سو ہیں تو فوج کو حکم دیا کہ ان لوگوں کے گلوں میں رسیاں ڈال کر مجھے پیش کردو۔ چنانچہ وہ آئے۔ حضرت عتبہؓ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ صرف دفاعی جنگ لڑیں۔ دشمن پر حملہ نہ کریں گرمی کا موسم تھا ہوا رکی ہوئی تھی جب زوال ہوگیا تو مسلمانوں کو حکم دیا کہ اب اللہ کے نام سے حملہ کردو چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور بہت سے کفار قتل کیے گئے "صاحب فرات" کو قید کرلیا گیا۔ اس کے بعد حضرت عتبہ بن غزوان نے حکم دیا کہ کوئی اچھی جگہ منبر بنادو اور ایک بلیغ خطبہ دیا۔ جبکہ علامہ مناویؒ کہتے ہیں کہ حضرت عتبہ بن غزوان نے خوزستان کے

لوگوں سے جو وہاں کے مقامی باشندے تھے تاوان چاہا وہ آئے تو مسلمانوں کی قلیل تعداد کو دیکھ کر غداری کی اور مسلمانوں پر حملہ کردیا۔ چنانچہ جنگ ہوئی اور میدان مسلمان کے ہاتھ رہا۔

<u>عتبہ کا طویل خطبہ:</u> **فقال عتبه بن غزوان الخ** ، یہ اسی طویل خطبہ کا حصہ ہے جس کا ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں واقعہ اور بقیہ خطبہ کو اختصاراً حذف کیا گیا ہے۔ اس خطبہ کا کچھ حصہ یوں ہے۔

''اے لوگوں یہ دنیا ختم ہورہی ہے اور منہ پھیر کر جارہی ہے۔ اس کا صرف اتنا تھوڑا حصہ باقی رہ گیا ہے جتنا برتن میں پانی پینے کے بعد رہ جاتا ہے تم لوگ ہمیشہ رہنے والی جگہ کی طرف منتقل ہورہے ہو۔ اس لئے تمہارے ساتھ جو بہترین سرمایہ (عمل) ہو اس کے ساتھ آخرت کو منتقل ہوجاؤ۔ مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ اگر ایک پتھر جہنم کے منڈھیر سے جہنم میں پھینک دیا جائے وہ ستر سال تک (بغیر رکے) جہنم میں گرتا ہوا جائیگا۔ اور اس جہنم کو تم (کافر) لوگ بھروگے۔ کیا تم اس سے تعجب کررہے ہو۔

مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جنت کے دروازہ کے دونوں کناروں میں چالیس برس کا فاصلہ ہے اور ایک دن ایسا آئے گا جب وہ دروازہ رش کی وجہ سے بھر جائیگا اور میں نے خود کو دیکھا۔۔۔۔ الخ

مالناطعام الاورق الشجر الخ یہی ترجمۃ الباب ہے یعنی تنگدستی کی وجہ سے درختوں کے پتے کھانا پڑے۔

فقسمتها بيني وبين سعد ، ایک نسخ میں سعد کی جگہ سبعہ آیا ہے لیکن اسے تصحیف بتایا جاتا ہے کیونکہ مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ **فقسمتها بيني وبين سعدبن مالكؓ فاتزرت بنصفها واتّزر سعدبنصفها**۔

وستجرّبون الامراء بعدنا ، اس کلام کا مطلب یہ ہے کہ ہم لوگوں نے نبی اکرم ﷺ کی مصاحبت اور ریاضات ومجاہدات سے جو کچھ سیکھا اسی کی برکت سے خدا اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی کی توفیق ملی ہے۔ ہمارے بعد ایسے امراء آئیں گے جو عیاشیوں میں پلے بڑھے ہونگے ان کو نہ خدا کے حقوق کی ادائیگی کی فکر ہوگی نہ مخلوق کی بدحالی ان کو ستائے گی۔ ان کو اپنی خواہشات اور عیاشیوں سے فراغت ہی نہیں ملے گی۔

(۷) حدثنا عبداللّٰه بن عبدالرحمٰن ثنا روح بن اسلم ابوحاتم البصری ثنا حماد بن سلمة ثنا ثابت عن أنسٍ قال قال رسول اللّٰه ﷺ لقد اخفت فی اللّٰه ومایخاف احد ولقد اوذیت فی اللّٰه ومایوذی احد ولقد اتت علی ثلثون من بین لیلة ویوم ومالی ولبلال طعام یاکله ذو کبد الاشیٔ یواریه ابط بلال(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اللہ کے راستے میں اس زمانہ میں ڈرایا گیا تھا جس میں کسی کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں نہیں ڈرایا گیا۔اور مجھے اللہ کے راستے میں اذیتیں دی گئی جب کسی کو اذیتیں نہیں دی جاتی تھیں اور مجھ پر تیس دن راتیں ایسی گزریں جب میرے اور بلال کے لئے کھانے کی کوئی چیز ایسی نہیں تھی جسے کوئی جاندار کھاسکے۔سوائے اس تھوڑے سے کھانے کے۔جسے بلال کا بغل چھپالیتا تھا۔

مشرکین کا حضور اقدس ﷺ کو ڈرانا دھمکانا: لقد اُخفت فی اللّٰہ الخ یعنی مشرکین نے مجھے ڈرایا۔ایسی حالت میں جب کوئی بھی نہیں ڈرتا تھا میں چونکہ اکیلا تھا اور اکیلا آدمی زیادہ ڈرتا ہے بہ نسبۃ جماعت کے۔ثلاثون من بین لیلة ویوم یعنی تیس دن راتیں۔

علامہ طیبی نے لکھا ہے کہ من بین لیلة ویوم ماسبق کی تاکید ہے۔اور معنی یہ ہے کہ تیس دن اور تیس راتیں۔لیکن ملاعلی قاریؒ کا خیال ہے کہ یہ ثلاثون کی تمیز ہے یعنی تیس دن رات اور مطلب یہ ہے کہ پندرہ دن اور پندرہ راتیں جو کل تیس بنتی ہیں۔

مایواریه ابط بلال ،یہ دراصل قلت سے کنایہ ہے یعنی کچھ تھوڑا سا کھانا ہوتا تھا جو بلال کے بغل میں سموجاتا تھا۔اسی پر اس سارے زمانہ میں ہمارا گزارا ہوتا تھا۔

---

(۱)سنن ابن ماجة ۱/۱۴ ابواب المناقب باب فضائل اصحاب رسول اللّٰه ﷺ، مسند احمد۳/۱۲۰،شرح السنة رقم الحدیث ۴۰۸۰(مختار)

اس حدیث کوامام ترمذیؒ نے جامع ترمذی میں ابواب صفۃ القیامۃ (۱) میں بھی ذکر کیا ہے وہاں آخر میں ان الفاظ کا اضافہ ہے ومعنی ھذا الحدیث حین خرج النبیؐ ﷺ ھارب من مکۃ ومعہ بلال إنّما کان مع البلال من الطعام مایحمل تحت ابطہٖ، صاحب لمعات کہتے ہیں کہ امام ترمذی کا مقصد یہ ہے کہ یہ واقعہ سفر ہجرت کے سوا کوئی دوسرا واقعہ ہے جس میں حضرت بلالؓ آپ ﷺ کے ساتھ تھے کیونکہ ہجرت میں تو بلالؓ ساتھ نہیں تھے تو شاید یہ طائف کے عبدکلاَل بن یاَلیل کے پاس آپ ﷺ کے آنے کا واقعہ ہو جس کو آپ ﷺ نے دعوت دی تھی اور اس نے بچوں سے پتھر برسوائے لیکن اس سفر میں بھی آپ ﷺ کے ساتھ بلالؓ کی بجائے زید بن حارثہؓ تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کوئی دوسرا موقعہ ہو جس میں حضرت بلالؓ آپ ﷺ کے ساتھ شریک سفر ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۸) حدثنا عبداللّٰہ بن عبدالرحمان انباناعفان بن مسلم ثنا أبان بن یزید العطار ثناقتادۃ عن أنس بن مالک أنّ النّبیّ ﷺ لم یجتمع عندہ غداء ولاعشاء من خبز ولحم الا علی ضفف قال عبداللّٰہ قال بعضھم ھو کثرۃ الایدی (۱)۔

ضفف کا مطلب:

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس (دسترخوان پر) صبح وشام کے کھانے میں کبھی بھی روٹی اور گوشت جمع نہیں ہوئے۔ سوائے حالت ضفف (یعنی اجتماعی حالت) میں۔

الاّعلی ضفف الخ، ضفف سے اجتماعی کھانا مراد ہے یعنی مہمانوں کے ساتھ یا گھر والوں کی معیت میں۔ یا دیگر لوگوں کی معیت میں کبھی گوشت اور روٹی اکٹھی مل جاتی۔ ورنہ صرف جَو کی روٹی معمول کا کھانا ہوتا تھا۔

---

(۱) مسند احمد ۳/ ۲۷۰ (مختار)

قال عبداللّٰہ یہاں امام ترمذیؒ کے شیخ عبداللہ بن عبدالرحمٰن مراد ہیں وہ کہتے ہیں کہ ضفف کا معنی کثرۃ الایدی ہے یعنی دوسرے لوگوں کے ساتھ شرکت طعام میں آپ ﷺ کو یہ چیزیں میسر ہوجاتی تھیں ضفف کے معنی میں دیگر اقوال بھی ہیں مثلاً بعض لوگوں نے کثرۃ العیال سے بعض نے تناولاً مع الناس اور بعض نے الضیق والشدۃ سے اس کا ترجمہ کیا ہے۔

یہی حدیث مؤلف نے پچھلے چھوٹے ''باب ماجاء فی عیش النبی ﷺ'' میں بھی ذکر کی ہے وہاں اس کی تفصیل بھی ہم عرض کر چکے ہیں۔

(۹) حدّثنا عبدالرحمن بن حمید ثنا محمّد بن اسمٰعیل بن ابی فدیک ثنا ابن أبی ذئب عن مسلم بن جندب عن نوفل بن أیاس الهذلیّ قال کان عبدالرحمٰن بن عوف لنا جلیسا و کان نعم الجلیس وانّه انقلب بنا ذات یوم حتی اذا دخلنا بیته و دخل فاغتسل ثمّ خرج واوتینا بصحفة فیها خبز ولحم فلمّا وضعت بکی عبدالرحمٰن فقلت له یا ابا محمد ما یبکیک قال هلک رسول اللّٰه ﷺ ولم یشبع هو واهل بیته من خبز الشعیر فلا ارانا اخرنا لما هو خیر لنا(۱).

ترجمہ: نوفل بن ایاس کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ ہمارے ہمنشین تھے اور وہ بہترین مصاحب تھے ایک دن وہ ہمارے ساتھ (بازار سے گھر) لوٹے۔ یہاں تک کہ ہم ان کے دولت خانہ پر آئے۔ غسل خانے میں جاکر انہوں نے غسل کیا پھر باہر آئے تو ہمارے پاس یک بڑا برتن روٹی اور گوشت کا لایا گیا۔ جسے (دسترخوان پر) رکھ دیا گیا۔ تو عبدالرحمٰنؓ رونے لگے میں نے پوچھا کہ اے ابو محمد! تجھے کس بات نے رلایا۔ فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ اس حال میں وفات پائے کہ وہ اوران کے گھر والے جو کی روٹی سے بھی شکم سیر نہیں ہوئے۔ ہمارا نہیں خیال کہ ہمیں کسی بھلائی کیلئے ان کے بعد زندہ رہنے دیا گیا ہے۔

---

(۱)مجمع الزوائد ۱۰/ ۳۱۲،الحلیلة الاولیاء لابی نعیم ۱/ ۹۹(مختار)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ: حضرت عبدالرحمٰن بن عوف بن الحارث بن زہرہ بن کلاب کا جاہلی نام عبدالکعبہ یا عبدعمرو تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے تبدیل کر کے نام عبدالرحمٰن رکھا۔ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ اور حضور اقدس ﷺ کے ننھیال بنوزہرہ سے تعلق ہے۔ واقعہ اصحاب فیل کے دس سال بعد ولادت ہوئی۔ قدیم الاسلام صحابی ہیں۔ ہجرت حبشہ کے بعد مدینہ منورہ کو بھی ہجرت فرمائی۔ بدر اور اس کے بعد کے تمام غزوات میں شریک رہے۔ غزوۂ احد میں ان کو اکیس زخم آئے۔ پاؤں کے ایک زخم کی وجہ سے لنگڑا پن بھی محسوس کیا جاتا رہا۔ سرخ وسفید رنگ، بڑی آنکھوں، خمدار پلکوں، بڑی گردن، مضبوط ہاتھ کی وجہ سے حسن ووقار آپؓ کی شخصیت میں نمایاں تھے۔

علم میں بھی امتیازی مقام حاصل تھا۔ نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں فتویٰ دیا کرتے تھے۔ ایک سفر کے دوران نبی اکرم ﷺ نے ان کی اقتداء میں صبح کی نماز بھی ادا فرمائی تھی۔ انہوں نے جاہلیت میں بھی شراب کو حرام سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔

کامیاب تجارت کی وجہ سے آپؓ کا شمار چند ایک دولتمند صحابہ میں ہوتا تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے سخاوت کی نعمت سے بھی مالا مال فرمایا تھا۔ نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں ایک دفعہ اپنا آدھا مال اللہ کے راستے میں دے دیا۔ پھر چالیس ہزار دینار صدقہ کئے۔ پھر پانچ سو گھوڑے اور پانچ سو اونٹ اللہ تعالیٰ کی راہ میں پیش کئے۔ ازواج مطہرات کو ایک باغ ہدیہ کیا جو چار لاکھ درہم میں فروخت ہوا۔ ازواج مطہرات کے حج اور مصارف سفر کا انتظام بھی آپؓ ہی فرمایا کرتے تھے۔ جعفر بن برقانؒ کہتے ہیں کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے تیس ہزار غلام اور باندیوں کو آزاد فرمایا تھا۔ وفات کے وقت بھی وصیت کی کہ موجود ہر بدری صحابی کو چار سو دینار دے دیئے جائیں۔ چنانچہ اس وقت ایک سو بدری صحابہ پائے گئے۔

حضرت عمرؓ نے خلیفہ کے انتخاب کیلئے چھ افراد کی کمیٹی بنائی۔ ان میں آپؓ کا نام شامل تھا۔ مگر آپؓ نے خلافت قبول کرنے سے انکار کیا بلکہ ایک دفعہ حضرت عثمانؓ نے ان کو خلیفہ بنانے کا وثیقہ لکھا تھا جس پر آپؓ ناراض ہوئے ان کی وفات ۳۲ھ یا ۳۱ھ میں تقریباً بہتر (۷۲) برس کی عمر میں ہوئی۔ جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

حتّٰی اذادخلنا بیته و دخل یعنی ہم بھی ان کے گھر میں داخل ہوئے اور وہ خود بھی گھر کے اندر داخل ہوئے۔لیکن ملاعلی قاریؒ کہتے ہیں کہ دخل کا مفعول "مغتسلہ" ہے جو مقدر ہے یعنی وہ گھر میں غسلخانہ میں داخل ہوئے۔مابعد کا کلام "فاغتسل" اس پر قرینہ ہے۔واُتینـا الخ مجھول کا صیغہ ہے۔یعنی ہمارے پاس کھانالایا گیا۔جب کھانے کو دیکھا جو پیٹ بھرنے کیلئے کافی تھا تو نبی اکرم ﷺ کی حالت یاد آئی۔

شبع اورنفی شبع تعارض کاحل: لم یشبع هو واهل بیته الخ، اس پرایک اشکال ہے کہ اسی باب میں ابوالہیثمؓ کے ہاں آپ کا پیٹ بھر کر کھانا مذکور ہے۔تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کیسے نفی فرمارہے ہیں۔اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں عادت کی نفی ہے یعنی نبی اکرم ﷺ نے اس قسم کا کھانا ہمیشہ کیلئے پیٹ بھر کرنہیں کھایا۔اگر کبھی کبھی کھانے کا موقعہ ملا ہوتو بعید نہیں یا مطلب یہ ہے کہ اپنے گھر میں اس سے پیٹ نہیں بھرا یا پھر یہاں بھی قید مراد ہے کہ لگا تار دو دن روٹی اور گوشت سے پیٹ بھر کرنہیں کھایا۔ کماجاء فی بعض الروایات.

فلاارانااخرنالماهو خیرلنا، یعنی نبی اکرم ﷺ اوران کے گھروالوں نے تو تنگدستی کی زندگی بتی۔ ہم خوشحال زندگی بسر کررہے ہیں۔ اب ہمیں خطرہ ہے کہ ہماری یہ خوشحالی ہمارے حق میں کوئی بہتر بات نہیں ہے بلکہ بہتر زندگی وہی تھی جو کہ سید الاولین والآخرین ﷺ نے منتخب فرمائی تھی۔ ہماری عارضی خوشحالی میں خطرات ہوسکتے ہیں کہ ہماری نیکیوں کا بدلہ دنیا میں ہمیں دیا جارہا ہو اوراخروی سعادتوں میں کمی کا باعث بن رہا ہو جبکہ حضوراقدس ﷺ اوران کے گھروالوں کے فقر میں یہ خطرات نہیں تھے۔ اذهبتم طیباتکم فی حیاتکم الدنیا(الآیة)

خلاصۂ باب

اس باب میں نبی اکرم ﷺ کے گزراوقات کا تذکرہ مقصود ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے کھانے پینے، لباس اور رہائش میں تنگی تھی عموماً فاقہ ہوتا تھا کھانا ملتا، تو وہ بھی جو کی روٹی یا کھجور ہوتے تھے۔ کبھی مہینہ بھر گھر میں آگ جلنے کی نوبت نہ آتی۔ بھوک کی شدت محسوس ہوتی تو پیٹ پر پتھر باندھ کر صبر سے برداشت کر لیتے تھے۔ گوشت تو شاذ ونادر ہی مہیا ہوتا تھا۔

گھر والوں کی بھی یہی حالت تھی جو کی روٹی پیٹ بھر کر میسر نہ تھی۔ عام صحابہؓ کی تنگدستی سے بھی نبی اکرم ﷺ کی حالت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اسی لئے شیخین کا واقعہ بھی لایا گیا ہے۔ جب کڑکتی دھوپ میں ان کو بھوک نے ستایا تو آپ ﷺ کے پاس آئے۔ آپ ﷺ کا بھی بھوک سے ان کی طرح برا حال تھا چنانچہ ایک مخلص صحابی ابوالہیثمؓ کے پاس تشریف لے گئے۔ اورانہوں نے خاطر تواضع کی۔

اسی طرح حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور عتبہ بن غزوانؓ بھی نبی اکرم ﷺ کے زمانے کی معاشی زبوں حالی کا ذکر کرتے ہیں کہ ہمیں درختوں کے پتوں سے گزارا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ خیر القرون میں معاشی ابتری ایک اختیاری امر تھا وہ دنیا سے بے رغبت تھے زہد ہی نے ان کو اس حالت پر پہنچایا تھا۔ اسی وجہ سے ان کا فقر ایک قابل فخر بات تھی وہ دعا میں بھی مساکین کی مصاحبت مانگا کرتے تھے۔

۵۴. باب ماجاء فی سنّ رسول اللہ ﷺ

حضور اقدس ﷺ کی عمر کے بیان میں

سن عمر کو کہتے ہیں اور دانت کو بھی سن کہا جاتا ہے شاید اس لئے کہ اس سے انسان کی عمر کا اندازہ لگایا جاتا ہے اس باب میں نبی کریم ﷺ کی عمر کے متعلق احادیث لائے گئے ہیں نیز اس بات کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مکہ میں اپنی عمر کا کتنا حصہ گزارا ہے اور مدینہ میں کتنے سال تک رہے۔

(۱) حدثنا احمد بن منیع ثنا روح بن عبادۃ ثنا زکریا بن إسحاق ثنا عمرو بن دینار عن ابن عبّاس قال مکث النبیّ ﷺ بمکۃ ثلاث عشرۃ یوحی إلیه وبالمدینۃ عشرا وتوفیّ وھو ابن ثلاث وّستین سنۃ(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ مکہ مکرمہ میں تیرہ سال تک رہے جن میں آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی رہی اور مدینہ منورہ میں دس سال تک رہے اور آپ ﷺ نے تریسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی۔

ثلاث عشرۃ سنۃ یوحی الیه الخ، یہ بات مسلم ہے کہ نبی کریم ﷺ کی عمر بعثت کے وقت چالیس سال تھی اس کے بعد مکہ میں آپ ﷺ تیرہ سال مزید رہے۔ گویا مکہ میں آپ ﷺ اپنی عمر کے ترپن (۵۳) سال گزار چکے تھے اور بقیہ عمر مدینہ میں گزاری۔ نبی اکرم ﷺ کی عمر کے بارے میں صحیح ترین روایت یہی ہے۔

(۲) حدثنا محمّد بن بشّار ثنا محمّد بن جعفر عن شعبۃ عن أبی إسحاق عن عامر ابن سعد عن جریر عن معاویۃ أنّه سمعه یخطب قال مات رسول اللّٰه ﷺ وھو ابن ثلاث وستین وابوبکر وعمرو انا ابن

(۱) صحیح بخاری ۱/۵۵۲ کتاب مناقب الانصار باب هجرۃ النبی ﷺ واصحابه إلی المدینۃ، صحیح مسلم ۲/۲۶۰ کتاب الفضائل باب کم اقام النبی ﷺ بمکۃ الخ، جامع ترمذی ۲/۲۸۴ کتاب المناقب باب محاسن رسول اللہ ﷺ کم کان حین مات، مسند احمد ۱/۳۷۰ (مختار)

ثلاث وّستین سنة(۱).

ترجمہ: جریر بن حازمؒ کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت امیر معاویہؓ سے خطبہ کے دوران سنا کہ نبی اکرم ﷺ تریسٹھ سال کی عمر میں وفات پائے، ابوبکرؓ اور عمرؓ بھی اسی عمر میں وفات پائے، اور میں بھی تریسٹھ برس کا ہوں۔

مات رسول اللّٰہ ﷺ، حضرت امیر معاویہؓ نبی کریم ﷺ کی عمر کے ساتھ ساتھ اپنے سے قبل ان اکابر صحابہ کی عمریں بھی بیان فرماتے ہیں جو خلافت سے سرفراز ہو چکے تھے۔ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اور شیخین کی عمریں تریسٹھ سال تھیں جبکہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی عمریں وفات کے وقت تریسٹھ سال نہ تھیں (۲)۔ یہ کہتے وقت گویا آپؓ کی تمنا تھی کہ اسی سال مجھے موت نصیب ہو کیونکہ اس خطبہ کے وقت خود حضرت امیر معاویہؓ کی عمر بھی تریسٹھ سال تھی لیکن آپؓ کو اس عمر میں وفات کی سعادت نہ مل سکی بلکہ آپؓ کی عمر اسّی سال سے بھی بڑھ گئی اگرچہ آپؓ کی نیت اور جذبہ قابل قدر ضرور ہے۔

(۳) حدّثنا حسین بن مهدی البصری ثنا عبدالرزاق عن ابن جریج عن الزهریّ عن عروة عن عائشة أنّ النبیّ ﷺ مات وهو ابن ثلاث وّستین سنة(۳).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ تریسٹھ برس کی عمر میں وفات پائے۔

---

(۱) صحیح مسلم ۲/۲۶۰ کتاب الفضائل باب کم اقام النبی ﷺ بمکة والمدینة، جامع ترمذی ۲/۶۸۴ کتاب المناقب باب فی سنّ النبی ﷺ کم کان حین مات، السنن الکبریٰ للنسائی کتاب الوفاة، مسنداحمد ۴/۹۶ (مختار)

(۲) جبکہ علامہ جلال سیوطیؒ نے لکھا ہے علی بن ابی طالب... بوی له بالخلافة یوم قتل عثمان وقتل لیلة الجمعة لثلاث عشرة بقیت من رمضان سنة أربعین بالکوفة وهو ابن ثلاث وستین سنة. (اسعاف المبطّابرجال المؤطأ ۶۷۹)(مختار)

(۳) جامع ترمذی ۲/۶۸۴ کتاب المناقب باب فی سن النبی ﷺ کم کان حین مات، مسنداحمدمصنف عبدالرزاق. (مختار)

ثــــلاث وّستیــــن، حضرت عائشہؓ کا یہ قول نبی کریم ﷺ کی عمر کے بارے میں صحیح ترین شمار کیا جاتا ہے۔اس لئے حضرت عائشہؓ کی دوسری روایت (۱) جس سے آپ ﷺ کی عمر ساٹھ برس معلوم ہوتی ہے کی تاویل ضروری ہے۔

(۴) حــدّثــنـا احــمــد بن منیع ویعقوب ابن إبراهیم الدورقیّ قالا ثنا اسماعیل بن علیّة عن خالدالحذّاء حدّثنی عمّار مولیٰ بنی هاشم قالت سـمـعـت ابـن عبّـاس یـقـول تـوفیّ رسول اللّـه ﷺ وهو ابن خمـس وّستین(۲).

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ پینسٹھ (۶۵) برس کے تھے جب وہ وفات پائے۔

خمس وّستین ، حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت میں آپ ﷺ کی عمر پینسٹھ (۶۵) برس بتائی گئی ہے جبکہ اس سے قبل کی احادیث میں تریسٹھ (۶۳) کا قول آیا ہے اور اس کتاب کی ابتدائی حدیث حضرت انسؓ کی حدیث میں جو اس باب میں آگے بھی آرہی ہے ساٹھ سال کی روایت بھی آئی ہے۔ان تینوں روایات میں سب سے اچھی تطبیق یہ ہے کہ حضرت انسؓ کی روایت میں کسر کو لغو کر کے اس کا اعتبار نہیں کیا گیا جبکہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں دو سال کا اضافہ کیا گیا ہے۔تا کہ ساتویں دہائی کو نصف تک پورا کیا جاسکے یا اس لئے کہ اس میں ولادت اور وفات کے دو سال زائد شمار کئے گئے ہیں جبکہ حضرت عروہؓ نے تو حضرت ابن عباسؓ کی روایت کو غلطی پر محمول کیا ہے اور اسے مرجوح قرار دیا ہے۔

(۵) حــدّثــنـا محمّدبن بشّارو محمّد ابن أبانٍ قالا ثنا معاذ بن هشام حـدّثـنی أبی عن قتادة عن الحسن عن دغفل بن حنظلة أنّ النبیّ ﷺ

---

(۱)عـن عـائشة وابـن عبـاسؓ أنّ الـنبـیّ لبـث بـمـكـة عشـر سـنیـن یـنزل علیه القرآن وبالمدینة عشـراً(بـخـاری ج۲ ص ۱۴۲)واوّلـوه أنّهـمـا اسـقـطـا مـدة فترة الوحی من لبثه بمكة وكانت نحو ثلاث سنین (اصلاح الدین)

(۲)صـحـیـح مسـلـم ۲/ ۲۶۰ كـتـاب الـفـضـائـل بـاب كـم اقـام النبی ﷺ بمكة والمدینة، جامع ترمذی ۲/ ۶۸۴ كتاب المناقب باب فی سن النبی ﷺ كم كان حین مات، مسنداحمد ۱/ ۲۲۳ (مختار)

قبض وهو ابن خمس وّستين سنة قال أبو عيسىٰ ودغفل لانعرف له سماعا من النبيّ ﷺ وكان في زمن النبيّ ﷺ رجلا(۱).

ترجمہ: دغفل بن حنظلہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ پینسٹھ برس کی عمر میں (دنیا سے) اٹھائے گئے۔

حضرت دغفل: وهو ابن خمس وّستين، اس حدیث میں بھی حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کی طرح پینسٹھ سال بتائی گئی ہے اوراس کی وہی توجیہات ہونگیں جو بیان ہو چکی ہیں۔

ودغفل لانعرف له سماعا الخ، دغفل بن حنظلہ سدوسی کے بارے میں اختلاف ہے۔امام حمیدیؒ، نوح بن حبیب، ابن حبان اور احمد بن ہارون البردیجی نے اسے صحابی قرار دیا ہےاور یہ کہا ہے کہ صرف یہی ایک روایت ان سے مروی ہے لیکن امام بخاریؒ اور دیگر محققین کا مذہب ہے کہ دغفل مخضرم تابعی ہیں یعنی نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں آپ موجود تو تھے لیکن ان سے ملاقات کا شرف نہ مل سکا۔امام احمدؒ بھی کہتے ہیں کہ ''من این لہ صحبۃ'' یعنی وہ صحابی کیسے ہوئے؟ جبکہ ایک جگہ کہتے ہیں کہ ''ماادری'' مجھے پتہ نہیں۔

البتہ یہ بات مسلّم ہے کہ دغفل سدوسی کا علم میں ایک بہت بڑا مقام تھا خصوصاً علم النساب اور عرب قبائل کی تاریخ میں انتہائی ماہر تھے حتیٰ کہ اس سلسلے میں ابوبکر صدیقؓ سے بھی آپ کا معارضہ منقول ہے عربیت، انساب اور نجوم میں ان کی مہارت کو دیکھ کر حضرت امیر معاویہؓ نے ان کو یزید کا استاد بنایا تھا کہتے ہیں کہ ۷۰ھ میں خوارج کے ساتھ جنگ دولاب میں وہ پانی میں ڈوب کر وفات پائے بعض حضرات نے ان کا نام حُجر اور لقب دغفل بتایا ہے۔

امام ترمذیؒ بھی ان کے بارے میں جمہور کے قول کے مطابق کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ سے ان کا سماع تو ثابت نہیں البتہ ان کے زمانہ میں دغفل آدمی یعنی بالغ تھے۔

(٦) حدّثنا إسحاق بن موسىٰ الأنصاري ثنا معن ثنا مالك بن أنس عن ربيعة بن أبي عبدالرحمٰن عن أنس بن مالك أنّه سمعه يقول

---

(۱)مجمع الزوائد ۱/۱۷، الدلائل للبیهقی ۷/۲۴۰(مختار)

كان رسول اللّٰه ﷺ ليس بالطويل البائن ولا بالقصير ولا بالأبيض الأمهق ولا بالاٰدم ولا بالجعد القطط ولا بالسبط بعثه اللّٰه تعالىٰ على راس اربعين سنة فاقام بمكة عشر سنين وبالمدينة عشر سنين وتوفاه اللّٰه تعالىٰ على راس ستين سنة وليس فی راسه ولحيته عشرون شعرة بيضاء(۱)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نہ زیادہ لمبے قد والے تھے نہ پستہ قد تھے نہ بالکل سفید رنگ کے تھے نہ بالکل گندم گون تھے نہ آپ ﷺ زیادہ گھنگریالے بالوں والے تھے نہ بالکل سیدھے (کھلے) بالوں والے تھے۔ چالیس سال کی عمر میں آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا۔ پھر آپ ﷺ مکہ میں دس سال رہے اور مدینہ میں بھی دس سال رہے اور ساٹھ سال کی عمر میں وفات پائی اس وقت آپ ﷺ کے سر اور داڑھی میں بیس سفید بال بھی نہیں تھے۔

(۷) حدثنا قتيبة بن سعيد عن مالك بن أنس عن ربيعة بن أبی عبدالرحمٰن عن أنس بن مالك ونحوه.

امام ترمذیؒ نے دوسری سند مذکورہ حدیث کیلئے بیان کی۔

ليس بالطويل البائن الخ، یہ حدیث شمائل ترمذی کی سب سے پہلی حدیث ہے اور وہاں اس کی مکمل تشریح گزر چکی ہے چونکہ اس میں حضور ﷺ کی عمر کا بیان ہے اس لئے اس باب میں بھی اس حدیث کو لایا گیا ہے البتہ عمر جو ساٹھ سال بتائی گئی ہے اس کی توجیہ غالباً یہی کی جاتی ہے کہ حضرت انسؓ نے کسر (اکائی) کا اعتبار نہیں کیا اور عقود یعنی دہائیوں کا ذکر کیا ہے۔

(۱) صحیح مسلم ۲/ ۲۶۰، جامع ترمذی ۲/ ۲۸۱، مؤطا امام مالک ص ۷۱۱، مسند احمد ۳/ ۲۴۰ (مختار)

خلاصۂ باب

اس باب میں نبی اکرم ﷺ کی عمر مبارک کے بارے میں احادیث کا ذکر ہے۔اور تین قسم کی روایات امام ترمذیؒ لائے ہیں یعنی ساٹھ سال، تریسٹھ سال اور پینسٹھ سال کی روایات ہیں۔اول الذکر اور مؤخر الذکر مؤول ہیں اور صحیح قول تریسٹھ سال کا ہے۔

۵۴۔ باب ماجاء فی وفات النبیﷺ

حضوراقدسﷺ کے وفات کا بیان

حضور نبی کریمﷺ کی وفات کے بارے میں اکثر محدثین کی رائے یہ ہے کہ یہ سانحہ ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو پیش آیا۔ بعض کے نزدیک حضورﷺ کی وفات کی یہ تاریخ غلط ہے۔ اس اختلاف کا سبب تقویم کے بعض ماہرین کا وہ اعتراض ہے جو وہ اس تاریخ پر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نو (۹) ذی الحجہ ۱۰ھ ہجری کو حجۃ الوداع کے موقعہ پر بالاتفاق جمعہ شریف کا دن تھا۔ اور اگر یہ صحیح ہے۔ تو کسی صورت میں بھی ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو پیر کا دن نہیں پڑتا۔ خواہ بعد کے تین مہینے تیس دن کے ہوں یا انتیس کے۔ یا بعض تیس کے اور بعض انتیس کے۔ جبکہ نبی کریمﷺ کی رحلت بالاتفاق پیر کے روز ہوئی ہے۔ اس لئے بعض محققین کا کہنا ہے۔ کہ نبی کریمﷺ کی وفات ۲ ربیع الاول (۱) کو ہوئی تھی۔ جبکہ بعض لوگوں نے ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ میں تاویلات کا سہارا لیا ہے۔

آغاز مرض: رسول اللہﷺ کے مرض وفات کی ابتداء دردسر سے شروع ہوئی۔ گرمی کا موسم تھا۔ حضورﷺ ایک جنازے میں شرکت فرمارہے (۲) تھے کہ سر میں درد ہونے لگا۔ پھر بخار نے آلیا۔ اس

(۱) وقدروی البیهقی باسناد صحیح الی سلیمان التیمیّ أنّ رسول اللہﷺ مرض لاثنتین وعشرین لیلة من صفر وکان اول یوم مرض فیه یوم السبت وکانت وفاته الیوم العاشر یوم الاثنین للیلتین خلتامن شهر ربیع الاول (۱۱ھ) واللہ أعلم ۱۲ اجمع الوسائل ج ۲ ص ۲۵۳)

(۲) علامہ مناویؒ کے بقول بیماری شروع ہونے کے روز آپﷺ جنت البقیع میں تشریف لے گئے تھے۔ وہاں اہل مقبرہ کیلئے دعا فرمائی۔ وہاں سے واپسی پر حضرت عائشہؓ کے پاس تشریف لائے ان کو بھی اس روز سردرد کی تکلیف تھی۔ آپﷺ گھر پہنچے تو وہ بولیں "وارأساہ" یعنی ہائے میرے سر کا درد۔ آپﷺ نے فرمایا "بل انا واللہ وارأساہ" یعنی خدا کی قسم میرے سر میں درد ہے۔ پھر از راہ ملاطفت آپﷺ نے فرمایا کہ اگر تو مجھ سے پہلے مرگئی تو میں تیری تجہیز و تکفین اپنے ہاتھ سے کروں۔ تیری نماز جنازہ خود پڑھاؤں اور خود ہی تجھ کو دفن کردوں۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں تو آپﷺ کو جانتی ہوں۔ اگر تم مجھ سے فارغ ہوگئے تو اسی رات کو کسی نئی دلہن کو میرے حجرے میں لے آؤ گے۔ جس پر آپﷺ نے تبسم فرمایا۔ اور اسی دردسر نے طول پکڑا جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوا۔ شاید حضرت شیخ مدظلہ نے بقیع میں حاضری کو جنازہ سے تعبیر کیا ہے۔ (مختار)

مرض کی ابتداء حضرت عائشہؓ کے حجرے میں ہوئی۔ لیکن حضور ﷺ اور ازواج مطہرات کے درمیان عدل اور قسم کا اتنا پاس تھا کہ شدید بیماری کی حالت میں بھی باری باری ازواج مطہرات کے حجروں میں پھروانے کا حکم دیا تا کہ کسی بیوی کی حق تلفی نہ ہو۔ظاہر ہے کہ ازواج مطہرات میں بھی ہر ایک کی خواہش ہوتی تھی۔ کہ بیماری کی حالت میں نبی کریم ﷺ ان کے پاس رہیں تا کہ وہ بھی ان کی تیمارداری اور خدمت کا شرف حاصل کرسکیں۔

حضرت میمونہؓ کے گھر میں آپ ﷺ کی تکلیف میں اضافہ ہوا۔حالت مرض میں ادھرادھر پھرانے سے نبی کریم ﷺ کو بھی تکلیف ہوتی تھی۔ نیز ہر روز جگہ اور تیمارداروں کی تبدیلی مرض میں مزید شدت کا باعث بنتی تھی۔لہٰذا تمام ازواج مطہرات نے آپس میں مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ چونکہ قلبی محبت کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کا دلی اطمینان حضرت عائشہؓ کے حجرے میں زیادہ ہوتا ہے۔اس لئے روز روز قیام گاہ بدلنے کی بجائے رسول اللہ ﷺ بیماری میں مستقلاً حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں رہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے مرض وفات کے بارہ یا چودہ دن اسی حجرے میں گزارے۔

<u>موت کے دروازے پر بے پناہ صبر واستقامت:</u> ہر شخص کی موت کسی نہ کسی حد تک افسوسناک اور اندوہناک ضرور ہوتی ہے۔مگر نبی کریم ﷺ کی موت تو روز اول سے لیکر آج تک امت کیلئے ایک دردناک اور عظیم حادثہ اور سانحہ شمار ہوتا ہے۔اور ظاہر ہے کہ انسان جتنا بھی عظیم ہوتا ہے موت کے وقت اس کی عظمت کے اتنے ہی مظاہر سامنے آتے ہیں۔ چنانچہ وہ تحمل، حوصلہ، صبر وشکر اور مصائب وشدائد کی برداشت کا اس نازک ترین موقعہ پر مظاہرہ کر کے اپنی عظمت کا ثبوت دیتا ہے۔حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے عظیم شخصیتوں کی وفات کے متعلق الہلال میں ”انسانیت موت کے دروازے پر“ کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔جس میں عظیم لوگوں کی وفات کے احوال لکھے ہیں۔اس کتاب میں مولانا نے حضور ﷺ کے سانحۂ ارتحال کے احوال بہت مؤثر اور دردناک انداز میں لکھے ہیں۔ان کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے وفات اور مرض وفات کے بارے میں بڑے پُر درد اور پُر سوز پیرائے میں کتابیں لکھی ہیں۔

امام ترمذیؒ بھی اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کی موت، مرض وفات کے شدائد اور اس موقع پر

حضورﷺ کے اطمینان اورصبروسکون کاذکرکرتے ہیں۔ پھروفات کے بعد جنازے اورکفن دفن کے حالات بیان کرتے ہیں۔جس سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کواللہ تعالیٰ نے کیسے صفات سے نوازاتھا۔اورکیسےانہوں نے استقامت سےاس سانحۂ کبریٰ کا سامنا کیا۔اورکتنے لوگ تھے جوفرط غم سے حواس گم کربیٹھے تھے۔

مرجع امۃ صدیق اکبر بنے رہے: پھر یہ بھی معلوم ہوگا کہ ابوبکرصدیقؓ کا مقام صحابہ کی نگاہ میں کیسا ہے؟ عموماً جب کوئی آدمی مرجاتا ہےتو لوگ کفن دفن کیلئے اس کے جانشینوں سے رجوع کرتے ہیں۔ مگرحضورﷺ کا معاملہ اورتھا۔آپ کی بیٹی، داماد، چچازاد بھائی اورقوم قبیلہ کےلوگ موجود تھے۔ازواج مطہرات موجودتھیں۔مگرساری امت کا مرجع ابوبکرصدیقؓ ہی بنتے ہیں۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب بھی تجہیزوتکفین کے بارے میں کوئی نزاع پیداہوتا ہےیا کوئی مسئلہ پیش آتا ہےتو لوگ صدیقؓ کے پاس آتے ہیں اوروہ جوبھی فیصلہ دیتے ہیں لوگوں کی طرف سے ''صدقت'' اور''قدصدق'' کی صداسنائی دیتی ہے۔ اس سےاس بات کی طرف بھی اشارہ ملتاہے کہ خیرالقرون میں حکومت ومملکت نسلی اوروراثت کی بنیادپرنہ تھی بلکہ صحابہ کرامؓ میں سے نبی کریمﷺ سےقریب ترین اورسب سےافضل ترین امیراورخلیفہ بن جاتا ہے نیزاس سے صحابہؓ کےدرمیان ابوبکرصدیقؓ کا مقام بھی بخوبی واضح ہوجاتاہے۔

(۱) حدّثنا أبوعمّارالحسين بن حريث وقتيبة بن سعيد وغيرواحدقالوا ثنا سفيان ابن عيينة عن الزهريّ عن أنس بن مالك قال اخرنظرة نظرتها إلٰى رسول اللهﷺ كشف الستارة يوم الاثنين فنظرت إلٰى وجهه كانّه ورقة مصحف والناس يصلّون خلف أبى بكرفاشارإلٰى النّاس ان اثبتواوابوبكريؤمّهم والقى السّجف وتوفّيّ من اخرذلك اليوم(۱).

---

(۱)صحيح مسلم ۱/۱۷۹ كتاب الصلوة باب استخلاف الامام اذاعرض له عذراً الخ، السنن الصغرىٰ للنسائى كتاب الجنائز باب الموت يوم الاثنين، سنن ابن ماجة ص۱۱۶ كتاب الجنائز باب ماجاء فى ذكر مرض رسول اللهﷺ(مختار)

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا آخری دیدار میں نے سوموار کے دن اس وقت کیا جب (صبح کی نماز کے دوران) آپ ﷺ نے حجرے کے دروازے سے پردہ ہٹایا۔ میں نے آپ ﷺ کے چہرے کو دیکھا تو وہ (صفائی، انوار اور طمانینت میں) قرآن پاک کے ورق جیسا تھا۔ لوگ اس وقت ابوبکر صدیق کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو اشارہ کر کے حکم دیا۔ کہ یونہی جمے رہو۔ ابوبکر صدیقؓ امامت میں مصروف تھے آپ ﷺ نے پردہ واپس ڈال دیا۔ اور اسی دن کے آخر میں آپ ﷺ نے وفات پائی۔

امت کا حالت سجدہ میں آخری مشاہدہ: (۱) آخر نظرة نظرتها الخ، حضرت عائشہؓ کے حجرے کا دروازہ مسجد نبوی ﷺ کی طرف کھلتا تھا۔ آپ ﷺ مرض وفات میں تین دن تک مسجد میں نہ آسکے۔ صحابہ کرام اور خود آپ ﷺ کو ملنے کا اشتیاق تھا۔ زندگی کے سب سے آخری دن صبح کو دروازے سے پردہ اٹھا کر دیکھا۔ کہ تمام صحابہ دربار الٰہی میں دست بستہ ہیں۔ صدیق اکبرؓ امامت فرما رہے ہیں۔ امت کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کی یہ آخری ملاقات تھی۔ کتنی عظیم نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ زندگی کے آخری لمحات میں آپ ﷺ کو سکون و اطمینان دلانے کیلئے یہ منظر دکھلا رہے ہیں۔ گویا وہ نبی کریم ﷺ کو بتانا چاہتے ہیں۔ کہ آپ ﷺ نے امت کیلئے جتنی قربانیاں دیں جو تکالیف اور مصائب امت کیلئے جھیلیں وہ رائیگاں نہیں گئیں۔ اور توحید کا جو پودا آپ نے تیئیس (۲۳) سال قبل لگایا تھا۔ اسے سینچا اور اس کی نشونما میں جانکاہ مصائب سہے۔ بالآخر وہ ثمر آور ہوا۔ یہی لوگ ہی تو تھے جولات و منات اور عزیٰ کے قدموں میں پڑے تھے۔ جہالت اور صنم پرستی کے ظلمات میں سرگرداں ٹھوکریں کھا رہے تھے مگر آج اللہ تعالیٰ کے در پر سربسجود ہیں (۲)۔ یہ نظارہ اس لئے بھی دکھایا گیا کہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے ہاں آخری گواہی بھی یہی دے سکیں

---

(۱) آخر نظرة الخ، آخر مبتداء ہے۔ اور کشف الستارة خبر کا قائم مقام ہے۔ جبکہ یوم الاثنین ظرف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی۔ آخر نظرة نظرتها الى وجهه حين كشف الستارة يوم الاثنين ۔ (اصلاح الدین)

(۲) اور نبی اکرم ﷺ کیلئے اس سے بڑی خوشی کی بات کوئی تھی ہی نہیں۔ چنانچہ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ ثم تبسم یضحک، یعنی یہ دیکھ کر آپ ﷺ خوشی سے ہنس پڑے۔ (اصلاح الدین)

کہ اے اللہ میں نے ان لوگوں کو ہر طرف سے کاٹ کر تیری بارگاہ میں جھکا ہوا چھوڑا تھا۔ اور وہ سر بسجود تھے میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ پھر اس کے بعد اے اللہ تعالیٰ تو ہی ان کا نگران رہا۔

<u>مصحف قرآن سے رُخِ زیبا کی تشبیہ:</u> حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے باہر جھانک کر دیکھا تو چہرۂ انور کو دیکھتے ہوئے یہ احساس ہوا۔ ''کانہ ورقۃ مصحف'' مصحف میم کے ضمہ کے ساتھ اشہر ہے۔ فتحہ بھی مشہور ہے اور کسرہ بھی جائز ہے۔ یہ بلیغ کلام اور بے نظیر تشبیہ حضرت انسؓ نے قرآن مجید کے نورانی صفحہ کے ساتھ چہرۂ انور کو تشبیہ دی ہے۔ گویا جس طرح قرآن مجید کے اوراق میں انوار ہوتے ہیں۔ اور ان انوار کا پوری طرح احساس بھی صحابہ ہی کو ہو سکتا ہے۔ اس طرح نبی کریم ﷺ کا چہرہ مبارک انوار الٰہی، وقار و بشاشت اور اطمینان و سکون کی وجہ سے دمک رہا تھا یا پھر اس تشبیہ سے غرض حضور ﷺ کے صبر و شکر اور اس طمانیت کی نشاندہی ہے۔ جو امت کو ایسی حالت میں دیکھ کر نبی کریم ﷺ کے چہرۂ انور پر عیاں تھی۔ نیز مسرت کی اس کیفیت کا پتہ بھی خوب چلتا ہے۔ جو رفیق اعلیٰ سے ملنے کے تصور سے نبی کریم ﷺ کو حاصل ہو رہی تھی۔

<u>امامت ابی بکر:</u> والنّاس یصلّون خلف أبی بکر الخ ، نبی کریم ﷺ نے پردہ اٹھایا۔ تو صحابہؓ سمجھے کہ شاید نبی کریم ﷺ مسجد میں تشریف لا رہے ہیں۔ چنانچہ ان میں کھلبلی مچی، مگر نبی کریم ﷺ نے لوگوں کے اضطراب کو محسوس کر کے اطلاع دی کہ میں نہیں آ رہا۔ اس لئے صفوں کو نہ توڑو، اپنی نمازیں پوری کرو، اس بات میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی امامت کی تقریر و تائید بھی ہے اور یہ اشارہ بھی ہے کہ آئندہ کیلئے ان کی اقتداء و اتباع میں ثابت قدم رہو۔ مخالفین و معاندین، سازشی اور منافقین ڈگمگاہٹ پیدا کرنے کی بارہا کوشش بھی کریں اور عظمت ابی بکرؓ اور ان کی خلافت کے بارے میں لب کشائی بھی کرتے رہیں لیکن تم لوگ ثابت قدم رہو اور اجتماعیت کو برقرار رکھتے ہوئے ثبات اختیار کرو۔

والقی السجف وتوفیّ الخ ،سجف سین کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ جائز ہے۔ دروازے کے پردے کو کہتے ہیں۔ جبکہ بعض لوگوں کے ہاں سجف وہ پردہ ہوتا ہے جو دروازے کے دو طاقوں کی طرح درمیان میں چیرا گیا ہو۔

آخریوم پراشکال کاحل: حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ اسی روز دن کے آخر میں وفات پاگئے۔مگراس پراشکال وارد ہوتا ہے کہ قوی روایات کے مطابق نبی کریم ﷺ نے چاشت کے وقت رحلت فرمائی تھی۔ بلکہ صاحب جامع الاصول نے اس پر اتفاق نقل کیا ہے۔اس کو مدنظر رکھتے ہوئے آخرالیوم کالفظ درست نہیں بنتا۔اس کا جواب یہ ہے کہ آخر کا اطلاق کبھی دخول فی النصف الثانی پر بھی ہوا ہےاورضحوۂ کبریٰ یعنی چاشت کا وقت بھی زوال کے قریب ہوتا ہے گویا ضحوہ کبریٰ کوقرب کی وجہ سے زوال کہا گیا ہے پھر زوال سے آخرالیوم کے لفظ سے تعبیر کی گئی۔دوسرا جواب یہ ہے کہ آخر کا لفظ کبھی مقحم بھی آتا ہےجس طرح عین کالفظ کبھی کبھی مقحم اورزائد مستعمل ہوتا ہے۔

تو یہاں بھی آخر کا معنی مقصود ومراد نہیں ہوگا بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ نبی کریم ﷺ اسی دن انتقال کر گئے۔تیسرا جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ چاشت کے وقت انتقال فرما گئے لیکن کسی کو بھی آپ ﷺ کی وفات کا یقین نہیں آیا۔خصوصاً حضرت عمرؓ تو آپ ﷺ کی موت کے بارے میں سننے کوتیار نہ تھے۔پھر حضرت ابوبکرصدیقؓ نے یہ عقدہ حل فرمایا مگرآپ کے فیصلے کاعلم اکثرصحابہ کواس وقت ہوا جب دن کا بیشتر حصہ گزر چکا تھا۔یوں لوگ سمجھنے لگے کہ آخرالنہار میں حضورﷺ کی وفات ہوئی تھی۔

(۳) حدّثنا محمّدبن مسعدة البصريّ ثنا سليم بن احضر عن ابن عون عن إبراهيم عن الأسود عن عائشة قالت كنت مسندة النبيّ ﷺ إلٰى صدري اوقالت إلىٰ حجري فدعا بطست ليبول فيه ثمّ بال فمات ﷺ(١).

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کواپنے سینے پر سہارادے رکھا تھا کہ آپ ﷺ نے ایک طست منگایا تا کہ اس میں پیشاب کریں پھر اس میں پیشاب کیااس کے بعد آپ ﷺ وفات پا ئے۔

---

(١)صحيح بخاري ٣٨٢/١ كتاب الوصايا باب الوصايا قول النبيّ وصية الرجل مكتوبة عنده، صحيح مسلم ٤٢/٢ كتاب الوصية باب ترك الوصية لمن ليس شئ يوصى به، سنن ابن ماجة ص١١٦ كتاب الجنائز باب ماجاء في ذكر مرض رسول الله ﷺ(مختار)

حالت نزع میں طہارت اور پردے کا اہتمام: فدعا بطست لیبول فیه (۱)، طست عجمی لفظ ہے۔عربی میں اس کا ہم معنی طسّ مستعمل ہے کھلے برتن کو کہتے ہیں لیکن چونکہ طست مؤنث ہے اس لئے لیبول فیہ کے ضمیر میں تاویل کی ضرورت پیش آ گئی۔چنانچہ ظرف یا مذکور کی تاویل سے اس کی طرف فیہ کا ضمیر راجع ہوگا۔

شدید بیماری اور انتہائی ضعف کے باوجود نبی اکرم ﷺ صفائی اور نظافت کا بہت زیادہ اہتمام فرماتے تھے۔حتیٰ کہ زندگی کے بالکل آخری لمحات میں جب آپ بستر سے اتر نہیں سکتے۔پھر بھی چلمچی جیسا کوئی برتن منگوایا اور پردہ کرا کر بول کیا۔

ملا علی قاریؒ نے فبال کا ترجمہ کیا ہے کہ ”ای فتخلیّ من الدنیا“ یعنی آپ ﷺ رب کے پاس حاضر ہونے سے قبل دنیا سے مکمل طور پر تجرد اختیار کرنا چاہتے تھے۔اسی لئے بول کیا تاکہ دنیا سے رہا سہا تعلق ختم ہو جائے۔

فمات اس کا یہ مطلب نہیں کہ نبی کریم ﷺ پیشاب کے فوراً بعد وفات پائے یہاں پر صرف آپ ﷺ کے ضعف کا بیان مقصود ہے۔اسی وجہ سے حالت وفات کے دیگر واقعات کا ذکر یہاں موجود نہیں ہے ورنہ اس کے بعد آپ ﷺ کا مسواک کرنا، اور پانی میں ہاتھ ڈال کر چہرے پر ملنا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے باتیں کرنا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا و آخرت میں تخییر اور ”فی الرفیق الاعلی“ کہہ کر وصال کا اختیار کرنا وغیرہ صحیح احادیث سے ثابت ہے۔

گود عائشہؓ کی یا علیؓ کی: البتہ یہاں ایک اشکال باقی رہتا ہے کہ امام حاکمؒ اور ابن سعدؒ نے کچھ روایات روایت کی ہیں کہ وفات کے وقت نبی اکرم ﷺ کا سر مبارک حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی گود میں تھا۔اس کے دو جواب منقول ہیں اول یہ کہ اس روایت کے جتنے بھی طُرق ہیں کوئی بھی ضعف وطعن سے خالی نہیں ہے اس لئے یہ روایت ان صحیح ترین روایات کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو تمام صحاح ستہ میں درجنوں طرق سے مروی ہیں اس لئے راجح یہی ہے کہ حضرت عائشہؓ کے سینے پر سر مبارک رکھ کر آپ ﷺ کا انتقال ہوا تھا۔

---

(۱) علامہ مناویؒ نے اس جملہ سے فقہی مسئلہ کا استنباط کیا ہے وفیہ حل الاستناد للزوجة والبول فی الطست بحضرتھا (مناوی علی ھامش جمع الوسائل ۲/ (مختار)

بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ممکن ہے کہ وفات سے کچھ دیر قبل حضرت علیؓ نے بھی آپ ﷺ کو سہارا دیا ہو اس کے بعد عین وفات کے وقت حضرت عائشہؓ نے سہارا دیا ہو لہذا دونوں روایات جمع ہو سکتی ہیں۔ بہر حال اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ کے ضعف کے ساتھ ساتھ حضرت عائشہؓ کے عظیم مرتبہ اور مناقب کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ اپنی آخری سانسوں میں آپؓ کی گود کا سہارا لئے ہوئے تھے۔ یہ اعزاز حضرت عائشہؓ کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہوا۔ بخاری شریف کی ایک روایت میں ان لمحات کا بہترین نقشہ موجود ہے(۱)۔

---

(۱)انّ عائشةؓ كانت تقول من نعم اللّٰه علىّ انّ رسول اللّٰه ﷺ توفىّ فى بيتى وفى يومى وبين سحرى ونحرى وانّ اللّٰه جمع بين ريقى وريقه عند موته دخل علىّ عبدالرحمٰن وبيده السواک وانا مسندة رسول اللّٰه ﷺ فرايته ينظر اليه وعرفت انّه يحبّ السواک فقلت آخذه لک؟ فاشار برأسه ان نعم فتناولته فاشتدّ عليه وقلت الينه لک فاشاربراسه ان نعم فليّنته فامّره. وبين يديه ركوة او علبة يشک عمر فيها ماء فجعل يدخل يديه فى الماء فيمسح بهما وجهه يقول لااله إلاّاللّٰه إنّ للموت سكرات ثم نصب يده فجعل يقول فى الرفيق الاعلىٰ حتّى قبض ومالت يده.(بخارى شريف ج۲ص ۶۴۰) (اصلاح الدين)

اور مشکوٰۃ کی روایت میں اور بھی عجیب اور عمدہ نقشہ کھینچا گیا ہے۔عن جعفر بن محمّد عن أبيه أنّ رجلاً من قريش دخل على أبيه على بن الحسين فقال الاأحدّثک عن رسول اللّٰه ﷺ قال بلىٰ حدّثنا عن ابى القاسم ﷺ قال لمّامرض رسول اللّٰه ﷺ اتاه جبرئيل فقال يا محّمد إنّ اللّٰه ارسلنى اليک تكريماً لک وتشريفاً لک خاصة لک يسألک عمّا هواعلم به منک يقول كيف نجدک قال اجدنى ياجبرئيل مغموماً أجدنى يا جبرئيل مكروباً ثمّ جاء اليوم الثانى فقال له ذلک فردّ عليه النبى ﷺ كما ردّ اوّل يوم ثمّ جاء ه اليوم الثالث فقال له كما قال اوّل يوم وردّ عليه كما ردّ عليه وجاء معه ملکٌ يقال له اسماعيل على مائة الف ملک كل ملک على مائة الف ملک فاستاذن عليه فساله عنه ثمّ قال جبرئيل هذاملک الموت يستاذن عليک مااستاذن على أدمى قبلک ولايستاذن على ادمى بعدک فقال ائذن له فاذن له فسلّم عليه ثمّ قال يا محمد انّ اللّٰه ارسلنى اليک فان امرتنى ان اقبض روحک قبضتُ وان امرتنى ان اتركه تركته فقال وتفعل ياملک الموت قال نعم بذلک امرت وامرت ان اطيعک قال فنظر النبىّ ﷺ إلىٰ جبرئيل (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(۳) حدّثنا قتیبة ثنا اللیث عن ابن الهاد عن موسی بن سرجسٍ عن القاسم بن محمد عن عائشة أنّها قالت رأیت رسول اللّٰه ﷺ وهو بالموت وعنده قدح فیه ماء وهو یدخل یده فی القدح ثمّ یمسح وجهه بالماء ثمّ یقول اللّٰهمّ اعنیّ علی منکرات الموت اوقال علی سکرات الموت(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا جب آپ ﷺ وفات فرمارہے تھے آپ ﷺ کے پاس ایک پیالہ تھا جس میں پانی تھا نبی اکرم ﷺ اس میں ہاتھ ڈالتے تھے اور (گیلا ہاتھ) منہ پر پھیرتے تھے۔ پھر یہ دعا فرماتے تھے کہ اے اللہ موت کی سختیوں پر میری مدد فرمائیے۔

عن القاسم بن محمّد الخ، یہ حضرت محمد بن ابی بکر کے بیٹے اور حضرت عائشہؓ کے بھتیجے ہیں۔

وهوبالموت، لفظ بالموت کا متعلق محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے وهو مشرف بالموت یعنی آپ ﷺ موت کے قریب تھے۔

ویمسح وجهه بالماء، بعض اوقات جب بخار انتہائی سخت ہوجاتا ہے تو تبرید ٹھنڈے تولیے اور کبھی برف کے ذریعے مریض کو آرام پہنچایا جاتا ہے۔ آج کل بھی بسا اوقات بخار کی حالت میں ڈاکٹر

(بقیه حاشیه ص۸)فقال جبرئیل یامحمّد انّ اللّٰه ﷺ قداشتاق إلی لقائک فقال النبی ﷺ لملک الموت امض لما امرت به فقبض روحه فلمّاتوفّی رسول اللّٰه ﷺ وجاء ت التعزیة سمعوا صوتاً من ناحیة البیت السلام علیکم اهل البیت ورحمة اللّٰه وبرکاته انّ فی اللّٰه عزآء من کل مصیبة وخلفاً من کل هالک ودرکاً من کلّ فائت فباللّٰه فاتّقوا وایّاه فارجوافانّماالمصاب من حرم الثواب فقال علیٌّ أتدرون من هذاهوألخضر علیه السلام رواه البیهقی فی دلائل النبوة (مشکوٰة ص ۵۴۹ باب وفاة النبی ﷺ)(مختار)

(۱)جامع ترمذی ۱۹۲/۱ کتاب الجنائز باب ماجاء فی التشدیدعندالموت، سنن ابن ماجة ص۱۱۶ کتاب الجنائز باب ماجاء فی ذکر مرض رسول اللّٰه ﷺ،مسنداحمد۶/۶۴ (مختار)

رکھواتے ہیں۔اس پرعمل کرتے ہیں۔اور خود نبی کریم ﷺ سے یہ مروی بھی ہے۔فرماتے ہیں

إنّ الحمّٰی من فیح جهنم فابر دوها بالماء (۱)، یعنی شدید بخار جہنم کے بھڑاس میں سے ہے اسے پانی سے ٹھنڈا کردیا کرو۔

نیز فرمایا **الحمّٰی فورمن النارفابر دوها بالماء**(۲)،

<u>نبی کریم ﷺ کے سکرات الموت:</u> **اللّٰهمّ اعنیّ علی منکرات الخ**، منکرات سے وہ نا آشنا اور غیر معروف حالات مراد ہیں۔جو موت کے وقت انسان کو پیش آتے ہیں۔پھر یہ احوال اوراہوال طبعی طور پر بوجھ اور ناپسندیدہ بھی ہوتے ہیں۔مزید براں اس سے قبل انسان کا اس سے واسطہ بھی نہیں پڑا ہوتا۔عموماً ایسی حالت میں آدمی غفلت کا شکار ہوجاتا ہے۔اور جزع وفزع میں آخرت اور رضائے الٰہی کو بھول جاتا ہے۔چنانچہ ایسے سخت ترین اور خطرناک حالت میں نبی کریم ﷺ نے ثبات اور صبر کی توفیق طلب کی۔تاکہ طبعی طور پر نامساعد حالات سے رضابالقضاء میں فرق نہ آئے اور شوق ملاقات مجروح نہ ہو چنانچہ استقامت کی دعا فرمائی۔کہ اے اللہ اس مرض میں مجھ سے خلاف ادب امور سرزدنہ ہوں اور موت کے وقت یکے بعد دیگرے جو بیہوشی ،غنودگی ،غفلت ،مدہوشی طاری ہوتا رہتا ہے۔اسے سکرات الموت کہتے ہیں اور یہی منکرات طبعی کی معلوم صورت بھی ہے۔اس لئے اکثر شراح نے منکرات اور سکرات کا مصداق ایک ہی بتایا ہے۔

<u>شدائد موت غیر مقبولیت کی علامت نہیں:</u> اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ موت کے وقت شدائد اور تکالیف سے دوچار ہونا مبغوضیت کی علامت نہیں ہمارے ہاں بسا اوقات اس شخص کو بدبخت اور گناہ گار تصور کیا جاتا ہے جس کے سکرات موت سخت اور طویل ہوں مگر یہ غلط ہے بلکہ درحقیقت سیأت وخطایا کم کرنے ،صالحات کی کمی پوری کرنے ،درجات کی بلندی اور مقامات عالیہ تک رسائی کی خاطر مقربین اور اولیاء اللہ پر یہ تکالیف اور شدائد زیادہ ہوتی ہیں گویا سکرات الموت کی شدت اللہ تعالیٰ کے دربار میں عدم

---

(۱) ترمذی ج۲ص۲۷

(۲) ایضاً

مقبولیت کی علامت نہیں اور سید المخلوقات رسول اللہ ﷺ کی نسبت اللہ تعالیٰ کو اور کون زیادہ محبوب ہو سکتا ہے۔ تو اس لطف و مہربانی کے زیادہ حقدار بھی وہی ہو سکتے تھے۔

<u>آپ ﷺ کا عالم نزع بھی امت کے لئے اسوۂ حسنہ:</u> مگر اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی رحلت کو اس معاملے میں بھی دنیا کے سامنے ایک قابل تقلید نمونہ بنایا۔ کہ شدائد موت میں آہ وفغاں کی بجائے صبر سے کام لینا چاہئے اور تجلّد و استقلال کا دامن مضبوطی سے تھام کر تسہیل و تخفیف کی دعا کرنی چاہئے۔ اور یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اچانک آنے والی موت سے پناہ مانگی ہے۔

چنانچہ عمرو بن العاصؓ کی روایت ہے کہ

إنّ رسول اللّٰہ ﷺ استعاذ من سبع موتاتٍ. موت الفجاء ۃ ومن لدغ الحیة ومن السبع ومن الحرق ومن الغرق ومن ان اخرّ علی شئی اویخرّ علیه شئی ومن القتل عند فرار الزحف،

ترجمہ: نبی کریم ﷺ نے سات موتوں سے پناہ مانگی، اچانک آنیوالی موت سے، سانپ کے ڈسنے سے، درندوں کی چیر پھاڑ سے، جلنے سے، ڈوبنے سے، کسی چیز پر گر کر مرنے سے یا کسی چیز کا اس پر گر جانے سے، اور جنگ سے بھاگتے ہوئے قتل ہونے سے۔

اور یہ اس لئے کہ عموماً ایسے حالات میں سوچنے، توبہ کرنے، اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑانے اور وصایا کرنے کا موقعہ نہیں ملتا۔

واضح رہے کہ بعض حضرات نے یہاں پر منکرات سے منکرات شرعی مراد لی ہیں یعنی شدائد موت کی وجہ سے آپ ﷺ نے منکر اور ناجائز امور کے ارتکاب سے بچنے کی دعا فرمائی۔ مگر اس ترجمہ پر علامہ ابن حجرؒ، ملا علی قاریؒ اور دیگر متعدد شراح نے رد کیا ہے۔

(۴) حدّثنا الحسن بن الصبّاح البزّار ثنا مبشر بن إسمٰعیل عن عبدالرحمٰن بن العلاء عن ابیه عن ابن عمر عن عائشة قالت لا اغبط

احدابھون موت بعد الذی رأیت من شدة موت رسول اللهﷺ (۱)

قال ابوعیسی سألت اباذرعة فقلت له من عبدالرحمٰن بن العلاء

هذاقال هو عبدالرحمٰن بن العلاء بن اللجلاج.

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں کسی بھی شخص پر اس کی موت کی آسانی پر رشک نہیں کرتی جب سے میں نے نبی کریم ﷺ کی موت کی شدت دیکھی ہے۔امام ترمذیؒ کہتے ہیں میں نے امام ابوزرعہ سے پوچھا کہ (اس سند میں) یہ عبدالرحمٰن بن العلاء کون ہیں۔انہوں نے بتایا کہ یہ عبدالرحمٰن بن العلاء بن اللجلاج ہیں۔

<u>موت کی آسانی قابل رشک نہیں:</u> قالت لااغبط احداً بھون الخ ،مطلب یہ ہے کہ اس سے قبل تو ہم سکرات موت میں تخفیف کی وجہ سے بعض لوگوں پر رشک کرتے تھے۔موت کی آسانی ایک نعمت معلوم ہوتی تھی اس لئے یہ تمنا ہوتی تھی کہ کاش فلاں شخص کی طرح آسان موت نصیب ہومگر نبی اکرم ﷺ کی موت کی سختی،شدائد وآلام نظر آئیں تو کسی کی مرض الموت میں تکلیف نہ ہونے پر رشک وغبطہ نامناسب معلوم ہونے لگا اور آسانی موت کی تمنا نہ رہی (۲)۔

اس حدیث میں بھی نبی اکرم ﷺ کی موت کی شدت کا بیان ہے۔لہٰذا موت کی تہوین وتخفیف کو کرامت سمجھنا خام خیال ہے کیونکہ شدائد گناہوں کی معافی اور رفع درجات کا سبب بن سکتے ہیں۔البتہ حضرت عائشہؓ نے یہ نہیں فرمایا کہ اب موت کی شدت کی تمنا کرتی ہوں۔کیونکہ جس طرح موت کی شدت ناپسندیدہ ہونے کی علامت نہیں۔اسی طرح اس کا ناپسندیدہ ہونا بھی حتمی نہیں ہے۔البتہ نبی اکرم ﷺ جیسے صاحب صبر وعزیمت کیلئے یہ نعمت ہی تھی۔

---

(۱)جامع ترمذی ۱/۱۹۲ کتاب الجنائز باب ماجاء فی التشدید عندالموت،السنن الکبریٰ للنسائی ۴/۲۶۰ کتاب الوفاة باب ذکر قولهﷺ حین شخص بصرة بأبی هو وامی، مسند احمد ۶/۶۴ (مختار)

(۲) شیخ عبدالجوادؒ الدومی نے لکھا ہے إنّ الشدة قد تکون تکفیراً لبعض السیّات وقدتکون لرفعة الدرجات (الاتحافات ۳۹۳) اور علامہ مناویؒ نے لکھا ہے والحاصل أنّ الشدة لیست امارة علی خیر ولا ضده والرفق لیست علامة علی سوء ولاضده (مناوی علی هامش جمع الوسائل ۲/۲۵۹) (مختار)

یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ یہ شدت اور پریشانی مقدمات موت کی وجہ سے ہے عین موت کی وجہ سے حضور ﷺ کو کوئی تکلیف و پریشانی نہ تھی بلکہ آپ ﷺ تو رفیق اعلیٰ کیلئے پہلے سے تڑپ رہے تھے۔ موت کے وقت بھی وصال کا تصور کر کے مسرت و بشاشت ظاہر ہو جاتی تھی۔

قال أبو عیسیٰ سألت أبازرعة الخ ، چونکہ عبدالرحمن بن العلاء متعدد ہیں۔اس لئے امام ترمذیؒ نے اس کے بارے میں امام ابوزرعہؒ سے پوچھا تو انہوں نے اس کی تعیین فرمائی۔ اور اسی تعیین کی غرض سے امام ترمذی یہ سوال و جوب نقل کر رہے ہیں۔

(۵) حدثنا ابو کریب محمّد بن العلاء ثنا أبومعاویة عن عبدالرحمٰن بن أبی بکرھوابن الملیکی عن ابن أبی ملیکة عن عائشة قالت لمّا قبض رسول اللّٰہ ﷺ اختلفوا فی دفنه فقال أبوبکر سمعت من رسول اللّٰہ ﷺ شیئاً مانسیته قال ما قبض اللّٰہ نبیّاًإلاّفی الموضع الّذی یحبّ ان یّدفن فیه ادفنوه فی موضع فراشه(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب نبی اکرم ﷺ وفات پائے۔تو صحابہ کرامؓ نے آپ ﷺ کے دفن کے بارے میں اختلاف کیا۔اس پر ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے ایک بات سنی تھی۔ جو میں ابھی تک نہیں بھولا۔ (وہ یہ کہ) آپ ﷺ نے فرمایا کہ کسی پیغمبر کی روح کو بھی اللہ تعالیٰ نے قبض نہیں کیا مگر ایسی جگہ پر جہاں اللہ تعالیٰ ان کے دفن کو پسند کرتے ہیں۔لہٰذا تم ان کو ان کے (وصال کے) بستر کی جگہ ہی دفن کردو۔

<u>ابوبکر صدیقؓ:</u> ابوبکر صدیقؓ کا اصلی نام عبداللہ تھا۔والد کا نام عثمان بن عامر تھا والدہ کا نام سلمی بنت صخر تھا۔قریش کے تیم بن مرۃ شاخ سے تعلق تھا۔والدین دونوں اسلام سے مشرف ہو چکے تھے۔ایک

---

(۱) مشکوٰۃ المصابیح ص۵۴۷ باب وفاۃ النبی ﷺ الفصل الثانی ،شرح السنة۴/۴۸باب فی مرضه ووفاته ﷺ کتاب الفضائل رقم الحدیث ۳۸۳۲(مختار)

روایت کے مطابق دونوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے میراث بھی پائی تھی۔گویا ان کی وفات آپ ﷺ کی وفات کے بعد ہوئی تھی۔عام الفیل کے ڈھائی سال بعد ابوبکر صدیقؓ کی ولادت ہوئی۔

بعثت نبوی ﷺ سے پہلے ہی نبی اکرم ﷺ سے دوستی کا تعلق تھا اور بعثت کے بعد سب سے پہلے آپؓ ہی ان پر ایمان لائے تھے۔اس زمانہ میں آپؓ ایک بہترین اور تجربہ کار تاجر تھے اور چالیس ہزار درہم کے کثیر سرمایہ کے مالک تھے لیکن وفات کے وقت آپؓ نے ایک درہم بھی میراث میں نہیں چھوڑا۔ مال کا اغلب حصہ اسلام کی خدمت میں صرف ہوا۔اسلام کے بعد نبی اکرم ﷺ کی صحبت وخدمت کا التزام کیا۔ شب وروز آپ ﷺ کی رفاقت کا شرف حاصل ہوا۔ مکہ مکرمہ میں، ہجرت میں، غارثور کی اقامت کے دوران، پھر تمام غزوات میں حتی کہ موت تک ساتھ رہے۔

اسلام لانے والے غلام باندیوں کو خرید خرید کر آزاد کرتے رہے جن میں حضرت بلالؓ، عامر بن فہیرہؓ، زنیرہؓ، نہدیہؓ اور ان کی بیٹی، بنی المؤمل کی کنیز اور ام عبیسؓ مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر نادار مسلمانوں کی معاونت بھی فرماتے رہے۔آپؓ کے مناقب اور خدمات کے احاطہ کیلئے کئی جلدیں بھی ناکافی ہیں ویسے آپ کی صحابیت منصوص ہے۔''اذھما فی الغار'' اور ''اذیقول لصاحبہ'' میں بالاتفاق آپؓ کا ذکر کیا گیا ہے۔اس لئے آپؓ کی صحابیت کے منکر کو کافر کہا گیا ہے(۱)، آپ کا لقب عتیق تھا۔ جو کہ والدین کی طرف سے اور ایک قول کے مطابق نبی اکرم ﷺ کی طرف سے دیا گیا تھا۔اس لقب کی متعدد وجوہ بیان کی جاتی ہیں مثلاً

۱) عتیق کا معنی جمیل ہے۔اور آپؓ کو ظاہری حسن کی وجہ سے عتیق کہا گیا تھا۔

۲) عتیق قدیم کے معنی میں ہے اور آپؓ قدیم فی الخیر تھے۔یعنی بھلائی میں سب سے آگے تھے۔

۳) عتیق نفیس چیز کو کہتے ہیں اور آپؓ بھی نسب کے لحاظ سے عیوب سے پاک تھے۔

۴) عتیق آزاد کو بھی کہتے ہیں اور چونکہ آپؓ کی والدہ کے ہاں اولاد زندہ نہیں بچتی تھی۔آپؓ کی ولادت کے بعد انہوں نے دعا کی ''اللّھمّ ھذا عتیقک من الموت'' اے اللہ یہ بچہ موت سے آزاد ہو۔

---

(۱) کما صرّح به القاری فی آخر هذاالباب، ۱۲ اصلاح الدین عفی عنه

مگراسلام کے بعد آپؓ کو نبی اکرم ﷺ کی طرف سے صدیق کالقب ملا۔ اورآپؓ کی کنیت ابوبکراورلقب صدیق آپؓ کے تمام ناموں پر غالب آ گئے۔

اپنے مناقب کی وجہ سے تمام صحابہ پر آپؓ کوتقدم حاصل تھا۔ چنانچہ غزوۂ تبوک میں اسلامی فوج کے علمبردار تھے۔ ۹ھ میں امیرحج مقرر ہوئے۔ اور نبی اکرم ﷺ نے اپنی زندگی میں امامتِ صغریٰ (نماز کی امامت) میں آپؓ کواپنانائب مقرر کردیا تھا۔ چنانچہ وفات نبوی ﷺ کے بعد باتفاق صحابہ آپ ﷺ کوامامۃ کبری خلافت نبوی ﷺ کیلئے منتخب کیا گیا۔

آپؓ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپ کوعرب کے انساب کاعلم پوری طرح حاصل تھا۔ بالخصوص قریش کے انساب اورمختلف قبیلوں کے خیروشر کی تاریخ ازبر تھی۔ بڑے بڑے نساب بھی اس سلسلے میں آپؓ کی طرف رجوع کرنے سے مستغنی نہیں تھے۔

روایت حدیث کے سلسلے میں آپؓ کے شاگردوں میں اکابر صحابہ اوراکابر تابعین کے نام آتے ہیں۔ خلفائے راشدین، عشرہ مبشرہ اوردیگر صحابہؓ آپؓ سے روایت کرتے ہیں۔

آپؓ کی وفات تریسٹھ برس کی عمر میں جمادی الاولیٰ ۱۳ھ میں ہوئی۔ ایک روایت کے مطابق حارث بن کلدہ رضی اللہ عنہ جوطبیب تھے۔ آپؓ کے ساتھ کھانے میں شریک ہوئے۔ حارث بن کلدہؓ نے جونہی کھانے سے ایک نوالہ لیاتو آپؓ کوکھانے سے منع کرتے ہوئے کہا کہ اے ابوبکرؓ! رکئے اس کھانے میں ایک سال مہلت دینے والا زہر ملا ہے۔ چنانچہ آپؓ اورحارث بن کلدہؓ دونوں کی موت ٹھیک ایک سال بعد ایک ہی دن واقع ہوئی۔ اس روایت کے مطابق آپؓ کی موت زہرخورانی سے ہوئی جیسے کہ نبی اکرم ﷺ کی وفات کا اصل سبب بھی زہرخورانی تھا۔ ایک گونہ شہادت کے اعزاز میں بھی اللہ نے آپؓ کو حضوراقدس ﷺ کے ساتھ شریک کیا۔

<u>تدفین میں اختلاف:</u> اختلفوا فی دفنہ الخ، یہ بات ذہن نشین رہے کہ صحابہ کرام عام اور معمولی باتوں میں اختلافات سے گریز کرتے تھے لیکن رحمۃ للعالمین ﷺ کی رحلت عام انسان کی موت نہ تھی نیز بنی اسرائیل میں انبیاء کثرت سے گزرے تھے۔ اور متعدد بارانہوں نے انبیاء کی تدفین اپنے

ہاتھوں سے کی تھی۔اس لئے ان کے ہاں یہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہوتا تھا۔لیکن نبی کریم ﷺ کی بعثت تو امیین میں ہوئی تھی اور انہوں نے نبی کی موت کے بارے میں سنا بھی نہ تھا وہ اس بات کا تصور بھی نہ کرسکتے تھے کہ ایسی مقدس ہستی پر خاک ڈال دیں وہ حیران تھے کہ نبی کیسے وفات پاتا ہے؟اور وفات کے بعد اس سے کیا رویہ برتا جاتا ہے؟اسے دفنایا بھی جاتا ہے یا نہیں؟اور ہے تو کہاں پر دفنایا جائے گا؟ان کا جنازہ بھی پڑھایا جائے گا یا نہیں؟جبکہ جنازہ پڑھانا بھی تو بڑے دل گردے کا کام ہے پھر جنازہ اجتماعی ہوگا یا انفرادی؟اس قسم کے دیگر سوالات کی وجہ سے وہ ششدر و پریشان تھے اور الجھنوں میں پڑے رہے۔

ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے صدیق الامت کے دل میں عزم واستقامت کا مادہ پیدا کردیا۔ امت کے اس مونس وغمخوار نے صحابہ کی تسلی اور پریشانی ختم کرنے کا کام اپنے ہاتھ میں لیا۔فقال ابوبکرؓ، جس طرح پہلے گزر چکا ہے کہ اختلاف کی متعدد جہتیں تھیں۔ یہاں صرف تدفین کے مقام پر اختلاف کا ذکر ہے آپ ﷺ کے مدفن کے بارے میں مختلف آراء سامنے آئیں۔کوئی جنت البقیع کا نام لیتا تھا،کوئی آپ ﷺ کے گھر کو ترجیح دیتا تھا،کوئی مسجد میں دفن کرنے پر مصر تھا،کسی کی رائے یہ تھی کہ آپ کو اپنے مولد یعنی مکہ مکرمہ میں مقام ابراہیم یا حطیم میں دفن کرنا چاہئے۔کوئی کہتا کہ چونکہ آپ ﷺ ملت ابراہیمی کے امام ومجدد ہیں۔اس لئے اپنے جدامجد کے پاس انہیں الخلیل میں دفن ہونا چاہئے۔ جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے علاوہ حضرت اسحٰق علیہ السلام،حضرت یوسف علیہ السلام اور دیگر جلیل القدر انبیاء مدفون ہیں۔ آج کل اس شہر کو حبرون بھی کہا جاتا ہے جو کہ بدقسمتی سے اسرائیل کے جدید مقبوضہ علاقوں میں شامل ہے۔ بعض دوسرے صحابہ کے خیال میں بیت المقدس لے جانا بہتر تھا(۱)۔

الغرض ہر کوئی اپنا خیال پیش کرتا۔ابوبکرؓ تک بات پہونچی تو آپ نے یہ گتھی سلجھادی اور اس سلسلے میں نبی کریم ﷺ کا فرمان پیش کردیا۔کہ نبی کو وہیں دفن کیا جاتا ہے جہاں ان کی موت واقع ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ اپنے مزاج اور عادت کی وجہ سے روایت کے سلسلے میں بہت محتاط تھے۔بلاضرورت روایت کرنے سے کتراتے تھے اور اس کا سبب بظاہر یہ تھا کہ آپؓ احادیث کی بہت

---

(۱)فقیل فی مسجده وقیل بالبقیع وقیل عند جده ابراهیم علیه السلام وقیل بمكة،(جمع الوسائل ج۲ ص ۲۶۱ (اصلاح الدین)

زیادہ تعظیم واحترام کرتے اور ادب ملحوظ رکھتے تھے۔ کہ کہیں بے احتیاطی نہ ہونے پائے۔ تاہم جب ضرورت پڑتی تو خاموش تماشائی بھی نہ بنتے تھے۔ خصوصاً امت کے درمیان نزاعی مسائل میں آپ ﷺ کی روایت فیصل اور حکم بنتی تھی۔ محدثین نے ایسی روایات کی نشاندہی کردی ہے۔ جن میں انتہائی ناگفتہ بہ حالات میں آپ کی رہنمائی نے امت محمدی کو سنبھالا دیا۔

<u>مدفن نبی کا انتخاب خدائی ہوتا ہے:</u> ماقبض اللّٰہ نبیّا الافی الموضع الخ ،یعنی پیغمبر کی روح اللہ تعالیٰ جس جگہ قبض فرماتے ہیں وہی جگہ تدفین کیلئے بھی منتخب فرما چکے ہوتے ہیں۔ گویا نبی کریم ﷺ نے خود ہی اس قول کے ذریعے فیصلہ دے دیا۔ کہ جس حجرہ میں ہیں وہیں دفن کردو۔ اتفاق سے وہ حجرہ سیدۃ عائشہؓ کا تھا اور سب نے اس حکم کے آگے سر تسلیم خم کردیا۔ کسی نے بھی لب کشائی نہ کی۔ یہ بھی نہ کہا کہ حضرت فاطمہؓ کا حجرہ قریب ہے یا حضرت علیؓ کے گھر دفن ہونا چاہئے نیز یہ بدگمانی بھی کسی نے نہیں کی کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی بیٹی کو یہ شرف دلوانے کیلئے کوئی بات بنائی ہوگی (والعیاذ باللہ) بعد کے معاندین اہل رفض نے ان ساری باتوں میں الزامات اور بدگمانیوں کا بازار گرم کیا۔ اس موقعہ پر اہل بیت، ازواج مطہراتؓ، حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور دیگر تمام صحابہؓ موجود تھے۔ لیکن سب نے اپنے رہبر ورہنما حضرت صدیق اکبرؓ کے قول پر شک تک بھی ظاہر نہیں کیا۔ اگر شیعہ موجود ہوتے تو یہ الزام اس وقت بھی لگاتے۔ کہ صدیقؓ نے یہ سب کچھ اقرباء پروری کیلئے کیا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہؓ کو دیگر تشریفات کے علاوہ اس شرف سے بھی مشرف فرمایا تھا۔ چنانچہ صحابہؓ میں سے کسی نے بھی اس پر انکار نہیں فرمایا۔

یہاں یہ بات بھی بخوبی واضح ہوگئی کہ نبی برحق کو اللہ تعالیٰ کبھی بھی غیر معزز مقام میں وفات نہیں ہونے دیتے ہاں جو جعلی اور بناوٹی نبی ہو اسے ٹٹی (بیت الخلاء) میں مرنا نصیب ہو تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ مرزا غلام احمد جیسے دجال کی تکذیب کیلئے یہ حدیث بھی کافی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کسی نبی کی روح اس جگہ لیتے ہیں۔ جس جگہ اسے دفن کرنا مقصود ہو۔ جب کہ اس کذاب کو ہم دیکھتے ہیں کہ اسے لاہور میں علاج کیلئے لایا گیا تو لاہوری مرزائیوں کی بلڈنگ میں اقامت کے دوران اسے سخت ہیضہ نے آلیا جب قضائے حاجت کیلئے گیا تو بیت الخلاء ہی میں جہنم واصل ہوا۔ چشم دید گواہوں کے مطابق غلاظت اس کے منہ پر بھی

لگی ہوئی تھی اگر وہ معاذ اللہ واقعی نبی ہوتا تو نبی کریم ﷺ کے اس قول کے مطابق تو اسے وہیں بیت الخلاء میں دفن کرنا تھا اور قادیان لیجانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

(۶) حدّثنا محمّد بن بشّار وعبّاس العنبری وسوار بن عبداللّٰہ وغیر واحد قالوا نا یحییٰ بن سعید عن سفیان الثوریّ عن موسیٰ بن أبی عائشة عن عبیداللّٰہ بن عبداللّٰہ عن ابن عبّاس وعائشة رضی اللّٰہ عنھم أنّ أبابکر قبّل النبیّ ﷺ بعدمامات(۱).

ترجمہ: حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ کو ان کی وفات کے بعد بوسہ دیا تھا۔

ابوبکر صدیقؓ کا بے پناہ صبر واستقامت: نبی کریم ﷺ کی رحلت کے وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ موجود نہیں تھے۔ اکثر تو مرض وفات میں آپؓ حاضر رہے۔ لیکن زراعت وغیرہ کی غرض سے انہیں دور جانا پڑتا۔ وفات سے کچھ قبل نبی کریم ﷺ کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی آپ اپنی زمین کے انتظام کی خاطر ایک میل دور مقام سُخ کی طرف چلے گئے تھے۔ ادھر نبی کریم ﷺ کی بیماری میں شدت پیدا ہوگئی دوپہر کے وقت جب حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنی مسجد میں بیٹھے تھے کہ حضرت سالمؓ نے یہ دلدوز خبر سنائی سب کچھ چھوڑ کر فوراً مسجد نبوی کا رخ کیا۔ وہاں صحابہ کی اشک بار آنکھیں آپ کی منتظر تھی۔

تمام صحابہ غم والم میں ڈوبے ہوئے تھے حضرت عمرؓ تلوار سونپتے ہوئے کھڑے تھے۔ اور کہہ رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ کی موت کے بارے میں جس نے لب کشائی کی اس کی گردن اڑادوں گا اس عظیم سانحہ نے صحابہ کے حواس کو معطل کر کے رکھ دیا تھا۔ حوصلہ اور استقامت صرف صدیقؓ کا کام ہوسکتا تھا۔ **قبّل النبیّ ﷺ بعد مامات الخ** (۲)، اگلی حدیث میں آئے گا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ آئے تو نبی کریم ﷺ

---

(۱) صحیح بخاری کتاب المغازی باب مرض النبیّ ﷺ، السنن الکبریٰ للنسائی ۴/۲۶۲ کتاب الوفاة الموضع الذی قبّل من رسول اللّٰہ ﷺ حین توفی، سنن ابن ماجة ص ۱۱۵ کتاب الجنائز باب ماجاء فی تقبیل المیت، مصنف ابن ابی شیبة ۳/۲۸۵ کتاب الجنائز (مختار)

(۲) علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے فتقبیل المیت سنة(المواھب الدنیة)(مختار)

پر صحابہ کا ہجوم تھا چھوٹا سا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا حضرت صدیقؓ کو دیکھتے ہی صحابہ نے راستہ بنا کر صاحب رسول اللہ ﷺ کو آخری دیدار کا موقعہ دیا۔ چنانچہ آپ حضور ﷺ کے پاس آئے۔ بے پناہ قوۃ برداشت، حوصلہ اور تحمل کے باوجود اس وقت عشق ووارفتگی سے بے قابو ہو کر پیشانی مبارک کو الوداعی بوسہ دیا اور وانبیّاہ، و اصفیاّہ و اخلیلاہ کے الفاظ منہ سے نکلے۔

ابوبکر صدیقؓ پر فراق نبوی ﷺ کا اثر: مورخین حیران ہیں کہ ابوبکرؓ بے پناہ عشق کے باوجود اتنا ضبط کیونکر کر سکے مگر حقیقت یہ ہے کہ آپؓ کا صبر صرف ظاہری تھا آپؓ کو اس جانکاہ صدمے سے اندر ہی اندر پگھلا کر رکھ دیا اور آپ اس سے جانبر نہ ہو سکے اور دوڑھائی سال بعد اپنے محبوب سے جا ملے چنانچہ موت کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ مات من کمدٍ لحقه، من هجر رسول الله ﷺ، یعنی آپؓ نبی اکرم ﷺ کی ہجر کے دکھ سے وفات پائے۔

نبی کریم ﷺ کے ساتھ محبت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ کہ جب نبی کریم ﷺ نے عین حیات میں ایک موقعہ پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا۔ إنّ عبداً خيّره الله بين ان يوتيه زهرة الدنيا ماشاء وبين ما عنده فبكىٰ ابوبكر (١)، ایک بندے کو اللہ تعالیٰ نے ان دو باتوں میں سے ایک اختیار کرنے کا کہا کہ یا تو وہ اس دنیا کی چمک دمک میں سے جو وہ چاہے دے دیگا یا پھر اسے وہ چیز دے دے گا جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

تمام صحابہ بیٹھے تھے اور اس قصہ کو ایک حکایت ہی سمجھ بیٹھے مگر صدیق پر نبی کا عکس پڑتا ہے وہ سمجھ گئے کہ نبی کریم ﷺ کسی دوسرے کی حکایت نہیں بلکہ اپنی بات کر رہے ہیں اس لئے آپ دھاڑیں مار کر رونے لگے اور کہا فدیناک بآباء نا و اُمهاتنا، ہمارے ماں باپ تجھ پر قربان ہوں۔ لوگوں نے کہا اس بوڑھے کو دیکھو کہ نبی کریم ﷺ کسی اور کی بات کرتے ہیں اور یہ رونے لگے۔ نبی کریم ﷺ سمجھ گئے کہ صدیق بات کی تہہ تک پہنچ گئے ہیں اس لئے فرمایا "على رسلک يا أبابكر" یعنی اے ابوبکر حوصلہ

---

(١) صحيح بخاری كتاب المناقب باب هجرة النبی ﷺ وأصحابه إلىٰ المدنية، جامع ترمذی ٢/٢٨٥ مناقب ابی بکرؓ و صحيح مسلم ٢/٢٧٣ كتاب الفضائل، باب مناقب ابی بکرؓ من مناقب ابی بکر رضی الله عنه (مختار)

رکھو، سنبھلو۔اور پھر فرمایالو کنت متخذاً خلیلاً لاتّخذت ابابکر خلیلاً الاو انّ صاحبکم خلیل اللّٰہ(۱)

ترجمہ: اگر میں کسی کو دوست چنتا تو ابو بکرؓ ہی ہوتا مگر تمہارا نبی اللہ کا دوست ہے۔

مقام صدیق:

اس والہانہ عشق ومحبت کے باوجود کہ وفات النبی ﷺ کے تصور سے بھی پھوٹ کر رونے لگے۔یہاں اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو قوت برداشت اور صبر وتحمل کا مظہر بنادیا۔تا کہ دکھی لوگوں کو ایک دلاسہ دینے والا مونس وغم خوار مل جائے اور بلاشبہ نیابت رسالت کا منصب ایسے شخص کے شایان شان ہے جس کے بارے میں خود نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے ہر شخص کے احسانات کا بدلہ دے دیا ہے صرف ابوبکر کے احسانات کا بدلہ میں نے آخرت کیلئے مؤخر کر دیا ہے۔

اقبال اپنے الہامی کلام میں نبی کریم ﷺ کے نزدیک صدیقؓ کے مرتبے کی یوں تصویر کشی کرتے ہیں ؎

آن کلیم اوّل سینائے ما آن امنّ الناس برمولائے ما

اور حضرت حسان بن ثابتؓ شاعر رسول اللہ ﷺ نے ایک موقعہ پر ابوبکر کی شان میں کیا عجیب مدحیہ اشعار کہے۔فرماتے ہیں کہ

خیر البریة اتقاهاو اعدلها بعدالنبیّ و اوفاها بما حملا

وثانی اثنین فی الغار المنیف وقل طاف العدویه اذ صعد الجبلا

وکان حِبُّ رسول اللّٰہ قدعلموا من البریة لم یعدل به رجلا

بہرحال صدیقؓ نے نبی کریم ﷺ کو الوداعی بوسہ دیا اور اس میں حضور ﷺ کی اقتداء اور تیمن و تبرک کو بھی ملحوظ رکھا۔خود نبی کریم ﷺ سے یہ سنت ثابت ہے۔چنانچہ حضرت عثمان بن مظعونؓ جب وفات پائے تو نبی کریم ﷺ نے ان کی پیشانی کو بوسہ دیا تھا۔

(۷) حدّثنا نصر بن علی الجهضمیّ ثنامرحوم بن عبدالعزیز العطّار عن أبی عمران الجونیّ عن یزید ابن بابنوس عن عائشة أنّ ابابکر

(۱) صحیح مسلم

رضی اللّٰہ عنھما دخل علی النبیّﷺ بعد وفاته فوضع فمه فاه بین عینیه ووضع یدیه علی ساعدیه وقال وانبیّاہ واصفیّاہ واخلیلاہ(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ آپﷺ کی وفات کے بعد حجرہ کے اندر تشریف لائے تو اپنا منہ نبی اکرمﷺ کی آنکھوں کے درمیان رکھا اور اپنے ہاتھ نبی اکرمﷺ کے بازوں پر رکھ کر کہا "ہائے نبی، ہائے اللہ کے برگزیدہ، ہائے میرے ساتھی، ہائے میرے دوست"

فوضع فمه بین عینیه الخ، یعنی آپﷺ کی پیشانی کو چوما اور ساتھ ساتھ "**وانبیّاہ واصفیّاہ** اور **واخلیلاہ**(۲)" پکار کر فراق کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ لیکن آپؓ کی یہ پکار نوحہ کے طور پر نہیں تھی۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ حقیقی صفات کا لحاظ کر کے میت کو "وا" اور "یا" سے پکارنا جائز ہے۔ مسند احمد کی روایت میں ہے کہ آپؓ رسول اللہﷺ کے سر کی جانب تشریف لائے۔ اور جھک کر پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا "**وانبیاہ**" پھر دوبارہ منہ جھکا کر پیشانی کو بوسہ دیا اور "**واخلیلاہ**" کہا(۳)، مزید تفصیل گزشتہ حدیث کے ضمن میں گزر چکی ہے۔

(۸) حدّثنا بشر بن ھلال الصوّاف البصریّ ثنا جعفر بن سلیمان عن ثابت عن انس قال لمّا کان الیوم الذی دخل فیه رسول اللّٰہﷺ المدینة اضاء منھا کلّ شئی فلمّا کان الیوم الذی مات فیه أظلم منھا

---

(۱) تفرد الامام الترمذی بھذا الحدیث

(۲) علامہ بیجوریؒ حدیث بالا سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے وھذا یدل علی جواز عدّ اوصاف المیت بلانوع بن ینبغی ان یندب لانّه من سنة الخلفاء الراشدین والأئمة المھتدین وقد صار ذلک عادة فی رثاء العلماء بحضور المحافل العظیمة والمجالس الفخیمة (المواھب الدنیة)(مختار)

(۳) بلکہ مسند احمد کی روایت میں تین بار بوسہ دینے کا ذکر ہے۔ پہلی بار "وانبیّاہ" دوسری بار "واصفیّاہ" اور تیسری بار "واخلیلاہ" کے الفاظ ادا فرمائے۔ لیراجع مسند احمد کتاب باقی مسند الأنصار باب باقی المسند السابق حدیث نمبر ۲۳۶۵۸، ۱۲، (مختار)

کل شئی ومانفضناایدینا عن التّراب وإنّا لفی دفنه ﷺ حتی انکرنا قلوبنا(۱)۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جس دن نبی کریم ﷺ مدینہ میں تشریف لائے (اس روز سے) مدینہ کی ہر چیز روشن ہوگئی۔ پھر جب وہ دن آیا جس میں آپ ﷺ نے وفات پائی تو ہر چیز پر اندھیرا چھا گیا اور ہم نبی اکرم ﷺ کی تدفین میں مصروف تھے ابھی ہاتھ بھی (قبر کی) مٹی سے جھاڑنے نہیں پائے تھے۔ کہ ہم نے اپنے دلوں کو اوپرا پایا۔

اضاء منها کل شئی الخ، یہاں پرانوار اور ظلمات کی تعیین میں شراح کا اختلاف ہے۔ علامہ ابن حجر، علامہ مناوی اور بعض دیگر شراح کا خیال ہے۔ کہ ظاہری نور اور ظلمت جو آنکھوں سے محسوس ہوتی ہوں مراد ہیں۔ گویا یہاں نبی اکرم ﷺ کے ایک معجزہ کا بیان ہے۔ کہ قدوم نبوی سے مدینہ میں انوار اور رحلت سے اندھیرے محسوس ہونے لگے۔ جیسا کہ قرآن کی آیت ''**فقدجاء کم من اللّٰہ نورو کتاب مبین**'' میں صراحۃً آپ ﷺ کو نور کہا گیا ہے لیکن ملا علی قاریؒ اور بعض دیگر شراح نے نور و ظلمت سے معنوی نور وظلمت مراد لی ہیں مابعد کا کلام اس کیلئے مؤید ہے کیونکہ بعد میں دلوں کا تغیر بیان ہے تو معنوی ظلمت ہی ہے ظاہری نور وظلمت دلوں میں تو نہیں ہوتی۔ چنانچہ نور اس مقام پر ہدایت سے یا خوشی ومسرت سے یا دنیا وآخرت کی صلاح سے کنایہ ہوگا۔ اور ظلمت سے اس کا بالعکس معنی مراد ہوگا۔

<u>نبی کریم ﷺ کی تدفین سے انوار میں کمی:</u> نبی کریم ﷺ جس دن مدینہ طیبہ تشریف لائے تھے۔ تو سارا شہر ظاہری وباطنی خوشیوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ انوار کی بارش سے یہ چیز ہر ایک کو محسوس ہو رہی تھی۔ نبی کریم ﷺ کی آمد سے مدینہ ہی کیا؟ سارا عالم منور ہوگیا۔ اس وقت مدینہ کے چھوٹے بڑے سب مسرور تھے بچے خوشی میں دف بجا بجا کر گاتے

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع وجب الشکر علینا مادعااللّٰہ داع

(۱) سنن ابن ماجة ص۱۱۷ کتاب الجنائز باب ذکر وفاته ودفنه ﷺ شرح السنة للبغوی ۱۴/۵۰ باب فی مرضه ووفاته ﷺ کتاب الفضائل رقم الحدیث ۳۸۳۴ (مختار)

اس سے قبل مدینہ کے لوگ دس پندرہ روز تک انتظار کی شدید کیفیتوں سے دوچار رہے تھے۔ چھوٹے بڑے سب ثنیۃ الوداع میں جمع ہوکر نبی کریم ﷺ کا انتظار کرتے۔ اور حضور ﷺ کو نہ دیکھتے تو واپس جا کر دوسرے دن استقبال کیلئے نکلتے۔ جس روز آپ ﷺ مدینہ پہنچے تو مدینہ میں عید کی سی خوشی منائی گئی۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے قدوم سے سارا مدینہ منور ہوگیا۔ ہر چیز روشن ہوگئی۔ پھر جب دس سال بعد وہ مبارک ومقدس ہستی رخصت ہونے لگی۔ تو ہم لوگ وصال کے بعد تدفین سے فارغ ہوکر ابھی ہاتھ سے مٹی جھاڑنے بھی نہ پائے تھے۔ کہ ہم نے دلوں کو بدلا ہوا پایا۔ ہر چیز اوپری سی لگ رہی تھی۔ یہاں تک کہ ہم نے اپنے دلوں کی کیفیت بھی متغیر محسوس کی۔ جیسے سورج کے ڈوبتے ہی ظلمتوں کا بحر محیط اُمڈ آتا ہے اور ساری کائنات اوپری سی لگتی ہے یونہی نبی کریم ﷺ کی موجودگی کے سبب جو انوار واثرات اور وحی کی برکتیں تھی۔ صاحب وحی کے اٹھتے ہی کم ہوگئیں۔ حتی انکرنا قلوبنا الخ، قلوب میں بھی وہ صفائی لطافت، طراوت وحلاوت، اور صحبت نبی کی برکت سے پیدا ہونے والی نورانیت نہ رہی جو اس سے قبل تھی۔ مگر انکار قلوب سے مراد تصدیق وایمان میں کمی مراد نہیں ہے ظاہر ہے کہ نبی کریم ﷺ کی صحبت کی وجہ سے جو مشاہدات اور طمانیت حاصل تھی وہ ادھوری ہوگئی۔ بلکہ آپ ﷺ کے بعد ہر لحظہ خیر میں کمی اور شر میں اضافہ ہوتا جاتا ہے یہی اثر نبی کریم ﷺ کی موت کے قریب ترین لمحات میں بھی رہا۔ جسے صحابہؓ کی حساس نظروں نے تاڑ لیا۔ پھر خیر القرون کے بعد تو ہر گزشتہ کل آج سے بہتر ہونے کا ثبوت ملتا رہتا ہے۔ ایک حکایت کے مطابق ایک صوفی شخص نے دکان کھولی جس میں تازہ روٹی ایک روپیہ اور باسی روٹی دو روپے میں بکتی تھی۔ مگر لوگ تازہ روٹی چھوڑ کر سوکھی روٹی خریدتے تھے۔ کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ کے زمانے کے کچھ قریب پکی ہوتی تھی۔

(۹) حدّثنا محمّد بن حاتم ثنا عامر بن صالح عن هشام بن عروة عن أبيه عن عائشة قالت توفيّ رسول الله ﷺ يوم الاثنين(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ سوموار کے دن وفات پائے۔

(۱)صحیح بخاری ۱۸۶ کتاب الجنائز باب موت یوم الاثنین، مصنف عبدالرزاق(مختار)

توفی رسول اللہ ﷺ یوم الاثنین الخ، نبی کریم ﷺ کا وصال پیر کے روز ہوا تھا یہ مسئلہ اجماعی ہے۔ کسی مورخ نے بھی اس میں اختلاف نہیں کیا۔ جس کی تفصیل ابتدائے باب میں گزر چکی ہے۔

(۱۰) حدّثنا محمّد بن أبی عمر ثنا سفیان بن عیینة عن جعفر بن محمّد عن ابیه قال قبض رسول اللّٰه ﷺ یوم الاثنین فمکث ذلک الیوم ولیلة الثّلثاء ودفن من اللّیل وقال سفیان وقال غیره یسمع صوت المساحی من اٰخر الیل(۱)۔

ترجمہ: محمد بن علی بن الحسینؒ (امام باقرؒ) سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ پیر کے روز وفات پائے اس روز اور منگل کے رات کو یونہی (بغیر دفن کے) رہے۔ اور (اگلی رات) یعنی بدھ کی رات کو دفن کئے گئے۔ حضرت سفیان کہتے ہیں کہ دوسرے راوی کہتے ہیں کہ رات کے آخری حصے میں پھاوڑوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔

محمّد بن علیّ بن الحسین، حدیث کے راوی حضرت حسین بن علیؓ کے پوتے ہیں۔ جو امام باقرؒ کے نام سے مشہور ہیں۔ تابعی ہیں۔ ۱۴۸ھ میں وفات پائی۔ بعض روایات کے مطابق انہیں زہر دے کر شہید کردیا گیا تھا۔ جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

فمکث ذالک الیوم، نبی اکرم ﷺ کا انتقال پیر کے روز ہوا۔ لیکن تدفین فوری طور پر نہ ہوسکی بلکہ منگل کی رات اور منگل کا دن بھی گزر گیا اور بدھ کی رات کو کہیں تدفین مکمل ہوسکی۔ لہٰذا **دفن من الیل**، اللیل سے معہود رات "لیلة الاربعاء" یعنی بدھ کی رات مراد ہے۔ گویا اس مقام میں اختصاراً "یوم الثلاثاء" یعنی منگل کی دن مذکور نہیں۔ حالانکہ وہ دن بھی بغیر تدفین کے گزر چکا تھا۔

<u>تدفین میں تاخیر کا سبب:</u> سنت اور افضل یہ ہے کہ میت کو جلدی دفن کردیا جائے۔ لیکن خاص حالات اس سے مستثنیٰ ہیں نبی کریم ﷺ کی تدفین بھی کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ بلکہ وہ حالات کچھ ایسے تھے کہ ہر ہر

---

(۱) تفرد الامام الترمذی بهذا الحدیث (مختار)

بات نئی ہونے کی وجہ سے جھگڑا پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔اس لئے غور وفکر اور مشوروں کی ضرورت تھی۔

ادھر نبی کریم ﷺ کے کفن ودفن کے احکامات بھی ہر کسی کو معلوم نہ تھے اور ان معاملات کو حضور ﷺ کی تدفین سے قبل ہی طے کرانا ناگزیر تھا۔تاکہ تجہیز وتدفین میں وحدت واجتماعیت برقرار رہے۔اور تمام صحابہ اس میں شریک ہوں۔

پھر بدقسمتی سے خلافت کے مسئلہ میں ابتداءً اختلاف پیدا ہوا جس کی اہمیت کا احساس صدیق اکبرؓ جیسے نباض امت اور عمر فاروقؓ جیسے صاحب فراست وسیاست ہی کو ہوسکتا تھا چنانچہ اس کٹھن مرحلہ میں امت کو افتراق اور تشتت وانتشار سے بچانے کیلئے ابوبکر صدیقؓ اور دیگر صحابہ نے پہلے اس کی طرف توجہ دینا ضروری سمجھا۔کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ اختلاف قیامت تک امت کیلئے دردسر بنا رہے گا۔

نبی کریم ﷺ کی رحلت کے فوراً بعد صحابہؓ میں خلیفۃ الرسول کے بارے میں مشورے ہوئے انصار نے سقیفہ بنوساعدہ میں جمع ہوکر یہ مسئلہ چھیڑ دیا ابوبکر صدیقؓ اور عمرؓ کو اس کے بارے میں پتہ چلا اور محسوس کیا کہ اگر انصار اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے تو وحدت واجتماعیت اور یکجہتی ختم ہوکر امت کا شیرازہ بکھر جائے گا چنانچہ وہ بھی اس مسئلہ سے نمٹنے کیلئے سقیفہ بنوساعدہ چلے گئے۔اسی دوران انصار میں سے حضرت حباب بن منذرؓ نے "منا امیر ومنکم امیر" کا نعرہ لگا کر "ادھر ہم ادھر تم" کا نظریہ پیش کردیا۔مگر صدیقؓ کی فراست نے امت کی وحدت کی لاج رکھ لی۔ چنانچہ آپؓ نے انصار کو ایک مؤثر تقریر کے ذریعے سمجھایا جس پر انصار کے مجمع نے لبیک کہا۔حضرت عمرؓ نے وہیں آپؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور پھر دوسرے روز مسجد نبوی ﷺ میں عمومی بیعت کے ذریعے تمام لوگوں نے صدیق اکبرؓ کو خلافت کا فریضہ سونپ دیا۔اس کے بعد ہی تدفین کی طرف توجہ دینے کا موقعہ ملا۔جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ تدفین میں دیر ہوگئی۔

تاخیر کا ایک سبب اور بھی تھا کہ نماز جنازہ اجتماعی طور پر نہیں ہوا تھا۔بلکہ صحابہؓ ٹولیوں کی صورت میں حجرہ میں جاتے اور نماز پڑھتے۔اور حجرہ بھی وہ حجرہ جس میں نبی کریم ﷺ تہجد پڑھتے تو حضرت عائشہؓ کے سونے کیلئے جگہ نہ ہوتی تھی حضور ﷺ سجدے میں جاتے تو حضرت عائشہؓ پاؤں سمیٹ لیتی تھیں تب حضور ﷺ کے سجدے کیلئے جگہ بنتی تھی تو ایسے حجرے میں بیک وقت زیادہ سے زیادہ تین چار آدمی ہی نماز

پڑھ سکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ہزاروں عشاق کے نماز پڑھنے پر بہت دیر لگی ہوگی۔

یسمع صوت المساحی الخ، مساحی مسحاۃ کی جمع ہے۔ یہ میم زائدہ کے ساتھ اسم آلہ ہے جس کا معنی کشف ہوتا ہے۔ پھاوڑے کو کہتے ہیں اور چونکہ رات کا آخری حصہ سکوت اور خاموشی کا وقت ہوتا ہے۔ اس وجہ سے یہ آواز دور سے بھی صاف سنائی دیتی تھی۔ اس دوسری روایت میں یہ تصریح ہے کہ تدفین رات کے آخری حصے تک جاری رہی۔ گویا حضرت سفیانؒ امام باقرؒ کی روایت کی تشریح کرتے ہیں کہ رات سے مراد رات کا آخری حصہ ہے۔

(۱۱) حدّثنا قتیبة بن سعید ثنا عبدالعزیز بن محمّد عن شریک ابن عبداللّٰہ بن أبی نمر عن أبی سلمة بن عبدالرحمٰن بن عوف قال توفیّ رسول اللّٰہ ﷺ یوم الاثنین ودفن یوم الثلثاء (۱) قال ابوعیسیٰ ھذاحدیث غریب.

ترجمہ: حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ پیر کے دن وفات پائے اور منگل کو آپ ﷺ کی تدفین ہوئی۔

<u>ابوسلمۃ</u>: ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن، حضرت ابوسلمہ مدنی تابعی ہیں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں <u>۲۰ھ</u> کے بعد ولادت ہوئی ان کا نام عبداللہ اور ایک قول کے مطابق اسماعیل تھا مکثر فی الحدیث ہیں <u>۹۴ھ</u> اور ایک قول کے مطابق <u>۱۰۴ھ</u> میں وفات پائی۔

ودفن یوم الثلاثاء الخ، دراصل منگل اور بدھ کی درمیانی شب کو حضور ﷺ کی تدفین ہوئی تھی جس کو مجازاً یوم الثلاثاء یعنی منگل کا دن بھی کہا جاسکتا ہے اور یوم الاربعاء بھی۔ یا یوں کہئے کہ منگل کی شام کو تدفین کا کام وغیرہ امور کو شروع کیا گیا اور رات کے آخری حصہ تک تکمیل ہوئی یوں تدفین کی نسبت منگل کے روز کو ہوگئی۔ جبکہ بعض شراح نے یہ کہا ہے کہ شریک بن عبداللہ نے خطأً اس دن کا ذکر کیا ہے خود امام ترمذیؒ نے بھی اس حدیث کو غریب کہا ہے۔

---

(۱) تفرد لامام الترمذی بھذا الحدیث (مختار)

(۱۲) حدّثنا نصربن علی الجھضمیّ انا عبداللّٰہ بن داؤد قال ثنا سلمۃ بن نبیط أخبرنا عن نعیم بن أبی ھند عن نبیط بن شریط عن سالم بن عبید وکانت لہ صحبۃ قال اغمی علی رسول اللّٰہﷺ فی مرضہ فافاق فقال حضرت الصلوۃ فقالوا نعم فقال مروا ابلالا فلیؤذّن ومروا أبابکر فلیصلّ للنّاس اوقال بالنّاس ثم اغمی علیہ فافاق فقال حضرت الصلوۃ قالوا نعم فقال مروا ابلالا فلیؤذّن ومروا أبابکر فلیصلّ بالنّاس فقالت عائشۃ إنّ ابی رجل اسیف اذا قام ذلک المقام بکیٰ فلایستطیع فلوامرت غیرہ قال ثمّ اغمی علیہ فافاق فقال مروا ابلالا فلیؤذّن ومروا أبابکر فلیصلّ بالناس فانّ کنّ صواحب اوصواحبات یوسف قال فامربلال فاذّن وامرابوبکرفصلّیٰ بالنّاس ثمّ انّ رسول اللّٰہﷺ وجدخفّۃ فقال انظروإلی من اتّکئی علیہ فجاء ت بریرۃ ورجل اخر فاتّکأ علیھما فلمّاراہ أبوبکرذھب لینکص فاومأالیہ ان یثبت مکانہ حتّٰی قضیٰ أبوبکر صلوتہ ثمّ أنّ رسول اللّٰہﷺ قبض فقال عمرواللّٰہ لااسمع احدایذکرأنّ رسول اللّٰہﷺ قبض إلاّضربتہ بسیفی ھذا قال وکان النّاس امیین لم یکن فیھم نبیّ قبلہ فامسک النّاس قالوا یاسالم انطلق إلیٰ صاحب رسول اللّٰہ ﷺفادعہ فاتیت أبابکر وھو فی المسجد فاتیتہ ابکی دھشًافلمّا رانی قال لی أقبض رسول اللّٰہﷺ قلت أنّ عمر یقول لا اسمع احدًایذکرأنّ رسول اللّٰہﷺ قبض إلاّضربتہ بسیفی ھذا فقال لی انطلق فانطلقت معہ فجاء ھو والنّاس قددخلوا علی رسول اللّٰہﷺ فقال یا ایّھاالنّاس افرجوا لی فافرجوالہ فجاء حتی اکبّ علیہ ومسّہ فقال إنّک میت

وإنّھم میتون ثمّ قالوا یا صاحب رسول اللّٰہ ﷺ أقبض رسول اللّٰہ ﷺ قال نعم فعلموا انّہ قدصدق قالوا یاصاحب رسول اللّٰہ ﷺ أنصلی علی رسول اللّٰہ ﷺ قال نعم قالوا وکیف قال یدخل قوم فیکبّرون ویدعون ویصلّون ثمّ یخرجون ثمّ یدخل قوم فیکبّرون ویصلّون ویدعون ثمّ یخرجون حتیّ یدخل الناس قالوا یاصاحب رسول اللّٰہ ﷺ أیدفن رسول اللّٰہ ﷺ قال نعم قالوا این قال فی المکان الذی قبض اللّٰہ فیہ روحہ فإنّ اللّٰہ لم یقبض روحہ إلاّفی مکان طیب فعلموا أنّہ قدصدق ثمّ امرھم ان یغسلہ بنوابیہ واجتمع المھاجرون یتشاورون فقالوا انطلق بنا اخواننا من الانصار ندخلھم معنا فی ھذا الامر فقالت الانصار منّا امیر ومنکم امیرفقال عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنہ من لہ مثل ھذہ الثّلٰث ثانی اثنین اذھما فی الغار اذ یقول لصاحبہ لاتحزن إنّ اللّٰہ معنا من ھما قال ثمّ بسط یدہ فبایعہ وبایعہ النّاس بیعۃً حسنۃً جمیلۃً(۱)۔

حدیث سالم میں تفصیلات:

ترجمہ: حضرت سالم بن عبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جو صحابی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ پر مرض وفات میں غشی طاری ہوئی۔ پھر افاقہ ہوا تو پوچھا کہ کیا نماز کا وقت ہو چکا ہے صحابہ کرامؓ نے کہا کہ ہاں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ بلالؓ سے کہو کہ وہ اذان دیں اور ابو بکرؓ سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ پھر آپ ﷺ بیہوش ہو گئے۔ پھر ہوش آیا۔ تو دریافت کیا کہ کیا نماز کا وقت ہو چکا ہے لوگوں نے کہا کہ

(۱)سنن ابن ماجۃ ص۸۶ کتاب اقامۃ الصلوٰۃ والسنۃ فیھا باب ماجاء فی صلوٰۃ رسول اللّٰہ ﷺ فی مرضہ، السنن الکبریٰ للنسائی ۲۶۴/۴ کتاب الوفاۃ ذکر کفن النبی ﷺ وفی کم کفن(مختار)

ہاں۔ پھر فرمایا کہ بلالؓ سے کہو کہ وہ آذان دیں اور ابوبکر صدیقؓ سے کہو کہ وہ نماز پڑھائیں۔(کئی بار ایسا ہوا تو) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ (میرے والد) ابوبکر رضی اللہ عنہ غم سے نڈھال ہونے والے (نرم دل) انسان ہیں۔ جب اس جگہ (جہاں آپ کھڑے ہوئے تھے) کھڑے ہونگے۔ تو رونے لگیں گے اور نماز پڑھانے کی استطاعت نہیں ہوگی۔ لہٰذا اگر آپ ﷺ کسی اور (مثلاً حضرت عمرؓ) کو (نماز پڑھانے کا) حکم دیں تو بہتر ہوگا۔ پھر آپ ﷺ پر غشی طاری ہوگئی پھر ہوش آیا تو فرمایا کہ بلالؓ سے کہو کہ وہ آذان دیں اور ابوبکر صدیقؓ سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ تم تو یوسف علیہ السلام کے قصے (میں مذکور مصر) کی عورتوں جیسی ہو۔ حضرت سالمؓ کہتے ہیں کہ پھر بلالؓ کو حکم دیا گیا کہ تو انہوں نے آذان دی اور ابوبکر صدیقؓ کو حکم دیا گیا تو انہوں نے (جمعہ کی رات کو عشاء کی) نماز پڑھائی۔ (اسی طرح سترہ نمازیں آپؓ نے پڑھائیں) پھر آپ ﷺ کی حالت (پیر کی صبح کو قدرے) سنبھل گئی۔ تو حکم دیا کہ دیکھو کوئی مجھے سہارا دینے والا ہو تو حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا اور ایک اور شخص آیا آپ ﷺ ان کا سہارا لے کر (باہر آئے) جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو دیکھا تو پیچھے ہٹنے لگے۔ تو نبی اکرم ﷺ نے اشارہ فرمایا۔ کہ اپنی جگہ کھڑے رہو۔ یہاں تک کہ ابوبکر صدیقؓ نے نماز پوری فرمائی۔ پھر نبی اکرم ﷺ (پیر کے دن ہی) وفات پائے تو حضرت عمرؓ نے (تلوار نکال کر) کہا کہ خدا کی قسم جس کسی کو بھی یہ کہتے ہوئے میں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ وفات پائے ہیں میں اس تلوار سے اس کا کام تمام کردوں گا۔ حضرت سالمؓ کہتے ہیں کہ عرب کے لوگ ناخواندہ تھے نبی اکرم ﷺ سے پہلے ان کے ہاں نبی نہیں آیا تھا (اس لئے وہ بھی وفات نبی میں متردد ہوئے۔ لوگ نبی اکرم ﷺ کو وفات شدہ کہنے سے رک گئے۔ (البتہ مجھے) انہوں نے حکم دیا کہ اے سالم رسول اللہ ﷺ کے ساتھی کے پاس

جاؤ ان کو بلاؤ، میں ابوبکر صدیقؓ کے پاس آیا وہ اس وقت مسجد میں تھے میں وحشت کے مارے روتا ہوا ان سے ملا جب انہوں نے مجھے (روتا ہوا) دیکھا تو پوچھا کہ کیا رسول اللہ ﷺ وفات پا چکے؟ میں نے کہا کہ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ جس کسی کو بھی یہ کہتے ہوئے میں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ وفات پائے ہیں میں اس تلوار سے اس کا کام تمام کردوں گا۔ ابوبکر صدیقؓ نے مجھے حکم دیا کہ آؤ میں ان کے ساتھ گیا آپؓ آئے اس حال میں کہ دوسرے (کچھ) لوگ بھی نبی اکرم ﷺ کے ہاں آچکے تھے آپؓ نے لوگوں سے کہا کہ اے لوگوں میرے لئے جگہ بناؤ (لوگ ہٹے) تو آپؓ آئے نبی اکرم ﷺ پر جھک گئے ان کو ہاتھ لگا کر (بوسہ دے کر) یہ آیت پڑھی "انک میّت وانھم میّتون" (اے نبی ﷺ تم بھی وفات پانے والے ہو اور وہ بھی مرنے والے ہیں) اس کے بعد صحابہ کرامؓ نے ابوبکر صدیقؓ سے پوچھا کہ اے رفیق رسول کیا نبی اکرم ﷺ وفات پا چکے ہیں آپؓ نے فرمایا "ہاں" صحابہ کو یقین ہوگیا کہ ابوبکر صدیقؓ سچ کہہ رہے ہیں انہوں نے پوچھا اے رفیق رسول کیا ہم رسول اللہ ﷺ کی نماز جنازہ پڑھیں گے فرمایا ہاں، انہوں نے پوچھا کس طرح پڑھیں گے آپؓ نے کہا کہ ایک جماعت حجرہ کے اندر جائے۔ وہ (چار) تکبیریں پڑھے اور اس کے اندر دعا اور درود بھی پڑھے پھر نکلے اس کے بعد دوسری جماعت اندر آئے اور تکبیریں اور درود اور دعا پڑھے پھر وہ نکل جائے یہاں تک سب لوگ حجرے میں آکر نماز پڑھ لیں صحابہ کرام نے پوچھا کہ اے رفیق رسول کیا رسول اللہ ﷺ دفن کئے جائیں گے فرمایا ہاں انہوں نے پوچھا کہاں؟ فرمایا اس جگہ پر جہاں پر اللہ تعالیٰ نے ان کی روح قبض کی ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روح کو پاک (اور مبارک) جگہ پر ہی قبض کیا ہوتا ہے۔ صحابہ کو یقین ہوگیا کہ صدیق نے سچ بولا ہے اس کے بعد ابوبکر صدیقؓ نے حکم دیا کہ نبی اکرم ﷺ کے دادا کی اولاد ان کو غسل دیدیں۔

ادھر مہاجرین آپس میں (امارت وخلافت کے سلسلے میں) مشورہ کرنے کیلئے جمع ہو گئے کچھ لوگوں نے کہا کہ آئیں اپنے انصار بھائیوں کو خلیفہ کے تقرر کے کام میں اپنے ساتھ شریک کرلیں (انصار سے مشورہ کے بعد) انصار نے کہا کہ ایک امیر ہم انصار میں سے اور ایک امیر تم مہاجرین میں سے ہو۔ حضرت عمرؓ (اس مجلس میں) بولے کون ہے جس کیلئے ان تین فضیلتوں کی طرح فضیلتیں حاصل ہوں۔ (اول) **ثانی اثنین اذھما فی الغار**، یعنی ابوبکر ان دو میں سے دوسرے ہیں جب وہ غار ثور میں تنہا تھے۔ (یہ منقبت نبی اکرم ﷺ کے ساتھ انتہائی گہرے ربط کی غماز ہے) دوم، **اذیقول لصاحبه** یعنی جب نبی اکرم ﷺ نے اپنے رفیق سے فرمایا (یہ منقبت خداوند تعالیٰ کی جانب سے ابوبکر صدیقؓ کی صحابیت اور نبی کریم ﷺ کی رفاقت کی تخصیص ہے) سوم، **لاتحزن إنّ اللّٰه معنا**، یعنی غم نہ کر اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے (اس خبر و آیت میں اللہ تعالیٰ کی معیت ونصرت کا بیان ہے کہ جس طرح وہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تھی ویسے ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ بھی تھی) بتاؤ وہ دو (غار ثور کے ساتھی) کون تھے (یعنی نبی اکرم ﷺ اور اس کے ساتھی ابوبکر صدیقؓ) اس کے بعد عمر فاروقؓ نے ہاتھ بڑھایا اور صدیق اکبرؓ سے خلافت پر بیعت کرلی اور (عمرؓ کی متابعت میں) دیگر لوگوں نے بھی ان کے ہاتھ پر برضا ورغبت بہت بچی بیعت کرلی۔

سالم بن عبیدؓ: حضرت سالم بن عبید اشجعی رضی اللہ عنہ اہل صفہ میں سے تھے۔ بعد میں کوفہ میں رہائش پذیر ہوئے اصحاب سنن نے ان سے دو حدیثیں روایت کی ہیں۔ ایک حدیث امام ترمذیؒ اور ابوداؤدؒ نے کتاب الادب باب ماجاء فی تشمیت العاطس میں روایت کی ہے اور دوسری زیر نظر حدیث ہے۔

اغمی علی رسول اللّٰه ﷺ فی مرضه فافاق، مرض سے مرض وفات مراد ہے۔ اور افاقہ سے مراد یہ ہے کہ کمزوری کی بناء پر آپ جس بے خودی کا شکار ہوئے۔ یا جس طرح آپ ملکوت

بالا کے مشاہدے میں مشغول ہوئے تھے وہ حالت ختم ہوگئی اور دوبارہ عالم ناسوت میں رجوع کر گئے۔

<u>اغماء نبوت کے منافی نہیں:</u> **اغمی علی رسول اللہ ﷺ** نبی اکرم ﷺ کو مرض وفات میں بار بار غشی ہوتی تھی۔ اور جب ہوش آتا تو پوچھتے کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے یا نہیں؟ جواب ملنے پر فرماتے کہ بلال کو آذان کہنے اور ابوبکر صدیق کو نماز پڑھنے کا حکم دو۔ اس جملے میں انبیاء پر بیہوشی طاری ہونے کا ذکر ہے اور یہ جائز ہے کیونکہ بیہوشی ایک جسمانی بیماری ہے جو انبیاء کے حق میں ممتنع نہیں لیکن علامہ سبکیؒ کہتے ہیں کہ انبیاء کا اغماء بھی معمولی بیخودی ہوتی ہے مکمل طور پر بے شعوری سے وہ محفوظ ہوتے ہیں جیسے کہ ان کی نیند بھی مکمل بے شعوری کا سبب نہیں بنتی البتہ انبیاء کے حق میں جنون ممتنع ہے بلکہ دیوانگی سے محفوظیت پر قرآن کریم ناطق ہے۔

<u>اقامۃ صلوٰۃ اور حاکم وقت کی ذمہ داری:</u> **مروا بلالاً ان یؤذن ،** آپ ﷺ نے بستر مرگ پر بھی اقامت نماز کی فکر فرمائی کیونکہ حاکم وقت کی ذمہ داری ہے کہ وہ واجبات وشرائع دین کی اقامت کا انتظام کرے۔ یہی اس کی حقیقی ذمہ داری ہے دنیوی امور میں اصلاحات وسیاست کی حیثیت ثانوی ہے بلکہ وہ بھی اسلئے ہے کہ لوگوں کو طمانیت کے ساتھ حق عبدیت کا موقعہ ملے۔ لہٰذا حکمران کو چاہئے کہ نماز کی اہمیت کے پیش نظر نظام صلوٰۃ نافذ کرے۔ مسجد اس کے ڈول، پانی، کوزہ، بجلی چٹائی جائے نماز، لاؤڈ سپیکر، گھڑی، اوقات صلوٰۃ کا اعلان وغیرہ کا بندوبست سب نظام صلوٰۃ کا جزو اور حکومت وقت کے فرائض میں داخل ہیں۔ اور نبی کریم ﷺ نے مرض الوفات میں بھی اس کا اہتمام رکھا۔ اسی طرح آپ ﷺ نے امام کا تقرر بھی فرمایا۔ **إنّ أبی رجل اسیف الخ، اسیف** لغۃً سخت غمزدہ، **سریع الحزن،** نیز نرم دل اور رحیم کو کہتے ہیں۔ یہاں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر صحابہ عزت وجاہ کے طالب ہوتے تو ان میں سے ہر ایک یہ سفارش کرتا کہ میرا باپ یا میرے بھائی بندوں میں سے کوئی امامت کرے۔ لیکن صحابہؓ کا طبقہ اخلاص وللہیت کا طبقہ تھا۔ خود حضرت عائشہؓ نبی اکرم ﷺ سے ان کے والد کی امامت کروانے کا حکم واپس لینے کی درخواست کرتی ہیں حالانکہ وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے جسے ہمارے دین کی امامت کیلئے منتخب فرمایا ہے وہی دنیا کے امور میں بھی امامت وقیادت کا حقدار ہوگا۔ گویا یہ امامت امارت

دنیوی اور خلافت کی بنیاد بننے والی تھی مگر بایں ہمہ وہ خود کہتی ہیں کہ میرے والد رقیق القلب ہیں۔ بہت زیادہ غمگین ہونے والے اور نرم دل ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کی عشق ومحبت بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ لہٰذا واضح ہے کہ آپ ﷺ کی جگہ خالی دیکھ کر دل پارہ پارہ ہوجائیگا۔ اور آہ وبکاء اس کی نماز میں حائل ہوجائے گی اس لئے ان کی جگہ کسی دوسرے کا تقرر کروائیے۔

صواحبات یوسف سے تشبیہ: فانّ کنّ صواحب یوسف الخ، نبی کریم ﷺ کو کچھ افاقہ ہوا۔ تو حضرت عائشہؓ کے اصرار کا جواب دیتے ہوئے اس کے عذر کرنے پر خفگی کا اظہار فرمایا۔ حاصل یہ کہ میں نے ایک حکم دیا ہے اب اس میں چون وچرا اور اس پر نکتہ سنجیوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم عورتیں تو وہ لوگ ہو جنہوں نے حضرت یوسفؑ کو بھی مصائب میں ڈالا تھا اور غلط مشورے دیئے اسی طرح تم بھی مجھے غلط مشورے دیکر پریشان کررہی ہو۔

یہاں پر نبی کریم ﷺ نے صرف عائشہؓ کیلئے جمع کا صیغہ استعمال کیا جو یا تو صرف اعزاز وتشریف کیلئے ہے۔ اور معزز ومہذب لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ مخاطب کو جمع کے صیغے سے مخاطب کرکے پکارتے ہیں۔ خواہ وہ مخاطب اس کے بیوی بچوں میں سے کیوں نہ ہو۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ سفر میں ان کی بیوی جارہی ہیں۔ مگر وہ کہتے ہیں۔ امکثوا إنّی آنست ناراً لعلّی آتیکم منها بخبر آلایة، تو نبی کریم ﷺ نے اعزازاً وتشریفاً جمع کا صیغہ استعمال کیا۔ یا اس وجہ سے جمع کا صیغہ لائے۔ کہ حضرت عائشہؓ کی تائید دیگر ازواج مطہرات نے بھی کی تھی۔ خصوصاً حضرت حفصہؓ تو اکثر باتوں میں حضرت عائشہؓ کے ہمراہ ہوا کرتی تھیں اور بخاری اور ترمذی (باب مناقب ابی بکرؓ) میں یہ تصریح ہے کہ حضرت عائشہؓ نے حضرت حفصہؓ کے ذریعے بھی یہ بات کہلوائی تھی۔

وجہ تشبیہ: یہاں پر تشبیہ ایک بے موقعہ بات کہنے اور اس پر اصرار کرنے میں ہے یعنی صواحبات (۱) یوسف علیہ السلام نے بھی یوسف علیہ السلام کے سامنے عجیب چال چلی اور بے جا مطالبے میں زلیخا کی

(۱) صواحبات یوسف سے اگر مصر کی عورتیں مراد ہوں تو یہ تشبیہ درست ہے لیکن ملا علی قاریؒ نے صواحب یوسف سے زلیخا مراد لیکر وجہ شبہ یہ بیان کی ہے کہ جیسے زلیخا نے بظاہر تو دعوت کا بہانہ کرکے مصر کی عورتوں کو اکٹھا کرلیا تھا مگر درپردہ وہ اپنی محبت میں مجبوری اور عذر خواہی کا ارادہ کرچکی تھی۔ (اصلاح الدین)

سفارش کردی اسی طرح حضرت عائشہؓ نے بھی گویا بے محل بات کہہ کر اصرار کیا۔ یا تشبیہ اس میں ہے کہ جس طرح زلیخا نے دعوت کا بہانہ بنایا مگر در حقیقت وہ اپنی سہیلیوں کی طعن و تشنیع کے جواب میں اعتزار اور اپنی مجبوری کا اظہار چاہتی تھی۔ اسی طرح حضرت عائشہ بھی بظاہر رقت قلبی کا بہانہ کرتی ہیں مگر حقیقت میں انہیں اس بات کا اندیشہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی جگہ کھڑا دیکھ کر لوگ ان کے والد کو منحوس سمجھیں گے۔ جیسا کہ بخاری و مسلم کی روایات میں تصریحات ہیں۔

<u>اقتداء ابوبکر اور امامت ابی بکر کی تاکید:</u> نبی کریم ﷺ کی تاکید پر حضرت ابوبکرؓ ہی نے نماز پڑھانی شروع کردی ادھر نبی کریم ﷺ نے خود یہ منظر دیکھنے کیلئے حضرت بریرہؓ اور ایک اور صحابی کا سہارا لیا اور مسجد تک تشریف لائے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سوچا کہ اب تو افضل ترین امام آچکے ہیں اس لئے **فذهب لينكص** ،ینکص کاف کے ضمہ کے ساتھ ینصر کے وزن پر اور کسرہ کے ساتھ یضرب کے وزن پر آتا ہے مؤخر الذکر قرآن میں بھی موجود ہے۔ یعنی نماز میں پیچھے ہٹنے لگے۔ مگر نبی کریم ﷺ نے اشارہ کیا کہ ٹھہرو اور نماز پڑھاؤ۔ میں تیری اقتداء میں نماز پڑھنے کا منظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ ابوبکر صدیقؓ نے نماز مکمل کرلی۔ اور رسول اللہ ﷺ نے گویا زبان حال سے اعلان کردیا کہ میں نے تمہارے لئے امام اور خلیفہ کو مقرر کردیا ہے۔

حتّٰی فصلّٰی ابوبکر صلواة ،علامہ مناویؒ لکھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے آکر ابوبکر صدیقؓ کی اقتداء میں نماز پڑھی بلکہ بیہقی کی روایت میں اس کی تصریح منقول ہے۔ جبکہ ملا علی قاریؒ نے اس کو ترجیح دی ہے کہ نبی اکرم ﷺ ابوبکر صدیقؓ کو دیکھنے کے بعد واپس ہوگئے۔ دوسری روایات میں اس کی تصریح ہے(۱) جس دن آپ ﷺ کی وفات ہوئی تھی اسی روز صبح کی نماز میں بھی آپ ﷺ نے حجرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر وحدت امت اور امامت ابی بکرؓ سے آنکھیں ٹھنڈی فرمائیں۔ اور پھر واپس حجرے میں تشریف لے آئے۔ اگر یہاں پر اسی نماز کا ذکر ہو پھر تو ملا علی قاریؒ کی بات راجح ہے۔ اور اگر یہ کسی اور نماز کا ذکر ہو تو پھر نبی اکرم ﷺ کا مسجد میں تشریف لانا۔ اور ابوبکر صدیقؓ کے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھانا بھی ثابت ہے۔

---

(۱) کماسبق فی الروایة الاولیٰ من هذاالباب ۱۲، اصلاح الدین عفی عنه

بہرحال واقعات کے تعدد سے یہ گتھی بھی سلجھ سکتی ہے اسی طرح نبی اکرم ﷺ جن دوشخصوں کا سہارالیکر مسجد میں تشریف لائے تھے۔ان کی تعیین میں بھی مختلف ناموں کا ذکر آتا ہے۔مثلاً حضرت عباسؓ، فضل بن عباسؓ، حضرت علیؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ، حضرت ثوبانؓ، حضرت نوبہؓ اور حضرت بریرۃ بنت صفوانؓ، اگر واقعات متعدد ہوں تو پھر اس اختلاف کی توجیہہ میں بھی آسانی ہوجاتی ہے۔

ثم أنّ رسول اللّٰہ ﷺ قبض ، یہ مطلب نہیں کہ اسی جمعرات کو جس میں امامت ابی بکرؓ کی ابتداء ہوئی تھی آپ ﷺ وفات پائے بلکہ مراد یہ ہے کہ امامت کے انتظام کے بعد آپ ﷺ کی وفات واقع ہوئی جو تین دن بعد پیر کی دوپہر واقع ہے۔اس وقت ابوبکر صدیقؓ عوالئ مدینہ میں سنخ کے مقام پر تھے جہاں ان کا اپنا گھر تھا۔

حضرت عمرؓ حواس گم کر بیٹھے: **فقال عمرؓ لااسمع احداً الخ** ، عشق ومحبت اور دل میں محبوب کی عظمت انتہاء کو پہنچ جائے تو انسان کی سمجھ میں محبوب کی موت ناممکن نظر آنے لگتی ہے وہ ہکا بکا اور حیران ہوتا ہے نبی کریم ﷺ کی حیثیت تو بڑی اونچی ہے ان سے کم تر لوگ بھی مرجائیں تو عقیدتمندوں کو ان کی موت کا اعتبار نہیں آتا اور اس کی قریب ترین مثال امیر المجاہدین سید احمد شہیدؒ کی شہادت کے وقت نظر آتی ہے۔جب اس کے کفن بردوش سپاہی اولوالعزمی، عالی ہمتی، جفاکشی اور وفاشعاری کا پیکر بن کر مشرقی ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے درہ بولان کے راستے افغانستان چلے جاتے ہیں۔پھر وہاں سے بے سروسامانی کی حالت میں درہ خیبر کے ذریعے پشاور آکر اسے فتح کرلیتے ہیں۔اس کے بعد یہ قافلہ مجاہدین پیش قدمی کرکے اکوڑہ خٹک آتا ہے اور یہاں پر سکھ حکومت سے ٹکر ہوتی ہے۔

سید صاحبؒ کی شہادت کا جان نثاروں پر اثر: مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہم نے یہاں دارالعلوم حقانیہ آمد کے موقع پر ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ مجھے بہت استقراء وتتبع اور تاریخ کو کھنگالنے کے بعد یہ معلوم ہوگیا کہ گزری ہوئی چارپانچ صدیوں سے صحیح اسلامی اصولوں کیمطابق جہاد پوری قواعد شرعی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہاں اکوڑہ خٹک سے شروع ہوا اتنی طویل مدت کے بعد سید احمد شہیدؒ نے اسلامی قوانین کی پاسداری کرتے ہوئے پہلے دشمن کو دعوت اسلام دی ورنہ جزیہ یا پھر تلوار سے جہاد کیلئے تیار ہوجانے کی اطلاع دی۔

اور جہاد کے تمام مقدمات کی تکمیل کے بعد اکوڑہ خٹک کے مقام پر حملہ کر کے شہداء نے اپنا خون بہایا۔

جنگ اکوڑہ خٹک: اس کے بعد سید صاحب اور اس کے ساتھی اکوڑہ خٹک کے مقام پر شب خون کے بعد قریبی گاؤں شیدو آتے ہیں اور وہاں باقاعدہ کافر افواج سے آمنا سامنا ہوتا ہے جنگ کی رات شیدو سے لے کر یہاں اکوڑہ خٹک اور نوشہرہ تک میدانوں میں تقریباً ایک لاکھ فوج خیمہ زن تھی ہائے اللہ چشم فلک نے کیسا منظر اس وادئ غیر ذی ذرع میں دیکھا ہوگا۔(حضرت شیخ الحدیثؒ تو اس وقت کے اکوڑہ خٹک کے بے شجر بے آب وگیاہ زمینوں اور اس میں دارالعلوم کے قیام کو مکہ کے وادی غیر ذی زرع سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔) رات بھر اللہ اکبر کی گونج اور جہاد کے غلغلوں سے کیا سماں رہا ہوگا یہ جہاں ہم اور آپ بیٹھے ہیں اور اس کے اردگرد اطراف میں سب میدان تھے اور اس چپہ چپہ پر اس رات مجاہدین سر بسجود ہو کر گڑگڑائے ہونگے صبح عین میدان جنگ میں غداری ہو جاتی ہے سید صاحب کو جنگ کی رات زہر دلوایا جاتا ہے وہ بیمار مگر پھر بھی جنگ میں شریک ہیں۔ بڑی مشکل سے انہیں بچا کر شیدو سے دریائے کابل کے اس پار لے جایا جاتا ہے صحت یاب ہو کر بکھرے ہوئے مجاہدین کو آپ پھر سے جمع کر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے پھر سے مجاہدانہ کارروائیاں شروع کر دیتے ہیں یہ تحریک بالآخر آپ کو مشہد بالاکوٹ پر لے جاتی ہے جہاں آپ کا محاصرہ ہو جاتا ہے اور اسی مقام پر سید صاحب، شاہ اسماعیل شہیدؒ اور ان کے اکثر جیالے ساتھی جام شہادت نوش فرماتے ہیں۔

مگر سید صاحبؒ اس افراتفری کے عالم میں غائب ہو جاتے ہیں ممکن ہے دشمنوں نے ان کی لاش دریا برد کر دی ہو یا کسی مجاہد نے مزید بے حرمتی سے بچانے کیلئے وہیں کہیں دفن کر دی ہو مگر آپ کے باقی ماندہ ساتھیوں میں سے کچھ لوگوں نے آپ کی شہادت سے انکار کر دیا بلکہ بعض جید علماء اور صاحب فراست لوگوں تک نے آپ کے متعلق غیبوبت کا عقیدہ اپنایا۔ اور کہہ دیا کہ سید صاحب مرے نہیں بلکہ بادلوں میں گئے ہیں عنقریب واپس آ کر ہماری قیادت فرمائیں گے۔ اور کفار کو شکست دیں گے۔ دردؔ جیسے مشہور شاعر نے اسی جذبے کے تحت ہی سید صاحب کے بارہ میں کہا

اتنا پیغام درد کا کہنا جب صبا کوئے یار سے گزرے — کونسی رات آپ آئیں گے دن بڑے انتظار سے گزرے

بہرحال ایسی حالت میں انسان ہکا بکا رہ جاتا ہے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا ہوا نظر آتا ہے ہوش

وحواس مفقود ہوجاتے ہیں اور عقل حقائق واقعیہ کو ناممکن سمجھنے لگتی ہے تو یہاں حضرت عمرؓ بھی جذبات سے مغلوب تھے۔ حواس کھو بیٹھے تھے اور حیرت زدگی کی کیفیت سے دوچار تھے ان کے خیال میں ساری دنیا کو اسلام کے جھنڈے تلے لانے سے قبل نبی کریم ﷺ کی موت ناممکن سی بات تھی۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ نبی کریم ﷺ کی رحلت کی خبر کو منافقین کی اڑائی ہوئی افواہ سمجھ بیٹھے۔ اور اعلان کردیا کہ جس نے حضور ﷺ کی موت کے بارے میں زبان کھولی۔ اس کی گردن اڑا دوں گا۔ نبی کریم ﷺ وفات نہیں ہوئے بلکہ اپنے رب سے مناجات کیلئے گئے ہیں اور عنقریب واپس آکر ان منافقین کے سر قلم کریں گے جنہوں نے آپ کی موت کی خبر پھیلائی ہے آپؓ کی تقریر سن کر بعض لوگ آپؓ کے ہمنوا بن گئے اور بعض خاموش ہوگئے۔

<u>صحابہ کا وفات انبیاء سے پہلا واسطہ:</u> **قال وكان الناس اميين**، حضرت سالمؓ اس کی وجہ بیان فرماتے ہیں کہ صحابہ پر یہ دہشت کیوں طاری ہوئی۔ وہ بتاتے ہیں کہ لوگ ان پڑھ تھے پیغمبروں اور انبیاء کی حیات وموت کا اس سے قبل دیکھنے کا اتفاق پیش نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا وہ ناواقفیت کی وجہ سے پریشان تھے مگر بعض ذی ہوش صحابہؓ نے جب دیکھا کہ نبی کریم ﷺ کی رحلت کا مسئلہ الجھتا جارہا ہے تو ان کو ابوبکر صدیقؓ کا خیال آیا۔ کہ وہی امت کو اندھیروں کے اس منجدھار سے نکال سکتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے حضرت سالمؓ کو آپؓ کے پاس بھیجا۔ **انطلق إلىٰ صاحب رسول الله ﷺ الخ**، یہاں پر صحابہؓ نے بیک زبان صدیق اکبرؓ کو "صاحب رسول اللہ" کہا ہے عقل وہوش کا ماتم کرنے والوں کیلئے مقام فکر ہے کہ وہ کیسے اس شخص کی صحبت سے انکار کررہے ہیں جن کی صحبت پر خیر القرون کے چھوٹے بڑے متفق ہیں۔ اور اسی نام ہی سے انہیں پکار رہے ہیں اور صرف "صاحب رسول اللہ ﷺ" کے الفاظ سے ذکر کئے جاتے ہیں۔

فاتيت ابابكرؓ وهو في المسجد، پہلے گزر چکا ہے کہ ابوبکر صدیقؓ رحلت کے روز سُخ گئے تھے وہاں ایک چھوٹی سی مسجد میں آپ بیٹھے ہوئے تھے (۱)، حضرت سالمؓ کہتے ہیں کہ میں ان کے پاس روتا

---

(۱) اکثر شراح نے اسی چھوٹی مسجد کا ذکر کیا ہے مگر بعض دیگر روایات میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اس سے پہلے حضور ﷺ کی خیریت معلوم کرنے کیلئے اپنے ایک غلام کو مدینہ بھیج چکے تھے۔ اس نے نبی کریم ﷺ کی موت کی خبر لا کردی تھی اور آپؓ سخ سے مسجد نبوی آئے تھے۔ اور شاید وہیں پر حضرت سالمؓ کی ان سے ملاقات ہوئی اور وہیں انہوں نے ابوبکرؓ سے بات کی۔ مولانا زکریاؒ نے بھی اس احتمال کو ترجیح دی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب ۱۲، اصلاح الدین حقانی

ہوا آیا۔ آپؓ نے دور سے دیکھا تو سمجھ گئے اور سوال کیا کہ کیا حضور ﷺ وفات پا گئے۔ حضرت سالمؓ نے کہا کہ مجھے تو یونہی لگ رہا ہے مگر زبان سے کہہ نہیں سکتا کیونکہ ادھر حضرت عمرؓ کی تلوار کا خوف ہے۔ جو کہہ رہے ہیں کہ جس نے کہا کہ حضور ﷺ وفات پا چکے ہیں اس کا سر اڑا دوں گا۔

ابوبکر صدیقؓ کیلئے صدمہ اولیٰ: حضرت ابوبکرؓ حضرت سالمؓ کو لے کر مدینہ آئے نبی کریم ﷺ کی جسد مبارک جان نثاروں میں گھری ہوئی تھی کہا راستہ دو تو راستہ بناتے ہوئے نبی کریم ﷺ تک پہنچ گئے۔ جبین اطہر کو بوسہ دیا اور یہ آیت پڑھی اِنک میّت و انھم میّتون، بیشک تم بھی مرنے والے ہو اور وہ بھی مرنے والے ہیں۔

اس جملہ کے استحضار اور برمحل بیان کی وجہ سے صدیقؓ نے ایک بڑے مخمصے کو ختم کر دیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے وفات کی تصدیق فرمائی۔ تو صحابی کے بقول

صدیق کی صداقت اور صحابیت مسلّم تھی: فعلموا ان قد صدق، یعنی لوگوں کو یقین آیا کہ وہ سچ فرماتے ہیں۔ یہ جملہ بار بار آئے گا کہ جب بھی ابوبکر صدیقؓ نے اس سلسلے میں کوئی فیصلہ دیا۔ تو صحابہؓ کو یقین ہو گیا۔ اور ہر بات پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے کہ بیشک ابوبکر صدیقؓ نے سچ فرمایا۔ اور پھر نبی کریم ﷺ کے نماز جنازہ کی بابت دریافت کیا۔ تو آپؓ نے فرمایا کہ ایک ایک جماعت اندر جا کر آپ ﷺ پر بلا جماعت نماز پڑھ کر باہر آئے اس طرح سب لوگ نماز پڑھیں گے۔ پھر پوچھا کہ کیا آپ ﷺ دفن کئے جائیں گے فرمایا ہاں پوچھا گیا کہ کہاں؟ فرمایا جہاں وفات ہوئی ہے وہی آپ ﷺ کا مدفن ہوگا۔ پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضور کے قریبی رشتہ داروں کو تجہیز و تکفین پر مامور کیا۔ اس وقت صحابہ کی حالت بہت ہی ابتر تھی۔ حضرت عبداللہ بن انیسؓ اپاہج ہو گئے حضرت عثمانؓ کی سماعت اور قوت گویائی جواب دے گئی دیگر صحابہ کو یقین نہیں آرہا تھا کہ حضور ﷺ کی وفات ہوئی ہے۔ سب سے پہلے حضرت اسماء بنت عمیسؓ نے حضور ﷺ کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر بتایا۔ کہ مہر نبوت غائب ہو چکی ہے اسلئے حضور ﷺ کا وصال ہو چکا ہے۔ حضرت عمرؓ جب آپ ﷺ کے پاس آئے اور حالت دیکھی تو ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ اور حضور ﷺ کی موت سے انکار کر دیا انکا خیال تھا کہ نبی اکرم ﷺ بیہوش ہو چکے ہیں۔ اور

ہوش میں آ کر منافقین کو سزا دیں گے۔ خود ابوبکر صدیقؓ جب حاضر ہوئے تو آنسو بہہ رہے تھے۔ ہچکیاں جاری تھیں اور اگرچہ بظاہر حوصلہ مند معلوم ہو رہے تھے۔ مگر صدمے نے اندر ہی سے کھوکھلا کر دیا تھا جسکی وجہ سے جلد ہی ان کا بھی وصال ہوا۔ آپؓ کی تسلی نے دیگر صحابہ کرام کی ڈھارس بندھائی۔ چنانچہ حجرے میں صحابہ کے سوالات کا جواب دینے کے بعد آپ مسجد میں آئے۔ حضرت عمرؓ سے کہا ''ایھا الحالف اجلس'' اے قسم کھانے والے بیٹھو۔ وہ ویسے ہی کھڑے رہے۔ آپؓ کو دیکھ کر لوگ حضرت عمرؓ کو چھوڑ کر آپؓ کی طرف آئے آپؓ نے فرمایا۔ خبردار جو محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا تو وہ تو وفات پا گئے ہیں۔ اور جو خدا کی عبادت کرتا تھا ان کا معبود اللہ تعالیٰ زندہ اور غیر فانی ہے پھر یہ آیت پڑھی۔ **وما محمد الاّ رسول قد خلت من قبله الرسل أفإن مات اوقتل انقلبتم علی أعقابکم الخ،** (ترجمہ اور محمد اللہ کے رسول ہی تو ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول گزرے ہیں اگر وہ وفات پائیں یا ان کو قتل کر دیا جائے تو کیا تم پیٹھ پیچھے پھر جاؤ گے؟) تب لوگوں کی چیخیں نکل گئیں اور سب لوگ اس آیت کو پڑھنے لگے گویا ابھی نازل ہوئی ہو۔

<u>انفرادی جنازہ کیوں؟</u> **یدخل قوم فیکبّرون ،** نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد ان پر اجتماعی نماز جنازہ کیوں نہیں پڑھا گیا؟ اس کے جواب میں بعض لوگوں نے تو یہ کہا ہے کہ چونکہ ابھی تک لوگ کسی خلیفہ کو مقرر نہیں کر سکے تھے۔ اس لئے انفرادی طور پر جنازہ پڑھا گیا۔ حضرت علیؓ سے ایک اور وجہ بھی منقول ہے۔ وہ یہ کہ آپؓ نے لوگوں سے کہا:

لایؤمّ احدکم علیه لانّه امامکم حال حیاته وحال مماته

ترجمہ: تم میں سے کوئی نماز جنازہ کی امامت نہ کرے کیونکہ آپ ﷺ زندہ اور مردہ دونوں حالتوں میں تمہارے امام ہیں۔

تیسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس بات کی وصیت فرمائی تھی۔ کہ یونہی میرا جنازہ پڑھو جیسا کہ مستدرک حاکم میں حضرت عائشہؓ کی روایت سے یہ بات ثابت ہے(۱)،

<u>غسل کس نے دیا:</u> **ثمّ امرهم ان یغسله بنوابیه،** بنوابیہ سے مراد آپ ﷺ کے چچا اور چچا زاد بھائی ہیں۔

---

(۱) مناوی ج۲ ص۲۷۲

آپ ﷺ کے غسل میں حضرت عباسؓ، حضرت علیؓ، حضرت فضل بن عباسؓ اور قثم بن عباسؓ کے علاوہ حضرت اسامہ بن زیدؓ، صالح الحبشیؓ اور شقران (نبی اکرم ﷺ کے آزاد کردہ غلام) کا نام آتا ہے۔

حضرت بزارؒ کی ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ **لایغسلنی الّا انت فانّه لا یریٰ احدعورتی الّا طمست عیناه**(۱)، تیرے سوا کوئی مجھے غسل نہ دے کیونکہ (تیرے سوا) کوئی بھی میرا پردہ دیکھے گا تو اس کی آنکھیں اندھی ہو جائیں گی۔

چنانچہ اصل غسل دینے والے تو علیؓ تھے۔ البتہ مذکورہ دیگر حضرات غسل دینے میں مدد فرما رہے تھے پھر بھی علیؓ کے سوا تمام حضرات کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ حضرت عائشہؓ کی روایت کے مطابق غسل دینے والوں کے درمیان اس بات میں اختلاف ہوا کہ آپ ﷺ کو برہنہ کر کے غسل دیا جائے یا کپڑوں میں۔۔؟ کہ اچانک سب لوگوں پر نیند طاری ہوگئی اور حجرے کے کونے سے ایک غیبی آواز سنائی دی کہ آپ ﷺ کو کپڑوں ہی میں غسل دے دیں(۲)۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

<u>تکفین:</u> غسل کے بعد آپ ﷺ کو تین کپڑوں میں کفن دیا گیا۔ جیسا کہ حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت جابرؓ اور حضرت عبداللہ بن مغفلؓ کی احادیث سے ثابت ہے۔ یہ تین کپڑے ازار، رداء اور قمیص تھے۔ جہاں تک حضرت عائشہؓ وغیرہ کی روایت میں ہے کہ "**لیس فیها قمیص**" تو اس کا معنی یا تو یہ ہے کہ ان میں متعارف قمیص نہیں تھا جن میں آستینیں، گریبان اور بعض دیگر اجزاء ہوتے ہیں۔ اور یا یہ تاویل ہوگی کہ وہ قمیص جو غسل دیتے وقت آپ ﷺ پہنے ہوئے تھے۔ تبدیل کر کے دوسری قمیص پہنائی گئی۔

---

(۱) جمع الوسائل ج۲ص۲۷۳

(۲) **ماروا ه البیهقی فی الدلائل عن عائشة انّهم لمّاارادوا غسله ﷺ قالوا لاندری أنجرده من ثیابه کما نجرد موتانا ای بالاکتفاء بالازار اوبما یستر الغلیظتین ام نغسله وعلیه ثیابه ای من القمیص وغیره فلمّا اختلفوا القی اللّٰه علیهم النوم حتی مامنهم رجل إلاّ ذقنه فی صدره ثمّ کلّمهم متکلم من ناحیة البیت لایدرون من هو اغسلوا النبیّ ﷺ وعلیه ثیابه فغسلوه وعلیه قمیصه یصبون الماء فوق القمیص(جمع الوسائل ۲/۲۷۳)(مختار)**

تدفین: بدھ کی رات کوصحابہ کرام جنازہ وغیرہ امور سے فارغ ہوگئے تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے بستر ے کی جگہ قبر کھود ڈالی اور اس میں لحد بنالی۔ پھراس میں علیؓ، عباسؓ اوران کے دونوں بیٹے فضلؓ اور قثمؓ اترے اور نبی اکرم ﷺ کو اس عالم کے بہترین مقام میں رکھ دیا قبر سے سب سے آخر میں قثم بن عباسؓ نکلے۔ لحد پر کچی اینٹیں رکھ دی گئیں پھر خاک ڈال دی گئی قبر کو ماہی پشت بنایا گیا۔ اور حضرت بلالؓ نے قبر پر پانی چھڑکا۔

خلافتِ صدیقی پر اجماع: واجتمع المهاجرون الخ ، اکثر مہاجرین حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حکم سے خلافت پر مشورہ کیلئے جمع ہوگئے۔ کیونکہ یہ اہم ترین مرحلہ تھا مہاجرین میں سے حضرت عمرؓ اور دیگر ذی رائے لوگوں نے مشورہ دیا کہ خلیفہ کے انتخاب میں انصار کو بھی اعتماد میں لینا چاہیے تا کہ جاہلیت کے دور کی طرح پھر سے سرداری نظام اور طوائف الملوکی کا دور شروع نہ ہو۔

دوسری طرف انصار بھی اسی سلسلے میں سقیفہ بنوساعدہ میں جمع تھے۔ چنانچہ شیخینؓ خود ان کے پاس چلے گئے تا کہ کہیں وہ ازخود کسی کے ہاتھ بیعت کی غلطی نہ کر بیٹھیں۔ چنانچہ انہوں نے ''منا امیر و منکم امیر'' کی بات کہی تو ابوبکر صدیقؓ نے حدیث ''الائمة من قریش '' سنائی اور انصارؓ خلافت سے دستبردار ہوگئے تو حضرت عمرؓ نے اٹھ کر فرمایا۔ کہ ہم سب میں سے کون ہے جس میں بیک وقت تین فضیلتیں جمع ہوگئی ہوں اور وہ منصوص ہوں۔ ایک تو ''ثانی اثنین اذهما فی الغار '' یعنی نبی کریم ﷺ کے ساتھ اتحاد ومعیت اور بالکل تنہائی کی رفاقت ہے۔ دوسری ''اذیقول لصاحبه الخ '' ہے۔ یعنی خود اللہ تبارک وتعالیٰ ابوبکر کو حضور ﷺ کا ساتھی اور صحابی فرمارہے ہیں۔ تیسری ''ان اللّٰه معنا '' ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ابوبکرؓ کے ساتھ بھی معیت ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔

حضرت عمرؓ نے اس موقعہ پر صحابہؓ سے کہا کہ تم ہی بتاؤ کہ وہ دو کون تھے جن کا ثانی اثنین میں ذکر ہے پھر اور بھی گفتگو ہوتی رہی جس کی تفصیلات دیگر روایات سے معلوم ہوتی ہیں مثلاً حضرت عمرؓ نے فرمایا اے انصار مدینہ کیا نبی کریم ﷺ نے ابوبکرؓ کو اپنے مصلّے پر کھڑا کر کے علالت کے دوران نماز نہیں پڑھوائی تھی۔ کیا تم میں سے کوئی یہ گوارا کر سکے گا۔ کہ نبی کریم ﷺ کے کھڑے کیے ہوئے شخص کو امامت سے ہٹادو۔

انصار نے فرمایا ''معاذ اللہ ہم یہ جرأت کب کر سکتے ہیں'' پھر حضرت عمرؓ نے ہاتھ بڑھایا اور حضرت ابوبکرؓ سے بیعت کی۔اس کے بعد سقیفہ بنوساعدہ میں جمع لوگوں نے بڑی محبت وعقیدت سے بیعت کی۔بعض روایات کے مطابق حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کے ہاتھ پر بیعت کا ارادہ ظاہر کیا مگر حضرت عمرؓ نے انکار کردیا۔وبایعه الناس بیعة حسنة جمیلة ،یہ ابتدائی بیعت تھی جو مجلس انصار میں ہوئی۔دوسرے روز مسجد نبوی میں عمومی بیعت ہوئی جس میں حضرت عمرؓ نے افتتاحی خطاب فرمایا۔پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنا شہرۂ آفاق خطبہ دیا۔اور تمام لوگوں نے ان کی خلافت تسلیم کرکے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔

(۱۳) حدثنا نصر بن علیّ ثنا عبداللّٰہ بن الزبیر شیخ باھلیّ قدیم بصریّ ثنا ثابت البنانیّ عن أنس بن مالک قال لمّا وجد رسول اللّٰہ ﷺ من کرب الموت ما وجد فقالت فاطمةؓ واکرباه فقال النبیّ ﷺ لاکرب علی ابیک بعد الیوم انّه قد حضر من ابیک مالیس بتارک منه احداالوفاة یوم القیٰمة(۱).

فاطمہؓ کا درد وکرب:

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کو(مرض وفات میں) سخت تکلیف ہوئی۔تو حضرت فاطمہ پکار اٹھیں ''ہائے تکلیف کی سختی'' اس پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تیرے باپ پر آج کے بعد کوئی تکلیف نہیں رہے گی۔بیشک آج تیرے باپ پر وہ چیز نازل ہوئی ہے۔جس کو اللہ تعالیٰ کسی سے قیامت کے دن تک نہیں ٹالتے۔وہ ہے موت۔

واکرباه ،کرب اس غم کو کہتے ہیں جس کی شدت جان لیوا ہو۔فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا نے اپنے محبوب والد کی تکلیفیں اور موت کی شدائد دیکھیں تو ضبط وتحمل کا دامن چھوٹ گیا اور غم اور تحسر کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''ہائے یہ تکلیفیں''۔

---

(۱)سنن ابن ماجة ص۱۱۷ کتاب الجنائز باب ذکر وفاته ودفنه ﷺ، السنن الکبریٰ للبیھقی ۳/۱۷، دارمی ۱/۴۰، مسنداحمد۳/۱۴۱ (مختار)

تسلی کا انداز: لاکرب علی ابیک بعد الیوم ، نبی اکرم ﷺ نے پیاری بیٹی کو تسلی دی کہ یہ شدائدان نعمتوں کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔جن کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے بہت پہلے ''ولسوف یعطیک ربک فترضی '' میں فرمایا ہے۔اب تو اس دارالمحن سے رخصت ہو کر مقام محمود پر فائز ہونا ہے اور رفیق اعلیٰ سے ملنا ہے۔اس لئے آج کے بعد تیرے والد کی تکلیفوں کا خاتمہ ہونے والا ہے۔اب تو وہ اٹل چیز جو دائمی نعمتوں کیلئے پل کا کام دیتی ہے نازل ہو رہی ہے۔

أنّه قد حضر من ابیک ما ،حضر کے معنی قرب اور ما کا معنی ہے شئی عظیم، لیس بتارک منه، لیس کا اسم اللہ ہے اور منہ کی ضمیر ''ما'' کو راجح ہے۔الوفاۃ ما کا بیان ہے۔اور یوم القیامۃ منصوب ہے بنزع الخافض ۔یعنی الیٰ کو حذف کر کے منصوب کر دیا گیا ہے۔اس جملے کی ترکیب میں دیگر اقوال بھی ہیں۔لیکن سب سے ظاہر ترکیب یہی ہے۔جو ذکر کی گئی ہے اس جملے میں بھی تسلی کا سامان موجود ہے۔یعنی جس چیز سے چھٹکارا نہیں وہ اٹل چیز نازل ہوئی تو کیا ہوا ایک دن تو اسے آنا تھا۔

(۱۴) حدّثنا ابو الخطاب زیاد بن یحییٰ البصریّ ونصربن علیّ قالاحدّثنا عبدربّه بن بارق الحنفیّ قال سمعت جدی أبا أمیّ سماک بن ولید یحدّث أنّه سمع ابن عبّاس یحدّث أنّه سمع رسول اللّٰه ﷺ یقول من کان له فرطان من امّتی أدخله اللّٰه تعالیٰ بهما الجنّة فقالت له عائشة فمن کان له فرط من امّتک قال ومن کان له فرط یا موفّقة قالت فمن لم یکن له فرط من أمّتک قال فانا فرط لامّتی لن یّصابوا بمثلی(۱)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے سنا وہ فرمار ہے تھے کہ میرے جس امتی کے دو بچے (مر کر) آخرت میں اس کے لئے پیشرو

(۱)جامع ترمذی ۱/۲۰۴ کتاب الجنائز باب ماجاء فی ثواب من قدم ولد، السنن الکبریٰ للبیهقی ۴/۶۷ کتاب الجنائز، مسند احمد ۱/۳۳۴(مختار)

بن جائیں تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے اس کو جنت میں داخل فرمائیں گے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ جس کا ایک ہی بچہ ذخیرہ آخرت بنا ہو (اس کا کیا ہوگا) آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس کا یک فرط ہو وہ بھی جنت میں جائیگا اے خیر کی توفیق دی گئی عائشہ۔ انہوں نے پھر عرض کیا کہ جس کا کوئی فرط پیشرو ہی نہ ہو (کوئی نہیں مرا ہو) آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کیلئے میں ذخیرہ آخرت بنوں گا۔ اس لئے کہ میری فراق کی مصیبت جیسی بڑی کوئی مصیبت ان پر نازل نہیں ہوئی۔

<u>صدمۂ عظمیٰ میں غمگساروں کیلئے تسلی کا سامان:</u> من کان لہ فرطان الخ، اس حدیث کا بظاہر وفات النبی ﷺ سے تعلق معلوم نہیں ہوتا لیکن اس باب سے مناسبت ضرور ہے اور وہ یہ کہ اس حدیث میں امت کو یہ تسلی دلائی ہے کہ جب رحلت النبی ﷺ کی وجہ سے کوئی دکھی ہوتا ہے تو اس درد کا بدلہ بصورت جنت ملے گا اور یہی کیفیت ہوئی کہ صحابہؓ نے اس دکھ کو عمر بھر سینے سے لگائے رکھا وہ جس میت کی تعزیت کیلئے جاتے تو اس کی موت پر تعزیت سے پہلے نبی کریم ﷺ کے فراق پر تعزیت فرماتے۔ تو وفات النبی ﷺ کے بیان کے بعد اس حدیث میں عشاق کے غمزدہ دلوں کیلئے تسلی کا سامان بھی موجود ہے۔

گویا امام ترمذیؒ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی رحلت بڑا المیہ، عظیم حادثہ اور سانحہ کبریٰ ہے جس طرح خود نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ ''لن یصابوا بمثلی'' یعنی میری امت کو بہت سے مصائب پیش آئیں گے، بہت سی محبوب اشیاء سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے مگر میرے فراق جیسا عظیم غم اور میری رحلت جیسی مصیبت کبھی بھی نازل نہیں ہوسکتی۔ ہاں میری امت کیلئے یہ حادثہ ناقابل برداشت دکھ کے ساتھ ساتھ رحمت کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ وہ یوں کہ جس طرح باپ کو بیٹے کی موت پر صبر کا بدلہ جنت کی صورت میں ملتا ہے یونہی نبی کریم ﷺ بھی غمزدہ امتیوں کی شفاعت کر کے نجات دلوائیں گے۔

من کان لہ فرطان الخ، فرط قافلے کے اس پیشرو کو کہتے ہیں جو پہلے جا کر بعد کے آنے والوں کیلئے جگہ، پانی اور سامان اقامت کا انتظام کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس کے دو بچے داغ جدائی دے کر ذخیرہ آخرت بن جائیں۔

یا ایک بچہ بھی تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے والدین کو ضرور جنت میں داخل فرمائینگے۔

قال ومن كان له فرط، یعنی کذالک، مطلب یہ ہے کہ ایک فرط والا بھی اسی طرح جنت میں جائیگا۔

یاموَفّقه، یعنی تجھے خیر کی توفیق دی گئی ہے۔ اسی وجہ سے مناسب سوال کر بیٹھی ہو اور چونکہ حضرت عائشہؓ کی اپنی اولاد کوئی نہ تھی۔ اس لئے یہ سوال بھی کر دیا "**فمن لم يكن له فرطٌ من امتک؟**" کہ جس کا کوئی بچہ نہ مرا ہو اس کا کیا ہوگا؟ نبی کریم ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ "**فانا فرط لامتي لن يصابوا بمثلي**" یعنی جس کا کوئی بچہ نہیں مرا ہو تو میں خود اس کیلئے ذخیرہ آخرت اور فرط بنوں گا کیونکہ میری جدائی اور وفات کا صدمہ اور رنج والم تو سب سے زیادہ ہوگا۔

یہاں امت سے امت اجابت مراد ہے اور "**لن يصابوا بمثلي**" جملہ مستانفہ بمنزلۃ التعلیل ہے۔ یعنی ماقبل کیلئے وجہ بیان کرنا مقصود ہے کہ صدمہ ہونے میں میری جدائی اور بچوں کی جدائی ایک جیسے ہیں بلکہ حضور ﷺ کی جدائی کا صدمہ بڑھ کر ہے۔ ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

والصبر يحمد في المواطن كلها   الاّعليک فانه مذموم

یعنی صبر تو ہر جگہ قابل تعریف صفت ہے سوائے تجھ پر کہ تجھ پر صبر مذموم ہے۔

ملا علی قاریؒ نے بڑی پیاری بات کہی ہے کہ یہ بشارت نبی کریم ﷺ کے اہل زمانہ مؤمنین اور بعد کے آنیوالوں کیلئے ہے "**فاللّٰهم اجعل النبيّ ﷺ لنا فرطاً**"

وصلى الله على سيّدنا وحبيبنا محمّد وآله وصحبه وسلم

خلاصہ باب

ربیع الاول ۱۱ھ اپنے ساتھ وہ فاجعہ کبریٰ بھی لایا۔

جس نے اس عالم فانی کی روشنی چھین لی۔اور صحابہ کرامؓ بلکہ ساری امت کے دل ودماغ پر غم کا انمٹ داغ ثبت کردیا۔اخیر صفر میں نبی کریم ﷺ کو سخت دردسر کا سامنا کرنا پڑا۔جو رفتہ رفتہ بیہوشی اور پھر وفات پر منتج ہوا۔

حکمت الٰہیہ کے تحت آپ ﷺ کا مرض وفات شدید تکلیف اور ناقابل برداشت کرب والم پر مشتمل تھا۔یہاں تک حضرت فاطمہؓ پکار اٹھیں "واکــربــاہ" اور حضرت عائشہؓ کو موت کی شدائد سے نفرت نامناسب معلوم ہونے لگی اور سہولت موت پر رشک چھوڑ دیا خود نبی اکرم ﷺ سخت تکلیف میں پانی سے ہاتھ بھگو کر بار بار منہ پر پھیر لیا کرتے تھے اور دعا کرتے تھے "اللّٰھمّ اعنیّ علی سکرات الموت" مگر ساتھ ساتھ پس ماندگان کو تسلی بھی دیا کرتے تھے کہ بس آخری تکالیف ہیں۔پھر اللہ تعالیٰ سے وصال کے مزے ہیں۔

وفات کا یقین ہوجانے کے بعد امت کی وحدت کی فکر دامنگیر ہوئی تو ابوبکر صدیقؓ کو امامت کا حکم دیا اور حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ کے مشوروں کے باوجود آپ ﷺ نے کسی اور کی امامت برداشت نہیں کی۔پھر ابوبکر صدیقؓ کی امامت میں ان کے پیچھے امت کی اقتداء کا نظارہ کرنے کیلئے انتہائی تکلیف کے باوصف دوسروں کا سہارا لیکر مسجد تشریف لے گئے تاکہ اس منظر سے دل خوش اور آنکھیں ٹھنڈی کرسکیں۔جس روز آپ ﷺ کی وفات ہوئی اسی دن صبح کی نماز میں بھی حجرے کے دروازے سے یہ منظر دیکھا اور عشاق کو اپنا آخری دیدار کروایا پھر اسی روز یعنی پیر کے دن ۱۲ یا ۲ ربیع الاول کو واصل بحق ہوئے۔

وفات کے بعد صحابہؓ جو وفات الانبیاء سے ناواقف اور ذہنی طور پر اس حادثہ عظمیٰ کے لئے تیار نہیں تھے آپ ﷺ کی وفات سے انکار کربیٹھے۔اکثر کو اس میں تردد ہوا۔بہت سے غم کی وجہ سے بدحواس۔بلکہ مفقود الحواس ہوگئے عمرؓ جیسے مضبوط اعصاب کے مالک کو بھی حقیقت تک رسائی نہ ہوئی اور نبی ﷺ کی موت کا نام لینے والوں کو واجب القتل سمجھنے لگے۔

ایسی حالت میں محسن امت صدیق اکبرؓ کے ہاتھوں امت کی ڈھارس بندھی۔وہ ہی بلائے گئے تو آئے اور نبی ﷺ کی بازؤں پر ہاتھ رکھ کر پیشانی کو بوسہ دیا''وانبیّــــاہ''''واخــــلیــــلاہ'' کہہ کر دردِغم کا اظہار کیا۔اور وفات نبی ﷺ کے سلسلے میں صحابہ کرامؓ کے اضطراب کو ختم کردیا۔صدیقؓ کا حوصلہ دیدنی تھا۔صحابہ کرام نے وفات،تدفین،اس کی جگہ،نماز جنازہ وغیرہ امور میں آپؓ سے سوالات کیے اور تشفی بخش جوابات پائے۔تو تردد ختم ہوا۔آپؓ کے حکم سے حضرت علیؓ اوران کے معاونین نے حضور ﷺ کے غسل اور تکفین کا انتظام کیا۔تدفین کی جگہ میں اختلاف پیدا ہوا تو آپؓ نے حدیث سنا کر ان کی تشفی فرمائی اور حضرت عائشہؓ کا حجرہ اس سعادت سے سرفراز ہوا۔مگر اس سے قبل جنازہ پڑھنا تھا جو مصلحت اور وصیت نبوی کے مطابق انفرادی طور پر پڑھی گئی۔

اسی دوران نباض امت نے اہم ترین مسئلہ یعنی مسئلہ خلافت پر توجہ مبذول کروائی۔مہاجرین کا شوریٰ طلب کیا ان کی نشاندہی پر انصار کو اپنا ہمنوا بنانے کیلئے حضرت عمرؓ کو ساتھ لیکر سقیفہ بنوساعدہ تشریف لے گئے۔ان کو مطمئن کروایا کہ خلافت بحکم نص قریش میں ہوگی اور حضرت عمرؓ کی تجویز پر وہیں صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت کا مرحلہ طے ہوا جو اگلے مرحلے میں مسجد نبوی ﷺ میں تکمیل پذیر ہوا۔

اس کے بعد نبی اکرم ﷺ کی تدفین کا مرحلہ آیا تو منگل اور بدھ کی درمیانی رات کو حجرہ عائشہؓ میں ابوطلحہؓ کی کھودی ہوئی قبر میں طے ہوا۔حضرت عباسؓ،ان کے دو فرزند،حضرت علیؓ اور بعض دیگر صحابہؓ رات گئے تک اس میں مصروف رہے اور نبوت کا سراج منیر سپرد خاک ہوا۔آپ ﷺ کی وفات سے مدینے کی ہر چیز پر تاریکی چھا گئی بلکہ بقول حضرت انسؓ اس کا اثر دلوں میں بھی پایا گیا جو کہ انجان سے لگ رہے تھے۔صحابہ کرامؓ بلکہ ساری امت کیلئے اس سے بڑا صدمہ ہو نہیں سکتا۔اور اسی وجہ سے ایمان والوں کیلئے اس کے اجر کی توقع بھی رکھنی چاہئے۔کیونکہ آپ ﷺ ہی آخرت میں ان کا فرط،پیشرو اور سہارا ہونگے اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس اجر سے محروم نہ فرمائے۔آمین

انتخاب خلیفہ،تکفین وتدفین،نیز حالت وفات کے بارے میں بعض دیگر تفاصیل بھی اور کتابوں میں موجود ہیں یہاں صرف باب میں مذکور امور کا تذکرہ بطور خلاصہ کیا گیا ہے۔

۵۵. باب ماجاء فی میراث رسول اللہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے میراث کے بارے میں

میراث مثال واوی ہے اصل میں موراث تھا۔میم کے کسرہ کے سبب واو،یاء سے بدل کر میراث بنا۔یہ مصدر کا صیغہ ہے لیکن موروث اور اس مال پر بولا جاتا ہے جو میت اپنے پیچھے چھوڑتا ہے۔اس باب میں آپ ﷺ سے مالی میراث کی نفی اور علمی میراث کا اثبات مقصود ہے۔سابقہ باب سے مناسبت اس بات میں ہے کہ وفات کے بعد میت کی میراث کا مسئلہ پیش آتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے مالی وراثت نہیں چھوڑی: مصنفؒ اس باب میں جو احادیث لائے ہیں وہ اہل سنت والجماعت کے مسلک کے لئے واضح براہین ہیں۔جمہور صحابہ کا اس پر اجماع ہے کہ آپ ﷺ کی کوئی مالی وارثت نہیں۔آپ ﷺ کا چھوڑا ہوا مال اور ترکہ رشتہ داروں کو نہیں ملے گا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ تقریباً دس صحابہؓ سے یہ مسئلہ روایۃً منقول ہے اور اس میں صحابہ اور اہلسنت والجماعت کا کوئی اختلاف نہیں تھا۔لیکن بعد میں آل سبا شیعوں نے اس بات کو خوب اچھالا۔ اور بدتمیزی کا طوفان کھڑا کر کے خلفاء راشدین خصوصاً شیخینؓ پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے ظالمانہ طریقوں سے آپ ﷺ کی میراث سے آپ ﷺ کی اولاد کو محروم کردیا۔حضرت فاطمہؓ اور آپ ﷺ کے دیگر ورثاء کو میراث نہیں دیا۔

رسول اللہ ﷺ کی ذخیرہ اندوزی سے نفرت: زندگی میں نبی کریم ﷺ کا معمول تھا کہ کوئی چیز اپنے پاس بطور ذخیرہ نہیں رکھتے تھے۔جو آتا اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کردیتے تھے۔زیادہ کوشش یہ ہوتی تھی کہ میری ملکیت میں کوئی چیز نہ رہ جائے۔لیکن بعض چیزیں ایسی تھیں جن کو آپ ﷺ نے بعض مصالح کی وجہ سے مجبوراً محفوظ کر کے اپنی تحویل میں چھوڑ دیا تھا۔ان میں سے وہ صفایا بھی تھیں جو کہ آپ ﷺ نے اجتماعی مفادات کی خاطر اپنے پاس رکھی تھیں۔ان میں فدک کی آدھی زمین،وادی القریٰ کا ایک تہائی،خیبر کی خمس کا ایک حصہ،اور بنونضیر کی کچھ زمینیں تھیں جو اسلامی حکومت کی سربراہ کی حیثیت سے آپ ﷺ کی

تحویل میں تھیں کیونکہ جہانبانی میں بہت سے مسائل ایسے ابھرتے ہیں جو کسی فوری فنڈ کا تقاضا کرتی ہیں۔ ایسے مواقع پر آپ ﷺ کی زندگی میں بھی ان زمینوں کے محاصل امت اسلامیہ کے اجتماعی مصالح میں صرف ہوئے تھے۔ اوران کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے وفات کے بعد کے لئے بھی واضح احکام بیان کئے۔

آپ ﷺ نے فرمایا(نحن معشر الانبیاء)لانورث ماتر کناصدقة(۱)

ہم انبیاء سے میراث نہیں پائی جاتی ہم جو بھی چھوڑتے ہیں وہ عامۃ المسلمین پر صدقہ ہوتا ہے۔

نیز فرمایا إنّ الانبیاء لم یورّثو ادینار أو لا درھما انّماورثو العلم(۲)

بیشک انبیاءؑ کی میراث دیناراور درہم نہیں ہوتی۔ وہ تو علم میراث میں چھوڑتے ہیں۔

اوراس حکم میں بہت بڑی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ انبیاء کے عدم ارث کی بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ پیغمبر کی تمام کوششیں، مساعی اور جدوجہد خالصۃً لوجہ اللہ ہوتی ہیں۔ وہ تمام قربانیاں کسی لالچ یا غرض کے بغیر کرتا ہے تا کہ کوئی یہ نہ کہے کہ اس شخص نے انقلاب کی دعوت دے کر تحریک اس لئے چلائی تھی کہ آخر میں گھر کے لئے ثمرات حاصل ہوں۔ آپ ﷺ کی زبان سے بلکہ تمام پیغمبروں کی طرف سے قرآن نے اعلان کیا کہ

ماأسئکم علیه من اجرٍ ان اجری الاّعلی رب العالمین (شعراء۱۰۹)

میں اس پر تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا۔ میرا صلہ نہیں ہے مگر رب العالمین پر ہے۔

نیز فرمایاام تسئلھم اجراً فھم من مغرمٍ مثقلون (طور ۴۰)

کیا تم ان لوگوں سے کچھ معاوضہ مانگتے ہو کہ وہ تاوان ان لوگوں پر گراں ہو۔

اس کے برعکس دنیا میں بڑے بڑے انقلابی اور نام نہاد رہنما ابتداء میں تو بڑی تکلیفیں جھیلتے ہیں۔ قیدوبند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے ہیں۔ لیکن جب سربراہی اور حکومت ملتی ہے تو ساری مملکت کو اپنی جاگیر سمجھ لیتے ہیں۔ اسی طرح بڑے پیر اور مصلحین جفاکشی کی زندگی گزار لیتے ہیں تا کہ لوگ ان کی اولاد

(۱)صحیح بخاری شریف ۱۰۸۵/۲ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة باب مایکرہ من التعمق والتنازع فی العلم(مختار)

(۲)جامع ترمذی ۵۵۴/۲ کتاب العلم باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة(مختار)

کوسر پر اٹھائے پھرتے رہیں اور جاگیریں ان کے نام لکھتے رہیں۔اس لئے یہ بھی دنیاداری اور چالاکی کا ایک طریقہ بن سکتا ہے کہ پچاس ساٹھ سال تک تکلیفیں جھیل کر اولاد و خاندان کے لئے طویل المیعاد رعائتیں اور عنایتیں حاصل کر لی جائیں۔اکثر نام نہاد قومی یا علاقائی مصلحین نے ایسا ہی کیا ہے۔

جبکہ نبی کریم ﷺ نے اپنی زندگی میں یہ اعلان کیا کہ میں تم سے کوئی اجرت نہیں مانگوں گا۔اور وہ امکانات جو آل و اولاد کے لئے ہوسکتی تھیں ختم کر دیئے۔مثلاً زکوۃ آمدنی کا بڑا ذریعہ تھا۔تمام امت کے مستحقین محتاج فقراء اور مساکین کے لئے اس کا لینا جائز ہے۔لیکن آپ ﷺ نے اپنی اولاد و اقارب پر اسے حرام قرار دیا۔تاکہ خاندان کو یہ عام مادی فائدہ پہنچنے کی تہمت بھی نہ لگائی جاسکے۔اور کوئی یہ نہ کہے کہ شکرانوں کا ایک بڑا دروازہ اہل بیت کے لئے کھول دیا ہے۔آج ہمارے ہاں پیر حضرات کروڑپتی بھی ہوں لیکن لوگ کسی بزرگ کے ساتھ نسبت ہونے کی بناء پر اسے شکرانے دیتے ہیں۔آپ ﷺ نے یہ شکرانے بھی اپنی اولاد پر بند کر دیئے(۱)۔اور اسی وجہ سے آپ ﷺ میراث کے مسئلہ میں بھی تصریح فرماتے ہیں کہ مجھ سے اگر تھوڑا بہت باقی رہ جائے تو میری اولاد کو نہ دیا جائے بلکہ وہ تمام ملت اسلامیہ کا مال اور بیت المال کا حق ہے۔

<u>ترکہ میراث نہ بننے کی حکمتیں:</u> آج بھی مستشرقین اعدائے اسلام اور اعدائے رسول ہر قسم کی کرتوتیں کرتے ہیں۔ لیکن کسی کو یہ انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے جاہ، منصب، عہدے اور مادی مفادات کیلئے یہ جدوجہد کی تھی۔کیونکہ ابھی باب عیش رسول اللہ ﷺ اور کتاب کے اوائل میں تم نے نبی کریم ﷺ کے گھر کی حالت کے بارے میں پڑھا۔کپڑوں، کھانے پینے اور سامان رہائش کی حالت پڑھی کہ ہفتوں اور مہینوں پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا تھا۔گھر والے بھی بھوکے، کپڑوں میں پیوند در پیوند اور حجرے کا چھت یوں کہ آدمی سیدھا کھڑا نہیں ہوسکے۔بلکہ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ میں ابھی بالغ بھی نہیں ہوا تھا۔کہ نبی کریم ﷺ کے حجرۂ مبارکہ میں داخل ہوا اس حالت میں بھی سر حجرے کی

---

(۱) عن ابی هريرةؓ قال اخذ الحسن بن علیؓ تمرة من تمر الصدقة فجعلها فی فيه فقال النبی ﷺ كخ كخ ليطرحها، ثمّ قال اماشعرت انّالاناكل الصدقة (بخاری شریف ج ۱ ص ۲۰۲)(اصلاح الدین حقانی)

چھت سے لگ رہا تھا۔ تنگ اتنا تھا کہ دو آدمی اس میں بمشکل سو سکتے تھے۔ بارش میں چھت بہنے لگتی تھی۔ دروازوں کی بجائے چادر اور ٹاٹ لٹکائے گئے تھے۔ چھت کھجوروں کی شاخوں سے بنی ہوئی تھی۔ یہ زندگی گزارنے کی حالت تھی اور زندگی کے بعد بھی آپ نے دیکھا کہ میراث اور صدقہ زکوٰۃ کا راستہ اہل خانہ پر بند کردیا۔ حالانکہ میراث تو خود انسان کے ذاتی مال میں جاری ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے تا کہ یہ بات خوب واضح ہوجائے کہ آپ ﷺ نے خالص اللہ تعالیٰ کے لئے یہ کوششیں فرمائی تھیں۔ نہ اپنی ذات کیلئے نہ اپنے خاندان کے لئے۔

علاوہ ازیں آپ ﷺ ساری امت کے روحانی باپ بھی ہیں بعض قراءت میں **النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسھم و ازواجه امّھٰتھم** کے ساتھ یہ بھی آیا ہے کہ **وھو ابٌ لھم** اور اگر یہ تصریح نہ ہوتو بھی **وازواجه امّھٰتھم** سے دلالت النص کے طور پر آپ ﷺ کی ابوّت ثابت ہوتی ہے۔ نیز امت کیلئے ازواج مطہرات کے ساتھ نکاح کی حرمت کی ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے کہ آپ ﷺ امت کے باپ ہیں۔ بہرحال آپ ﷺ کی ابوّت تمام امت کیلئے ہوتو میراث بھی تمام امت کو ملے گی نہ کہ بعض افراد کو۔

تیسری وجہ عدم ارث کی یہ بھی ہے کہ انبیاء کی حیات برزخی دوسرے اموات کی نسبت زیادہ قوی ہوتا ہے وہ حیات جیسے بھی ہولیکن دنیوی حیات کے قریب تر ہے۔ اور زندوں کی میراث تقسیم نہیں کی جاتی۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ نبی کے ہاتھ میں جو مال ہوتا ہے وہ خود کو اس مال کا مالک شمار نہیں کرتا تھا۔ بلکہ خود کو اللہ تعالیٰ کا نائب اور خلیفہ شمار کرتا تھا۔ اور نیابت کی حیثیت سے ملا ہوا مال ذاتی ملک نہیں ہوتا۔ بلکہ درحقیقت وہ مخلوف عنہ کا ہوتا ہے۔ خلیفہ تو زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس قومی اور اجتماعی امانت میں متولی ہوتا ہے۔ اور واضح ہے کہ مخلوف عنہ کا مال متولی کے ورثاء میں تقسیم نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ اس کا ہوتا نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے بھی عملاً یہ ثابت کردیا کہ فدک اور خیبر کی جائیداد انہوں نے اجتماعی مفادات اور مصالح کیلئے چھوڑ رکھی ہے اور اس لئے آپ ﷺ نے کسی کو اس میں حق تملیک نہیں دی بلکہ ملک خداوندی میں خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے تصرف کرتے رہے۔

اس کے علاوہ عدم ارث میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اگر بالفرض آپ ﷺ کی وراثت جائز ہوتی

تو بہت سے ورثاء شاید ایسے بھی ہوں جن کے دل میں یہ تمنا آئے کہ نبی کریم ﷺ اب مرجائیں۔تاکہ ہمیں ان کا میراث مل جائے۔جس طرح کہ خوانین اور نوابوں کی اولاد ان کی موت کے انتظار میں ہوتے ہیں تاکہ مال حاصل ہو کر عیش وعشرت کا موقع مل سکے بلکہ کئی ظالم وارث تو ایسے بھی دیکھنے میں آئے ہیں جو اپنے مورث کو ٹھکانے لگادیتے ہیں تو اگرچہ آپ ﷺ کے ورثاء میں کوئی یہ جرأت نہ بھی کرسکتا۔لیکن آپ ﷺ کی موت کی تمنا یا موت کے بعد میراث پاکر آپ ﷺ کی موت پر خوش ہونے کا خطرہ تھا۔اور ان دونوں صورتوں میں اس وارث کا کفر لازم تھا۔اب عدم ارث کی صورت میں سرے سے یہ امکان ہی جاتا رہا(۱)۔

بہر حال آپ ﷺ نے یہ مسئلہ قبل از وفات ظاہر کیا تھا۔تمام جلیل القدر صحابہ کو یہ معلوم تھا لیکن جب نبی کریم ﷺ وفات پائے اس وقت بعض صحابہ کو پتہ نہ تھا۔ساتھ ساتھ منافقین وسازشی لوگ ہر وقت انکے کان بھرتے رہے کہ نعوذ باللہ ابو بکرؓ وعمرؓ ظالم ہیں۔اور نبی کریم ﷺ کی میراث کو غصب کررہے ہیں۔ اور اسی کو بنیاد بنا کر شیعوں نے اپنے علم کلام کی روح کو بعض صحابہ سے بھردیا۔نیز ابتدائی ایام میں بعض صحابہ کی طرف سے شیخین کے اس عمل پر ناراضگی کو خوب بڑھا چڑھا کر بطور استدلال بیان کیا۔

حالانکہ یہ خالص بکواس ہے۔کیونکہ اول تو یہ سوچنا چاہئے کہ حضرت صدیق اکبرؓ جب خلیفہ ہوئے تو محض نبی کریم ﷺ کے احکامات کی تعمیل کرتے رہے۔نظام مملکت اور حکومت کی تشکیل میں آپؓ کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔جو ورثہ میں ملا وہی نافذ کیا۔اموال وریاست کے احکام میں محض تابع تھے۔اس مملکت کے بانی تو نبی کریم ﷺ خود تھے۔اب اگر وہ الزام لگائیں تو نعوذ باللہ نبی کریم ﷺ پر لگائیں کہ یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہے۔اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دل میں یہ لوگ یہی عناد اور یہی بُغض وخبث لئے پھرتے ہیں۔اس یہودنواز ٹولے کا مقصد ابتداء ہی سے نبی کریم ﷺ کے دین کی مخالفت تھی اور ہے۔لیکن اپنے تقیہ اور خوف

(۱) ملاعلی قاریؒ نے دو اور حکمتیں بھی بیان کی ہیں۔اول یہ کہ انبیاء سے اقرباء کی وراثت کو دیکھ کر لوگ دنیا اور اس کو جمع کرنے کی طرف راغب ہونگے۔دوم یہ کہ لوگ یہ سوچیں گے کہ انبیاء کا فقر اختیاری نہیں تھا۔ورنہ وہ بھی ہماری طرح مال جمع کرکے وارثوں کیلئے چھوڑنے کی فکر میں نہ ہوتے۔اور دونوں باتیں شریعت کے مزاج کے منافی ہیں۔دیکھیں جمع الوسائل ج۲ص ۲۲۸۔(اصلاح الدین)

کی وجہ سے اس کا برملا اظہار نہیں کرتے۔اوراس بات کی دلیل یہ ہے کہ کبھی کبھی جوش میں آکر یہ عناداور خبائث ظاہر بھی کردیتے ہیں۔

خمینی کی ملحدانہ باتیں: جس طرح کہ آج کے خمینی کو دیکھ لیں۔کہ اس کی تحریروتقریر اس پر شاہد ہے اور ہم تو اس بات پر اس کے شکرگزار ہیں کہ اس سے مزید تقیہ نہ ہوسکا اور ملت اسلامیہ کو مزید دھوکہ نہیں دے سکا۔اس نے ایک بڑے جلسہ میں جس میں اس کی مملکت کے سارے صنادید بھی موجود تھے کہا کہ ’’مجھے سب سے بڑا صدمہ اس بات پر ہے کہ جو اسلامی حکومت اور نظام مطلوب تھا وہ صدر اسلام سے آج تک قائم نہ ہوسکا۔

خود نبی کریم ﷺ کو بھی کچھ مخصوص حالات کے پیش نظر مکمل اسلامی نظام قائم کرنے کا موقعہ نہ مل سکا(۱)‘‘

گویا اس ظالم کے خیال میں نبی کریم ﷺ اپنے مشن میں ناکام ہو چکے ہیں اور اسلامی مملکت قائم نہیں کرسکے۔پھر اس تقریر میں شیخینؓ کو تو بالکل ہی گول کردیا۔لیکن آخر میں حضرت علیؓ پر بھی ہاتھ صاف کرکے کہہ دیا ہے کہ ’’ان کے زمانے میں بھی بدقسمتی یہ تھی کہ سازشوں کی بدولت وہ لوگ جو (نعوذباللہ) کفار سے بھی بدتر تھے۔حضرت علیؓ کے لئے رکاوٹ بنے اور وہ بھی اسلامی حکومت تشکیل نہ دے سکے‘‘۔بعد کے ائمہ اور بعد کے دور کے بادشاہوں کو تو وہ کب معاف کرسکتے ہیں۔دراصل یہ ساری چال اس دعوے کیلئے ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لئے جو اس کا پیغمبر بھی نہ کرسکا پیدا کیا ہے۔نیز وہ یہ بھی کہہ چکا ہے کہ قرآن کے معانی کو صحابہؓ میں سے کوئی بھی نہ سمجھ سکا۔گویا اب تک کے ساری تفاسیر بھی غلط ہیں۔بقول اس کے قرآن کی تفسیر صرف حضرت علیؓ کو معلوم تھی۔لیکن اس کو بھی وفات تک کوئی ایسا شخص نہ مل سکا۔جسے وہ یہ راز بتا سکے۔لیکن سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ وہ علوم خمینی تک کیسے پہنچ گئے؟

ایرانی انقلاب صیہونی انقلاب تھی: درحقیقت ایران کا انقلاب شیعہ انقلاب بھی نہیں بلکہ یہ صیہونی انقلاب ہے اور سیاسی منظر پر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔مثلاً حال ہی میں روسی علاقہ میں ایران

(۱)اس کے مزید تفصیلات کیلئے مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی کتاب انقلاب ایران وغیرہ دیکھئے۔

جانیوالا اسلحہ سے بھرا ہوا ایک جہاز گر گیا۔اس اسلحہ پر اسرائیلی مہر لگے ہوئے تھے۔دراصل عرب ممالک کو کمزور کرنے کے لئے ایسے لوگوں کی پشت پناہی امریکہ سمیت ساری صیہونی دنیا کر رہی ہے۔تاریخ اسلام کے حوالہ سے شیعیت روز اوّل سے اسلام کے لئے دردسر ہے۔اور تاریخ شاہد ہے کہ اسلامی دنیا میں جہاں بھی کوئی غداری اور سازش ہوئی اس میں اہل رفض کا ہاتھ ضرور ہوتا تھا۔

<u>میراث کے سلسلے میں شیعوں کا موقف:</u> میراث کے سلسلے میں شیعوں کا موقف یہ ہے کہ خلفاء راشدین نے فاطمہؓ پر ظلم کیا۔لیکن کیا نبی کریم ﷺ کے وارثوں میں فقط وہ تھیں۔نہیں بلکہ آپ ﷺ کے ورثاء میں تو صدیق اکبرؓ کی اپنی چہیتی بیٹی عائشہ صدیقہ بھی تھیں۔اسی طرح حضرت عمرؓ کی بیٹی حضرت حفصہؓ بھی تو وارث تھیں۔علاوہ ازیں دیگر ازواج مطہرات بھی زندہ تھیں۔علاوہ ازیں قوانین میراث کے مطابق حضرت علیؓ کا تو میراث میں حق بھی نہیں بنتا تھا۔

تو سوال یہ ہے کہ کیا شیخینؓ اپنی اپنی بیٹیوں پر بھی ظلم کر رہے تھے۔اور کیا ایک وسیع سلطنت میں غصب اور ظلم کے لئے صرف نبی کریم ﷺ کی وراثت ہی نظر آئی۔واضح بات ہے کہ ایسا نہیں بلکہ یہ سب کچھ خود نبی کریم ﷺ کے فرمان کا نتیجہ تھا جس کی حکمتیں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔حضرت عائشہؓ خود بھی ورثاء میں سے تھیں مگر جب دوسری امہات المؤمنینؓ نے ان کے پاس آ کر پوچھا کہ ہمیں میراث سے حصہ کیوں نہیں دیا جاتا۔تو آپؓ نے جواب میں یہی کہا کہ کیا میں نبی کریم ﷺ کی بیوی نہیں۔لیکن کیا تم کو نبی کریم ﷺ کی وہ بات یاد نہیں کہ میری میراث تقسیم نہیں ہوگی۔تو تمام ازواج مطہرات نے اس کا اعتراف کیا۔اور دعویٰ سے رُک گئیں (۱)۔

یہاں یہ تو ہم ضروری ہوتا ہے کہ یہ ازواج اپنا حصہ مانگنے کیوں آئی تھیں۔حالانکہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے فرمان کو سنا بھی تھا۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ یا تو ازواج وہ حدیث بھول چکی ہونگیں اور پھر

(۱) قال عروۃ انا سمعت عائشۃؓ زوج النبی ﷺ تقول ارسل ازواج النبی ﷺ عثمانؓ الی ابی بکرؓ یسئلنہ ثمنہن ممّا افاء اللّٰہ علی رسولہ ﷺ فکنت انا اردّھن فقلت لھن الاتتقین اللّٰہ الم تعلم ان النبی ﷺ کان یقول لانورث ماترکناہ صدقۃ....فانتھی ازواج النبی ﷺ الی مااخبرتھنّ الخ.

(بخاری ۵۷۶/۳ کتاب المغازی حدیث بنی النضیر) (اصلاح الدین)

حضرت عائشہؓ نے انہیں یاددلایا۔اوریا یہ کہ ان ازواج مطہرات کا خیال تھا کہ نبی کریم ﷺ کا یہ فیصلہ منقول اشیاء کے بارے میں ہے۔اورشاید غیر منقولہ اشیاء میں یہ بات نہ ہو۔جبکہ فدک اورخیبروغیرہ زمینیں تو غیر منقولہ جائدادیں ہیں۔اور جب پوچھا تو حضرت عائشہؓ نے اس حدیث کی تعمیم کی طرف اشارہ کردیا۔

شیعوں کا ایک استدلال یہ بھی ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ دونوں بعد میں بھی بار بار حضرت عمرؓ کے پاس مذکورہ زمینوں کے سلسلے میں آکر مطالبات پیش کرتے ہیں۔جس طرح اس باب اور بخاری شریف کی احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں عدم ارث کی بات پر مطمئن نہیں تھے۔لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ محققین کی تحقیق کے مطابق حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کا شیخینؓ کے پاس دعویٰ یہ نہ تھا کہ وہ ہمیں ملکیت کے طور پر یہ علاقہ دے دیں۔بلکہ سب سے پہلے مطالبے کے بعد ہی صدیق اکبرؓ نے یہ بات واضح کردی تھی کہ یہ سرکاری زمین ہے اور سرکاری زمین مختلف لوگوں کی تحویل میں عموماً ولایت کے طور پر دی جاتی ہے۔یہ متولّی صرف اس کا انتظام چلاتے ہیں۔نہ یہ کہ ان کی ملکیت ہوجائے۔تو یہ دونوں حضرات بھی انتظام اپنے اپنے ہاتھ میں لینے آئے تھے۔اور حضرت عمرؓ نے بھی بخوشی یہ زمین (۱) ان کی تحویل میں دی تھی۔پھر جب تولّی کے سلسلے میں دونوں میں اختلاف ہوگیا تو وہ دونوں پھر سے ولایت کے سلسلے میں آئے۔شیعہ لوگ پہلے کی طرح اس بار بھی یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ ملکیت کا نیا دعویٰ کررہے ہیں۔حالانکہ جب دونوں صدیق اکبرؓ کے سامنے اور پھر حضرت عمرؓ کے سامنے ایک بار اعتراف کرچکے تھے۔کہ یہ زمین ہماری نہیں ہے تو کیا وہ دیوانے تھے کہ وہی دعویٰ پھر سے کرتے۔لہٰذا حضرت عمرؓ کے زمانے میں دراصل ان کا دعویٰ ملکیت کا نہ تھا بلکہ حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ چونکہ مشترکہ طور پر ان اراضی کا انتظام نہیں چلاسکے۔تو یہ مطالبہ لے کر آئے کہ ہمارے درمیان یہ زمین انتظام کے لئے تقسیم کردیں۔حضرت عمرؓ نے وہ دعویٰ اس لئے مسترد کردیا کہ اس طرح اگر تقسیم در تقسیم شروع ہوجائے تو لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہونگے کہ یہ شاید نبی کریم ﷺ کی وراثت تھی۔جو ورثاء کے درمیان تقسیم ہوچکی ہے۔حضرت عمرؓ کی حساس نظر نے اس خطرہ کو محسوس کیا کہ لوگ تولیت کی بجائے اسے تملیک سمجھیں گے۔لہٰذا حضرت عمرؓ نے

---

(۱) بخاری شریف وغیرہ کتب حدیث کی روایات میں تصریح ہے کہ صرف مدینہ میں بنونضیر کی زمین کی تولیت ان حضرات کو ملی تھی جہاں تک فدک اور خیبر کی زمین تھی وہ خود امیر المؤمنینؓ کے تصرف میں تھی۔(اصلاح الدین)

ان کو وہی حدیث پیش کر کے واپس کر دیا۔

پھر ہم یہ کہتے ہیں کہ چلو بالفرض شیخین ؓ اور حضرت عثمان ؓ نے تو ظلم کر دیا ہوگا تو حضرت علی ؓ کو بھی تو خلافت ملی تھی انہوں نے اس غلط فیصلے کو کیوں برقرار رکھا۔ کیا وہ تینوں ظالم ہے اور حضرت علی ؓ ظالم نہ ہوئے۔ پھر چھ مہینے خود حضرت حسن ؓ کو بھی خلافت ملی تھی کیا وہ بھی اپنی ماں کی میراث حاصل نہ کر سکے۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ اراضی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور تک اسی طرح بیت المال کے تصرف میں رہیں (۱)۔

شیعوں کا ایک اور الزام یہ ہے کہ حضرت فاطمہ ؓ ابوبکر ؓ سے ناراض تھیں۔ لیکن اول تو یہ مسلّم نہیں کہ وہ خفا تھیں اور بالفرض اگر وہ خفا تھیں تو کیا ہوا۔ شریعت کا حکم ان کی رضا جوئی کے لئے نہ شیخین توڑ سکتے ہیں نہ عثمان ؓ نہ علی ؓ اور نہ کوئی اور۔ ناراضگی کی ثبوت میں یہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہ ؓ نے چھ مہینے تک حضرت ابوبکر صدیق ؓ سے ملاقات تک نہیں کی۔

لیکن اوّل تو یہ بات ہے غلط۔ کیونکہ اس باب میں ملاقات کا ذکر ہے۔ دوسری یہ کہ حضرت فاطمہ ؓ تو بتول ہیں۔ مجسمہ حیاء ہیں۔ وہ کیسے ایک غیر مرد سے ملاقات کرتی۔ ابوبکر صدیق ؓ ان کا کیا لگتا تھا؟ لوگوں سے کنارہ کشی اور پردے کا زیادہ اہتمام کرنے کے سبب ہی تو حضرت فاطمہ ؓ کو بتول کہتے ہیں۔

نیز یہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے حضرت فاطمہ ؓ کی نماز جنازہ میں بھی شرکت نہیں کی۔ نہ حضرت علی ؓ نے ان کو اطلاع دی تھی۔ لیکن یہ بھی دراصل ایک شرارت ہے۔ کیونکہ حضرت فاطمۃ الزہراء ؓ رات کے وقت وفات پائی تھیں۔ جو کمال حیاء کے سبب ان کی خواہش تھی کہ میرے جنازے پر بھی کسی کی نظر نہ پڑے۔ اس زمانے میں جنازے پر پردہ لگانے کا رواج نہ تھا۔ تو اس لئے آپ ؓ کو اس بات کی فکر ہوتی تھی۔ پھر کسی نے بتایا کہ اس طرح جنازے پر پردے کا بھی ایک طریقہ ہو سکتا ہے۔ یہ سن کر آپ ؓ خوشی سے ہنس پڑی۔ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا جب آپ ہنسی تھیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ ؓ کی حیا کی لاج رکھتے ہوئے آپ ؓ کو رات کے وقت موت دے دی۔ اور اس زمانہ

---

(۱) قال (عروةؓ) فكانت هذه الصدقه بيد علىؓ منعها علىؓ فغلبه عليها. ثم كان بيد حسن بن علىؓ ثم بيد حسين بن علىؓ وحسن بن حسنؓ كلاهما كان يتداولانها. ثم بيدلزيدبن حسن وهى صدقة رسول اللهﷺ حقا (بخارى ۲/۵۷۶ كتاب المغازى. حديث بنى النضير) (اصلاح الدين)

میں مرنے والوں کی موت کا ڈھنڈورا پیٹنے اور اعلانات کا رواج نہ تھا۔ تو اگر حضرت ابوبکر صدیقؓ کو تکلفات سے کنارہ کشی کی خاطر اطلاع نہیں دی گئی تو اس میں کیا قباحت ہے۔ خصوصاً جبکہ حضرت علیؓ نے راتوں رات خود ہی تکفین وتدفین کے مراحل طے کردیئے۔ اور یہی امر حضرت فاطمہؓ کے منشاء کے مطابق تھا۔

(۱) حدثنا احمد بن منیع ثنا حسین بن محمد ثنا اسرائیل عن ابی اسحاق عن عمرو بن الحارث اخی جویریة له صحبة قال ماترک رسول اللہ ﷺ الا سلاحه وبغلته وارضا جعلها صدقة(۱).

ترجمہ: عمرو بن الحارثؓ جو صحابی اور ام المؤمنین جویریہؓ کے بھائی ہیں۔ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے پیچھے نہیں چھوڑا مگر اسلحہ خچر اور کچھ زمین جسے آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں وقف کردیا تھا۔

عمرو بن الحارثؓ بن ابی ضرار ، یہ حضرت جویریہ بنت الحارثؓ کے بھائی ہیں۔ جو امہات المؤمنین میں سے ہیں۔ قلیل الحدیث صحابی ہیں۔ خود رسول اللہ ﷺ سے اور کبھی اپنی بہن حضرت جویریہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ اسی طرح حضرت ابن مسعودؓ اور ان کی بیوی زینبؓ سے بھی روایات کرتے ہیں ۵۰ھ کے بعد تک زندہ رہے۔ البتہ تاریخ وفات معلوم نہیں ہے۔ ان کا تعلق بنوالمصطلق سے ہے۔

الا سلاحه مثلاً آپ ﷺ نے تلوار، نیزہ، زرہ، خود اور حربہ چھوڑا تھا۔ **وارضا** زمین میں آپ ﷺ نے فدک، وادی القریٰ کا تہائی حصہ، خیبر کے خمس کا حصہ اور بنی نضیر کی زمین چھوڑی تھی۔

جعلها صدقة الخ، جعلها کی ضمیر میں اختلاف ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ضمیر صرف ارض یعنی زمین کو راجع ہے۔ یعنی آپ ﷺ نے زمین کو صدقہ کردیا تھا۔ اور مطلب یہ ہے کہ زمین کے بارے میں آپ ﷺ نے زندگی میں یہ بتایا تھا کہ یہ صدقہ ہے۔ یعنی وقف مال کی طرح اس کی منفعت عام لوگوں کے لئے ہے۔ جبکہ اسلحہ وغیرہ چیزیں صرف آپ ﷺ استعمال کرتے تھے۔ ملا علی قاریؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ جبکہ علامہ کرمانیؒ کہتے ہیں کہ ضمیر تینوں اشیاء یعنی اسلحہ، خچر اور زمین کو راجع ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری ۱/۳۸۲ کتاب الوصایا باب الوصایا وقول النبی ﷺ، سنن الدارقطنی ۴/۱۸۵، مسند احمد ۴/۲۷۹ (مختار)

<u>نبی اکرم ﷺ کا دیگر ترکہ:</u> بعض اہل سیر نے مذکورہ تین چیزوں کے سوا اور چیزیں بھی آپ ﷺ کے ترکہ کے طور پر ذکر کی ہیں۔ مثلاً آپ ﷺ کے استعمال میں بیس اونٹنیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ جن کا دودھ آپ ﷺ کے پاس لایا جاتا تھا۔ اسی طرح سات بکریوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جو ام ایمنؓ چرایا کرتی تھیں۔

علامہ مناویؒ نے ان اونٹوں اور بکریوں میں سے ایک ایک کا نام ذکر کیا ہے۔ بلکہ وہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے پاس سو بکریاں تھیں(۱)۔ اسی طرح بعض برتنوں اور کپڑوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔

ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں جو حصر مذکور ہے کہ ان تین چیزوں کے سوا اور کوئی چیز آپ ﷺ نے نہیں چھوڑی تو یہ حصر اضافی یا ادّعائی ہے۔ اور یا پھر دیگر اشیاء کا اعتبار قلت کی وجہ سے نہیں کیا گیا ہے۔ جہاں تک جانوروں کا تعلق ہے تو وہ یا تو صدقہ کے اونٹ تھے یا پھر منائح تھیں۔ یعنی ایسے جانور جو دودھ حاصل کرنے کیلئے لوگوں نے عاریتاً آپ ﷺ کو دی تھیں۔

(۲) حدثنا محمدبن المثنی ثناابو الولید ثناحماد بن سلمة عن محمد بن عمرو عن ابی سلمة عن ابی ہریرةؓ قال جاء ت فاطمة الی ابی بکرؓ فقالت من یرثک فقال اھلی وولدی فقالت مالی لاارث ابی فقال ابوبکر سمعت رسول اللہ ﷺ یقول لانورث ولکنی اعول من کان رسول اللہ ﷺ یعولہ وانفق علی من کان رسول اللہ ﷺ ینفق علیہ(۲).

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضرت فاطمہؓ ابوبکر صدیقؓ کے پاس تشریف لائیں اور پوچھا کہ تمہارا وارث کون ہوگا۔ انہوں نے فرمایا کہ میرے گھر

---

(۱) مناوی ج۲ ص ۲۸۹ علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے کہ آپ ﷺ نے ایک جوڑا (چادروں کا) ایک عمانی تہہ بند، دو صحاری کپڑے ایک صحاری اور ایک سحولی قمیص ایک یمنی جبہ ایک خمیصہ ایک سفید کمبل تین یا چار چھوٹی ٹوپیاں، ایک ورس سے رنگی ہوئی اوڑھنی اپنے ترکہ میں چھوڑ دی تھیں۔ دیکھیں المواہب اللدنیہ ص ۲۹۵۔ (اصلاح الدین)

(۲) مسند احمد ۱/۱۰، جامع ترمذی ۲/۲۲۴ کتاب السیر باب ماجاء فی ترکة رسول اللہ ﷺ (مختار)

والے اور میری اولاد۔اس پر حضرت فاطمہؓ نے پوچھا کہ پھر کیوں میں اپنے والد کی وارث نہیں بنتی؟ابوبکر صدیقؓ نے کہا کہ میں نے نبی اکرمﷺ سے سنا وہ فرمارہے تھے کہ "ہم (انبیاء) سے کوئی شخص (مالی) وارث نہیں پاتا" البتہ میں (وقف مال سے) ان لوگوں کی کفالت کروں گا۔جن کی کفالت نبی اکرمﷺ فرماتے تھے اور جن لوگوں پر آپﷺ مال خرچ کرتے تھے۔میں بھی ان پر مال خرچ کروں گا۔

فقالت من یرثک حضرت فاطمہؓ حضرت ابوبکرؓ سے ان کے وارثوں کے بارے میں اس لئے پوچھتی ہیں تا کہ ان کے اقرار کے بعد ان پر الزام کرسکیں۔**فقال اهلی وولدی** صدیقؓ بھی مداہنت سے کام نہیں لیتے تھے۔نہ کسی چالاکی سے حضرت فاطمہؓ کو ٹالنے کی کوشش کی۔بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ میری اولاد اور گھر والے وارث ہونگے۔اور جب حضرت فاطمہؓ نے یہ کہہ دیا کہ پھر مجھے میرے باپ کی میراث سے کیوں محروم کیا جاتا ہے تو فرمایا کہ میرا اور نبی کریمﷺ کا حکم الگ ہے۔مسئلہ یہ ہے کہ میری میراث میری اولاد کو ملے گی۔اور نبی کریمﷺ کی میراث خود ان کی ہدایت کے مطابق بیت المال کو جائے گی۔یہ تو حکم تھا۔جو وہ بیان کر چکے۔لیکن نفس الامر میں ابوبکر صدیقؓ کا مال بھی ان کے ورثاء نہیں لے سکے کیونکہ آپؓ بیت المال سے جو تھوڑا سا وظیفہ زمانہ خلافت میں لیتے رہے۔اخیر عمر میں اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ جو تنخواہ میں نے اب تک حکومت سے لی ہے وہ ساری واپس کر دو۔لہٰذا مرنے کے بعد اولاد کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔بلکہ میراث تو کجا انہوں نے اپنے مال سے باپ کا قرضہ چکایا۔اور وصیت کے مطابق آپؓ کا سارا مال بھی بیت المال میں داخل کر دیا۔

لکنّی اعول الخ،حضرت ابوبکر صدیقؓ تو نبی کریمﷺ کے بھائی دوست اور دست راست تھے۔فرمایا کہ میں تمہیں میراث کے طور پر نبی کریمﷺ کے مال سے شرعی موانع کے سبب کچھ نہیں دے سکتا۔لیکن تمہاری ساری ضرورتوں کی کفالت مجھ پر ہے۔بلکہ نبی کریمﷺ اپنے خاندان میں جن لوگوں کے متکفل تھے وہ بیویاں ہوں یا غلام اور خدام ہوں ہم ان سب کا لحاظ کریں گے۔اور ان کے اخراجات کو برداشت کریں گے۔جس طرح خود نبی کریمﷺ ان کی کفالت کیا کرتے تھے۔

وانفق علی من الخ،یہ اعول کے لئے تفسیر بھی ہوسکتا ہے۔اور بعض لوگوں نے دونوں کے

درمیان فرق بیان کیا ہے کہ اعول علی من الخ سے مراد اہل بیت پر خرچ کرنا اور انفق علی من الخ سے مراد ان کے سوا دیگر متعلقین پر خرچ کرنا ہے۔

ابوبکر صدیقؓ کے جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ قانون وراثت اگرچہ قرآن میں موجود ہے۔لیکن اس حدیث کی وجہ سے جو کہ مشہور بلکہ متواتر ہے انبیاء اس قانون سے مستثنیٰ ہیں۔یا مطلب یہ ہے کہ انبیاء کا ملک ہی ان کی وصیت کے مطابق ان کے مال سے زائل ہو چکا ہوتا ہے۔لہٰذا ان کے مال میں وراثت جاری نہ ہوگی۔جبکہ حضرت فاطمہؓ کے خیال میں وراثت کے حق میں نبی اور غیر نبی میں فرق نہیں تھا۔اس لئے انہوں نے اطمینان کے لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے مطالبہ کر دیا۔

(۳) حدثنا محمدبن المثنیٰ ثنایحییٰ بن کثیر العنبری ابوغسان ثناشعبة عن عمرو بن مُرّة عن البختری ان العباس وعلیا جآء الی عمر یختصمان یقول کل واحدمنهماالصاحبه انت کذا انت کذا فقال عمر لطلحة والزبیر وعبدالرحمٰن بن عوف وسعد نشدتکم باللّٰه اسمعتم رسول اللّٰه ﷺ یقول کل مال نبیّ صدقة الاما اطعمه اللّٰه انالانورث وفی الحدیث قصة(۱).

ترجمہ: ابوالبختری سے روایت ہے کہ حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کے پاس (ان کی خلافت کے زمانے میں) جھگڑا لے کر آئے۔ایک دوسرے کو کہتا تھا کہ تم ایسے ہو دوسرا کہتا تھا کہ تم ایسے ہو۔حضرت عمرؓ نے (حاضرین حضرات) طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد (بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم) سے کہا کہ میں تم لوگوں کو خدا کی قسم دیتا ہوں کیا تم لوگوں نے نبی اکرم ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ نبی کا سارا ترکہ صدقہ (وقف) ہوتا ہے۔سوائے اس مال کے جو وہ اپنے اہل وعیال کو کھلائے۔ ہم انبیاء سے کوئی وراثت نہیں پاتا۔اس حدیث میں (مفصّل) قصہ مروی ہے۔

---

(۱)سنن ابی داؤد ۲/۵۹ کتاب الخراج والامارة والفئ باب فی صفایارسول اللّٰه ﷺ من الاموال السنن البیهقی ۶/۲۹۹،مسنداحمد ۱/۴،ابوداؤد الطیالسی رقم الحدیث ۶۱ (مختار)

عن ابی البختریؒ، ابو البختریؒ، سعید بن فیروز تابعی ہیں۔ان کے نام کے ضبط کے بارے میں علامہ ابن حجرؒ(۱) سے چوک ہوئی ہے۔ کیونکہ انہوں نے اسے حاء مھملہ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ حالانکہ یہاں باء کے بعد خاء معجمہ (نقطہ والی) ہے۔ پھر خود علامہ ابن حجر نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ بختر سے ہے۔ جس کا معنی خوش رفتاری ہے۔ چنانچہ علامہ ملا علی قاریؒ اور علامہ بیجوریؒ کے مطابق ابن حجرؒ کی غلطی ظاہر ہے۔ لیکن یہ غلطی ابن حجرؒ نے شاید شمائل کی شرح میں کی ہو کیونکہ تقریب میں وہ لکھتے ہیں "**بفتح الموحّدة والمثناة بينهما معجمةٌ ساكنةٌ**"(۲)

یہ بات بھی یاد رہے کہ ابوالبختری خود اس واقعے کے چشم دید نہیں ہیں۔ بلکہ ابوداؤدؒ کی روایات کے مطابق وہ یہ روایت حضرت مالک بن اوس بن حدثان (المتوفی ۹۲ھ) سے روایت کرتے ہیں۔ (کذا فی جمع الوسائل ج ۲ ص ۲۸۶) مالک بن اوسؓ کی روایت امام بخاریؒ نے مفصّل ذکر کی ہے۔

یختصمان ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے پاس وہ دونوں کوئی نیا دعویٰ لے کر نہیں آئے تھے۔ جائیداد کا دعویٰ تو پہلے ہی مسترد ہو چکا تھا بلکہ دراصل دونوں حضرات میں انتظامی امور میں اختلاف پیدا ہو چکا تھا۔ چونکہ بنی نضیر کی زمین کی ولایت حضرت عمرؓ نے دونوں کو دی تھی۔ اب اگر کہیں کوئی خرابی پیش آتی تو ایک کہتا کہ تمہاری وجہ سے یوں ہو گیا۔ دوسرا کہتا کہ نہیں بلکہ غلطی تمہاری تھی۔ اس نزاع کو نمٹانے کے لئے دونوں نے تقسیم یعنی ولایت کی تقسیم کا مطالبہ کر دیا۔

انت کذا انت کذا، ملا علی قاریؒ اور علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے کہ انت کذا سے مراد جھگڑنے والوں کے درمیان تلخ کلامی اور تیز الفاظ مراد ہیں۔ جو وہ ایک دوسرے کے بارے میں کہتے تھے اور جیسا کہ بعض شارحین نے لکھا ہے کہ یہاں گالیاں مراد ہیں۔ تو وہ دونوں کی شان کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بخاری کی شرح میں علامہ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ بعض روایات میں یہ لفظ مروی ہیں "**اقض بيني وبين هذا الظالم استبّا**" اور ایک روایت میں ہے "**اقض بيني وبين هذا الكاذب الآثم الغادر الخائن**"

---

(۱) علامہ مناویؒ نے بھی ابن حجرؒ کی تقلید میں یہی خطا کی ہے۔ (اصلاح الدین)

(۲) تقریب التہذیب ج ۲ ص ۳۶۰، دیکھیں فتح الباری باب فرض الخمس، اسی طرح بخاری شریف کتاب المغازی میں یہ حدیث تفصیل کے ساتھ ذکر ہے وہاں الفاظ یہ ہیں فاستبّ علیؓ و عباسؓ دیکھیں بخاری ص ۵۷۵، (اصلاح الدین)

تو اگر یہ الفاظ ثابت ہوں تو بقول ابن حجر یہ حضرت عباسؓ نے بولے ہوں گے۔ کیونکہ وہ علیؓ کے لئے باپ کے مرتبے پر ہیں۔ حضرت علیؓ سے ایسے الفاظ چچا کے بارے میں مستبعد معلوم ہوتے ہیں۔

فقال عمر لطلحة الخ، یعنی حضرت عمرؓ نے خود فیصلہ نہیں کیا بلکہ ان کو مطمئن رکھنے کے لئے ان کا مطالبہ شوریٰ میں پیش کیا۔ جو کہ تمام اہم معاملات نمٹاتی تھی۔ اس دن شوریٰ میں حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیر بن العوامؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جیسے جلیل القدر صحابہ بیٹھے تھے۔ یہ تمام صحابہ اور خود عمرؓ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔

وفی الحدیث قصہ یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ بخاری اور حدیث کی دیگر کتابوں میں نقل کیا گیا ہے۔ اور شراح حدیث نے اس کی تفاصیل بیان کی ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کے پاس آئے۔ دونوں بنی نضیر کی اس زمین پر جو کہ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے بطور فی دی تھی جھگڑ رہے تھے۔ حضرت عباسؓ نے کہا کہ اے امیر المؤمنین ہمارے درمیان آپ فیصلہ کر دیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنے پاس کے حاضرین سے کہا کہ میں تم کو اس اللہ کی ذات کی قسم دلاتا ہوں جس کے حکم سے زمین وآسمان قائم ہیں کہ کیا تم کو اس بات کا علم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے "**لا نورث ماترکناہ صدقة**" (یعنی ہماری میراث نہیں لی جاتی ہم جو کچھ چھوڑ دیتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے) حاضرین نے کہا کہ ہاں نبی کریم ﷺ نے یہ کہا ہے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ، حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے کہ میں تم دونوں کو اللہ تعالیٰ کی قسم دلاتا ہوں کہ کیا نبی کریم ﷺ نے یہ بات کہی تھی۔ انہوں نے کہا کہ ہاں آپ ﷺ نے یہ کہا تھا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا پس میں اس امر کے بارے میں تمہیں بتاتا ہوں۔ بیشک نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اس فی میں ایک یمنی چادر، ایک عُمانی تہہ بند، دو صحاری کپڑے، ایک صحاری قمیص، ایک سحولی قمیص، ایک یمنی جبّہ، ایک سیاہ مربّع کپڑا، ایک سفید چادر اور کچھ ٹوپیاں بھی دی تھیں۔ خدا کی قسم نبی کریم ﷺ نے تمہارے سوا وہ چیزیں کسی کو نہیں دیں۔ نہ کسی اور کو آپ ﷺ پر ترجیح دی بلکہ وہ چیزیں تمہیں دیں اور تمہارے درمیان تقسیم کر دیں (جہاں تک زمین کا قضیہ ہے) تو نبی اکرم ﷺ اس میں سے اپنے گھر والوں کا سالانہ نفقہ دیا کرتے تھے۔ اور جو کچھ اللہ جانتا ہے کہ میں اس میں سچا، صالح، ہدایت یافتہ اور حق کا اتباع کرنے والا ہوں۔

پھر تم دونوں اس سے قبل بھی میرے پاس آئے تھے۔تم دونوں کی بات اور مدعا ایک تھا۔اے عباسؓ تم میرے پاس آئے تھے اپنے بھتیجے کی میراث سے اپنا حصہ مانگنے اور یہ میرے پاس آیا۔آپ ﷺ کی بیٹی (فاطمہؓ) کا حصہ مانگنے۔تو میں نے تم سے یہی کہا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ "لانورث ما ترکناہ صدقۃ" پھر جب مجھے یہ مناسب لگا کہ میں یہ زمین تم دونوں کو دوں۔تو میں نے اس شرط پر یہ زمین تمہیں دی کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد و میثاق کرو۔کہ اس میں تم بھی ویسے ہی تصرف کروگے۔جیسے کہ نبی کریم ﷺ ،ابوبکرؓ اور میں نے اس میں اس وقت سے کیا جب سے یہ میری ولایت میں آئی تھی۔یہ کہہ کر حضرت عمرؓ نے حاضرین سے کہا کہ میں تم کو خدا کی قسم دلاتا ہوں۔کہ کیا میں نے یہ زمین ان دونوں کو اسی شرط پر دی تھی۔انہوں نے کہا کہ ہاں اس کے بعد حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا۔ میں تم دونوں کو قسم دلاتا ہوں کہ کیا میں نے یہ زمین تم کو اس شرط پر دی تھی۔دونوں نے کہا ہاں۔

حضرت عمرؓ نے کہا تو اب تم مجھ سے اس فیصلے کے سوا کوئی دوسرا فیصلہ چاہتے ہو۔پس اس اللہ کی قسم جس کے حکم پر زمین و آسمان قائم ہیں۔میں اس کے بارے میں کوئی دوسرا فیصلہ قیامت تک نہیں کروں گا۔ اور اگر تم اس کے تصرف سے عاجز آچکے ہو تو یہ زمین مجھے واپس کردو۔میں تم دونوں کی جگہ لے سکتا ہوں پھر اس کے بعد یہ صدقہ (یعنی اوقاف) حضرت علیؓ کے ہاتھ میں رہیں۔جو حضرت عباسؓ پر غالب آئے۔ان کے بعد حضرت حسنؓ کے ہاتھ میں۔ ان کے بعد حسینؓ اور ان کے بعد حضرت علی ابن الحسینؓ کے ہاتھ میں رہیں۔الحدیث(۱)۔

(۴) حدثنا محمدبن المثنی ثناصفوان بن عیسیٰ عن اسامۃ بن زید عن الزھری عن عروۃ عن عائشۃ ان رسول اللہ ﷺ قال لانورث ماترکنا فھوصدقۃ(۲).

---

(۱)بخاری شریف ۲/۱۱۸۵ کتاب الاعتصام بالکتاب باب مایکرہ من التّعمق والتنازع فی العلم وبخاری شریف ۱/۴۳۶باب فرض الخمس، وبخاری شریف ۲/۱۲۰ کتاب المغازی باب حدیث بنی النضیر (مختار) (۲)صحیح بخاری ۲/۵۷۵ کتاب المغازی باب حدیث بنی نظیر، سنن ابی داؤد ۲/۶۰ کتاب الخراج والامارۃ والفئ باب فی وصایارسول اللہ ﷺ من الاقوال، صحیح مسلم ۲/۱۲۰ کتاب الجھاد والسیر باب قول النبیؐ ﷺ لانورث ماترکناصدقۃ(مختار)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہم سے کوئی وراثت نہیں پاتا۔ ہم جو مال چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔

فھو صدقۃ، یعنی ہمارا ترکہ بیت المال میں جائے گا اور عامۃ المسلمین کیلئے وقف ہوگا۔

(۵) حدثنا محمدبن بشار ثنا عبدالرحمٰن بن مھدی ثنا سفیان عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی ھریرۃؓ عن النبی ﷺ قال لایقسم ورثتی دینارا ولادرھما ماترکت بعد نفقۃ نسائی ومؤنۃ عاملی فھو صدقۃ.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں فرمایا کہ میرے پسماندگان (میرے ترکہ میں سے دینار اور درہم تقسیم نہ کریں۔ میری بیبیوں اور میرے عامل کا خرچہ نکال کر میں جو کچھ چھوڑتا ہوں وہ صدقہ ہے۔

لایقسم ورثتی، یہ نفی یا نہی کا صیغہ ہے دونوں صورتوں میں مآل ایک ہی ہے۔ یعنی میرے ورثہ تقسیم مال کے مستحق نہیں ہیں۔ پھر اپنے عزیز و اقارب کو "ورثہ" بھی مجازاً کہا ہے۔ یعنی جو بالقوۃ وراثت کے اہل ہیں۔ ورنہ شرعاً وہ وارث نہیں ہیں۔

دیناراً ولادرھما، چونکہ غالباً ترکہ نقد کی شکل میں ہوتا ہے اور پھر تقسیم کے وقت تو سارے مال کی قیمت نقد سے لگائی جاتی ہے۔ اس لئے ان دونوں کا ذکر کیا ورنہ کسی بھی مال کی تقسیم وہ نہیں کر سکتے۔

بعدنفقۃ نسائی یعنی ازواج مطہرات کا نفقہ میرے ترکہ سے دیا جائے گا۔ کیونکہ نبی زندہ ہوتا ہے تو ان کی بیبیوں کا نفقہ پہلے کی طرح جاری ہوگا۔ دوم یہ کہ ان کے لئے دوسری جگہ نکاح ناجائز ہے۔ تو وہ معتدات کی طرح اپنے خاوند کے حق میں محبوس ہیں۔ سوم یہ کہ وہ مؤمنین کی مائیں ہیں تو مؤمنین کے لئے چھوڑے ہوئے مال میں سے ان کا نفقہ دیا جائے گا۔ کیونکہ ان کا نفقہ مؤمنین پر واجب ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری ۱/۳۸۹ کتاب الوصایا باب نفقۃ القیم للوقف، صحیح مسلم ۲/۸۹، ۹۰ کتاب الجھاد والسیر باب قول النبی ﷺ لانورث ماترکنا فھو صدقۃ، سنن ابی داؤد ۲/۵۸ کتاب الخراج والامارۃ والفیٔ باب فی وصایا رسول اللہ ﷺ من الاموال، السنن الکبریٰ للبیھقی ۶/۳۰۲، مسنداحمد ۲/۲۴۲ (مختار)

ومؤنة عاملی، عامل سے مراد بعض شراح کے نزدیک خلیفہ اور امیر المؤمنین ہیں۔ بعض کے ہاں اس سے مراد جائیداد کا انتظام چلانے والا، بعض کے خیال میں اس سے مراد صدقات کا عامل ہے۔ اور بعض نے مسلمانوں کے اجتماعی امور میں مصروف ہر کارندہ مراد لیا ہے۔

(٦)حدثنا الحسن بن علی الخلال ثنابشربن عمرقال سمعت مالک بن انس عن الزهری عن مالک بن اوس بن الحدثان قال دخلت علی عمرفدخل علیه عبدالرحمٰن بن عوف وطلحة وسعد وجاء علی والعباس یختصمان فقال لهم عمر انشدکم بالذی باذنه تقوم السّماء والارض أتعلمون ان رسول اللّٰهﷺ قال لانورث ماترکنا صدقة فقالوا اللهّم نعم وفی الحدیث قصة طویلة(١).

ترجمہ: مالک بن اوس بن الحدثانؓ کہتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو ان کے پاس عبدالرحمٰن بن عوف، طلحہ اور سعد رضی اللہ عنہم تشریف لائے۔ ان کے بعد علیؓ اور عباسؓ جھگڑتے ہوئے آئے۔ حضرت عمرؓ نے حاضرین صحابہؓ کو کہا کہ میں تم کو اس ذات کی قسم دلواتا ہوں جس کے حکم سے آسمان اور زمین قائم ہیں۔ کیا تم کو علم ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا "ہم (انبیاء) سے کوئی وراثت نہیں پاتا۔ ہم جو مال چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ تمام حضرات نے کہا کہ بیشک ہم نے سنا ہے۔ اس حدیث میں طویل قصہ ہے۔

مالک بن اوس بن الحدثانؓ، النصری کی کنیت ابوسعید تھی۔ صالح المرّی اور بعض اکابر کے بقول وہ صحابی ہیں۔ تقریب میں ابن حجرؒ نے بھی اسے صحابی کہا ہے۔ بلکہ نبی کریم ﷺ سے ان کی روایت بھی

(١)صحیح بخاری ٤٣٦/٢ کتاب فرض الخمس باب فرض الخمس، صحیح مسلم ٩٠/٢ کتاب الجهاد والسیرباب حکم الفیٔ، سنن ابی داؤد ٥٦/٢ کتاب الخراج والامارة والفیٔ باب صفایارسول اللّٰهﷺ من الاقوال، جامع ترمذی کتاب السیر باب ماجاء فی ترک رسول اللّٰهﷺ، السنن الکبریٰ للبیهقی ٢٩٧/٦ (مختار)

بعض کتب میں موجود ہے۔لیکن اکثر روایات عشرہ مبشّرہ اور دیگر اکابر صحابہ سے کرتے ہیں۔دوسری طرف ابن سعدؒ امام بخاریؒ اور بعض دیگر اکابر نے ان کو تابعی کہا ہے۔ابن حبانؒ اور ابن مندہ کہتے ہیں کہ ان کو صحابی سمجھنا وہم ہے۔اتنی بات ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں وہ بالغ آدمی بلکہ شہسوار تھے۔لیکن صحابیت میں تردد موجود ہے۔حضرت عمرؓ نے ان کو اپنی قوم میں عریف اور معتمد مقرر کیا تھا۔اموال کی تقسیم اور دیگر امور میں ان سے تعاون لیا کرتے تھے ۹۲ھ یا ۹۱ھ میں وفات پائی۔

فقالوا اللّٰھمّ نعم ،ان حضرات نے جواب کی ابتداء اللّٰھم سے محض تاکید کے لئے یا خطا سے بچنے کے لئے احتیاطاً کی ہے۔جبکہ بعض شراح کے مطابق یہ کلمہ شہادت کے مرتبہ میں ہے۔یعنی ہم اس کی گواہی دیتے ہیں۔

وفی الحدیث قصة طویلة ،یہ طویل قصہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔البتہ مصنف نے اسے ذکر نہیں کیا۔شاید اس لئے کہ اس میں اشکالات اور اہل بدعت کے اوہام ہیں۔لہٰذا اسے قابل ذکر نہیں سمجھا۔

(۷) حدثنا محمد بن بشّار ثنا عبدالرحمٰن بن مھدی ثنا سفیان عن عاصم بن بھدلہ عن زر بن حبیش عن عائشةؓ قالت ما ترک رسول اللّٰہ ﷺ دینارا ولا درھما ولا شاةً ولا بعیراً قال واشک فی العبد والامة(۱)۔

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے نہ کوئی دینار چھوڑا اور نہ درہم نہ کوئی بکری چھوڑی اور نہ اونٹ۔راوی کہتا ہے کہ مجھے اس بات میں شک ہے کہ آپؐ نے غلام اور باندی کا ذکر کیا یا نہ۔

تشریح: اس روایت میں راوی کو غلام اور باندی کے ذکر میں شک ہے۔مگر دوسری روایت صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ نہ غلام چھوڑا اور نہ باندی۔گویا انبیاء کرام مال و دولت کے وارث نہیں بناتے ان کا ترکہ علم ہوتا ہے۔

---

(۱)مصنف ابن ابی شیبة ۱/۲۰۶، السنن الکبریٰ للبیھقی ۶/۲۶۶، شرح السنة للبغوی رقم الحدیث ۳۸۳۶ ۱۴/۵۱ باب تزکیة النبی ﷺ کتاب الفضائل صحیح ابن حبان رقم الحدیث ۲۱۶۴(مختار)

٥٦. باب ماجاء فی رؤیة النبیﷺ فی المنام

رسول اللہﷺ کوخواب میں دیکھنا

رؤیا اور رؤیہ دونوں مصدر ہیں۔ جیسے یُسریٰ اور عُسرۃ۔ عموماً رؤیا خواب دیکھنے کیلئے اور رؤیۃ جاگتے ہوئے دیکھنے کیلئے مستعمل ہوتا ہے لیکن ایک دوسرے کی جگہ ان کا استعمال جائز ہے۔ پھر رویا اگرچہ مصدر ہے لیکن اس کا اطلاق "مایراہ الرجل فی منامه" یعنی خواب میں دیکھی ہوئی چیز پر بھی ہوتا ہے۔ اس وقت یہ مصدریت سے نکل کر اسم بن جاتا ہے۔

زندگی کا مکمل نقشہ کھینچنے کے بعد مصنفؒ اس باب میں وہ احادیث لاتے ہیں جو خواب میں نبی اکرمﷺ کی زیارت سے متعلق ہیں۔

خواب کیا ہے؟ خواب کی حقیقت کے بارے میں علماء ظاہر و باطن، حکماء نیز جدید دور کے ڈاکٹروں نے مختلف قسم کے خیالات ظاہر کئے ہیں مثلاً بعض حکماء کہتے ہیں کہ واقعات وحوادث کی صورتیں عالم بالا میں موجود ہوتی ہیں جب نیند میں روح کا محاذات ان نقوش میں سے بعض کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ تو وہ صورتیں جو کہ پہلے سے خزانہ میں جمع ہو چکی ہیں نفس میں منعکس ہوتی ہیں (١)، اور بعض اہل طب کا خیال ہے کہ سارے خواب جسم کے اخلاط کے اثرات سے ظاہر ہوتے ہیں۔ یعنی خوابوں میں انسانی بدن میں موجود مادوں کے ہیجان ایک دوسرے پر غلبہ، مزاج کی گرمی، سردی، خشکی اور رطوبت وغیرہ کا عمل دخل ہوتا ہے گویا ان کا سبب اندرونی عوامل ہوتے ہیں۔ مثلاً بعض گرم مزاج کے لوگ خود کو آگ میں جلتا ہوا دیکھتے ہیں۔ اور ٹھنڈے مزاج کے لوگوں کو پانی، برف اور دیگر سرد اشیاء دکھائی دیتی ہیں۔ اس طرح صفراوی، سوداوی اور بلغمی مزاج کے لوگوں کے خوابوں میں اختلاف ہوتا ہے (٢)۔

جبکہ علماء شریعت میں اکثریت کی رائے یہ ہے کہ جس طرح جاگتے ہوئے بھی دل میں خیالات واعتقادات اترتے ہیں اور اللہ تعالیٰ دل میں ادراکات پیدا کرتے ہیں اس طرح نیند کی حالت میں بھی اللہ

---

(١) قال ابن حجرؒ وهذا اشدّ فساداً لكونه تحكماً لابرهان عليه (از كوكب الدرى) (اصلاح الدين)

(٢) قال صاحب المواقف اما الرؤيا فخيال باطلٌ عند المتكلمين (جمع الوسائل ج ٢ ص ٢٩٠) (اصلاح الدين)

تعالیٰ کی تخلیق سے دل میں خواب پیدا ہوتے ہیں البتہ ان خوابوں کی تخلیق کبھی کسی فرشتے کی وساطت سے ہوتی ہے یہ الہامی خواب اور مبشّرات کہلاتے ہیں اور کبھی اس کا واسطہ شیطانی وساوس ہوتے ہیں کیونکہ شیطان کو بھی نفس انسانی میں داخل ہونے اور رگوں میں تیرنے کی قوت دی گئی ہے اس صورت میں خواب شیطانی ہوتا ہے اسے تحزین الشیطان یاحلم کہاجاتا ہے اور کبھی انسان کی نفسانی ترجیحات اور اس کے اپنے خیالات وتصورات ان خوابوں کیلئے اساس بن جاتے ہیں اس صورت میں اسے حدیث النفس کہاجاتا ہے اور اضغاث احلام بھی کہا گیا ہے(۱)۔

البتہ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ مرئیٔ امر ادراک کے قبیلے سے ہے جیسا کہ علامہ ابن عربیؒ کی رائے ہے یا یہ محض تصوّرات ہیں جو خلاف حقیقت بھی ہوسکتی ہے جیسا کہ علامہ مازریؒ وغیرہ علماء کا خیال ہے۔ بہرحال اکثر اہل مذہب کے نزدیک خواب اللہ تعالیٰ اور نفس وشیطان کے تصرفات کا نتیجہ ہوتی ہیں اور وہ تصورات جو کہ حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے قلب میں ڈال دی جاتی ہیں سچے خواب ہوتے ہیں اور جو شیطان کے وسوسہ سے ظاہر ہوں وہ شیطانی خواب ہوتے ہیں گویا خواب بیرونی عوامل سے بھی اثر پذیر ہوتے ہیں۔ کچھ نفس کے خواطر اور افکار بھی مختلف اشکال میں متشکل ہوکر کبھی کبھی نظر آتی ہیں۔

<u>رویۃ نبی سچا خواب ہے:</u> جو کچھ بھی ہوامتی کا خواب غیر یقینی تصورات وخیالات کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جس میں الہام، حدیث نفس اور شیطانی وسوسے کا احتمال ہوسکتا ہے البتہ پیغمبر کا خواب وحی ہوتا ہے یونہی اگر کسی کو نبی کریم ﷺ خواب میں دکھائی دیں تو اس میں بھی کسی شک کی گنجائش نہیں ہوتی یہ سچا اور الہامی خواب ہے اور دکھائی دینے والے نبی اکرم ﷺ ہی ہونگے خود نبی اکرم ﷺ اس بات کی ہمیں بشارت دیتے ہیں اور اس کا سبب بھی بتادیا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کی زندگی میں شیطان سے یہ قوتیں سلب کردی ہیں کہ وہ کسی پیغمبر کی شکل میں متشکل ہو یا نبی کی آواز میں آواز ملا کر وحی میں اختلاط کا سبب بنے۔ اس طرح آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی آپ ﷺ کی شکل میں شیطان متشکل نہیں ہوسکتا۔

---

(۱)عن أبی هريرةؓ قال الرؤيا ثلث الحسنة بشرىٰ من الله والرؤيايُحدّث بهاالرجل نفسه والرؤيا من تحزين الشيطان الخ(ترمذی ابواب الرؤيا، باب ماجاء فی رؤياالنبی ﷺ فی الميزان والدلو.) ۱۲ (اصلاح الدين)

(۱) حدّثنا محمّد بن بشّار ثنا عبدالرحمٰن بن مهدیّ ثنا سفیان عن أبی إسحاق عن أبی الأحوص عن عبداللّٰه عن النبیّ ﷺ قال من رانی فی المنام فقدرانی فانّ الشیطان لا یتمثّل بی(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ جس شخص نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے حقیقۃً مجھ ہی کو دیکھا اس لئے کہ شیطان میری صورت میں نہیں ڈھل سکتا۔

فقدرأنی اس حدیث کی تاویل میں مختلف اقوال ہیں۔

اول مطلب یہ کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا وہ جاگتے میں مجھے دیکھ لے گا۔(بخاری) اور مسلم شریف کی ایک روایت میں بھی یہی الفاظ آتے ہیں(۲)

دوسرا معنی یہ ہے کہ جو خواب میں مجھے دیکھے گا گویا اس نے مجھے جاگتے ہوئے دیکھا ہے گویا اس شخص کا بھی صحابہ کی طرح بڑا عظیم مرتبہ ہے۔

تیسرا اور مشہور معنی یہ ہے کہ اس شخص کا خواب سچا خواب ہے اوہام نہیں ہیں یعنی اس نے حقیقۃً مجھے دیکھ لیا اور یہ پراگندہ خیالی اور شیطانی تصرفات نہیں ہونگے۔

<u>اصل صورت میں نہ دیکھنے کی وجہ:</u> اب اگر کسی نے نبی کریم ﷺ کو ایسی حالت میں دیکھا ہو جو کہ مناسب شان نبوی ﷺ نہیں تو اس میں دراصل خواب دیکھنے والے کو یہ تنبیہ ہوتی ہے کہ اسی نوعیت کی خامیاں تم میں خود موجود ہیں جس طرح کہ نبی ﷺ میں دیکھ رہے ہو۔ مثلاً کسی شخص پر انگریزی تمدن غالب

(۱)جامع ترمذی ۲/۱۰۵ کتاب الرؤیا باب ماجاء فی قول النبیّ من رأنی فی المنام فقدرأنی، سنن ابن ماجة ص۲۸۷ ابواب کتاب تعبیر الرؤیا باب رویة النبیّ ﷺ، مصنف ابن ابی شیبة ۱۱/۵۵،(مختار)

(۲)من رأنی فی المنام فسیرانی فی الیقظة. بخاری ۲/۱۰۳۵ کتاب التعبیر باب من رأی النبی ﷺ فی المنام. مسلم ۲/۲۵۰ کتاب الرویاء باب قول النبی ﷺ من رأنی فی المنام فقدرانی ابوداؤد ۲/۳۳۷ کتاب الادب باب ماجاء فی جاء فی الرؤیا. ۱۲ (اصلاح الدین)

ہے یا وہ اس کی طرف مائل ہے تو وہ دیکھ سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ انگریزی لباس میں ملبوس ہوں تو حقیقتاً یہ خواب دیکھنے والے کے خیالات اور اس کی نفسیات کا اثر ہوتا ہے وہ اپنے ظرف اور دل کے آئینے میں نبی کریم ﷺ کو دیکھتا ہے اور آئینہ ٹیڑھا ہو تو اس میں نظر آنے والی صورت بھی ٹیڑھی ہوتی ہے۔ جس طرح کوئی شخص شفاف عینک لگائے تو ہر چیز اصل رنگ میں نظر آتی ہے لیکن سبز عینک لگائے تو چیز بھی سبز نظر آتی ہے اگرچہ وہ چیز نفس الامر میں سفید ہو تو اصلی حالت اور صورت میں موجود ہوتے ہوئے بھی نبی کریم ﷺ کی ہیئت اسے اس لئے متغیر نظر آتی ہے کہ اس شخص کی آنکھوں پر مختلف رنگ کے خول چڑھے ہوئے ہوتے ہیں(۱) اور یہی وجہ ہے کہ نیک لوگوں کے خوابوں میں نبی کریم ﷺ عموماً ویسے دکھائی دیتے ہیں جیسے شمائل میں ذکر ہے۔

لہٰذا اب یہ اعتراض بھی نہیں ہوگا کہ ممکن ہے کہ کوئی خواب میں نبی کریم ﷺ کو اپنی اصل صورت میں نہ دیکھے تو یہ کیسی حقیقت ہے۔ نیز یہ اعتراض بھی مندفع ہے کہ دنیا کے مختلف گوشوں میں بیک وقت کیسے آپ ﷺ حقیقتاً دکھائی دیتے ہیں کیونکہ ہم کہہ چکے ہیں کہ ذات تو حقیقۃً مرئی جبکہ صفات متخیل ہیں ہوسکتا کہ ان کے ادراک میں خطا واقع ہو یہاں یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ جب شیطان ظاہری صورت کے لحاظ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تشبہ سے عاجز ہے تو باطنی صفات میں تشبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۲) حدّثنا محمّد بن بشّار و محمّد بن المثنیٰ قالا ثنا محمّد ابن جعفر ثنا شعبة عن أبی حصین عن أبی صالح عن أبی هریرة قال قال رسول اللّٰه ﷺ من رأنی فی المنام فقدرأنی فانّ الشیطان لایتصوّر اوقال لایتشبّه بی(۲)۔

---

(۱)فرؤیاه فی صورة حسنة دلیل حسن دین الراء ی وعکسه عکسه لاز کالمرأة الصقیلة ینطع فیها مایقابلها .۱۲جمع ج۲ ص ۲۹۲۹ (اصلاح الدین)

(۲)صحیح بخاری ۱/۲۱ کتاب العلم باب آثم من کذب علی النبی ﷺ، جامع ترمذی ۲/۵۰۱ مسنداحمد ۵/۳۰۶ (مختار)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے حقیقۃً مجھ ہی کو دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت میں ظاہر نہیں ہوسکتا یا یہ فرمایا کہ مجھ جیسا نہیں بن سکتا۔

شیطانی تصرف سے تحفظ کی وجہ: لایتصور او قال لا یتشبہ بی الخ ،اس حدیث میں یتمثل کی بجائے دیگر الفاظ آئے ہیں معنی تینوں لفظوں کا ایک ہے یعنی میری صورت، تمثیل اور شبیہ وہ پیش نہیں کرسکتا۔ بلکہ آواز بھی نبی کریم ﷺ جیسی نہیں نکال سکتا اور جو بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ آپ ﷺ تلاوت فرمارہے تھے کہ آپ ﷺ کی زبان مبارک پر شیطانی تصرف سے یہ الفاظ ادا ہوئے کہ ''تلک الغرانیق العلیٰ وإنّ شفاعتهنّ لترتجی ''تو محققین اور ائمہ حدیث نے اس پر روایۃً اور درایۃً بڑی تنقید کی ہے۔ اور اس کی تردید کی ہے دراصل یہ روایت جلالین میں مروی ہے اور چونکہ صاحب جلالین نے نوعمری کے زمانہ میں تفسیر لکھی تھی۔ اس لئے کئی مقامات پر ان سے غلطیاں بھی سرزد ہوئیں۔ اور کچھ رطب ویابس کو نقل کیا۔ عقلاً یہ اس لئے بعید ہے کہ شیطان کو اگر اس تصرف کا حق دیا جائے پھر تو ساری وحی غیر محفوظ اور نا قابل اعتماد ہو جائیگی حالانکہ وحی کی حفاظت عرش سے فرش تک خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اسی طرح بعد از وفات بھی اگر یہ اختیار شیطان کو دیا جائے تو بڑے بڑے بزرگ بھی دھوکے میں پڑے رہیں گے۔ حاصل یہ کہ نبی کریم ﷺ کی شکل میں شیطان کا آنا عقلاً ونقلاً محال ہے(۱)۔

اب یہ زیارت بعض محققین کے نزدیک عین ذات کی ہوتی ہے گویا راءی (خواب دیکھنے والے) اور (مرئی) نبی کریم ﷺ کے درمیان تمام حجابات ہٹ جاتے ہیں اور آپ ﷺ دکھائی دیتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک یہ ایک مثالی صورت ہوتی ہے جو کہ ذات سے حکایت ہوتی ہے دونوں قسم کی رؤیت کا امکان ہے اور جس درجہ میں بھی ہو آپ ﷺ کی زیارت عظیم سعادت ہے۔ اللّٰھمّ ارزقناہ

---

(۱)قال المناوی واذا تنوّر العالم بنوره ووجوده رحمت الشياين لميلاده وهدمت بنيان الكهنة فكيف يتصوّر ان يتمثل الشيطان بصورته ولو قدران يتمثل بصورته تمثّل فی الحارج كذالك(المناوی علی هامش جمع الوسائل ۲/۲۹۱) (مختار)

(۴) حدّثنا قتیبہ ثناخلف بن خلیفة عن ابی مالک الأشجعیّ عن ابیہ قال قال رسول اللّٰہﷺ من رأنی فی المنام فقدرأنی (۱) قال ابوعیسیٰ وابومالک ھذاھوسعد بن طارق بن أشیم وطارق بن اشیم ھو من أصحاب النّبیّﷺ وقدروی عن النبیّﷺ احادیث وسمعت علّی بن حجر یقول قال خلف بن خلیفة رأیت عمرو بن حریث صاحب النبیّﷺ وأناغلام صغیر(۱).

ترجمہ: طارق بن اشیم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرمﷺ نے فرمایا جس نے خواب میں مجھے دیکھا اس نے حقیقۃً مجھے دیکھا۔امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ یہ ابو مالک سعد بن طارق بن اشیم ہیں اور (ان کے والد) طارق بن اشیمؓ صحابہ میں سے ہیں۔ انہوں نے نبی اکرمﷺ سے متعدد احادیث روایت کی ہیں۔میں نے اپنے شیخ علی ابن حجرؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ خلف بن خلیفہؒ (تابعی) نے فرمایا کہ میں نے صحابی رسول عمرو بن حریثؓ کو دیکھا تھا جبکہ میں چھوٹا تھا۔

طارق بن اشیمؓ: حضرت طارق بن اشیم بن مسعود الاشجعیؓ کوفہ میں رہنے والے صحابہ میں سے ہیں۔امام مسلمؒ کہتے ہیں کہ ان سے ان کے بیٹے ہی کی روایات ملتی ہیں۔امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ وہ نبی اکرمﷺ سے متعدد روایات روایت کر چکے ہیں بلکہ ترمذی باب ماجاء فی ترک القنوت میں تصریح ہے کہ وہ نبی اکرمﷺ کے پیچھے نمازیں پڑھ چکے ہیں۔اس لئے خطیبؒ کا یہ قول درست نہیں ہے کہ ان کی صحابیت مشکوک ہے۔

من رآنی فی المنام فقدرآنی ملاعلی قاریؒ نے مشکوٰۃ المصابیح کے بعض شارحین اور امام بغویؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ شیطان جس طرح نبی اکرمﷺ کی صورت میں ظاہر نہیں ہوسکتا اس طرح دیگر انبیاء کرام، ملائکہ، سورج، چاند، بادل اور بارش کی صورت میں بھی ظاہر ہونے سے قاصر ہے۔واللہ اعلم

قال ابوعیسیٰؒ وابومالکؒ الخ، امام ترمذیؒ یہاں یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ ابو مالکؒ تابعی

(۱)مصنف ابن ابی شیبة ۱۱/۵۵، مجمع الزوائد۷/۱۸۱، مسنداحمد۳/۴۷۲(مختار)

اوران کے والد صحابی ہیں۔طارق بن اشیمؓ جب نبی اکرمﷺ سے متعدد احادیث کے راوی ہیں۔توان کی صحابیت میں شک باقی نہیں رہا۔

وسمعت علی بن حجر الخ، اس کلام سے امام ترمذیؒ کا مقصد یہ ہے کہ خلف بن خلیفہؒ تابعی ہیں ان کی ملاقات صحابی عمرو بن حریثؓ سے ثابت ہے۔لہٰذا زیر نظر روایت میں ایک تابعی دوسرے تابعی سے روایت کرتے ہیں۔

(۴) حدّثنا قتیبه هو ابن سعید ثنا عبدالواحد بن زیادعن عاصم بن کلیب حدّثنی ابی أنّه سمع أباهریرة یقول قال رسول اللهﷺ من رأنی فی المنام فقدرأنی فانّ الشیطان لا یتمثّلنی قال ابی فحدّثت به ابن عبّاس فقلت قدرأیته فذکرت الحسن بن علی فقلت شبّهته به فقال ابن عبّاس إنّه کان یشبهه(۱).

ترجمہ: عاصم بن کلیب کہتے ہیں کہ مجھے میرے والد نے بتایا کہ میں نے ابو ہریرہؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے مجھے حقیقۃً دیکھا کیونکہ شیطان میری مشابہت نہیں کرسکتا۔میرے والد کلیبؒ نے یہ حدیث عبداللہ بن عباسؓ کو سنائی اور یہ بھی بتایا کہ میں نے نبی اکرمﷺ کو خواب میں دیکھا تو صورت دیکھ کر مجھے (حضور اقدسﷺ کے نواسے) حسن بن علیؓ کی صورت یاد آئی اور کہا میں نے نبی اکرمﷺ کو حضرت حسنؓ کے مشابہ پایا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بے شک آپﷺ حضرت حسنؓ سے ملتے جلتے تھے۔

<u>حضور اقدسﷺ سے حسنؓ اور حسینؓ کی مشابہت:</u> **فذکرت الحسن بن علی الخ،** حضرت کلیب فرماتے ہیں کہ خواب میں جب نبی اکرمﷺ کی زیارت ہوئی تو مجھے حضرت حسن بن علیؓ (جن کو انہوں نے دیکھا تھا) یاد آئے کیونکہ نظر آنے والی صورت مبارکہ حضرت حسنؓ کی صورت سے ملتی

(۱)المستدرک للحاکم، مسنداحمد ۲/ ۲۳۲(مختار)

جلتی تھی اور جب انہوں نے حضرت ابن عباسؓ سے خواب بیان کیا اور بتایا کہ نبی اکرمﷺ کی نظر آنے والی صورت کو حضرت حسنؓ سے مشابہ پایا تو انہوں نے تصدیق کی کہ آپﷺ ایسے ہی تھے۔ بعض محققین کے بیان کے مطابق نبی اکرمﷺ کا نصف اعلیٰ یعنی سر، سینہ اور چہرۂ انور حضرت حسنؓ سے زیادہ مشابہ تھا اور نصف اسفل یعنی پاؤں، پنڈلیاں، قدم اور انگلیاں حضرت حسینؓ سے زیادہ مشابہت رکھتا تھا(۱)، اس طرح گویا اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمﷺ کی شبیہ کو کچھ عرصہ تک امت کیلئے زندہ شکل میں بھی باقی رکھا تھا۔

آثار کچھ حسن کو ملے کچھ حسین کو یوں بٹ گیا مرقع ہمارے رسولﷺ کا

(۵) حدّثنا محمّد بن بشّارثنا ابن ابی عدیّ ومحمّد بن جعفر قال ثنا عوف بن أبی جمیلة عن یزید الفارسیّ وکان یکتب المصاحف قال رأیت النبیّﷺ فی المنام زمن ابن عبّاس فقلت لابن عبّاس انّی رأیت رسول اللّٰہﷺ فی النوم فقال ابن عبّاس إنّ رسول اللّٰہﷺ کان یقول إنّ الشیطان لایستطیع ان یتشبّہ بی فمن رانی فی النّوم فقدرأنی هل تستطیع ان تنعت هذاالرجل الذی رأیته فی النّوم قال نعم انعت لک رجلاً بین الرّجلین جسمه ولحمه اسمرإلٰی البیاض اکحل العینین حسن الضحک جمیل دوائر الوجه قدملأت لحیته مابین هذه إلٰی هذه قدملاء ت نحره قال عوف ولاادری ما کان مع هذا النعت فقال ابن عبّاس لورأیته فی الیقظة ما استطعت ان تنعته فوق (۲) هذا قال ابوعیسیٰ ویزید الفارسیّ هو یزید بن هرمزوهواقدم من یزید الرقاشیّ وروی یزید الفارسیّ عن ابن عبّاس رضی اللّٰہ عنهما احادیث ویزید الرقاشیّ لم

---

(۱)وعن علیؓ کرم اللّٰہ وجهه أنّ الحسن اشبه رسول اللّٰہﷺ مابین الصدرالی الرأس والحسین اشبه رسول اللّٰہﷺ ماکان اسفل من ذٰلک(جمع ج۲ ص۲۹۵)۱۲ اصلاح الدین

(۲)مجمع الزوائد۸/۲۷۲،مصنف ابن ابی شیبة۱۱/۵۶،مسنداحمد۱/۳۶۱(مختار)

یدرک ابن عباس وھو یزید بن ابان الرقاشیؒ وھویروی عن انس بن مالک ویزید الفارسیؒ ویزید الرقاشیؒ کلاھما من اھل البصرة وعوف بن أبی جمیلة ھو عوف الأعرابی.

ترجمہ: یزید فارسیؒ جومصحف نویس تھے کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عباسؓ کی زندگی میں مجھے خواب میں نبی اکرم ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ میں نے عبداللہ بن عباسؓ سے کہا کہ میں نے خواب میں نبی اکرم ﷺ کی زیارت کی ہے تو ابن عباسؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ شیطان میری شبیہ نہیں بنا سکتا۔اس لئے جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے حقیقۃً مجھے دیکھا۔(اور) کیاتم اس شخص کا حلیہ بیان کر سکتے ہو جس کو تم نے خواب میں دیکھا تھا میں نے کہا کہ ہاں میں تیرے سامنے درمیانی انداز کے شخص کی صفات بیان کرونگا۔جوجسم اور گوشت میں(نہ زیادہ موٹا، پرگوشت نہ نحیف ونزار بلکہ)معتدل تھا۔گندم گوں رنگ سفیدی مائل تھا۔سرگین آنکھوں والا تھا۔عوف بن ابی جمیلہؒ کہتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ ان صفات کے ساتھ مزید کیا صفات تھیں(جو یزید فارسی بیان کر چکے تھے) تو عبداللہ بن عباسؓ نے(یزید فارسی سے) کہا کہ اگر تم نبی اکرم ﷺ کو(زندگی میں) اپنی بیداری کی حالت میں دیکھتے تو بھی حلیہ کے بیان میں ان صفات پر مزید اضافہ نہیں کر سکتے تھے۔امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ یزید فارسی یزید بن ہرمز ہیں جو یزید الرقاشی سے بڑے ہیں۔یزید فارسی عبداللہ بن عباسؓ سے کئی احادیث کے راوی ہیں جبکہ یزید الرقاشی کی ملاقات ابن عباسؓ سے نہیں ہوئی ہے۔یہ یزید بن ابان الرقاشی ہیں جو حضرت انسؓ سے روایات کرتے ہیں۔یزید فارسی اور یزید الرقاشی دونوں کا تعلق بصرہ سے ہے(جس کی وجہ سے دونوں کے ایک ہونے کا توہم کیا جاتا ہے) اور عوف بن ابی جمیلہ عوف الاعرابی ہیں(امام ترمذیؒ نضر بن شمیل سے روایت کرتے ہیں) کہ عوف اعرابی کہا کرتے تھے کہ میں

حضرت قتادہؒ سے عمر میں بڑا ہوں۔

معتدل متوازن سراپا: انعت لک رجلاً بین الرجلین الخ، یعنی میں نے جو دیکھا وہ کچھ یوں تھا کہ آپ ﷺ قد میں میانہ قد تھے نہ پتلے تھے نہ موٹے۔

جسمہ ولحمہ یہ مبتداء ہے اور بین الرجلین اس کی خبر مقدم ہے یعنی ان کا جسم اور گوشت درمیانی تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ جسمہ ولحمہ ''بین الرجلین'' کیلئے باعتبار متعلق فاعل بن جائے یعنی ثبت اووقع بین الرجلین جسمہ ولحمہ دونوں صورتوں یہ جملہ رجلاً کیلئے صفت بنے گا۔ گویا وہی نقشہ ہے جو ہم اس کتاب میں پڑھ چکے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ معتدل الخلق تھے۔ قد میں ''ربعة من القوم'' یعنی میانہ قد تھے بال بھی درمیانی تھے نہ زیادہ گھنگریالے اور نہ بالکل کھلے ہوئے۔ اسمر یعنی گندم گون تھے لیکن سفیدی مائل تھے اور کھلی صاف رنگت تھی اکحل العینین سرگین آنکھیں تھیں قدرتی سیاہی ایسی لگتی تھی جیسے کہ آنکھوں میں سرمہ ڈالا ہو۔

حسن الضحک، یعنی دانتوں کی سفیدی کے سبب خوبصورت مسکراہٹ تھی۔

جمیل دوائر الوجہ، چہرے کے نقش ونگار بہت حسین اور اعضاء متوازن تھے۔ چہرے کی گولائی کی وجہ سے اس کے ہر جز کو الگ دائرہ بنا کر دوائر جمع لایا گیا ہے یعنی چہرے کا ہر ہر جزء خوبصورت تھا۔

قدملأت لحیتہ الخ، یعنی خوب گھنی داڑھی تھی۔ ان کی داڑھی نے اس کان سے اس کان تک چہرہ ڈھانپ لیا تھا (یعنی گنجان داڑھی تھی) اور بالائی سینہ بھی چھپا دیا تھا۔

قال وما کان یدری الخ، اس جملہ کا ظاہر ومتبادر معنی ملا علی قاریؒ نے یہ بیان کیا ہے کہ بقول یزید فارسی کے شاگرد کے مجھے صحیح یاد نہیں کہ میرے استاد یزید نے مذکورہ صفات کے ساتھ اور کیا کیا تفصیلات بیان کیں۔ لو رأیتہ الخ، حضرت ابن عباسؓ نے یزید فارسی کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر حین حیات میں بھی تم نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا ہوتا تو اس سے زیادہ صحیح صحیح بیان کرنے کی استطاعت نہ ہوتی گویا یہ صحابہ اور تابعین کے دور میں ان احادیث کی تائید ہے کہ شیطان کو نبی اکرم ﷺ کی شکل میں متشکل ہونے کی استطاعت نہیں ہے اور خواب میں نبی اکرم ﷺ کی حقیقی شکل وصورت ہی نظر آتی ہے۔

سندی بحث: قال ابو عیسیٰ ویزیدالفارسی هویزید بن هرمز، امام ترمذیؒ اس عبارت میں دو باتیں بیان کررہے ہیں اول یزید فارسی کا تعارف کہ ان کا نام یزید بن ہرمز ہے لیکن ان کے اس دعوے میں محققین اختلاف کرتے ہیں کیونکہ یزید بن ہرمز متوفی ۱۰۰ھ ایک دوسرے شخص ہیں جو مدنی ہیں اور متوسط درجہ کے تابعین میں سے ہیں جبکہ یزید فارسی بصری راوی ہیں جن کا شمار چھوٹے تابعین میں ہوتا ہے(۱)۔

دوم یہ کہ یزید فارسی اور یزید رقاشی الگ الگ راوی ہیں اگر چہ دونون بصری ہیں دونوں کا نام بھی ایک ہے اسی وجہ سے بعض لوگوں کو ایک ہی راوی ہونے کا وہم ہوا ہے۔

لیکن امام ترمذیؒ کے ہاں یہ قابل تسلیم نہیں اوران کی یہ بات درست ہے کیونکہ یزید بن ابان الرقاشی (متوفی ۱۲۰ تقریباً) کا تعلق بصرہ سے ہے۔ زاہد وعابد واعظ (۲) تھے مگر ان کا سماع عبداللہ بن عباسؓ سے ثابت نہیں ہے جبکہ اس حدیث میں یزید فارسی کا ان سے سماع مذکور ہے(قال عوف الاعرابی انا اکبر من قتادہ ،اس روایت سے تین باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ عوف بن ابی جمیلہ ہی عوف الاعرابی ہیں جیسے کہ پہلے امام ترمذی دعویٰ کر چکے ہیں۔

دوسری یہ کہ عوف اعرابی یعنی عوف بن ابی جمیلہ یزید فارسی کے شاگرد ہیں۔ قتادہؓ سے عمر میں بڑے ہیں تو ان کی طرح وہ بھی ابن عباس سے مل چکے ہوں گے۔ تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے استاد یزید فارسی کی ملاقات ابن عباسؓ سے ضرور ثابت ہوگی۔ تیسری بات اس بات پر تنبیہ ہے کہ یہاں ایک تابعی (عوف) دوسرے تابعی (یزید فارسی) سے روایت کرتے ہیں۔

(٦) حدثنا عبداللہ بن أبی زیادثنا یعقوب بن إبراھیم بن سعد ثنا أبی اخی ابن شھاب الزھریّ عن عمه قال قال أبوسلمة قال أبوقتادة قال رسول اللہﷺ من رأنی فی النوم فقدرأی الحق(۳).

(۱)لیراجع التقریب ج۲ ص۳۳۳ (عدد ۷۸۱۸) ج۲ ص۳۳۵(عدد ۷۸۲۴) ۱۲ اصلاح الدین

(۲)صحیح بخاری ۱۰۳۶/۲ کتاب التعبیر باب من رأی النبیّﷺ فی المنام، صحیح مسلم ۲۵۰/۲ کتاب الرؤیا باب قول النبیّﷺ من رأنی فی المنام ،مسنداحمد۳۰۶/۵(مختار)

ترجمہ: حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جس نے مجھے دیکھا یعنی خواب میں پس اس نے صحیح اور سچا خواب دیکھا۔

یعنی فی النوم، یہ جملہ کسی راوی نے بطور تشریح حدیث میں داخل کیا ہے۔

فقد رأی الحق: فقد رأی الحق، بعض شراح کے نزدیک الحق صفۃ ہے۔مفعول مطلق کے لئے ۔یعنی فقد رأی الرؤیۃ الحق ، گویا یہ خواب شیطانی خواب نہیں بلکہ اس نے سچا خواب دیکھا ہے۔جو مبشرات میں سے ہے۔بعض شراح نے ''الحق'' کا معنی ''الامر الثابت'' سے کیا ہے اور اسے مفعول بہ قرار دیا ہے یعنی اس نے ایک نفس الامری اور حقیقی خواب دیکھا ہے۔اس کا خواب پراگندہ خاطری اور شیطانی دھوکہ نہیں ہے۔

بعض حضرات نے زیر نظر حدیث میں ''الحق'' سے مراد اللہ جل وعلا شانہ لیا ہے۔اس صورت میں حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا ہے۔وہ اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھے گا۔یا مطلب یہ ہے کہ یہ اس شخص کی جنتی ہونے کی نشانی ہے۔اور وہ جنت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار کرے گا۔

بہر صورت حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دیدار رسول ایک بڑی سعادت ہے اور دنیا وآخرت میں عند اللہ مقبولیت کی علامت ہے البتہ امام بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو شخص نبی اکرم ﷺ کا دیدار خواب میں بکثرت کریگا وہ دنیا میں ضرورت سے زائد مال رکھنے سے کترائے گا۔ بلکہ عموماً قلیل المال رہیگا(۱)۔

(۷) حدثنا عبداللّٰہ بن عبدالرحمٰن انا معلیٰ بن اسد ثنا عبدالعزیز بن المختار ثنا ثابت عن أنس أنّ رسول اللّٰہ ﷺ قال من رآنی فی المنام فقد رانی فإنّ الشیطان لایتخیّل بی قال ورؤیا المؤمن جزء من ستۃ واربعین جزءً من النبوۃ(۲)۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جس

---

(۱) مناوی ج۲ص۲۹۳، (اصلاح الدین)

(۲) صحیح بخاری ۱۰۳۶/۲ کتاب التعبیر باب من رأی النبیّ ﷺ فی المنام، مسند احمد ۲۶۹/۳، مصنف ابن ابی شیبۃ ۵۶/۱۱ (مختار)

نے مجھے خواب میں دیکھا۔اس نے حقیقۃً مجھے دیکھا۔کیونکہ شیطان میرے مشابہ نہیں
ہوسکتا نیز فرمایا کہ مؤمن کا خواب نبوت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔
لایتخیل بی شیطان میری صورت خیالی کسی کے سامنے پیش نہیں کرسکتا۔

<u>رویائے صادقہ اور جزئیت نبوت:</u> رؤیا المؤمن جزء من الخ، یعنی مومن کے رویائے صادقہ نبوت اور وحی کا چھیالیسواں حصہ ہے۔گویا وحی کی طرح وہ بھی صادق ہیں ان میں کذب کا احتمال نہیں۔لیکن اس حصہ کی ماہیت اور حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی کیونکہ اس کی حقیقت تب سمجھ میں آئیگی جب کل یعنی نبوت اور وحی کی حقیقت سمجھ میں آئیگی اور وحی کی حقیقت تو صرف اللہ جل شانہ اور اس کے رسول ﷺ کو معلوم ہے۔ کیونکہ یہ خالص ایک وہبی امر ہے۔کسب کا اس میں ذرہ بھر دخل نہیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ولکن اللّٰہ یجتبی من رسله من یشآء(آل عمران ۱۷۹) لیکن اللہ تعالیٰ جن کو چاہے انبیاء منتخب کرتا ہے۔

نیز فرمایا اللّٰہ اعلم حیث یجعل رسالته(انعام ۱۲۴) اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کہاں رسالت کو رکھے۔کس کو رسالت سے نواز دے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح نبوت کی حقیقت ہمارے لئے ایسی ہے کہ 'من لم یذق لم یدر' اسی طرح اس کے جزء کی حقیقت بھی ہمارے لئے مجہول ہے لیکن بایں ہمہ یہ بات مؤمن کیلئے ایک درجہ میں بڑی بشارت ہے کہ جس طرح وحی اور نبی کریم ﷺ کے فرامین سچے ہیں اسی مناسبت کی وجہ سے رویائے مومن بھی سچے ہونگے۔اسی لئے بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ یہاں علوم نبوت کا حصہ مراد ہے۔ نہ کہ نبوت کا کیونکہ نبوت متجزی نہیں ہے۔

بعض دیگر روایات میں پینتالیسواں اور بعض میں چالیسواں جزء بعض میں سترواں، بعض میں چہتر واں، بعض میں چھبیسواں، بعض میں پچاسواں بعض میں چوالیس واں اور بعض میں انچاسواں حصہ بتایا گیا ہے(۱)، جو کہ بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی توجیہ یہ ہوگی کہ یہاں نبی کریم ﷺ کا مقصد تحدید نہیں بلکہ تکثیر ہے کہ نبوت کے بہت سے اجزء قریبی ہیں اور ان رؤیاء کا بھی وحی اور نبوت سے

(۱) فتح الباری ج۱۲ص۳۸۰

قریبی مناسبت ہے۔ نیز علامہ بیجوری نے ایک اور توجیہ بھی کی ہے وہ کہتے ہیں کہ راءی کے بھی مرتبے ہوتے ہیں۔ وہ جس درجے کا ہوگا اوراس کا اپنا ظرف جتنا پاکیزہ ہوگا اتنا ہی اس کے خواب کا درجہ بڑھا ہوا ہوگا۔ مثلاً صفائی باطن زیادہ ہوگی تو اس کے خواب وحی کا چالیسواں حصہ ہونگے اور اگر دوسرے درجہ میں ہوگی تو پینتالیسواں حصہ اور اگر تیسرے درجہ میں ہوگی تو اس کے خواب بھی نبوت کے چھیالیسواں حصہ شمار ہونگے گویا جتنا راوی صداقت، زہدوتقویٰ کے قریب ہوگا۔ یا پھر اچھے مقام یا بہتر زمانہ میں ہوگا اس کا خواب بھی اسی قدر نبوت کے قریب تر ہوگا اور بعض کے (۱) خیال میں یہ حدیث دراصل مبشرات نبوی ﷺ کی مدت سے صرف تعبیر ہے وہ یوں کہ نبی اکرم ﷺ کی مدت نبوت تیئس سال ہے۔ جس کا چھیالیسواں حصہ چھ مہینے بنتے ہیں گویا نبی کریم ﷺ کی بعثت سے قبل چھ مہینے تک مبشرات یعنی سچے خوابوں کا دور تھا یہ وہ زمانہ تھا جب غار حرا میں آپ ﷺ تبتل اور تخلی الی اللہ کیا کرتے تھے نبوت سے قبل کے ان چھ مہینوں میں آپ ﷺ وحی کے انداز کے عجیب سچے خواب دیکھا کرتے تھے۔

---

(۱) ذکرہ النووی ناقلاً عن الجزری وقدزیف المحققون ھذاالقول کما فی جمع الوسائل۔ ۱۲/اصلاح الدین عفی عنہ

خلاصہ باب

کتاب کے سب سے آخری باب میں نبی اکرم ﷺ کی دیدار کا شرف پانے کی سعادت کا ذکر ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے آپ ﷺ کو دیکھا اور حلیہ مبارکہ کی تفصیل ہم تک پہنچائی۔ اب آپ ﷺ کی ملاقات خواب میں ممکن ہے اور اس باب کا سب سے بڑا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ خواب میں آپ ﷺ کی زیارت کرنے والوں کا خواب سچا ہوتا ہے اور دکھائی دینے والی صورت نبی اکرم ﷺ ہی کی ہوتی ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ کی صورت میں تشکل شیطان کی بساط سے باہر ہے۔

ساتھ ساتھ اس بات کا بھی بیان ہے کہ آپ ﷺ کی صورت حضرت حسنؓ (اور کچھ حضرت حسینؓ) سے ملتی تھی نیز کسی حد تک آپ ﷺ کا حلیہ خواب میں دیکھنے والے کی زبانی مذکور ہے آخر میں مؤمن کے الہامی خوابوں کی قدر و قیمت کا ذکر ہے کہ وہ نبوت کا چھیالیسواں حصہ، قابل اعتماد اور مقبولیت کی علامت ہے۔ اس میں حضور اقدس ﷺ کے وفات سے غمزدہ اور فراق و ہجر میں تڑپنے والے عشاق کو تسلی اور تسکین کا بھی کسی حد تک سامان ہے کہ خواب میں آپ ﷺ کی زیارت سچی زیارت ہوگی اور پس ماندگان کو خواب سے بھی بڑی تسلی ہو جاتی ہے۔

خاتمہ

(۱)حدثنا محمد بن علیّ قال سمعت أبی یقول قال عبداللّٰہ ابن المبارک اذابتلیت بالقضاء فعلیک بالاثر(۱).

ترجمہ: عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ اگر قضاء کی ذمہ داری گلے پڑجائے تو آثار کا اتباع کرو۔

عبداللہ بن مبارکؒ: عبداللہ بن المبارکؒ، ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن المبارک بن واضح الحنظلی مرو(خراسان) کے رہنے والے تھے۔اسی وجہ سے ان کو مروزی کہتے ہیں۔۱۱۸ھ یا ۱۱۹ھ میں ولادت ہوئی۔اصل میں ترکی النسل تھے۔مرواس زمانہ میں اہل علم سے بھراپڑاتھا۔ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ پھرشام،حجاز،مصر،یمن اورعراق کے مختلف شہروں میں جاکرعلم حاصل کیا۔امام احمد کے بقول ان سے زیادہ سفرکرنے والاکوئی نہیں ہے۔بہت سے تابعین سے ملاقات ہوئی۔امام مالک،امام ابوحنیفہ،امام اوزاعی، سفیان ثوری رحمہم اللہ وغیرہ بہت سے دیگراکابر سے تلمذکاشرف حاصل ہوا۔ان کے ایک معاصرکاقول ہے کہ ان کے آٹھ سو اساتذہ سے تو مجھے ملاقات کا موقع ملا۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے پناہ حافظہ،ذہانت اور تقویٰ سے نوازاتھا۔

تبع تابعین میں آپ کوسرخیل کا درجہ حاصل ہے بالخصوص علم حدیث میں آپؒ کوامیرالمؤمنین سمجھاجاتاتھا۔حدیث کی کوئی بھی کتاب آپ کی روایات سے خالی نہیں ہوگی۔امام ابوحنیفہؒ سے ان کوانتہائی عقیدت تھی۔فرمایاکرتے تھے''**لولا اعاننی اللّٰہ بابی حنیفة وسفیان لکنت بدعیاً**''یعنی اگراللہ تعالیٰ میری مددابوحنیفہؒ اورسفیان سے نہ فرماتے تو میں آج بدعتی ہوتا۔اسی وجہ سے آپ کوفقہاء میں بھی بڑا درجہ حاصل ہے۔امام مالک ان کو''فقیہہ خراسان''یعنی خراسان کے فقیہ کے لقب سے پکاراکرتے تھے۔ عملی طورپرجہادمیں شرکت فرماتے تھے۔رومیوں کے خلاف آپ نے جس جرأت وبہادری کامظاہرہ کیا اس کے کئی حیران کن واقعات کتابوں میں موجودہیں۔۱۸۱ھ کوتریسٹھ برس کی عمرمیں وفات پائی۔

---

(۱)تفردالامام الترمذی بھذاالاثر

قضاء اور مراحل زندگی میں وحی اور آثار کا اتباع: اذا ابتلیت بالقضاء فعلیک بالاثر

حضرت ابن مبارکؒ عظیم اور جلیل القدر امام ہیں۔امام ترمذیؒ ان کا اثر کتاب کے آخر میں ذکر کرتے ہیں۔ جو اس بات پر تنبیہ ہے کہ جب ہم نے احادیث اور نبی کریم ﷺ کے اقوال پڑھ لئے تو اب اس پر عمل بھی چاہئے۔اور اس کے بعد صحابی کا قول اور ائمہ سلف کے فیصلے اور آثار ہیں۔جن کا اتباع چاہئے۔نیز اس میں اس بات پر بھی تنبیہ ہے کہ قضاء اور عہدہ کے پیچھے نہ پڑو۔کیونکہ یہ ایک امتحان اور مصیبت ہے۔اسی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ اور دیگر اکابر نے اسے قبول نہ کیا۔اور اگر گلے پڑ جائے اور مجبوراً انصاف کے مسند پر بیٹھنا پڑے یا اسی طرح کوئی علمی مسئلہ یا فتویٰ پوچھا گیا تو اثر سے استمساک کر و اپنی رائے اور عقل کو دوسرے مرتبہ میں رکھو۔

تعبیر خواب میں اتباع آثار: حضرت ابن مبارکؒ کے اس قول کی بظاہر ترجمۃ الباب سے واضح مطابقت نہیں مگر شراح کہتے ہیں کہ مناسبت یہ ہے کہ اگر کسی نے تعبیر پوچھی تو شیطانی خیالات اور تخمینوں کے ساتھ رائے مت قائم کرو۔ بلکہ خواب کی تعبیر میں بھی قرآن وحدیث اور آثار الصالحین کی تتبع کر کے جواب دو۔مثلاً کوئی خواب دیکھتا ہے کہ میں سمندر میں تیر رہا ہوں اور تم سے اس کی تعبیر پوچھے تو قرآن سے یوں تمسک کر سکتے ہو کہ وہ کہتا ہے **وجعلنا من الماء کل شئی حیّ۔** (انبیاء ۳۰) اور ہم نے ہر چیز کو پانی سے پیدا کیا۔

اس لئے تم بھی خواب کی تعبیر طویل زندگی سے کرو تو بعید نہیں ہوگا۔

زبیدہ خاتون نے خواب دیکھا کہ دنیا بھر سے لوگ آکر میرے ساتھ زنا کر رہے ہیں۔لوگوں سے تعبیر پوچھی لیکن کوئی ان کو مطمئن نہ کرسکا۔بالآخر ایک بزرگ سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ تو بہت اچھا خواب ہے۔تم سے اللہ تعالیٰ ایک فیض جاری کرے گا جس سے تمام عالم مستفیض ہوگا۔چنانچہ نہر زبیدہ انہوں نے کھدوائی ہے جس سے حجاز مقدس میں پانی مہیا کیا جانے لگا۔عرفات، منیٰ اور مکہ والوں کو پانی کی تکلیف ہوتی تھی۔جو اس نہر کے سبب دور ہوگئی اور اس طرح حرمین کے واسطے سے تمام عالم کے لوگ مستفیض ہونے لگے۔مشرق ومغرب سے لوگ آکر اس کا پانی استعمال کرنے لگے۔

لیکن اس سے بھی مناسبت بہتر یہ ہے کہ خاتمہ میں جو دو آثار منقول ہیں۔ان کا تعلق سارے کتاب سے ہے۔ نہ کہ صرف آخری باب سے۔ کتاب میں ہم قرآن اور حدیث پڑھ چکے ہیں اب آخر میں دو باتوں کی تنبیہ کی جاتی ہے اول یہ کہ چونکہ قضاء نبوت کا کام اور اسے نبی کی خلافت کے طور پر نبھایا جاتا ہے ۔اس لئے یہ تنبیہ مقصود ہے۔ اگر کسی کو ملے تو نبی اور ان کے نائبین کی اقتداء کرے۔ اور حضور اقدس ﷺ کا نائب بننے کیلئے آپ ﷺ کی زندگی کا نقشہ اپنانا پڑتا ہے۔جو کہ کتاب شمائل کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ چنانچہ یہاں پر اثر سے مراد اصطلاح فقہاء مراد نہیں بلکہ محدثین کی اصطلاح کے مطابق مرفوع موقوف مرسل احادیث اور اقوال سلف سب اس کے زمرے میں آتے ہیں۔دوسری تنبیہ علم حدیث کے اہتمام شان سے متعلق ہے۔جو آئندہ اثر میں آرہی ہے۔

سند کی اہمیت:

(۲) حدّثنا محمّد بن علیّ ثنا النضر أخبرنا ابن عوف عن ابن سیرین قال ھذاالحدیث دین فانظروا عمّن تاخذون دینکم (۱)۔

ترجمہ: محمد بن سیرین کہتے ہیں کہ یہ علم حدیث دین ہے۔لہٰذا یہ دیکھو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو۔

إنّ ھذاالحدیث دین، یہ جملہ باب سابق سے مربوط ہوسکتا ہے کیونکہ خواب کی تعبیر کے بھی آداب ہیں۔اور سب سے بڑا ادب یہ ہے کہ اس کی تعبیر معتمد متقی عالم سے پوچھنی چاہئے اور اسی کو اس کی تعبیر نکالنے کا حق ہے۔ہر کس وناکس کو خواب کی تعبیر میں عقل نہیں لڑانا چاہئے۔

امام مالکؒ سے کسی نے پوچھا کہ ''**أیعبّر الرویا کل احد**'' یعنی کیا ہر کسی کو خواب کی تعبیر نکالنی چاہئے تو انہوں نے کہا'' **أبالنبوة تلعب**'' کیا نبوت کے ساتھ کھیلا جاتا ہے۔

اساتذہ ومشائخ کے انتخاب میں احتیاط: لیکن اس کا تعلق سارے کتاب بلکہ علوم الحدیث سے زیادہ بہتر طریقے سے بنتا ہے کیونکہ یہ جملہ مسلم شریف میں بھی ابن سیرین کے حوالے سے مروی ہے۔

---

(۱)مقدمة صحیح مسلم ۱/۱۱باب بیان الاسناد من الدین، دارمی ۱/۱۱۲،الحلیلة الاولیاء لابی نعیم ۲/۲۷۸(مختار)

وہاں پراس کے الفاظ ہیں۔

إنّ هـذاالعـلـم دين فانظروا عمّن تاخذون دينكم (۱)، یعنی یہ علم حدیث دین ہے۔لہٰذا اسے دیکھا جائے کہ کس سے یہ علم حاصل کررہے ہو۔

بلکہ امام دیلمیؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے مرفوع حدیث روایت کی ہے۔وہاں الفاظ یہ ہیں کہ **العلم دين والصلوٰة دين فانظروا عمّن تاخذون هذاالعلم. الخ**

ان تمام روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ دینی عقائد، اعمال، احکام وغیرہ کا علم قابل اعتماد شیوخ واساتذہ سے حاصل کرنا ضروری ہے۔کیونکہ جوعلم غیر مستند طریقے سے حاصل ہو یا ایسے اساتذہ سے ملے جن کا تعلق،علم تقویٰ اور دیانت سے برائے نام ہو۔تو ظاہر ہے کہ وہ بے برکت ہوتا اور قابل اعتماد نہیں رہتا۔بلکہ علم کے ساتھ ساتھ بداعتقادی،خیانت اور بدعملی بھی ساتھ ساتھ ملے گی۔خواہ وہ دانستہ طور پر ہو یا نادانستہ طور پر۔

جیسے آج کل ہم دیکھ رہے ہیں کہ مغربی یونیورسٹیوں میں ڈاکٹر بننے والے یا مطالعوں کے زور پر مفسر اور محدث بننے والے بالآخر الحاد و بدعت کا شکار ہوجاتے ہیں اور معتزلہ وخوارج بلکہ یہود ونصاریٰ کی بداعتقادیاں ان میں سرائیت کر جاتی ہیں۔رفتہ رفتہ خود کو امام، مجتہد بلکہ نبی سمجھنے لگتے ہیں۔پھر ان سے استفادہ کرنے والے بالعموم صراط مستقیم سے ہٹ کر صحابہ اور سلف صالحین پر انگشت نمائی کا کام دین کا اصل کام سمجھ لیتے ہیں۔تقلید سلف چھوڑ دیتے ہیں۔حدیث کے منکر بن جاتے ہیں۔قرآن کو زمانے کے تقاضوں کے مطابق نئے نئے سانچوں میں ڈھالنے لگتے ہیں۔

اسی طرح تصوف کے طالبین گمراہ قسم کے پیروں کے ساتھ لگ کر مشرکانہ رسوم کے داعی بن جاتے ہیں بے نماز اساتذہ کے شاگرد قابل بھی ہوں مگر ان کے دلوں میں نماز کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی ہدایت کیلئے صرف کتابوں پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ انبیاء کی صورت میں رجال اللہ کا ایک سلسلہ بھی ساتھ ساتھ چلادیا ہے اور کسی مبعوث نبی کے راستے ہی کو ہدایت کا معیار ٹھہرایا ہے۔

---

(۱)مسلم شریف مقدمة ۱/۱۱ (مختار)

الحمدللہ اس سلسلے میں ہم یہ دعویٰ بڑے فخر کے ساتھ کر سکتے ہیں کہ ہم تک پہنچنے والے علوم ہم تک سونے کے موتیوں بھری زنجیر سلسلہ الذہب کے ذریعہ پہنچے ہیں۔ ہمارے شیوخ کا تقویٰ، زہد، علم، دینی تصلب کسی پر بھی مخفی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بلند ترین درجات سے نوازے جن کی تعلیم وتربیت نے ہمیں اس مقام پر پہنچادیا ہے۔ مناسب ہے کہ کم ازکم ان کا تذکرہ ہوجائے۔

<u>میرا اسلسلہ سند:</u> میری سند حضرت شیخ الحدیث سیدی ووالدی مولانا عبدالحق رحمۃ اللہ کے وساطت سے اور کئی دیگر مشائخ عرب وعجم اجلّہ اکابر حرمین الشریفین کے اجازت سے حضور اقدس ﷺ تک پہونچتی ہے جس کی تفصیل اس سندالاجازۃ میں ہے۔

فہرست روات احادیث

شرح شمائل میں جن راویوں کے حالات ذکر کئے گئے ہیں۔ان کے اسماء گرامی حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ باب اور حدیث نمبر کے حوالے کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں۔میری تتبع کے مطابق کسی بھی حدیث کا آخری راوی تذکرے کے بغیر نہیں رہا۔البتہ شرح میں اس کا ذکر صرف ایک بار کیا گیا ہے۔

اصلاح الدین عفی عنہ

الف			
نمبر شمار	نام راوی	باب نمبر	حدیث نمبر
۱	ابن سیرین	۱۴	۴
۲	ابواسید	۲۶	۷
۳	ابوالطفیلؓ	۱	۱۳
۴	ابوالھیثم بن التیھان	۵۱	۴
۵	ابوامامۃ باہلی	۲۵	۲
۶	ابوایوب الانصاریؓ	۲۸	۱
۷	ابوالبختریؒ	۵۴	۳
۸	ابوبردہ	۸	۱
۹	ابوبکرالصدیقؓ	۵۳	۵
۱۰	ابوجحیفۃ وھب بن عامر	۵	۶
۱۱	ابوذرالغفاریؓ	۳۵	۴
۱۲	ابورمثۃ التیمی	۵	۷

۱۳	ابوسعید الخدریؓ	۲	۸
۱۴	ابوسلمۃ بن عبدالرحمٰن	۵۳	۱۱
۱۵	ابوطلحۃ	۵	۲
۱۶	ابوعبیدؓ	۲۶	۱۸
۱۷	ابوعمیرؓ	۳۶	۲
۱۸	ابوقتادہؓ	۳۹	۷
۱۹	ابوموسیٰ الاشعریؓ	۳۶	۲
۲۰	ابوھریرۃؓ	۱	۱۱
۲۱	اسامۃ بن زید	۸	۶
۲۲	اسماء بنت یزید	۸	۴
۲۳	اصمعیؒ	۱	۶
۲۴	انس بن مالک	۱	۱
۲۵	ام المنذر سلمٰی	۲۶	۳۰
۲۶	ام سلمۃ	۸	۱
۲۷	ام سلیم	۳۲	۹
۲۸	ام ہانی	۵	۳
	ب		
۲۹	باقر (الامام)	۵۳	۱۰
۳۰	بشر بن الفضل	۷	۳
۳۱	براء بن عازب	۱	۳
۳۲	بریدہ بن الحُصیف	۲	۶
۳۳	بلال بن رباح	۲۶	۱۵

۵۱	رُمیثہ	۶	۳
	ز		
۵۲	زاہر بن حرام	۳۶	۵
۵۳	زبیر بن العوام	۱۵	۱
۵۴	زہدم الجرمی	۲۶	۴
۵۵	زید بن ثابت	۴۷	۱
۵۶	زید بن خالد الجہنی	۳۹	۹
	س		
۵۷	سائب بن یزید	۲	۱
۵۸	سالم بن عبید	۵۳	۱۲
۵۹	سدّیؒ	۱۱	۶
۶۰	سعد بن ابی وقاص	۳۲	۱۰
۶۱	سعد بن معاذ	۲	۳
۶۲	سعید بن الحسن	۱۴	۲
۶۳	سفینہ مولیٰ رسول اللہ ﷺ	۲۶	۵
۶۴	سلمان الفارسی	۲	۶
۶۵	سلمۃ بن الاکوع	۱۸	۳
۶۶	سلمیٰؓ ام رافع	۲۶	۲۷
۶۷	سلمیٰ بنت قیس ام المنذر	۲۶	۳۰
۶۸	سمرۃ بن جندب	۱	۸
۶۹	سھل بن سعدؓ	۲۴	۴

۸۷	عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ	۳۲	۲
۸۸	عبداللہ بن قیس، ابوموسیٰ اشعریؓ	۱۶	۴
۸۹	عبداللہ بن مسعودؓ	۲۶	۱۷
۹۰	عبداللہ بن مغفل	۴۳	۶
۹۱	عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ	۴۰	۳
۹۲	عبدالرحمٰن بن عوف	۵۱	۹
۹۳	عتبۃ بن غزوان	۵۱	۶
۹۴	عروۃ بن مسعودؓ	۱	۱۲
۹۵	عطاء بن مسلم الخفاف	۲۳	۲
۹۶	علی بن ابی طالب	۱	۵
۹۷	عمر بن ابی سلمۃ	۲۸	۳
۹۸	عمر بن الخطاب	۲۶	۸
۹۹	عمرو بن الاخطب	۲	۴
۱۰۰	عمرو بن الحارث	۵۴	۱
۱۰۱	عمرو بن العاص	۴۷	۲
۱۰۲	عمرو بن حریث	۱۱	۶
۱۰۳	عوف بن مالکؓ	۴۲	۱۶
	ف		
۱۰۴	فضل بن عباس	۲۳	۲
	ق		
۱۰۵	قتادۃ بن عامر	۴۳	۷
۱۰۶	قرۃ بن ایاس	۸	۵

۱۰۷	قیلہ بنت مخرمۃ	۸	۱۲
ک			
۱۰۸	کبشۃ بنت ثابت	۳۲	۷
۱۰۹	کعب بن مالک	۲۴	۱
ل			
۱۱۰	لبید بن ربیعہؓ	۳۷	۲
م			
۱۱۱	مالک بن اوسؓ	۵۴	۶
۱۱۲	مالک بن دینار	۹	۲
۱۱۳	محمد بن الحنفیہ	۱	۶
۱۱۴	محمد بن علی بن الحسین (باقر)	۵۳	۱۰
۱۱۵	مزیدہ بن جابرؓ	۱۴	۳
۱۱۶	مسروق	۲۵	۶
۱۱۷	معاذ بن الحارث	۳۰	۶
۱۱۸	معاویۃ بن ابی سفیان	۵۲	۲
۱۱۹	معوذ بن حارثؓ	۳۰	۶
۱۲۰	معیقیب	۱۳	۶
۱۲۱	مغیرہ بن شعبۃ	۸	۱۶
۱۲۲	میمونۃ بنت الحارث	۳۱	۲
ن			
۱۲۳	نعمان بن بشیرؓ	۲۶	۲

و			
۱۲۴	وھب بن عامر، ابوجحیفۃ	5	۶
ہ			
۱۲۵	ہند بن ابی ہالہ	۱	۷
ی			
۱۲۶	یحیٰ بن معین	۸	۶
۱۲۷	یزید الرشک	۴۰	۱
۱۲۸	یزید الفارسی	۵۵	۵
۱۲۹	یوسف بن عبداللہ بن سلام	۲۶	۳۲